اُردو اکادمی، دہلی کا ترجمان

اُردو اکادمی، دہلی کی چند اہم مطبوعات

مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے

اُردو اکادمی دہلی نے "مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے" کے عنوان سے جو کل ہند سیمینار منعقد کیا تھا اس میں پڑھے جانے والے مقالے اس کتاب میں یکجا کر دیے گئے ہیں جو چھ حصوں میں تقسیم ہیں۔ سیرت و شخصیت، سیاست، مذہب، ادبی نثر، صحافت اور شاعری۔ کوشش کی گئی ہے کہ مولانا کی شخصیت اور کارناموں کے ہر پہلو پر خاطر خواہ روشنی پڑ جائے۔ مولانا کی شخصیت اور کارناموں سے مکمل آگاہی کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ تقریباً دو سو صفحات پر مولانا کے مکمل سوانح حیات بیان کیے گئے ہیں اور مولانا کی تاریخی اور اہم ترین تصویریں بھی شامل کی گئی ہیں۔

مرتب: ڈاکٹر خلیق انجم۔ صفحات: ۵۰۲ قیمت: ۴۸ روپے

بزمِ آخر

اس کتاب میں ابونصر معین الدین اکبر شاہ ثانی کے زمانے سے لے کر ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ آخری بادشاہ دہلی کے عہد تک روزمرہ کے کُل برتاؤ، عادتیں، رہنی خانگی معاملات، دربار اور سواری کے قاعدے، جشن اور نذروں کے قرینے زنانہ اور مردانہ میلوں کے رنگ، تماشوں کے ڈھنگ، تخت نشینی وغیرہ نہایت شرح و بسط کے ساتھ درج ہیں۔ ابتدا میں کامل قریشی کا جامع مقدمہ شامل ہے۔

مصنف: منشی فیض الدین مرتب: ڈاکٹر کامل قریشی

صفحات: ۱۲۴ قیمت: ۲۱ روپے

دہلی کی آخری شمع

دہلی کے ایک یادگار مشاعرے کا حال جسے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ قلعۂ معلّیٰ اور اس کے باہر مشاعروں کے کیا آداب تھے۔ مشاعرہ سماجی ضرورت بھی تھا اور ایک تربیت گاہ بھی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ اس مشاعرے کے سامع بھی ہیں اور راوی بھی۔ کلام اور شاعر کے پڑھنے کے انداز ان کے دلچسپ تبصرے اس بات کی دلیل ہیں کہ اگر وہ سنجیدگی سے تنقید کی طرف توجہ کرتے تو اُردو ادب کو کیا کچھ دے جاتے۔ دہلی کے اس یادگار مشاعرے کا نیا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے جسے ڈاکٹر صلاح الدین نے اپنے جامع مقدمے کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ کتاب میں مقدمے کے علاوہ بعض ضروری حواشی اور فرہنگ کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔

مصنف: مرزا فرحت اللہ بیگ مرتب: ڈاکٹر صلاح الدین

صفحات: ۱۴۰ قیمت: ۲۳ روپے

دلّی کا آخری دیدار

سیّد وزیر حسن دہلوی نے دلّی کی ٹکسالی زبان میں دلّی کے لال قلعے اور اس کے مکینوں کے شب و روز کی جھلکیاں پیش کی ہیں۔ یہ کتاب آخری مغل دور کی معاشرتی فضا کا منہ بولتا مرقع ہے۔ جس دلّی کا یہ کتاب قصہ سُناتی ہے وہ صرف ایک شہر ہی نہ تھی، ایک تہذیب کا نشان، ایک تمدن کا گہوارہ، علم و ادب کا مرکز اور ایک ایسی گزرگاہِ فکر تھی جہاں علم و فن، تعلیم و تربیت، اخلاق و مذہب، معاشرے اور سیاست کے سانچے صدیوں تک ڈھلے تھے۔ سیّد ضمیر حسن دہلوی نے اپنے طویل مقدمے کے ساتھ اس کتاب کو مرتب کیا ہے۔

مصنف: سیّد وزیر حسن دہلوی مرتب: سیّد ضمیر حسن دہلوی

صفحات: ۴۷ قیمت: ۱۷ روپے

دلّی والے

اُردو اکادمی، دہلی کی طرف سے منعقد "دلّی والے" سیمینار میں پڑھے جانے والے خاکوں کا مجموعہ۔ ان شخصیتوں کے قلمی خاکے جنھوں نے دلّی کی ادبی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی زندگی کے خد و خال سنوارے۔ ہر وہ شخص جو دلّی آ کر بسا وہ دلّی والا کہلایا۔ دلّی نے اسے اپنایا اور اس نے دلّی کو گلے لگایا۔

مرتب: ڈاکٹر صلاح الدین صفحات: ۳۵۷ قیمت: ۳۶ روپے

مئی ۱۹۸۷

اُردو اکادمی، دہلی کا ترجمان

جلد ۱
نمبر ۱

ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی

حرفِ آغاز — سید شریف الحسن نقوی — ۴

مضامین
عمدۂ منتخبہ میں تذکرۂ غالب — کالی داس گپتا رضا — ۲۸
پتھر بولتے ہیں — خلیق انجم — ۴۱
تذکرہ گلابوں کا — ابو شعیب احسن — ۵۵
دلّی کی بدلتی فضا — ڈاکٹر محمد اسلم پرویز — ۶۴

انشائیے
چلو اکیسویں صدی — معین اعجاز — ۷۱

افسانے
دُکھ ہرن — جوگندر پال — ۳۴
صرف ایک شب کا فاصلہ — ابنِ کنول — ۴۸
نیم پلیٹ — طارق چھتاری — ۵۹

غزلیں:
جگن ناتھ آزاد، بشیر بدر — ۳۳
حفیظ میرٹھی، محسن زیدی — ۴۰
جاوید وششٹ، کرشن بہاری نور — ۴۷
شاہد ماہلی — ۵۴
ملکہ نسیم، نسیم نکہت — ۶۶
اُردو کا خبرنامہ: ادارہ — ۷۷
نئی کتابیں: مخمور سعیدی — ۷۴

سید شریف الحسن نقوی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے سمر آفسیٹ پریس دہلی ۲ سے چھپوا کر دفتر اُردو اکادمی نئی دہلی ۲ سے شائع کیا۔

حرفِ آغاز

ایوانِ اُردو دھلی کا پہلا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔

دہلی اُردو صحافت کا قدیم مرکز ہے۔ مولوی محمد حسین آزاد کے والد اور استاذ ذوق کے حبیبِ لبیب مولوی محمد باقر نے اردو کا پہلا مکمل اخبار دھلی اردو اخبار کے نام سے یہیں سے جاری کیا تھا۔

آج بھی دہلی سے اُردو کے بہت سے اچھے اخبار اور رسالے نکل رہے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے قارئین کا ایک حلقہ رکھتا ہے اور ان کے ذوقِ مطالعہ کی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے۔

اُردو اکادمی، دہلی نے جب اپنا رسالہ نکالنے کا فیصلہ کیا تو اس کے پیشِ نظر اُردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے بنیادی مقصد کے ساتھ ساتھ ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ اُن گنگا جمنی ثقافتی اور تہذیبی قدروں کو فروغ دیا جائے جو ہمارا قیمتی قومی ورثہ ہیں اور جن کی تشکیل و تعمیر میں اُردو زبان اور اُردو ادب نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔

اردو زبان اپنے آغاز ہی سے مختلف الخیال اور مختلف العقائد افراد اور گروہوں کو باہم قریب لانے کا خوشگوار فریضہ ادا کرتی رہی ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا کہ یہ زبان اسی ضرورت کے تحت وجود میں آئی اور پھر اس نے اس اہم تاریخی اور تمدنی ضرورت کو جس خوبی کے ساتھ پورا کیا؛ اس میں کوئی دوسری ہندوستانی زبان مشکل ہی سے اس کی شریک قرار دی جا سکتی ہے ——— آج بھی ملک گیر رابطے کی زبانیں دو ہی ہیں: ایک ہندی، جسے ہماری قومی اور سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے اور دوسری اُردو، جسے نہ تو مرکز، نہ بیشتر ریاستوں میں کوئی سرکاری حیثیت ملی ہے لیکن جو ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جسے دوسری زبانوں والے بھی، غیر زبان والوں کے ساتھ اپنے وسیلۂ اظہار کے طور پر استعمال کرنے میں سہولت محسوس کرتے ہیں۔

آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے بین الاقوامی سیاست میں بقائے باہم کے جن اصولوں کی اَن تھک حمایت کی تھی، اُردو اُن اصولوں کی ہمیشہ ترجمان رہی ہے۔ آج ملکی سیاست پر بھی ان زریں اصولوں کے ہمہ گیر اطلاق کی ضرورت ہے ——— ہندوستان رقبے کے لحاظ سے بھی اور آبادی کے اعتبار سے بھی بہت بڑا ملک ہے۔ یہاں مختلف مذہبوں اور مسلکوں کے ماننے والے آباد ہیں! اسی مناسبت سے یہاں کی تہذیب و ثقافت میں بھی رنگا رنگی اور بوقلمونی ہے۔ یہاں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں جنھیں اپنے اپنے علاقے میں، اکثریت کی مادری زبان کی اہمیت حاصل ہے اور جن میں سے کئی طویل اور پُر شکوہ ادبی علمی روایت کی حامل ہیں۔ ان تمام مذہبوں، تہذیبوں، ثقافتوں اور زبانوں کو پھولنے پھلنے کے یکساں مواقع ملنے چاہئیں اور ہمارے آئین میں اس کی ضمانت دی گئی ہے لیکن یہ عمل کسی آپسی ٹکراؤ کے بغیر ہونا چاہیے۔ ٹکراؤ اور تصادم کی فضا تعصب، تلخی، تشدد اور تخریب کاری کو جنم دیتی ہے اور یہ چیزیں ہمارے قومی آدرشوں کے منافی ہی نہیں، ان کی قاتل بھی ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ان کی جگہ کشادہ دلی، معاملہ فہمی، اعتماد اور تعمیر پسندی کے میلانات کو دی جائے اور کثرت میں وحدت کا جو نظارہ ہم ہندوستانی کرتے آئے ہیں، اُسے آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیا جائے۔

ایوانِ اردو دھلی کا ایک اور مقصد سائنسی روشن خیالی کو فروغ دینا ہے جسے اوّل الذکر مقصد کا تابع بھی کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے

بیشتر تعصّبات ان توہّمات کی دین ہوا کرتے ہیں جو سائنسی اندازِ نظر کی عدم موجودگی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر ہم اپنے ضرورت سے زیادہ پُرجوش جذبات و خیالات کو عقل و استدلال کی کسوٹی پر پرکھ لینے کے عادی ہو جائیں تو اپنی ذات کا خود احتساب کر سکتے ہیں جو ایک مہذب انسان کی پہلی پہچان ہے۔ عقل و استدلال کی روشنی میں ہم دوسرے کے نقطۂ نظر کو بھی بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں اور ان بدگمانیوں سے پیچھا چھڑا سکتے ہیں جو ایک دوسرے کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ آپ ان نیک مقاصد میں ہمارے شریک ہیں —— تو آئیے ان کے فروغ و استحکام میں ہمارا ساتھ دیجیے اور ہماری آواز کو، جو آپ کی بھی آواز ہے، مؤثر بنانے کے لیے ایوانِ اردو دہلی کو گھر گھر پہنچا دیجیے۔

اس شمارے میں چار مضامین شامل ہیں —— تین کی نوعیت تحقیقی ہے۔ اُردو اکادمی، دہلی کی تحقیقی اور اشاعتی کمیٹی کے چیئرمین خلیق انجم صاحب ادبی تحقیق کے علاوہ دہلی کے آثار و احوال کی دید و دریافت سے بھی گہرا شغف رکھتے ہیں۔ سرسید نے اپنی مشہور کتاب آثار الصّنادید میں دہلی کی بہت سی تاریخی عمارتوں کا ذکر کیا ہے لیکن کئی اہم تعمیرات تھیں جو ان کی نظر سے رہ گئیں یا جن کا ذکر انھوں نے ضروری نہیں سمجھا —— آثار الصّنادید کی ترتیب و اشاعت کو سوا سو سال سے اوپر کا عرصہ گزر چکا ہے، جن عمارتوں کا اس میں ذکر ہے، اس طویل عرصے میں وہ بہت سے تغیّرات سے دوچار ہوئی ہیں۔ ان کی حالت اب وہ نہیں جو سرسید نے دیکھی تھی —— خلیق انجم صاحب ایسی تمام عمارتوں پر تحقیق کر رہے ہیں۔ اپنے نتائجِ تحقیق میں انھوں نے ماہ بہ ماہ ایوانِ اردو دہلی کے قارئین کو شریک کرنے کا ہم سے وعدہ کیا ہے۔ اس شمارے میں شامل ان کا مضمون اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے اور معلومات اور دلچسپی دونوں سے پُر ہے۔

جنابِ کالی داس گپتا رضا غالبیات سے خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ انھوں نے ایک ہمعصر تذکرے میں غالب کے ذکر اور اس کے متعلّقات سے بحث کی ہے۔ ان کا طرزِ نگارش علمیت کے ساتھ ساتھ شگفتگی کا بھی حامل ہے۔ ابوشعیب احسن صاحب کا مضمون بھی تحقیق و تلاش پر مبنی ہے لیکن یہ رنگ و بو کی تحقیق و تلاش ہے۔ گلاب کو پھولوں کا بادشاہ کہا گیا ہے، ابوشعیب احسن صاحب نے رنگ و بو کی مملکت کے اسی بادشاہ کی تاریخ رقم کی ہے۔ اگلی قسط میں وہ اس کے خصائل و اوصاف کے بیان کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے ہمارے شہروں میں بڑھتی ہوئی فضائی آلودگی کے مسئلے پر قلم اُٹھایا ہے۔ اس مسئلے کا سیدھا تعلق ہماری زندگی سے ہے۔ عام طور پر ہمارے رسائل ادبی موضوعات کے حصار سے باہر نکلنا نہیں چاہتے۔ ہم نے یہ حصار توڑنے کی جسارت کی ہے اور ہماری کوشش ہوگی کہ ایوانِ اُردو دہلی کے صفحات اس رنگارنگی اور بوقلمونی کا نمونہ ہوں جو انسانی زندگی میں پائی جاتی ہے۔

اس شمارے کے افسانہ نگار حضرات میں جوگندر پال، ابنِ کنول اور طارق چھتاری شامل ہیں۔ جوگندر پال ترقی پسندی کے دَور سے جدیدیت کے دور تک اُردو فکشن کا اہم نام رہے ہیں اور ان کے قلم کی تازگی اور توانائی میں آج بھی کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ انھوں نے ہماری درخواست پر اپنا تازہ ترین افسانہ ہمیں عنایت کیا ہے۔ ابنِ کنول اور طارق چھتاری دونوں نئی پیڑھی کے نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانے بلیغ معنویت کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ اس ابہام اور پیچیدگی سے بَری ہیں جس نے کہانی سے اس کا کہانی پن چھین لیا تھا۔

معین اعجاز کا انشائیہ طنز و مزاح کی چاشنی بھی لیے ہوئے ہے اور کچھ تلخ ماحولی حقیقتوں کی طرف انگشت نما بھی ہے۔

شعری حصے میں ہمارے عہد کے کئی محبوب و محترم شاعروں اور شاعرات کی دل چھو لینے والی غزلیں آپ پڑھیں گے۔

نئی کتابوں پر تبصرے اور ادبی خبریں آخری صفحات میں شامل کی گئی ہیں۔ یہ دونوں کالم آپ کو ہمعصر ادبی صورتِ حال سے باخبر رکھنے میں معاون ہوں گے۔

آخر میں یہ کہتے ہوئے ہمیں مسرت ہو رہی ہے کہ ایوانِ اُردو دھلی کا نام، دہلی کے ادب دوست لیفٹیننٹ گورنر جناب ایچ۔ ایل۔ کپور کا پسند کردہ ہے، جو اُردو اکادمی، دہلی کے چیئرمین بھی ہیں اور جن کی سرگرم تائید و حمایت اکادمی کو ہمہ وقت حاصل رہی ہے۔ دہلی انتظامیہ نے بھی جس کے سربراہوں میں جناب جگ پرویش چندر، جناب کلانند بھارتیہ، جناب بنسی لال چوہان اور جناب چودھری پریم سنگھ جیسی معزز عوامی شخصیتیں شامل ہیں، اکادمی کے کاموں سے ہمیشہ گہری دلچسپی لی ہے اور قدم قدم پر ہماری حوصلہ افزائی کی ہے — صدر جمہوریہ جناب گیانی ذیل سنگھ، مرکزی وزیر خوراک و رسد و پارلیمانی امور جناب ہری کشن لال بھگت، مرکزی وزیر سیر و سیاحت جناب مفتی محمد سعید، اتر پردیش کے وزیر تعلیم جناب سید سبط رضی، دہلی میٹروپولیٹن کونسل کے چیئرمین جناب پرشوتم گوئل، نائب چیئرمین محترمہ تاجدار بابر، اکادمی کے معزز ممبران اور دوسری اہم شخصیتوں کے علاوہ ہمارے ان محسنوں کے حوصلہ افزا پیغامات بھی اس شمارے کی زینت ہیں۔

اعلان کے مطابق ایوانِ اُردو دھلی کی ضخامت ۶۸ صفحے ہونی تھی لیکن اس شمارے میں نگارشات کے علاوہ چونکہ پیغامات بھی شامل ہیں اس لیے صفحات کی تعداد بڑھا دی گئی ہے۔

ہم آپ کے مفید مشوروں کے منتظر رہیں گے تاکہ ان کی روشنی میں آپ کے رسالے کو بہتر سے بہتر بنا سکیں۔
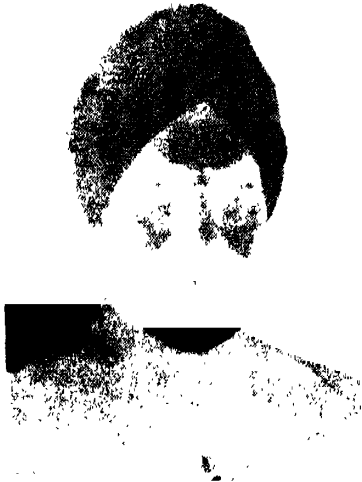
राष्ट्रपति सचिवालय
राष्ट्रपति भवन
नई दिल्ली-110004.
President's Secretariat
Rashtrapati Bhavan
New Delhi 110004

MESSAGE

The President of India is glad to learn that the Urdu Academy, Delhi Administration, Delhi, is bringing out the First Issue of its Monthly Journal "Aiwan-e-Urdu Delhi" shortly.

The President sends his greetings to all the members of the Academy on the occasion and best wishes for the success of the Journal.

(Tarlochan Singh)

New Delhi,
March 4, 1987.

संसदीय कार्य एवं
खाद्य और नागरिक पूर्ति मंत्री
भारत सरकार
नई दिल्ली-११०००१
MINISTER OF
PARLIAMENTARY AFFAIRS AND
FOOD AND CIVIL SUPPLIES
GOVERNMENT OF INDIA
NEW DELHI-110001

پیغام

مجھے یہ معلوم ہو کر بہت خوشی ہوئی کہ اردو اکادمی، دہلی ایک ماہانہ رسالہ "ایوان اردو دہلی" نکال رہا ہے - یہ میرے علم میں ہے کہ اردو اکادمی دہلی پچھلے چند برسوں سے بہت سرگرم اور فعال ہے - اس نے اردو ادب اور صحافت کے موضوعات پر سیمینار اور ورکشاپ منعقد کئے ہیں جن میں مختلف مکاتب فکر کے ادیبوں اور صحافیوں کو اپنے خیالات کے اظہار کا موقعہ ملا اور متعدد تعمیری تجویزیں ابھر کر سامنے آئیں - اکادمی نے ثقافتی میدان میں بھی کئی معرکۃ الارا پروگراموں کا اہتمام کیا جن میں اس ملک کی گنگا جمنی تہذیب کو اجاگر کیا گیا اور جنہیں دہلی کے عوام اور خواص میں بہت پسند کیا گیا -

مجھے امید ہے کہ "ایوان اردو دہلی" اردو اکادمی دہلی کے مقاصد اور آدرشوں کی تشہیر میں مدد دے گا - میری پرخلوص دعا ہے کہ آپ کا ماہنامہ کامیاب ہو -

(ایچ کے ایل بھگت)

पर्यटन मंत्री
MINISTER OF TOURISM

March, 1987

MESSAGE

I am glad to know that Urdu Academy, Delhi is planning to bring out a monthly journal, **Aiwane-e-Urdu Delhi**. We should all make earnest efforts in getting Urdu its rightful place in the country. I wish the organisers all well in their efforts to spread the message of goodwill and friendship through Urdu language.

(MUFTI MOHD. SAYEED)

Transport Bhawan Parliament Street New Delhi 110001 INDIA

संसदीय कार्य एवं
खाद्य और नागरिक पूर्ति मंत्री
भारत सरकार
नई दिल्ली-११०००१
MINISTER OF
PARLIAMENTARY AFFAIRS AND
FOOD AND CIVIL SUPPLIES
GOVERNMENT OF INDIA
NEW DELHI-110001

پیغام

مجھے یہ معلوم ہو کر بہت خوشی ہوئی کہ اردو اکادمی، دہلی ایک ماہانہ رسالہ "ایوان اردو دہلی" نکال رہا ہے - یہ میرے علم میں ہے کہ اردو اکادمی دہلی پچھلے چند برسوں سے بہت سرگرم اور فعال ہے - اس نے اردو ادب اور صحافت کے موضوعات پر سیمینار اور ورکشاپ منعقد کئے ہیں جن میں مختلف مکاتب فکر کے ادیبوں اور صحافیوں کو اپنے خیالات کے اظہار کا موقعہ ملا اور متعدد تعمیری تجویزیں ابھر کر سامنے آئیں - اکادمی نے ثقافتی میدان میں بھی کئی معرکۃ الارا پروگراموں کا اہتمام کیا جن میں اس ملک کی گنگا جمنی تہذیب کو اجاگر کیا گیا اور جنہیں دہلی کے عوام اور خواص میں بہت پسند کیا گیا -

مجھے امید ہے کہ "ایوان اردو دہلی" اردو اکادمی دہلی کے مقاصد اور آدرشوں کی تشہیر میں مدد دے گا - میری پرخلوص دعا ہے کہ آپ کا ماہنامہ کامیاب ہو -

(ایچ کے ایل بھگت)

March, 1987

MESSAGE

I am glad to know that Urdu Academy, Delhi is planning to bring out a monthly journal, **Aiwane-e-Urdu Delhi.** We should all make earnest efforts in getting Urdu its rightful place in the country. I wish the organisers all well in their efforts to spread the message of goodwill and friendship through Urdu language.

(MUFTI MOHD. SAYEED)

Transport Bhawan Parliament Street New Delhi 110001 INDIA

संसदीय कार्य एवं
खाद्य और नागरिक पूर्ति मंत्री
भारत सरकार
नई दिल्ली-११०००१
MINISTER OF
PARLIAMENTARY AFFAIRS AND
FOOD AND CIVIL SUPPLIES
GOVERNMENT OF INDIA
NEW DELHI-110001

پیغام

مجھے یہ معلوم ہو کر بہت خوشی ہوئی کہ اردو اکادمی، دہلی ایک ماہانہ رسالہ " ایوان اردو دہلی" نکال رہا ہے - یہ میرے علم میں ہے کہ اردو اکادمی دہلی پچھلے چند برسوں سے بہت سرگرم اور فعال ہے - اس نے اردو ادب اور صحافت کے موضوعات پر سیمینار اور ورکشاپ منعقد کئے ہیں جن میں مختلف مکاتب فکر کے ادیبوں اور صحافیوں کو اپنے خیالات کے اظہار کا موقعہ ملا اور متعدد تعمیری تجویزیں ابھر کر سامنے آئیں - اکادمی نے ثقافتی میدان میں بھی کئی معرکۃ الآرا پروگراموں کا اہتمام کیا جن میں اس ملک کی گنگا جمنی تہذیب کو اجاگر کیا گیا اور جنہیں دہلی کے عوام اور خواص میں بہت پسند کیا گیا -

مجھے امید ہے کہ " ایوان اردو دہلی" اردو اکادمی دہلی کے مقاصد اور آدرشوں کی تشہیر میں مدد دے گا - میری پرخلوص دعا ہے کہ آپ کا ماہنامہ کامیاب ہو -

(ایچ کے ایل بھگت)

पर्यटन मंत्री
MINISTER OF TOURISM

March, 1987

MESSAGE

I am glad to know that Urdu Academy, Delhi is planning to bring out a monthly journal, **Aiwane-e-Urdu Delhi**. We should all make earnest efforts in getting Urdu its rightful place in the country. I wish the organisers all well in their efforts to spread the message of goodwill and friendship through Urdu language.

(MUFTI MOHD. SAYEED)

Transport Bhawan Parliament Street New Delhi 110001 INDIA

उपराज्यपाल
दिल्ली
LIEUTENANT GOVERNOR
DELHI

राज निवास
दिल्ली-११००५४
RAJ NIWAS
DELHI-110054

پیغام

"اردو" نے مختلف مذہبوں اور عقائد کے ماننے والوں کو یک جہتی کے جس رشتے میں پرویا ہے ، اس کو برقرار رکھنا اور مزید مستحکم کرنا ہمارا ایک قومی فرض ہے ، اس فرض کی تکمیل میں دہلی اردو اکادمی اور اس کے ممبران ایک اہم کردار ادا کررہے ہیں ، اکادمی کی گذشتہ چند برسوں کی کارگردگی اور خدمات کا جائزہ لینے سے احساس ہوتا ہے کہ ہندوستان کے اس عظیم اور تاریخی شہر میں یک جہتی کی قدروں کو تقویت ملی ہے ، غیر اُردو داں طبقے میں اُردو سیکھنے اور پڑھنے کا جذبہ پیدا ہوا ہے ۔ یہی چھوٹے چھوٹے جذبے ملک کی سالمیت اور استحکام کو مزید مستحکم کریں گے اور یک جہتی کی قدریں فروغ پائیں گی ۔

دہلی اردو اکادمی کی طرف سے شائع کیا جانے والا ماہنامہ جریدہ "ایوانِ اردو" اکادمی کی ٹھوس اور تعمیری خدمات ایک اور مثبت قدم ہے ۔ میں اس جریدے کی کامیابی اور مقبولیت کا متمنی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ یہ جریدہ دہلی اور اردو کے رشتے اور قومی یک جہتی اور اردو کے تعلق کو نئی توانائی اور تازگی دے گا ۔
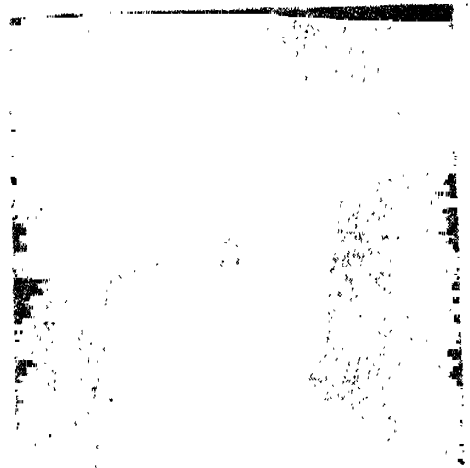
(ایچ ۔ ایل ۔ کپور)

کونسل ہاؤس
لکھنؤ
۳ مارچ ۸۷ء

سید سبطِ رضی
وزیر تعلیم و مسلم اوقاف
حکومت اُترپردیش

پیغام

مجھے یہ جان کر بہت مسرت ہوئی کہ اُردو اکادمی کے زیرِ اہتمام ماہنامہ

— ایوانِ اُردو دہلی —

بہت جلد اجرا ہونے والا ہے۔ اُردو اکادمی دہلی کے ادبی کارنامے مشعلِ راہ بنتے جا رہے ہیں، اُردو اکادمی دہلی کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والی تصنیفات اگر ایک طرف دامنِ اُردو کو مالا مال کر رہی ہیں تو دوسری طرف ارکانِ اکادمی کی مستحسن عمل کی گواہی بھی دے رہی ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ یہ ماہنامہ بھی اُردو ادب کو ثقافتی، تہذیبی، تعلیمی اور ادبی سرمایہ فراہم کرے گا، اور ہر شمارہ، ہر مضمون آپ حضرات کی خوش سلیقگی، اور بے مثال تجربات کا آئینہ دار ہوگا۔

نیک خواہشات اور بہترین تمناؤں کے ساتھ

آپ کا مخلص
سید سبطِ رضی

بہ سید شریف الحسن نقوی صاحب (سکریٹری)
اُردو اکادمی دہلی
دریاگنج - نئی دہلی

JAG PARVESH CHANDRA

मुख्य कार्यकारी पार्षद
दिल्ली प्रशासन, दिल्ली
CHIEF EXECUTIVE COUNCILLOR
DELHI ADMINISTRATION, DELHI
दिल्ली, दिनांक
Delhi, Dated

MESSAGE

I am delighted to know that the Urdu Academy is going to bring out its monthly journal- Aiwan-e-Urdu Delhi.

It is a commendable venture, specially when it aims at not only promote Urdu literature but also to foster national integration. Urdu had been the vehicle of patriotic feelings during the freedom struggle and should now rightfully take up the task of ~~welding~~ uniting the Indian people and strengthening nationalism.

I wish you well in your laudable venture.

Jag Parvesh Chandra
(JAG PARVESH CHANDRA)

Shri S.H. Naqvi,
Secretary,
Urdu Academy,
Darya Ganj,
New Delhi

कार्यकारी पार्षद (शिक्षा)
दिल्ली प्रशासन, दिल्ली
EXECUTIVE COUNCILLOR (EDU.)
DELHI ADMINISTRATION, DELHI

दिल्ली, दिनांक 27 मार्च, 87
Delhi, Dated

संदेश

मुझे यह जानकर हार्दिक प्रसन्नता हुई कि उर्दू अकादमी, दिल्ली द्वारा "एवाने उर्दू" नामक मासिक पत्रिका का प्रकाशन आरम्भ किया जा रहा है।

उर्दू भाषा हम सबकी भाषा है। यह सबको जोड़ती है। यह बड़ी मधुर और सरल भाषा है, जिसका बोध आम जनता को आसानी से हो जाता है। स्वतन्त्रता आन्दोलन के दिनों में यही भाषा थी जिसके माध्यम से सर्वसाधारण को स्वतन्त्रता के लिए जागृत किया।

उर्दू भाषा का उत्थान बहुत आवश्यक है। उर्दू अकादमी इस दिशा में विभिन्न माध्यमों के द्वारा सराहनीय कार्य कर रही है और अब "एवाने उर्दू" का प्रकाशन शुरू करके एक और प्रशंसनीय प्रयास होगा। मुझे आशा है कि उर्दू भाषा के उत्थान के लिए उर्दू अकादमी द्वारा किए जा रहे प्रयासों को सफलता में इस पत्रिका का काफी योगदान मिलेगा।

मेरी शुभ कामनायें आपके साथ हैं। मैं इस पत्रिका की सफलता की कामना करता हूँ।

(कुलानन्द भारतीय)

श्री एम॰एच॰नक़वी,
सचिव, उर्दू अकादमी, दिल्ली,
दरिया गंज, नई दिल्ली-2

कार्यकारी पार्षद (विकास)
दिल्ली प्रशासन, दिल्ली
EXECUTIVE COUNCILLOR (DEV.)
DELHI ADMINISTRATION, DELHI

दिल्ली, दिनांक / Delhi, Dated 18/3/87

پریم سنگھ
ایگزیکیوٹو کونسلر ۔ دلی ایڈمنسٹریشن دلی ۔

مجھے یہ جان کر دلی خوشی ہوتی ہے کہ اردو اکادمی دہلی ۔
ایک ماہنامہ ۔ "ایوانِ اردو دہلی" شائع کرنے جا رہی ہے ۔
اردو ہندوستانی زبانوں کا سنگم ہے ۔ اور ہماری جنگ
آزادی میں اس کا نمایاں حصہ ہے ۔ یہ ہر دلعزیز زبان آپسی
بھائی چارہ میل ملاپ اور قومی یکجہتی کی علامت بن گئی ہے ۔

اردو زبان کو ہر ممکن طریقے سے فروغ دیا جانا نہایت
ضروری ہے ۔ تاکہ یہ اپنی روایتی شان برقرار رکھتے ہوئے ، ملک و
ملت کی خدمت کرتی رہے ۔
میں اردو اکادمی کو اس نیک قدم کیلئے مبارکباد دیتا ہوں ۔
اور ماہنامہ کی ترقی اور اردو کے فروغ کیلئے دعاگو ہوں ۔

پریم سنگھ

بنسی لال چوہان
ایگزیکیوٹو کونسلر (صحت)

कार्यकारी पार्षद (स्वास्थ्य)
दिल्ली प्रशासन, दिल्ली
EXECUTIVE COUNCILLOR (HEALTH)
DELHI ADMINISTRATION DELHI

दिल्ली, दिनांक
Delhi, Dated 3/3/87

پیغام

مجھے یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی ہے کہ دلی اردو اکادمی "ایوانِ اردو دہلی" کے نام سے ایک ماہنامہ جلد ہی شائع کرنے جا رہی ہے۔ یہ مبارک اور قابلِ تعریف کام ہے۔

اردو ایک شیریں اور دلکش زبان ہے۔ اس میں بڑی رعنائی اور توانائی ہے۔ اس کے ادبِ لطیف نے صدیوں اس ملک کے لوگوں کی ذہنی آبیاری کی ہے۔ اردو کے اعلیٰ پایہ کے ادیبوں نے اس ملک کی بڑی خدمت کی ہے۔ اردو ادب اور اردو شاعری اس ملک میں بے حد مقبول رہی ہے۔ اردو زبان و ادب کا ہندوستانی زبانوں میں اعلیٰ مقام رہا ہے۔

اردو نے حصولِ آزادی اور آزادی کے بعد ملک کی تعمیر کے کام میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ مجھے اردو سے بے پناہ محبت ہے۔ میں اپنی تحریر اور تقریر میں زیادہ سے زیادہ اردو الفاظ کا استعمال کر کے مسرت محسوس کرتا ہوں۔ ملک اردو کی اعلیٰ خدمات کو بھلا نہیں سکتا۔

دلی اردو اکادمی نے گذشتہ چند برسوں میں قابلِ تعریف اور نمایاں کام کیا ہے اور دلی میں اردو کو فروغ دینے اور اسے مقبول بنانے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ مجھے اکادمی کے بیشتر جلسوں میں شرکت کا موقع ملا ہے۔ اس کے مشاعرے، سیمینار وغیرہ اچھے لگے۔ خاص طور پر "اردو کی کہانی روشنی اور آواز کی زبانی" مجھے بے حد پسند آیا۔

میں اکادمی کے ماہنامہ رسالہ کی کامیاب اشاعت کے لئے نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔

بنسی لال 3.3.87

بخدمت جناب شریف الحسن نقوی صاحب
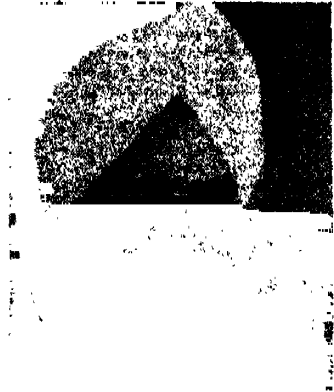
MAHINDER SINGH SAATHI
MAYOR OF DELHI

ٹاؤن ہال
مورخہ ۹. مارچ ۱۹۸۷ء

مقامِ مسرت ہے کہ اردو اکادمی دہلی کی جانب سے "ایوانِ اردو" کے زیرِ عنوان ایک رسالہ شائع کیا جا رہا ہے جسے اکادمی نہ صرف اردو کی تبلیغ و ارتقاء کے لئے جاری کرنا چاہتی ہے بلکہ اس کی وساطت سے جذباتی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کی بھی حوصلہ افزائی کا ارادہ رکھتی ہے۔

اصل میں اردو زبان کسی مخصوص فرقہ یا طبقہ کی زبان نہیں۔ اس کی پرورش و پرداخت اور تبلیغ و ترویج میں ہمارے آباء و اجداد نے بلا امتیاز شانہ بشانہ کام کیا ہے۔ جس کے سبب اردو ثقافتی بوقلمونی اور لسانی رنگا رنگی میں قومی شیرازہ بندی کی زبان بن گئی ہے۔ اس زبان نے ملک کی تحریکِ آزادی میں بھی ایک نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

اردو اکادمی کی جانب سے ایک ایسے ماحول میں جب تشدد اور فرقہ پرستی بڑھتے جا رہے ہیں، قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کو فروغ دینے کی یہ کوشش فی الواقعی قابلِ تعریف ہے۔

رسالے کی کامیابی کے لئے دعاؤں کے ساتھ۔

مہندر سنگھ ساتھی
(مہندر سنگھ ساتھی)

جناب سید شریف الحسن نقوی
سیکریٹری اردو اکیڈمی
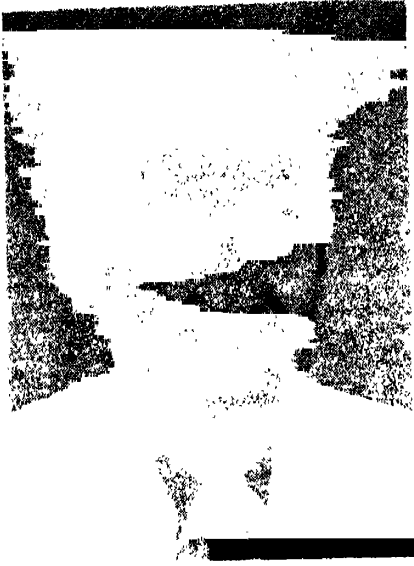
K.K. MATHUR

5-Sham Nath Marg,
Delhi-110054.

Dated the 2nd March, 1987.

MESSAGE

I am glad to learn that the Urdu Academy, Delhi, is bringing out a monthly journal - Aiwan-e-Urdu Delhi.

Urdu is a beautiful language and Delhi can justifiably take pride of being a key centre of its development.

I hope that the monthly journal - Aiwan-e-Urdu, Delhi, being brought out by Urdu Academy, would be a great success and would make significant contribution to the development and propagation of Urdu not only in Delhi, but in other parts of the country also.

(K.K. MATHUR)
Chief Secretary
Delhi Administration:Delhi.

Phones:
Secretariat: 823733
Offices:
Indian Institute of Islamic Studies, Panchkuin Road: 344830
Institute of History of Medicine and Medical Research, Tughlaqabad 682830
Ghalib Academy, Nizamuddin West: 611090
Residence: 376723
Telegrams: HAMDARD (Delhi)

حکیم عبدالحمید، دہلی، ۱۹ مارچ ۸۷ء

پیغام

مجھے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ اردو اکیڈمی دہلی نے ماہنامہ رسالہ "ایوان اردو" نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اکیڈمی جس طرح اردو اور اردو کے مقاصد کے لیے سرگرم کوشش کرتی رہی ہے، اسی طرح وہ اس رسالہ کے ذریعہ اردو زبان و ادب کی خدمت کے ساتھ ملک و قوم کی خدمت بھی شعر و ادب کے وسیلے سے کرے گی۔ دعا ہے کہ اکیڈمی اپنی اس نئی مہم میں کامیاب ہو۔

پیغام

یہ معلوم کر کے بے حد خوشی ہوئی کہ اردو اکادمی دہلی کی جانب سے ایک ماہانہ رسالہ "ایوان اردو" کے نام سے جاری کیا جا رہا ہے۔ بلا شبہ اردو کا دہلی پر حق ہے اور دہلی کا اردو پر۔ اردو اکادمی دہلی کے رسالے کی کمی ایک مدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ بارے اب یہ بطریقِ احسن پوری ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ رسالہ اعلا ترین ادبی، قومی اور ثقافتی معیار و اقدار کی پاسداری کرے گا اور اردو کی ادبی صحافت میں اس سے ایک نئی اور روشن روایت کا آغاز ہوگا۔

مخلص

گوپی چند نارنگ

20/3/87

(پروفیسر گوپی چند نارنگ)

Dr. ZAHEER AHMED SIDDIQUI
DEPARTMENT OF URDU
DELHI UNIVERSITY, DELHI-110007
Phone : Office ~~221401/Ext. 246~~ 2521521/246

Res. :
C-8 (29-31) PROBYN ROAD,
DELHI UNIVERSITY, 2511369
DELHI-7 • Phone : ~~223079~~

۷۸۹

12. 2. 1987.

محترمی شریف الحسن نقوی صاحب! تسلیم

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ ممنون ہوں۔ یہ خبر اردو والوں کے لیے باعثِ مسرت ہے کہ دہلی اردو اکیڈمی نے ایک ماہانہ رسالہ "ایوانِ اردو دہلی" نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ کسی رسالے کے نکالنے کے لیے کن ہفت خواں سے گزرنا پڑتا ہے مگر اس سے دشوار تر کام یہ ہے کہ اس رسالے کا معیار اور مزاج قائم رکھا جائے۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ یہ رسالہ صالح انسانی اور ادبی اقدار کا ترجمان ہو نیز دوسرے اداروں کے لیے ایک علامت بن جائے اور کسی "ازم" یا "ذاتی تاثرات و تعصبات" کا شکار نہ بنے۔

میری طرف سے مبارک باد قبول کیجیے۔ رسالے کی کامیابی کے لیے دعا کرتا ہوں۔

نیازمند

(پروفیسر) ظہیر احمد صدیقی

اردو کے مولد و مسکن دلی جیسے ادبی شہر میں، جہاں بدقسمتی سے ایک زمانہ سے اردو اور اردو تہذیب اور اس کی روایات کا چلن فصیلِ شہر کی چند گلیوں تک محدود ہو گیا تھا۔ اردو کی ترویج و ترقی کا کام، اردو اکادمی کے سپرد کیا گیا ہے۔ عوامی تعاون کے بغیر کسی بھی زبان کو ترویج و ترقی ممکن نہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ دلی اردو اکادمی کو اردو کے پرستاروں کا تمام تر تعاون حاصل ہے اور اکادمی اپنے مختلف النوع پروگراموں کی بدولت اردو و غیر اردو داں طبقے تک پہنچانے اور اردو کے لئے محبت کا گوشہ پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کر رہی ہے۔

ماہنامہ ایوانِ اردو دہلی کا اجرا کامیابی کی سمت ایک اور کامیاب قدم ہے۔ خدا کرے یہ ماہنامہ اردو کی ہمہ گیر علمی و ادبی روایت کا ترجمان بن سکے۔ تمام تر نیک خواہشات کے ساتھ اس خوشی کے موقع پر میری جانب سے مبارکباد قبول فرمائیے۔

خیر اندیش

صلاح الدین

شعبۂ اردو
ذاکر حسین کالج
اجمیری گیٹ
دہلی۔

(ڈاکٹر صلاح الدین)

Mashkoor-Ali-Siddiqi
Member
Urdu Academy, Delhi

1059, Gali Rajan,
Farash Khana,
Delhi - 110006
Phone No. Resi. : 2915045
Office : 521995

پیغام

بڑی خوشی کا مقام ہے کہ اردو اکادمی دہلی
"ایوانِ اردو دہلی" کے نام سے بہت جلد ایک ماہنامہ
منظرِ عام پر لا رہی ہے۔ یہ ماہنامہ یقیناً اردو زبان کے
فروغ میں اہم کردار ادا کرے گا۔ اور اسی زبان کے
ذریعہ جس نے ملک کی آزادی حاصل کرنے اور ہندو مسلم
اتحاد پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ادبی،
ثقافتی اور کلچرل قدروں کو عوام تک پہنچانے میں
یہ ماہنامہ مفید ثابت ہوگا۔ اور اردو زبان کی ہمہ گیر حیثیت کا
احساس پیدا کرنے میں مدد ملے گی۔
جس طرح اردو اکادمی دہلی نے نمایاں مقام
حاصل کیا ہے یہ جریدہ بھی اردو اکادمی دہلی کے شایانِ شان
ہوگا۔ میری تمام نیک خواہشات اردو اکادمی کے ساتھ ہیں۔

مشکور علی صدیقی
20/2/87

ادا ہو تو اسے اپنی قضا کہوں

حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ بسوے دل
ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں

ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہے! خدا نہ کردہ، تجھے بیوفا کہوں

اقبالِ کلفتِ دلِ بے مدعا رسا
اختر کو داغِ سایۂ بالِ ہما کہوں

مضمونِ وصل ہاتھ نہ آیا، مگر اسے
اب طائرِ پریدۂ رنگِ حنا کہوں

دزدیدنِ دلِ ستم آمادہ ہے محال
مژگاں کہوں کہ جوہرِ تیغِ قضا کہوں

طرزِ آفرینِ نکتہ سرائیٔ طبع ہے
آئینۂ خیال کو طوطی نما کہوں

غزلوں سے لیے گئے ہیں۔ پانچ غزلوں
ایک شعر، ایک غزل سے دو شعر اور ایک غزل سے تین شعر
ں میں سے، جن کا صرف ایک ایک شعر ہم تک عمدۂ منتخبہ کے
سے پہنچا تھا، دو غزلیں مکمل دستیاب ہوگئی ہیں۔ دونوں غزلیں
(قدیم بخطِ غالب) ۱۸۱۶ء نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) ۱۸۲۱ء
۱۸۲۶ء میں موجود ہیں۔ ہوسکتا ہے ان کے کچھ اشعار
گئے ہوں تاہم ان کی اساس ۱۸۱۲ء تک پڑ چکی تھی
تخلیق کا عہد یہی مانا جائے گا۔ ترمیم و تنسیخ کا عمل
اری رہ سکتا ہے۔ دونوں غزلوں کے باقی
غزل کے مقطعے میں غالب تخلص آیا

"۔۔۔ جولائی ۱۸۲۰ء کے بعد تذکرے کے حاشیوں میں کثرت سے اضافے کیے گئے اور یہ عمل ۳۲-۱۸۳۱ء تک جاری رہا۔ اس طرح غالب کے ترجمے اور اشعار دونوں میں خاصا اضافہ ہوا۔ اس کی وجہ صرف غالب کی شہرت نہیں تھی بلکہ سرور کی ان سے ذاتی شناسائی بھی تھی۔۔۔"

عمدۂ منتخبہ میں تذکرۂ غالب

کالی داس گپتا رضا

تذکرۂ شعرا موسوم بہ عمدۂ منتخبہ از معظم الدولہ میر محمد خاں سرورؔ، غالب کی ابتدائی شاعری کا عہد متعین کرنے کے لیے اہم ترین ماخذ ہے خصوصاً نسخہ مملوکہ قومی عجائب گھر، کراچی۔ اس کا زمانۂ تصنیف ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۰ء تا ۱۲۴۷ھ / ۳۲-۱۸۳۱ء ہے، جس میں متن کے علاوہ حاشیوں پر اضافے شامل ہیں۔ متن میں غالب کا ترجمہ اسد کے تحت ہے اور وہ یہ ہے:

اسد تخلص، میرزا نوشہ۔ اصلش از سمرقند، مولدش مستقر الخلافہ اکبر آباد۔ جوانِ قابل و یار باش۔ ہمیشہ بہ خوش معاشی بسر برُدہ۔ ذوقِ ریختہ گوئی در خاطر متمکن۔ اکثر اشعارش در زمینِ سنگلاخ بہ مضامینِ نازک موزوں گشتہ۔ روئے خیال جدی بیش از بیش پیش نہادِ خاطر دارد، از نتائجِ طبع اوست:

۱۔ شمشیرِ صاف یار جو زہراب دادہ ہو
وہ خطِ سبز ہو کہ بہ رخسارِ سادہ ہو

۲۔ دیکھتا ہوں اسے تھی جس کی تمنا مجھ کو
آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھ کو

۳۔ آئے ہیں پارہ ہائے جگر درمیانِ اشک
لایا ہے لعلِ بیش بہا، کاروانِ اشک

۴۔ آنسو کہوں کہ آہ، سوارِ ہوا کہوں
ایسا عناں گسیختہ آیا کہ کیا کہوں

۵۔ ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے
یہ رنگِ زرد ہے چمنِ زعفراں مجھے

۶۔ دیکھ وہ برقِ تبسم، بس کہ دل بیتاب ہے
دیدۂ گریاں مرا، فوارۂ سیماب ہے

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے جائزہ مخطوطاتِ اردو، جلد اوّل، ص ۴۵۰ تا ۱۰۵۸، از مشفق خواجہ، مطبوعہ فروری ۱۹۷۹ء مرکزی اردو بورڈ، لاہور۔

۷۔ کھول کر دروازۂ میخانہ بولا مے فروش
اب شکستِ توبہ مے خواروں کو فتح الباب ہے

۸۔ مجلسِ شعلہ عذاراں میں جو آ جاتا ہوں
شمع ساں میں تہِ دامانِ صبا جاتا ہوں

۹۔ ہووے ہے جادۂ رہ رشتۂ گوہر ہر گام
جس گزرگاہ سے میں آبلہ پا جاتا ہوں

۱۰۔ سرگراں مجھ سے سبک رو کے، نہ رہنے سے رہو
کہ بہ یک جنبشِ لب مثلِ صدا، جاتا ہوں

اس نسخے کی کتابت کی تکمیل ۲۶ رمضان ۱۲۳۵ھ مطابق
رجولائی ۱۸۲۰ء کو ہوئی، گویا اس سے پہلے غالب کا ترجمہ لکھا جا چکا تھا
اہر ہے کہ جب یہ ترجمہ تحریر ہوا تھا اس وقت تک سرور غالب سے ذاتی
در پر واقف نہ تھے۔ گویا غالب دلّی میں ابھی نئے ہوں گے۔ وہ ۱۸۱۲ء
ں آگرہ سے دلّی آکر مستقل طور پر سکونت پذیر ہوئے۔ سال دو سال
ھر اُدھر علمی ادبی حلقوں میں جان پہچان میں لگ گئے ہوں گے۔
اس طرح شاید ۱۸۱۴ء کے آخر میں اس نسخے کی زینت بنے ہوں گے
نچہ اوپر کے ان دس اشعار کو ۱۸۱۲ء تک کے فکر کردہ اشعار کہا
سکتا ہے جبکہ غالب کی عمر ۱۵ سال کی تھی۔

یہ دس اشعار سات غزلوں سے لیے گئے ہیں۔ پانچ غزلوں
ہ ایک ایک شعر، ایک غزل سے دو شعر اور ایک غزل سے تین شعر۔
ع غزلوں میں سے، جن کا صرف ایک ایک شعر ہم تک عمدۂ منتخبہ کے
یعے سے پہنچا تھا، دو غزلیں مکمل دستیاب ہو گئی ہیں۔ دونوں غزلیں
ۂ بھوپال (قدیم بخطِ غالب) ۱۸۱۶ء نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) ۱۸۲۱ء
نخۂ شیرانی، ۱۸۲۶ء میں موجود ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کے کچھ اشعار
ر میں فکر کیے گئے ہوں تاہم ان کی اساس ۱۸۱۲ء تک پڑ چکی تھی
ں لیے غزلوں کی تخلیق کا عہد یہی مانا جائے گا۔ ترمیم و تنسیخ کا عمل
ں کار کے یہاں عمر بھر جاری رہ سکتا ہے۔ دونوں غزلوں کے باقی
ندہ اشعار ملاحظہ کیجیے۔ ایک غزل کے مقطعے میں غالب تخلص آیا

ہے۔ تب تخلص اسد ہی تھا۔ غالب تخلص کا استعمال ۱۸۱۶ء میں شروع
ہوا :

ظاہر کرے ہے جنبشِ مژگاں سے مدعا
طفلانہ ہاتھ کا ہے اشارہ، زبانِ اشک

میں وادیِ طلب میں ہوا جملہ تن عرق
ازبسکہ صرفِ قطرہ زنی تھا، بسانِ اشک

رونے نے طاقت اتنی نہ چھوڑی کہ ایکبار
مژگاں کو دوں فشار، پئے امتحانِ اشک

دل خستگاں کو ہے طربِ صد چمن بہار
باغِ بخوں تپیدن و آبِ روانِ اشک

سیل بنائے ہستیِ شبنم ہے آفتاب
چھوڑے نہ چشم میں تپشِ دل، نشانِ اشک

ہنگامِ انتظارِ قدومِ بتاں اسد
ہے بر سرِ مژہ نگراں، دیدبانِ اشک

عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آسکا
گر ایک ادا ہو تو اسے اپنی قضا کہوں

حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ بسوئے دل
ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں

ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہے! خدا نہ کردہ، تجھے بیوفا کہوں

اقبالِ کلفتِ دلِ بے مدعا رسا
اختر کو داغِ سایۂ بالِ ہما کہوں

مضمونِ وصل ہاتھ نہ آیا، مگر اسے
اب طائرِ پریدۂ رنگِ حنا کہوں

دزدیدنِ دلِ ستم آمادہ ہے محال
مژگاں کہوں کہ جوہرِ تیغِ قضا کہوں

طرز آفرینِ نکتہ سرائیِ طبع ہے
آئینۂ خیال کو طوطی نما کہوں

غالب ہے رتبۂ فہمِ تصور سے کچھ پرے
ہے عجز بندگی کہ علی کو خدا کہوں

جیسا کہ کہا جا چکا ہے، ، جولائی ۱۸۲۰ء کے بعد تذکرے کے حاشیوں میں کثرت سے اضافے کیے گئے اور یہ عمل ۳۲-۱۸۳۱ء تک جاری رہا۔ اس طرح غالب کے ترجمے اور اشعار دونوں میں خاصا اضافہ ہوا۔ اس کی وجہ صرف غالب کی شہرت نہیں تھی بلکہ سرور کی ان سے ذاتی شناسائی بھی تھی۔ ترجمے میں یہ اضافہ ہوا۔

تخلص کے بعد: "اسداللہ خاں عرف"
"یارباش" کے بعد: "و دردمند"
"متمکن" کے بعد: "خوکردۂ غم ہائے عشقِ مجاز،
تربیت یافتۂ غمکدۂ نیاز
درفنِ سخن سنجی متبع محاوراتِ میرزا عبدالقادر
بیدل علیہ الرحمہ و ریختہ در محاوراتِ فارسی
موزوں می کند بالجملہ موجدِ طرزِ خود است
و باراقم رابطۂ یک جہتی مستحکم دارد۔"

اشعار میں ۳۴ شعر اور ایک رباعی کا اضافہ ہوا۔ وہ یہ ہیں:

۱۔ اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے
رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے

۲۔ پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لیے اسد
ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

۳۔ جگر سے ٹوٹی ہوئی ہو گئی سناں پیدا
دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

۴۔ خوباں کے چاہنے کے میں قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

۵۔ نیازِ عشق خرمن سوزِ اسبابِ ہوس بہتر
جو ہو جاوے نثارِ برق مشتِ خار و خس بہتر

۶۔ یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ غلط
کی تصور نے بہ صحرائے ہوس راہ غلط

۷۔ گلشن میں بندوبست بہ ضبطِ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

۸۔ اس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے اسد
خونِ زاہد کو مباح اور مالِ صوفی کو حلال

۹۔ کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بہ سوزِ دل
دردِ جدائیِ اسداللہ خاں نہ پوچھ

۱۰۔ اسد کو بوریے میں دھر کے پھونکا موجِ ہستی نے
فقیری میں بھی باقی ہے شرارت نوجوانی کی

۱۱۔ شکلِ طاؤس گرفتار بنایا ہے مجھے
ہوں میں وہ دام کہ سبزے میں چھپایا ہے مجھے

۱۲۔ ماہِ نو ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے
عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سلاتا ہے مجھے

۱۳۔ پھر کچھ اس دل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخمِ کاری ہے

غزل کے ۱۲ مزید شعر:

۲۶۔ بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

۲۷- کب سُنتے ہے وہ کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

۲۸- خلشِ غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ
دیکھ خونابہ فشانی میری

۲۹- کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے لوگ
مگر آشفتہ بیانی میری

۳۰- عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

۳۱- تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جُدا ہو جانا

۳۲- اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

۳۳- دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جُدا ہو جانا

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
ہوتے ہیں ملول اس کو سُن کر جاہل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل

اِن ۳۳، اشعار اور ایک رباعی میں ۲، اشعار ایسے ہیں جو سوائے "عمدۂ منتخبہ" کے کسی اور مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخے میں نہیں پائے جاتے۔ وہ ہیں شعر نمبر (۱) ایک گرم آہ کی . . . (۲) پروانے کا نہ غم . . . (۵) نیازِ عشق خرمن سوز . . . (۶) یاد آیا جو وہ کہنا . . . اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ وہ غزلیں ہیں جو نسخۂ بھوپال بخطِ غالب (۱۸۱۶ء) مرتب کرتے ہوئے غالب نے خارج کر دیں۔ لہٰذا ان کا زمانۂ فکر بھی ۱۸۱۲ء ہی کے آس پاس ہوگا۔

شعر ۳-۴-۷-۸-۹-۱۰-۱۱-۱۲، نسخۂ بھوپال بخطِ غالب (۱۸۱۶ء) کے متن میں موجود ہیں اس لیے ان کا زمانۂ فکر زیادہ سے زیادہ ۱۸۱۶ء قرار پایا۔ ع عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا،

اس غزل کے چار شعر نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) (۱۸۲۱ء) کے حاشیے پر اور نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) کے متن میں موجود ہیں۔ اس لیے پیش از پیش ۱۸۲۶ء کی کہی ہوئی ہے۔ ع پھر کچھ اس دل کو بے قراری ہے
اس غزل کے تمام شعر (۱۴) نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) کے متن میں درج ہیں۔ زمانۂ فکر بھی اسی سال کو سمجھ لیجیے۔ ع
کب سُنتے ہے وہ کہانی میری، یہ مصرع جو بعد میں ع
کب وہ سنتا ہے کہانی میری، میں تبدیل ہو گیا، ایک ایسی غزل سے ہے جو نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) کی تکمیل کے بعد بھی پورا کرتی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے کل شعر ۹ ہیں جن میں سے ۳ عمدۂ منتخبہ میں لیے گئے۔ یہ غزل متن میں نہیں حاشیے پر ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ یہ بھی ۱۸۲۶ء میں کہی گئی ہو گی کیونکہ میری دانست میں عمدۂ منتخبہ میں غالب کے ترجمے کے حواشی (در اشعار کے اضافے نومبر ۱۸۲۶ء تک مکمل ہو چکے تھے۔ گو اس بات کا امکان ہے کہ تذکرے کے اوراق مزید شاعروں کے تراجم کے اندراج کے لیے چندے اور بھی کھلے رکھے گئے ہوں
۱۸۲۶ء میں غالب کو دلی آئے اور مستقل سکونت اختیار کیے ہوئے چودہ برس ہو گئے تھے۔ اس مدت میں سرور مولف تذکرہ سے (جیسا کہ ترجمے میں بعد کے اضافے سے ثابت ہے) " رابطۂ یک جہتی" بھی مستحکم ہو چکا تھا۔ ایسی حالت میں یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ دسمبر ۱۸۲۶ء میں جب غالب کلکتہ کے دُور دراز سفر پر روانہ ہوئے تو وہ اپنے ترجمے میں کوئی کسر چھوڑ گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ اب (۱۸۲۶ء) کے بعد دوسرے شاعر اپنا کلام انھیں دیتے تھے تاکہ وہ اپنے دوست نواب سرور سے سفارش کر کے ان کا کلام داخلِ تذکرہ کرا دیں۔ اور یہ بات غالب کے خط بنام شیفتہ (مطبوعہ پنج آہنگ) سے ظاہر ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ قیامِ کلکتہ کے دوران مرزا احمد بیگ خاں تپاں نے انھیں اپنا کلام دیا تھا تاکہ جب وہ دلی لوٹیں اور اعظم الدولہ (نواب سرور مؤلف تذکرہ) ان سے ملنے آئیں تو انھیں وہ تپاں کا کلام تذکرے میں درج کرنے کے لیے دیں۔ ایسی حالت میں، اور غالب کے مزاج کو جانتے ہوئے یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت (۱۸۲۶ء) تک تذکرۂ سرور یعنی عمدۂ منتخبہ میں ان کا ترجمہ کسی طرح بھی ادھورا رہا ہو۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ آخری تین غزلیں (زمانۂ فکر تقریباً ۱۸۲۶ء) :

پھر کچھ اس دل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخمِ کاری ہے

کب سُنے ہے وہ کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

غالب کی بہترین غزلوں میں سے ہیں اور یقیناً خود غالب کی فراہم کردہ ہیں۔

عمدۂ منتخبہ کے تعلق سے یہاں تذکرۂ عیار الشعراء کا کچھ حال بیان کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ تذکرہ عمدۂ منتخبہ سے دو سال پہلے شروع ہوا اور ایک سال بعد تک اس میں مسلسل اضافے ہوتے رہے۔ اس کا زمانۂ تصنیف ۱۲۱۳ھ / ۹۹-۱۷۹۸ء تا ۱۲۴۸ھ / ۳۳-۱۸۳۲ء تسلیم کیا جاتا ہے مگر اس کا ذکر عمدۂ منتخبہ کے بعد اس لیے کیا جا رہا ہے کہ اس میں غالب کا ترجمہ اسد کے تحت نہیں بلکہ غالب کے تحت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ترجمۂ غالب، ۱۸۱۶ء یا اس کے بعد داخل کیا گیا۔ کیونکہ غالب تخلص ۱۸۱۶ء سے استعمال میں آیا۔ ترجمے کے شروع کے الفاظ یہ ہیں:

"۔ ۔ ۔ مرزا اسداللہ عرف مرزا نوشہ المتخلص
بہ غالب ۔ ۔ ۔"

کل شعر دس ہیں جن میں دو شعر ایسے ہیں جو اور کہیں نہیں پائے جاتے حتیٰ کہ نسخۂ بھوپال بخطِ غالب (۱۸۱۶ء) میں بھی نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ شعر غالب کی کسی ابتدائی بیاض کے ہیں جو نسخۂ بھوپال بخطِ غالب میں جگہ نہ پا سکے اور خارج کر دیے گئے۔ لہٰذا انھیں بھی ۱۸۱۲ء ہی کا فکر کردہ کہنا چاہیے۔ وہ شعر یہ ہیں:

زخمِ دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے
ایسے ہنستے کو رلایا ہے کہ جی جانے ہے

صبا، لگا وہ طپانچے طرف سے بلبل کی
کہ رُوئے غنچۂ گل، سوئے آشیاں پھر جائے

ایک ثقہ راوی کے مطابق کسی تذکرے میں لکھا ہے کہ خوب چند ذکا مؤلف تذکرۂ عیار الشعرا، نواب سرور مؤلف تذکرہ عمدۂ منتخبہ کے وہاں منشی گیری پر ملازم تھا۔ اور کہ جو کچھ وہ عمدۂ منتخبہ میں درج کرتا تھا وہی گھر جا کر اپنے تذکرے عیار الشعراء میں شامل کر لیا کرتا تھا لیکن باوجود تلاش کے میری نظر سے یہ تذکرہ نہیں گزرا۔ بہرحال ایسا لکھا بھی ہو تو یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی اس لیے کہ

(الف) تذکرہ عیار الشعرا کی نبیاد عمدۂ منتخبہ سے دو سال پہلے پڑ چکی تھی۔

(ب) دونوں کے یہاں ترجمۂ اسد (غالب) میں بہت فرق ہے اور دونوں ترجموں میں تعدادِ اشعار اور اشعار بھی ایک سے نہیں۔

(ج) صاحبِ تذکرۂ عمدۂ منتخبہ نے اپنے یہاں ذکا کا ترجمہ دیا ہے اور لکھا ہے ۔ ۔ ۔

"جوانے سلیم الطبع، مزاجش بہ صلاحیت راغب، کلامش نمکین ۔ ۔ ۔ مشارالیہم تذکرۃ الشعرا تالیف کردہ۔ در علم اخلاص و دوستیِ راسخ دریافت گردیدہ (۷۵ شعر)"

یعنی خود صاحبِ تذکرہ (نواب سرور) ذکا کے تذکرے کا ذکر کرتے ہیں اور ذکا کو بہ تحقیق مخلص اور دوست جانتے ہیں اور کہیں اشارہ تک نہیں کرتے کہ ذکا ان کے پاس ملازم تھا۔

"اِنسان کا خلقی مَنصب یہ ہے کہ وہ اپنی تمام محرومیوں اور مایوسیوں کے درمیان اپنے سینے کو آرزو سے آباد رکھے اور اُمید کی شمع کو کسی حال میں گُل نہ ہونے دے۔ یہ بھی اس کے مقدر ہی کا ایک جزو ہے اور وہ طبیعی اور طبعی طور پر اس کے لیے مجبور ہے۔ اگر اِنسان اِس طرح اپنے آپ کو سنبھالے نہ رہے تو اس کے سامنے خودکشی کے سوا کوئی راستہ نہ رہ جائے۔ اِسی لیے غالب ہم کو یہ تعلیم دیتے ہیں:

نفس نہ انجمنِ آرزو کے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں، انتظارِ ساغر کھینچ

—— مجنوں گورکھپوری
(غالب شخص اور شاعر)

غزلیں

جگن ناتھ آزاد

کیا گِلہ غیروں کا، خود ہی سانحہ لے کر چلے
پتھروں کے شہر میں ہم آئنہ لے کر چلے

زندگی بھر کی وفاؤں کا صلہ لے کر چلے
دردِ پنہاں اک سزا تھی یا جزا لے کر چلے

کیا بتائیں ہم تری محفل سے کیا لے کر چلے
چند یادوں کی متاعِ بے بہا لے کر چلے

ہم میں اور اُن میں ازل کے روز جو حائل رہا
ہم وہی روزِ ابد تک فاصلہ لے کر چلے

باوجودِ کس مپرسی دل کہیں تنہا نہ تھا
ہر جگہ یادوں کا ہم اک قافلہ لے کر چلے

جھولیاں پھیلا کے جو آئے ہیں دیکھ ان کی طرف
ہم تو پہلے ہی سے دستِ نارسا لے کر چلے

ان دنوں کچھ جادہ و منزل کا عالم اور ہے
جس کو چلنا ہو فقیروں کی دُعا لے کر چلے

جس جگہ دُنیا تھی اور دُنیا کا دامانِ طلب
ہم وہاں بس اک دلِ بے مدعا لے کر چلے

بشیر بدر

ہر جنم میں اُسی کی چاہت تھے
ہم کسی اور کی امانت تھے

جیسے جنگل میں آگ لگ جائے
ہم کبھی اتنے خوبصورت تھے

دن میں اِن جگنوؤں سے کیا لینا
یہ دیے رات کی ضرورت تھے

اُس کی آنکھوں میں جھلملاتی ہوئی
ہم غزل کی کوئی علامت تھے

تیری چادر میں تن سمیٹ لیا
ہم کہاں کے دراز قامت تھے

پاس رہ کر بھی دُور دُور رہے
ہم نئے دَور کی محبّت تھے

اُن بزرگوں کی یاد آتی ہے
جو خدُا کی عظیم رحمت تھے

اس خوشی میں مجھے خیال آیا
غم کے دن کتنے خوبصورت تھے

"۔ ۔ ۔ گھر کی چوکھٹ سے باہر قدم دھرتے ہوئے وہ دل ہی دل میں یہ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی کہ اُچھے بابو اُس کے بنائے ہوئے پراٹھے کتنی رغبت سے کھا رہا ہے۔ کچھ خیال آنے پر وہ پھر گھر کے اندر پلٹ آئی۔ ۔ ۔"

دُکھ ہرن

جوگندر پال

کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ موہ مائی کہاں سے آتی ہے اور ہمارے گھروں میں سارے دن کے کام کے بعد کہاں چلی جاتی ہے۔ صبح کے وقت وہ سورج کی طرح لوٹنیاں کھاتے ہوئے گلی میں داخل ہو رہی ہوتی تو بچے پہلے ہی باہر کی نرم نرم دھوپ کے جل تھل میں ایک دوسرے پر چھینٹے اُڑانے میں مگن ہوتے۔ موہ مائی سب کچھ بھول کر وہیں رُک جاتی اور اُنھیں دیکھتے ہوئے گویا اُن کے ساتھ کھیل رہی ہوتی۔

"ار ــــ ر ا ــــ گیند میرے منہ پر دے ماری!"

"پر تم راستے میں کھڑی ہی کیوں ہو مائی؟"

بے بے کا پوتا کتنا مُنہ پھٹ ہو گیا ہے! ــــ موہ مائی ہنسنے لگی ــــ مگر بات تو ٹھیک ہی کہتا ہے۔ راستے تو کھیلنے کے لیے ہی ہوتے ہیں ــــ پھر وہ اپنے آپ سے پوچھنے لگی، پر تو اِدھر کھڑی کیا کر رہی ہے مائی؟ چل، بے بے اپنا پنڈا کھول کر بیٹھی ہوگی۔ اُس کی مالش کا وقت بیتا جا رہا ہے۔

موہ مائی نے اپنے آپ کو جو اُچھالا دیا تو بچوں کے شور اور تالیوں میں سے ہوتی ہوئی سیدھی بے بے کے آنگن میں آ گری جہاں بے بے اُس کے انتظار میں سوکھی جا رہی تھی۔

"آ گئی ہو، موہ مائی؟"

"تمھیں دِکھ رہی ہوں بے بے، تو کیسے نہیں آئی ہوں گی؟"

موہ مائی اُس کے سر پر آ کھڑی ہوئی۔

"اری، یہی تو مصیبت ہے۔" بے بے اُسے بتانے لگی۔ "مجھے اب ٹھیک طرح دِکھتا بھی نہیں۔ بیٹے سے کئی بار کہہ چکی ہوں، مجھے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ پر وہ سُنے بھی۔"

موہ مائی نے بے بے کی کھاٹ کی پائینتی بیٹھ کر اُس کی پنڈلیوں کو اپنی ٹھنڈی ہتھیلیوں میں لے لیا۔

"تمھارے ہاتھ تو مُوئی موت سے بھی ٹھنڈے ہیں۔"

"لاؤ، وہ تیل پکڑاؤ۔" مائی نے اُس سے کہا۔ "اگر تم لوگوں کی سیوا نہ کروں بے بے، تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہی سدھار جاؤں۔"

وہ ہتھیلیوں کو تیل سے لتھیڑ کر بے بے کے بدن پر جھک گئی۔

"ایسا مت کہو مائی۔" بے بے نے بدن سے چادر ہٹا کر قمیض اُتار دی اور اپنے آپ کو اُس کے سامنے بچھا دیا۔ "اگر تم سدھار گئیں تو مجھے مالش کون کرے گا؟ میری بہو تو مجھے دُور

سے دیکھ کر ہی ناک بھوں سکوڑ لیتی ہے۔"

موہ مائی نے بے بے کی سوکھی چھاتیوں کے نیچے اپنے ہاتھ جمالیے۔

"تم میرے کلیجے پر ہاتھ رکھتی ہو مائی، تو مجھے ٹھنڈ پڑ جاتی ہے، اتنی، کہ بہو کی جلی کٹی باتیں بھی بھول جاتی ہوں ——— ذرا زور سے!"

"جور سے ہاتھ لگا یا تو کوئی رگ اوپر نیچے ہو جائے گی۔" موہ مائی نے اُسے جواب دیتے ہوئے کہا —— "بہو کہاں گئی ہوئی ہے؟"

"مَیں کیا جانوں؟ مجھ سے پوچھ کر تھوڑا ہی جاتی ہے —— اب نیچے ہاتھ لے آؤ۔ خالی پیٹ میں اتنی گیس بھر گئی ہے کہ جان کو نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہیں سوجھتا۔"

"پر بے بے، تم پیٹ کھالی ہی کیوں رکھتی ہو؟"

"خالی کیسے نہ رکھوں؟" بوڑھیا مالش رکوا کر اُسے بتانے لگی ——— "لو سنو، آج ہی کیا ہوا؟ بھوک سے میرا دم نکل رہا تھا۔ آس پاس کوئی تھا نہیں، اس لیے مَیں آپ ہی رسوئی خانے میں جا پہنچی اور کچھ کھانے کو ڈھونڈنے لگی۔ اتنی دیر میں بہو بھی وہاں آگئی اور مجھ پر جھپٹ کر بولی، کئی بار کہہ چکی ہوں، جو کچھ کھانا ہو مانگ کر کھایا کرو۔" وہ دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ "تم ہی بتاؤ مائی، اپنے ہی گھر میں مانگ کے کھانا پڑے تو مَیں خالی پیٹ کیوں نہ رہوں؟"

موہ مائی گھر سے بھوکی ہی نکل پڑی تھی، مگر اس وقت بے بے پر ترس کھاتے ہوئے وہ سیر ہو گئی۔ اُسے اچانک یاد آیا کہ کل شام کو دیا ونتی نے اُسے پشاوری گڑ کی ایک ڈلی کھانے کو دی تھی جو ابھی تک اُس کے دوپٹے کے کونے میں بندھی پڑی ہے۔ اُس نے فوراً گانٹھ کھول کر گڑ کی ڈلی نکالی اور اسے بے بے کی طرف بڑھا دیا۔ "لیو بے بے، نا کھالس پشاوری گڑ ہے۔ کھا لیو۔"

بوڑھیا ڈلی لے کر اسے اپنے مسوڑھوں سے توڑنے لگی اور اپنی کوشش میں ناکام ہو کر اسے چوسنا شروع کر دیا ——— "بڑی میٹھی ہے مائی۔"

"اِسی لیے تمھیں دی ہے بے بے۔" موہ مائی نے بے بے کا ایک کندھا مالش کے لیے ہاتھوں میں لے لیا ——— "کسی بات کی چنتا مت کیا کرو۔"

بے بے کے گھر سے تیز تیز نکلتے ہوئے موہ مائی سوچ رہی تھی، اچھے بابو بے چارہ تیار و یار ہو کے اُسی کے انتظار میں بیٹھا ہوگا کہ کب وہ آکر ناشتہ بنائے اور کب وہ دفتر جائے۔ دروازے سے باہر آتے ہی وہ ایک لنگڑے بھکاری سے ٹکرا گئی اور اُسے بڑی مشکل سے گرنے سے بچا کر بولی۔ "مائھ کرنا، بابا۔" اُسے یاد آیا کہ گڑ کی ڈلی کے ساتھ اُس نے اپنی گانٹھ میں دس پیسے کا سکہ بھی دیکھا تھا۔ لنگڑے بھکاری نے اُسے دوپٹے کی گانٹھ کھولتے پا کر اپنا پیالہ اُس کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ لو۔" موہ مائی نے گانٹھ کھول کر سکہ اُس کے پیالے میں ڈال دیا۔

"تمھارے بچے جیتے رہیں، مائی۔"

موہ مائی اپنے اندر ہی اندر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

اُس کے ساتھ کسی نے کبھی اُس کا بچہ نہ دیکھا تھا۔ اُس کا اپنا کوئی بچہ ہوگا ہی نہیں، تاہم وہ سبھی شیر خواروں کو اتنی اپنائیت سے دیکھتی تھی کہ وہ اپنی ماؤں کے بازوؤں سے بے اختیار اُس کی چھاتیوں کی جانب اچھل آتے۔ لالہ کی حویلی میں لالہ کی چھ بہوؤں کے کتنے ہی چھوٹے چھوٹے بچوں کو فرش پر لڑھکتے پا کر وہ انھیں بڑی ممتا سے ایک ٹک دیکھتی چلی جاتی اور اتنی توجہ سے دیکھنے کے باوجود اُسے یہی لگتا کہ ایک ہی دودھ پیتا کنہیا وہاں ایک ہی وقت جا بجا ہنس کھیل رہا ہے۔ کیا مجال، ایک کی شکل دوسرے کی شکل سے الگ معلوم ہو۔

موہ مائی کی مُسکان گاڑھی ہو ہو کر دودھ کی بالائی کے مانند اُس کے منہ ماتھے پر کھنچ آئی ——— ساری بھاگ دوڑ تو آدمی کی مَیں نے مچا رکھی ہے۔ کسی بچے میں اُس کی مَیں ابھی پیدا ہی نہیں ہوئی ہوتی۔ اس لیے سبھی بچے ایک ہی دِکھتے ہیں، وہی ایک کنہیا ———

"اری او مائی!"

نام ہجار مورے کسن کنہیا کے ——— موہ مائی کبھی ہی جی میں کرشن کی آرتی اُتار رہی تھی۔

" مائی ! "

انجانے میں وہ اچھے بابو کے گھر سے آگے بہہ آئی تھی کہ اُسے پیچھے سے اچھے بابو کی آواز سنائی دی۔ " ہمیں چھوڑ کے کہاں جا رہی ہو، مائی ؟ "

وہ بھاگ کر پلٹ آئی۔

" تمھیں چھوڑ کے مَیں کدھر جاؤں گی اچھے بابو ؟ " موہ مائی نے کہنے کو تو کہہ دیا مگر شرما گئی۔

اچھے بابو گھر میں اکیلا اپنے ہی ساتھ رہا کرتا تھا۔

" مگر بے چارہ اپنے ساتھ بھی کہاں رہتا ہے ؟ " موہ مائی سوچا کرتی۔ " اپنے ساتھ رہنا تو اُس وکھت نسیب ہوتا ہے جب اوروں کے ساتھ رہنا نسیب ہو۔ "

" اچھے بابو۔ " ایک دن موہ مائی نے اُس کے سامنے ناشتہ رکھتے ہوئے پوچھ ہی لیا تھا —— " تم نے اپنی سادی کیوں نہیں بنائی ؟ "

اچھے بابو اُس دن بہت اداس تھا اور آدمی جتنا زیادہ اداس ہو اتنی ہی سیدھی اور سرل بات کرتا ہے۔ " کیونکہ جس سے مَیں شادی کرنا چاہتا تھا اُس نے کسی اور سے شادی کر لی۔ "

لیکن موہ مائی تو سدا ہی سیدھی اور سرل ہوتی تھی ——

" ستیاناس ! ارے اچھے بابو، سکلوں میں کیا رکھا ہے ؟ اور بھی ہجاروں لاکھوں ہوں گی، کسی کو بھی گلے لگا لیتے۔ "

مائی ادھیڑ عمر اچھے بابو کے آگے آگے اِس طرح تیزی سے اس کے گھر میں داخل ہوئی جیسے اُس کے بچوں کی ماں ہو۔ اُس کی عمر بہت زیادہ نہ تھی۔ اگر وہ نہا دھو کر کنگھی پٹی کر کے اچھے بابو کے بستر پر براجمان ہو جاتی تو یہی لگتا کہ وہ بنی ہی اُس کی بیوی بننے کے لیے ہے مگر کام کرنے والی مائی تو صرف مائی ہوتی ہے۔ چار اور چار آٹھ گننے والا اچھے بابو کتنا بھی اچھا تھا، پھر بھی وہ اُسے کوئی اور کیسے نظر آتی ؟ اُس کے لیے تو وہ وہی کچھ تھی جو تھی —— مائی کی مائی !

" تمھیں دیر ہو جاتی ہے مائی، تو مَیں بہت پریشان ہونے لگتا ہوں۔ "

" مجھے کھاٹ اپنے گھر میں ہی ڈال لینے دو اچھے بابو۔ "

اُس نے معصوم سی ہنسی ہنس کر جواب دیا۔ " پھر دیر سویر کا سوال ہی نہ رہے گا۔ "

اچھے بابو اور زیادہ پریشان ہو کر اپنی دھوتی کی لانگ ٹھیک کرنے لگا۔

" تم کپڑے وپڑے پہن کے تیار ہو جاؤ۔ میں تمھارا ناستہ پھورن تیار کیے دیتی ہوں۔ "

اچھے بابو کے ٹھنڈے چولھے میں جھٹ ہی جان پڑ گئی۔ موہ مائی چولھے پر دودھ رکھ کے جلدی جلدی برتن دھونے لگی، اس کے بعد جتنی دیر میں اُس نے پراٹھوں کا آٹا گوندھا، اتنی دیر میں دودھ اُبلنے میں آ گیا، اور پھر اچھے بابو ابھی تیار ہو کر کھانے کی میز پر پہنچ بھی نہ پائے تھے کہ وہ باہری دروازے کی طرف لپکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ " ناستہ تیار ہے اچھے بابو۔ میں جا رہی ہوں۔ "

اچھے بابو کے گھر کی چوکھٹ سے باہر قدم دھرتے ہوئے وہ دل ہی دل میں یہ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی کہ اچھے بابو اُس کے بنائے ہوئے پراٹھے کتنی رغبت سے کھا رہا ہے۔ کچھ خیال آنے پر وہ پھر گھر کے اندر پلٹ آئی " اچھے بابو ! "

اچھے بابو اب تک کھانے کی میز پر بیٹھ چکا تھا۔

" دپھتر سے لوٹتے ہوئے آج پھول گوبھی لیتے آنا اچھے بابو۔ "

اچھے بابو کا پہلا لقمہ ابھی حلق سے نیچے نہ اُترا تھا کہ اُس کی انگلیاں دوسرا لقمہ منہ میں ٹھونس رہی تھیں۔ مائی شاید یہی دیکھنے کے لیے اندر آئی تھی۔ " اور رات کو دودھ کو جرا سا کھٹا بھی لگا دینا —— کل تمھیں دہی کے ساتھ گوبھی کے پراٹھے کھلاؤں گی۔ "

اور پھر اچھے بابو کا کوئی جواب سُنے بغیر وہ سرعت سے باہر آ گئی —— سرکار کا پکا نوکر ہے پر کیا پھائدہ ؟ گھر میں کوئی روٹی کھلانے والی بھی نہیں۔ کھا نکھا جندگی کو سجا کی تراں بھگت رہا ہے —— جیسے اچھے بابو کا چولھا جلنے میں نہ آ رہا ہو اور دھوئیں سے اُس کی آنکھوں میں پانی سا چھلک آیا ہو۔ وہ ذرا رُک کر اپنے میلے کچیلے آنچل سے آنکھیں پونچھنے لگی —— مَیں

اگر مورکھ کی ماں بہن ہوتی تو اُس کی سادی بنائے بگیر چین نہ لیتی ——— ارے ! ——— اُس نے ایکدم اپنے آپ کو دھکا دیا ——— لالہ کی بہوویں تمارے انتجار میں ایک دوسرے کے بال نوچ رہی ہوں گی۔

لالہ کی حویلی کی ڈیوڑھی میں شیرے نے روز کی طرح بھونک کر موہ مائی کا سواگت کیا۔ لالہ کے اس کتے کی بھونک میں پہلے تو واقعی کسی شیر کے غرّانے کا احساس ہوتا تھا مگر ادھر دو ایک سال سے گمان ہونے لگا تھا کہ بوڑھا کتا غصّے میں غرّانے کے بجائے رونا شروع کر دیتا ہے۔

"کیوں اپنے آپ کو تھکا رہے ہو بھائی ؟" موہ مائی نے شیرے کو مخاطب کیا ہے۔" دیر سے کیوں آئی ہوں ؟ ——— باپ مورے، آ تو گئی ہوں۔ آنکھ کھلتے ہی گھر سے نکل پڑتی ہوں تمھیں کیا مالوم، کتنی دیر جوتے گھسیٹ گھسیٹ کر پہنچتی ہوں ——— اوہ !" موہ مائی نے اپنے ننگے پیروں کی طرف دیکھا ——" اپنے جوتے تو میں اچھے بابو کے گھر ہی چھوڑ آئی ہوں !" اِس طرف اُس کا دھیان ہی نہ گیا تھا کہ وہ ساری گلی ننگے پاؤں چل کر آئی ہے ——— یا ——— یا شاید ——— وہ اپنے اس شبہے پر ہنسنے لگی ——— شاید میں بھی ابھی تک وہیں بیٹھی اپنی آنکھوں کے سامنے اچھے بابو کو ناستہ کروا رہی ہوں ——— اور پرا ٹھا لیو اچھے بابو ——— نیں ؟ ——— نیں ——— میری مانو اچھے بابو، جھٹ پٹ سادی بنا لو۔ گھر والی نہ ہو تو آدمی کھانا کھانا بھی بھول جاتا ہے ——— موہ مائی نے پہلے تو واپس جانے کے لیے مُنہ موڑا کہ اپنے جوتے لے آئے مگر پھر سر جھٹک کر حویلی کی ڈیوڑھی سے آنگن میں آنکلی ——— جوتے اپنے آپ چل کر تھوڑا ہی اِدھر اُدھر ہو لیں گے ۔ وہ کھوئیں گے تو اُسی وقت کھوئیں گے جب میں ہی انھیں پیروں میں ڈال کر کہیں کھو جاؤں گی ——— گوبھی کا پھول لانا مت بھولنا اچھے بابو ———

موہ مائی لالہ کے کمرے کی جھاڑ پھونک کے لیے مُڑنے لگی تو لالہ کے سب سے بڑے بیٹے سے اُس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔

"ہائیں ! کون ہو تم ؟" موہ مائی کو معلوم تھا کہ لالہ کا سب سے بڑا بیٹا ' دماگ کا جرا نرم ' ہے۔ "کیا باپ کا گھر سمجھ کے اندر چلی آئی ہو ؟"

" میں ——— میں ———"

" میں میں کیا ؟ شیرا ! شیرا ! ———"

بوڑھا شیرا ڈیوڑھی سے ایکدم بھونک بھونک کر روتا ہوا اُن کے پاس آ کھڑا ہوا۔

" تم اب کسی کام کے نہیں رہے شیرے۔ اسی لیے میں نے موٹی ماں سے کہا تھا اب تمھیں چھٹی دے دی جائے۔" لالہ کی بیوی کو سبھی موٹی ماں کہہ کر بلاتے تھے۔

" بھاؤں ! بھاؤں !" ——— شیرے نے احتجاج کیا۔

" بھاؤں بھاؤں کیا ؟ سیدھی طرح بات کرو۔ دیکھو اِسے !" اُس نے موہ مائی کی طرف اشارہ کیا اور اُس سے پھر پوچھنے لگا۔" بولو، کون ہو تم ؟"

" میں مائی ہوں بڑے بابا ——— موہ مائی !"

" ہائیں ! ——— ہاں، تم تو اپنی مائی ہو۔ منہ پر دوپٹہ کیوں لپیٹے رکھا ہے ؟"

" نہیں بڑے بابا۔"

" نہیں ؟ تو پھر نظر کیوں نہیں آ رہی ؟" وہ تیز تیز ڈیوڑھی کی طرف ہو لیا اور اس کے پیچھے بدستور احتجاجاً بھونکتا ہوا شیرا بھی، اور مائی نے یہ سوچتے ہوئے لالہ کے کمرے کا رُخ کیا کہ میں اُسے نجر ہی نیں آتی تو اِس میں اُس کا کیا دوس ؟

کمرے میں داخل ہوتے ہوئے گویا حویلی کا سارا کام اُس کے سر پر چڑھ آیا۔ اُس نے بڑی پھرتی سے ایک کونے سے جھاڑ دہاتھ میں لی اور سر جھکا کر فرش کی صفائی میں جٹ گئی اور آدھا فرش کر چکی تو اُسے موٹی ماں کی تلخ آواز سُنائی دی۔

" اتنی گرد کیوں اُڑا رہی ہو مائی ؟"

مائی کی سمجھ میں نہ آیا کہ موٹی ماں کو کیونکر بتائے، تمھاری ہی تو ہے۔ موٹی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے اُس کا سر اُدھر ہی اٹھا رہ گیا۔ " ارے اِتم کب آئیں سُمِترا بیٹی ؟" موٹی ماں کے ساتھ اُس کی اُس سے بھی موٹی بیٹی سُمِترا بیٹھی تھی اور لگاتار

آنسو بہائے جا رہی تھی۔ مائی جھاڑو وہیں چھوڑ کر اُن کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ "رو کیوں رہی ہو بیٹی؟"

"اس کے سسرال والوں نے اسے یہاں بھیج دیا ہے۔"

"تو کیا ہوا؟ اپنے ہی گھر تو بھیجا ہے۔" وہ اپنے میلے دوپٹے سے سمترا کے آنسو پونچھنے لگی، جس پر سمترا اُس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"اُنھوں نے اپنے گھر سے نکال کر بھیج دیا ہے مائی۔"

"ہائے رام!" موہ مائی کو جیسے گولی لگی ہو۔ "رو مت، سمترا بیٹی۔" سمترا کا اِس قدر فربہ جسم اُس کی لپیٹ میں نہیں آ پا رہا تھا۔ "رام بھلی کریں گے۔ رو مت۔" مائی نے سوچا کہ وہ یہیں سے کٹوری بھر کچا آٹا آج رام مندر میں چڑھاوے کے لیے لے جائے گی۔

موٹی ماں اُسے بتا رہی تھی۔ "اس کا پرشوتم کسی اور لڑکی سے پریم کرتا ہے مائی۔"

"ہائے رام! شادی کسی سے اور پریم کسی سے۔" سمترا کا سارا وجود مائی کے بازوؤں میں سمٹ ہی آیا اور اُسے اپنی چھاتیوں پر ناک رگڑ رگڑ کر روتے ہوئے پا کر اُس کی آنکھیں بھی ساون بھادوں ہونے لگیں۔ "میں تو تمہارے بارے میں کھُس کھُسری کی ٹوہ لیتی پھرتی تھی بیٹی۔"

"یہی تو گڑبڑ ہے مائی۔" موٹی ماں بولی۔ "سمترا پیٹ سے بھی ہے۔"

"ہائے پھر بھی ظالموں کو ہماری گئو بیٹی پر دیا نہ آئی؟" مائی نے سمترا کو اپنے ہاتھوں کھلا پلا کے اونچا کیا تھا۔ اُسے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیونکر ابھاگن کا سارا دکھ چوس لے۔

"تم پہلے اپنا کام ختم کر لو مائی۔" موٹی ماں نے اپنی آنکھیں پونچھ کر اُسے یاد دلایا۔ "اوپر چھت کی طرف دیکھو، کتنا جالا لٹک رہا ہے۔ بانس لے کر اِسے بھی صاف کر دو۔"

موہ مائی لالہ کے کمرے کی چھت سے بہت گھبراتی تھی۔ ایک دفعہ وہ شہتیروں سے جالا صاف کر رہی تھی کہ اُوپر سے سانپ کا ایک بچہ شقب سے نیچے آ گرا۔

"میں بولوں موٹی ماں۔" وہ موٹی ماں کو اکثر مشورہ دیا کرتی تھی۔ "اب یہ چھت ہی بدلوا دو۔"

"چھت تو جیسی بھی ایک بار پڑ جائے مائی، اُسی کے نیچے عمر گزارنا پڑتی ہے۔"

موہ مائی کو بڑا دُکھ تھا کہ موٹی ماں کو ایسی چھت کی کڑیوں تلے سونا پڑتا ہے جس کے سوراخوں میں سنپولیے پل رہے ہیں۔ ایک رات تو اپنی کھولی میں سوتے سوتے وہ چیخ مار کر جاگ پڑی۔ اور جاگنے پر بھی اُسے لگتا رہا کہ وہی موٹی ماں ہے اور ابھی ابھی سانپ کا ایک بچہ اُس کے بستر پر آ گرا ہے —— کہاں گیا؟ —— ہوش میں آنے کے بعد بھی وہ اپنی خوفزدہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنا بستر جھاڑتی رہی۔

موٹی ماں کے کمرے کی صفائی سے فارغ ہو کر وہ پھر آنگن میں چلی آئی تاکہ بقیہ کام نمٹانے سے پہلے باورچی خانے میں اپنا ناشتہ کر آئے۔ باورچی خانہ کافی دور آنگن کے دوسرے کنارے پر تھا اور لالہ کی سبھی بہوؤں کے کمرے اسی راستے میں ایک قطار میں واقع تھے۔ لالہ کی تیسرے اور چوتھے نمبر کی بہوئیں اپنے اپنے کمرے کے سامنے کھڑی ایک ایک بچہ بغل میں دابے آپس میں خوب جھگڑ رہی تھیں اور بعض بچے اُن کے پیروں میں متواتر رینگے جا رہے تھے۔ چوتھی بہو نے اچانک موہ مائی کو دیکھ لیا اور اپنا جھگڑا بھول کر اُسے صدا لگائی۔ "یہ تمہارے آنے کا ٹائم ہے مائی؟"

"اِس طرح ہر روز دیر سے آؤ گی مائی۔" تیسری بہو نے اپنا غصہ اُس کی طرف منتقل کر دیا۔ "تو ہم کوئی اور بندوبست کر لیں گے۔"

"میں ابھی آتی ہوں بہوؤ۔" مائی اپنے آپ کو باورچی خانے کی طرف تیز تیز گھسیٹنے لگی —— "بس ذرا سا ناشتہ کر آؤں۔"

باورچی خانے کی چوکھٹ میں قدم دھرتے ہوئے مائی نے نوجوان باورچی کو اپنے ناشتے پر بیٹھے پایا۔ اُس نے مائی کا ناشتہ بھی نکال کر اپنی ایک طرف رکھا ہوا تھا۔ مائی نے جلدی سے ہاتھ دھو کر کلی کی اور اس کے پہلو میں آ بیٹھی۔

"سناؤ کھسیا، تمہاری گھر گائی کا کوئی کھت پتر آیا۔ سب

کُسل ہے نا؟"

"ہاں، مائی، کُسل تو ہے۔"

"کیا کُسل ہوگی کھُسیا؟" مائی نے خشک رسک کو منہ
ی طرف لے جانے سے پہلے چائے میں بھگو لیا۔ "تم اِدھر پڑے
ہوئے ہو اور تمارے بیوی بچے اُدھر۔ یہ بھی کوئی جینا ہے!" اس
نے چائے میں بھیگے ہوئے رسک کو زبان پر رکھا تو اُسے محسوس ہوا
اُسے بہت بھوک لگی ہوئی تھی۔ پھر وہ خوشیا کی طرف ایک نظر
یکھتے ہوئے ٹھٹک گئی۔ "تمارا چہرہ کیوں اترا ہوا ہے؟ سچ
اؤ، وا کیائی سب کُسل ہے نا؟"

"میرا ننھا بہت بیمار ہے مائی۔" خوشیا نے کھانے سے
تھ روک لیا۔ "کملا نے لکھا ہے دوا دارو کے لیے پیسے بھیجو؛
میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔"

"تو کیا ہوا کھُسیا؟ لالہ سے اُدھار لے کر پچورن بھیج
دو۔"

"کل سے اِسی کوشش میں لگا ہوا ہوں مائی۔ سب نے
ورا جواب دے دیا ہے۔" خوشیا کی آنکھوں میں غم و غصہ سے
نی بھرنے لگا۔ "میں نے سوچا ہے کام کاج چھوڑ کر آج ہی چلا
اؤں گا۔"

موہ مائی اپنا ناشتہ بھول کر اس کے قریب سرک آئی اور
یار سے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ "گھبراؤ نہیں کھُسیا۔"
س کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ "میں نے اپنے مرنے جینے کے لیے
و پچاس جماں کر رکھے ہیں۔ کل لیتی آؤں گی۔"

خوشیا کی آنکھوں میں جمع ہوتا ہوا پانی نشیب پاتے ہی
بے اختیار بہہ نکلا۔ "تم کتنی اچھی ہو مائی!" اُس نے موہ مائی کے
ردآلود پھٹے ہوئے پاؤں چھو کر ہاتھ اپنے ہونٹوں پر رکھ لیے۔

تھوڑی دیر وہ دونوں چپ چاپ کھانے میں مشغول رہے
پھر موہ مائی خوشیا کی طرف سر اُٹھا کر کہنے لگی۔ "موٹی ماں بیچاری
ہت دُکھی ہے کھُسیا۔"

"ایک بات پوچھوں، مائی؟" خوشیا کی آواز سے غصہ
ٹپک رہا تھا۔

"پوچھو، بیٹے۔"

"کیا تمھیں اپنا کوئی دُکھ نہیں ہے؟"

"دُکھی تو ہر کوئی ہوتا ہے بیٹا۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں، مائی۔ ہم غریب لوگ سر سے
پاؤں تک دلدل میں پھنسے ہوتے ہیں۔" خوشیا نے سوکھے
رسک کو منہ میں کھبو کر کہا۔ "پھر بھی ہمارے مالکوں کو ہمارے
دُکھوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔" وہ چائے کا گھونٹ بھرنے
کے لیے ذرا اُرک گیا۔ "تم ہمیشہ اُنہی کا دُکھ کیوں روتی رہتی ہو؟"

"یہ بات نہیں کھُسیا۔" موہ مائی نے اپنی بات سمجھانے
کے لیے چائے کا پیالہ ایک طرف رکھ کے اپنے ہاتھ خالی کر لیے۔
"ہم گریبوں کو کھاس اپنے رونے دھونے کی پھرست ہی کب ملتی
ہے؟" ایسے لگ رہا تھا کہ وہ صرف منہ سے بولنے کی بجائے سارے
وجود سے اپنی بات سمجھانا چاہ رہی ہے۔ "سو جب ہمیں اپنے
مالکوں کے دُکھوں پر رونے کا موکا ملتا ہے تو اِس تراں ہمارا اپنا
رونا دھونا بھی ہو جاتا ہے۔ جیسے بھی راہت ملے بیٹا۔"

●●

". . . اِس سے پہلے کہ خُدا کی
بادشاہی کا دن نزدیک آئے، کیا بہتر
نہیں کہ اس کے لیے ہم اپنے تئیں تیار
کریں؟ تاکہ جب اس کا مقدس دن آئے
تو ہم یہ کہہ کر نہ نکال دیے جائیں
کہ تم نے غیروں کی حکومت کے آگے خُدا
کی حکومت کو بُھلا دیا تھا، جاؤ کہ آج خُدا
کی بادشاہت میں تم بھی بُھلا دیے گئے . . ."

——— مولانا ابوالکلام آزاد

("الہلال" یکم جولائی ۱۹۱۳ء)

غزلیں

حفیظ میرٹھی

پھر رہے ہیں خود نمائی کو وہ بے پردا کیے
اس ہوس نے کیسے کیسے خوبرو رُسوا کیے

مَیں نے تو محرومیوں سے حوصلے پیدا کیے
جو خزانے تم نے پائے تھے وہ آخر کیا کیے

دیکھنے دیتے نہیں، کچھ سوچنے دیتے نہیں
وہ جو بیٹھے ہیں نگاہ و فکر پر قبضا کیے

چاند کا کردار اپنایا ہے ہم نے دوستو!
داغ اپنے پاس رکھے، روشنی بانٹا کیے

یہ نہ سُننا، یہ نہ پڑھنا، یہ نہ بن جانا کہیں
شوق کے دروازے اِن پابندیوں نے وا کیے

وار کو اُن کے کبھی خاطر میں لایا ہی نہیں
کتنے دشمن مَیں نے اس تدبیر سے پسپا کیے

رشک مجھ کو بے ضمیروں پر نہیں آیا حفیظ
لاکھ تیرے حال پر وہ طنز فرمایا کیے

محسن زیدی

ہو مجھ کو عطا میرے خدا اس سے زیادہ
پھیلے گا نہ دامانِ گدا اس سے زیادہ

کل تک یہیں رہتا تھا وہ اطراف میں دل کے
معلوم نہیں اُس کا پتا اس سے زیادہ

جانے نہ دو اس دشت سے آگے اسے ورنہ
پھیلے گی مری گردِ نوا اس سے زیادہ

جب ہوگا خود احساس چھپا لے گا وہ چہرہ
آئینہ دکھائیں اسے کیا اس سے زیادہ

ہوتا ہے زمانے میں ہر اک شخص کا اک نام
اپنی کوئی پہچان بتا اس سے زیادہ

کچھ بھولے ہوئے شعر ہیں اب اپنا اثاثہ
لے دے کے نہ کچھ پاس بچا اس سے زیادہ

محسنؔ یہ جواب دیکھنے سُننے کو ملا ہے
پہلے کبھی دیکھا نہ سُنا اس سے زیادہ

"... سُنہری مسجد کی مرمت آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا نے نہیں کرائی۔ اس میں نماز پڑھی جاتی ہے۔ مسجد کی ایک کمیٹی ہے اس کمیٹی کا فائدہ یہ ہے کہ مسجد صاف ستھری رہتی ہے لیکن یہ برا ہوا کہ دالان کی دیوار پر سفیدی کر دی گئی اور ..."

پتھر بولتے ہیں

خلیق انجم

دہلی میں نواب قدسیہ اور جاوید خاں کی تعمیرات

دھلی میں کئی قدیم عمارتیں ایسی ہیں جن کی تعمیر نواب قدسیہ اور نواب بہادر جاوید خاں نے کی تھی۔ ان عمارتوں میں لال قلعے کے دہلی دروازے کے قریب سنہری مسجد، شاہ مرداں میں مجلس خانہ، مسجد، حوض (جس میں حضرت علیؓ کے قدم مبارک کا نشان ہے)، اور علی گنج کی چار دیواری شامل ہیں۔ کشمیری گیٹ کے شمال میں قدسیہ باغ بھی نواب قدسیہ ہی کی یادگار ہے۔ اس باغ کی عمارت منہدم ہو چکی ہے۔ جو حصّہ بچا ہوا ہے اس پر کوئی ایسا کتبہ نہیں ملتا جس سے معلوم ہو سکے کہ اس کی تعمیر میں جاوید خاں کا بھی ہاتھ تھا یا نہیں لیکن نواب قدسیہ اور جاوید خاں کے تعلقات دیکھتے ہوئے اس کا امکان ہے کہ دوسری عمارتوں کی طرح قدسیہ باغ کی عمارت کی تعمیر میں بھی جاوید خاں نے نمایاں حصّہ لیا ہو۔

آج کل سنہری مسجد کے چاروں طرف بالکل آبادی نہیں ہے۔ ہاں اس کے مغرب میں ایک فوجی بیرک ہے جس میں چپراسی وغیرہ رہتے ہیں۔ بیرک کے برابر سے وہ سڑک گزرتی ہے جو فیض بازار سے کشمیری گیٹ کی طرف جاتی ہے۔ اس سڑک کے دوسری طرف سبھاش پارک ہے، جو چند سال قبل تک ایڈورڈ پارک کہلاتا تھا اور جسے دلی کے کرخندار "یادگار" کہتے تھے۔ اس باغ میں پہلے ایڈورڈ پنجم کا مجسمہ نصب تھا۔ وہ مجسمہ اتار لیا گیا۔ ایک روایت کے مطابق اب وہ مجسمہ لندن کے عجائب خانے میں ہے اس مجسمے کی جگہ جنگِ آزادی کے مجاہد سبھاش چندر بوس کا مجسمہ نصب کر دیا گیا ہے۔ سنہری مسجد کے شمال میں پریڈ گراؤنڈ اور اس میں خاصی بری حالت میں شاہ کلیم اللہ جہان آبادی کا مزار ہے۔ جنوب میں ایک سڑک ہے اس کا نام نیو دریا گنج روڈ ہے۔ یہ روڈ پندرہ بیس سال پہلے بنائی گئی تھی۔ پہلے یہ سڑک راج گھاٹ دروازے تک تھی۔ سڑک کے دوسری طرف پٹرول پمپ ہے مسجد کے مشرق میں ایک سڑک ہے، جو مسجد کے شمال جنوب کو جاتی ہے۔ سڑک کے پار سے فوجی بیرکیں شروع ہو جاتی ہیں۔ جہاں اب بیرکیں ہیں یہاں پہلے ایک گرجا گھر اور عیسائیوں کا قبرستان تھا۔ اب نہ قبرستان ہے اور نہ گرجا گھر۔ گرجا گھر کے سامنے قلعے کی دیوار کے قریب ایک دھرم شالہ اور اس سے آگے محلہ ملاحان تھا۔ قبرستان پر فوجی بیرکیں بنا دی گئی ہیں، اب وہاں کوئی قبر نظر نہیں آتی۔ گرجا گھر اور بیرکوں کے مشرقی حصّے میں سنگ باسی کی ایک صلیب نصب ہے، جس پر درج ذیل انگریزی عبارت

کندہ ہے۔

This Cross
Marks THE SITE
OF
DURYAGUNGE
AND IS
Dedicated to the Memory
OF THOSE
WHOSE REMAINS LIE AROUND

MDCCCLXI

THY DEAD MEN SHALL LIVE TOGETHER WITHIN
MY DEAD BODY SHALL THEY ARISE
AWAKE AND SING YE THAT DWELL IN THE DUST
FOR THY DEW IS AS THE DEW OF HERBS
AND THE EARTH SHALL CAST OUT HER DEAD
Isiah xxvi 19

فوجی بارکوں میں نصب صلیب

قبرستان کے بعد ایک دھرم شالہ تھی۔ فوجی بیرکیں جہاں ختم ہوتی ہیں وہاں ایک راستہ ہے جو نیچے جاتا ہے پہلے اس راستے پر سیڑھیاں تھیں اور جہاں سیڑھیاں ختم ہوتی تھیں وہاں فصیل تھی۔ فصیل میں ایک دروازہ تھا۔ اس دروازے کا نام راج گھاٹ دروازہ تھا۔ یہ دروازہ منہدم ہو چکا ہے لیکن فصیل کا کچھ حصہ راج گھاٹ دروازے کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس دروازے سے باہر نکل کر دائیں طرف ایک مندر ہے آزادی سے قبل یہ جگہ "شاہ بڑے" کہلاتی تھی۔ دن بھر بھنگ گھولی جاتی اور بہت سے لوگ بھنگ پی کر یہیں پڑے رہتے۔ بعض بزرگوں کا کہنا ہے کہ ۱۹۴۷ء تک شاہ بڑے کا مزار بھنگ کے لیے مشہور تھا۔ کچھ سال پہلے تک اگر کوئی ناقابلِ یقین بات کہتا تو کہتے کہ شاہ بڑے کی چھوڑ رہا ہے۔ اب بہت کم لوگوں کی زبان پر یہ محاورہ ہے۔ پرانی عمارت کے کچھ حصے اب بھی باقی ہیں۔ قدیم زمانے میں راج گھاٹ کے دروازے سے بہت قریب جمنا بہتی تھی اور دروازے کے سامنے کشتیوں کا پل تھا۔ جمنا پار دوسرے مقامات پر جانے کے لیے یہاں بیل گاڑیاں اور گھوڑا گاڑیاں وغیرہ کرایے پر ملتی تھیں۔ لال قلعے کے دلی دروازے کے جنوب مغرب کی طرف (یعنی سنہری مسجد کے مشرق کی طرف) جہاں اب فوجی بیرکیں ہیں، سعد اللہ خاں کا چوک تھا۔ سعد اللہ خاں شاہ جہاں کے وزیر تھے۔ انہی کے نام سے یہ چوک منسوب تھا۔ یہ دہلی کا سب سے زیادہ بارونق بازار تھا۔ نواب درگاہ قلی خاں مئی ۱۷۳۸ء میں دکن سے دلی آئے تھے اور جولائی ۱۷۴۱ء تک وہ یہیں رہے۔ وہ اپنی کتاب "مرقعِ دہلی" میں چوک سعد اللہ خاں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"... قلعہ کے دروازے کے روبرو اور جلو خانے کے اگلے حصے کے پاس ہی چوک کا ہنگامہ اور مجمع ہوتا ہے۔ سبحان اللہ، طرح طرح کی چیزوں کی ایسی فراوانی ہوتی ہے کہ آنکھ دیکھتے دیکھتے تھک جاتی ہے اور نظر نت نئی اشیاء کی کثرت اور من پسند چیزوں کی بہتات سے حیرت زدہ ہو جاتی ہے۔ ہر طرف لونڈے اپنے رقص سے قیامت برپا کرتے ہیں اور جگہ جگہ داستان گو دھوم مچاتے ہیں۔ راوی مولویوں کی

طرح وضع قطع بنائے اور جگہ جگہ منبر جیسی لکڑی کی کرسی بچھائے ہر مہینے کی مناسبت سے مثلاً رمضان میں روزے کے فضائل، ذی الحجہ میں حج و عمرہ کے مناسک یا محرم میں کربلا کے واقعات پوری فصاحت و بلاغت کے ساتھ عوام کے ذہن نشیں کرتے ہیں۔۔ اکثر دو گھڑی رات تک وعظ و تذکیر کی یہ محفلیں چلتی ہیں۔

نجومی اور رمّال بھی لوگوں کو بے وقوف بنانے میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ وہ بھی الگ مجمع لگائے لوگوں کے دل کا بھید بتاتے ہیں :

اسلحہ فروش طرح طرح کے ہتھیار نیام سے نکال کر سجائے رہتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی ضرورت سے مجبور ہو کر خریدے گا۔ کپڑے والے رنگ برنگے کپڑے ہاتھوں پر پھیلائے پوری فضا کو رنگین بنائے رہتے ہیں کہ کسی نہ کسی رنگ پر تو خریدار کی نظر جمے گی۔ کھانے پینے کی طرح طرح کی نعمتیں ٹھیک آپ کے برابر بک رہی ہیں، ہاتھ بڑھائیے اور لقمہ منہ میں رکھ لیجیے۔ ہندوستانی اور ولایتی میوے برابر بکتے ہیں۔ ذرا پلٹ کر دیکھیے اور مُنہ کا مزا لیجیے۔ جنگلی جانوروں اور پرندوں کے بازار میں پہنچ کر تو حواس اُڑ جاتے ہیں، باز، بحری، کبوتر، بلبل اور دوسرے تمام پرندوں کی ایسی بہتات ہے کہ جب تک کوئی منطق الطیر نہ پڑھا ہو یا سلیمان آصف کی صحبت میں نہ رہا ہو، ان کی پہچان مشکل ہے۔۔۔ رنگا رنگ اور طرح طرح کے پنجرے خریداروں کو پیش کیے جاتے ہیں۔ غرضیکہ انسانی ضرورت اور نفسانی لذت کی سبھی چیزیں وہاں موجود ہیں۔ چونکہ یہ جگہ قلعے کے سامنے ہے اور وہاں سے امرا اور افسران کی آمد و رفت رہتی ہے اس لیے ہر وقت ایک محشر سا برپا رہتا ہے۔ ۔ ۔" (ڈاکٹر نور الحسن انصاری نے فارسی سے ترجمہ کیا ہے)

سعد اللہ خاں چوک کے جنوب میں چڑی ماروں اور قصائیوں کی دکانیں اور شاہی فیل خانہ تھا۔ فیل خانے کے قریب راج گھاٹ کی وہ پولیس چوکی تھی، جسے مرزا سنگین بیگ نے "تھانہ گزر راج گھاٹ" لکھا ہے۔ اس تھانے سے متّصل سنہری مسجد تھی۔

سنہری مسجد کے شمال میں لال قلعے کے دلّی دروازے سے جامع مسجد کے مشرقی دروازے تک ایک بازار تھا، جس کا نام خاص بازار تھا۔ یوں تو اس بازار میں سب طرح کے سودے والوں کی دکانیں تھیں، لیکن سبزی فروشوں کی دکانیں بہت زیادہ تھیں۔ آجکل قلعے کے دلّی دروازے سے جامع مسجد کے مشرقی دروازے کی طرف ایک چھوٹی سی سڑک ہے، جو فیض بازار سے کشمیری گیٹ کی طرف جانے والی سڑک میں مل جاتی ہے۔ اس کے بعد چند سال قبل جامع مسجد کے مشرقی دروازے کے سامنے لال چوکوں سے لمبے لمبے حوض بنائے گئے ہیں۔ یہ حوض ہمیشہ سوکھے پڑے رہتے ہیں۔ اس مسجد کی تعمیری خصوصیات کی بہت سے ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے تعریف کی ہے لیکن پہلی بار سیّد احمد خاں نے مختصر لیکن بہت جامع الفاظ میں اس مسجد کی تعمیری خوبیاں بیان کی ہیں۔ انھوں نے اس مسجد کے بارے میں کچھ اہم معلومات بھی فراہم کی ہیں۔
سیّد صاحب لکھتے ہیں :

"۔ ۔ ۔ لطافت اور نزاکت اس کی بیان سے باہر، خوبی اور خوشنمائی اس کی حد سے زیادہ ہے۔ قطع اس کی بہت خوب اور وضع اس کی نہایت مرغوب ہے۔ سر سے پاؤں تک سنگِ باسی کی بنی ہوئی ہے اور دو مینار ہیں خوبصورت، وہ بھی سنگِ باسی کے ہیں۔ تین گنبد تھے سنہرے، یعنی کاٹھ کے گنبد بنا کر اس کے اوپر تانبے کے موٹے موٹے پترے چڑھائے تھے اور اُن پتروں پر سونے کے پترے بطور ملمّع کے چڑھائے تھے اور اسی طرح تمام برجیاں اور کلسیاں اس مسجد کی سنہری ہیں اندر سے تمام در و دیوار اس کے سونے سے لیپی ہوئی تھیں (کذا) چند روز سے کاٹھ اس کے برجوں کا گل گیا تھا اور برج ٹیڑھے ہو گئے تھے۔ اس کا نقشہ کھینچنے کے بعد بموجب حکم حضور والا

کے وہ برج اُتار لیے گئے۔۔"

سنہری مسجد غیر معمولی حد تک چھوٹی ہے۔ پوری مسجد سنگِ باسی کی بنی ہوئی ہے۔ مسجد کا مغربی حصّہ سڑک کی سطح پر ہے، لیکن مشرقی دروازے کی طرف زمین کی سطح کافی نیچی ہے۔ ادھر دیکھنے سے خیال ہوتا ہے کہ اونچے چبوترے پر مسجد بنائی گئی تھی اس لیے مسجد کا دروازہ بہت

سنہری مسجد کا دروازہ

بلند ہے۔ دہری محراب کا یہ دروازہ ۱۳ فٹ پانچ انچ بلند (سنگی کٹہرہ چھوڑ کر) اور ۸ فٹ، ۱ انچ چوڑا ہے۔ دروازے کی محراب پر خوبصورت سنگ تراشی کی گئی ہے۔ دروازے کے دونوں طرف پتھروں میں چھوٹے چھوٹے خوبصورت طاق تراشے گئے ہیں۔ دروازے پر باہر کے رُخ نیچے دونوں طرف دو بڑے بڑے محراب دار طاق ہیں۔ بشیر الدین احمد نے واقعاتِ دارالحکومت میں لکھا ہے کہ دروازے کے دونوں طرف ایک ایک مینار تھا، جنھیں غدر کے بعد منہدم کر دیا گیا۔ دروازے کے اوپر دہرا کٹہرا ہے۔ کٹہرے پر اندر اور باہر دونوں رخوں پر پندرہ پندرہ محراب دار در بنائے گئے ہیں۔ یہ در چھوٹے چھوٹے محرابی کنگوروں پر بنائے گئے ہیں۔ دروازے سے مسجد میں داخل ہونے کے لیے ۹ سیڑھیاں ہیں۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی دروازے سے ملا ہوا ایک چبوترہ ہے۔ اس چبوترے پر چڑھنے کے لیے دونوں طرف چار چار سیڑھیاں ہیں۔ مسجد کا صحن بھورے رنگ کے چوکوں سے بنایا گیا ہے۔

سنہری مسجد

سیّد احمد خاں نے اس مسجد کا جو نقشہ دیا ہے، اس میں دونوں طرف پنج دریاں ہیں۔ یہ پنج دریاں منہدم ہو چکی ہیں۔ اس دالان کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مرزا سنگین بیگ نے لکھا ہے "اس مسجد میں جنوب کی طرف حضرت سیّد الشہدا امام حُسین کے تبرکات ایک حجرے میں رکھے ہوئے ہیں۔ اس حجرے کے چاروں طرف سنہرے حروف میں یہ عبارت لکھی ہوئی ہے:

اللھُمَّ صلے علی محمّد والہ وبارک وسلم علیھم

اجمعین۔ ۱۲۳۶ ہجری۔ اس حجرے کے شمالی پہلو پر یہ لکھا ہوا ہے:

این موی مکرمی کہ فرمود درود
آثارِ ظفر بود برای طالب
گفتیم کہ منسوب الہٰ کس بود
گفتند ملائک اسد اللہ الغالب

قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم

عن انس ان رسول اللہ علیہ وسلم من زاد شیبتی
وجبت لہ شفاعتی یوم القیمۃ بل حلق راسہ
کان ابو طلحہ : اول
من احد من شعرۃ

محراب کے اندر، حجرے کی چوکھٹ کی پیشانی پر، یہ لکھا ہوا ہے:

توکلت علی اللہ

گیسوی پاکِ امام شاہِ شہیدان علیہ السلام۔ الشفاعتہ یا رسول اللہ۔

یارب برسالتِ رسول الثقلین
یارب بغزا کنندۂ بدر و حنین
عصیانِ مرا دو حصہ کن نگذار
نیمی بحسن بہ بخش و نیمی بہ حسین
اے حیدر شہسوار، وقتِ مدد است
اے منبع ہشت و چار، وقتِ مدد است
کارے عجب نستاد مشکل مارا
اے صاحبِ ذوالفقار، وقتِ مدد است

اس عمارت کے دونوں طرف دروازوں کی پیشانی پر کلمۂ طیبہ اور حدیثِ نبوی صلعم لکھی ہوئی ہے۔

اس سنہری مسجد کے پیچھے بھگو بیگم صاحبہ مرحومہ بنت حضرت فردوس منزل کا مقبرہ ہے، جو کوہ باری کے نام سے مشہور ہے۔

یہاں مذکورہ بالا مسجد کے مغربی دروازے پر یہ عبارت تحریر ہے:

دروازۂ کلانِ غربی خانقاہِ مبارک نیازِ رسول اللہ مقبول صلعم۔

یہ تفصیل نہیں ملتی کہ یہ تبرکات کیا تھے اور کہاں گئے؟

دروں کی پیشانی پر سنگِ مرمر کے پانچ کتبے نصب ہیں۔ جن پر سنگِ موسیٰ کی پچی کاری سے درج ذیل پانچ اشعار کندہ کیے گئے ہیں:

شکرِ حق در عہدِ احمد شاہِ غازی بادشاہ
خلق پرور، دادگر، شاہانِ عالم را پناہ
مسجدے کردہ بنا نواب قدسی منزلت
باد دائم فیضِ عامِ آں ملائک سجدہ گاہ
سعیِ نوابِ بہادر، صاحبِ لطف و کرم
ساختہ تعمیرِ چنیں جاوید عالی دستگاہ
چاہ و حوضِ صافِ صحنش آبروئے زمزم است
ہر کہ از آبش طہارت کرد، شد پاک از گناہ
سالِ تاریخش بچہ خرم یافت از الہامِ غیب
مسجدے بیتِ مقدس مطلعِ نورِ اللہ

مسجد اکہرے دالان کی ہے۔ دالان کے تین در، تین گنبد ہیں۔ دونوں طرف دو مینار ہیں۔ ہر در پر پانچ پانچ کنگورے ہیں تینوں دروں میں بہت نفیس محرابیں بنی ہوئی ہیں۔ ان محرابوں کے پاکھوں پر بہت خوبصورت نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔

دائیں طرف کے تین کنگوروں کے پتھر گر چکے ہیں بشیر الدین احمد لکھتے ہیں کہ:

۱؎ آخری شعر کے دوسرے مصرع سے ۱۱۶۴ھ (۵۱-۱۷۵۰ء) سنہ برآمد ہوتا ہے۔

۲؎ سنہری مسجد کا یہ کتبہ سیر المنازل، آثار الصنادید، واقعاتِ دارالحکومت، جلد دوم اور لسٹ آف محمڈن اینڈ ہندو مونومنٹس جلد اول میں نقل ہوا ہے۔ اور سب میں کچھ قرأتیں اصل متن سے مختلف ہیں۔ میں نے یہاں یہ عبارت اصل کتبے سے نقل کی ہے۔

"مسجد کی پچھیت کی دیوار کے دونوں سروں پر
ایک ایک دیوار دوز بلند مینار ہے جو برجوں کو سہارا دیے
ہوئے ہیں۔ ان پر برجیاں تو ہیں مگر کلس نہیں ہیں"
اب یہ دونوں مینار گر چکے ہیں۔

درمیانی در کے دونوں طرف آٹھ آٹھ فٹ بلند پتلے پتلے دو خوبصورت مینار ہیں۔ پچھیت کی دیوار میں بھی ان کے جواب میں دو مینار تھے۔ اب یہ دونوں مینار گر چکے ہیں۔

مسجد کے صحن کے دائیں طرف بہ قول سید احمد خاں:

"... خوبصورت حوض اور اس میں فوّارہ لگا ہوا۔ اس حوض میں اُس کنویں سے جو اس مسجد کے متصل ہے، پانی آتا تھا، اب بہ سبب بے مرمت ہو جانے کے پانی نہیں آتا اور فوّارہ نہیں چھوٹتا..."

سید احمد خاں نے یہ تفصیل ۱۸۴۷ء میں بیان کی تھی۔ سید احمد خاں کے ستر سال بعد بشیر الدین احمد نے بھی اس حوض کے خشک رہنے کی اطلاع دی ہے۔ اب یہ حوض بھرا جا چکا ہے۔ مسجد کا صحن بھورے چوکوں کا ہے۔ یہ چوکے اُس وقت کے معلوم ہوتے ہیں جب مسجد تعمیر ہوئی تھی۔ صحن کے دونوں طرف جہاں پہلے شمال کی طرف حوض اور جنوب کی طرف کاٹھ کا دالان تھا، چند سال پہلے لال چوکوں سے فرش بنا دیا گیا ہے۔ گنبدوں، درمیناروں کے اوپر جو برجیاں اور کلس ہیں وہ سنہرے ہیں۔ ان پر غالباً تانبے کے پترے اور پھر سونے کے پترے چڑھے ہوئے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اس مسجد کی دیواروں پر اس طرح سنہری کام کیا گیا تھا، شبہ ہوتا تھا کہ دیواروں پر سونے کے پترے چڑھائے گئے۔ ۱۹۱۹ء میں ان دالانوں کی حالت بیان کرتے ہوئے بشیر الدین احمد نے لکھا تھا:

"... مسجد کا اندرونی تمام حصّہ سخت مرمت کا محتاج ہے۔ گنبدوں کی اندارنی چھپر گئی۔ اینٹوں نے دانت نکوس دیے۔ جا بجا سے استرکاری کے کھپرے کے کھپرے اتر گئے۔ اب یہ مسجد بالکل نِچی کھچی اور لُنڈی ہے..."

دہلی کے تمام آثارِ قدیمہ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے زیرِ نگرانی نہیں ہیں۔ سوا سو کے قریب عمارتوں کی دیکھ بھال آرکیالوجیکل سروے کرتا ہے۔ یہ محکمہ صرف اپنا بورڈ لگا دینا کافی سمجھتا ہے۔ دہلی میں کس بارہ آثارِ قدیمہ کے سوا باقی سب کی حالت بے انتہا خراب ہے۔ سنہری مسجد کی مرمت آرکیالوجیکل سروے نے نہیں کرائی۔ اس میں نماز پڑھی جاتی ہے۔ مسجد کی ایک کمیٹی ہے۔ اس کمیٹی کا فائدہ یہ ہے کہ مسجد بہت صاف ستھری رہتی ہے۔ لیکن یہ بُرا ہوا کہ دالان کی دیواروں پر سفیدی کر دی گئی اور دیواروں کے نچلے حصّے پر تین ساڑھے تین فٹ تک پیلے رنگ کا انتہائی بھدا روغن کر دیا گیا ہے۔

بگوا بیگم کا مزار

سنہری مسجد کی مغربی دیوار کے عقب میں ایک چھوٹا سا احاطہ ہے جس میں ایک زنانی قبر ہے۔ یہ قبر سنگِ مرمر کی بنی ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قبر محمد شاہ بادشاہ کی صاحبزادی بگوا بیگم اور بقول مرزا سنگین بیگ بھگو بیگم کی ہے۔ ہر جمعرات کو اس مزار پر منّت ماننے کے لیے بہت عورتیں آتی ہیں۔ اس مزار کے چاروں طرف پہلے باغ تھا جسے بگوا باڑی کہتے تھے۔ مرزا سنگین بیگ نے اس باغ کا نام کوہ باڑی" لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ اس جگہ کے دونوں ہی نام ہوں۔ یہیں ایک عمارت تھی جسے 'خانہ باغ' کہا جاتا تھا، اس میں شاہی خاندان کے لوگ رہتے تھے۔

(باقی آئندہ)

غزلیں

جاوید وششٹ

اُن کے شیشے میں بال سا کچھ ہے
اپنے دل میں ملال سا کچھ ہے

وہ حسیں چہرہ آج آنکھوں میں
خواب سا کچھ، خیال سا کچھ ہے

دھڑکنوں کو جواب کی ہے فکر
دل میں بہیم سوال سا کچھ ہے

وہ تو اک راز ہے، رہے گا راز
آپ اپنی مثال سا کچھ ہے

قرب میں فاصلہ سا حائل تھا
فصل میں اب وصال سا کچھ ہے

شعر جاوید سن کے وہ بولے
اس کے فن میں کمال سا کچھ ہے

کرشن بہاری نور

بچھڑ کے تجھ سے نہ جیتے ہیں اور نہ مرتے ہیں
عجیب طرح کے بس حادثے گزرتے ہیں

بڑا سکون ہے، دن چین سے گزرتے ہیں
ہم اب کسی سے نہیں بس خدا سے ڈرتے ہیں

زمین چھوڑ نہ پاؤں گا انتظار یہ ہے
وہ آسمان سے دھرتی پہ کب اُترتے ہیں

یہ کس نے کھینچ دی سانسوں کی لکشمن ریکھا
کہ جسم جلتا ہے باہر جو پاؤں دھرتے ہیں

یہ چاند تارے زمیں اور آفتاب تمام
طواف کرتے ہیں، کس کا طواف کرتے ہیں؟

حیات دیتی ہیں سانسیں بس اک مقام تلک
پھر اُس کے بعد تو بس سانس سانس مرتے ہیں

" . . . اے عزیز ہم تمہارے شہر میں اجنبی ہیں اور نظر بندی کے نفاذ کے اعلان کے بعد پناہ کی تلاش میں یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ کیا تم ہمیں پناہ دو گے؟" ابو سعد نے اپنا حال بیان کیا . . .

صرف ایک شب کا فاصلہ

ابنِ کنول

بعد کئی صدیوں کے زید بن حارث کی آنکھوں میں آفتاب کی کرنیں چبھنے لگیں، اُس نے آہستہ آہستہ پلکوں کو حرکت دی، اور اپنے گرد دیکھا، روشنی دھیرے دھیرے غار کے اندر داخل ہو چکی تھی۔ اُس نے اپنے خوابیدہ ساتھیوں پر نظر ڈالی اور محسوس کیا کہ ان کی پلکوں کے نیچے تپش پھیلنے لگی ہے اور عنقریب یہ وا ہو جانا چاہتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ اس کا کوئی ساتھی اپنی پلکوں کو وا کرتا اور آفتاب کی روشنی آنکھوں میں اتار لیتا، اس نے آواز دی۔

" ساتھیو! کیا تم اپنی آنکھوں میں روشنی کی چبھن محسوس نہیں کرتے؟"

اور اس آواز کے ساتھ سب کی آنکھوں میں آفتاب اُتر گیا۔ اُن سب نے اپنے جسموں کو حرکت دی اور نیم دراز ہوئے۔ ابو سعد کفِ دست سے اپنی آنکھوں کو ملتا ہوا یوں گویا ہوا

" اے حارث کے بیٹے کیا ہم سوئے ہوئے تھے؟"

"ہاں شاید ہم سب ہی سو گئے تھے۔" زید بن حارث نے جواب دیا اور استفسار کیا۔

" اے عمر کیا تم جانتے ہو کہ ہم نے کتنا عرصہ عالمِ غفلت میں گزارا؟"

" صرف ایک شب"

پھر وہ سب ہی اپنے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگے۔ وہ ایک غار میں تھے، اپنے آپ کو غار کی پناہ میں دیکھ کر طلحہ بن عبید نے اپنے ساتھیوں سے دریافت کیا :

" دوستو! کیا تمھیں یاد ہے کہ ہم نے اس تاریک غار میں پناہ کیوں لی تھی؟"

" اے طلحہ کیا تمھیں یاد نہیں رہا؟" زید نے طلحہ سے پوچھا قبل اس کے کہ طلحہ کچھ جواب دیتا ابو سعد کہنے لگا۔

" عزیزو! یہ باتیں بوقتِ فرصت دہرائی جائیں گی — سرِ دست اشتہا بڑھتی جاتی ہے۔ چلو ہم سب بستی کی جانب چلیں اور کھانے کا انتظام کریں۔"

ابو سعد کے مشورے کو سب نے قبول کیا اور اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کہ جن میں دینار موجود تھے ——— پھر وہ چند نوجوان بستی کی سمت روانہ ہوئے۔ کچھ دور چلنے کے بعد ہی انھیں بستی

دکھائی دینے لگی۔ لیکن انھوں نے اس بستی کو اُس بستی سے مختلف پایا جسے چھوڑ کر انھوں نے غار میں پناہ لی تھی۔ اہلِ شہر کے لباس اور چہرے اُن سے مختلف تھے۔ کچھ دیر تک وہ حیران و پریشان رہے۔ پھر اسی عالم میں ایک دوسرے سے کہنے لگے :

" اے زید شاید ہم راستہ بھٹک گئے ۔"

" تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ قوم وہ نہیں، جن کے بیچ ہم رہتے تھے ۔"

" فی الحال یہیں ٹھہرتے ہیں اور اس ملک کو دیکھتے ہیں پھر ہم اپنے ملک کی راہ پوچھیں گے ۔"

وہ چاروں ایک جگہ کھڑے ہو کر لوگوں کی آمد و رفت دیکھنے لگے کہ ایک راہ گیر اُن کے نزدیک سے گزرا۔ زید بن حارث نے اُسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

" اے برادرِ عزیز اس مُلک کا حاکم کون ہے ؟"

اُس نے اُن کو بہ نظرِ غور دیکھا اور کہا :

" یہاں عوام کی حکومت ہے ۔"

وہ سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے ۔ ابو سعد نے نافہمی کا اظہار کیا۔

" اے عزیز کیا تم وضاحت سے بیان کر سکو گے کہ عوام کی حکومت سے کیا مراد ہے ؟"

" ہمارے یہاں حاکم کے انتخاب کے لیے عوام کی راے حاصل کی جاتی ہے اور جس شخص کو اکثریت چاہتی ہے، حاکم بنایا جاتا ہے ۔"

" کیا منتخب شدہ شخص تمام عمر حاکم رہتا ہے اور کیا اس کے بعد اس کی اولاد تخت نشیں نہیں ہوتی ؟" عمر نے پھر استفسار کیا ۔

" نہیں ! حاکم کا انتخاب ہر سات برس بعد ہوتا ہے۔ اور اس حکومت کے آئین کے مطابق اس کی اولاد اس کی جانشیں نہیں ہوتی۔ بلکہ عوام جب چاہیں حاکم کو بدل سکتے ہیں ۔" راہ گیر اتنا کہہ کر آگے بڑھ گیا ان سب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ انھیں اپنے اندر خوشی کی کرنیں پھوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ سب کہنے لگے :

" دوستو ! کیا ہم نے اپنے ملک میں اسی طرح کی حکومت کا نفاذ نہیں چاہا تھا ؟ شاید ہم صحیح ملک میں پہنچ گئے ہیں۔ اگر یہاں کی حکومت نے اجازت دے دی تو یہیں مستقل قیام کریں گے ۔"

وہ سب عوامی حکومت کے نام سے اس قدر خوش ہوئے کہ انھیں اس بات کا خیال ہی نہ رہا کہ اپنی اشتہا مٹانے کے لیے بستی کی سمت آئے تھے، اُن کا شوقِ دیدارِ شہر لمحہ بہ لمحہ بڑھتا گیا اور پھر سب نے اس بات پر اتّفاق کیا کہ ہم سب اوّل وقت میں اس شہرِ متقدس کی زیارت کریں کہ جس میں عوام کی حکومت ہے اور اس فیصلے کے بعد وہ شہر کے ایک راستے پر بہ ہمراہِ حیرت و استعجاب چلنے لگے ۔ تھوڑی دُور چلے تھے کہ شہر کے ایک راستے سے ایک جلوس آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ ٹھہر کر جلوس کا انتظار کرنے لگے ۔ جلوس میں شامل افراد حاکمِ وقت کے خلاف آوازیں بلند کر رہے تھے ، اُسے دغاباز اور فریبی کہہ رہے تھے ۔ وہ بھی جلوس کے ساتھ ہو لیے ۔ اور اس بات سے خوش تھے کہ بعد مدت کے ایسا ملک دیکھا ہے کہ جس میں ہر شخص کو ہر بات کہنے کی آزادی ہے، وہ بات خواہ حاکمِ وقت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ جب وہ مجمع ایک میدان میں ٹھہر گیا تو اُن میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور یوں گویا ہوا :

" دوستو ! آج پھر وہ وقت آگیا ہے کہ ہم سب موجودہ حاکم کے خلاف عَلمِ بغاوت بلند کریں ۔ کیا بوقتِ انتخاب حاکمِ وقت سے تمھاری توقعات یہی تھیں جو آج تم دیکھ رہے ہو ؟ کیا اس حاکم نے تم سے کیے ہوئے وعدوں کو پورا کیا ؟ کیا تم نے جو کچھ اس سے مانگا تھا تمھیں ملا ؟ پھر تم کیسے کہتے ہو کہ اس ملک میں عوام کی حکومت ہے ۔"

طلحہ بن عبید نے اپنے پاس کھڑے ہوئے ایک شخص سے دریافت کیا۔

" اے عزیز یہ شخص کون ہے ؟"

اُس نے جواب دیا ۔

" اے برادر یہ بھی اُن لوگوں میں سے ایک ہے جو عوام کا نمائندہ بن کر اس ملک پر حکومت کرنا چاہتے ہیں ۔ یہ حاکمِ وقت کے حریفوں کی صف کا ایک آدمی ہے ۔"

" تو کیا عوام اسے پسند کرتے ہیں ؟" زید بن حارث نے سوال کیا ۔

" کچھ عرصہ پہلے عوام نے اسے ایک ریاست کا حاکم منتخب کیا تھا۔ لیکن یہ حاکمِ اعلیٰ کا ہمراے نہیں تھا۔ اسی لیے اُس نے

اپنے اقتدار کا بے جا استعمال کیا اور اسے اپنے عہدے سے برطرف کر دیا۔"

"کیا عوام کی رائے کے بغیر ایسا کیا جا سکتا ہے" عمر نے معلوم کیا۔

"یہاں عوام کو سات برس بعد اپنی رائے دینے کا حق حاصل ہے۔ اس کے درمیان منتخب شدہ حاکم اپنی رائے کو برتر اور بہتر سمجھتا ہے۔"

اجنبی کا یہ جواب پاکر زید کے ساتھی ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ تقریر اب بھی جاری تھی۔ یہاں تک کہ اس شخص کی اشتعال انگیز باتوں کو سُن کر مجمع مشتعل ہوگیا اور ان کی زبانیں زہر اُگلنے لگیں۔ اسی لمحہ حاکمِ وقت کی فوج کے سپاہیوں نے اُس ہجوم پر حملہ کر دیا۔ ہجوم منتشر ہوگیا۔ لوگ زخمی ہو ہو کر گرنے لگے۔ سینکڑوں لوگ گرفتار کیے گئے۔ اُن چاروں نے بھی اپنے لیے جائے پناہ تلاش کی۔ اسی وقت پورے شہر میں نظر بندی کا اعلان کر دیا گیا۔ کوئی شخص اپنے گھر سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ فوج راستوں پر تعینات تھی۔

طلحہ اور اس کے ساتھیوں نے جب اپنے سروں پر آسمان کے بجائے ایک مکان کی چھت دیکھی تو زید بن حارث سے پوچھا کہ وہ اسے بڑا مانتے تھے۔

"اے حارث کے بیٹے ہم کس مقام پر ہیں۔ کیا ہم نظر بند کر دیے گئے ہیں؟"

"ہم اس وقت کسی کے مکان میں ہیں اور شاید آفاتِ شہر کا شکار ہو کر نظر بند ہو گئے ہیں۔" زید اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا تھا ——— کچھ دیر بعد ہی ایک شخص اُن کے قریب آیا اور استفسار کیا۔

"دوستو تم لوگ کون ہو اور یہاں کیونکر پہنچے ہو؟"

"اے عزیز ہم تمھارے شہر میں اجنبی ہیں اور نظر بندی کے نفاذ کے اعلان کے بعد پناہ کی تلاش میں یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ کیا تم ہمیں پناہ دوگے؟" ابو سعد نے اپنا حال بیان کیا۔

اُس شخص نے اُن چاروں کے ساتھ بہتر سلوک کیا اور اپنے دسترخوان پر کھانا کھلایا، وہ چاروں اُس کے اس سلوک سے خوش ہوئے اور اُس کا شکرادا کرتے ہوئے کہنے لگے:

"اے مہربان! ہم تمھارے شکر گزار ہیں کہ تم نے ہمیں پناہ دی اور اپنے دسترخوان پر کھانا کھلایا ——— اے محسن اب تم کوئی تدبیر کرو کہ ہم یہاں سے نکل سکیں۔"

"تم ایسے ہنگامی حالات میں کہاں جاؤگے ——— کہ تم سب مسافر ہو۔ ایسا نہ ہو کہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ۔ مجھے اپنا دوست جانو اور اس غریب خانے میں اُس وقت تک قیام کرو، جب تک حالات معمول پر نہ آجائیں۔" صاحبِ خانہ کے اس جواب پر سلسلۂ مشورہ اُن لوگوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اس بات پر اتفاق کیا کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ یہاں قیام کریں۔ اور اس فیصلے کے بعد انھوں نے آرام کیا اور روزِ فردا صاحبِ خانہ سے پوچھا:

"اے برادرِ عزیز کیا تم اپنے مُلک اور یہاں کی حکومت کے بارے میں کچھ بتاؤگے۔" صاحبِ خانہ نے بہ نظرِ غور اُن چاروں کو دیکھا اور اپنے شک کا اظہار کیا۔

"دوستو کیا تم میرے اس شک کو دُور کر سکوگے کہ تم کسی ملک کے جاسوس ہو۔"

وہ سب حیران و پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے، انھیں خاموش دیکھ کر صاحبِ خانہ نے کہا:

"تم اس وقت میرے مہمان ہو اور میں نہیں چاہوں گا کہ میری کسی بات سے تمھیں تکلیف پہنچے۔ مجھے یہ شک اس لیے گزرا کہ حاکمِ وقت مُلک میں ہونے والے ہر حادثے کا الزام غیر ملکوں پر عائد کرتا ہے۔"

"وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟" عمر نے سوال کیا۔

"اس سے وہ خود بے گناہ ثابت ہو جاتا ہے ——— تم لوگوں کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ یہاں ہر شخص دو چہرے رکھتا ہے۔ ایک سیاہ اور ایک سفید ——— سفید چہرہ لے کر وہ سب کے سامنے آتا ہے اور سیاہ سے پس پشت بات کرتا ہے۔"

"ایسا کیوں ہے؟" طلحہ نے معلوم کیا۔

"یہ بات ابھی تک قابلِ غور ہے اور کوئی شخص اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکا کہ اس ملک کے لوگ دو چہرے کیوں ہیں۔" صاحبِ خانہ

نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ طلحہ نے پھر پوچھا :

" کیا اس کی کوئی مثال پیش کر سکتے ہو؟"

" یہاں ہر شخص اس کی مثال ہے۔ یہاں کا حکمراں طبقہ جو عوام کا منتخب کردہ ہے جب عوام کے رُوبرو آتا ہے تو اتنا عاجز ور منکسر ہوتا ہے جیسے عوام اس کا خدا ہے اور جب وہ کرسیِ اقتدار پر جلوہ افروز ہوتا ہے تو عوام کے سینے میں چھُرے بھونکتا ہے۔ تمھیں یاد ہوگا کہ روزِ گزشتہ عوام کے ایک نمائندے کی وجہ سے کتنے لوگوں کی جانیں گئیں۔ کل وہ حاکمِ وقت کے خلاف زہر اُگل رہا تھا۔ اور آج وہ دیکھو حاکمِ وقت کی مدح میں قصیدے پڑھ رہا ہے۔"

اُن سب نے دروازے کے باہر جھانکا۔ صاحبِ خانہ سچ کہہ رہا تھا، زید نے پوچھا :

" ایسا کیوں کر ہوا؟"

" میرے عزیز میں نے کہا کہ یہاں سب دو چہرہ لوگ ہیں آج جو میرے ساتھ ہے، ہو سکتا ہے وہ کل میرے ساتھ نہ رہے یہاں لوگ بِک جاتے ہیں۔ یہاں کا حاکم عوام کے نمائندے نہیں چاہتا۔ بلکہ اپنے ہمخیال چاہتا ہے۔ یہاں عوام کے نام پر حکومت کی جاتی ہے۔"

صاحبِ خانہ کی ان باتوں کو سُن کر وہ سب کچھ سوچنے لگے اور بہت دیر تک سوچتے رہے۔ کچھ دیر بعد عمر نے پوچھا :

" دوستو! کیا تم سب بھی وہی سوچ رہے ہو، جو بات میں سوچ رہا ہوں۔"

انھوں نے پوچھا :

" تم کیا سوچ رہے ہو؟"

" میں سوچ رہا ہوں کہ یہاں کے لوگ دو چہرہ کیوں ہیں؟"

" ہاں عمر ہم سب بھی یہی سوچ رہے ہیں۔"

" کیا یہ اس بات کا ردِ عمل . . . " طلحہ نے اتنا کہا تھا کہ زید بن حارث نے اُسے اشارے سے روک دیا۔ صاحبِ خانہ نے سب کو عالمِ محویت میں دیکھ کر معلوم کیا :

" ساتھیو کیا میں تم لوگوں کے بارے میں کچھ جان سکتا ہوں؟"

وہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ زید بن حارث نے کہ اُن سب میں بڑا تھا کہا :

" عزیزو یہ شخص بڑا مہربان اور محسن ہے۔ اس سے کچھ پوشیدہ رکھنا گُناہ کا باعث ہوگا۔"

زید کی بات سے سب نے اتّفاق کیا پھر طلحہ بن عبید نے یوں بیان کیا۔

" اے برادر کچھ عرصہ پہلے ہم نے اپنے ملک کے بادشاہ کے ظلم سے تنگ آکر اپنا شہر چھوڑ دیا تھا۔ ہم لوگ اپنے ملک میں عوام کی حکومت چاہتے تھے۔ اسی جرم میں بہت سے لوگ قید خانوں میں ڈال دیے گئے۔ ہم چاروں نے قید سے بچنے کے لیے راہِ فرار اختیار کی۔ کچھ روز اِدھر اُدھر گھومتے رہے اور پھر ایک غار میں پناہ لی۔ ہمارے جسم تھکن سے بوجھل ہو گئے تھے۔ اس لیے ہم پر غفلت طاری ہو گئی اور ہم سو گئے۔ دوسری صبح آفتاب کی کرنوں نے ہمیں بیدار کیا۔ اور جب ہمیں بھوک لگی تو ہم تمھارے شہر میں پہنچ گئے کہ ہمارے پاس دینار موجود تھے۔" طلحہ نے اپنی جیب سے چند سکّے نکال کر اُس شخص کے روبرو کیے، اُس شخص نے وہ سکّے دیکھے اور ہنسنے لگا۔ وہ سب حیران ہوئے کہ اس کی ہنسی کا سبب کیا ہے۔ وہ اپنی ہنسی کو روکتے ہوئے پوچھنے لگا : " تمھارے ملک کا نام کیا ہے؟"

" ہم بلقان کے رہنے والے ہیں۔" عمر کے اس جواب سے صاحبِ خانہ اور زور سے ہنسنے لگا۔ زید نے پوچھا :

" اے عزیز تمھاری ہنسی کا باعث کیا ہے؟"

اُس نے کہا :

" تم لوگ مجھ سے مذاق کر رہے ہو یا جھوٹ بول رہے ہو — تم اس وقت جس ملک میں ہو، اس کا نام بلقان ہے اور یہ سکّے اسی ملک میں تین سو برس پہلے رائج تھے۔"

صاحبِ خانہ کی اس بات پر وہ سب چونک پڑے۔ ان کی حیرانی اور پریشانی بڑھ گئی، ابو سعد نے متعجبانہ انداز میں پوچھا :

" ساتھیو کیا ہم تین سو برس تک اُس غار میں سوتے رہے؟"

" لیکن یہ کس طرح ممکن ہے؟" عمر نے حیرانی ظاہر کی۔

" خدا ہر چیز پر قادر ہے۔" زید بن حارث خود حیران تھا۔

صاحبِ خانہ ان کی یہ باتیں سُن کر خوش ہوا اور عقیدتمندانہ اُن کے روبرو آیا اور کہنے لگا :

" شاید تم ہی وہ لوگ ہو جن کا انتظار میں کئی برسوں سے

کر رہا ہوں۔"

"تمھارے انتظار کی وجہ کیا ہے؟" طلحہ نے معلوم کیا۔

"کئی برس پہلے ایک بزرگ نے یہ کہا تھا کہ کچھ عرصے بعد چار نوجوان آئیں گے اور وہ بتائیں گے کہ اس ملک کے لوگ دو چہرہ کیوں ہیں۔ ہمارے شہر کی ایک جماعت بہت دن سے آپ لوگوں کی منتظر ہے میں اُن سب کو یکجا کرتا ہوں تاکہ آپ کی باتیں سُن سکیں"——

صاحبِ خانہ کا اضطراب بڑھتا گیا۔

"ٹھہرو ابھی کچھ دیر توقف کرو۔ ابھی اس شہر کے حالات ٹھیک نہیں۔ ہم آج شام کو اس غار کی طرف لوٹ جائیں گے۔ تم کل صبح اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں آنا۔" زید نے اُسے روکا——

صاحبِ خانہ نے ضبط کیا۔

دوسرے دن علی الصبح غار کے دہانے پر لوگوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ چاروں طرف امن قائم رکھنے کے لیے فوج تعینات تھی۔ وہ چاروں غار کے اندر حیران و پریشان بیٹھے تھے کہ یا خدا یہ کیسا عذاب ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ شخص کہ جس کے مکان میں وہ مہمان رہے تھے آیا اور کہنے لگا:

"حضرات، باہر لوگ بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

پہلے تو اُن لوگوں نے تامل کیا پھر چاروں اُس کے ساتھ باہر آئے اور مجمع کا جائزہ لیا۔ سبھی کے چہروں سے اشتیاق ظاہر ہو رہا تھا۔ زید بن حارث نے آگے بڑھ کر یوں بیان شروع کیا:

"دوستو ہم بھی تم جیسے اور تمھارے ملک کے رہنے والے ہیں۔ لیکن یہ خدا کی عجیب قدرت ہے کہ اُس نے تین سو برس ہمیں عالمِ خواب میں رکھا جبکہ ہمیں ایسا لگتا ہے کہ ہم صرف ایک رات سوئے ہیں۔"

تمام مجمع پر سکوت طاری تھا۔ زید کہہ رہا تھا:

"تین سو برس پہلے ایک خاتون اس ملک کی بادشاہ تھی۔ جس کے ظلم اور جبر سے ہر شخص پریشان تھا۔ وہ صرف اسی امیر کو پسند کرتی تھی جو اُس کے سامنے زبان بند کیے، سر جھکائے بیٹھا رہے۔ ایک مرتبہ ملکہ نے عزیزِ مصر کی طرح خواب دیکھا کہ سات موٹی گائیں ایک میدان میں آئیں۔ پھر سات کمزور گائیں آئیں۔ موٹی گائیں کمزور گائیوں کو کھا گئیں۔—— ملکہ یہ خواب دیکھ کر پریشان ہوئی اور ہر ایک سے اُس کی تعبیر پوچھی، لیکن کوئی نہ بتا سکا۔ پھر ایک بزرگ نے کہ جو ہمیشہ سچی تعبیر بتاتا تھا کہا کہ یہ سات موٹی گائیں سات سال ہیں۔ ان سات سالوں میں خوب غلّہ پیدا ہو گا۔ پھر سات کمزور گائیں یعنی سات سال ایسے آئیں گے کہ ان میں قحط پڑے گا۔ اگر ملکہ پہلے سات سالوں میں خوب غلّہ اکٹھا کروالیں تو اگلے سات سال آرام سے گزریں گے——ملکہ نے کہ خود کو سب سے دانش مند سمجھتی تھی۔ اس تدبیر کو تسلیم نہ کیا اور خود کوئی نئی تدبیر سوچنے لگی۔ اُس ملکہ کے ایک نوجوان بیٹا بھی تھا کہ جس نے ماں کو مشورہ دیا:

"اے والدۂ محترمہ میرے ذہن میں ایک تدبیر ہے کہ جس پر عمل کرنے سے ہمارا ملک قحط کی بلا سے بچ جائے گا۔"

ملکہ اپنے فرزند کی لیاقت پر خوش ہوئی اور کہنے لگی:

"بیان کر۔"

"اے ملکہ معظمہ اگر ملک کے سبھی مردوں کی رگِ افزائشِ نسل قطع کر دی جائے تو ہمارے مُلک کی آبادی بڑھنے سے رُک جائے گی اور سات سال بعد اس سے بھی کم لوگ ہمارے ملک میں رہ جائیں گے۔ جب آبادی کم ہو گی تو غلّہ کم خرچ ہو گا اور اگلے سات سال میں ہم پریشان نہ رہیں گے۔"

عورت کہ آدم تا ایں دم ناقص العقل سمجھی گئی ہے۔ اپنے بیٹے کی اس بات پر خوش ہوئی اور اس نے پورے ملک میں اعلان کرا دیا کہ ملک کے تمام مردوں کی رگِ افزائشِ نسل قطع کر دی جائے تاکہ ہمارے ملک میں آئندہ سات سال کوئی بچّہ پیدا نہ ہو۔ اس حکم پر فوری عمل کیا گیا۔ بالآخر نتیجہ یہ ہوا کہ آبادی کم ہونے لگی اور پھر آبادی کا بڑا حصّہ قحط کے سات سالوں کی نذر ہو گیا۔ اب ملکہ کو فکر ہوئی کہ اگر یہ بچی ہوئی عورتیں اور مرد بھی ختم ہو گئے تو ملک ختم ہو جائے گا۔ وہ بقیہ مرد اس لائق نہیں تھے کہ بقیہ عورتوں کی سوکھی ہوئی کھیتیوں میں ہریالی لا سکیں۔ بہت غور و خوض کے بعد ملکہ اس نتیجے پر پہنچی کہ دوسرے ملکوں سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنے یہاں کے مرد یہاں بھیجیں تاکہ ہمارے یہاں کی عورتیں اُن سے مل کر بچّے پیدا کر سکیں، بمشکل ایک ملک اس کے لیے تیار ہوا——اُس دوسری قوم کے مردوں سے اختلاط کے بعد یہاں کی عورتوں نے جو بچّے پیدا کیے وہ سب دو چہرہ تھے۔ دوسری قوم کے مردوں نے افزائشِ نسل کے لیے خاصا معاوضہ

صول کیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ معاوضے کی ادائیگی کے بعد پیدا ہونے
الی نسل آج بھی معاوضہ پاکر اپنا ضمیر بیچ دیتی ہے ـــــــ اپنے
لک کے بادشاہ کے ظلم سے بچنے کے لیے ہم چودہ برس تک ملک سے
ہر رہے اور پھر جب ایک غار میں پناہ لی تو خدا نے ہماری آنکھوں پر
دہ ڈال دیا جس سے ہم تین سو برس تک سوتے رہے ـــــــ اور
ب اپنے ملک میں عوامی حکومت دیکھ کر خوش ہوئے کہ تین سو برس
بل ہم جس طرح کی حکومت چاہتے تھے وہ ہمارے ملک میں آچکی ہے
جس میں ہر شخص کو ہر بات کہنے کی آزادی ہے۔"

زید بن حارث نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ لوگوں نے انھیں اپنے کاندھوں پر اُٹھا لیا اور بآوازِ بلند نعرے لگانے لگے، اُن چاروں کے لیے بے پناہ عقیدت ظاہر کی۔

سارے مجمع میں اشتعال پیدا ہو گیا۔ اُسی وقت حاکمِ وقت کی طرف سے فوج کو حکم ملا کہ اِن چاروں یادہ گو اور دیوانے نوجوانوں کو گرفتار کر لیا جائے، ان کی آزادی امن کے لیے خطرہ ہے۔

(اُردو اکادمی، دہلی کے افسانہ سیمینار/ورکشاپ میں پڑھا گیا)

"... پائے والوں کی طرف، جامع مسجد کے پھلواری والے چبوترے کے نیچے۔ پٹڑی پر جہاں اور کوئی دوکاندار نہیں بیٹھتا تھا۔ شام کے پانچ چھ بجے ایک کبابی صاحب دوکان لگایا کرتے تھے اور رات کے بارہ ایک بجے تک کباب بیچتے تھے۔ ان کا نام مجھے معلوم نہیں۔ چچا کبابی کہلاتے تھے ـــــــ چچا کبابی غدر ۱۸۵۷ء کے دس بارہ سال بعد پیدا ہوئے ہوں گے اور غدر ۱۹۴۷ء سے چند سال قبل انتقال کر گئے ـــــــ ایک دفعہ میری موجودگی میں تیرہ چودہ برس کا ایک لڑکا آیا اور بولا "چار پیسے کے کباب دے دو۔" چچا کبابی نے کہا: "نہیں بھائی! میں تجھے کباب نہیں دوں گا۔" اب وہ لڑکا سر ہو رہا ہے اور خوشامدیں کر رہا ہے اور چچا کبابی انکار پر انکار کیے جا رہے ہیں۔ جب بہت دیر اس حجت بازی میں گزر گئی تو میں نے ہمت کر کے پوچھ لیا: "چچا کیا بات ہے اسے کباب کیوں نہیں دے رہے؟" کہنے لگے: "میاں! یہ پیسے چرا کر لاتا ہے۔ گھر سے لاتا ہو یا کہیں اور سے۔ روز چار پیسے کے کباب کھا جاتا ہے یہیں بیٹھ کر۔ دیکھو نا اس کی صورت۔ جا بیٹا جا۔ عادت کہیں اور جا کر بگاڑ۔ میں چار پیسے کی خاطر تجھے تباہی کے راستے پر نہیں لگاؤں گا۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ تیرے ماں باپ چار پیسے روز تجھے کباب کھانے کے واسطے دیتے ہوں گے..."

ـــــــ مُلّا واحدی دہلوی

(چچا کبابی دلّی والے)

غزلیں

شاہد ماہلی

بُوئے پیراہنِ وفا آئے
کھڑکیاں کھول دو ہوا آئے
منزلیں اپنے نام ہوں منسوب
اپنی جانب بھی راستا آئے
جلتے بجھتے چراغ سا دل میں
آرزوؤں کا سلسلہ آئے
خامشی لفظ لفظ پھیلی تھی
بے زبانی میں کچھ سُنا آئے
رنگ بے رنگ منظروں سے پرے
ایک بے نام سی صدا آئے
ڈوب کر ان اُداس آنکھوں میں
اک جہانِ طرب لُٹا آئے
دل میں رہ رہ کے اک خلش اُٹھے
بے سبب اک خیال سا آئے

دردِ پنہاں نہ اب سہا جائے
اور کہہ دیں تو سب مزا جائے
ڈھل گیا ہے ورق ورق دل کا
کچھ نہ لکھا نہ کچھ پڑھا جائے
لفظ گونگے ہیں حرف بکھرے ہیں
کیا کہا جائے کیا سُنا جائے
ایک اک شہر، شہر کوفہ و شام
اب کہاں دشتِ کربلا جائے
لوگ ٹھہرے ہوئے ہیں بُت بن کر
منزلیں آئیں راستا جائے
کھو گیا کون ان فضاؤں میں
کس کو ہر لمحہ ڈھونڈتا جائے
یہ بجھی شام، یہ اُداس سی رات
تو جو آ جائے جگمگا جائے

”۔ ۔ ۔ ایک روایت کے مطابق جب کیوپڈ کی ماں زہرہ جذبۂ شوق سے مغلوب ہوکر اپنے عاشق سے ملنے کے لیے تیز تیز قدموں سے چل کر کسی گھنے کُنج سے گزر رہی تھی تو اس کے پیروں میں کانٹا چُبھ گیا۔ اس کی وجہ سے جو قطرۂ خوں نکلا وہ گلاب کا پودا بن گیا۔ ۔ ۔“

ابو شعیب احسن

تذکرہ گلابوں کا

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

بچپن میں غالب کا یہ شعر جھوم جھوم کر پڑھتے تھے اور گل سے مراد انواع و اقسام کے پھول سمجھتے تھے۔ اردو زبان میں اشارہ، کنایہ، تمثیل سبھی کے لیے گل اور گلاب کا استعمال ہوتا ہے۔ میرے خیال میں عوامی سطح پر گل کے معنی پھول کے ہیں اور گلاب ایک مخصوص پھول ہے جس کا ہم آج ذکر کرنے جارہے ہیں لیکن فارسی میں گلاب کے معنی گلاب کا عرق ہیں۔ اور ہندوستانی اور ہندی میں لفظ گلاب، گلاب کے پھول کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ کنایتاً فارسی میں گلاب محبوب کے آنسو یا رخسار پر پسینے کی بوند کو بھی کہتے ہیں۔ گل چہرہ، گل رُخ، گل رنگ جیسے بہت سے مرکبات سے بھی ہم آشنا ہیں۔ اسی طرح گلبرگ کے معنی گلاب کی پنکھڑی جس سے محبوب کے ہونٹ بھی مراد لیے جاتے ہیں۔

گل، گلاب کی تاریخ :

فرانسیسی شاعر والٹر دی لامیئر (WALTER DE LAMARE) نے کہا ہے کہ کسی انسان کو نہیں معلوم کہ گلاب کی تاریخ اور اس کی کہانی کتنی ان گنت صدیوں سے شروع ہوتی ہے اور یہ امر واقع ہے کہ کچھ ہی دنوں پہلے تک اس کا علم دُنیا میں کسی کو نہیں تھا کہ گلاب کی کہانی کب سے اور کہاں سے شروع ہوئی ہے لیکن آخر کار خود زرِ گل یا گلاب کے زردانوں (POLLEN) نے فطرت کے اس راز سے پردہ اُٹھا دیا جو پتھروں کے اندر فاسل (FOSSILے) کی شکل میں محفوظ ہوگئے (فاسل کی تعریف یہ ہے کہ کسی بھی جاندار، درخت یا پودے کا پورا وجود یا اس کا کوئی حصّہ پتّھر میں تبدیل ہوجائے اور زمین کے طبقات میں محفوظ ملے جس سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ کسی گزشتہ زمانے سے اس کا تعلق ہے) گلاب کے زردانوں کے فاسل اپنے خودرو جدِّ امجد کی داستان کو تین کروڑ پچاس لاکھ سال پیچھے لے جاتے ہیں۔ گلاب کتنا قدیم ہے اس کا اندازہ آپ کو اس بات سے ہوسکتا ہے کہ سائنسی اعتبار سے (مذہبی عقائد سے قطع نظر) ہم انسانوں کے جدِّ امجد کی تاریخ اس دُنیا میں بمشکل پچپن لاکھ سال پرانی ہے لہٰذا گلاب کے مقابلے میں ہم انسانوں کی سائنسی تاریخ زمانۂ ماضی میں بہت قریب ہے۔

کب اور کہاں گلاب کی شروعات ہوئی اس کا علم ابھی تک انسان کو نہیں ہوسکا ہے۔ لیکن یہ بات قطعی طور پر معلوم ہوچکی ہے کہ گلاب کا پودا

راجہ رام موہن رائے

کرۂ شمالی میں ہر جگہ خودرَو شکل میں پایا جاتا تھا لیکن خطِ استوا کے جنوبی کُرّے میں گلاب نہیں پایا جاتا تھا اور اس کے لیے گلاب کو انسان کا احسان مند ہونا پڑا۔

اس بات کو ہم جانتے ہیں کہ اوائلِ زندگی میں انسان اپنی غذا خودرو پھلوں، پھولوں، پتیوں سے یا جانوروں کا شکار کر کے فراہم کرتا تھا اور اس کے لیے وہ خانہ بدوشوں یا بنجاروں کی زندگی گزارتا تھا اور کسی ایک مقام پر مستقل رہائش اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ دس ہزار سال پہلے انسان نے پہلی بار دجلہ و فرات اور نیل کی وادی میں کاشت کی ایجاد کی اور اس ایجاد کے نتیجے میں جس کا سہرا مردوں کے نہیں عورتوں کے سر ہے، انسان نے خانہ بدوشی کی زندگی چھوڑ کر ایک مقام پر مستقل رہائش اختیار کرنا شروع کی۔ اب ایک انسان تقریباً سو انسانوں کی غذائی ضروریات کے لیے اناج پیدا کر لیتا تھا۔ اس زرعی پیداواری انقلاب نے آغاز کے علمی، تجارتی، سماجی اور قانونی اداروں کی بنا ڈالی اور مجموعی طور پر انسانی زندگی میں ایک زبردست انقلاب آیا جسے ہم تہذیب و تمدن کا نام دیتے ہیں۔ اس انقلاب کے بعد انسانوں نے بستیاں بسائیں، مکانات بنائے اور اپنی بستیوں کو وہ ایک مدافعتی دیوار سے گھیر لیتے تھے تاکہ خارجی حملہ آوروں سے اپنے کو محفوظ رکھتے ہوئے اپنے تعمیری کاموں میں مصروف رہیں۔ پھر انسان فنونِ لطیفہ کی طرف مائل ہوا۔ اوائلِ تاریخ کی انسانی تہذیب کے پس منظر میں ہم اس بات کی اُمید کر سکتے ہیں کہ عہدِ عتیق کی مصوّری یا داستانوی بیان سے ہم گلاب کے بارے میں کچھ جان سکیں۔ بہرحال یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ پہلے پہل گلاب کی کاشت اُن گلابوں سے ہی شروع ہوئی ہوگی جو انسانی بستیوں کے اردگرد پائے جاتے تھے۔ ایسے گلابوں کی نوع یا نسل (SPECIES) کی مجموعی تعداد تقریباً ایک سو پچاس ہے لیکن ان کی قسمیں لاکھوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ نسل و نوع کی تعریف یہ ہے کہ کوئی جاندار شئے خواہ وہ جانور ہو یا پودا اپنی حیاتیاتی بنیادی ساخت میں دوسری نوع و نسل سے مخلوط و مشترک نہ ہو بلکہ مختلف ہو گو ظاہری شکل رنگ، روپ، خوشبو اور ساخت میں ایک دوسرے کے مماثل ہی کیوں نہ ہو۔ مندرجہ بالا گلابوں کی ظاہری ساخت ایک دوسرے سے اس قدر مماثل ہے اور ان کی جائے روئیدگی بھی اس قدر مشترک ہے کہ ان میں سے بہتوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنا اور پہچاننا ممکن نہیں۔

گلاب کی کاشت کس عہد میں شروع ہوئی؟ اس کا علم یقینی طور پر ابھی تک نہیں ہو سکا ہے۔ بہرحال قبل مسیح سے قدیم زمانوں میں گلاب کا ذکر دیو مالا، اساطیر، شاعری اور مصوّری میں ملتا ہے۔ یہ خیال اغلب ہے کہ حضرتِ مسیح سے قبل گلاب کی کاشت نہیں ہوتی تھی۔ بائبل میں گلاب کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ بلاشبہ لفظ 'گلاب' (ROSE) کا ذکر دو بار کیا گیا ہے، مگر بعد کی تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ یہ لفظ نرگس کے پھول کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

(ISAIAH 35 : 1 SONG OF SOLOMON 2 : 1)

میسوپوٹامیا (موجودہ عراق) کی تہذیب میں جس کی تاریخ بہت قدیم ہے، گلاب کی کاشت کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ کچھ زیورات پر پھولوں کی تصاویر ضرور ہیں لیکن یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ گلاب کی ہیں۔ اسی طرح مصر میں وادیٔ نیل کی قدیم تہذیب میں بھی گلاب کا ذکر نہیں ہے۔ ۱۴۵۰ قبلِ مسیح میں فرعون تھٹ موز ثانی (THUT MOSE II) سیریا میں کامیابی کے بعد دو سو پچاس درخت اپنے ساتھ لایا تھا۔ جن میں گلاب کا بھی ذکر ہے اور اس کی تصاویر بھی ہیں مگر موجودہ نباتیات کے ماہران گلابوں کو پہچاننے سے قاصر ہیں۔ لیکن یونان میں گلاب کی ایک ایسی تصویر ملتی ہے جو ساڑھے تین ہزار سال پرانی ہے۔ ہومر (HOMER) کی ایلیڈ اور اُڈیسی (ILLIAD AND ODESSEY) میں روغنِ گلاب کا ذکر ملتا ہے اور دوسرے یونانی مخطوطات میں روغنِ

گلاب کی تجارت کے اعداد وشمار بھی پائے جاتے ہیں۔

ہندوستان میں گلاب خود رو شکل میں ہمالیہ کے پہاڑوں اور ترائی کے علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ جہاں تک اس کی کاشت کا سوال ہے اس کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں۔ گرچہ بی۔ ایس بھٹاچارجی کا خیال ہے کہ ہندوستان میں زمانۂ قدیم سے گلاب کی کاشت ہوتی تھی۔ انھوں نے بہت سی سنسکرت کی پرانی کتابوں کا حوالہ دیا ہے مثال کے طور پر تروُنی پُشپا۔ آتی کنجولا اور سیمنتیکا۔ مغلوں کا جمالیاتی ذوق بہت بلند تھا اور وہ گلاب کے پھول کی قدر کرتے تھے۔ ملکہ نور جہاں کو گلاب کے عطر کی ایجاد کا اعزاز دیا جاتا ہے۔ زمانۂ حال میں گلاب کی پیداوار پر توجہ دی گئی ہے اور گلاب کی نئی قسمیں یورپ اور امریکہ سے درآمد کی گئی ہیں۔

شاعری میں گلاب کا ذکر پہلی بار یونان کی شاعرہ سیفو (SAPPHO) نے ۶۰۰ قبل مسیح میں کیا ہے اور اسی شاعرہ نے گلاب کو پھولوں کی ملکہ کا خطاب دیا ہے جبکہ ہماری ہندوستانی زبانوں میں گلاب کو پھولوں کا راجہ کہتے ہیں۔ اس شاعرہ کے بعد بہت سے یونانی شاعروں نے گلاب کا ذکر بار بار کیا۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں شاعر اینکریان (ANECREON) نے ان لفظوں میں خراج عقیدت گلاب کو پیش کیا ہے: "گلاب دیوتاؤں کی خوشبو ہے: انسان کی فرحت اور خوشی محبت کے جوان ہونے پر گلاب اس میں اور نکھار لاتا ہے۔ اور یہ زہرہ کا پسندیدہ پھول ہے۔"

یونان کے مشہور مورخ ہیروڈوٹس (HERODOTUS) نے اپنی تصنیف پیریڈیکاس آف میکےڈان (PERIDICCAS OF MACEDON) میں ایسے گلاب کا ذکر کیا ہے جس میں ساٹھ پنکھڑیاں ہوتی تھیں لیکن اس کا یہ بیان مبالغے پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ وہ سیر و سیاحت کا بہت شوقین تھا لہٰذا یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے یہ گلاب ایشیائے کوچک میں دیکھے ہوں گے۔ بہرحال اس کا یہ بیان اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس نے پہلی بار گلاب کی کاشت کا ذکر کیا۔

ارسطو کے مشہور شاگرد تھیوفرسٹس (THEOPHARASTUS) نے اپنی کتاب 'درختوں پر تحقیق' (INQUIRY INTO PLANTS) میں گلاب کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ اس کا مختصر اقتباس درج ذیل ہے:

"۔ ۔ ۔ گلابوں کی بہت سی قسمیں ہیں جو ایک دوسرے سے رنگ کی خوبصورتی، خوشبو اور ساخت میں مختلف ہوتی ہیں۔ زیادہ تر گلابوں میں پانچ پنکھڑیاں ہوتی ہیں لیکن کچھ میں بارہ یا بیس بھی ہوتی ہیں اور لوگ کہتے ہیں کہ گلاب کی کچھ قسمیں ایسی بھی ہیں جن میں سو پنکھڑیاں ہوتی ہیں۔ ان گلابوں کی باغبانی ہوتی ہے۔ کچھ قسموں میں خوشبو نہیں ہوتی اور کچھ بڑے ہوتے ہیں اور بہت زیادہ خوشبودار ہوتے ہیں۔ عموماً جیسا کہا گیا ہے خوبصورت رنگ اور خوشبو ہر جگہ کی مٹی اور آب و ہوا پر منحصر ہے اور کچھ گلاب بجائے پودے کے جھاڑیوں کی شکل یعنی گلاب کی بیلوں کی شکل میں پائے جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ خوشبودار گلاب سائیرین (CYRENE) میں پائے جاتے ہیں۔ گلاب کی کاشت اس کے بیج کے ذریعے بھی کی جا سکتی ہے۔"

قصہ کہانی، دیومالا اور اساطیر میں گلاب کا ذکر:

بسیٹی (BASSITY) نے ہندو دیومالا کی ایک خوبصورت

سری نواس

کہانی کے حوالے سے گلاب کی اہمیت بیان کی ہے۔ اس کہانی کے مطابق بھگوان وشنو جب اس دُنیا میں اُترے تو ایک تالاب میں اشنان کرنے لگے۔ اسی دوران کنول کی کلی کھِل اُٹھی اور اس میں سے وہاں دیوتا برہما نے نکل کر وشنو کو اپنا درشن دیا اور ساتھ ہی ساتھ پھول کی طرف اشارہ کرکے کہا یہ دُنیا کا خوبصورت ترین پھول ہے۔ وشنو نے اس بات سے اتفاق کرتے برہما سے بنتی کی کہ آئیے میں آپ کو اپنی جنّت بیکنٹھ کی سیر کرالاؤں۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے گلاب کی جھاڑی کی طرف اشارہ کیا جس میں چاندی کی مانند زرد پھول کھلا ہوا تھا اُسے دیکھ کر اور اس کی راحت بخش خوشبو سونگھ کر برہما اس قدر پرسنّ ہوئے کہ انھوں نے اپنا سر جھکالیا اور اقرار کیا کہ واقعی یہ ایسا پھول ہے جو سب پھولوں میں ہر لحاظ سے اوّلیت کا درجہ رکھتا ہے۔ سیزر کے عہد میں ہر سال ۲۳ مئی کو گلاب کا تہوار منایا جاتا تھا۔ اس دن سیزر کو گلاب کے عرق سے نہلایا جاتا تھا۔ اس کے بعد روغنِ گلاب کی مالش کرکے اس کے جسم پر گلاب کی پنکھڑیوں کا پاوڈر چھڑکا جاتا تھا۔ پھر گلاب کی مالا پہنا کر گلاب سے بھرے ہوئے تخت پر بٹھایا جاتا تھا پھر گلاب کی خوشبو سے معطر شراب کا پیالہ پیش کیا جاتا تھا اور ساتھ ہی چھت سے گلاب کا پھول اس کے سر پر لٹکا دیا جاتا جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ گلاب کے پھول کے نیچے جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب راز میں رکھا جائے۔ گلاب کے پھول کو چھت سے لٹکانے کی روایت کیوپڈ سے منسوب کی جاتی ہے جس نے خاموشی کے دیوتا ہارپوکریٹس (HARPOCRATS) کے سر پر گلاب کا ایک پھول چھت سے لٹکا کر یہ عہد کرایا تھا کہ کیوپڈ کی ماں زہرہ (VENUS) کے عشق و محبت کی داستان کو فاش نہ کریں اور اس طرح گلاب کا پھول یونان میں راز کی علامت بن گیا۔

ایک کہانی کے مطابق باغِ رضواں میں سفید گلاب کو دیکھ کر حوّا نے اس کا بوسہ لیا اس پر گلاب کا پھول ایسا شرمایا کہ اس کے چہرے پر سُرخی دوڑ گئی اور اس طرح وہ سُرخ ہوگیا۔ ایک دوسری کہانی کے مطابق رہوڈنتھے (RHODANTHE) جو بہت خوبصورت نوجوان حسینہ تھی، ایک عاشق کے پیچھا کرنے پر اس نے مندر میں پناہ لی عصمت کی دیوی نے اس حسینہ کو گلاب کے پھول میں تبدیل کر دیا جس کا رنگ اب بھی ویسا ہی گلابی ہے جیسا کہ عاشق کے پیچھا کرنے پر اس کے رخسار شرم و حیا سے سُرخ ہوگئے تھے۔ اس اساطیری کہانی کی بِنا پر شاید گلاب کے لیے یونانی لفظ روہڈاس (RHODAS) استعمال ہوتا ہے۔

مصر میں دیوی اِسِس (ISIS) کی پوجا کے لیے گلاب چڑھایا جاتا تھا۔ اپولیس کی مشہور کہانی "سنہرا گدھا" —— (APOLEIUS ; THE GOLDEN ASS) کا ہیرو لوسئیس (LUCIES) اپنے گناہوں کی سزا کے طور پر گدھے میں تبدیل کر دیا گیا جس پر وہ بہت شرمندہ رہا اور جب گناہوں کا کافی کفارہ ادا کر چکا تو دیوی نے اس کو خواب میں بتایا کہ پوجا کے لیے جو گلاب کے پھول اس پر چڑھائے جاتے ہیں ان میں سے کچھ پھول لے کر تم چبا لینا۔ ایسا کرنے پر تم دوبارہ انسانی شکل اختیار کر لوگے۔ ہدایت پر عمل کرنے سے وہ پھر سے انسانی روپ میں آگیا۔

یونانی اور رومی دیومالاؤں میں گلاب کو محبت اور حُسن کی دیوی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ زہرہ کی پیدائش، میں جو مصوری کا شہرۂ آفاق نمونہ ہے، مصور بائیسلی (BOTTICELY) نے دکھایا ہے کہ جیسے جیسے زہرہ نیلے سمندر سے ابھرتی ہے اسی کے ساتھ ساتھ گلاب کے پھول بھی اُبھرتے ہیں۔ ایک دوسری روایت کے مطابق یہ کہا جاتا ہے کہ جب زہرہ جذبۂ شوق سے مغلوب ہو کر اپنے عاشق سے ملنے کے لیے تیز تیز قدموں سے چل کر کسی گھنے کنج سے گزر رہی تھی تو اس کے پیروں میں کانٹا چبھ گیا۔ اس کی وجہ سے جو قطرۂ خوں نکلا وہ گلاب کا پودا بن گیا۔

روم کے بادشاہ نیرو (NERO) نے ایک دعوت میں چالیس لاکھ رومی سکّہ، گلابوں کے ہار بنوانے میں خرچ کیا جو آج کے تیس لاکھ روپے کے برابر ہے۔ ایک دوسری روایت کے مطابق نیرو ایک شہرۂ آفاق باعزت شادی شدہ حسین خاتون کو اپنے غسل خانے کے ٹب میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس عقلمند حسینہ نے ٹب کے اندر داخل ہونے سے قبل ٹب کے اندر پانی کی سطح کو گلاب کے پھولوں سے ڈھک دیا اور اس میں گھس کر اپنے کپڑے اتار دیے۔

آئندہ قسط میں گلاب کی کاشت سے متعلق تفصیل سے لکھنے کی کوشش کی جائے گی۔ اور دُنیا کے مشہور گلاب کے باغوں کا ذکر۔ اخیر میں اپنے پڑھنے والوں سے متمنی ہوں کہ وہ اپنی تعمیری تنقید اور تجویز دونوں ہی سے آگاہ کریں تاکہ اس سے مستفید ہو سکوں اور ان کی خواہش کے مطابق مضمون تحریر کرسکوں۔

(باقی آئندہ)

"... تو یہ وہی پارک ہے جہاں وہ شادی کے دو دن بعد اسے لے کر آئے تھے ... ٹوٹی ہوئی بارہ دری کے پتھروں کے نیچے سے ہوتی ہوئی ان کی نظریں چالیس برس پرانی بارہ دری میں ..."

نیم پلیٹ

طارق چھتاری

"کیا نام تھا اس کا ؟ اُف بالکل یاد نہیں آرہا ہے ——" کیدار ناتھ نے اپنے اوپر سے لحاف ہٹا کر پھینک دیا اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"یہ کیا ہو گیا ہے مجھے، ساری رات ہوگئی نیند ہی نہیں آرہی ہے۔ ہوگا کچھ نام وام، نہیں یاد آتا تو کیا کروں —— لیکن نام تو یاد آنا ہی چاہیے۔ آخر وہ میری بیوی تھی میری دھرم پتنی ——" انھوں نے پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ پچھتر سالہ کیدار ناتھ کے ماتھے کی بے شمار جھرّیاں بوڑھی ہتھیلی کے نیچے دب کر پھڑپھڑانے لگیں۔

"سرلا کی ماں ..." ان کے منہ سے بے ساختہ نکل پڑا۔

"اُف وہ تو ٹھیک ہے مگر کچھ نام بھی تو تھا اس کا —— کیا نام تھا ؟ اس کے نام کا پہلا اچھّر ... ہاں ہاں کچھ یاد آرہا ہے ..." انھوں نے پیر پلنگ کے نیچے لٹکا دیے اور لائٹ آن کرنے کے لیے دیوار میں لگے سوئچ کی طرف بڑھے۔

"اُس کے نام کا پہلا اچھّر ... "کے" نہیں، نہیں —— ہاں ں ں یاد آگیا ——"

ان کا جھرّیوں سے بھرا پوپلا منہ مسکرانے کے لیے تیار ہی ہو رہا تھا کہ کھانسی کا ایک ٹھسکا لگا اور پھر وہ بھول گئے کہ وہ اچھّر کیا تھا۔

کمرے میں چاروں طرف روشنی پھیل چکی تھی ——

"ڈھائی بجنے کو ہیں ——" ان کی نظر ٹائم پیس پر پڑ گئی۔

"ٹائم پیس ... ؟ ہاں ... ٹا ... ٹیم پی، پیس ... "سا" ارے ہاں "سا" ہی تو تھا اس کے نام کا پہلا اچھّر ——"

"سا" ؟ نہیں یہ تو سرلا کی ماں ..."

"پھر سرلا کی ماں —— آخر نام بھی تو کچھ تھا اس کا ——" کیدار ناتھ نے جھنجھلا کر سرہانے رکھی چھڑی کو اٹھایا گلے میں کس کے مفلر لپیٹا اور بار بار چھڑی کو فرش پر پٹخنے لگے۔ پھر دونوں ہاتھوں میں چھڑی کو جکڑ کر اس طرح سر کے قریب لائے

جیسے اس کے ہتھے سے اپنا سر پھوڑ ڈالنا چاہتے ہوں۔

"تعجب ہے اپنی بیوی کا نام بھی بھول گیا۔ اسے مرے ہوئے بھی تو چالیس برس گزر گئے ہیں۔ تین سال کا عرصہ ہوتا ہی کتنا ہے۔ صرف تین سال ہی تو اس کے ساتھ رہ پایا تھا میں ۔۔۔"

وہ خالی خالی نظروں سے کمرے کو گھور رہے ہیں۔ پلنگ، میز، کرسی اور الماری ۔کتابیں۔ ۔ "الماری کتابوں سے بھری پڑی ہوگی"، الماری کے پٹ بند ہیں۔ وہ پلنگ کی جانب بڑھے اور پھر الماری کی طرف مڑ گئے۔ دروازہ کھولا — الماری خالی تھی — نہ اس میں کتابیں تھیں اور نہ خانے ۔۔۔ "ارے اس میں تو پچھلی دیوار بھی نہیں ہے —"

وہ لرز گئے اور گھبرا کر ایک پاؤں اس کے اندر رکھ دیا پھر دوسرا پاؤں۔ اب وہ دروازے کے باہر کھڑے تھے۔ سب کچھ خالی تھا، ان کے ذہن کی طرح۔ وہ سمت بھول گئے تھے اور الماری کے بجائے باہر جانے والا دروازہ کھول بیٹھے تھے۔ باہر سڑک پر کہرا جما ہوا تھا۔ کھمبوں کے بلب مدھم دیوں کی طرح ٹمٹما رہے تھے۔ سنسان سڑک پر انھیں لگا کہ یکایک بھیڑ اُمڈ آئی ہے۔ چاروں طرف شور ہو رہا ہے۔ باجے کے شور سے کان پھٹے جا رہے ہیں۔ دور کہرے میں چھپی ہوئی ڈولی ۔۔۔ سرخ جوڑا پہنے دلہن، دلہن مسکرا رہی ہے۔

سڑک پر ایک پتھر کا ٹکڑا پڑا تھا، انھیں ٹھوکر لگی اور لڑکھڑا کر کھمبے سے جا ٹکرائے، بہت زور سے دھکا دیا تھا محلے بھر کی لڑکیوں نے — اور پھر دروازہ بند۔

"کیا نام ہے تمھارا —" نام معلوم ہوتے ہوئے بھی اس کا نام پوچھا تھا انھوں نے — وہ شرما گئی تھی اور گھٹنوں میں منہ چھپا لیا تھا۔ انھوں نے پھر پوچھا تو اس نے آہستہ سے اپنا نام بتایا۔

"کیا بتایا تھا اس نے —"؟ اُف بالکل یاد نہیں — اور وہ چھڑی کو زمین پر پٹکتے ہوئے تیز تیز قدموں سے چل پڑے۔ انھیں کہاں جانا ہے؟ پتا نہیں — پھر بھی وہ چلتے رہے اور اب وہ اپنے گھر سے بہت دور نکل آئے تھے۔

یہ کون سا علاقہ ہے؟ کیلاش نگر؟ ہاں شاید وہی ہے۔ آگے دائیں طرف ان کے دوست شرما جی کی کوٹھی ہے باہر گیٹ پر نیم پلیٹ لگی ہے۔ "ست پرکاش شرما" وہ ان کے دفتر کے ساتھی تھے۔ گزرے ہوئے کئی برس ہو گئے۔

اچانک کیدار ناتھ ٹھٹکے اور رک گئے ۔۔۔ "ارے یہی تو ہے شرما جی کی کوٹھی، ہاں بالکل یہی ہے۔ وہاں لگی ہے ان کے نام کی پلیٹ ——" کیدار ناتھ کو کہرے کی دھند میں ایک تختی نظر آئی۔

"شرما۔ ۔ ۔" انھوں نے پڑھا —— "رام پرکاش شرما"

رام پرکاش۔ ۔ ۔؟ نہیں ان کا نام تو ست پرکاش تھا۔ انھوں نے غور سے دیکھا۔

"رام پرکاش شرما (ایڈوکیٹ) ——" صاف صاف لکھا تھا۔

انھیں یاد آیا کہ ایک روز شرما جی نے کہا تھا —"میرا بیٹا رام پرکاش ایڈوکیٹ ہو گیا ہے"۔

"اچھا تو اپنے باپ کے نام کی پلیٹ اکھاڑ کر۔ ۔ ۔" کھٹ سے کوئی چیز گری۔ انھیں لگا کہ ان کے ذہن سے کوئی چیز ٹوٹ کر قدموں میں آن گری ہے۔ وہ سہم گئے اور مجرم کی طرح گردن جھکا لی۔ یہ کسی کے نام کی پلیٹ تھی۔ مگر ایک حرف بھی صاف نہیں سب کچھ مٹ چکا ہے۔ ان کے جسم میں زن زناہٹ سی ہونے لگی لاغر ٹانگیں جو ابھی ابھی کانپ رہی تھیں، پیاسے ہرن کی طرح کلانچیں مارنے کو بیتاب ہو اٹھیں۔

وہ بھاگ رہے ہیں۔ نہیں آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔ یا رینگ رہے ہیں یا کھڑے ہی۔ ۔ ۔ یہ تو پتا نہیں مگر اب وہ اپنے گھر سے کئی میل دور سرلا کے گھر کے بہت قریب آن پہنچے ہیں۔ سرلا سے اس کی ماں کا نام پوچھ ہی لیں گے۔

سرلا کو اپنی ماں کا نام یاد ہوگا —— ؟ کیوں نہیں —— کوئی ماں کا نام بھی بھولتا ہے کیا۔

"پاروتی دیوی ——" ان کی ماں کا نام پاروتی

دیوی تھا۔ انھیں پچھتر سال کی عمر میں بھی اپنی ماں کا نام یاد ہے۔

"پاروتی دیوی کی جے . . . "بچپن میں وہ اپنے بابا کے ساتھ بیٹھے پوجا کر رہے تھے۔" بابا . . . آماں کا نام بھی تو پاروتی دیوی ہے ——" "ہاں بیٹے یہی پاروتی دیوی ہیں جن کے نام پر تمھاری آماں کا نام رکھا گیا ہے۔ اور اس روز سے وہ آج تک روزانہ پاروتی دیوی کی پوجا کرتے ہیں اور جے بولتے ہیں۔ ماں تو بھگوان کا روپ ہوتی ہے، پھر بھلا سرلا کیسے اپنی ماں کا نام بھولی ہوگی —— ! کیدارناتھ کا دل اندر سے اتنا خوش ہو رہا تھا کہ ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ رفتار میں دھیما پن آگیا مگر وہ اپنے بوڑھے جسم کو دھکیلتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے —— !!

"بابوجی آج اتنے سویرے آپ اِدھر . . . ؟"

سرلا نے کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے کیدارناتھ کو چائے کی پیالی دیتے ہوئے پوچھا —— ! بوڑھے آسمان کی گود سے نئے سورج کا گولا جھانک رہا ہے۔ کیدارناتھ کے پنجوں کی انگلیاں سرد ہو کر سُن پڑ چکی ہیں۔ جیسے ان میں گوشت ہے ہی نہیں اور وہ اندر سے بالکل خالی، بالکل کھوکھلی ہو چکی ہیں، پرندے ان کے سر پر منڈلاتے منڈلاتے سرلا کے مکان کے اوپر جا بیٹھتے ہیں اور وہ سرلا کے مکان کے باہر پتا نہیں کب سے کھڑے کھڑے تھک چکے ہیں۔ ——

"میں یہاں کھڑا ہوں۔ آتے جاتے لوگ دیکھ کر کیا سوچیں گے۔ اب تو دن چڑھے کافی دیر ہو گئی ہے۔ سرلا سو کر اُٹھ گئی ہوگی۔ اندر چلنا چاہیے۔ لیکن کیا واقعی سرلا نے اب تک اپنی ماں کا نام یاد رکھا ہوگا شرما جی کے بیٹے نے اپنے باپ کے نام کی پلیٹ اُکھاڑ کر . . . "

کھٹ سے کوئی چیز گری انھیں لگا کہ ان کے ذہن سے کوئی چیز ٹوٹ کر قدموں میں آن گری ہے۔ دُھندلے دھندلے حروف ابھرنے لگے۔ اور ان کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا —— اندھیری رات . . . کہرے سے بھری ہوئی سرد رات . . . بے شمار کتوں کے بھونکنے کی آوازیں، کئی آوارہ کتے ان کے پیچھے لگ گئے ہیں۔ وہ کتوں سے بچنے کے لیے ملٹن پارک میں گھس جاتے ہیں ملٹن پارک ؟ اب تو اس کا نام گاندھی پارک ہو گیا ہے۔ گاندھی پارک ہو یا ملٹن پارک، ہے تو یہ وہی پارک جہاں وہ شادی کے دو دن بعد اسے لے کر آئے تھے۔ پارک کی بارہ دری ٹوٹ کر کھنڈر بن گئی ہے۔ ٹوٹی ہوئی بارہ دری کے پتھروں کے نیچے سے ہوتی ہوئی ان کی نظریں چالیس برس پُرانی بارہ دری میں گھس جاتی ہیں، —— "آؤ یہاں بیٹھو . . . کتنی خوبصورت ہیں یہ محرابیں!"

وہ دونوں سنگِ مرمر کے ستون سے کمر ٹکا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور پھر وہ دُنیا سے بے خبر بہت دیر تک اس کے پاس بیٹھے رہے۔ مہینوں . . . برسوں . . . کہ اچانک ان کی بیٹی سرلا نے انھیں چونکا دیا۔

"بابوجی آپ چپ کیوں ہیں ؟ کیا سوچ رہے ہیں —— ؟"

"کچھ نہیں بیٹی۔ میں سوچ رہا تھا آج اتنے سویرے . . . اصل میں میں نے سوچا جوگیندر کے دفتر جانے سے پہلے ہی پہنچ جاؤں تو اچھا ہے ——"

"بابوجی آج تو اتوار ہے۔"

"اوہ، ہاں آج تو اتوار ہے۔ کیا کروں بیٹی ریٹائر ہونے کے بعد دن تاریخ یاد ہی نہیں رہتے۔"

وہ دل ہی دل میں سوچنے لگے —— "دن تاریخ کیا اب تو بہت کچھ یاد نہیں رہا۔"

اتنے میں جوگیندر بھی آنکھیں مسلتے ہوئے آئے اور کیدارناتھ کو پرنام کر کے صوفے پر بیٹھ گئے۔

"بابوجی، اتنے سویرے ؟ سب ٹھیک ہے نا ——"

میرے صبح جلدی آجانے پر یہ لوگ اتنا زور کیوں دے رہے ہیں۔ ضرور میرے اچانک آنے سے اُن کا ڈسٹرب ہُوا ہوگا۔ مجھے چلے جانا چاہیے، ابھی . . .

کیدارناتھ کو خاموش بیٹھا دیکھ کر سرلا بول پڑی ——

"ارے بابوجی تو بھول ہی گئے تھے کہ آج اتوار ہے اسی لیے تو اتنی جلدی . . ."

آج اتوار ہے اور میں اس طرح بغیر بتائے یہاں

جیسے اس کے ہتھے سے اپنا سر پھوڑ ڈالنا چاہتے ہوں۔

"تعجب ہے اپنی بیوی کا نام بھی بھول گیا۔ اسے مرے ہوئے بھی تو چالیس برس گزر گئے ہیں۔ تین سال کا عرصہ ہوتا ہی کتنا ہے۔ صرف تین سال ہی تو اس کے ساتھ رہ پایا تھا میں ...... "

وہ خالی خالی نظروں سے کمرے کو گھور رہے ہیں۔ پلنگ، میز، کرسی اور الماری ـــ کتابیں... "الماری کتابوں سے بھری پڑی ہوگی"، الماری کے پٹ بند ہیں۔ وہ پلنگ کی جانب بڑھے اور پھر الماری کی طرف مڑ گئے۔ دروازہ کھولا ـــ الماری خالی تھی ـــ نہ اس میں کتابیں تھیں اور نہ خانے ـــ "ارے اس میں تو پچھلی دیوار بھی نہیں ہے ـــ"

وہ لرز گئے اور گھبرا کر ایک پاؤں اس کے اندر رکھ دیا پھر دوسرا پاؤں۔ اب وہ دروازے کے باہر کھڑے تھے۔ سب کچھ خالی تھا، ان کے ذہن کی طرح۔ وہ سمت بھول گئے تھے اور الماری کے بجائے باہر جانے والا دروازہ کھول بیٹھے تھے۔ باہر سڑک پر کہرا جما ہوا تھا۔ کھمبوں کے بلب مدھم دیوں کی طرح ٹمٹما رہے تھے۔ سنسان سڑک پر انھیں لگا کہ یکایک بھیڑ اُمڈ آئی ہے۔ چاروں طرف شور ہو رہا ہے۔ باجے کے شور سے کان پھٹے جا رہے ہیں۔ دور کہرے میں چھپی ہوئی ڈولی ـــ سرخ جوڑا پہنے دلہن، دلہن مسکرا رہی ہے۔

سڑک پر ایک پتھر کا ٹکڑا پڑا تھا، انھیں ٹھوکر لگی اور لڑکھڑا کر کھمبے سے جا ٹکرائے، بہت زور سے دھکا دیا تھا محلے بھر کی لڑکیوں نے ـــ اور پھر دروازہ بند۔

"کیا نام ہے تمھارا ـــ" نام معلوم ہوتے ہوئے بھی اس کا نام پوچھا تھا انھوں نے ـــ وہ شرمائی تھی اور گھٹنوں میں منہ چھپا لیا تھا۔ انھوں نے پھر پوچھا تو اس نے آہستہ سے اپنا نام بتایا۔

"کیا بتایا تھا اس نے ـــ؟ اُف بالکل یاد نہیں ـــ" اور وہ چھڑی کو زمین پر پٹکتے ہوئے تیز تیز قدموں سے چل پڑے۔ انھیں کہاں جانا ہے؟ پتا نہیں ـــ پھر بھی وہ چلتے رہے اور اب وہ اپنے گھر سے بہت دور نکل آئے تھے۔

یہ کون سا علاقہ ہے؟ کیلاش نگر؟ ہاں شاید وہی ہے۔ آگے دائیں طرف ان کے دوست شرما جی کی کوٹھی ہے باہر گیٹ پر نیم پلیٹ لگی ہے۔ "ست پرکاش شرما" وہ ان کے دفتر کے ساتھی تھے۔ گزرے ہوئے کئی برس ہو گئے۔

اچانک کیدار ناتھ ٹھٹکے اور رُک گئے ـــ "ارے یہی تو ہے شرما جی کی کوٹھی، ہاں بالکل یہی ہے۔ وہاں لگی ہے ان کے نام کی پلیٹ ـــ" کیدار ناتھ کو کہرے کی دھند میں ایک تختی نظر آئی۔

"شرما..." انھوں نے پڑھا ـــ "رام پرکاش شرما"

رام پرکاش...؟ نہیں ان کا نام تو ست پرکاش تھا۔ انھوں نے غور سے دیکھا۔

"رام پرکاش شرما (ایڈوکیٹ) ـــ" صاف صاف لکھا تھا۔

اُنھیں یاد آیا کہ ایک روز شرما جی نے کہا تھا ـــ "میرا بیٹا رام پرکاش ایڈوکیٹ ہو گیا ہے"۔

"اچھا تو اپنے باپ کے نام کی پلیٹ اکھاڑ کر..."

کھٹ سے کوئی چیز گری۔ انھیں لگا کہ ان کے ذہن سے کوئی چیز ٹوٹ کر قدموں میں آن گری ہے۔ وہ سہم گئے اور مجرم کی طرح گردن جھکا لی۔ یہ کسی کے نام کی پلیٹ تھی۔ مگر ایک حرف بھی صاف نہیں سب کچھ مٹ چکا ہے۔ ان کے جسم میں زن زناہٹ سی ہونے لگی۔ لاغر ٹانگیں جو ابھی ابھی کانپ رہی تھیں، پیاسے ہرن کی طرح کلانچیں مارنے کو بیتاب ہو اٹھیں۔

وہ بھاگ رہے ہیں۔ نہیں آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔ یا رینگ رہے ہیں یا کھڑے کھڑے ہی... یہ تو پتا نہیں مگر اب وہ اپنے گھر سے کئی میل دور سرلا کے گھر کے بہت قریب آن پہنچے ہیں۔ سرلا سے اس کی ماں کا نام پوچھ ہی لیں گے۔

سرلا کو اپنی ماں کا نام یاد ہوگا ـــ؟ کیوں نہیں ـــ کوئی ماں کا نام بھی بھولتا ہے کیا۔

"پاروتی دیوی ـــ" ان کی ماں کا نام پاروتی

دیوی تھا۔ انھیں پچھتر سال کی عمر میں بھی اپنی ماں کا نام یاد ہے۔

"پاروتی دیوی کی جے . . ." بچپن میں وہ اپنے بابا کے ساتھ بیٹھے پوجا کر رہے تھے۔ "بابا . . . آماں کا نام بھی تو پاروتی دیوی ہے ـــــ" "ہاں بیٹے یہی پاروتی دیوی ہیں جن کے نام پر تمھاری آماں کا نام رکھا گیا ہے۔ اور اس روز سے وہ آج تک روزانہ پاروتی دیوی کی پوجا کرتے ہیں اور جے بولتے ہیں۔ ماں تو بھگوان کا روپ ہوتی ہے، پھر بھلا سرلا کیسے اپنی ماں کا نام بھولی ہوگی ـــــ! کیدارناتھ کا دل اندر سے اتنا خوش ہو رہا تھا کہ ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ رفتار میں دھیما پن آگیا مگر وہ اپنے بوڑھے جسم کو دھکیلتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے ـــــ!!

"بابوجی آج اتنے سویرے آپ ادھر . . . ؟" سرلا نے کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے کیدارناتھ کو چائے کی پیالی دیتے ہوئے پوچھا ـــــ! بوڑھے آسمان کی گود سے تنے سورج کا گولا جھانک رہا ہے۔ کیدارناتھ کے پنجوں کی انگلیاں سرد ہو کر سُن پڑ چکی ہیں۔ جیسے ان میں گوشت ہے ہی نہیں اور وہ اندر سے بالکل خالی، بالکل کھوکھلی ہو چکی ہیں، پرندے ان کے سر پر منڈلاتے منڈلاتے سرلا کے مکان کے اوپر جا بیٹھتے ہیں اور وہ سرلا کے مکان کے باہر پتا نہیں کب سے کھڑے کھڑے تھک چکے ہیں ـــــ "میں یہاں کھڑا ہوں۔ آتے جاتے لوگ دیکھ کر کیا سوچیں گے۔ اب تو دن چڑھے کافی دیر ہو گئی ہے۔ سرلا سو کر اُٹھ گئی ہوگی۔ اندر چلنا چاہیے۔ لیکن کیا واقعی سرلا نے اب تک اپنی ماں کا نام یاد رکھا ہوگا شہراجی کے بیٹے نے اپنے باپ کے نام کی پلیٹ اُکھاڑ کر . . ." کھٹ سے کوئی چیز گری انھیں لگا کہ ان کے ذہن سے کوئی چیز ٹوٹ کر قدموں میں آن گری ہے۔ دُھندلے دھندلے حروف ابھرنے لگے۔ اور ان کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا ـــــ اندھیری رات . . . کہرے سے بھری ہوئی سرد رات . . . بے شمار کتوں کے بھونکنے کی آوازیں، کئی آوارہ کتے ان کے پیچھے لگ گئے ہیں۔ وہ کتوں سے بچنے کے لیے ملٹن پارک میں گھس جاتے ہیں ملٹن پارک؟ اب تو اس کا نام گاندھی پارک ہو گیا ہے۔ گاندھی پارک ہو یا ملٹن پارک، ہے تو یہ وہی پارک جہاں وہ شادی کے دو دن بعد اسے لے کر آئے تھے۔ پارک کی بارہ دری ٹوٹ کر کھنڈر بن گئی ہے۔ ٹوٹی ہوئی بارہ دری کے پتھروں کے نیچے سے ہوتی ہوئی ان کی نظریں چالیس برس پُرانی بارہ دری میں گھس جاتی ہیں، ـــــ "آؤ یہاں بیٹھو . . . کتنی خوبصورت ہیں یہ محرابیں!" وہ دونوں سنگِ مرمر کے ستون سے کمر ٹکا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور پھر وہ دُنیا سے بے خبر بہت دیر تک اس کے پاس بیٹھے رہے۔ مہینوں . . . برسوں . . . کہ اچانک ان کی بیٹی سرلا نے انھیں چونکا دیا۔

"بابوجی آپ چپ کیوں ہیں؟ کیا سوچ رہے ہیں ـــــ؟"

"کچھ نہیں بیٹی۔ میں سوچ رہا تھا آج اتنے سویرے . . . اصل میں میں نے سوچا جوگیندر کے دفتر جانے سے پہلے ہی پہنچ جاؤں تو اچھا ہے ـــــ"

"بابوجی آج تو اتوار ہے۔"

"اوہ، ہاں آج تو اتوار ہے۔ کیا کروں بیٹی ریٹائر ہونے کے بعد دن تاریخ یاد ہی نہیں رہتے۔"

وہ دل ہی دل میں سوچنے لگے ـــــ "دن تاریخ کیا اب تو بہت کچھ یاد نہیں رہا۔"

اتنے میں جوگیندر بھی آنکھیں ملتے ہوئے آئے اور کیدارناتھ کو پرنام کر کے صوفے پر بیٹھ گئے۔

"بابوجی، اتنے سویرے؟ سب ٹھیک ہے نا ـــــ"

میرے صبح جلدی آجانے پر یہ لوگ اتنا زور کیوں دے رہے ہیں۔ ضرور میرے اچانک آنے سے ان کا ڈسٹرب ہوا ہوگا۔ مجھے چلے جانا چاہیے، ابھی . . .

کیدارناتھ کو خاموش بیٹھا دیکھ کر سرلا بول پڑی ـــــ "ارے بابوجی تو بھول ہی گئے تھے کہ آج اتوار ہے اسی لیے تو اتنی جلدی . . ."

آج اتوار ہے اور میں اس طرح بغیر بتائے یہاں

چلا آیا ہوں۔ ہو سکتا ہے ان دونوں کا کوئی پروگرام ہو ——
اب میری وجہ سے . . .
ہفتے میں چھٹی کا ایک ہی دن تو ملتا ہے ان لوگوں کو
—— مگر میں بھی تو روز روز نہیں آتا، گھر سے چل پڑا تھا
بس چلتا رہا اور چلتے چلتے جب سرلا کے گھر کے قریب آ گیا تو سوچا
ملتا چلوں۔ کیا یہ لوگ آج میرے لیے اپنے پروگرام نہیں چھوڑ
سکتے ؟

کیدار ناتھ کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے ہیں۔
کمبخت بڑھاپے میں آنسو بھی کتنی جلدی نکل آتے ہیں۔
وہ آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے کہ سرلا نے ان کی آنکھوں
میں جھانک کر دیکھا۔ یہ اس طرح کیا دیکھ رہی ہے ؟ کہیں سب کچھ سمجھ
تو نہیں گئی۔

کیا سمجھے گی ؟ یہ کہ میں اپنی بیوی کا نام بھول گیا ہوں اور
رات بھر جاگتا رہا ہوں یا یہ کہ میں رو رہا ہوں ——

"بیٹی آج مجھے جوگیندر سے کچھ کام تھا . . ."

"بابوجی مجھ سے ؟" جوگیندر نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"ہاں یونہی، کوئی خاص بات نہیں تھی ——" پھر
وہ لان کی طرف جھانکنے لگے۔

"آج بہت سردی ہے۔ تمہارے لان میں تو سویرے ہی
دھوپ آ جاتی ہے۔" سرلا نے لان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

—— "ہاں بابوجی ابھی تو دھوپ میں تیزی بھی نہیں آئی اور
اوس بھی بہت ہے پورا لان گیلا ——"

وہ کہہ رہی تھی کہ جوگیندر بیچ میں بول پڑے۔

"بابوجی ابھی کچھ کام کے سلسلے میں آپ کہہ رہے تھے۔"

کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں جلدی سے کام بتا کر چلتا
بنوں تاکہ ان کے پروگرام ڈسٹرب نہ ہوں ؟ کیدار ناتھ کھانسنے لگے
اور کافی دیر تک کھانستے رہے۔ وہ کھانس رہے تھے اور سوچتے جا رہے
تھے کہ اب کیا کہوں کہ بغیر سوچے سمجھے ہی بول پڑے۔

"بیٹے تمھیں نام یاد رہتے ہیں ؟"

"کیسے نام بابوجی ؟ ویسے میں ہمیشہ نام یاد رکھنے میں کمزور
رہا ہوں اسی لیے ہسٹری کے پرچے میں میرے نمبر بہت کم آتے تھے۔"

اب کیا پوچھوں ؟ کیا سرلا سے یہی سوال کروں ؟ مگر یہ تو
بڑی بے تکی بات ہوگی۔ اگر سرلا خود ہی بول پڑے کہ بابوجی مجھے نام یاد
رہتے ہیں، تو جلدی سے پوچھ لوں کہ بتاؤ تمھاری ماں کا کیا نام تھا۔

کیدار ناتھ نے حسرت بھری نظروں سے سرلا کی طرف دیکھا
لیکن وہ خاموش بیٹھی رہی اور پھر اُٹھ کر کچن کی طرف چل دی۔

سورج چڑھے کافی دیر ہو چکی تھی۔ دھوپ میں بھی تیزی
آتی جا رہی تھی۔ لان کی ہری گھاس پر جمے ہوئے شبنم کے قطرے
اپنا وجود کھو چکے تھے۔ کیدار ناتھ نے اپنے جسم پر چڑھے ہوئے گرم
کپڑوں کو اس طرح ٹٹولا جیسے وہ ڈھونڈ رہے ہوں کہ ان کپڑوں
کے اندر جسم ہے بھی یا نہیں۔

دوپہر کا کھانا تیار تھا۔ لیکن ابھی تک سرلا سے اس
کی ماں کا نام پوچھنے کا موقع نہیں مل پایا تھا۔ سرلا صبح سے کھانا
تیار کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ کیدار ناتھ باہر دھوپ میں جا کر بیٹھتے
تو کبھی اندر آ کر برآمدے میں ٹہلنے لگتے۔ کبھی جوگیندر سے ادھر اُدھر
کی باتیں ہوتیں اور کبھی سرلا آتی تو اس موقعے کی تلاش میں رہتے کہ
ذرا جوگیندر اُٹھ کر جائیں اور وہ اکیلے میں سرلا سے اس کی ماں کا
نام پوچھ لیں۔

اب دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا ہے۔ کھانے میں
بات میں بات نکلے گی تب تو پوچھ ہی لوں گا۔ انھوں نے سوچا اور
مطمئن ہو گئے۔

کھانے کی میز سج چکی ہے۔ سرلا نے کئی طرح کی سبزیاں
بنائی ہیں —— کھانا بہت لذیذ ہے۔ آج بہت دنوں کے
بعد اپنی بیٹی کے ہاتھ کا کھانا ملا ہے۔ نوکر کے ہاتھ کا کھاتے کھاتے
ان کا دل بھر گیا تھا۔ سرلا کی ماں کے ہاتھ کا ذائقہ تو اب انھیں یاد
بھی نہیں —— اس کا نام بھی تو یاد نہیں —— ان کا جی
چاہا کہ جلدی سے پوچھ لیں۔ بیٹی تمھاری ماں کا کیا نام تھا۔

ارے یہ کیا۔ اگر اس طرح وہ کوئی سوال کریں گے تو یہ
دونوں کیا سوچیں گے۔ دونوں قہقہہ مار کر ہنس پڑیں گے ——
کیدار ناتھ خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگے کہ کہیں بھول کر
یہ سوال ان کے منہ سے نکل پڑے —— اف کس سے پوچھوں
. . . کمبخت خود ہی میرے ذہن میں آ جائے تو پوچھنا ہی کیوں پڑے۔

انھوں نے بھنویں سکوڑیں، پیشانی پر بے شمار بل پڑ گئے پھر آنکھیں بند کرلیں اور اپنے ذہن سے جھوجھنے لگے۔ آج سرلا کا بیٹا نظر نہیں آرہا ہے، شاید اسے اپنی نانی کا نام یاد ہو —— باتوں باتوں میں اس سے تو پوچھ ہی لوں گا —— "سرلا آج تمھارا بیٹا . . . ؟"

"ھاں پتاجی میں تو بتانا بھول ہی گئی۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد اس نے کمپٹیشن کی تیاری شروع کردی تھی۔ کل سے اس کے امتحان ہیں۔ دو دن پہلے ہی دلی چلا گیا ہے" ——

"او . . . اچھا . . . تو گھر پر نہیں ہے" کیدارناتھ ایک ٹھنڈی سانس لے کر پھر کھانے میں مصروف ہوگئے۔ کھانا ختم ہوگیا اور کیدارناتھ کو اپنی بیوی کا نام یاد نہیں آیا۔ کھانے کے بعد چائے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے شام ہوگئی۔ کیدارناتھ بغیر نام پوچھے ہی وہاں سے اٹھ پڑے۔ گھر لوٹنے کے لیے بس پکڑی۔ اب ان کے جسم کی ساری رگیں ڈھیلی پڑ چکی تھیں۔ ہر ایک شخص کو دیکھ کر انھیں لگتا کہ اسے ضرور میری بیوی کا نام معلوم ہوگا۔ وہ ہر ایک سے پوچھنا چاہتے مگر کوئی شخص نہ تو ان کی طرف متوجہ ہوتا اور نہ ہی کچھ پوچھنے کے لیے ان کے ہونٹ کھلتے۔ سفر جاری رہا اور پھر اچانک ایک جھٹکے کے ساتھ بس رکی۔ انھوں نے کھڑکی سے باہر جھانکا اور اترنے کے لیے سیٹ سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔

کمرے میں چاروں طرف اندھیرا ہے۔ وہ بغیر روشنی کیے بستر پر ڈھیر ہوگئے۔ اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا، کیدارناتھ کو محسوس ہوا کہ دیواریں ان کی طرف کھسکتی چلی آرہی ہیں۔ انھوں نے آنکھوں پر زور دے کر دیواروں کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔ پورے کمرے میں دھواں بھر گیا تھا۔ "اٹھ کر لائٹ جلا دی جائے۔" انھوں نے سوچا۔ مگر روشنی میں تو انھیں نیند ہی نہیں آتی۔ اندھیرے میں بھی کب آتی ہے۔ اب ان کی آنکھیں شعلوں کی طرح دہکنے لگی تھیں۔ جسم سے بھی آگ نکلنے لگی ہے۔ آگ کی لپٹیں بہت تیز ہوگئی ہیں۔ سرلا کی ماں کی چتا جل رہی ہے۔ روشنی بہت تیز ہے اور انھیں نیند نہیں آرہی ہے۔ تو پھر آنکھیں نیند سے بوجھل کیوں ہوتی جا رہی ہیں —— ؟ جگہ جگہ سے جسم گل گیا ہے۔ وہ جدھر کروٹ لیتے ہیں ادھر ہی سے شدید درد کی لہر اٹھتی ہے۔ ان کے ہاتھ پیر بالکل ٹھنڈے ہوتے جا رہے تھے کہ اچانک ذہن سے کوئی چیز نکل کر پلنگ کے نیچے فرش پر جا پڑی کیدارناتھ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ لائٹ جلائی اور الماری کھول کر تمام کتابیں فرش پر بکھیر دیں۔ ایک ایک کرکے میز کی دراز کے تمام کاغذات نکال ڈالے اور پرانے بکس سے کچھ فائلیں نکالیں پھر دیوانوں کی طرح انھیں الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے —— کسی کاغذ کو پڑھتے، کسی کو پھاڑ کر پھینک دیتے اور کسی کو تہہ کرکے رکھ لیتے۔

"کمبخت اس کی کوئی چٹھی بھی تو نہیں مل رہی ہے۔" اب کیدارناتھ نے جھنجھلا کر کتابوں، کاغذوں اور فائلوں کو نوچ کر پھینکنا شروع کردیا ہے۔ دونوں ہاتھ بالکل شل ہو چکے ہیں۔ سانس رکنے لگی ہے۔ انھوں نے گھبرا کر گلے میں بندھے مفلر کا بل کھولنا چاہا کہ پتا نہیں کیسے گرنت اور تنگ ہوگئی پھر ایک جھٹکے کے ساتھ مفلر کھینچ لیا اور بری طرح ہانپنے لگے —— ڈھونڈنے سے کوئی فائدہ نہیں —— یاد کرنا بھی بیکار ہے، اب کچھ یاد نہیں آئے گا اور وہ یاد کرنے لگے کہ ان کی بیوی کا کیا نام تھا۔

شانتی . . . ؟

نہیں ——

سروجنی —— ؟

نہیں . . . نہیں . . .

سرشٹھا . . . ؟

اف یہ بھی نہیں ——

ہزاروں نام ان کے ذہن میں تیزی سے آنے لگے۔ پھر وہ بھول گئے کہ وہ کیا یاد کر رہے تھے۔

آج کون سا دن ہے ؟

اتوار ——

نہیں اتوار تو کل تھا۔

کل ؟

اتوار تو اس دن تھا جب وہ سرلا کے گھر گئے تھے اور سرلا کے گھر گئے ہوئے اب صدیاں گزر چکی ہیں۔

اُن کی آنکھوں سے زرد روشنائی ٹپک کر پورے کمرے
ں پھیل گئی ہے۔ کتابیں، کاغذات اور فائلیں ——— انھیں
چھ دھندلے دھندلے حروف نظر آئے۔

شرما ——— ہاں میرے دفتر کے ساتھی شرما۔

"پورا نام کیا تھا ان کا؟"

اُف یہ بھی بھول گیا۔

"اور ان کے بیٹے کا؟"

نہیں، اب مجھے کچھ بھی یاد نہیں ہے۔

پارک ———

کون سا پارک؟

وہی پارک جہاں وہ کھڑی مسکرا رہی ہے۔

لیکن اب تو اس پارک کا نام بھی بدل گیا ہے۔

"کیا ہے اس کا نیا نام؟"

نیا ہی کیا اب تو پرانا بھی یاد نہیں۔ مَیں سب کچھ بھولتا
رہا ہوں۔

میری بیٹی ———

اُف اس کا نام بھی یاد نہیں آرہا ہے۔

اُس کے شوہر کا نام؟

ہے بھگوان مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے ——— اب تو
چھ بھی یاد نہیں۔

کیا صرف بیوی کے نام کے لیے وہ اتنا پریشان ہیں۔

نہیں، کوئی اور چیز بھی ہے جسے وہ بھول گئے ہیں۔

"کیا چیز ہے وہ؟"

وہ نیم پلیٹ جو بار بار اُن کے ذہن سے نکل کر گر پڑتی
ہے! کیا لکھا ہے اس میں؟ کچھ دکھائی نہیں دیتا ——— سب
چھ مٹ چکا ہے ———

دیواریں چھت، دروازے اور فرش . . . کچھ بھی نہیں
ہے ——— دُور تک پھیلا ہوا ایک بہت بڑا میدان ہے جس
کی زمین میں جگہ جگہ دراڑیں پڑ چکی ہیں۔ سورج کا گولا پھیل کر
اتنا بڑا ہو گیا کہ پورا آسمان اس کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ روشنی
اتنی تیز ہے کہ کچھ دکھائی نہیں دیتا کہ اچانک دور کوئی بہت
چھوٹی سی چیز نظر آئی۔

کیا ہے وہ؟

کوئی انسان ہے جو اپنے چاروں طرف مُڑ مُڑ کر دیکھ رہا
ہے۔ اس کے قریب کوئی نہیں ہے، وہ تنہا ہے، بالکل تنہا۔

ارے وہ تو میری طرف بڑھ رہا ہے اور اب میری
آنکھوں کے اتنا قریب آگیا کہ اس کے پیچھے سارا میدان، آسمان
اور سورج کا پھیلا ہوا گولا بھی چھپ گیا ہے ——— کون ہے
یہ شخص؟

"مَیں؟" اور ان کی آنکھوں کے سامنے خود ان کی اپنی
ذات اندھیرا بن کے چھانے لگی۔

"مگر میں کون ہوں؟ کیا نام ہے میرا؟"

"اَیں . . . اَب تو مَیں اپنا نام بھی بھول گیا" ———
وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر زور سے چیخے اور بغیر ریڑھ کی ہڈی والے
آدمی کی طرح دہرے ہوتے ہوتے اپنے آپ میں سمٹنے لگے۔ انھیں
لگا کہ وہ کئی گز زمین کے اندر دھنس گئے ہیں۔ ان کا دم گھٹ
رہا ہے۔ سر بری طرح چکرانے لگا اور آنکھوں سے نیلے پیلے بادل
اُمڈ آئے۔ ہاتھ پاؤں سُن پڑ چکے ہیں اور گلا رُندھ گیا ہے۔ جیسے کوئی
بہت موٹی سی چیز اس میں اٹک گئی ہو۔ کانپتا ہوا ہاتھ انھوں نے
گردن پر رکھ لیا۔ اور کھنکارنا چاہا مگر انھیں لگا کہ کھنکارتے ہی
ہچکی آجائے گی اور وہ مر جائیں گے۔

"نہیں ———" وہ بہت زور سے چیخے ان کے ہاتھ کی
گرفت گلے پر خود بخود مضبوط ہو گئی تھی۔ دھندلے دھندلے حروف
ابھرنے لگے۔

"کے . . . کے . . ." اف لگتا ہے ذہن کے پرخچے
اُڑ جائیں گے اور زبان کٹ کر دُور جا گرے گی۔ انھوں نے غور سے
دیکھا حرف کچھ کچھ صاف دکھائی دینے لگے تھے "کے وا . . ."

اور پھر انھوں نے پڑھ لیا ——— "کیدار ناتھ ———"
وہ خوشی سے چیخ پڑے اور گلے پر سے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔
دل بہت زور سے دھڑکا، پورے بدن میں گدگدی سی ہونے
لگی اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے پلنگ پر جا پڑے ———

"کیدار ناتھ، کیدار ناتھ ———" وہ زور زور سے

کہنے لگے جیسے اب اُنھیں سب کچھ یاد آگیا ہو۔
اپنی بیٹی کا، دوست کا، اس پارک کا اور اپنی بیوی
کا نام ——— کیدار ناتھ ———!
انھیں محسوس ہوا کہ ساری دُنیا کا نام کیدار ناتھ ہے۔

پھر آہستہ سے اُٹھے۔ لائٹ بجھائی اور کیدار ناتھ . . .
کیدار ناتھ کہتے ہوئے لحاف میں گھس گئے۔
صبح ہوئی تو انھوں نے خود کو بہت مطمئن محسوس کیا۔ رات
انھیں بہت گہری اور سکون کی نیند آئی تھی ———!!

●●

(اکادمی کے افسانہ ورکشاپ/سیمینار میں پڑھا گیا)

غزلیں

ملکہ نسیم

شاخِ گل، رنگینیاں، پُروائیاں، بھیگا سماں
لکھ رہا ہے کون موسم کی انوکھی داستاں

خواہشوں کی برف پیروں پر مرے جمتی رہی
مَیں کھڑی تھی بند آنکھوں میں لیے بکھرا سماں

پاؤں میں چھوٹی انا کی بیڑیاں پہنے رہی
سامنے نظروں کے میرے جل گیا میرا مکاں

کلفتوں کی دھول جب پونچھی تو آئینے میں تھا
اُترا اُترا ایک چہرہ آنسوؤں کے درمیاں

کچھ شکستہ خواب لے کر شبنمی پلکوں کے ساتھ
حال کی دہلیز پر بیٹھی ہے یادِ رفتگاں

ایک اک پل زندگی کا جس کو دے ڈالا نسیم
ہو گیا ہے کیوں نہ جانے اس قدر وہ بدگماں

نسیم نکہت

تیری محبتوں کے حوالوں میں قید ہوں
میں اک غزل ہوں اور رسالوں میں قید ہوں

گھر سے چلی تھی مَیں تو نگاہیں تھیں مطمئن
آئی ہوں لوٹ کر تو سوالوں میں قید ہوں

اک اتفاق تھا وہ ملا اور بچھڑ گیا
لیکن مَیں اب بھی اُس کے خیالوں میں قید ہوں

کیا جانے کیا ہوئی مری ننھی سی اوڑھنی
گھٹتا ہے دَم میں ریشمی شالوں میں قید ہوں

بہتر تھی مَیں تو تازہ ہوائیں بھی تھیں نصیب
مورت جو بن گئی تو شوالوں میں قید ہوں

نکہت کوئی خزانہ نہیں زندگی مری
ناگوں کا مجھ پہ پہرہ ہے تالوں میں قید ہوں

"... تقریباً دس لاکھ پچھتر ہزار گاڑیاں دلّی کی سڑکوں پر دوڑتی ہیں اور اِن میں ہر سال اوسطاً پچاس ہزار گاڑیوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے..."

دِلّی کی بَدلتی فضا

ڈاکٹر محمّد اسلم پرویز

اگر ہم دلّی کے عروج وزوال اور تاریخ کا مطالعہ
ں تو دلّی ہم کو مختلف ادوار میں نِت نئے رنگوں میں نظر آتی
ہے۔ مختلف بادشاہوں نے اسے نِت نئے ناموں سے آباد کیا۔
ں کا نام سب سے پہلے بکرماجیت کے زمانے میں سننے میں آتا ہے
ں طرح دیکھیں تو دِلّی نام کا شہر تقریباً دو ہزار سال پُرانا ہے
ر اگر اندر پرستھ کو سب سے پہلے کی دلّی مان لیں تو اس شہر کی
ساڑھے تین ہزار برس ہو جاتی ہے۔ ان تمام برسوں میں دلّی
بہت سے دورِ حکومت دیکھے، بہت سی قومیں یہاں آباد
یں کچھ ہجرت کر کے آن بسیں تو کچھ حملہ آور بن کر آئیں اور یہیں
ہو گئیں۔ اُس وقت کی دلّی آج کی دلّی سے بہت چھوٹی تھی
جب کی تو بات کیا اُنّیسویں صدی تک دلّی بہت مختصر تھی۔
ہ جہاں آباد کی فصیلوں کے اندر اندر کُل شہر آباد تھا اور یہ
ہ جہاں آباد اجمیری گیٹ، ترکمان گیٹ، کشمیری گیٹ اور
زری گیٹ کے اندر واقع تھا۔ اس کے برخلاف اگر ہم آج کی
دیکھیں تو شاہ جہاں آباد کے عین وسط سے آپ کسی بھی سمت
یس کیلومیٹر تک چلے جائیں، آپ دلّی کی حدود سے باہر نہ
نکل سکیں گے۔

دِلّی کی آبادی میں اضافے کی شروعات اگرچہ بیسویں صدی کے اوائل سے ہوئی تھی لیکن آزادی کے بعد اس میں بے پناہ اضافہ ہوا اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ کچھ تو اس کے نام کا جادو اور کچھ اس کے راجدھانی ہونے کی اہمیت، دونوں ہی باتیں مُلک کے کونے کونے سے لوگوں کو کھینچ کر یہاں لاتی ہیں اور یہ شہرِ نگاراں اپنی باہیں وا کیے سبھی کو خوش آمدید کہتا ہے۔ لیکن آبادی میں لگاتار ہونے والے اس اضافے نے آج کچھ ایسی صورتِ حال پیدا کر دی ہے کہ ایک مرتبہ پھر دلّی والے ایک بڑے خطرے سے دوچار ہیں۔ تاریخ داں ہم کو بتاتے ہیں کہ دلّی کئی مرتبہ بسی اور اُجڑی۔ ہر مرتبہ حملہ آور بیرونی تھے، جنھوں نے لشکر کے ساتھ چڑھائی کی۔ آج دلّی والوں کو خطرہ کسی بیرونی حملہ آور کا نہیں ہے۔ قاتل تو ہر شہری کے ارد گرد نہ صرف موجود ہے بلکہ اُس کی سانسوں میں سمایا ہوا ہے۔ دُور کی بات نہیں ہے ہم نے اپنے بزرگوں سے ہی سُنا ہے کہ ادھر کشمیری گیٹ سے باہر اور اُدھر نظام الدین اولیاء سے آگے منھ بجے

بعد جانے میں خوف آتا تھا کہ گھنے جنگلوں میں نہ جانے کیا ہو۔ ان ہرے بھرے علاقوں کی جگہ آج کنکریٹ کی عمارتیں اور ڈی ڈی اے کے راہنما نقشے نظر آتے ہیں۔ نئی آبادیوں کو روزگار اور ملک کی صنعت کو فروغ دینے کے لیے نئے نئے کارخانے اور فیکٹریاں قائم ہوئیں جنھوں نے روزگار کے علاوہ دلّی کے عوام کو مقررہ وقت پر سائرن کی آواز اور چمنیوں سے دن رات نکلتا ہوا کالا دھواں عطا کیا۔ دور دراز کے علاقوں کو ایک دوسرے سے جوڑنے کے لیے ہزاروں بسیں اور دیگر ذرائع آمدورفت رائج ہوئے جن سے خارج ہونے والے دھوئیں نے اس شہر کی فضا کو مزید بوجھل کر دیا اِن تمام سرگرمیوں کے نتیجے میں جو خوشحالی آئی کچھ اُس نے اور کچھ وقت کی کمی اور بڑھتی ہوئی مصروفیات نے دلّی کے شہریوں کو کاروں اور اسکوٹروں سے نواز دیا۔ اِس وقت صورت حال یہ ہے کہ تقریباً دس لاکھ پچھتر ہزار گاڑیاں دلّی کی سڑکوں پر دوڑتی ہیں۔ اور ان میں ہر سال اوسطاً پچاس ہزار گاڑیوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ان گاڑیوں سے نکلنے والے دھویں اور کارخانوں اور ہمارے بجلی گھروں سے خارج ہونے والی گیسوں نے دلّی کی فضا کو آج اس حد تک مکدّر کر دیا ہے کہ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کے ایک تازہ جائزے کے مطابق دلّی دُنیا کا تیسرا ایسا شہر ہے جس کی فضا سب سے زیادہ آلودہ اور غیر صحت مند ہے!

اِنکم ٹیکس آفس (I.T.O) کے چوراہے پر کھڑا ایک ٹریفک کانسٹبل اپنی چار گھنٹے کی ڈیوٹی کے دوران پچاس ہزار سے زائد گاڑیوں سے خارج شدہ گیس اور دھویں کو اپنے سانس میں سموتا ہے۔ اِس عرصے میں اس کو سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے۔ اس کی بصارت متاثر ہوتی ہے اور وہ آنکھوں اور سینے میں جلن کی شکایت بھی کرتا ہے۔ کوئی تعجب کی بات نہیں اگر دلّی کے بیشتر شہری ان تکالیف کا شکار ہیں۔ پورے ملک کی اوسط کے مقابلے میں دلّی میں سانس کی تکالیف بارہ گُنا زیادہ پائی جاتی ہیں۔ اِن تکالیف کی وجہ یہ ہے کہ گاڑیوں سے خارج ہونے والے دھویں میں کاربن کے باریک ذرات کے علاوہ کئی دیگر زہریلی گیسوں کی آمیزش بھی ہوتی ہے۔ کاربن مونو آکسائیڈ اور نائٹروجن آکسائیڈ جیسی زہریلی گیسیں، جست کے زہریلے مرکّبات کے ساتھ اس میں شامل رہتی ہیں۔ صورتحال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے دہلی انتظامیہ نے گزشتہ سال سے اس مسئلے پر تحقیقات کی ابتدا کرائی تھی۔ اس سال ان تحقیقات سے جو نتائج برآمد ہوئے ہیں اُن سے کئی نئی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ اوّل یہ کہ اگرچہ بسوں اور ٹرکوں سے کافی کالا دھواں خارج ہوتا ہے لیکن اس میں زہریلی گیسوں کی مقدار اتنی نہیں ہوتی جتنی پٹرول سے چلنے والی گاڑیوں، خاص طور سے دو پہیے اور تین پہیے والے اسکوٹروں اور موٹر سائیکلوں سے نکلنے والے دھویں میں ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ دلّی کی فضا کو مکدّر کرنے میں بڑا ہاتھ ٹریفک کا ہے۔ اگرچہ کارخانے اور بجلی گھر فضا کو کافی آلودہ کرتے ہیں۔ لیکن اس آلودگی کا اوسط گاڑیوں کے مقابلے میں کم ہے۔ اوسطاً روزانہ گاڑیوں سے ۷۰ ٹن ہائیڈرو کاربن، ۸۰ ٹن نائٹروجن آکسائیڈ اور دو ٹن سلفر ڈائی آکسائیڈ خارج ہوتی ہے۔ ان تحقیقات سے ایک اور اہم بات یہ سامنے آئی ہے کہ گاڑیوں سے پیدا ہونے والی کثافت کے لیے بڑی حد تک ان کے ڈرائیور ذمّہ دار ہیں۔ اگر وہ صحیح طریقے سے گاڑی چلائیں اور انجن کو ٹھیک حالت میں رکھیں تو کافی حد تک صاف دھواں خارج ہو سکتا ہے۔ گاڑی کو ایک دم ریس دینے اور ایک دَم روکنے سے انجن پر زور پڑتا ہے جس کی وجہ سے اس میں پٹرول زیادہ مقدار میں آ جاتا ہے۔ یہ زیادہ مقدار پوری طرح جل نہیں پاتی اور اس طرح اَدھ جلا پٹرول اپنی پوری کثافت کے ساتھ فضا میں خارج ہو جاتا ہے۔ اگر ڈرائیور گاڑی کو یکلخت روکنے اور ایک دَم تیز رفتار سے چلانے سے باز آ جائیں تو نہ صرف یہ کہ اُن کے پٹرول کی بچت ہوگی بلکہ دھواں بھی صاف نکلے گا۔ اس کے علاوہ اگر گاڑی کے انجن کو اور خاص طور سے اُس کے کاربوریٹر اور ایئر فلٹر کو صاف اور ٹھیک رکھا جائے تو بھی دھواں صاف نکلتا ہے اور پٹرول کی بھی بچت ہوتی ہے۔ عوام کے علاوہ گاڑیاں بنانے والی کمپنیوں کی بھی یہ ذمّہ داری ہے کہ وہ ایسے انجن بنائیں جن سے کم اور صاف دھواں خارج ہو۔ اس وقت عالمی مارکیٹ میں ایسی تکنیک موجود ہے جو اس سلسلے میں مددگار ہو سکتی ہے۔ گاڑیوں کے لیے اس قسم کے آلے ہیں جن میں سے اگر دھویں کو گزارا جائے تو یہ کافی صاف ہو جاتا ہے۔ لیکن اس آلے

——— میں استعمال ہونے والی دو دھاتیں پلاٹینم
(PLATINUM) اور پلیڈیم (PALLADIUM) کافی
ئ ہیں۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے دہلی کے آئی آئی ٹی،
(I.I.T) میں تحقیقات چل رہی ہیں جن میں ان دھاتوں کی جگہ
ے کی ایک خاص قسم کو اس مقصد کے لیے استعمال کرنے
شش کی جا رہی ہے۔ علاوہ ازیں حکومت کو بھی تبلیغ و تشہیر کے
لیے عوام کو واقف کرانا چاہیے اور ساتھ ہی ایسے قوانین بھی ترتیب
ا چاہئیں جن سے ضرورت پڑنے پر مدد لی جاسکے۔ انتظامیہ کے
ہے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ فی الحال حکومت شہریوں کو واقفیت
پہنچانے پر ہی اکتفا کرے گی۔ قانونی کارروائی اور جرمانوں کا
شاید ابھی دور ہے۔ توقع ہے کہ اگلے تین ماہ کے اندر دلی کے کچھ اہم
ل پمپوں پر ایسی مشینیں لگائی جائیں گی جو گاڑی سے نکلنے والے
وں کا فوری تجزیہ کرکے رپورٹ دے سکیں گی۔ اس رپورٹ کی
د پر گاڑی کو چھ ماہ کے لیے سرٹیفکیٹ دیا جائے گا جن گاڑیوں
انجنوں کو سدھار کی ضرورت ہوگی انھیں ٹھیک کرانے کا حکم دیا
ئے گا۔ یہ جانچ بلا معاوضہ ہوگی۔

دلی کی فضا کو آلودہ کرنے میں کارخانوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے
ی ڈی اے (D.D.A) کے ایک جائزے کے مطابق دلی میں
۴ ہزار کارخانے ہیں جن میں سے ۵ ہزار عین آبادیوں میں واقع ہونے
وجہ سے خطرناک ہیں۔ ان میں کیمیکل، پلاسٹک اور تیزاب بنانے
لے اور نکل پالش کے کارخانے شامل ہیں۔ ان تمام کارخانوں سے
ڈرن اور سلفر ڈائی آکسائیڈ جیسی خطرناک گیسیں خارج ہوتی
ں جو نہ صرف ان جگہوں پر کام کرنے والے مزدوروں کے لیے بلکہ
س پاس کی آبادیوں کے لیے بھی خطرناک ہیں اور کسی حادثے کی صورت
ں بڑی تباہی لاسکتی ہیں۔ پرانی دلی میں واقع ۷ ہزار کارخانوں
ں سے دس فیصد کارخانے ایسے ہیں جن کو آبادی سے باہر ہونا چاہیے
ندر پرست کے علاقے میں (جو کہ پہلے ماسٹر پلان میں ہریالی والا علاقہ
ھا) اس وقت ۱۰ ہزار کارخانے ہیں جن میں سے ایک ہزار کارخانے
طرناک کارخانوں کے زمرے میں آتے ہیں۔ نجف گڑھ نالے
ے گرد و نواح میں سب سے زیادہ کثافت پیدا کرنے والے کارخانے
قائم ہیں۔ جراثیم کش دوائیں بنانے والا کارخانہ اور ایک کھاد
بنانے والا کارخانہ بھی یہیں پایا جاتا ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ
جراثیم کش دوائیں بنانے والے کارخانے میں ایسی ہی زہریلی
گیسیں استعمال ہوتی ہیں جیسی کہ بھوپال حادثے میں یونین کاربائڈ
کے کارخانے سے خارج ہوئی تھیں۔ کیمیائی کھاد بنانے والے
کارخانے سے تو تھوڑے عرصے قبل گیس خارج بھی ہوئی تھی جس
سے اُس علاقے کے عوام میں کافی خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ آج
سے ۲۵ سال قبل جب ماسٹر پلان بنا تھا تبھی ان کارخانوں کو
آبادی سے باہر لے جانے کا پروگرام تھا لیکن آج بھی یہ اپنی جگہ
قائم ہیں۔

کوئلے سے چلنے والے بجلی گھر بھی فضا میں کثافت
پھیلاتے ہیں۔ دلی میں راج گھاٹ، اندر پرستھ اور بدرپور میں
واقع تینوں بجلی گھر کوئلے پر ہی منحصر ہیں۔ ان میں سے ہر بجلی گھر میں
۲۰۰۰ سے ۲۵۰۰ ٹن کوئلہ جلتا ہے۔ جس کے نتیجے میں روزانہ
تقریباً چھ سو ٹن راکھ فضا میں منتشر ہوتی ہے۔ اندر پرستھ بجلی گھر
جو کہ آبادی سے نسبتاً قریب ہے روزانہ ۳۵۰ ٹن راکھ اور دھواں
خارج کرتا ہے۔ اس کثیف دھویں کے پیدا ہونے کی دو وجوہ
ہیں ایک تو یہ کہ جو کوئلہ ان کو فراہم کیا جاتا ہے اس میں راکھ کا تناسب
زیادہ ہوتا ہے کبھی کبھی یہ ۴۵ فی صد تک جا پہنچتا ہے۔ اس
کوئلے کے جلنے میں سلفر ڈائی آکسائیڈ گیس بھی زیادہ نکلتی ہے۔
دوسری بات یہ ہے کہ اس دھویں کو پوری طرح صاف کرکے خارج
کرنے میں ابھی تک کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ دھویں سے
کوئلے اور راکھ کے ذرات الگ کرنے کے لیے جو آلے اندر پرستھ
بجلی گھر میں لگائے بھی گئے تھے وہ پوری طرح کام نہیں کر رہے
ہیں۔

آلودگی اور کثافت پیدا کرنے والی ان تمام وجوہ کی
بنا پر دلی کی فضا میں زہریلی گیسوں اور کوئلے کے ذرات کی مقدار
کافی بڑھ گئی ہے۔ زہریلی گیسیں اور مادّے انسانی صحت کے لیے
نہایت مضر ہیں۔ ان کی وجہ سے آنکھوں اور سانس کی بیماریوں
میں اضافہ ہوا ہے۔ ایک جائزے کے مطابق اندر پرستھ کے بجلی
گھر کے ارد گرد ۱۰ کیلو میٹر کے دائرے میں رہنے والے لوگ

سانس کے امراض کے زیادہ شکار ہیں۔ اس کے علاوہ ان ذرائع سے خارج ہونے والی سلفر ڈائی آکسائیڈ گیس فضا میں اگر ایک مقرّرہ مقدار سے زیادہ جمع ہو جائے تو یہ بارش کے پانی کے ساتھ گھل کر تیزاب بناتی ہے۔ ایسی بارش کو تیزابی بارش کہا جاتا ہے جو کہ پیڑوں اور سبھی جانداروں کے لیے نہایت نقصان دہ ہے۔ ان تیزابی بارشوں کا تجربہ سب سے پہلے جاپان کو ہوا تھا۔ ان زہریلی گیسوں کے فضا میں اکٹھا ہونے سے کبھی کبھی گھٹن بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہ عمل سردیوں کے دوران خاص طور سے ہوتا ہے، کیونکہ سورج کی تپش سے ہوا گرم ہو کر ہلکی ہوتی ہے اور اوپر اٹھتی ہے اگر فضا میں گرماؤ نہ ہو تو یہ ہوا بھاری ہو کر نیچے ہی رہتی ہے۔ اب اگر اس ہوا میں زہریلی گیسیں بھی شامل ہیں تو یہ آبادیوں کو ایک غلاف کی مانند لپیٹ لیں گی۔ یہ سب واقعات صنعتی سرگرمیوں کے نتیجے میں ہوتے ہیں اور آج کے سبھی صنعتی ممالک اپنے ابتدائی دور میں اِن سے گزرے ہیں۔ لندن میں ۱۹۵۲ء کی سردیوں میں ایسی ہی زہریلی گیسوں سے بھری دھند نے پانچ ہزار افراد کو ہلاک کر دیا تھا۔ یہ سب حادثات ہم کو سبق دیتے ہیں اور ایک راہ دکھاتے ہیں۔ احتیاط اور بچاؤ کی راہ۔ کثافت کو قابو میں کرنے کی جتنی ذمّہ داری حکومت کی ہے کم از کم اتنی ہی عوام کی بھی ہے۔ عوام کی کثرت اور اُن کے افعال کی وجہ سے ہی یہ آلودگی پیدا ہوتی ہے اور یہ سیدھا عوام کی بقا کا ہی مسئلہ ہے۔ دلّی میں گاڑیوں کی بڑی تعداد عوام کے پاس ہے۔ وہ دیکھیں کہ اُن کی گاڑی فضا کو خراب تو نہیں کرتی۔ جہاں تک کارخانوں کا تعلّق ہے تو ان میں سے بھی کافی کارخانے لوگوں کی ذاتی ملکیت ہیں۔ اُن کا فرض ہے کہ وہ اپنی فیکٹریوں میں آلودگی کو روکنے والے آلات لگائیں اور ایسے اسباب پیدا کریں کہ فضا کثیف نہ ہو۔ اِس سے اُن کے مزدوروں کی اور خود ان کی زندگی بھی محفوظ رہے گی۔ عوام کی طرف سے اس قسم کی پیش رفت نہ ہو تو حکومت کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ سخت قوانین بنائے اور ان کو صحیح انداز سے لاگو کرے تاکہ ہم اور آپ سب ہی جس ہوا میں سانس لیتے ہیں اس میں گھٹ کر نہ رہ جائیں۔

●●

"۔ ۔ ۔ دِلّی والوں کی طبیعت میں نفاست اور مزاج میں نزاکت کبھی بلا کی تھی ـــــ گالم گلوچ اور بُری سُری باتوں کا تو ذکر ہی کیا وہ تو اُن باتوں سے بھی احتراز کرتے رہتے جنھیں سُن کے طبیعت میں گھِن، خوف یا تکدّر پیدا ہو۔ سانپ کو رسّی، چھپکلی کو دیوار والی، سور کو جنگل والا، جھاڑو کو سُتھرائی، پاخانے کو جا ضرور اور دِق کو لمبی بیماری اِسی لیے کہا جاتا تھا۔ اَب چاہے آجکل والے اسے وہم کہیں یا جہالت، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اِس سے دِلّی والوں کی نفاستِ طبع کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ ۔ ۔"

ـــــ سیّد ضمیر حسن دہلوی
(مقدّمہ "مرحوم دِلّی کی ایک جھلک")

"۔۔۔ اکیسویں صدی میں ہمارا قیام کافی عرصے رہا اور اب ہم گھر واپس جانا چاہتے تھے لیکن ایک دن اچانک معلوم ہوا کہ جو یہاں آچکا ہے وہ واپس نہیں جاسکتا۔۔۔"

چلو اکیسویں (۲۱) صدی

معین اعجاز

اور پھر اچانک ہر طرف ایک نعرہ بلند ہوا کہ ـــــ "چلو اکیسویں صدی" یہ نعرہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا عموماً مختلف علاقوں کے لوگ اپنے مطالبات منوانے کے لیے دلّی آتے وقت بلند کرتے ہیں۔ "چلو دلّی" یا "دلّی چلو"۔ پہلے تو ہم نے یہ سمجھا کہ اکیسویں صدی، ایک خاص صدی کا نام ہے جو موجودہ صدی کے بعد آنے والی ہے لیکن بعد میں ہماری غلط فہمی دُور ہو گئی اور ہم نے یہ محسوس کیا کہ یہ کسی صدی کا نہیں بلکہ علاقے کا نام ہے، جہاں پہنچنے کے لیے لوگوں نے کافی زور و شور سے تیاریاں شروع کردی ہیں۔ ویسے بھی کوئی اکیسویں صدی کے "آنے" کی نہیں بلکہ ہر شخص وہاں "جانے" کی بات کر رہا تھا۔ جسے دیکھیے وہ اپنا بریف کیس یا جھولا لٹکائے اکیسویں صدی کی طرف رواں دواں ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ہمارے محلّے کے ایک سوشل ورکر بھی اکیسویں صدی میں داخل ہونے کی تیاریاں کرنے لگے حالانکہ اُن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بھگوتی جاگرن کے لیے چندہ مانگنے کے سوا مشکل ہی سے کسی اور کام کے لیے محلّے سے باہر قدم نکالتے ہیں۔

اکیسویں صدی کے سفر کے لیے فضا کچھ اس طرح ہموار ہوئی کہ اخباروں کے تمام تر مضامین کی تان اکیسویں صدی پر ٹوٹنے لگی۔ بعض سیاسی لیڈر اپنی تقریریں اکیسویں صدی سے شروع کرتے اور اکیسویں صدی ہی پر ختم بھی کرتے۔ ہاں بیچ بیچ میں کچھ اور باتیں بھی کرتے جاتے۔ ہم نے جب دیکھا کہ اکیسویں صدی سے مفر ممکن نہیں تو ایک دن خود بھی وہاں جانے کا فیصلہ کر بیٹھے۔ اب سب سے اہم سوال یہ تھا کہ وہاں جانے میں کتنا وقت لگتا ہے! دریں اثنا ہماری نظر ایک اخبار کے کارٹون پر پڑی جس میں ایک شخص اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا کہ ۔۔۔ "ذرا ناشتہ جلدی تیار کرنا کیونکہ سات بجے مجھے اکیسویں صدی جانا ہے اور آٹھ بجے واپس بھی آجانا ہے" گویا وہاں آنے جانے کے لیے ایک گھنٹے کا وقت کافی ہے۔ لیکن پھر ہم نے محسوس کیا کہ اتنے کم وقت میں تو صرف ہوائی جہاز سے یہ سفر طے کیا جاسکتا ہے۔ ٹرین سے جانا ہو تو دس، بارہ گھنٹے لگیں گے۔ اور اگر خوش قسمتی سے ڈی ٹی سی کی بس مل جائے تو شاید اس سے کم وقت لگے کیونکہ ڈی ٹی سی کی بسیں لال بتی زیبرا کراسنگ اور خطرناک سے خطرناک موڑ کی پروا کیے بغیر تمام گاڑیوں کو "اوورٹیک" کرتی ہوئی "بے خطر آتشِ نمرود میں"

کو دیکھتی ہیں۔

بہرحال جب اکیسویں صدی تک جانے کی تمام تر تیاریاں ہم نے مکمل کر لیں تو اپنے آپ کو ایک دن دلّی کے "انٹر اسٹیٹ بس ٹرمنل" پر کھڑا پایا۔ وہاں ہم نے ایک کنڈکٹر سے دریافت کیا کہ "کیا یہاں سے اکیسویں صدی کے لیے کوئی بس جاتی ہے؟" اس نے کہا "نہیں بابوجی! یہاں سے تو علی گڑھ، میرٹھ، مرادآباد اور سہارنپور کے لیے بسیں جاتی ہیں ویسے اس جگہ کا نام تو ہم نے بھی سُنا ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ بس کہاں سے جاتی ہے؟" ہم بہت دیر تک اکیسویں صدی جانے والی بس ڈھونڈتے رہے، لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ بالآخر ایک شریف آدمی کو ہماری حالت پر رحم آگیا اور اس نے ہمیں ایک پرائیویٹ جیپ پر بٹھا دیا۔ یہ سفر کوئی بارہ گھنٹے تک جاری رہا اور اس طرح ہم اکیسویں صدی میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ دیکھنے میں ایک انتہائی کشادہ سا میدان لگ رہا تھا اور جگہ جگہ مختلف ممالک کے پیویلین نظر آرہے تھے۔ اس کی شکل بالکل ویسی ہی تھی جیسی نئی دلّی کے پرگتی میدان کی ہے۔ پیویلین میں بھیڑ بھاڑ بھی ویسی ہی تھی جیسی عموماً یہاں بین الاقوامی تجارتی میلوں میں دیکھنے میں آتی ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کا رقبہ پرگتی میدان سے کہیں بڑا اور پیویلین بھی بے شمار تھے۔ ہم نے کئی ملکوں کے پیویلین دیکھے جہاں ان کی تعمیری اور ترقیاتی سرگرمیوں کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ لیکن اُس وقت سچ پوچھیے تو ہمیں کسی بھی ملک کی تعمیر و ترقی سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ ہم بڑی بے چینی سے اپنے ملک کا پیویلین تلاش کرنے لگے۔ ایک ایک سے پوچھا کہ بھئی ہندوستان کے پیویلین کو کون سا راستہ جاتا ہے لیکن کسی نے ہماری رہنمائی نہیں کی۔ اتفاق سے کچھ دیر بعد ایک ایشیائی باشندہ ملا جو ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ ہم نے پوچھا . . . "بھائی صاحب! کیا آپ ہمیں ہندوستانی پیویلین تک پہنچا دیں گے؟" اُس نے کہا۔ "ہاں کیوں نہیں، آئیے ہمارے ساتھ!" ہم دونوں ایک مخصوص طرز کی گاڑی پر بیٹھے جس پر ایک جگہ لکھا ہوا تھا: MADE IN 21ST CENTURY اس عجیب و غریب گاڑی نے پندرہ بیس منٹ میں ہمیں وہاں پہنچا دیا۔ یہاں کئی ایشیائی ملکوں کے پیویلین نظر آئے۔ ہندوستانی پیویلین کو دیکھ کر ہمارا دل بلّیوں اُچھلنے لگا۔ گویا ہم اپنے وطن پہنچ گئے وہاں اپنے کئی ساتھیوں سے ہماری ملاقات ہوئی۔ اور ہم نے مل جُل کر کئی ممالک کے پیویلین دیکھے۔ اِن تمام ممالک کے پیویلین میں، جن میں ہندوستان سے چھوٹے اور اس کے بعد آزاد ہونے والے کئی ممالک بھی شامل تھے، ایک بات مشترک نظر آئی۔ وہ یہ کہ سب کے سب اپنی اقتصادی اور صنعتی ترقی کے خاکے تیار کر رہے تھے وہ صرف مستقبل کی باتیں کر رہے تھے اور کسی دوسری چیز سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ نہ تو وہ روایات کی باتیں کر رہے تھے اور نہ مذہب اور زبان کے نام پر لڑنے جھگڑنے کی تدبیریں سوچ رہے تھے بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی! گویا ان کے نزدیک مذہب، ذات پات فساد اور توڑ پھوڑ کا نہ کوئی مسئلہ تھا اور نہ اہمیت! دوسری طرف ہمارے پیویلین میں گفتگو کا بنیادی موضوع روحانیت اور مذہبی مسائل سے تعلّق رکھتا تھا۔ مختلف قسم کے دَل، بھانت بھانت کی سینائیں اور ایکشن کمیٹیاں اپنے اپنے مستقبل کے پلان پر غور کر رہی تھیں اور لوگ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ اگر ہمارا مسئلہ حل نہیں ہوا تو ہم حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ ہم دل ہی دل میں بہت خوش ہوئے کہ روحانیت سے عاری اکیسویں صدی کے اس ماحول میں ہمارا ملک، مسائل کی رنگا رنگی سے دوسروں کو آشنا کر رہا تھا۔ دیکھنے والے بڑی دلچسپی سے یہ سب کچھ دیکھتے تھے اور شاید دل ہی دل میں رشک بھی کرتے تھے۔

اکیسویں صدی میں ہمارا قیام کافی عرصے رہا اور اب ہم گھر واپس جانا چاہتے تھے لیکن ایک دن اچانک ہمیں معلوم ہوا کہ جو یہاں آچکا ہے وہ واپس نہیں جا سکتا۔ تمام ملکوں کے تمام باشندے یہیں آنے والے ہیں۔ ہم بادلِ ناخواستہ اس دن کا انتظار کرنے لگے۔ آخر وہ دن بھی آگیا اور ہم اُس طرف جا کر کھڑے ہو گئے جدھر سے ہندوستانی کارواں آنے والا تھا۔ اچانک شور بلند ہوا:

"جے بجرنگ بلی"

"نعرۂ تکبیر اللہ اکبر"

"اکبری مسجد لے کے رہیں گے"

"مکتی سنگرام جاری ہے، جاری رہے گا"

"راج کرے گا خالصہ"

گویا ہندوستانی آ گئے۔ ہم نے دیکھا کہ کچھ دُوری پر چند سفید فام "جنٹلمین" کھڑے مسکرا رہے تھے۔ اُن میں سے ایک نے اپنے ایک ساتھی کی پیٹھ تھپتھپائی اور بولا :

WELL DONE MY BOY

ہم نے جوش میں آ کر ایک فلک شگاف نعرہ بلند کیا :
"جے اکیسویں صدی"

نئی کتابیں

مولانا ابوالکلام آزاد
شخصیت اور کارنامے

قیمت : ۸۴ روپے   صفحات : ۵۰۲
سائز : ڈیمائی
مرتب : ڈاکٹر خلیق انجم

مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستانی تاریخ کی عظیم ہستیوں میں سے ایک ہیں۔ بیسویں صدی کی مذہبی، فکری اور سیاسی زندگی کا کوئی اہم گوشہ ایسا نہیں جس پر مولانا آزاد اثر انداز نہ ہوئے ہوں۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے ان کے انتقال پر کہا تھا: "مولانا آزاد نے قومی تحریک کی جو رہنمائی کی، اس کی وجہ سے ہماری قومی تاریخ میں انھیں ہمیشہ بلند مقام حاصل رہے گا"

مولانا نے ایک طرف قید و بند اور دار و رسن کی آزمائشوں میں زندگی گزاری اور دوسری طرف اپنی قوم، بالخصوص مسلمانوں کی فکری قیادت کا مشکل فریضہ انجام دیا۔ سرسیّد نے مسلم فرقے کو جدید تعلیم کی طرف راغب کیا اور مذہب کو عصری زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ مولانا آزاد نے اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعے سرسیّد کے اس مشن کو آگے بڑھایا لیکن سیاسی نظریات میں ان سے اختلاف کیا۔ سرسیّد برطانوی حکومت کے حامی تھے اور اپنے فرقے سے بھی وہ یہی مطالبہ کرتے تھے۔ لیکن مولانا آزاد ابھی نوجوان ہی تھے جب ان میں غیر ملکی تسلّط کے خلاف بغاوت کا جذبہ پیدا ہوا اور اسی جذبے کے زیرِ اثر انھوں نے ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی رہنمائی کی۔

مولانا آزاد بڑی متنوع شخصیت کے مالک تھے: عالمِ دین، سیاسی مدبّر، تاریخ داں، فلسفی، ادیب، خطیب، صحافی اور ہر حیثیت میں منفرد۔ ایسے غیر معمولی انسان بار بار پیدا نہیں ہوتے۔

زیرِ نظر کتاب میں خلیق انجم صاحب نے ان مقالوں کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے جو مولانا کی شخصیت اور ان کے کارناموں پر، اردو اکادمی، دہلی کی طرف سے منعقدہ سہ روزہ کل ہند سیمینار میں پڑھے گئے تھے۔ کتاب الگ الگ عنوانات کے تحت چھ حصّوں میں منقسم ہے۔ مولانا آزاد کے والد اور بھائی کی تصانیف کے سرورق کے عکس، مولانا کا عکسِ تحریر اور ان کی متعدد نادر تصاویر بھی شاملِ کتاب ہیں۔ مولانا کے عقیدت مندوں کے لیے بھی اور ان لوگوں کے لیے بھی جو مولانا آزاد کی شخصیت و سیرت کو سمجھنا اور ان کے علمی اور سیاسی کارناموں سے واقف ہونا چاہتے ہیں، یہ کتاب ایک قیمتی تحفہ ہے۔

داغ دہلوی
حیات اور کارنامے

قیمت : ۳۱ روپے   صفحات : ۲۳۸
سائز : ڈیمائی   مرتب : ڈاکٹر کامل قریشی

داغ دہلوی اپنے زمانے کے مقبول ترین شاعر تھے۔ انھوں نے دلی کے لال قلعے میں، جسے دلی والے لال حویلی بھی کہتے تھے، شعور کی آنکھ کھولی۔ اس وقت تک مغل سلطنت اگرچہ اپنے زوال کی آخری حدوں میں داخل ہو چکی تھی لیکن لال قلعہ پھر بھی ان تہذیبی اور ثقافتی روایات کو سنبھالے ہوئے تھا جو صدیوں کی پروردہ تھیں بہادر شاہ ظفر کو چونکہ امورِ سلطنت سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا اس لیے ان کا زیادہ تر وقت تہذیبی اور ثقافتی مشاغل ہی میں گزرتا تھا۔ وہ خود شاعر تھے اور ان کی وجہ سے دوسرے سلاطین اور شہزادوں میں بھی شعر گوئی کا ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ لال قلعے میں اکثر و بیشتر مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے اور ذوق اور غالب جیسے سربرآوردہ شاعروں کی صدائیں وہاں کے در و دیوار میں گونجتی رہتی تھیں۔ داغ کی شاعری اسی ماحول میں پروان چڑھی۔ اس میں عصری حقیقتوں سے صرفِ نظر اور اپنے آس پاس کی محدود دنیا میں عافیت کی تلاش کا وہ میلان غالب ہے جو اس عہد کے زوال پذیر معاشرے کی پہچان بن گیا تھا۔ اس لحاظ سے داغ کو اپنے عہد کا ایسا عکاس کہا جا سکتا ہے جس کی نظر دور بینی یا ژرف بینی سے تو محروم تھی لیکن وہ سب کچھ دیکھ سکتی اور دکھا سکتی تھی جو سطح کے اوپر موجود تھا۔ اپنے زمانے میں داغ کی شاعرانہ مقبولیت کا ایک بڑا سبب غالباً یہ بھی رہا ہوگا۔

لیکن داغ کی شاعری کا ایک اور اہم پہلو ان کی سادہ، سلیس اور عام فہم زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ انھوں نے زبان کو جس طرح سنوارا، نکھارا اور اس میں روزمرہ کی جو چاشنی بھری، شوخی اور شگفتگی کی جو رنگ آمیزی کی وہ انھی کا حصہ ہے۔ دوسرا کوئی شاعر اس وصفِ خاص میں ان کا شریک نہیں۔ غالب نے ایک بار نثار علی شہرت سے کہا تھا کہ "دہلی والوں کی جو اردو ہے، اسی کو اشعار میں لکھنا چاہیے۔ آخر عمر میں ہماری تو یہی رائے قائم ہوئی ہے"۔ شہرت نے پوچھا کہ "داغ کی اردو کیسی ہے؟" غالب نے جواب دیا "ذوق نے اردو کو اپنی گود میں پالا تھا۔ داغ اس کو نہ فقط پال رہا ہے بلکہ اس کو تعلیم دے رہا ہے"

داغ "جہاں استاد" بھی تھے۔ ان کے ہزاروں شاگرد ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں امرا، شرفا، علما، عامی اور ہر مذہب و ملت کے لوگ شامل تھے۔ داغ نے ان سب کی فنی تربیت کی اور انھیں زبان و بیان کے وہ گر سکھائے جو شاید کسی اور سے نہیں سیکھے جا سکتے تھے۔ یہ اردو زبان اور اردو شاعری پر داغ کا ایسا احسان ہے جو کبھی فراموش نہیں کیا جانا چاہیے۔

اردو اکادمی، دہلی نے ۹ اور ۱۰ فروری ۱۹۸۵ء کو داغ پر دو روزہ کل ہند سیمینار منعقد کیا تھا جس میں ممتاز محققوں اور ناقدوں نے داغ کی زندگی، شخصیت اور فن پر مقالے پڑھے تھے۔ یہ کتاب انھی مقالات پر مشتمل ہے اور سلیقے سے مرتب اور شائع کی گئی ہے۔ سرورق داغ کی تصویر سے مزین ہے۔

دلّی والے

صفحات: ۳۵۷
سائز: ڈیمائی
قیمت: ۳۶ روپے
مرتب: ڈاکٹر صلاح الدین
ناشر: اردو اکادمی، دہلی

میر نے لکھنؤ پہنچ کر دلی کو یاد کرتے ہوئے کہا تھا:

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

واقعہ یہ ہے کہ کچھ تو دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے اور کچھ تہذیب و ثقافت کا کلیدی مرکز ہونے کی بنا پر دلی ہمیشہ مرجع خلائق رہی، دور دور کے اہلِ کمال خواہ وہ زندگی کے کسی شعبے سے تعلق رکھتے ہوں، اس کی طرف کھنچے چلے آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ خود اس سرزمین نے بھی ہر شعبۂ حیات میں بڑے بڑے باکمال پیدا کیے جنھوں نے اس کی شہرت اور عظمت کو چار چاند لگا دیے۔ خواجہ الطاف حسین حالی نے ۱۸۵۷ء کی بربادی کے بعد دلی کا مرثیہ لکھتے ہوئے بالکل سچ کہا تھا:

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں ایسا خزانہ ہرگز

اس میں کچھ شک نہیں کہ دلی کی خاکِ پاک میں ہزاروں کیا لاکھوں گوہر یکتا دفن ہیں مگر ان کے کارنامے اور ان کی یادیں ان کے ساتھ دفن نہیں ہوئیں۔ ان یادوں کو زندہ رکھا جا سکتا ہے اور

اس لیے ضروری ہے کہ باکمال بزرگوں کے کارناموں کی یادیں، ان شخصیتوں کا تصور اور ان کے معمولاتِ زندگی سے واقفیت، بعد کے لوگوں کے لیے، اگر وہ صاحبِ توفیق ہیں، سرچشمۂ فیضان ہوا کرتی ہے۔

اُردو اکادمی، دہلی نے پرانے دلّی والوں کی یاد تازہ کرنے کے لیے "دلّی والے" کے زیرِ عنوان ایک سہ روزہ سیمینار ۱۹۸۴ء میں منعقد کیا اور دوسرا ۱۹۸۵ء میں۔ دونوں سیمیناروں میں دلّی کی ان برگزیدہ شخصیتوں کے خاکے پڑھے گئے جو اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ دلّی والوں کی تعریف یہ متعین کی گئی کہ ان میں صرف وہ لوگ ہی شامل نہیں جو دلّی میں پیدا ہوئے، وہ لوگ بھی شامل ہیں جنھوں نے دلّی میں رہ کر اپنی پہچان قائم کی خواہ وہ کہیں پیدا ہوئے ہوں، کسی بھی زبان کے بولنے والے ہوں اور کسی بھی مسلک و مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس طرح یہ سیمینار میر و سودا کے زمانے سے ماضی قریب تک کی ان شخصیتوں کے کارناموں کو موجودہ نسل تک پہنچانے کا ایک موثر وسیلہ بن گیا جنھوں نے دلّی کی ادبی، تہذیبی، ثقافتی، تجارتی، سیاسی، یا مذہبی زندگی میں سرگرم حصہ لیا اور اس پر اپنے اثرات مرتب کیے۔

سیمینار میں بعض ایسی شخصیتوں کے خاکے بھی پیش کیے گئے جنھوں نے بظاہر کوئی امتیازی کارنامہ انجام نہیں دیا لیکن جو ان خصوصیات کا مرقع تھیں جن سے 'دہلویت' عبارت ہے۔

یہ کتاب ان خاکوں کا مجموعہ ہے جو ۱۹۸۴ء کے سیمینار میں پڑھے گئے۔ کل ۴۳ خاکے ہیں جو مختلف اہلِ قلم نے لکھے ہیں۔ آخر میں خاکہ نگاروں کا بھی مختصر تعارف شامل کر دیا گیا ہے جس سے کتاب کی دستاویزی حیثیت اور بڑھ گئی ہے۔ اُمید رکھنی چاہیے کہ اُردو اکادمی ۸۵ء کے سیمینار میں پڑھے جانے والے خاکوں کو بھی اس کتاب کی دوسری جلد کی صورت میں شائع کرنے کا اہتمام کرے گی۔

رسومِ دہلی

صفحات : ۲۰۸ سائز : ڈیمائی

قیمت : ۲۸ روپے

مصنّف : مولوی سیّد احمد دہلوی

مرتّب : خلیق انجم

دہلی کی آخری شمع

صفحات : ۱۴۷ سائز : ڈیمائی

قیمت : ۲۳ روپے

مصنّف : مرزا فرحت اللہ بیگ

مرتّب : ڈاکٹر صلاح الدین

بزمِ آخر

صفحات : ۱۲۴ سائز : ڈیمائی قیمت : ۲۱ روپے

مصنف : منشی فیض الدین مرتّب : ڈاکٹر کامل قریشی

دِلّی کا آخری دیدار

صفحات : ۷۴ سائز : ڈیمائی

قیمت : ۱۷ روپے

مصنّف : سیّد وزیر حسن دہلوی

مرتّب : سیّد ضمیر حسن

قلعۂ معلّٰی کی جھلکیاں

صفحات : ۷۲ سائز : ڈیمائی

قیمت : ۱۷ روپے

مصنّف : عرش تیموری

مرتّب : اسلم پرویز

یہ پانچوں کتابیں بھی اُردو اکادمی، دہلی کی شائع کردہ ہیں اور ان میں دلّی کی معاشرتی فضا، سماجی رسم و رواج اور یہاں کی ثقافتی زندگی کے مرقعے صفحۂ قرطاس پر ایسے لوگوں نے کھینچے

اس بار جگہ کم پڑ جانے کی وجہ سے
ان کالموں میں صرف دہلی کی ادبی سرگرمیوں
کی رپورٹ پیش کی جارہی ہے۔ آئندہ ماہ سے انشاء اللہ
پوری اردو دنیا کی خبریں دی جایا کریں گی۔

اردو کا خبر نامہ

اردو ریسرچ اسکالرز سیمینار

اردو اکادمی، دہلی کے زیر اہتمام "اردو ریسرچ اسکالرز سیمینار" ۲۹ / ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں منعقد ہوا۔ ہندوستان میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا سیمینار تھا جو صرف ریسرچ اسکالرز کے لیے منعقد کیا گیا تھا اور جس میں نوجوان طلبہ وطالبات کے علاوہ اساتذہ اور دوسرے دانشوروں نے بھی شرکت کی۔ دلی کی تین بڑی یونیورسٹیوں یعنی جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی یونیورسٹی اور جواہرلال نہرو یونیورسٹی کے طلبہ و اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز پہلی بار ایک چھت کے نیچے مل بیٹھے ایک دوسرے کے علمی نتائج کو سب نے مل کر پوری توجہ سے سُنا اور آپس میں تبادلۂ خیال کیا۔

پروفیسر مونس رضا نے اپنے خطبۂ افتتاحیہ میں علمی کام کی ضرورت اور تحقیق کی مبادیات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے فرمایا کہ اگرچہ انسان کا علم بڑھ رہا ہے لیکن علم میں کوئی بھی چیز حرفِ آخر نہیں ہے۔ انسان کی ترقی کا ہر قدم نئی تشنگی کا احساس دلاتا ہے۔ لوگوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ نئی نسل گمراہ ہے، علمی معیار گرتے جارہے ہیں یا نوجوان نسل ذہن و شعور سے عاری ہے۔ ایسا سوچنا بالکل غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت سے معاملوں میں آج کی نوجوان نسل بوڑھوں کے مقابلے میں زیادہ آگاہ ہے۔ آخر میں انھوں نے ریسرچ اسکالرز اور نگراں کے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے موجودہ تحقیقی ماحول اور طریقِ کار میں اصلاح پر زور دیا تاکہ ریسرچ اسکالرز اور نگراں کے تعلقات کو خوشگوار بنایا جاسکے۔

اختتام پر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ تحقیق بے حد دشوار گزار اور کٹھن راہ ہے۔ اس میں انتہائی دل سوزی اور لگن سے کام کرنا پڑتا ہے۔ لیکن تحقیق کے موجودہ تصور کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ تحقیق کو صرف سوانح مرتب کرنے یا متن ترتیب دینے تک ہی محدود نہیں ہونا چاہیے بلکہ تحقیق کا کوئی کلی تصور سخن فہمی، تحسین شناسی یا روایت آگہی کے بغیر ممکن نہیں ہوسکتا۔

کل ہند مشاعرہ جشنِ جمہوریت

۲۴ جنوری ۸۷ء کو جشنِ جمہوریت کا کل ہند مشاعرہ اردو اکادمی دہلی اور ساہتیہ کلا پریشد دہلی کے اشتراک میں لال قلعے کے سبزہ زار پر منعقد ہوا۔ مشاعرے کی صدارت ایگزیکٹو کونسلر (تعلیمات) جناب کلانند بھارتیہ نے فرمائی اور مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے لیفٹننٹ گورنر محترم ایچ۔ ایل کپور صاحب محترم کلانند بھارتیہ صاحب نے مشاعرے کے شرکا کو خطاب کرتے ہوئے یاد دلایا کہ ۲۶ جنوری کا دن

دائیں سے بائیں: جنابِ تسیم احمد صدیقی، جنابِ پرشوتم گوئل، لیفٹننٹ گورنر جنابِ ایچ۔ ایل۔ کپور، جناب کلانند بھارتیہ، جنابِ راہی شہابی اور مائک پر جنابِ مجروح سلطان پوری

جس کی مبارک تقریبات کے سلسلے میں یہ مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے، وہ مبارک دن ہے جب ہندوستان کی آزادی اور خود مختاری کا خواب پورا ہوا اور ایک جمہوری نظام کی صورت میں اس خواب کی روشن تعبیر ہمارے سامنے آئی۔ اسی دن ہمارا قومی آئین ملک میں لاگو ہوا ــــ اس آئین نے جہاں ہمیں وہ ساری آزادیاں دی ہیں، جن کی ہم تمنّا رکھتے تھے، وہاں ہمیں کچھ ذمہ داریاں بھی سونپی ہیں۔ سچ یہ ہے کہ ہم ان ذمہ داریوں کو پورا کرکے ہی آزادی کا صحیح لطف اٹھا سکتے ہیں اور اس کی برکتیں حاصل کر سکتے ہیں۔ ہماری ان ذمہ داریوں میں سب سے بڑی ذمہ داری ہندوستان کی اکھنڈتا اور سلامتی کی حفاظت ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ پورے ملک میں ایک جذباتی اور ذہنی ہم آہنگی کی فضا پروان چڑھے۔"

انھوں نے مزید کہا کہ: "ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے ــــ یہاں کئی مذہبوں کے ماننے والے اور کئی زبانوں کے بولنے والے آباد ہیں۔ ان کے کلچر میں بھی رنگارنگی ہے لیکن اسی رنگا رنگی میں یک رنگی بھی یہاں ہمیشہ قائم رہی ہے اور ہم سب مل جل کر ایک بڑے خاندان کی طرح یہاں رہتے آئے ہیں۔ آج اس شاندار روایت کو اور زیادہ مضبوط بنانے کی ضرورت ہے۔"

لیفٹننٹ گورنر محترم ایچ۔ ایل۔ کپور صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہمارا آئین، قوم کے ہر فرقے کو صرف یہ حق ہی نہیں بلکہ یہ ضمانت بھی دیتا ہے کہ وہ اپنے مذہب پر عمل کرے، اپنے کلچر میں جیے اور اپنی زبان بولے۔ مذہب، کلچر، رنگ، نسل اور زبان کی بنیاد پر کسی کو نہ کوئی بڑا درجہ دیا گیا ہے، نہ اس کا درجہ گھٹایا گیا ہے۔ سب کو ایک جیسے موقعے اور سہولتیں دی گئی ہیں ــــ یہ گنجائش بھی رکھی گئی ہے کہ اگر کوئی گروہ کسی وجہ سے یہ محسوس کرے کہ کہیں اس کی حق تلفی ہو رہی ہے تو وہ بلا روک ٹوک اس کا اظہار کر سکتا ہے اور ان جمہوری طریقوں سے جو ہمارے آئین نے ہمیں سکھائے ہیں، اپنا حق حاصل کر سکتا ہے۔"

انھوں نے کہا کہ: "جب ہمیں یہ سبھی جمہوری سہولتیں حاصل ہیں تو اپنا کوئی چھوٹا بڑا مطالبہ منوانے کے لیے غیر جمہوری طریقوں کا سہارا لینا غلط ہے۔ تشدد اور انتشار کے میلان کو بڑھاوا دینا اور فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکا کر غیر ذمہ دارانہ سیاسی کھیل کھیلنا ملک اور قوم کے لیے بھی نقصان دہ ہے اور خود یہ کھیل کھیلنے والوں کو بھی اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔"

لفٹیننٹ گورنر صاحب نے آخر میں ہندوستان بھر کے عوام سے اپیل کی کہ "آپ ایک آزاد ملک کے شہری کی حیثیت سے اس ملک کے جمہوری نظام اور جمہوری روایات کی حفاظت کریں اور اتحاد و اتفاق، یک جہتی اور رواداری کے ان قیمتی اصولوں کو کسی حالت میں ہاتھ سے نہ جانے دیں جو صدیوں کے سفر میں ساتھ رہے ہیں اور مستقبل کے لیے بھی چراغِ منزل ہیں۔" انھوں نے شعرا سے خصوصی طور پر مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے پُراثر کلام سے تعمیری جذبات کو ابھاریں اور تشدد اور تخریب اور فرقہ واریت کے گھاتک میلانات کے خلاف

آواز بلند کریں کہ اسی میں ملک و قوم کی نجات ہے۔

مشاعرے کی نظامت اس سال جناب ثقلین حیدر نے کی جنھیں کلکتے سے اسی مقصد کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ مندرجۂ ذیل بیرونی اور

رسمِ اِجرا

۶ فروری ۱۹۸۷ء کو غالب اکیڈمی میں شجاع خاور کی غیر مطبوعہ غزلوں پر مشتمل شعری مجموعے "مصرعِ ثانی" کی رسمِ اجرار کے موقع پر ایک ادبی جشن کا اہتمام کیا گیا۔ جلسے کا انعقاد غزل آباد کلچرل سوسائٹی کی طرف سے سراج درین نے کیا۔ جلسے کی صدارت محترمہ قرۃ العین حیدر نے کی۔ کتاب کا اجرار نئے انداز میں ہوا اور شجاع خاور کی خواہش کے مطابق ایک اردو میڈیم اسکول (اینگلو عربک سینیئر سیکنڈری اسکول) میں زیرِ تعلیم ایک اردو طالب علم محمد جمال سے کتاب کا اجرار کرایا گیا۔ یہ جہاں ایسے موقعوں پر غیر متعلقہ سیاسی یا سماجی شخصیتوں کو مہمانِ خصوصی بنانے کی مصلحت پر ایک خاموش تبصرہ تھا وہاں اس بات کا مثبت اشارہ بھی کہ اردو میڈیم اسکولوں میں زیرِ تعلیم آج کے ہمارے طالب علم بھی اردو اور اردو کی کتابوں کے مستقبل کے لیے بہت اہم ہیں

دہلی کی متعدد اہم ادبی شخصیتیں اس جشن میں نظر آرہی تھیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ، شمیم حنفی، عنوان چشتی۔ عمیق حنفی، اور گوپال متل نے شجاع خاور کے فنِ شاعری پر عموماً اور "مصرعِ ثانی" کی غزلوں پر خصوصاً مفصّل تقریریں کیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ بظاہر سادہ اور سیدھی نظر آنے والی یہ شاعری بہت ساری پیچیدگیاں اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ پروفیسر عنوان چشتی نے شجاع خاور کی فنکارانہ دسترس اور بحر و اوزان کے تنوّع کا خاص طور سے ذکر کیا۔ عمیق حنفی نے کہا کہ شجاع خاور کی غزل پڑھ کر ہمیں نظیر اکبرآبادی، شاد عارفی اور یگانہ چنگیزی کی یاد آتی ہے یہ بڑی دلچسپ اور مزے دار شاعری ہے۔ شمیم حنفی نے کہا کہ شجاع خاور کی غزلوں کے لہجے میں فلسفیانہ پوز اور تصنّع آمیز متانت سے انحراف ہے۔ گوپال متل نے کہا کہ شجاع خاور نے بڑی خوش اسلوبی سے صوتی قافیے اپنی غزل میں سموئے ہیں ان کی غزل میں تازہ ہوا کے جھونکے کی سی کیفیت ہے۔ مقرّرین کے اظہارِ رائے کے بعد شجاع خاور نے "مصرعِ ثانی" کی غزلوں میں سے کچھ اشعار پڑھ کر سنائے اور خوب داد پائی۔

اپنے صدارتی کلمات میں قرۃ العین حیدر نے کہا کہ وہ کتابوں کے اجرار کی معمولاتی تقریبوں سے گریز کرتی ہیں مگر انھیں شجاع خاور کی شاعری اس شاعری سے بہت مختلف محسوس ہوئی جو آج کے بیشتر شعرار بطورِ عادت لکھتے اور شائع کراتے رہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس تقریب کی صدارت پر وہ یوں بھی آمادہ ہوئیں کہ اس شعری مجموعے میں شاعر کا لکھا ہوا ایک نثری بیان انھیں بہت پسند آیا۔

جلسے کی نظامت ڈاکٹر اسلم پرویز نے انجام دی۔

"نئی تعلیمی پالیسی اور اُردو تدریس"

دو روزہ کُل ہند سیمینار

۷، ۸ فروری ۸۷ء کو "نئی تعلیمی پالیسی اور اردو تدریس" کے موضوع پر دو روزہ کل ہند سیمینار اردو اکادمی کے دفتر واقع گھٹا مسجد روڈ میں منعقد ہوا۔ اس سیمنار کا مقصد تھا نئی تعلیمی پالیسی میں اردو اور اردو تدریس کے مسائل پر غور و غوض، اور اردو کے جائز مقام کے تعیّن کی کوشش۔

سیمینار کا پہلا اور افتتاحی اجلاس جناب سیّد حامد سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی صدارت میں ½ ۱۰ بجے شروع ہوا۔ سیمینار کمیٹی کے چیرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ اردو والوں نے نئی تعلیمی پالیسی کا اپنے مطالبات کی روشنی میں احتساب نہیں کیا اور یہ سیمینار اس لحاظ سے اہم ہے کہ ہم اپنے مطالبات کا احتساب کریں۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستانی سماج کثیر لسانی سماج ہے۔ شمالی ہندوستان میں سہ لسانی فارمولے کی تعبیر میں اب ہندی اور انگریزی کے بعد جنوبی ہند کی زبانوں کو جگہ دی جارہی ہے۔ اردو والے اس بارے میں غور کریں، اردو والوں کے لیے جنوبی ہند کی زبان کی شرط نہیں ہونی چاہیے۔ اردو تو خود قومی یکجہتی کی زبان ہے۔ لہٰذا دے اسکولوں میں تیسری زبان شمالی ہند میں اردو ہونی چاہیے۔

صدرِ جلسہ جناب سیّد حامد نے "اقلیتوں کے لیے درس و تدریس کے آئینی تحفظات اور نئی تعلیمی پالیسی" پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ گرچہ نئی تعلیمی پالیسی میں اقلیتوں کو تمام آئینی تحفظات فراہم کیے گئے ہیں لیکن

ر کو نظرانداز کر کے بڑی ناانصافی کی گئی ہے۔ انھوں نے اردو عوام
اقلیتوں کو بیدار ہونے اور اپنے مطالبات کو منوانے کے لیے ارباب
اقتدار کے ساتھ گفتگو اور اشتراک کا عمل شروع کرنے کا مشورہ دیا۔ نئی
تعلیمی پالیسی کے نفاذ میں جہاں کہیں بھی ناانصافی ہو فوراً اس کی نشاندہی
کی جائے۔ اور نئی تعلیمی پالیسی سے جو فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اس کی تیاری
جانفشانی عرق ریزی اور بیدار مغزی کے ساتھ کرنی چاہیے۔
جناب سید ہاشم علی وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ——
—— نے اپنے صدارتی کلمات میں تمام مقالوں
کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے ایک مشورہ دیا کہ اگر تمام مذاہب کی اخلاقی
قدروں کو اردو میں ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو یہ ایک مفید کام ہوگا۔

آخر میں چند اہم تجاویز ایوان کی منظوری کے لیے پیش کی گئیں طے پایا کہ تو
تجاویز ہیں مرکزی اور ریاستی سرکاروں کو عملی اقدام کے لیے بھیجی جائیں پانچ
قرار دادوں کا روئے سخن خود اردو والوں کی طرف ہے کہ اپنی زبان کے
تحفظ اور بقا کے لیے ان پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اور نئی تعلیمی
پالیسی سے وہ کس طرح استفادہ کر سکتے ہیں۔

حکومت کو بھیجی جانے والی قرار دادوں میں اس بات پر زور دیا
گیا ہے کہ نئی تعلیمی پالیسی میں سب سے بڑی اقلیتی زبان اردو کا ذکر ہونا
چاہیے اور تیسری زبان کے طور پر جنوبی ہندوستان کی زبانوں کا جو
ذکر کیا گیا ہے وہ دراصل اردو کی قیمت پر ہے۔ ہندی علاقوں میں
ہندی اور انگریزی کے علاوہ اردو کے لیے گنجائش نکالنی چاہیے تھی
جبکہ وہاں جنوبی ہندوستان کی زبانوں کا خصوصی ذکر کیا گیا ہے۔
سیمنار کی عام رائے یہ تھی کہ پہلے تیسری زبان کے طور پر کلاسیکی
زبان کو شامل کر کے اردو کے ساتھ بے انصافی کی جاتی رہی ہے اور اب
جنوبی ہندوستان کی زبانوں کا تذکرہ کر کے اردو کا راستہ بند کر دیا
جائے گا۔ اردو والے تو جنوبی زبانوں کو آندھرا، کرناٹک وغیرہ
میں پڑھیں گے ہی نئی تعلیمی پالیسی اور نوادوے اسکولوں میں ہندی
علاقوں میں اردو کی تعلیم کا خصوصی انتظام بہت ضروری ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین: قومی اور ادبی خدمات

دو روزہ سیمینار

۱۴ فروری، ۸۰ء کو صبح دس بجے غالب اکیڈمی کے آڈیٹوریم
میں اردو اکادمی دہلی کی طرف سے سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین
مرحوم کی قومی اور ادبی خدمات پر ایک دو روزہ سیمینار کا افتتاح سابق
مرکزی وزیر اور ذاکر صاحب کے قریبی عزیز جناب خورشید عالم خاں
صاحب نے کیا —— موصوف نے اردو اکادمی کے اس
اقدام کو سراہتے ہوئے کہا کہ ذاکر صاحب ان شخصیتوں میں ہیں جو اپنی زندگی
میں بھی مخدوم و مکرم رہے اور انتقال کے بعد بھی۔ جیسے جیسے وقت
گزرتا جا رہا ہے، ان کی عظمت کا احساس فزوں سے فزوں تر ہوتا جا رہا
ہے۔ انھوں نے کہا کہ ذاکر صاحب ایک سچے مسلمان اور سچے محب وطن تھے
اور ان کے نزدیک ان دونوں باتوں میں کوئی ٹکراؤ نہیں تھا۔ ان کی
ہمیشہ یہ تمنا رہی کہ ہندوستانی مسلمان بڑھ چڑھ کر تعمیر وطن کے کاموں
میں حصہ لیں اور گروہی فرقہ بندی سے اوپر اٹھ کر اپنی زندگی کو قومی
روایات کے سانچے میں ڈھالیں۔
کرنل بشیر حسین زیدی صاحب نے کہا کہ ذاکر صاحب
ایک ہمہ صفت موصوف انسان تھے اور ان میں مختلف اعلیٰ انسانی
اوصاف اس طرح رچ بس گئے تھے جس طرح دھنک میں سات رنگ۔
وہ ہماری گنگا جمنی تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ انھوں نے گاندھی
جی کی قیادت میں آزادی کی جنگ میں حصہ لیا اور آزادی کے بعد ملک
کی تعمیر نو میں پنڈت جواہر لال نہرو اور دیگر زعماء سیاست کے شریک کار
رہے۔ انھوں نے تعلیم کو قومی کردار سازی کا ذریعہ بنانے کی کوشش
کی۔ وہ روشن خیالی، وسیع النظری اور بے لوث انسانی خدمت کا
پیکر تھے۔ ہمیں آج کے حالات میں ان کی زندگی سے بطور خاص سبق
لینے کی ضرورت ہے۔ زیدی صاحب کے خطبہ صدارت کے ساتھ ہی
مقالہ خوانی کی پہلی نشست کے اختتام پذیر ہونے کا اعلان کیا گیا۔
مقالہ خوانی کی دوسری نشست سوا تین بجے پروفیسر مسعود حسین
خاں کے زیر صدارت ہوئی —— اور نظامت کے فرائض غالب
اکیڈمی کے سکریٹری جناب ذہین نقوی نے سنبھالے۔

اگلے دن کی صبح کی نشست کی صدارت جسٹس حمید اللہ
بیگ صاحب چیرمین مائنارٹیز کمیشن نے کی اور نظامت کے فرائض
ڈاکٹر صلاح الدین نے انجام دیے۔
سیمینار کی آخری نشست سید حامد صاحب کی صدارت
میں ہوئی۔ نظامت کے فرائض عبدالحق خاں صاحب نے انجام دیے۔

ایوانِ اُردو دہلی، مئی ۱۹۸۷ء
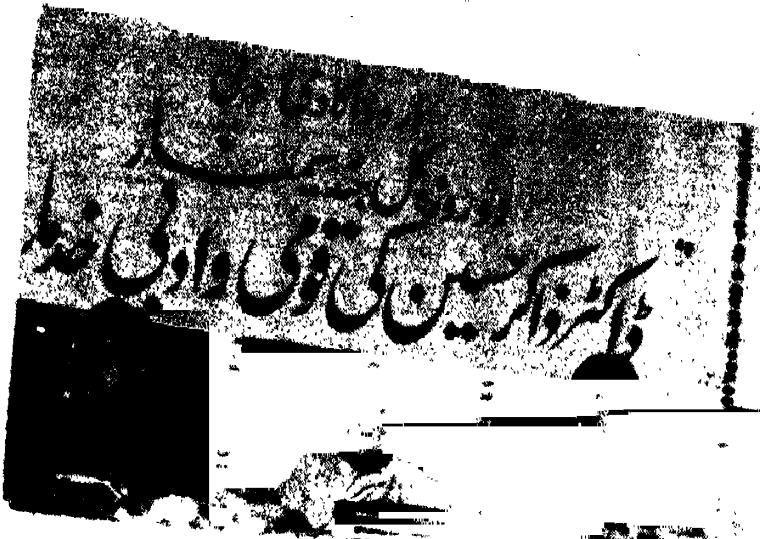
دائیں سے:
کرنل بشیر حسین زیدی
جناب خورشید عالم خاں
بیگم صالحہ عابد حسین
ڈاکٹر کامل قریشی

سیّد حامد صاحب نے ذاکر صاحب کی مجموعی قومی خدمات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ذاکر صاحب نے ایک سچے مسلمان اور مخلص ہندوستانی کی حیثیت سے قومی زندگی میں جو اہم کردار ادا کیا وہ قابلِ تقلید ہے۔

اُردو شاعری کی ہندی اصناف

سہ روزہ کُل ہند سیمینار

۲۸ فروری تا ۲ مارچ ۸۷ء "اُردو شاعری کی ہندی اصناف" کے موضوع پر غور و فکر کے لیے ایک سہ روزہ کل ہند سیمینار اُردو اکادمی دلّی کے زیرِ اہتمام غالب اکیڈمی میں منعقد ہوا۔ مقصد اُردو اور ہندی کے باہمی رشتوں اور ان بنیادوں کی نشاندہی کرنا تھا جن پر یہ دو زبانیں اپنے آغاز سے لے کر اب تک ایک دوسرے کی بقا اور ترقی میں معاون و مددگار رہی ہیں۔

سیمینار کا افتتاحی اجلاس پروفیسر آل احمد سرور کی صدارت میں صبح ساڑھے دس بجے ہوا۔ سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے دلّی کے لیفٹننٹ گورنر اور اکادمی کے چیرمین جناب ایچ۔ ایل۔ کپور نے کہا کہ مُلک کے موجودہ حالات میں جب زبان، ثقافت اور مذہب کے نام پر بھائی کو بھائی سے لڑانے کی مذموم کوشش کی جارہی ہے، یہ ضروری ہے کہ وہ مشترکہ تہذیبی اور لسانی قدریں تلاش کی جائیں اور ان کی پہچان ... رشتے میں پروتی ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ اس سیمینار کا مقصد صرف دو زبانوں کے لسانی رشتوں کی نشاندہی کرنا ہی نہیں بلکہ تخلیقی رویّوں اور شعری سرچشموں کا بھی جائزہ لینا ہے۔

اپنے خطبۂ صدارت میں پروفیسر آل احمد سُرور نے کہا کہ اُردو ہندوستان کے مشترکہ کلچر کی زبان ہے اردو کا نقصان ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا نقصان ہے۔

سیمینار کی پہلی نشست پروفیسر نذیر احمد کی صدارت میں ہوئی۔ کاظم علی خاں نے "اردو کے آئینۂ شعر و سخن میں ہندی خدوخال کی جلوہ گری" کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔

"اُردو میں بارہ ماسے کی روایت" پر مقالہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے کہا کہ بارہ ماسے کی روایت کا آغاز راگ رتھوں سے ہوا۔ اُردو بارہ ماسے کی روایت بھی اسی روایت سے جڑی ہوئی ہے جو چار سو سال پرانی ہے۔

دوسرا اجلاس پروفیسر مغنی تبسم کی صدارت اور جناب اختر الوا... کی نظامت میں ہوا۔ "اُردو میں گیت اور نعت کی روایت" پر ڈاکٹر ... انصار اللہ نظر نے مقالہ پڑھا۔ پروفیسر شہاب سرمدی کے مقالے کا عنوا... "اُردو اور ہندی کا اشتراک عمل تھا۔"

ڈاکٹر گیان چند جین کا مقالہ "دکنی و گجری شاعری میں ہندی اصنا..." کو ڈاکٹر عابد پشاوری نے پڑھا۔ پروفیسر نذیر احمد نے "مسعود سعد سلم... اور بارہ ماسہ" پر مقالہ پڑھا۔

یکم مارچ کو تیسرا اجلاس ظ۔ انصاری کی صدارت میں ہوا۔ ...

محمد صابرین نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ یہ اجلاس لوک گیتوں کے لیے مخصوص تھا اس میں پانچ مقالے پڑھے گئے۔ جناب بھیشو دیال نے "دلّی کے لوک گیت" پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اُردو کے جو لوک گیت ہم تک پہنچے ہیں ان کا سلسلہ دلّی میں مسلم حکمرانوں کے دور سے شروع ہوتا ہے۔ کاظم علی خاں نے "اتر پردیش کے لوک گیتوں کی روایت" پر گفتگو کرتے ہوئے مختلف مواقع پر گائے جانے والے لوک گیتوں کے نمونے پیش کیے سلیمان اطہر جاوید نے "جدید اُردو شاعری میں گیت" کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔

چوتھا اجلاس پروفیسر مسعود حسین خاں کی صدارت میں ہوا ایم حبیب خاں نے "اردو میں دوہے کی روایت" سے گفتگو کرتے ہوئے دوہے کی اہمیت پر روشنی ڈالی شمس الرحمٰن فاروقی نے "میر کی ہندی بحر" پر اظہارِ خیال کیا۔ پروفیسر عابد پشاوری نے "کلامِ انشا میں ہندی اصناف" کی نشاندہی کی۔ پروفیسر جعفر رضا نے "نظیر کی شاعری پر برج بھاشا کے اثرات" پر مقالہ پیش کیا۔

پروفیسر مسعود حسین خاں نے صدارتی تقریر میں دوہے کی اقسام اس کے فنّی لوازم اور فکری میلانات پر روشنی ڈالی۔

۲ر مارچ ۸۷ء کو سیمینار کا پانچواں اجلاس پروفیسر جعفر رضا کی صدارت میں ہوا۔ ڈاکٹر صلاح الدین نے "سودا کے کلام میں ہندی پنجابی اصناف کی جھلک" دکھائی۔ قیصر جہاں کا مقالہ "قدیم اُردو شاعری میں گیت کی روایت" پر تھا جو مخمور سعیدی نے سُنایا۔

"اُردو عروض پر ہندی پنگل کا اثر" کے موضوع پر مقالہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی نے کہا کہ متقدمین سے متاخرین تک تمام شعرا نے ہندی پنگل کے اوزان میں بھی شاعری کی ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے "ایہام گو شعرائے دہلی پر ریتی کال کی ہندی شاعری کا اثر" پر مقالہ پیش کیا۔

چھٹا اور آخری اجلاس ہندی کے نامور ادیب پروفیسر نامور سنگھ کی صدارت میں ہوا۔ پروفیسر مغنی تبسم نے "اُردو غزل اور گیت" پر اظہارِ خیال کیا۔ رشید حسن خاں نے "اُردو میں کبت کی روایت" سے بحث کرتے ہوئے کہا کہ باغ و بہار اور نوطرزِ مرصع کے علاوہ اُردو کی قدیم کتابوں میں کبت ملتے ہیں۔ ظ۔ انصاری نے "اُردو شاعری اور ہندوستانی موسیقی کے رشتوں پر چند خیالات" کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ابتدا ہی سے اُردو شاعری اور موسیقی کا اٹوٹ رشتہ ہے جس کو فراموش کردیا گیا آج اُن رشتوں کو پھر تازہ کرنے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے "امیر خسرو کے ہندوی کلام" پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ خسرو کے ہندوی کلام کو تین زمروں میں رکھا جا سکتا ہے الحاقی، غیر مستند اور مستند۔ انھوں نے خسرو کی پہیلیوں کے ایک نو دریافت مخطوطے کی اطلاع بھی دی۔

سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز کے ڈائریکٹر ڈاکٹر ڈی۔ پی پٹنایک نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے اُردو اور ہندی کے رشتوں کے کئی اہم گوشوں پر روشنی ڈالی۔ صدرِ جلسہ پروفیسر نامور سنگھ نے اپنی صدارتی تقریر میں گنگا جمنی تہذیب کی اُن بنیادوں کی تلاش پر زور دیا جن سے مشترکہ کلچر وجود میں آیا تاکہ قومی اتحاد و سالمیت کی فضا کو مزید سازگار بنایا جاسکے۔ انھوں نے اس سلسلے میں سیمینار کو بہت اہم قرار دیا۔

بقیہ ص ۷۶ سے آگے

ہیں جو خود اسی فضا اور اسی ماحول کے پروردہ تھے۔ ان میں سے مرزا فرحت اللہ بیگ کی کتاب "دہلی کی آخری شمع" کو چھوڑ کر کہ جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہے اور بعض درس گاہوں کے نصاب میں بھی شامل ہے سبھی کتابیں نایاب یا کمیاب ہو چکی تھیں۔ اُردو اکادمی نے تدوینِ نو کے ساتھ ان کی اشاعت کا اہتمام کر کے اُس علمی، اَدبی اور تہذیبی روشنی کو جس سے ان کتابوں کے صفحات منجلی ہیں، ماضی کے دھندلکوں میں گم ہونے سے بچا لیا ہے۔ مرتبین کے دیباچوں نے ان کی قدر و قیمت اور بڑھا دی ہے۔ یہ سبھی کتابیں دلّی کی ٹکسالی زبان میں لکھی گئی ہیں اس لیے ان کی دستاویزی اہمیت سے قطع نظر صرف لطفِ مطالعہ کی خاطر بھی انھیں پڑھا جا سکتا ہے۔

—— مخمور سعیدی

اُردو اکادمی، دہلی کا ترجمان

ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی

مجلسِ مشاورت :
خلیق انجم، حکیم عبدالحمید
خواجہ حسن ثانی نظامی، بیگم ریحانہ فاروقی

ادارۂ تحریر :
سیّد شریف الحسن نقوی
مخمور سعیدی

جون ۱۹۸۷ء

جلد : ۱ شمارہ : ۲

فی کاپی
دو روپے پچاس پیسے

سالانہ قیمت
۲۵ روپے

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ
ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی
اُردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

فون نمبر ۲۷۶۲۱۱ اور ۲۶۲۶۹۳

حرفِ آغاز ——— سید شریف الحسن نقوی ——— ۲

مضامین :
اُردو میں کبت ——— رشید حسن خاں ——— ۱
دلّی کے آثارِ قدیمہ ——— خلیق انجم ——— ۹
تذکرہ گلابوں کا ——— ابوشعیب احسن ——— ۳
پُرشور ماحول ——— محمد خلیل ——— ۷

انٹرویو :
آرٹ اور ادب کی زبان ——— گوربچن چندن ——— ۰

انشائیہ :
دروازے ——— یوسف ناظم ——— ۸

افسانے :
یادبسیرے ——— انور خاں ——— ۱
خواب ——— شفق ——— ۶
ایک ہاتھ کا آدمی ——— انجم عثمانی ——— ۶

غزلیں :
مظہر امام، مظفر حنفی ——— ۰
شہاب جعفری ——— ۸
مصوّر سبزواری ——— ۹
سکھ دیو شرما رشک، پرکاش تیواری ——— ۳

نظمیں :
نذرِ جوہر ——— ظہیر احمد صدیقی ——— ۵
حسنِ غروبِ مہر "تنہائی" ——— ممتاز میرزا ——— ۵
اُردو کا خبر نامہ ——— ادارہ ——— ۹
آپ کی رائے ——— قارئین ——— ۷

سیّد شریف الحسن نقوی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے سمر آفسیٹ پریس دہلی ۶ سے چھپوا کر دفتر اُردو اکادمی نئی دہلی ۲ سے شائع کیا۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں اُردو پر بڑا بُرا وقت پڑا تھا اور اس ہر دلعزیز زبان کے خلاف شکوک اور شبہات کی ایک ایسی فضا پیدا ہوگئی تھی جس نے اس کے قدرتی ارتقا کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں پیدا کر دی تھیں۔
لیکن دھیرے دھیرے شکوک و شبہات کے یہ بادل چھٹنا شروع ہوئے اور محترمہ اندرا گاندھی کے عہدِ حکومت میں سرکاری سطح پر کئی ایسے اقدامات کیے گئے جو اُردو کی ترویج و ترقی میں معاون ہوسکیں۔ ان اقدامات کا ایک حصہ مرکز میں ترقی اُردو بورڈ اور متعدد ریاستوں میں اُردو اکادمیوں کا قیام تھا۔ عوامی حلقوں میں بھی اس زبان کے خلاف جو بے جا تعصب تھا وہ دُور ہوتا گیا۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ اُردو کی سرگرم مخالفت کا زور ٹوٹ چکا ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ مخالفت بالکل ختم ہوچکی ہو۔ خصوصیت سے اُردو کی تعلیم کی راہ میں جو مشکلات پیدا ہوگئی تھیں انھیں نہ صرف باقی رکھا جا رہا ہے بلکہ نئی نئی مشکلات بھی پیدا کی جا رہی ہیں۔
اگر کسی زبان کی تعلیم کے راستے مسدود ہو جائیں تو وہ اپنے عمومی چلن کی بنا پر بول چال کی زبان کے طور پر تو زندہ رہ سکتی ہے لیکن دھیرے دھیرے تحریری یا علمی زبان کی حیثیت سے مردہ ہو جائے گی۔ اُردو کو اس وقت یہی اندیشہ لاحق ہے، اس لیے جو لوگ اس زبان کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں، ان پر دہری ذمّہ داری عائد ہوتی ہے۔ اولاً یہ کہ وہ اُردو کے جمہوری حقوق کی بحالی کے لیے متعلقہ اداروں اور افراد کے سامنے اپنے مطالبات رکھتے رہیں، نیز انتظامی سطح پر اگر ان کی زبان کی کوئی حق تلفی ہو رہی ہے تو اسے بھی سامنے لانے اور دُور کرانے کی کوششیں جاری رکھیں۔ دوسرا کام جو کسی طرح پہلے سے کم اہم نہیں، یہ ہے کہ اپنی آئندہ نسلوں کو اُردو کی تعلیم سے بے بہرہ نہ رہنے دیا جائے، خواہ اس کا انتظام اپنے طور پر ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ ہمیں اس کا احساس ہے کہ موجودہ نظامِ تعلیم میں جو نصابات مروّج ہیں، وہ کافی بوجھل ہیں اور ان کی موجودگی میں بچے پر ایک اور زبان کی پڑھائی کا بوجھ ڈالتے ہوئے، والدین ہچکچائیں گے، لیکن اگر ہمیں اپنی زبان کو اور اس کے وسیلے سے اس گنگا جمنی تہذیب کو جس کی تشکیل و تعمیر میں صدیاں صرف ہوئی ہیں، زندہ رکھنا ہے تو ایسا کرنا ضروری ہے۔

"ایوانِ اُردو دہلی" کے پہلے شمارے کا اُردو حلقوں میں پرتپاک خیر مقدم ہوا۔ ہماری اس جراتِ اندانہ کو بھی سراہا گیا کہ اس رسالے کو صرف ادبی موضوعات تک محدود نہ رکھا جائے اور زندگی کے دوسرے گوشوں کا بھی احاطہ کرنے کی کوشش کی جائے ـــــ دوسرے شمارے کو ہم نے پہلے شمارے سے بھی کچھ زیادہ متنوع بنانے کی کوشش کی ہے۔ ہم چاہیں گے کہ ہمارے پڑھنے والے ہر شمارے کے بارے میں اپنی قیمتی رائے سے ہمیں آگاہ کریں اور اپنے مشوروں سے بھی ہمیں نوازیں۔

"...آج اُردو ادب کے طالب علم کے لیے یہ ذرا تعجب
کی بات ثابت ہوگی اگر اس سے کہا جائے کہ اُردو
ادب میں کبت بھی پائے جاتے تھے..."

اُردو میں کَبِت

رشید حسن خاں

کَبِت سے ہندی کی ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس کے قابلِ ذکر نمونے اردو میں محفوظ ہیں۔ قصّے کہانیوں کی جو پرانی کتابیں ہیں، اور پرانی کتابوں سے میری مراد ان کتابوں سے ہے جن کو لکھے ہوئے سو برس سے زیادہ ہو چکے ہیں، ان میں بہت سے کبت ملتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو اردو شاعروں کے کہے ہوئے ہیں اور کچھ ہندی کے مشہور کبت ہیں، جنھوں نے کسی نہ کسی نسبت سے ان کتابوں میں جگہ پائی ہے اور اِس طرح جیسے وہ اس قصّے کا ضروری حصّہ ہوں۔ یا یوں کہیے کہ جس طرح بہت سے فارسی اشعار جگہ جگہ لائے جاتے تھے، اسی طرح یہ کبت بھی آئے ہیں۔ اِسی طرح پرانے شاعروں کے ایسے دیوان بھی ملتے ہیں جن میں مختلف اصنافِ سخن کے ذیل میں کبت بھی موجود ہیں۔

کہنے کے قابل ایک یہ بات بھی ہے کہ ہندی میں کبت کی جو روایت رہی ہے اور جو انداز ہے، اردو میں کبھی تو پوری طرح اس کی پیروی کی گئی ہے، کہ زبان بھی وہی ہے اور پیرایۂ اظہار بھی ویسا ہی ہے، اور کبھی زبان اور بیان، دونوں کے لحاظ سے ایسی تبدیلی کی گئی ہے جیسے کبت کو اردوا لیا گیا ہو۔ اس سلسلے میں کچھ اور کہنے سے پہلے میں دو مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں، تاکہ بات اچھّی طرح واضح ہو جائے۔ پہلی مثال تو ہندی کے ایک ایسے کبت کی ہے جو اردو کی ایک کتاب میں اس طرح آیا ہے جیسے وہ اس قصّے کی ایک ضروری کڑی ہو، اور دوسری مثال ایک ایسے کبت کی ہے جسے اردو کے ایک شاعر نے کہا ہے اور اس طرح کہا ہے کہ مفہوم کے لحاظ سے وہ اردو ادب کی روایت کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے اور زبان کے لحاظ سے اِس طرح تصرّف کیا ہے کہ اس میں اردو پن چمک اٹھا ہے۔

میر امّن کی کتاب باغ و بہار پہلی بار ۱۸۰۳ء میں چھپی تھی۔ اِس کتاب میں تین کبت ہیں۔ پہلا کبت دوسرے درویش کی سیر میں آیا ہے۔ شاہی دربار کا ایک بڑا عہدے دار کہتا ہے: "تب وہ کہنے لگا کہ حرص دنیا کی کسی کے جی سے نہیں گئی، چناں چہ کسو کب نے یہ کبت کہا ہے:

نکھ بِن کٹا دیکھے، سیس بھاری جٹا دیکھے
جوگی کن پھٹا دیکھے چھار لائے تن میں
مَونی اَن بُول دیکھے، سیوڑھا سِر مُچھول دیکھے
کَرَت کَلول دیکھے بَن کھنڈی بَن میں
بیر دیکھے، سوُر دیکھے، سب گنی اور کوڑھ دیکھے
مایا کے پوُر دیکھے بھوُل رہے دھن میں
آدِ اَنت سکھی دیکھے، جنم ہی کے دُکھی دیکھے
پَر وے نہ دیکھے جن کے لوُبھ نا نہ مَن میں

ہندی کے مشہور زبان شناس پنڈت ترلوچن شاستری سے میں نے پوچھا تھا کہ یہ کبت کس کا ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ یہ کس کا کہا ہوا ہے، ہاں یہ جانتا ہوں کہ کبیر پنتھی سادھو اکثر اس کو پڑھا کرتے ہیں۔ بہ ہر حال، ہندی کا یہ مشہور کبت

اردو کی ایک اہم کتاب میں اس طرح آیا ہے جیسے وہ کوئی اجنبی چیز نہ ہو۔ ایک بادشاہی عہدے دار کی زبان سے یہ کبت ادا ہوا ہے، وہ اِس موقعے پر فارسی کا شعر بھی پڑھ سکتا تھا، مگر اس نے کبت پڑھا اور اِس سے اُس زمانے میں اِس خاص صنفِ سخن سے آگاہی اور مؤانست دونوں کا کچھ نہ کچھ اندازہ تو کیا ہی جاسکتا ہے۔

محمد بخش مہجور لکھنوی اردو کے مشہور مصنّف گزرے ہیں، ان کی کتاب نورتن نے بہت شہرت پائی تھی، جس میں بہت سے قصّے اور لطیفے لکھے گئے ہیں۔ یہ ۱۸۱۱ء کی تصنیف ہے۔ مصنّف نے اِس میں تیرہ کبت درج کیے ہیں۔ میں دوسری مثال اِسی کتاب سے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کبت نعت میں ہے۔ مصنّف نے پہلے اردو کی ایک رباعی لکھی ہے اور پھر اسی رباعی کی مناسبت سے ایک کبت لکھا ہے۔ مناسب یہ ہوگا کہ اس ٹکڑے کو میں انھی کے الفاظ میں پیش کروں، رسولِ پاک کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اور اپنے نزدیک تو یوں ہے:

کیا اس کی صفت کرے زبانِ ادراک
خود حق نے کہا ہو جس کے حق میں لولاک
ظاہر میں تو یوں ہے، پر یہ باطن دیکھو
ظاہر کیا اس نے نور اپنا از خاک

فی الواقعی اِس میں کچھ دروغ نہیں؛ چناں چہ اس کے مطابق یہ کبت ہے:

جا دِن نور نبی کو ہتو، تا دِن ہتو نہیں لَوح نہ کلَم
کیتے اکاس پتال گئے، اور کیتے رہے جگ میں متکلّم
ایک لاکھ کئی ہزار پیمبر، کاہو کو دین رہو نہ مُسلَّم
آخر نور ظہور رچے ہی، صلی اللہ علیہ وَ سلّم"

صاف ظاہر ہے کہ یہ کبت یا تو خود مہجور کا بنایا ہوا ہے یا انھی جیسے کسی اردو شاعر کا کہا ہوا ہے۔ اس میں مفہوم، زبان اور بیان، ہر اعتبار سے اردو کے شاعر نے جس طرح کبت کو اپنے سانچے میں ڈھالا ہے، وہ دیکھنے کے قابل ہے۔ اس کا وزن بھی نظر میں رکھنے کی چیز ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک اردو والوں کے لیے کبت آج کی طرح، اجنبی چیز نہیں تھی۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ میر امّن دہلی کے تھے اور مہجور لکھنؤ کے، یعنی زبان اور مکان کا فاصلہ بھی اس راہ میں حائل نہیں تھا۔

یہاں میں ایک اور بات کی وضاحت کردوں۔ میں نے کبت کو ہندی کی صنفِ سخن کہا ہے اور یہ میں نے اپنی آسانی کے لیے کہا ہے۔ اردو میں جو کبت موجود ہیں، جاننے والوں نے ان کے متعلّق یہ بتایا کہ ان میں سے اکثر برج کے ہیں، بعض اودھی کے ہیں اور بعض میں ایسا ملا جلا انداز ہے کہ ان کو کسی ایک بولی یا علاقے سے متعلّق کردینا مناسب نہیں۔ یہ بھی بتایا گیا کہ ان میں وہ کبت بھی ہیں جو سنّیاسیوں اور جوگیوں کی زبانوں پر رہے ہیں اور جس طرح رمتا جوگی اور بہتا پانی ایک جگہ ٹھہرتا نہیں، اسی طرح یہ کبت کئی زبانوں پر رواں دواں رہے ہیں اور مختلف بولیوں کے اجزا کو جذب کرتے رہے ہیں۔ آپ کو خیال ہوگا کہ فارسی کے پرانے مصنّفوں نے ہندستانی زبانوں کے لیے ایک خاص لفظ "ہندوی" بھی استعمال کیا ہے، یہ لفظ حاوی ہوتا تھا سبھی ہندستانی زبانوں پر یا پھر بہت سی زبانوں پر، مطلب یہ ہوتا تھا کہ فارسی کے علاوہ جو کچھ ہے، وہ ہندوی ہے۔ اسی طرح میں نے بھی اپنی آسانی کے لیے کبت کو ہندی صنفِ سخن کہا ہے۔

قصّے کہانیوں کی پرانی کتابوں میں جو کبت ملتے ہیں، ان کو پڑھ کر ایک طرف تو یہ بات صاف طور پر سامنے آتی ہے کہ اردو کے ادیب اور شاعر ہندی کی اس صنفِ سخن سے اچھی طرح واقف تھے اور دوسری طرف یہ کہ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ جو لوگ اس کتاب کو پڑھیں گے، وہ جس طرح اِس میں مندرجہ فارسی کے شعروں کو سمجھ لیں گے، شاید اُسی طرح ہندی کے یہ کبت بھی ان کے لیے اجنبی نہیں ہوں گے۔ یہ دونوں باتیں اپنی جگہ پر اہمیت رکھتی ہیں۔ اِس کو یوں بھی دیکھیے کہ نوطرزِ مرصّع میں اردو فارسی کے اشعار بڑی تعداد میں ہیں، ان کے ساتھ ساتھ اس میں پانچ کبت بھی ہیں۔ یہ کتاب ۱۷۷۵ء تک مکمّل ہو چکی تھی، یعنی اردو کی جو پرانی کتابیں ہیں یہ ان میں سے ایک ہے اور یہ فورٹ ولیم کالج کے وجود میں آنے سے پہلے کی کتاب ہے۔

میر امّن کی باغ و بہار اِس کتاب کا دوسرا نقش ہے۔ باغ و بہار میں نوطرزِ مرصّع کے مقابلے میں اردو کے اشعار کم ہیں، بل کہ یوں کہیے کہ بہت کم ہیں، دوسری طرف اِس میں ایک دوہا ہے اور تین

لبت ہیں اور ان میں سے صرف ایک کبت ایسا ہے جو نوطرزِ مرصّع
بں بھی ہے، باقی دونوں کبت میر امّن نے اپنے طور پر شامل کیے
یں۔ یہ بھی دیکھ لیجیے کہ یہ کبت کسی سادھو سنت یا کسی جوگی کی زبان
سے نہیں کہلوائے گئے ہیں، ایک کبت تو ایک شاہ زادی پڑھتی ہے
ور دو کبت بھی ان لوگوں کی زبان سے ادا ہوئے ہیں جو ویسے اردو
فارسی شعر پڑھا کرتے ہیں۔ میں یہاں آپ کو اس کتاب کا وہ کبت
سنانا چاہتا ہوں جو ایک بادشاہ زادی نے اپنے حال پر پڑھا ہے۔
س سے میرا مقصد یہ بھی ہے کہ کبت کا ایک اور روپ اور ایک
اور نمونہ آپ کے سامنے آجائے۔ قصّہ یہ ہے کہ بادشاہ اپنی ایک
بیٹی سے ناراض ہو جاتا ہے اور اُسے رات کے اندھیرے میں ایک
جنگل میں بھجوا دیتا ہے، جہاں نہ آدم ہے نہ آدم زاد، وہاں وہ
شاہ زادی مناجات کے طور پر ایک کبت پڑھتی ہے — میر امّن کے
الفاظ یہ ہیں :

"غرض اس میانے میں بیٹھی ہوئی خدا سے لو لگائے رہیں
تھیں اور یہ کبت اس دم پڑھتی تھیں :

جب دانت نہ تھے، تب دودھ دیو، جب دانت دیے، کہا: انّ نہ دے ہے
جُو جل میں تھل میں پنچھی پَشُو کی سُدھ لیت، سو تیری بھی لے ہے
کاہے کو سوچ کرے مَن مؤرکھ، سوچ کرے کچھ ہاتھ نہ آے ہے
جان کو دیت، اَجان کو دیت، جہاں کو دیت، سُو تو کو بھی دَے ہے

مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی کا مجموعۂ کلام نادراتِ شاہی جن
لوگوں نے دیکھا ہے، اُن کو معلوم ہوگا کہ وہ ہندی کے بھی شاعر تھے۔
اس مجموعے میں کبت بھی ہیں۔ عجائب القصص ایک نثری قصّہ
ہے اور یہ کتاب بھی انھی کی بتائی جاتی ہے، اس داستانی قصّے
میں ۱۵ دوہرے اور دو کبت ہیں۔ ایک کبت تو مولود کے پالنے میں
جھولنے سے اور دوسرا چھٹی کی رسم سے متعلق ہے۔ نادراتِ شاہی میں
شاہ عالم کے کہے ہوئے جو کبت ہیں، ان کو سامنے رکھا جائے تو یہ
کہنے میں ذرا بھی مشکل پیش نہیں آسکے گی کہ یہ کبت شاہ عالم کے
کہے ہوئے بھی ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے اس کتاب کے
مقدّمے میں اس کا سالِ تصنیف ۱۲۰۷ھ متعیّن کیا ہے، اس حساب
سے یہ نوطرزِ مرصّع کے بعد کی کتاب ہوئی۔

مرزا سوداؔ کا ہندی اور پنجابی کلام ملتا ہے، انھوں نے کبت بھی
کہے ہیں۔ قاضی عبدالودود صاحب نے معاصر کے حصّہ اوّل میں، جو ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا تھا، یہ لکھا تھا کہ: "کلیاتِ سوداؔ کی جن اصحاب
نے سیر کی ہے، وہ اِس سے بے خبر نہیں کہ سوداؔ نے اردو کے علاوہ
اور ہندوستانی زبانوں میں بھی شعر کہے ہیں اور برج بھاشا کی بعض
بحروں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اُن کے چند کبت کلیاتِ سوداؔ کے
اس قلمی نسخے میں ہیں جو کتب خانۂ مشرقیہ میں ہے، اور کلیاتؔ کے
مطبوعہ اور کُل قلمی نسخے جو میری نظر سے گزرے ہیں، ان سے خالی
ہیں، ان میں سے دو کبت فی الحال پیش کیے جاتے ہیں، باقی آیندہ
پیش ہوں گے"۔ معاصر کی اِس اشاعت میں دو کبت چھپے ہیں،
باقی میں نے نہیں دیکھے، ان میں سے ایک کبت یہ ہے :

ایکن کو کر دینی صاحب تکت تاج کے، ایکن کو ترنگ تاج، ایکن کو بھکھاری اناج کے
ایکن کو سوگ، ایکن کو جوگ، ایکن کو رس بھوگ، ایکن کو صاحب راج کے
ایکن کو بَسَن گڈھ کوٹ، ایکن کو ناہیں تن کی اوٹ، فعل الحکیم لا یخلوا
عن الحکمۃ، جانت ہیں، او رہم کیا جانت کرتب مہاراج کے (کذا)

میں نے اس کبت کو خاص کر یوں نقل کیا ہے کہ سوداؔ نے عربی کے
ایک مشہور مقولے کو شامل کر کے جس طرح اِس خالص ہندی نژاد
صنفِ سخن میں تصرّف کیا ہے، وہ قابلِ توجّہ ہے۔

محمد بخش مہجورؔ کی کتاب نورتن کا ذکر آچکا ہے۔ اِس کتاب میں
ایک باب خاص طور پر ہماری توجّہ کا طلب گار ہے، یہ اس کتاب کا
چوتھا باب ہے، جس کا عنوان ہے: "چوتھا باب مصرع کہنے بادشاہوں
اور گداؤں میں، اور فی البدیہہ شاعری کے مطلع کرنے میں، اور
بادشاہوں کے چھچھا کہنے میں اور کبیشروں کے کبت کرنے میں"۔
اس باب کے آخری حصّے میں گیارہ کبت درج کیے گئے ہیں اور ہر
کبت کے ساتھ وہ واقعہ بھی لکھا گیا ہے جس کو دیکھ کر بادشاہ نے
چھچھا کہا اور پھر دربار میں آکر کبیشر کو وہ چھچھا سنایا، اس کبیشر نے
دربار میں اُسی وقت اس مضمون کا کبت کہا، جس کو سن کر ایسا معلوم
ہوتا تھا جیسے اِس شخص نے پورا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ یہ
بہت دل چسپ بیان ہے، ہمارے لیے اس کی اہمیت یہ ہے کہ اردو
میں غالباً پہلی بار اِس تفصیل کے ساتھ اردو کے عام پڑھنے والوں کے
سامنے اِس صنف کے ایک خاص انداز کو پیش کیا گیا۔ اردو میں ایک

ل ہے، جو فرہنگ آصفیہ میں بھی موجود ہے: "کبت بھاٹ کو سُوہے،
ر کھیتی جاٹ کو۔" بھاٹوں کا کبت کہنا مشہور ہے، مگر اس باب میں کبت
ہنے والے کبیشر کی جو تصویر بنتی ہے، وہ بے حد روشن اور قابلِ قدر ہے
ر ہمارے زمانے میں اردو والوں کے لیے اِس اندازِ تعارف کی بڑی
ہمیّت ہے۔

یں نمونے کے طور پر ایک کبت، اس سے متعلّق لکھے گئے واقعے
ے مختصر بیان کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں مگر پہلے
ِ ضروری بات کہہ دی جائے کہ یہ قصّے کہانیوں کی کتاب ہے، مصنّف
ے اسے ہر طرح دل چسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اِس لیے یہ ذہن
یں رکھیے کہ ہر کبت سے متعلق جو واقعہ مصنّف نے لکھا ہے، اس کا صحیح
ونا کچھ ضروری نہیں، ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا ہے۔ [یہ واقعہ
ہے کہ مہجورؔ نے بڑی عجیب واقعہ تراش طبیعت پائی تھی، اِس کا اندازہ
س کیجیے کہ اُنھوں نے امیر خسروؔ کو اکبر کے دربار میں لا کھڑا کیا ہے۔ مہجورؔ
اِس کتاب کے اسی باب میں لکھا ہے کہ اکبرؔ بادشاہ کی "ایک بار لالۂ
غ دار پر نگاہ جو پڑی تو یہ مصرع... زبان پر گزرا: لالہ در سینہ داغ چوں دارد"
ر خسرو نے فوراً مصرع لگایا کہ: عمر کوتاہ و غم فزوں دارد۔ پھر اس پر
ربل نے یہ مصرع لگایا: سبز شاخے بزیر کوں دارد۔ جب امیر خسروؔ
ر کے مصرعے پر مصرع لگا سکتے ہیں تو پھر ہر بات واقع ہو سکتی ہے۔
مد حسین آزادؔ نے آبِ حیات میں سوداؔ کے احوال میں اِس مصرعے:
لہ در باغ... سے متعلّق جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی دیدنی ہے)۔] اس
صّے میں مہجورؔ نے جتنے کبت لکھے ہیں، ان کا تعلّق شہنشاہ اکبر کی
ایش سے ہے۔ جب بادشاہ دربار میں آکر کبیشر کو چھپا سناتا ہے
ر اُس سے اسی وقت کبت کہنے کی فرمایش کرتا ہے، تو سب سے
لے وہ کبیشر یہ "دوہا" پڑھتا ہے:

کدھی نہ کاگج ہاتھ لیوں، نا جانوں سیاہی کیسا رنگ
سدا سرشٹی داہنے حکم سے بھگوان کے سنگ

اِس دوہے کی لفظیات بھی قابلِ توجّہ ہیں اور اِس سے ایسے
رایتی کبت کہنے والوں کی تصویر بھی سامنے آجاتی ہے۔ ایک کبت
ے سلسلے میں مہجورؔ نے واقعہ یہ لکھا ہے کہ ایک دن اکبر بادشاہ سرِ راہ
رہ دری میں بیٹھے ہوئے تھے کہ "ایک نازنینِ مہ جبیں ڈول میں پانی بھرے
س طرف سے ہو کر نکلی اور بادشاہِ جم جاہ کی نگاہ اس رشکِ ماہ کی
چھاتی پر جو پڑی تو کیا نظر آیا کہ کچھ انگیا کے مسکنے سے چھاتی یوں ابھری
دکھائی دیتی ہے، بہ قولِ شخصے:

نِکسَت کلی گلاب کی جیوں، نِکسَت لَلِت لکیر

اور اس کی اٹھکھیلی چال خوش اندازی سے ڈول کا پانی ہلتا جاتا تھا۔ اِس
عالم پر بادشاہ کے دل پر یہ مضمون گزرا کہ اِس ڈول کے پانی کا ہلنا
بے وجہ نہیں ہے، یعنی اس نازنیں مہ جبیں کی ابھری ہوئی چھاتیوں کو
دیکھ کر وہ پانی... یہ کہتا ہے کہ ہیہات! میرے ہاتھ نہ ہوئے، جو میں
ان چھاتیوں تک دسترس پاکر محظوظ ہوتا... بادشاہ نے اس ڈول
کی ڈالنوں ڈول طبیعت دیکھ کر اور پانی کے ہلنے پر یہ چھپا کہا:
کہ کارَن ڈول میں ہالت پانی۔ یہ چھپا کہتے ہوئے بادشاہ نے دیوانِ
خاص میں برآمد ہو کر ہر ایک کبیشر سے ارشاد کیا کہ اِس ارتھ کا کبت
جلد تیار کرو۔ اِس میں کب سَنت... اپنے دیوتاؤں کو یاد کرکے،
بادشاہ... سے کہنے لگا کہ خداوندِ نعمت... اس کا کبت یوں ہے:

ایک سمے جل آنن گھر سے نِکسی ابلہ برج کی رانی
جات سو کول میں ڈول بھرن، جل کھینچت تھی انگیا مسکانی
دیکھ سبھے چھتیاں اُگھر ہیں کب سَنت کہیں منسا للچانی
ہاتھ بنا پچھتات رہو، اِہ کارَن ڈول میں ہالت پانی"

دکنی ادبیّات کا مطالعہ کرنے والوں نے علی عادل شاہ ثانی کا
کلیّات ضرور دیکھا ہوگا، اُس میں تین دوہے ہیں اور تین کبت ہیں۔
یہ عرض کر دیا جائے کہ یہ مقصود نہیں کہ اردو کے شعری مجموعوں اور
نثری کتابوں میں جس قدر کبت ہیں، وہ اردو والوں کے کہے ہوئے
ہوں، یا ہندی سے منقول ہوں، اُن کا گوشوارہ بنایا جائے۔ ایک ایسی
مختصر تحریر میں ایسی تفصیلات سما بھی نہیں سکتیں۔ اِس تحریر کا مقصد
صرف یہ ہے کہ اردو ادب کے طالب علموں کو ہندی کی اِس قابلِ ذکر صنفِ سخن
کی طرف متوجّہ کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ ایک زمانے تک اُردو کے
شاعر اور مصنّف اِس صنف سے خاصی اچھّی طرح واقف رہے ہیں
اور اردو اور فارسی کے قطعوں اور رباعیوں کی طرح کبتوں کو بھی اپنی
نثر میں کھپاتے رہے ہیں اور اپنے کلام میں شامل کرتے رہے ہیں۔
میر امّن نے باغ و بہار میں اور میر محمد حسین عطا خاں تحسین نے نوطرزِ مرصّع
میں قصّہ لکھتے لکھتے، کبت سے وہی کام لیا ہے، جو ایسے موقعوں پر
قطعوں اور رباعیوں سے لیا جاتا رہا ہے۔ ہندی کے انداز پر اردو کے

عروں نے کبت کہے بھی ہیں اور اردو کے مصنّفین نے ہندی کے مشہور
ؤں کو بھی اپنی نثر میں اِس طرح نقل کیا ہے جیسے وہ ان کے لیے
ئی اجنبی یا نامانوس چیز نہ ہوں۔ اردو شاعروں نے کبتوں میں بعض
ات زبان، بیان اور وزن، ہر لحاظ سے ایسے تصرّفات بھی کیے ہیں
ں کی بنا پر ایسے کبت ہندی کے روایتی کبتوں سے ذرا مختلف ہو گئے
۔ یہ سب باتیں ہماری سنجیدہ توجّہ کی مستحق ہیں، خاص کر ادب کی
یخ لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کے لیے اِن سے واقف ہونا ازبس
ری ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ انیّسویں صدی کے نصفِ اوّل تک اردو کی نظم و نثر
کم و بیش کے فرق کے ساتھ کبت مل جاتے ہیں، مگر اس کے بعد وہ
رت حال باقی نہیں رہی، یہاں تک کہ آج اردو ادب کے ایک طالبِ علم
لیے یہ ذرا تعجّب کی بات ثابت ہوگی اگر اُس سے کہا جائے کہ اردو
میں کبت بھی پائے جاتے تھے۔ اِس کی بہ ظاہر دو وجہیں معلوم ہوتی
۔ ایک تو کبت کی زبان، جس پر برج بھاشا کا زیادہ گہرا رنگ چڑھا
ہے اور زبان کا یہ انداز رفتہ رفتہ اردو والوں کے لیے نامانوس ہوتا
لیا۔ اِس کے وجوہ تہذیبی اور تاریخی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ
دو میں قطعہ اور رباعی، یہ دو اصنافِ سخن ایسی ہیں جن کو کبت
قابل کہنا چاہیے۔ اِن دونوں نے اُردو میں پہلے دن سے اپنی
بنالی تھی اور زبان و ادب کی ترقی کے ساتھ اِن کا چلن بڑھتا ہی
۔ جو کام کبت سے لیا جا سکتا تھا، وہ قطعے اور رباعی سے بہتر طور پر
یا، یوں کبت کو فروغ ملنے کے اسباب گویا ختم ہو کر رہ گئے۔ کبت
وزن کی طوالت بھی اردو میں اس کی کم رواجی میں مددگار ثابت ہوئی
۔ کبت ہوتا ہے چار مصرعوں کا، مگر وزن کی طوالت اسے کھینچ کر
ائر بنا دیا کرتی ہے۔ اِس کے مقابلے میں رباعی میں بھی چار ہی
ع ہوتے ہیں اور بہت سے قطعے بھی چار مصرعوں کے ہوتے ہیں،
ن کے اوزان میں وہ طوالت نہیں ہوتی، جو ایک طرح سے کبت کی
نا ہے۔

آخر میں ایک اور ضروری بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اردو میں
ا قدر کبت موجود ہیں، باغ و بہار کو چھوڑ کر، اور کسی نسخے سے اُن
ل کرنا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بہت سی کتابوں
پہلے اڈیشن ملتے نہیں، بعد کو جو نسخے چھپے ہیں، وہ صحتِ متن کے
لحاظ سے بے حد ناقص ہیں۔ مثلاً میں کوشش کے باوجود نوطرزِ مرصّع
سے ایک کبت بھی نقل نہیں کر سکا، اس لیے کہ پروفیسر نور الحسن ہاشمی
صاحب کا مرتّب کیا ہوا جو نسخہ میرے سامنے ہے، وہ صحّتِ متن کے
اعتبار سے بے حد مایوس کن ہے، اُردو کے جملے تو سر مغزن کرکے پڑھ
ہی لیے جاتے ہیں، مگر کبت صحیح طور پر پڑھنے میں نہیں آپاتے۔ نو رتن
کا پہلا اڈیشن اِس وقت مجھے نہیں ملا، لکھنؤ میں اب سے کئی سال پہلے
میں نے اُسے دیکھا تھا۔ اِس وقت میرے سامنے مجلسِ ترقّیِ ادب لاہور
کا چھاپا ہوا نسخہ ہے۔ صحتِ متن کے لحاظ سے اس کا احوال ویسا ہی
ہے جیسا مجلس کی اکثر کتابوں کا ہے۔ یہ دو کبت جو میں نے اس سے
نقل کیے ہیں، اِن کو بہ مشکل نقل کر سکا ہوں اور اِس طرح کہ دہلی
یونی ورسٹی کے شعبۂ ہندی کے دو سینیر اساتذہ سے مدد لی۔ بہ قول اُن
کے، بعض مقامات پھر بھی مشکوک رہ گئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ پاکستان
میں مجلسِ ترقّیِ ادب اور ہمارے یہاں ترقّیِ اردو بورڈ، یہ دونوں ادارے
جس وسیع پیمانے پر تدوینِ متن کا کام کرا رہے ہیں، اس کا نتیجہ
یہی نکلنا چاہیے تھا۔ تحقیق اور تدوین کا کام تھوک میں نہیں کرایا
جا سکتا۔ مگر اب تک اِن دونوں اداروں میں بیش تر کام ایسے ہی ہوئے
ہیں جیسے P.W.D. کا محکمہ ٹھیکیداروں کی مدد سے سرکاری عمارتیں
بنوایا کرتا ہے۔ ایک مختصر سی مقرّرہ مدّت میں نہ تحقیق کا کام صحیح
طور پر ہو سکتا ہے نہ تدوین کا۔ ۳۱ مارچ کی تلوار سر پر لٹکتی رہتی
ہے اور جھولیاں بھر بھر کے تحقیق اور تدوین کے کام ہوتے رہتے ہیں۔
ترقّی اردو بورڈ نے فارسی کتابوں کے جو اردو ترجمے چھاپے ہیں اور
جن دواوین کو مرتّب کیا ہے، اُن کا حال اِس قدر خراب ہے کہ وہ مصنّف
اور شاعر اگر آج زندہ ہوتے تو اس مرتّب اور اِس ادارے، دونوں پر
ازالۂ حیثیتِ عرفی کا مقدّمہ دائر کرنے میں تکلّف نہیں کرتے۔ عرض
یہ کرنا ہے کہ یہ کام بھی کرنے کا ہے کہ جس طرح کبتوں کا جائزہ لیا
جائے، اسی طرح کوشش کرکے ان کا متن بھی ایک بار صحیح کر لیا جائے،
تاکہ ادب کے طالب علم آسانی اور صحّت کے ساتھ انھیں پڑھ سکیں اور
مجھ سے ناآشنائے زبان اگر نقل کرنا چاہیں تو نقل کر سکیں۔ مثال
کے طور پر باغ و بہار کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ گل کرسٹ کے مقرّر کردہ
اصولِ املا و علامات کے مطابق اِس کتاب میں ان تینوں کبتوں کو
اُردو رسمِ خط میں اس طرح لکھا گیا ہے کہ پڑھنے میں ذرا بھی دقّت نہیں ہوتی۔

●●

مثل ہے، جو فرہنگ آصفیہ میں بھی موجود ہے: "کبت بھاٹ کو سُوہے، اور کھیتی جاٹ کو۔" بھاٹوں کا کبت کہنا مشہور ہے، مگر اس باب میں کبت کہنے والے کبیشر کی جو تصویر بنتی ہے، وہ بے حد روشن اور قابلِ قدر ہے اور ہمارے زمانے میں اردو والوں کے لیے اس اندازِ تعارف کی بڑی اہمیت ہے۔

میں نمونے کے طور پر ایک کبت، اس سے متعلق لکھے گئے واقعے کے مختصر بیان کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں مگر پہلے ایک ضروری بات کہہ دی جائے کہ یہ قصّے کہانیوں کی کتاب ہے مصنّف نے اسے ہر طرح دل چسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے یہ ذہن میں رکھیے کہ ہر کبت سے متعلق جو واقعہ مصنّف نے لکھا ہے، اس کا صحیح ہونا کچھ ضروری نہیں، ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا ہے۔ [یہ واقعہ ہے کہ مجوّر نے بڑی عجیب واقعہ تراش طبیعت پائی تھی، اس کا اندازہ یوں کیجیے کہ اُنھوں نے امیر خسروؔ کو اکبر کے دربار میں لا کھڑا کیا ہے۔ مجوّر نے اس کتاب کے اسی باب میں لکھا ہے کہ اکبر بادشاہ کی "ایک بار لالۂ داغ دار پر نگاہ جو پڑی تو یہ مصرع ... زبان پر گزرا: لالہ در سینہ داغ چوں دارد۔ امیر خسرو نے فوراً مصرع لگایا کہ: عمر کوتاہ و غم فزوں دارد۔ پھر اس پر بیربل نے یہ مصرع لگایا: سبز شاخے بزیرِ کوں دارد۔ جب امیر خسرو اکبر کے مصرعے پر مصرع لگا سکتے ہیں تو پھر ہر بات واقع ہو سکتی ہے۔ (محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں سوداؔ کے احوال میں اس مصرعے: لالہ در باغ ... سے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی دیدنی ہے)۔] اس حصّے میں مجوّر نے جتنے کبت لکھے ہیں، ان کا تعلق شہنشاہ اکبر کی فرمایش سے ہے۔ جب بادشاہ دربار میں آکر کبیشر کو سمسیا سناتا ہے اور اُس سے اسی وقت کبت کہنے کی فرمایش کرتا ہے، تو سب سے پہلے وہ کبیشر یہ "دوہا" پڑھتا ہے:

کدھی نہ کاگج ہاتھ لیوں، نا جانوں سیاہی کیسا رنگ
سدا سرشتی داہنے حکم سے بھگوان کے سنگ

اس دوہے کی لفظیات بھی قابلِ توجّہ ہیں اور اس سے ایسے روایتی کبت کہنے والوں کی تصویر بھی سامنے آجاتی ہے۔ ایک کبت کے سلسلے میں مجوّر نے واقعہ یہ لکھا ہے کہ ایک دن اکبر بادشاہ سرِ راہ بارہ دری میں بیٹھے ہوئے تھے کہ "ایک نازنینِ مہ جبیں ڈول میں پانی بھرے اُس طرف سے ہو کر نکلی اور بادشاہِ جم جاہ کی نگاہ اس رشکِ ماہ کی چھاتی پر جو پڑی تو کیا نظر آیا کہ کچھ انگیا کے مسکنے سے چھاتی یوں ا
دکھائی دیتی ہے، بہ قولِ شخصے:

نِکسَت کلی گلاب کی جیوں، نِکسَت لَلِت لکیر

اور اس کی اٹھکھیلی چال خوش اندازی سے ڈول کا پانی ہلتا جاتا تھا
عالم پر بادشاہ کے دل پر یہ مضمون گزرا کہ اِس ڈول کے پانی
بے وجہ نہیں ہے، یعنی اس نازنیں مہ جبیں کی ابھری ہوئی چھا
دیکھ کر وہ پانی ... یہ کہتا ہے کہ ہیہات! میرے ہاتھ نہ ہوئے،
ان چھاتیوں تک دسترس پاکر محظوظ ہوتا ... بادشاہ نے اس
کی ڈانوں ڈول طبیعت دیکھ کر اور پانی کے ہلنے پر یہ سمسیا کہ
کہ کارن ڈول میں ہالت پانی۔ یہ سمسیا کہتے ہوئے بادشاہ نے
خاص میں برآمد ہو کر ہر ایک کبیشر سے ارشاد کیا کہ اِس ارتھ کا
جلد تیار کرو۔ اس میں کب سنت ... اپنے دیوتاؤں کو یا
بادشاہ ... سے کہنے لگا کہ خداوند نعمت ... اس کا کبت

ایک سمے جل آنن گھر سے نکسی ابلہ برج کی رانی
جات سوکول میں ڈول بھرن، جل کھینچت تھی انگیا مسکانی
دیکھ سبھے چھتیاں اُگھریں کب سنت کہیں منا للچانی
ہاتھ بِنا پچھتات رہو، اہ کارن ڈول میں ہالت پانی "

دکنی ادبیات کا مطالعہ کرنے والوں نے علی عادل شاہ ثا
کلیات ضرور دیکھا ہوگا، اُس میں تین دوہے ہیں اور تین کب
یہ عرض کر دیا جائے کہ یہ مقصود نہیں کہ اردو کے شعری مجموعو
نثری کتابوں میں جس قدر کبت ہیں، وہ اردو والوں کے کہے
ہوں، یا ہندی سے منقول ہوں، اُن کا گوشوارہ بنایا جائے۔ ایک
مختصر تحریر میں ایسی تفصیلات سما بھی نہیں سکتیں۔ اس تحر
صرف یہ ہے کہ اردو ادب کے طالب علموں کو ہندی کی اِس قابلِ ذ
کی طرف متوجّہ کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ ایک زمانے تک ار
شاعر اور مصنّف اِس صنف سے خاصی اچھی طرح واقف ر
اور اردو اور فارسی کے قطعوں اور رباعیوں کی طرح کبتوں کو
نثر میں کھپاتے رہے ہیں اور اپنے کلام میں شامل کرتے رہے
میر امّن نے باغ و بہار میں اور میر محمد حسین عطا خاں تحسین نے نو
میں قصّہ لکھتے لکھتے، کبت سے وہی کام لیا ہے، جو ایسے موقعو
قطعوں اور رباعیوں سے لیا جاتا رہا ہے۔ ہندی کے انداز پر ار

ں نے کبت کہے بھی ہیں اور اردو کے مصنّفین نے ہندی کے مشہور
کو بھی اپنی نثر میں اِس طرح نقل کیا ہے جیسے وہ ان کے لیے
جنبی یا نامانوس چیز نہ ہوں۔ اردو شاعروں نے کبتوں میں بعض
زبان، بیان اور وزن، ہر لحاظ سے ایسے تصرّفات بھی کیے ہیں
ی بنا پر ایسے کبت ہندی کے روایتی کبتوں سے ذرا مختلف ہوگئے
یہ سب باتیں ہماری سنجیدہ توجّہ کی مستحق ہیں، خاص کر ادب کی
لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کے لیے اِن سے واقف ہونا ازبس
ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ انیسویں صدی کے نصفِ اوّل تک اردو کی نظم و نثر
بیشی کے فرق کے ساتھ کبت مل جاتے ہیں، مگر اس کے بعد وہ
حال باقی نہیں رہی، یہاں تک کہ آج اردو ادب کے ایک طالبِ علم
یہ ذرا تعجّب کی بات ثابت ہوگی اگر اُس سے کہا جائے کہ اردو
ں کبت بھی پائے جاتے تھے۔ اِس کی بہ ظاہر دو وجہیں معلوم ہوتی
یک تو کبت کی زبان، جس پر برج بھاشا کا زیادہ گہرا رنگ چڑھا
اور زبان کا یہ انداز رفتہ رفتہ اردو والوں کے لیے نامانوس ہوتا
۔ اِس کے وجوہ تہذیبی اور تاریخی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ
ں قطعہ اور رباعی، یہ دو اصنافِ سخن ایسی ہیں جن کو کبت
ل کہنا چاہیے۔ اِن دونوں نے اُردو میں پہلے دن سے اپنی
لی تھی اور زبان و ادب کی ترقی کے ساتھ اِن کا چلن بڑھتا ہی
کام کبت سے لیا جا سکتا تھا، وہ قطعے اور رباعی سے بہتر طور پر
یوں کبت کو فروغ ملنے کے اسباب گویا ختم ہو کر رہ گئے۔ کبت
ن کی طوالت بھی اردو میں اس کی کم رواجی میں مددگار ثابت ہوئی
بت ہوتا ہے چار مصرعوں کا، مگر وزن کی طوالت اسے کھینچ کر
بنا دیا کرتی ہے۔ اِس کے مقابلے میں رباعی میں بھی چار ہی
ہوتے ہیں اور بہت سے قطعے بھی چار مصرعوں کے ہوتے ہیں،
ے اوزان میں وہ طوالت نہیں ہوتی، جو ایک طرح سے کبت کی
ہے۔

آخر میں ایک اور ضروری بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اردو میں
ر کبت موجود ہیں، باغ و بہار کو چھوڑ کر، اور کسی نسخے سے اُن
رنا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بہت سی کتابوں
اڈیشن ملتے نہیں، بعد کو جو نسخے چھپے ہیں، وہ صحتِ متن کے

لحاظ سے بے حد ناقص ہیں۔ مثلاً میں کوشش کے باوجود نوطرزِ م
سے ایک کبت بھی نقل نہیں کر سکا، اس لیے کہ پروفیسر نورالحسن
صاحب کا مرتّب کیا ہوا جو نسخہ میرے سامنے ہے، وہ صحّتِ متن
اعتبار سے بے حد مایوس کن ہے، اُردو کے جملے تو سر مغزن کر کے
ہی لیے جاتے ہیں، مگر کبت صحیح طور پر پڑھنے میں نہیں آپاتے۔
کا پہلا اڈیشن اِس وقت مجھے نہیں ملا، لکھنؤ میں اب سے کئی سا
میں نے اُسے دیکھا تھا۔ اِس وقت میرے سامنے مجلسِ ترقیِ ادب لا
کا چھاپا ہوا نسخہ ہے۔ صحتِ متن کے لحاظ سے اس کا احوال ویسا
ہے جیسا مجلس کی اکثر کتابوں کا ہے۔ یہ دو کبت جو میں نے اس
نقل کیے ہیں، اِن کو بہ مشکل نقل کر سکا ہوں اور اِس طرح کہ د
یونی ورسٹی کے شعبۂ ہندی کے دو سینیر اساتذہ سے مدد لی۔ بہ قول
کے، بعض مقامات پھر بھی مشکوک رہ گئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ پاک
میں مجلسِ ترقیِ ادب اور ہمارے یہاں ترقیِ اردو بورڈ، یہ دونوں
جس وسیع پیمانے پر تدوینِ متن کا کام کرا رہے ہیں، اس کا
یہی نکلنا چاہیے تھا۔ تحقیق اور تدوین کا کام تھوک میں نہیں ک
جا سکتا۔ مگر اب تک اِن دونوں اداروں میں بیش تر کام ایسے ہی
ہیں جیسے P.W.D. کا محکمہ ٹھیکیداروں کی مدد سے سرکاری عمارت
بنوایا کرتا ہے۔ ایک مختصر سی مقرّرہ مدّت میں نہ تحقیق کا کام صح
طور پر ہو سکتا ہے نہ تدوین کا۔ ۳۱ مارچ کی تلوار سر پر لٹکتی ر
ہے اور جھولیاں بھر بھر کے تحقیق اور تدوین کے کام ہوتے رہتے
ترقی اردو بورڈ نے فارسی کتابوں کے جو اردو ترجمے چھاپے ہیں ا
جن دواوین کو مرتّب کیا ہے، اُن کا حال اِس قدر خراب ہے کہ وہ مص
اور شاعر اگر آج زندہ ہوتے تو اس مرتّب اور اِس ادارے، دونوں
ازالۂ حیثیتِ عرفی کا مقدمہ دائر کرنے میں تکلّف نہیں کرتے۔ ع
یہ کرتا ہے کہ یہ کام بھی کرنے کا ہے کہ جس طرح کبتوں کا جائزہ
جائے، اسی طرح کوشش کر کے ان کا متن بھی ایک بار صحیح کر لیا جا
تاکہ ادب کے طالب علم آسانی اور صحّت کے ساتھ انھیں پڑھ سکیں او
مجھ سے ناآشنائے زبان اگر نقل کرنا چاہیں تو نقل کر سکیں۔ مثا
کے طور پر باغ و بہار کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ گل کرسٹ کے مقرر کر
اصولِ املا و علامات کے مطابق اِس کتاب میں ان تینوں کبتوں
اُردو رسم خط میں اِس طرح لکھا گیا ہے کہ پڑھنے میں ذرا بھی دقّت نہیں ہو

غزلیں

مظہر امام

زخمِ تازہ کیا دکھاؤں جب مسیحائی نہ ہو
اس کے گھر جاؤں تو پہلی سی پذیرائی نہ ہو

رایگاں سارا سفر، سب کوہ پیمائی نہ ہو
میرے جذبے کی طرح گہری کہیں کھائی نہ ہو

جُرم نو عاید نہ ہو، اک تازہ رسوائی نہ ہو
دیکھ لوں دنیا کہیں میرے قریب آئی نہ ہو

یہ سزا کیا ہے کہ جلنے کے لیے شعلے نہ ہوں
ڈوبنے جاؤں تو دریاؤں میں گہرائی نہ ہو

فاتحوں کے دل بھی اکثر ڈوبتے دیکھے گئے
اے خدا! میں ہار بھی جاؤں تو پسپائی نہ ہو

مظفر حنفی

کوئی یُوسف نہیں ہے اور کاروبار پھیلا ہے
ہمارے سامنے اک مصر کا بازار پھیلا ہے

اُمیدوں پر ہمیشہ اوس پڑتی ہے مری جانب
اُدھر حدِ نظر تک ابرِ گوہر بار پھیلا ہے

ہمارے صحن میں برچھی لیے کرنیں اُتر آئیں
پڑوسی آنگنوں میں سایۂ دیوار پھیلا ہے

سلاخوں سے لگا رکھی ہیں آنکھیں اہلِ زنداں نے
جدھر بھی دیکھتے ہیں کوچۂ دلدار پھیلا ہے

سمٹتی جا رہی ہے کہکشاں تارے لرزتے ہیں
ہمارا ہاتھ، اُس کا طرۂ دستار پھیلا ہے

بالآخر مٹ گئی سرحد محبت اور نفرت کی
اُبلتا خون کچھ اِس پار، کچھ اُس پار پھیلا ہے

مری طبعِ رواں منت کشِ ساحل نہیں ہوگی
مظفرؔ، بادبانِ آسماں بیکار پھیلا ہے

"... پھر، آجکل وہ کدھر ہے؟
ایک مارواڑی سیٹھ تولارام کے پاس
شادی کرلی اُس کے ساتھ؟
پتہ نہیں!
خورشید کے ذہن میں پیش امام صاحب کی صورت گھوم گئی...

انور خاں

یاد بسیرے

خورشید جتنے دن لندن میں رہا بمبئی کو یاد کرتا رہا کہ اُس کی جوانی کے حسین و خوش گوار لمحے اِسی شہر کی سڑکوں پر، گلیوں میں گزرے تھے لیکن یہ عجیب بات تھی کہ دورانِ پرواز اُس کا جہاز جوں جوں ہندستان سے قریب آتا گیا، اُسے سورت کے قریب تاپی ندی کے کنارے بسے ہوئے اپنے گانو کی یاد شدّت سے ستانے لگی۔ چھوٹا سا خوش حال گانو جس کے ہر گھر کا کم از کم ایک فرد ضرور بمبئی، لندن یا افریقہ کے کسی شہر میں بسا ہوا تھا۔ گانو کی یاد کے ساتھ ہی شاندار پختہ مکانات، حویلیاں، بنگلے نظر سے گزرنے لگے۔ دس پندرہ سال گزارنے کے بعد جب بھی کوئی شخص گانو واپس آتا تو اُس زمانے کے فیشن کے مطابق اپنا مکان ضرور بنواتا اور یہ سلسلہ تقریباً سو سال سے چل رہا تھا۔ گانو کا کوئی مکان ایسا نہ تھا جو پختہ، رنگ و روغن سے آراستہ نہ ہو۔ بعض پرانی حویلیوں پر ایسی پچّی کاری تھی کہ آدمی ٹھٹھک کر دیکھنے لگے۔ گانو کی مسجد بھی اتنی ہی شاندار تھی اور وہ مدرسہ بھی جہاں اُس نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ مدرسے کے مہتمم اپنے وقت کے جیّد عالم دین تھے جنھیں خاص طور پر بلا کر رکھا گیا تھا اور ان کی رہائش کے لیے علیحدہ سے ایک خوبصورت مکان بنوا کر دیا گیا تھا۔ اُس زمانے میں انھیں پانچ سو روپے تنخواہ دی جاتی تھی جو گانو کی ضروریات اور اخراجات کے لحاظ سے بہت زیادہ تھی۔ جدید طرز کا اسکول تھا جس میں انگریزی میں تعلیم دی جاتی تھی اور ایک لازمی مضمون اردو کا ہوتا۔ مادری زبان گجراتی ہونے کے باوصف لوگ اردو بڑے شوق سے سیکھتے کہ یہ زبا[illegible] انھیں ملک کے دوسرے مسلمانوں سے جوڑ دیتی تھی۔ اردو اخبار سورت سے آتے۔ گھر کی عورتیں خواتین کے اردو ناول بڑے شوق سے پڑھتیں۔ فاطمہ مبین، اے۔ آر۔ خاتون، حجاب امتیاز علی اور بیگم عبدالقادر کے ناول گھر گھر موجود تھے۔ مردوں میں ایم۔ اسلم، رئیس احمد جعفری، انتصار حسین اور رشید اختر ندوی کے ناول مشہور تھے۔ اسے یاد تھا کہ بچپن میں وہ ایک بار بمبئی گیا تھا تو اس کے ماموں نے اُسے تاکید کی تھی کہ وہ حبیب اشعر کا ناول شہلا ضرور لیتا آئے۔ بے شمار ناموں میں سے یہ چند اُسے یاد رہ گئے تھے۔ اُس کے ماموں نے ایک دار المطالعہ بھی قائم کیا تھا، جہاں لوگ شام میں جمع ہو کر اکثر حالاتِ حاضرہ پر تبادلۂ خیال کرتے۔ دار المطالعے کے لیے ہزاروں روپے کی کتابیں انھوں نے آپس میں چندہ کر کے بمبئی سے منگوائی تھیں۔ ا[illegible] میں اردو کتابیں بھی تھیں، انگریزی بھی اور گجراتی بھی۔ لائف لورٹائم کی مختلف سیریز کی کتابیں، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی تمام جلدیں نہ صرف دار المطالعے میں موجود تھیں بلکہ کئی لوگوں کے ذاتی کتب خانوں میں بھی دیکھی جا سکتی تھیں۔ خورشید کے والد تاریخی کتابوں کے دلدا[illegible] تھے۔ تاریخ طبری، تاریخ فرشتہ، تاریخ آصفیہ، الفاروق، سیرۃ النبیؐ وغیرہ کے پرانے نایاب ایڈیشنوں کے علاوہ جادوناتھ سرکار، ایشوری پرشاد، تاراچند اور ڈی پی مکرجی، مولانا آزاد وغیرہ کی کتابیں اُن کی

لائبریری میں بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ چرچل اور جواہر لال نہرو کی انگریزی کے وہ دلدادہ تھے۔ انگریزی بہتر کرنے کے لیے وہ اکثر ڈسکوری آف انڈیا اور چرچل کی خود نوشت سوانح کا مطالعہ کرتے۔ تمام قیمتی کتابوں کی انھوں نے شاندار چمڑے کی جلدیں بنوائی تھیں جن پر مصنف اور کتاب کا نام زرّیں حروف میں کندہ ہوتا۔ خورشید جتنے دن گاؤں میں رہا ان کتابوں کو اِدھر اُدھر سے دیکھتا رہا۔ خوبصورت نفیس جلدیں اُسے بہت اچھی لگتی تھیں۔ جلدوں پر کندہ کتابوں کے نام اُس نے سینکڑوں بار پڑھے ہوں گے۔ اب بھی آنکھیں بند کرکے وہ اُن میں سے چند ایک کے بارے میں تو کہہ ہی سکتا تھا کہ وہ لائبریری کے کس شلف میں کس مقام پر رکھی ہوں گی۔ لیکن کتابوں سے زیادہ مزہ اُسے اُن مجلسوں میں آتا تھا جو اکثر شام کو دیوان خانوں میں منعقد ہوتیں۔ عمر کے لحاظ سے ورنہ اُس نے یا تو ابنِ صفی کے ناول پڑھے ہوں گے یا پھر تیرتھ رام فیروز پوری کے ترجمے۔ بمبئی سے گاؤں کا کوئی شخص آتا یا پھر دور دراز سے کسی کی واپسی ہوتی تو دعوتوں اور محفلوں کا ایک لمبا سلسلہ چلتا جو دنوں دن چلتا رہتا۔ بڑے بڑے شہروں کی باتیں، حیرت انگیز واقعات جو معلوم ہوتا تھا ان شہروں کا معمول ہیں اور ملکی سیاست کی باتیں وہ منہ کھولے، ایک ٹک، بغیر پہلو بدلے سنتا رہتا۔ زیادہ تر محفلوں کا اختتام سن رسیدہ، بوڑھوں کے ان جملوں پر ہوتا کہ دنیا بہر حال فانی اور ناپائیدار ہے اور آخرت کی تیاریاں کرنی چاہییں۔ اصلی گھی میں تر تراتے خوشبودار چاولوں، میٹھی سوئیوں یا زردے اور دوسری مرغن غذاؤں کو طبیعت سے صاف کرنے کے بعد دانتوں میں خلال کرتے ہوئے ان جہاں دیدہ لوگوں کی زبان سے یہ باتیں جنھوں نے سچ مچ ایک دنیا دیکھی تھی اور ڈٹ کر دنیاداری کی تھی خورشید کو متبسّم کر دیتیں۔ ایسی کتنی ہی باتیں اسے یاد آئیں۔

خورشید بمبئی ایر پورٹ پر اترا تو اس کا ماموں زاد بھائی نجیب اس کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ برسوں بعد اپنے بچپن کے ساتھی سے ملتے ہوئے اسے بے حد خوشی ہوئی۔ اُس نے سوچا تو تھا کہ زیادہ وقت وہ بمبئی میں گزارے گا پھر کشمیر، دلّی اور آگرہ کی سیر کے لیے نکل جائے گا لیکن جب اُس کی گاڑی ایر پورٹ سے باہر آئی اور اُس نے سڑکوں، گلی کوچوں، دکانوں اور مکانوں سے اُبلتے ہوئے ہجوم کو دیکھا، جگہ جگہ اُسے غلاظت کے ڈھیر اور جھونپڑ پٹیوں کی قطاریں نظر آئیں تو اس کا دل گھبرانے لگا۔

"اِس شہر میں تو میں دو روز بھی نہیں رہ سکتا" اُس نے نجیب سے کہا: "چلو کل ہی گاؤں نکل چلتے ہیں۔"

"یہ کیسے ممکن ہے"، نجیب نے کہا "کتنے ہی عزیز، رشتہ دار تم سے ملنا چاہتے ہیں تقریباً سارے واقف کار بمبئی میں ہیں اور تم پندرہ سال بعد لندن سے لوٹ رہے ہو۔ دو چار دن تو رُکنا ہی پڑے گا۔"

دو چار دن تو کیا تقریباً پندرہ دن ملنے ملانے میں ہی گزر گئے۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اُس کے اتنے سارے عزیز و اقارب ہوں گے۔ ماموں، ماموں کے بچے، خالائیں، خالاؤں کی اولادیں پھر اُن کے بچے، چچا کے عزیز، بہنوں کے کنبے اور پھر اُن کے سسرالی رشتہ دار۔ دعوتوں کا سلسلہ تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا ہر شخص اپنے تموّل کو جتانے کا خواہشمند تھا کہ اگر تم نے سمندر پار دولت کمائی ہے تو ہم نے بھی بمبئی میں گھاس نہیں کھودی ہے۔ اگر خورشید سب کی دعوتیں قبول کر لیتا تو شاید ابھی اور دو مہینے اُسے بمبئی سے چھٹکارا نہ ملتا۔ بالآخر گاؤں سے واپسی پر اس نے ان دعوتوں کو ٹالا اسے یہ جان کر تعجب ہوا کہ اس کے رشتہ داروں میں سے گزشتہ دس پندرہ برسوں میں شاید ہی کسی کا گاؤں جانا ہوا ہو۔ خود نجیب کو بھی گاؤں دیکھے دس برس کے لگ بھگ ہو گئے تھے اور وہ بھی بس دوستوں کے ساتھ بطور پکنک ہی گیا تھا۔ حالانکہ اگر وہ غور کرتا تو اس میں تعجب کی بات ہی کیا تھی۔ اُس نے خود دس سال بمبئی میں گزارے تھے اور شروع کے چند برسوں کے سوا اُس نے گاؤں کی طرف کبھی پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

گاؤں چلنے کے لیے نہ اُس کی بیوی راضی ہوئی نہ بچے۔ ان کے بڑے لمبے پروگرام تھے۔ پچاسوں ہندی فلمیں تھیں جو ابھی دیکھنی باقی تھیں۔ کچھ شہر کے مختلف سینما گھروں میں چل رہی تھیں۔ بقیہ ویڈیو پر دیکھنے کا پروگرام تھا۔ پھر پاکستان کے ٹی۔ وی ڈرامے تھے شیطان کی آنت کی طرح طویل۔ ایک ڈرامہ "وارث" تو سات کیسٹوں میں تھا تعجب کی بات یہ تھی کہ لوگ دو دو دن تک مسلسل یہ ڈرامے دیکھتے پھر نئے کیسٹوں کی تلاش شروع ہو جاتی۔ اس کی بیوی تقریباً ہر سال ہندوستان آتی مگر اُس کا سارا وقت یا تو بمبئی میں فلمیں دیکھنے اور شاپنگ میں گزرتا یا پھر وہ بچوں کو لے کر دلّی، اجمیر، آگرہ، جے پور

سیر کو نکل جاتی۔ کبھی گرمیوں میں آنا ہوتا تو چند روز بمبئی میں گزار کر وہ سیدھی کشمیر چلی جاتی۔ گانو وہ بھول کر بھی نہیں گئی۔ اس کے ذہن میں گانو کا تصور بس اُس وقت کا تھا جب وہ بہت چھوٹی تھی۔ عورتیں لمبے لمبے فراک پہنے، زیوروں میں لدی یا تو کھانے پکانے میں مصروف ہیں یا بچوں کے گو، موت میں۔ عمر کچھ زیادہ ہوئی اور انھوں نے جانماز سنبھالی منہ اندھیرے اٹھ کر قرآن کی تلاوت کرتیں پھر فجر کی نماز کے بعد وظیفے جو شروع ہوتے تو چاشت کے وقت تک چلتے رہتے۔ بات بات میں پاکی ناپاکی کا قضیہ شروع ہو جاتا۔ اپنا بچپنا اُسے یاد آتا کہ جہاں کسی بڑھیا کے کمرے میں گھسی اور ہنگامہ ہوا۔ اے لڑکی کیا کر رہی ہے۔ اری بھاگ ابھی سارا کمرہ دھلوانا پڑے گا۔ کرسیوں، میزوں تک کو غسل دیا جاتا تھا۔

چنانچہ خورشید کو نجیب کی معیت پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔ اس نے سوچا اچھا ہے۔ اس طرح جھنجٹ بھی کم ہو رہے گی۔ بمبئی سینٹرل جب وہ پہنچے تو ہجوم کو دیکھ کر اُسے بڑی وحشت ہوئی مگر اُس نے خود کو تسلی دی کہ چند گھنٹوں میں بہر حال وہ اپنے گانو میں ہوگا۔ آدھ گھنٹے بعد پسنجر گاڑی نے پلیٹ فارم سے دھیرے دھیرے کھسکنا شروع کیا اور کچھ دیر بعد بس ٹرین کی گھڑ گھڑ تھی اور ڈبے میں بیٹھے گجراتی مسافروں کی زور زور سے گفتگو کی آوازیں جو ٹرین کے شور پر اپنی آواز کو فوقیت دلانے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ اپنے سامنے بیٹھے مسافر تک بات پہنچ سکے۔ گھنٹہ بھر ہو گیا اور وہ لوگ اسی جوش و خروش سے گفتگو کرتے رہے تو خورشید نے سوچا کہ ان لوگوں کا شمار شاید سب سے زیادہ بولنے والے لوگوں میں ہوتا ہوگا۔ اگر اس کی تصدیق ہو سکے تو وہ BOOK OF RECORDS کے مرتبین کو یہ بات لکھ بھیجے۔

اس خیال کا اظہار اُس نے نجیب سے کیا نجیب ہنس پڑا۔

یہ باتیں ابھی چل ہی رہی تھیں کہ اگلے اسٹیشن پر دو گجراتی تاجر ڈبے میں داخل ہوئے اور انھوں نے گفتگو کا رخ اشیاء کے بھاؤ کی طرف موڑ دیا۔ ہینگ، دار چینی، مونگ پھلی اور پتہ نہیں کن کن چیزوں کا بھاؤ سنتے سنتے جس میں ہر مسافر شریک ہونا چاہتا تھا اور بیچ بیچ کراہیت والے کا اظہار کر رہا تھا خورشید کی طبیعت صاف ہو گئی۔ اس نے سوچا یہ ریلوے کمپارٹمنٹ ہے یا سپر بازار۔ اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کا بس ایک ہی طریقہ اس کی سمجھ میں آیا۔ پسنجر گاڑی چونکہ چھوٹے سے چھوٹے اسٹیشن پر بھی دو چار منٹ کے لیے رک جاتی ہے وہ ہر اسٹیشن پر ڈبے سے اتر جاتا۔ اس طرح کانوں کو کچھ راحت میسر آئی جو اس وقت اس کے لیے بے حد ضروری تھی۔

گاڑی جب اس کے گانو پہنچی تو سہ پہر شروع ہو چکی تھی۔ ا[illegible] گانو کو دیکھ کر اس کا دل کھل اٹھا۔ سفر کی ساری کوفت، تمام تکا[illegible] گانو کی فضا میں قدم رکھتے ہی جیسے ہوا ہو گئی۔ اسے لگا جیسے ا[illegible] وہ دوڑ پڑے گا۔

گانو آج بھی ویسا ہی تھا۔ اُس نے یہ بات خاص طور سے [illegible] کی کہ بمبئی سے یہاں تک سارے علاقے میں نہ ایسے مکانات نظر آئے نہ ایسی زرخیزی۔ پختہ مکانات، بنگلوں پر بمبئی کے مضافات کا گ[illegible] ہوتا تھا۔ اُس نے یہ بات بھی نوٹ کی کہ نجیب اور وہ بس دو ہی م[illegible] تھے جو اس اسٹیشن پر اُترے۔ دوسرے مسافروں نے بھی انھیں [illegible] عجیب نظروں سے تاکا تھا۔

اسٹیشن کے باہر ایک یکہ کھڑا نظر آیا۔ کسی زمانے میں یہا[illegible] تانگوں کی ریل پیل رہتی تھی مگر آج بس یہی ایک ٹوٹا پھوٹا برسو[illegible] پرانا یکہ دکھائی دے رہا تھا۔ انھیں دیکھ کر ایک بوڑھا آگے بڑ[illegible] اور انھیں اِس طرح دیکھنے لگا گویا وہ کوئی عجوبہ روزگار ہوں۔

"بہت پیسہ لائے ہو؟" اُس نے اِن سے پوچھا۔

"کیا مطلب؟" نجیب نے ناگواری اور کچھ حیرت سے پوچھا۔

"پیسہ کمانے گئے تھے نا شہر؟" اُس نے اسی سپاٹ لہجے میں [illegible]

"تو۔۔۔ تو کیا ہوا" نجیب نے کہا۔

"ہم سمجھے بہت دھن کما لیا ہوگا۔ تبھی تو اتنی جلدی واپس لو[illegible] آئے۔"

خورشید اور نجیب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ بوڑھا کچھ سن[illegible] معلوم ہوتا ہے۔ "قاضی محلہ چلو گے" نجیب نے پوچھا۔

"قاضی محلہ؟" اُس نے انھیں غور سے دیکھا۔ اس کی پتلیاں پھیلیں پھر سکڑ گئیں۔ "قاضی محلہ" اس نے پھر دہرایا۔ پھر انھیں تعجب سے دیکھنے لگا جیسے سوچ رہا ہو بھلا وہاں بھی کوئی جاتا [illegible] پھر خاموشی سے اگلی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا اور لگام ہاتھ میں لے [illegible] ایک بار پھر نظروں کا تبادلہ ہوا اور دونوں اپنچی لے کر یکہ پر چڑھ گئے۔ گھوڑا آہستہ آہستہ بڑھا گویا اب بھی کسی سوچ میں [illegible]

کچّے پکّے راستوں سے دلکی چال چلتا گھوڑا گزرا تو ماحول بالکل شانت تھا۔ لمبی لمبی گھانس اور پیڑوں کی شاخوں کو جھلاتی ندی کی سبک ہوا باربار خورشید اور نجیب کے بالوں کو بے ترتیب کر دیتی۔ اور وہ بار بار ہاتھوں سے انھیں درست کرنے کی کوشش کرتے۔

"یہ رفیق چاچا کا گھر ہے" نجیب نے ایک دو منزلہ مکان کی طرف اشارہ کیا۔

یکّہ مکان کے پاس سے گزرا تو خورشید نے دیکھا دروازے پر تالا پڑا ہے۔ مکان کا پینٹ اب بھی کچھ زیادہ ماند نہیں پڑا تھا۔ وہ اُس وقت تک مڑمڑ کر مکان کو دیکھتا رہا جب تک مکان نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔ اس کے بعد کئی مکان نظر آئے، کئی حویلیاں مگر سب پر تالے پڑے تھے۔ اِن کے مکینوں کے متعلق نجیب کو بھی پتہ نہیں تھا۔ شاید اُس کے بمبئی آنے کے بعد بنی تھیں۔ اُس کے بعد وہ راستہ آیا جو خورشید کو سب سے زیادہ پسند تھا۔ فرلانگ بھر راستہ جس کے دونوں طرف پیڑ تھے اور کچھ فاصلے پر ندی کنارے برگد کے کئی پیڑ اِس طرح سایہ کیے ہوئے تھے کہ بچے دن بھر جھولا کرتے۔ گرمیوں کی راتوں میں بڑے بھی جمع ہو جاتے اور بڑے زوروں کے بحث مباحثے ہوتے۔ برسات میں گھروں سے پکوان بنوا کر کئی کئی خاندان پکنک منانے پہنچ جاتے۔ خورشید نے دیکھا کہ وہاں سوائے سائیں سائیں کرتی ہوا کے کچھ بھی نہ تھا۔ رفتہ رفتہ یہ منظر بھی اوجھل ہو گیا۔

"یہ شوکت بھائی کا گھر ہے"

"وہ افریقہ والے"

"نہیں نہیں، اِن کے گھر والے سب بمبئی میں رہتے ہیں۔ والکیشور پر انھوں نے فلیٹ لے لیا ہے۔ یہ حمید دودھ والے کا گھر ہے۔ اس کا انتقال ہو گیا۔ ایک ہی لڑکا تھا وہ لندن میں ہے۔ کئی سال سے گھر بند پڑا ہے۔ یہ خیرو چاچی کی حویلی ہے اِن کے میاں اسّی تولہ سونا لے کر افریقہ سے آئے تھے۔ بھائی سارا سونا موس کر پاکستان لے گئے اب اکیلی پڑی رہتی ہیں چاچا پھر بھی اتنا کچھ چھوڑ گئے کہ گزر بسر ہو جاتا ہے"

یکّے کی گرڑ گرڑ سن کر ایک ضعیفہ پہلی منزل کی کھڑکی میں نمودار ہوئیں خورشید نے بغور دیکھا۔ بڑھیا کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا شاید وہ دکھ اور سکھ کی منزلوں سے بہت آگے جا چکی تھی۔

"یہ پلیٹس امام صاحب کا مکان ہے نا؟" خورشید نے ایک مکان کو پہچانتے ہوئے کہا۔

"ہاں، اِن کی لڑکی شکیلہ تو تمھیں یاد ہو گی؟"

"وہ جو سینٹ زیویرس کالج میں پڑھتی تھی؟"

"ہاں وہی" نجیب نے کہا "تم تو جانتے ہو کہ اُسے ڈراموں میں کام کرنے کا بہت شوق تھا۔"

"مجھے تو بس اتنا یاد ہے کہ ہم لوگوں نے بہت چکّر کاٹے مگر وہ ہمیں کبھی خاطر میں ہی نہیں لائی۔"

"تمھیں پتہ ہو گا ایک پروڈیوسر نے اسے فلم میں چانس دینے کا وعدہ کیا تھا۔"

"شاید اُس نے چند فلموں میں کام بھی کیا تھا۔"

"ہاں وہ چند سی کلاس فلموں میں آئی بھی تھی۔"

"پھر آج کل وہ کدھر ہے؟"

"ایک مارواڑی سیٹھ تولارام کے پاس"

"شادی کر لی اُس کے ساتھ"؟

"پتہ نہیں"

خورشید کے ذہن میں پلیٹس امام صاحب کی صورت گھوم گئی کیسے نورانی بزرگ تھے، عالم دین۔ مذہب پر کیسی گہری نظر تھی۔ ہرج کو ظہر کی نماز کے بعد تفسیر بیان کرتے تھے۔

یکّہ اب محلّوں سے گزر رہا تھا۔ محلّے کے محلّے خالی۔ کہیں کو اکّا دکّا آدمی نظر آ جاتا۔ بچوں کا تو جیسے پتہ ہی نہ تھا۔ کبھی کبھار کہا کوئی دکان نظر آ جاتی۔ آٹھ دس مکانوں میں کہیں ایک آدھ مکان کو کھلا نظر آتا۔

"یار یہ سب محلّے خالی پڑے ہیں کیا۔ مجھے تو ہول ہو رہا ہے" خو نے کہا۔

"گوالوں کا طبیلہ اب بھی ہے صاحب" یکّہ بان پہلی بار بولا۔

"کتنے گوالے ہیں"

"بیس پچیس تو ہوں گے ہی۔" یکّہ بان بولا "گھاس ادھر ہے اب تو گھسیارے بھی بہت آ گئے ہیں اِس طرف۔"

"تو یہ سب بیچتے کس کو ہیں۔"

"ساب صبح گاڑی میں دودھ چڑھا دیتے ہیں اور گھاس کے بھی۔ سورت اور بمبئی کے بیوپاری اسٹیشن پر اتار لیتے ہیں۔ اُن کا

گاڑی میں گن گن کر نقد پیسہ دے دیتا ہے۔"
"اچھا۔"
یکّہ ایک جانے پہچانے محلّے میں داخل ہوا۔ اس گلی میں خورشید اور نجیب کی زندگی کے بیش قیمت سال گزرے تھے۔ گلی کے دونوں طرف پختہ شاندار مکانات آج بھی ایسے لگ رہے تھے جیسے ابھی اِن کے مکین آئیں گے اور سارے محلّے میں چہل پہل شروع ہو جائے گی۔ خوبصورت مکانات جن کی تعمیر پر ان کے مالک فخر سے پھولے نہ سماتے تھے اپنے مکینوں کی راہ دیکھ رہے تھے جو پتہ نہیں کن زمینوں میں دولت کی ذخیرہ اندوزی میں منہمک تھے۔ گلی جس میں دن بھر بچے اودھم کرتے رہتے تھے اس طرح سنسان دیکھ کر خورشید کا دل بیٹھ گیا۔

تانگہ خورشید کے مکان کے سامنے رکا اور وہ دونوں یکّے سے اترے۔ قریب کے ایک مکان کی کھڑکی کا ایک پٹ کھلا اور ایک بوڑھی عورت کا چہرہ نمودار ہوا۔ گلی کے کئی مکانوں کے نیم وا دریچوں سے اکاّ دکاّ چہرے جھانکتے نظر آئے۔ خورشید کو کچھ خوف سا محسوس ہوا مگر پھر ان کے خدو خال کچھ مانوس سے معلوم ہوئے۔ اس خرابے میں بھی رات بسر کی جا سکتی ہے۔ اُس نے سوچا۔

"مکان کی چابی کس کے پاس ہوگی" نجیب نے کہا "یہ تو ہم پوچھنا ہی بھول گئے"

ابھی وہ اسی تذبذب میں کھڑے تھے کہ پاس کے مکان کی ایک کھڑکی سے ایک جھرّیوں بھرا ہاتھ باہر آیا اور اُسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ خورشید کھڑکی کے نیچے پہنچا۔ ایک عمر رسیدہ عورت کھڑکی میں کھڑی تھی جس کے بال سن سے زیادہ سفید تھے۔

"غیاث الدین کے لڑکے ہو تم؟" باریک، منمناتی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔

اُس نے سر کے اشارے سے ہاں کہا۔ تبھی اس کے ذہن میں مانوس خدو خال کا ایک شاداب چہرہ ابھرا۔ ارے یہ تو شاہدہ خالہ ہیں

"شاہدہ خالہ!" اس نے چلّا کر کہا۔

"پہچان لیا مجھے" عورت نے مسرت سے کہا "ٹھہرو میں چابی بھیجتی ہوں۔"

یکے بعد دیگرے مختلف دریچوں سے کئی بوڑھے چہرے نمودار ہوئے اور انھوں نے اپنی پہچان کروائی۔

ارے یہ تو فدا علی ہیں جن کی بمبئی میں تالوں کی دکان تھی۔

ابراہیم جناب جنھوں نے انھیں پرائمری اسکول میں پڑھایا

رحمت آپا جن کے دروازے سے برات لوٹ گئی تھی کیونکہ دُ
کی عمر بہت زیادہ تھی۔

مولوی بشیرالدین جن کی کتابوں کی دکان تھی۔ تقریباً ہر شـ
اباّ سے ملنے آتے۔

چہرے جن پر وقت جالے تان چکا تھا مگر اب یہ گلی کچھ ز
مانوس سی لگنے لگی۔ یہ اس کا اپنا محلّہ تھا وقت نے اس کے سا
بھلے ہی جو بھی سلوک کیا ہو۔

شاہدہ خالہ نے دریچے سے چابی پھینکی

"بھابی کا خط آیا تھا" اُنھوں نے کہا "کمرے صاف کروا د
ہیں، رات میں کھانا بھجوا دوں گی۔ فکر مت کرنا۔ کسی چیز کی ضر
ہو تو منگوا لینا۔"

اپنے مکان کا تالا کھولتے ہوئے اس کے ہاتھ بری طرح ک
نجیب نے اس کے ہاتھ سے چابی لی اور دروازہ خود کھولا۔

سب کچھ ویسا ہی تھا۔ دیوان خانہ، اباّ جان کے مطا
کمرہ، آنگن، زنانے کمرے۔ یہ امیّ کا پلنگ، یہ ابّا جان کی میز۔ یہ
کا اپنا کمرہ۔ کپ بورڈ میں کپڑے اب بھی اس سلیقے سے رکھے
گویا امیّ نے ابھی ابھی تہہ کر کے رکھے ہیں۔ اُس نے اپنی میز کی
دراز کو کھولنے کی کوشش کی۔ دراز جام ہو گئی تھی۔ اس نے
قوت سے کھینچا۔ اندر اس کی چیزیں اب بھی ویسی کی ویسی
پینسلیں، ربڑ، قلم، اسکول کی کاپیاں۔ میز پر اب بھی ابن صفـ
کئی ناول دھرے تھے۔ اُس نے ایک کپڑا لے کر گرد جھاڑی۔ آ
زیادہ کتاب دیمک چاٹ گئی تھی۔ اباّ جان کی کتابیں کس حالت میں
گی۔ وہ اُن کے مطالعے کے کمرے میں آیا۔ خوبصورت جلدیں
اُسی نفاست سے سجی تھیں: بمبئی سے چلتے وقت اُس نے سوچا
اِن کتابوں کو کسی یونیورسٹی یا اچھی لائبریری کو دے دےگا۔ کپڑ
اُس نے کتابوں کو جھٹکا۔ اور گرد کی تہہ کچھ چھٹی۔ سنہری حروف
ہوئے "کیمیائے سعادت، کلیاتِ میر، دیوانِ داغ، دیوانِ غ
مکتوباتِ ربانی، کتاب الشفا۔"

اُس نے کیمیائے سعادت، کو انگلیوں کے دباؤ سے کھینچ کر باہر نکالا۔ دیمک نے جگہ جگہ سوراخ کر دیے تھے۔ اُس نے کتاب واپس اپنی جگہ پر رکھ دی۔ اور ایک دوسری کتاب نکالی۔ یہ کلیات میر کا ایک بہت پرانا ایڈیشن تھا۔ دیمک اس پر بھی قابض ہو چکی تھی۔ اُس نے صفحات پلٹے۔ مگر جو صفحہ ہاتھ میں لیتا وہ ہاتھ لگاتے ہی مٹی کی طرح بھربھرا کر جگہ جگہ سے ٹوٹ جاتا۔ خورشید نے اسے بھی واپس رکھ دیا۔ دیوانِ غالب کا جرمن ایڈیشن اُسے نظر آیا۔ شاید اِس کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہو گا۔ اُس نے اوراق پلٹے۔ اِس کی بھی وہی کیفیت تھی۔ جہاں انگلیاں مس ہوئیں اور صفحات جھڑ جھڑ کر ٹوٹنا شروع ہو گئے۔ لندن میں اس سے کسی نے کہا تھا ہندوستان میں تاریخ فرشتہ کا کوئی نسخہ ملے تو ضرور لانا اور اس نے بڑے فخر سے کہا تھا کہ یہ کتاب تو اس کے والد کی لائبریری میں موجود ہے۔ اُس نے کتابوں کے درمیان تلاش کرنا شروع کیا۔ پتہ نہیں اس کتاب کا کیا حال ہو گا۔ تاریخ کی کتابوں میں تلاش کرتے ہوئے اُسے تاریخ فرشتہ نظر آ ہی گئی۔ اُس نے بڑے اشتیاق سے کتاب نکالی۔ دوسری کتابوں کی طرح اسے بھی دیمک لگ چکی تھی۔ اُس نے صفحات پلٹے مگر وہی کیفیت کہ انگلیاں لگتے ہی صفحات بھربھرا کر ٹوٹ جاتے۔ اُس نے بے دلی سے کتاب میز پر ڈال دی۔ اُسے یاد آیا بچپن میں اس نے سنا تھا کہ ۱۹۴۴ء میں بمبئی کی بندرگاہ پر ایک نیوی کے جہاز میں جس میں بموں کا ذخیرہ تھا آگ لگی تھی اور بمبئی دہل گئی تھی۔ بموں کے دھماکوں سے دور دور تک بلڈنگیں کانپ گئی تھیں کھڑکیوں کے شیشے چور چور ہو گئے تھے۔ لوگ گھبرا کر گھروں سے نکل آئے تھے۔ گلیوں میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ مارواڑیوں کی تجوریوں میں نوٹوں کی گڈیاں بظاہر جوں کی توں نظر آتیں مگر ہاتھ لگاتے ہی مٹی ہو جاتیں۔ یہ قیمتی ذخیرہ بھی اب مٹی ہو چکا۔ اُس نے کتابوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

وہ دیوان خانے میں آیا۔ نجیب بستر پر لیٹا سفر کی تکان دور کر رہا تھا۔ رات میں شاہدہ خالہ کی طرف سے کھانا آیا۔ اور دونوں نے خاموشی سے زہر مار کر لیا۔ اس کے بچپن میں اسی مکان میں جب دسترخوان بچھتا تھا تو کبھی دس پندرہ افراد سے کم نہ ہوتے۔ کیسی چہل پہل رہتی تھی۔ اُس کی یادوں نے پل بھر میں ساری حویلی روشن کر دی۔ فانوس جگ مگ کرنے لگے۔ آراستہ صاف ستھرے کمرے جگ مگ کرنے لگے۔ کہیں برتنوں کی کھڑکھڑاہٹیں، کہیں یہ لاؤ، یہاں آؤ، وہاں جاؤ کی صدائیں۔ یہ پلاؤ کی پلیٹ ذرا اٹھانا۔ ہاں میٹھے چاول یہاں رکھ دو۔ کیسی خوش گپیاں رہتی تھیں۔ قہقہے، چہلیں صدائیں، نصیحتیں۔ پھر ایک دم سے اندھیرا ہو گیا۔ در و دیوار پر ویرانی برسنے لگی۔

"کمال ہے کسی نے ہمیں بتایا ہی نہیں کہ گاؤں کی حالت اس قدر بدل گئی ہے۔" نجیب نے کہا۔

"کوئی آتا ہی نہیں اِس طرف" خورشید نے کہا۔

"بھولے بھٹکے کوئی چلا بھی آتا ہو گا تو فوراً واپس چلا جاتا ہو گا۔" نجیب نے کہا۔

خورشید نے کھڑکی میں سے باہر جھانکا۔ لیمپ سارے روشن تھے۔ سنسان گلی میں اجالا کچھ عجیب سا سماں پیدا کر رہا تھا۔ مکانات اب بھی جیسے منتظر تھے۔ ندی کی طرف سے ہوا کے تیز جھونکے آئے مکانوں کی کنڈیاں ہلیں۔ کہیں کوئی کھڑکی کا پٹ ہوا سے ٹکرا ٹکرا کر ناگوار سا شور کرنے لگا۔ تبھی خورشید کے کانوں کو کچھ التباس سا ہوا کہ بہت سارے لوگ گاؤں کی طرف آ رہے ہیں۔ شاید اب سب گٹھریوں میں سونے اور چاندی کے ذخیرے باندھے واپس آ رہے ہوں گے اُس نے سوچا۔ سارے مکانات کے دروازے کھل جائیں گے۔ حویلیاں روشن ہو جائیں گی۔ گلی بچوں کی صداؤں سے چہک اٹھے گی۔ مگر کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ ہواؤں کے جھکڑ بند مکانات سے ٹکرا ٹکرا کر بکھرتے رہے شاہدہ خالہ کی ملازمہ برتن اٹھانے آئی تو خورشید نے اس سے پوچھا۔

"تم لوگوں کے لیے سودا سلف کون لاتا ہے؟"

گوالے دودھ دے جاتے ہیں" اُس نے جواب دیا۔ 'پیر کو گوالا کی طرف بازار لگتا ہے تو ہم لوگ جا کر سامان لے آتے ہیں۔ ابرا ہیم جناب اور مولوی بشیر سب کے گھر کا سودا سلف لکھ لیتے ہیں۔ آپ یہاں کتنے دن رہیں گے۔"

خورشید اور نجیب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اور بے چینی سے پہلو بدلے۔ خورشید مراقبے میں چلا گیا۔

"خالہ نے پوچھا ہے" ملازمہ نے انھیں تردّد میں دیکھ کر کہا: کہنا چاہتی ہو کہ... اِس سوال کا جواب ضروری ہے۔

خورشید مراقبے سے باہر آگیا۔ اُسے لگا کہ کمرے کی دیواریں اُس سے کہہ رہی ہیں کہ کم از کم تم تو ہمیں چھوڑ کر مت جاؤ۔ سب چلے گئے۔ بس تم ہی واپس آئے ہو۔ تمھارے بعد یہاں کون آئے گا۔

"تمھیں جواب ابھی چاہیے؟ اسی وقت؟" نجیب نے اس سے پوچھا۔

"نہیں نہیں، ہم کل صبح چلے جائیں گے،" خورشید جلدی سے بولا کہ کہیں سچ مچ یہ دیواریں اُسے روک نہ لیں۔

سویرے ناشتہ کر کے وہ نکلے تو خاصا اجالا ہو چکا تھا۔ نجیب دروازے کو تالا لگا رہا تھا کہ وہی کل والا تانگہ ٹخ ٹخ کرتا گلی میں داخل ہوا۔

خورشید نے نجیب کو سوالیہ نگاہوں سے تاکا۔

"میں نے تو نہیں کہا تھا" نجیب اُس کی نظروں کو سمجھ کر بولا "شاید شاہدہ خالہ نے کہلوا لیا ہوگا۔"

تانگہ ان کے قریب آکر رک گیا۔ بوڑھے کوچوان کی نگاہوں نے کہا میں جانتا تھا تم لوگ نہیں رک سکوگے۔ وہ دونوں تانگے میں بیٹھے اور اُس کی نظریں اچانک ایک مکان کے کھلے دریچے پر جا کر ٹھہر گئیں۔ اُس کے ذہن میں شاید کوئی دریچہ وا ہوا اور ایک معصوم تیرہ چودہ سال کی لڑکی نے گلی میں جھانکا۔ وہ اُسے ہی دیکھ رہی تھی۔ تیکھے نقوش، معصوم سا گورا گورا چہرہ۔ کیسی معصوم محبت تھی۔ جتنی دیر وہ گلی میں رہتا سورج مکھی کے پھول کی طرح وہ بس اُس کے چہرے کو تکتی رہتی۔ لندن میں، ڈربن میں، بمبئی میں یہ چہرہ اُسے کتنی ہی بار یاد آیا تھا۔ یہ محبت جس میں کوئی غرض نہ تھی، کوئی ملاوٹ نہیں تھی۔ ابھی تو انھیں محبت کے معنی بھی معلوم نہ تھے۔ اُسے بھی بس اتنا احساس تھا کہ یہ لڑکی ہمیشہ اس کی طرف دیکھتی رہتی ہے وہ کبھی جھینپتا کبھی جھنجلاتا مگر جیسے ہی وہ مکان کے باہر قدم رکھتا اُس کی نگاہیں خود بخود اُسے تلاش کرنے لگتیں۔ ابھی وہ اس جذبے کو سمجھ بھی نہ پایا تھا کہ ایک روز گلی میں شہنائیاں بجیں۔ گیس کے ہنڈولوں سے سارا محلہ منور ہو گیا۔ مکان پھولوں کی لڑیوں سے ڈھک گئے۔ سہرے میں ڈھکا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے زینے سے اترا۔ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے ایک آخری وحشت بھری بے چین نظر اُس نے خورشید پر ڈالی اور تھوڑی ہی دیر میں پھولوں سے سجی موٹر اسے لے کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

ایک ادھیڑ عمر عورت کا چہرہ کھڑکی میں نمودار ہوا۔ کیا یہ وہی تھی مگر نہیں وہ اسے پہچان نہیں سکتا۔ اب تو وہ خد و خال بھی ذہن میں دھندلا چکے تھے۔ دو آنکھیں اسے تک رہی تھیں۔ وہ مسکرایا۔ ادھیڑ عمر عورت بھی مسکرائی اور تانگہ ایک ہلکے سے دھچکے سے چل پڑا۔ خورشید کا چہرہ خود بہ خود گھوم گیا۔ بند مکانات، بند دروازے، بند کھڑکیوں کے درمیان نیم وا دریچوں سے کہیں کہیں کچھ بوڑھے چہرے اسے تک رہے تھے۔ ایک ایک شے کو اُس نے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا جیسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے ذہن میں محفوظ کر لینا چاہتا ہو۔ تانگہ مڑا تو اُسے محسوس ہوا جیسے ادھیڑ عمر عورت اُسے دیکھنے کے لیے جھک گئی ہے۔ اس نے یونہی ہاتھ ہلا دیا جواباً لمحہ بھر کے لیے اُسے ایک ہاتھ ہلتا محسوس ہوا یا یہ محض اس کا گمان تھا؟

ایک بار پھر وہ خوبصورت، پختہ، شاندار مکانوں کے درمیان سے گزرے۔ اِس بستی کے مکین کن زمینوں میں کھو گئے؟ عمارتوں کا جھنڈ دور ہوتے ہوتے بالآخر نظر سے اوجھل ہو گیا۔ خورشید نے ایک لمبا سانس لیا اور پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

کوچوان گھوڑے کو بار بار پچکارتا مگر وہ یکساں رفتار سے چلتا رہا۔ ایک موڑ کاٹ کر جیسے ہی وہ پلیا پر آئے ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں کے اثر سے خورشید نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ ندی پر سے گزر رہے تھے۔ یہ ندی، یہ پیڑوں کا جھنڈ، یہ پرندے، یہ موسم، یہ فضا سب کچھ ویسا ہی ہے۔ جیسا ہمیشہ سے تھا۔ خورشید نے سوچا۔ اور جھک کر ندی میں اپنا عکس دیکھنے لگا۔ شاید وہ اِس ندی کو زندگی میں آخری بار دیکھ رہا تھا۔

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور کئی پتے شاخوں سے جدا ہو کر فضا میں ڈولنے لگے۔ ایک پتہ لہراتا ڈولتا خورشید کی گود میں آگرا۔ اس نے عقیدت سے پتے کو ہاتھ میں لیا اور اُس کی چکنی شفاف سطح پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ نجیب ساتھ نہ ہوتا تو شاید وہ اِس پتے کو آنکھوں سے لگا لیتا۔ اس نے اپنے سفری بیگ کی زپ کھولی، نجیب کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ وہ اونگھ رہا تھا۔ اس نے پتے کو قمیضوں کے درمیان رکھ کر سفری بیگ بند کر دیا۔

چند منٹوں بعد ندی بھی پیچھے رہ گئی۔ خورشید نے مڑ کر دیکھا اسے ایک درخت کے نیچے چند بچے کھیلتے نظر آئے۔ ایک لمحے کے لیے

(بقیہ صفحہ ۱۱۲ پر)

غزل

شہاب جعفری

بے سروساماں کچھ اپنی طبع سے ہیں گھر میں ہم
شہر کہتے ہیں جسے، ہیں اُس کے پس منظر میں ہم

شام ڈوبی، پڑ رہے سورج کے در پر شب کی شب
صبح بکھری، چل پڑے خود کو لیے ٹھوکر میں ہم

آگہی تو نے ہمیں کن وسعتوں میں گُم کیا
بے نشاں ہر مُلک میں، بے آسرا ہر گھر میں ہم

اپنے ہی صحرا میں کھو جائیں گے۔ اندازہ نہ تھا
بازگشت اپنی، لیے پھرتے ہیں اپنے سر میں ہم

ساتویں در تک پکار آئی خودی کو بیخودی
اور ہر در سے جواب آیا — نہیں ہیں گھر میں ہم

تیری دستک تھی کہ سنّاٹا وہی ہر شام کا؟
رہروِ کوہِ ندا ہیں، گھر کے بام و در میں ہم

چار سو صحرا میں ہے وردِ انا الصحرا کی گونج
کاٹ کر اپنی زباں رکھ آئے تھے پتّھر میں ہم

چھان یہ صحرا، گھٹی ہیں اس کی چو حد میں صدائیں
کاٹ یہ پربت، دبے ہیں اس کی خاکستر میں ہم

اب ہمیں بھاتا نہیں پیہم صداؤں کا نزول
اب تو خود گونجے ہوئے ہیں گنبدِ بے در میں ہم

کیا مکاں تاکا ہے دل نے رات اور دن سے پرے
بے زباں ہوتے چلے ہیں قیدِ بام و در میں ہم

جانے اِس رہرو کی نظریں کون سی منزل پہ ہوں
ایک کانٹا سا کھٹکتے ہیں دلِ رہبر میں ہم

زہر کا پیالہ ہو پینا یا اُٹھانی ہو صلیب
صدیوں بعد آئیں، مگر ہوتے ہیں اس منظر میں ہم

دشت در دشت آسماں بر دوش چلتے ہیں شہاب
ہم سے بنجارے، جنم اپنا لیے ٹھوکر میں ہم

"... نواب قدسیہ کو جو عروج حاصل ہوا وہ مغل حکومت میں کسی رقاصہ کو حاصل نہیں ہوا۔ نواب قدسیہ اور ان کے مشیر نواب بہادر جاوید خاں نے ..."

دِلّی کے آثارِ قدیمہ

خلیق انجم

نواب قدسیہ اور جاوید خاں کی تعمیرات

پہلی قسط (ایوانِ اُردو، مئی ۱۹۸۷ء) میں ہم نے نواب قدسیہ اور جاوید خاں کی بنائی ہوئی سنہری مسجد کی تفصیلات بیان کی تھیں۔ مزید عمارتوں کا ذکر کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ان دونوں کا سوانحی خاکہ پیش کر دیا جائے۔

اورنگ زیب کی زندگی میں ہی مغل حکومت کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ اور جب نادر شاہ ہندوستان کے شاہی خزانے امراؤ روسا کی دولت، حکمرانوں کی بہادری، دلیری، معاملہ فہمی، فوج کی طاقت، ہمت اور حوصلوں کو اُونٹوں پر لاد کر ایران لے گیا تھا تو مغل حکومت کے زوال کی رفتار بہت تیز ہو گئی۔ بادشاہ عیش و عشرت میں ڈوب کر ذہنی فرار کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس زوال کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ مغل حکومت میں بعض معمولی عورتوں کو عروج حاصل ہوا۔ اس سلسلے میں دو عورتوں کے نام خاص طور سے لیے جاتے ہیں۔ ایک لال کنور جو رقاصہ تھی اور جسے جہاندار شاہ کی بیوی بننے کا اعزاز حاصل ہوا اور دوسری نواب قدسیہ جو محمد شاہ کی بیوی اور احمد شاہ کی ماں تھی۔

نواب قدسیہ کا اصل نام ادہم بائی بتایا جاتا ہے۔ یہ رقاصہ تھی۔ نواب عمادالملک امیر خاں کی صاحبزادی خدیجہ خانم کے ذریعے ادہم بائی کی محمد شاہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ ادہم بائی نے اپنے حُسن اور فن سے محمد شاہ کو اپنا گرویدہ کر لیا۔ نام سے یہ خاتون غیر مسلم معلوم ہوتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ مسلمان تھی کیوں کہ اس کے سگے بھائی کا نام مان خاں تھا۔ اقتدار اور دولت کی ہوس میں اس نے کچھ ایسی حرکتیں کیں، جو محمد شاہ کو ناگوار گزریں اور ادہم بائی معتوب ہو گئی اور محمد شاہ کی وفات تک معتوب رہی۔

محمد شاہ کے ملازمین میں ایک خواجہ سرا تھے جاوید خاں۔ یہ شاہی حرم کے نگراں تھے۔ محمد شاہ کی زندگی ہی میں قلعے میں اقتدار حاصل کرنے کے لیے ان دونوں میں گٹھ جوڑ ہو گیا۔ ان کے تعلقات پر بعض مورخین نے شک کا اظہار کیا ہے، میرا خیال ہے کہ یہ شک بے بُنیاد ہے کیوں کہ جاوید خاں خواجہ سرا تھے۔

۱۷۴۸ء میں جب محمد شاہ کا انتقال ہو گیا اور احمد شاہ تخت نشین ہوئے تو ادہم بائی اور جاوید خاں کی قسمت جاگ گئی۔ احمد شاہ ادہم بائی کے بطن سے تھے۔ اس لیے ادہم بائی کو سیاسی اقتدار حاصل کرنے میں دِقت نہیں ہوئی۔ ادہم بائی کو حکومت کے معاملات کا شعور نہیں تھا، لیکن اُن کا آئیڈیل نور جہاں تھی۔ نور جہاں بننے کے شوق میں انھوں نے حکومت کے

معاملات میں دخل حاصل کرلیا۔ اس سلسلے میں اُن کے صلاح کار جاوید خاں تھے۔ حکومت کے اعلیٰ افسران حرم کی ڈیوڑھی میں آکر بیٹھتے۔ ادھم بائی معاملات سُن کر فیصلے صادر کرتیں۔

احمد شاہ نے اپنی والدہ ادھم بائی کو بائی جیو صاحبہ نواب قدسیہ صاحب الزمانی صاحب جیو صاحبہ حضرت قبلہ عالم کے خطابات سے نوازا اور پنج ہزاری منصب عطا کیا[1]۔ جاوید خاں کو نواب بہادر کا خطاب دیا گیا تھا۔ نواب قدسیہ کا بھائی مان خاں رقاص تھا۔ اُسے شش ہزاری منصب پر فائز کیا گیا اور معتمد الدولہ بہادر کے خطاب سے نوازا گیا۔

نواب قدسیہ کو جو عروج حاصل ہوا وہ مغل حکومت میں کسی رقاصہ کو حاصل نہیں ہوا تھا۔ نواب قدسیہ اور اُن کے مشیر نواب بہادر جاوید خاں نے ناجائز طریقوں سے کروڑوں روپے کمائے۔

اس سلسلے میں ایک عبرت ناک واقعہ سُنیے۔ محمد شاہ کے زمانے میں نادر شاہ نے شاہی خزانہ خالی کر دیا تھا۔ احمد شاہ کے زمانے میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ شاہی پہرہ داروں اور سپاہیوں کو مہینوں تنخواہ نہیں ملی۔ انھوں نے بغاوت کر دی۔ تنخواہوں کی ادائیگی کے لیے قلعے کے سونے چاندی کے برتن فروخت کیے گئے، پھر بھی دو لاکھ روپے سے زیادہ نہیں ملے۔ جب کہ انھی دنوں میں نواب قدسیہ کی سالگرہ منائی گئی، جس پر بقول ہرچرن داس دو کروڑ روپیہ خرچ کیا گیا۔ یہ رقم مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کا پورا امکان ہے کہ اس موقعے پر غیر معمولی روپیہ خرچ کیا گیا ہو۔

مغل حکومت کے قوانین کے مطابق کوئی خواجہ سرا رات کو حرم میں نہیں رہ سکتا تھا، لیکن نواب بہادر جاوید خاں کو اتنا عروج حاصل ہوا کہ وہ رات کو بھی حرم میں رہنے لگے۔ یہ وہی جاوید خاں تھے، میر تقی میر نے جن کی کچھ دن ملازمت کی تھی۔ میر نے ذکر میر میں جاوید خاں کے بارے میں لکھا ہے کہ "میں نے نواب بہادر (جاوید خاں) کے ہاں ملازمت کی کوشش کی اور مجھے ملازمت مل گئی۔ جاوید خاں کے بخشی فوج اسد یار خاں نے میرا حال اُن کو بتایا اور گھوڑا اور نوکری معاف کرادی۔ جاوید خاں میرا بہت لحاظ کرتے تھے اور مجھے اپنے پہلو میں بٹھاتے تھے۔"

جاوید خاں کو اتنا عروج حاصل ہوا کہ نواب صفدر جنگ جیسا مدبر اور بہادر انسان بھی چھوٹی چھوٹی سازشوں اور وعدہ خلافیوں پر مجبور ہوگیا۔ مورخین کا خیال ہے کہ اگر نواب قدسیہ اور جاوید خاں کو حکومت میں اتنا دخل نہ ہو اور نواب صفدر جنگ کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا پور موقع مل جاتا تو مغل حکومت کی تاریخ آج بالکل مختلف ہو کم سے کم زوال کی رفتار تو سُست پڑ جاتی۔

صفدر جنگ جب بالکل مجبور اور بے بس ہوگئے ت انھوں نے جاوید خاں کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ ۲۷، اگسـ ۱۷۵۲ء کو سورج مل جاٹ سے گفتگو کے بہانے صفدر جنگ نے جاوید خاں کو اپنے گھر بلایا اور قتل کرا دیا۔ نواب قدسیہ نے احمد شاہ کو صفدر جنگ کے خلاف بھڑکایا اور پھر امر میں بھی ایسے لوگوں کی تعداد خاصی تھی، جو جاوید خاں کے جاں نثار تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ احمد شاہ نے صفدر جنگ کو برطرف کرکے عماد الملک نواب غازی الدین خاں کو وزیر بنا کر دیا۔ عماد الملک نے ۲، جون ۱۷۵۴ء کو معز الدین جہا دار شاہ کے بیٹے ابوالعادل عزیز الدین محمد عالم گیر ثانی تخت پر بٹھا دیا۔ عالم گیر ثانی نے تخت نشیں ہوتے ہی ا شاہ اور ان کی ماں نواب قدسیہ کی گرفتاری کا حکم دے د یہ دونوں خاص محل کے ایک باغ میں درختوں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔ دونوں کو گرفتار کرکے قید خانے میں ڈال دیا گ اور عالم گیر ثانی کے حکم سے آنکھوں میں سلائیاں پھیر کر دونو کو اندھا کر دیا گیا۔ اواخر جمادی الثانیہ ۱۱۶۷ھ کو دونو کو گرفتار کیا گیا اور ۱۰، شعبان ۱۱۶۷ھ کو دونوں کو اند

---

(۱) قدسیہ بیگم اور جاوید خاں کے حالات جادو ناتھ سرکار نے چہار گلزار شجاعی (مصنفہ ہرچرن داس، مخطوطہ پٹنہ) کے حوالے سے لکھے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

FALL OF THE MUGHAL EMPIRE, SARKAR, V.I, NEW DELHI, 1971

کر دیا گیا۔ ۲، شعبان ۱۱۸۸ھ کو احمد شاہ کا انتقال ہوگیا۔

یہ نہ معلوم ہوسکا کہ نواب قدسیہ کا کب انتقال ہوا اور انھیں کہاں مدفون کیا گیا۔ ان کے بارے میں بشیرالدین احمد نے لکھا ہے کہ وہ شاعرہ بھی تھیں اور رعنائی تخلّص کرتی تھیں۔ اُن کا ایک شعر ہے ؎

ہم جانتے تھے آنکھ لگی، دل کو سُکھ ہوا
کم بخت کیسی آنکھ لگی، اور دُکھ ہوا

رعنائی کا ذکر کسی تذکرے میں میری نظر سے نہیں گزرا۔

دہلی کا مشہور قدسیہ باغ انھی نواب قدسیہ سے منسوب ہے۔ جس زمین پر قدسیہ باغ بنایا گیا وہ بادشاہ کی ملکیت تھی۔ بعض مورخین کا کہنا ہے کہ یہاں پہلے ہی سے ایک باغ تھا۔ نواب قدسیہ نے اس باغ میں کچھ پرانے درخت گرا کر بڑی تعداد میں نئے درخت لگائے۔ اور باغ میں ایک انتہائی خوبصورت محل تعمیر کیا۔ مجھے کوئی ایسی تاریخی شہادت نہیں ملی، جس کی بنیاد پر اس محل کی تعمیر کا سنہ متعین کیا جا سکتا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ محل اُس وقت تعمیر ہوا ہوگا، جب محمد شاہ کی وفات کے بعد اپنے بیٹے احمد شاہ کے زمانے میں نواب قدسیہ کو عروج حاصل ہوا۔ احمد شاہ ۱۷۴۸ء میں تخت نشیں ہوا اور ۱۷۵۴ء میں تخت سے اتار دیا گیا، اس چھ سات سال کی مدت میں یہ عمارت بنائی گئی ہوگی۔ جادو ناتھ سرکار نے ہرچرن داس (مصنف گلزارِ شجاعی) کے حوالے سے لکھا ہے کہ جاوید خاں نے جمنا کے کنارے اپنے لیے ایک محل بنا رکھا تھا۔ اس محل سے مراد قدسیہ باغ کا محل معلوم ہوتا ہے۔ ۱۸۴۷ء میں سرسید نے آثار الصنادید میں اس عمارت کے بارے میں لکھا ہے کہ "اور اندر اس باغ کے ایک بارہ دری ہے۔ نہایت کلاں اور شہ نشیں اس میں نہایت وسیع اور خوشنما اور دلچسپ اور اس بارہ دری کے پیچھے بھی ایک پائیں باغ ہے۔ ہر چند اس باغ کی آراستگی کی طرف کسی کو کچھ توجہ نہیں لیکن باوجود اس کے بھی ایسا تازہ اور معطّا اور رشکِ فردوس ہے کہ قلم کو طاقت اس کے وصف کی نہیں"۔ مرزا سنگین بیگ نے سیر المنازل میں لکھا ہے کہ "قدسیہ باغ، جسے عوام الناس کرسیہ باغ کہتے ہیں، نواب قدسیہ بیگم کا بنایا ہوا ہے۔ آج کل یہ باغ مرزا محمد ابوظفر ولی عہد بہادر کے قبضے میں ہے"۔ دہلی کے ریذیڈنٹ اور گورنر جنرل کے ایجنٹ سر تھامس مٹکاف نے مصوروں سے دہلی کی کچھ عمارتوں کی تصویریں بنوائی تھیں۔ جو The Golden Calm میں شامل ہیں اُن میں قدسیہ باغ کی بھی ایک رنگین اور انتہائی خوبصورت تصویر ہے، یہ تصویر مشرق جنوب کی طرف سے بنائی گئی ہے۔ تصویر کے نیچے مصور کا نام مظہر علی خاں لکھا ہوا ہے۔ مٹکاف نے اس تصویر کے نیچے یہ بھی لکھا ہے کہ "در تحتِ ولی عہد بہادر" مرزا سنگین بیگ اور مٹکاف کے بیانات سے پتا چلتا ہے کہ قدسیہ باغ ولی عہد کے قبضے میں تو تھا لیکن وہ اس میں رہتے نہیں تھے۔

THE GOLDEN CALM میں شائع شدہ قدسیہ باغ کے محل کی قدیم

قدسیہ باغ کے جنوب مشرق میں ایک مسجد ہے۔ یہ مسجد نواب قدسیہ نے بنوائی تھی۔ اس مسجد کے بارے میں سرسید لکھا ہے کہ "سنگِ سرخ کی نہایت خوش قطع اور وسیع" جب کی حالت خراب ہوگئی تو بہادر شاہ ظفر نے ۳۴-۱۸۳۳ء اس میں ترمیم کی (ترمیم سے مراد غالباً مرمت ہے) اور مسجد شمالی دیوار میں سنگِ مرمر کا ایک کتبہ نصب کیا، جس پر درج شعر کندہ تھا:

ھوالشاق

سالِ ترمیمِ ایں بنائے قدیم
اے ظفر جد و جہدِ اجرِ عظیم

۱۲۴۹ ہجری

قدسیہ باغ کی مسجد

اب یہ کتبہ موجود نہیں ہے۔

۱۸۵۷ء میں جب انگریزوں نے دہلی کا محاصرہ کیا تو برطانوی فوج کے دو توپ خانوں کا قیام قدسیہ باغ میں تھا۔ ہندوستانیوں نے کشمیری دروازے سے قدسیہ باغ پر ایسی زبردست گولہ باری کی کہ عمارت کو بہت سخت نقصان پہنچا۔ پھر برطانوی فوج نے دہلی پر حملہ کرنے کے لیے قدسیہ باغ کے بیشتر درخت گرادیے اس طرح اس شاندار محل کا بڑا حصّہ منہدم ہوگیا۔

قدسیہ باغ اور اس کے محل کا ذکر اکثر مورخین اور ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے کیا ہے، لیکن کارسٹیفن نے اس محل کی جتنی تفصیلات بیان کی ہیں، اتنی میری نظر سے کہیں اور نہیں گزریں۔ سٹیفن نے لکھا ہے کہ محل کا دروازہ پتھر اور چونے کا بنا ہوا ہے۔ ۳۹ فٹ اونچا، ۴۷ فٹ لمبا اور ۵۵ فٹ چوڑا ہے۔ دروازے کی محرابوں کے درمیان ایک آدھی دیوار کھڑی کردی گئی ہے۔

دروازے کے دونوں طرف دیوار میں دو ستون بنے ہوئے ہیں۔ ان ستونوں پر سجاوٹ کے لیے گملے بنائے گئے ہیں، ان گملوں کی بناوٹ بھدی ہے۔ دروازے کے دونوں طرف پتھر اور چونے کی بنی ہوئی کوٹھڑیاں ہیں۔ کسی زمانے میں یہ کوٹھڑیاں باغ کی چار دیواری کا کام کرتی ہوں گی لیکن اب بہت سی کوٹھڑیاں منہدم ہوچکی ہیں۔

بشیرالدین احمد نے ۱۹۱۹ء میں واقعاتِ دارالحکومت جلد دوم میں لکھا ہے کہ "عام طور پر یہ بات زبان زدِ خلایق ہے کہ بیگم صاحب کو یہ باغ بنا بنایا مل گیا تھا جس کو انھوں نے اپنے شوق اور سلیقے سے خوب بنایا سنوارا۔ عالی شان عمارتیں بنواکر کھڑی کردیں۔ متعدد ذرائع آب رسانی بنواتے جن کے بمبوں کے نشانات اب بھی نظر آتے ہیں۔ اب یہ باغ نہیں رہا بلکہ بمقابلہ حالتِ ماسبق کے جنگل کہا جائے تو بجا ہے۔ نہ کوئی بڑی عمارت باقی رہی نہ چمن۔ اب نہ کوئی محل ہے نہ بارہ دری۔ ہاں جا بجا

آب رسانی کے ذرائع کے کھنڈر موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سارے باغ میں یہی حصّہ زیادہ پُر رونق اور آباد تھا اور کچھ تعجب نہیں کہ شاہی محل بھی یہیں رہا ہو۔ باغ کے شمال اور جنوب میں دو دیواریں اور کھڑی ہیں جن میں اسی قسم کی کوٹھڑیاں بنی ہوئی ہیں جیسی کہ صدر دروازے کے ہر دو جانب ہیں اور انھیں دیواروں کے بیچ میں ایک چھوٹی سی بارہ دری باقی رہ گئی ہے۔ ان کوٹھڑیوں کی کرسی پانچ فیٹ بلند ہے اور کوٹھڑیوں کا عرض وطول ۳۰ ف × ۲۰ ف ہے، جن کے سامنے تین محراب دار دروازے ہیں۔ یہ بارہ دری جس کا ہم نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے نہایت خوش نما اور عظیم الشان تھی جس میں بڑے بڑے وسیع او دل چسپ شہ نشین تھے مگر افسوس کہ اب یہ بارہ دری جا بجا سے ڈھ گئی ہے، بیرونی رُخ پر بے شمار برساتیں گزر جانے سے تمام استرکاری پر ہیبت ناک سیاہی دوڑ گئی ہے۔ اینٹو

یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ اصل محل کا دروازہ ہے یا قدسیہ باغ کی کسی اور عمارت کا۔ آج کل اسے ہاتھی خانہ کہا جاتا ہے

اور پتھروں پر اکثر جگہ سبز سیاہی مائل کائی کی تہیں چڑھ گئی اندر کی حالت اس سے بھی بدتر ہے کہ چونا اور استرکاری اینٹو سو چھوڑ چکی ہے، اب صرف گرنے ہی کی کسر باقی رہ گئی ہے۔ اس کی چھتیں گو بڑی خوبصورتی اور خوش نمائی سے نقش و نگار آراستہ کی گئیں تھیں مگر افسوس کہ خوش نمائی اور رونق گو ا

قدسیہ باغ کے محل کا ایک شکستہ ستون

عماراتِ شکستہ کے ملبے کے کے ٹیلے دیکھ لو جن سے سمجھ لو کہ یہاں محل تھا وہاں بارہ دری تھی۔ پچھلی شان و شوکت، عظمت اور آراستگی کی یادگار، مشتے نمونہ از خروارے سب جا جو کے ایک صدر دروازہ اور دو بارہ دریاں۔ تین ٹکڑے دیواروں کے وہ بھی متفرق، چند گری پڑی کوٹھڑیاں زمانے کی برباد اور فنا کن رفتار سے مقابلہ کر رہی ہیں اور اپنا نمونہ دکھلا کر یاد دلا رہی ہیں کہ اسی جنگل میں منگل تھا، یہیں سبزہ لہلہاتا تھا۔ اب باغ میں بڑے بڑے پُرانے درختوں اور چوڑی چوڑی، بجری کی سڑکوں کے سوا کوئی سامان تفریح طبع کا نہیں ہے البتہ ایک دروازہ بجانب مغرب نہایت مستحکم سنگ بست بنا ہوا ہے جو ۳۹ فٹ اُونچا، ۴۷ فٹ لمبا ہیں اور ۵۵ فٹ چکلان میں ہے۔ تاکہ محل کا سامنا نہ ہو ایک پردے کی دیوار دروازے کی محرابوں کے سامنے کھڑی ہوئی ہے۔ دروازے کے اِدھر اُدھر دو دیوار دوز ستون ہیں جن پر گملے بنے ہوئے ہیں۔ دروازے کے دونوں جانب تھوڑی دور تک پختہ کوٹھڑیوں کی ایک قطار رہ گئی ہے وہ بھی جا بجا شکستہ۔ باغ کا مشرقی حصّہ تو اب صفاچٹ میدان ہے لیکن اس میں بھی جا بجا

قدسیہ باغ کا وہ نقشہ، جو سرسید نے آثار الصنادید میں دیا تھا

کے عروج کا زمانہ اپنے ساتھ لے گیا اور بخت سیہ نے اسے اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ اس بارہ دری کے عقب میں ایک نفیس پائیں باغ تھا جو شادابی اور تروتازگی میں بے نظیر تھا مگر برسوں کی کس مپرسی اور تغافل نے باغبانوں کی حیرت انگیز صنعت اور تعجب خیز کاریگری کو خاک میں ملا دیا۔"

(واقعاتِ دارالحکومت دہلی، حصہ دوم، ص: ۴۶۸)

قدسیہ باغ کی مسجد کے بارے میں بشیرالدین احمد نے لکھا ہے: "یہ مسجد نہایت خوش وضع اور شان دار از سرتاپا سنگِ سرخ کی بنی ہوئی تھی۔ تمام صحن میں پختہ فرش تھا۔ در و دیوار پر عمدہ پچیکاری کا کام تھا۔ نہایت عمدہ بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ اس کی تعمیر میں زرِ خطیر صرف ہوا تھا، لیکن افسوس کہ اب وہ بالکل ویران اور غیر آباد پڑی ہے۔ عمارت بالکل بوسیدہ اور خراب وخستہ ہوگئی۔ صحن میں کوڑے کرکٹ کا ڈھیر لگا رہتا ہے۔ خاک تودوں نے فرش کو چھپا رکھا ہے۔ غرض ویرانی اور وحشت کی پوری تصویر ہے۔"

میرا خیال ہے کہ ۱۹۱۹ء (سنہ تصنیف واقعاتِ دارالحکومت) کے بعد محل کے کھنڈرات مخدوش ہوگئے ہوں گے، اس لیے انھیں بالکل منہدم کر دیا گیا۔ اب مغرب کی طرف کا صرف ایک دروازہ (جسے آج کل ہاتھی خانہ کہا جاتا ہے) ایک ستون اور مسجد محفوظ ہیں۔ آج کل قدسیہ باغ کے جنوب میں انٹر سٹیٹ بس اڈہ ہے۔ بس اڈے اور قدسیہ باغ کے درمیان جمنا پار کرنے کے لیے ایک نیا پل بن رہا ہے جو چند مہینوں میں مکمل ہو جائے گا۔

(باقی آئندہ)

●

آئینِ خوش نویسی

لال قلعے کے بادشاہوں کے ہاں یہ آئین تھا کہ ایک استاد خوشنو[یس] کے ہزار پانچ سو کم عمر غلام شاگرد کروائے جاتے تھے اور وہ مشق کر کے تر[قی] خوشنویسی میں کامل ہو جاتے تھے، اور سب کا خط ایسا ملتا جلتا ہوتا [تھا کہ] زید بکر کے لکھے میں کوئی فرق نہ معلوم ہوتا تھا۔ جب حضور والا چاہتے [تھے] سو جزی کتاب کا شیرازہ توڑ کر سو غلاموں کو ایک ایک جز بانٹ دیتے اور فرما[تے] تھے کہ ہر کاتب اپنا اپنا جز دو غروب آفتاب سے پہلے لکھ کر پورا کرے۔ اور اس [طرح] سے سو جزی کتاب ایک دن میں لکھی جاتی تھی۔ پھر ساری کتاب ایک قلم ایک [ہاتھ] کی، ایک کاتب کی لکھی معلوم ہوتی تھی۔ اسی طرح جدول کش، نقاش، مصو[ر] ساتھ ساتھ سینکڑوں ہزاروں ہوتے تھے، اور ایک ہی دن میں وہ بھی [کتاب] کو بنا سنوار کر دلہن بنا دیتے تھے۔

سید ناصر نذیر فراق (لال قلعے کی ایک جھلک)

ماہنامہ ایوان اردو دہلی جون ۱۹۸۷ء

نذرِ جوہر

ظہیر احمد صدیقی

اے مجاہد اے امیرِ کاروانِ حریت
سرزمینِ ہند پر اے آسمانِ حریت

تیرے اربابِ وطن کو آ رہی ہے تیری یاد
ملک میں ہر سو منائی جا رہی ہے تیری یاد

تحفۂ حسنِ ارادت لے کے آیا ہے وطن
نذرِ گل ہائے محبت لے کے آیا ہے وطن

ہر طرف چرچے ہیں تیری عظمتِ کردار کے
تذکرے ہیں تیری قربانی ترے ایثار کے

جاودانی ہے ترے عزم و عمل کی داستاں
ہے تری خدمات کے اظہار سے قاصر زباں

تو نے پیدا کر دیا فکر و نظر میں انقلاب
تو نے دیکھا ہند کی آزادیِ کامل کا خواب

عظمتِ پارینہ کی گرتی عمارت تھامنے
ڈٹ گیا تو سامراجی طاقتوں کے سامنے

سرنگوں تیرے مقابل تھا فرنگی کا غرور
تو وہ شیشہ تھا کیا تھا پتھروں کو جس نے چور

تو نے گاندھی جی کے قومی زاویہ ہائے نظر
کر دیے اسلامیانِ ہند سے نزدیک تر

تو نے فرقِ کیش و مذہب کو فسانہ کر دیا
تو نے ہم کو صف بہ صف، شانہ بشانہ کر دیا

دل سے تھا تحریکِ قومی کا علم بردار تو
تھا ہمارے کارواں کا قافلہ سالار تو

کر کے دہلی میں قیامِ جامعہ کا اہتمام
تو نے اور آگے بڑھایا جنگِ آزادی کا کام

تو نے توڑا دانشِ افرنگ کا رنگیں طلسم
ہند کو بخشے نئے ذہن و نگاہ و روح و جسم

فکر سے تیری صحافت کو نئی سمتیں ملیں
آج تک اس صنف میں تیرا کوئی ہم سر نہیں

برقِ خاطف تھا، اُپی تلوار تھا تیرا قلم
تیرے سوزِ دل سے شعلہ بار تھا تیرا قلم

دے نہ پائے گی صحافت اور خطابت کی کتاب
تیری بذلہ سنجی و حاضر جوابی کا جواب

ہند والوں کی زبوں حالی کا غم بھی تھا تجھے
اور پاسِ عزّ و ناموسِ حرم بھی تھا تجھے

رشک کے قابل یہ شانِ سرفرازی تھی تری
نغمہ ہندی تھا مگر لَے تو حجازی تھی تری

تجھ کو اپنے اس گدازِ دل کی قیمت مل گئی
دفن کی بیت المقدس میں سعادت مل گئی

حق کی راہوں سے قدم تیرا بھٹک سکتا نہ تھا
ٹوٹ تو سکتا تھا تو لیکن لچک سکتا نہ تھا

جن پہ نازاں ہے وطن ان کج کلاہوں میں تھا تو
کاروانِ حریت کے سربراہوں میں تھا تو

ہر طرف اب تک ترے عزم و عمل کے سائے ہیں
ہم کو تیرے نقشِ پا ہی تا بہ منزل لائے ہیں

اے دیارِ ہند کے فردوس مسکن رہنما
حق تو ہم سے کیا ادا ہوگا تری خدمات کا

ہاں مگر دامن میں ہیں یہ چند آنسو چند پھول
اے گرامی قدر، یہ نذرِ عقیدت ہو قبول

قدسیہ باغ کا وہ نقشہ، جو سرسید نے آثار الصنادید میں دیا تھا

عروج کا زمانہ اپنے ساتھ لے گیا اور بخت سیہ نے اسے اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ اس بارہ دری کے عقب میں ایک نفیس باغ تھا جو شادابی اور تروتازگی میں بے نظیر تھا مگر افسوس کی کس مپرسی اور تغافل نے باغبانوں کی حیرت انگیز صنعت اور تعجب خیز کاریگری کو خاک میں ملا دیا۔"

(واقعات دار الحکومت دہلی، حصہ دوم، ص: ۴۶۸)

قدسیہ باغ کی مسجد کے بارے میں بشیر الدین احمد نے لکھا ہے۔"یہ مسجد نہایت خوش وضع اور شان دار از سرتا پا سنگ سرخ کی بنی ہوئی تھی۔ تمام صحن میں پختہ فرش تھا۔ در و دیوار پر عمدہ پیکاری کا کام تھا۔ نہایت عمدہ بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ اس کی تعمیر میں زر خطیر صرف ہوا تھا۔ لیکن افسوس کہ اب وہ بالکل ویران اور غیر آباد پڑی ہے۔ عمارت بالکل بوسیدہ اور خراب و خستہ ہو گئی۔ صحن میں کوڑے کرکٹ کا ڈھیر لگا رہتا ہے۔ خاک تودوں نے فرش کو چھپا رکھا ہے۔ غرض ویرانی اور وحشت کی پوری تصویر ہے۔"

میرا خیال ہے کہ ۱۹۱۹ء (سنہ تصنیف واقعات دار الحکومت) کے بعد محل کے کھنڈرات مخدوش ہو گئے ہوں گے، اس لیے انھیں بالکل منہدم کر دیا گیا۔ اب مغرب کی طرف کا صرف ایک دروازہ (جسے آج کل ہاتھی خانہ کہا جاتا ہے) ایک ستون اور مسجد محفوظ ہیں۔ آج کل قدسیہ باغ کے جنوب میں انٹر سٹیٹ بس اڈہ ہے۔ بس اڈے اور قدسیہ باغ کے درمیان جمنا پار کرنے کے لیے ایک نیا پل بن رہا ہے جو چند مہینوں میں مکمل ہو جائے گا۔

(باقی آئندہ)

●●

آئینِ خوش نویسی

لال قلعے کے بادشاہوں کے ہاں یہ آئین تھا کہ ایک استاد خوش نویس کے ہزار پانچ سو کم عمر غلام شاگرد کروائے جاتے تھے اور وہ مشق کر کے تو کرتے خوشنویسی میں کامل ہو جاتے تھے۔ اور سب کا خط ایسا ملتا جلتا ہوتا تھا کہ زید بکر کے لکھے میں کوئی فرق نہ معلوم ہوتا تھا۔ جب حضور والا چاہتے تھے، سو جزکی کتاب کا شیرازہ توڑ کر سو غلاموں کو ایک ایک جز بانٹ دیتے اور فرما دیتے تھے کہ ہر کاتب اپنا اپنا جزو غروب آفتاب سے پہلے لکھ کر پورا کرلے۔ اور اس تدبیر سے سو جزکی کتاب ایک دن میں لکھی جاتی تھی۔ پھر ساری کتاب ایک قلم ایک سیاہی کی، ایک کاتب کی لکھی معلوم ہوتی تھی۔ اسی طرح جدول کش، نقاش، مصور بھی ساتھ ساتھ سینکڑوں ہزاروں ہوتے تھے۔ اور ایک ہی دن میں وہ بھی کتاب کو بنا سنوار کر دلہن بنا دیتے تھے۔

سیّد ناصر نذیر فراق (لال قلعے کی ایک جھلک)

نذرِ جوہر

ظہیر احمد صدیقی

اے مجاہد اے امیرِ کاروانِ حریت
سرزمینِ ہند پر اے آسمانِ حریت

تیرے اربابِ وطن کو آرہی ہے تیری یاد
ملک میں ہر سو منائی جارہی ہے تیری یاد

تحفۂ حسنِ ارادت لے کے آیا ہے وطن
نذرِ گل ہائے محبت لے کے آیا ہے وطن

ہر طرف چرچے ہیں تیری عظمتِ کردار کے
تذکرے ہیں تیری قربانی ترے ایثار کے

جاودانی ہے ترے عزم و عمل کی داستاں
ہے تری خدمات کے اظہار سے قاصر زباں

تو نے پیدا کردیا فکر و نظر میں انقلاب
تو نے دیکھا ہند کی آزادیِ کامل کا خواب

عظمتِ پارینہ کی گرتی عمارت تھامنے
ڈٹ گیا تو سامراجی طاقتوں کے سامنے

سرنگوں تیرے مقابل تھا فرنگی کا غرور
تو وہ شیشہ تھا کیا تھا پتھروں کو جس نے چور

تو نے گاندھی جی کے قومی زاویہ ہائے نظر
کردیے اسلامیانِ ہند سے نزدیک تر

تو نے فرقِ کیش و مذہب کو فسانہ کردیا
تو نے ہم کو صف بہ صف، شانہ بشانہ کردیا

دل سے تھا تحریکِ قومی کا علم بردار تو
تھا ہمارے کارواں کا قافلہ سالار تو

کرکے دہلی میں قیامِ جامعہ کا اہتمام
تو نے اور آگے بڑھایا جنگِ آزادی کا کام

تو نے توڑا دانشِ افرنگ کا رنگیں طلسم
ہند کو بخشے نئے ذہن و نگاہ و روح و جسم

فکر سے تیری صحافت کو نئی سمتیں ملیں
آج تک اس صنف میں تیرا کوئی ہمسر نہیں

برقِ خاطف تھا، اُپی تلوار تھا تیرا قلم
تیرے سوزِ دل سے شعلہ بار تھا تیرا قلم

دے نہ پائے گی صحافت اور خطابت کی کتاب
تیری بذلہ سنجی و حاضر جوابی کا جواب

ہند والوں کی زبوں حالی کا غم بھی تھا تجھے
اور پاسِ عزّ و ناموسِ حرم بھی تھا تجھے

رشک کے قابل یہ شانِ سرفرازی تھی تری
نغمہ ہندی تھا مگر لَے تو حجازی تھی تری

تجھ کو اپنے اس گدازِ دل کی قیمت مل گئی
دفن کی بیت المقدس میں سعادت مل گئی

حق کی راہوں سے قدم تیرا بھٹک سکتا نہ تھا
ٹوٹ تو سکتا تھا تو لیکن لچک سکتا نہ تھا

جن پہ نازاں ہے وطن ان کج کلاہوں میں تھا تو
کاروانِ حریت کے سربراہوں میں تھا تو

ہر طرف اب تک ترے عزم و عمل کے سائے ہیں
ہم کو تیرے نقشِ پا ہی تا بہ منزل لائے ہیں

اے دیارِ ہند کے فردوس مسکن رہنما
حق تو ہم سے کیا ادا ہوگا تری خدمات کا

ہاں مگر دامن میں ہیں یہ چند آنسو چند پھول
اے گرامی قدر، یہ نذرِ عقیدت ہو قبول

"... سُنتی ہو، دُور دیس سے سوداگر آئے ہیں۔ اُن کے دیس میں بچّوں کا کال پڑ گیا ہے وہ بڑی اچھی قیمت پر بچّے خرید رہے ہیں... کیوں نہ ڈبّو کو..."

[illegible]اب

شفق

دیوگیری یہاں سے صرف پندرہ کوس دُور ہے۔

اُس نے خیمے سے نکل کر اعلان کیا ہمیں وہاں پہنچنے کی تیاریاں کرنی ہیں، دیوگیری بہت خوبصورت شہر ہے، شیشے کی سڑکیں، سنگِ مرمر کی عمارتیں، دُودھ کی نہریں، سڑکوں کے کنارے چاندی کے درخت سونے کی پتّیاں اور ہیرے کے پھل اور جہاں کی ندیوں کے کنارے سنگ ریزوں کی جگہ یاقوت، لعل، پکھراج اور زمرد پڑے ہوئے ہیں، جہاں کسی کو جسمانی محنت کی ضرورت نہیں ہوگی، وہاں سارا کام مشینیں کرتی ہیں، شیو بنانے سے لے کر دُودھ پلانے تک کا کام، جہاں مرد اور عورتیں ہمیشہ جوان اور تندرست رہیں گی، اس لیے تیاریاں کیجیے، مشینوں پر توجہ دیجیے کہ وہاں وہی زندگی کا سہارا ہوں گی۔

اس اعلان کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا، وہ کتنے دنوں سے در در بھٹک رہے تھے۔ جو راہبر بنا اس نے منزل پر پہنچانے کا صرف وعدہ کیا اور اُس نے جو راہ اختیار کی وہ مشکلات سے بھری ہوئی پیچیدہ تھی اور پھر وہ بیچ راستے میں چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلا گیا مگر اب..... نہ صرف منزل کی نشان دہی ہوگئی بلکہ یہ بھی معلوم ہوگیا کہ وہ صرف پندرہ کوس دُور ہے، یہ پندرہ کوس پلک جھپکتے گزر جائیں گے اس لیے ہمیں تیاری کرنی چاہیے۔

اِس طویل سفر میں زمینیں، کھیت، باغات نہ جانے کتنا پیچھے چھوٹ گئے اور اُن سے حاصل شدہ رقمیں زادِ راہ کے طور پر صرف ہوچکی تھیں، ویسے بھی سفر میں فاضل سامانوں سے بوجھ بڑھتا ہے اس لیے کچھ تو ضرورتاً اور کچھ بھاری بوجھ کی وجہ سے راستے میں چھوڑ دیے گئے، جو باقی بچا تھا اُسے راہزنوں نے لوٹ لیا تھا۔

وہ خوشی خوشی اپنے خیموں میں آئے، عورتوں کو خوشخبریاں سنائیں، بچّوں کو پیار کیا اور انھیں دیوگیری کے سبز باغ دکھائے تو بچّوں کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

ہم تو سب پھل توڑ لیں گے، ہیرے کے چمکتے ہوئے پھل کتنا مزہ آئے گا انھیں کھانے میں۔

اور سب اکیلے ہی کھا جاؤ گے، ماں نے ڈانٹا، بھائی بہنوں کو نہیں دوگے؟

میں تو سونے کی پتّیاں جمع کروں گی، چھوٹی بیٹی نے کہا۔

اور میں ندی کنارے کے سارے گھونگھے اور سیپیاں چن کر ان کا زیور بناؤں گی، جوان بیٹی نے کہا تو والدین کی نظریں اُس کی بغیر چوڑی کی کلائیوں سے چڑھتی ہوئی سینے کی گولائیوں تک پہنچیں پھر انھوں نے گھبرا کر سر جھکا لیا۔

میں کہہ رہی تھی زمین کی فروخت سے جو پیسہ ملا ہے اُس سے بیٹی کی شادی کے لیے زیور بنوا دو مگر تم نے سُنا ہی نہیں؟

میں بھی کیا کروں کہ جیسے جیسے سفر طے ہو رہا ہے پھل دار درخت اُونچے ہوتے جا رہے ہیں، جوتے کی ایڑیاں اُونچی کراتے کراتے سب کچھ ختم ہوگیا اور اب کتنا اُچھلنا اور ہاتھ پاؤں مارنا پڑتا ہے تب

ری پھل ہاتھ لگتا ہے سوچتا ہوں آئندہ کیا ہوگا مگر...... وہ
مڑی بھر کے لیے رکا ایک نظر جوان بیٹی پر ڈالی پھر سرگوشی میں
بیوی سے کہنے لگا۔

وہاں ہم تم پھر سے جوان ہو جائیں گے۔

چلو ہٹو...... وہ ذرا سی گلابی ہوئی، میں جوان ہو کر کیا
کروں گی، تم پھر بچے جنوانے لگو گے۔

ارے پگلی سوچ تو کتنا ہی بچہ پیدا ہو تمہارا جسم جیوں کا
تیوں رہے گا دودھ تک مشینیں پلائیں گی ہر کام مشینوں سے ہوگا
ہمارا کام تو صرف...... وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

میں تو خوب بڑا گھر لوں گی، آٹھ دس کمروں والا خوب
ہوادار جس کے دروازوں پر پشمین پردے جھول رہے ہوں گے
اور کھڑکیوں سے ندی کا جھلمل کرتا ہوا پانی نظر آتا ہوگا دیکھو وہاں
بھی پیچھے نہ رہ جانا۔

نہیں نہیں، میں سب سے پہلے دیوگیری میں گھسنے کی
کوشش کروں گا مگر پھر اسے کچھ یاد آگیا، اس نے مشینوں پر
توجہ دینے کو کہا ہے، مشینیں عزت کا معیار ہوں گی مگر
مشینیں کیسے خریدی جائیں؟ اس کی نظریں خیمے کی ایک ایک
چیز کا جائزہ لیتی ہوئی اپنے چھوٹے بیٹے پر رک گئیں۔

وہ لکڑیاں چولہے میں جھونک کر کھانا پکاتی ہوئی بیوی کے
پاس گیا، محتاط نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا پھر بیوی سے کہنے لگا
سنتی ہو، دُور دیس سے سوداگر آتے ہیں، ان کے دیس میں بچوں کا
کال پڑ گیا ہے، وہ بڑی اچھی قیمت پر بچے خرید رہے ہیں، ان کے
دیس کے سیٹھ، ساہوکار انھیں گود لے لیتے ہیں پھر وہ بچے شہزادوں
کی سی زندگی گزارتے ہیں کیوں نہ ڈبو کو......

پھونک مارتی ہوئی بیوی سانپ کی طرح پلٹ پڑی، تمھیں
شرم نہیں آتی ایسی بات سوچتے ہوئے؟

اس میں شرم کی کیا بات ہے، جب ہم جوان ہو جائیں گے تو
ہر سال بچے پیدا ہوں گے تم اپنا شوق پورا کر لینا، ابھی یہ ڈبو کے
لیے بھی اچھا ہے اور ہمارے لیے بھی کہ مشینیں......

جو تمہارا جی چاہے کرو، نہ جانے دھواں لگنے کی وجہ سے اس
کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا یا کوئی اور بات تھی، مگر اس نے
رُخ نہیں بدلا اور مرد ڈبو کو کھلونے دلانے کا بہانہ کر کے باہر
لے گیا۔

وہ واپس آیا تو اس کے جوتے کی ایڑیاں کافی اونچی ہو رہی
تھیں، عورت کی آنکھیں لال ہو گئی تھیں، بھائی بہنوں نے ڈبو کے
بارے میں پوچھا تھا پھر وہ کھانے کی چیزیں دیکھ کر سب بھول
گئے، ارے امرود، شریفے، آم کتنے دن ہو گئے کھائے ہوئے مزہ تک
یاد نہیں۔

رات ہوئی تو ایک اور مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ جوتا کہاں
چھپایا جائے؟

وہ مُنہ ڈھانپے ننگی تلواریں لیے آتے ہیں اور نظروں کے سامنے
سے جوتے اُٹھا لے جاتے ہیں، کوئی مزاحمت نہیں کرتا، کر ہی نہیں
سکتا کہ وہ تلوار کی زبان سے بات کرتے ہیں۔

کیوں نہ بڑی بیٹی کے پاس چھپا دیا جائے، مرد نے کہا،
کسی کو خیال بھی نہ ہوگا کہ......

کیا بکتے ہو، عورت نے جھڑکا، اگر انھیں شک ہو گیا تو غیر
مرد کا ہاتھ لگے گا۔ جوتا بھی جائے گا اور عزت بھی۔

مرد دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر اس نے چٹکی بجائی، آگئی ترکیب
زمین کھود کر جوتا اس میں چھپا دیں کوئی پوچھے گا تو کہہ دیں گے ڈبو
کی قبر ہے۔ صرف ایک رات کی تو بات ہے کل قافلہ اگلے پڑاؤ کی طرف
روانہ ہو جائے گا۔

صبح قافلہ روانہ ہوا، کچی سڑک بھی ختم ہو گئی تھی اب کانٹے
دار جھاڑیوں کے درمیان راستہ بنا کر چلنا تھا، کپڑے اُلجھ کر پھٹ
رہے تھے، کانٹے بدن میں چبھ رہے تھے، وہ شانوں پر بھاری بو
لیے کانٹوں سے اُلجھتے ہوئے لڑکھڑاتے گرتے سنبھلتے آگے بڑھتے ر
جنگلی جانوروں کا خطرہ بڑھ گیا تھا، وہ کسی جھاڑی کی اوٹ سے
اچانک حملہ کرتے اور کسی کو دبوچ کر پھر جھاڑیوں میں چھپ جا
زہریلے سانپ تھے جو پیروں میں زنجیر کی طرح لپٹ جاتے ا
گوشت سڑنے لگتا مگر کسی کو پلٹ کر دیکھنے کی ہمت نہ تھی نہ
طاقت کہ وہ گرنے والوں کو اُٹھاتا۔ قافلے سے بچھڑ جانے کا خوف
دیوگیری میں پہلے پہنچنے کی ہوس انھیں آگے بڑھنے پر مج
کر رہی تھی۔

سروں پر آگ برساتا ہوا سورج قہقہہ لگا رہا تھا، پیاس سے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے اور پانی اگلے پڑاؤ پر تھا، جہاں پھل دار درخت اور اونچے تھے، جوتے کی ایڑیاں اور اونچی کروانی تھیں، دو چار منزلوں میں ہی باقی بچے بھی سوداگروں کے پاس راج کرنے چلے گئے تھے مگر مشینیں نہ خریدی جاسکیں اور اب تو صرف ایک جوان بیٹی رہ گئی تھی۔

میں جوان بیٹی کو ہرگز نہیں بیچوں گی ـــ عورت نے فیصلہ سُنا دیا۔

بیچنے کو کون کہتا ہے ـــ مرد چڑ گیا، میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ زمانہ بدل گیا ہے اب سب مل کر محنت کریں کہ یہ کٹھن وقت گذر جائے پھر دیوگیری پہنچ کر آرام ہی کرنا ہے سارا کام مشینیں کریں گی، مسٹر زیڈ کہہ رہے تھے تم سونا کو میرے پاس بھیج دو تو میں ..... منزل قریب آتی جا رہی ہے اور ہم ایک مشین بھی نہ خرید سکے۔

دن کو یا رات کو .....؟ عورت نے بجھے ہوئے دل سے پوچھا۔

عجیب احمق ہو دن رات سے کیا فرق پڑتا ہے وہاں عزت کا معیار مشینیں ہوں گی اور پھر سونا کو اپنے طور پر جینے کا سلیقہ آجائے گا۔

اور جب وہ مشینیں خرید رہے تھے ایک ـــ نیا فتنہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

قشقے والوں نے کہا، چوں کہ راہبر نے اکھنڈ شبد کا پریوگ کیا ہے اس لیے صرف ہم دیوگیری میں داخل ہوں گے اور جو ہمارے ساتھ جانا چاہتا ہے وہ قشقہ کھینچ لے۔

یہ قافلہ نہ جانے کب سے محوِ سفر ہے کبھی ایسی بات سوچی بھی نہیں گئی کہ پھر قافلے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا تو اب، احتجاج ہوا۔

ٹھیک ہے پھر راہبر سے کہو ہمیں الگ کر دے، پگڑی والوں نے کہا۔

ہم بھی یہی چاہتے ہیں، چپٹی ناکوں والوں نے کہا۔
اور یہ تو ہماری دلی آرزو ہے، برف پوشوں نے کہا۔
ہم بھی یہی چاہتے ہیں، سرحدی لوگوں نے کہا۔

اور داڑھی والے بھی راہبر کی مسلسل دل آزاریوں سے تنگ آچکے تھے۔

وہ ٹولیوں میں بٹ گئے، تلواریں، بلم، گنڈاسے بھالے نکل آئے، لاشیں گریں، خیمے جلائے گئے اور خوف و ہراس نے پورے قافلے کو نرغے میں لے لیا۔

مگر کوئی تصفیہ نہیں ہوسکا کہ بہت دنوں کے ساتھ نے ان کی جڑیں ایک دوسرے سے ملادی تھیں وہ لڑتے جھگڑتے ساتھ چلنے پر مجبور تھے اور ایک رات جب وہ خیمہ زن ہوتے تو راہبر نے اعلان کیا۔ صبح ہم دیوگیری میں داخل ہوں گے۔

کچھ دیر تک انھیں اپنے کانوں پر یقین ہی نہ آیا۔ ہم پہنچ گئے، وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے، ہم پہنچ گئے، وہ اپنی عورتوں کو گود میں اُٹھا کر ناچ رہے تھے، ہم پہنچ گئے، وہ اپنی لٹی پٹی جوان بیٹیوں سے کہہ رہے تھے۔ ہم پہنچ گئے ہم پہنچ گئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

جذبہ صادق ہو تو منزل مل کر رہتی ہے، جذبات سرد ہوئے تو انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، اس سفر میں کیا کیا نہ چھوٹ گیا۔ روح پر کتنے زخم لگے، کتنی عزیز چیزیں قربان کرنی پڑیں، جوتوں کی ایڑیوں کے لیے کیا کیا جتن نہ کرنے پڑے، آخر ہم پہنچ گئے ـــ ساری کٹھنائیوں کا انت ہوا۔

ساری رات آنکھوں میں کٹ گئی اور جب وہ صبح دیوگیری میں داخل ہو رہے تھے تو ان کے بدن پر صرف لنگوٹی باقی بچی تھی اور کاندھوں پر ٹیلی ویژن، وی سی آر اور ویڈیو کا بھاری بوجھ تھا۔

اور حدِ نظر تک ریگستان پھیلا ہوا تھا۔

●●

(بقیہ صفحہ ۱۷ سے آگے)

اُسے محسوس ہوا جیسے اب بھی وہ اس درخت کے نیچے کھیل رہا ہے۔ اور وقت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تھم گیا ہے۔ پھر وہ درخت بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اچانک گھوڑے نے پھر ہری کالی اور تیزی سے دوڑنے لگا جیسے جلد از جلد اسٹیشن پہنچ جانا چاہتا ہو۔

●●

غزلیں

مصوّر سبزواری

کس خواب کی کو یہ صبح تک تھی
جگنو سی کرن پلک پلک تھی
ہے دُور تو جاں میں گھُل گیا ہے
تھا پاس تو بُعد کی جھلک تھی
پانی تھا سراب سے زیادہ
وشبو تھی کہ پیاس کی مہک تھی
اتوں میں ملالِ ہجر کا رنگ
انکھوں میں دروغ گو چمک تھی
ستی میں نہ کوئی شخص جاگا
ک چیخ زمیں سے تا فلک تھی
ٹھہرے ہیں گزرتے موسموں کے
م میں بھی کبھی چمک دمک تھی
ارے ہوئے وقت سے محبّت
ونوں میں صفت یہ مشترک تھی

آنکھیں یوں برسیں پیراہن بھیگ گیا
تیرے دھیان میں سارا ساون بھیگ گیا
خشک محاذو مجھ کو بڑھ کے سلامی دو
میرے لہُو کی چھینٹوں سے رن بھیگ گیا
میری چھتیں تو نکلیں ساحلِ ابرِ آشام
اک بدلی سے تیرا آنگن بھیگ گیا
تم نے مے پی چُور چُور ہم نشّے میں
کس نے نچوڑا کس کا دامن بھیگ گیا
کیا نمناک ہنسی دیوار و دَر پر تھی
بچا کھچا سب رنگ و روغن بھیگ گیا
آب تھی خنجر کی مقتول کی آنکھوں میں
سرتاپا اِک خوف سے دُشمن بھیگ گیا
سجنی کی آنکھوں میں چھپ کر جب جھانکا
بن ہولی کھیلے ہی ساجن بھیگ گیا

امن کی نئی تحریک پر ماسکو کی
بین الاقوامی کانفرنس میں شریک ہونے
والے ہندوستانی مندوب پروفیسر
گوپی چند نارنگ سے انٹرویو

ادب اور آرٹ کی زبان محبّت ہے

گوربچن چندن

چندن۔ یہ کانفرنس کس نے بلائی تھی اور اس کی غرض و غایت کیا تھی؟

نارنگ۔ اس کانفرنس کا انعقاد سوویت یونین کی طرف سے عمل میں آیا۔

میرا خیال ہے کہ نہایت اعلیٰ سطحی قومی پالیسی کے تحت یہ فیصلہ ہوا ہوگا۔ صدر میخائل گورباچیف کے انتخاب کے بعد سوویت یونین کی قیادت میں بین الاقوامی پیچیدگیوں کے تئیں ایک نیا تحرّک پیدا ہوا۔ اس کا کچھ اندازہ اس وقت ہو گیا تھا جب صدر گورباچیف ہندوستان تشریف لائے تھے اور یہاں ایک مشترکہ اعلانیہ جاری ہوا تھا۔ اس میں نیوکلیائی اسلحہ سازی کی بین الاقوامی دوڑ کی شدید ترین الفاظ میں مذمّت کی گئی ہے۔

اس وقت عالمی صورتِ حال نہایت پیچیدہ ہے۔ امریکی صدر ریگن نے ایس ڈی آئی (اسٹار وار) کے تحت جس نئے پروگرام کا اعلان کیا ہے اس سے یقیناً بقائے انسانی کے لیے نئے خطرات پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ بھی سامنے کی بات ہے کہ اسٹار وار کے تصور سے مقابلے کی جو دوڑ شروع ہوگی اس میں بے پناہ مالی وسائل تباہ ہوں گے۔ سوشلسٹ ممالک بہ شمول سوویت یونین جو لابُد اس دوڑ میں شریک ہوں گے وسائل بہرحال محدود ہیں، چنانچہ نتیجۃً وہ ممالک جہاں زیادہ توجّہ سماجی مسائل پر ہے، ان میں نیوکلیائی اسلحہ سازی کی خلائی دوڑ سے شدید نقصانات کا امکان ہے۔ مالی مسائل سے قطع نظر انسانیت کے مستقبل کو بھی خطرہ لاحق ہے۔ یہ وہ حالات ہیں جن پر سوویت روس کی نئی امن تحریک مبنی ہے۔ ماسکو کا بین الاقوامی امن فورم اسی سلسلے کا پہلا بڑا قدم تھا۔

میں نے بیسیوں بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی ہے اور اظہارِ خیال بھی کیا ہے، لیکن میں نے اس سے بڑی کانفرنس آج تک نہیں دیکھی۔

اس میں آٹھ بڑے بڑے سیکشن تھے جن کے اجتماعات ماسکو شہر کے اندر مختلف آڈی ٹوریمز (جلسہ گاہوں) میں منعقد ہوئے اور آخری دن بہت بڑا مشترکہ اجتماع گرینڈ کریملن پیلس میں ہوا۔ ان آٹھ سیکشنوں میں تقریباً ۸۰ ملکوں کے ۹۰۰ سے زیادہ ماہرین نے شرکت کی۔

آپ کو سن کر تعجّب ہوگا کہ اس میں مختلف علوم (سائنسز) اور فنون کے تقریباً تمام شعبوں کی نمائندگی تھی۔ مثال کے طور پر ادیبوں، شاعروں، فلسفہ دانوں، اور فن کاروں کا شعبہ، جس میں میں نے شرکت کی، الگ تھا۔ اسی طرح سائنس دانوں کا شعبہ الگ تھا۔ فلمکاروں، موسیقاروں، اداکاروں اور تھیٹر کے ماہرین نے انسانی ثقافتی میراث کو درپیش خطرات پر اپنے نقطۂ نظر سے بحث کی۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ
اور دوسرے مندوبین ماسکو
بین الاقوامی فورم برائے
بقائے انسانیت میں

ایک شعبہ ڈاکٹروں سے متعلق تھا جسے یہ دیکھنا تھا کہ جغرافیائی ماحول کو تابناکی کے مضر اثرات سے کیسے محفوظ رکھا جائے۔ اسی طرح سیاسی مفکرین، مختلف ملکوں کے پارلیمانی اراکین اور سیاسی کارکنوں کا شعبہ الگ تھا۔ اور تو اور فوج سے سبکدوش بریگیڈیروں اور جنرلوں نے بھی اپنے شعبے میں اس مسئلے پر غور کیا کہ نیوکلیائی جنگ کل انسانیت کے لیے کس درجہ خطرناک ہوگی۔ اور اس میں فوجی حکمت عملی کے مسائل سے کیسے نمٹا جائے اور کرۂ ارض پر کسی حادثے کی وجہ سے یا عمداً کسی ملک کی غلط اندیشی سے اگر جنگ چھڑ جائے تو اس کو فوراً کیسے روکا جائے؟

اسی طرح مذہبی اور روحانی مفکرین کا شعبہ بھی الگ تھا جنھوں نے اس سنگین عالمی مسئلے کے اخلاقی و انسانی پہلوؤں پر غور کیا اور اپنے نتائج پیش کیے۔

میں نے شعبوں کی تفصیل اس لیے عرض کی تاکہ آپ کو بتا سکوں کہ ہر شعبے کا انتظام ایک الگ تنظیم کے سپرد تھا اور وہی اس کی داعی بھی تھی۔ مثال کے طور پر سائنس دانوں کی میزبانی اکیڈمی آف سائنسز نے کی۔ اسی طرح ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور آرٹسٹوں کی میزبانی سوویت رائٹرز یونین کے سپرد تھی جس نے انتظامات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ غیر ملکی مندوبین کی دیکھ بھال نہایت سلیقے سے کی گئی اور ان کی سہولت اور آرام کا بیحد خیال رکھا گیا۔

ج۔ اس میں آپ کی شرکت کسی ادارے کے نمائندے کی حیثیت سے تھی یا ہندوستان کے ایک منتخبہ ادیب کی حیثیت سے؟ اور ہندوستان کے ایک اردو ادیب کی حیثیت سے وہاں آپ کا کنٹری بیوشن کیا رہا؟

ن۔ مجھے جنوری ۸۷ء میں باقاعدہ دعوت نامہ موصول ہوا۔ اس سے پہلے مجھے کوئی اطلاع نہیں تھی۔ اس میں درج تھا کہ ماسکو میں وسط فروری میں نیوکلیائی اسلحہ سازی اور کرۂ ارض پر بقائے انسانی کے مسائل پر ایک بین الاقوامی فورم ہوگا جس کے ادبی شعبے میں آپ کو شرکت کرنا ہے۔ براہِ کرم اپنی منظوری بھجوا دیجیے۔ میں نے دعوت منظور کرلی۔ چند روز میں معلوم ہوا کہ ہندوستان سے بعض چوٹی کے سائنس دانوں اور مفکرین کو بھی دعوت دی گئی ہے۔ ادیبوں میں سے پنجابی کی نمائندگی امرتا پریتم اور ہندی کی بھیشم ساہنی نے کی۔ ہمارے شعبے میں مشہور ہندوستانی فلسفی ڈاکٹر سچدانند مورتی، وائس چیئرمین یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن بھی شریک تھے۔ فلموں سے مرینال سین اور شام بینی گل نے شرکت کی۔ سیاسی مفکرین کے شعبے میں جواہر لال نہرو یونی ورسٹی

کے ڈاکٹر رشید الدین خاں شریک ہوئے۔ ایئر و فلوٹ میں میری ملاقات پاکستان کے دانشور شوکت صدیقی اور ان کی بیگم سے ہوئی جو چند روز پہلے کراچی سے تشریف لائے تھے۔

ادیبوں اور دانشوروں کے بین الاقوامی شعبے کی سربراہی مشہور انگریزی ناول نگار گراہم گرین نے کی۔ ہالی وڈ سے گریگری پیک اور فلمی دنیا کے کئی اور آرٹسٹ بھی شریک ہوئے۔ ہندوستان کی ایک قد آور شخصیت پروفیسر نارائن مینن کی تھی جنھوں نے فنونِ لطیفہ کے حوالے سے شرکت کی۔ وہ سنگیت ناٹک اکاڈمی کے صدر رہیں۔

کانفرنس کے دوران شروع سے آخر تک انتہائی آزادانہ ماحول تھا۔ مختلف ملکوں سے آنے والے اور مختلف سیاسی نظاموں سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور دانش وروں نے کھل کر اظہارِ خیال کیا۔

اس موقعے پر میری معروضات کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ ادب اور آرٹ کی زبان محبّت ہے اور محبت امن اور زندگی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ اعلیٰ ادب نے ہمیشہ انسانیت کے جوہر کا دفاع کیا ہے۔ ادب کا سب سے بڑا مسئلہ انسانیت کی بقا ہے۔ البتہ نیوکلیائی عہد میں داخل ہونے کے بعد اب ادب سے ایسے ہیرو کے دن لد جائیں گے جس کی عظمت کا نقش مفتوح انسانوں کے خون سے قائم ہوتا تھا۔ دنیا کی تمام نیوکلیائی طاقتوں کو یہ بات تسلیم کر لینی چاہیے کہ نیوکلیائی جنگ میں کسی کی فتح ہو ہی نہیں سکتی۔ اس میں نہ کوئی فاتح ہوگا، نہ کوئی ہیرو ہوگا۔ بلکہ وہ تہذیب جو نوعِ انسانی کی صدیوں کی کمائی ہے آنِ واحد میں نیست و نابود ہو جائے گی۔ رزمیہ ہیرو داستان پارینہ کا حصّہ بن گیا۔ مستقبل کو ایسے ہیرو کی ضرورت ہوگی جو انسانیت کے حسن کے تحفظ اور اس کی بقا کے تئیں مثبت کردار ادا کرے۔ میں نے یہ بھی عرض کیا کہ ہندوستان ایک ترقی پذیر ملک ہے جس میں ہم فلاحی ریاست کی تنظیم کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ ہمارے مالی وسائل بہت محدود ہیں۔ غریبی، پسماندگی، بے روزگاری، صحت عامّہ تعلیم، سماجی بہبود ان سب کے لیے مالی وسائل کی ضرورت ہے اور مالی وسائل جٹانے کے لیے امن کی۔ لیکن شدید افسوس کا مقام ہے کہ مقامی طور پر برصغیر اور اس کے نواح میں اور بحرِ ہند میں اسلحہ سازی کی ایسی بھیانک دوڑ جاری ہے کہ مالی وسائل کا فوجی امور میں بٹ جانا ناگزیر ہو گیا ہے۔ آبادی میں تیز رفتار اضافے نے ان مسائل کو ہمارے لیے اور بھی سنگین بنا دیا ہے۔ چنانچہ قدیم ہندوستانی فکر سے روشنی حاصل کرتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو نے پنچ شیل اور غیر جانب داری کا جو تصور دیا تھا ہندوستان آج بھی اس پر قائم ہے۔ غیر جانب دار ملکوں کے کلب کے ممبران تک سو سے زائد نہیں لیکن ہندوستان کی غیر جانبداری کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہم خیر و شر میں غیر جانب دار ہیں۔ بلکہ یہ کہ ہم خیر کی قوتوں کے ساتھ ہیں۔ نئے سامراجی ہتھکنڈوں اور ان کے استحصال کے خلاف ہندوستان نے ہمیشہ اپنی آواز بلند کی ہے۔ امن تحریک کے ساتھ وابستگی محض فلسفیانہ اساس نہیں رکھتی بلکہ ہماری فوری سماجی اور قومی ضرورت بھی ہے۔ سوویت عوام کی دوستی سے ہمیں ہمیشہ تقویت ملی ہے اور خوشی کی بات ہے کہ یہ دوستی طرفین سے باہمی محبت اور احترام کی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔

خاکسار کو اظہارِ خیال کا موقعہ کئی بار ملا۔ مذاکروں میں دراصل بات سے بات نکلتی ہے۔ علاوہ کئی دوسرے امور کے میں نے ایک موقعے پر اردو کی اس مہتم بالشان روایت کا ذکر کیا جو صدیوں سے انسان دوستی کے اعلیٰ ترین تصور پر مبنی رہی ہے۔ اس سلسلے میں صوفیا اور بھگتوں کے مسلک صلح کل اور ہم وجودیت کے تصورات سے لے کر جدید عہد کے شعرا تک میں نے کئی نمائندہ آوازوں کا ذکر کیا اور ثبوت میں مثالیں پیش کیں۔ کئی موقعوں پر مجھے اردو میں اظہارِ خیال کا موقع ملا کیوں کہ ترجمان موجود تھا۔ ہر مندوب کے لیے مترجم کی سہولت فراہم کی گئی تھی۔ یہ مترجمین زبانوں سے کماحقہ واقف تھے۔ ایسے ایک موقعے پر میں نے جاں نثار اختر کی نظم "امن نامہ" کے کچھ اشعار سنائے جنھیں کانفرنس کے ماحول میں بے حد پسند کیا گیا۔

ح۔ امن کے موضوع پر ادیبوں اور سائنس دانوں کا عالمی اجتماع ایک بے نظیر واقعہ ہے۔ یہ اصحاب علم و نظر کے الگ الگ ڈسپلن سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسے مختلف طبقہ ہائے فکر کے اکابر کے درمیان آپ نے ایک ادیب کی حیثیت سے کیا تاثرات قائم کیے؟

ن۔ تفصیل تو بہت زیادہ ہے۔ مختصراً عرض کرتا ہوں۔

ماسکو فورم کی کانفرنسیں تو بیک وقت کئی جگہوں پر منعقد ہوتی رہیں۔ اتفاق سے ہوٹل کاسماس جہاں میں ٹھہرا تھا اور جہاں ادیبوں

اور دانش وروں کا اجتماع تھا، وہیں پاس ہی کے آڈی ٹوریم میں سائنس دانوں کا اجتماع بھی تھا جس کے تین مزید حصے تھے۔ مشہور روسی سائنس داں سخاروف بھی خطاب کرنے والے تھے۔ وہ جب ہال میں داخل ہوئے تو ہجوم اتنا بڑھ گیا کہ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔

سائنس داں کا کام دریافت کرنا ہے۔ علم کی حدود کو وسیع کرنا ہے۔ ان کی عملی تعبیر سماج اور سیاست کرتے ہیں۔ انسانیت کو نئی سائنسی دریافتوں کے خطرات سے بچانا کیا سائنس داں کے لیے ممکن ہے؟ اس میں بہت سی اعلیٰ سطحی تکنیکی بحثیں بھی آئیں جن کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو طبعیات کے نکات میں استعداد رکھتے ہیں۔ تاہم سائنسی مسائل کی مختلف جہات کا کچھ ایسا اثر ذہن پر ہوا کہ بتا نہیں سکتا۔ ہم لوگ تو عموماً اپنے ضابطے کے اندر ہی رہ کر سوچتے ہیں۔ دوسرے ضابطہ ہائے علم کے ماہرین کے درمیان بیٹھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ فکرِ انسانی کے کیسے کیسے پہلو ہیں جن کے بارے میں آج تک ہم نے سوچا ہی نہیں۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ پانچویں یعنی آخری دن جب کریملن گرینڈ پیلیس میں اختتامی اجلاس ہوا جس کے آخر میں صدر گورباچیف نے نہایت بھرپور اور فکر انگیز خطاب کیا تو اس سے پہلے آٹھوں شعبوں کے سربراہوں نے اپنے اپنے شعبوں میں پیش کیے گئے خیالات کی روداد سنائی۔ اس موقعے پر بھی معلوم ہوا کہ بقائے انسانی کا کوئی اہم پہلو نظر انداز نہیں ہوا اور ہر زاویۂ فکر سے اظہارِ خیال کیا گیا۔

اس بین الاقوامی اجتماع کے ایک اور پہلو کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہندوستان کو اس وقت جس نوعیت کے مسائل کا سامنا ہے اس کے پیشِ نظر ہمیں اس تجربے سے روشنی حاصل کرنی چاہیے۔ ہمارے ہاں اقدام تو ہوتے ہیں لیکن شاید بات نہیں بنتی۔ مثلاً ابھی کچھ مدت پہلے اندرا گاندھی میموریل ٹرسٹ کی جانب سے "نئے آغاز کی طرف" کے عنوان سے دانش وروں کا ایک بین الاقوامی اجتماع طلب کیا گیا۔ اسی طرح انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز نے بین الاقوامی اہل قلم کی ایک زبردست کانفرنس انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں طلب کی۔ لیکن ان دونوں موقعوں پر ہندوستانی ادیبوں کی نمائندگی برائے نام تھی اور عمل اور ردِ عمل کا کوئی بڑا نمونہ سامنے نہیں آیا۔ ضرورت ہے کہ نہ صرف تمام زبانوں کے ادیبوں، دانش وروں اور فن کاروں کو بلکہ سائنس دانوں اور دوسرے ضابطہ ہائے علم کے نمائندوں کو بھی ایک چھت کے نیچے جمع کیا جائے تاکہ وہ قومی مسائل پر مل کر سوچیں۔ ہم نے یہ مقدس کام صرف سیاست دانوں پر چھوڑ رکھا ہے اور چوں کہ سیاست کا سب سے بڑا مقصد اقتدار ہے اور ہماری سیاست اخلاقیات سے روز بروز دور ہوتی جا رہی ہے، اس لیے ہمارے سیاست داں اپنی ناک سے آگے نہیں دیکھ سکتے۔ ادیبوں اور دانش وروں کو نظر انداز کرنے کی ایک وجہ بھی یہی اقتدار کی دوڑ ہے جس نے تمام اخلاقی اور اعلیٰ انسانی قدروں کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔

پ ح ۔ جنگ روکنے کا کام چند عظیم تر طاقتوں کے ہاتھ میں ہے لیکن یہ طاقتیں مہلک ترین ہتھیاروں کی دوڑ میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے پر مصر ہیں۔ ان کے رہ نماؤں کو مشرف بہ دینِ امن کرنے کے لیے دوسرے بلکہ چھوٹے ملکوں کے ادیب اور عوام کیا کر سکتے ہیں؟ اور اس سلسلے میں کانفرنس نے کیا تدبیریں پیش کیں؟

ل ۔ نیوکلیائی جنگ کا مسئلہ بظاہر تو عظیم طاقتوں کا مسئلہ ہے لیکن جینوا اور ریکاوک کے مذاکرات میں یہ بات تو بہرحال روس اور امریکہ کے درمیان طے ہو چکی ہے کہ نیوکلیائی جنگ "ناقابلِ عمل" ہے اور اسی حوالے سے چھوٹے ملکوں کا کردار بھی معنی خیز ہو جاتا ہے۔ پھر ہندوستان تو کچھ ایسا چھوٹا ملک بھی نہیں۔ اسٹار وار کے پروگرام بلاشبہ انسان دشمن ذہنیت کے غماز ہیں اور انسانیت کے مستقبل کو خطرے میں ڈالنے والی باتیں ہیں۔ ہندوستان اور تیسری دنیا کے چھوٹے بڑے ممالک کا کردار موجودہ پیچیدہ حالات میں یہ ہے کہ وہ دنیا بھر کی رائے عامہ کو اپنے ساتھ لیں تاکہ اگر کوئی ایک اعلیٰ طاقت یا چند ممالک پوری انسانیت کے مستقبل کو مخدوش بنانے کے خواب دیکھتے ہیں تو انھیں اس کے خطرات سے آگاہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ چھوٹے ممالک کچھ نہیں کر سکتے۔

پ ح ۔ عالمی امن کی تحریک کو مضبوط تر بنانے کے لیے ہندوستان کے ادیب اور بالخصوص اردو کے ادیب کیا کر سکتے ہیں؟

ل ۔ میرا خیال ہے کہ تہذیبِ انسانی جس میں ادبیات اور فنونِ لطیفہ کے تمام شعبے آ جاتے ہیں دراصل امن ہی کا ثمر ہے

لیکن امن اور امن کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ قبائلی امن۔ علاقائی امن۔ ملکی امن۔ قومی امن۔ بین الاقوامی امن۔ اب مسائل بہت بدل گئے ہیں۔ ادیب بہ حیثیت مفکر اور دانش ور کھل کر اظہارِ خیال کر سکتا ہے اور ان طاقتوں کو مضبوط کر سکتا ہے جو امنِ عالم کے حق میں ہیں اور ان طاقتوں کے خلاف آواز اٹھا سکتا ہے جو تباہی کی طرف دھکیل رہی ہیں۔ یہ سب فرائض اس پر بہ حیثیت ایک فرد کے یا ایک شہری کے عائد ہوتے ہیں۔ بہ حیثیت فن کار یا شاعر اس کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ فکر و فن کا اعلیٰ نمونہ پیش کرے یا اعلیٰ سے اعلیٰ شعر لکھے۔ اگر شعر کمزور ہے تو محض خیال سے فن پارہ دائمی اہمیت حاصل نہیں کر سکتا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ فن کار کے لیے لازم ہے کہ فکر کے ساتھ وہ فنی تقاضوں کی پابندی کرے تاکہ اس کی آواز میں اثر پیدا ہو۔ پھر یہ بھی کہ فنکار کسی بھی موضوع پر اظہارِ خیال کے لیے آزاد ہے۔ مسائل ایک نہیں لاکھوں ہیں۔ داخلی اور خارجی بھی۔ ایسے ادیبوں کی مثالیں سامنے ہیں جنھوں نے مسائل کو صرف خارجی طور پر لیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ ان کا ادب ہنگامی نوعیت کا ہو کے رہ گیا۔ ادب اور فنون کی اپنی تخلیقی حرکیت ہے۔ انسان دوستی، محبت، دکھ سکھ، گھریلو مسائل، جذباتی رشتے، خواب، شکستِ خواب اور آرزومندی ان سب کا رشتہ بقائے انسانی اور بالآخر امن ہی سے جڑ جاتا ہے۔ گویا فن کار کے لیے ضروری نہیں کہ وہ محض سطحی نقیب بن جائے بلکہ فن میں انسانی و آفاقی قدروں کے اعلیٰ شہ پاروں کی راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ اعلیٰ ادب انسانیت اور امن کی بہترین خدمت ہے۔ گویا ادیب اور فن کار اگر چاہے تو براہِ راست بھی یہ خدمت عملی طور پر انجام دے سکتا ہے اور چاہے تو فن کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بالواسطہ بھی انسانی صورتِ حال کے درد میں شریک ہو سکتا ہے۔ مرجح یہ ہے کہ یہ درد اس کی باطنی واردات کا حصہ ہو اور جمالیاتی تجربہ بن کر ظاہر ہو۔

ماسکو کے پروگرام کے بعد ہمیں آزادی تھی کہ ہم کہیں کا بھی سفر کر سکتے تھے۔ میں نے، شوکت صدیقی نے اور چند مصری مندوبین نے فیصلہ کیا کہ مرکزی ایشیا میں تاشقند اور سمرقند و بخارا کی زیارت کریں۔ ان علاقوں کا سفر ایسے تھا جیسے کسی دیرینہ خواب کی تعبیر نکل آئے۔ وہی سرو و شمشاد و صنوبر، وہی اشجار، وہی نازنینانِ سبک اندام، وہی چنگ و رباب، وہی رقص و سرود اور وہی رحمت سلامت۔

یہی وہ علاقے ہیں جن کا سیدھا رشتہ صدیوں کے تاریخی عمل سے گزرتا ہوا ہماری اس گنگا جمنی تہذیب سے جڑ جاتا ہے جس کی حسن کاری کو مغلوں کے زمانے میں زبردست فروغ حاصل ہوا۔ یہیں کہیں فرغانہ ہے جہاں سے گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بابر نے سینکڑوں منزلیں ماری ہوں گی اور جہاں سے ہمایوں اور اکبر کے آبا و اجداد آئے تھے۔

تاشقند میں "قند" کے معنی میٹھا ہرگز نہیں بلکہ "قند" بہ معنی شہر ہے یہ سب آریائی علاقے ہیں۔ میں چوں کہ لسانیات کا طالب عل ہوں، ہند یورپی کی نو تعمیر شدہ شکلوں سے بھی تھوڑا بہت واقف ہوں ازبیکی تاجکی اور فارسی کا یہاں گہرا اثر ہے، اور فارسی کی قدیم شا پہلوی اور ویدوں کی انڈک بہنیں تھیں۔ تاش بہ معنی پتھر اور قند بہ معن شہر۔ چنانچہ یہ قند وہی سنسکرت "کھنڈ" ہے جو روھیل کھنڈ او بندھیل کھنڈ میں ملتا ہے۔ یہی لفظ سنسکرت میں "کنج" ہو گیا ا پراکرتوں میں اسی کی ایک شکل "گنج" بھی ملتی ہے یعنی "سلطان گ حضرت گنج" وغیرہ۔

ان علاقوں میں سوشلسٹ نظام کے تحت قدیم و جدید بہترین امتزاج دیکھنے میں آیا۔ میں علی شیر نوائی یونی ورسٹی اور تاش یونی ورسٹی بھی گیا۔ بعض قدیمی شاگردوں سے بھی ملاقاتیں ہو فرینڈشپ سوسائٹی اور ادیبوں کی انجمنوں کے استقبالیوں میں شرکت کی۔ یہ لمبی داستان ہے کبھی پھر بیان ہوگی۔

شوکت صدیقی اور ان کی بیگم کی خوش اخلاقی اور رفاقت میں کبھی بھلا نہیں سکتا۔ امیر تیمور کا مقبرہ، مسلم بخاری کا مزار، ا کی رسد گاہ، شاہ زندان کے گنبد و محراب، بخارا کا مینار کلاں ا دوسری بیسیوں عمارات اور عجائبات روزگار ہم لوگ ساتھ سا دیکھنے گئے۔ انگوروں کی بیلیں، ناشپاتی کے پیڑ، انار و شفتالو شاخیں، بے برگ و بار، برف سے جھکی ہوئی تھیں لیکن محفلوں جذبات کی گرم جوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ہر صوبہ الگ آ ری پبلک کہلاتا ہے۔ ہر نسل کو قوم کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ ا۔

بقیہ صفحہ

حسنِ غروبِ مہر تنہائی

ممتاز مرزا

ہر شام کو جب
دن رات گلے سے ملتے ہیں
میں اپنے دریچے میں بیٹھی
سورج کو ڈوبتے دیکھتی ہوں

جب دن کا اُجالا گھٹتا ہے
اور سایے بڑھنے لگتے ہیں
جب تنہائی اور خاموشی کی
ساعتیں پھیلنے لگتی ہیں
تب میرا دل بھی
جیسے میری روح میں ڈوبنے لگتا ہے

اے ربِّ جہاں، اے خالقِ کل
یہ شام کا رنگیں نظارا
یہ حُسنِ غروبِ مہر کبھی
کیا پھر میں دوبارہ دیکھوں گی
معلوم نہیں، معلوم نہیں!!

جب میں گھبراتی ہوں ہنگامے سے،
تنہائی میں لیتی ہوں پناہ
اور پھر اپنے خیالات میں کھو جاتی ہوں
بیتے لمحات کی یادوں میں اُلجھ جاتی ہوں
یادیں شیریں بھی ہیں، تلخ بھی ہیں
وقت کے ساتھ ہوئے جاتے ہیں لیکن دھندلے
رنج و راحت کے نقوش

وقت گزرا ہی چلا جاتا ہے
اور مجھے چھوڑ چلا ہے پیچھے
منتظر اب ہوں میں اُس منظر کی
جب کسی آنکھ میں آنسو نہ کسی لب پہ تبسم ہوگا
اور میں
خوش و خرّم ابدی نیند کی آغوش میں کھو جاؤں گی

(ترجمہ انگریزی سے)

"... ایک دن وہ آئے گا جب بُرے کام انجام د
والے اپنے اعمال کی تفصیل بائیں ہاتھ میں لیے ایک
طرف ہوں گے اور نیک کام انجام دینے والے اپنے اع
کی تفصیل دائیں ہاتھ میں لیے دوسری طرف ...

ایک ہاتھ کا آدمی

انجم عثمانی

بات اب ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی۔ بستی کے بیشتر افراد اپنے آپ سے شرمندہ اور ایک دوسرے کے سامنے خود کو چور محسوس کر رہے تھے، جب کہ بستی کا ہر کام جوں کا توں جاری تھا، کھیتوں میں ہل بھی چل رہے تھے اور فائلوں پر قلم بھی۔ مگر زیادہ تر لوگ اپنے کاموں کو صرف عادتاً انجام دے رہے تھے اور اپنے آپ کو خجل اور پژمردہ محسوس کر رہے تھے۔

ہوا یوں تھا کہ ایک دن بستی کے لوگوں نے محسوس کیا کہ وہ جو کام اپنے دائیں ہاتھ سے انجام دیتے رہے ہیں وہ ان کا بایاں ہاتھ انجام دے رہا ہے۔

شروع شروع میں لوگوں نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی اور اسے اپنا وہم سمجھے مگر آہستہ آہستہ انھیں محسوس ہوا کہ کوئی اَن دیکھی قوت ان مخصوص کاموں کو بھی بائیں ہاتھ سے انجام دینے پر مجبور کر رہی ہے جنھیں وہ ہمیشہ سے دائیں ہاتھ سے انجام دیتے رہے ہیں اور ان کا داہنا ہاتھ دھیرے دھیرے مفلوج اور پھر معدوم ہوتا جارہا ہے۔

ابتداً بستی کا ہر فرد یہی سمجھتا رہا کہ بیماری صرف اسی کو لاحق ہے اور باقی افراد حسبِ معمول اپنا کام انجام دے رہے ہیں چنانچہ شرمندگی کو چھپانے کے لیے کوئی اس تبدیلی کا ذکر کسی سے نہ کرتا لیکن دھیرے دھیرے سب کو یہ اندازہ ہونے لگا کہ یہ ایک اجتماعی عذاب ہے جس میں بہت سے افراد مبتلا ہیں کہ وہ کتابوں میں پڑھ اور بزرگوں کی زبانی سن چکے تھے کہ:

"ایک دن وہ آئے گا جب برے کام انجام دینے والے اپنے اعمال کی تفصیل بائیں ہاتھ میں لیے ایک طرف ہوں گے اور نیک کام انجام دینے والے اپنے اعمال کی تفصیل دائیں ہاتھ میں لیے دوسری طرف۔ اور تب سورج بائیں ہاتھ والوں کے عین سر پر سوا نیزے اوپر ہوگا، دماغ کھولتی ہنڈیا کی طرح گرم ہوں گے، نفوس ایک دوسرے سے اس طرح بے پروا ہوں گے کہ ماں باپ اولاد کو، اولاد ماں باپ کو پہچاننے سے انکار کردے گی اور دائیں ہاتھ والے بائیں ہاتھ والوں کی طرف پلٹ کر نہ دیکھیں گے۔"

چنانچہ بستی کے بہت سے لوگ اس عذاب سے نجات پانے کی ترکیب کی امید لیے ان افراد کی طرف رجوع ہوئے جن کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ وہ نہ صرف اپنے داہنے اور بائیں ہاتھ کے کاموں میں فرق رکھ پاتے ہیں بلکہ وہ عذابوں، بلاؤں اور ان کے سدِّباب کی راہ سے بھی واقف ہیں۔ لیکن بستی والوں کو مایوسی ہوئی جب ان لوگوں نے برملا اعلان کیا کہ:

"ایسے لوگ جھوٹے، وہمی اور بیمار ہیں اس طرح کا عذاب

نازل ہونے کی کوئی خبر نہیں ہے، ہر آدمی اپنے داہنے
ہاتھ کا کام داہنے ہاتھ سے اور بائیں کا کام بائیں سے
انجام دے رہا ہے، بستی کے ہر فرد کا داہنا ہاتھ سلامت
ہے نہ دایاں بائیں سے تعارض کر رہا ہے اور نہ بایاں
دائیں سے۔"

اس اعلان سے بستی میں مزید بے چینی پھیلی اور لوگوں کا ان
پر سے اعتماد اٹھ گیا جن کے بارے میں عام خیال تھا کہ وہ عذاب سے
نجات حاصل کرنے کا راستہ بتائیں گے۔

صورت حال روز بروز بگڑتی جا رہی تھی، کچھ لوگوں نے کھانا
پینا بھی چھوڑ دیا تھا کہ انھیں لگتا کہ وہ دائیں کے بجائے بائیں ہاتھ
سے کھا اور پی رہے ہیں اور بائیں ہاتھ سے تو انھوں نے ابھی ابھی
گندگی صاف کی تھی۔ کراہیت اور نفرت کی وجہ سے وہ کھا پاتے اور نہ
پی پاتے۔ نتیجے میں لوگ بھوک اور پیاس سے مرنے لگے اور بستی میں
مزید بے چینی، کرب، خوف اور سراسیمگی بڑھتی گئی جب کہ بستی میں
گونجتا نقارہ "سب ٹھیک ٹھاک ہے" کا نعرہ حسب معمول لگا رہا تھا۔
چند لوگوں کا اب بھی یہی خیال تھا کہ کچھ مفاد پرست لوگ "یمین" و
"یسار" کا قضیہ کھڑا کر کے جان بوجھ کر بستی میں بے چینی پیدا کر رہے ہیں
تاکہ ایک خاص گروہ کے لوگوں کو ان کے مقام سے گرایا جا سکے۔ ادھر
کچھ لوگ آہستہ آہستہ اس عذاب کے اس درجہ عادی ہوتے جا رہے
تھے کہ کھلم کھلا بغیر کسی خجالت کے اپنے داہنے ہاتھ کے کام بھی بائیں
ہاتھ سے انجام دینے لگے تھے مگر ایک دن انھیں بھی لگا کہ ہمارا داہنا
ہاتھ تو بیکار ہو چکا ہے اور اگر ہم چاہیں بھی تو اس سے کام نہیں لے
سکتے۔

دھیرے دھیرے عذاب نے مزید وسعت اختیار کر لی تھی۔ بہت
کم افراد رہ گئے تھے جو یہ کہہ سکتے کہ ان کا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ سے
قوی ہے اور وہ اس اَن دیکھی قوت کے پنجے سے محفوظ ہیں جو ہر کام
کو بائیں سے کرنے پر مجبور کرتی ہے، حتیٰ کہ قلم نے بھی اپنا رخ بدل
لیا، حرفوں نے ساخت، لفظوں نے معانی اور جملوں نے مفہوم بدل
لیے، استعارے، علامتیں، تشبیہیں اور اشارے اپنے مطالب سے
منکر ہو گئے۔ اب بستی کے ہر فرد پر یہ ظاہر ہو چکا تھا کہ دوسروں کو کھبّا
کہنے والے بھی اس عذاب میں مبتلا ہیں اور ان کے بھی دائیں ہاتھ کو
بایاں نگل چکا ہے۔

ساری بستی کھبّی ہو چکی تھی اور مایوسی میں مبتلا تھی کہ بستی
سے فرار کے سارے راستے بھی بند تھے اور آس پاس کی بستیوں کے
لوگ کسی قیمت پر اس کے لیے تیار نہ تھے کہ کسی عذاب میں مبتلا
لوگ اپنے عذاب سمیت سرحد پار کر کے ان کے ہاں گھس آئیں۔
چنانچہ بستی کے سارے نفوس ایک جگہ جمع ہوئے تاکہ اس اجتماعی
عذاب سے نجات کا راستہ تلاش کر سکیں کہ اچانک مجمع میں نامعلوم
سمت سے ایک ایسا شخص نمودار ہوا جس کا چہرہ ناقابل شناخت
تھا اور جس کا ایک ہاتھ سرے سے غائب تھا۔ سارے مجمع کا رخ
اس ایک ہاتھ والے شخص کی جانب مڑ گیا مگر کسی میں ہمت نہ تھی
کہ کچھ پوچھ سکے۔ ایک ہاتھ والے شخص نے ایک نگاہ سارے مجمع
پر ڈالی، اپنے اکلوتے ہاتھ کو سر سے بلند کیا اور سارا مجمع کچھ سوچتا
ہوا چپ چاپ منتشر ہو گیا۔

اگلی صبح انھوں نے دیکھا کہ بستی کے سارے بچے داہنے ہاتھ
والے کام بھی بائیں ہاتھ سے انجام دے رہے ہیں اور ان کے
بھولے چہروں پر کسی کرب کے آثار نہیں ہیں۔

●●

اردو اکادمی افسانہ ورکشاپ، سیمینار میں پڑھا گیا

(بقیہ صفحہ ۳۴ سے آگے)

ادیبوں، شاعروں، مصوّروں اور دانش وروں کا بڑا احترام
کرتے ہیں۔ یونی ورسٹیاں، میوزیم، تھیٹر بڑی بڑی عمارتیں اور
تو اور زمین دوز ٹیوب کے اسٹیشن بھی ادیبوں اور شاعروں کے
نام پر رکھے جاتے ہیں۔ جہاں جہاں ہم گئے چھوٹی چھوٹی بچیوں نے
پھولوں کے گلدستوں سے ہمارا استقبال کیا۔ ایک پل کے لیے بھی
اجنبیت کا گمان نہیں ہوا۔

تجربات اور تاثرات کی یہ الگ کہکشاں ہے جسے کسی اور موقع
پر بالتفصیل بیان کروں گا:

مے باقی و ماہتاب باقیست
مارا بتو صد حساب باقیست

●●

"... اب بڑے بڑے دروازے بنانے کا رواج، اخلاق و آداب کے رواج کی طرح قصۂ پارینہ ہو چکا ہے۔ ان کی بجائے اب جگہ جگہ چور دروازے بن گئے ہیں ..."

دروازے

یوسف ناظم

ہمیں جب بھی موقعہ ملتا ہے ہم کسی نہ کسی مسئلے پر ضرور غور کرتے ہیں اور ہم نے محسوس کیا ہے کہ غور کرنے اور غور کرتے رہنے کے فوائد بے شمار ہیں۔ اس سے دل کو بڑی تقویت ملتی ہے۔ حال حال میں ہم نے جس مسئلے پر غور کیا وہ اپنے ہی وطن ہندوستان سے متعلق تھا۔ ہندوستان گو شکل و صورت کے لحاظ سے مثلث ہے لیکن اس پر کئی زاویوں سے غور کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ کافی بڑا ملک ہے اور گنجان شہروں کے علاوہ یہاں بنجر علاقہ بھی بہت ہے۔ ہندوستان کے دو قحط کافی مشہور ہیں۔ ایک تو قحط بنگال اور دوسرے قحط الرجال۔ قحط الرجال کی وجہ سے یہاں مسائل کی پیداوار میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس پیداوار کی باہر مانگ نہیں ہے ورنہ یہ فارن ایکسچینج کمانے کے لیے بہت اچھی چیز تھی (کوئی بات نہیں۔ فارن ایکسچینج حاصل کرنے کے لیے ہم نے ایک نیا راستہ ڈھونڈ نکالا ہے۔ اب جو بھی اس ملک سے باہر جائے گا اس کے فارن ایکسچینج سے ہم ۱۵ فیصد اپنے لیے رکھ لیں گے) اس مرتبہ ہم نے ہندوستان کے جغرافیائی اور تعمیراتی معاملات پر غور کیا (یہ بھی اچھا موضوع ہے) تو ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اس ملک میں جتنے دریا، پہاڑ اور گڑھے ہیں اتنے ہی بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی دروازے بھی ہیں اپنے غور و خوض کے عمل کے دوران تو ہمیں چند لمحوں کے لیے تشویش بھی ہو گئی کہ اگر ہمارے ملک میں اتنے دروازے نہ ہوتے تو ہماری زندگی کتنی لایعنی ہوتی۔ ہندوستان میں باہر سے آنے والے لوگ کس دروازے سے داخل ہوتے یہ کہنا مشکل ہے، لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جب ایک مرتبہ یہاں دروازے بننے شروع ہو گئے تو پھر کوئی شہر، شہر کا کوئی محلہ دروازے سے محروم نہیں رہا۔ یہ دروازے عام طور پر ایسی جگہوں پر بنائے گئے جہاں ان کی ضرورت نہیں تھی لیکن ملک خدا تنگ نیست کا معاملہ تھا اس لیے دروازوں کی تخلیق ضروری سمجھی گئی۔ (بعض دروازے تو بجائے خود شہر سے بڑے دکھائی دیے) تعمیرات کے فن کی ترقی کا دار و مدار، ماہرین کہتے ہیں کہ دروازوں ہی پر ہے اور ان کی اہمیت سنگ بنیاد کی اہمیت کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ ہمارا خیال ہے کسی بھی شہر کے دروازے

پہلے سے بنے ہوئے نہیں تھے کیونکہ اجنتہ دروازے نہیں بناتے، اس لیے یہ طے ہے کہ یہ دروازے شہر میں آنے کے لیے نہیں بنائے گئے تھے بلکہ شہر سے باہر جانے کے لیے وضع کیے گئے تھے (ہمارے اس بیان سے صدیوں پُرانی غلط فہمی اب دُور ہوجانی چاہیے) اس بات کا خیال بھی رکھا گیا کہ ہر دروازے کے اطراف سے بھی آنے جانے کا راستہ کھُلا رہے اور کسی بھی شخص کو دروازے کے اندر سے ہوکر گزرنے کے لیے مجبور نہ کیا جائے۔ اس سہولت کے باوجود لوگ دروازوں ہی سے گزرتے رہے اور وہ بھی سر جُھکا کر کیونکہ ہندوستان میں سر اُٹھا کر چلنا سب کی قسمت میں ہے بھی کہاں ـــ یہ خصوصیت صرف چند خاندانوں کے افراد تک محدود ہے۔

خود دلّی جو ہماری راجدھانی ہے دروازوں اور پھاٹکوں کا شہر ہے۔ وہاں کے پھاٹک ہمارے مطالعے میں نہیں آئے لیکن یہ بھی منٹو کے افسانوں کی طرح مشہور ہیں مثلاً یہی پھاٹک حبش خاں، اس کی خاصی شہرت ہے اور یہ ہندوستان کے صفِ اوّل کے پھاٹکوں میں شمار کیا جاتا ہے ـــ دلّی کے دروازوں سے ہم (میر تقی میر کی زبان میں) سرسری ہی سہی گزرے ضرور ہیں (وہی سر جھکا کر) ان دروازوں کے سایے کو ہم نے ہما کا سایہ تو نہیں سمجھا لیکن ہما شما کا یقیناً سمجھا ہے (چلن بھی آج کل اسی سایے کا ہے یہ بہت مفید ہوتا ہے) اجمیری گیٹ ہو یا کشمیری گیٹ۔ ان دونوں میں سے کس گیٹ کو آلائش اور آلودگی کے معاملے میں فوقیت حاصل ہے، اس موضوع پر ہمیں عملی یا معروضی تنقید کا موقع نہیں ملا لیکن اس باب میں اتنا تو ہم کہہ ہی سکتے ہیں کہ یہ دونوں دروازے جعفر از بنگال و صادق از دکن کی طرح شہرۂ آفاق نکلے۔ لاہوری گیٹ کا نام بھی ہمارا سُنا ہوا ہے۔ لیکن ہم ٹھیک سے نہیں کہہ سکتے کہ یہ کہاں واقع ہے۔ اور اس کے حدودِ اربعہ میں کون سے جزائر پائے جاتے ہیں لیکن اتنا ہم ضرور جانتے ہیں کہ یہ گیٹ بھی ہے یہیں کہیں اور اپنے نام ہی سے کافی وقیع اور وسیع معلوم ہوتا ہے۔ دلّی کا ترکمان گیٹ بھی کچھ کم مشہور نہیں ہے۔ تھوڑا سا مزاحیہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مزاحیہ ہونے میں سُبکی یا ذم کا کوئی پہلو نہیں نکلتا بلکہ اب تو مزاحیہ چیزیں زیادہ مقبول ہوتی جارہی ہیں اور ہمارا دُوردرشن تو اس ٹوہ میں رہتا ہے۔ ترکمان گیٹ کا دیدار ہم نہیں کر سکے۔ ہوسکتا ہے یہ گیٹ اب نایاب بھی ہوگیا ہو کیونکہ جہاں تک دروازوں کا تعلق ہے، ان کا دوسرا ایڈیشن تیار نہیں کیا جاسکتا۔ ترکمان گیٹ کے اطراف ہمارا خیال ہے کہ ایک زمانے میں زبانِ یارِ من ترکی کا رواج زیادہ ہوگا اور ہمارے اسلاف کو اپنے عرضِ مدعا میں بڑی دقت محسوس ہوتی ہوگی لیکن اب اس گیٹ کے اطراف و اکناف میں سلیس اور عام فہم شاعری کا بول بالا ہے اور ہم اس خیال کے حامی ہیں کہ شاعری کو دردِسر کا باعث نہیں بننا چاہیے۔ (اس کے لیے بریک فاسٹ ٹی وی پروگرام کافی ہے)۔

ترکمان گیٹ کے ایک شاعر تو ہمیں خاص طور پر عزیز ہیں۔ انہی کے ایک شعر سے ہمیں معلوم ہوا کہ ہر شخص اپنی طالب علمی کے زمانے میں کالج کی کتابوں پر لڑکی کا پتہ لکھا کرتا تھا (امتحانات میں فیل ہونے والے طلبا کی تعداد اسی لیے ساٹھ اور ستّر فی صد ہوا کرتی تھی اور لوگ مجبوراً پنجاب یونی ورسٹی جاکر ڈگری حاصل کیا کرتے تھے)۔

جہاں تک دروازوں کی ساخت اور ثقافت کا تعلق ہے، ہم سمجھتے ہیں سب ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں ہر گیٹ پر اُداسی ضرور برسنی چاہیے۔ قرب وجوار میں خستگی ہونی چاہیئے۔ اسی اُداسی سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دروازہ کلاسیکی ادب کا حصّہ ہے۔ آثارِ قدیمہ بھی اگر آج کل کی عمارتوں کی طرح تر و تازہ نظر آنے لگے تو پھر ان کے پُرانے ہونے کا فائدہ کیا ہے ـــ یہی کیا کم ہے کہ کافی عمر رسیدہ ہونے کے باوجود یہ دروازے نوجوان نسل کے دروازوں سے اب بھی بہتر ہیں ـــ (اُس زمانے کے بلڈر صرف دروازے بنانا جانتے تھے، پیسہ کمانا نہیں جانتے تھے۔ اُن کی اِس نادانی کی وجہ سے سرکاری اور میونسپل عہدہ داروں کی معیشت پر بھی بُرا اثر پڑا ہوگا۔)

دلّی شہر ہی پر کیا منحصر ہے۔ ہندوستان کے ہر شہر میں دو چار دروازے موجود ہیں۔ ہمارے اورنگ آباد میں تو

شاید، دروازے ہیں۔ ان سب دروازوں کی خوبی یہ ہے کہ
ان سے گزر کر آدمی شہر کے اندر ہی رہتا ہے۔ ان میں سے ایک
دروازہ تو کالا دروازہ کہلاتا ہے لیکن باوجود عام کساد بازاری
کے یہاں نہ تو کوئی بلیک مارکیٹ ہے اور نہ اس کے گرد بلیک
میلنگ ہوتی ہے۔ بس یہ برائے نام کالا دروازہ ہے۔ اس کی
تعمیر کے وقت جتنے بھی پتھر استعمال ہوئے تھے وہ سب خضاب
زدہ تھے۔ اس کے جواب میں یہاں ایک رنگین دروازہ بھی ہے
طیّاروں کی پرواز کی وجہ سے اس دروازے کے رنگ بھی
اُڑ چکے ہیں لیکن دروازے کے اندر کی فضا اب بھی رنگین ہے
(اسے ادب میں انڈر کرنٹ کہا جاتا ہے) رنگین دروازے کو ہم
اس شہر کا انڈیا گیٹ بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ پورے اورنگ آباد
میں بس اسی دروازے کی طرف جانے والی سڑک ہے جسے
سڑک کہا جا سکتا ہے۔ یہ کرکٹ کے ٹیسٹ میچ کے لیے تیار
کی ہوئی پچ کی طرح تو نہیں ہے لیکن اس میں کرکیٹ ڈپلومیسی
کے کچھ عناصر ضرور پائے جاتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ایلورا،
خلد آباد اور اجنتا دیکھنے کے لیے جو سیّاح اورنگ آباد آتے ہیں
انہی کی وجہ سے اس شہر کی سڑکیں متاثر ہوتی رہتی ہیں۔
ورنہ خود اورنگ آباد کے رہنے بسنے والے تو اپنے شہر کی سڑکوں
کے ساتھ ایسا ناروا سلوک نہیں کر سکتے کہ ہر طرف سے ان کے
بخیے اُدھڑ جائیں۔

اورنگ آباد میں دل رس بانو کا مقبرہ بھی ہے جو تاج محل
کا پیپر کور ایڈیشن ہے۔ یہاں پہنچنے کے لیے بھی ایک دروازے
سے گزرنا پڑتا ہے اور یہ دروازہ قد و قامت میں اجمیر کے
بلند دروازے کی طرح کا نظر آتا ہے لیکن اس کی وجہ صرف
یہ ہے کہ یہ ذرا بلندی پر۔ اُونٹ کو آپ کسی ٹیلے پر کھڑا
کر دیں تو وہ کتنا اونچا نظر آنے لگے گا حالانکہ ہو گا وہ اُسی
قد کا جو اونٹوں میں مستعمل ہے۔ بس یوں سمجھیے کہ اس دروازے
کی مثال اس کتاب کی سی ہے جس کا مقدمہ نہایت شاندار
ہو (شاندار سے مُراد مبالغہ آمیز ہے) ویسے اس دروازے میں
کوئی جھول نہیں ہے۔

حیدر آباد کے چارمینار کی شہرت تو بلاد یورپ تک
پہنچ چکی ہے لیکن اب اس دروازے سے کوئی گزرتا نہیں ہے
یہاں شاید پولیس چوکی قائم کر دی گئی ہے (یہ دروازوں کا صحیح
استعمال ہے یعنی شہروں کے دروازے تو آکٹرائے ڈیوٹی کی وصولی کے
لیے زیر استعمال ہیں بلکہ کہا جاتا ہے کہ ان شہروں میں آکٹرائے
ڈیوٹی وصول کرنے کی تحریک اسی لیے ہوئی کہ دروازوں کی سہولت
حاصل تھی) ـــــ ایک نعل ہاتھ آجائے تو پھر تین عدد نعل اور ایک
گھوڑے کی فراہمی آسان ہو جاتی ہے، چارمینار کی شہرت جب
سات سمندر پار پہنچی تو ہم نے اطمینان کی سانس لی کہ ہماری کوئی
چیز تو باہر پہنچی ورنہ جتنی بھی سیاسی اور ادبی تحریکیں اور وبائیں
ہیں سب باہر سے یہاں پہنچی ہیں۔

شہر بمبئی میں دروازے کم ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ
بمبئی تین طرف سے سمندر سے گھرا ہوا ہے اور سطح سمندر پر
دروازہ بنانے کا خیال کسی انجینئر کے ذہن میں نہیں آیا لیکن کچھ
نہ کچھ تو کرنا تھا۔ اس لیے سمندر کے کنارے ایک گیٹ وے بنایا
گیا جس کا عنوان گیٹ وے آف انڈیا ہے۔ درّۂ خیبر تو بس
یونہی مشہور ہے اور ادھر مشرق میں ہمارا پاسباں ہمالہ کھڑا
ہے۔ ہر سال دو چار آدمی ہمالہ پر چڑھ جاتے ہیں لیکن آمد و رفت
کا عام راستہ نہیں ہے۔ گیٹ وے آف انڈیا کی تعمیر سے
پہلے شہر کے کبوتروں کو رہائش کی بڑی تکلیف تھی۔ اب وہ آرام
سے ہیں۔ ویسے شہر میں ایک کبوتر خانہ بھی ہے۔ بمبئی کبوتروں
کی آبادی کے لحاظ سے بھی بڑا شہر ہے اور یہ پرندہ اب جدید افسانوں
میں بھی جگہ پا گیا ہے اسے بطور علامت استعمال کیا جاتا ہے۔ کلاسکی
ادب میں بھی کبوتر موجود ہیں لیکن یہ صرف کسی مست شباب کی
چال بتانے کے لیے لائے گئے تھے۔ اب ان کا مصرف کچھ
اور ہے۔ ادب کے رجحان ہمیشہ بدلتے رہے ہیں۔

بمبئی کا دوسرا مشہور گیٹ چرچ گیٹ ہے جو کہیں
نہیں ہے۔ گیٹ تو ایک طرف رہا اس کا شائبہ بھی کہیں نظر
نہیں آتا۔ یہ درِ توبہ کی طرح کا دروازہ ہے۔ چرچ کی مناسبت
سے اسے درِ توبہ ہی کہنا چاہیے۔ اعترافات اور توبہ میں زیادہ
فرق نہیں ہے۔ یہ دونوں چھوٹے بڑے مصرعے ہیں لیکن ہیں
ایک ہی بحر میں۔ کہتے ہیں کہ اس مقام کو چرچ گیٹ اس لیے

کہا جاتا ہے کہ لوگ یہاں پہنچ کر افغان چرچ کی سمت جا سکتے تھے۔ اس لیے چرچ گیٹ کو مرغِ قبلہ نما بھی کہا جا سکتا ہے۔ بہر حال ہمارا خیال ہے، ہندوستان بھر میں یہی ایک گیٹ ہے جو نہ ہوتے ہوئے بھی موجود ہے۔ سنا ہے ان کے گر ہے۔ کہاں ہے کدھر ہے۔ کا معاملہ ہے۔

ہم جب اپنے ملک کے دروازوں پر غور کر رہے تھے تو اچانک ہمیں خیال آیا کہ امریکہ میں بھی چند گیٹ ہیں جو نظر نہیں آتے ہیں۔ دو گیٹ جو حال حال میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچے ہیں، فنِ تعمیر کا نہیں فنِ تخریب کا نمونہ ہیں۔ یہ دونوں گیٹ ہیں واٹر گیٹ اور ایران گیٹ اور ان دونوں میں دو ہم قافیہ شخصیتیں زیرِ بحث رہی ہیں۔ یعنی نکسن اور ریگن۔ واٹر گیٹ اور ایران گیٹ دونوں سیاسی اور قیاسی گیٹ ہیں۔ ایک گیٹ سے نکسن سیاست اور قیادت کی دنیا سے بالکل ہی باہر چلے گئے۔ واٹر گیٹ کی خرابی یہی ہوتی ہے کہ اس راستے سے آدمی واپس نہیں آسکتا۔ وَن وے سسٹم میں یہی تکلیف ہوتی ہے۔ یک رُخی راستوں سے اُن ملکوں میں کوئی فرق نہیں پڑتا جہاں دو رُخی لوگوں کی بہتات ہوتی ہے۔ امریکہ کے ان دو دروازوں پر غور کرتے وقت ہمارا ذہن اس نکتے کی طرف بھی گیا کہ امریکہ میں ٹن، ٹن اور سن پر ختم ہونے والے نام بے حد مقبول ہیں خاص طور پر سن تو وہاں اس طرح پیدا ہوتے ہیں جس طرح ہمارے یہاں بیٹ سن پیدا ہوتا ہے ـــ چلتے چلتے ہم یہ ضرور عرض کرنا چاہیں گے کہ گو نکسن صاحب سے ہمارے کوئی ذاتی مراسم نہیں ہیں لیکن ہمیں بہر حال اُن سے ہمدردی ہے۔ اُنھیں خواہ مخواہ صدارت کی کرسی چھوڑنی پڑی۔ ایسے کتنے ہی واقعات کتنے ملکوں میں ہوتے ہیں (بلکہ اب تو ایسے واقعات کا نہ ہونا معیوب سمجھا جاتا ہے) لیکن وہاں کی کرسیوں اور کرسی نشینوں کو کوئی دھکا نہیں پہنچتا، استحکام پہنچتا ہے (پہنچے ہوئے لوگوں کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔)

ہندوستان میں اونچے اونچے دروازوں کے نیچے سے گزرنے کا شوق اتنا جڑ پکڑ گیا ہے کہ جب کسی بھی شہر میں کوئی اندرونی یا بیرونی بڑا آدمی درآمد کیا جاتا ہے تو اس کے قیام و طعام کے بندوبست سے پہلے اُس کے گزرنے کے لیے راستوں پر جگہ جگہ کمانیں بنائی جاتی ہیں۔ اس لیے کہ دروازے تو اتنی عجلت میں بن نہیں سکتے۔ ان کمانوں کو پھول پتّوں اور بیل بوٹوں سے سجایا جاتا ہے، کسی کمان کو کاغذی پیراہن عطا ہوتا ہے تو کسی کو طلسی لباس، بعض موقعوں پر تو اس آمد آمد کی تقریب کے سلسلے میں کمانیں اُگانے اور اُنھیں پروان چڑھانے کے لیے انعامات کا اعلان کر دیا جاتا ہے (غریبی دُور کرنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے) اس اعلان کے ہوتے ہی عوام میں مسابقت کا جذبہ اتنی شدّت سے اُبھر آتا ہے کہ وہ گھر گھر سے (زبردستی) چندہ وصول کر کے اپنے علاقے کی کمان بناتے ہیں۔ جو کوئی چندہ دینے سے انکار کرتا ہے، اُسے یہ انکار چندے سے بھی زیادہ مہنگا پڑتا ہے۔ کمان تو اچھی بن جاتی ہے لیکن جہاں تک انعام کا تعلق ہے، تیر نشانے پر نہیں لگتا کیونکہ انعام حاصل کرنے کے لیے جو تیر چاہیے وہ تیر بے کمان ہوتا ہے۔ اِن کمانوں کی پیشانی پر آنے والے مہمان کی درازیِ عمر کے لیے دعائیہ الفاظ (کبھی کبھی اشعار) لکھے ہوتے ہیں۔ خوش رنگ کپڑوں سے بنائے ہوئے بینرس پر خوش آمدید درج ہوتا ہے اور اس طرح فنِ خطّاطی اور فنِ خیاطی، دونوں فن، فنونِ لطیفہ کی حدوں کو چھونے لگتے ہیں ـــ جس مہمان کا استقبال صرف سرخ بانات سے ہوتا ہے وہ کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ اُس کی تشفی کے لیے کمانوں کا ہونا بے حد ضروری ہے ـــ مہمان کے چلے جانے کے فوری بعد ساری کمانیں مالِ غنیمت میں تبدیل ہو جاتی ہیں ـــ کاغذ کے پھول پتّوں کے اور کپڑوں کے بینرس برتنوں کے کام آتے ہیں۔

ہندوستان میں جس طرح دروازوں کو قبولِ عامّہ کی سند حاصل ہوئی تقریباً اُسی طرح سرنگیں بھی یہاں مقبول ہوئیں۔ لیکن سرنگوں کا معاملہ یہ تھا کہ دروازے زمین کے اوپر بنتے تھے اور سرنگیں زمین کے اندر۔ یہ اُن ترکاریوں کی طرح تھیں جو زیرِ زمیں پھلتی پھولتی ہیں۔ گڈّا گوبھی کی مانند دروازے پھول گوبھی تھے) سرنگوں کے ذکر پر ہمیں وہ سرنگ یاد آگئی جو دہلی کے شہنشاہ اکبر کے حکم سے انارکلی کو ہندوستان کی سرحد

سے باہر بھیجنے کے لیے تیار کی گئی تھی۔ اس کی داستان یوں ہے کہ جب شہنشاہ موصوف نے ہندوستان کے تخت اور اپنے بیٹے کی بہبودی کے پیش نظر شہزادہ سلیم کو انارکلی کے معاملے میں لہو ولعب سے کنارہ کش ہونے اور متذکرہ رقاصہ سے قطع تعلق کرنے کی ہدایت دی اور شہزادہ سلیم کی طرف سے حکم عدولی کا مظاہرہ ہوا تو احکام خسروی کی بنا پر رقاصہ مذکور کو دیوار میں زندہ چنوا دیا گیا۔ لیکن صرف بظاہر۔ درحقیقت اُسے اس کی ایستادہ قبر ہی میں بنی ہوئی ایک سرنگ کے ذریعے ہندوستان کی سرحد سے باہر روانہ کر دیا گیا (کشمیری گیٹ سے تو وہ لے جائی نہیں جا سکتی تھی)، اس سرنگ کا ذکر ہم نہ کرتے کیونکہ ہمارا موضوعِ تحقیق دروازے ہیں سرنگیں نہیں لیکن اس سرنگ میں بھی ایک دروازہ موجود تھا اور وہ تھا چور دروازہ۔

اب بڑے بڑے دروازے بنانے کا رواج اخلاق و آداب کے رواج کی طرح قصۂ پارینہ ہو چکا ہے۔ ان کی بجائے اب جگہ جگہ چور دروازے بن گئے ہیں۔ ان میں اگر ایک دروازے تک کسی کی رسائی ہو جاتی تو وہ چند ہی دنوں میں کہاں سے کہاں پہنچ سکتا ہے۔ ترقی کا صحیح راستہ اب چور دروازے ہی سے نکلتا ہے۔ اس چھوٹے سے دروازے سے نکل کر کسی شخص کو آپ آسمان کی بلندیوں پر جاتا دیکھ کر بس یہی پوچھیں گے: منزل ہے کہاں تیری لے لا[؟] [؟]رائی اور اس بھٹکے ہوئے راہی سے آپ کو کوئی جواب نہیں ملے گا کیونکہ اسے خود خبر نہ ہوگی کہ آگے چل کر اس کے ڈنکے بجیں گے یا بارہ بجیں گے۔

●●

تب اور اب

اورنگ زیب عالمگیر سنبھل مراد آباد کے علاقے میں کسی گاؤں کے پاس خیمہ زن تھے، جو گاؤں کے قاضی صاحب کا چپراسی بادشاہ کے نام سمن لے کر بارگاہ پر آیا۔ بادشاہ نے چپراسی کو بارگاہ میں بلا کر اپنے ہاتھ سے سمن لے کر پڑھا۔ لکھا تھا چونکہ گاؤں کا چودھری آپ پر ایک ہزار روپیہ بتاتا ہے لہٰذا کل دن کے دس بجے حاضر عدالت ہو کر جواب دہی کریں۔ دوسرے دن وقتِ مقررہ سے دو گھنٹے پہلے گاؤں کی کچہری میں بادشاہ پہنچے تو معلوم ہوا قاضی صاحب اپنے کھیت کو جوتنے کے لیے ہل بیل لے کر جنگل کو گئے ہیں۔ کچھ دیر بعد قاضی صاحب ہل اپنے کندھے پر رکھے بیل ہنکاتے آئے اور بادشاہ کو دیکھا تلوار ہاتھ میں لیے حاضر ہیں، قاضی صاحب اپنے زنانہ مکان میں گئے۔ نہا دھو کر عدالت کا لباس پہن شمشیرِ خارا شگاف ہاتھ میں لیے آئے اور سلام سنت الاسلام کے بعد مسندِ قضا پر بیٹھ کر فرمانے لگے۔

قاضی صاحب، "چپراسی، یہ اورنگ زیب مدّعا علیہ عدالتِ محمدی میں خلاف ضابطہ تلوار لے کر آیا ہے تلوار اس کے ہاتھ سے لے لو۔"

اورنگ زیب نے فوراً تلوار زمین پر رکھ دی اور چپراسی نے اٹھالی۔

مدّعی کا دعویٰ تھا کہ جب بادشاہ سلامت بادشاہ زادے تھے، تو شکار کھیلنے اس نواح میں تشریف لائے تھے، اور کسی ضرورت سے ہزار روپیے مجھ سے لیے تھے اور فرمایا تھا ڈیرے پر پہنچ کر بھجوا دوں گا۔ مگر دس برس ہونے آئے وہ روپے مجھے نہ ملے، اب جو حضور ادھر آئے تو میں نے دادخواہی کی۔

اورنگ زیب "مدّعی سچّا ہے۔ میں بھول گیا تھا، میں معافی چاہتا ہوں، یہ ہزار روپیہ حاضر ہے" عدالت نے روپیہ مدّعی کو دلوا دیے۔ مدّعی اپنا روپیہ لے کر چل دیا کچہری برخاست ہوئی اور قاضی صاحب اور بادشاہ رہ گئے۔

بادشاہ سلامت "کیوں قاضی صاحب آپ ہر روز عدالت میں تلوار لے کر آتے ہیں؟"

قاضی صاحب "نہیں بلکہ آج تمہارے دھمکانے کے لیے کہ بادشاہت کا گھمنڈ عدالت میں نہ کرو۔ مگر تم تلوار لے کر عدالت میں کیوں آئے تھے؟"

اورنگ زیب "اس لیے کہ اگر تم میرے ڈر سے مقدمہ ٹھیک نہ کرو تو تلوار سے تمہارا سر کاٹ لیا جائے۔"

سیّد ناصر نذیر فراق (لال قلعے کی ایک جھلک)

غزلیں

سکھدیو شرما رشک

واردات عشق کی تحریر ہے میری غزل
عمر بھر کے خواب کی تعبیر ہے میری غزل
آفتابِ حُسن کی تنویر ہے میری غزل
چہرۂ محبوب کی تصویر ہے میری غزل

دل کا آئینہ کہو کہ عکسِ فکر و غم اسے
شدتِ جذبات کی تصویر ہے میری غزل

اس کے ہر اک شعر میں تعظیم ہے اصنام کی
عاشقانِ دہر کی توقیر ہے میری غزل

اک لڑی ہے موتیوں کی پیار سے گوندھی ہوئی
منتخب الفاظ کی زنجیر ہے میری غزل

بالیقیں ہے سادگی و پختگی اس کا کمال
فکر کی بنیاد پر تعمیر ہے میری غزل

خاندانِ جوش کی میراث ہے اردو زباں
داغ کی بخشی ہوئی جاگیر ہے میری غزل

غور سے اس کو پڑھو تو رشک یہ کھل جائے گا
کتنی دلکش اور پُر تاثیر ہے میری غزل

پرکاش تیواری

حوصلے اُڑنے کے جواں بہت ہیں
پَر نہیں، ورنہ آسماں بہت ہیں

پیار کی ناؤ ہے شکستہ تو کیا
غم کی موجیں رواں دواں بہت ہیں

غم کے مارے مسافروں کی خاطر
سوکھے پیڑوں کے سائباں بہت ہیں

میرے ہی نام کی کوئی نہیں اینٹ
ورنہ اس شہر میں مکاں بہت ہیں

بڑھ کے تلوار سے ہے وار ان کا
یہ جو الفاظ بے زباں بہت ہیں

تیری دیوار کے جو سائے میں ہیں
اپنے گھر میں وہ بے اماں بہت ہیں

دل و جاں اُس کی راہ میں لٹا کر
ہم تو پرکاش شادماں بہت ہیں

○

(گزشتہ سے پیوستہ)

"... اب میرے ساتھ ساتھ وہ خوشبو سفر میں ہے
آنگن میں اس کے تھا کوئی پودا گلاب کا!"

تذکرہ گلابوں کا

ابوشعیب احسن

اس مضمون کی پہلی قسط کے صفحہ نمبر ۵، کالم نمبر ۲ کی اس لائن کو "انسانوں کے جدِ امجد کی تاریخ اس دنیا میں بمشکل پچیس لاکھ سال پرانی ہے۔" یوں پڑھیے "انسانوں کے جدِّ امجد کی تاریخ اس دنیا میں ڈھائی لاکھ سال سے کچھ زیادہ پرانی ہے۔"

جیسا کہ پچھلی قسط میں وعدہ کیا گیا تھا کہ آئندہ قسط میں گلاب کے باغات اور ان کی نوع و نسل کا تذکرہ کیا جائے گا لہٰذا اس موضوع پر ہم اپنی معلومات پیش کر رہے ہیں۔

گلابوں کے شہرہ آفاق باغات

دنیا کے مختلف حصّوں میں گلابوں کے بہت سے مشہور باغات ہیں جن کو دیکھ کر انسان سحر زدہ ہو جاتا ہے اور ان کی یاد برسوں ذہن کو رنگ و خوشبو کے مناظر سے لطف اندوز کرتی رہتی ہے۔ غالباً دنیا کا سب سے مشہور گلابوں کا باغ پیرس میں بوائس ڈی بولون BOIS DE BOULOGNE کے اندر بگاٹیلے BAGATELLE ہے دوسرا باغ "روزیری ڈی لاہے" ROSERAIC DE LHAY ہے جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یورپ میں گلابوں کی جتنی قسمیں پائی جاتی ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر یہاں موجود ہیں۔ پارک لاگرینج (PARC LA GRANGE) گلابوں کا باغ جو جینوا میں ہے، بہت زیادہ مشہور ہے۔ یہ باغ ۱۹۳۶ء میں قائم کیا گیا تھا اور اس میں گلاب کے بارہ ہزار پودے ہیں۔ یہ ایک جھیل کے کنارے لگایا گیا ہے اور رات کے وقت بجلی کے قمقموں سے جگمگا جاتا ہے۔ گلاب کے تختوں اور جھاڑیوں کے ارد گرد رقص و موسیقی کی محفل سجائی جاتی ہے اور کبھی کبھی فیشن کی نمائش بھی ہوتی ہے۔ لندن میں ریجنٹس پارک REGENTS PARK کے اندر "کوین میری روز گارڈن" QUEEN MARY ROSE GARDEN بہت مشہور ہے اور برطانیہ کے شہر آئر (EIR) میں رسبورو RUSSBOROUGH اپنی خوبصورتی کے لیے بہت مشہور ہے۔ اسپین کے دارالخلافہ میڈرڈ میں پارکو ڈل کوئسٹ PARCO DEL QUEST کے اندر گلابوں کا جو باغ ہے وہ گلاب کے کنج اور سرنگوں کے لیے مشہور ہے۔ امریکہ میں گلاب کے جس باغ کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہے وہ امریکہ کی ریاست آریگان OREGON میں پورٹ لینڈ پر واقع ہے۔ گلاب کے دوسرے مشہور باغات میں ریاست کنیکٹیکٹ (CONNECTICUT) میں ہارٹ فورڈ کا "الزبیتھ پارک"، لاس اینجلس میں ڈیس کانسو باغ — DES CANSO GARDEN اور ٹکساس کا ٹائلر میونسپل گارڈن، TYLAR MUNICIPAL GARDEN شامل ہے ہندوستان میں اتنے شاندار باغات نہیں ہیں لیکن بلا شبہ کچھ باغات قابلِ ذکر ضرور ہیں مثلاً پٹیالہ کے مہاراجہ کا گلابوں کا باغ اور چنڈی گڑھ

یں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے نام پر ذاکر روز گارڈن جو سولہ ایکڑ قطعے پر پھیلا ہوا ہے۔ حال ہی میں منعقد جنگ نئی دہلی میں قومی گلاب باغ کی بنیاد ہندوستان کی گلاب سوسائٹی نے رکھی ہے۔

گلابوں کی درجاتی تقسیم

گلابوں کی ہزارہا انواع و اقسام پائی جاتی ہیں ان قسموں کی بنیاد خصوصی طور پر محض آٹھ نسلوں پر ہے اس کے علاوہ مزید سات نسلیں ایسی ہیں جو گلابوں کو رنگا رنگ بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں اور بنیادی خصوصیات میں تبدیلی پیدا کرتی ہیں اور دو یا چار مختلف خصوصیات کو مختلف پودوں میں یکجا کرنے میں معاون ہوتی ہیں۔

خود رو گلاب

پچھلے شمارے میں ہم گلابوں کی نوع و نسل کی مجموعی تعداد کا ذکر کر چکے ہیں جو ساری دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں گلابوں کی نسل جو خود رو شکل میں پائی جاتی ہے ان کی مجموعی تعداد دس ہے جو حسب ذیل ہیں:

(۱) روزا کلینوفلا (ROSA CLINOPHYLLA) یہ نسل مضبوط، سیدھی یا آدھی بیل جھاڑی کی شکل میں پائی جاتی ہے۔ اس کے پھول سفید ہوتے ہیں پھول ایک شاخ پر ایک یا گچھے کی شکل میں کھلتا ہے اس کا پھول گولائی لیے ہوئے پیلا اور روئیں دار ہوتا ہے۔ یہ پورے ہندوستان میں پایا جاتا ہے خاص طور سے بنگال کے میدانی علاقوں میں، ندی نالوں کے یا دلدلی زمین کے قریب پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے گرم علاقوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

(۲) روزا اگلینٹیریا۔ خوشبودار بریر (ROSA EGLANTERIA) LINN SWEET BRIAR یہ بہت زیادہ پتیوں والا چھوٹی جھاڑی کا پودا ہے۔ پھول گلابی رنگ کا ہوتا ہے پھول ایک سے تین تک ایک شاخ پر کھلتے ہیں۔ اس کا پھل گول اور قرمزی رنگ کا ہوتا ہے یہ عام طور پر گلگت کے شمال میں ہمالیائی علاقوں میں پایا جاتا ہے اس کے علاوہ کشمیر اور مغربی تبت میں بھی ملتا ہے۔

(۳) روزا فوئیٹڈا (ROSA FACTIDA) یہ متوسط قد کی سیدھی جھاڑی کی شکل میں پایا جاتا ہے تیز خوشبو والا زرد رنگ کا پھول ہوتا ہے عام طور سے ایک یا دو تین پھول ایک شاخ پر کھلتے ہیں۔ پھل سرخ رنگ کا گول ہوتا ہے۔ یہ کم زرخیز مٹی میں بھی اچھی طرح پروان چڑھتا ہے ہندوستان کے علاوہ دوسرے ایشیائی ملکوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

(۴) روزا جیگینٹیا (ROSA GIGANTEA) یہ اوپر چڑھنے والی بیل کا پودا ہے جس کے کانٹے موٹے اور مڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کے پھول سفید یا زرد رنگ کے خوشبودار ہوتے ہیں۔ عام طور پر ایک شاخ پر ایک پھول پایا جاتا ہے۔ اس کا پھل ناشپاتی کی شکل کا ہوتا ہے جس کا رنگ زرد یا نارنجی ہوتا ہے یہ برما سے لے کر سکم تک کے علاقے میں پایا جاتا ہے۔

(۵) روزا لیشے نالٹیانا (ROSA LESCHENAULTIANA) بیل کی شکل میں پایا جاتا ہے اس کی شاخیں بنفشی رنگ کی ہوتی ہیں جن میں چھوٹے مڑے ہوئے کانٹے پائے جاتے ہیں۔ گلابی رنگ کے بڑے خوشبودار پھول چھوٹے گچھوں کی شکل میں کھلتے ہیں۔ اس کے پھل سرخ اور کھردرے، گولائی لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ مغربی گھاٹ، نیلگری ہل اور پالنی پہاڑیوں پر تین ہزار دو سو اسی فٹ کی بلندی پر پایا جاتا ہے۔

(۶) روزا لانگی کسپس (ROSA LONGICUSPIS) یہ سدا بہار بیل کی شکل میں پایا جاتا ہے شاخوں پر دور دور کانٹے ہوتے ہیں۔ اس کے سفید پھول گچھوں میں کھلتے ہیں۔ گول پھل زرد یا گہرے سرخ رنگ کے ہوتے ہیں۔ پہاڑیوں پر پایا جاتا ہے۔

(۷) روزا میکروفلا (ROSA MACROPHYLLA) یہ کھڑی جھاڑی کی شکل میں پایا جاتا ہے گلابی پھول اکیلے یا گچھوں میں کھلتے ہیں۔ ہندوستان کی شمالی پہاڑیوں میں چار ہزار دو سو پینسٹھ سے لے کر دس ہزار آٹھ سو پچیس فٹ تک کی بلندی پر پایا جاتا ہے۔ مغرب میں پاکستان اور مشرق میں سکم تک اور چین میں بھی یہ نسل پائی جاتی ہے۔

(۸) روزا موسشاٹا (ROSA MOSCHATA) بیل کی نسل کا پودا ہے۔ یہ کانٹے دار ہوتا ہے اور سفید خوشبو والے پھول گچھوں کی شکل میں کھلتے ہیں۔ پھل بھورے رنگ کا ہوتا ہے۔ یہ ہمالیہ کے ترائی کے علاقوں میں تین ہزار دو سو اسی سے لے کر پندرہ ہزار چار سو بیس فٹ تک کی بلندی پر پایا جاتا ہے۔ یورپ میں بھی یہ نسل پائی جاتی ہے۔

(گزشتہ سے پیوستہ)

"...اب میرے ساتھ ساتھ وہ خوشبو سفر میں ہے
آنگن میں اس کے تھا کوئی پودا گلاب کا"

تذکرہ گُلابوں کا

ابوشعیب احسن

اس مضمون کی پہلی قسط کے صفحہ نمبر ۵۵، کالم نمبر ۲ کی اس لائن کو "انسانوں کے جدِّ امجد کی تاریخ اس دنیا میں بمشکل پچیس لاکھ سال پرانی ہے۔" یوں پڑھیے "انسانوں کے جدِّ امجد کی تاریخ اس دنیا میں ڈھائی لاکھ سال سے کچھ زیادہ پرانی ہے۔"

جیساکہ پچھلی قسط میں وعدہ کیا گیا تھا کہ آئندہ قسط میں گلاب کے باغات اور ان کی نوع و نسل کا تذکرہ کیا جائے گا لہٰذا اس موضوع پر ہم اپنی معلومات پیش کر رہے ہیں۔

گلابوں کے شہرۂ آفاق باغات

دنیا کے مختلف حصّوں میں گلابوں کے بہت سے مشہور باغات ہیں جن کو دیکھ کر انسان سحر زدہ ہو جاتا ہے اور ان کی یاد برسوں ذہن کو رنگ و خوشبو کے مناظر سے لطف اندوز کرتی رہتی ہے۔
غالبًا دنیا کا سب سے مشہور گلابوں کا باغ پیرس میں بوائس ڈی بولون BOIS DE BOULOGNE کے اندر بگاٹیلے BAGATELLE ہے دوسرا باغ "روزیری ڈی لاہے" ROSERAIC DE LHAY ہے جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یورپ میں گلابوں کی جتنی قسمیں پائی جاتی ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر یہاں موجود ہیں۔ پارک لاگرینج (PARC LA GRANGE) گلابوں کا باغ جو جینوا میں ہے، بہت زیادہ مشہور ہے۔ یہ باغ ۱۹۴۶ء میں قائم کیا گیا تھا اور اس میں گلاب کے بارہ ہزار پودے ہیں۔ یہ ایک جھیل کے کنارے لگایا گیا ہے اور رات کے وقت بجلی کے قمقموں سے جگمگ جاتا ہے۔ گلاب کے تختوں اور جھاڑیوں کے اِردگرد رقص و موسیقی کی محفل سجائی جاتی ہے اور کبھی کبھی فیشن کی نمائش بھی ہوتی ہے۔ لندن میں ریجنٹس پارک REGENTS PARK کے اندر "کوین میری روز گارڈن" QUEEN MARY ROSE GARDEN بہت مشہور ہے۔ اور برطانیہ کے شہر آئر (EIR) میں رسبورو SSBOROUGH اپنی خوبصورتی کے لیے بہت مشہور ہے۔ اسپین کے دارالخلافہ میڈرڈ میں پارکو ڈل کوئسٹ PARCO DEL QUEST کے اندر گلابوں کا جو باغ ہے وہ گلاب کے کنج اور سرنگوں کے لیے مشہور ہے۔ امریکہ میں گلاب کے جس باغ کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہے وہ امریکہ کی ریاست آریگان OREGON میں پورٹ لینڈ پر واقع ہے۔ گلاب کے دوسرے مشہور باغات میں ریاست کنیکٹیکٹ (CONNECTICUT) میں ہارٹ فورڈ "الزبیتھ پارک"، لاس اینجلس میں ڈیس کانسو باغ DES CANSO GARDEN اور ٹکساس کا ٹائلر میونسپل گارڈن TYLAR MUNICIPAL GARDEN شامل ہے۔ ہندوستان میں اتنے شاندار باغات نہیں ہیں لیکن بلاشبہ کچھ باغات قابلِ ذکر ضرور ہیں مثلاً پٹیالہ کے مہاراجہ کا گلابوں کا باغ اور چنڈی گڑھ

میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے نام پر ذاکر روز گارڈن جو سولہ ایکڑ قطعے پر پھیلا ہوا ہے۔ حال ہی میں صفدر جنگ نئی دہلی میں قومی گلاب باغ کی بنیاد ہندوستان کی گلاب سوسائٹی نے رکھی ہے۔

گلابوں کی درجاتی تقسیم

گلابوں کی ہزارہا انواع واقسام پائی جاتی ہیں ان قسموں کی بنیاد خصوصی طور پر محض آٹھ نسلوں پر ہے اس کے علاوہ مزید سات نسلیں ایسی ہیں جو گلابوں کو رنگارنگ بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں اور بنیادی خصوصیات میں تبدیلی پیدا کرتی ہیں اور دو یا چار مختلف خصوصیات کو مختلف پودوں میں یکجا کرنے میں معاون ہوتی ہیں۔

خودرو گلاب

پچھلے شمارے میں ہم گلابوں کی نوع و نسل کی مجموعی تعداد کا ذکر کر چکے ہیں، جو ساری دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں گلابوں کی نسل جو خودرو شکل میں پائی جاتی ہے ان کی مجموعی تعداد دس ہے جو حسب ذیل ہیں:

(۱) روزا کلینوفلا (ROSA CLINOPHYLLA) یہ نسل مضبوط، سیدھی یا آدھی بیل جھاڑی کی شکل میں پائی جاتی ہے۔ اس کے پھول سفید ہوتے ہیں۔ پھول ایک شاخ پر ایک یا گچھے کی شکل میں کھلتا ہے اس کا پھول گولائی لیے ہوئے پیلا اور روئیں دار ہوتا ہے۔ یہ پورے ہندوستان میں پایا جاتا ہے خاص طور سے بنگال کے میدانی علاقوں میں، ندی نالوں کے یا دلدلی زمین کے قریب پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے گرم علاقوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

(۲) روزا اگلینٹیریا۔ خوشبودار بریر ROSA EGLANTERIA یہ بہت زیادہ پتیوں والا چھوٹی جھاڑی کا LINN: SWEET BRIAR پودا ہے۔ پھول گلابی رنگ کا ہوتا ہے پھول ایک سے تین تک ایک شاخ پر کھلتے ہیں۔ اس کا پھل گول اور قرمزی رنگ کا ہوتا ہے۔ یہ عام طور پر گلگت کے شمال میں ہمالیائی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کشمیر اور مغربی تبت میں بھی ملتا ہے۔

(۳) روزا فوئیٹیڈا (ROSA FACTIDA) یہ متوسط قد کی سیدھی جھاڑی کی شکل میں پایا جاتا ہے تیز خوشبو والا زرد رنگ کا پھول ہوتا ہے عام طور سے ایک یا دو تین پھول ایک شاخ پر کھلتے ہیں۔ پھل سرخ رنگ کا گول ہوتا ہے۔ یہ کم زرخیز مٹی میں بھی اچھی طرح پروان چڑھتا ہے ہندوستان کے علاوہ دوسرے ایشیائی ملکوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

(۴) روزا جیگینٹیا (ROSA GIGANTEA) یہ اوپر چڑھنے والی بیل کا پودا ہے جس کے کانٹے موٹے اور مڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کے پھول سفید یا زرد رنگ کے خوشبودار ہوتے ہیں۔ عام طور پر ایک شاخ پر ایک پھول پایا جاتا ہے۔ اس کا پھل ناشپاتی کی شکل کا ہوتا ہے جس کا رنگ زرد یا نارنجی ہوتا ہے یہ برما سے لے کر سکم تک کے علاقے میں پایا جاتا ہے۔

(۵) روزا لیشنے نالٹیانا (ROSA LESCHENAULTIANA) بیل کی شکل میں پایا جاتا ہے اس کی شاخیں بنفشئی رنگ کی ہوتی ہیں جن میں چھوٹے مڑے ہوئے کانٹے پائے جاتے ہیں۔ گلابی رنگ کے بڑے خوشبودار پھول چھوٹے گچھوں کی شکل میں کھلتے ہیں۔ اس کے پھل سرخ اور کھردرے، گولائی لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ مغربی گھاٹ، نیلگری ہل اور پالنی پہاڑیوں پر تین ہزار دو سو اسّی فٹ کی بلندی پر پایا جاتا ہے۔

(۶) روزا لانگی کسپس (ROSA LONGICUSPIS) یہ سدا بہار بیل کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ شاخوں پر دور دور کانٹے ہوتے ہیں۔ اس کے سفید پھول گچھوں میں کھلتے ہیں۔ گول پھل زرد یا گہرے سرخ رنگ کے ہوتے ہیں۔ پہاڑیوں پر پایا جاتا ہے۔

(۷) روزا میکروفلا (ROSA MACROPHYLLA) یہ کھڑی جھاڑی کی شکل میں پایا جاتا ہے گلابی پھول اکیلے یا گچھوں میں کھلتے ہیں۔ ہندوستان کی شمالی پہاڑیوں میں چار ہزار دو سو پینسٹھ سے لے کر دس ہزار آٹھ سو پچیس فٹ تک کی بلندی پر پایا جاتا ہے مغرب میں پاکستان اور مشرق میں سکم تک اور چین میں بھی یہ نسل پائی جاتی ہے۔

(۸) روزا موسشاٹا (ROSA MOSCHATA) بیل کی نسل کا پودا ہے۔ یہ کانٹے دار ہوتا ہے اور سفید خوشبو والے پھول گچھوں کی شکل میں کھلتے ہیں۔ پھل بھورے رنگ کا ہوتا ہے۔ یہ ہمالیہ کے ترائی کے علاقوں میں تین ہزار دو سو اسّی سے لے کر پندرہ ہزار چار سو بیس فٹ تک کی بلندی پر پایا جاتا ہے۔ یورپ میں بھی یہ نسل پائی جاتی ہے۔

(۹) روزا سیری سیار (ROSA SERICEA) جھاڑی کی شکل میں پایا جاتا ہے شاخیں کانٹے دار ہوتی ہیں۔ پھول ہلکے پیلے رنگ کے ہوتے ہیں۔ ایک شاخ پر تنہا کھلتا ہے۔ جنگلی گلابوں میں پانچ پنکھڑیاں پائی جاتی ہیں لیکن اس میں صرف چار پنکھڑیاں ہوتی ہیں۔ پھل چمک دار سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔ ہمالیہ کے ٹھنڈے ترائی کے علاقوں میں پایا جاتا ہے کمایوں سے مشرق میں سکم، بھوٹان، منی پور، آسام سے برما کے علاقوں میں نو ہزار آٹھ سو چالیس فٹ سے لے کر پندرہ ہزار چار سو بیس فٹ تک کی بلندی پر اگتا ہے۔

(۱۰) روزا ویبیانا (ROSA WEBBIANA) یہ اوسط اونچائی کی کھڑی جھاڑی کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ گلابی پھول تنہا یا چھوٹے گچھوں میں کھلتے ہیں۔ پھل زردی مائل سرخ فلاسک نما ہوتا ہے یہ ہمالیہ کے اندرونی خشک حصوں میں ... ۱ فٹ سے لے کر ۱۲۰۰ فٹ تک کی بلندی پر پایا جاتا ہے۔ لداخ میں یہ نوع بہت عام ہے۔

کاشت کیے جانے والے گلاب

دنیا کے باغات میں جن گلابوں کی کاشت ہوتی ہے ان کو بنانے میں گلاب کی حسب ذیل آٹھ نسلوں نے بہت اہم رول ادا کیا ہے، ان کے علاوہ سات یا آٹھ اور نسلیں ہیں مگر ان کا رول اتنا اہم نہیں ہے جتنا نیچے بیان کی ہوئی نسلوں کا:

(۱) چینی گلاب ROSA CHINENSIS (INDIA))

یہ چین میں پایا جاتا تھا اور یورپ میں اس کا تعارف ۱۷۶۸ء میں ہوا۔ اس کے پھول کی پنکھڑیاں بہت ہوتی ہیں۔ پھول سرخ سے لے کر تقریباً سفید رنگ تک کا ہوتا ہے، گچھے کی شکل میں کھلتا ہے۔ پھل بیضوی شکل کا ہوتا ہے۔ اونچائی ڈھائی سے لے کر تین فٹ تک ہوتی ہے۔

(۲) روزا دمسینا، دمشقی گلاب ROSA DAMASCENA

یہ ایشیا کے کوچک کا گلاب ہے جس کا ذکر ورجل نے ۵۰ ق م میں کیا۔ یہ پندرھویں صدی عیسوی میں یورپ میں لایا گیا۔ اس کے پھول میں ۱۸ یا اس سے زیادہ پنکھڑیاں ہوتی ہیں۔ رنگ سرخ یا گلابی ہوتا ہے۔ گچھوں کی شکل میں کھلتا ہے اور خوشبودار ہوتا۔ پھل بڑا، بیضوی اور قرمزی رنگ کا ہوتا ہے۔ اونچائی آٹھ فٹ تک ہوتی ہے۔ یہ سخت جان گلاب تیز خوشبو والا ہے۔ اس قدیمی گلا اور اس کی قسموں کا ذکر بہت پرانی کتابوں میں ملتا ہے اور اکثر کی تصویریں بھی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔

(۳) روزا فوئٹیڈا (لوتیا) آسٹرین برائر

OSA FOETIDA (LUTEA) AUSTRIAN BRIAR

تفصیل اوپر بیان ہوئی

(۴) روزا گلیکا (پراونشیلس) فرانسیسی گلاب

SA GALLICA (PROVINCIALIS) FRENCH ROSE

یہ قدیمی گلاب یورپ اور مغربی ایشیا میں پایا جاتا ہے بڑے ہوتے ہیں۔ پانچ پنکھڑیوں کے یا بارہ سے زیادہ پنکھڑیاں ہیں۔ گہرے سرخ رنگ کا پھول ہوتا ہے جو کہ پورا کھلا ہوا ہوتا اور ایک شاخ پر تنہا پایا جاتا ہے۔ یہ پھول خوشبودار ہوتا ہے بڑے گول اور سرخ رنگ کے ہوتے ہیں۔ اونچائی ڈھائی سے۔ چار فٹ تک ہوتی ہے۔ سیدھی جھاڑی کی شکل میں پایا جاتا۔

(۵) روزا جیگنیٹیا

SA GIGANTEA COLLETT SYN ROSA [illegible]ARATA

تفصیل اوپر دی جا چکی ہے

(۶) روزا مشاٹا مشکی گلاب

OSA MOSCHTA (HERRM)

تفصیل اوپر آ چکی ہے

(۷) روزا ملٹی فلورا (پولینتھا) جاپانی گلاب

A MULTIFLORA (POLYANTHA) JAPANESE ROSE

یہ جاپان اور کوریا کا گلاب ہے۔ اس کا تعارف یورپ میں [illegible] میں ہوا۔ بڑے گچھوں میں کھلنے والا چھوٹا پھول سفید رنگ کا ہو پانچ پنکھڑیاں ہوتی ہیں۔ یہ بہت خوشبودار ہوتا ہے۔ پھل چھوٹا سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔ اونچائی آٹھ فٹ تک ہوتی ہے۔ یہ بہت تیز بڑھنے والا سیدھا پودا ہے۔ یہ پودا بہت سخت جان ہوتا ہے۔ گلا

"... اگر ہم روز مرّہ پیش آنے والی کچھ چھوٹی
چھوٹی باتوں کا خیال رکھیں تو ہم شہر کے شور
کو کم کر سکتے ہیں اور اس کے مضر اثرات
سے محفوظ رہ سکتے ہیں ..."

پُرشور ماحول۔ دماغی اور جسمانی صحت کا دشمن

محمد خلیل

آج ہم سائنسی دور سے گزر رہے ہیں اور اپنی روز مرّہ کی زندگی میں مختلف کاموں کے لیے مشین سے مدد لے رہے ہیں لیکن یہی مشینیں شور اور دھواں اگل کر ہماری صحت کو خراب کر رہی ہیں۔ عام آدمی کسی طرح اِن کے مضر اثرات سے بچ سکتا ہے لیکن وہ لوگ جو کارخانوں میں کام کرتے ہیں، مشینیں موٹریں، ریل اور جہاز چلاتے ہیں، اُن پر اس آلودگی کا براہِ راست نقصاندہ اثر پڑتا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ شور کے مضر اثرات آج ہمارے لیے کوئی نامعلوم چیز نہیں لیکن لوگوں کا خیال اس طرف نہیں جاتا۔ اٹلی کے سائنسداں رمجینی نے آج سے تقریباً تین صدی قبل اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ شور سے مزدوروں کے کانوں کے علاوہ ان کا قلب، دماغ، جسمانی نسیں اور معدہ بھی اثر پذیر ہوتا ہے یہی نہیں بلکہ کارخانوں میں ہونے والے کئی حادثات کی وجہ بھی شور ہی ہے۔ اور آج کارخانوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اِس کے ساتھ آبادی اور آبادی کے ساتھ ٹرانسپورٹ بھی بڑھ رہا ہے یہ سب مل کر ہمارے ماحول کو پُرشور بنا رہے ہیں اور ضرر رسانی میں اضافہ کر رہے ہیں۔

شور کی وجہ سے مزدوروں کی کام کرنے کی قوّت بھی مسلسل کم ہو رہی ہے۔ شور کی وجہ سے خون کے خلیوں، انگلیوں، انگوٹھوں اور جلد کے مختلف حصّوں پر برا اثر پڑتا ہے۔ شور سے آنکھوں کی باریک نسیں اور پتلی بھی متاثر ہو سکتی ہے اور یہ تیزی سے پھیل سکتی ہے بینائی کم ہونے اور آنکھ کی روشنی جانے کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ شور کے اثر سے دماغی نسیں مفلوج ہو سکتی ہیں۔ آج دنیا میں لاکھوں بچے مفلوج پیدا ہوتے ہیں سائنسدانوں کا خیال ہے کہ اس کی ایک خاص وجہ فضائی آلودگی اور پرشور ماحول ہے۔ لیکن اس کے باوجود بڑے شہروں میں رہنے والے بہت کم لوگ ان خطرات کو محسوس کرتے ہیں۔ سڑکوں پر مختلف جگہوں پر لاؤڈ اسپیکر کی آواز گونجتی رہتی ہے خاص طور پر پان کی دکانوں پر ریڈیو پوری آواز سے کھلے رہتے ہیں اب ایسی کچھ دکانیں بھی آپ کو مل جائیں گی جہاں ریڈیو کی جگہ ٹی وی اسی کام کو انجام دے رہے ہیں۔ شاید اس وقت ہم اِس حقیقت سے واقف نہیں ہوتے کہ یہ شور ہمارے قلب، دماغ اور ہمارے پورے جسمانی نظام پر کس قدر نقصان دہ اثر ڈالتا ہے۔ کئی ایسی جگہوں پر جہاں گاڑی کے ہارن کو بجانے کی ضرورت نہیں ہے وہاں بھی لوگ ہارن بجاتے ہیں۔ اگر ہم روز مرہ پیش آنے والی اِن چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھیں تو ہم شہر کے شور کو کم کر سکتے ہیں اور اس کے مضر اثرات سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

شور کی اِکائی کو ڈیسی بل کا نام دیا گیا ہے جسے مخفف طور پر ڈی بی لکھتے ہیں۔ پانچ ڈی بی کی آواز بہت دھیمی ہوتی

ہے۔ جبکہ ۱۰۰ ڈی بی کی آواز الٹا اثر رکھتی ہے زیادہ تیز آواز کے
متعلق ابھی تک سارے ماہرین کی رائے ایک جیسی ہے اور وہ بخوبی
واقف ہیں کہ ۸۵ ڈی بی سے اوپر کی آواز کے اثرات کافی وقت
تک رہیں تو انسان بہرا ہو سکتا ہے۔ کچھ سائنسدانوں کا یہ بھی خیال
ہے کہ ۱۳۵ ڈی بی سے زیادہ تیز آواز کو سننے سے قطعی گریز کرنا
چاہیے۔ سائنس دانوں نے چوہوں پر اس کا تجربہ کیا۔ ۱۲۰ ڈی بی
سے زیادہ تیز آواز حاملہ خواتین اور جسم میں پرورش پا رہے بچے
پر بھی مضر اثر ڈالتی ہے۔ ان وجوہ کے پیشِ نظر کئی ممالک نے شور
کی آخری حد ۷۵ ڈی بی اور ۸۵ ڈی بی کے درمیان طے کی ہے۔
دنیا کے کئی ممالک نے شور کے ان مضر اثرات کو روکنے کے لیے
کچھ اہم قدم اٹھائے ہیں۔ مثلاً انگلینڈ نے شور پر قابو پانے کے
لیے قانون بنائے ہیں، روس میں شور کو جذب کرنے والے آلات
اور کانوں کو محفوظ رکھنے والے آلات کا استعمال بہت عام ہو گیا ہے۔

آپ کہیں گے ہمیں شور سے کوئی پریشانی نہیں ہے لیکن
ماہرین کا خیال ہے کہ خواہ ہمیں اس کا شعور ہو یا نہ ہو ہم شور سے
متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ مثال کے طور پر عام بات چیت
اوسطاً ۴۰ ڈیسی بل کی ہوتی ہے اور ایک کاروباری دفتر میں
عام طور پر پچاس ڈیسی بل کا شور ہوتا ہے لیکن بڑے دفتروں
میں ۷۰ ڈیسی بل تک پہنچ جاتا ہے۔

عام خیال ہے کہ ہم جسمانی اور دماغی نظام کو شور کے
مطابق ڈھال نہیں سکتے بار بار ہونے والی آوازوں سے خواہ
ہم کتنا ہی مانوس کیوں نہ ہوں وہ کبھی اثر انداز ہوئے بغیر نہیں
رہ سکتیں اگر آپ سو رہے ہیں تو آواز کی لہریں اعصاب پر اثر
انداز ہو کر آپ کو چونکا دیتی ہیں اور آپ راحت میں خلل محسوس
کرتے ہیں۔ مشین کا زیادہ آواز کرنا اُس کی خرابی کی وجہ سے ہے۔
موٹر کے ہارن کو بھی کم شور والا بنایا جا رہا ہے۔ ایسے ہارن تیار کیے
جا رہے ہیں جن میں صرف پانچ ڈیسی بل کی آواز ہوتی ہے۔ ایک
دوسری ہمت افزا بات بھی سامنے آئی ہے اور وہ یہ ہے کہ فیکٹریوں،
دفاتر اور گھروں میں ایسا میٹریل استعمال کیا جا رہا ہے جو شور کو جذب
کر لیتا ہے۔ شور کے جائزے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ٹریفک کی گاڑیوں
کا شور سب سے پہلے نمبر پر آتا ہے اور قابلِ اعتراض آوازوں میں
پہلا نمبر بلند آواز ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا ہے۔ آج کل ٹیپ ریکارڈر
اور ٹرانسسٹر کو بلند آواز سے بجانے کی جو وبا چل نکلی ہے اور
اس سے جو شور وغل پیدا ہوتا ہے وہ مختلف اقسام کی اعصابی
بیماریوں کا سبب بن رہا ہے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ سب سے پہلے آپ خود یہ غور
کریں کہ شور پیدا کرنے والی آوازوں میں آپ کس قدر حصہ لے
رہے ہیں مثال کے طور پر کیا آپ ضرورت سے زیادہ تیز آواز
میں تو بات چیت نہیں کرتے کیا آپ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پوری
آواز سے بجاتے ہیں؟ کیا آپ نے شور والی مشینیں تو نہیں لگا رکھ
ہیں؟ کیا آپ موٹر کا ہارن اُسی وقت بجاتے ہیں جب اُس کی شد
ضرورت ہوتی ہے؟ اگر ایسا ہے تو یقیناً آپ قصداً ایسا نہیں کر
ہیں بلکہ اس کی وجہ آپ کی ناواقفیت ہے۔

کارخانوں میں ہونے والے شور کو کم کرنے کے لیے کچھ لوگ
سائیلنسر لگاتے ہیں۔ ویلڈنگ سے ہونے والے شور کو کم کر
کے لیے ریویٹنگ عمل کو بڑھا کر شور کم کیا جا سکتا ہے۔ اسی ط
دھاتوں پر ہائی اسپیڈ پالیشنگ کے دوران پیدا ہونے والے
کو کیمیائی صفائی کرکے کم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ عام مشینو
وقتاً فوقتاً صفائی کرکے تیل اور گریز دینا چاہیے اس سے مشین
مزید شور کو کم کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی پرزہ گھس گیا ہو تو اُ
فوری طور پر تبدیل کر دینا چاہیے کیوں کہ گھسے پرزوں کی مشی
زیادہ شور کرتی ہیں۔

سائنس داں تھامس ایڈیسن نے ایک موقعے پر یہ کہا
کہ شہروں کا شور لازمی طور پر بڑھتا جائے گا جس کا نتیجہ یہ
کہ مستقبل کا انسان بہرا ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ اگر آوا
کرنے کی تدابیر عمل میں نہیں لائی گئیں تو ایڈیسن کا قول صحیح ثا
ہوگا۔

اُردو نامہ

غیر ملکی شاعروں کا استقبال

۲۴ مارچ کی شام کو ایوانِ غالب، نئی دہلی کے لائبریری ہال میں اُردو اکادمی، دہلی کی طرف سے غیر ملکی مہمان شعرا اور شاعرات کے اعزاز میں ایک خیر مقدمی محفل آراستہ کی گئی۔ محفل کا آغاز مخمور سعیدی کے تعارفی کلمات اور اکادمی کے سیکریٹری سید شریف الحسن نقوی کی خیر مقدمی تقریر سے ہوا۔ نقوی صاحب نے مہمان شعرا اور شاعرات کا شکریہ ادا کیا کہ وہ اکادمی کی درخواست
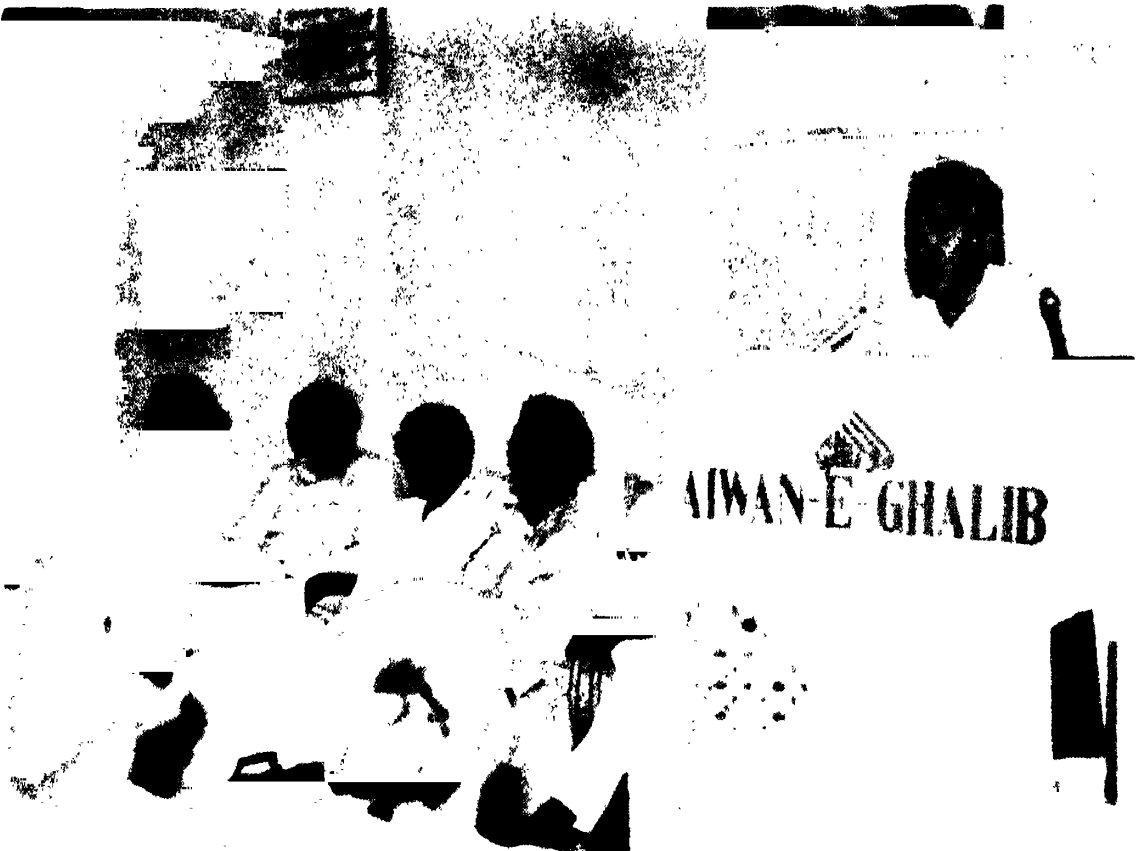
مائک پر منیر نیازی — کرسیوں پر حمایت علی شاعر، تنویر سپرا، ظفر پیامی اور نزہت صدیقی

فل میں تشریف لائے اور کسی طرح کے تکلف یا تامّل سے
ین لیا۔ محفل کو صدرِ محفل دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی اکادمی
ں اور سیمینار کمیٹی کے چیئرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ، اور
ادمی ڈاکٹر کامل قریشی نے بھی خطاب کیا اور بین الاقوامی ثقافتی
تول اور علمی ادبی لین دین کی اہمیت اور افادیت پر روشنی
نظامت کے فرائض مخمور سعیدی نے ادا کیے۔ جن شعرا اور
رات نے اپنا کلام سنا کر باذوق سامعین کے دل جیت لیے
ے اسمائے گرامی ہیں:

جنابِ منیر نیازی (پاکستان)، جنابِ حمایت علی شاعر
ستان)، جنابِ تنویر سپرا (پاکستان) جنابِ سعادت سعید
ستان)، جنابِ ضیاء الحق قاسمی (پاکستان) محترمہ نزہت صدیقی
(کناڈا)، محترمہ گلنار آفریں (سعودی عرب) جنابِ جاوید دانش (امریکہ)
سامعین میں دہلی کی اہم علمی، ادبی، صحافتی اور سماجی
شخصیتیں موجود تھیں۔

سہ روزہ کل ہند اُردو مرثیہ سیمینار

اُردو اکادمی، دہلی کے زیرِ اہتمام "اُردو مرثیے کی شعری اور ثقافتی روایت" کے عنوان سے ایک سہ روزہ کل ہند سیمینار ۲۸ مارچ سے ۳۰ مارچ ۱۹۸۷ء تک غالب اکیڈمی نئی دہلی میں منعقد ہوا۔ سیمینار کی افتتاحی نشست میں سیکریٹری اُردو اکادمی، دہلی نے اُردو مرثیے کی روایت اور اہمیت پر روشنی ڈالی۔ سیمینار کا افتتاح کرنل بشیر حسین زیدی صاحب نے کیا جس کے بعد جنابِ انور علی دہلوی اور جنابِ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار مرثیے کے سلسلے میں کیا اور کنور صاحب نے ایک مرثیے کے چند بند بھی سُنائے۔ افتتاحی نشست کی صدارت پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی۔ موصوف نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ مرثیے کا سرچشمۂ فیضان اگرچہ مذہب ہے لیکن اس سے اس کی ادبی قدر و قیمت کم نہیں ہوتی۔ دنیا کی بڑی شاعری کا ایک بہت بڑا حصّہ ایسا ہے جس نے مذہب سے فیضان حاصل کیا ہے۔ انھوں نے بالمیکی، سور داس، ملٹن، اقبال اور کئی دوسرے شعرا کی مثالیں پیش کیں جن کی عظمت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ انھوں نے کہا کہ

ائیں سے: پروفیسر گوپی چند نارنگ، کرنل بشیر حسین زیدی اور کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

مرثیے پر اور انیسؔ و دبیرؔ پر اُردو میں خاصا تنقیدی اور تحقیقی کام ہوا ہے لیکن مرثیے کی شعری روایت کی بہت سی جہات ایسی ہیں جن پر مزید توجّہ کی ضرورت ہے۔ انھوں نے سوال کیا کہ کیا وجہ ہے کہ اسلامی ادب میں مرثیے کی شعری روایت بشمول عربی و فارسی کے کسی دوسری زبان میں اتنی وقیع نہیں ہے جتنی اُردو میں ہے؟ اگرچہ مرثیے کا آغاز عرب و ایران میں ہی ہوا لیکن مرثیہ ہندوستان ہی میں درجۂ کمال کو پہنچا پروفیسر نارنگ نے مزید کہا کہ اُردو زبان کی شعری روایت کا مرثیے کے بغیر مکمل تصور نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے کئی ایسی جہات کی نشاندہی کی جن پر ابھی اہلِ نظر کو مزید توجّہ کرنی چاہیے مثلاً مرثیے کے لسانی، جمالیاتی، سماجیاتی، اخلاقی اور ڈرامائی پہلو۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر شارب ردولوی نے کی۔

پہلی نشست کا آغاز ڈاکٹر نیر مسعود کے زیرِ صدارت ہوا۔ نظامت جناب ذہین نقوی نے کی۔ ڈاکٹر فضل امام نے "سوز خوانی روایت اور آداب" سید ضمیر حسن دہلوی نے "سودا کے مراثی" اور پروفیسر منظر عباس نقوی نے "اُردو مرثیے کی لسانی اہمیت، انیسؔ اور دبیرؔ کے خصوصی حوالے سے" کے عنوانات سے اپنے مقالات پڑھے دوسری نشست کا آغاز سہ پہر تین بجے ہوا جس کی صدارت جناب سید حسین علی جعفری نے اور نظامت ڈاکٹر شریف احمد نے کی۔ ڈاکٹر اجمل اجملی نے "مرثیہ دورِ حاضر اور آفاقی قدریں" ڈاکٹر تنویر علوی نے "واقعاتی مرثیہ" جناب مہدی نظمی نے "عہدِ حاضر کے ممتاز پاکستانی مرثیہ گو" اور ڈاکٹر نیر مسعود نے "مرثیہ خوانی کا فن" کے عنوانات سے اپنے اپنے مقالات پڑھے۔

اختتام پر بزمِ مرثیہ اور سوز خوانی کی محفل منعقد ہوئی جس میں جناب شہاب سرمدی اور محسن جونپوری نے مرثیہ خوانی اور سوز خوانی کی۔ دوسرے روز کی پہلی نشست کا آغاز پروفیسر گوپی چند نارنگ کی افتتاحی تقریر سے ہوا۔ نشست کی صدارت پروفیسر مونس رضا (وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی) نے اور نظامت ڈاکٹر کامل قریشی نے کی۔ جن حضرات نے مقالات پڑھے ان میں جناب کاظم علی خاں ("مرزا دبیر کے غیر مطبوعہ مراثی") جناب ڈاکٹر شارب ردولوی ("میر انیس کے مراثی کا سماجیاتی مطالعہ") اور جناب شہاب سرمدی ("تحت خوانی، روایت اور آداب") کے نام شامل تھے۔ پروفیسر مونس رضا نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اُردو اکادمی، دہلی نے یہ سہ روزہ سیمنار منعقد کر کے اُردو والوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے اس سے بہت سے نئے حقائق سامنے آئیں گے اور بہت سی ایسی نئی معلومات فراہم ہوں گی جن پر آج تک توجّہ نہیں دی گئی موصوف نے کہا کہ مرثیے کے تعلّق سے حقیقت یہ ہے کہ میں نے ادب سے محبّت کرنا سیکھا ہے مرثیے سے انسانیت دوستی کا مطلب سمجھ میں آتا ہے موصوف نے کہا کہ مرثیہ ایک تہذیب یافتہ انسان کی ذہنی تربیت کا وسیلہ ہے۔ پروفیسر مونس رضا نے مرثیے کے فن پر توجہ کو جڑوں کی تلاش کے مترادف قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ مرثیے کا موضوع تو عرب کا ایک واقعہ تھا، زمینی ماحول انیسؔ و دبیرؔ کے لیے گرد و پیش کی اودھ[ی] زندگی نے فراہم کیا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں آسمانی قدریں زمین[ی] قدروں سے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔ اُردو والوں کے لیے بے حد ضروری ہے کہ وہ اس نکتے کو سمجھیں۔ ہندوستان میں اُردو کے مستقبل کا تعلق اسی نکتے سے ہے۔

دوسری نشست کی صدارت جسٹس ویاس دیو مصرا نے اور نظامت جناب قمر احسن نے کی جناب ریاضت علی شائق نے "دہلی میں مجالسِ عزا و مرثیہ گوئی" کے عنوان سے، جناب ناشر نقوی نے "دہلی کے قدیم مرثیہ نگار" کے عنوان سے، ڈاکٹر مجاور حسین رضوی نے "اُردو مرثیے کے غیر مسلم شعرا" کے عنوان سے، جناب گلزار دہلوی نے "اُردو مرثیہ اور مشترکہ تہذیب" کے عنوان سے اور پروفیسر سید[؟] جعفر نے "اُردو مرثیہ دکن میں ۱۷۰۰ء سے قبل" کے عنوان سے مقالات پڑھے۔ جسٹس ویاس دیو مصرا نے اپنی صدارتی تقریر میں مرثیے کی روایتی تہذیب پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

۳۰ مارچ کا دن اس سہ روزہ کل ہند سیمنار کا آخری د[ن] تھا۔ پہلی نشست پرنس انجم قدر (کلکتہ) کے زیرِ صدارت ہو[ئی] اور نظامت کے فرائض محترمہ شمیم نکہت نے انجام دیے۔ "شخص[ی] مرثیہ" پر پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے اور "دکن میں مرثیہ ۱۷۰۰ کے بعد" کے عنوان سے ڈاکٹر رشید موسوی نے مقالے پڑھے۔ جن

محمود نقوی نے "موجودہ دور کے غیر مسلم شعرا کے مراثی" کے عنوان سے، ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی نے "رثائی ادب اور رباعی" کے عنوان سے جناب سید محمد سیادت نقوی نے "مرثیے کی ثقافتی اہمیت" کے عنوان سے، جناب صادق نقوی نے "باقر امانت کی مرثیہ نگاری" کے عنوان سے اور پروفیسر جعفر رضا نے "انیسؔ و دبیرؔ کی روایت میں توسیع" کے عنوان سے مقالات پڑھے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے نشست کے آغاز میں سمینار کی فکری سمتوں کا تعین کرتے ہوئے کہا کہ مرثیے پر تحقیق کرنے والوں کو چاہیے کہ رثائی ادب کے بارے میں زیادہ سے زیادہ واقعاتی حقائق کو اجاگر کریں۔ ہمارے محققین یہ دیکھیں کہ جس طرح اس زمانے کی غزل کے اشعار میں سیاسی اور سماجی شعور جھلکتا ہے اسی طرح انتزاع سلطنت اودھ کے المیے کا کیا اثر اُردو مرثیے پر مرتب ہوا؟ اس لیے کم سے کم انیسؔ و دبیرؔ کے مراثی کے تاریخی تعین کی بے حد ضرورت ہے۔ انیسؔ و دبیرؔ زوال سلطنت اودھ اور غدر اٹھارہ سو ستاون کے بعد سترہ اٹھارہ برس تک حیات رہے ان برسوں کی تخلیقات میں اس درد کا شامل ہوجانا فطری ہے۔ اسی طرح مٹیا برج میں جو کچھ لکھا گیا یعنی واجد علی شاہ اور ان کے ہمعصر شعرا نے جو کچھ کہا اس کی تاریخی ترتیب بھی سامنے آنی چاہیے۔ ان حقائق سے آگاہی کے بعد مرثیے کی سماجیاتی تنقید کے نئے گوشے سامنے آئیں گے۔ سوز خوانی اور ہندوستانی سنگیت کے رشتے پر بھی مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔

نشست کے صدر پرنس انجم قدر نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ میں اس متبرک اور مبارک سمینار میں شریک ہوکر جس مسرت کا احساس کر رہا ہوں وہ ناقابل بیان ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ اُردو مرثیے کے سلسلے میں منعقد ہونے والا یہ سمینار قوم و ملک کے لیے ایک ایسا بیش قیمت علمی سرمایہ فراہم کرے گا جس سے ہماری آنے والی نسلیں مستفیض ہوتی رہیں گی۔

اختتامی نشست سہ پہر تین بجے شروع ہوئی صدارت مولانا ڈاکٹر کلب صادق (لکھنؤ) نے کی، نظامت کے فرائض ڈاکٹر صلاح الدین نے انجام دیے۔ جناب شہاب جعفری نے "اُردو مرثیے میں ہندوستانی تہذیب کی عکاسی" کے عنوان سے، ڈاکٹر کوکب قدر نے "واجد علی شاہ کی مرثیہ گوئی" کے عنوان سے، ڈاکٹر انیس اشفاق نے "عہد حاضر کے ممتاز ہندوستانی مرثیہ گو" کے عنوان سے، سید شریف الحسن نقوی نے "جدید مرثیہ، مفہوم اور تجربہ" کے عنوان سے، خواجہ حسن ثانی نظامی نے "صوفیہ کی درگاہوں میں مرثیہ خوانی" کے عنوان سے اور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے "سانحۂ کربلا کا علامتی و شعری استعمال" کے عنوان سے مقالات پیش کیے۔ نشست کے بعد بزم مسالمہ و مرثیہ خوانی کا اہتمام کیا گیا جس میں ممتاز مقامی اور بیرونی شعرا حضرات نے اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ تحت اللفظ مرثیہ جناب محسن جبلپوری نے اپنے مخصوص انداز میں پڑھا۔ سکریٹری اُردو اکادمی نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس سہ روزہ سمینار کے اختتام کا اعلان کیا۔

۱۹۸۶ء کے اکادمی ایوارڈ

۹ اپریل کی شام اُردو اکادمی، دہلی کی جانب سے کمانی آڈیٹوریم میں منعقدہ ایک جلسے میں اکادمی کے سالانہ ادبی ایوارڈ اُردو اکادمی دہلی کے چیئرمین اے۔ وی۔ ایم۔ (ریٹائرڈ) جناب ایچ۔ ایل۔ کپور لیفٹیننٹ گورنر، دہلی نے تقسیم کیے۔ یہ ایوارڈ اُردو کے مصنفین کو ان کی مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں دیے جاتے ہیں۔ ان میں ایک ایوارڈ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے نام سے منسوب ہے اور اس کی نوعیت کل ہند ہے باقی چار ایوارڈ دہلی کے اہل قلم کے لیے مخصوص ہیں۔

جلسے کا آغاز اکادمی کے سرکاری ممبر اور دہلی انتظامیہ کے سکریٹری (تعلیمات) جناب گوپال بھٹا چاریہ کے خیر مقدمی کلمات سے ہوا۔ موصوف نے اس سال کے ایوارڈ حاصل کرنے والے حضرات کو اپنی جانب سے اور اکادمی کے تمام اراکین کی جانب سے دلی مبارکباد پیش کی اور امید ظاہر کی کہ ہم سب مل کر اسی طرح اُردو ادب کی خدمت میں اپنا بھرپور تعاون دیتے رہیں گے۔

جلسے میں جناب جگ پرویش چندر (چیف ایگزیکیٹو کونسلر دہلی) جناب کلانند بھارتیہ، ایگزیکیٹو کونسلر (تعلیمات) اور

جناب ایچ۔ ایل۔ کپور ایوارڈ دیتے ہوئے۔ ایوارڈ پانے والے حضرات ہیں، دائیں سے: جناب سرور تونسوی، جناب مشیر جھنجھانوی، ڈاکٹر شارب ردولوی اور جناب غلام ربانی تاباں۔

جناب گوپال بھٹاچاریہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔
اس سال بہادر شاہ ظفر ایوارڈ بزرگ شاعر جناب غلام ربانی تاباں کو دیا گیا۔ دوسرے ایوارڈ یافتگان میں ڈاکٹر شارب ردولوی (برائے اُردو تحقیق و تنقید) جناب ودیا پرکاش سرور تونسوی (برائے اُردو صحافت) جناب مشیر جھنجھانوی (برائے اُردو شاعری) اور جناب حاجی زین العابدین (پس از مرگ) (اُردو میڈیم اسکول کے بہترین اُستاد) شامل ہیں۔ جناب زین العابدین کا ایوارڈ ان کی بیوہ نے لیا۔

بہادر شاہ ظفر ایوارڈ گیارہ ہزار روپے کا ہے۔ باقی ایوارڈ پانچ ہزار ایک سو روپے کے ہیں۔ نقد رقم کے علاوہ ایوارڈ یافتگان کو ایک ایک شال، شیلڈ اور سند توصیف بھی پیش کی گئی۔

جلسے کے آخر میں اکادمی کے چیئرمین جناب ایچ۔ ایل۔ کپور لیفٹننٹ گورنر دہلی نے اپنی مختصر تقریر میں کہا کہ قومی اور تہذیبی زندگی میں شعر و ادب کا مؤثر کردار رہا ہے اور اُردو زبان کی ایک خاص اہمیت ہے، اس زبان کو ہمیں تمام ممکن ذرائع سے فروغ دینا ہے۔ آخر میں سکریٹری اکادمی نے ایوارڈ یافتگان، مہمان خصوصی اور تمام حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جلسے کے اختتام کا اعلان کیا۔ جلسے کے اختتام کے بعد اکادمی کی جانب سے احمد فراز کا منظوم ڈرامہ "روشنیوں کا شہر" پیش کیا گیا، جس کی ہدایت کار محترمہ آمنہ شیروانی ہیں۔

دفتر اُردو اکادمی میں معزز مہمانوں کی آمد

۱۳ اپریل کو اُردو اکادمی دہلی کے دفتر میں دہلی کے لیفٹننٹ گورنر جناب ایچ۔ ایل۔ کپور نے اُردو اکادمی کے ماہانہ ترجمان "ایوانِ اُردو دہلی" کے پہلے شمارے کا اجرا فرمایا۔ رسم اجرا کے جلسے کی صدارت ایگزیکیٹو کونسلر (تعلیمات) جناب کلانند بھارتیہ نے فرمائی۔ لیفٹننٹ گورنر صاحب نے اس موقعے پر دفتر اکادمی کی نئی بلڈنگ پر اکادمی کے نام کا پتھر بھی نصب فرمایا۔ لیفٹننٹ گورنر صاحب اور جناب کلانند بھارتیہ نے جلسے کے شرکا کو خطاب کرتے ہوئے اُردو زبان اور اُردو ثقافت کی ترویج و ترقی کے لیے اکادمی کی طرف سے کی جانے والی کوششوں کو سراہا اور کہا کہ "ایوانِ اُردو دہلی" کے اجرا سے ان کوششوں کو مزید استحکام حاصل ہوگا۔ اکادمی کی تین ذیلی کمیٹیوں کے چیئرمین حضرات ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور جناب انور علی دہلوی کے علاوہ ڈپٹی ڈائریکٹر تعلیمات جناب کے۔ بی۔ رائے زادہ نے بھی جلسے کو خطاب کیا اور امید ظاہر کی کہ دہلی ہی نہیں ملک بھر کے اُردو

جناب ایچ۔ ایل۔ کپور اکادمی کے دفتر کا افتتاح فرماتے ہوئے۔ ساتھ کھڑے ہیں جناب گلانند بھارتیہ

دلّی کے لیفٹننٹ گورنر اور اُردو اکادمی کے چیئرمین جناب ایچ۔ ایل۔ کپور ''ایوانِ اُردو'' دہلی کا اجرا فرماتے ہوئے۔ گورنر صاحب کے دائیں جانب کھڑے ہیں جناب گلانند بھارتیہ اور بائیں جانب ڈاکٹر خلیق انجم۔

دائیں سے: جناب انور علی دہلوی، جناب جگ پرویش چندر
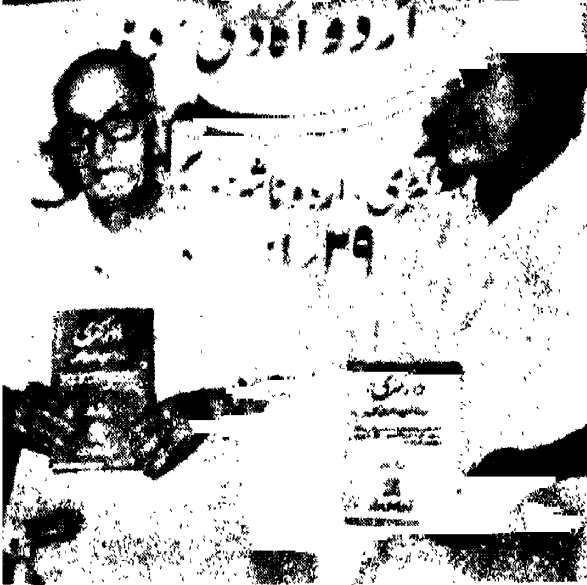
حلقوں کی طرف سے ''ایوانِ اُردو دہلی'' کا پر تپاک خیر مقدم ہوگا اور یہ رسالہ اُردو کی ادبی صحافت میں ایک نیا معیار قائم کرے گا۔

جلسے میں اُردو اکادمی دہلی کے محترم ممبر، ممتاز ادیب، شاعر، صحافی اور دوسرے معززین شریک تھے۔

ڈائریکٹری اُردو ناشرین و تاجران کتب

۲۹ر اپریل کی شام کو اولڈ سکریٹریٹ دہلی کے کمیٹی روم میں دہلی کے چیف ایگزیکیٹو کونسلر جناب جگ پرویش چندر نے ''ڈائریکٹری اُردو ناشرین و تاجران کتب'' کا اجرا فرمایا۔ یہ ڈائریکٹری جناب انور علی دہلوی نے مرتّب کی ہے اور اسے اُردو اکادمی، دہلی نے شائع کیا ہے۔ اس میں سرکاری نیم سرکاری اور

سرکاری اُردو اداروں، مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں کے دو شعبوں، اُردو اکادمیوں اُردو رسالوں کے تقسیم کار اداروں، بوے بک اسٹالوں اُردو لائبریریوں اور مُلکی و غیر مُلکی اُردو کتب فروشوں اور اُردو پبلشروں کے پتے شامل ہیں جو ۶۸۰ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اس موقعے پر جناب جگ پرویش چندر نے کہا کہ اُردو والے اس قسم کی ڈائرکٹری کی ضرورت ایک مدت سے محسوس کر رہے تھے۔ جناب انور علی دہلوی نے مرتب کر کے اور اُردو اکادمی دہلی نے اسے شائع کر کے وقت کی اہم ضرورت کو پورا کیا ہے جس کے لیے یہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ جناب خلیق انجم اور جناب انور علی دہلوی نے بھی حاضرین کو خطاب کیا۔

اُردو ترقی بورڈ اور ریاستی اکادمیاں

نئی دہلی — مرکزی وزیر مملکت برائے تعلیم و ثقافت مسز کرشنا ساہی نے اُردو زبان کی یکساں ترقی کے لیے اُردو ترقی بورڈ اور ریاستی اُردو اکادمیوں کے درمیان مناسب رابطے پر زور دیا ہے۔ اُردو ترقی بورڈ کی میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ حکومت اُردو کی ترقی میں مخلصانہ دلچسپی رکھتی ہے۔ ترقی اُردو بورڈ کی کارکردگی کا جائزہ لیتے ہوئے کئی ممبروں نے اُردو شارٹ ہینڈ اور اُردو ٹائپ کے لیے مرحلے وار انتظام کیے جانے کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ اُردو شارٹ ہینڈ اور ٹائپ رائیٹنگ کلاسس کے لیے حکومت کو چاہیے کہ وہ رضاکار تنظیموں کو مدد فراہم کرنے پر غور کرے۔

ہندی اور اُردو کا رشتہ

نئی دہلی — ہندی اور اُردو زبان میں کوئی جھگڑا نہیں ہے، اصل جھگڑا جو ہے وہ سیاسی ہے۔ ہندی اور اُردو کے کئی دانشوروں نے "ہندی اُردو کے آپسی تعلقات" کے موضوع پر ایک سمینار میں ان خیالات کا اظہار کیا۔ اس دو روزہ سمینار کا اہتمام ہندی اکادمی دہلی نے کیا تھا۔ سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے دہلی کے لیفٹننٹ گورنر جناب ایچ۔ ایل۔ کپور نے کہا کہ زبان، صوبے اور مذہب کے نام پر ملک کے اتحاد کو توڑنے کی کوشش ملک کے اندر اور باہر دونوں طرف سے ہو رہی ہے۔ ایسی صورت میں ادیبوں کو اپنے قلم سے ملک کے ان دشمنوں کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر علی اشرف نے کہا کہ کبیر اور منشی پریم چند ہندی کے بھی ادیب ہیں اور اُردو کے بھی۔ دونوں زبانوں میں جھگڑے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ مُلک میں ایک قومی زبان کی ضرورت ہے جو ہندی ہو سکتی ہے لیکن اس کے لیے ہندی کو عام فہم بنانا ہوگا۔ ہندی کو سہل بنانے میں اُردو سے بہت مدد مل سکتی ہے۔

اُردو کی ترقی حکومت اور عوام دونوں کی ذمّے داری

حیدرآباد — روزنامہ رہنمائے دکن کی اطلاع کے مطابق گورنر آندھرا پردیش مسز کمود بین جوشی نے اُردو کی بقا اور ترقی کے لیے حکومت کی سرپرستی اور مدد کو ضروری قرار دیا اور ساتھ ہی اُردو والوں کو یہ مشورہ بھی دیا کہ یہ کام سرکار کے ساتھ ساتھ خود اردو والوں اور نوجوانوں کا ہے کہ وہ اس زبان کی ترویج و ترقی پر دھیان دیں۔

این سی ای آر ٹی کی اُردو کتابیں

اُردو اکادمی دھلی سے حاصل کی جا سکتی ھیں

اُردو اسکولوں کے طالب علموں، اساتذہ اور والدین کو این سی ای آر ٹی کی اُردو کتابیں حاصل کرنے میں بہت زحمت ہو رہی تھی اس سلسلے میں اکادمی کو بھی شکایتیں موصول ہوتی رہتی تھیں۔

اکادمی نے این سی ای آر ٹی سے گفت و شنید کرنے کے بعد دہلی اور قرب و جوار کے علاقوں کے لیے تقسیم کار کی ذمہ داری سنبھال لی ہے۔ اب این سی ای آر ٹی کی ساری کتابیں اکادمی کے دفتر (گھٹا مسجد روڈ دریا گنج، نئی دہلی) سے کتب فروش حضرات ۱۵ فیصدی کمیشن پر اور مدارس ۱۰ فیصدی کمیشن پر خرید سکتے ہیں۔ انفرادی خریدار یہ کتابیں کتب فروشوں سے حاصل کریں۔

کتب فروش اور مدارس دفتری دنوں میں صبح ۱۰ بجے سے ایک بجے تک دفتر اکادمی سے کتابیں لے سکتے ہیں۔

اُردو علومِ عصریہ کی بہترین ترجمان

گلبرگہ ۔ مسٹر نرسمہا چار رجسٹرار گلبرگہ یونیورسٹی نے کہا ہے کہ اُردو زبان اپنے بنیادی ڈھانچے، قواعد اور ساخت کے اعتبار سے ایک ہندوستانی زبان ہے۔ اس کا تعلق ہند آریائی خاندان السنہ سے ہے تاہم اس میں فارسی، عربی اور ترکی کے الفاظ و اصطلاحات کی موجودگی اس کی شیرینی اور اثرات میں اضافے کا باعث ہے۔ مسٹر نرسمہا چار نے صدیوں سے جاری اُردو کے ارتقائی سفر کو اس زبان کی زندگی کی علامت قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ اُردو والوں کو احساسِ کمتری کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اُردو زبان میں علومِ عصریہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترجمانی کی بھرپور قوت موجود ہے۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی وضع اصطلاحات کے ضمن میں کی گئی عظیم کوششیں اس کا بہترین ثبوت ہیں۔

رواداری کے قیام میں اُردو کا رول

حیدرآباد ۔ پروفیسر علی محمد خسرو کے مطابق ہندوستان کے مختلف علاقوں، زبانوں، نسلوں اور مذاہب کے درمیان رواداری کے قیام اور قومی یک جہتی کے استحکام کے لیے اُردو زبان سب سے بڑا وسیلہ ہے۔ پروفیسر خسرو نے آگے چل کر کہا کہ اُردو کے برخلاف ہندی گذشتہ تیس پنتیس سال سے شُدھ پن کی طرف جارہی تھی۔ سرکاری خطوط پر اس کے تسلّط کی کوششوں سے خاص طور سے جنوبی ہند میں اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند ہونے لگا لیکن پانچ سات سال سے ہندی میں نئے رجحانات پیدا ہونے لگے ہیں اور دوسری زبانوں کے الفاظ سے ہندی کو مالامال کیا جانے لگا ہے۔ اس نئی روش کے زیرِ اثر ہندی کا رنگ بھی اُردو کی طرح ہوگا۔ اور جب ہندی اس رنگ میں آجائے گی تو پھر قومی یک جہتی کے کام کو آگے بڑھایا جاسکے گا۔ پروفیسر علی محمد خسرو نے کہا کہ عام طور سے یہ ہوتا آیا ہے کہ کسی بھی زبان کی ترقی کے لیے درباروں کی سرپرستی ضروری ہوتی ہے لیکن اُردو کی نشوونما میں درباروں کا کم اور عوامی سرپرستی کا [illegible] عمل دخل رہا ہے۔ اُردو نے رواداری کی قدروں کو آگے بڑھایا اور سامراج کو شکست دی۔ آزادی کے بعد کسانوں، مزدوروں اور متعدد چھوٹی بڑی تحریکوں کو آگے بڑھایا۔ جب جب آزادی کو خطرہ ہوا اُردو کے ادیبوں اور شاعروں نے ان خطرات کا مقابلہ کیا۔ اُردو ہندوستان کے ہر ایک علاقے کی اہم زبان ہے۔

ماریشس میں اُردو

علی گڑھ ۔ ماریشس نیشنل اُردو انسٹی ٹیوٹ اور مسلم کونسل کے صدر جناب عبداللہ احمد نے مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ماریشس میں اس وقت ۱۳۰ مسجدیں اور ۵۰۰ مدرسے ہیں جن میں اُردو زبان کی تعلیم کا معقول انتظام ہے۔ ان کے مُلک میں ہفتے میں تین مرتبہ اُردو میں خبریں نشر کی جاتی ہیں اور ایک اُردو ماہنامہ "جستجو" بھی شائع ہوتا ہے۔

●●

بقیہ صفحہ ۴۶ سے آگے

(LLIANTHES)

کے لیے اس کی شاخیں استعمال ہوتی ہیں یہ پولینتھس گروہ کے گلابوں اور دوسرے کاشت کیے جانے والے گلابوں کا جدِّ امجد [illegible]

(۸) روزا ویچورائنا (میموریل گلاب)

ROSA WICHURAIANA (MEMORIAL ROSE)

یہ چین اور جاپان کا گلاب ہے یورپ میں اس کا تعارف ۱۸۵۹ء میں ہوا۔ اس کا پھول گچھوں کی شکل میں کھلتا ہے چھوٹا سفید اور خوشبودار ہوتا ہے۔ پودا کوتاہ قد اور سخت جان ہوتا ہے۔ یہ بیل اور پھیلنے والے گلابوں کی نئی نئی قسمیں بنانے میں استعمال ہوتا ہے۔

ہمیں اس کا احساس ہے کہ ہندوستان میں پائی جانے والی [illegible] نسلوں کی تفصیل اور آٹھ ایسی نسلوں کا ذکر جن کی مدد سے دنیا [illegible] کاشت کیے جانے والے سارے گلاب نباتیاتی طریقوں سے بنائے گئے ہیں خاصا غیر دلچسپ اور خشک ہے مگر چونکہ یہی نسلیں بنیادی طور پر سارے گلابوں کے رنگ و بو، حسن، خوبصورتی اور نزاکت کی [illegible] ہیں اس لیے قارئین کی معلومات کے لیے ان کا بیان ضروری سمجھا گیا۔ ان بنیادی نسلوں کا ذکر اگلے صفحات میں بار بار آئے گا۔ ●●

(باقی آئندہ)

یہ کالم آپ کے اظہارِ خیال کے لیے ہے۔ "ایوانِ اُردو دہلی" میں شائع شدہ تحریروں پر اپنی رائے اس کالم میں ظاہر کیجیے اور کوئی اختلافی نکتہ ہے تو اس کا اظہار بھی کیجیے۔ اختصار کو ضرور ملحوظ رکھیے۔

آپ کی رائے

"ایوانِ اُردو" جیسے خوبصورت ماہنامے کے اجرا پر
ارکباد پیش کرتی ہوں۔ "ایوانِ اُردو" اُردو ادب میں ایک
زین اضافہ ہے۔ آپ جس شعبے میں بھی کام کرتے ہیں اُسے
رج کی آخری منزل پر پہنچا دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں مخمور سعیدی
احب بھی قابلِ مبارکباد ہیں۔ مجھے ڈاکٹر خلیق انجم سے اُن کے
مون بعنوان "پتھر بولتے ہیں" کے بارے میں ایک شکایت ہے۔
وں نے اپنے مذکورہ مضمون میں ایک جگہ لکھا ہے "سنہری مسجد
شمال میں پریڈ گراؤنڈ میں شاہ کلیم اللہ کا مزار خاصی بُری حالت
ں ہے۔" میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب نے صرف درگاہ شریف
اردگرد کا ماحول دیکھ کر ہی یہ لکھا ہے۔ اگر موصوف کبھی درگاہ
یف کے اندر جاتے تو شاید یہ نہ لکھتے۔ یہ بات تو آپ کے علم
بھی ہے ایمرجنسی کے وقت میں کچھ لوگوں نے درگاہ شریف کے
رنی حصّے پر ناجائز قبضہ کر لیا تھا اور اس حصّے کے لیے فاروقی
حب نے کتنی کوشش کی یہ بھی آپ کے علم میں ہوگا۔ اس کے
سکندر بخت صاحب جو اس زمانے میں وزیر تھے — محمد شفیع
ی صاحب نے پارلیمنٹ میں سوال بھی اُٹھایا تھا غرض قصّہ
ں ہے اور آپ کے علم میں۔ بہر حال مجھے اس بات سے دُکھ ہوا
ڑ صاحب نے اپنے مضمون میں یہ تاثر دیا ہے کہ مزار کی حالت
ت خراب ہے میں ڈاکٹر صاحب کو مشورہ دیتی ہوں کہ وہ ایک
درگاہ شریف کے اندر جا کر دیکھیں کہ مزار شریف کی حالت
واقعی خراب ہے یا اس میں برابر تعمیری کام ہو رہا ہے۔ دِلّی میں ابھی
ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے ۱۹۵۱ء میں اس درگاہ کو دیکھا
ہوگا اُس وقت مزارِ شیخ پر صرف ٹین کی چادر کا معمولی سائبان
تھا۔ فاروقی صاحب کو حضرت شیخ سے والہانہ عشق تھا اس لیے
انھوں نے اپنے تمام تر وسائل و ذرائع درگاہ حضرت شیخ کی
تعمیر و ترقی کے لیے صرف کیے اور تاحیات اسی ضمن میں سرگرم
جد و جہد رہے۔ اور اس حقیقت کا سب کو اعتراف ہے۔
۱۹۵۱ء کی بہ نسبت آج مزار شریف اور درگاہ مقدّس سینکڑوں
گُنا بہتر حالت میں ہے۔

—— بیگم ریحانہ فاروقی، دہلی

ماہنامہ "ایوانِ اُردو دہلی" نظر نواز ہوا۔ ماشاء اللہ —!
عمدہ اُردو رسالوں کے کال کے اس زمانے میں "ایوانِ اُردو" پاکر
ایسا ہی محسوس ہوا جیسے دشت میں چشمہ اُبل پڑا ہو یا صحرا میں
خوشگوار ہوا کے لمس نے مسرور کر دیا ہو۔ ادب کو اعتبار و وقار عطا
کرنے کی آپ کی یہ کوشش بلا شبہ قابلِ قدر ہے۔

—— آمنہ ابوالحسن، نئی دہلی

ہندوستان کے جن جن صوبوں کی اُردو اکیڈیمیاں اپنے
ترجمان شائع کرتی ہیں اُن میں "ایوانِ اُردو دہلی" ہر لحاظ سے
منفرد دکھائی دیا۔ آپ کی یہ جسارت قابلِ ستائش ہے کہ
"ایوانِ اُردو" صرف ادبی موضوعات تک محدود نہیں ہوگا۔ اس

طرح رسالہ ایک بڑے حلقے میں مقبولیت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگا۔

—— خلیل تنویر، جے پور

"ایوانِ اُردو" کا پہلا شمارہ بیحد پسند آیا۔ ایسے ہی ایک ماہنامے کی ابھی ہندوستان میں ضرورت تھی۔ اس طرح کا علمی و ادبی ماہنامہ "شاعر" کے سوا دوسرا نہیں ہے لیکن "ایوانِ اُردو" میں آپ نے تنوع برقرار رکھا ہے۔ بعض موضوعات ایسے ہیں جن کی طرف نگاہ نہیں گئی تھی۔ میری جانب سے مبارکباد قبول کریں۔

—— مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

"ایوانِ اُردو دہلی" کا پہلا شمارہ، بُک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ سے دستیاب ہوا۔ میں نے خاص طور پر وقت نکال کر اس کا بغور مطالعہ کیا۔ اور جب مجھے یہ شمارہ بے حد پسند آیا تو میں نے اپنی رہائش گاہ پر ایک مخصوص ادبی نشست میں اپنے حلقۂ احباب سے اس رسالے کو متعارف کیا۔ مضامین، افسانوں اور غزلوں پر دیر تک بحث ہوتی رہی۔ کل ملا کر نتیجہ سامنے آیا کہ "ایوانِ اُردو دہلی" یقیناً اُردو ادب کا ایوان ثابت ہوگا۔ مجھے اُمید ہے کم ہی دنوں میں آپ کا یہ رسالہ بہت مقبول ہو جائے گا۔

—— محمد احسن عالم پورنوی، پٹنہ

"ایوانِ اُردو دہلی" کا پہلا شمارہ نظر سے گزرا۔ یہ شمارہ نہایت معیاری اور وقیع ہے۔ اُردو دشمنی کے اس دَور میں آپ نے اتنا معیاری جریدہ نکال کر جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔

—— وسیم مینائی، شاہجہانپور

پہلی فرصت میں ناچیز نے آپ کی V.P.P. چھڑائی۔ پارسل کھولا تو بس —— دیدہ زیب ٹائیٹل، عمدہ کاغذ، خوبصورت جاذبِ نظر چھپائی، ادبی و تحقیقی مضامین، پیاری پاک غزلیں، کس کس چیز کی تعریف کروں۔ بس خدا سے دُعا ہے کہ ماہنامہ "ایوانِ اُردو دہلی" کو نظرِ بد سے بچائے۔ اتنی کم قیمت میں اتنا خوبصورت رسالہ!

چند معروضات: قیمت صفحۂ اوّل پر ضروری ہے۔ شعرا حضرات کے نام کے ساتھ مکمل پتے بھی لکھا کریں تاکہ ا[illegible] کو بھی مبارکباد کا خط لکھا جا سکے۔
ادبی سوال و جواب کا مختصر کالم بھی ضروری ہے تا[illegible] ادبی معلومات میں اضافہ ہو سکے۔

—— محمد اظہر، برہانپ[illegible]

●

اُردو اکادمی، دہلی کا ترجمان

ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی

مجلسِ مشاورت:
خلیق انجم، حکیم عبدالحمید
خواجہ حسن ثانی نظامی، بیگم ریحانہ فاروقی

جولائی ۱۹۸۷ء

جلد: ۱ — شمارہ: ۳

فی کاپی دو روپے پچاس پیسے

سالانہ قیمت ۲۵ روپے

خط وکتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ
ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی
اُردو اکادمی گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

فون نمبر ۲۷۶۲۱۱ اور ۲۶۲۶۹۳

حرفِ آغاز	سیّد شریف الحسن نقوی	۴
مضامین:		
دِلّی کے آثارِ قدیمہ	خلیق انجم	۱۷
ہماری صحت	حکیم عبدالحنان	۴۳
سفر نامہ:		
امریکہ	کنور مہندر سنگھ بیدی سحر	۵
خاکہ:		
کیا دھوپ تھی کہ...	راج نرائن راز	۳۰
افسانے:		
عورت نامہ	مشتاق مومن	۱۳
جیون گیان	صبیحہ انور	۲۵
آخری انعام	ہیرا نند سوز	۳۸
دوہے:	وقار واثقی	۱۶
نظمیں:	صابر فخر الدین	۱۶
غزلیں:		
	حیات لکھنوی، اسعد بدایونی	۲۴
	ایم۔ آر۔ قاسمی	۲۹
	کشور آرا شبنم، رخسانہ جبیں	۳۷
	حقیر آستانی، وید دیوانہ	۴۲
نئی کتابیں:	م۔م۔ راجندر، اطہر فاروقی	۴۷
اُردو کا خبر نامہ	ادارہ	۵۱
آپ کی رائے	قارئین	۵۵

مئی کے آخری دو ہفتے اردو دُنیا کے لیے بڑے نامسعود رہے۔
ا مئی کو نئی دہلی میں جناب ولی شاہ جہاں پوری کا انتقال ہوگیا۔ وہ
انی مدت سے بیمار تھے اور فالج کے عارضے میں مبتلا تھے۔ ولی صاحب
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ سے وابستہ تھے اور اس کے دو رسالے ماہنامہ "پیام
تعلیم" اور ماہنامہ "کتاب نما" ان کی ادارت میں شائع ہوتے تھے۔ انھوں
نے بچوں اور بڑوں کے لیے کچھ کتابیں بھی لکھی تھیں۔ ان کے دو بھائی
محمود احمد ہنر اور مظفر شاہ جہاں پوری بھی اُردو شعر و ادب کی معروف
شخصیتوں میں تھے۔ محمود احمد ہنر کی ادارت میں الہ آباد سے شائع ہونے
والے ماہنامہ "شاہکار" کی یاد اُردو قارئین کے ذہنوں سے ابھی محو
نہیں ہوئی ہوگی۔

۳۰ مئی کو جناب قمر مرادآبادی اور جناب مہدی نظمی رحلت
کرگئے۔ قمر صاحب نے اپنے وطن مالوف مرادآباد میں اور نظمی صاحب نے
وطن سے دور غازی آباد میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ قمر صاحب ۸ر
اگست ۱۹۱۰ء کو مرادآباد میں پیدا ہوئے تھے۔ وہیں تعلیم و تربیت
پائی۔ اوائل عمر ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔ "ماہِ تمام" "شعورِ غم" "شاخِ گل"
"گلستانِ غزل" اور "کلیاتِ قمر" ان کے مشہور شعری مجموعے ہیں۔ وہ
اچھے نثر نگار بھی تھے۔ ان کی نثری تصنیفات میں "معراجِ داغ" "روحِ
اصغر" اور "آئینۂ سکندر" شامل ہیں۔

مہدی نظمی صاحب لکھنؤ کے خاندانِ اجتہاد میں ۲۳ر اپریل
۱۹۲۳ء کو پیدا ہوئے تھے۔ آگے چل کر انھوں نے صحافت کا شغل اختیار
کیا اور بہت سے روزناموں، ہفتہ روزہ اخباروں اور ماہانہ رسالوں
کے شعبۂ ادارت سے وابستہ رہے۔ صحافت کے ساتھ ساتھ انھوں نے
شاعری میں بھی اپنی طبیعت کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ نثر میں
زودنویسی اور نظم میں پُرگوئی ان کی پہچان تھی چنانچہ نثر و نظم دونوں
ہی میں انھوں نے بیسیوں کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ ایک قدامت
پسند مذہبی گھرانے کے فرد ہونے کے باوجود اُن کی تصنیفات اس
وسیع النظری، روشن خیالی اور کشادہ دلی کی آئینہ دار ہیں جن کا سرچشمہ
انسانی وحدت و اخوت پر یقینِ کامل ہوا کرتا ہے۔ جہاں انھوں نے
مدحِ اہلِ بیت میں پرزور قصائد کہے ہیں وہیں دوسرے مذاہب کی
اہم شخصیتوں مثلاً گورونانک اور شری کرشن کو بھی مخلصانہ منظوم
خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ رواداری ہمیشہ انسانی سماج کی
اہم ضرورت رہی ہے اور موجودہ حالات میں تو اور بھی ضروری ہوگئی
ہے۔
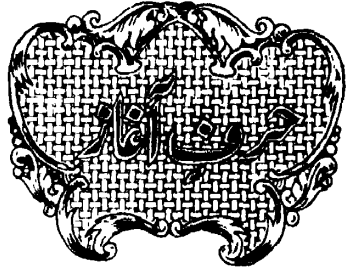
خواجہ احمد عباس کا انتقال ۳۱ مئی کو بمبئی میں ہوا۔ وہ ۷ر
جون ۱۹۱۴ء کو ہریانہ کے تاریخی شہر پانی پت میں پیدا ہوئے تھے اور
ان کا سلسلۂ نسب دو واسطوں سے اُردو کے مشہور شاعر اور نقاد
خواجہ الطاف حسین حالی سے جا ملتا تھا۔ انھوں نے مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ سے آرٹس اور قانون میں گریجویشن کیا۔ ۱۹۳۵ء میں
وہ بمبئی کے انگریزی اخبار "بمبئی کرانیکل" کے رپورٹر اور سب ایڈیٹر
مقرر ہوئے، پھر اس کے سنڈے ایڈیشن کے جوائنٹ ایڈیٹر بنائے گئے۔
۱۹۴۰ء میں انھوں نے ہفت روزہ "بلٹز" سے وابستگی اختیار کی جو
آخر تک قائم رہی۔ "بلٹز" میں "آزاد قلم" کے نام سے ان کا لکھا
ہوا "آخری صفحہ" اس اخبار کا مقبول ترین کالم تھا۔

اخباری کالم نگار کے علاوہ خواجہ صاحب نے ایک افسانہ
نویس کی حیثیت سے بھی شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ انھوں نے
فلمی کہانیاں بھی لکھیں اور خود بھی فلمیں بنائیں۔ ان کی بنائی
ہوئی فلموں میں "دھرتی کے لال" "سات ہندوستانی" "پردیسی"
"نکسلائٹ" "شہر اور سپنا" "فقیرا" "ہمارا گھر" اور دوسری کئی
فلموں نے ملک اور بیرونِ ملک کے فلمی حلقوں میں بڑا نام کمایا۔
"برسات" سے "رام تیری گنگا میلی" تک آر کے۔ فلمز کی ساری فلموں
کے اسکرپٹ بھی خواجہ صاحب ہی نے لکھے تھے۔ آج کے مشہور اداکار
امیتابھ بچن کو اداکاری کا پہلا موقع خواجہ صاحب ہی نے اپنی
فلم "سات ہندوستانی" میں دیا تھا۔

ہم خواجہ احمد عباس کے شایانِ شان "ایوانِ اُردو" دہلی
کا ایک خصوصی شمارہ ان کی یاد میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے
ہیں۔ اس کے لیے ہم قلم کار حضرات کو خط لکھ کر مضامین بھجوانے
کی درخواست کر رہے ہیں۔ اور ان سطور کے ذریعے بھی ہم ان کے
احباب اور ان کے مداحین سے درخواست گذار ہیں کہ ان کی ہمہ گیر
شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں کے بارے میں اپنے مشاہدات و
تاثرات قلمبند کرکے ہمیں بھجوائیں — جن حضرات کے پاس ان کے
خطوط اور تصویریں وغیرہ ہوں، وہ یہ خطوط اور تصویریں بھی ہمیں
بھجوانے کی زحمت کریں۔ انھیں ان کے حوالے سے شائع کیا جائے
گا اور اشاعت کے بعد بہ حفاظت واپس کر دیا جائے گا۔

——— سید شریف الحسن نقوی

"... ہم دوسری اپریل کو صبح پونے چار بجے کے قریب دلّی سے چلے اور جب تقریباً چھبیس گھنٹے کے سفر کے بعد بوسٹن پہنچے تو یہاں ابھی دوسری اپریل ہی تھی ..."

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

مُدّت سے دل میں خواہش تھی کہ ایک بار امریکہ بھی ہو آئیں. یورپ تو دو بار جا چکا تھا اور بقول شخصے ایک بار نہیں دو مرتبہ انگلینڈ ریٹرنڈ بھی ہو چکا تھا لیکن امریکہ جانے کی خواہش نے ابھی حسرت تک کی ہی مسافت طے کی تھی۔ بلاوے کئی بار آئے اور سفر کے لیے کمر بھی کسی لیکن بقول سید محمد جعفری "ہم وہ حاجی تھے کہ جا کر بمبئی سے لوٹ آئے" آخری بار تو سید محمد جعفری مرحوم کے صاحبزادے سید احمد جعفری صاحب نے ریٹرن ہوائی ٹکٹ بھی بھجوا دیا، مگر افسوس کہ عین آخر وقت پر مجھے وہ دورہ ملتوی کرنا پڑا۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ مجھے آپریشن کرانا تھا اور دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ احباب میری ڈائمنڈ جوبلی منانے کی فکر میں تھے اور ان کے خیال کے مطابق میرا جوبلی کے فنکشن سے پہلے اور بعد تک دلّی رہنا ضروری تھا۔ امریکہ کے دورے کو ملتوی کرنے میں سید احمد جعفری صاحب کو کچھ مالی نقصان بھی ہوا اور اُن کی تنظیم کی ساکھ کو بھی ضرب لگی۔ میں اظہارِ ندامت کے سوا کچھ بھی نہ کر پایا اور اب کے جب دوبارہ دعوت نامہ اور ٹکٹ آیا تو میں سو فی صدی صحت مند نہ ہونے کے باوجود سفر پر چل نکلا۔ احمد جعفری اور اُن کے ساتھیوں کا یہ کرم تھا کہ انھوں نے میری بیوی کا بھی ٹکٹ بھجوا دیا کہ وہ میری دیکھ بھال کر سکے چنانچہ دوسری اپریل کی شام ہم دلّی کے ہوائی اڈے پر پہنچے۔

پین ایم

ہمیں پین ایم کے طیارے سے سفر کرنا تھا۔ پین ایم دُنیا کی دو تین بڑی ہوائی کمپنیوں میں سے ایک ہے۔ اِن کے طیارے دُنیا کے گوشے گوشے میں جاتے ہیں۔ جہاز بھی بوئنگ ۷۴۷ تھا جو بین الاقوامی سفر کے لیے سب سے زیادہ موزوں گنا جاتا ہے۔ جہاز کی روانگی کا وقت صبح دو بج کر بیس منٹ تھا لیکن جہاز تقریباً ایک گھنٹے کی تاخیر سے چلا۔ ہمیں آخیر وقت تک پتا نہ چل سکا کہ جہاز راستے میں کہاں کہاں اور کتنی دیر کے لیے رُکے گا۔ دلّی سے چل کر ہم لوگ ریاض رُکے جو سعودی عرب کا دارالخلافہ ہے۔ یہ اُڑان ساڑھے چار گھنٹے کی تھی۔ اُڑان میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ جہاز آدھے سے زیادہ خالی تھا چنانچہ میری بیوی تو ایک خالی سیٹ پر جا کر سو گئی۔ میں جاگتا ہی رہا مجھے ڈر تھا کہ اگر میں نے لیٹنے کی کوشش کی اور پگڑی ڈھیلی ہو گئی تو دوبارہ باندھنے میں دقّت ہوگی۔ ریاض میں صرف وہی مسافر اُترے جنھیں ریاض ہی تک آنا تھا باقی سب جہاز کے اندر ہی رہے۔ تقریباً پچاس منٹ کے بعد ہم ریاض سے روانہ ہوئے اور ساڑھے پانچ گھنٹے کی اُڑان کے بعد فرینک فرٹ پہنچے۔ جب ہم پاؤں سیدھے کرنے کے لیے وہاں اُترے تو ہمیں بتایا گیا کہ

جہاز صرف پینتالیس منٹ رُکے گا اور ہمیں تیس پینتیس منٹ کے اندر ہی جہاز کی جانب لوٹنا پڑے گا۔ جب ہم آدھے گھنٹے کے بعد واپس جہاز کی طرف آرہے تھے تو ہمیں رُوک دیا گیا کہ ابھی تو جہاز یہیں ٹھہرے گا۔ نہ جانے کیوں لیکن کوئی بھی ہمیں صحیح اطلاع نہ دے سکا کہ جہاز کتنی دیر رُکے گا اور کہ ہمیں جہاز بدلنا تو نہیں پڑے گا۔ میں نے کئی جگہ دریافت کیا کوئی کچھ کہتا تھا کوئی کچھ۔ عام طور پر اس طرح کی بڑی ہوائی کمپنی میں یوں نہیں ہوتا۔ آخر ساڑھے تین گھنٹے کی تاخیر سے ہم فرینک فرٹ سے روانہ ہوئے۔ جہاز بالکل بھر گیا تھا ایک سیٹ بھی خالی نہ رہی۔ چنانچہ فرینک فرٹ سے نیویارک تک ساڑھے سات گھنٹے کی مسافت ہم نے یوں ہی طے کی۔ میں تو پچھلے بائیس گھنٹے میں ایک منٹ کے لیے بھی نہ سو سکا تھا میری بیوی کو بھی سونے کی جگہ نہ ملی۔ بالآخر ہم کنیڈی ایرپورٹ پر اُترے اور امیگریشن اور کسٹم کراکر گیٹ نمبر ۲ پر آگئے جہاں سے ہمیں بوسٹن کا جہاز پکڑنا تھا۔ ساڑھے تین گھنٹے وہاں رُکنا پڑا اور جب اُڑے تو پچیس منٹ میں بوسٹن پہنچ گئے۔ وہاں معارج کرمانی اور اُن کی بیگم صاحبہ ہمیں لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ہمیں اپنا سامان لینے کے لیے رُکنا پڑا اور جب سامان آیا تو ایک سوٹ کیس اور ایک بیگ گُم پایا۔ معارج صاحب کی بھاگ دوڑ کے باوجود کچھ پتا نہ چل سکا۔ چنانچہ ہم نے رپورٹ لکھوا دی اور ایئر پورٹ سے چل کر سید محمود جعفری کے گھر پہنچے۔ محمود صاحب اور اُن کے چند اور دوست انتظار میں تھے۔ محمود صاحب کو دیکھتے ہی سید محمد جعفری صاحب کی یاد میرے دل میں تازہ ہوگئی۔ وہی تبسّم، وہی چہرہ، وہی نقش و نگار۔ اُن کی بیگم زیبا سے مل کر بہت ہی خوشی ہوئی۔ اُن کی ننھی منّی بچّی فاطمہ نے ہم سب کا دل موہ لیا۔ ہم بوسٹن کے ہوائی اڈّے پر سامان کے گُم ہونے کی رپورٹ لکھوا آئے تھے۔ سوٹ کیس تو اگلے دن مل گیا مگر بیگ نہ مل سکا۔

بوسٹن

بوسٹن میں ہمارا قیام کتنے دن رہا اور ہم کون سی تاریخ کو دلّی سے روانہ ہوئے اور کس دن کس وقت اور کون سی تاریخ بوسٹن پہنچے، یہ بھی ایک معمّہ ہے۔ ہم دوسری اپریل کو صبح پونے چار بجے کے قریب دلّی سے چلے اور جب تقریباً پچیس گھنٹے کے سفر بعد بوسٹن پہنچے تو یہاں ابھی دوسری اپریل ہی تھی کیوں کہ ہم سو کے تعاقب میں پرواز کر رہے تھے اور ہماری دانست کے مطابق تاریخ بدل چکی تھی یہاں اب بھی وہی تھی اور دن بھی وہی او یہاں پہنچنے کے فوراً ہی بعد ہمیں موسم گرما کے وقت کے مطا گھڑیوں کو ایک گھنٹا آگے کرنا پڑا۔ اِس جغرافیائی تبدّل نے شرو شروع میں قدرے الجھن میں ڈال دیا لیکن دو ایک دن کے بعد سنبھل گئے۔ ہم جمعرات کے دن بوسٹن پہنچے تھے۔ جمعہ اور ہفتہ دن میں نے اپنی نیند پوری کرلی لیکن میری بیوی بیگم زیبا جعف کے ساتھ کچھ خرید و فروخت کرنے کی غرض سے گھومتی رہیں۔ مشا ہفتے کی رات کو آٹھ بجے تھا۔ بوسٹن یونیورسٹی کے کمیونی کیشن کے ہال میں تھا۔ دو تین سو سامعین موجود تھے۔ اس مشاعرے جن شعرا نے شرکت کی وہ تھے جناب عبید اللہ صاحب علیم، جنا نصیر ترابی (پاکستان)، جناب عزیز الحسن صاحب، محترمہ رشیدہ ان کے علاوہ بوسٹن کے جناب داؤد رہبر، جناب نادر درّانی زخمی، جنا محمود عالم، جناب خالد اور جناب ——— ڈاکٹر دوانی۔ جنا داؤد رہبر نے اس مشاعرے کی صدارت کی۔ مشاعرہ عین وقت پر شروع نہ ہو سکا لیکن ہندوستان و پاکستان کی طرح زیادہ تاخیر ہوئی۔ سامعین نے اچھے اچھے شاعروں کو داد دی اور جو انھیں پ نہ آئے اُن کو خاموشی سے سُن لیا۔ یہ بھی ایک بڑی بات ہے ور ہندوستان اور پاکستان میں تو فوراً ہوٹنگ شروع ہو جاتی ہے ابھی یہ وبا ادھر نہیں پھیلی۔ مشاعرہ ساڑھے بارہ بجے کے قریب خت ہوا۔ اِس کے بعد معارج کرمانی صاحب کے ہاں کھانے کی دعوت تھی۔ سب لوگ وہاں پہنچے۔ معارج صاحب اور اُن کی بیگم صاح اور اُن کی سالی صاحبہ اور ہم زُلف نے بہت پُر تکلّف کھانا کھلا معارج صاحب کا مکان بہت ہی خوب صورت اور کشادہ ہے دعوت کے بعد گھر پہنچتے پہنچتے صبح کے چار بج چکے تھے۔ چنانچہ ہم سب لمبی تان کر سوئے۔ میں تو اگلے روز گھر پر ہی رہا اور تمام دن سونے ہی میں گذار دیا لیکن میری بیوی بیگم زیبا جعفری کے ساتھ پھر خرید و فروخت کو نکل گئیں۔ علیم صاحب اور نصیر ترابی بھی وہیں محمو جعفری صاحب کے ہاں ہی ٹھہرے تھے۔ یہ دونوں حضرات اپنے

دوست احباب سے ملنے ملانے کے لیے نکل گئے۔ ایک دن آرام کرنے کے بعد میری بیوی کنیڈی سنٹر دیکھنے کے لیے گئیں لیکن میں بوسٹن ایکوریم دیکھنے کے لیے گیا۔ وہاں اتنی قسم کی مچھلیاں دیکھیں کہ شاید و باید لیکن سب سے بڑھ کر ڈالفن مچھلیوں اور سی لائن کا تماشا تھا۔ سی لائن کا ہزار بارہ سو پونڈ وزن ہوگا لیکن ایک لڑکی کے اشارے پر اُس نے وہ وہ کام دکھائے کہ عقل دنگ رہ گئی۔ آدمی واقعی اشرف المخلوقات ہے ورنہ ایک لاغر سی کمزور و ناتواں لڑکی نے اُسے اس طرح سدھایا ہوا تھا کہ ایسے معلوم ہوتا جیسے کوئی آدمی اس کے احکام کی تعمیل کر رہا ہے۔ وہ اُسے گانا سُنانے کو کہتی تھی تو وہ اس زور سے دھاڑتا تھا کہ دِل ہل جاتا تھا۔ رقص کرنے کے لیے کہتی تھی تو کبھی سر کے بل کبھی دم کے بل کھڑا ہو جاتا تھا اور اپنے جسم کو ایک خاص ترکیب سے ہلاتا تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے کھیل سی لائن نے دکھائے۔ سی لائن کے بعد ڈالفن کی باری آئی تین ڈالفن بیک وقت تالاب میں آئیں اور پہلے تو بینڈ باجے کی تال کے ساتھ رقص دکھایا۔ پھر پانی سے دس دس فٹ اونچا اچھل کر ایک گول رِنگ میں سے گذریں۔ یہاں تک کہ ایک ڈالفن نے تو پانی سے کم از کم بارہ پندرہ فٹ اونچے بیلون کو چھُو لیا۔ سمر سالٹ اور ڈبل سمر سالٹ کے مظاہرے بھی کیے۔ اِن آبی جانوروں کو سدھانے میں کتنی کوشش، محنت اور وقت صرف ہوا ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

ایک دن داؤد رہبر صاحب نے بھی مجھے لنچ پر مدعو کیا۔ رہبر صاحب بوسٹن یونیورسٹی میں موسمیات کے پروفیسر ہیں شعر بھی خوب کہتے ہیں۔ میں اپنے فرائض میں کوتاہی کروں گا اگر سید محمود جعفری اور اُن کی بیگم زیبا جعفری اور اُن کی ننھی منّی بچی فاطمہ کا ذکر نہ کروں۔ محمود صاحب اور اُن کی بیگم صاحبہ سے یہ ہماری پہلی ملاقات تھی لیکن ہم پہلی ہی ملاقات میں اس طرح گھُل مل گئے کہ

اُن سے ملتے ہی مرے دل نے کیا یوں محسوس
جیسے صدیوں سے مری اُن سے شناسائی ہے

خیر سے محمود صاحب کا بڑا وسیع کاروبار ہے اور اللہ تعالے نے اُنھیں دُنیا کی ہر نعمت سے نوازا ہے لیکن اُنھوں نے اپنے والدِ محترم و مرحوم سید محمد جعفری صاحب کی روایات کو زندہ و تابندہ رکھا ہوا ہے۔ خدا ان سب کو سلامت رکھے۔ مساوات کو اسلام میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ سکھ پنتھ میں بھی مساوات کو بہت اونچا درجہ دیا گیا ہے۔ محمود صاحب کے ہاں اس کی زندہ مثال موجود ہے۔ اُن کی ایک ملازمہ ہے جس کو وہ اپنے ساتھ میز پر بٹھا کے کھانا کھلاتے۔ اُنھیں کے ساتھ رہتی بھی ہے اور رہائش اور کھانے کے علاوہ پانچ سو ڈالر اُسے تنخواہ بھی ملتی ہے کام کا وقت بھی متعینہ ہے کسی زمانے میں ہمارے پنجاب کے گورنر کی تنخواہ اتنی ہُوا کرتی تھی۔

معارج صاحب نے بھی مسافر نوازی کا حق ادا کیا اور مجھے اور میری بیوی کو بوسٹن کی خوب سیر کرائی۔ معارج صاحب اور محمود صاحب کا کچھ کاروبار بھی مشترکہ ہے اور مجھے اُمید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ یہ دونوں اور بھی ترقی کریں گے۔

اگلے دن ہم سائنس میوزیم دیکھنے گئے۔ وہاں ایک سینما شو دیکھا جو حیرت انگیز تھا۔ تازہ ترین تکنیک کی مدد سے سارے ہال کو ایک اسکرین بنا دیا گیا تھا اور ایسے دکھائی دیتا تھا کہ ہم خلا میں سفر کر رہے ہیں اور دنیا بازیچۂ اطفال بن کر ہمارے سامنے سے گذر رہی ہے۔ وہاں سے لوٹ کر ہم نے معارج صاحب کے ہم زلف کے ہاں کھانا کھایا۔ یہاں معارج صاحب کی سالی اور ہم زلف اور ان کی ساس کا بھی ذکر کرنا ہے۔ بڑے وضعدار لوگ ہیں خدا اُنھیں خوش رکھے بوسٹن میں آخری شب بھی معارج صاحب کے ہاں کھانے کی دعوت تھی جو رات گئے تک چلی۔ اگلی صبح کافی سویرے اُٹھ کر سامان باندھا اور بوسٹن ہوائی اڈّے پر پہنچے۔ وہاں سے پرواز کی اور نیویارک ہوتے ہوئے شکاگو آگئے۔

شکاگو

نویں اپریل کو ہم صبح ہی بوسٹن سے روانہ ہوئے اور نیویارک ہوتے ہوئے شکاگو آگئے۔ ہوائی اڈّے پر نسیم صاحب ہمارا انتظار کر رہے تھے چنانچہ اُن کے ہمراہ ہم اُن کی رہائش گاہ پر پہنچے۔ اُن کا فلیٹ چالیسویں منزل پر تھا۔ اُنھوں نے اپنا بیڈ روم میرے اور میری بیوی کے لیے خالی کر دیا۔ علیم صاحب

اور نصیر ترابی صاحب نے فرش پر بستر لگائے۔ نسیم صاحب مجرّد ہیں لیکن کھانا پکانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ سارا کھانا اپنے ہاتھ سے تیار کیا تھا۔ مُرغ تو خاص طور پر بہت ہی اچھا پکا تھا۔ کھانا کھا کے سونے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ اعجاز ہاشمی صاحب تشریف لے آئے اور فرمانے لگے کہ مجھے اور میری بیوی کو اُن کے ہاں ٹھہرنا ہوگا۔ چنانچہ ہم نے دوبارہ اپنا سامان نیچے اُتارا اور اُن کے ساتھ اُن کے دولت کدے پر آئے۔ نہایت ہی سلیقے سے گھر کو آراستہ کیا ہوا تھا۔ بالکل ایسے محسوس ہوا جیسے ہم اپنے گھر پر آگئے ہیں۔ اُن کی بیگم صاحبہ بھی بڑی خلیق اور ملنسار خاتون ہیں۔ کافی عرصہ ہوا اُن کے والد مرحوم کی صدارت میں ناگپور میں مَیں نے ایک مشاعرے میں شرکت کی تھی اور نظامت بھی۔ وہ انھیں اب تک یاد تھی۔ ان کے والد ہائی کورٹ کے جج تھے اور شعر و ادب سے دلچسپی رکھتے تھے۔ میں صبح صبح اُٹھ کر سیر کرنے کا عادی ہوں۔ بوسٹن میں محمود صاحب کا گھر ایسی جگہ واقع تھا جہاں سیر کرنے کی کافی گنجائش تھی لیکن ہم جمعرات سے جمعرات تک وہاں ٹھہرے اور تمام وقت بارش ہوتی رہی جس سے میں کمرے میں بند پڑا رہا۔ اعجاز صاحب کا گھر ایک ایسی جگہ واقع ہے جہاں سیر کرنے کی بہت گنجائش ہے چنانچہ میں صحیح معنوں میں امریکہ آنے کے بعد پہلی مرتبہ لمبی سیر کو گیا۔ طبیعت قدرے بحال ہوئی۔ جمعہ کی شام کو اعجاز صاحب نے چند دوستوں کو اپنے ہاں کھانے پر مدعو کیا۔ اور وہ تھے ڈاکٹر اور بیگم فضل الرحمان خاں ڈاکٹر و بیگم محفوظ الحق، بیگم اور خلیل کیانی، حبیب بیگ اور بیگم شمسی بیگ۔ جو اس دعوت میں شریک ہوئے۔ میں ان سب حضرات سے پہلی مرتبہ ملا لیکن اعجاز صاحب نے ان حضرات سے میرا غائبانہ تعارف پہلے ہی کرایا ہوا تھا۔ میرے کلام کے کچھ ٹیپ اُن کے پاس تھے جو ان حضرات نے سُن رکھے تھے۔ بیگم اعجاز نے نہایت ہی لذیز کھانا تیار کیا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر مختصر سی محفلِ مشاعرہ منعقد ہوئی اور پھر بیتے ہوئے ایام کا ذکر ہوتا رہا۔ جوشؔ اور فیضؔ کا ذکر ہوا۔ احمد فراز کا بھی ذکر ہوا۔ میں نے اور اعجاز صاحب نے دیگر شعرا کے پسندیدہ اشعار سُنائے۔ محفل کا آغاز اور اختتام محترمہ بیگم حبیبہ کیانی کی نعت شریف پر ہوا۔ محترمہ پاکستان کی مشہور نعت گو شاعرہ ہیں اور ٹی وی اور ریڈیو پر

آپ کا کلام اکثر و بیشتر نشر ہوتا رہا ہے۔ اگلی صبح ہم اعجاز صا[حب] کی قیادت میں شکاگو شہر کے دلچسپ مقامات دیکھنے کے لیے [گئے]۔ سب سے پہلے سیرز ٹاور دیکھنے گئے۔ یہ دُنیا کی سب سے اُونچی عم[ارت] ہے۔ اس کی کُل ایک سو دس منزلیں ہیں۔ ایک سو تین منزلیں [ایسی] ہیں جن میں لوگ رہتے ہیں یا جن میں دفاتر ہیں۔ اس سے اُوپر [کی] منزلیں غالباً سامان رکھنے اور عمارت کی مشینری وغیرہ کے لیے [ہیں]۔ ایک سو تیسری منزل زمین سے تیرہ سو ترپن فٹ کی بلندی پر [ہے]۔ ایک سو دسویں منزل کی بلندی زمین سے چودہ سو چوّن فٹ [ہے]۔ اور اس کے بعد دو ٹی وی ٹاورز ہیں جو سطح زمین سے سترہ سو فٹ کی بلندی پر ہیں۔ اس بلڈنگ کی فلور سپیس ساڑھے چا[ر] لاکھ مربع فٹ ہے اور اس میں تقریباً بارہ ہزار آدمی کام کر[تے] ہیں۔ اس کے بنانے میں سولہ سو مزدور متواتر تین برس تک [کام] کرتے رہے۔ اس کے ڈھانچے میں سرسٹھ ہزار ٹن لوہا خرچ [ہوا] ہے اور اس بلڈنگ میں سولہ ہزار کھڑکیاں ہیں۔ اس بلڈنگ [کا] وزن دو لاکھ ساڑھے بائیس ہزار ٹن ہے۔ ایک سو تیسری منز[ل] پر لے جانے کے لیے بڑی بڑی لفٹیں ہیں جو بہت تیز رفتاری اوپر لے جاتی ہیں اور ایک منٹ دس سیکنڈ میں ہم ایک سو [تیسری] منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ اگر مطلع صاف ہو تو وہاں سے امریک[ہ کی] چار مختلف ریاستوں کا کچھ کچھ علاقہ دکھائی دیتا ہے۔ اس منز[ل] تک جانے کا سوا تین ڈالر ٹکٹ ہے اور روزانہ ہزاروں آدمی ا[سے] دیکھنے آتے ہیں۔ اس کے بعد ہم لیک کے کنارے گئے وہاں اع[جاز] صاحب نے کچھ تصویریں اُتاریں جن سے شکاگو کی سکائی لائ[ن] دکھائی دیتی ہے۔

اگلی صبح یعنی اتوار کو ہم گوردوارے گئے۔ وہاں خصوصاً اُ[س] روز بڑی چہل پہل تھی گوردوارہ کمیٹی کا الکشن ہو رہا تھا۔ تھوڑ[ی] دیر وہاں رُک کر واپس آگئے۔ کھانا کھایا اور ٹی وی پر پاکستان[ی] ڈراما "مسافر خانہ" دیکھتے رہے۔ بڑا دلچسپ ڈراما تھا۔ پیر کے د[ن] میں صبح ہی لمبی سیر کو نکل گیا واپس لوٹا ناشتہ کیا اور سفرنامہ لکھ[نے] میں مصروف ہوگیا۔ لنچ کے بعد کچھ آرام کیا۔ شام کو ڈاکٹر مظفر ال[دین] فاروقی کے ہاں دعوت تھی۔ وہاں پہنچے تو نصیر ترابی اور علیم صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ مشاعرے کے بعد وہ اور میں الگ الگ مصرو[ف]

. فخری صاحب بھی وہاں آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے
ہاں ایک اور دعوت کر رکھی تھی لیکن چونکہ اُن کا دولت کدہ
ں پچپن میل دور تھا اور میری طبیعت بھی قدرے علیل تھی میں نے
سے معذرت کرلی۔ کوئی سوا دس بجے شب واپس لوٹے تو
زخاں صاحب وہاں ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ وہ مجھ سے
ق ایک مُووی بنانا چاہتے تھے۔ باقاعدہ اسٹوڈیو کی طرح
ی اور مائکروفون وغیرہ کا انتظام کیا ہوا تھا۔ مجھے اپنی فلم سازی
مانہ یاد آگیا۔ وہی ماحول تھا لیکن ہیرو دلیپ کمار یا سنیل دت
جگہ یہ بندۂ ناچیز تھا۔ دو ڈھائی گھنٹے تک کچھ ادبی اور غیر
ی گفتگو ہوتی رہی اور کچھ کلام پیش کرتا رہا۔ عزیز خاں اپنے فن
ماہر معلوم ہوتے تھے۔ اُن سے مل کر خوشی ہوئی۔

س اینجلز

چودھویں کی صبح ہم شکاگو سے روانہ ہوئے اور ڈینور ایک
منٹ رُکنے کے بعد لاس اینجلز پہنچے۔ وہاں احمد جعفری' الیاس
ظفر بخاری ہوائی اڈّے پر موجود تھے۔ شکاگو سے لے کر لاس اینجلز
امریکہ کے مُلک کا کسی حد تک تفصیل سے نظارہ کر سکے۔ شکاگو
لے کر ڈینور تک بڑے بڑے وسیع میدان اور زراعتی فارم
یکھنے کا موقعہ مِلا۔ یہاں نہری آبپاشی کم ہے مگر ٹیوب ویلز
ر چشموں سے پانی لے کر بذریعہ مشین آبپاشی کی جاتی ہے۔ مشین
نی کے دباؤ سے خود ہی گھومتی رہتی اور آبپاشی بھی کرتی ہے۔
ہاز سے یوں دکھائی دیتا تھا جیسے زمین پر بڑے بڑے سبز رنگ
گول دائرے بنا دیے گئے ہیں۔ یہ دراصل وہ زراعتی فارم ہیں
ہاں پانی کے دباؤ سے مشینیں گھوم گھوم کر آبپاشی کرتی ہیں۔ ڈینور
سے اُڑے تو ایک نئی دُنیا نظر آئی۔ کچھ ہی فاصلے پر امریکہ کے "راکی"
پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ امریکہ کے پہاڑوں میں سب
سے اونچے اور لمبے ہیں۔ کنیڈا سے شروع ہوتے ہیں اور قریب قریب
میکسیکو کی حد تک جاتے ہیں۔ ان کی چوڑائی بھی تقریباً دو سو
میل ہوگی۔ تاحدِّ نظر برف ہی برف نظر آتی تھی۔ درمیان میں
بڑی بڑی خوب صورت وادیاں بھی نظر آتی تھیں۔ ان پہاڑوں
کو عبور کرنے کے لیے جگہ جگہ سڑکیں اور ریلوے لائنیں تھیں لیکن
بہت جگہ پر وہ برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ اس پہاڑی سلسلے سے
گذرنے کے بعد بڑی گہری گہری وادیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ دُنیا
کی مشہور گرینڈ کینین بھی دکھائی دی کچھ بادل چھائے ہوئے تھے۔
لیکن میں نے چونکہ گرینڈ کینین کی تصویریں دیکھ رکھی تھیں مجھے پہچاننے
میں کوئی دقّت نہیں ہوئی گرینڈ کینین کی تہ سطح زمین سے تین چار
ہزار فٹ گہری ہے اور کولوریڈو دریا کی کُرید سے بنی ہے۔ لاکھوں
سال پہلے دریا اُوپر بہتا تھا لیکن آہستہ آہستہ دونوں طرف سے دریا
مٹّی کو بہاتا رہا اور اب وہ دریا اپنی پُرانی سطح سے ہزاروں فٹ
نیچے بہتا ہے گرینڈ کینین کی دیواریں مختلف رنگوں کی ہیں اور اُن میں
الگ الگ تہیں صاف نظر آتی ہیں۔ گرینڈ کینین دنیا کے عجائبات
میں گنی جاتی ہے۔ گرینڈ کینین سے گذرنے کے بعد صحرا کا سلسلہ شروع
ہوگیا۔ میلوں تک چھوٹی چھوٹی خشک پہاڑیاں اور درمیانی وادیوں
میں ریت ہی ریت دکھائی دی۔ یہ صحرا لاس اینجلز سے ڈیڑھ دو
سو میل کے فاصلے پر ہے اور دُور دُور سے لوگ اسے دیکھنے آتے
ہیں۔ اس صحرا کا نام موہیو ہے۔ اس کے فوراً ہی بعد پھر سر سبز و
شاداب علاقہ آگیا۔ سرسبز و شاداب پہاڑیاں دکھائی دیں اور یہیں
سے لاس اینجلز کا شہر شروع ہوگیا۔ لاس اینجلز امریکہ کے پانچ چھ
بڑے شہروں میں سے ایک ہے لیکن چونکہ اکثر و بیشتر عمارتیں ایک
منزلہ ہیں' اس کا پھیلاؤ بہت ہے۔ اس شہر میں کئی جگہیں دیکھنے
سے تعلّق رکھتی ہیں لیکن ہم نے طے کیا کہ مشاعرے کے بعد گھومنے نکلیں
گے۔ اس کے علاوہ آپریشن کے بعد مجھے ابھی درد رہتا تھا۔ چنانچہ
احمد میاں اور الیاس صاحب کی وساطت سے ڈاکٹر ضیا سے وقت
لیا گیا۔ الیاس صاحب مجھے خود اُن کے پاس لے گئے۔ اُن کے مطب
کی صفائی اور اعلیٰ انتظام دیکھ کر طبیعت دنگ رہ گئی۔ تمام مطب
اس قدر صاف اور سُتھرا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت غور سے میرا
معائنہ کیا اور فرمایا کہ کوئی خاص تکلیف نہیں ہے البتّہ سوزش
ہے جس کے لیے اُنھوں نے دوا تجویز کی۔ ڈاکٹر صاحب نے جو کہ ماہر
یورالجسٹ ہیں مجھ سے فیس بھی قبول نہ کی اور دوا بھی مُفت ہی دی۔
میں نے ہر چند کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ شاید یہ اُن کے اس خلوص و
محبّت کا نتیجہ تھا کہ دوا کی دو خوراکوں کے بعد میں اسّی فیصدی
تندرست ہوگیا۔ اُن کی دوا نے واقعی معجزہ دکھایا۔ خدا انھیں خوش رکھے

جمعہ کی شب الیاس صاحب نے اپنے ہاں کھانے پر مدعو
یا۔ وہاں دیگر حضرات کے علاوہ ظفر بخاری صاحب سے بھی دوبارہ
اقات ہوئی۔ نہایت لذیذ اور پرتکلف دعوت تھی۔ دعوت کے بعد
فتہ کے روز ہونے والے مشاعرے کے سلسلے میں ظفر بخاری صاحب
ے نصیر صاحب اور علیم صاحب کا اور میرا انٹرویو لیا۔ وہاں سے
ارغ ہوکر ہم واپس گھر پہنچے۔

ہفتہ کی شام مسانک لاج ہل خلاود میں مشاعرہ تھا۔ نصیر
رابی، علیم صاحب اور میرے علاوہ مقامی شعرا بھی شریک ہوئے
یکن افسوس کہ میں اُن سب کے اسماگرامی نوٹ نہ کرسکا۔
نیر خاں لاس دیگاس سے تشریف لائے تھے۔ مشاعرے کی صدارت
ے لیے مجھے حکم ملا۔ نظامت الیاس صاحب نے کی۔ تعارفی تقریر
ظفر بخاری صاحب نے کی۔ تین صد کے قریب سامعین موجود تھے۔
اس مشاعرے میں اکثریت سلجھے ہوئے سامعین کی تھی۔ اچھے شعر پر
دل کھول کر داد دیتے تھے۔ لاس اینجیلز کا مشاعرہ پہلے دونوں مشاعروں
سے ہر لحاظ سے بہتر تھا۔ احمد جعفری صاحب نے اپنے والد کے رنگ
میں اور اُسی ترنم سے دو نظمیں سُنائیں جن میں مشہور اشعار کو
خوب صورت ڈھنگ سے تضمین کیا تھا۔ اُن کو سُن کر اُن کے والد
سید محمد جعفری بہت یاد آئے۔ مشاعرہ تاخیر سے شروع ہوا لیکن اس
کے باوجود دونوں دور ڈیڑھ بجے تک ختم ہوگئے۔ اتوار کو گھر پر
آرام کیا لیکن شام کو جعفری صاحب ہمیں ہوا خوری کے لیے لے
گئے۔ پہلے تو ہم پرانے شہر میں گھومے جہاں بڑی بڑی اونچی عمارتیں
تھیں۔ پھر ہم پیسفک اوشن یعنی بحرالکاہل کے کنارے گئے۔ موٹر
پارک کرکے سمندر کے عین کنارے تک گئے بلکہ سمندر کے پانی کو
چھو آئے کہ ہم کہہ سکیں کہ ہم بحرالکاہل کو بھی چھو آئے۔ وہاں سے
گھومتے گھامتے پھر اپنی قیام گاہ پر آئے۔ نصیر صاحب اور علیم صاحب
اپنے کسی دوست کے ساتھ گشت کو نکل گئے۔ رات کہیں باہر ہی رہنے
کا ارادہ تھا تاکہ پیر کے روز لاس دیگاس بھی دیکھ آئیں۔ پیر کے روز
بیگم احمد نے ڈاکٹر خالد بشیر احمد سے میری بیوی کو دکھانے کا وقت
لیا اور ہم لوگ ڈاکٹر خالد کے مطب پہنچے۔ نہایت ہی صاف ستھرا
مطب تھا جس میں کئی نرسیں کام کر رہی تھیں۔ پہلے تو وہاں میری
بیوی کے کئی ایکس رے لیے گئے بعد ازاں ڈاکٹر خالد نے تشخیص کی
اور بتایا کہ میری بیوی کو دراصل ارتھرائیٹس کی وجہ سے دوسری
تکلیفیں بھی ہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے کچھ دوائیں تجویز کیں اور گردن
کو سیدھا کرنے کا ایک آلہ بھی دیا اور اس کا طریقۂ استعمال بھی
بتایا جب چلنے لگے تو بار بار اصرار کرنے پر بھی فیس نہیں لی بلکہ
نئے آلے اور دوائیں بھی مُفت میں دیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں احمد
جعفری اور اُن کی بیگم صاحبہ کا رسوخ بھی کارفرما تھا لیکن ڈاکٹر
صاحب کی ذاتی شرافت اور فیاضی بھی قابلِ ستائش تھی۔ وہاں
دو اور باتوں کا انکشاف ہوا جن سے ڈاکٹر خالد میں میری دلچسپی
اور بھی بڑھ گئی۔ ایک تو یہ کہ وہ ضلع گوڑگانوں کے باشندے تھے
جہاں میں دو سال ڈپٹی کمشنر رہ چکا تھا اور دوسری بات جو انتہائی
دلچسپی کا باعث ہوئی وہ یہ تھی کہ ڈاکٹر خالد کو اپنی زمین کے عوض
جو اراضی پاکستان میں الاٹ ہوئی وہ ہماری تھی۔ ساڑھے تین
تین ہزار ایکڑ کچھ گاؤں ہمارے ایک ہی جگہ واقع تھے جو ہماری واحد
ملکیت تھے اور ہماری اس زمینداری کا ہیڈکوارٹر چک بیدی تھا
جہاں ہماری رہائش تھی یہ اراضی ان کو چک بیدی میں ملی۔

منگل کے روز میں ڈزنی لینڈ دیکھنے گیا۔ یہ دُنیا کے عجائبات
میں گنی جاتی ہے۔ میری بیوی چونکہ زیادہ پیدل نہیں چل سکتی،
نہیں گئی میں اکیلا ہی گیا۔ چونکہ وہ بہت ہی بڑی نمائش ہے اور
میں قطعی ناواقف اور اجنبی تھا اُسے صحیح معنوں میں دیکھ نہ سکا
اور پھر یوں بھی ہوا کہ وہاں ایک چھوٹی سی ریل میں ہمیں بیٹھایا
گیا جو اندھیرے میں بہت ہی زیادہ تیز رفتاری سے چلائی گئی اور
جس نے اعضا شکن موڑ لیے اور جھٹکے دیے۔ جب وہ رُکی تو بڑی
بُری حالت تھی اور سر اس قدر گھوم رہا تھا کہ میں ایک بینچ پر
گر گیا اور پندرہ بیس منٹ تک اسی عالم میں وہیں بیٹھا رہا۔
جب ذرا حواس دُرست ہوئے تو اُٹھا اور کچھ اور اِدھر اُدھر جاکر
گھومنے کی کوشش کی لیکن طبیعت اِس قدر اُکھڑ چکی تھی کہ بہت کم
دیکھ پایا۔ ڈزنی لینڈ کے داخلے کا ٹکٹ بیس ڈالر کا ہے اور حالاں کہ
آج تعطیل نہیں تھی، اِس قدر بھیڑ تھی کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔
دریافت پر پتہ چلا کہ ایک ہفتے کے اندر تقریباً سات آٹھ لاکھ آدمی
ڈزنی لینڈ دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔

منگل کی شام ہی کو نعمان محمّدی صاحب نے کھانے پر

...لیا تھا۔ وہ خود ہی لینے کے لیے آئے۔ نصیر ترابی صاحب اور ...صاحب نے کہیں اور ہاں کر دی تھی۔ چنانچہ میں اور میری بیوی ...ن صاحب کے ہاں گئے۔ نعمان صاحب مرحوم سیٹھ نظر علی رتلامی ...داماد ہیں۔ سیٹھ نظر علی میرے کرم فرما تھے اور میں دو مرتبہ اُن کی ...ت خاص پر رتلام کے مشاعرے میں شریک ہوا تھا۔ نعمان صاحب ...ہاں کئی حضرات اور بھی مدعو تھے جن میں سے چھ سردار صاحبان اور ...کی بیویاں تھیں۔ لاس اینجیلز میں کافی سردار رہتے ہیں لیکن ان ...جان سے میری پہلی ملاقات تھی۔ پوچھنے پر اُنھوں نے بتایا کہ ...ں اینجیلز کے مشاعرے کے دعوت نامے اُن کو تاخیر سے ملے تھے اور ...کہیں اور ہاں کر بیٹھے تھے۔ نعمان صاحب ادبی ذوق رکھتے ہیں ...اُنھوں نے ایسے ہی مہمانوں کو مدعو کیا تھا جنھیں شعر و ادب سے ...دلچسپی ہو۔ سبھروال صاحب بھی موجود تھے جو ہلکا اور پکا گانا ...تے ہیں اور امریکہ میں مختلف جگہوں پر پروگرام کرتے ہیں۔ اُنھوں ...نے مجھے بتایا کہ وہ مہدی حسن کے شاگرد ہیں اور مہدی حسن صاحب ...اپنے پروگراموں میں فیض صاحب کی وہ مشہورِ زمانہ غزل "چلے ...بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے" سناتے ہیں تو ہمیشہ اسی زمین میں ...میری کہی ہوئی غزل کا یہ شعر خاص طور پر میرا نام لے کر سناتے ہیں کہ:

ہوا جو تیرِ نظر نیم کش تو کیا حاصل
مزا تو جب ہے کہ سینے کے آر پار چلے

...یہ مہدی حسن صاحب کا کرم خاص ہے ورنہ میں اس لائق کہاں۔

رات ڈھلے یہ محفل ختم ہوئی اور نعمان صاحب ہمیں خود گھر چھوڑنے آئے۔

بُدھ کے روز ہمیں میامی کے لیے روانہ ہونا تھا چنانچہ ہم سب ہوائی اڈے پر پہنچے۔ ہوائی جہاز وقت پر چلا اور ساڑھے چار گھنٹے کی پرواز کے بعد میامی اُترا۔ لاس اینجیلز بحرالکاہل کے کنارے ہے اور میامی ایٹلانٹک اوشن کے کنارے واقع ہے یعنی ہم امریکہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے آپہنچے۔ راستے میں بادل تھے اس لیے میں میسوری دریا اور امریکہ کے صحرائی علاقے ٹیکساس، ایریسوری رونا، ٹسکن وغیرہ کا نظارہ نہ کر سکا۔ میامی ہوائی اڈے پر متعدد حضرات ہمیں لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ نصیر صاحب اور علیم صاحب تو اپنے کسی دوست کے ہاں ٹھہرے لیکن مجھے اور میری بیوی کو شوکت صاحب اپنے گھر لے آئے۔ اُن کی بیگم صاحبہ اور بچّوں سے مل کر طبیعت خوش ہوئی۔

جمعرات کے دن محترمہ خورشید ظفر مجھے اور میری بیوی کو میامی سی اکیوریم دکھانے لے گئیں۔ میں نے بوسٹن سی اکیوریم بھی دیکھا تھا۔ میامی سی اکیوریم اُس سے بڑا بھی تھا اور یہاں سی لائن اور ڈالفن کے علاوہ مکرو ہیل بھی دیکھنا نصیب ہوئی۔ یہ سمندر کے تمام آبی جانوروں میں سے زیادہ خونخوار ہے اور مکرو ہیلوں کا جھنڈ بڑی سے بڑی وہیل کو بھی "آناً فاناً" ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ ایک دفعہ اِن کا جھنڈ کسی اور جاندار آبی چیز کا تعاقب کرے تو اُس کا بچنا ناممکن ہو جاتا ہے اس مکرو ہیل نے ہمیں وہ وہ

کمالات دکھائے جو ایک معمولی انسان کی ذہانت سے بھی باہر ہیں، یہ سب کچھ دیکھ کر عقل دنگ رہ گئی اور واقعی اس بات کا قائل ہونا پڑا کہ آدمی اشرف المخلوقات ہے۔ ہزاروں گھنٹوں کے صبر آزما سدھانے کے بعد یہ نتیجہ نکل سکا ہوگا۔

جمعہ کے روز ابراہیم صاحب مجھے میامی کا چڑیا گھر دکھانے لے گئے یہ چڑیا گھر چار پانچ مربع میل میں پھیلا ہوا ہے۔ مختلف جانوروں کے لیے ان کے رہنے سہنے کے لیے نہایت وسیع اور دلکش احاطے بنائے ہوئے ہیں لیکن ابھی یہ چڑیا گھر پوری طرح سے آباد نہیں ہوا۔ بلکہ دو ایک ایشیائی جانوروں کی قسم اور نام بھی غلط لکھے ہوئے تھے اسی رات کو ظفر صاحب اور اختر محمود صاحب کی جانب سے ہماری مشترکہ دعوت تھی۔ دعوت میں تقریباً ایک سو اہالیانِ میامی شریک ہوئے۔ بہت سے حضرات سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ امریکہ میں عام طور پر اور میامی میں خاص طور پر ہر ہفتے کے روز کہیں نہ کہیں دعوت ہوتی ہے۔ تفریح کے علاوہ دُور افتادہ لوگوں کو آپس میں ملنے ملانے کا موقع مل جاتا ہے۔ دعوت بڑی ہی پُر تکلف تھی اور میز بانوں اور اُن کی بیگمات نے مہمانوں کی خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ایسے معلوم ہوا جیسے ہم دلی، لاہور یا کراچی میں بیٹھے ہیں۔ شوکت مرزا کا گھر وہاں سے کوئی چالیس میل دُور تھا چنانچہ رات کوئی ڈیڑھ بجے واپس آئے اور تھوڑی دیر گپ شپ لگا کر سو گئے۔

●●

(۱) ایجنسی کم سے کم دس کاپیوں کی شرائط کی ...

(۲) کمیشن کی شرح:

دس سے پچیس کاپیوں تک　۲۵%

چھبیس سے پچاس کاپیوں تک　۳۰%

اکیاون سے سو کاپیوں تک　۳۵%

سو سے زیادہ کاپیوں پر　۴۰%

(۳) پچاس کاپیاں تک ڈاک خانے سے بھیجی جاسکیں گی۔

(۴) پچاس سے زیادہ کاپیاں ریل سے ارسال کی جائیں گی اس لیے اگر آپ کا آرڈر پچاس کاپیوں سے زیادہ ہو تو اپنے قریب ترین ریلوے اسٹیشن کا نام ضرور لکھیے

(۵) ڈاک سے بھیجے جانے والے پیکٹ ... کے لیے وی پی سے ارسال ہوں گے۔

(۶) ریل سے بھیجے جانے والے بنڈلوں کی ... بذریعہ وی۔ پی ارسال ہوگی ... بھیجی جائے گی

(۷) ...

’’.....اسے چمکتا رنگ پسند ہے اور یہ رنگ مجھ پر سے چھوٹ گیا ہے۔ اُسے گدریلی گولائیاں عزیز ہیں اور میں نے پانچ بچوں کو دُودھ پلایا ہے.....‘‘

مشتاق مومن

اور پھر مجھے گیان ہوا۔

کیا گیان ہوا اس کا بیان آگے آئے گا۔ فی الوقت میری لائنوں میں گھومتی ہوئی کانچ کی یہ چوڑیاں لوٹ لوٹ کر کرچیاں ہی جا رہی ہیں اور دھیرے دھیرے کلائی میں پیوست ہو کر دوڑتے ہوئے مل کر رگوں کی اندرونی اَن چھوئی سطحوں سے ٹکرا رہی ہیں۔ نرم توے پر گیہوں کی روٹی نہیں میرا دل رکھا ہوا ہے جسے میں دو اپنے ہاتھ سے سینک رہی ہوں۔ یہ سب ایک زندہ حقیقت ہے۔ مدت سے میں خواب جیسی شے سے محروم ہوں گزرے ہوئے دن اور بیتی ہوئی باتیں ہی میرے خواب ہیں زندگی کے وہ لمحات جو وقت کی سولی پر چڑھ کر مردہ ہو گئے ہیں میری آنکھوں میں زندہ ہیں۔ یہ اور اسی قسم کی بہت ساری باتیں میری ذات کے ساتھ وابستہ ہیں اور بالکل میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں کہانی کہاں سے شروع کروں!

چلیے یوں فرض کر لیتے ہیں کہ میری کہانی شروع ہو رہی ہے مگر ایک بات پہلے ہی آپ کو بتا دوں کہ آپ کے خیال سے جہاں اس کہانی کا انت ہوگا میرے حساب سے وہیں سے اس کتھا کا آغاز ہوگا۔ آپ سن رہے ہیں نا؟

میں ایک عورت ہوں، شوہر والی، بچے والی اور گھر والی ___ باہر پیپل کے درخت پر لٹکے ہوئے چمگادڑ پھڑ پھڑا کر اڑ چکے ہیں۔ میرے بچے گہری نیند میں سو رہے ہیں۔ منّی نیند میں کچھ دیکھتی ہے اور مسکراتی ہے۔ مجھے نیند نہیں آتی۔ ماں کہتی تھی تو خاندان میں سب سے الگ ہے نہ جانے تجھ پر کس کی پرچھائیں پڑی ہے ___ جب میں نے اپنے آپ کو جاننے اور پہچاننے کی کوشش کی تو مجھے گیان ہوا۔

کیا گیان ہوا اس کا بیان آگے آئے گا۔

ماں کے ذکر پر یاد آیا کہ کئی باتوں پر مجھے ماں سے اختلاف ہے، ویسے ماں ہے بہت اچھی، اس کا آدمی اس کے سامنے جوان جوان لڑکیوں کو لے کر گھومتا ہے، وہ سب کچھ دیکھتی ہے اور کچھ نہیں کہتی۔

میں جانتی ہوں ماں اس وقت گھر کے کام کاج میں مصروف ہوگی اور ابّا دن بھر کا حساب کتاب کر کے اور نوکروں کو تنخواہ دے کر اپنی مخصوص جگہ بیٹھے شراب پی رہے ہوں گے اور ماں کو گالیاں دے رہے ہوں گے۔ یہ ان کی اصل کی عادت ہے، اور ماں گالیوں سے بے نیاز اپنا کام کرتی رہے گی کبھی کبھار گردن موڑ کر انھیں دیکھے گی اور بس ___ پھر اچانک ابّا، اماں سے پیار بھری باتیں کرنا شروع کر دیں گے اور ماں تمام کھڑکیاں دروازے بند کر کے ان کے ساتھ سو جائے گی۔ آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں ان دونوں سے محبت کرتی ہوں یا نفرت۔

پہلے ابّا مل میں کام کرتے تھے۔ آسانی سے گزر بسر ہو جاتی تھی پھر مل میں بے مدت ہڑتال جو شروع ہوئی تو ختم ہی نہ ہوئی۔ ایک سال وہ ادھر اُدھر بھٹکتے رہے پھر انھوں نے شراب کا دھندا شروع کر دیا۔ پیتے تو وہ پہلے ہی سے تھے پھر جلد ہی انھیں پرمٹ بھی مل گیا اس وقت میں نویں جماعت میں تھی انھوں نے مجھے اسکول سے اٹھا لیا ___ میری خوشی

حالات دکھاتے جو ایک معمولی انسان کی ذہانت سے بھی باہر ہیں۔ سب کچھ دیکھ کر عقل دنگ رہ گئی اور واقعی اس بات کا قائل ہونا پڑا کہ آدمی اشرف المخلوقات ہے۔ ہزاروں گھنٹوں کے صبر آزما سدھانے کے بعد یہ نتیجہ نکل سکا ہوگا۔

جمعہ کے روز ابراہیم صاحب مجھے میامی کا چیڑیا گھر دکھانے لے گئے یہ چیڑیا گھر چار پانچ مربع میل میں پھیلا ہوا ہے۔ مختلف جانوروں کے لیے ان کے رہنے سہنے کے لیے نہایت وسیع اور دلکش احاطے بنائے ہوئے ہیں لیکن ابھی یہ چیڑیا گھر پوری طرح سے آباد نہیں ہوا۔ بلکہ دو ایک ایشیائی جانوروں کی قسم اور نام بھی غلط لکھے ہوئے تھے۔ اسی رات کو ظفر صاحب اور اختر محمود صاحب کی جانب سے ہماری مشترکہ دعوت تھی۔ دعوت میں تقریباً ایک سو اہالیان میامی شریک ہوئے۔ بہت سے حضرات سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ امریکہ میں عام طور پر اور میامی میں خاص طور پر ہر ہفتے کے روز کہیں نہ کہیں دعوت ہوتی ہے۔ تفریح کے علاوہ دور افتادہ لوگوں کو آپس میں ملنے ملانے کا موقع مل جاتا ہے۔ دعوت بڑی ہی پرتکلف تھی اور میزبانوں اور ان کی بیگمات نے مہمانوں کی خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ایسے معلوم ہوا جیسے ہم دلّی، لاہور یا کراچی میں بیٹھے ہیں۔ شوکت مرزا کا گھر وہاں سے کوئی چالیس میل دور تھا چنانچہ رات کوئی ڈیڑھ بجے واپس آئے اور تھوڑی دیر گپ شپ لگا کر سو گئے۔

●●

"... اسے چمکتا رنگ پسند ہے اور یہ رنگ مجھ پر سے چھوٹ گیا ہے۔ اُسے گدریلی گولائیاں عزیز ہیں اور میں نے پانچ بچوں کو دُودھ پلایا ہے..."

مشتاق مومن

عورت نامہ

اور پھر مجھے گیان ہوا۔

کیا گیان ہوا اس کا بیان آگے آئے گا۔ فی الوقت میری
ہوں میں گھومتی ہوئی کانچ کی چوڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر کرچیاں
جا رہی ہیں اور دھیرے دھیرے کلائی میں پیوست ہو کر دوڑتے
ل مل کر رگوں کی اندرونی ان چھوئی سطحوں سے ٹکرا رہی ہیں
توے پر گیہوں کی روٹی نہیں میرا دل رکھا ہوا ہے جسے میں
پنے ہاتھ سے سینک رہی ہوں۔ یہ سب ایک زندہ حقیقت
۔ مدت سے میں خواب جیسی شے سے محروم ہوں گزرے
ے دن اور بیتی ہوئی باتیں ہی میرے خواب ہیں زندگی کے
عات جو وقت کی سولی پر چڑھ کر مردہ ہو گئے ہیں میری آنکھوں
زندہ ہیں۔ یہ اور اسی قسم کی بہت ساری باتیں میری ذات
ساتھ وابستہ ہیں اور بالکل میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے
ں کہانی کہاں سے شروع کروں!

چلیے یوں فرض کر لیتے ہیں کہ میری کہانی شروع ہو رہی
ر ایک بات پہلے ہی آپ کو بتا دوں کہ آپ کے خیال سے جہاں
کہانی کا انت ہوگا میرے حساب سے وہیں سے اس کتھا کا آغاز
۔ آپ سن رہے ہیں نا؟

میں ایک عورت ہوں، شوہر والی، بچے والی اور گھر والی ــــ
پیپل کے درخت پر لٹکے ہوئے چمگادڑ پھڑ پھڑا کر اڑ چکے ہیں۔
ے بچے گہری نیند میں سو رہے ہیں۔ منّی نیند میں کچھ دیکھتی ہے
سکراتی ہے۔ مجھے نیند نہیں آتی۔ ماں کہتی تھی تو خاندان میں سب
سے الگ ہے نہ جانے تجھ پر کس کی پرچھائیں پڑی ہے ــ جب
میں نے اپنے آپ کو جاننے اور پہچاننے کی کوشش کی تو مجھے گیان ہوا۔

کیا گیان ہوا اس کا بیان آگے آئے گا۔

ماں کے ذکر پر یاد آیا کہ کئی باتوں پر مجھے ماں سے اختلاف
ہے، ویسے ماں ہے بہت اچھی، اس کا آدمی اس کے سامنے
جوان جوان لڑکیوں کو لے کر گھومتا ہے، وہ سب کچھ دیکھتی ہے
اور کچھ نہیں کہتی۔

میں جانتی ہوں ماں اس وقت گھر کے کام کاج میں معروف
ہوگی اور ابا دن بھر کا حساب کتاب کر کے اور نوکروں کو تنخواہ دے
کر اپنی مخصوص جگہ بیٹھے شراب پی رہے ہوں گے اور ماں کو گالیاں
دے رہے ہوں گے۔ یہ ان کی اصل کی عادت ہے، اور ماں گالیوں
سے بے نیاز اپنا کام کرتی رہے گی کبھی کبھار گردن موڑ ھا کر انھیں
دیکھے گی اور بس ــــ پھر اچانک ابا، اماں سے پیار بھری باتیں
کرنا شروع کر دیں گے اور ماں تمام کھڑکیاں دروازے بند کر کے
ان کے ساتھ سو جائے گی۔ آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں
ان دونوں سے محبت کرتی ہوں یا نفرت۔

پہلے ابا مل میں کام کرتے تھے۔ آسانی سے گزر بسر ہو جاتی تھی
پھر مل میں بے مدت ہڑتال جو شروع ہوئی تو ختم ہی نہ ہوئی۔ ایک سال
وہ ادھر اُدھر بھٹکتے رہے پھر انھوں نے شراب کا دھندا شروع کر دیا۔ پیتے
تو وہ پہلے ہی سے تھے پھر جلد ہی انھیں پرمٹ بھی مل گیا اس وقت میں
نویں جماعت میں تھی انھوں نے مجھے اسکول سے اٹھا لیا ــــ میری خوشی

کی انتہا نہ رہی پڑھائی سے میری جان نکلتی تھی۔ خواب دیکھنا اپنے آپ سے باتیں کرنا، کہنیوں تک چوڑیاں پہننا اور مہندی لگانا مجھے اچھا لگتا تھا۔ کیسی بھی مہندی ہو میری ہتھیلی پر لگنے کے بعد خون کی طرح سرخ ہو جاتی تھی۔

اسکول چھوڑنے کے بعد اب میرا کام یہ تھا کہ شام ہوتے ہی اُبلے ہوئے چنے اور تلی ہوئی بانگڑا مچھلی لے کر ایک کونے میں بیٹھ جاتی تھی یسورج غروب ہوتے ہی گاہک طلوع ہونا شروع ہو جاتے۔ عجیب عجیب لوگ آتے تھے روتے ہوئے، ہنستے ہوئے، چھپتے چھپاتے ــــ ایک عجیب سی بو چاروں طرف پھیل جاتی سگریٹ اور بیڑی کے دھوئیں میں ڈوبے لوگ ہنستے قہقہے لگاتے اور اونچے اونچے سروں میں جانے کیا کیا باتیں کرتے رہتے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو بڑی جلدی میں آتے کھڑے کھڑے غٹاغٹ شراب کا جام چڑھاتے اور منہ بسورتے ہوئے ساسر میں رکھا نمک چکھتے اور پھر یہ جا وہ جا۔

شروع شروع میں یہ کام کرتے ہوئے بہت گھبراہٹ ہوتی اور بڑی شرم آتی تھی مگر آہستہ آہستہ میں اس کام اور اس ماحول کی عادی ہو گئی۔ ان سبھوں میں سیاہ آنکھوں اور بڑے بڑے بالوں والا وہ شخص مجھے بہت یاد آتا ہے جسے سب قلندر کہتے تھے۔ اس کے کاندھے پر ہمیشہ ایک مٹیالا سا جھولا لٹکا رہتا جس میں الم غلم چیزیں ٹھسی رہتی تھیں۔ وہ ایک چھوٹا سا اسٹول لے کر بالکل میرے پاس بیٹھ جاتا اور باتیں شروع کر دیتا اور آہستہ آہستہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے۔

اس کے چہرے پر بڑی پُراعتماد ہنسی ہوتی اور جب وہ ہنستا تو اس کے گالوں میں گڑھے پڑ جاتے۔ عجیب عجیب باتیں کرتا تھا وہ ــــ تیسری دنیا، غریب، انقلاب، شعور، استحصال اور جانے کیا کیا میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر جس انداز سے وہ مٹھیاں بھینچتا، جس طرح اس کی آنکھیں گردش کرتیں، صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ضرور خوفناک اور خطرناک قسم کی باتیں کر رہا ہے۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگتا ــــ پھر وہ بات توڑ کر مجھ سے مخاطب ہوتا ــــ "لیکن منی تو غم نہ کر" وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا۔ "تیرے ہاتھ کی لکیریں تو ریڈیم کی طرح چمک رہی ہیں۔ تجھے زندگی میں وہ سکھ ضرور ملے گا جو ہمیں نہیں ملا۔"

"سچ!" میں خوشی کے مارے پاگل ہو جاتی "کب آئے گا وہ دن" میں بے چین ہو جاتی اور میری خوشی دیکھ کر وہ دکھی ہو جاتا۔ اس کی آواز مدھم ہو جاتی۔

"کب آئے گا وہ دن ــــ یہ تو میں نہیں بتا سکتا لیکن آئے گا وہ دن ضرور" وہ مجھے جواب دیتا اور پھر اچانک ابا سے کہنے لگتا "ماسٹر صاحب آپ اپنی لڑکی کو یہاں مت لایا کرو" ابا معنی خیز انداز میں مسکراتے پھر اچانک وہ خاموش ہو جاتا اور جھولے میں سے کچھ نکال کر پڑھنے لگتا۔

ماں کہتی تھی ہر چیز کے خدا نے جوڑے پیدا کیے ہیں سو آج میری شادی کو دس برس ہو گئے ہیں اور ان دس برسوں میں میں نے پانچ بچوں کو جنم دیا ہے۔ منّا نیند میں بڑی زور سے رو یا ہے کل رات اسے چوہے نے کاٹ کھایا تھا، وہ حصہ اب سوج گیا ہے آما یلدی لگانے سے کچھ فائدہ ہوا ضرور ہے لیکن درد ابھی باقی ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ میری شادی ہو گئی۔ پانی بھرنا، کپڑے دھونا کپڑے سینا، کھانا پکانا یہ سب کام تو پہلے بھی میں اپنے گھر میں کرتی تھی لیکن شوہر کے لیے یہ سارے کام کرنا اچھا لگتا تھا اور اس لمحے کو تو میں کبھی نہیں بھول سکتی جب مجھ میں ایک نئی زندگی نے جنم لیا اور میرے سینے میں دودھ کا چشمہ پھوٹا اور میں ماں بنی مگر آہستہ آہستہ ــــ جیسے دھیمی آنچ پر گھی پگھلتا ہے مجھے محسوس ہونے لگا جیسے میں ایک چہار دیواری سے دوسری چہار دیواری میں آ گئی ہوں۔ کچھ بھی نہیں بدلا ــــ

بس صرف میں بدلتی جا رہی ہوں۔ پھر وہ بھی مجھ سے دور ہوتا چلا گیا غیر محسوس طریقے پر بالکل گزرتے وقت کی طرح ــــ اسے چمکتا رنگ پسند ہے اور یہ رنگ مجھ پر سے چھوٹ گیا ہے۔ اسے گدر یلی گولائیاں عزیز ہیں اور میں نے پانچ بچوں کو دودھ پلایا ہے۔ میرا رنگ، میری آنکھوں کی چمک، میری تازگی اور میرا حسن میرے بچوں میں پل رہا ہے ــــ اب وہ رات گئے آتا ہے شراب پی کر ــــ کبھی کبھی وہ بڑی روانی اور بے تکلفی سے اپنی عیاشیوں کو مزے لے لے کر بیان کرتا ہے۔ میں سنتی ہوں اور ہنس کر ٹال جاتی ہوں ــــ نہیں نہیں، آپ غلط سمجھے ایسی بات نہیں ہے کہ میرا سینہ بہت کشادہ ہے بلکہ مجھے اپنے گھر کی چھت عزیز ہے۔

آپ غور سے سن رہے ہیں نا؟

گھر کا خرچ بہت بڑھ گیا، قرض کی نوبت آگئی، مہینے کی آخری تاریخوں میں خالی برتن لے کر پڑوسیوں کے ہاں جانا پڑتا ہے۔ ان سے پیسے مانگو تو گالیاں اور مار کھاؤ — تنگ آکر ایک دن میں نے یہ کیا کہ بچوں کو ہمراہ لیا اور گھر چھوڑ کر ماں کے ہاں آگئی۔ گالوں پر طمانچے اور گردن پر گلا دبانے کا نشان زندہ تھا، باقی باتیں بچوں نے بتادیں — دو تین ہفتے میں آرام سے رہی، اسی طرح ایک مہینہ گزر گیا پھر آہستہ آہستہ ماں نے مجھے سمجھانا شروع کیا — جاؤ — بیٹی اپنے گھر جاؤ۔ وہی تمہارا گھر ہے۔ میں اس نرک کی زندگی گزارنا نہیں چاہتی تھی مگر ماں مجھے سمجھاتی "اری پاگلی طلاق دے دیں گے، بچوں کو چھین لیں گے پھر تو کیا کرے گی؟"

پھر خود ماں بھی رونے لگتی اور کہتی "ٹھنڈے دل سے سوچو۔ دیکھو میں نے کس طرح تم لوگوں کو پال پوس کر بڑا کیا اور ..." اب آپ سے کیا بتاؤں جب بچوں کو لے کر واپس جارہی تھی تو ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کسی دیوی کے سامنے پھولوں کی بھینٹ لے کر جارہی ہوں۔ بس صرف پہلی مرتبہ ایسا احساس ہوا اور اس کے بعد تو خود میں بھی عادی ہوگئی۔ جھگڑا ہوتا وہ مجھے مار پیٹ کر گھر سے نکال دیتے میں وہاں سے یہاں آجاتی ماں کے ہاں مہینے دو مہینے رہتی پھر ماں سمجھا بجھا کر مجھے میری سسرال چھوڑ آتی۔ زندگی گزرتی رہی۔

ویسے اب میری دنیا بچوں میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ میں ردی کاغذ کے لفافے بناتی۔ اور بچے صبح و شام اطراف کے گھروں اور کالونیوں میں — ملک کالونی کا دودھ تقسیم کرتے۔ اب پیسوں کا رونا نہیں تھا اور ہاں یہ بتانا تو آپ کو میں بھول ہی گئی کہ مجھے پانچواں مہینہ لگ چکا تھا۔ رات میں سوتے وقت جب کبھی میں اپنے ابھرے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیرتی تو اندر کا وجود باہر کی گرمی پاکر گھوم گھوم جاتا۔

تو ہوا یوں کہ — ایک رات میں سو رہی تھی کہ وہ چند ساتھیوں کے ساتھ آئے۔ سب کے سب نشے میں تھے — سب کے لیے کھانا بنانا تھا۔ میں نے سب کچھ کیا جیسا وہ بولتے رہے میں کرتی رہی پھر نہ جانے وہ کس بات پر ناراض ہوئے اور غصہ ہوئے مجھے ٹھیک سے یاد نہیں — کھانا خراب بنا تھا یا پروسنے میں مجھ سے کچھ غلطی ہوگئی تھی — پہلے انھوں نے مجھے گندی سی گالی دی اور پھر اچانک ان کی لات میرے پیٹ پر پڑی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے لگا جیسے کسی نے گرم گرم دہکتی ہوئی سلاخ میرے پیٹ میں گھسا دی ہو اور بس اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا — ہوش مجھے ہسپتال میں آیا — ایک چہرہ مجھ پر جھکا ہوا تھا "بیٹی" ایک ایسی آواز جیسے کوئی اندھے کنوئیں میں سے مجھے آواز دے رہا ہو — یہ میری ماں کی آواز تھی — "بیٹی ہم نے ڈاکٹر کو یہ بیان دیا ہے کہ باتھ روم میں تمہارا پیر پھسلا — اس لیے — ایسا ہوا" — پیٹ میں ان گنت کیکڑے بڑے بڑے ڈنکوں سے مجھے اذیت پہنچاتے رہے — "ہاں بیٹی — ہم نے ڈاکٹر کو ایسا ہی بتایا ہے اگر تم کچھ اور کہوگی تو پولیس کیس ہو جائے گا" — میں آنکھیں بند کیے پڑی رہی اور کراہتی رہی اور آنکھوں سے آنسوؤں کی لکیریں تکیے میں جذب ہوتی رہیں پھر میں نے آنکھیں کھولیں سامنے پولیس، ڈاکٹر اور ڈاکٹرنی، ابا، اماں، شوہر اور بچے کھڑے تھے۔ اور ان سب لوگوں کے سامنے میں نے بیان دیا۔ "میں باتھ روم میں تھی میرا پیر پھسلا اور میں گر پڑی ... اس لیے ..." اس کے بعد مجھ سے کچھ کہا نہیں گیا میں رو پڑی — بچہ دانی بچہ ڈھونڈتی رہی اور اس عالم میں مجھے گیان ہوا۔

کیا گیان ہوا اس کا بیان آگے آئے گا۔

چار مہینے تک میری حالت بہت خراب رہی۔ اگر وہ سانحہ مجھ پر نہ گزرا ہوتا تو آج میرا بچہ میری گود میں میرے سینے سے لپٹا ہوا دودھ پی رہا ہوتا مگر اب تو ...

ایک رات میں سو رہی تھی کہ اس کا ہاتھ میرے سینے پر سانپ کی طرح رینگنے لگا، انگلیاں سنپولوں کی طرح چلنے لگیں۔ "ہاتھ مت لگاؤ مجھے۔" میں اتنے زور سے بولی کہ اپنی آواز پر خود مجھے بھی حیرت ہوئی — "کیوں بھونک رہی ہو؟ بچے جاگ جائیں گے۔" "یاد رکھو اگر تم نے مجھے ہاتھ لگایا تو —" میری آواز کی مضبوطی بدستور قائم تھی "کیوں نہیں ہاتھ لگاؤں؟" وہ مکاری سے ہنسا۔ "آخر کو تم میری پتنی ہو میں تمہارا شوہر ہوں۔" پھر اس چھینا جھپٹی میں بچے جاگ اٹھے اور رونے لگے ان کے ساتھ میں بھی رونے لگی اور اس کے زہریلے قہقہے دیر تک مجھے کچوکے لگاتے رہے۔

(بقیہ ص ۲۸ پر)

وقار واثقی

دوہے

لاکھوں گھر میں دیکھ چکا، گھر کی مجھے پہچان
وہ تو تیرا گھر نہیں، جس میں ہو دربان

ٹیڑھا میڑھا راستہ، پگ پگ ٹھوکر کھاؤں
تو ہی بتلا راستہ، تجھ تک کیسے آؤں

ننھے تارے کیا کریں، چاند کھڑا ممیائے
گھور گھٹا کے سامنے، سورج مُنہ کی کھائے

گوری تیرے گاؤں سے، اب ہوں اتنی دُور
جنم جنم کا ناسنک، ہری سے جتنی دور

پیدل چل کر آئیں گے، جانے کب ہو میل
اے ری سکھی، اِس گاؤں میں کب آئے گی ریل

صابر فخر الدین

نظمیں

- وہ شب گزیدہ مُسافر
جو ساری رات چلے
ہوئی جو صبح تو دیکھا...
ہنوز ہم تو اُسی شہرِ بے چراغ میں ہیں

- جزیرے خواب کے ــــ
بے خوابیوں کا نوحہ کرتے ہیں!
مگر نیندیں تو
کب کی جاگتے صحرا کا حصّہ
بن چکی ہوں گی!!

- میری پیدایش پر، ماں نے
کشٹ سہے تھے
لیکن میں تو مرتے دم تک
پیدایش کے کشٹ سہوں گا!!

"... مغل فنِ تعمیر کی آخری بڑی اور اہم عمارت صفدر جنگ کا مقبرہ ہے، جسے صفدر جنگ کے صاحبزادے نواب شجاع الدولہ نے تین لاکھ روپے کی لاگت سے مشیدی ہلال محمد خاں کے زیرِ اہتمام تعمیر کرایا ..."

دِلّی کے آثارِ قدیمہ

خلیق انجم

درگاہ شاہِ مرداں

پہلی دو قسطوں میں نواب قدسیہ کے بنائے ہوئے محل، باغ اور سنہری مسجد کی تفصیلات بیان کی گئی تھیں، اب اُن عمارتوں کا ذکر کیا جائے گا، جو نواب صاحبہ نے علی گنج میں تعمیر کی تھیں۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ شاہ جہاں کی وفات کے بعد مغل دربار نے فنونِ لطیفہ کی سرپرستی اور اُن کی ترقی و فروغ میں حصہ لینا تقریباً بند کر دیا تھا۔ اورنگ زیب کے زمانے میں تو اس کی وجہ نظریاتی تھی بعد میں نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے شاہی خزانہ بالکل خالی کر دیا اور حکومت اتنی کمزور ہوگئی کہ آمدنی کے ذرائع غیر معمولی طور پر محدود ہوگئے ایسی صورت میں عمارتوں کی تعمیر کا کسے خیال آسکتا تھا۔ غالباً نواب قدسیہ صاحبہ مغل خاندان کی آخری فرد ہیں، جنھوں نے اس عہدِ زوال میں دِلّی میں کچھ عمارتیں تعمیر کیں۔ مغل فنِ تعمیر کی آخری بڑی اور اہم عمارت صفدر جنگ کا مقبرہ ہے، جسے صفدر جنگ کے صاحبزادے نواب شجاع الدولہ نے تین لاکھ روپے کی لاگت سے مشیدی ہلال محمد خاں کے زیرِ اہتمام تعمیر کرایا۔ صفدر جنگ کے مقبرے کے مشرق میں ایک موضع تھا "جوڑ باغ" اب یہاں عالیشان کوٹھیاں ہیں اور کالونی کا نام جور باغ ہے۔ اربندو مارگ پر صفدر جنگ کے مقبرے سے مہرولی کی طرف جاتے ہوئے تھوڑے سے فاصلے پر جور باغ کی طرف ایک سڑک جاتی ہے، آج کل اس سڑک کا نام جور باغ روڈ ہے۔ آزادی سے قبل یہ کربلا روڈ کہلاتی تھی۔ اس سڑک پر چل کر تھوڑی دُور پر کربلا واقع ہے۔ اس کے بعد تھوڑی دُور چل کر دائیں طرف ایک سڑک مڑتی ہے، جو درگاہ شاہ مرداں کی طرف جاتی ہے۔ اس سڑک کے دونوں طرف حکومت نے کوارٹر بنا کر پناہ گزینوں کو دے دیے ہیں اور اس کالونی کا نام بی۔ کے۔ دت کالونی رکھا ہے۔ یہ پورا علاقہ علی جی یا علی گنج یا شاہ مرداں کہلاتا تھا۔ یہ دراصل موضع علی گنج تھا۔ درگاہ شاہ مرداں بننے کے بعد یہ نام پڑا یا پہلے ہی سے تھا، یہ بتانا مشکل ہے۔ موضع علی گنج میلوں میں پھیلا ہوا تھا۔ یہاں پوری بستی تھی۔ بہت بڑا قبرستان تھا۔ بڑے بڑے کھیت تھے۔ عام طور سے مسلمان آباد تھے، لیکن ہندو کاشت کاروں کی بھی خاصی بڑی آبادی تھی۔

علی گنج کے شمالی دروازے کی پیشانی پر سنگِ مرمر کی تختی لگی ہوئی تھی، جس پر ایک کتبہ نصب تھا۔ اس کتبے سے پتا چلتا ہے کہ نواب قدسیہ نے نواب بہادر جاوید خاں کے زیرِ اہتمام عہدِ احمد شاہ (۱۷۴۸ء سے ۱۷۵۴ء تک) میں ایک سال
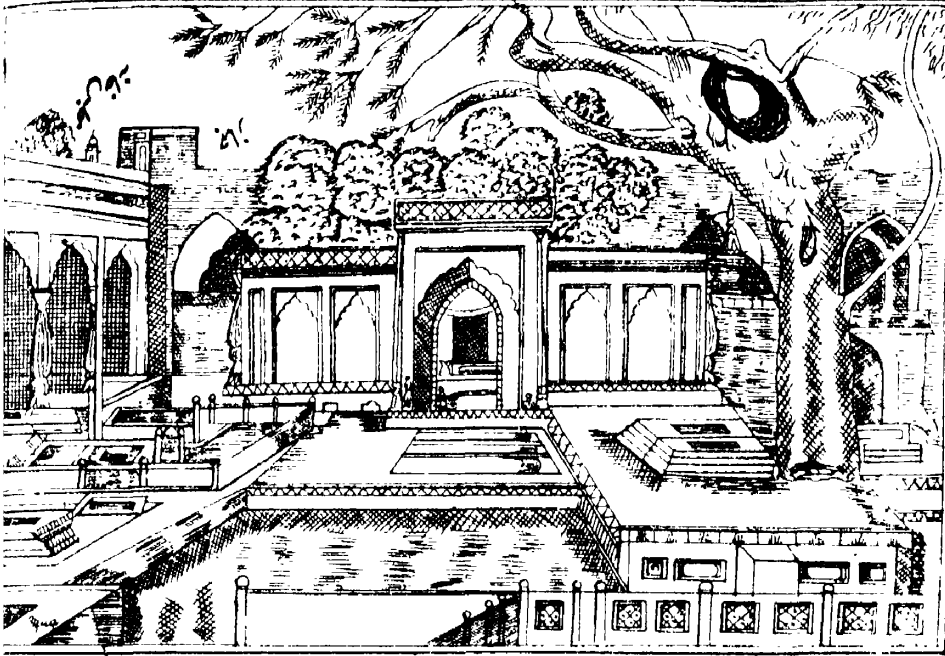
شاہ مرداں کا وہ نقشہ جو سرسید نے ۱۸۴۷ء میں آثار الصنادید میں شائع کیا تھا۔

کی مدت میں قلعہ، مجلس خانہ، مسجد اور حوض تعمیر کیا تھا۔ قلعے سے مراد وہ فصیل ہے جو علی گنج بستی کے گرد بنائی گئی تھی۔ کتبے کی عبارت یہ تھی :

"قال محمد حبیب اللہ انا مدینۃ العلم و علی بابہا
۱۱۶۲ ہجری در عہد مبارک احمد شاہ بہادر بادشاہ
غازی بہ موجب ارشاد نواب قدسیہ حضرت صاحب
زمانیہ باہتمام نواب بہادر جاوید خاں صاحب
بسر براہی خاکسار لطف علی خاں تعمیر قلعہ و مجلس
خانہ و مسجد و حوض در یکسال مرتب شدہ"

درگاہ شاہ مرداں یا درگاہ قدم مبارک

اگرچہ شاہ مرداں اور اس سے متعلق عمارتوں کا ذکر پہلی بار غالباً درگاہ قلی خاں نے "مرقع دہلی" میں کیا تھا۔ لیکن درگاہ قدم مبارک کا تفصیلی ذکر پہلی بار بشیرالدین احمد نے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اب درگاہ شریف میں چلیے، جس کا مشرق رویہ دروازہ ۹ ½ فٹ اونچا اور ۶ فٹ ۳ انچ چوڑا چوکی دار ہے، جس کے پٹ چوبی ہیں۔ لیکن جیسا عالیشان عمارت ہے، ویسا دروازہ نہیں۔ یہ درگاہ ایک بڑے احاطے کے اندر ہے، خود درگاہ کا احاطہ ۳۶ فٹ ×۲۶ انچ ـــــ ۸ فٹ ـــ ۸ انچ اونچا سنگِ مرمر کی نفیس سلوں کا ہے۔ جنوبی دیوار میں دس پوری سلیں سنگِ مرمر کی نصب ہیں اور نصف نصف سلیں کونوں میں اور ایسے ہی شمالی دیوار میں۔ مشرق کی طرف داخلی دروازہ ۷ فٹ ۹ انچ اونچا ۵ فٹ عریض ہے جس کی چوکھٹ سنگِ مرمر کی ہے اور پٹ چوبی۔ دروازے کے ادھر ادھر دو سلیں سنگ مرمر کی ہیں، جو ایک رخ چار دیواری کا ہے۔ اسی طرح مغرب کی دیوار میں دو سلیں سنگِ مرمر کی اور بیچ میں ایک معمولی سادہ دروازہ ہے۔ اس دروازے کے دونوں پاکھوں پر سنگِ مرمر کے کچھ کتبے دوسری جگہ سے لاکر نصب کر دیے ہیں کہ رونددن میں آتے تھے[1]

داہنے پاکھے پر :

اللہ محمد علی
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
اللہ محمد علی فاطمہ حسن حسین علی
محمد جعفر موسیٰ علی محمد علی

---

[1] اب یہ کتبے یہاں نہیں ہیں۔

شاہ مرداں میں قدم مبارک کا احاطہ

حسن محمد علیہم السلام
تاریخ وفات شرف النسا بیگم عرف حاجی بیگم مرحومہ
—— نبتِ مرزا سید محمد گلستانہ عرف مرزا جانی مرحوم
—— دوازدہم شہر ربیع الثانی روز یکشنبہ ۱۲۱۶ء۔
بائیں پاکھے پر:
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
۱۱۴۹

صحن درگاہ میں سنگِ مرمر کی سلوں کا فرش ہے جس کے بیچ میں ایک پرانا درخت نیم کا بھی کھڑا ہے۔ قدم شریف کی اصل جگہ اسی احاطے کے بیچوں بیچ سنگ مرمر کا ایک چبوترہ ۸ فٹ × ۵ ½ انچ —— ۲ فٹ ۵ انچ اونچا ہے، جس پر ٹین کا صندوق نما پٹاؤ کر دیا ہے اور ٹین کو سبز رنگ کا رنگ دیا ہے، اس صندوق کے دونوں طرف لمبان میں کھلنے بند ہونے والی کھڑکیاں رکھ دی ہیں۔ اس کے اندر سنگِ مرمر کا ایک نہایت خوب صورت حوض ۴ فٹ ۲ انچ لمبا اور ۲ فٹ ۱۰ انچ چوڑا —— ۱ فٹ ۳ انچ عمیق ہے۔ اس کے اندر قدم مبارک ہے، جس میں خوشبو دار پانی اور پھول پڑے رہتے ہیں۔ اس حوض کے کنارے عرض میں ایک طرف یہ شعر کندہ ہے۔

برزمینے کہ نشان کفِ پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

لہ جہاں بھی قدم شریف کے حوض پر کندہ اس شعر کا ذکر کیا گیا ہے، اس لفظ کو "زمینے" لکھا گیا ہے، اور یہی درست ہے، لیکن حوض پر "زمینے" نہیں "زمین" کندہ تھا، اس کی نشان دہی بشیر الدین احمد نے کی ہے۔

سرسید نے آثار الصنادید کے پہلے اڈیشن میں قدمِ مبارک کے بارے میں بہت مختصر سی معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھا ہے: "اس جگہ (شاہِ مرداں) پتھر پر قدم کا نشان بنا ہوا ہے، اس نشان کو حضرت امیرالمومنین علی کرم اللہ وجہہ کے قدم کا نشان بیان کرتے ہیں..... اس نقشِ پا کو سنگِ مرمر کے حوض میں جمایا ہے اور اس کے کنارے پر یہ شعر کندہ ہے۔ کتبہ

بر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود"

۱۱۳۷ ہجری

(آثار الصنادید، پہلا اڈیشن، ص ۲۱۶)

دوسرے اڈیشن میں قدم شریف کے سلسلے میں نواب قدسیہ کا ذکر کرتے ہوئے سرسید لکھتے ہیں: "نواب قدسیہ صاحب الزمانی کے پاس ۱۱۳۷ ہجری مطابق ۱۷۲۴ء میں ایک پتھر آیا، جس پر نقشِ قدم تھا اور یہ بیان کیا گیا کہ یہ حضرت علی کے قدم کا نقش ہے، نواب قدسیہ نے اس نقشِ قدم کو اس مقام پر سنگِ مرمر کے حوض میں جما دیا اور اس حوض کے نیچے سنگِ مرمر کا فرش کر کر مجر بنایا اور اُس کے کنارے پر یہ شعر کندہ کر دیا۔ شعر:

بر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود"

۱۱۳۷ ہجری

(آثار الصنادید، دوسرا اڈیشن، باب سوم، ص ۸۷)

آثار الصنادید کے تمام اڈیشنوں میں شعر کے نیچے جو سنہ دیا گیا ہے وہ ۱۱۳۷ھ ہے، جب کہ واقعاتِ دارالحکومت دہلی (جلد سوم، ص ۶۵) اور مسلم اور ہندو آثارِ قدیمہ کی فہرست (انگریزی) (جلد دوم، ص ۱۹۵) میں یہ ۱۱۷۳ھ ہے۔ اب وہ حوض اور کتبہ باقی نہیں ہے، اس لیے یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے، لیکن چوں کہ دو مُصنّفین نے ۱۱۷۳ھ لکھا ہے اس لیے گمان ہوتا ہے کہ سرسید کو سہو ہوا۔

پوری کوشش کے باوجود میری سمجھ میں نہیں آیا کہ حوض پر ۱۱۷۳ھ کس نے اور کیوں کندہ کرایا۔ بہ ظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حوض کی تاریخِ تعمیر ہے اور اس شعر سے تاریخ نکلتی ہے لیکن شعر سے کسی طرح بھی یہ تاریخ نہیں نکلتی، جس کا مطلب ہے کہ اس سنہ کا شعر سے کوئی تعلق نہیں۔ اب سرسید کے بیان پر غور کیا جائے۔ سرسید کا کہنا ہے کہ "۱۱۳۷ھ میں نواب قدسیہ کے پاس قدم شریف آیا" یہ سنہ ۱۱۳۷ھ ہو یا ۱۱۷۳ھ دونوں صورتوں میں نواب قدسیہ کا قدمِ مبارک سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔ نواب قدسیہ کے اقتدار کا زمانہ ۱۱۶۲ھ تا ۱۱۶۸ھ (مطابق ۱۷۴۷ء تا ۱۷۵۴ء) ہے۔ ۱۱۶۲ھ میں انھوں نے علی گنج کی عمارتیں تعمیر کرائی تھیں۔ ۱۱۳۷ھ میں اس لیے ممکن نہیں کہ اس زمانے میں نواب قدسیہ اقتدار میں نہیں تھیں، اس لیے وہ اتنی بڑی رقم خرچ نہیں کرسکتی تھیں اور ۱۱۷۳ھ میں تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیوں کہ ۱۱۶۸ھ میں انھیں گرفتار کرلیا گیا تھا اور ممکن ہے کہ ۱۱۷۳ھ سے قبل ہی اُن کا انتقال ہوگیا ہو۔

نواب قدسیہ، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، ۱۷۴۷ء میں اقتدار میں آئی تھیں۔ درگاہ شاہ مرداں اور قدم شریف اس سے پہلے موجود تھے۔ نواب ذوالقدر درگاہ قلی خاں سالار جنگ ۱۷۳۸ء میں حیدرآباد سے دِلّی آئے تھے۔ اور ۱۷۴۱ء میں واپس گئے۔ اس دوران میں انھوں نے "مرقع دہلی" کے نام سے دہلی کے حالات لکھے ہیں۔ نواب صاحب نے درگاہ شاہ مرداں کے بارے میں لکھا ہے کہ قدم گاہ حضرت علی بادشاہی قلعے سے تین کروہ کے فاصلے پر ہے۔ زائرین شنبہ کے دن زیارت کے لیے جوق جوق آتے ہیں۔ ۱۲۔ محرم کو اربابِ تعزیہ بردلِ محزون اور چشمِ گریاں کے ساتھ عزاپرسی کے لیے اس مکانِ خلد آستاں میں جمع ہوتے ہیں[1]۔ مرقع دہلی کے مرتّب حکیم سید مظفر حسین نے مقدمے میں قدم شریف کے حوض اور اس پر کندہ شعر کا ذکر کیا ہے، لیکن نواب نے ایسی کوئی اطلاع نہیں دی۔ میرا خیال ہے کہ حکیم صاحب کا ماخذ "آثار الصنادید" ہے۔ اس کا ثبوت بھی موجود ہے کہ نواب قدسیہ کی ولادت سے کم سے کم ڈیڑھ سو سال قبل قدم شریف یہاں موجود تھا۔ صمصام الدولہ شہنواز خاں نے

۱؎ مرقع دہلی، متن، ص ص ۲—۳۔

مہابت خاں کے بارے میں لکھا ہے کہ "شروع میں کسی مذہب کا پابند نہ تھا۔ آخر میں امامیہ مذہب اختیار کر لیا تھا۔ ائمہ معصومین کے نام قیمتی جواہر پر کھدوا کر اپنے گلے میں باندھتا تھا"[۱]

شہنواز خاں نے یہ بھی لکھا ہے کہ مہابت خاں کا انتقال ۱۰۴۴ھ مطابق ۱۶۳۴ء - ۱۶۳۵ء) میں ہوا۔ مہابت خاں نے وصیت کی تھی کہ "میرے تابوت کو دہلی لے جا کر شاہ مرداں کے قدموں کے نیچے دفن کریں..... راجپوت اُس کی وصیت کے مطابق اس کو برہان پور سے دہلی تک اس طریقے سے لے گئے، جیسے اس کی زندگی میں مجرا و سلام کیا کرتے تھے"[۵]۔ اس کا مطلب ہے کہ ۱۶۳۴ء میں درگاہ شاہ مرداں دلّی میں موجود تھی اور اُس میں قدم مبارک موجود تھا، یہ درگاہ اور اس میں قدمِ مبارک کب سے ہے، یہ بتانا فی الحال ممکن نہیں۔

۱۹۴۷ء میں جب ہندو مسلم فساد ہوا اور تمام مسلمان علی گنج چھوڑ کر پاکستان یا کسی محفوظ مقام پر چلے گئے تو آغا مرزا نامی ایک نوجوان (آغا مرزا صاحب بفضلہٖ تعالیٰ حیات ہیں، انھوں نے درگاہ کی مرمت اور حفاظت کے سلسلے میں غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں) نے یہاں سے قدم شریف نکال کر کشمیری گیٹ کی درگاہ پنجہ شریف میں محفوظ کر دیا۔ اس عمل میں درگاہ قدم مبارک کا وہ حوض شہید ہو گیا، جس میں قدم شریف نصب تھا۔ جب کچھ امن جمی ہوئی تو آغا مرزا صاحب اور اُن کے ساتھیوں نے قدم شریف لاکر اس کی پرانی جگہ پر نصب کر دیا۔ آغا مرزا صاحب کے بیان کے مطابق دہلی کے ایک بزرگ سید وقار عبّاس رضوی مجنوں دہلوی نے حوض دوبارہ بنوایا اور اس کے اُوپر ٹین کا شیڈ ڈال دیا۔ جس احاطے میں قدم شریف کا حوض بنا ہوا تھا، اس کے مغرب میں ۲۰ فٹ لمبا اور ½۱۱ فٹ چوڑا ایک حجرہ ہے، جس پر چھت نہیں تھی۔ ۱۹۸۳ء میں اشرف علی سما کے صاحبزادے نے حجرے پر چھت ڈال کر قدم شریف اُس میں منتقل کر دیا۔ آج کل قدم شریف اسی حجرے میں ہے۔

مجلس خانہ : نواب قدسیہ نے جو مجلس خانہ تعمیر کرایا تھا، وہ قدمِ شریف کی پشت پر مغرب کی جانب تھا۔ مسلم اور ہندو آثارِ قدیمہ کی فہرست (انگریزی) میں اس مجلس خانے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ مجلس خانے کی لکڑی کی ہموار چھت ہے۔ یہ ایک مستطیل ہال ہے۔ جس کی لمبائی ۴۷ فٹ ۶ انچ اور چوڑائی ۱۶ فٹ ۴ انچ ہے۔ اس ہال کے جنوب میں ۱۲ فٹ ۶ انچ لمبا اور ۱۹ فٹ ۴ انچ چوڑا ایک کمرہ ہے۔ اس کمرے میں چاند کے ہر مہینے کی بیسویں تاریخ کو مجلس ہوتی تھی۔

نواب قدسیہ کا تعمیر کردہ یہ مجلس خانہ منہدم ہو چکا ہے۔ بشیر الدین احمد نے واقعاتِ دارالحکومت میں جہاز نامی ایک عمارت کی تفصیل بیان کی ہے اور اس کا مقام وہی بتایا ہے، جہاں "مسلم اور ہندو آثارِ قدیمہ کی فہرست" میں نواب قدسیہ کا مجلس خانہ بتایا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پہلے جس مقام پر نواب قدسیہ کا مجلس خانہ تھا، اس کے منہدم ہونے کے بعد وہیں جہاز نامی عمارت تعمیر کی گئی۔ بعد میں یہ عمارت بھی گر گئی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہال کے جنوب میں جس کمرے کا ذکر کیا گیا ہے، وہی نواب قدسیہ کا بنایا ہوا مجلس خانہ ہو۔ بہر حال وہ مجلس خانہ منہدم ہو چکا ہے۔

احاطہ قدمِ شریف کے جنوب میں ایک مجلس خانہ ہے، جس پر سنگِ مرمر کی تختی پر جو کتبہ لگا ہوا ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ ۱۲۲۳ھ (مطابق ۱۸۰۸ - ۱۸۰۹ء) میں عشرت علی خاں نے تہرے دالان کا یہ مجلس خانہ تعمیر کرایا۔ اس مجلس خانے میں قبریں تھیں، اب قبریں ہموار کر دی گئی ہیں اور ان کی لوحیں دیواروں پر نصب کر دی گئی ہیں۔ مجلس خانے کی شمالی دیوار پر ایک اور کتبہ نصب ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ ۱۳۰۲ھ میں نواب وزیر علی خاں نے اس کی مرمّت کرائی۔

نواب قدسیہ کی مسجد : درگاہ قدمِ شریف کے احاطے میں (قدم شریف کے شمال میں) ایک مسجد ہے، جس پر کتبہ نہیں ہے، اس لیے پورے یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ جا سکتا، لیکن گمانِ غالب ہے کہ یہی وہ مسجد ہے، جسے نواب قدسیہ نے تعمیر کیا تھا۔ میرے اس گمان کی بنیاد یہ ہے کہ قدم شریف کا احاطہ، مجلس خانہ اور مسجد تینوں درگاہ شریف

---

[۵] مآثر الامرا، مترجمہ ایوب قادری، جلد سوم، لاہور ۱۹۶۸ء، ص ۳۴۵۔
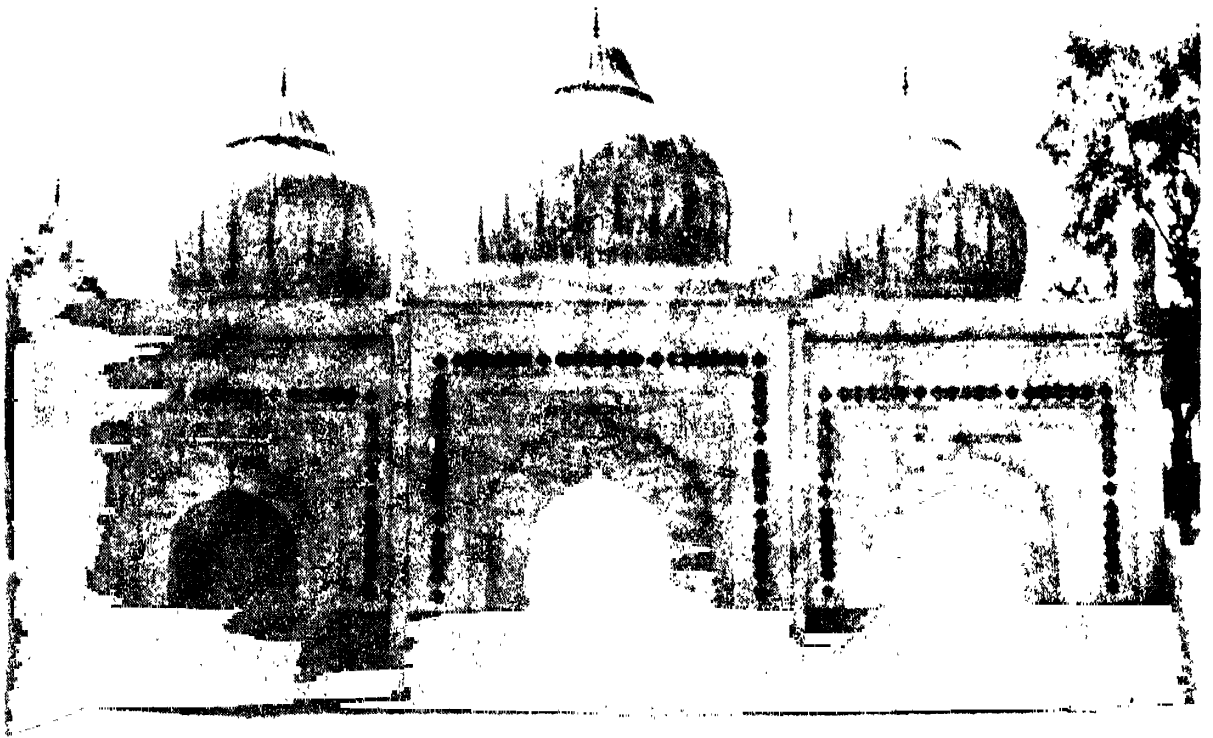
شاہ مرداں میں نواب قدسیہ کی تعمیر کردہ مسجد

کے احاطے میں تھے۔ جب مجلس خانہ اور قدم شریف کا احاطہ نواب قدسیہ نے تعمیر کیا تھا تو یہ مسجد بھی انھوں نے ہی بنوائی ہوگی۔ "مسلم اور ہندو آثارِ قدیمہ کی فہرست" میں بھی اسی مسجد کو نواب قدسیہ کی مسجد بتایا گیا ہے۔ اس مسجد کے تین سفید گنبد ہیں اور تین در ہیں۔ ½ ۴۰ فٹ لمبی اور ۱۲ فٹ چوڑی ہے۔ اس کے صحن میں لال پتھر کا ایک حوض ½ ۲۸ ف × ۱۵ ف ور تین فٹ گہرا تھا۔ حوض کے بیچ میں لال پتھر کا فوارہ تھا۔ ستعمال نہ ہونے کی وجہ سے یہ حوض مٹی سے اٹ گیا تھا اور س میں بہت اُونچی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ دس پندرہ سال پہلے یہ حوض بند کر دیا گیا۔ مسجد کے صحن میں کچھ اور زمین ملاکر سے اور وسیع کر دیا گیا، اور مسجد میں باقاعدہ نماز شروع کر دی گئی۔

فصیل: نواب قدسیہ نے علی گنج بستی کے چاروں طرف ایک عالی شان فصیل تعمیر کی تھی جسے کتبے میں "قلعہ" کہا گیا ہے اور جس کا اُوپر ذکر کیا جا چکا ہے، اب اس فصیل کا نام و نشان بھی باقی نہیں ہے، لیکن اس کی تفصیل بشیرالدین احمد نے ان الفاظ میں بیان کی ہے: "علی گنج کی بستی کے گرد ایک بڑی عالیشان فصیل بڑے وسیع حلقے کو گھیرے ہوئے ہے۔ یہ فصیل اسی وضع کی ہے، جیسی کہ شہر دہلی یا روشن چراغ دہلی کی ہے، اس میں بڑے بڑے دیوار دوز طاق بنے ہوئے ہیں۔ یہ فصیل سنگِ خارا کی ہے ۱۷ فٹ اُونچی اور ۳ فٹ کا کنگورا اس کے سوا ہے۔ کنگورا ملاکر ۲۰ فٹ کی اُونچان ہے۔ فصیل کے اُوپر چڑھنے کے دو رخے زینے اٹھارہ سیڑھیوں کے ہیں۔ اس شہر پناہ میں تین دروازے ہیں،

نرقی جانب کا دروازہ مسمار ہوگیا۔ شمال کی طرف کا روازہ وہ ہے، جس پر کتبہ ہے اور اُس کا حال ہم لکھ آئے یں۔ جنوبی دروازہ بھی بہت عالیشان اور اُسی وضع قطع کا ہے جیساکہ شمالی دروازہ ہے، یہ دروازہ بھی بڑی شان دار وکیوں دار اور دومنزلہ ہے، آگے ایک دروازہ ہے، پیچھے دوسرا۔ بیچ میں گنبد اور دوطرفہ بغلی میں دومنزلہ سہ دری یں۔ اس کی بلندی ۲۷ فٹ اور کنگورہ ۳ فٹ — جملہ ۳۰ ٹ ہے۔ چوڑان ۱۸ فٹ، ۴ انچ۔ اُوپر جانے کو ۲۷ سیڑھیوں کا زینہ ہے۔"

(واقعات دارالحکومت دہلی، جلد سوم، ص ۴۷)

اس فصیل کی تفصیل "مسلم اور ہندو آثارِ قدیمہ کی فہرست" (جلد دوم) میں بھی دی گئی ہے۔ اسی فصیل کے شمالی دروازے پر وہ کتبہ لگا ہوا تھا، جس کا شروع میں ذکر کیا گیا ہے ور جس میں نواب قدسیہ کا ذکر تھا۔ تقریباً تین صدی سے مسلمانوں اور خاص طور سے شیعہ حضرات کے لیے یہ مقام بہت مقدس اور متبرک رہا ہے۔ اس درگاہ میں حضرت علی کا نقش قدم اور حضرت فاطمہ کے پیالے کا نقش ہے[1]۔ آزادی کے بعد اتنے بڑے پیمانے پر ہندو مسلم فساد ہوا کہ علی گنج سے تمام مسلمانوں کو نکلنا پڑا اور فصیل کے اندر علی گنج میں پناہ گزیں آباد ہوگئے۔

دلچسپ معاملہ یہ ہے کہ ۱۹۱۱ء میں برطانوی حکومت نے کربلا اور علی گنج کی تمام زمین ایکوائر کر لی تھی اور متعلقہ لوگوں کو ان کا معاوضہ بھی دے دیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں جب پناہ گزیں یہاں آباد ہوگئے تو MINISTRY OF REHABILITATION نے ۱۹۵۱-۵۲ء میں یہ علاقہ صاف کرکے یہاں کواٹر بنانے شروع کیے۔ نواب قدسیہ کی تعمیر کردہ فصیل اور اس کے عالیشان دروازے گرادیے گئے۔ فصیل کے پتھر مکان اور سڑکیں بنانے کے کام آگئے۔ درگاہ قدم مبارک کے باہر بائیں طرف ایک مسجد تھی، اسے بھی شہید کردیا۔ اس کارروائی کو روکنے کے لیے جب مسلمانوں نے دوڑ دھوپ کی تو معلوم ہوا کہ حکومت بہت پہلے معاوضہ دے کر پورا علاقہ حاصل کر چکی ہے۔ شیعہ حضرات نے "گلدستۂ حیدری" کے نام سے ایک انجمن بنائی جس کے صدر کرنل بشیر حسین زیدی، سکریٹری سید اولاد علی رضوی ساقی اور خازن سید سلیمان عباس منتخب ہوئے۔ کچھ دن بعد "گلدستۂ حیدری" کا نام بدل کر انجمن حیدری کر دیا گیا۔ نواب حامد علی خاں سابق والیِ رام پور، نواب زین یار جنگ بہادر، ہمایوں مرزا انڈر سکریٹری وزارت خارجہ، پنڈت ویاس دیو مصرا بیرسٹر (جو بعد میں جسٹس ہوئے)، حسین علی جعفری صاحب، مولانا زبیر قریشی، مولانا احمد سعید، خواجہ حسن نظامی، مولانا حفظ الرحمن، آغا مرزا صاحب، شنکر پرشاد (چیف کمشنر دہلی) کی کوششوں سے درگاہ شاہ مرداں پناہ گزینوں سے خالی کرائی گئی۔ آزادی کے بعد چاند کے مہینے کی ہر بیس تاریخ کو مجلس پڑھنے کا سلسلہ ختم ہوگیا تھا، اس وقت شیعہ علما دلی میں نہیں تھے، اس لیے سنی علما مولانا احمد سعید اور مولانا زبیر قریشی نے کچھ عرصے تک مجلسیں پڑھیں۔ اب یہ سلسلہ مسلسل جاری ہے۔

---

[1] بشیر الدین احمد نے نقش کاسۂ حضرت فاطمہ علیہا السلام لکھا ہے۔ آج کل اس برج پر حضرت فاطمہ کی چکی لکھا ہوا

استدراک

۱۔ میں نے پہلی قسط میں ایڈورڈ پارک کے بارے میں لکھا تھا کہ یہاں ایڈورڈ پنجم کا مجسمہ تھا۔ حسین علی جعفری صاحب نے توجہ دلائی کہ یہاں ایڈورڈ ہفتم کا مجسمہ تھا۔

۲۔ دوسری قسط میں لکھا تھا کہ "احمد شاہ ۱۸۴۷ء میں تخت نشین ہوا اور ۱۸۵۴ء میں تخت سے اتار دیا گیا۔ سنہ میں کتابت کی غلطی ہے یہ ۱۷۴۷ء اور ۱۷۵۴ء ہیں۔

۳۔ پہلی قسط میں سنہری مسجد کے شمال میں درگاہ شاہ کلیم اللہ لکھا گیا ہے جو سہو قلم ہے میرا اشارہ درگاہ بھورے میاں کی طرف تھا۔

غزلیں

حیات لکھنوی

یہ بار بار مجھے کیا خیال آتا ہے
کہ جیسے دور سے کوئی مجھے بلاتا ہے

خدا کرے کوئی اُس کا بھی خواب پورا ہو
وہ کیسے کیسے ہوا میں محل بناتا ہے

کبھی جو گزری ہوئی ساعتوں میں کھو جاؤں
نفس نفس میں مرے کوئی گنگناتا ہے

میں ایک حرفِ غلط کی طرح ہوں اُس کے لیے
کبھی مٹاتا ہے مجھ کو کبھی بناتا ہے

یہاں تو کوئی بھی مجھ کو نظر نہیں آیا
وہ خوش نصیب جو اپنی مُراد پاتا ہے

بدلنے لگتی ہے دُنیا تمام رشتوں کی
جب ایک رشتۂ اُمّید ٹوٹ جاتا ہے

پڑھو حیات کو بھی پُر خلوص آنکھوں سے
وہ بے ہنر سہی لیکن ہنر دکھاتا ہے

اسعد بدایونی

مآلِ برگ ہوا کو پتا ہے یا مجھ کو
ہر ایک جبر خدا کو پتا ہے یا مجھ کو

ترے بدن کے فلک پر کئی ستارے ہیں
مگر یہ دل کے خلا کو پتا ہے یا مجھ کو

بس ایک نام سماعت میں زندہ ہے اب تک
وہ راز صرف ہوا کو پتا ہے یا مجھ کو

جو ایک خواب کی تصویر میں نظر آیا
وہ رنگ برگِ حنا کو پتا ہے یا مجھ کو

نہیں وہ جسم نہیں، پھول ہیں لباس میں قید
یہ بات بندِ قبا کو پتا ہے یا مجھ کو

اکیلے میں بھی کبھی بھول کر نہ رویا میں
مری شکست خدا کو پتا ہے یا مجھ کو

"۔۔ لذت سے کنارہ کشی کے لیے پہلے اس میں ڈوبنا بھی لازمی ہے —— لذتوں کے لیے بوند بوند ترسنے والا لذت سے کنارہ کشی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

گرتی ہوئی دیواروں کے پیچھے رہنے والوں کی آنکھیں سنہری جھنوں کے سپنے آسانی سے نہیں توڑ پاتیں ۔۔۔"

جیون گیان

صبیحہ انور

چپلیں اتار کر جب میں نے زردی مائل سفید پتھروں والے فرش پر قدم رکھا تو ایک عجیب سی ٹھنڈک سرایا میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بچے مجھ سے آگے نکل چکے تھے، میں ابھی نچلی سیڑھیوں پر ہی کھڑی گرد و پیش کے سحر میں کھوئی ہوئی تھی۔

"بدھم، شرنم، گچھامی ۔ نووم ۔ نووم گچھامی" کی پراسرار آوازوں سے سارا ماحول بوجھل تھا۔ اونچے درختوں سے گھری سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے میں نے پیچھے گھوم کر دیکھا۔ دور پھاٹک پر نیلے رنگ کی موٹر کھڑی تھی۔ میں اور میرے دونوں بچے گوتم بدھ کی آخری آرام گاہ کی سیر کا اشتیاق لیے زبردستی یہاں اتر پڑے تھے —— ہم لوگ ایک لمبے سفر سے واپس آ رہے تھے۔ میرے شوہر کو سفر کے درمیان ایسی غیر سنجیدہ اور طویل تفریحیں قطعی پسند نہیں ہیں۔ گاڑی کے اکتا دینے والے سفر اور خراب موسم نے یونہی ان کا موڈ خراب کر رکھا تھا —— اسی لیے اس وقت اس پُراسرار معبد میں، میں بچوں کو گائیڈ کر رہی تھی اور وہ گاڑی میں سگریٹ پیتے ہوئے ہم سب کا انتظار کر رہے تھے۔ پھاٹک سے اسٹوپ تک کافی لمبا راستہ ہے۔ ہم لوگ راستے میں نصب پیلے بورڈوں کو پڑھتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے جن پر کالی عبارت میں گوتم بدھ کی زندگی کی تفصیلات درج تھیں۔

گوتم بدھ کی زندگی میں تین درختوں کا ذکر نمایاں طور پر ملتا ہے۔ پہلا درخت وہ تھا جس کے نیچے میکے جاتے وقت دورانِ سفر سدھارتھ کی ماں نے انھیں جنم دیا تھا۔ دوسرا وہ اہم درخت جس کے نیچے انھیں حقیقت کی روشنی یا جیون گیان ملا تھا۔ اور تیسرا وہ درخت تھا جس کے سائے میں انھیں بیماری، بڑھاپے اور موت کی فکروں سے نجات ملی تھی۔ میں نے غور سے ایک ایک کو پڑھا۔ مگر درختوں کے سائے میں کہیں اس درخت کا ذکر نہیں تھا جس کا نام کلپ ترو تھا۔ دیومالا کا وہ درخت جو سمندر منتھن سے نکلا تھا اور اس کے پھولوں سے اپنی مرضی کے مطابق کوئی بھی خوشبو سونگھی جا سکتی ہے۔ اور جس کے نیچے کی گئی ہر خواہش پوری ہوتی ہے۔

میں نے پنجوں کے بل پر اونچے ہو کر دیکھا نیچے ترائی میں دور تک جنگل سیڑھیاں اترتا چلا گیا تھا۔ ہر طرف سبز اندھیرا جھک آیا تھا۔ کہیں کہیں ہریالی کی آنکھ بچا کر زمین کا ٹکڑا جھانک لیتا تھا۔ درخت پتوں سے لدے ہوئے کھڑے تھے۔ جنگل سے آنے والی تیز ہوا میں رچی ہوئی کھٹی خوشبو عجیب سا

پیغام لارہی تھی ۔ مگر ہریالی اور خوشبو کی اس بھیڑ میں کلپ ترو
کون سا ہے ؟ کیا یہ مہک "کلپ ترو" کی ہے ؟ مجھے بتلانے والا
کوئی نہ تھا ۔ زندگی کے ہرے بھرے جنگل میں کسی ایک درخت کی
تلاش بھی کتنی مشکل ہے ۔ ساری عمر زندگی کے جنگل میں بن باس
بھوگتے رہو ۔ پیروں میں یادوں کے چھالے ہوں تو آرزووں کی
چٹیل دھوپ میں سفر کتنا تکلیف دہ ہوجاتا ہے ۔ مگر کلپ ترو
کی پہچان بڑی مشکل ہے ۔

ایک تندرست سا بھکشو گلے میں مالا منکے ڈالے عنابی
رنگ کی عبا پہنے استوپ کے سائے میں پالتی مارے بیٹھا تھا ۔
سر پر عنابی پیالہ نما ٹوپی لگائے وہ اپنے گرد و پیش سے بالکل بے خبر
تھا ۔ میں اس کے پاس سے گزرتی ہوئی معبد کے اندر چلی گئی ۔
وہ ٹکٹکی باندھے خلا میں کچھ تلاش کر رہا تھا ۔

معبد کے اندر کی فضا بڑی گمبھیر تھی ۔ عود اور لوبان کے
دھوئیں میں لپٹی ہوئی 'بدھم ، شرنم گچھامی' کی آوازیں بل کھا کھا کر
اوپر اٹھ رہی تھیں ۔ سامنے ہی تقریباً تین فٹ اونچے چبوترے پر
ملکوتی مسکان ہونٹوں پر سجائے بائیں کروٹ کی مدرا میں گوتم بدھ
کی مورتی تھی ۔ مورتی کے چہرے سے وہی جانا پہچانا سکون اور
طمانیت برس رہی تھی جو گوتم بدھ نے صرف اپنے لیے مخصوص کرلی
ہے ۔ کانوں کی لمبی لو کے اوپر بہت سے دائروں میں سمٹے
ہوئے گھنگرالے بالوں سے ٹپکنے والی بے پناہ آسودگی ، میری
بے چینی کے تلووں میں ریشک بن کر کانچ کی طرح چبھ گئی ۔ آرزووں سے
منہ موڑ کر کوئی بھلا اس طرح مسکرا سکتا ہے ؟

چبوترے کے بالمقابل لوبان دان اور اگربتیوں کی قطار
کے بعد چٹائیوں پر دور تک بدھ بھکشوؤں اور راہباؤں کا ایک
گروہ آنکھیں بند کیے دعاؤں میں مصروف تھا ۔ دعائیں التجائیں
آرزوئیں اور حسرتیں جو ازل سے انسان کا مقدر ہیں ۔ یہی
آرزوئیں جب اظہار کا قالب پہنتی ہیں تو دل دکھاتی ہیں ، ورنہ
جب تک دل دھڑکتا ہے چپکے چپکے سانسیں لیتی رہتی ہیں ۔
راہباؤں کے اونچے جوڑے اور لمبی سفید انگلیوں میں دبی ایک
اجنبی رسم خط میں لکھی دعاؤں کی کتاب دیکھ کر پتہ نہیں کیوں
مجھے ایسا لگا جیسے یہ منظر میری آنکھوں کے لیے نیا نہ ہو ۔

بے خواب راتوں میں جانماز پر سر جھکائے ہوئے جانے کتنی س
آہیں اور آنسو میری نظروں میں جھلملا اٹھے ۔ معصوم اور ساد
تمناؤں کی فہرست بہت طویل تھی اتنی طویل کہ اسے دہرانے ک
میرے پاس وقت نہ تھا ۔ میں کسی معمول کی طرح اپنے بچوں
کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی ۔ دونوں بچے ہال کا چکر کاٹتے ہو
مورتی کے پیچھے چلے گئے تھے ۔ پتہ نہیں یہ فضا پر چھائے ہو
تقدس کا احترام تھا یا گوتم سدھارتھ کی نیند ٹوٹ جانے کا لحا
کہ وہ آپس میں بہت چپکے چپکے بات کر رہے تھے اور دبے قد
چل رہے تھے ۔ مورتی کے پیچھے کھڑے ایک ٹورسٹ سے
وہ شاید کچھ سوال کر رہے تھے ۔ ان کی انگلیوں کے اشار
گول پنکھوں کی طرف تھے جو کپڑے کے مختلف رنگوں کے ٹکڑے جو
بنائے گئے تھے ۔ ان پنکھوں کی رنگارنگی پر نظریں نہیں ٹھہر ر
تھیں ۔ جیسے موہوم وعدے ، محدود لمحے ، مجبور جذبے ہوں
مگر جب مل کر جھلملاتے ہوں تو نظریں خیرہ ہوجاتی ہیں ۔ او
آنکھوں کے آگے دھند چھا جاتی ہے ۔ میں نے نظر بھر کر ان
پنکھوں کو دیکھا ۔ کپڑے کے پھول اور موتیوں کی جھالروں س
سجے ہوئے پنکھے جن میں حسن تو تھا ہی مگر ساتھ میں پروئی ہو
عقیدت اور وابستگی جیسے منہ سے بول رہی تھی لیکن سننے وا
کوئی نہ تھا جیسے آنکھیں ہی نہیں کان بھی بند ہوں ۔ دبیز نارنج
چادر پر ستاروں سے تین پنکھڑی والے پھول بنے تھے ۔ ابدی نیند
میں ڈوبی ہوئی مورتی ، کورس میں گاتی ہوئی راہباؤں کی ٹو
اور ماحول پر طاری ایک گہری اداسی ۔ کوئی نئی بات نہیں ہے
میری آنکھوں کے لیے منظر بہت پرانا ہے ۔ امید اور ناامید
کا یہ کھیل میں نے بار ہا دیکھا ہے ۔ خواہشوں اور چاہتوں میں
جکڑا ہوا انسان ۔ فنا اور بقا کی کشاکش میں گرفتار یہ ذات
اور سچ اور جھوٹ کی صلیب پر تڑپتی ہوئی یہ مخلوق ، سر پر امید و
بیم کی لٹکتی ہوئی تلوار کے ساتھ جینے والا یہ جاندار ۔ ازل سے
اضطراب اس کا مقدر ہے ۔

دعائیں ، امیدیں ، سسکیاں ، پسیجی ہوئی ہتھیلیوں
میں دبے دھاگوں کے بے ترتیب سرے جو کسی محراب کی جالی
میں بندھے بندھے اپنی رہائی کی آس میں اپنی پہچان بھ

بھول جاتے ہیں۔ کیونکہ وقت اپنی سرعت میں بجلی سے بھی تیز ہے۔ مجھے ایسا لگا جیسے بھیڑ سے الگ ہو کر پیچھے کھڑا کوئی اپنی جیبیں ٹٹول رہا ہو، شرارت سے مسکراتی ہوئی اس کی آنکھیں دل کی باتیں کہہ رہی ہوں "کوئی دھاگا ہوگا تمہارے پاس۔ اسے باندھا جائے۔ سب کو تو آزما چکے، ذرا ان کو بھی آزما لیں۔"
میں نے گھبرا کر جلدی سے دوپٹے سے ایک چٹ پھاڑ دی تھی۔ فیروزی رنگ کی وہ چٹ کیا اب بھی وہیں بندھی ہوگی؟ کیا اپنا رنگ روپ کھو کر وہ آج بھی میری منتظر ہوگی۔؟!

ابھی پچھلے دنوں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ایک بار وہاں گئی تھی۔ مگر باوجود تمام وعدوں سے آزاد ہونے کے مزار کے قریب جا کر کسی گرہ کو کھول دینے کی میں ہمت نہ کر سکی۔ کیونکہ کبھی کبھی انتظار میں بھی ایک تعلق ہوتا ہے اور کسی کو اپنا منتظر رکھنا بھی بھلا لگتا ہے۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ انتظار کا دوسرا نام ہی زندگی ہے۔ ظہور کا۔ تکمیل کا اور بچھڑنا کا انتظار۔۔ کسی کے انتظار میں ہمیشہ کے لیے کھلی رہ جانے والی آنکھیں۔ ان میں خواہش بھی ہوتی ہے۔ ارمان بھی۔ بے چینی بھی اور جستجو بھی۔

اس انتظار اور تجر کی جان لیوا تڑپ کا اندازہ راج محل کے سنہرے چھپر کھٹ پر نیند میں بے خبر اس راج کماری کو ہو سکتا ہے جس کا محبوب اس کے پہلو کو ٹھکرا کر اندھیری رات میں اسے تنہا چھوڑ گیا تھا۔ کسی ان دیکھی سچائی اور نامعلوم نروان کی تلاش میں۔

لیکن کیا سچ سے بڑھ کر دنیا کی کوئی سچائی ہے، حقیقت جو جاگتی آنکھوں کا منظر ہے۔ جو سامنے ہے بس وہی سچ ہے۔ اور سچائی تو یہ بھی ہے کہ میں اپنی گرہستی میں مشغول اور مصروف عورت ہوں۔ میرا شوہر اور میرے بچے میری زندگی کا محور ہیں مگر سچائی یہ بھی ہے کہ میرا معصوم دل اپنے حالات کے خول میں پنجرے کے پنچھی کی طرح پھڑپھڑا تا رہتا ہے۔ مجھ سے سوال کرتا ہے۔ مجھے بے چین کرتا ہے۔ سدھارتھ نے مادی سکھوں کو تیاگ کر نروان کی تلاش کی تھی۔ مگر میں مادی خوشیوں میں گلے گلے تک ڈوب کر ایک ان دیکھے نروان کی تمنا کر رہی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میری زندگی کے راستے میں کوئی گھنا برگد کا درخت نہیں ہے جس کے سائے میں نروان میرے اوپر برس جاتا اور میری بے خواب آنکھوں پر زندگی کے بوجھل غلاف ہوتے ہیں جو تمام زندگی سے آزاد ہو جاتی۔

لیکن نروان کی یہ دولت شاید صرف راجکماروں کو ہی نصیب ہوتی ہے۔ لذتوں سے کنارہ کشی کے لیے پہلے اس میں ڈوبنا بھی لازمی ہے۔ لذتوں کے لیے بوند بوند ترسنے والا لذت سے کنارہ کشی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میرے اوپر یہ حقیقت بخوبی آشکارا ہو چکی ہے کہ گرتی ہوئی دیواروں کے نیچے رہنے والوں کی آنکھیں سنہری چھتوں کے سپنے آسانی سے نہیں توڑ پاتیں۔
اسی لیے اپنی بے خواب راتوں کا ذمہ دار میں نے تمہیں کبھی نہیں ٹھیرایا۔ کیونکہ قصور تمہارا نہیں ہے۔ تم نے اپنی محبت کا محل اور محبوب کا پہلو رات کے اندھیرے میں نہیں چھوڑا تھا۔ بلکہ دن کے اجالے میں ایک نئی سمت اس لیے پرواز کر گئے تھے کہ رفیق سفر کی شکل میں ایک آرام دہ زندگی تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ تم دبے پاؤں بھی نہیں گئے تھے اور نہ ہی تم نے پہرے داروں کے سو جانے کا انتظار کیا تھا۔ میں نے تمہاری اداس آنکھوں میں وہ تمام سمجھوتے پڑھ لیے تھے جو تمہاری مجبوری تھے۔ اچھی زندگی گذارنے کی خواہش۔ ماں باپ کے خوابوں کی تکمیل۔ اور بھائی بہنوں کے چہروں پر سوالیہ نشان کی طرح چسپاں ان کا مستقبل۔ تمہارے چہرے سے عیاں تھا۔

اگر زندگی خواہشوں کی تکمیل کا نام ہے تو میں بھی ایک مکمل زندگی کی مالک ہوں۔ میں نے تمہارے ہجر میں کوان سے تنکے چننے۔ بظاہر تو میں بھی اپنی جگہ پر اتنی ہی پُر سکون ہوں جتنے تم اپنے ایرکنڈیشنڈ گھر میں ہو گے۔ ہم دونوں ہی سنہری چھتوں کے نیچے پیدا نہیں ہوئے۔ شاید اسی لیے ان حسین سپنوں کو نہ توڑ سکے۔ پتہ نہیں ہم کتنے غلط ہیں اور کتنے صحیح!!

زندگی کے سربستہ رازوں کے انکشاف کے لیے بے چین رہنے والے گوتم سدھارتھ کو گہری نیند میں سوتے دیکھ کر میرا دل چاہا کہ میں اس کا شانہ ہلا کر اس سے پوچھوں۔ سدھارتھ تم نے صرف ایک بڑھاپا دیکھا تھا اور زندگی کے بوجھ سے گھبرا گئے کاش کہ تم نے مجبور اور معذور آنکھوں کی وہ تھکن دیکھی ہوتی جہاں زندگی ایک بوجھ ہے اور موت محبت بھری تھپکی۔

اندھیرے سے اجالے کی جانب ایک جست ۔ سدھارتھ کی بند آنکھوں سے یقین کی کرنیں پھوٹتی ہیں تو پھوٹتی رہیں۔ میں یہ سوال کیسے نہ کروں کہ تم صرف ایک بیمار کو دیکھ کر کراہ اُٹھے تھے تم کتنے خوش قسمت تھے کہ تم نے ایڑیاں رگڑتے، موت کی بھیک مانگتے، مارفیا اور پیتھیڈین کے سمندر میں ڈبکیاں کھاتے اور نلکیوں کے سہارے زندگی کی آس میں موت کی طرف تل تل گھسٹتے انسانی ڈھانچے نہیں دیکھے۔

محفوظ اور مامون راج محل کے لمس جھروکے سے اداس کاندھوں پر رکھا ہوا ایک جنازہ دیکھ کر تم زندگی کے اس روپ کی تاب نہ لا سکے تھے۔ اچھا ہوا کہ ایٹمی دھماکے، جنگ اور قحط سالی کی وہ تصویریں نہیں دیکھیں، جن کی ہماری آنکھیں عادی ہو چکی ہیں۔ سچ میں کتنے سادہ لوح تھے تم اور کتنی معصوم تھیں تمہاری آنکھیں۔ بہت سی بے چین آتمائیں بدھم شرنم کی صداؤں، تکونی جھنڈیوں، زیر لب دعاؤں اور منکوں کی غیر محسوس گردش میں تمہارے ذریعے موکش کی منتظر ہیں کیونکہ مجھے ہی نہیں تمہیں بھی معلوم ہے کہ کبھی کبھی کسی کو اپنا منتظر رکھنا بھی بھلا لگتا ہے۔ سنہری پھولوں سے لدی زرد دبیز چادر میں لپٹے ہوئے اس راج کمار سے کاش میں پوچھ سکتی کہ کیا تم نے ان منتظر آنکھوں، بے قرار سانسوں پُر امید صداؤں اور سوگوار لہجوں سے بھی نروان پا لیا ہے؟؟ ورنہ تمہاری گھنگھرالی زلفوں میں ترتیب وار حلقے اور آگہی کے بوجھ سے جھکے ہوئے کانوں میں بے خبری اور ہونٹوں کی مسکراہٹ اور آنکھوں میں نیند کیسے ممکن ہوئی۔ مگر میرے پاس سوالوں کے جواب پانے کا وقت ہی کہاں تھا۔ کیونکہ وقت ہی ایک اٹل حقیقت ہے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا زائرین کی ایک بڑی ٹولی معبد کے اندر۔ غیر مانوس جملے دہراتی ہوئی داخل ہو رہی تھی۔ احترام اور ادب کے ساتھ۔

میرے بچے معبد سے نکل کر میرے منتظر تھے۔ باہر تیز ہوا کسی طوفان کی آمد کا پتہ دے رہی تھی۔ جنگل سے آنے والی خوشبو بھولی بسری یادوں کی طرح دل کے دروازوں کو چھوتی ہوئی گزر رہی تھی۔ عنابی عبا اور گول ٹوپی والا بھکشو بڑی تیزی سے پھاٹک کی طرف جا رہا تھا جیسے اسے کوئی ضروری بات یاد آگئی ہو۔ لمبے ڈگوں سے بودھ وہار کی اونچی نیچی دیواروں کو پھلانگتا ہوا۔

استوپ کے چاروں طرف بنی کشادہ سڑک پر چلتی ہوئی میں بچوں کے ساتھ باہر آگئی جہاں ڈرائیور کے ساتھ میرے شوہر میرے منتظر تھے۔

زندگی کے ہرے بھرے جنگل میں "کل پ ترو" کی تلاش بے سود ہے۔ گوتم بدھ کی لازوال مسکراہٹ سب کو جیون گیان بانٹ رہی تھی۔

●●

بقیہ : عورت نامہ

اور پھر ایک رات جب بچے اپنی نانی کے یہاں گئے ہوئے تھے وہ اچانک میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ "تو یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟" "ہاں۔" میرا پورا بدن کانپ رہا تھا اور بھٹی کی طرح تپ رہا تھا۔

"اور اگر میں زبردستی کروں تو؟" — وہ لڑکھڑاتے قدموں سے میری طرف بڑھا۔ "نہیں تم مجھے ہاتھ نہیں لگا سکتے" — میں ایک قدم پیچھے ہٹی — وہ ہنستے ہوئے اور آگے بڑھا۔ "اگر تم نے میرے ساتھ زبردستی کی تو" — میں نے جھک کر گھاسلیٹ کا ڈبہ اٹھا لیا — "میں اپنے آپ کو ختم کر لوں گی، جل مروں گی۔"

"ہمت ہے جل مرنے کی" — وہ پھر ہنسا — "اچھا تو لو مرو —" اس نے ماچس کی ڈبیا میری طرف اچھال دی۔ "سالی — ہول دیتی ہے کتی۔" "ہاں میں جل مروں گی مگر تمہیں ہاتھ لگانے نہیں دوں گی۔" میں نے گھاسلیٹ کا ڈبہ کاندھوں تک اٹھا کر ترچھا کر لیا اور ٹھیک اسی لمحے مجھے گیان ہوا اور جیسے میرے اندر سے کوئی بولا۔ "تو نے کوئی قصور نہیں کیا ہے — آخر ہر بار تو کیوں مرے؟ آج تو نہ مر — آخر ہر بار تو کیوں مرے؟" اور اس شکتی کے سہارے میں نے اپنی انا اور اپنے وجود کا اعلان کیا اور اس کے بعد آپ جانتے ہیں کیا ہوا ہوگا؟

یا پھر کیا ہوا؟ یہ آپ کا مسئلہ ہے میرا نہیں اور ویسے بھی میں پہلے ہی آپ کو بتا چکی ہوں کہ آپ کے خیال سے جہاں اس کہانی کا انت ہوگا، میرے حساب سے وہی دراصل اس کتھا کا آغاز ہوگا۔

●●

ایم۔ آر۔ قاسمی

شق کے آزار سے بچنے کی صورت چاہیے
ہ زمیں بنجر ہوئی · اب حکمِ ہجرت چاہیے

ایسے ویسے اسم سے کھلتا نہیں جاں کا طلسم!
قفلِ ابجد کے لیے تھوڑی ریاضت چاہیے

آج اپنی فالتو چیزیں جُدا کرتا ہوں میں
ئے کوئی ایسا جسے میری شرافت چاہیے

کاسۂ خالی کو اُس نے آنسوؤں سے بھر دیا
اور کیا اِس کے سوا سائل کو دولت چاہیے

اب کسی بے سمت منزل کو نہیں جاؤں گا میں
ھ کو نقشہ چاہیے، مجھ کو روایت چاہیے

روشنی کی لہر کیا، آبِ رواں کیا، نہر کیا
مجھ کو سب کی دوستی، سب کی محبّت چاہیے

پتا نہیں احساسِ زیاں کیوں ہوتا ہے
ہر چہرے پر تیرا گماں کیوں ہوتا ہے

جلنا ہی ٹھہرا تو جلا اوروں کو بھی!
اپنی آگ میں جل کے دُھواں کیوں ہوتا ہے

جس دھرتی سے نخل کا رشتہ کٹتا ہے
اس کی گود میں پل کے جواں کیوں ہوتا ہے

اکثر میں خود سے بھی اُکتا جاتا ہوں
میرا وجود بھی مُجھ پہ گراں کیوں ہوتا ہے

کوئی تعلّق جن کا نہیں اس محفل سے ــــ
ان لوگوں کا ذکر یہاں کیوں ہوتا ہے

میری پیاس عظیم بہت ہے ابرِ کرم
صحراؤں کی سمت رواں کیوں ہوتا ہے

"... صادقین صاحب نے مزے لے لے کر بتایا کہ جوشؔ صاحب نے سالنامے کے لیے رُباعیات اور تصویر کی فرمائش بڑے ادب و احترام کے ساتھ کی تھی لیکن جب میری تصویر دیکھی نوجوان میں لکھا: میاں صادقین جیتے رہو!"

جے نرائن رازؔ

کیا دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

صادقین مرحوم کے بارے میں یہ سطریں لکھنے بیٹھا ہوں، لفظ ہاتھ نہیں آرہے۔ عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے۔ جذبات و فور ہے۔ ذہن دھندلایا ہوا ہے۔ آنکھیں سوگوار ہیں۔ ل پکے ہوئے پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے۔ یہ ماتم خود کو "حقیر فقیر" ہنے والے شخص صادقین کا ہے۔

صادقین عالمی شہرت کے مصور تھے۔ اس نقاش کا ش لفظوں میں کون بنائے۔ عجز آڑے بنتا اور آڑے آتا ہے۔ یالات گڈمڈ ہونے لگتے ہیں کہ اس ہجوم کو اظہار کی کوئی راہ نہیں ی۔ توجہ کرتا ہوں تو ماضی کی دھند چھٹنے لگتی ہے۔ کچھ نقوش واضح نے لگتے ہیں۔

مارچ ۱۹۸۲ء کی ایک خوش گوار شام تھی۔ للت کلا اکادمی ں صادقین کی تصویروں کی نمائش تھی۔ افتتاح کے موقع پر جانے پہچانے ہندوستانی مصور، تصویر شناس، اخباری نامہ نگاروں اور ادقین کے مدّاحوں کا ایک میلا سا لگا ہوا تھا۔ اس بھرے میلے میں ڑا حصہ صرف دور کا جلوہ تھا۔

سر پر سادہ کھادی ریشم کی ٹوپی۔ اس کے نیچے سے باہر کو لتے ہوئے پٹوں جیسے بال جنھیں بہ سہولت زلفیں کہہ سکتے ہیں۔ ہاں ئرہ گیر نہیں تھیں۔ رنگ صاف، چہرہ لمبا، ناک کے بانسے پر ذرا گے کو رکھا ہوا چشمہ۔ چشمے کے پیچھے سے چمکتی ہوئی آنکھیں۔ قد نکلتا ہوا جسم دُبلا پتلا۔ اس پر جھولتی ہوئی کھادی ریشم کی زردی مائل شیروانی، معلوم نہیں، کون کسے وقار بخش رہا تھا۔ بٹن کھلے ہوئے۔ شیروانی کے نیچے سے جھانکتی ہوئی سادہ سی قمیض اور نیچے کھلے پائنچوں والا سفید پاجامہ، جو شکنوں سے ایسا بے نیاز نہ تھا۔ پاؤں میں چمڑے کا عام سا جوتا، تسمے کھلے ہوئے۔

یہ تھے صادقین — اپنی ڈرائنگز کی مرکزی شبیہہ کی منہ بولتی تصویر۔ بہت دیر تک ان کی تصویروں میں کھویا رہا۔ لوٹا تو صادقین صاحب سے نہ مل سکنے کی حسرت دل میں تھی۔

چھ سات روز بعد کی بات ہے۔ میں ایک دوپہر میں، ایک سرکاری ضرورت سے نکلا تو دفتر واپس آنے میں کوئی تین گھنٹے لگ گئے۔ لوٹا تو دیکھا کہ ایک دُبلا پتلا شخص جو کچھ روز پہلے میرے لیے محض دور کا جلوہ تھا، اب بہ نفسِ نفیس میرے میز کی دوسری طرف جھکا ہوا، آج کل کے پرانے فائل دیکھ رہا ہے۔ صادقین صاحب سے معذرت کی۔ گلہ گزار ہوا کہ آپ نے کیوں زحمت کی۔ مجھے حکم دیا ہوتا۔ اور اگر دفتر تشریف لانا ہی مقصود تھا تو اطلاع کرا دی ہوتی تاکہ میں موجود رہتا اور آپ کو انتظار کی زحمت نہ اٹھانا پڑتی۔ آپ یوں بور نہ ہوتے۔

زبان میں کسی قدر لکنت تھی۔ ارباب، احباب سبھی جانتے ہیں۔ بولے: یہاں کوئی زحمت نہیں اٹھانا پڑی۔ میں قطعی

ہو نہیں ہوا۔ بلکہ میں تو بہت اطمینان سے پُرانے فائل دیکھ رہا تھا۔ ماضی کو حال سے ہم کنار کرنے کی سعی کر رہا تھا۔

دیکھا ۱۹۴۹ء کا فائل سامنے رکھا ہوا تھا۔ بڑے شوق سے میری توجّہ جون ۱۹۴۹ء کے شمارے کی طرف مبذول کرائی۔

صادقین ۱۹۴۹ء

صادقین کے موقلم سے
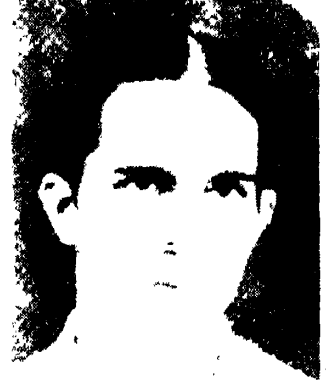
اس میں صادقین کی رباعیات سرِفہرست شائع ہوئی تھیں۔ اس شمارے میں فراق گورکھپوری مرحوم کا کلام چھٹے یا ساتویں نمبر پر شائع ہوا تھا۔ پھر اگست کا شمارہ کھول کر دکھایا۔ اس میں ان کی تصویر شائع ہوئی تھی۔ اسی شمارے میں "آج کل" کے مُدیر جوش ملیح آبادی کی ایک مصور رباعی شائع ہوئی تھی۔ نقش اور تشریح دونوں صادقین کے تھے۔ پھر دسمبر کا شمارہ دکھایا۔ اس میں صادقین صاحب کا ایک مضمون ہندوستانی مصوری کے موضوع پر چھپا تھا۔ یہ صادقین صاحب سے میری پہلی باضابطہ ملاقات تھی۔ صادقین کے دو رُوپ میرے سامنے تھے۔ ہر رُوپ ہزار شیوہ۔

بعد کی ایک ملاقات میں صادقین صاحب نے خوب مزے لے لے کر مجھے بتایا کہ جوشؔ صاحب نے سالنامے کے لیے رُباعیات اور تصویر کی فرمائش بڑے ادب و احترام کے ساتھ کی تھی لیکن جب میری تصویر دیکھی تو جواب میں لکھا: "میاں صادقین جیتے رہو"۔

"آج کل" سے تعلقات کی تجدید ہوئی۔ صادقین صاحب رُباعیاں عطا فرمانے پر آمادہ ہوئے۔ رُباعیاں بڑے بڑے کاغذوں پر سیاہ قلم سے لکھنا شروع کیں۔ خوب صورت نسوانی خدوخال والی شبیہوں سے مزین کیں لیکن وہ ابتدا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کرنا نہیں بھولے۔ پھر یہی لفظ ایک خوب صورت شبیہہ کی گرہ گیر زُلفوں کا حصّہ بنے۔ یہ رُباعیات "آج کل" کے شمارہ مئی ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئیں۔ اس طرح "آج کل" میں "بہ خط شاعر" کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ مقبول عام سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ مئی ۱۹۸۲ء کے شمارے میں صادقین کی ۱۹۴۹ء کی تصویر مکرر شائع کی گئی۔ سرورق بھی انھیں کا عطا کیا ہوا تھا۔

"آج کل" کے سرورق کی بات چل نکلی ہے تو یہ ذکر نامناسب نہ ہوگا کہ ۱۹۸۳ء میں "آج کل" کے آٹھ شماروں کے سرورق پر صادقین صاحب کے بنائے ہوئے غالبؔ کے مصور اشعار شائع ہوئے۔ یہ سلسلہ بے حد پسند کیا گیا۔ بلکہ اسی برس حکومت ہند کی وزارت اطلاعات ونشریات کے ڈائریکٹوریٹ آف ایڈورٹائزنگ اینڈ وژول پبلسٹی نے "آج کل" کو کل ہند مقابلے میں بہترین

صادقین ۱۹۸۲ء

ڈیزائننگ اور چھپائی کے لیے دوسرا انعام دیا تھا۔ (پہلا انعام گجراتی کے ایک رسالے کو ملا تھا) یہ افتخار بھی "آج کل" کو صادقین صاحب کی بدولت حاصل ہوا۔

صادقین صاحب مزے کے آدمی تھے۔ باتیں مزے لے لے کر یعنی رُک رُک کر کرتے۔ ان کے اندازِ خط کا اثر اندازِ گفتگو پر یوں پڑا کہ حروف کی کشش تحریر سے تقریر میں در آئی۔ آخری لفظ بالعموم کھینچ کر اور کسی قدر اُونچا ادا کرتے۔ یوں معلوم ہوتا کہ لفظ کا آخری حرف ان کے منہ میں گونجنے لگا ہے۔ میاں انور کو آواز دیتے تو لفظ انور بیشتر یوں ادا ہوتا کہ ر ـــــ ر ـــــ ر ـــــ ر کی گونج تا دیر محسوس ہوتی رہتی۔ لفظ بالعموم دبا کر بولتے۔ لامحالہ اثر آواز کے زیر و بم میں نمایاں ہوتا۔

مزاج میں مثالی سادگی تھی۔ قول اور فعل میں ہوا حرص اور ہوس کا شائبہ تک نہ تھا۔ دوست سے دوستی تھی۔ غیر سے دشمنی نہ تھی۔ بلکہ ان کے یہاں غیر اور دشمن دونوں لفظ گمان اور قیاس سے خارج تھے۔ کون کتنا اور کیسا دوست ہے؟ وہ اس سے قطعی بے نیاز تھے۔ ان کا ڈیرا تو ایک فقیر بے نظیر کا آستانہ تھا۔ اس صورت میں بعض ایسے لوگوں کی بھی بن آئی جنھیں اور کہیں کھل کھیلنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ شے سے غرض نشاط تھی یا نہیں۔ بہر حال اک گونہ بے خودی کے طلب گار شام سے کچھ پہلے ہی ڈیرے پر دستک دیتے۔ گویا صلائے عام ہو۔ صادقین صاحب کا رفیق میاں انور چاہیے' اُن چاہے لوگوں کی مدارات میں مصروف محفلیں رات گئے تک جمی رہتیں۔ قاعدے سے جس شخص کو ہونا چاہیے تھا' وہ میزبانی کے فرائض انجام دیتا۔ اور یہ آئے دن کا تھا۔ عام خیال ہے کہ صادقین صاحب بہت تھے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ یہ البتّہ درست ہے کہ وہ دیر تک پیتے بسا یہ معلوم نہ ہوتا کہ آفتاب جام کب طلوع ہوا اور کب غ صادقین صاحب نے ایسا شاید کبھی کہا تو نہیں' تاہم میں محسوس کیا کہ بعض لوگوں کی آمد سے صادقین صاحب کو اُلجھ تھی کہ وہ ان سے زیادہ پیتے تھے۔ نیت میں گویا ایک ہی ہوتی: ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں۔ اور کھانے وہ صادقین صاحب سے یقیناً کہیں زیادہ تھے۔ تلی ہوئی مچھ کبابوں کی فرمائشوں کا جو سلسلہ شروع ہوتا تو صادقین صاحب دم بہ خود رہ جاتے۔ میاں انور عاجز آجاتا۔ بہر حال ایسا بھ

ہندوستان میں اس صورت حال سے شاید ہی کسی فنکار کا سامنا رہا ہو۔ صادقین صاحب کو صنعتی نمائش میں پا پیویلین کی ترتیب' تزئین اور تیاری کے لیے ایک کثیر رقم ملی تھ کے ہندوستان آنے کا بہانہ یہ نمائش بنی تھی۔ پھر کچھ دنو وہ ثقافتی تعلقات کی ہندوستانی کونسل کے مہمان رہے تھ بات مجھے خود صادقین صاحب نے بتائی کہ ہندوستان میں چو کے قیام میں موصوف نے تقریباً دو لاکھ روپیے صرف کیے۔ ا خرچ کی کیفیت عجیب تھی۔ روپیوں کی کمی نہ تھی۔ لیکن ایک مرحلے پر جو ہوئی، وہ محض قریبی احباب کو معلوم تھی۔

ایک روز امیر قزلباش دفتر آئے۔ گفتگو کے دوران م عرض کی کہ صادقین صاحب کو رُباعیات اور سرورق کا معا کرنا ہے۔ رقم اتنی معمولی ہے کہ صادقین صاحب کو پیش کر حوصلہ نہیں کر پا رہا ہوں۔ امیر بولے: "کتنے روپیے ہیں؟" کہا "تین سو روپیے"۔ بولے "اس وقت صادقین صاحب یہ رقم قطعی معمولی نہیں ہے"۔ تھوڑی دیر بات چیت کا سلسلہ وہ چلے گئے۔ اور میں کام میں اُلجھ گیا۔ اچانک ذرا سی آ ساتھ دروازہ کھلا۔ کیا دیکھتا ہوں! صادقین صاحب ا میاں انور کے ساتھ کمرے میں داخل ہو رہے ہیں۔ امیر قزل

بات میرے ذہن میں تھی۔ اس وقت اس کی صداقت پر کچھ زیادہ یقین نہیں لا پایا تھا۔ گھڑی کی طرف دیکھا۔ سوا پانچ بج رہے تھے۔ دفتری اوقات ختم ہو چکے تھے۔ کسی قدر الجھن میں پڑ گیا۔ صادقین صاحب کو بیٹھنے کو بھی نہ کہا۔ فوراً کرسی سے اُٹھا اور تیزی سے صادقین صاحب کو لیے ہوئے کیش سیکشن میں پہنچ گیا۔ خیریت

مضمون نگار اور صادقین

گزری کہ کیشیئر مل گیا۔ صادقین صاحب نے رسید پر دستخط کیے۔ نوٹ تھے ہی کتنے! لپیٹ کے جیب میں رکھ لیے۔ پھر ہم کمرے میں لوٹ آئے۔ میں نے کہا: "بھائی آپ ایسے میں تشریف لائے ہیں کہ میں ایک پیالی چائے کا انتظام بھی نہیں کرسکتا کہ دفتر بند ہو چکا ہے۔ بولے "کوئی مضائقہ نہیں۔ پھر کبھی سہی" ہنس کر میاں انور سے کہنے لگے: "دیکھو انور، راز صاحب کبھی خالی ہاتھ نہیں جانے دیتے۔ میں جب کبھی آیا، کتابیں اور رسالے لے کر گیا۔ آج روپے چاہیے تھے۔ سو وہ بھی مل گئے۔ چلو اب چلیں۔"

صادقین صاحب چلے گئے اور میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس شخص نے ریڈیو اور ٹی۔ وی پر بیسیوں پروگرام دیے۔ جو چیک ملے پشت پر دستخط کر کے، ریکارڈنگ کرنے والے شخص کو اس فرمائش کے ساتھ دے دیے کہ آج 'چینی کھانے' کی ضیافت ہو جائے۔ ہندوستان کے مختلف شہروں علی گڑھ، بنارس، حیدرآباد، دہلی میں جو خطاطی کی یا جو میورل بنائے ان کا کوئی معاوضہ نہیں لیا جو لاکھوں روپے بنتا تھا۔ پھر یہ کیسے ہوا؟ دختِ رز بھلے کسی اور

شے کی خواہش فرمائش نہ کرے نہ کرے مجھے طشت کی طلب گار البتّہ ہوتی ہے۔ اور یہاں تک دماغ کہ کیا اور کیسے ہو رہا ہے بہ حال اتنا معلوم کہ کچھ ہو رہا ہے۔

ایک سہ پہر کو دفتر سے اٹھا تو جنگ پورہ چلا گیا۔ صادقین صاحب گھر پر تھے۔ اور اکیلے تھے۔ آس پاس حسب معمول کاغذ کھلے تھے۔ انھیں میں ایک پُرزہ تھا۔ غالباً صادقین صاحب نے کسی صاحب کو خط لکھا تھا۔ کہنے لگے "راز صاحب پڑھیے" مکتوب الیہ پاکستان کے صدر جناب ضیاؑ الحق تھے۔ صادقین صاحب نے لکھا تھا کہ انھیں ایک لاکھ روپیے درکار ہیں۔ ان کی ادائیگی یہاں ہندوستان میں کر دی جائے۔ جناب صدر کو یہ خط لکھنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ پاس پلّے جو کچھ تھا، خرچ ہو گیا تھا مزید آیا نہ تھا۔ پاکستانی سفارت خانے کے حکام نے اتنی بڑی رقم کی فراہمی کے لیے معذرت کر لی تھی۔ اب اور کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ خط انھوں نے اسی روز سفارتی بیگ سے جناب ضیاؑ الحق صاحب کو بھجوایا تھا۔ دو روز بعد ملاقات ہوئی تو بتانے لگے کہ صدر ضیاؑ الحق کو خط پہنچنے کے محض چند گھنٹوں کے اندر دہلی میں پاکستان سفارت خانے کو ہدایات ملیں کہ صادقین صاحب کو روپے فراہم کر دیے جائیں۔ یہ بھی بتایا کہ گذشتہ روز سفارت خانے سے بلاوا آیا تھا۔ دس ہزار روپیے دیے ہیں۔ باقی کا جلد انتظام ہو جائے گا۔

اللہ مالک ہے، ہاں اللہ مالک ہے۔

ایک روز کہنے لگے: راز صاحب میں نے اب کے ایک اچھا کام کیا ہے۔ آپ کو خوشی ہوگی۔ بولے دو بچیوں کی شادی تھی۔ پچیس پچیس ہزار روپے دونوں کو دے دیے۔ کسی طرح کی خست خصلت میں نہ تھی۔ نہ شراب میں، نہ ثواب میں۔ کشادہ قلب، کشادہ دست، دست گیر۔

یہاں ایک بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ صادقین نے پاکستان کے صدر جناب ضیاالحق کو جو خط لکھا تھا انھیں وہ خط نہیں بلکہ اس کی زیراکس کاپی بھجوائی تھی۔ خط ہی میں درج کر دیا تھا کہ اصل خط صادقین میوزیم کے لیے محفوظ کر رہا ہوں۔

تعلقات کی یہ سطح اور اعتماد کا یہ عالم دیدنی ہے۔

یہ شخص اتنا خرچ کرتا ہے، تو پاتا کتنا ہے!

ایک روز یوں ہی باتوں باتوں میں اس کا ذکر نکل آیا کہنے لگے: میں نے جب لاہور میوزیم میں میورل بنایا تو مجھے حکومت نے ساڑھے تین لاکھ روپیے دیے تھے۔ ان دنوں بیلن ٹین کی بوتل ۹۵ روپیے میں آتی تھی۔ ایک بوتل اسکاچ وہسکی کی قیمت — صادقین صاحب نے گرانی کے اندازے کا معیار خوب مقرر کیا تھا۔ روپیے تو ہمیشہ اسی طرح پائے، لیکن کبھی اپنی کوئی تصویر یا خطاطی کا نمونہ فروخت نہیں کیا۔ معلوم نہیں کس ملک کا ذکر کر رہے تھے۔ ایک جگہ کو رک گئے پھر بولے میں نے آیات قرآنی کی نمائش کا اہتمام کیا تھا۔ نمائش میں ایک مقام پر اپنے لیے ایک میز رکھوایا تھا۔ وہیں بیٹھا ہوا آیات کی خطاطی کیا کرتا تھا۔ ایک روز کیا دیکھتا ہوں! ایک نوجوان عورت آئی اور میز کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ بولی: "شہزادی خطاطی کے بعض نمونے خریدنا چاہتی ہے۔" میں نے دیکھا: ذرا ہٹ کر سامنے کو ایران کی شہزادی فرح چلی آرہی ہے۔ یہ نوجوان خاتون شہزادی کی سکریٹری تھی۔ میں نے جواباً عرض کیا کہ یہ نمونے فروخت کے لیے نہیں ہیں۔ اس پر موصوفہ نے دام کئی گنا بڑھا دیے۔ اور میری صورت دیکھنے لگی۔ میرا جواب وہی تھا جو میں پہلے عرض کر چکا تھا۔ پھر مایوسی کے عالم میں میز پر رکھے ہوئے کاغذات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی: "کیا میں یہ لے سکتی ہوں؟" میں نے کہا: "بخوشی" اس نے حسبِ پسند آیات قرآنی کی خطاطی والے کاغذات سمیٹ لیے۔ دام پوچھے "متاعِ بے بہا" تھی۔ موصوف نے دام نہیں لگائے۔ بلا معاوضہ حاضر کر دی۔ اسی طرح ایک بہت بڑے امیر شیخ کا ذکر کرتے ہوئے ہنس دیے۔ بولے: "راز صاحب، دام دے رہے ہیں، اور انگریزی اعداد یعنی ملین و بلین میں، کتنے روپیے بنتے ہیں میری تو سمجھ ہی میں نہیں آئے۔ بہر حال میں اپنے فن پارے بیچتا نہیں۔"

ایک روز بتانے لگے: "مجھے یونسکو کے لیے ایک میورل بنانا تھا۔ پیر کی صبح میں نے کام شروع کیا۔ اور ٹھیک سے ہاتھ اگلے اتوار کی شام میں دھوئے۔" گویا سات دن کام کیا۔ کہنے لگے: "اتوار کی شام میں، میں اپنے ساتھیوں کو سامان سمیٹ کر ہوٹل آنے کی ہدایت دے کر ہوٹل چلا آیا۔ متعلقہ حکام کو جب معلوم ہوا کہ میں کام مکمل کر کے ہوٹل چلا گیا ہوں تو فوراً ہوٹل آئے۔ اور مجھے سوئس بنک پر ساڑھے سات لاکھ روپیے کا چیک پیش کیا۔" اس پورے واقعے کے بیان میں صرف دو جملے خاص توجہ چاہتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ پیر کی صبح میں کام شروع کیا اور دوسرا: ٹھیک سے ہاتھ اگلے اتوار کی شام میں دھوئے۔ گویا سات دن — دن رات برابر کام کرتے رہے۔ دن رات کا ذکر آگیا ہے، تو یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ صادقین صاحب کی رات کبھی چھ گھنٹوں سے بڑی نہیں رہی اور یہ کہ اس کا قطعی کوئی تعلق دن ڈھلنے یا سورج نکلنے سے نہیں ہے۔ گویا ان کے دن رات شام و سحر کے پابند نہ تھے۔ سچ تو یہ ہے صادقین صاحب کی رات فجر کی نماز کے وقت یعنی صبح ساڑھے چار بجے شروع ہوتی اور دن چڑھے دس گیارہ بجے تک رہتی۔ باقی وقت وہ دوستوں کی تحویل میں ہوتے یا خطاطی مصوری میں مصروف ہوتے۔ وہ ان تھک کام کرنے والے تھے۔ وہ تخلیقی کام میں مصروف ہوتے یا احباب کی فرمائشیں پوری کیا کرتے۔ کتابوں کے سرورق بناتے۔ لیٹر ہیڈ کے لیے نام لکھتے اور نہ جانے کیا کیا کرتے۔ اور اگر بہ ظاہر کچھ نہ کر رہے ہوتے جب بھی ان کی لمبی ٹیڑھی ٹیڑھی انگلیاں خلا کے قرطاس پر کچھ نہ کچھ رقم کیا کرتیں۔ خامہ خونچکاں بھلے نہ ہو، انگلیاں بہرحال فگار رہتیں۔

کام بہت جم کر اور یکسو ہو کر کرتے تھے کسی قسم کی مداخلت یا

خلل برداشت نہ کرتے تھے۔ ایک روز میں دفتر میں، کام میں کھویا ہوا تھا۔ نظریں اٹھا کر دیکھا تو صادقین صاحب سامنے کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ حیرت ہوئی۔ خیریت پوچھی۔ بولے: "راز صاحب میں کل سے مصروف ہو جاؤں گا۔ اسلامک انسٹی ٹیوٹ کے لیے اسمائے حسنیٰ کی خطاطی کا کام شروع کرنا ہے۔ گھر پر نیچے بیٹھ کر کام نہیں ہوگا۔ اس لیے لینا پڑا رہے گا۔ میں اوپر کام کروں گا۔ آپ آئیں اور پریشان ہوں۔ یہ مناسب معلوم نہیں ہوا۔ سوچا میں خود ہی آپ سے مل آؤں اور بتا آؤں کہ اب ملاقات تقریباً دس دن بعد ہوگی۔"

انھیں دنوں مجھے بلا بھیجا۔ حاضر ہوا تو دیکھا کہ متعدد مربع کینوس ایک طرف رکھے ہوئے ہیں۔ اسمائے حسنیٰ کی ادھوری خطاطی تکمیل کی منتظر ہے۔ پوچھا صادقین بھائی کام روک کیوں دیا؟ بولے: "راز صاحب نقالی کرنے کو جی نہیں مانا۔ اسمائے حسنیٰ کی خطاطی میں پیشتر کر چکا ہوں۔ اسے نقل کرنے میں کیا خلاقی ہے؟ پھر انسٹی ٹیوٹ کے ستون اُونچے ہیں اور مستطیل کینوس کے متقضی ہیں۔ پندرہ بیس مربع کینوس تیار کیے تھے۔ سب بیکار ہو گئے۔ اب مستطیل کینوس تیار کراؤں گا۔ اس طرح یہ ایک نیا کام ہوگا۔ کینوس ابھی تیار ہو کر آئے نہیں۔ اسی لیے آپ کو بلا بھیجا۔ کچھ وقت ساتھ گزاریں گے۔"

ایک اور تصویر بنٹی کی کشش سے انکار مشکل ہے۔ یہ کشش کیسے کرب کی شکل اختیار کرتی ہے، اس کا اندازہ صادقین صاحب کے ایک جملے سے بہ خوبی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے یہ منظر ملاحظہ فرمائیں۔ ہوائی اڈے پر ایک جیٹ ہوائی جہاز سے اتر کر ہوائی اڈے کی عمارت میں داخل ہونے والے افراد میں ایک شخص باقی دوسرے سبھی مسافروں سے مختلف تھا۔ وضع قطع جداگانہ طور طریقے الگ۔ کھلا پاجامہ، شیروانی، ٹوپی، چشمہ، عام سادہ جوتا۔ کوئی بھی شے تو غیر معمولی نہ تھی۔ لیکن خیر مقدم کے لیے موجود لوگ بڑی خندہ پیشانی سے بڑھے اور بغل گیر ہوئے۔ وہ گرم جوشی اور خوش دلی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ آنے والا معزز مسافر صادقین تھا۔ اور خیر مقدم کے لیے آئے ہوئے احباب پاکستانی سفارت خانے کے حکام تھے۔ قریب ہی ایک اجنبی کھڑا تھا۔ جب دوست احباب مصافحہ کر چکے تو وہ اجنبی آگے بڑھا۔ وہ وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی کا خاص ایلچی تھا۔ مختصر سے تعارف کے بعد بولا۔ محترمہ اگلے روز غیر ملکی دورے پر تشریف لے جانے والی ہیں لیکن چاہتی ہیں کہ جانے سے پہلے آپ سے ملاقات ہو جائے۔ آپ براہ کرم کوئی وقت بتا دیں تو ملاقات کا انتظام ہو جائے۔ صادقین صاحب اور سفارت خانے کے حکام بولے: "محترمہ اندرا گاندھی کی مصروفیات کا ہمیں اندازہ ہے، جو وقت وہ مناسب خیال فرمائیں، اس سے مطلع کر دیں۔ صادقین صاحب حاضر ہو جائیں گے۔"

صادقین صاحب محترمہ اندرا گاندھی سے ملاقات کے لیے پہنچے۔ محترمہ نے پوچھا: "آپ کا سفر کیسا رہا؟" سوال رسمی سا تھا۔ مگر جواب میں مضمر گرمی کسی بھی آبگینے کو پگھلا دینے کے لیے کافی تھی۔ بولے: "سفر خوب رہا۔ گھنٹے بھر کا تھا۔ مگر طے کرنے میں ۳۲ برس لگ گئے۔" ملاحظہ فرمایا آپ نے مٹی کی کشش کیسے کرب میں ظاہر ہوئی تھی۔ فگار انگلیاں اس ملاقات میں بھی نچلی نہ رہیں۔ ایک کاغذ پر صادقین صاحب نے دیوناگری میں "اوم" لکھا۔ انداز خوبصورت اختیار کیا۔ کاغذ کا رُخ دائیں سے نیچے کو کر دیں تو لفظ اللہ پڑھا جاتا تھا۔ گنگا جمنی تہذیب کے حامل ہندوستان ایسے ملک کے وزیر اعظم کے لیے اس سے بہتر تحفہ کیا ہو سکتا تھا! اسی انداز کا اوم اور اللہ موصوف نے لکھ کر مجھے عطا کیا تھا، جو میرے غریب خانے میں مختصر سے مندر میں اب بھی موجود ہے۔ گویا اب اللہ میرے مندر میں رہتا ہے۔

ایک مرتبہ صادقین صاحب نے ایک بات کا اعتراف بڑی کشادہ قلبی سے کیا۔ کہنے لگے: "راز صاحب آپ کے ملک میں لوگ بہت دوست اور بہت مزے کے ہیں۔ بڑے سے بڑے آدمی کو بھی اس فقیر کے بورے اور چٹائی پر بیٹھنے میں کبھی تامل نہیں ہوا۔" میں نے کہا: "اچھے آدمی ہر کہیں ہوتے اور مل جاتے ہیں"۔ بولے "نہیں — ایسا نہیں ہوتا۔" پھر لمحے بھر کو رُکے جیسے سوچ میں پڑ گئے ہوں۔ بولے: "میرے ڈیرے پر گزشتہ روز پاکستان کے ایک وزیر اپنی فیملی کے ساتھ آئے تھے۔ دروازے پر آ کر رک گئے۔ کمرے کا جائزہ لیا اور یقیناً یہی محسوس کیا ہوگا کہ بیٹھنے کو کوئی صوفہ کرسی یا دیوان نہیں ہے۔ وہ لمحہ بھر کو رُکے۔ رسمی خیر خیریت پوچھی

دروہیں سے لوٹ گئے۔ ایسا رویّہ میں نے یہاں بڑے سے بڑے
آدمی کا نہیں دیکھا۔"

وہ فنکار تھے۔ ان کے یہاں کسی ملکی، علاقائی تعصب کا گزر
نہیں تھا۔ مجھے ایک روز قرآنی آیات کی نمائش دکھانے لے گئے۔ پاکستانی
سفارت خانے کے بعض افسران بھی نمائش دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ مجھ
سے تعارف کراتے ہوئے بولے: "یہ آج کل کے ایڈیٹر ہیں۔ 'آج کل' 'ماہ نو'
جیسا سرکاری رسالہ ہے لیکن یہ 'ماہ نو' جیسا نہیں۔ یہ بہت مقبول رسالہ
ہے۔ یہ آٹھ ہزار چھپتا اور بکتا ہے۔" ان کے قریب رہ کر میں نے محسوس
کیا وہ بہت سی باتوں سے بلند و بالا تھے۔ وہ کبھی کو یہ محسوس نہ کرتے
کہ آس پاس کے لوگوں کا ان سے کیا تعلق ہے؟ تاہم وہ ہمیشہ اس
بات کا احساس دلاتے کہ خود ان کا تعلق آس پاس موجود ہر شخص سے
ذہنی اور گہرا ہے۔

اُن کے ڈیرے پر علم ادب، آرٹ کے شیدائیوں کا ہم گھٹ تو
بہرحال سمجھ میں آتا تھا۔ پاکستانی ویزا حاصل کرنے کے خواہش مندوں
کی اس درجہ ریل پیل رہنے لگی تھی کہ موصوف گھبرا گئے تھے۔ گھر کے باہر
ایک تختی آویزاں کردی تھی۔ واردان بساط ہوائے دل سے درخواست
کی گئی کہ پاکستانی ویزا کے سلسلے میں فرمائش کرکے شرمندہ نہ کریں اور نہ
خود شرمندہ ہوں۔ اس پر بھی دوست داری کی عجب شان تھی۔ ایک روز
میں نے کہا: بھائی یہ میرے محترم دوست مہتاب بسروری ہیں۔ لاہور
جانا چاہتے ہیں۔ کرم فرماکر ویزا دلادیں۔ بولے: "ہوجائے گا۔" مہتاب
صاحب نے دو چار پھیرے کیے۔ بہرحال صادقین صاحب ایک روز
ان کا فارم اور پاسپورٹ لے کر پاکستانی سفارت خانے میں گئے کہا کہ ویزا دے دیا جائے۔
ویزا افسر نے فارم دیکھا۔ کہا کہ فارم نامکمل ہے۔ کچھ خانہ پری ہونا باقی
ہے۔ فارم واپس لیتے ہوئے پوچھا: "کون سا خانہ ہے؟" دیکھا تو فارم میں
وہ خانہ خالی تھا جس میں پاکستانی رشتہ دار کا نام اور پتہ درج ہونا تھا
صادقین صاحب نے اپنا آرٹسٹوں والا جلی سیاہ قلم جیب سے نکالا۔
رشتہ دار کے نام والے خانے میں اپنا نام اور پتے والے خانے میں اپنا
لاہور کا پتہ لکھ دیا۔ اب کوئی صورت انکار کی نہ تھی۔ لہٰذا ستیہ پرکاش
مہتاب بسروری کو اپنے رشتہ دار صادقین احمد نقوی سے ملاقات
کے لیے لاہور جانے کا ویزا مل گیا۔ یہی نہیں صادقین صاحب نے
لاہور کے ایک خاص دوست جعفری صاحب کے نام رقعہ بھی لکھ دیا کہ

مہتاب صاحب کو وہاں قیام کے دوران کوئی تکلیف نہ ہو۔ گویا وہ دوست ہی
نہیں دست گیر بھی تھے جو حاضر اور غائبانہ دونوں میں شریک اور شفیق تھا۔

ایسے ہی کوئی بات چل نکلی۔ میں نے کہا: "بھائی جانے دیجیے۔
بس کہنے کی باتیں ہیں۔ ادھر آپ کا طیارہ دہلی ہوائی اڈے سے اڑے گا
ادھر آپ سب بھول بھال جائیں گے۔ کون بھائی کیسا دوست!" ان کی
چمکتی ہوئی آنکھیں سوچ میں ڈوب گئیں۔ بولے: "راز صاحب میں آپ
کو بھلا تو نہ سکوں گا لیکن کبھی خط لکھوں گا، یہ وعدہ نہیں کرتا اس
لیے کہ میں کبھی خط لکھتا نہیں۔" مجھے یہ سوال جواب برائے سوال جواب
معلوم ہوئے۔ میرے اندر سے ایک آواز ہلکی سی آرہی تھی۔ اب
صادقین کہیں جائیں گے نہیں۔ اور پھر ایک روز اس کے برعکس ہوا
صادقین صاحب نے اپنی پاکستان واپسی کا اعلان کردیا مگر دل باور
کرنے کو تیار نہ تھا۔ ان کی روانگی کی تاریخ سے ایک دن پہلے شام کو
صادقین صاحب سے ملاقات کے لیے غالب اکادمی حاضر ہوا۔ ادھر
ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے درخواست کی کہ اس رسید پر دستخط
کردیں۔ یہ معمولی سی رقم ہے۔ پوچھا: "کتنے روپے ہیں؟" میں نے عرض
کی "تین سو۔" بولے: "میں رسید پر دستخط کردیتا ہوں۔ روپے آپ رکھ
لیں۔" پوچھا: "سبب؟" بولے: "میرے پاس بہت ساری ہندوستانی کرنسی
ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا اسے کیا کروں۔" عرض کی: "ان تین سو روپیوں کا بھی
وہی کچھ کیجیے گا جو باقی کے لیے طے فرمائیں۔" موصوف نے خاموشی کے
ساتھ لفافہ لے لیا۔ لیکن ایک کرب چہرے سے نمایاں تھا۔ بچھڑنے کا۔
بہرحال بچھڑنا تھا۔ اور بچھڑنا بھی کیسا دائمی! انتہائی کرب انگیز۔

صادقین صاحب نے خط لکھنے کا وعدہ تو نہیں کیا لیکن جانے
کے کچھ ہی عرصے بعد میرے آبائی شہر کوئٹہ سے مجھے بڑا محبت بھرا خط لکھا۔
اُس دور افتادہ بھائی نے اس بھائی کو کوئٹے کی وادیوں، پہاڑیوں،
گلی کوچوں اور وہاں کی سبزیوں، خشک میووں، تازہ و تر پھلوں کی
دعائیں اور سلام لکھا۔ ان کے خط میں درج جملوں میں ان کی
باتوں جیسی خوشبو تھی —— گلوں کی خوشبو تھی۔

میری آنکھیں بھیگ گئی ہیں۔ ذہن میں خیالات گڈ مڈ
ہونے لگے ہیں۔ اظہار کی راہ مفقود ہے۔ آنکھیں خلا میں لگی ہوئی ہیں
اور کچھ دیکھ نہیں رہی ہیں۔ جیسے کسی کو ڈھونڈھ رہی ہیں۔ جیسے
اُسی کو ڈھونڈھ رہی ہیں۔

●●

کشور آرا شبنم

زندگی کو درد کا صحرا بنا سکتی ہوں میں
آپ کے غم کے لیے ہر غم اُٹھا سکتی ہوں میں

میرے ذوقِ جستجو کو کم ہے ساری کائنات
اور اگر سمٹوں تو خود میں ہی سما سکتی ہوں میں

میں نے چاہا ہی نہیں تم کو بھلا دینا کبھی
ورنہ اپنی طرح تم کو بھی بھلا سکتی ہوں میں

حادثہ ہوں، حادثہ ہی ہے مرا رازِ جنوں
حادثوں سے کس طرح دامن بچا سکتی ہوں میں

میرے اشکوں میں ہے شبنم چاند تاروں کی چمک
مشعلِ منزل ہوں راہیں جگمگا سکتی ہوں میں

رخسانہ جبیں
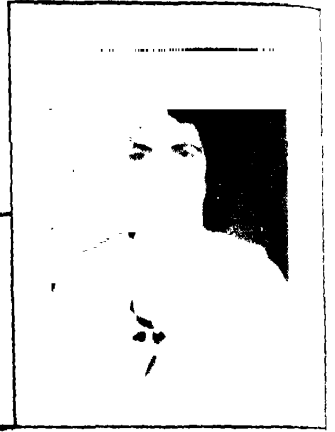
اک عمر سے جاری ہے لہو دیدۂ تر سے
اس دشتِ تپاں پر کبھی بادل نہیں برسے

دونوں نے خفا ہو کے جسے چھوڑ دیا تھا
گزرا ہی نہیں کوئی بھی اس راہگزر سے

اُس کو بھی مہک لمس کی کرتی ہے پریشاں
کچھ میرے لہو میں بھی اُڑاتی ہے شرر سے

ہر صبح مرے شہر میں بکھرا کے اُجالا
ہر شام چلا جاتا ہے وہ جانے کدھر سے

آنکھوں نے سنائی ہے وہ بے لفظ کہانی
ہم مہر بہ لب لوٹے تھے لذت کے سفر سے

"... کانوینٹ کے آٹھویں درجے میں پڑھنے والا راجیش جسے اگلی پیڑھی میں اُن کا نمائندہ بننا تھا ان کے بیٹے اُن پڑھ تھا۔ اس کا باپ بھی اس زبان سے نا آشنا تھا..."

آخری انعام

هیرانند سوز

"ارژنگِ چین"

رانا بخشی کے کتب خانے کے لیے یہ نام واقعی موزوں تھا۔ انھوں نے اپنے کمرے میں اس نام کی تختی سوچ سمجھ کر ہی لگائی تھی۔ یہ کمرہ اُن کی نشست گاہ ہونے کے علاوہ سٹڈی رُوم اور بیڈ رُوم سبھی کچھ تھا۔ مکان کے عقب میں پچھلے صحن سے ملحق ہونے کی وجہ سے یہ کمرہ بچّوں کے شور و شر اور گھر کے دیگر افراد کی دخل اندازی سے محفوظ تھا۔ اس لیے وہ اس میں بیٹھ کر پورے اطمینان اور دل جمعی کے ساتھ کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ کمرے میں دیواروں پر ٹنگی ہوئی مشہور شاعروں اور نامور ادیبوں کی تصاویر کے علاوہ باقی چاروں طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں جنھیں الماریوں اور ریکوں میں قرینے سے سجا کر رکھا گیا تھا۔ کتابوں کی پُشت پر چھپے ہوئے اُن کے ناموں سے بخوبی پتہ چل رہا تھا کہ یہ ساری کی ساری کتابیں اُردو میں ہیں۔ "کلیاتِ میر" سے لے کر "دستِ صبا" تک ہر مستند شاعر کا کلام وہاں موجود تھا۔ نثری گوشے میں جہاں ایک طرف منشی پریم چند کے ناولوں اور افسانوی مجموعوں کے ساتھ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، منٹو، عینی، عصمت اور احمد ندیم قاسمی جلوہ افروز تھے، وہاں برصغیر کے دوسرے قدیم اور جدید کہانی کاروں اور ناول نگاروں کی تخلیقات بھی الماریوں کی زینت بنی ہوئی تھیں۔ ان کے علاوہ شخصیات، تنقید، انشائیہ نگاری اور فنِ عروض پر بھی بے شمار کتابیں الماریوں میں سجی رانا بخشی کی وسعتِ مطالعہ کی گواہی دے رہی تھیں۔ سامنے میز پر نئے اور پُرانے ادبی رسالوں کا ڈھیر تھا۔

یہ سب کچھ نمائشی نہیں تھا۔ رانا بخشی پچھلے پچاس سال سے ان صفحات کا سفر طے کرتے چلے آ رہے تھے۔ یہاں رکھی ہوئی ایک ایک کتاب اُن کے مطالعے کی راہوں سے گزر چکی تھی۔ بہت سی کتابوں کا متن آج بھی اُن کے ذہن میں محفوظ تھا۔ دوستوں سے گفتگو کے دوران وہ تمام دانشور قلم کاروں کے نظریات اور فرمودات کچھ اس طرح سے بیان کر جاتے تھے کہ اُن کی قوتِ یادداشت پر رشک آنے لگتا۔ اس کی وجہ شاید زبان و ادب کے تئیں اُن کی بے پناہ عقیدت اور اُن تمام مصنّفوں سے اُن کی والہانہ محبت تھی جو مطالعے کے دوران فکری سفر میں اُن کے ساتھ رہتے تھے۔

ان کتابوں کے علاوہ اُن کی اپنی بھی اکیس کتابیں سامنے الماری میں سلیقے سے سجی تھیں جنھیں مختلف اشاعتی اداروں نے وقتاً فوقتاً شائع کیا تھا۔ رانا بخشی اپنی اس چھوٹی سی دُنیا میں جو اندر سے بہت وسیع تھی پوری طرح سے مطمئن اور مسرور تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اپنی عمر کا یہ آخری دَور اپنے گھر میں اپنے اکلوتے بیٹے نریندر کے ساتھ گذار رہے تھے جو یہاں ایک صنعتی ادارے میں ملازم تھا۔ اُن کی بیوی ان کی ملازمت کے دوران ہی

تھے۔ پچاسویں سال میں اُن کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ تب سے یہ کتب خانہ ہی اُن کے لیے جائے اماں تھا۔ وہ اب اپنی زندگی انہیں کتابوں کی رفاقت میں گذار رہے تھے۔ اُس وقت بھی وہ اپنے ٹیبل پر جھکے ایک ضخیم کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے اور پڑھنے کے ساتھ ساتھ اُس میں سے کچھ اقتباسات بھی اپنی ڈائری میں نوٹ کرتے جا رہے تھے۔ مصروفیت کے ان لمحات میں اچانک اُن کے پوتے راجیش نے اندر آکر کچھ خطوط اور رسائل اُن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "دادا جی! یہ آپ کی ڈاک۔"

انھوں نے کتاب پر سے نظریں ہٹا کر راجیش سے اپنے خطوط و رسائل لیتے ہوئے پیار سے "تھینک یو" کہا اور پھر اُن میں سے ایک میگزین کا ریپر اتارنے لگے۔ میگزین کے سرورق پر اپنے دادا کی تصویر دیکھ کر راجیش چونک پڑا اور مسرت بھرے لہجے میں کہنے لگا۔

"دادا جی! یہ تو آپ کا فوٹو ہے۔ کون سی بُک ہے یہ؟ تصویر کے نیچے نام بھی آپ کا ہوگا۔"

"ہاں بیٹا! اس میگزین کا نام 'جائزہ' ہے۔ یہ تصویر بھی میری ہے اور اس کے نیچے لکھا ہوا نام بھی۔ تمھارے دادا اس پرچے میں لکھتے ہیں نا!"

رانا بخشی کو اپنے پوتے کا سوال اچھا لگا۔ مگر جواب دیتے ہیں انھیں دُکھ بھی محسوس ہوا۔ کانوینٹ کے آٹھویں درجے میں پڑھنے والا راجیش جسے اگلی پیڑھی میں اُن کا نمائندہ بننا تھا اُن کے لیے اَن پڑھ تھا۔ اس کا باپ بھی اس زبان سے نا آشنا تھا۔ اس گھر کا ایک بھی فرد اُن کے جمع کیے ہوئے علم و ادب کے اتنے بڑے سرمایے سے فیض اٹھانے کے قابل نہ تھا۔ اُن کے کمرے میں رکھی ہوئی اتنی ڈھیر ساری کتابیں اب صرف انھیں کے لیے تھیں۔ اس خیال سے انھیں دھچکا سا لگا۔ یہ سب کتابیں اُن کے بعد اس گھر کے لیے ایک ردّی کے ڈھیر کے سوا کچھ بھی نہ ہوں گی۔ کئی بار اُن کا جی چاہا تھا کہ وہ یہ زبان اپنے پوتے کو تو پڑھا دیں تاکہ مستقبل میں وہ ان نوادر سے فیضیاب ہو سکے اور زبان کی شیرینی اور لطافت کا حظ اُٹھا سکے۔ لیکن اتنا وقت اُس کے پاس کہاں تھا۔ پہلے ہی تین زبانوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ان کا کمسن پوتا اب ایک اور زبان کا بوجھ کس طرح اُٹھا سکتا تھا اور اُدھر فکرِ معاش میں گھرے ہوئے اُن کے اپنے بیٹے کے پاس بھی اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اُن کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اُن کے پاس اردو کا قاعدہ پڑھنے کے لیے بیٹھ جاتا۔ وہ کبھی کبھی بے حد اُداس ہو جاتے تھے۔ وہ اپنا یہ سرمایہ دل کھول کر بانٹنا چاہتے تھے۔ نئی نسل کے ذہنوں کو اس روشنی سے منوّر کرنا چاہتے تھے مگر اپنے تھکے ہوئے اعضاء کے ساتھ اب وہ خود میں اتنی ہمت نہیں پا رہے تھے کہ یہ تک بھی چل سکیں۔ انھیں گناہ کا احساس ہو رہا تھا کہ یہ خیال اُن کے دماغ میں اُس وقت کیوں نہیں آیا جب وہ اپنے بیٹے کے ساتھ اس کے بچپن میں کو بھی بآسانی اُردو پڑھا سکتے تھے۔ اب تو زندگی کے اپنے بچے اتنے بڑے ہو گئے تھے کہ وہ خود انھیں پڑھانے کے لیے ڈیوٹی سے لوٹنے کے بعد گھنٹوں تک مغز کھپاتا تھا۔ رانا بخشی کی ادبی مصروفیات اور ذوقِ شاعری صرف انھی کی ذات تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ گھر والوں کے لیے یہ چیزیں بے مقصد اور فضول تھیں۔

بچّوں کے امتحانات قریب آ رہے تھے۔ گھر میں اب سائنس، ہسٹری اور اکنامکس کے تذکرے تھے۔ امتحان پاس کرنے کے لیے نصابی زبانوں کی طرف توجہ دی جا رہی تھی۔ اُردو کا ذکر دُور دُور تک کہیں نہیں تھا۔ لیکن بخشی صاحب اُس وقت بھی سب سے الگ تھلگ اپنے مطالعے اور تخلیقی کاموں میں مصروف تھے۔

لیکن پھر نہ جانے کیسے گھر میں آہستہ آہستہ نئی قسم کی سرگوشیاں جنم لینے لگیں۔ کانوینٹ اسکولوں کی فیس اگلے سال سے ڈیڑھ گنا بڑھائی جا رہی تھی۔ داخلے کی شرحوں میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ درسی کتابوں کی قیمتیں آسمان کو چھونے لگی تھیں۔ یونیفارم، بلڈنگ فنڈ غرض یہ کہ بچّوں کی تعلیم کا ہر آئٹم گھر کے اقتصادی ڈھانچے پر کاری ضرب لگا رہا تھا۔ اُدھر بڑھتی ہوئی مہنگائی نے بھی آمدنی اور گھر کے اخراجات کا توازن بگاڑ دیا تھا — پھر ایک دن اُس گھر میں دھماکہ ہو گیا۔

بخشی صاحب ایک اتوار کی شام کو جب کسی ادبی سیمینا

سے گھر واپس لوٹے تو اُن کے بیٹے نریندر نے اُن کے پاس آکر نرم لہجے میں کہا۔

"پاپا! آپ سے ایک درخواست ہے۔ بچّوں کے بڑھتے ہوئے تعلیمی اخراجات اور اس قدر بڑھتی ہوئی مہنگائی کے کارن اب مجھ سے اپنی اس تنخواہ کے ساتھ گھر کا خرچ چلانا مشکل ہو رہا ہے۔ اس لیے طے یہ ہوا ہے کہ آپ کا یہ کمرہ جو محض کتابوں سے بھرا پڑا ہے کرایے پر اٹھا دیا جائے۔ اردو کتابوں کا چلن اب کہاں رہا ہے۔ گھر میں یوں ہی اتنی ساری جگہ گھری پڑی ہے۔ کرایہ دار اس وقت ہمارے پاس ہے جو چھ ماہ کا کرایہ پیشگی دینے کے لیے تیار ہے۔ اس سے نہ صرف بچّوں کے داخلے اور کتابوں کے سارے اخراجات پورے ہوں گے بلکہ بچّوں کی فیس بھی ہر ماہ ادا ہوتی رہے گی۔ آپ کی یہ کتابیں آپ ہی کے پاس رہیں گی آپ بس انھیں بوریوں میں بھر کر اوپر برساتی میں پہنچا دیں۔ آپ کی اپنی رہائش کے لیے بچّوں کے کمرے میں کافی جگہ ہے۔ امید ہے آپ میری مجبوری کو سمجھتے ہوئے اس بات کو محسوس نہ کریں گے۔"

نریندر کی بات معقول تھی یا نہیں مگر رانا بخشی کو اس سے بہت صدمہ پہنچا۔ وہ کرسی کا بازو تھام کر وہیں بیٹھ گئے۔ اس اچانک حملے کے لیے وہ بالکل تیار نہیں تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی بات کا کیا جواب دیں۔ انھوں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے رسان سے کہا "اچھا بیٹے جیسے تمھاری مرضی ہو کرو لیکن ان کتابوں کو سنبھالنے کے لیے مجھے کچھ وقت درکار ہوگا۔ ساری عمر انھوں نے میرا ساتھ دیا ہے۔ میں ان سے چشم پوشی کرکے انھیں اس طرح کس مپرسی کی حالت میں نہیں ڈال سکتا۔"

"لیکن پاپا! کتابیں تو آپ کے پاس ہی رہیں گی۔ آپ بس انھیں پیک کرکے اوپر برساتی میں رکھوا دیں۔ جب بھی آپ کا جی چاہے آپ انھیں نکال کر پڑھ سکتے ہیں۔"

رانا بخشی کو اس بار اپنے بیٹے کی بات سن کر خاموش ہو جانا پڑا۔ وہ نریندر کو ان کتابوں کی عظمت اور اُن کے احترام کا احساس نہیں دلا سکتے تھے۔ اس نے ان کتابوں کے سینوں میں چھپے ہوئے علم و دانش کے خزانے نہیں دیکھے تھے۔ وہ اردو الفاظ کے طلسم اور شعروں کی نغمگی اور رس و رسے نا آشنا تھا جس شخص کو پتہ ہی نہیں تھا کہ دانشوروں کے خیالات کس طرح زندگی کی راہیں روشن کرتے ہیں، وہ ان کتابوں کی قدر کا اندازہ کیسے کر سکتا تھا۔

رانا بخشی چپ چاپ وہاں سے اٹھ کر اپنے مطالعہ گھر میں آگئے اور اس کے بعد دو دن تک اپنے اوپر خاموشی کا لبادہ اوڑھے رہے۔ اسی ہفتے انھیں ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے حیدرآباد جانا تھا۔ وہ اس بات کا فیصلہ وہاں سے لوٹ کر کرنا چاہتے تھے کیوں کہ اس سلسلے میں ان کا ارادہ وہاں کی لائبریری سے مشورہ کرنے کا بھی تھا مشاعرے کی تاریخ میں ابھی کچھ دن باقی تھے مگر وہ گھر کی گھٹن سے نجات پانے کے لیے جلد ہی وہاں سے روانہ ہو گئے۔

اور پھر چار پانچ دن بعد جب وہ وہاں سے لوٹے تو انھیں اپنے کمرے کا نقشہ یکسر بدلا ہوا نظر آیا۔ کرایہ دار وہاں پہنچ چکا تھا اور اس کا سامان باہر صحن میں رکھا ہوا تھا۔ کمرے کی تمام کتابیں بوریوں میں بھر کر باہر نکالی جا چکی تھیں۔ کچھ کتابیں ادھر اُدھر بکھری بھی پڑی تھیں۔ غالب، داغ اور ذوق زمین پر پڑے ایک فریادی کی طرح ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

رانا بخشی کا دل ڈوبنے لگا۔ انھیں چکر آتے ہوئے محسوس ہوئے۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئیں اور وہ ایک کٹے ہوئے درخت کی طرح چار پائی پر گر پڑے۔ راجیش نے دادا جی کو اس حالت میں دیکھ کر پاپا کو آواز دی۔ نریندر دوڑ کر جب اُن کے قریب پہنچا تو اُن کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ جلدی سے ڈاکٹر کو بلوایا گیا دل کے دورے کی علامتیں نظر آ رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے انھیں پوری طرح سے آرام کرنے کی تاکید کی اور کچھ دوائیاں دے کر صبح انھیں ہسپتال میں ہارٹ سپیشلسٹ کے پاس لے جانے کا مشورہ دیا۔ گھر والوں کا خیال تھا کہ یہ سب حیدرآباد کے دورے کی وجہ سے ہوا ہے۔ سب کو شکایت تھی کہ انھیں اس عمر میں اتنے لمبے سفر نہیں کرنے چاہئیں۔ بخشی صاحب نے اس وقت بھی منہ سے کچھ نہ کہا۔ وہ جانتے تھے کہ گھر کے بے حس لوگوں کو وہ ان بکھری ہوئی کتابوں

وہ اُردو زبان سے اپنی محبت کا احساس نہیں دلا سکتے۔ جن لوگوں نے اس زبان کا حُسن دیکھا ہی نہیں وہ اُس سے محبت کی کسک کو کیسے محسوس کرسکتے ہیں۔ رات بھر وہ تکلیف سے کروٹیں بدلتے رہے اور پھر صبح جب گھر میں ایمبولینس گاڑی منگوانے کے لیے مشورے ہو رہے تھے، اتفاق ایک معجزے کی طرح ان سب کے سامنے رونما ہوا۔

ایمبولینس کے لیے ٹیلیفون کرنے سے پہلے ہی دو اجنبی شخص ایک کار سے اُتر کر اُن کے صحن میں داخل ہوئے اور باہر کھڑے ہوئے راجیش سے رانا بخشی کے بارے میں دریافت کرنے لگے۔ ان میں سے ایک کے کاندھے پر کیمرہ لٹک رہا تھا اور دوسرے کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے۔

نریندر باہر نکل کر جب اُن کے پاس پہنچا تو انھوں نے بتایا کہ وہ پریس رپورٹر ہیں۔ آج رات کو ہی اُن کے اخبار کے دفتر میں ٹیلی پرنٹر سے خبر موصول ہوئی ہے کہ صوبائی اردو اکادمی نے بخشی صاحب کو اردو زبان کے لیے ان کی پچاس سالہ خدمات کے صلے میں گیارہ ہزار روپے کا ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ اُن کا انٹرویو اور اُن کے اسٹڈی روم کے فوٹو لینے کے لیے آئے ہیں۔ اُمید ہے بخشی صاحب انھیں اس کی اجازت دے دیں گے۔

نریندر جلدی سے انھیں بخشی صاحب کے پاس لے آیا اور اُن کا تعارف کرانے کی غرض سے جھک کر بولا "پاپا جی! یہ لوگ......"

مگر بخشی صاحب شاید اپنے آپ کو اس انعام کے قابل نہ سمجھتے ہوئے پہلے ہی وہاں سے کوچ کر چکے تھے۔

اُن کی جگہ اب صرف اُن کی کتابیں ہی انٹرویو دینے کے لیے چاروں طرف بکھری پڑی تھیں۔

●●

شاہ جہاں کی اولادیں

شاہ جہاں کی عمر پندرہ سال دو مہینے چودہ روز کی تھی تو اس کی شادی ممتاز زمانی بیگم سے ہوئی۔ پانچ برس منگنی رہی تھی، نکاح کے وقت اس بیگم کی عمر ۱۹ برس کچھ مہینوں کی تھی، پانچ لاکھ مہر بندھا۔ اس شادی سے پہلے شاہ جہاں کا مظفر حسین مرزا کی دختر سے نکاح ہوا تھا اور اس بیگم کے پیٹ سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام پرہیز بانو رکھا گیا۔ ممتاز محل کے نکاح سے پانچ برس بعد شاہ جہاں کا نکاح ۲ رمضان کو عبدالرحیم خاں، خانِ خاناں کی بیٹی سے مصلحتاً کیا گیا۔ اس بیوی کے پیٹ سے ایک لڑکا آگرے میں پیدا ہوا جو ایک برس نو مہینے کا ہوکر مرگیا، جہاں افروز نام تھا۔

ممتاز محل کی کوکھ سے بیس برس میں آٹھ لڑکے اور چھ لڑکیاں اس تفصیل سے پیدا ہوئے:

نور النسا بیگم ــــــــ ۸ ماہ صفر سنہ ۱۰۲۰ ہجری
جہاں آرا بیگم ــــــــ ۲۱ صفر سنہ ۱۰۲۳ ہجری
دارا شکوہ ــــــــ ۲۹ صفر سنہ ۱۰۲۴ ہجری
شاہ شجاع ــــــــ ۱۸ جمادی الآخر سنہ ۱۰۲۵ ہجری
روشن آرا بیگم ــــــــ ۲ رمضان سنہ ۱۰۲۶ ہجری
اورنگ زیب ــــــــ ۱۵ ذیقعدہ سنہ ۱۰۲۷ ہجری
اُمید بخش ــــــــ ۱۱ محرم سنہ ۱۰۲۹ ہجری
ثریا بانو بیگم ــــــــ ۲ رجب سنہ ۱۰۳۰ ہجری
لڑکا نام رکھنے سے پہلے مرگیا ــــ سنہ ۱۰۳۲ ہجری
مراد بخش ــــــــ ۲۵ ذی الحجہ سنہ ۱۰۳۳ ہجری
لطف اللہ ــــــــ ۴ صفر سنہ ۱۰۳۴ ہجری
مرزا دولت افزا ــــــــ ۴ رمضان سنہ ۱۰۳۶ ہجری
حسن آرا بیگم ــــــــ ۱۰ رمضان سنہ ۱۰۳۹ ہجری
گوہر آرا بیگم ــــــــ سنہ ۱۰۴۰ ہجری

اس لڑکی کے پیدا ہونے کے صدمے سے ممتاز محل فوت ہوگئیں۔

ــــ سید ناصر نذیر فراق (لال قلعے کی ایک جھلک)

غزلیں

حقیر آستانی

زندگی فکر و عمل کا نام ہے
راز یہ صدیوں سے طشت از بام ہے

آزمائش ایک صبح و شام ہے
زندگی پروردۂ آلام ہے

چین سے کب بیٹھنے دے گی ہمیں
نام اس کا گردشِ ایّام ہے

اک تماشا دیکھتے ہیں روز و شب
آج کل آرام ہی آرام ہے

ہوں مُبارک تجھ کو بالا دستیاں
بُود و باش اپنی تو زیرِ دام ہے

ناچتی پھرتی ہے وحشت شہر میں
ایک عالم لرزہ براندام ہے

گویا خاکستر سے اُٹھیں گے حقیر
جو خبر ہم نے سنی ہے عام ہے

وید دیوانہ

اب کوئی ساتھ نہیں، ساتھ نبھانے والا
یاد آتا ہے بہت رُوٹھ کے جانے والا

بس اسی آس پہ آنکھوں کے دیے جلتے ہیں
لوٹ آئے گا کبھی روٹھ کے جانے والا

اپنے چہرے کی ہو پہچان کسی کو کیوں کر
کوئی ملتا نہیں آئینہ دِکھانے والا

رات کے پچھلے پہر روز چلا آتا ہے
میری آنکھوں کے چراغوں کو بُجھانے والا

خانہ برباد پرندوں کی طرف بھی دیکھے
سبز پیڑوں کو سرِ راہ گرانے والا

دے گیا اور بھی کچھ طول سفر کو میرے
مُجھ کو ہر موڑ پہ آواز لگانے والا

خُود سے روٹھوگے دیوانہ تو بکھر جاؤگے
اب یہاں کوئی نہیں تم کو منانے والا

"... ایک بزرگ سے میں ذاتی طور پر واقف ہوں۔ ان کا انتقال ایک سو سات سال کی عمر میں ہوا۔ آخر وقت تک نہ صرف یہ کہ وہ تندرست رہے بلکہ اپنے تمام کام حتیٰ کہ کھیتی باڑی سے متعلق کام بھی جو بہت سخت ہوا کرتے ہیں خود ہی کرتے رہے..."

ڈاکٹر عبدالحنان

ہماری صحت — روبہ زوال کیوں؟

عام مشاہدہ یہ ہے کہ انسانی صحت روز بروز روبہ زوال ہے۔ جسمانی اور دماغی سکون کے لحاظ سے ہمارے بزرگ شاید زیادہ خوش نصیب تھے حالانکہ سائنسی ترقی کا عہد نہیں تھا۔ سائنسی علوم ترقی پر ہیں، نت نئی ایجادات و معلومات سامنے آ رہی ہیں، بہت سے امراض کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ نئے اور زیادہ بھیانک امراض پیدا ہوتے جا رہے ہیں زیادہ کثرت سے پھیلنا شروع ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر امراضِ قلب اور بلڈ پریشر کو ہی لے لیجیے۔ یہ شاذ و نادر ہی کسی کو ہوا کرتے تھے۔ بلڈ پریشر امیروں اور فیشن زدہ لوگوں کی بیماری سمجھا جاتا تھا اور اگر کوئی عام آدمی اس میں مبتلا ہو جاتا تو اسے مبارکباد دی جاتی تھی کہ آپ کا شمار بھی رئیسوں میں ہو گیا۔ بواسیر کبھی کبھی کسی کو ہو جاتا تھا۔ پیٹ کے امراض، آنتوں کے ورم اور معدہ کی تیزابیت جیسے امراض اتنے عام نہیں تھے گردے بھی کثرت سے خراب نہیں ہوتے تھے۔ نظر عام طور پر بڑھاپے میں ہی کمزور ہوتی تھی — جوانوں میں شاذ و نادر ہی کوئی عینک لگائے نظر آتا تھا۔ دانت بھی بڑھاپے تک — ساتھ دیا کرتے تھے۔

لیکن آج کا نوجوان اتنی اچھی صحت کا مالک نہیں ہے جتنا کہ اُسے ہونا چاہیے۔ اس کے لیے ہمیں ایک نظر اپنے بزرگوں کے رہن سہن اور غذائی عادات پر ڈالنی ہوگی چونکہ تندرستی کا انحصار انہی چیزوں پر ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گرد و پیش میں بھی نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ ہمارے بزرگوں کا رہن سہن بہت سادہ تھا۔ زندگیاں پُر مشقت تھیں۔ جسمانی محنت اور چہل قدمی زیادہ کرنی پڑتی تھی۔ گرد و اعصابی ہیجان کم تھے۔ پیدل چلنے کے مواقع مل جایا کرتے تھے جو سواریاں استعمال ہوتی تھیں — وہ بھی پُر مشقت تھیں۔ ایک بزرگ سے میں ذاتی طور پر واقف ہوں۔ ان کا انتقال ایک سو سات سال کی عمر میں ہوا۔ آخر وقت تک نہ صرف یہ کہ وہ تندرست رہے بلکہ اپنے تمام کام حتیٰ کہ کھیتی باڑی سے متعلق کام بھی جو بہت سخت ہوا کرتے ہیں، خود ہی کرتے رہے۔ انھیں کبھی کسی نے خالی بیٹھے ہوئے یا دوستوں میں محض وقت ضائع کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ان کی عمر جب سو سال سے تجاوز کر گئی تو بیٹوں اور پوتوں کو ترس آیا اور انھیں مشورہ دیا گیا کہ اب آپ آرام کیجیے ہم لوگ کاروبار سنبھالنے کے لیے موجود ہیں۔ سو سالہ باہمت بزرگ کا جواب تھا "کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں وقت سے پہلے مر جاؤں"۔ اس زمانے میں مشقت کے ساتھ ساتھ بھرپور آرام بھی کیا جاتا تھا۔ جلدی سونے — اور جلدی اٹھنے کا عام معمول تھا۔ روشنیاں اس قدر تیز ایجاد نہیں ہوئی تھیں جو نظر کو چکا چوند کر دیں اس لیے زیادہ تر کام دن کی روشنی میں مکمل کر لیے جاتے تھے۔ اس سے بینائی بھی محفوظ رہتی تھی اور ہر

غزلیں

حقیر آستانی

زندگی فکر و عمل کا نام ہے
راز یہ صدیوں سے طشت از بام ہے
آزمایش ایک صبح و شام ہے
زندگی پروردۂ آلام ہے
چین سے کب بیٹھنے دے گی ہمیں
نام اِس کا گردشِ ایّام ہے
اک تماشا دیکھتے ہیں روز و شب
آج کل آرام ہی آرام ہے
ہوں مُبارک تجھ کو بالا دستیاں
بُود و باش اپنی تو زیرِ دام ہے
ناچتی پھرتی ہے وحشت شہر میں
ایک عالم لرزہ براندام ہے
گویا خاکستر سے اُٹھیں گے حقیرؔ
جو خبر ہم نے سنی ہے عام ہے

وید دیوانہ

اب کوئی ساتھ نہیں ساتھ نبھانے والا
یاد آتا ہے بہت رُوٹھ کے جانے والا
بس اسی آس پہ آنکھوں کے دیے جلتے ہیں
لوٹ آئے گا کبھی روٹھ کے جانے والا
اپنے چہرے کی ہو پہچان کسی کو کیوں کر
کوئی ملتا نہیں آئینہ دِکھانے والا
رات کے پچھلے پہر روز چلا آتا ہے
میری آنکھوں کے چراغوں کو بُجھانے والا
خانہ برباد پرندوں کی طرف بھی دیکھے
سبز پیڑوں کو سرِ راہ گرانے والا
دے گیا اور بھی کچھ طول سفر کو میرے
مجھ کو ہر موڑ پہ آواز لگانے والا
خود سے روٹھو گے دِوانہ تو بکھر جاؤ گے
اب یہاں کوئی نہیں تم کو منانے والا

"... ایک بزرگ سے میں ذاتی طور پر واقف ہوں۔ ان کا انتقال ایک سو سات سال کی عمر میں ہوا۔ آخر وقت تک نہ صرف یہ کہ وہ تندرست رہے بلکہ اپنے تمام کام حتیٰ کہ کھیتی باڑی سے متعلق کام بھی جو بہت سخت ہوا کرتے ہیں خود ہی کرتے رہے ..."

حکیم عبدالحنان

ہماری صحت ـــــ روبہ زوال کیوں؟

عام مشاہدہ یہ ہے کہ انسانی صحت روز بروز روبہ زوال ہے۔ تندرستی اور دماغی سکون کے لحاظ سے ہمارے بزرگ شاید ہم سے زیادہ خوش نصیب تھے حالانکہ سائنسی ترقی کا عہد نہیں تھا۔ آج سائنسی علوم ترقی پر ہیں۔ نت نئی ایجادات و معلومات ہمارے سامنے آرہی ہیں۔ بہت سے امراض کا خاتمہ کردیا گیا ہے۔ لیکن نئے اور زیادہ بھیانک امراض پیدا ہوتے جارہے ہیں یا زیادہ کثرت سے پھیلنا شروع ہوگئے ہیں۔ مثال کے طور پر امراض قلب اور بلڈ پریشر کو ہی لے لیجیے۔ یہ شاذ و نادر ہی کسی کو ہوا کرتے تھے۔ بلڈ پریشر امیروں اور فیشن زدہ لوگوں کی بیماری سمجھا جاتا تھا اور اگر کوئی عام آدمی اس میں مبتلا ہو جاتا تو اسے [illegible] مبارکباد دی جاتی تھی کہ آپ کا شمار بھی رئیسوں میں ہوگیا۔ کینسر کبھی کبھی کسی کو ہو جاتا تھا۔ پیٹ کے امراض، آنتوں کے ورم اور معدہ کی تیزابیت جیسے امراض اتنے عام نہیں تھے۔ گردے اتنی کثرت سے خراب نہیں ہوتے تھے۔ نظر عام طور پر بڑھاپے میں ہی کمزور ہوتی تھی ـــــ جوانوں میں شاذ و نادر ہی کوئی عینک لگائے نظر آتا تھا۔ دانت بھی بڑھاپے تک ـــــ ساتھ دیا کرتے تھے۔

لیکن آج کا نوجوان اتنی اچھی صحت کا مالک نہیں ہے جتنا کہ اسے ہونا چاہیے۔ اس کے لیے ہمیں ایک نظر اپنے بزرگوں کے رہن سہن اور غذائی عادات پر ڈالنی ہوگی چونکہ تندرستی کا انحصار انھیں چیزوں پر ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان دونوں شعبوں میں ہی بڑی نمایاں تبدیلی پیدا ہوگئی ہے۔ ہمارے بزرگوں کا رہن سہن بہت سادہ تھا۔ زندگیاں پُر مشقت تھیں۔ جسمانی محنت اور بہت زیادہ کرنی پڑتی تھی مگر دماغی [illegible] اعصابی ہیجان کم تھے۔ پیدل چلنے کے مواقع مل جایا کرتے تھے جو سواریاں استعمال ہوتی تھیں ـــ وہ بھی پُر مشقت تھیں۔ ایک بزرگ سے میں ذاتی طور پر واقف ہوں۔ ان کا انتقال ایک سو سات سال کی عمر میں ہوا۔ آخر وقت تک نہ صرف یہ کہ وہ تندرست رہے بلکہ اپنے تمام کام حتیٰ کہ کھیتی باڑی سے متعلق کام بھی جو بہت سخت ہوا کرتے ہیں، خود ہی کرتے رہے۔ انھیں کبھی کسی نے خالی بیٹھے ہوئے یا دوستوں میں محض وقت ضائع کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ان کی عمر جب سو سال سے تجاوز کر گئی تو بیٹوں اور پوتوں کو ترس آیا اور انھیں مشورہ دیا گیا کہ اب آپ آرام کیجیے ہم لوگ کاروبار سنبھالنے کے لیے موجود ہیں۔ سو سالہ باہمت بزرگ کا جواب تھا "کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں وقت سے پہلے مر جاؤں"۔ اس زمانے میں مشقت کے ساتھ ساتھ بھرپور آرام بھی کیا جاتا تھا۔ جلدی سونے ـــــ اور جلدی اٹھنے کا عام معمول تھا۔ روشنیاں اس قدر تیز ایجاد نہیں ہوئی تھیں جو نظر کو چکا چوند کردیں اس لیے زیادہ تر کام دن کی روشنی میں مکمل کرلیے جاتے تھے۔ اس سے بینائی بھی محفوظ رہتی تھی اور [illegible]

چہرے پر چشمے بھی سجے ہوئے نظر نہیں آتے تھے۔ آج کل معصوم بچّوں کے چہروں پر بھی عینکیں اس طرح لگی ہوتی ہیں گویا یہ ان کے جسم کا کوئی لازمی حصّہ ہوں یا پیدائشی طور پر ہی انھیں وراثت میں ملی ہوں۔

کپڑے عام طور پر سُوتی استعمال ہوتے تھے یا اونی۔ ان کے علاوہ بھی جو کپڑے استعمال کیے جاتے تھے وہ قدرتی چیزوں سے ہی بنائے جاتے تھے۔ مصنوعی اور کیمیاوی چیزوں کا دخل نہیں ہوتا تھا۔ کھانا پکانے اور کھانے کے برتن بھی تانبے، پیتل، چینی، کانچ یا لکڑی کے استعمال ہوتے تھے۔ پلاسٹک کی بھرمار نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی ایلومنیم اور اسٹین لیس اسٹیل عام ہوا تھا۔ تانبے کے برتنوں پر وقتاً فوقتاً قلعی کرائی جاتی تھی جس سے وہ صاف اور چمکدار بھی رہتے تھے اور قلعی جسم کو بھی فائدہ پہنچاتی تھی۔

ایک بہت بڑی تبدیلی جس شعبے میں ہوئی ہے اور جس کے اثرات بھی صحت پر بہت نمایاں طور پر ہوئے ہیں، وہ غذا اور اس سے متعلقہ چیزیں ہیں۔ غذا تیار کرنے کے بیشتر مراحل گھروں میں ہی طے کیے جاتے تھے مثلاً گندم کی دھلائی بنائی اور پسائی، دالوں کی تیاری، مصالحے پیسنا، دلیہ، سوجی وغیرہ تیار کرنا۔ اچار، چٹنیاں، مربّے حتیٰ کہ گھروں میں استعمال ہونے والے شربت وغیرہ بھی خانہ ساز ہوا کرتے تھے۔ اس وقت تک یہ شعبہ صنعت کاروں کی نظر کرم سے محفوظ تھا۔ پھلوں کو وقت سے پہلے پکانے یا ان کے رس کو ڈبوں میں کیمیائی اشیاء ملاکر محفوظ کرنے کے طریقے بھی عام نہیں ہوئے تھے۔ کھانے مہینوں تک فریج اور ڈیپ فریزر میں رکھ کر نہیں کھائے جاتے تھے۔ خشک دُودھ کی بجائے تازہ دُودھ استعمال ہوتا تھا۔ کھانے سادہ اور تازہ پکائے جاتے تھے جو مصنوعی رنگوں اور خوشبوؤں سے پاک ہوا کرتے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر چیز میں تبدیلی آتی چلی گئی۔ ملکی اور غیر ملکی صنعت کاروں کی دلچسپیاں ہر شعبے میں بڑھتی چلی گئیں۔ نت نئی چیزیں بازار میں آنے لگیں۔ پیکنگ کی دیدہ زیبی اور اشتہارات کی جادوگری نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا۔ باہر سے آئی ہوئی ہر چیز سونا نظر آنے لگی۔ خود اپنی تہذیب و تمدّن حتیٰ کہ غذائیں تک دقیانوسی لگنے لگیں۔ تاجرانہ ذہن جب کسی چیز میں دلچسپی لیتا ہے تو اس کے سامنے بنیادی مقصد منافع کمانا ہوتا ہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہوتا ہے کہ جب کم قیمت کو بیش قیمت بنا کر پیش کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ فروخت کرنے کی کوشش کی جائے چنانچہ اس کے لیے تمام ممکنہ جتن کیے جاتے ہیں خواہ معیار برقرار نہ رہے۔ بعض اوقات اس لالچ میں انسانی صحت کی بھی فکر نہیں کی جاتی۔ یہ غفلت بعض غذائی اشیا میں بھی برتی جا رہی ہے۔

سہل پسندی اور تن آسانی کی عادت نے صنعت کاروں کو اپنی دکان چمکانے کا خوب موقع دیا ہے۔ اس لیے ہر چیز سر بند حالت میں گھروں میں آنے لگی ہے۔ پہلے مربّے مصالحے پیک ہوتے تھے پھر پوری پراٹھے فیرنی حتیٰ کہ پکوڑے بھی اس کی زد میں آگئے۔ شاید وہ وقت بھی آجائے جب پکی پکائی بلکہ ہضم شدہ غذا ڈبوں میں ملے گی اور باورچی خانے کی گھروں میں ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ اس دور کی ابتدا میں پہلے تیلوں کو اس قدر صاف کیا گیا کہ ان سے بیشتر غذائی اجزا غائب ہوگئے پھر انھیں جما کر انھیں "گھی" کا نام دے دیا گیا۔ اس کارروائی میں جو کچھ غذائیت کم ہوئی وہ الگ، اور کیمیاوی اجزا جو شامل ہوگئے اور صحت کو نقصان پہنچانے لگے وہ ایک طرف۔ سادہ لوح عوام نے اسے زیادہ قیمت دے کر خریدنا اور گھی سمجھ کر کھانا شروع کر دیا۔ شکر بنانے کے دوران گنّے کے رس اور گڑ کو اتنا صاف کیا گیا کہ وہ خوشنما صاف شفّاف نظر آنے لگے مگر اس کی فکر کسی نے نہیں کی کہ گنّے اور گڑ میں موجود وہ ضروری اجزا کیا ہوئے جو جسم میں پہنچتے ہی انسولین کی پیدائش بڑھا دیتے تھے اور ذیابیطس کا مرض پیدا نہیں ہونے دیتے تھے۔ بہت باریک چھنا ہوا آٹا اور بغیر چھلکے کی دالیں استعمال ہونے لگیں جس کی وجہ سے معدے کی تیزابیت، معدے اور آنتوں کے زخم عام ہوگئے۔ چاول پالش کیے ہوئے اس لیے پکائے جاتے ہیں تاکہ خوشنما نظر آئیں خواہ ان کی زیادہ تر غذائیت پالش کرنے میں ضائع ہو جائے۔

اس دور میں سب سے زیادہ نقصان بچّوں کی صحت کو پہنچا ہے۔ چیونگم، چاکلیٹ، ٹافی، ٹھنڈی بوتلیں کچھ اس طرح

لگیں کہ ان کے بغیر زندگی محال نظر آنے لگی۔ ان کی پرکشش تشہیر نے بچّوں کے ذہنوں میں ان کی اہمیت اور افادیت اس قدر بٹھا دی ہے کہ وہ انھیں استعمال کرنا فخر کی بات سمجھنے لگے ہیں اور اپنا پیٹ زیادہ تر انھی چیزوں سے بھرتے ہیں۔ حالانکہ ان میں غذائیت برائے نام اور بیماریوں کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ ان کے رواج پا جانے کی وجہ سے ہماری روایتی چیزیں جو بچّے اپنے جیب خرچ سے خریدا کرتے تھے یا والدین انھیں دیتے تھے اب غیر مہذب اور حقیر ہو گئی ہیں مثلاً مونگ پھلی، چنے، شکر قندی، شتو وغیرہ جو کہ سستی بھی ہوتی ہیں اور بچّوں کی جسمانی ضرورت کے لحاظ سے انھیں پروٹین اور دوسرے ضروری اجزا فراہم کرتی ہیں۔ بچّے تو بچّے بڑوں کا انداز فکر اس قدر بدل گیا ہے کہ وہ بھی اگر بچّوں کو مونگ پھلی اور چنے کھاتے ہوئے دیکھ لیں تو اپنی ہتک تصور کرتے ہیں کہ ناحق ہماری ناک کٹوا رہا ہے۔

اب ہم ایک تفصیلی نظر آج کی ہر دلعزیز و مشہور زمانہ اشیائے خور و نوش چائے، کافی، کولا، چاکلیٹ اور ان سے تیار ہونے والی چیزوں پر ڈالتے ہیں۔ ان سب میں جو فرحت بخش جز شامل ہے اور جس کی وجہ سے یہ اتنی تیزی سے مقبول ہوتی ہیں وہ "کیفین" ہے۔ جس کے بارے میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ الکحل کی طرح نشہ تو نہیں لاتی مگر اس کے مسلسل استعمال سے لوگ اس کے عادی اسی طرح سے ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے اس کی طلب بھی بار بار ہوتی ہے۔ کیفین تمام دنیا میں نباتات کی مختلف اقسام میں ملتی ہے مگر یہ سب سے زیادہ کافی سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ چائے، میٹ، پیراگوآنہ اور کولا میں پائی جاتی ہے۔

کیفین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اعصاب کو سکون دیتی ہے اور جسم میں چستی پیدا کرتی ہے۔ ابتدا میں یہ دماغ کے بالائی مراکز پر اثر انداز ہو کر تیزی کے ساتھ بیداری اور تحریک پیدا کرتی ہے جس سے تھکاوٹ کا احساس جاتا رہتا ہے۔ حالانکہ جسمانی اور دماغی کام کرنے والوں کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اس بیداری اور تحریک کے ساتھ یہ خیالات کی آمد میں بھی تیزی کے ساتھ اضافہ کر دیتی ہے اور یہ آمد کبھی اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ ذہن کو ایک بات پر مرکوز رکھنا دشوار ہو جاتا ہے جس کے باعث کسی نتیجے پر نہیں پہنچا جا سکتا۔ دوسرا فائدہ تھکاوٹ میں کمی کا ہے۔ اسے اس طرح سمجھنا چاہیے کہ تھکاوٹ جسم کی طرف سے ایک واضح اشارہ ہے کہ اب مجھے آرام کی ضرورت ہے اور اس اشارے کو سمجھتے ہوئے ضروری ہو جاتا ہے کہ کچھ دیر آرام کر لیا جائے نہ کہ محرک چیزیں استعمال کر کے اس احساس کو دبا دیا جائے۔ محض احساس دور کر دینے سے تھکاوٹ تو دور نہیں ہوگی وہ جسم میں اپنی جگہ برقرار ہے اور جسم کو نقصان پہنچا رہی ہے صرف آپ کو اس کا پتا نہیں چل رہا۔ اس طرح جسم میں محفوظ قوت کا ذخیرہ خرچ ہونا شروع ہو جاتا ہے جس کی تلافی ناممکن ہوتی ہے دھیرے دھیرے یہی جسمانی کمزوری دماغی ضعف اور اعصابی خستگی کا سبب بن جاتی ہے۔ تکان کا علاج صرف آرام سے ہی کیا جا سکتا ہے۔

کیفین اگر مناسب مقدار میں بھی استعمال کی جائے تب بھی یہ معدے میں تیزابی مادّے پیدا کرتی ہے۔ اس کا تجربہ واضح طور پر جانوروں پر کیا جا چکا ہے۔ انھیں کیفین تھوڑے تھوڑے وقفے سے دن میں کئی بار استعمال کرائی گئی جس کی وجہ سے ان کے معدے میں جلد ہی زخم پیدا ہو گئے۔ اس کے علاوہ جو نقصانات کیفین کے استعمال سے ہو سکتے ہیں وہ بے خوابی، چڑچڑا پن، اعصابی کمزوری، ہاتھوں میں رعشہ اور دل کی حرکت میں بے قاعدگی ہیں۔

کافی کے ایک پیالے میں ۱۰۰ سے لے کر ۱۵۰ ملی گرام تک کیفین ہوتی ہے اور چائے میں بھی اس کی اچھی خاصی مقدار پائی جاتی ہے۔ چائے میں اس کے علاوہ ٹینک ایسڈ بھی پایا جاتا ہے جو دیر ہضم ہے اور معدے کے امراض پیدا کرتا ہے۔

ٹھنڈی بوتلیں جو کثرت سے استعمال ہو رہی ہیں دو رنگ کی ہیں۔ ایک کتھئی جو کہ "کولا" کہلاتی ہیں اور دوسری سفید رنگ کی ہیں جن کے مختلف نام ہیں۔ "کولاز" جتنے بھی ہیں ان میں کیفین شامل ہوتی ہے اس لیے ان کا مسلسل استعمال بھی چائے کافی کی طرح انسان کو ان کا عادی بناتا ہے۔ یہ بات ڈاکٹر او۔ اوسبرن نے جو کہ ییل یونیورسٹی (امریکہ) میں شعبۂ ادویات

انجا رہے ہیں پورے وثوق کے ساتھ ثابت کی ہے۔ انھوں نے یہ بھی مشورہ دیا ہے کہ خصوصاً بچوں کو ان سے دور رکھنا چاہیے۔ ڈاکٹر فریڈرک ڈیمران میڈیکل ریسرچ کنسلٹینٹ (نیویارک) نے ۱۹۶۳ء میں اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ "کولا کی عادت بچوں، نوجوانوں، اعصابی مریضوں اور امراض قلب میں مبتلا لوگوں کے لیے مضر ہے کیونکہ اس میں کیفین کا جز ہوتا ہے۔" ڈاکٹر کلاو میکے نیول میڈیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بینتھیڈا (میری لینڈ) نے چوہوں کو عام خوراک کے ساتھ کولا پینے کے لیے دیا۔ چھ ماہ کے اندر چوہوں کے دانت گر گئے۔ دوسری قسم کی ٹھنڈی بوتلیں جو سفید رنگ کی ہوتی ہیں ان میں کیفین تو شامل نہیں ہوتی مگر ان میں موجود چند دوسرے اجزا صحت اور خصوصاً دانتوں کے لیے بہت مضر ہوا کرتے ہیں، مثلاً تیزاب جو کہ ترشی کے لیے ملائے جاتے ہیں یا فاسفورس وغیرہ۔ یہ دانتوں کی اوپری چمکدار پرت کو جو دانتوں کی حفاظت بھی کرتی ہے خراب کر دیتے ہیں جس کے نتیجے میں دانت بدنما ہو جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ بوسیدہ اور کھوکھلے ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان مشروبات میں شکر کا تناسب دس فیصد ہوا کرتا ہے۔ اس طرح نصف اونس شکر فی بوتل کے حساب سے جسم میں پہنچتی ہے۔ اور یہ آپ کے علم میں ہے کہ شکر کی زیادتی خصوصاً سفید چینی کی زیادتی جسم کے لیے کس قدر مضر ہے۔ اب تو بچوں کے لیے بھی یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ انھیں سفید چینی کم استعمال کرائی جائے۔

چاکلیٹ اور کوکو مخصوص قسم کے بیجوں سے جنھیں "کوکا بینز" کہا جاتا ہے تیار کی جاتی ہیں۔ ان بیجوں میں پہلے خمیر اٹھا کر انھیں بھونا اور پیسا جاتا ہے۔ اس پاؤڈر میں شکر یا دودھ ملا کر اسے چاکلیٹ کی شکل دے دی جاتی ہے۔ ان بیجوں کو پیستے وقت ان میں سے تیل نکال لیا جاتا ہے تو اسے کوکو کہا جاتا ہے۔ اس لیے کوکو میں آٹھ فیصد چکنائی ہوتی ہے جب کہ چاکلیٹ میں پچاس فیصد تک چربی ہوا کرتی ہے۔ اس لیے یہ وزن بڑھاتی ہے اور خون میں کولیسٹرول کا اضافہ کر کے امراضِ قلب کے لیے راہ ہموار کرتی ہے۔ اس کے علاوہ نوجوانی میں چہرے پر مُہاسے بھی سب سے زیادہ چاکلیٹ کی وجہ سے ہی نکلا کرتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کی رات کو سوتے ہوئے بستر گیلا کر دینے کی عادت میں بھی اس کا بڑا دخل ہے۔

ایک وقت تھا جب ہمارے بزرگ لسی، دودھ اور گنے کا رس پیا کرتے تھے۔ اور بلاشبہ وہ انھیں پورے فخر کے ساتھ "قومی مشروب" کہہ سکتے تھے۔ ان کی ٹافیاں اور چاکلیٹ، کھجوریں، خشک میوے، بھٹے، مونگ پھلی اور چنے تھے مگر آج ہر شہر گلی کوچے حتیٰ کہ دیہات تک سے یہ چیزیں رخصت ہوگئی ہیں۔ ان کی جگہ چائے، ٹھنڈی بوتلوں اور سربند غذاؤں نے لے لی ہے۔ یہ تقلید نہ صرف ہماری اور ہمارے بچوں کی صحت کو نقصان پہنچا رہی ہے بلکہ کروڑوں اربوں روپے زرمبادلہ کی شکل میں ملک سے باہر جا رہے ہیں۔ اس طرح مفلسی میں آٹا اور گیلا ہوتا چلا جا رہا ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں تمام چیزوں کو پوری تفصیل کے ساتھ تحریر کرنا تو ممکن نہیں تھا مگر غور و فکر کے لیے چند خطوط ضرور وضع کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ ہم اپنی روایتی چیزوں کو دوبارہ اپنا کر زندگی کو سادہ اور فطرت سے قریب تر انداز میں گزارنے کی کوشش کر سکیں۔ ہمارے بچے بھی ان عادات کو اپنائیں اور ایک بار پھر وہ دور آسکے جب صحت کی دیوی کا جوبن اپنے پورے عروج پر ہو۔

●●

ڈھائی روپیے

(دلّی کے) صدرالصدور مفتی صدرالدین صاحب کو صدرالصدوری کی تنخواہ سے سرکار کمپنی کئی سو روپے دیتی تھی، اور بادشاہ سلامت کے خزانے سے مفتی کے منصب کے دو روپیے آٹھ آنے ملتے تھے، وہ بھی محبوب علی خاں خواجہ سرا نے وزیر ہو کر بند کر دیے۔ مفتی صاحب نے بادشاہ سلامت کے ہاں ڈھائی روپیے کا مقدمہ دائر کیا اور باقاعدہ مقدمہ لڑ کر ڈھائی روپیے جاری کرواتے۔ صاحب کمشنر دہلی نے مفتی صاحب سے کہا آپ کو ہماری سرکار ہزار روپے سے اوپر دیتی ہے، ول آپ نے دو روپیے آٹھ آنے کے لیے اتنی کیوں کھکھیڑ اٹھائی؟ مفتی صاحب نے کہا آپ کے ہزار بارہ سو روپیے پر یہ ڈھائی روپیے بھاری ہیں، یہ تبرک ہے اس پر ہمیں فخر ہے۔

— سید ناصر نذیر فراق دہلوی (لال قلعے کی ایک جھلک)

نئی کتابیں

عالم میں انتخاب ــــ دِلّی

مصنّف : مہیشور دیال
صفحات : ۵۲۰
قیمت : ۵۳ روپے
ناشر : اُردو اکادمی، دہلی

"عالم میں انتخاب ــــ دلّی" کے مصنّف مہیشور دیال صاحب کے نام اور اُن کے کام سے میں بہت عرصے سے واقف تھا، مگر عجیب اتفاق رہا کہ اگرچہ میں دلّی میں تینتالیس چوالیس سال سے اوپر سے سکونت پذیر ہوں، اُن سے ملاقات کا موقع صرف کوئی دو سال پہلے ہی میسر آیا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ ہم سب ڈراما گروپ کے لیے مشہور چیک مصنّف کارل کاپیک کے شہرۂ آفاق ڈرامے "مدر" کا اُردو میں ترجمہ کرانا چاہتی تھی اور کسی نے میرا نام تجویز کر دیا تھا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نے مجھے خط لکھا کہ میں اس سلسلے میں مہیشور دیال صاحب سے رابطہ قائم کروں۔ اس طرح اُن سے ملاقات ہو پائی اور میں پہلے ہی دن اُن کے اخلاص، مروّت اور غیر معمولی استعداد کی گہری چھاپ دل پر لیے گھر لوٹا۔

ایک روز انھوں نے مجھے فون کیا کہ میں کافی عرصے سے گذشتہ دلّی کے سماجی اور ثقافتی پہلوؤں پر ایک کتاب لکھنے کا منصوبہ بنا رہا ہوں اور کچھ کام بھی کر لیا ہے مگر ان موضوعات پر مختلف مصنّفین کی بے شمار مطبوعات موجود ہیں اور بہت سے معاملے مزید تحقیق کے متقاضی ہیں اس لیے مجھے ایک ایسے مددگار کی ضرورت ہے جو میری رہنمائی میں اُردو فارسی اور انگریزی کتب میں سے اقتباسات لے سکے اور لائبریریوں اور کتب خانوں میں جا سکے۔ میں نے خود کو اس کام کے لیے پیش کر دیا اور مواد کی فراہمی اور ترتیب و تدوین کا کام انھوں نے مجھے سونپا۔ اس طرح اس کتاب کی تصنیف اور تالیف میں اُن کی جاں فشانی، غیر معمولی کاوش اور حد درجہ انہماک اور مصروفیت کا میں چشم دید گواہ بن گیا۔

اس کتاب کے آغاز میں پروفیسر نورالحسن صاحب کے پیش لفظ اور مصنّف کے عرضِ احوال کو پڑھ کر کتاب کے مطالعے کے لیے ذہن میں ایک خاص طرح کی آمادگی پیدا ہوتی ہے۔ پروفیسر نورالحسن صاحب کے اوّلین فقرے سے اس کتاب کے پس پشت کارفرما بلند مقصد پر روشنی پڑتی ہے جب وہ کہتے ہیں کہ "عالم میں انتخاب ــ دلّی" لکھ کر مہیشور دیال صاحب نے نہ صرف دلی والوں کو ممنون احسان کیا ہے جنھیں دلّی سے پیار ہے بلکہ اُن تمام لوگوں کو بھی زیربارِ احسان کیا ہے جنھیں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب پر ناز ہے اور جو قومی یک جہتی کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔"

اس کتاب کا نام شاید اس سے بہتر نہیں ہو سکتا تھا جو رکھا گیا ہے۔ اگرچہ مہیشور دیال صاحب نے یہ الفاظ میر سے مستعار لیے ہیں مگر اپنے عنوان کے لیے ان کا انتخاب اُن کی دور رس نگاہ اور حسنِ انتخاب پر دلالت کرتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ بالکل متصل مصرعوں میں دلّی کے لیے میرؔ نے "عالم میں انتخاب" اور "اجڑا دیار" دونوں تشبیہیں استعمال کی ہیں مگر "عالم میں انتخاب" پر کسی اور مصنّف کی نظر اس سے پہلے نہیں پڑی۔ اس نام میں ایک خاص ندرت اور کشش تو ہے ہی مگر یہ مہیشور دیال صاحب کا دلّی کے تئیں پیار بھی جھلکاتا ہے کیوں کہ اس سے وہ دلّی کی پرانی مشترکہ تہذیب اور اقدار کو ایک آفاقیت عطا کرتے ہیں۔

جب یہ کتاب مجھے ملی تو میں نے اسے تین یا چار نشستوں میں ختم کر ڈالا۔ جہاں تک مضامین کی غیر معمولی دلچسپی اور رواں دواں طاقتور اسلوب کا تعلق ہے یہ کتاب ایک طویل نشست میں بھی ختم کی جا سکتی تھی مگر اس کے لیے اس کی ضخامت مانع تھی۔ دوسرے میں اسے نہایت غور و خوض سے پڑھنا چاہتا تھا۔ کتاب کے اختتام پر پہنچ کر میرا ردِ عمل انتہائی مسرت اور استعجاب کا تھا۔ "عالم میں انتخاب — دلّی" ایک ایسی کھڑکی ہے جس میں سے ہم گزشتہ دلّی کی تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی زندگی کے مختلف پہلوؤں عوام کے رہن سہن، رسم و رواج، مشاغل اور عادات کی بھرپور جھلک دیکھ سکتے ہیں اور وقتی طور پر اپنے آپ کو اس دور میں منتقل پاتے ہیں۔ اگر ہم اپنی نئی تصنیفات کا پرانی کلاسیکی کتب سے مقابلہ کرنے میں شرم اور جھجک محسوس نہ کریں کیوں کہ ادب کی تعمیر اور اس کی نشو و نما میں وقت کی حدِ فاصل نہیں ہوتی تو میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ مہیشور دیال صاحب کی یہ گراں مایہ کتاب عبد الحلیم شررؔ صاحب کی شہرۂ آفاق تصنیف "گزشتہ لکھنؤ" کے ہم پلہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ جلد یا بدیر اسے وہی مقبولیت نصیب ہوگی۔

یہ تصنیف اس لحاظ سے ایک جراًت مندانہ قدم بھی ہے کہ اس میں شامل مضامین پر متاخرین کا بیش بہا خزانہ پہلے ہی سے موجود ہے۔ اگر کسی موجودہ مصنّف کو بہادر شاہ ظفر کے عہد میں ہوئے میلے "پھول والوں کی سیر" پر لکھنے کو کہا جائے تو اسے کمتری کا نہیں تو ایک بے چارگی کا احساس ضرور جکڑ لے گا کیونکہ مرزا فرحت اللہ بیگ اور حال ہی میں شاہد احمد دہلوی کی لاثانی تحریریں پہلے ہی سے موجود ہیں اور ان سے کمتر لکھنا ایک بے سود مشق ہوگی اور ان سے بہتر لکھنا جادوگری ہوگا۔ اُس وقت کے بہت سے مصنّف اس زندگی کے عینی شاہد بھی تھے۔ ناصر نذیر فراق، راشد الخیری، خواجہ محمد شفیع، مرزا فرحت اللہ بیگ، ملا واحدی، سیّد احمد دہلوی، خواجہ حسن نظامی اور شاہد احمد دہلوی وہ چند باوقار اور لافانی نام ہیں جنھوں نے دلّی کے محبوب تاجداروں اور عوامی زندگی کی بڑی خوب صورت اور اثر انگیز تصویریں پیش کی ہیں اور ایسی خوبصورت زبان میں جو صرف پرانے دلی والوں سے مخصوص ہے۔ مہیشور دیال صاحب اور پیش رفتہ مصنّفوں میں صرف ایک بات مشترک ہے۔ انھیں بھی دلّی کی زندگی کا تہذیبی سرمایہ جو تین صدیوں پر مشتمل تھا وراثت میں ملا ہے مگر دلّی کی سماجی زندگی پر پرانی بیش بہا تحریریں آج کے مصنّف کا اُن ہی مضامین کو قلم بند کرنے میں حوصلہ پست بھی کر سکتی ہیں اور سود مند بھی ثابت ہو سکتی ہیں۔ حوصلہ شکنی کی وجہ میں نے ابھی بیان کی ہے۔ سود مند اس لیے کہ اصلیت سے پُر قابلِ اعتبار مواد کافی مقدار میں موجود ہے جس سے بقدرِ ضرورت استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

مہیشور دیال صاحب نے مطالعے کے جو حوالے کتاب کے آخر میں دیے ہیں وہ مکمل نہیں۔ انھوں نے کہیں زیادہ کتابوں، دستاویزوں، جرائد، نایاب دستی تحریروں، خطوط اور کرم خوردہ ڈائریوں حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے کاغذ کے پرزوں کا مطالعہ کیا ہے۔ کوئی بھی تحقیق طلب بات آجاتی تو پریشان ہو جاتے۔ سینکڑوں جگہ فون کر کے پوچھتے اور کتابوں پر کتابیں منگواتے۔ ایک روز میں پہنچا تو وہ پتنگ بازی کے باب پر جھکے ہوئے تھے اور اپنے گرد بہت سی کتابیں پھیلا رکھی تھیں۔ بولے کہ منشی چھو یا کے متعلق یہ مشہور تھا کہ پتنگ کے ٹھڈے میں ایک چھوٹی سی نہ نظر آنے والی سوئی اپنے پتنگ میں لگا لیتے تھے اور ڈھکائی دینے پر وہ سوئی حریف کے پتنگ کو پھاڑ کر رکھ دیتی تھی مگر اس کا ذکر کسی اور تحریر میں نہیں مل رہا ہے۔ وہ دس بارہ دن تک پریشان رہے۔ بالآخر ایک انگریز مصنّف کی عوامی مشغلوں پر لکھی ہوئی کتاب میں یہ بات انھیں مل گئی۔ ان کی مسرت کا ٹھکانہ نہ رہا اور اس کے بعد ہی

وہ آگے بڑھے۔

"عالم میں انتخاب - دلی" کی ایک خصوصیت اور امتیازی حیثیت یہ بھی ہے کہ جہاں دلی کی زندگی کے سماجی اور ثقافتی پہلوؤں پر جزوی طور پر بیش بہا کتب ملتی ہیں، صرف یہی تصنیف ایسی جامع اور بسیط دستاویز ہے جس میں اس دور کی زندگی کے تمام اہم پہلوؤں کو یکجا اور اجاگر کیا گیا ہے۔ ۵۲-۱۹۵۱ء کے لگ بھگ ایک ایسی مثال اور ملتی ہے جب دلی کالج نے اپنے میگزین کے دو مخصوص ضخیم شمارے شائع کیے تھے جن میں ان پہلوؤں پر اعلیٰ پایہ کے مضامین تھے مگر وہ مضامین بھی مختلف قلم کاروں نے الگ الگ لکھے تھے۔ کچھ کارڈ مطبوعات بھی ہیں جن میں دلی گزیٹیئر بھی شامل ہے۔ اس ضرورت کو پورا نہیں کرتیں۔

"عالم میں انتخاب - دلی" کافی ضخیم کتاب ہے مگر جو بھی اس وقت کی سماجی زندگی کے تمام پہلوؤں کا ذکر اس میں نہیں ملتا۔ مثلاً اس میں اس دور کے شعرا اور مشاعروں کا ذکر نہیں ہے۔ وہ دور شخصیتوں اور محفلوں کا دور رہا۔ کئی باتیں اتنی دلچسپ ہیں کہ انھیں پڑھ کر تشنگی کا احساس ہوا جیسا کہ لوگ گیت اور رزم سے بزم مگر اس ضمن میں جیشور دیال صاحب کی مجبوری کو سمجھا جا سکتا ہے کیوں کہ ہر پہلو کا احاطہ کرنے اور ان کے بہ حاصل بیان کے لیے کئی ضخیم جلدیں درکار ہوتیں مگر کئی مقامات پر اختصار سے اتنی خوب صورتی سے کام لیا گیا ہے کہ پڑھنے کا احساس قائم رہتا ہے۔ جیشور دیال صاحب نے خصوصیت سے اس وقت کے دلی والوں کی خانگی زندگی، ان کے رسم و رواج اور تہواروں کی بہت عمدہ اور سچی تصویریں پیش کی ہیں۔

جیشور دیال صاحب پرانے دلی والے ہیں اور جیسا پیارا بولتے ہیں، ویسا ہی پیارا لکھتے ہیں۔ تحریر میں کہیں کہیں موضوع کے مطابق انشا پردازی کے جوہر بھی دکھاتے ہیں۔ دلی والوں کی پیاری زبان کا مزہ لینا ہو تو اس کتاب میں "نائن" پڑھیے۔ نائن یہ مناظر ہمارے سماج کا ایک اہم اور دلچسپ کردار رہی ہے مگر اس کا اتنا خوب صورت اور جاذب خاکہ میری نظر سے نہیں گزرا۔

اُردو اکادمی دہلی ہماری مبارکباد کی مستحق ہے کہ اس نے ایسی علمی اور تحقیقی کتب کا سلسلہ شروع کیا اور اس کتاب کو اتنی خوب صورتی اور سلیقے سے چھپوایا۔

——— م م راجندر

متاعِ آخرِ شب

شاعر: حفیظ میرٹھی

صفحات: ۱۶۰

قیمت: چالیس روپے

ناشر: الکتاب، اے ۱۱۱، میور کنسالس، عابد روڈ، حیدر آباد

مشاعروں کی روایت نہ صرف اُردو شاعری کی قدیم ترین روایت ہے بلکہ اُردو غزل کی ایک اہم بازشان روایت کا حصہ بھی ہے۔ غزل کی کامیابی اور اس کی ہر دلعزیزی بھی یہی ORAL TRADITION ہے۔ غزل اگر اردو شاعری کی آبرو ہے تو مشاعرے میں اس کی کامیاب پیش کش بھی کچھ آسان کام نہیں۔ اس کے لیے عام مذاق سے واقفیت پہلی اور بنیادی شرط ہے۔

حفیظ میرٹھی غزل کے مقبول شاعر ہیں ان کے متعدد اشعار لوگوں کی زبان پر ہیں۔ وہ غزل کی روایت کا احترام کرتے ہیں اور تجربے کے نام پر کرتب بازی کو برا تصور کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں کا سنجیدہ سیاسی مزاج ان کے تغزل کا خاص وصف ہے۔ سیاسی موضوعات پر شعر کہنے کے باوجود بھی تلخی اور جھنجھلاہٹ سے ان کا کلام مبرا ہے۔ ثابت قدمی سے آگے بڑھنے کا حوصلہ اور انتہائی نرمی سے احتساب و تجزیے کا جذبہ ان کی پوری شاعری میں جاری و ساری نظر آتا ہے ؎

ان کے جانے کا منظر تماشا نہیں
دور تک دیکھیے، دیر تک سوچیے

جب سب کے لب سِل جائیں گے، ہاتھوں سے قلم چھن جائیں گے
باطل سے لوہا لینے کا اعلان کریں گی زنجیریں

اس کتاب کا نام شاید اِس سے بہتر نہیں ہو سکتا تھا جو رکھا گیا ہے۔ اگرچہ مہیشور دیال صاحب نے یہ الفاظ میرؔ سے مستعار لیے ہیں مگر اپنے عنوان کے لیے ان کا انتخاب اُن کی دور رس نگاہ اور حسنِ انتخاب پر دلالت کرتا ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ بالکل متصل مصرعوں میں دلی کے لیے میرؔ نے "عالم میں انتخاب" اور "اجڑا دیار" دونوں تشبیہیں استعمال کی ہیں مگر "عالم میں انتخاب" پر کسی اور مصنّف کی نظر اس سے پہلے نہیں پڑی۔ اس نام میں ایک خاص ندرت اور کشش تو ہے ہی مگر یہ مہیشور دیال صاحب کا دلّی کے تئیں پیار بھی جھلکاتا ہے کیوں کہ اس سے وہ دِلی کی پرانی مشترکہ تہذیب اور اقدار کو ایک آفاقیت عطا کرتے ہیں۔

جب یہ کتاب مجھے ملی تو میں نے اسے تین یا چار نشستوں میں ختم کر ڈالا۔ جہاں تک مضامین کی غیر معمولی دلچسپی اور رواں دواں طاقتور اسلوب کا تعلق ہے یہ کتاب ایک طویل نشست میں بھی ختم کی جا سکتی تھی مگر اس کے لیے اس کی ضخامت مانع تھی۔ دوسرے میں اسے نہایت غور و خوض سے پڑھنا چاہتا تھا۔ کتاب کے اختتام پر پہنچ کر میرا ردِّ عمل انتہائی مسرت اور استعجاب کا تھا۔ "عالم میں انتخاب — دلّی" ایک ایسی کھڑکی ہے جس میں سے ہم گزشتہ دلّی کی تہذیبی، تمدّنی اور ثقافتی زندگی کے مختلف پہلوؤں، عوام کے رہن سہن، رسم و رواج، مشاغل اور عزائم کی بھرپور جھلک دیکھ سکتے ہیں اور وقتی طور پر اپنے آپ کو اس دور میں منتقل پاتے ہیں۔ اگر ہم اپنی نئی تصنیفات کا پرانی کلاسیکی کتب سے مقابلہ کرنے میں شرم اور جھجک محسوس نہ کریں کیوں کہ ادب کی تعمیر اور اس کی نشو و نما میں وقت کی حد فاصل نہیں ہوتی تو میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ مہیشور دیال صاحب کی یہ گراں مایہ کتاب عبدالحلیم شررؔ صاحب کی شہرۂ آفاق تصنیف "گزشتہ لکھنؤ" کے ہم پلہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ جلد یا بدیر اسے وہی مقبولیت نصیب ہوگی۔

یہ تصنیف اس لحاظ سے ایک جرأت مندانہ قدم بھی ہے کہ اس میں شامل مضامین پر متاخرین کا بیش بہا خزانہ پہلے ہی سے موجود ہے۔ اگر کسی موجودہ مصنّف کو بہادر شاہ ظفر کے عہد میں ہوئے میلے "پھول والوں کی سیر" پر لکھنے کو کہا جائے تو اسے کمتری کا نہیں تو ایک بے چارگی کا احساس ضرور جکڑ لے گا کیونکہ مرزا فرحت اللہ بیگ اور حال ہی میں شاہد احمد دہلوی کی لاثانی تحریریں پہلے ہی سے موجود ہیں اور ان سے کمتر لکھنا ایک بے سود مشق ہوگی اور ان سے بہتر لکھنا جادوگری ہوگا۔ اُس وقت کے بہت سے مصنّف اُس زندگی کے عینی شاہد بھی تھے۔ ناصر نذیر فراق، راشد الخیری، خواجہ محمد شفیع، مرزا فرحت اللہ بیگ، ملا واحدی، سیّد احمد دہلوی، خواجہ حسن نظامی اور شاہد احمد دہلوی وہ چند باوقار اور لافانی نام ہیں جنھوں نے دِلّی کے محبوب تاجداروں اور عوامی زندگی کی بڑی خوب صورت اور اثر انگیز تصویریں پیش کی ہیں اور ایسی خوبصورت زبان میں جو صرف پرانے دِلی والوں سے مخصوص ہے۔ مہیشور دیال صاحب اور پیش رفتہ مصنّفوں میں صرف ایک بات مشترک ہے کہ انھیں بھی دِلی کی زندگی کا تہذیبی سرمایہ جو تین صدیوں پر مشتمل تھا وراثت میں ملا ہے۔ مگر دِلّی کی سماجی زندگی پر پرانی بیش بہا تحریریں آج کے مصنّف کا اُن ہی مضامین کو قلم بند کرنے میں حوصلہ پست بھی کر سکتی ہیں اور سودمند بھی ثابت ہو سکتی ہیں۔ حوصلہ شکنی کی وجہ میں نے ابھی بیان کی ہے۔ سودمند اس لیے کہ اصلیت سے پُر قابلِ اعتبار مواد کافی مقدار میں موجود ہے جس سے بقدرِ ضرورت استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

مہیشور دیال صاحب نے مطالعے کے جو حوالے کتاب کے آخر میں دیے ہیں وہ مکمّل نہیں۔ انھوں نے کہیں زیادہ کتابوں، دستاویزوں، جرائد، نایاب دستی تحریروں، خطوط اور کرم خوردہ ڈائریوں حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے کاغذ کے پرزوں کا مطالعہ کیا ہے۔ کوئی بھی تحقیق طلب بات آ جاتی تو پریشان ہو جاتے۔ سینکڑوں جگہ فون کر کے پوچھتے اور کتابوں پر کتابیں منگواتے۔ ایک روز میں پہنچا تو وہ پتنگ بازی کے باب پر جھکے ہوئے تھے اور اپنے گرد بہت سی کتابیں پھیلا رکھی تھیں۔ بولے کہ منشی بھویا کے متعلّق یہ مشہور تھا کہ پتنگ کے ٹھڈے میں ایک چھوٹی سی نہ نظر آنے والی سوئی اپنے پتنگ میں لگا لیتے تھے اور جھکائی دینے پر وہ سوئی حریف کے پتنگ کو پھاڑ کر رکھ دیتی تھی مگر اس کا ذکر کسی اور تحریر میں نہیں مل رہا ہے۔ وہ دس بارہ دن تک پریشان رہے۔ بالآخر ایک انگریز مصنّف کی عوامی مشغلوں پر لکھی ہوئی کتاب میں یہ بات انھیں مل گئی۔ ان کی مسرت کا ٹھکانہ نہ رہا اور اس کے بعد ہی

وہ آگے بڑھے۔

"عالم میں انتخاب۔ دلّی" کی ایک خصوصیت اور امتیازی حیثیت یہ بھی ہے کہ جہاں دلّی کی زندگی کے سماجی اور ثقافتی پہلوؤں پر جزوی طور پر بیش بہا کتب ملتی ہیں، صرف یہی تصنیف ایسی جامع اور بسیط دستاویز ہے جس میں اُس دور کی زندگی کے تمام اہم پہلوؤں کو یکجا اور اُجاگر کیا گیا ہے۔ ۵۲-۱۹۵۱ء کے لگ بھگ ایک ایسی مثال اور ملتی ہے جب دلّی کالج نے اپنے میگزین کے دو مخصوص اور ضخیم شمارے شائع کیے تھے جن میں ان پہلوؤں پر اعلیٰ پایے کے مضامین تھے مگر وہ مضامین بھی مختلف قلمکاروں نے فرداً فرداً لکھے تھے کچھ سرکاری مطبوعات بھی جن میں دلی گزیٹیر بھی شامل ہے اِس ضرورت کو پورا نہیں کرتیں۔

"عالم میں انتخاب۔ دلّی" کافی ضخیم کتاب ہے مگر پھر بھی اس وقت کی سماجی زندگی کے تمام پہلوؤں کا ذکر اس میں نہیں ملتا۔ مثلاً اِس میں اُس دور کے شعرا اور مشاعروں کا ذکر نہیں ہے۔ وہ دور شخصیتوں اور محفلوں کا دور تھا۔ کئی باتیں اتنی دلچسپ تھیں کہ انھیں پڑھ کر تشنگی کا احساس ہوا جیسا کہ لوک گیت اور رزم سے بزم۔ مگر اس ضمن میں مہیشور دیال صاحب کی مجبوری کو سمجھا جا سکتا ہے کیوں کہ ہر پہلو کا احاطہ کرنے اور ان کے سیر حاصل بیان کے لیے کئی ضخیم جلدیں درکار ہوتیں مگر کئی مقامات پر اختصار سے اتنی خوب صورتی سے کام لیا گیا ہے کہ جامعیت کا احساس قائم رہتا ہے۔ مہیشور دیال صاحب نے خصوصیت سے اُس وقت کے دلی والوں کی خانگی زندگی، ان کے رسم و رواج اور تہواروں کی بہت عمدہ اور سچی تصویریں پیش کی ہیں۔

مہیشور دیال صاحب پُرانے دلّی والے ہیں اور جیسا پیارا بولتے ہیں، ویسا ہی پیارا لکھتے ہیں۔ تحریر میں کہیں کہیں موضوع کے مطابق انشا پردازی کے جوہر بھی دکھاتے ہیں۔ دلّی والوں کی پیاری زبان کا مزہ لینا ہو تو اس کتاب میں 'نائن' پڑھ لیجیے۔ نائن یا مشاطہ ہمارے سماج کا ایک اہم اور دلچسپ کردار رہی ہے مگر اُس کا اتنا خوب صورت اور جاذب خاکہ میری نظر سے نہیں گزرا۔

اُردو اکادمی، دہلی ہماری مبارکباد کی مستحق ہے کہ اس نے ایسی علمی اور تحقیقی کتب کا سلسلہ شروع کیا اور اس کتاب کو اتنی خوب صورتی اور سلیقے سے چھپوایا۔

—— م م۔ راجند

متاعِ آخرِ شب

شاعر: حفیظ میرٹھی
صفحات: ۱۶۰
قیمت: چالیس روپے
ناشر: الکتاب، اے ۱۱۱، میور کنٹالس، عابد روڈ، حیدرآباد

مشاعروں کی روایت نہ صرف اُردو شاعری کی قدیم ترین روایت ہے بلکہ اُردو غزل کی مستحکم باالشان روایت کا حصہ بھی ہے۔ غزل کی کامیابی اور اس کی ہردلعزیزی بھی یہی ORAL TRADITION ہے۔ غزل اگر اُردو شاعری کی آبرو ہے تو مشاعرے میں اس کی کامیاب پیش کش بھی کچھ آسان کام نہیں۔ اس کے لیے عام مذاق سے واقفیت پہلی اور بنیادی شرط ہے۔ حفیظ میرٹھی غزل کے مقبول شاعر ہیں ان کے متعدد اشعار لوگوں کی زبان پر ہیں۔ وہ غزل کی روایت کا احترام کرتے ہیں اور تجربے کے نام پر کرتب بازی کو برا تصور کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں کا سنجیدہ سیاسی مزاج ان کے تغزل کا خاص وصف ہے۔ سیاسی موضوعات پر شعر کہنے کے باوجود بھی تلخی اور جھنجھلاہٹ سے ان کا کلام مبرّا ہے۔ ثابت قدمی سے آگے بڑھنے کا حوصلہ اور انتہائی نرمی سے احتساب و تجزیے کا جذبہ ان کی پوری شاعری پر جاری و ساری نظر آتا ہے ؎

ان کے جانے کا منظر تماشا نہیں
دور تک دیکھیے، دیر تک سوچیے

جب سب کے لب سل جائیں گے، ہاتھوں سے قلم چھن جائیں گے
باطل سے لوہا لینے کا اعلان کریں گی زنجیریں

حل ہوئے ہیں مسئلے شبنم مزاجی سے مگر
گتھیاں ایسی بھی ہیں کچھ جن کو سلجھاتی ہے آگ

ایسے موقعے پر مت چھُونا بھُول کے اپنے دامن کو
اس سے رونے والے کی ہمّت افزائی ہوتی ہے

کبھی تھکن کا کبھی فاصلوں کا رونا ہے
سفر کا حوصلہ مجھ کو نہ ہم سفر سے مِلا

ہم جینے سے تو اُوب گئے مرنے سے مگر یوں ڈرتے ہیں
جو بویا ہے وہ کاٹیں گے، کیا بویا ہے دل جانے ہے

"متاعِ آخرِ شب" اپنی خوشنما اور دیدہ زیب طباعت کے سبب سالِ رواں کی خوب صورت ترین کتاب ہے۔
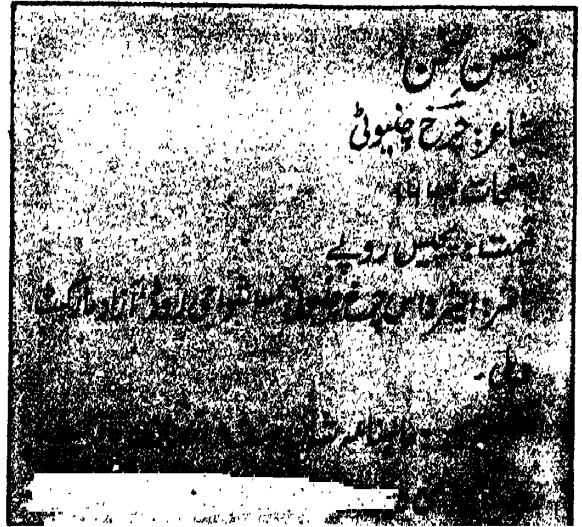
چرخ چنیوٹی اگلے زمانے کے ان لوگوں میں ہیں جن پر موجودہ نسل رشک کر سکتی ہے۔ شکست و ریخت سے دوچار اقدار اور انقلابی ہیجانات سے گزرتی زندگی میں یہ لوگ ماضی کی ہر چیز کو بہت احتیاط سے برتتے ہیں۔ غزل بھی انھی میں سے ایک ہے جو واقعی ان کے یہاں اپنی مانوس شکل میں نظر آتی ہے اور غزل ہی معلوم ہوتی ہے۔ تبھی تو رشید احمد صدیقی نے کہا ہے:

"تعجب ہے کہ آج کل جب شاعری کا انداز اتنا بدل چکا ہے، آپ غزل کے رنگ و آہنگ کو اس سلیقے اور خلوص سے برت رہے ہیں، جو غزل کا مزاج داں ہونے کے لیے ضروری ہے۔ اس رواداری اور استواری کے لیے آپ ہماری تہنیت و تشکر کے مستحق ہیں۔"

آج جب ہندوستان تو کیا خود ایران اپنے قدیم شعرا کو زیبِ طاقِ نسیاں کر چکا ہے ـــــ جب چرخ چنیوٹی جیسے شاعر کا کوئی ایسا مجموعہ شائع ہوتا ہے جس میں فارسی کلام بھی شامل ہو تو واقعی بیمار کو بے وجہ قرار آجاتا ہے۔

چرخ صاحب نے تقریباً تمام ہی اصناف میں کامیاب طبع آزمائی کی ہے۔ ۱۶۶ صفحات کو محیط، اغلاط سے تقریباً پاک، انتہائی دیدہ زیب آفسیٹ کی طباعت سے آراستہ ان کا حسنِ سخن ذہن پر قوسِ قزح کے ایسے رنگ بکھیر دیتا ہے جن کا بیان بھی چرخ صاحب ہی کر سکتے ہیں ؎

دھڑکنو تیز چلو، ڈوبتی نبضو اُبھرو
آج وہ بُجھتے چراغوں کی سحر دیکھیں گے

پردہ رخ سے اُٹھا رہا ہے کوئی
صبح بیدار ہوتی جاتی ہے

پینے آئے تھے شرابِ زندگی
ہم شرابِ زندگی پی کر چلے
جینے والو! جس طرح چاہو جیو
ہم تو جینے کی طرح جی کر چلے

ـــــ اطہر فاروقی

●●

اُردو ادب، صحافت اور شاعری کا ناقابلِ تلافی نقصان

خواجہ احمد عبّاس، قمر مرادآبادی اور مہدی نظمی

کے انتقال پر اُردو اکادمی، دہلی کی تعزیتی قرار دادیں

یکم جون ۱۹۸۷ء کو جنابِ خواجہ احمد عبّاس، جنابِ قمر مرادآبادی اور جنابِ مہدی نظمی کے انتقال پر اُردو اکادمی، دہلی کے اسٹاف کی ایک تعزیتی میٹنگ اکادمی کے دفتر میں منعقد ہوئی جس میں مرحومین کی ارواح کو ایصالِ ثواب کے بعد تینوں حضرات کے لیے الگ الگ قرار دادِ تعزیت منظور کی گئی۔ قرار دادیں اکادمی کے سیکریٹری سید شریف الحسن صاحب نقوی نے پیش کیں اور ان کی منظوری کے ساتھ ہی مرحومین کے سوگ میں دفتر بند کر دینے کا اعلان کیا۔

تعزیتی قرار دادوں کا متن درجِ ذیل ہے:

اُردو اکادمی، دہلی کے اسٹاف کا یہ جلسہ جنابِ خواجہ احمد عبّاس کے انتقالِ پُرملال پر دلی رنج وغم کا اظہار کرتا ہے اور اس سانحے کو اُردو ادب اور صحافت کا ناقابلِ تلافی نقصان سمجھتا ہے۔ جنابِ خواجہ احمد عبّاس ایک دانش ور ادیب اور ایک بااصول صحافی کی حیثیت سے اُردو ادب وصحافت کی تاریخ میں ہمیشہ احترام کے ساتھ یاد کیے جائیں گے۔ ان کے مضامین ہوں، یا افسانے یا اخباری کالم، ہر جگہ وہ انسان اور انسانیت کے خیرخواہ اور بدی کے مقابلے میں نیکی کے طرفدار نظر آتے ہیں۔ انھوں نے فلموں کے لیے بھی لکھا اور خود فلمیں بنائیں اور اس وسیلے سے بھی انھی انسانی اقدار کو عام کرنے کی کوشش کی جو

خواجہ احمد عباس

اُن کی متاعِ عزیز تھیں۔

جنابِ خواجہ احمد عبّاس کو ان کی گوناگوں قیمتی خدمات کے اعتراف میں کئی ادبی، صحافتی اور فلمی اعزاز پیش کیے گئے۔ اُردو اکادمی دہلی کو بھی یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے ۱۹۸۴ء

یں انھیں اپنا خصوصی سالانہ ایوارڈ پیش کیا اور اس کی پذیرائی کے لیے وہ اپنی بیماری کے باوجود بہ نفسِ نفیس بمبئی سے دلّی تشریف لاتے تھے۔

جنابِ خواجہ احمد عبّاس کی بیماری پچھلے دنوں شدّت اختیار کر گئی تھی اور انھیں اسپتال میں داخل ہونا پڑا تھا لیکن بعد کی اخباری اطلاعات کے مطابق وہ صحت یاب ہو کر اسپتال سے گھر لوٹ آئے تھے؛ اس لیے اب ان کے انتقال کی خبر ملی تو یہ غیر متوقع تھی جس سے اس کی اندوہناکی میں اور اضافہ ہو گیا۔ ہم خدا سے ان کی مغفرت کے خواستگار ہیں۔

جنابِ قمر مرادآبادی ہمارے زمانے کے معروف و ممتاز غزل گو شاعر تھے۔ انھوں نے تقریباً ساٹھ برس تک اپنے خونِ جگر سے اُردو شاعری کی اس محبوب ترین صنف کی آبیاری کی۔ تغزّل کی جو خصوصیات داغ سے چل کر حسرت اور جگر کو اپنا وسیلۂ اظہار بناتی ہوئی ہم تک پہنچی تھیں، جنابِ قمر مرادآبادی ان کے امانت دار بھی تھے اور انھوں نے انھیں کچھ نئے امکانات سے بھی آشنا کیا۔ قمر صاحب کا کلام خواص کے ساتھ ساتھ عوام میں بھی پسند کیا جاتا تھا۔ مشاعروں میں انھیں بڑے ادب و احترام اور ذوق و شوق کے ساتھ سنا

قمر مرادآبادی

جاتا تھا اور لوگ ان کے اشعار کو حاصلِ مشاعرہ سمجھ کر اپنے ذہنوں میں یا پھر اپنی نوٹ بکوں میں محفوظ کر لیا کرتے تھے۔ ان کے انتقال سے اُردو غزل کی محفل میں جو جگہ خالی ہوئی ہے، اُسے پُر کرنے والا کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ اُردو اکادمی، دہلی کے اسٹاف کا یہ جلسہ ان کی مغفرت کے لیے بارگاہِ خداوندی میں دست بہ دعا ہے اور ان کے پس ماندگان سے اظہارِ تعزیت کرتا ہے۔

جنابِ مہدی نظمی ایک کہنہ مشق شاعر اور پختہ کار صحافی کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ انھوں نے قومی اور وطنی موضوعات پر بہت سی ایسی طویل نظمیں لکھیں جو شاعرانہ محاسن سے مزیّن ہیں۔ اہلِ بیت کی شان میں اُن کے پُر زور مدحیہ قصائد اور واقعاتِ کربلا پر مبنی اُن کے پُرسوز مراثی جہاں ایک

مہدی نظمی

طرف ان کے حسنِ عقیدت کی گواہی دیتے ہیں وہیں دوسری طرف ان کی قادر الکلامی کے بھی شاہدِ عادل ہیں۔

ایک صحافی کی حیثیت سے بھی جنابِ مہدی نظمی کی خدمات کی فہرست خاصی طویل ہے۔ انھوں نے خود کئی اخبار اور رسالے نکالے اور بہت سے اخبارات و رسائل کے وہ پس پردہ مدیر بھی رہے اور مختلف قومی اور بین الاقوامی مسائل پر خیال انگیز تحریریں لکھتے رہے —— ان کی عمر ابھی کچھ ایسی زیادہ نہیں تھی، ۶۴ سال کے تھے اور دیکھنے میں پوری طرح

چاق و چوبند نظر آتے تھے لیکن اچانک ان پر دل کا دورہ پڑا
جس سے جاں بر نہ ہو سکے۔ ان کی وفات اُردو شاعری اور
اُردو صحافت کے لیے ایک بڑا صدمہ ہے۔ اُردو اکادمی، دہلی
کے اسٹاف کا یہ جلسہ ان کے غم میں ان کے پس ماندگان اور
ان کے بے شمار مدّاحوں کے ساتھ شریک ہے۔

الوداعی تقریب

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نئی دہلی میں SCHOOL
OF LANGUAGES کے CENTRE OF INDIA LANG-
-UAGES میں شعبۂ اُردو کے زیرِ اہتمام DIPLOMA IN
MASS MEDIA IN URDU کے سالِ رواں کے طلبہ
اور اساتذہ کی الوداعی نشست منعقد کی گئی۔ صدارت
جناب رفعت سروش نے کی، مہمانِ خصوصی شعبۂ اُردو کے
اُستاد اور کورس کے نگراں ڈاکٹر اشفاق محمد خاں تھے۔ ابتدا
میں حمید نسیم رفیع آبادی نے اپنے تمام اساتذہ کا شکریہ ادا
کیا جنھوں نے کمال شفقت کے ساتھ تعلیمی مراحل میں ہر
طرح تعاون فرمایا۔ اس کے بعد ڈاکٹر اشفاق محمد خاں نے کہا کہ
MASS MEDIA بحیثیت مضمون پر یونیورسٹیز میں ہندوستانی
زبانوں کے ذریعے بہت کم توجہ دی گئی ہے خصوصاً اُردو میں
شروع ہونے والا یہ پہلا ڈپلوما ہے اور معیار کے اعتبار سے
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کی مہتم بالشان تعلیمی روایت سے علاقہ
رکھتا ہے۔ تقریباً سات سال قبل پروفیسر محمد حسن کی کوششوں سے
یہ ڈپلوما شروع ہوا تھا اور صحافت، فلم، ریڈیو اور ٹی وی وائیڈ ٹنگ
سے متعلق اس ڈپلومے کو حاصل کرنے والے بیشتر طلبا باعزت روزگار
حاصل کر چکے ہیں۔

اس کے بعد صدرِ محفل جناب رفعت سروش نے کہا کہ
اس ڈپلومے کے طلبہ کو ریڈیو سے متعلق درس دیتے ہوئے مجھے بہت
خوشگوار تجربات ہوتے ہیں تمام ہی طلبہ خلاقانہ صلاحیتوں سے
مالا مال تھے اور ایسے طلبہ کو درس دینا بجائے خود ایک مشکل کام
اور اپنی صلاحیتوں کا امتحان تھا۔ انھوں نے مزید کہا کہ طلبہ نے
بے انتہا سنجیدگی، دلچسپی اور باقاعدگی سے کلاسز میں حاضری
دے کر یہ ثابت کر دیا کہ اگر اُردو میں اچھے کورسز شروع کیے جائیں تو
باصلاحیت اور سنجیدہ طالب علم بہ آسانی دستیاب ہو سکتے ہیں۔

اس کے بعد طلبہ کی طرف سے پُرتکلّف چائے کا اہتمام کیا
گیا اور آخر میں شعری نشست کا انعقاد ہوا جس میں جناب رفعت
سروش، اطہر فاروقی، سید عارف اختر نقوی اور حمید نسیم رفیع
آبادی نے اپنی نئی نظمیں سنائیں۔

اُردو رواداری کی زبان ہے

بمبئی — مہاراشٹر اسٹیٹ اُردو اکادمی کی جانب سے
۱۹۸۶ء کی کتابوں پر تقسیم انعامات کا جلسہ ۲۹ اپریل کو منعقد
کیا گیا۔ وزیر اعلیٰ (صدر اُردو اکادمی) شنکر راؤ چوہان نے تقریب
کی صدارت کی اور گورنر مہاراشٹر ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے ظفر
گورکھپوری، فضیل جعفری، میر ہاشم، ڈاکٹر عبدالستار دلوی اور
دیگر انعام یافتگان کو اعزازی سند اور رقم سے نوازا۔ گورنر شرما
نے شیوجینتی کے موقعے پر اکادمی کا تیار کیا ہوا کتابچہ بھی جاری
کیا۔

ڈاکٹر ظ۔ انصاری، نائب صدر اکادمی نے حاضرین کا
استقبال کیا اور تقریب کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ گورنر نے
حاضرین سے خطاب کیا اور کہا کہ اُردو رواداری کی زبان ہے اُردو
والوں کو مایوسی اور نا امیدی کی باتیں چھوڑ دینی چاہئیں۔ ملک
کے موجودہ حالات کے تحت امن و آشتی کے لیے اُردو بڑا اہم کردار
ادا کر سکتی ہے۔ اُردو دوستوں کا فرض ہے کہ وہ اس کے لیے جدوجہد
کریں۔ اُردو مراٹھی کو قریب لائیں اور دونوں زبانوں کا ادب
ایک دوسری زبان میں منتقل کیا جائے۔

وزیرِ اعلیٰ شنکر راؤ چوہان نے اکادمی کی جانب سے
اورنگ آباد میں امجد میموریل کے قیام کے لیے کارپوریشن کو ایک
لاکھ روپے کی گرانقدر رقم پیش کی اور انعام یافتگان کو مبارکباد
پیش کی۔ اور کہا کہ اُردو ہمیشہ سے عوامی توجہ اور دلچسپی کا مرکز
رہی ہے۔ اس کی شاعری اور ادب کو مقبولیت حاصل رہی ہے

...و قلم کاروں کو چاہیے کہ وہ ملک میں پھیلی گمراہیوں اور غیر ...جی عناصر کے خلاف لڑیں۔ مثبت اور نیک جذبے کو پوری ...میں پھیلائیں۔ اُردو گھر کے بارے میں آپ نے کہا کہ اُردو گھر ...جلد تعمیر کیا جائے گا۔

...ہور میں "ایوانِ اقبال" کی تعمیر

لاہور میں ایوانِ اقبال کی جدید اور خوب صورت عمارت ...میر کا کام ۳۰ فیصد مکمّل ہو گیا ہے۔ اس کا پروجیکٹ ورک ...ری ۱۹۸۰ء میں شروع کیا گیا تھا اور تعمیراتی کام ۱۹۸۵ء ...شروع ہوا۔

بین الاقوامی شہرت یافتہ نیشنل کنسٹرکشن کمپنی اس عمارت ...میر کی ذمے دار ہے اور ۱۹۸۸ء تک اس کی تعمیر مکمّل کرنے کا ...زہ کیا گیا ہے۔ عمارت کی تعمیر کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لیے ...سات رکنی ایگزیکٹو کمیٹی قائم کی گئی ہے کمیٹی کی رپورٹ ...اندازہ ہوتا ہے کہ ایوانِ اقبال کی تعمیر کا کام تیزی سے جاری ...جس میں دو سو پچاس افراد یومیہ کام کر رہے ہیں۔ اکیڈمی ...کی عمارت ۱۳۶ فٹ، رینٹ ایبل بلاک کی عمارت ۴۲ فٹ، ...ریری بلاک کی عمارت ۴۲ فٹ اور کانفرنس سینٹر کی عمارت ۱۶ ...بلندی تک پہنچ چکی ہے۔ واضح رہے کہ پنجاب کے سابق گورنر ...ل غلام جیلانی نے ایوانِ اقبال کے لیے ایک خاص آراضی کا ...عطیے کے طور پر حکومتِ پنجاب کی طرف سے دیا تھا۔ یہاں پر ...لیات پر ریسرچ کے لیے تمام تر سہولتیں مہیا کی جائیں گی کمپلکس ...ائبریری میں ۳ لاکھ کتب ہوں گی اور ایک انٹرنیشنل ہال بنایا ...ئے گا جس میں بارہ سو افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہوگی۔

...دو کے زندہ مشاہیر کے مسوّدے

خدا بخش لائبریری پٹنہ، قدیم مخطوطات کے ساتھ اُردو ...زندہ مشاہیر کے مسوّدات بھی جمع کر رہی ہے۔ اگر مصنّفین و ...را اپنی طبع شدہ کتابوں کے مسوّدات لائبریری کو تحفتہً عنایت کر سکیں تو لائبریری انھیں محفوظ کرنے میں خوشی محسوس کرے گی۔ یہ مسوّدات یعنی طبع شدہ تحریروں کے پہلے یا دوسرے ڈرافٹ جو ادبا و شعرا لائبریری کو عنایت کریں گے شکر گزاری کے ساتھ قبول کیے جائیں گے۔ اس سے ان مشاہیر پر ریسرچ میں یہ مسوّدات کام آئیں گے اور ان کی قلمی دولت ضائع نہیں ہوگی۔

نقوش ادبی ایوارڈ

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی نے "ابوالقاسم لاہوتی" پر جو مونوگراف لکھا تھا اسے حکومتِ پاکستان کے نقوش ادبی ایوارڈ ۱۹۸۶ء (برائے تحقیق) کے لیے انعام کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ انعام کی رقم ساڑھے سات ہزار روپے ہے جو کبیر صاحب کو پانچ جولائی کو پاکستان میں پیش کی جائے گی۔ آج کل کبیر صاحب ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ریڈر ہیں۔

● ڈیر شری نقوی!

"ایوانِ اُردو دہلی" کے پہلے شمارے کی جو ایک کاپی آپ نے صدرِ محترم کو ارسال کی ہے، اس کے لیے شکریہ۔

صدرِ محترم آپ کے شکرگزار اور آپ کی ادبی سرگرمیوں کی مسلسل کامیابی کے خواہاں ہیں۔

نیک خواہشات کے ساتھ

—— ایم۔ ایس۔ بترا

(اسپیشل ڈیوٹی آفیسر، صدر جمہوریہ ہند)

(انگریزی سے ترجمہ)

● "ایوانِ اُردو دہلی" کا پہلا شمارہ ملا۔ بصمیم قلب شکریہ۔ اپنی مصروفیات کے باوجود اسے اوّل سے آخر تک پڑھا سطر سطر، صفحہ صفحہ، ورق ورق، ادب، ثقافت، تخلیق و تحقیق، غور و فکر اور اُردو کی گنگا جمنی تہذیب کا جیتا جاگتا شاہکار ہے۔ ہر صفحے پر آپ حضرات کی نفاست پسندی اور خوش سلیقگی کی لطیف جلوہ سامانیاں ہیں اور کیوں نہ ہو۔ جس ماہنامے کی مجلسِ مشاورت میں جناب خلیق انجم، جناب حکیم عبدالحمید، جناب خواجہ حسن ثانی نظامی کی ایسی قدآور اور معتبر شخصیتوں کا نام نامی ہو، بیگم ریحانہ فاروقی کا اسم گرامی ہو۔ جس کے ادارۂ تحریر میں آپ اور مخمور سعیدی صاحب جیسی بلند مرتبہ شخصیتیں ہوں وہ ماہنامہ اپنی پہلی ہی اشاعت میں خوب تر نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا؟

مبارک باد قبول فرمائیے۔

—— سید سبط رضی

(وزیر تعلیم و مسلم اوقاف، حکومتِ اُتر پردیش، لکھنؤ)

● "ایوانِ اُردو دہلی" موصول ہوا۔ شکریہ۔ سرورق خوبصورت، دیدہ زیب اور جاذب نظر ہے۔ طباعت صاف ستھری اور شگفتہ، کاغذ عمدہ۔ ابتدا میں صاحبانِ اقتدار کے پیغامات سے طبیعت اُوب جاتی ہے۔ ایک آدھ پیغام کسی ادبی شخصیت کا ہوتا تو زیادہ موزوں رہتا۔ تصاویر کی تعداد ۲۳ ہے جو ادبی رسالے کے لیے زیب نہیں دیتی، رسالہ البم معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اُردو کے جو رسائل شائع ہوتے ہیں ان میں تحقیقی مضامین کا فقدان ہے۔ اُمید تھی کہ "ایوانِ اُردو" اس کمی کو دُور کرے گا لیکن جب دیکھا اور پڑھا تو وہ بھی ایسا ہی نکلا۔

جناب کالی داس گپتا رضا کا مضمون "عمدۂ منتخبہ میں تذکرۂ غالب" تحقیقی نوعیت کا نہیں ہے۔ عمدۂ منتخبہ میں غالب کے غیر مطبوعہ اشعار کی نشاندہی سب سے پہلے جناب قاضی عبدالودود صاحب نے اپنے رسالے "معیار" پٹنہ میں کی تھی۔ اس کے بعد یہ اشعار دوبارہ خدا بخش لائبریری جرنل شمارہ نمبر ۱۷ اور ۱۸ میں ۱۹۸۱ء میں شائع کیے گئے۔ کچھ اشعار کمال احمد صدیقی نے بھی اپنی کتاب "بیاضِ غالب — ایک تحقیقی جائزہ" میں درج کیے ہیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ادبا اور اساتذہ

تحقیق کے صحیح مفہوم سے واقف نہیں ہیں۔

—— اکبر حیدری کاشمیری، سری نگر

● "ایوانِ اُردو دہلی" کا پہلا شمارہ، مئی ۱۹۸۷ء کا دیکھنے اور پڑھنے کو ملا۔ سرورق دیکھ کر ہی افسوس ہوا، بد ذوقی کی بدترین مثال —— خاص کر رنگوں کا بھدا استعمال۔ داغ کی تصویر کی چھپائی اور رنگ فنِ طباعت پر ایک داغ۔ اچھی خاصی تصویر کو بگاڑ کر رکھ دیا گیا ہے۔ بھرتی کے فضول قسم کے پیغامات، کاغذ، رسالے کے لیے انتہائی غیر موزوں اور نامناسب۔ پھر وہی روایتی انداز، غزل، افسانہ، انشائیہ۔

کیا اُردو والوں کا یہی کل سرمایہ ہے یا اس طرح ہم اپنے کو طشت از بام کر کے ہم خود اپنا مذاق اُڑاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اُردو والوں کا مطمحِ نظر سکڑ کر رہ گیا ہے یا دانستہ اس کو سکوڑا جا رہا ہے، کیا اس سے بہتر تخلیقات اُردو کے خزانے میں نہیں ہیں؟ اگر یہی ہیں تو افسوس ہے۔

آپ کو بُرا تو لگے گا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ آپ کا یہ رسالہ POOR SHOW کا مصداق ہے اور کسی طرح تحسین اور تعریف کا مستحق نہیں۔ آپ کے پاس تعریف کے خطوط کے انبار لگیں گے۔ یہ بھی ایک انداز ہو گیا ہے اُردو والوں کا کہ آسمان پر چڑھا دیتے ہیں۔ تاکہ تعلقات خوشگوار رہے (رہیں!) وہ ایسے رشتوں کو توڑنا نہیں چاہتے آپ سے کچھ نہ کچھ حاصل ہو جاتے۔ یہی مزاج بن گیا ہے۔

—— سید محی رضا، بمبئی

● "ایوانِ اُردو" کو "پیکرِ جمیل بہ لباسِ حریر" کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ اُردو میں یہ ماہانہ رسالہ ایک خوشگوار اور خوش نما اضافہ ہے۔ کتابت، طباعت، ترتیب و تہذیب کا تو کہنا ہی کیا، مشمولات کے لحاظ سے بھی قابلِ ستائش کوشش ہے۔ آپ نے ہر ذوق کی تسکین کا لحاظ رکھا ہے۔ صرف ادبی رسالوں کی اُردو میں کمی نہیں مگر زبان کا قرض صرف غزلوں اور افسانوں سے ادا نہیں ہو سکتا۔ اس کے اور بھی تقاضے ہیں۔ اور اُن کا آپ نے خیال رکھا ہے۔ صرف افسانوں اور شعری تخلیقات سے کوئی زبان عالمی ادب کی صف میں شمار نہیں ہو سکتی۔ محض انھی کے بل بوتے پر ناز کرنا نادانی ہے۔

اپنے ذوق کو جس مضمون نے اپنی طرف مبذول کیا وہ کالی داس گپتا صاحب رضا کا مضمون ہے۔ انھوں نے "عمدۂ منتخبہ" کے سلسلے میں بڑی دادِ تحقیق دی ہے۔ خدا نہ خواستہ اگر پاکستانی نسخہ ناپید رہتا تو لندن والے نسخے سے (جس کو خواجہ صاحب نے ترتیب دیا ہے اور جس میں شریکِ کار جناب رشید حسن خاں صاحب بھی ہیں) یہ بآسانی ثابت ہوتا ہے کہ غالب آٹھ دس سال ہی کی عمر میں صاحبِ طرز شاعر ہو گئے تھے۔ لندن والا نسخہ ۱۲۲۴ھ کا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس میں وہ سب اشعار متن میں ہیں جو کراچی والے نسخے (۱۲۳۵ھ) کے حواشی پر ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ لندن والے نسخے کا ترقیمہ ۱۲۲۴ھ کا نہیں۔ اس میں تحریف ہوئی ہے۔ تعجب ہے کہ مرتبین نسخہ کی نظر اس پر نہ پڑی۔ پیرس والا نسخہ (۱۲۴۹ھ) خارج از بحث ہے۔ ایک بات اور۔ رضا صاحب نے بار بار نسخہ بہ خط غالب (۱۸۱۶ء) جس کو چاہے نسخۂ بھوپال کہیے یا نسخۂ طفیل۔ جناب طفیل ہی کے طفیل سے یہ نسخہ منصۂ شہود پر آیا ہے۔ ہاں تو اس نسخے کے بارے میں غالبیات کے محققین کا کیا کوئی متفقہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ واقعی اس کی اصلیت ناقابلِ انکار ہے؟ میرے خیال میں ابھی یہ مسئلہ متنازعہ فیہ ہے۔ اگرچہ جناب نثار احمد فاروقی نے اپنے ایک مضمون (مطالعہ دو ماہی پٹنہ) کے شمارے ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء میں اس پر بحث کرتے ہوئے اس کی اصلیت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔

ایوان کے اس شمارے میں جو فضا کی کثافت پر گیس کی کرشمہ سازیوں کا جائزہ لیا گیا ہے وہ معلومات افزا ہے۔ اس کی گھٹن کو گلاب والے مضمون نے دور کر دیا۔ یہ مضمون بھی دلچسپی کے ساتھ پڑھنے کے لائق ہے۔ دہلی کے آثارِ قدیمہ کی بچی کھچی یادگار پر جو مضمون ہے وہ آثار الصنادید کے ایک ضمیمے کی حیثیت رکھتا ہے۔ پتھر کو زبان بخش کر مقالہ نگار نے بُت کی خاموشی کی جو روایت چلی آتی ہے اس کو بہ حسن و خوبی توڑا ہے۔

انشائیوں اور افسانوں پر کوئی اظہارِ خیال کرنا اپنے حدود سے بڑھنے کے مترادف ہے۔ اپنے قلم کو اس پر افسوس

بھی ہے اور ندامت بھی۔ ان کو میں اُوروں کے لیے چھوڑتا ہوں۔
غزلوں میں ایک غزل کے مطلع نے بہت مسرور کیا۔ "سانحہ
لے کر چلے، آئینہ لے کر چلے" والا مطلع داد سے مستغنی ہے۔

صفحہ ۶۶ پر یہ شعر عورت ہی کہہ سکتی ہے اچھا شعر ہے ؎

گھر سے چلی تھی میں تو نگاہیں تھیں مطمئن
آئی ہوں لوٹ کر تو سوالوں میں قید ہوں

اسی غزل میں "ننھی سی اوڑھنی" نے رنگین و انشا کی یاد دلائی۔
وہ دونوں ڈاڑھی رکھے ہوئے اوڑھنی میں کیا چھپتے اور کیا چھپاتے۔
خیر اس کو تو جانے دیجیے۔ دوپٹہ کے مقابلے میں اوڑھنی اصطلاحاً
چھوٹی ہوتی ہی ہے پھر مزید "ننھی" کی صفت کیا ضروری ہے؟
بفرض محال اگر گم بھی ہوجائے تو ایک اوڑھنی کے بدلے متعدد
"شالوں" کی کیا ضرورت پیش آئی۔ وہ تو خیر ریشمی تھا اگر اونی
ہوتا تو کیا حال ہوتا؟

صفحہ ۵۴ پر "آئے" اور "جائے" والی دونوں غزلیں
سہل ممتنع میں خوب ہیں۔ مصرعے ایسے بے ساختہ ہیں کہ کیا
کہنا۔ غزل کی زبان کا حق ادا کیا ہے۔

مجموعی طور پر یہ شمارہ معیاری ہے اور اُمید ہے کہ خوب
سے خوب تر کی طرف گامزن ہوکر اپنا مشن حق زبان و ادب ادا
کرے گا۔ ہاں تو یہ تو بھول ہی گیا۔ رسالے کا نام "ایوانِ اُردو"
رکھنا ایوانِ تخیل کا کرشمہ ہے۔ خوب نام تجویز کیا ہے۔

——— عطا کاکوی، پٹنہ

● ماہنامہ "ایوانِ اُردو دہلی" کا گیٹ اپ دیکھ کر بہت دل
خوش ہوا اور متن پڑھ کر بہت سی اُمیدیں بندھیں۔ اس ماہنامے
نے وقت کی بہت بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ اور دوسری
صوبائی اُردو اکادمیوں کے لیے مشعلِ راہ روشن کی ہے۔

——— ڈاکٹر اظہار الحسن، علی گڑھ

● "ایوانِ اُردو دہلی" کے خوب صورت اور معلوماتی شمارے
کی اجرائی پر مُبارکباد پیش کرتا ہوں۔ "حرفِ آغاز" سے معلوم ہوتا
ہے کہ آپ اس جریدے کو عام ادبی جرائد کی روایتی راہ سے ہٹاکر
رنگا رنگی اور بوقلمونی سے ہمکنار کرنا چاہتے ہیں۔ رسالہ آپ کے
اس عزم کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے "پتھر بولتے ہیں" کے عنوان سے دلّی کی
قدیم عمارتوں پر تحقیقی قلم اُٹھایا ہے، انداز بیان شگفتہ ہے۔ جناب
کالی داس گپتا رضا کا طرز نگارش تحقیقی اور معلوماتی ہے۔ جناب
ابوشعیب احسن صاحب نے "تذکرہ گُلابوں کا" کے عنوان سے پھولوں
کے بادشاہ گلاب پر تحقیقی قلم اُٹھایا ہے۔ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے
"دلّی کی بدلتی فضا" کے عنوان سے شہروں میں فضائی آلودگی کے
مسئلے پر تحقیقی تجزیہ پیش کیا ہے۔ یہ کیفیت دلّی کی ہی نہیں، بلکہ ہر
شہر کی ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے میں حکومتیں سنجیدہ نہیں ہیں
عوام بے بس ہیں۔ جناب معین اعجاز کا انشائیہ "چلو اکیسویں صدی"
طنز و مزاح کی بھرپور چاشنی کے ساتھ ساتھ ہمارے ملک کی
سیاسی فضا پر ایک لطیف طنز ہے۔

جناب ابن کنول، جناب طارق چھتاری اور جناب جوگندر
پال کے افسانے ہماری زندگی کی حقیقتوں کی عکاسی کرتے ہیں۔

نئی کتابوں پر تبصرے اور ادبی خبریں۔ یہ دونوں کالم
بیحد معلوماتی ہیں۔ انھیں مستقل طور پر جاری رکھیے۔

شعری حصّے میں مجھے جناب جگن ناتھ آزاد اور ڈاکٹر
بشیر بدر کی غزلیں پسند آئیں۔

——— محمد عبدالرحیم، اقبال اکادمی، محبوب نگر

● جاذب نظر سرورق، دلنشیں کتابت، پرکشش طباعت،
متنوّع موضوعات، نفیس ترتیب، دل پذیر طرز پیش کش۔ اہم
شخصیات کے پیغامات و تصاویر نے رسالے کے حُسن میں چار
چاند لگادیے ہیں۔ کالی داس گپتا رضا نے غالب کی شاعری کی
ابتدا کے تعلق سے جو کچھ سپردِ قلم کیا ہے اس سے ان کا تجسّس
اور ریاض ٹپکتا ہے۔ خلیق انجم صاحب مستحق داد ہیں کہ وہ تحقیق
کے نازک مراحل سے کامیابی کے ساتھ گزر رہے ہیں۔ "تذکرہ
گُلابوں کا" اپنے نام ہی کی طرح شگفتہ و شاداب ہے۔ میں تو
اتنا ہی کہہ سکتا ہوں "حرف حرف رنگت ہے لفظ لفظ خوشبو
ہے"۔ "دلّی کی بدلتی فضا" مُفید معلوماتی مضمون ہے۔ "چلو
اکیسویں صدی" میں ہماری دُکھتی رگوں پر ہاتھ رکھنے کی ہلکی
سی کوشش نظر آتی ہے۔ افسانہ "دُکھ ہرن" میں جوگندر پال نے
کردار نگاری میں فنی چابکدستی کا ثبوت دیا ہے۔ "صرف ایک

شب کا فاصلہ" تلخ حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے "نیم پلیٹ" ایک پُراسرار ذہنی کیفیت کا نقیب ہے۔ جگن ناتھ آزاد کی غزل فرسودگی کی حد تک روایتی ہے۔ بشیر بدر کی غزل سبک، نرم اور سجل ہے امیجری ان کی شعریت کی جان ہے۔ حفیظ میرٹھی کے یہاں مشاہدے کی تیزی کے ساتھ لہجے کی بیباکی ملتی ہے کہیں کہیں جدید رجحانات کو اپنانے کی سعی بھی کارفرما ہے محسن زیدی کے یہاں شعریت ہے مگر دبی دبی سی۔ جاوید وششٹ کی غزل زمینِ نو میں ہے مگر سوچ کا رُخ کہنگی کی طرف ہے۔ کرشن بہاری نور کی غزل کی فضا گنگا جمنی ہے۔ شاہد ماہلی نکہت و نور میں نہائے اشعار کے خالق ہیں۔ ملکہ نسیم کی غزل ندرتِ احساس کا پتا دیتی ہے نسیم نکہت کچھ زیادہ ہی مائل بہ جدیدیت ہیں نئی کتابوں پر تبصرے مختصر جامع اور پُرمغز ہیں مخمور سعیدی صاحب کی ناقدانہ تحریریں بالغ نظری، بیدار مغزی اور ادبی بصیرت کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہمیں اپنے محبوب جریدے کے لیے اُن جیسا ذہین اور باصلاحیت ادیب اور شاعر مُدیر کی صورت میں ملا۔

—— مخمور جمالی، نہٹور

● خلیق انجم کا شہر نامہ "پتھر بولتے ہیں" تواریخ اور جغرافیہ کے طالب علموں کے لیے خاص طور پر کارآمد ہے۔ ابو شعیب احسن کا مضمون "تذکرہ گلابوں کا" ایک اچھی تحقیقی کاوش ہے مگر موصوف نے گلابوں سے متعلق ماضی کے جتنے بھی حوالے پیش کیے ہیں ہر جگہ وہ لفظ "کہانی" دہراتے چلے گئے ہیں تو پھر کیا واقعاتی کچھ بھی نہیں۔؟

جگن ناتھ آزاد، حفیظ میرٹھی، محسن زیدی، شاہد ماہلی کی غزلیں اچھی ہیں۔ بشیر بدر اب شاعری کر نہیں رہے ہیں بلکہ شاعری کو ڈھو رہے ہیں، حالانکہ ایک شاعر چاہے عمر کے اعتبار سے بوڑھا ہو تا جائے مگر اُس کی شاعری نکھرتی اور جوان ہوتی ہے۔

—— قاصر مجیبی، گیا

● اُردو میں ایک معیاری، ادبی، تنقیدی اور معلوماتی پرچے کے اضافے پر میری جانب سے دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔ اُردو میں اتنا معیاری رسالہ شائع کر کے آپ نے اُردو پڑھنے والوں میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ تمام مضامین، افسانے، غزلیں معیاری اور جامع ہیں۔ بالخصوص کالی داس گپتا رضا، جوگندر پال، خلیق انجم، ابن کنول، ابو شعیب احسن اور ملکہ نسیم کی نگارشات بہت ہی پسند آئیں۔ چونکہ ان قلمکاروں کے پتے آپ نے درج نہیں کیے اس لیے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ میری جانب سے انھیں مبارکباد پیش کریں۔

پرچے کا گیٹ اپ بہت ہی خوب صورت ہے اور پچھلے صفحے پر داغ دہلوی کی تصویر حکومت سے اُردو کے جائز مطالبے پورے کرنے کی درخواست کرتی نظر آتی ہے۔

—— اظہار احمد

● سرورق نہایت ہی جاذبِ نظر، عمدہ کتابت و طباعت، دُودھ میں نہائے اوراق اور اُردو ادب کے آسمان کے درخشاں ستارے —— واقعی آپ نے ایک رسالے میں اتنی ساری خوبیوں کو یکجا کر کے "ایوانِ اُردو" کو صفِ اوّل کے اعلیٰ معیاری رسالوں کی اگلی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

—— اختر آزاد، جمشید پور

● ماہنامہ "ایوانِ اُردو" آج ہی خریدا اور دورانِ شب ہر لفظ بہ لفظ مطالعہ کرنے کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ اُردو زبان کی شان و شوکت آج بھی باقی ہے۔ دُعا ہے کہ یہ بیش قیمت جریدہ اُردو ادب کی خدمت اور فروغ کے لیے دن دُگنی اور رات چوگنی ترقی کرے۔

—— محمد صادق شاد، تھنہ منڈی

● "ایوانِ اُردو" نظر سے گزرا۔ ارے صاحب! ہم مانتے ہیں کہ آپ دلّی والوں نے اُردو کو تخت و تاج سے نوازا اور اپنی میراث بنا لیا لیکن "ایوانِ اُردو" کو دیکھ کر اس وراثت پر اپنا بھی تھوڑا حق جتانے کو دل چاہتا ہے —— بولتے پتھر، ہنستے گلاب، دُکھ ہرن، فاصلہ رات کا اور پھر اپنی شناخت گہرا احساس (نیم پلیٹ) —— کیسے سمیٹ لیا آپ نے یہ سب؟

مزید کچھ لکھتے ہوئے اپنے الفاظ کے بے وزن ہونے کا احساس ہو رہا ہے۔ اگلے شمارے کا انتظار رہے گا۔

—— صبوحی طارق، رانچی

●●

مجلسِ مشاورت
خلیق انجم، حکیم عبدالحمید،
خواجہ حسن ثانی نظامی، بیگم ریحانہ فاروقی

ادارۂ تحریر
سید شریف الحسن نقوی
مخمور سعیدی

جلد : ۱
شمارہ : ۴

اگست ۱۹۸۷ء

یومِ آزادی مبارک

فون نمبر
۲۷۶۲۱۱
۲۶۲۶۹۳

سالانہ قیمت
۲۵ روپے

فی کاپی
دو روپے پچاس پیسے

فہرست

حرفِ آغاز — سید شریف الحسن نقوی ۴

مضامین :

افسانے میں بیانیہ اور ... — شمس الرحمٰن فاروقی ۵
دلی کے آثارِ قدیمہ — خلیق انجم ۱۷
مرغوب خاص و عام — آم — محمد رضی الدین معظم ۲۲

خاکہ :

سنیل گریٹ گواسکر — تنویر ۴۱

افسانے :

شیش محل — م۔م۔ راجندر ۱۴
کہرا — حسین الحق ۲۴
یوں بھی جیا کرتے ہیں — فاطمہ ترمذی ۳۰

نظمیں :

ڈاکٹر اختر بستوی، جینت پرمار ۲۱

غزلیں :

جگن ناتھ آزاد ۱۳
شجاع خاور، اطہر عنایتی ۲۳
شہپر رسول، انوار رضوی، فرہاد آزر ۳۶
احترام اسلام، شفیع اللہ خاں راز، رئیس الدین رئیس ۴۶

نئی کتابیں : اطہر فاروقی ۴۷
اُردو کا خبرنامہ : ادارہ ۵۱
آپ کی رائے : قارئین ۵۵

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ
ماہنامہ ایوان اُردو دہلی
اُردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سید شریف الحسن نقوی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے سمر آفسیٹ پریس دہلی ۶ سے چھپوا کر دفتر اُردو اکادمی نئی دہلی ۲ سے شائع کیا۔

اُردو کے بہی خواہوں کی طرف سے اکثر یہ بات کہی جاتی رہی ہے کہ حکومت سے اُردو کی حقوق طلبی کی مہم جاری رکھتے ہوئے ہمیں اپنے طور پر بھی اُردو کی ترویج و ترقّی کے لیے موثّر کوششیں کرنی چاہئیں، ان میں سرِفہرست اپنے بچّوں کو اُردو تعلیم دلانا ہے۔ پچھلے دِنوں ہمیں ہبلی (کرناٹک) کی ایک اُردو تنظیم کی طرف سے کچھ تجویزیں موصول ہوئی ہیں۔ مذکورہ تنظیم نے یہ تجویزیں یومِ اُردو کے موقعے پر سائیکلوسٹائل کرا کے تقسیم کی تھیں۔ تجویزیں یہ ہیں :

۱۔ اپنے خطوں پر پتے اُردو میں تحریر کریں۔

۲۔ اپنے کاروبار کا حساب اُردو میں رکھیں۔

۳۔ گھروں پر نام کی تختی اور دُکانوں کے سائن بورڈ اُردو میں لگائیں۔

۴ (جہاں یہ سہولت موجود ہو) سرکاری محکموں کو درخواستیں اُردو میں دیں۔

۵۔ اُردو اساتذہ اپنی اپنی درس گاہوں میں اُردو کے یوم (یا اُردو ہفتے) منائیں اور اپنے طلبہ کو اُردو کے استعمال کی ترغیب دیں۔

۶ جن ریاستوں کے اطلاعات اور تعلّقات عامّہ کے محکموں سے اُردو خبرنامے شائع نہیں ہوتے، انھیں خطوط لکھ کر ان خبر ناموں کی ضرورت اور افادیت کا احساس کرایا جائے۔

۷۔ اپنے بچّوں کو اُردو تعلیم ضرور دلائیں (اگر اسکول میں انتظام نہیں ہے تو اپنے طور پر)۔

ان کے علاوہ اور بھی ایسی آسان تجاویز سوچی جاسکتی ہیں جو اُردو کی ترویج و ترقّی میں مُفید ثابت ہوں اور ان پر آسانی سے عمل بھی کیا جاسکتا ہو۔ مثلاً ہم اپنے ماہانہ بجٹ میں زیادہ بڑی نہیں ایک چھوٹی سی رقم اُردو کے اخباروں، رسالوں اور کتابوں کی خریداری کے لیے مخصوص کر دیا کریں۔ ہندوستان میں لاکھوں اُردو جاننے والے ہیں اگر وہ سب ایسا کرنے لگیں تو اُردو کی کساد بازاری کی جو عام شکایت ہے وہ دُور ہوسکتی ہے اور اُردو ادارے مضبوط مالی بنیادوں پر کھڑے ہوسکتے ہیں۔ یہ عادت کہ اُردو مطبوعات دوسروں سے مانگ کر پڑھ لی جائیں یا اعزازی طور پر ہمیں ملتی رہیں اُردو کو بہت نقصان پہنچانے والی ہے۔ سرکاری یا سرکار سے امداد یافتہ اداروں کی طرف سے شائع ہونے والے رسائل وکتب سے خاص طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اعزازی طور پر حاصل ہوں یہ درست ہے کہ ان رسائل وکتب کا مالی خسارہ سرکار پورا کر دیتی ہے لیکن وہ رسائل وکتب کی خریداری یا عدم خریداری سے اس زبان کی مقبولیت اور اس کے اثر و رسوخ کا اندازہ بھی لگاتی ہے جس میں یہ شائع ہو رہے ہیں۔ اگر خریداروں کی تعداد کم ہے تو وہ اس زبان کو غیر مقبول یا مردہ سمجھ کر اس میں اپنی مطبوعات کا سلسلہ موقوف بھی کرسکتی ہے —— ماضی میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں اور اگر ہم نے اپنا اندازِ فکر نہ بدلا تو آیندہ بھی ایسی مثالیں سامنے آتی رہیں گی۔

—— سیّد شریف الحسن نقوی

"... نئے افسانہ نگار نے پریم چندی افسانے کو مسترد کر کے ادب کی ایک اہم خدمت انجام دی ہے لیکن پریم چندی افسانے سے اس کو ابھی پوری طرح گلو خلاصی نہیں ملی ہے دوسری طرف اسے نثری نظم کا خطرہ ہے۔ نثر کا ہفت خواں طے نہ کر سکنے کے باعث اس کا قافلہ نثری نظم کے نخلستان میں ٹھہرا ہوا معلوم ہوتا ہے ..."

شمس الرحمٰن فاروقی

افسانے میں بیانیہ اور کردار کی کشمکش

نئے افسانے کے بارے میں عام طور پر اس تشویش کا اظہار کیا جاتا ہے کہ اس کو روایت سے اللہ واسطے کا بیر ہے۔ اس میں روایت شکنی کا رجحان ہے۔ اس میں بیانیہ کی روایتی خوبیاں نہیں ہیں یا بہت کم ہیں۔ افسانے سے بیانیہ کے اخراج کا ذمہ دار جدیدیت کو ٹھہرایا گیا ہے۔ یعنی جدیدیت کے جرائم کی فہرست میں بیانیہ کا قتل بھی شامل ہے۔ چنانچہ بعض حلقوں کی طرف سے جب افسانے کی موت کا اعلان ہوا تو اس کے کچھ دنوں بعد یعنی تحقیق و تفتیش کی کارروائی پوری کرنے کے بعد، یہ بھی کہا گیا کہ جدیدیت نے افسانے کو چیستاں بنا کر ان ہزاروں قارئین سے اسے چھین لیا تھا جو انسانی مسائل کے تخلیقی افسانوی اظہار کو "افسانے کا افسوں جانتے تھے"۔ ڈاکٹر قمر رئیس کی بات سے قطع نظر کہ "تخلیقی افسانوی اظہار" کی اصطلاح میری سمجھ سے بالاتر ہے، اس بیان میں بنیادی بات یہ ہے کہ افسانے میں کسی طرح کا افسوں ہوتا ہے اور وہ افسوں اس وقت جاتا رہتا ہے جب افسانہ چیستاں بن جائے۔ اور افسانہ چیستاں تب بنتا ہے جب افسانہ نگار کو افسانے کی روایت کا شعور نہ ہو۔ ڈاکٹر قمر رئیس آگے چل کر ایک نوجوان افسانہ نگار ابن کنول کے بارے میں فرماتے ہیں کہ انھوں نے "افسانے کی بحالی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ کیوں کہ اردو افسانے کی روایت کا شعور وہ اپنے ہم عصروں سے کچھ زیادہ ہی رکھتے ہیں۔" اس وقت میں ابن کنول کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال نہ کروں گا۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اردو افسانے کی جس نام نہاد روایت کی پاسداری قمر رئیس صاحب اور ان کے ہم نواؤں یعنی ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر محمد عقیل کی طرف سے ہو رہی ہے، وہ اردو افسانہ تو کیا، مغربی افسانے کی بھی روایت نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ حضرات جس روایت کی بات کرتے ہیں اس کی عمر مشکل سے سو سال ہے اور اس کے آغاز کا سہرا [illegible] ہے۔ یعنی ان حضرات کی نظر میں پریم چند [illegible] بیانیہ ہے جس میں کردار کو افضلیت حاصل ہے۔ یہ وہ بیانیہ ہے جو کردار کی داخلی زندگی کی وضاحت کی خاطر واقعے کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ اس بیانیہ کی رو سے واقعہ پیش ہی اس لیے کیا جاتا ہے کہ اس کے ذریعے کردار کی نقاب کشائی ہو۔ اور کردار کی نقاب کشائی اس لیے کی جائے کہ اس کے ذریعے کرداروں کی آپس میں کشمکش اور خود ان کی داخلی زندگی اور تصورات و خیالات یعنی MENTAL EVENTS اور MENTAL CONFLICTS کو ظاہر کیا جائے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ واقعے کو کردار کا اظہار تصور کرنے کا نظریہ بیانیہ کا روایتی نظریہ نہیں ہے۔ یہ نظریہ بڑی حد تک بیانیہ کی روح کا استحصال کر دیتا ہے۔ اس کے برخلاف ہمارے نئے افسانے، جن میں کردار کی کوئی خاص اہمیت نہیں، بلکہ جن میں واقعہ ہی تقریباً سب کچھ ہوتا ہے، بیانیہ کی اصل روایت سے نزدیک تر ہیں۔ اور جب میں نئے

D' 11/88 کاکا نگر، نئی دہلی

افسانے"، کہتا ہوں تو میری مراد انتظار حسین کے افسانے نہیں، جن میں داستانی رنگ ہر ایک کو نظر آتا ہے۔ میری مراد آٹھویں اور نویں دہائی کے افسانے ہیں جن میں باقاعدہ پلاٹ چاہے نہ بھی ہو، لیکن ان میں واقعے کی کثرت ہے۔ روایتی بیانیے کی شان واقعات کی کثرت ہے، کردار نگاری نہیں۔ یہ بات اب اتنی عام ہو چکی ہے کہ ہمارے مرثیہ خواں حضرات اگر شولز اور کلاگ کی ہی کتاب پڑھ لیتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ بیانیہ کی اصل روایت کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

> کردار نگاری کا سب سے اہم عنصر وہی ہے جسے کردار کی داخلی زندگی کہتے ہیں۔ یہ عنصر جتنا کم ہوگا، فن پارے کی تعمیر میں دوسرے بیانیہ عناصر مثلاً پلاٹ، حالات کا بیان، دوسرے واقعات کے حوالے اور بدیعیات RHETORIC کا حصہ زیادہ ہوگا۔ کامیاب بیانیہ کے لیے ضروری نہیں ہے کہ اس میں داخلی زندگی پر زور دیا جائے اور اسے تفصیل سے پیش کیا جائے۔ لیکن اسے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے دوسرے عناصر کا استعمال کرنا ہوتا ہے، اگر اسے خود کو انسانی دلچسپی کی چیز کی حیثیت سے باقی رکھنا منظور ہو۔ یونانی داستانی قصوں میں یہ کمی پیچیدہ پلاٹ، محاکاتی بیان اور صنائع بدائع سے بھرپور بدیعیات سے پوری کی جاتی تھی۔ یہی حال سولہویں اور سترہویں صدی کے انگریزی اور فرانسیسی داستانی قصہ گویوں کا ہے جو یونانیوں کے متبع تھے۔

اس بیان سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ کردار اور واقعے کے آپسی ردعمل اور کردار نگاری کے ذریعے واقعات کے تانے بانے جوڑنا قدیم بیانیہ کی رسم نہیں۔ قدیم بیانیہ کی رسم یہی تھی کہ واقعات کی کثرت ہو، افسانے کے موثر اور قابلِ قبول بنانے کے لیے اسی بدیعیات یعنی RHETORIC یعنی PERSUASIVE TECHNIQUE استعمال کی جائے جو بہت رنگین اور صنائع بدائع سے بھرپور ہو۔ جس شخص نے ہماری داستانوں کا ایک صفحہ بھی پڑھا ہے وہ اس بات کو تسلیم کرے گا کہ شولز اور کلاگ کا بیان ہماری داستانوں (یعنی ہماری اصل بیانیہ روایت) پر حرف بہ حرف صادق آتا ہے۔

افسانے میں بدیعیات کا معاملہ بہت اہم اور دلچسپ ہے۔ بدیعیات سے مراد وہ طریقے ہیں جن کے ذریعے افسانہ نگار اپنے واقعات کو قابلِ قبول بناتا ہے۔ ان طریقوں کے شعوری یا غیر شعوری ہونے سے بحث نہیں، بنیادی بات یہ ہے کہ یہ طریقے ہر افسانہ نگار کو استعمال کرنا ہوتے ہیں، چاہے وہ نام نہاد واقعیت نگار ہو یا تمثیلی یا علامتی۔ مائر اسٹائن برگ MEIR STEINBERG نے ایک پوری کتاب اسی موضوع پر لکھی ہے۔ اس نے ایک ماہر نفسیات کا ایک تجربہ نقل کیا ہے جس کی مختصر تفصیل حسب ذیل ہے۔ ایک عبارت ترتیب دی گئی جس میں ایک فرضی شخص مثلاً زید کے بارے میں بعض باتیں کہی گئیں۔ شروع میں جو باتیں کہی گئی تھیں، عبارت کے آخری حصے میں ان تمام باتوں کی بالکل الٹی باتیں کہی گئیں۔ مثلاً اگر شروع میں لکھا کہ زید بہت نیک دل اور مخیر تھا، تو آخر میں لکھا کہ وہ بہت سخت دل اور کنجوس تھا۔ یا اگر شروع میں لکھا کہ زید بہت سخت دل اور کنجوس تھا تو بعد میں لکھا کہ وہ بہت نیک دل اور مخیر تھا۔ دونوں طرح کی عبارتیں کئی لوگوں کو دی گئیں اور ان سے کہا گیا کہ ان کو جو عبارت دی گئی ہے اسے بغور پڑھ کر زید کے بارے میں اظہار خیال کریں۔ ہر شخص نے اپنی عبارت کو بغور بار بار پڑھا لیکن زید کے کردار کے بارے میں جو بھی اظہار خیال کیا گیا وہ ان باتوں پر مبنی تھا جو عبارت کے شروع میں تھیں۔ اگر شروع میں زید کی تعریف لکھی تھی تو زید کو اچھا آدمی بتایا گیا۔ اگر شروع میں اس کی برائی لکھی تھی تو اس کو برا بتایا گیا۔ بعض پڑھنے والوں نے تو بعد کی عبارت کو بالکل نظر انداز ہی کر دیا۔ اور بعض نے اس کی توجیہیں طرح طرح سے کیں۔ اس تجربے سے اس بات کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ افسانہ نگار اپنے قاری پر کس قدر اختیار رکھتا ہے۔ اب اگر وہ اس اختیار کو ٹھیک سے استعمال نہ کر سکے تو اس میں قاری کا کیا قصور؟ لیکن اگر قاری کی نیت صاف نہ ہو اور وہ افسانے میں فرضی چیزیں تلاش کرنا شروع کر دے تو افسانہ نگار کی بدیعیاتی کارروائی RHETORICAL STRATEGY ناکام ہو سکتی ہے۔ فرضی چیزوں سے میری مراد یہ ہے کہ اگر قاری کو افسانے میں کردار کی تلاش پر اصرار ہو، جب کہ افسانہ نگار آپ کو واقعہ سنا رہا ہے، تو لا محالہ آپ اس کے ساتھ ناانصافی کر رہے ہیں۔ ہاں اگر واقعہ خود ان صفات کا حامل نہ ہو جو کردار نگاری کی کمی

سوس نہ ہوتے دیں تو اور بات ہے۔

میں نے اوپر ہنری جیمز کا ذکر کیا ہے۔ افسانے میں کردار اور بیانیہ کی کشمکش کا آغاز ہنری جیمز سے ہوتا ہے۔ یہ جیمز ہی تھا جس نے کردار کے اظہار میں اس قدر غلو کیا کہ اس نے اکثر جگہ "ناول نگار" یا "فکشن نگار" کا لفظ ہی نہیں استعمال کیا، بلکہ "ڈراما نگار" لکھا۔ یعنی اس کا خیال تھا کہ ناول نگار دراصل ڈراما نگار ہوتا ہے اور جس طرح ڈرامے میں تمام واقعات کا اظہار کردار کے حوالے سے ہوتا ہے، اسی طرح ناول میں بھی ہونا چاہیے۔ ہنری جیمز نے ناول میں واقعات کے اسلوب اظہار کے لیے (منظری) SCENIC اور (غیر منظری) NON SCENIC کی اصطلاحیں وضع کیں۔ "منظری" سے اس کی مراد تھی وہ اسلوب جو ڈراما سے قریب تر ہو، یا جس میں واقعات اس طرح نمایاں ہوں جس طرح ڈراما میں ہوتے ہیں۔ اور غیر منظری سے اس کی مراد تھی وہ اسلوب جو ڈراما سے دور تر ہو۔ جیمز نے تقریباً ہمیشہ اس نام نہاد "منظری" اسلوب کو "غیر منظری" اسلوب پر فوقیت دی ہے۔ کردار اور واقعے کے رشتے کردار نگاری کی واقعے پر فوقیت کے بارے میں ہنری جیمز کے بعض اہم بیانات حسب ذیل ہیں۔ یہ میں نے اس کے مختلف مضامین سے اخذ کیے ہیں:

> کردار کیا ہے اگر وہ واقعے کی تعیین نہیں ہے؟ واقعہ کیا ہے اگر وہ کردار کی وضاحت نہیں کرتا؟ کوئی تصویر یا کوئی ناول کیا ہے اگر وہ کردار کے بارے میں نہیں ہے؟ کردار کے علاوہ ہم ناول یا تصویر میں تلاش ہی کیا کرتے ہیں اور حاصل ہی کیا کرتے ہیں؟ اگر کوئی عورت اس طرح کھڑی ہو کہ وہ اپنا ہاتھ میز پر ٹکائے ہوئے آپ کو ایک خاص انداز سے دیکھے، تو یہ ایک واقعہ ہے۔ یا اگر یہ ایک واقعہ نہیں ہے تو میرا خیال ہے یہ کہنا بہت مشکل ہوگا کہ پھر یہ اور کیا ہے؟

یہ اقتباس جیمز کے مشہور مضمون THE ART OF FICTION کا ہے۔ اس کی اشاعت کو صرف ایک سو ایک برس ہوئے ہیں۔ لیکن یہ بیان اتنا پر اثر ثابت ہوا ہے کہ یار لوگ بیانیہ کی ہزاروں برس پرانی روایت کو بھول کر اس بیان کی روشنی میں بیانیہ کی روایت مرتب کرتے ہیں۔ محمد احسن فاروقی بھی ان لوگوں میں شامل ہیں۔ لیکن دیکھیے زویتان ٹاڈراف TZVETAN TODOROV اس باب میں کیا کہتا ہے:

> ہم نے شاید ہی کوئی ایسی مثال اور دیکھی ہو جس میں خالص خود رائی نے خود کو ہمہ گیر حقیقت کے طور پر پیش کیا ہو۔ ممکن ہے جیمز کا نظریاتی آدرش ایسا ہی بیانیہ رہا ہو جس میں ہر چیز کرداروں کی نفسیات کے تابع ہے، لیکن ادب میں ایک پورا نا قابل نظر انداز رجحان موجود ہے جس کی رو سے واقعات اس لیے نہیں ہیں کہ وہ کردار کی وضاحت کریں۔ بلکہ اس کے برخلاف، وہاں تو سارے کے سارے کردار ہی واقعات کے تابع ہوتے ہیں۔ مزید برآں کہ اس رجحان کی رو سے "کردار" کی اصطلاح جس چیز کی نشان دہی کرتی ہے وہ نفسیاتی مربوطی یا کردار کے ذاتی انوکھے رجحانات کا اظہار نہیں ہے۔

ایک دوسرے سیاق و سباق میں ٹاڈراف یہ سوال بھی پوچھتا ہے کہ ممکن ہے پلاٹ کے بارے میں جو خیال ہے کہ وہ علت اور معلول کا نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ آج کل کے پلاٹ کے بارے میں صحیح ہو۔ لیکن اس تصور کا اوڈیسی کے پلاٹ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے، جہاں ہر بات دیوتاؤں نے پہلے ہی سے طے کر دی ہے؟ مراد یہ ہے کہ ہم لوگوں کو پلاٹ اور کردار کے بارے میں اپنے ان خیالات پر نظر ثانی کرنا چاہیے جو ہم نے پچھلے سو برس سے کچھ کم یا زیادہ کے عرصے میں مغرب میں دریافت کیے ہیں۔ یہ کہنا غلط ہے کہ ناول چونکہ جدید صنف سخن ہے، اس لیے اس پر جدید ہی خیالات کی روشنی میں بات ہوگی۔ کیوں کہ ناول تو ہنری جیمز کے پہلے سے موجود تھا۔ بلکہ دنیا کے سب سے بڑے ناول نگاروں میں سے کم سے کم تین یعنی ڈکنس، بالزاک اور فلابیر، ہنری جیمز کے پہلے تھے۔ اور دو یعنی دستوئفسکی اور ٹالسٹائی بھی جیمز کے بزرگ ہم عصر تھے۔ لہٰذا ہنری جیمز جو ٹالسٹائی، دستوئفسکی اور ڈکنس کو پسند نہیں کرتا تھا کہاں کا ارسطو ہے کہ ہم ناول کے بارے میں اس کی ہر بات مان لیں۔ خیر، جیمز کے بعض اور جواہر ریزے ملاحظہ ہوں:

[illegible]سی مصنف کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ روح [illegible]
[illegible] ملاقات کرے، چاہے اس کے نتیجے میں اسے محاکات
[illegible] دبانا، بلکہ منہا ہی کیوں نہ کرنا پڑ جائے۔ اس کو
چاہیے کہ وہ اپنے کرداروں کی خبر رکھے۔ اس کے
محاکات اپنا معاملہ خود ہی ٹھیک کریں گے۔

یہ تحریر [illegible] کے بالکل آخری زمانے کی ہے (۱۹۱۴)۔ ایک
[illegible] ملاحظہ ہو:

[illegible] سچی بات یہ ہے کہ ایک بات مجھے بڑے
زبردست طریقے سے سچی معلوم ہوتی ہے۔ اور وہ یہ
ہے کہ کسی تصویر میں جو لوگ ہیں، یا کسی ڈرامے
میں جو فاعل ہیں وہ اسی حد تک دلچسپ ہیں جس
حد تک وہ اپنی اپنی صورت حال کو محسوس کرتے
[illegible] کہ جو پیچیدگیاں ظاہر ہوتی ہیں، خود ان
[illegible] شعور جس حد تک ہوتا ہے، اسی حد تک
ہمارا [illegible] ان کے شعور کا رشتہ قائم ہو سکتا ہے۔

یہ [illegible] ۱۹۰۸ کا ہے۔ آگے چل کر وہ **ہیملٹ اور شاہ لیر کی** مثال دیتا ہے۔ یہ لوگ [illegible] ہیں۔ اور ہمیں ان لوگوں سے ہمدردی کم ہوتی ہے جو روحانی طور پر اندھے یا احمق یا غیر مہذب ہوتے ہیں۔ یعنی افسانے میں ایسے کرداروں کا ذکر ہونا چاہیے جو حساس ہوں، اپنا شعور رکھتے ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ اس طرح [illegible] کو وضاحت سے بیان کرنے کے لیے اس کی داخلی زندگی [illegible] کی گہرائیوں میں جانے کے سوا چارہ نہیں۔ [illegible] کہتا ہے کہ بڑے بڑے واقعہ نگاروں، مثلاً اسکاٹ [illegible] یہ کیا ہے کہ کسی نہ کسی طرح کے ذہن کو کسی مہم سے [illegible] اگر ایسا نہیں کیا ہے تو انھیں نقصان بھی [illegible] معلوم نہیں ہومر یا فردوسی کے کرداروں یا قدیم [illegible] کے کرداروں میں کس قسم کا دماغ ہے [illegible] ڈارف نے خوب کہا ہے کہ روایتی بیانیہ [illegible] ہے۔ دوسری بات وہ یہ کہتا ہے کہ جب ہنری جیمز [illegible] نے "خود دیکھا" تو اس کے نزدیک الف اہم تر ہے۔ [illegible] الف لیلیٰ قصہ گو شہرزاد کے لیے بے اہم تر ہے۔ یعنی کس طرح دیکھا گیا، کس نے دیکھا، یہ اہم نہیں ہے، بلکہ کیا دیکھا گیا، اہم ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ میں کردار نگاری کے خلاف ہوں۔ کردار نگاری اور کردار کی نفسیات کی تہوں میں اتر کر کیچڑ اور موتی کھنگالنا بڑی عزیز اور اہم چیز ہے۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ کردار نگاری اور بیانیہ ہم معنی نہیں ہیں، اور نہ ہی کردار نگاری بیانیہ کی قدیمی روایت کا حصہ ہے۔ بیانیہ کی قدیمی روایت اور جدید طریق کار میں بنیادی فرق بدیعیات کا ہے، گرامر کا نہیں۔ یعنی دونوں کے قاعدے ایک سے ہیں، لیکن اپنی بات کو قائم کرنے کے لیے جدید یعنی ہنری جیمز کا طریق کار یہ ہے کہ اس کے ذریعے اس شخص کو اہمیت دی جاتی ہے جس پر واقعہ گزرا۔ قدیمی روایت کی رو سے وہ شخص اہم نہیں جس پر واقعہ گزرا، بلکہ واقعہ خود اہم ہے۔ اس طرح اس چیز کی اہمیت کم ہو جاتی ہے جسے ہنری جیمز POINT OF VIEW نقطۂ نظر کہتا ہے۔ یعنی واقعہ بیان کرنے والا (راوی) اور مصنف الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے رولاں بارت کہتا ہے کہ "متن کو اس کے باپ (یعنی خالق) کی گارنٹی کے بغیر پڑھا جا سکتا ہے... ایسا نہیں ہے کہ مصنف اپنے متن میں واپس نہیں لوٹ سکتا۔ وہ لوٹ سکتا ہے، لیکن محض ایک "مہمان" کی طرح۔ اگر مصنف ناول نگار ہے تو وہ اپنے متن میں خود کو ایک کردار کی طرح درج کر دیتا ہے... اس کے دستخط کسی خاص احترام و مراعات PRIVILEGE یا پدرانہ اہمیت کے حامل نہیں ہوتے... اس کی زندگی (وجود) اس کی کہانیوں کا سرچشمہ نہیں رہ جاتی، بلکہ ایک ایسی کہانی بن جاتی ہے جو اس کی تحریر کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔" بارت کی مراد یہ ہے کہ بیانیہ میں جب کوئی واقعہ بیان ہوتا ہے تو پھر اس میں مصنف کے ادراکات شامل نہیں ہوتے، بلکہ راوی کے ہوتے ہیں۔ لیکن بیانیہ کے غیر روایتی نظریات کے حامل نقادوں کی رو سے وہ نقطۂ نظر اہم ہے جس جگہ سے واقعے کو دیکھا جا رہا ہے۔ واقعیت کی تلاش نے ہمارے **فکشن** کو اس منزل تک پہنچا دیا جہاں کوئی بیان، کوئی روداد اپنی اصلی شکل میں باقی ہی نہیں رہی۔ واقعیت کے نام پر واقعے ہی کا استیصال ہو گیا۔

پھر سوال یہ ہے کہ روایتی بیانیہ کس طرح کام کرتا ہے؟ اس کی

[ر]یات کیا ہے؟ اور اس کی کارفرمائی ہم آج کے افسانے میں کس [طر]ح دیکھ سکتے ہیں؟ اگر آج کا افسانہ واقعی روایتی بیانیہ کا پیرو ہے [تو] اس میں اس طرح کا تاثر کیوں نہیں ہے جو ہم روایتی بیانیہ میں [د]یکھتے ہیں؟ آخری سوال کا تو جواب یہ ہے کہ روایتی بیانیہ کی پیروی [کی ا]یک اہم شرط نئے افسانے نے نہیں پوری کی ہے۔ وہ شرط یہ ہے کہ بیانیہ میں صرف راوی کا POINT OF VIEW ہو۔ کسی کردار کا یا مصنف کا نہ ہو۔ واقعیت کی مار ہمارے افسانہ نگاروں پر اس قدر زبردست ہے کہ جب وہ کوئی منظر بیان کرتے ہیں تو خود اپنے تاثرات بیان کرنے لگتے ہیں، یا کسی کردار کے۔ اپنے تاثرات بیان کرنے میں مشکل یہ ہے کہ پھر افسانے کی TECHNIQUE کمزور پڑ جاتی ہے۔ اور کردار کے تاثرات بیان کرنے میں مشکل یہ ہے کہ کردار ان کے یہاں ہے نہیں۔ لہٰذا منظر کا بیان جھوٹا اور مصنوعی ہو جاتا ہے اور پریم چند کے افسانے کا بھوت آموجود ہوتا ہے۔ روایتی بیانیہ میں واقعہ خود کردار کا قائم مقام ہوتا ہے (یعنی کردار کے ESSENTIAL EVENT نہیں بیان ہوتے، بلکہ اس کے اعمال بیان ہوتے ہیں) اس لیے اس میں یہ سوال نہیں اٹھتا کہ ہم کس کے ادراکات سے دوچار ہو رہے ہیں۔ یہ مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) سمندر کی لہروں اور عورتوں کے خون کو راستہ بتانے والا چاند ایک کھڑکی کے راستے اندر چلا آیا تھا اور دیکھ رہا تھا۔ دروازے کے اس طرف کھڑا مدن اگلا قدم کہاں رکھتا ہے؟ مدن کے اپنے اندر ایک گھن گرج سی ہو رہی تھی اور اسے اپنا آپ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے بجلی کا کھمبا ہے جسے کان لگانے سے اسے اندر کی سنسناہٹ سنائی دے جائے گی۔

بیدی: اپنے دکھ مجھے دے دو

مدن کی شادی کی پہلی رات ہے۔ وہ حجلۂ عروسی میں ایک قدم رکھ کر ٹھٹکا کھڑا ہے۔ اس منظر کا بیان انتہائی اعلیٰ درجے کا ہے، اس میں کوئی کلام نہیں۔ لیکن اس بیان میں چاند کو سمندر کی لہروں اور عورتوں کے خون کو راستہ بتانے والا کیوں کہا گیا ہے؟ "راستہ" کی معنویت پر بھی غور کیجیے۔ پھر مدن خود کو بجلی کے سنسناتے ہوئے کھمبے کی طرح محسوس کر رہا ہے۔ اس پیکر کی اشاریت ملحوظ رکھیے۔ یہ پیکر

بیان کی قوت میں اضافہ کرتے ہیں۔ لیکن یہ چاند جو [illegible] ہے۔ مدن نے دیکھا ہے کہ بیدی نے؟ اور مدن کے [illegible] کو ہم مدن کی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں یا بیدی کی [illegible] رات کی چاندنی نہ ہوتی تو کیا اس وقت بھی بیدی [illegible] عورتوں کے خون کو راستہ بتانے والا کہتے [illegible] بھی ظاہر ہے کہ یہ چاندنی بیدی نے بنائی ہے [illegible] قدم اٹھنے کے انتظار میں ہے نہ واقعی ہے [illegible] کھلونا ہے۔ بجلی کے سنسناتے ہوئے کھمبے [illegible] نہ ہوتا جب سہاگ رات کے بجلے منظر [illegible] لڑکی کے انٹرویو کے وقت کا ذکر ہوتا [illegible] کی ہیں۔ خوب صورت ہیں۔ حسب حال [illegible] کوئی تعلق نہیں۔ یہ واقعے پر طاری [illegible] افسانہ نگاری شروع کر دی ہے۔ [illegible] ہے۔ بلکہ کس پر ہوا؟ [illegible] سے زیادہ اہم ہے کہ کس نے بیان کیا [illegible] لا شخصیت کا پتہ نہیں۔ وہ لا شخصیت [illegible] تھی۔ لیکن بیدی [illegible] لہٰذا ان کے یہاں [illegible] افسانہ نگار تو قدیمی بیانیہ کو اپنا [illegible] نگاری کی ٹوپی پہن [illegible] آتی ہے۔ یہ اقتباس دیکھیے:

(۲) ننھے ننھے پتھر جب [illegible]
پہلے کائی پھٹی، پھر دھوپ اندر [illegible]
پانی میں بل چل ہوئی۔ لہریں اٹھیں [illegible]
بھی کائی سمٹ کر دور چلی گئی۔ [illegible]
ان پتھروں کی طرف لپکیں۔ ایک دنیا کا طلسم [illegible]
ایک دنیا کی آنکھ کھلی۔ پتھر برستے رہے۔ [illegible]
جوان رہا۔ لہریں زندگی کی علامت بن کر [illegible]
بڑھتی رہیں۔

[illegible]

تحریر اپنے درجے اور رتبے کے اعتبار سے بیدی سے کچھ ہی

کم ہے۔ لیکن یہاں کردار تو ہے نہیں۔ پھر یہ کس کے ادراکات بیان کیے جا رہے ہیں؟ اور یہ MENTAL EVENTS کو ادراک کا درجہ کیوں دیا جا رہا ہے؟ بظاہر یہ ادراک اس مرکزی کردار کے ہیں جس نے خود کو "میں" کے نام سے متعارف کیا ہے۔ لیکن ہوگا۔ مدن کی سہاگ رات تو پھر بھی ایک دلچسپ یا کم سے کم ایک THRILLING موقع تھی، یہاں کس صورت حال کا اظہار کیا جا رہا ہے؟ ظاہر ہے کہ کردار کو منہا کر دیا گیا ہے، لیکن کردار نگاری سے ابھی نجات نہیں ملی ہے۔ جو تاثرات بیان کیے جا رہے ہیں وہ افسانہ نگار ہی کے ہیں، راوی کے نہیں۔ افسانہ نگار نے اپنے خیالات کو "میں" کے ذریعے ادا کیا ہے، لیکن "میں" تو کوئی شخص نہیں ہوتا، جب تک کامیو کے THE FALL کے مرکزی کردار کی طرح وہ ہم کو اپنے بارے میں براہ راست نہ بتائے۔ یہاں جو "میں" ہے وہ کردار نہیں ہے، کردار کا بھوت ہے جس کی نقاب افسانہ نگار نے اوڑھ لی ہے۔ اگر باقاعدہ کردار ہوتا تو ہم اس سے سوال جواب کرتے۔ موجودہ صورت میں ہمارے پاس کردار نہیں ہے، لیکن راوی بھی نہیں ہے، صرف افسانہ نگار ہے۔ پھر بیانیہ کی قدیم روایت کے خد و خال کیوں کر نمایاں ہوں؟ اب ایک اور اقتباس دیکھتے ہیں:

> (۳) ہر چیز تھم گئی ہے۔ چوراہے پر سے گزرتی بسیں، گاڑیاں، راہ گیر، سب وقت کے فرسودہ فریم میں تصویر کے مانند ساکت ہو گئے ہیں۔ صرف شام اتر رہی ہے۔ دھیرے دھیرے، گلی کوچوں میں عمارتوں پر، ٹیلی گراف کے تاروں پر، اپنے گھروں کو رواں ہوتے انسانوں کے جمِ غفیر پر۔
>
> (انور خاں۔ شام رنگ)

سب سے پہلی بات تو یہ کہ یہ شام بیدی صاحب کی اس شام سے ملتی جلتی ہے جب سورج کی ٹکیہ بہت لال تھی۔ یہ شام بھی زور اور عبارت کے مرتبے میں بیدی سے کچھ ہی کم ہے۔ لیکن بیدی کی شام ان کرداروں کے ادراک میں تھی جن سے ہم فوراً ہی دوچار ہوتے ہیں۔ یہاں پھر وہی "میں" ہے، جس میں کوئی کرداری صفت نہیں۔ بنیادی بات یہ کہ دونوں افسانہ نگاروں کی بدیعیات ایک سی ہے۔ بیدی کے یہاں وہ کامیاب اس لیے ہے کہ وہ قدیم روایت کے بیانیہ کے برخلاف کردار نگاری کر رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس طرح کی منظر کشی، جس میں افسانہ نگار اپنے کرداروں کی تقدیر کا فیصلہ مقدمہ شروع ہونے کے پہلے کر دیتا ہے، واقعیت کے نام پر بے ایمانی ہے۔ لیکن وہ بے ایمانی اپنی شعریات کی حدود میں ہے۔ انور خاں کردار نگاری سے منحرف ہیں، لیکن ادراکات وہ بیان کر رہے ہیں تو راوی کے نہیں بلکہ کردار کے حوالے سے خود ان کے ہیں۔ یہی انور خاں جب سیدھی سادی تمثیل ALEGORY لکھتے ہیں، مثلاً "فن کاری" تو غیر معمولی طور پر کامیاب ہوتے ہیں:

> (۴) جب شیٹی نے چائے کے داموں میں اضافہ کر دیا تو بھارت ہندو ہوٹل میں مختلف میزوں پر بیٹھنے والے بے روزگار نوجوانوں میں برہمی پھیل گئی ملک کی اقتصادیات سیاسیات اور سماجیات پر طویل بحث کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ انھیں احتجاج کرنا چاہیے۔ انھوں نے ٹیبل والے سے اخبار منگوا کر اس شام منعقد ہونے والے پروگراموں کی تفصیلات دیکھیں اور ایک پروگرام جس میں شہر کے تمام سربر آوردہ اور معزز لوگوں کی آمد متوقع تھی، چُن لیا۔
>
> (انور خاں: فن کاری)

تمثیل ابھی قائم نہیں ہوئی ہے۔ لیکن ہلکے ہلکے اشارے موجود ہیں۔ یہ آغاز بلراج کومل کے افسانے "کنواں" کی یاد دلاتا ہے لیکن اگر وہ افسانہ یاد نہ بھی آئے تو شیٹی، بھارت ہندو ہوٹل، بے روزگار نوجوانوں کی بحث، اخبار میں ENGAGEMENTS کا کالم دیکھ کر احتجاج کی جگہ منتخب کرنا، ان سب سے ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ معاملہ وہ نہیں ہے جو بظاہر نظر آتا ہے۔ ان تفصیلات کی اہمیت نہیں ہے، بلکہ جس ترتیب سے وہ یکجا کی گئی ہیں، وہ اہم ہے۔

چونکہ بیانیہ کی قدیم روایت واقعے کی کثرت کا تقاضا کرتی ہے اور کردار کو واقعے کا تفاعل ٹھہراتی ہے۔ لہٰذا اس کے سامنے دو مسائل ہیں۔ اوّل یہ کہ واقعات کو کس طرح پیش کیا جائے، اور دوئم یہ کہ جب کردار کی داخلی زندگی نہ بیان ہو تو اس کے خیالات (اگر کوئی ہیں) کس طرح بیان کیے جائیں؟ پہلے سوال کا جواب تو آسان ہے۔ بیانیہ کی کوئی بھی ترکیب کارگر ہو سکتی ہے۔ تمثیل کی

مثال سامنے ہے۔ مسئلہ افسانے کے ابہام یا اشکال یا علامتوں سے افسانہ نگار کے شغف کا نہیں ہے۔ علامت تو کسی بھی طرح کے افسانے میں ہو سکتی ہے، اور آج کل کے زیادہ تر افسانوں میں علامت ہے ہی نہیں۔ مسئلہ دراصل یہ ہے کہ افسانہ یعنی بیانیہ کس طرح وجود میں آئے؟ واقعات کس طرح درج کیے جائیں اور کس طرح کے واقعات ہوں؟ ان مسائل پر میں پہلے بھی تھوڑا بہت اظہار خیال کر چکا ہوں۔ ایک بات میں نے اوپر کہی ہے کہ افسانہ نگار کو قاری پر غیر معمولی اختیار حاصل ہوتا ہے۔ وضعیاتی STRUCTURALIST نقاد تو ہر افسانے کو RELATIONSHIP'S اور CATEGORIES' میں بانٹ کر چھٹی کر دیتا ہے۔ میں نے وضعیاتی اور بعد وضعیاتی تنقید سے تھوڑا بہت سیکھا ضرور ہے لیکن مجھے اس بات کا احساس رہے کہ محض RELATION اور توازن کے اقسام بیان کر دینے سے واقعے کی واقعاتی قدر کا تعین نہیں ہو سکتا۔ یہ بات غور کرنے کی ہے کہ آخر افسانہ آزاد وجود رکھتا ہے نہیں؟ بعض نقادوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ افسانے میں لسانی سطح کے علاوہ ایک SEMIOTIC سطح بھی ہوتی ہے، اور وہ لسانی سطح کے ماقبل ہوتی ہے۔ فرض کیجیے ہم وہاں تک نہ جائیں، اور یہ کہیں کہ افسانے کے لیے دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک تو واقعہ اور دوسرے اس واقعے کو بیان کرنے والا۔ بیان کرنے والے کے بغیر واقعہ بے معنی ہے اور واقعے کے بغیر بیان کرنے والا ہو ہی نہیں سکتا۔ تو پھر ان دونوں میں وہ کیا رشتہ ہے جس کی بنا پر ہم اسے افسانے کی سطح پر قبول کرتے ہیں؟

ظاہر ہے کہ یہ رشتہ اس بات میں مضمر ہے کہ بیان کرنے والے نے واقعہ کو بیان کرنے کے لائق سمجھا۔ لیکن کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ بیان کرنے والے نے واقعے میں کوئی خاص معنی دیکھے؟ یا کہیں ایسا تو نہیں کہ بیان کرنے کے بعد اس میں معنی پیدا ہو جاتے ہوں؟ کیوں کہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ بیان کیے ہوئے واقعے کے معنی کسی کے لیے کچھ ہوں اور کسی کے لیے کچھ؟ اگر تشریحیات MERMENEUTIC'S کے نئے نظریات کی روشنی میں دیکھیں تو گاڈامر GADAMER کی طرح یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جب کوئی تخلیق وجود میں آ گئی تو اس کے معنی بھی ہوں گے۔ کیوں کہ تخلیق کی فطرت ہی یہی ہے کہ وہ بامعنی ہو۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیان کرنے والا معنی کی غرض سے واقعہ نہیں بیان کرتا۔ بلکہ وہ اس کو بیان کرنے کے لائق اس لیے سمجھتا ہے کہ اس میں خود اس کے لیے معنی ہیں اور وہ اس کے ذہن میں بطور واقعے کے قائم ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ اس کو قاری کے بھی ذہن میں بطور واقعے کے قائم کر دے۔ یعنی بیان کرنے والے کو ایک شارح درکار ہوتا ہے جو بیان کی ہوئی چیز کی شرح واقعے کے طور پر کر سکے۔ لہٰذا واقعہ اور اس کو بیان کرنے والا مل کر ایک تیسرا رشتہ خلق کرتے ہیں جو شارح کا ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ ابلاغ کا نہیں بلکہ بیانیہ کے اختیار کو کامیابی سے استعمال کرنے کا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ افسانہ نگار جو بھی کہتا ہے شارح اس کو مان لیتا ہے۔ پھر افسانہ نگار شارح سے یہ کیوں نہیں منوا لیتا کہ میں نے افسانہ لکھا ہے، جغرافیہ کی کتاب نہیں؟ روایتی بیانیہ وہ کیا کام کرتا ہے جس کی بنا پر ہم اس کو افسانہ یعنی FICTION مان لیتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اپنے کرداروں کو سرگرم عمل دکھاتا ہے، یہاں تک کہ ان کا سوچنا بھی عمل ہوتا ہے۔ یعنی ان کا سوچنا گفتگو کا عمل SPEECH ACT ہوتا ہے۔ نئے افسانے میں واقعہ کثرت سے ہے، لیکن عمل بہت کم ہے۔ اس میں مکالمہ بھی سوچ کی شکل میں نظر آتا ہے، کجا کہ سوچ کو مکالمے کا رنگ دیا جائے۔ یہاں چند مثالیں دیکھیے:

> کوکب دل سے اپنے باتیں کرتا ہے کہ اے کوکب کاشکے عمرو مجھ کو اس حال زار میں نہ دیکھتا۔ عمرو بیٹھنے والا دربار صاحب قراں کا ہے جس وقت عمرو اس بارگاہ آسماں جاہ میں جا کر بیٹھے گا اس دربار میں جوانانِ صف شکن تیغ زن جلوہ فرما رہے ہیں فرزندان صاحب قراں صاحب شوکت و شان جس امر کا ارادہ کرتے ہیں بدون فتح قدم نہیں ہٹاتے۔ اس نامدار نے کیا کیا جفا اٹھائی سات برس گنبد نور میں قید رہا چاہیے حوصلہ پست ہوتا کہ ملک ساحران تک ہمارا قدم نہ جمے گا افراسیاب ہمارے قتل کیے قتل نہ ہو سکے گا، حوصلے میں کمی مزاج میں برہمی ہوتی۔ ہوشربا کو چھوڑ کر چلے جاتے۔ جفا اٹھانے سے اور حوصلہ بڑھا۔ آج تک کھیت سے پاؤں نہیں ہٹایا۔ اے کوکب سب کی نگاہوں سے گر جاؤ گے سمجھ جائیں گے کہ صرف جادوگر

ہے، ہنر جرأت سے نابلد ہے۔ اپنے مقام پر ہنسیں گے مردانِ عالم طعن کریں گے۔ یہ تو ناممکن ہے کہ اتنا بڑا معرکۂ عظیم مشہور و معروف نہ ہو۔ پس اے کوکب واپس ہونا، روگردانی اس مقدمے سے سراسر نامردی ہے۔ عمرو نے دیکھا جب پتلے مارے جا چکے اور کوکب زخموں میں چور ہو چکا شمشیر زنی کی بھی طاقت نہ رہی بیچ میں سے تلواروں کے نکل کر الگ کھڑا ہوا سایے سے ابر کے ہٹ آیا... عمرو حیران ہے کہ یہ کیا معرکہ گزرا کوکب کے جی چھوٹ گئے... اے عمرو بزرگوں کا جو قول ہے سخن شنیدن بیخ دولت، کوکب نے اس کے خلاف کیا۔ ہم نے کہا تھا کہ تامل کرو ہم عیاری کرکے ساحیاں کو ماریں گے۔ اس وقت جوشِ جرأت میں ہمارا کہنا نہ مانا۔ آخر مجبور ہو کے پلٹ گیا۔ صاحب عزت ہے ایسا نہ ہو اپنی جان دے۔ اب کہاں جا کر تلاش کروں؟

(طلسم ہوشربا۔ جلد ہفتم ص ۳۶۶-۳۶۷)

یہ داستان گوئی کا بہترین نمونہ نہیں ہے، لیکن نمائندہ نمونہ ضرور ہے۔ خیال کو تقریر کی شکل میں دکھانے کے پیچھے یہ قدیم نظریہ ہے کہ خیال دراصل خاموش تقریر ہوتا ہے۔ اور خود تقریر دراصل بولی ہوئی تحریر ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے پرانی داستانوں اور رزمیوں میں کرداروں کے خیالات بھی ایسی زبان میں بیان کیے جاتے ہیں جو دراصل تحریری زبان ہوتی ہے۔ تحریر اور تقریر کے بارے میں یہ نظریہ اب بالکل غلط ثابت ہو چکا ہے لیکن آپ کو صحیح نظریہ لینا ہے یا کامیاب افسانہ نگاری کرنی ہے؟ افسانہ نگار جب داستانی شعریات قبول کر رہا ہے تو اس کے لیے تو وہی نظریہ درست ہوگا جو اس شعریات سے برآمد ہو۔ اس اقتباس میں مندرجہ ذیل باتیں لائق توجہ ہیں:

(۱) تقریر یعنی SPEECH ACT کی زبان، آہنگ اور لہجہ

(۲) حال، ماضی، مستقبل کی یک جائی۔ (عمرو... کا ہے... بیٹھے گا ... جلوہ فرما رہے ہیں... ارادہ کرتے ہیں... قدم نہیں ہٹاتے۔)

(۳) ماضی کا بطور حال کے استحضار (کیا کیا جفا اٹھائی... قید رہا ... چاہیے حوصلہ پست ہوتا... نہ جمے گا... چلے جاتے... اور حوصلہ بڑھا۔)

(۴) مستقبل اور حال کا ادغام (گر جاؤ گے... نابلد ہے... مشہور و معروف نہ ہو... نامردی ہے۔)

(۵) دو تقریروں کے بیچ میں بیان (عمرو نے دیکھا۔)

(۶) ماضی کا بطور حال کے بیان (عمرو نے دیکھا... مارے جا چکے ... چور ہو چکا۔)

(۷) ماضی کا فلیش بیک۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ یہ محض خیال بطور تقریر نہیں ہے، بلکہ تقریر کے اندر بھی ماضی، حال اور مستقبل کے واقعات کا عمل جاری رہتا ہے۔ یہ بظاہر سادہ سی تحریر بہت پیچیدہ اور حرکت سے بھرپور ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے افسانہ نگار کو چاہیے کہ وہ داستانی زبان استعمال کرے۔ ہمارے شعرا کو جب میر کی نقل سوجھتی ہے تو "آؤ ہو"، "جاؤ ہو"، "چمن کے بیچ" لکھ کر خوش ہو لیتے ہیں کہ ہم نے حق ادا کر دیا۔ اور نثر نگاروں کو جب داستانی رنگ اپنانا ہوتا ہے تو وہ "صاحبو"، "قصہ کچھ یوں ہے"، "اے مرد نیک نہاد" وغیرہ قسم کے فقرے لکھ کر سمجھتے ہیں کہ ہم نے "بوستان خیال" دوبارہ لکھ دی۔ میں تو ان ترکیبوں کو اپنانے کی سفارش کر رہا ہوں جن میں سے بعض کو ہم نے مندرجہ بالا عبارت میں دیکھا۔ بیانیہ کی ایسی بہت سی ترکیبیں قرۃ العین حیدر نے استعمال کی ہیں، اور بڑی خوبی کے ساتھ۔ انھوں نے داستان گویوں کی اس ترکیب کو سمجھ لیا ہے کہ افسانہ حرکت سے عبارت ہے، اور حرکت کا راز زمانے کی SIMULTANIETY میں ہے۔ م۔ ق۔ خان لکھتے ہیں:

> وہ جگہ دیوتاؤں اور دیویوں سے بھر گئی۔ ان کے ہمراہ اگر رشی منی تھے تو بھوت اور اسور بھی تھے۔ برہما عجیب وحشیانہ ڈھنگ سے جھانجھ پیٹ رہے تھے۔ وشنو ڈھول بجا رہے تھے۔ سرسوتی وینا کے تاروں کو چھیڑ رہی تھی اور اندر مرلی کی تان اڑا رہے تھے اور بھوت اسور بدمست ہو کر محو رقص تھے۔ نٹ راج کی جٹا طوفان کی زد میں آئے درختوں کی طرح دیوانہ وار جھوم رہی تھی۔

یہاں افسانہ نگار کو علامتیں جمع کرنے کا اتنا شوق ہے کہ انھیں عبارت بنانے کی فرصت نہیں۔ اسی ٹکڑے کو احمد حسین قمر کی طرح ماضی

جگن ناتھ آزاد

اِس زمانے کے علاوہ بھی زمانے ہیں بہت
دل ہو مشتاقِ تماشا تو نشانے ہیں بہت

مرے مُرشد نے یہ آخر میں بتایا مجھ کو
کہ حقیقت ہے فقط ایک، فسانے ہیں بہت

بعد میں خواب کا ہوتا ہے جو انجام نہ پوچھ
ابتدا میں تو سبھی خواب سہانے ہیں بہت

ترے در پر گذر اوقات کی ہے بات کچھ اور
یوں تو ہم خاک نشینوں کے ٹھکانے ہیں بہت

جو سُنا بزم نے، وہ ایک جھلک بھی تو نہ تھی
مرے احساس میں خوابیدہ ترانے ہیں بہت

میں نے خوشیوں کو نہ للچائی نظر سے دیکھا
کہ مرے پاس غمِ دل کے خزانے ہیں بہت

سختِ جانی کا نہیں کوئی علاج اے آزاد!
ورنہ اِس دور میں مرنے کے بہانے ہیں بہت

تری تلاش میں نکلا جو قافلہ دل کا
تو ہر مقام پہ حائل تھا مرحلہ دل کا

یہ التفات کا عالم، مجھے تو ڈر ہے یہیں
نکل نہ جائے کہیں آج حوصلہ دل کا

دل اس طرح سے خود اپنے لہو میں ڈوب گیا
کہ دل کو مل ہی گیا جس طرح صلہ دل کا

یقین و شک میں یہ اب اعتبار کس پہ کرے
عجب مقام پہ اٹکا ہے فیصلہ دل کا

تری زباں کے تصدق تری نظر کے نثار
مگر جہاں تھا وہیں ہے ابھی گلہ دل کا

تعلق اس کا حقیقت میں ہے نگاہ کے ساتھ
زباں کے ساتھ بھی ہے گرچہ سلسلہ دل کا

غزل میں سوز و گداز و خلوص و درد کی بات
نہیں زبان کا، یہ ہے معاملہ دل کا

۸۲۵ - گورنمنٹ کوارٹرس، گاندھی نگر، جموں توی

"... سچ پوچھو تو بڑے نواب صاحب کی ضد نے یہ دن دکھائے ہیں۔ بینی پرشاد ہوٹل کھولنے کے لیے دو لاکھ روپے شیش محل کے دے رہے تھے..."

شیش محل

م۔م۔ راجندر

شیش محل دولت نگر کی ایک ایسی غیر آباد اور اُجاڑ عمارت تھی جسے لوگ اب بھول سا گئے تھے۔ اس محل نما، لمبی چوڑی، خوبصورت حویلی میں جس کا بڑا ہال دیواروں اور چھت پر جڑے ہوئے ہزاروں چھوٹے چھوٹے رنگین شیشوں سے اندھیرے میں بھی جگمگاتا تھا، اب ایک چوکیدار خان بابا کے سوا اور کوئی نہیں رہتا تھا۔ شیش محل کے وارث اقبال بخت اب اپنا بڑھاپا شہر کی ایک گنجان گلی کے چھوٹے سے مکان میں اپنے ایک بھتیجے بیدار بخت اور اُس کی اولاد کے ساتھ گزار رہے تھے۔ خان بابا تعلق داروں کے اس خاندان میں اُس وقت نوکر ہوا تھا جب وہ صرف دس گیارہ سال کا تھا اور آج وہ خود ستّر برس کا ہو گیا تھا۔

شیش محل کوئی سو سوا سو سال پرانی عمارت تھی لیکن آج بھی ٹھوس پتھر کی طرح مضبوط تھی۔ بلاشبہ اس کی دیکھ بھال نہیں ہو رہی تھی اور در و دیوار سیاہ ہو گئے تھے اور مٹی اور جالوں سے اٹے پڑے تھے۔ شیش محل کی بجلی بھی بلوں کے ادا نہ ہونے کے باعث کبھی کی کٹ چکی تھی۔ رات کے وقت صرف صدر دروازے کے برابر والے ایک کمرے میں خان بابا کی لالٹین جلتی تھی۔ خان بابا نے اپنی ساٹھ سالہ ملازمت میں تعلق داروں کے خاندان کی اُبھرتی اور ڈوبتی قسمت کے تمام رنگ دیکھے تھے۔ شیش محل میں کبھی اس خاندان کے پچاس ساٹھ افراد نوابوں کی سی شان اور شوکت کے ساتھ رہتے تھے۔ زمانے کی گردش نے وہ شان و شوکت تو مٹا ہی دی تھی، اس بھرے پُرے خاندان کو بھی تقریباً نیست و نابود کر دیا تھا۔ اس خاندان کی نشانی اب اسّی سال کے اقبال بخت ہی تھے۔ اُن کا بھتیجا بیدار بخت اور اس کی اولاد بھی اسی خاندان کے تھے لیکن بیدار بخت بالکل نالائق ثابت ہوا تھا اور ایک چھوٹے سے سرکاری دفتر میں چپراسی کی ملازمت کر رہا تھا۔ خان بابا بھی بیدار بخت کو اس بڑے خاندان میں شامل کرتے ہوئے ایک ذہنی کرب محسوس کرتا تھا۔

اقبال بخت کے پاس ابھی کچھ پیسہ تھا اور وہ اس میں سے خان بابا کی وہی پرانی پچاس روپے ماہوار تنخواہ دے رہے تھے اور گھر کا خرچ چلا رہے تھے۔ خان بابا کو دونوں وقت کی روٹی گھر سے ہی بھیج دی جاتی تھی۔ کوئی دو سال ہوئے ایک بیوپاری شیش محل کو دو لاکھ روپے میں خرید کر اُس میں ایک ہوٹل شروع کرنا چاہتا تھا مگر اقبال بخت اور خان بابا راضی نہیں ہوتے تھے۔ اقبال بخت کو یہ گوارا نہیں تھا کہ جس شیش محل میں ان کے آبا و اجداد خاندانی عزّت اور وقار سے رہے ہوں وہ اب شراب نوشی، رقص اور جوئے کا اڈّہ بن جائے۔ اقبال بخت سب سے یہ کہا کرتے تھے کہ شیش محل میں اپنی زندگی میں نہیں بیچوں گا، میری موت کے بعد بیدار بخت چاہے تو بیچ دے۔

دولت نگر ایک پھلتا پھولتا شہر تھا اور اس علاقے میں اناج کی ایک بڑی منڈی کی حیثیت رکھتا تھا۔ کبھی شیش محل کے

اس قصبے کے سب سے امیر آدمی تھے لیکن وہ زمانہ تو کب کا
ڈھل چکا تھا۔ جہاں پہلے شیش محل کے نزدیک ہی اقبال بخت اور
اُن کے خاندان کی سینکڑوں ایکڑ زمین تھی وہاں اب شیش محل کے
سامنے سے گزرتی ہوئی ایک بڑی پکّی سڑک بن گئی تھی۔ اور شیش محل
سے کچھ ہی دُور پرے ایک چینی کا مل قائم ہو گیا تھا۔ اس سڑک پر
صبح و شام دولت نگر کے بہت سے آدمی سیر کرنے آتے تھے۔ ان میں
نئی عمر کے لڑکے شیش محل کو دیکھ کر بڑے حیران ہوتے تھے کہ اتنی بڑی
عمارت کس نے بنوائی تھی اور اب اس خستہ حالت میں خالی کیوں
پڑی رہتی ہے۔ لیکن بڑی عمر کے اُدمی جانتے تھے کہ اس کے درودیوار
میں ایک اعلیٰ اور امیر خاندان کی ترقی اور زوال کی داستان
پوشیدہ ہے۔

خان بابا کا معمول تھا کہ وہ علی الصبح اور ہر شام شیش محل
کے صدر دروازے کو قفل لگا کر اپنے کمرے کے سامنے بنے ہوئے کھلے
چبوترے پر بیٹھ جاتا اور سیر کو آنے والے بزرگ آدمی جو اقبال بخت
اور خان بابا کو جانتے تھے خان بابا کو بیٹھا دیکھ کر رُک جاتے اور
اس سے بات کرنا شروع کر دیتے تھے۔ عموماً یہ بات گزرے ہوئے
زمانے اور شیش محل اور اُس کے مالکوں کے بارے میں ہی ہوتی تھی۔
اس چبوترے پر ہر دوپہر اور شام کو اقبال بخت کے گھر میں کام
کرنے والا نوکر اور خانساماں قلن خاں، خان بابا کو اس کی روٹی
دے جاتا تھا۔ قلن خاں خان بابا سے روپے بھی اُدھار مانگتا رہتا
تھا کیوں کہ خان بابا کو روٹی اور کپڑا تو گھر سے ہی مل جاتا تھا اور
تمباکو، بیڑی کا خرچ پچھتّر پیسے روز سے زیادہ کا نہیں تھا۔ جو روپے
تنخواہ میں سے بچ جاتے وہ اپنے ٹوٹے ہوئے ٹرنک کے ایک کونے میں
اپنے پُرانے کپڑوں کی تہوں میں رکھتا جاتا۔ خان بابا کا آگے پیچھے کوئی
نہیں تھا اور اس کی طبیعت میں بھی بڑی رحمدلی تھی قلن خاں گاہ بگاہ
اُس سے پندرہ بیس روپے اُدھار مانگ لیتا اور کبھی واپس کر
دیتا اور کبھی مار لیتا۔

ایک دفعہ قلن خاں کو ساٹھ روپے کی سخت ضرورت پڑ گئی
مگر وہ جانتا تھا کہ اتنے روپے خان بابا اسے کبھی نہیں دے گا۔
اسے ایک ترکیب سوجھی اور اس نے جا کر خان بابا سے کہا کہ
بیدار بخت سخت مصیبت میں ہیں اور انھوں نے تم سے ساٹھ روپے
منگوائے ہیں۔ خان بابا کی آنکھوں میں بیدار بخت کا نام سُنتے ہی آنسو
آگئے۔ اس نے بچپن سے اُس خاندان کا نمک کھایا تھا۔ فوراً
ساٹھ روپے نکال کر قلن خاں کو دے دیے اور رُندھے ہوئے گلے
سے بولا ——

"یہ روپیہ اُن ہی کا ہے۔ مالک آج نوکر سے اُدھار مانگ رہا
ہے" یہ سوچ کر جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ قلن خدا کے قہر سے
ہر بشر کو ڈرنا چاہیے۔ ایک بات اور سُن لے کہ یہ روپے چھوٹے نواب
سے کبھی واپس نہ مانگیو" قلن خاں نے روپے جیب میں رکھ لیے
اور تنک کر بولا ——

"خان بابا سچ پوچھو تو بڑے نواب صاحب کی ضد نے یہ
دن دکھائے ہیں۔ بینی پرشاد کھتری ہوٹل کھولنے کے لیے دو لاکھ
روپے شیش محل کے دے رہا تھا مگر انھوں نے صاف انکار کر دیا۔
کچھ دن ہوئے پھر ایک پارٹی شیش محل کو خریدنے آئی تھی
مگر نواب صاحب ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ بھلا یہ بھی کوئی
عقلمندی ہے۔"

خان بابا قلن خاں کی بات سُن کر بولا ——

"قلن تم نواب صاحب کی بات نہیں سمجھوگے۔ شیش محل کی
اینٹ اینٹ میں ان کی اور ان کے بزرگوں کی محبت اور محنت لگی
ہوئی ہے۔ وہ اس میں مدّتوں اپنے خاندان کے ساتھ شرافت اور
عزّت سے رہے ہیں۔ کیا تم سوچ سکتے ہو کہ پیسے کی خاطر وہ اسے
مجرے اور قوالی کے لیے اور رقص کی محفلوں کے لیے فروخت کر دیں
گے؟ میاں خاندان کی آبرو بھی کوئی شے ہوتی ہے۔ پیسہ تو آنی جانی
چیز ہے۔ نواب صاحب کو میرا سلام کہیو۔ شاید کل آؤں گا۔"

قلن بغیر کچھ جواب دیے چل دیا اور خان بابا چبوترے پر بیٹھ کر
خیالات میں غرق ہو گیا۔

اس کے کوئی ایک ہفتے بعد کی بات ہے، صبح سویرے شیش
محل کا پھاٹک کسی نے بہت زور سے کھٹکھٹایا۔ خان بابا اپنے کمرے
سے باہر نکلا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پانچ چھ آدمی تھے۔ ان میں
لالہ بھیکو رام بھی تھے۔ جنھیں خان بابا اچھی طرح جانتا تھا۔ لالہ بھیکو
رام اس علاقے کی مانی ہوئی ہستی تھے اور اُن کے پاس دولت بھی
کافی تھی۔ خان بابا نے آگے بڑھ کر انھیں سلام کیا۔ لالہ بھیکو رام بولے۔

"خان بابا شیش محل کھول کر ہمیں دکھا دو۔"

"چابیاں تو یہ میرے ہاتھ میں ہی لٹکی ہیں مالک، مگر آپ نے تو شیش محل کا چپہ چپہ دیکھا ہوا ہے۔ شاید آپ اپنے دوستوں کو دکھانا چاہتے ہیں۔"

"خان بابا" لالہ بھیکو رام بولے "شیش محل اب ہمارا ہو گیا ہے اور کل سے اس کی صفائی اور مرمّت وغیرہ شروع ہو جائے گی۔"

خان بابا کے پاؤں تلے کی زمین سرک گئی۔ وہ چند لمحوں تک لالہ بھیکو رام کے چہرے کو تکتا رہا اور اس کے منہ سے صرف یہ نکلا ——

"مگر نواب صاحب کی اجازت؟"

"ہم سب نواب صاحب کے پاس سے ہی آ رہے ہیں۔ انھوں نے ہمیں تمھارے نام یہ رقعہ دیا ہے کہ قفل کھول کر ہمیں شیش محل دکھا دو۔ اور خان بابا تم اپنی نوکری کی فکر نہ کرنا۔ اس پہلی سے تم ہمارے ملازم ہوگے اور تمھیں سو روپے ماہوار تنخواہ ہم سے ملے گی۔"

خان بابا کی آنکھوں تلے اندھیرا سا چھا گیا۔ کیا شیش محل بک گیا تھا؟ کیا نواب صاحب حالات سے اتنے مجبور ہو گئے تھے کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہا تھا؟ لیکن اب کے انھوں نے اس کا ذکر خان بابا سے بھی نہیں کیا تھا! خیر مالکوں کی مرضی، اس میں وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔ اس نے نواب صاحب کا لکھا ہوا رقعہ پڑھا اور اُن کے حکم کی تعمیل میں قفل کھول دیا اور ایک ایک کر کے سب کمرے کھول کر دکھانے لگا۔ مگر اس کے بعد وہ ایک لفظ بھی نہیں بولا۔

یہ لوگ چلے گئے تو قلن خاں آ گیا۔ قلن نے اپنی سائیکل کھڑی ہی کی تھی کہ خان بابا نے شیش محل کے بارے میں دریافت کیا۔ قلن چبوترے پر چڑھ کر بولا ——

"کئی دنوں سے بہت سے لوگ نواب صاحب کے پاس آ رہے تھے۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ نواب صاحب شاید سیاست میں حصہ لینا چاہتے ہیں کیوں کہ دلچسپی تو شروع سے ہی تھی اور پچھلے مہینے سے ایک کی بجائے تین اخبار لینے شروع کر دیے تھے اور ریڈیو کی خبریں جب بھی آتی ہیں ضرور سنتے ہیں۔ اگر باریک لفظوں کا اخبار ہوتا ہے تو منشی عبدالستار کے لڑکے کو بلوا کر پڑھوا[تے] ہیں۔ مگر پھر میں نے سوچا کہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں، نہ جان نہ توانائی، سیاست کی بات نہیں ہو سکتی۔ ایک دو دفعہ آنے والے لوگوں کے لیے چائے اور ناشتہ لے کر گیا تو شیش محل کا تذکرہ کانوں میں پڑا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیش محل بک رہا ہے اور نواب صاحب راضی ہو گئے ہیں۔ آخر کب تک رُکتے۔ ہاتھ اب بہت تنگ ہے۔ چھوٹے نواب کو میں نے یہ خبر سُنائی تو اُن کی باچھیں کھل گئیں۔ نواب صاحب کے دن کے ہیں۔ یہ روپیہ تو آخر ان کے ہی ہاتھ لگنا ہے۔"

خان بابا پہلے ہی اداس اور ملول تھا، قلن خاں کی باتیں سُن کر اور جی خراب ہو گیا۔ اس نے جوتے پہنے، اپنی پگڑی سر پر رکھی اور شیش محل کا پھاٹک اور اپنا کمرہ بند کر کے قلن خاں سے بولا ——

"تمھارے پاس تو سائیکل ہے تم چلو۔ میں پیچھے پیچھے نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں۔"

"تو میں ہی سائیکل پر لے چلتا ہوں۔" قلن خاں بولا۔

"نہ بابا میں نے گر کر اس بڑھاپے میں اپنی ہڈی پسلی نہیں تڑوانی۔ تم چلو۔"

مکان پر پہنچتے ہی خان بابا سیدھا اقبال بخت کے کمرے میں پہنچا۔ اقبال بخت کمرے کے پچھواڑے میں مونڈھا ڈالے اخبار پڑھ رہے تھے۔ خان بابا نے سلام کیا اور گھٹنے پکڑ کر نیچے بیٹھ گیا۔

اقبال بخت بولے ——

"کیوں میاں، کیا بات ہے؟"

"کیا حضور نے شیش محل بیچ ڈالا۔"

"شیش محل میرے جیتے جی نہیں بکے گا۔" اقبال بخت مسکرا کر بولے "میں نے تو شیش محل برائے نام کرایے پر بچّوں کا ایک اسکول قائم کرنے کے لیے دیا ہے۔ اس سے بہتر مصرف شیش محل کا اور کیا ہو سکتا تھا۔ اسکول والے ہی اس کی مرمّت اور سفیدی وغیرہ کروالیں گے۔ نجّو اور شوکت بھی اسی اسکول میں پڑھنے جایا کریں گے۔ جہاں تک تمھارا تعلق ہے تم شیش محل میں ہی اپنے اُسی کمرے میں رہوگے اور بدستور ہمارے ملازم رہوگے۔ ہاں میں نے لالہ بھیکو رام سے طے کر لیا ہے کہ تم اسکول کے چوکیدار کے طور پر بھی

"... ایک ماہرِ آثارِ قدیمہ نے پرانے قلعے کے ایک حصّے کی کھدائی کی تھی۔ کھدائی میں مٹّی کے بھورے منقش پیالے، تانبے سے بنی ہوئی چیزیں مثلاً درانتی، ناخن تراش اور سرمہ لگانے کی سلائیاں وغیرہ نکلی تھیں۔ اس سامان سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ کم سے کم ایک ہزار سال قبل مسیح اس علاقے میں آبادی تھی ..."

دِلّی کے آثارِ قدیمہ

بستی حضرت نظام الدین (غیاث پور)

موجودہ دہلی اور نئی دہلی میں آبادی کس زمانے سے ہے، اس کا ٹھیک تعین تو مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ کچھ شواہد ایسے ضرور ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈیڑھ دو ہزار قبل مسیح یعنی لگ بھگ ساڑھے تین ہزار سال سے اس علاقے میں آبادی ہے۔ راماتن کے ماہرین اور تاریخ ہند کے مورخین کا خیال ہے کہ جب کورو پانڈو کی مشترکہ فرمانروائی میں نفاق اور اختلاف پیدا ہوا تو پانڈووں نے دریائے جمنا کے کنارے شہر اندرپرست[1] کو اپنا پایۂ تخت بنالیا۔[2]

ممکن ہے کہ پانڈووں سے قبل بھی یہاں آبادی رہی ہو اگر ایسا ہے تو ابھی تک اُس آبادی کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔

کننگھم بہت محتاط مورخ اور ماہرِ آثارِ قدیمہ ہے۔ اُس کا کہنا ہے: "اندرپرست کا پہلا راجہ یدھشٹر (پانڈووں کا سب سے بڑا بھائی) کو بتایا جاتا ہے۔ یہ دارالسلطنت پندرہ سو سال قبل مسیح میں قائم ہوا تھا۔ اندرپرست جمنا کے کنارے کوٹلہ فیروز شاہ اور ہمایوں کے مقبرے کے درمیان تھا۔"[3]

اس آبادی کے بارے میں سب سے پہلے غالباً سرسیّد نے آثار الصنادید میں لکھا ہے۔ سرسیّد کے مآخذ سُجان رائے بھنڈاری کی فارسی تاریخ "خلاصۃ التواریخ" "مہابھارت" اور "پوتھی اندرپرست مہاتم" ہیں۔ امکان یہ ہے کہ سرسیّد نے سنسکرت کے کسی ماہر سے مدد لی ہو۔ سرسیّد اندرپرست کے بارے میں لکھتے ہیں: **"پہلے اندرپت اُس میدان کا نام تھا جو پُرانے قلعے اور دریبے کے خونی دروازے کے درمیان میں ہے۔"**[4][5]

تقریباً تیس سال قبل ایک ماہرِ آثارِ قدیمہ بی۔ بی۔ لال نے پُرانے قلعے کے ایک حصّے کی کھدائی کی تھی۔ کھدائی میں مٹّی کے بھورے منقّش پیالے، تانبے سے بنی ہوئی چیزیں مثلاً درانتی، ناخن تراش اور سُرمہ لگانے کی سلائیاں وغیرہ نکلی تھیں۔ اس سامان سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ کم سے کم ایک ہزار سال قبل مسیح اس علاقے میں آبادی تھی۔

زمین کی مختلف سطحوں سے جو آثار نکلے ہیں، اُن سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ دوسری اور تیسری صدی عیسوی تک یہاں آبادی رہی۔ ماہرین کا یہ بھی خیال ہے کہ بیچ میں کئی صدیاں ایسی بھی آئیں، جب یہ علاقہ غیرآباد اور ویران پڑا رہا۔ کئی صدیوں تک متھرا کے حکمرانوں کا بھی اس سرزمین پر قبضہ رہا۔ دوسری صدی عیسوی میں یودھ خاندان اور تیسری صدی عیسوی میں کوشن خاندان کے لوگ اس علاقے پر قابض رہے۔[6] مہابھارت میں بتایا گیا ہے کہ "پانڈووں نے کورووں سے پانچ گاؤں مانگے تھے۔ اندرپرست، باغپت، تل پت، سونی پت اور پانی پت۔

اس روایت کی بنیاد یقیناً مہابھارت ہی پر ہے۔ کیونکہ اس میں پانچ گاؤں کا ذکر ہے، گو چار گاؤں کے نام کچھ اختلاف سے دیے گئے ہیں اور پانچویں کا نام درج نہیں ہے۔ ان پانچوں علاقوں میں کھدائی سے جو آثار ملے ہیں، اُن سے تمدنی یکسانیت اور باہمی روابط کا پتا چلتا ہے۔(۷)

سیّد احمد خاں نے اندر پرست کے پہلے راجا کا نام نمی عرف راجا دشت وان لکھا ہے، جو اسین کرشن کا لڑکا تھا اور جو ۱۲۱۲ قبل مسیح میں ہستناپور میں تخت نشین ہوا تھا۔ سیّد احمد خاں کے قول کے مطابق اندر پرست پر ۲۷۸ سال کے عرصے میں ۳۴ راجاؤں نے حکومت کی تھی۔(۸)

اندر پرست کا جو علاقہ بتایا جاتا ہے، اس سے موجودہ بستی حضرت نظام الدین کا فاصلہ، جس کا پُرانا نام غیاث پور ہے، دو فرلانگ سے زیادہ نہیں ہے، اس لیے ممکن یہ علاقہ بھی اندر پرست میں شامل ہو، تقریباً اسی زمانے میں یعنی پہلی یا دوسری صدی عیسوی میں سکندریہ کے جغرافیہ داں PTOLEMY نے اندر پرست کے پاس DAIDALA نامی ایک شہر کا ذکر کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قنوج کے دہلو نامی ایک راجا نے اندر پرست کے جنوب میں تقریباً دس کلومیٹر کے فاصلے پر قطب اور تغلق آباد کے درمیان میں "دہلو" نام سے ایک شہر آباد کیا۔ مسجد قوۃ الاسلام کے صحن کی لاٹ پر دہلی کا نام دہلو ہی کندہ ہے۔ بعض ایسے شواہد موجود ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ دہلی پر مسلمانوں کے قبضے کے بعد تک بعض لوگ دہلی کو "دہلو" کہتے تھے، جلال الدین خلجی کی مدح میں امیر خسرو نے جو قصیدہ لکھا تھا، اس کا ایک شعر ہے:

بایک اسپم بخش، یاز آخور بفرما بارگیر
یا بفرماں دہ کہ گردوں شبینم و دہلو روم

قنوج کے راجا دہلو کے بارے میں ہماری معلومات نہیں کے برابر ہیں، ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ راجا دہلو کی وجہ سے دہلی کا مرکز آبادی اندر پرست سے جنوب میں دس پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر منتقل ہو گیا۔ سیّد احمد خاں نے لکھا ہے کہ اندر پرست کے راجا سروپ دت کے زمانے میں "شاید۔۔۔ راجا دہلو والیِ قنوج نے دہلو نام سے شہر بسایا۔"(۹)

دہلی کی اس وقت تک کی تاریخ کے بارے میں ماہرینِ آثارِ قدیمہ یا مورخین نے جو کچھ کہا ہے اس کی بنیاد قیاس آرائیوں اور اندازوں پر ہے۔ پہلی تحریری شہادت لوہے کی اس لاٹ سے ملتی ہے، جو مہرولی میں مسجد قوۃ الاسلام کے صحن میں نصب ہے اور جس پر کندہ ہے کہ اننگ پال نے دہلی کو ۱۰۵۳ء میں بسایا۔ اننگ پال تومور خاندان کا راجا تھا۔

نقل آبادی کے منتقل ہونے پر اندر پرست پر تاریکی کے پردے پڑ گئے۔ لیکن یہاں آبادی رہی کیوں کہ مسلم مورخوں کی تاریخوں میں اِس شہر کا ذکر بار بار آیا ہے اور اسے موضع اندر پرست کہا گیا ہے۔

غزنی اور خراسان کے بادشاہ شہاب الدین محمد بن سام غوری نے ۵۸۹ھ مطابق ۱۱۹۳ء میں دہلی پر قبضہ کیا اور اپنے سپہ سالار قطب الدین ایبک کو دہلی کا گورنر بنایا۔ اُس وقت چوہان خاندان کے آخری راجا رائے پتھورا کی دِلّی موجودہ مہرولی میں تھی۔ اور لال کوٹ اُس کا نام تھا قطب کی لاٹ اور مسجد قوۃ الاسلام اسی لال کوٹ میں واقع ہے۔ رائے پتھورا کا قلعہ بھی لال کوٹ ہی میں تھا۔ قطب الدین ایبک نے اسی قلعے میں قیام کیا اور اسی قلعے میں قصر سفید کے نام سے اپنے لیے محل بنایا تھا۔ قطب الدین کے بیٹے آرام شاہ کو چند مہینے ہی حکومت کرنی نصیب ہوئی وہ بھی اسی قلعے میں رہا۔ اس طرح قطب الدین ایبک سے لے کر سلطان ناصر الدین محمود شاہ تک سبھی بادشاہ اسی علاقے میں رہے۔ ناصر الدین محمود نے اپنے لیے ایک محل بنوانا شروع کیا تھا، جس کی تکمیل اُس کے مرنے کے بعد سلطان غیاث الدین بلبن نے کی۔ بلبن پہلا مسلمان بادشاہ ہے جس نے اندر پرست کے پاس کے علاقے پر بھی توجہ کی۔

شاہ جہاں آباد کے دِلّی گیٹ سے چار پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر ہمایوں کے مقبرے اور عرب سرائے (جہاں اب آئی ٹی آئی کی عمارت ہے) کے مغرب میں سڑک پار کر کے ایک بستی ہے، جس کا نام ہے بستی حضرت نظام الدین۔ بستی کا یہ نام سلطان المشائخ محبوبِ الٰہی حضرت نظام الدین اولیاؒ کی وجہ سے پڑا جن کی یہاں درگاہ ہے۔ کچھ سال قبل تک اس درگاہ اور درگاہ کی وجہ سے بستی کو سلطان جی بھی کہتے تھے۔ اس بستی کا پُرانا نام غیاث پور ہے۔ اب تک فارسی کی جو تاریخیں میری نظر سے گزری ہیں، ان میں سب سے پہلے ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں غیاث پور کا ذکر آیا ہے۔ یہ تاریخ ۷۵۸ھ (۱۳۵۶-۱۳۵۷ء) میں اختتام پذیر ہوئی۔ گویا چودھویں صدی عیسوی میں اس آبادی کا نام غیاث پور پڑ چکا تھا۔ کسی بھی معتبر تاریخ میں یہ نہیں بتایا گیا کہ بستی کا نام غیاث پور کس کے نام پر رکھا گیا ہے۔ میں نے ۱۱۹۱ سے ۱۳۵۶ء تک تقریباً ڈیڑھ سو سال کی مسلم تاریخ میں ایسے بادشاہ

شہزادے، امیر یا صوفی کی تلاش کی جس کا نام غیاث ہو اور اس کے نام پر اس بستی کا نام رکھے جانے کا امکان ہو۔ مجھے ایسا نام صرف غیاث الدین بلبن کا ملا، جو ۱۲۶۵ء میں تخت نشیں ہوا تھا۔ اس لیے امکان یہی ہے کہ غیاث الدین بلبن نے یہ شہر آباد کیا ہو۔ سید احمد خاں اور بعض دوسرے مورخین کا کہنا ہے کہ بلبن نے غیاث پور میں کوشک لعل نام سے ایک محل اور مرزغن نام سے ایک قلعہ بنایا تھا۔ بعض مورخین اسے تسلیم نہیں کرتے۔ کار اسٹیفن جیسے ماہرینِ آثارِ قدیمہ کا خیال ہے کہ بلبن نے یہ دونوں عمارتیں رائے پتھورا کے قلعے لال کوٹ میں بنائی تھیں[11]۔ ان تمام امور پر ہم اگلی قسطوں میں بحث کریں گے۔ یہاں تو صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اس آبادی کا نام غالباً غیاث الدین بلبن کے نام پر ہے۔ انیسویں صدی کے شروع میں آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا نے دہلی کے آثارِ قدیمہ پر مکمل رپورٹ تیار کرائی تھی، اُس رپورٹ میں اس آبادی کا نام نظام الدین گاؤں ہے۔ یہ رپورٹ "LIST OF MOHAMMADAN AND HINDU MONUMENTS OF DELHI" کے نام سے ۱۹۱۹ء میں مرتب ہو کر شائع ہوئی تھی۔ ۱۹۲۲ء میں مولوی ظفر حسین نے بھی اپنی کتاب میں اس بستی کا نام نظام الدین گاؤں لکھا ہے[12]۔ اس کا مطلب ہے کہ انیسویں صدی کے اختتام یا بیسویں صدی کے آغاز میں غیاث پور کا نام بستی نظام الدین ہو گیا تھا۔ اور ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۲ء میں اس علاقے کی حیثیت گاؤں کی تھی۔ غیاث پور یعنی بستی حضرت نظام الدین کو غیر معمولی اہمیت حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیا کی وجہ سے ملی۔ مولوی ظفر حسین نے شجرۃ الانوار (۲۸۸ ورق ۲۸۹ اور ۳۲۲) کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت نظام الدین جب پاک ٹپن سے دہلی تشریف لائے تو اُن کے پاس دہلی میں رہنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اُنھوں نے اپنے قیام کے لیے غیاث پور پسند کیا۔ اُنھوں نے جمنا کے کنارے چھپّر کا ایک گھر بنا لیا بعد میں یہ مکان پختہ کر دیا گیا[13]۔ ہمایوں کے مقبرے کے شمال مشرق میں، گُردوارہ دمدمہ سے متصل یہ مکان ابھی تک محفوظ ہے۔ اگرچہ خستہ حالت میں ہے۔ وہ کمرہ بھی محفوظ ہے جسے حضرت نظام الدین لائبریری کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ بہت سے مورخین نے لکھا ہے کہ ہمایوں کا مقبرہ کیلوکھڑی میں بنایا گیا ہے۔ جب کہ سیر الاولیا اور دوسرے مآخذ سے پتا چلتا ہے کہ وہ علاقہ جہاں ہمایوں کا مقبرہ ہے، غیاث پور تھا۔ ممکن ہے کہ یہ وہ حد ہو جہاں غیاث پور اور کیلوکھڑی ملتے ہوں۔

حضرت نظام الدین کی وجہ سے غیاث پور کو بہت زیادہ اہمیت مل گئی۔ بادشاہ امرا اور رؤسا سے لے کر عام لوگ اس علاقے کی زیارت کرنا باعث برکت سمجھتے تھے۔ حضرت نظام الدین کی زندگی میں غیاث پور کی آبادی اور لوگوں کی آمد و رفت بہت بڑھ گئی۔ ضیاء الدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں تین بار غیاث پور کا ذکر کیا ہے۔ غیاث پور، کیلوکھڑی اور اندرپت موضع تھے اور ایک دوسرے سے بہت قریب تھے۔ ایک اور موضع تھا تلوکہ۔ وہ بھی ان آبادیوں سے بہت قریب تھا۔ ضیاء الدین برنی نے سلطان جلال الدین کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: "چنگیز خاں ملعون کا نواسہ الغو، چند مغل امیرانِ ہزارہ و امیرانِ صدہ کے ساتھ سلطان (جلال الدین) سے آ کر مل گیا۔ اس کے سب مغل ساتھی مسلمان ہو گئے۔ سلطان نے الغو خاں کو اپنی دامادی کا شرف بخشا۔ الغو خاں کے ساتھ جو مغل آئے تھے، وہ مع اپنے خاندان والوں کے شہر (دہلی) میں آ گئے۔ سلطان نے اُن کے وظیفے مقرر کیے اور اُن پر نوازش کی۔ ان لوگوں نے کیلوکھڑی، غیاث پور، اندرپت اور تلوکہ کی آبادیوں میں مکانات (سراہا) بنوا لیے اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔"[14]

سلطان علاء الدین خلجی نے بعض سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے شراب نوشی پر سخت پابندی عائد کر دی تھی۔ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے برنی نے لکھا ہے: "اگر کسی کے لیے بغیر شراب کے گزارا ممکن نہ ہوتا تو وہ دس بارہ کوس دور کسی گاؤں میں چلا جاتا اور وہاں پی لیتا، لیکن غیاث پور، اندرپت یا کیلوکھڑی میں یا چار پانچ کوس پر واقع دوسرے قصبات میں جا کر شراب بیچنا یا پینا کسی کے لیے ممکن نہ تھا"

حضرت نظام الدین کے مریدوں اور ارادت مندوں کی تعداد غیر معمولی تھی۔ مرشد کی خدمت میں حاضر ہونے والے مریدوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ برنی نے لکھا ہے کہ: "مخیّر اور مہربانیاں کرنے والے لوگوں نے شہر سے غیاث پور تک متعدد مقامات پر لکڑیوں کے چبوترے بندھوا دیے تھے یا چھپر ڈال دیے تھے اور کنویں کھدوا دیے تھے اور مٹکے اور پانی کے گھڑے اور مٹی کے لوٹے تیار

"آثار الصنادید" کے پہلے اڈیشن مطبوعہ ۱۸۴۷ء میں لال محل کا یہ نقشہ چھاپا گیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ لال محل اُس کوشک لعل کے باقی ماندہ آثار ہیں، جس کی تعمیر سلطان غیاث الدین بلبن نے کی تھی۔

لال محل، موجودہ حالت میں ــــ اس کے تفصیلی حالات اگلی قسط میں پیش کیے جائیں گے۔

...تے تھے اور چھپروں میں بوریے بچھے رہتے تھے۔ ان چبوتروں اور
...روں میں حافظ اور خادم مقرر کر دیے جاتے تھے تاکہ شیخ کے مریدوں
...ر تائبوں کو اور دوسرے نیک لوگوں کو ان کے آستانے پر
...تے اور جاتے وقت وضو کرنے اور وقت پر نماز ادا کرنے میں کوئی
...قت نہ ہو۔"[۱۶]

معزالدین کیقباد کے زمانے میں (۱۲۹۰ء - ۱۲۸۷ء)
...ایست خاں کے خلاف قتل کرنے کی سازش کی گئی، بہ قول یحییٰ
...ن احمد سرہندی" شایست خاں نے اسی وقت اپنے چچا کو .....
...سد بنا کر برن بھیجا اور اپنے تمام افراد قبیلہ کو کہلوا دیا کہ لشکر
...ل سامان تک آن پہنچا ہے اس لیے آپ سب کو چاہیے اپنا
...ل و دولت اور ساز و سامان لے کر راتوں رات (برن سے) نکل
...یں اور دریائے جمنا کے کنارے غیاث پور گھاٹ کے قریب
...سر جائیں"[۱۷]

یہاں غیاث پور گھاٹ سے مراد غالباً بستی نظام الدین ہی
...سرائے کالے خاں کے پاس مقبرۂ خانخاناں کے شمال میں اور
...گاہ حضرت نظام الدین سے دو ڈھائی فرلانگ کے فاصلے پر ایک
...رہ پلہ ہے جسے جہانگیر کے زمانے میں مہربان آغا عرف
...امان المخاطب آغائے آغایان خواجہ سرا نے تعمیر کیا تھا۔ یہ پل
...بھی موجود ہے اور اب بھی اس کے نیچے نالہ بہتا ہے اگرچہ اب
...میں پانی بہت کم ہے اور وہ بھی بہت گندا۔ لیکن نالہ اتنا گہرا
...ر اتنا چوڑا ہے کہ کسی زمانے میں اس میں یقیناً کشتیاں چلتی
...ں گی۔ اور شہر کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے جمنا کا پانی
...ٹ کر اس نالے میں لایا گیا ہوگا۔ اس پل کا ذکر کرتے ہوئے
...رالدین احمد نے لکھا ہے "مسٹر ولیم فنچ WILLIAM FINCH
...جو جنوری ۱۶۱۱ء میں دہلی میں تھا اس نالے پر حضرت نظام الدین
...یا کی درگاہ کے پاس بارہ پلے کا ہونا اور اس نالے کا جمنا کا
...ے پھاٹا ہونا لکھا ہے۔"[۱۸] مرزا مشرف کا مزار درگاہ نظام الدین
...قریب ہی تھا۔ اس کے بارے میں نواب درگاہ قلی خاں لکھتے
...کہ اس شمع روزگار کی قبر معشوق الٰہی کے جوار میں ہے۔ قبر کے
...اطے کے بائیں میں بہت نظر فریب اور کمال دیدہ زیب
...بہتی ہے۔"[۱۹]

ابھی دہلی میں ایسے بزرگ موجود ہیں، جو بستی نظام الدین کے قریب سے گزرنے والی نہر میں تیرتے تھے۔ اخلاق حسین دہلوی کے قول کے مطابق یہ نہر خانخاناں کے مقبرے سے ہوتی ہوئی اُس جگہ سے گزرتی تھی جہاں اب بستی نظام الدین کا تھانہ ہے۔ موصوف کا کہنا ہے کہ یہ وہی نہر تھی، جسے سعادت خاں کی نہر کہا جاتا تھا اور جو دریا گنج سے گزرتی تھی۔ سید احمد خاں کے قول کے مطابق سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی ۱۲۹۱ء میں اس نہر کو سواد پرگنہ خضر آباد میں دریائے جمنا سے کاٹ کر اپنی شکار گاہ سے سفیدوں تک لے گیا۔ کئی بار یہ نہر بند ہوئی اور کھولی گئی۔ شاہ جہاں نے جب قلعہ بنایا تو یہ نہر صاف کرائی اور سفیدوں سے لال قلعے تک نہر جاری کرائی۔ ممکن ہے کہ جمنا مشرق کی طرف کٹ گئی ہو اور پھر سعادت خاں کی نہر کو یہاں سے گزارا گیا ہو۔

(باقی آئندہ)

حواشی

۱۔ فارسی اور اردو تاریخوں میں اس شہر کا نام اندر پرست، اندر پرستھ اور اندر پت تینوں طرح ہے۔ آثار الصنادید میں اندر پرست اور اندر پت دونوں طرح لکھا ہے۔

۲۔ سجان رائے بھنڈاری، خلاصۃ التواریخ، مترجمہ ناظر حسین زیدی، لاہور ۱۹۶۶ء، ص ۵۔

3. CUNNINGHAN, ARCHAEOLOGICAL SURVEY OF INDIA REPORT, VOL I (REPRINT) 1972, VARANASI, P 136.

۴۔ یہ خونی دروازہ چاندنی چوک میں اُس جگہ پر تھا، جہاں سے دریبے کو راستہ جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ نادر شاہ کی فوج نے یہاں زبردست قتل عام کیا تھا، اس لیے اس دروازے کا نام خونی دروازہ پڑ گیا۔ یہ دروازہ بہت خستہ حالت میں تھا، اس کا بڑا حصہ گر چکا تھا، اس لیے ستر اسّی سال پہلے اسے گرا دیا گیا۔

۵۔ سید احمد خاں، آثار الصنادید، دہلی ۱۸۵۴ء، پہلا باب، ص ۲۷۔

"آثار الصنادید" کے پہلے اڈیشن مطبوعہ ۱۸۴۷ء میں لال محل کا یہ نقشہ چھاپا گیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ لال محل اُس کوشک لعل کے باقی ماندہ آثار ہیں، جس کی تعمیر سلطان غیاث الدین بلبن نے کی تھی۔
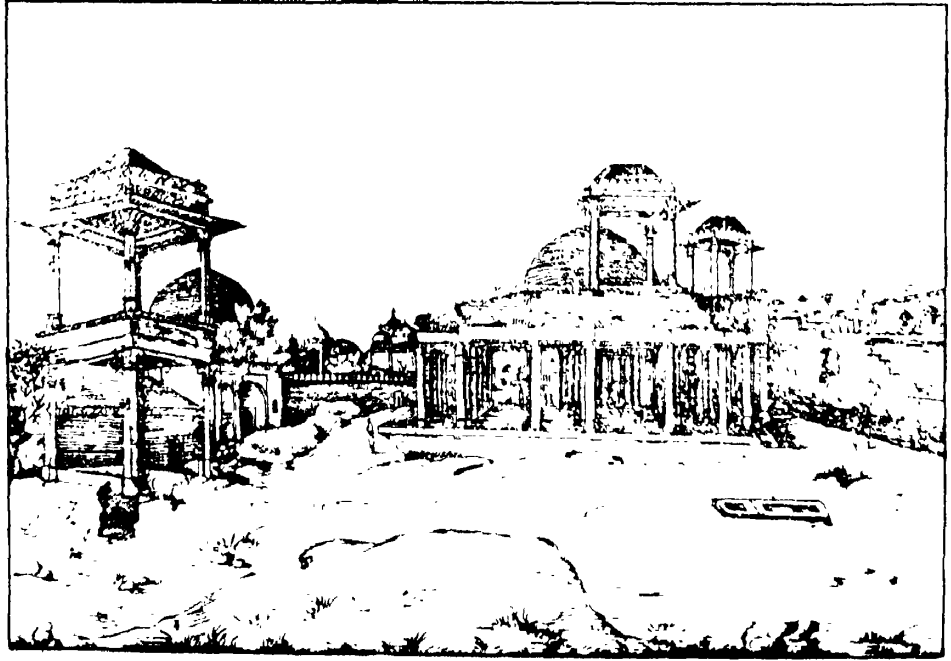
لال محل، موجودہ حالت میں —— اس کے تفصیلی حالات اگلی قسط میں پیش کیے جائیں گے۔

رہتے تھے اور چھپروں میں بوریے بچھے رہتے تھے۔ ان چبوتروں اور چھپروں میں حافظ اور خادم مقرر کر دیے جاتے تھے تاکہ شیخ کے مریدوں اور تائبوں کو اور دوسرے نیک لوگوں کو ان کے آستانے پر آتے اور جاتے وقت وضو کرنے اور وقت پر نماز ادا کرنے میں کوئی دقت نہ ہو۔"[۱۶]

معزالدین کیقباد کے زمانے میں (۱۲۹۰ء-۱۲۸۷ء) شایست خاں کے خلاف قتل کرنے کی سازش کی گئی، بہ قول یحییٰ بن احمد سرہندی "شایست خاں نے اسی وقت اپنے چچا کو...... قاصد بنا کر برن بھیجا اور اپنے تمام افرادِ قبیلہ کو کہلوادیا کہ لشکرِ مغل سامانہ تک آن پہنچا ہے اس لیے آپ سب کو چاہیے اپنا مال و دولت اور ساز و سامان لے کر راتوں رات (برن سے) نکل آئیں اور دریائے جمنا کے کنارے غیاث پور گھاٹ کے قریب ٹھہر جائیں۔"[۱۷]

یہاں غیاث پور گھاٹ سے مراد غالباً بستی نظام الدین ہی ہے۔ سرائے کالے خاں کے پاس مقبرۂ خانخاناں کے شمال میں اور درگاہ حضرت نظام الدین سے دو ڈھائی فرلانگ کے فاصلے پر ایک بارہ پلہ ہے جسے جہانگیر کے زمانے میں مہربان آغا عرف آغامان المخاطب آغائے آغایان خواجہ سرا نے تعمیر کیا تھا۔ یہ پل اب بھی موجود ہے اور اب بھی اس کے نیچے نالہ بہتا ہے اگرچہ اب اس میں پانی بہت کم ہے اور وہ بھی بہت گندا۔ لیکن نالہ اتنا گہرا اور اتنا چوڑا ہے کہ کسی زمانے میں اس میں یقیناً کشتیاں چلتی ہوں گی۔ اور شہر کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے جمنا کا پانی کاٹ کر اس نالے میں لایا گیا ہوگا۔ اس پل کا ذکر کرتے ہوئے بشیرالدین احمد نے لکھا ہے: "مسٹر ولیم فنچ WILLIAM FINCH نے جو جنوری ۱۶۱۱ء میں دہلی میں تھا اس نالے پر حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ کے پاس بارہ پلے کا ہونا اور اس نالے کا جمنا کا ایک پھاٹا ہونا لکھا ہے۔"[۱۸] مرزا مشرف کا مزار درگاہ نظام الدین کے قریب ہی تھا۔ اس کے بارے میں نواب درگاہ قلی خاں لکھتے ہیں کہ اس شمعِ روزگار کی قبر معشوق الٰہی کے جوار میں ہے۔ قبر کے احاطے کے بائیں میں بہت نظر فریب اور کمال دیدہ زیب نہر بہتی ہے۔[۱۹]

ابھی دہلی میں ایسے بزرگ موجود ہیں، جو بستی نظام الدین کے قریب سے گزرنے والی نہر میں تیرتے تھے۔ اخلاق حسین دہلوی کے قول کے مطابق یہ نہر خانخاناں کے مقبرے سے ہوتی ہوئی، اس جگہ سے گزرتی تھی جہاں اب بستی نظام الدین کا تھانہ ہے۔ موصوف کا کہنا ہے کہ یہ وہی نہر تھی، جسے سعادت خاں کی نہر کہا جاتا تھا اور جو دریا گنج سے گزرتی تھی۔ سیّد احمد خاں کے قول کے مطابق سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی ۱۲۹۱ء میں اس نہر کو سواد پرگنہ خضر آباد میں دریائے جمنا سے کاٹ کر اپنی شکار گاہ سے سفیدوں تک لے گیا۔ کئی بار یہ نہر بند ہوئی اور کھولی گئی۔ شاہ جہاں نے جب قلعہ بنایا تو یہ نہر صاف کرائی اور سفیدوں سے لال قلعے تک نہر جاری کرائی۔ ممکن ہے کہ جمنا مشرق کی طرف کٹ گئی ہو اور پھر سعادت خاں کی نہر کو یہاں سے گزار گیا ہو۔

(باقی آئندہ)

حواشی

۱۔ فارسی اور اُردو تاریخوں میں اس شہر کا نام اندرپرست، اندرپرستھ اور اندرپت تینوں طرح ہے۔ آثارالصنادید میں اندرپرست اور اندرپت دونوں طرح لکھا ہے۔

۲۔ سجان رائے بھنڈاری، خلاصۃ التواریخ، مترجمہ ناظر حسین زیدی، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۵۔

3. CUNNINGHAN, ARCHAEOLOGICAL SURVEY OF INDIA REPORT, VOL I (REPRINT) 1972, VARANASI, P.136.

۴۔ یہ خونی دروازہ چاندنی چوک میں اُس جگہ پر تھا، جہاں سے دریبے کو راستہ جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ نادر شاہ کی فوج نے یہاں زبردست قتلِ عام کیا تھا، اس لیے اس دروازے کا نام خونی دروازہ پڑ گیا۔ یہ دروازہ بہت خستہ حالت میں تھا، اس کا بڑا حصّہ گر چکا تھا، اس لیے ستر اسّی سال پہلے اسے گرا دیا گیا۔

۵۔ سیّد احمد خاں، آثارالصنادید، دہلی، ۱۸۵۴ء، پہلا باب، ص ۲۷۔

6. A GHOSH, ED. INDIAN ARCHAEOLOGY 1954 – 55, DEPT. OF ARCHAEOLOGY, NEW DELHI, 1955.

۷۔ خلیق احمد نظامی، اوراقِ مصوّر، دہلی، ۱۹۷۲ء ص ۱۱۔

۸۔ آثار الصنادید، ص ص ۱۲ – ۸۔

۹۔ ایضاً ص ۱۲۔

۱۰۔ مرزا سنگین بیگ لکھتے ہیں: "سلطان غیاث الدین بلبن نے غیاث پور نام سے ایک شہر آباد کیا، یہ شہر اُس جگہ واقع تھا، جہاں حضرت نظام الدین اولیا کا مزار ہے۔" سیر المنازل، مرتّبہ و مُترجمہ سیّد شریف الحسن نقوی، نئی دہلی، ۱۹۸۲ء۔

11. CARR STEPHEN, MONUMENTAL REMEINS OF DEHLI, REPRINT, ALLAHABAD, 1967, PP. 79 – 80.

12. ZAFAR HASAN, A GUIDE TO NIZAM-UDDIN, CALCUTTA, 1922, P. 7.

13. A GUIDE TO NIZAMUDDIN, P. 3.

۱۴۔ ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، مترجمہ معین الحق، لاہور، ۱۹۶۲ء، ص ص ۴۳۴ – ۴۳۳۔

۱۵۔ تاریخ فیروز شاہی، ص ۹۱۴۔

۱۶۔ ایضاً ص ۵۰۱۔

۱۷۔ تاریخ مبارک شاہی، اُردو ترجمہ، ص ۱۲۴۔

۱۸۔ بشیر الدین احمد، واقعاتِ دار الحکومت، حصّہ اوّل، دہلی، ۱۹۱۹ء، ص ۴۔

۱۹۔ درگاہ قلی خاں، مرقع دہلی، مرتّبہ سیّد مظفر حسین، حیدرآباد، ص ۳۱۔

●●

بھونچال

شاہ جہاں آباد میں ایک دفعہ ایسا امن چین (بھونچال) آیا کہ مخلوق ڈر کے مارے تراہ تراہ کرنے لگی۔ طاقوں میں سوائے قرآنوں کے کوئی چیز نہ رہی، سب گر پڑیں۔ اور امن چین کسی طرح رُکنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا، کئی گھنٹے جب برابر در و دیوار لرزتے رہے تو شاہ عبدالعزیز صاحب نے فرمایا: "لوگو! ہم سب اپنے اپنے گناہوں سے سچّے دل سے توبہ کریں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں سے کوئی شخص گناہ پر اڑ گیا ہے۔ اس لیے بھونچال بھی اڑ گیا ہے، اگر وہ شخص اپنی بدی سے باز نہ آئے گا تو شہر غضبِ الٰہی سے اُجڑ جائے گا۔ اور آٹے کے ساتھ گھن کی طرح پس جائے گا۔"

اس بات کو سُن کر لال قلعے کی ایک لونڈی نے کہا، برس دن ہوا کہ ملکۂ زمانی کی ایک ہیکل جواہر کی چوری گئی تھی جس کی تختیوں پر سارا قرآن کُھدا ہوا تھا اور پھر اس کا پتا نہ لگا۔ دراصل وہ ہیکل مجھ بندی نے اُڑائی اور ایک سنڈاس میں دبائی ہے۔ یہ اُسی کی آفت ہے۔ میرے ساتھ دو چار آدمیوں کو بھیجا جائے تو میں نکلوا دوں، جہاں پناہ کے ہونٹ ہلتے ہی بہت سے نوکر اور بادشاہ زادے دوڑے، اُسے کھود کر لائے۔ پہلے اُسے نہر میں پاک کیا، پھر کنویں کے پانی سے، کیوڑے سے، گلاب سے دھویا، طرح طرح کی خوشبو اور عطر میں بسایا، خیر خیرات ہزاروں کی ہوئی، تمام بادشاہ زادیاں ہیکل پر سے قربان ہوئیں۔ بادشاہ سلامت نے اُسے سر پر چڑھایا آنکھوں سے لگایا۔ لونڈی مُردار سے سجدہ کروایا۔ امن چین جاتا رہا۔ ہیکل کے نکلتے ہی وہ بلا دفع ہوگئی تھی۔

—— سید ناصر نذیر فراق (لال قلعے کی ایک جھلک)

غزلیں

شجاع خاور

اس اعتبار سے بے انتہا ضروری ہے
پکارنے کے لیے اِک خدا ضروری ہے

ہزار رنگ میں ممکن ہے درد کا اظہار
ترے فراق میں مرنا ہی کیا ضروری ہے

شعور شہر کے حالات کا نہیں سب کو
بیان شہر کے حالات کا ضروری ہے

کچھ ایسے شعر ہیں یارو جو ہم نہیں کہتے
ہر ایک بات کا اظہار کیا ضروری ہے

شجاع موت سے پہلے ضرور جی لینا
یہ کام بھول نہ جانا ـــ بڑا ضروری ہے

اظہر عنایتی

طلسموں کی صورت پُر اسرار سا
وہ اِک شخص اظہر، مرا یار سا
قبیلے کا سب سے بڑا آدمی
کہانی کا رنگین کردار سا
مصاحب قصیدے سُناتے ہوئے
سجائے ہے گھر میں وہ دربار سا
بڑا خوب صورت سا اِک ہمسفر
گلے میں وہ بانہوں کا اِک ہار سا
وہ اِک پل کسی سے مری گفتگو
بہت دیر تک ذہن بیکار سا
وراثت میں اِک نیم جاں سی زباں
میں خود اپنے فن کا عزادار سا
دل و جاں میں اظہر اُترتا ہوا
وہ بس میر صاحب کے اشعار سا

جانے آیا تھا کیوں مکان سے میں
کیا خریدوں گا اس دُکان سے میں
ہو گیا اپنی ہی انا سے ہلاک
دب گیا اپنی ہی چٹان سے میں
ایک رنگین سی بغاوت پر
کٹ گیا سارے خاندان سے میں
روز باتوں کے تیر چھوڑتا ہوں
اپنے اجداد کی کمان سے میں
اے مرے دوست تھک نہ جاؤں کہیں
تیری آواز کی تکان سے میں
مانگتا ہوں کبھی لرز کے دُع
کبھی لڑتا ہوں آسمان سے میں
ڈرتا رہتا ہوں خود بھی اظہر خا
اپنے اندر کے اس پٹھان سے میں

"... وہ ایک دم بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ چہرہ تو اندھیرے میں دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر سانس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ انتہائی گھبرایا ہوا تھا..."

کہرا

حُسین الحق

پارک کے اندر دُور دُور تک دسمبر کی ٹھنڈی شام اُتر آئی تھی، دیودار اور چیڑ کے درختوں پر کہرا گر رہا تھا، ابھی پانچ بھی نہیں بجے تھے مگر بادلوں کے ٹکڑوں نے سورج کو چھپا لیا تھا اور پورے پارک میں سردیوں میں کھلے ان پانچ کے سوا کوئی نہ تھا، دربان بھی سردی سے بچنے کے لیے پارک کے ایک گوشے میں بنے لائبریری کے دالان میں اپنے پھٹے پُرانے گرم کپڑوں میں لپٹا تھرتھرا رہا تھا ——

"یار — لگتا ہے ناصر ہتھے چڑھ گیا" جنید کے لہجے میں مایوسی کا پرتو تھا۔

"کیا پتہ؟ ہتھے چڑھا یا بلی چڑھا؟" افروز آہستہ سے بولا ——

"تم کو شرم نہیں آتی؟ بلی کہتے ہو؟ شہید کہتے ہوئے زبان دُکھتی ہے؟" اعجاز کے لہجے میں بلا کی کاٹ تھی۔

"کیسی ظالمانہ باتیں کر رہے ہو تم لوگ؟" رؤف جیسے تڑپ اُٹھا "صرف اس لیے کہ وہ یہاں پہنچا نہیں، تم لوگ اُس کی موت کی نوعیت پر بھی باتیں کرنے لگے؟"

جنید، افروز، اعجاز اور رؤف مُسلسل گفتگو میں مصروف تھے۔

شعار احمد خاموش بیٹھا لائبریری کی طرف دیکھے جا رہا تھا ——

"لیکن کیسا بھیانک منظر تھا یار؟" سرفراز شاید سوچ کر سہم گیا تھا۔

"مگر سارا پروگرام سالوں نے کرکرا کر دیا ورنہ آج تو ہم لوگ اسمبلی میں گھس ہی جاتے" اعجاز کے لہجے سے تاسّف جھلک رہا تھا۔

"ہاں اور کیا؟" جنید بولا — "شہید میموریل تک تو ہم لوگ پہنچ ہی گئے تھے، وہاں سے اسمبلی کتنی دُور ہے؟ اگر دس منٹ وہ سب اور ٹھہر جاتے تو سارا مرحلہ طے ہو گیا ہوتا ——"

"یار پتہ نہیں منظور کا کیا ہوا؟" اعجاز کو اچانک یاد آیا۔ "بم کا اسٹاک تو اُسی کے پاس تھا!"

"کیا؟ بم بھی تھا؟" شعار احمد اُچھل پڑا ——

"ہاں مُنّے! بم بھی تھا۔" اعجاز نے بھنچا بھنچا قہقہہ لگایا۔ "تم کیا سمجھ رہے تھے؟ ہم لوگ کیا گڈے گڈی کی شادی کرنے گئے تھے؟"

"مگر یار اس کی ضرورت کیا تھی؟ تم لوگوں نے تو بتایا تھا کہ ہم اپنا احتجاج درج کرانے چلیں گے۔"

"تو یار، احتجاج ہی تو درج ہوا...... اور کیا ہوا!

ڈپارٹمنٹ آف اردو، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا (بہار)

فروز بولا——

"یہ احتجاج تھا؟"

"ہاں پیارے..... یہ احتجاج تھا۔"

"کیا بات کرتے ہو تم لوگ؟" شعار انتہائی جھلاہٹ کا شکار ہو چکا تھا..... "یہ احتجاج تھا؟ حالات کو ہم لوگ کھینچ کر فائرنگ پوائنٹ تک لے آئے اور تم کہہ رہے ہو، یہ احتجاج تھا؟"

"ہاں بھولے راجہ۔ یہاں احتجاج ایسے ہی ہوتا ہے۔"

"تو پھر یار ہنگامے اور احتجاج میں فرق کیا ہے؟"

اس پر سب دوست کچھ دیر چپ رہے...... پھر رؤف بولا——"جانِ من! یہاں تو ہر احتجاج ہنگامہ ہے اور ہر ہنگامہ احتجاج! پھر اس سے پہلے کہ بات کچھ اور آگے بڑھے، اچانک سب کو چپکی لگ گئی، جیسے سب کو سکتہ مار گیا ہو.....

رات آ چکی تھی، جاڑے میں تو سورج ساڑھے پانچ بجتے بجتے ہی غروب ہو جاتا ہے۔ اب تو ساڑھے چھ بج چکے تھے، نزدیک و دُور ہر چہار سمت رات کا ڈیرا تھا اور پارک میں لگے دودھیا بلبوں کی روشنی جھک جھور ٹھنڈی رات میں گرتے کہاسے میں رُل مل کر یوں مند مند دکھائی دے رہی تھی جیسے قمقموں کو بھی نیند آ رہی ہو، اور دُور پارک کے ایک گوشے میں لائبریری کے دالان میں پھٹے پُرانے گرم کپڑوں اور کمبل میں لپٹا دربان اُونگھ اونگھ جا رہا تھا...... اور ان پانچوں کو چپکی لگی ہوئی تھی.....

سب کے سب سامنے پارک کے چاروں طرف پھیلی سڑک کو گھورے جا رہے تھے، جہاں اسمبلی کی طرف سے آتی سڑک پر سے پولیس وینس شہر کی طرف بھاگے —— رہی تھیں ..... سات، آٹھ، نو، دس، گیارہ، بارہ ......" جنید بڑبڑا رہا تھا——

"بارہ گاڑیاں ہیں نا؟" افروز سرگوشیوں میں بولا، شاید اُس نے بھی گنا تھا——

"ہاں"

"یار معاملہ کیا ہے؟"

"تشویش کی بات ہے" اعجاز بولا——" سب کا جماؤ تو نارتھ بلاک سے شہید میموریل تک تھا...... پھر ادھر رُخ کیوں مڑا؟"

"ادھر یہ سب کہاں جا سکتے ہیں؟" جنید نے جیسے خود سے سوال کیا۔ تین محلّے تو اُن کے ہیں اور پارک ہی کے آس پاس ہیں، یہاں سے اتنا اندازہ تو کیا ہی جا سکتا ہے کہ ان تین محلّوں میں کوئی گڑبڑ نہیں ہے...... جنید قیاس کے سہارے کسی فیصلے تک پہنچنا چاہ رہا تھا......" اور باقی محلّے جو اپنے ہیں وہ بھی ان سے متصل ہیں، اگر اُن میں کوئی گڑبڑ ہوتی تو سامنے کے ان تینوں محلّوں میں بھی کچھ نہ کچھ کُنمناہٹ تو محسوس ہوتی ہی۔"

"یار اس کا مطلب یہ ہوا کہ سٹی گڑبڑ ہے؟" رؤف کے لہجے سے گھبراہٹ عیاں تھی...... اُس کا گھر سٹی میں تھا۔ کسی نے کچھ نہیں کہا، سب سامنے کی طرف دیکھ رہے تھے——

"مگر یار! ناصر کا کیا ہوگا؟" شعار احمد بہت دیر کی خموشی کے بعد پھر بولا——

"ہاں یار! ناصر کی بات تو ہم لوگ بھول ہی گئے۔" اعجاز چونکا......" اب تک تو اُس کو آ جانا چاہیے تھا۔"

"تم نے سارا پروگرام اس کو بتا دیا تھا؟" شعار کی پوری توجہ ناصر کی طرف تھی۔

اعجاز نے اس بات کا جواب نہ دیا...... اس بات پر تو سبھی کو چپکی لگ گئی۔

"میں نے پوچھا سارا پروگرام ناصر کو معلوم ہے نا؟" شعار نے پھر سوال کیا۔

"مگر یار...... اب تو انتہا ہو گئی۔" جنید کا انداز شعار کے سوال سے گریز کا تھا...... جنید کی اس بات پر سب نے جنید کی طرف دیکھا——" ہاں یارو...... دیکھئے کیا ہو؟ اب اس سے زیادہ انتہا کیا ہوگی؟ کہ ہمارے خلاف یک طرفہ فیصلہ کر دیا جائے اور جب صدائے احتجاج بُلند کرنے جائیں تو گولیوں کی باڑھ ماری جائے۔"

"مگر احتجاج تو اور جگہوں پر بھی ہوا...... گولی تو

کہیں نہیں چلی۔" جنید کی کوشش کامیاب ہوئی، شعار بھی
اپنا اصل سوال بھول کر جنید سے الجھ گیا۔
"یہ کیا بات ہوئی؟" رؤف نے دخل دیا ..... "اور
جگہ نہیں چلی ..... ارے یہاں تو چلی"۔
"اور کوشش کہاں نہیں کی گئی ہوگی ..... کامیابی نہیں
ملی ہوگی ..... یہاں کامیابی مل گئی، موقع مل گیا .....
شروع ہوگئے۔" جنید نے کہا ____
"مگر یہ سوچنے کی بات ضرور ہے۔" افروز نے کہا ____
"اگر جنید کی بات مان بھی لی جائے تو پھر سوال اُٹھتا ہے کہ
یہاں کامیابی کیوں مل گئی؟"
رؤف، جنید، افروز ایک دوسرے سے اُلجھے ہوئے تھے،
اعجاز سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا ..... اور شعار احمد سر جھکائے
خاموش بیٹھا جانے کیا سوچ رہا تھا ____
"ارے ارے ..... یہ کیا؟" اچانک اعجاز اُچھل کر کھڑا
ہوگیا ..... سب کی نگاہ اعجاز کی نگاہ کے رُخ پر اُٹھی .....
پورب کی سمت بہت دُور پر آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔
"یار یہ ..... یہ ....." رؤف نے شدّتِ جذبات میں اعجاز
کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔"..... یہ شعلے دُوری پر ہیں .....
یہ سارا کچھ سٹی میں ہو رہا ہے۔" ___ "لگتا تو ایسا ہی ہے" اعجاز
اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا ____

سب کے دل میں ہمدردی کی اک لہر اُٹھی، سبھی جانتے
تھے کہ رؤف اپنے محلّے میں تنہا ہے اور اُس کا محلّہ بغل کے محلّے
کی وجہ سے خاصا SENSETIVE ہے، ظاہر ہے ایسی صورتِ
حال میں رؤف کی بے چینی بجا تھی ____
"یار مجھے جانا چاہیے۔"
صورتِ حال ایک ایسے موڑ تک پہنچ چکی تھی کہ اب کوئی
جانے والوں کو رُکنے کا مشورہ دینے کی پوزیشن میں بھی نہیں
تھا ..... سب نے خالی خالی نگاہوں سے رؤف کو تکا ..... رؤف
آگے بڑھا مگر ٹھٹھک گیا ..... ایک گاڑی کچھ اعلان کرتی گذر رہی
تھی ..... سب نے اعلان سُنا اور یوں مبہوت ہوگئے جیسے انھوں
نے شیر کی دھاڑ یا ہاتھی کی چنگھاڑ اپنے بالکل قریب سُن لی ہو۔

"اِس کا مطلب یہ کہ معاملہ بہت سنگین رُخ اختیار کر چکا ہے،"
جنید آہستہ سے بولا ____
"ظاہر ہے، ورنہ عام طور پر تو دفعہ ۱۴۴ اسے کام چلا
لیا جاتا ہے۔" افروز اُس سے بھی زیادہ آہستگی کے ساتھ
بولا ____
اعجاز نے بات کاٹی۔ "کبھی کبھی تو یہ معاملے کو سنگین بنانے
کے لیے بھی ایسا کرتے ہیں"۔
"ایسی پیچیدہ صورتِ حال میں قیاس کے گھوڑے نہیں
دوڑانے چاہئیں"۔ شعار احمد بہت دیر بعد بولا ____
"پروفیسر شعار احمد — آپ اپنا فلسفہ اپنے پاس رکھیں"
اعجاز نے شعار کا مضحکہ اُڑانے کے انداز میں کہا اور شعار احمد
خاموش ہوگیا۔
"مجھے جانا چاہیے۔" رؤف پھر کھڑا ہوگیا۔
"مگر کیسے جاؤگے؟ پاس بھی تو نہیں ہے؛" جنید
نے پُوچھا ____
"بھئی __ مجھے کسی بھی صورت جانا چاہیے۔"
"یہاں سے اگر روانہ بھی ہو جاؤ تو اس کی کیا گارنٹی
ہے کہ تم وہاں پہنچ پاؤگے؟" افروز نے سوال کیا ____
"میرے خیال میں تو ایسا ہو سکنے کا پانچ فی صد بھی امکان
نہیں ہے۔" اعجاز بولا ____
"مگر مجھے جانا چاہیے"۔ رؤف ایک ایک لفظ پر زور دے کر
بولا ___ "میں تم لوگوں کی طرح مشترکہ خاندان کا فرد نہیں ہوں،
بچّے گھر میں تنہا ہیں ....." اتنا کہتے کہتے جیسے اچانک اُسے کچھ
اور یاد آگیا، وہ ایک دم بے چین ہو کر کھڑا ہوگیا، اُس کا سانس
دھونکنی کی طرح چل رہا تھا، چہرہ تو اندھیرے میں دکھائی نہیں
دے رہا تھا مگر سانس کی آواز صاف سُنائی دے رہی تھی
وہ انتہائی گھبرایا ہوا تھا ..... "مجھے کسی بھی حال میں پہنچ
جانا ہے!"
"کیا بات ہے؟ اِس طرح اچانک پریشان کیوں
ہوگئے؟" شعار نے اُس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر
پُوچھا ____

"میں گھر سے چلا تو بیوی مارکٹنگ کے لیے نکل رہی تھی، بچے گھر میں تنہا تھے۔"

"تم دو بجے کے قریب نکلے تھے، اب تک لوٹ نہ سکی ہو گی؟"

"سو تو ہے..... لیکن نہ لوٹی تو؟"

تو اس "تو" کا جواب کس کے پاس تھا؟ اس "تو" کا جواب کس کے پاس ہے؟

"یہاں تو کم از کم ہم محفوظ ہیں۔" اعجاز بولا..... "اس وسیع میدان کے بارے میں کوئی سوچ نہیں سکے گا، اور کسی طرح رات گذار کر صبح کو اپنے اپنے گھروں تک پہنچا جا سکتا ہے..... لیکن یہاں سے نکل کر اگر کسی بھیڑ میں گھرے تب بھی..... جوانوں کے ہتھے چڑھے تب بھی گھر نصیب نہیں ہوگا....."

اعجاز کی اس دلیل پر رؤف نے بوکھلا کر اعجاز کو دیکھا، اس بات کا اُس کے پاس بھی جواب نہ تھا ——

رؤف کھڑا رہا..... چاروں طرف سیاہ اندھیری رات تنی رہی..... پارک کے چاروں طرف پولیس کی گاڑیاں دوڑتی رہیں..... بہت دُور پر آگ کے شعلے اُٹھتے رہے..... اور پارک میں سب دوست چُپ بیٹھے جانے کیا سوچتے رہے۔

"ناصر کو سارا پروگرام معلوم تھا؟" شعار پھر اعجاز کی طرف متوجہ ہوا ——

"یار — وہ پروگرام کا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ....."

اعجاز آدھی بات کہہ کر رُک گیا۔

"ہاں ہاں..... کیا معاملہ ہے پروگرام کا؟" شعار ہمہ تن گوش تھا۔

"جنید! اب تم ہی بتا دو یار..... میرا تو دماغ ہی کام نہیں کر رہا ہے۔"

"یار مجھے بھی کیا پتہ؟ تم نے کہا، چلو..... میں ساتھ ہو لیا" جنید نے اپنی جان چھڑائی۔

"اچھا اچھا..... تم تو بیچ راہ میں ملے تھے..... تمھیں کیا پتہ..... افروز تم بتا دو..... میرا تو اب بولنے کو جی ہی نہیں چاہ رہا ہے۔"

"لو — میں کون سا ابتدا سے انتہا تک کا رفیق ہوں، مجھے تو رؤف نے کھینچ لیا۔"

"اور میرا معاملہ یہ ہے کہ..... جلوس محلے سے گذرا تو رگِ حمیت پھڑک اُٹھی..... پھر جلوس ہی میں تم لوگوں سے ملاقات ہو گئی....."

"جنید، افروز، رؤف اور میں"..... شعار احمد نے بہت اطمینان اور آرام سے کہا — "ہم سب لوگ گویا بیچ راہ میں آن ملنے والے رفیقوں میں ہوئے..... تو اب لے دے کر یار اعجاز"..... شعار اعجاز کی طرف متوجہ ہوا..... "بس تم ہی بچ جاتے ہو۔"

شعار احمد کی اس بات پر سب نے ہنکاری بھری اور اعجاز بہت دیر تک خاموش بیٹھا رہا، پھر بولا — "ہاں میں جلوس کی شروعات ہی سے جلوس کے ساتھ ہوں مگر پروگرام کا تو سچ پوچھو تو مجھے بھی پتہ نہیں..... بس اتنا معلوم ہے کہ منظور کو سب معلوم تھا۔"

"اور منظور کے پاس بم کا اسٹاک تھا۔" شعار ہنسا ——

"مگر شعار احمد! جلوس والوں کی طرف سے تو بم چلا نہیں۔" افروز بولا ——

"بم کی بات اعجاز جانیں..... اُن ہی نے بتائی تھی۔"

"میں نے بھی بم دیکھا نہیں تھا..... بات بات میں منظور بولا تھا کہ آج اگر ہم لوگوں کو روکا گیا تو بم مار دیا جائے گا۔"

"ارے — تو بس اتنی سی بات پر تم نے سمجھ لیا کہ اُس کے پاس بم کا اسٹاک ہے۔" شعار شدید جھلاہٹ کا شکار ہو چکا تھا ——

"یار — ناصر والی بات پھر رہ گئی۔" افروز نے یاد دلایا ——

"مارو سالے کو۔" جنید کو غصہ آ گیا۔ "ہمیشہ تو یہی کرتا ہے، پچھلی مرتبہ کی بات یاد ہے نا؟ جنتر منتر میں جب ہم لوگ راستہ بھول گئے اُس وقت بھی وہ ہم لوگوں کے ساتھ نہیں تھا۔"

"مگر یار! وہ بھی عجب حادثہ تھا۔" افروز کہنے لگا ——

"آج بھی یاد آجاتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں" وہ تو
خدا بھلا کرے ڈاکٹر شرما کا، ورنہ ہم لوگ تین کے بجائے تیس
گھنٹہ بھی چکراتے رہتے تو شاید راستہ نہ ملتا۔"

"اور وہ ..... ناصر ....." جنید کو یاد آیا ..... "اکیلے ہی
گم ہوا اور اکیلے ہی اُس نے راستہ ڈھونڈھ لیا۔"

"ہمیں نجات کے لیے مسیحا چاہیے، وہ اپنی صلیب خود
اُٹھاتا ہے۔" شعار نے سرگوشیوں میں کہا ——

"نہیں یار ..... مل کر سہنے سے دُکھ ہلکا ہو جاتا ہے .....
ایسے لوگ کتنے ہوں گے جو سب کچھ خود ہی سہن کرلیں۔"

"کم ہوتے ہیں مگر ہوتے تو ہیں ..... اور ہر دور میں ہوتے
ہیں۔" افروز بولا —— پھر ذرا رک کر آہستہ سے بُدبُدایا ..... "وہاں
بھی اُس نے یہی کیا ..... ساتھ چلا اور پھر وہاں پہنچ کر آگے
بڑھ گیا۔"

"پتہ نہیں صرف آگے بڑھا یا مشتعل ہونے والوں میں
بھی آگے رہا۔" شعار نے جیسے خود سے پوچھا ——

"غلط الزام لگانا اچھی بات نہیں ..... مشتعل صرف
پولیس والے ہوئے۔" اعجاز نے فوراً کاٹ کی ——

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" افروز نے COUNTER کیا! "تم
تو ہمارے ساتھ سب سے پیچھے تھے۔"

"اور تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ اعجاز کی بات غلط ہے
جب کہ تم خود ہی کہہ رہے ہو کہ تم بھی پیچھے ہی تھے۔" جنید
ہنسا ——

"ہاں ایسے میں دو ٹوک فیصلہ بہت مشکل ہو جاتا ہے۔"
شعار نے بیچ کی راہ نکالی ——

"مگر یار ..... ناصر ——" جنید کو پھر یاد آیا۔

"ناصر ..... ناصر ..... ناصر ....." رؤف بلبلا کر کھڑا
ہو گیا ..... "اُدھر پورا محلہ جل رہا ہے اور تم لوگ بس ایک ناصر
کی فکر میں گم ہو .....؟"

سب چُپ ہو گئے، رؤف سے سب کو ہمدردی تھی مگر
جس صورتِ حال میں وہ گھرے ہوئے تھے، اُس سے چھٹکارا پائے
بغیر کچھ ممکن نہ تھا، اور اُس صورتِ حال سے نکل جانا .....

رؤف سمیت سبھی اِس نقطے پر آکر سوچنے سمجھنے اور کچھ کرنے
کی قوت کھو بیٹھتے ..... رؤف کی اِس بات پر بھی سب
چُپ ہو گئے ..... سب چُپ ہوئے تو مکان نے پھر گھیرا
تنگ کیا ..... دسمبر کی سرد اندھیری رات، کٹکٹاتا جاڑا، جسم
کو برف بناتی سردی، ۸ بجے شب کا عمل، سارے شہر میں کرفیو
..... اور دُور پر اُٹھتے شعلے ..... اور اِس اندھیری رات میں
گم شدہ یار کی فکر ..... اور سامنے دالان میں اُونگھتا دربان

"یار یہاں تو اب جان نکل جائے گی ..... دالان میں کیوں
نہ چلا جائے؟" افروز نے تجویز رکھی ——

"ہاں وہاں تو آگ بھی جل رہی ہے۔" جنید نے حامی
بھری ——

"نہیں ایسی صورتِ حال میں کسی بھی اجنبی کا سامنا
مناسب نہیں۔" شعار نے اختلاف کیا۔

"پہلی مرتبہ ایک اچھی اور صحیح بات تم نے کہی ہے۔"
اعجاز ہنسا —— رؤف اپنے آپ میں گم تھا۔

"پڑوسیوں سے تمھارے تعلقات کیسے ہیں؟" شعار نے
رؤف کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پوچھا ——

"تعلقات کا کیا پوچھتے ہو؟ بہت اچھے تعلقات ہیں مگر
ایسے وقتوں میں تعلقات بے معنی بھی تو ہو جاتے ہیں اور یہ
مانا کہ پڑوسیوں کی طرف سے کوئی بات نہ ہو، سارا محلہ اگر
بدنیت ہو جائے تو؟ اور اگر سارا محلہ ٹھیک رہے مگر باہر سے
بلوائی آجائیں تو محلے والے کیا کرسکیں گے؟؟"

"مگر تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ سب کچھ تمھاری ہی سمت
ہو رہا ہے؟" شعار نے پوچھا ——

"کیوں؟ یہ تم نے کیوں کہا؟" جنید چونکا ——
شاید وہ پہلے ہی سے اِس مسئلے پر کچھ غور کر رہا تھا ——

"اس لیے کہ آگ دُور پر لگی ہوئی ہے اور پھیلی ہوئی ہے
ایسے میں سمت کا اندازہ ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"تمھارے کہنے کا مطلب یہ کہ آگ پورب میں نہیں لگی
ہے۔" جنید قدرے بے چین ہو گیا۔

"ہاں ..... یہ تو شعار صحیح کہہ رہا ہے، آگ کا رُخ تو

قدرے جنوب کی طرف بھی ہے۔" افروز بولا ——
" ارے —— تو جنوب میں تو میرا گھر ہے۔" جنید تڑپ کر
کھڑا ہو گیا۔
" نہیں —— میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں۔" شعار نے بات
سنبھالنی چاہی مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔
اب رؤف اور جنید دونوں کے دلوں میں شک نے گھر
پکڑا کہ آگ اُن کی سمت میں لگی ہے ——
دونوں مخمصے میں گرفتار ہوئے اور ناصر کے سلسلے میں سبھی
مخمصے میں گھرے ہوئے تھے کہ" آخر ابھی تک وہ آیا کیوں نہیں؟"
" یار —— ناصر کے معاملے میں ہم لوگ ابھی تک سنجیدہ نہیں
ہیں۔" افروز کو پھر ناصر یاد آیا۔
" کیا مطلب؟" اعجاز چونکا ——
" مطلب یہ کہ ......" افروز نے کہنا شروع کیا" ہم ناصر
کے بارے میں تشویش میں مبتلا ضرور ہیں مگر اس بات پر ہم
نے اب تک غور نہیں کیا ہے کہ آیا ناصر واقعی کسی مصیبت میں
گرفتار ہوا یا وہ کسی اور سمت نکل گیا۔"
" اب تم نے یہ ایک نیا پہلو پیدا کیا؟" اعجاز جھلا
گیا ....." ارے اتنی بات تو صاف ہے کہ ناصر آگے بڑھ گیا
تھا' اور آگے والے اسمبلی تک پہنچ کر میمورنڈم خود وزیر اعلیٰ
کے حوالے کرنا چاہ رہے تھے' یہ بھی طے ہے' پولیس اپنی ضد پر
اڑی رہی اور مظاہرین اپنی بات پر مصر رہے' یہ بھی آنکھوں
دیکھی بات ہے' جب پولیس مظاہرین سے اپنی بات نہ منوا
سکی تو اُس نے پہلے آنسو گیس چھوڑا اور پھر گولی چلادی' اس
کی گواہی بھی یہاں موجود ہر شخص دے سکتا ہے ..... پیچھے
والے بھاگے ..... مگر آگے والوں کو بھاگنے کا بھی موقع کہاں
ملا؟ ..... اور ناصر آگے تھا ..... پھر وہ کسی اور سمت کیسے
نکل سکا ہوگا —— ؟؟"
" مگر ناصر کہاں سے ہم لوگوں سے الگ ہوا؟" شعار
نے پوچھا ——
" ایں ..... یہ کیا بات ہوئی؟" اعجاز چونکا ——
افروز بولا —— " جلوس جہاں سے شروع ہوا وہاں سے
تم ساتھ تھے' پھر راہ میں جنید' رؤف' شعار اور میں' سبھی
ساتھ ہوئے' مگر وہ کہاں سے ساتھ ہوا! یہ کسے یاد ہے؟"
" ہاں بھائی افروز۔" جنید نے حامی بھری ......" یہ
بات تم نے صحیح کہی' مجھے بھی یاد بس اتنا ہے کہ شہید میموریل
کے پاس جہاں مقررین نے تقریریں کی تھیں اور جہاں پولیس
والے ہمیں روکنے کی کوشش کر رہے تھے' وہاں ناصر بار بار
نعرے لگا رہا تھا ....."
" مگر اُس سے پہلے وہ کہاں کہاں ہمارے ساتھ تھا؟"
شعار نے پھر سوال کیا ——
سب چپ رہے .... کسی کو اُس سے پہلے کی رفاقت
کا کوئی منظر یاد ہی نہیں آ رہا تھا۔
" شعار یار ..... تو نے بڑی مصیبت میں ڈال دیا۔"
جنید کہنے لگا ——
" کیسی مصیبت؟"
" یار ..... وہ جو اُچھل اُچھل کر نعرے لگا رہا تھا .....
وہ ناصر ہی تھا؟؟"
" ارے ارے ..... اب یہ کیا فساد تیرے ذہن میں آیا
مُسٹنڈے؟" اعجاز بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔
شعار ہنسا ..... افروز مسکرایا ..... جنید نے سر ہلایا
..... اور اعجاز ناچ ناچ گیا۔
" یہ سوال کیوں اُٹھا کہ وہ ناصر نہیں تھا۔" اعجاز کا
لہجہ اب بہت تیکھا ہو گیا تھا۔
" اس لیے کہ یہاں سبھی اِس بات پر متفق ہیں کہ
ناصر آگے بڑھ چکا تھا ..... تو پھر نعرہ لگانے والا کون تھا؟"
افروز نے کہا ——
" جنید کا کہنا ہے کہ وہ ہمارے پاس نعرے لگا رہا تھا
تو پھر آگے بڑھ جانے والا کون تھا؟" شعار احمد نے
پوچھا ——
" نعرے لگانے والا بھی ناصر نہیں' آگے بڑھنے والا بھی
ناصر نہیں تو ناصر کون تھا؟" اعجاز دانت کچکچا کر چیخا ——
" یہ تو تم ہی بتا سکتے ہو اعجاز صاحب!" افروز نے

بڑے تیکھے لہجے میں کہا..... "کیوں کہ وہ تم ہی تھے جو ہمیں اشارہ کرکرکے یہ بتا رہا تھا کہ وہ..... اپنا یار ناصر..... نعرے لگا رہا ہے..... وہ آگے بڑھ رہا ہے..... سنو سنو! پولیس سے بحث کر رہا ہے....."

"اور تم سب کی کوئی یاری ناصر سے نہیں تھی؟؟"

"مگر وہ ناصر ہمیں ملا کہاں جانی؟؟؟" رؤف نے جھنجھلا کر کہا ——

"بس اب تو خدا ہی حافظ ہے"..... شعار احمد نے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا..... "دسمبر کی کٹکٹاتی سردیاں، ہم کھلے میدان میں، مگر قریب کے دالان میں جا نہیں سکتے..... چاروں طرف کرفیو برا جمان، سو ہم یہاں سے نکل نہیں سکتے..... شہر میں گڑبڑ، آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں، مگر یہ کہنا مشکل کہ آگ کس طرف لگی ہے..... ناصر کا انتظار..... مگر اس کا پتہ نہیں کہ یہ ناصر کون ہے؟ اور اس کا ہمیں انتظار کیوں ہے؟؟"

سب نے شعار احمد کی بات سنی اور کچھ نہ کچھ کہنے کے لیے بے تاب ہوئے مگر کہہ نہ سکے ——

اعجاز اندر اندر تلملا رہا تھا مگر پتہ نہیں کس بات پر تلملا رہا تھا —— ؟؟"

●●

اُردو اکادمی، دہلی

بچّوں کا رسالہ بھی شائع کرے گی

"ایوانِ اُردو دھلی" کی اشاعت اور مقبولیت کے بعد اب اُردو اکادمی، دہلی نے اُردو پڑھنے والے بچّوں کے لیے بھی ماہانہ رسالہ نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اُردو اکادمی کے چیرمین، لیفٹننٹ گورنر دہلی جناب ایچ۔ ایل۔ کپور کی منظوری سے رسالے کا ڈیکلریشن فارم داخل کر دیا گیا ہے اور رسالے کی ترتیب کا کام شروع ہو گیا ہے۔

اس رسالے کا مقصد بچّوں میں تعلیمی لگن پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں نئی سماجی اور سائنسی سچائیوں سے باخبر کرنا اور ان کی دل چسپی کا لحاظ رکھتے ہوئے ایسی صاف ستھری تحریروں کی فراہمی اور پیش کش ہے جو اُن کی کردار سازی اور انھیں اچھّا شہری بنانے میں معاون ہوں —— اہلِ قلم حضرات سے گزارش ہے کہ وہ اس مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی نثری اور شعری نگارشات ہمیں ارسال کریں۔ تصویریں اور کارٹون بھی ارسال کیے جا سکتے ہیں۔

شائع ہونے والی چیزوں پر اُردو اکادمی کے ضابطوں کے مطابق معاوضہ پیش کیا جائے گا۔

ایجنٹ حضرات اپنے آرڈر جلد از جلد بھجوائیں۔ شرائطِ ایجنسی وھی ھیں جو "ایوانِ اُردو دھلی" کی ھیں

سیکریٹری اُردو اکادمی، دہلی —— گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

نظمیں

ڈاکٹر اختر بستوی

● ...ئے کو مری عمر قدم اپنے بڑھائے
...لمحہ مگر مجھ کو یہ محسوس کرائے
...پھر لوٹ رہی ہیں مری راہیں اُسی جانب
...ہوئے تھے جدھر سے مرے آغاز کے سائے
موٹر میں سفر کرتے ہوئے جیسے کوئی شخص
یوں سمجھے کہ پیچھے کو سڑک بھاگتی جائے

● ...آکھ شاداب ہو آباد ہو دُنیا کا چمن
دل کی قسمت میں ہے تنہائی کے کانٹے کی چبھن
بے سہارا یہ ہمیشہ سے رہا ہے یارو
اس نے ہر درد اکیلے ہی سہا ہے یارو
صرف اِک راز جو سینے میں چھپا بیٹھا ہے
دوست بن کر اسے تسکین دیا کرتا ہے
سوچتا ہوں کہ میں وہ راز بھی افشا کردوں
دل کو اب دہر میں بالکل ہی اکیلا کردوں

ڈپارٹمنٹ آف اردو، یونیورسٹی آف گورکھپور، گورکھپور

جینت پرمار

دُور.....
گھنے جنگل سے دُور
اُونچے
نیچے پربت کے اُس پار
کالے کالے بادلوں
جگمگ چاند ستاروں سے بھی دُور
سات آسمانوں کے اُوپر
اپنی نازک انگلی تھما کے
خواب ہمیں لے جاتے ہیں
وہاں سے جانے کیوں پھر ہم
واپس لوٹ نہیں سکتے ہیں

300/4 اقبال فیلیا، مسرکیواڑ، شاہ پور، احمد آباد 380001

"... یوں تو آم کم و بیش سرزمینِ ہند کے ہر حصّے میں پیدا ہوتا ہے لیکن بعض ریاستیں اور ان ریاستوں کے بعض شہر و قصبات آم کی فراوانی اور عمدگی کے لیے مشہور ہیں..."

مرغوبِ خاص و عام ــ آم

محمد رضی الدّین معظّم

جس طرح مدینہ منوّرہ اور بصرہ اپنی کھجوروں، طائف اور دمشق اپنے انگور، انجیر، انار، اصفہان اور طہران اپنے خربورے پر فخر و ناز کر سکتے ہیں اُسی طرح ہندوستان کے اکثر و بیشتر شہروں کو آم پر فخر و ناز کرنے کا حق حاصل ہے۔ اگرچہ آم برما، سری لنکا، یمن، عمان، بحرِ ہند کے بعض جزائر، مصر اور سوڈان میں بھی پایا جاتا ہے، مگر جو رنگ و بُو اور ذائقہ ہندوستان کی آب و ہوا سے پیدا ہوتا ہے، وہ بے مثال ہے۔ امریکہ کے بعض حصّوں میں بھی آم کی کاشت ہوتی ہے۔ اور عمدہ قسم کے آم پیدا کرنے کی مُسلسل جد و جہد جاری ہے۔

آم کی قدامت اور اس کا ہندوستان سے متعلّق ہونا اس سے ظاہر ہے کہ وہ ہندوستان کے قدیم شاستروں اور طبّی کتابوں میں مختلف ناموں سے موسوم ہے۔ اس کا پھل "دیوتاؤں" کا "بھوگ" یعنی ان کی مرغوب غذا سمجھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنگال کے بعض آم خاص خاص دیوتاؤں کے بھوگ سے منسوب ہیں۔ جیسے کہ بنگال کے مشہور آم کشن بھوگ یا موہن بھوگ یا گپت بھوگ وغیرہ وغیرہ۔ مُسلم بادشاہوں اور امرا نے اس پھل کی ترقی اور عمدگی کے لیے جو کچھ کیا اگر وہ بالتفصیل بیان کیا جائے تو ایک کتاب درکار ہے۔

ہندوستان میں عام طور پر جو مُسلمان آکر آباد ہوئے وہ ایسے ممالک کے رہنے والے تھے جہاں عمدہ عمدہ اور نفیس نفیس میووں کی اس درجہ فراوانی تھی کہ خود کھاتے اور اپنے جانوروں کو بھی کھلاتے تھے۔ ہندوستان میں آکر اُنھیں سوائے آم کے کوئی دوسرا قابلِ توجّہ پھل نظر نہ آیا اس لیے اپنی تمام تر توجّہ اسی کی طرف مبذول کر لی۔ ہزاروں باغ لگوا دیے اور سب سے بڑی چیز جو وہ اپنے ساتھ لائے وہ پیوند یا قلم (GRAFTING) کا طریقہ تھا جس نے آم کی دُنیا میں ایک انقلابِ عظیم بپا کر دیا، اور اچھے قسم کے آموں کی کاشت میں بیحد آسانیاں پیدا ہوگئیں۔

آم کو بعض لحاظ سے دُنیا کے تمام معلومہ پھلوں پر ایک گونہ امتیاز حاصل ہے۔ انگور، کھجور، سیب میں بھی مختلف اقسام اور ذائقے ہوتے ہیں مگر آم کی مختلف اقسام ان کی شکل و صورت، رنگ و رُوپ، بو باس، مزے اور ذائقہ میں جو نمایاں فرق پایا جاتا ہے وہ کسی پھل کو نصیب نہیں اور نہ اس کی اتنی قسمیں ہو سکتی ہیں جتنی آم کی گنائی جاتی ہیں۔ کیونکہ ہر تخمی درخت کا پھل دوسرے تخمی درخت کے پھل سے مختلف ہوتا ہے۔ ہندوستان میں کروڑوں کی تعداد میں تخمی درخت اب بھی موجود ہیں (اگرچہ ان کا بڑا حصّہ کٹ گیا اور کٹ رہا ہے) اس لیے اس کے اقسام کو بے شمار تصوّر کرنا چاہیے۔ آم وزن میں پانچ گرام سے لے کر پانچ کلو گرام تک پہنچتا ہے۔ شکل و صورت میں لمبے، گول، چپٹے، خمدار، نوکدار،

[illegible] رحیم منزل، شاہ گنج، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲ [illegible]

ناشپاتی، سیب اور آلو کی وضع قطع کے ملیں گے۔ رنگ و بو میں سبز، سرخ، زرد، سیندوریہ، گلابی، بینگنی، کاسنی، دھانی، عنابی، دودھیا۔ بعض میں گلاب بعض میں کیوڑہ، لیمو، سنترہ، زعفران، مشک وغیرہ کی مہک محسوس ہوگی جس طرح اس پھل کی صورت اور بوباس میں فرق ہوتا ہے اسی طرح اس کا ذائقہ بھی مختلف ہوتا ہے۔ بہت شیریں، ہلکا میٹھا، میخوش، کھٹ میٹھا، ترش وغیرہ وغیرہ۔ علاوہ اس کے بے شمار مختلف مرکبات اور مصنوعات اس پھل سے بن سکتے ہیں شاید ہی کسی اور پھل سے تیار ہوسکتے ہوں۔ جس زمانہ میں ریفریجریٹرس کا رواج نہ تھا آم کے شائقین اخیر فصل کے آموں کو وقت پر توڑ کر ریت کے ڈھیروں میں کسی تہہ خانے یا سرد مقام میں دفن کر دیتے تھے اور آموں کی فصل گذر جانے پر حسب ضرورت ان کو نکالتے اور استعمال کرتے تھے مگر آم کا مزہ آم کی فصل کے ساتھ ہی ہے۔ مصنوعی طریقہ سے اگے ہوئے یا ریفریجریٹرس میں محفوظ شدہ آم حقیقی مزہ کھو دیتے ہیں۔

ہندوستان میں آم کی فصل کا آغاز عین موسم بہار میں ہوتا ہے۔ جاڑوں کے ختم ہونے ہی آم کے درخت تین چار ماہ کی میٹھی نیند لے کر جاگ اٹھتے اور پھول دینے لگتے ہیں۔ ملک کے جن حصوں میں یہ پھل عین برسات میں تیار ہوتا ہے وہاں کے زندہ دل اس سے بڑا ہی لطف اُٹھاتے ہیں۔ باغات میں دعوتیں، ضیافتیں، جلسے، جھگڑے ہوتے ہیں۔ جھولے پڑتے ہیں۔ نو بیاہی جوڑوں کے لیے آم کا تحفہ سسرال کی جانب سے عطیۂ اکرم کے مصداق ہوتا ہے۔

تقریباً نصف صدی قبل تک زیادہ تر رواج صرف تخمی آموں کا تھا۔ آم کے پھل کو پیوندی یا قلمی کہنا لاعلمی پر مبنی ہے۔ البتہ آم کے درختوں کو تخمی یا پیوندی زمرے میں رکھنا درست ہے۔ بعض آم ایسے ہوتے ہیں جن کو ہم تخمی درخت کی ایک شاخ یا آنکھ لے کر الگ تیار کر لیتے ہیں اور یہی پیوندی یا قلمی درخت کہلاتے ہیں۔ اور انھیں کے پھل عام محاورے میں پیوندی یا قلمی کہلاتے ہیں۔

فرض کیجیے آپ کو آموں کا بے حد شوق ہے آپ کسی کے باغ میں گئے اور اُس نے ایک درخت کے آم آپ کو کھلائے۔ آپ کو وہ آم بے حد پسند آئے اور یہ خواہش ہوئی کہ وہ درخت آپ کے باغ میں بھی پھلے پھولے۔ جس درخت کو آپ اپنے باغ میں بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس درخت سے "دابہ" لیجیے۔ یعنی اس کی ایک تازی اور نرم ڈالی کسی قدر چھیل کر عمدہ مٹی سے بھرے گملے میں دبا دیجیے۔ اور اس کو حسب ضرورت پانی دیتے رہیے۔ ایک وقفہ کے بعد اس شاخ میں جڑیں پیدا ہو جائیں گی جب جڑیں اچھی طرح جگہ کو پکڑ لیں اور مضبوط ہو جائیں تو اس شاخ کو اصل درخت سے جدا کر لیجیے۔

اس عمل کو انگریزی میں LAYERING کہتے ہیں۔ ایک اور طریقہ یہ ہے کہ اصل درخت کی آنکھ یعنی تازہ "انکھوا" نہایت احتیاط سے جدا کر کے آم کے ایک پودے کی پوست میں اس طرح داخل کیجیے کہ جس طرح گلاب کے پودے میں داخل کیا جاتا ہے اور اس پر نرم ڈورا لپیٹ دیجیے۔ چند دنوں میں یہ انکھوا بڑھتے بڑھتے شاخ بن جائے گی۔ اس کو قائم رکھیے اور اس پودے کی دوسری شاخوں کو کاٹتے رہیے۔ اسے انگریزی میں BUDDING کہتے ہیں۔ ان دونوں طریقوں میں پہلا طریقہ اگرچہ آسان ہے لیکن درخت کی تیاری کے لیے ایک طویل مدت درکار ہوتی ہے۔ جب کہ دوسرے طریقے میں نہایت ہوشیاری اور احتیاط کی سخت ضرورت ہے۔ ایک اور آسان طریقہ پیوند کاری یا قلم کاری کا ہے۔ جس کو انگریزی میں GRAFTING کہا جاتا ہے اس کا طریقہ یہ ہے کہ آم کا ایک چھوٹا سا پودا جو گملے میں لگا ہوا ہے اسے اس درخت کے پاس لے جا کر جس سے قلم لینا مقصود ہے رکھیے اور اصل درخت کی ایک شاخ اور گملے کے پودے کے تنے کو تھوڑا سا چھیل کر دونوں کو ملا کر مضبوطی کے ساتھ باندھ دیجیے۔ اور اس پر پلاسٹک لپیٹ دیجیے۔ تاکہ جوڑوں میں ہوا اور پانی داخل نہ ہونے پائے۔ چند ہی روز میں یہ دو پودوں کے جسم ایک دوسرے میں پیوست ہو جائیں گے۔ اب اسے اصل درخت سے جُدا کر لیجیے۔

ان تینوں طریقوں میں جو بھی طریقہ مناسب سمجھیں اپنا کر پودے کو آپ اپنے باغ میں لگا سکتے ہیں اور یہ اسی قسم کے پھل دے گا جیسے اصل درخت میں لگتے ہیں۔ البتہ اگر آپ اسے کسی دوسری آب و ہوا میں لے جا کر لگائیں گے تو ممکن ہے کہ پھلوں کے ذائقے میں فرق آجائے۔ موافق آب و ہوا میں اصل سے ترقی اور مخالف آب و ہوا میں اصل سے تنزل کا امکان غالب رہتا ہے۔ یہ خیال کرنا غلطی ہے کہ پیوند یا قلم کے ذریعے سے نئے نئے آم پیدا ہوتے ہیں۔ یہ شرف فطرت نے صرف گٹھلی ہی کو دیا ہے۔ اور اسی سے مختلف قسم کے آم پیدا ہوتے ہیں۔ بنارس میں امپیریل بنک کے

احاطے میں (جو بمبئی میں بینک آف بنگال کے نام سے موسوم تھا)
تقریباً پچاس سال قبل اتفاقاً ایک درخت نکل آیا تھا جس کے
پھل نہایت نفیس اور خوش ذائقہ ثابت ہوئے۔ اور درختوں سے
ممیز کرنے کے لیے اسے "لنگڑا" کہنے لگے۔ اب سارے ملک میں بنارسی
لنگڑے کے جتنے قلمی درخت ہیں وہ سب اسی کی اولاد در اولاد ہیں۔
بہار میں پہنچ کر اس آم نے لطف وذائقہ میں اور ترقی کی۔ پٹنہ میں
حاجی پور کا مقام لنگڑا آم کے لیے ممتاز ہے۔

یوں تو آم کم وبیش سرزمین ہند کے ہر حصے میں پیدا ہوتا
ہے لیکن بعض ریاستیں اور ان ریاستوں کے بعض شہر وقصبات آم
کی فراوانی اور عمدگی کے لیے ممتاز ہیں۔ بنگال میں کلکتہ، مالدہ، مُرشدآباد،
بہار میں پٹنہ، دربھنگہ، اترپردیش میں لکھنؤ، ملیح آباد، شاہ جہاں پور،
سہارنپور وغیرہ جنوبی ہند میں مہاراشٹر کے بعض اضلاع نوجہر،
رتناگری، کرناٹک، میسور اور آندھرا پردیش میں حیدرآباد کے
علاوہ بیلم پلی، وقارآباد، وجے واڑہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان مقامات پر
رائج اور معروف آم یہ ہیں۔ شمالی ہند میں بمبئی، آج تک معلوم نہ
ہوسکا کہ اس کا نام بمبئی کیوں پڑا حالانکہ نہ یہ قسم بمبئی میں ہوتی ہے
اور نہ پسند کی جاتی ہے۔ لنگڑا، دوپہرہ، دسہری، کشن بھوگ،
ثمر بہشت، تیموریہ، فجری، کھجری شامل ہیں۔ جنوبی ہند کے مشہور آم
یہ ہیں: الفن، گوا (پاپڑی) بے نشان، جہانگیری، حمایت پسند،
مُرشدآبادی، اعظم الثمر، فخرالثمر، طوطاپری، ملغوبہ وغیرہ۔

ہندوستان کی آزادی سے کچھ قبل بمبئی میں سرکاری طور پر
عظیم الشان پیمانے پر آم کی نمائش کا اہتمام ہوا تھا جس میں سارے
ہندوستان کے سرکاری باغات کے مہتمم صاحبان کو مدعو کیا گیا تھا اور
ان سے خواہش کی گئی تھی کہ اپنے اپنے مقامات کے آم ساتھ لائیں۔
نمائش کی معائنہ کمیٹی تمام آموں کو جانچنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ
جنوبی ہند کا آم الفن (ہاپس یا قادر پسند) تمام آموں کا بادشاہ
ہے۔ مگر خان بہادر شمس العلما مولانا امداد امام اثر مرحوم جو آم کے
متعلق عملی تجربہ رکھتے تھے اپنی ایک تصنیف "کتاب الاثمار" میں
"اصیل فجری" کو ہندوستان کے تمام آموں کا سرتاج قرار دیتے ہیں۔
نمائش کمیٹی کے ججوں اور مولانا امداد امام اثر مرحوم کی رائے بجائے
خود درست ہے صرف نقطۂ نظر کا فرق ہے۔ نمائش کمیٹی کے پیشِ نظر
تجارتی مقاصد بھی تھے۔ ہندوستان کے آموں میں الفن ہی ایسا
آم ہے جو کئی خوبیوں کے ساتھ بہ آسانی برآمد بھی کیا جاسکتا ہے،
اور زیادہ عرصے تک خراب ہونے سے محفوظ رہتا ہے۔ مولانا نے صرف
ذائقہ لطافت ونفاست اور اس وقت تک قائم رہنے کا خیال کیا
ہے جب کہ تمام آموں کی بہار ختم ہوجاتی ہے اور "میدان انبہ" میں
صرف یہی فتح ونصرت کا امتیاز حاصل کرتا ہے۔

حیدرآبادی آموں کا ذکر کیا جائے تو آصف جاہی دور کے
رؤسا مقرب جنگ اور اعظم علی خاں فرنگی کا نام نہ لینا ناشکری ہے
کیوں کہ ان دونوں صاحبان نے مختلف اقسام کے آم کے درخت
فراہم کرنے اور ان کی بہتر سے بہتر پرورش اور پرداخت میں
کسی قسم کی کسر نہ اٹھا رکھی جس کے نتیجے میں حیدرآباد میں عمدہ
سے عمدہ قسم کے آم پیدا ہونے لگے۔ مقرب جنگ کے لگائے ہوئے
دو باغ سردار باغ اور خداداد باغ اپنے دور کے مخزن کہلاتے تھے۔
اعظم علی خاں کے باغ کے آم ملکہ وکٹوریہ اور والی کابل امیر
عبدالرحمن خاں کے دسترخوان کی زیب وزینت بنا کرتے تھے۔
خان صاحب ہر معاملے میں کفایت شعار واقع ہوئے تھے لیکن آم
کے معاملے میں مقرب جنگ سے دریادلی وفیاضی میں سبقت
لے گئے تھے۔ فصل میں جو بھی ان سے ملاقات کا شرف حاصل کرلیتا
آموں کے پارسل سے محروم نہ رہتا اور جتنی بار ملاقات کرتا اتنی بار
تحفہ ملتا جاتا اور خان صاحب کبھی یہ نہ کہتے کہ آپ کیا صرف آم لینے
کے لیے میرے پاس آتے ہیں؟

بھرپور غذائیت اور صحت بخشی کے لحاظ سے بھی آم کسی پھل
سے پیچھے نہیں ہے۔ عہدِ عتیق سے ہی وید اور حکیم اس کے فوائد سے
خوب واقف تھے۔ طبّی کتابیں آم کی تعریف وتوصیف سے بھری
پڑی ہیں۔ جدید سائنس نے بھی یہ ثابت کردیا ہے کہ آم میں حیاتین
الف وج بکثرت پائی جاتی ہیں جو انسان میں متعدی امراض اور
اسکوڈی (دارالجفر) کی دافع ہیں۔

سائنٹفک تجربات سے ثابت ہوا ہے کہ آم کا چھلکا وٹامن
سی کا اتنا ہی عظیم ذخیرہ ہے جتنا عظیم اس کا گودا۔ آم کے
چھلکوں کو دودھ میں پیس کر اور شہد میں ملا کر کھانا خونی پیچش
میں مفید ہے کچے آم کا چھلکا دہی میں پیس کر شیرہ بنا لیجیے تو

ہیضہ، قے اور دست کی دوا ہے۔ کچے آم بھلبھلا کر تھوڑا بھنا ہوا زیرہ، نمک اور سیاہ مرچ پسی ہوئی ڈال کر شروب بنائیں اور صبح نہار مُنہ پی لیں تو لُو کا اثر نہیں ہوتا اور سارا دن طبیعت تروتازہ رہتی ہے۔ کھٹّا آم مُضر صحت ہے۔ نزلہ اور زکام پیدا کرتا ہے۔ گلے اور دانتوں کو نقصان پہنچاتا ہے اور خرابیِ خون کا باعث بنتا ہے۔ قلمی آم ثقیل اور دیر ہضم ہوتا ہے۔ پختہ شیریں اور بغیر ریشے والا آم مفید ہوتا ہے۔ جدید تحقیقات کی روشنی میں آم دوسرے تمام پھلوں کے مقابلے میں بہت زیادہ غذائیت بخش پھل ہے جس میں حیاتین ج چارسنتروں کے مقابلے میں چالیس گنا اور ایک سیب کے مقابلے میں چھ گنا زیادہ ہوتی ہے۔ امریکہ کے ممتاز ڈاکٹر دامن نے اپنے تجربات سے ثابت کر دکھایا ہے کہ "آم میں مکھن سے زیادہ طاقت موجود ہے اس کے استعمال سے جسم میں اعصابی نظام کی خرابی سے پیدا شدہ نقص رفع ہو جاتا ہے، اور بدن میں غیر معمولی طاقت آجاتی ہے" امپائر مارکٹنگ بورڈ آف لنڈن نے اپنے ایک خصوصی بیان میں لکھا ہے کہ "آم میں وٹامن اے، سی اور ڈی دوسرے تمام پھلوں سے زیادہ مقدار میں پائے جاتے ہیں۔" آم اعضائے رئیسہ کو حیرت انگیز طور پر طاقت بخشتا ہے، قوت باہ میں اضافہ کرتا ہے، معدے، مثانے اور گردوں کو طاقت بخشتا ہے جسم کو فربہ کرتا ہے۔ دافع قبض اور پیشاب آور ہے۔ خون بکثرت پیدا کرتا ہے۔ اور مصفّی خون بھی ہے۔

آم کھانا کھا کر کھانا چاہیے۔ نہار مُنہ خلوے معدہ کی حالت میں اس کا استعمال ضعف ہضم کا سبب بنتا ہے اور معدے میں گرمی پیدا کرتا ہے جس سے کئی طرح کے عارضے لاحق ہو جاتے ہیں۔ آم کھانے کے بعد دودھ پینے سے جسم میں طاقت پیدا ہوتی ہے۔ اور لسّی پینے سے اس کی گرمی کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ جامن اور دودھ کو آم کا مصلح کہا جاتا ہے۔ اگر آم کھانے کے بعد کچھ مقدار میں جامن کھالیں تو آم بہت جلد ہضم ہو جاتا ہے۔ کم خوابی یا بے خوابی کے مریض کے لیے آم سے زیادہ کوئی چیز سود مند نہیں۔ رات کو سونے سے قبل آم کھا کر دودھ پی لیں تو بہت گہری اور پُرسکون نیند آئے گی۔ دورانِ حمل خواتین کے لیے بھی آم نعمت عظمیٰ ہے۔ اس سے حاملہ خاتون کی نہ صرف صحت اچھی رہتی ہے بلکہ بچّہ بھی صحت مند خوب صورت پیدا ہوتا ہے۔ تازہ اور میٹھے آم تھوڑی مقدار میں کھائیں اور پابندی سے کھائیں۔ ضعفِ اعصاب میں آم خصوصیت کے ساتھ مُفید ہے۔ ایسے اشخاص جو خون کی کمی یا عام کمزوری اور ضعف باہ کے شکار ہیں متواتر آم استعمال کریں تو بہت جلد ان کی صحت میں سدھار آجاتا ہے۔ آم جوان بوڑھے بچّے مرد عورت ہر ایک کے لیے یکساں مفید ہے۔ اس سے بدن کی نشوونما میں مدد ملتی ہے۔ آم کو برف میں یا سرد پانی میں ٹھنڈا کر کے کھانا چاہیے اس طرح اس کی گرمی اور مضرت دور ہو جاتی ہے۔ تخمی آم پلپلا کر کے رس کو چوس لیں۔ قلمی ہو تو تراش کر قاشوں کی شکل میں استعمال کریں۔ دونوں صورتوں میں آم مناسب مقدار میں استعمال کریں۔ آم زیادہ کھانے سے بجائے فائدہ حاصل ہونے کے نقصان بھی ممکن ہے۔ کمزور معدے والے خاص طور پر احتیاط برتیں۔

آم بواسیر، سنگرہنی اور قولنج کے امراض میں بھی مُفید ہے۔ البتہ جگر کے امراض کے لیے مُضر ہے۔ آم کا مُربّہ دل اور معدے کو قوت بخشتا ہے۔ دماغ اور پھیپھڑوں کو طاقت دیتا ہے۔ آم کا اچار صفراوی مزاج والوں کے لیے بہت مفید ہے۔ میٹھے آم کے رس میں تھوڑا دودھ اور بقدر ضرورت شکر ملا کر پینے سے ضعف دماغ سے پیدا ہونے والا درد سر دُور ہو جاتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیری کی شکایت ہو تو دُور ہو جاتی ہے۔ دمہ، اسہال، پرانی پیچش، سیلان الرحم، اور خونی بواسیر جیسے امراض میں آم کی گُٹھلی کا سفوف بنا کر ایک تا دو ماشہ شہد میں ملا کر کھانے سے فائدہ ہوتا ہے۔

اگر آم کو افضل الاثمار (پھلوں میں سب سے افضل) کہہ جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ مرزا غالب نے اس پھل کو باغ جنّت کے سربمہر گلاس سے تعبیر کیا ہے یہ محض شاعری نہیں حقیقت کا شاعرانہ اظہار ہے۔

●●

غزلیں

انوار رضوی

کیا جانیے کب آئی تھی کیا لے گئی ہوا
بے نام راستوں کا پتا دے گئی ہوا

حتّٰی کہ برگِ خشک بنا شاخ سے گرا
آ آ کے روز خواب میں گرجے گئی ہوا

میں اور توقّعات کے جنگل کی سختیاں
موقع ملا تو صاف دغا دے گئی ہوا

میں اِک گریزاں لکۂ ابر آسماں میں تھا
پاتال پستیوں کی سزا دے گئی ہوا

مجھ کو کبھی کسی سے شکایت نہ تھی مگر
انوارؔ دل کا چین اڑا لے گئی ہوا

شہپر رسول

واقعوں کو 'بھول دامن' سے ہوا کرتے رہے
داستاں بننے کی سب رسمیں ادا کرتے رہے

ہم کہ جو درخواست لکھنے پر کبھی مائل نہ تھے
جانے کن مجبوریوں میں التجا کرتے رہے

پھول کھلتے اور بکھر کر ٹوٹتے گرتے رہے
غنچے اپنے شاد رہنے کی دُعا کرتے رہے

موسموں کے کچھ اشارے تھے ہمارے نام بھی
ہم مگر اپنے فرائض ہی ادا کرتے رہے

آج کی تبدیلیوں پر بدگماں ہیں سب کے سب
عمر بھر شہپرؔ یہ شاعر جانے کیا کرتے رہے

فریاد آزر

سماعتوں کے نقوش میں ڈھونڈتا ہوں کب سے
مجھے بھی سُن لو کہ ناشنیدہ صدا ہوں کب سے

بدن سے مجھ کو نکال کر اب نجات دے دے
الاؤ میں اس گپھا کے میں جل رہا ہوں کب سے

کبھی تو پاؤں سے چھو کے مجھ کو حیات دے دے
میں تیری راہوں میں سنگ صورت پڑا ہوں کب سے

چراغِ ہستی مرا کوئی آندھیوں میں رکھ دے
سکوت موسم مکان میں جل رہا ہوں کب سے

کہاں ہوں آخر کوئی لگائے سُراغ میرا
میں اپنے چہروں کی بھیڑ میں لاپتا ہوں کب سے

"... اور همرا آدمی ـــــ اس کو بیٹا چہیے تھا، سو ھم کا بھگوان ســے لڑائی کری کہ لڑکا کیوں نہیں دی ـــــ تو اوھم سے چھپا کے دوسری عورت کو لیا پر ھمکا پتہ چل گیا تب ھم پوچھا کہ مرد ھوکر چوری چوری عورت کیوں کرتا ھے اور..."

یوں بھی جیا کرتے ہیں

فاطمہ ترمذی

"بجر لاگی راجہ تورے بنگلے پہ..... بجر لاگی راجہ..... وہ اپنے مخصوص انداز میں گنگناتی ہوئی اندر آئی ـــــ

"نمستے بی بی جی..... رام رام..... ماتا جی ـــــ"

"نمستے پاربتی" چترا نے اخبار سے نظریں اٹھائیں ـــــ

"ٹھیک ہو پاربتی" ماتا جی نے خصوصی توجہ دی ـــــ

ہاں جی ہم ٹھیک ٹھاک ہے ایکدم بھسٹ کلاس۔"

"تم کتنے اور گھروں میں کام کرتی ہو پاربتی؟" پمی بالوں میں رولر لگاتے ہوئے بولی ـــــ

"ارے بے بی ہمارے پاس بہوت کوٹھی ہے۔ دس برس سے اُوپر ہوگیا ہم ادھر کام کرتی ہے۔ کتنے بابو لوگ آئے اور چلے گئے۔ اچھا اب پھٹا پھٹ کپڑے دیو پھٹا پھٹ جب تک ہم جھاڑو لگاتی ہے۔"

پاربتی گذشتہ دو ماہ سے چترا کے گھر کپڑے دھونے اور جھاڑو برتن کرنے کے لیے آتی تھی۔ کتنی کٹھن ہوگئی تھی زندگی کہ بغیر ہمارے کے کام کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ نوکری بھی ضروری اور اسکول کالج کی پڑھائی بھی۔ پھر گھر گرہستی کی چکّی۔ اور صحت بھی کسی کی اس قابل نہ رہی کہ زیادہ محنت کرسکے۔ اسی لیے چترا نے مجبور ہوکر کام کرنے والی کو لگا لیا تھا۔

"تمھارا آدمی کیا کام کرتا ہے پاربتی؟" ماتا جی نے سبزی بناتے بناتے پوچھا ـــــ

"ارے ماتا جی ہمرا آدمی کی بات مت کرو۔ ہمرا آدمی بڑا نکما نکل گیا۔ دارو نے اس کا دماگ آؤٹ کر دیا۔ ہم کا جانی کا کرت ہے کا نہیں۔ اب او کا ہمرا کوئی سمبندھ نہیں ـــــ"

"ہائے ہائے دارو پیتا ہے نامراد کیسی بری عادت ہے۔" ماتا جی نے ہونٹ سکوڑے ـــــ

"اور کا کبھی اس نے پکّا کام نہ کیا ایک لڑکی ہے اس کی سادی بھی ہم ہی تیری میری چاکری کرکے کر دیا اور او کا کوئی پھکر نہیں بس دارو اور اوائی توائی ـــــ ایک بار آیا بہوت بیمار پڑا ہم اس کی سیوا کی۔ اس کا علاج کرائی یہ جو باجو والی ڈاکدرنی ہے نا او ہی اپنے اسپتال میں لے گئی۔ بڑا ڈاکٹر کو دکھائی اور جب او اچھا ہوا تو بدماس ہمرا ڈھکا چھپا چار سو روپیہ لے کر بھاگ گیا بے سرم کہیں کا اب تو دوئی تین سال ہوگئے نہ چٹھیا نہ پاتر ہوئے کا کیوں اُو نہ ہوبے ہمکا کا کرنا ـــــ"

پاربتی نے زور سے جھاڑو کو جھٹکا جیسے گذشتہ تمام یادوں کو ذہن سے جھٹک دینا چاہتی ہو۔

"آج کی کیا کھبر ہے بی بی جی؟" اب کپڑے ڈوری پر پھیلاتے

ہوئے وہ چترا سے مخاطب ہوئی جو اخبار میں محو تھی۔

"سنی ہے کہ ہماری لوگن کی جگی جھونپری ہٹائی دی جائے گی اور بلڈنگ بنائی جائی... کہت ہیں کہ سرکار ایک کمرہ دے گی ہنہ ہمکا سب پتہ ہے ای سب گورمنٹ کی جھوٹ موٹ باتیں ہیں ایک ایک پریوار کا چار چار پرچی کاٹ دی یہ بابو لوگ۔ پوچھو کیسے؟ بس جے مٹھی گرم کر دی وہی کا کام بن گیا۔ صبح سے سام تک بھوکی پیاسی پبلک لین لگائے رہی اور سام کا کورا جواب ــــ"

"ہوں یہ تو ہو ہی رہا ہے۔ دیکھنا میری سلکن ساڑھی ذرا احتیاط سے دھونا کل ہی نکالی ہے... دھبے نہ لگ جائیں۔" چترا نے اخبار سے نگاہیں اُٹھائے بغیر کہا ــــ

"ہاں ہم جانتی ہے ڈرائی کالین کیوں نہیں کرائیں ایسے کپڑے گھر میں دھونا ٹھیک نہیں" پاربتی نے مزید معلومات میں اضافہ کیا ــــ

وہ روز اسی طرح ادھر اُدھر کی خبریں... گورمنٹ کی پالیسی اور حالاتِ حاضرہ اور سیاسی مسئلوں پر تبصرہ کرتی رہتی تھی۔ اور سب تو بہت جلدی میں رہتے تھے بس ماتاجی کو کوئی چاہیے تھا بات چیت کو۔ چترا آدھے دن اسکول میں رہتی اور آدھے دن لکھائی پڑھائی اور گھر کے دوسرے کاموں میں۔ بچے اپنے کالج میں اور روپیش بچارا تو صبح نو بجے جا کر رات کے دس گیارہ بجے آتا، تھکا ماندہ بس آتے جاتے نمستے کرنا نہیں بھولتا۔ ارے داماد کی یہی بات کیا کم تھی کہ وہ بہت اصرار سے ماتاجی کو مہندر کے گھر سے لے آیا کہ وہاں دن بھر ماتاجی اکیلی رہتی تھیں... مہندر اور اس کی بیوی دونوں آفس میں کام کرتے تھے۔ وہ داماد کے گھر آنے پر راضی ہی نہ تھیں مگر روپیش اس وعدے پر لایا کہ جب تک آپ کا دل گھبرائے نہیں آپ رہیے گا۔ ور اب وہ پاربتی کا سہارا لینا چاہتی تھیں سو وہ بھی ایک ڈیڑھ گھنٹے کے کام کو آتی تھی، وہ بھی مصروف۔ توبہ کیسا زمانہ آ گیا پہلے بھی ردلوگ روزی روٹی کماتے تھے مگر ایسی مشینی زندگی نہ تھی کہ بل دوڑ ــــ چل دوڑ ــــ کسی کو دوسرے کے لیے وقت نہیں ــــ ھر اور باہر ایک ہو رہا ہے اب تو ــــ

دو دن کی چھٹی کے بعد پاربتی آئی تو اس کے ساتھ ایک وان لڑکی بھی تھی جس کی گود میں ایک کالی، سوکھی مرگھلی سی بچی رُوں رُوں کر رہی تھی۔

چترا نے سوالیہ نظریں اُٹھائیں۔

"ارے نمستے کر بی بی جی کو یہ ہمری روپا ہے بی بی جی ہمری لڑکی گام سے ہیں اسے بلائی اب یہو کام کرے گی۔" اور اُس نے روپا کو کام کی تفصیل بتائی اور اچھی طرح کام کی ہدایت کر کے چلی گئی ــــ

پاربتی کی بیٹی روپا سے پتہ چلا کہ پاربتی کا داماد بمبئی شہر میں محنت مزدوری کرتا ہے مگر بیوی بچوں کو ساتھ نہیں رکھتا۔ سارا خرچ اپنی ماں کو بھیج دیتا ہے اور روپا کو کچھ نہیں ملتا بچے بھی تکلیف اٹھاتے ہیں... کھیت کا کام بھی کرتی ہے روپا اور پاربتی کا ایک بھائی بہن ماں سب یہیں ہیں۔ اور پھر چند روز کے بعد پاربتی دو دن کے لیے بغیر بتائے غائب ہو گئی ــــ نہ وہ آئی نہ لڑکی آس پاس سے بھی یہی پتہ چلا کہ کہیں کوئی اطلاع نہیں کام کی مشکل کے ساتھ یہ فکر بھی ہو گئی کہ پاربتی پر کیا گذری کہ چوتھے دن مقررہ وقت پر پاربتی آ گئی بس ایک بات نئی تھی کہ آج وہ کچھ نڈھال سی تھی۔

"پاربتی تم کہاں چلی گئی تھیں بتایا بھی نہیں۔" چترا نے شکایت بھری نظریں پاربتی پر ڈالیں۔ "اپنی لڑکی کو بھی نہیں بھیجا ــــ ہیں؟ کیا قصہ ہے؟"

"ارے اب کا بتائی بی بی جی وہ ہمرا جنوائی بڑا جھگڑا کیا کہ ہم اپنی مہریا سے جھوٹن ناہیں ساپھ کرائی۔ اس کا کام میں بھیج دو ہمری کھیتی باڑی کا کام بگڑ جائی۔ بڑا ناک والا آیا ــــ اور ہماری جھونپڑی ٹوٹ گئی سو ہم کہوں اور اپنی مڑیا ڈال رہی تھی اسی کارن نہیں آئے ابھی تو پوری بنی بھی ناہیں ہے۔"

"ارے جھونپڑی ٹوٹ گئی ہائے ہائے اب کہاں رہے گی تو؟" ماتاجی بڑے افسوس سے پوچھ رہی تھیں۔

"اب کہیں اور جھونپڑی بنائے گی ــــ رات بھر کھلے آکاس تلے پڑے رہے ہم لوگ ماتاجی ارے ہم سب جانتی ہے یہ بیچ والا بابو لوگ کی سرارت ہے۔ الکسن کے زمانے میں ووٹ لینے کو بڑی بڑی باتیں کرت ہیں بعد میں سب کھتم ــــ اب جو اپنی کلونی سے کھڑا ہوا تھا الکسن میں اوکا کرسی مل گئی صاحب بن گیا سب بھول گیا ہمکا پتا ہے یہ موٹر کے کارخانے میں ٹکے ٹک تھا ٹکے ٹک اب سرکار

گیا، غریبن کو کون یاد رکھے ـــــ"

"ارے آج کالج نہیں جانا ہے بی بی؟" وہ پمّی کی طرف متوجہ ہوگئی
پھر چھوٹی دیدی کی طرف دیکھ سوالیہ نگاہیں پمّی کی طرف ڈالیں "یہ
ہماری ماسی ہیں پاربتی انٹرویو دینے آئی ہیں، یہاں کالج
میں ـــــ"

"اچھا اچھا تم کو دپھتر کی نوکری پسند ناہیں تو پرائیوٹ جگہ
پر جاوارے کالج اسکول سرکاری دپھتر سب کام گڑبڑ گیا ہے ـــــ
جب تک گورنمنٹ کی طرف سے بھرا ہوا غبار دل سے نہیں نکلا تھا ـــــ
اچھا ہم پتا کرے گی جگہ کھالی ہوئے گی تو بتائے گی" پاربتی نے فوراً
اپنی خدمات پیش کر دیں۔

وہ اتنے عرصے میں گھر کے ہر فرد سے متعلق ہوگئی۔ کبھی راکیش
سے امتحان کے بارے میں پوچھتی اور کبھی پمّی کی پڑھائی کے متعلق ـــــ
گھر کے بر آنے جانے والے رشتہ دار کی خیریت معلوم کرتی اب وہ
چھوٹی دیدی سے بھی بے تکلف ہوگئی تھی ـــــ تہوار کے موقعوں پر
بخشش مانگتی گلال لگا کر ہولی کی بخشش مانگتی شادیوں میں شریک
ہوکر ساڑھی اور نیگ کے لیے جھگڑتی تھی ـــــ وہ ہر وقت اپنا
دکھڑا نہیں روتی تھی نہ قسمت کا گلہ کرتی اگر کبھی کوئی بھولی بسری
بات کرتی تو جلدی ہی موضوع بدل دیتی۔

"ارے ہوئیے جو بھاگ میں لکھی ہے وہ ہونی ہے جب اوپر
والے نے دھرتی پر جنم دیا تو وہی آگے بھی کچھ نہ کچھ کر لیہیے اس کا کا
سوچنا ـــــ روئے دھوئے سے کا ہوت ہے ـــــ سمے تو کٹ ہی
جاتا ہے ـــــ" اس پر غصّے خفگی کا موڈ ہوتا مگر بہت عارضی۔ وہ
خفا ہو کر جلدی ہی بگڑتی مگر اگلے روز اسی طرح گاتی گنگناتی ہلو ہلو
کرتی آتی یہ ہلو ہلو پمّی کے لیے ہوتا۔ کبھی ڈسکو ڈانس کرتی اپنے
خیال میں اور کبھی دیہاتی اور بچّوں کو ہنساتی رہتی تھی۔ راکیش
سے مطالبہ کرتی کہ کب تک وہ نوکر ہو جائے گا جو وہ بڑھیا
ساڑھی لے ـــــ

ایک دن پاربتی دیر میں کام کرنے آئی۔ اسپتال ماں
کو دکھانے گئی تھی۔ کام کرتے کرتے دوپہر ہوگئی ... پمّی کی
چھٹی تھی اور چترا کی بھی ... اور چھوٹی دیدی ابھی ابھی باہر سے
آئی تھیں۔

"تمھارا جھگڑا اپنے آدمی سے کس بات پر ہوا پاربتی؟"
چھوٹی دیدی کو پاربتی اور اس کے شوہر کے کیس میں بہت زیادہ دلچسپی
ہوگئی تھی۔ "آؤ آؤ پنکھے میں بیٹھ جاؤ" ماتا جی نے بہت اخلاق سے
کہا ـــــ چھوٹی دیدی کو اس موضوع سے یوں بھی دلچسپی تھی کہ وہ بھی
تو اسی تیغ کی کشتہ ستم تھیں کہ ان کے ماڈرن شوہر انھیں اپنے ساتھ
باہر کے ملک میں رکھنا چاہتے تھے اور یہ اپنے وطن سے الگ نہیں ہونا
چاہتی تھیں اس لیے بات بگڑ گئی اور وہ خود جا کر پردیس میں بس گئے
اور چھوٹی دیدی اپنے بھائی کے پاس رہتی کبھی کسی بہن کے پاس
اب وہ نوکری کر کے الگ رہایش اختیار کرنا چاہتی ہیں "ہاں تو تمھارا
آدمی تمھیں کیوں چھوڑ گیا ـــــ" چھوٹی دیدی نے پھر اپنا سوال دہرایا۔
چترا کو بے حد ناگوار گذر رہا تھا کہ کیوں بار بار یہ تکلیف دہ موضوع
چھیڑا جا رہا تھا لیکن وہ بہن کی نازک مزاجی سے گھبراتی تھی کہ ڈپریشن
کے دورے نہ پڑنے لگیں اور ماتا جی کو بھلا کیا کہا جا سکتا تھا۔

"اب ہم اپنی کہانی کا سنائی۔ پتا بچپن میں چھوٹا چھوٹا چھوڑ
کر گجر گیا۔ چھوٹا بھائی تو اس کے بعد ہوا ـــــ بڑا لاڈ پیار میں رکھی ہم
ماں بہن نے پر اوہ تو پڑھا لکھا نہ کام کاج کیا بگڑ گیا ـــــ سادی
کرائی تو مہریا بڑی کھراب نکلی لڑائی جھگڑا ہمری ماں سے کری اس
کی جمین مکان سب لے لیا اور بھائی سے بھی ان بن ہوئی اور ماں
سے بھی۔ ہمری بہن کا بیٹا مر گیا سال اور اس کا آدمی کہیں غائب
ہوگیا جانے مرا کہ کیا تب سے ہمری بہن کا دماغ بھی چل سا گیا۔ سو ہم
سب کا لے کر یہاں آئی اور کام پر لگا دے دی" وہ سب سے
ہی مخاطب تھی۔

"اور ہمرا آدمی ـــــ اس کو بیٹا چہیے تھا۔ سو ہم کا بھگوان سے
لڑائی کرتی کہ لڑکا کیوں نہیں دی ـــــ تو او ہم سے چھپائے کے دوسری
عورت کر لیا پر ہمکا پتہ چل گیا تب ہم پوچھا کہ مرد ہو کر چوری چوری عورت
کیوں کرتا ہے۔ اور ہم اس کا گھر چھوڑ دیا کہ لیو ہم جاتی ہے۔ بولا جاؤ
نہیں یہ تمرا گھر ہے یہ مہریا تمری سیوا کر لیہے روٹی پکا کر کھلائے
گی ـــــ"

"اور بیٹا بھی دے گی" ہم کہی تو بول بھی ناہیں پایا چُپ رہ
گیا پھر ہم کہی "اب تم دونوں رہو کھوسی کھوسی اور بیٹا کی آس لگاؤ ہمکا
ہاتھ پاؤں چلائے دیو ـــــ سو ہم سب کا لے کر یہاں آئی اور کام پر لگ گئی۔"

رُک کر کچھ نمائشی میچ کھیلتے ہوئے ویسٹ انڈیز جانا تھا۔ لیکن تبھی ایک حادثہ ہوا۔ انگلینڈ میں نمائشی میچ کھیلتے ہوئے گواسکر کے داہنے ہاتھ کی انگلی میں چوٹ لگی اور سیپٹک (Septic) ہو جانے سے اس قدر سوجن آگئی کہ انگلینڈ کے کئی ڈاکٹروں نے انگلی کاٹے جانے کی بات کہی۔ ابھی گواسکر کو اپنا پہلا ٹیسٹ کھیلنا باقی تھا اور ڈاکٹر اس کی انگلی کاٹنے کی بات کر رہے تھے۔ ہندوستان کی پوری ٹیم اپنا طے شدہ وقت انگلینڈ میں بتانے کے بعد ویسٹ انڈیز روانہ ہو گئی۔ اور گواسکر علاج کے سلسلے میں انگلینڈ ہی میں رُک گیا۔ اچھا یہ ہوا کہ انگلی کاٹنے کی نوبت نہیں آئی۔ لیکن جب تک وہ ٹھیک ہو کر ویسٹ انڈیز پہنچا، اس وقت تک پہلا ٹیسٹ میچ نکل چکا تھا۔ دوسرے ٹیسٹ میچ میں گواسکر کو پہلی بار کھیلنے کا موقع ملا اور دیکھتے ہی دیکھتے کرکٹ کی دنیا میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا، گواسکر نے اپنے پہلے ٹیسٹ کی پہلی ہی باری میں ۶۵ رن ناٹ آوٹ اور دوسری باری میں ۶۷ رن ناٹ آوٹ بنائے اور ہندوستان وہ ٹیسٹ جیت گیا۔ اس وقت ویسٹ انڈیز ٹیم کی کپتانی دنیا کے تمام آل راونڈر کھلاڑیوں کا بے تاج بادشاہ گیری سوبرس کر رہا تھا۔ اس پوری سیریز کے چار میچوں میں جو سات باریاں گواسکر نے کھیلیں ان میں اس کا اسکور ۶۵، ۶۷ ناٹ آوٹ، ۱۱۶، ۶۴ ناٹ آوٹ، ۱، ۱۱۷ ناٹ آوٹ، ۱۲۴ اور ۲۲۰ رن تھا۔ کوئی بھی کھلاڑی جو اپنی زندگی کی پہلی سیریز کھیل رہا ہو اس کے لیے ایسا کارنامہ خواب جیسا لگتا ہے۔ گواسکر نے اپنی پہلی سیریز کے چار میچوں میں ۷۷۴ رن بنائے جو ابھی تک ایک عالمی ریکارڈ ہے۔

اگلے دو تین سال گواسکر زیادہ کامیاب نہ ہو سکا۔ رن تو بنتے تھے پر زیادہ نہیں اور وہ اس دوران کوئی بھی سینچری نہیں لگا پایا اور نہ ہی وہ فارم دکھائی دیا جو اس نے اپنی پہلی سیریز میں دکھایا تھا۔ پھر ۷۵-۱۹۷۴ء میں انگلینڈ میں انگلینڈ کے خلاف کھیلتے ہوئے مانچسٹر کی کڑاکے کی سردی میں جان سنو John Snow جیسے تیز گیند باز کا سامنا کرتے ہوئے اس نے شاندار ۱۰۱ رن بنائے اور پھر سینچری بنانے کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔ پچھلے چار پانچ سالوں سے اس بات کا بہت زیادہ شور تھا کہ گواسکر بریڈ مین کی ۲۹ سینچری کا ریکارڈ توڑ پائے گا یا نہیں اور جب گواسکر نے دلّی میں ویسٹ انڈیز کے خلاف کھیلتے

۲۹ ویں ٹیسٹ سینچری لگا کر بریڈ مین کے ریکارڈ کو برابر کرتے ہوئے فیروز شاہ کوٹلہ گراؤنڈ دہلی میں۔

ہوئے ۱۹۸۳ء میں ۲۹ سینچری بنا لیں تو پھر یہ سوال اُٹھا کہ گواسکر ٹیسٹ میچوں میں دس ہزار رن بنا پائے گا یا نہیں؟ اور اس بار بھی گواسکر نے پاکستان کے خلاف کھیلتے ہوئے اس سوال کا جواب بڑے اطمینان سے دیا اور اب صرف ایک ہی بڑا سوال ہے کہ کیا گواسکر اس سال ہندوستان میں ہونے والے ورلڈ کپ کے بعد بھی ہندوستان کی طرف سے ٹیسٹ میچ کھیلتے رہیں گے یا نہیں؟ اس جواب کو ہاں میں سننے کے لیے پورے ہندوستان کے کرکٹ شائقین بیقراری سے منتظر ہیں۔ گواسکر کی ۱۷ سالہ لمبی کرکٹ زندگی میں بہت سی ایسی بہترین باریاں ہیں جن کی وجہ سے گواسکر کرکٹ کی دنیا میں اپنا سکہ جما چکے ہیں۔ ۱۹۷۹ء میں اوول میں انگلینڈ کے خلاف کھیلتے

جب ہندوستان کو ۴۳۰ رن بنانے کا مشکل چیلنج ملا تو گواسکر پورے ڈیڑھ دن تک کھیلتے ہوئے بہترین ۲۲۲ رن بنائے اور ہندوستان جیت کے بہت ہی قریب لا کر کھڑا کر دیا۔ یہ ایک ایسی باری تھی جس میں ان نکالنی مشکل ہے اور تعریف کرنے کے لیے کچھ خاص الفاظ کی ضرورت ہے۔ سرلین ہٹن (Sir Len Hutton) گواسکر ہی کی طرح دنیا کے دس بڑے کھلاڑیوں میں سے ایک نے وہ ۲۲۲ رن گواسکر کو بناتے دیکھے اور لکھا "میں نے بہت سی ڈبل سنچریاں دیکھی ہیں لیکن گواسکر کی یہ ڈبل سنچری سب سے برتر اور اوّل ہے۔ اس بات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے کہ باری شروع ہونے پر ہندوستان کی حالت کتنی خستہ تھی۔" وہ آگے کہتے ہیں کہ گواسکر سارے عظیم کھلاڑیوں کی طرح اپنے دونوں پیروں کا استعمال کر کے کھیل سکتا ہے وہ کٹ کر سکتا ہے، وہ پل کر سکتا ہے، وہ ڈرائیو کر سکتا ہے گواسکر ایک عمدہ ماڈل ہے ان اسکول کے بچّوں کے لیے جو آگے چل کر کرکٹر بننا چاہتے ہیں۔" اس کے بعد ۱۹۸۳ء میں جب گواسکر ویسٹ انڈیز کی ٹیم کے خلاف کانپور کے پہلے ٹیسٹ کی دونوں باریوں میں صرف ایک اور صفر رن ہی بنا پائے، دوسری باری میں گواسکر کے ہاتھ سے مارشل کی گیند پر بلّا ہی چھوٹ گیا تو سب کو ایسا لگا جیسے گواسکر کسی نوسکھیے کھلاڑی کی طرح مارشل کی تیز گیند بازی کا مقابلہ کر رہا ہے اور آگے مارشل کو نہیں کھیل پائے گا۔ لیکن اگلے ٹیسٹ میچ میں جو دلّی میں کھیلا گیا گواسکر نے جس جارحانہ انداز میں مارشل کی پٹائی کی اس سے پتا چلا کہ گواسکر میں اب بھی بہت دم خم باقی ہے، اور وہ بھی ووین رچرڈس جیسا تیز کرکٹ کھیل سکتا ہے۔ یہ گواسکر کی ۲۹ ویں سنچری تھی۔ جس نے بریڈمین کے عالمی ریکارڈ کی برابری کر لی، اور اب حال ہی میں پاکستان کے خلاف کھیلتے ہوئے بنگلور میں گواسکر نے شاندار ۸۶ رن بنائے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ گواسکر کی آخری اننگ ہو اور کوئی بھی کھلاڑی اس سے زیادہ بہتر آخری اننگ کی امید نہیں کر سکتا۔ پچ پر ٹپہ پڑنے کے بعد گیند کب کہاں اور کتنی اونچائی تک اچھل پڑے گی، اس بات کا اندازہ کوئی بھی ہندوستانی یا پاکستانی کھلاڑی نہیں لگا پایا لیکن گواسکر پورے ڈیڑھ دن تک توصیف احمد اور اقبال قاسم کی بے انتہا خطرناک گیند بازی کا مقابلہ کرتے ہوئے پچ پر ڈٹا رہا۔ اور جب تک وہ کھیلتا رہا جیت پاکستانی کھلاڑیوں سے دور نظر آتی رہی کیونکہ گواسکر ہی ایک ایسا کھلاڑی ہے جو وقت کی پروا کیے بنا اپنے اسکور کو کہیں سے کہیں پہنچا سکتا ہے۔

دس ہزار رن جو کسی بھی کھلاڑی کے لیے آج سے دو سال پہلے ایک خواب کی مانند تھے، گواسکر نے اس خواب کو پورا کر دکھایا۔ ۱۹۸۴-۸۵ء میں ایسا نہیں لگتا تھا کہ کوئی بھی کھلاڑی ان بری سو برس کے ساڑھے آٹھ ہزار رن کی برابری کر پائے گا۔ انگلینڈ کا مشہور سلامی بلّے باز جیف بائیکاٹ جو ہمیشہ گواسکر سے رنوں اور سنچریوں کے معاملے میں آگے چل رہا تھا، سا وتھ افریقہ جانے کی وجہ سے اپنا ٹیسٹ کیریر برقرار نہیں رکھ سکا اور گواسکر اس سے کہیں آگے نکل گیا۔ آٹھ ہزار رن کو پار کرنے والے دو کھلاڑی کیری سوبرس اور جیف بائیکاٹ تو ہیں لیکن اور کوئی بھی کھلاڑی نو ہزار رن تک نہیں پہنچ سکا جبکہ گواسکر نے حال ہی میں اپنے دس ہزار رن پورے کر لیے اور فی الحال دنیا میں ابھی کوئی ایسا کھلاڑی نظر نہیں آتا جو آگے دو چار سال اور کھیلتے ہوئے گواسکر کے دس ہزار رنوں کی برابری کر سکے۔ ایسا نہیں ہے کہ گواسکر نے اپنے زیادہ تر رن ہندوستان کی زمین پر کھیلتے ہوئے بنائے ہیں بلکہ ریکارڈ ہمیں بتاتے ہیں کہ گواسکر نے ہندوستان سے باہر صرف ۶۰ ٹیسٹ میچ کھیلتے ہوئے پانچ ہزار پچپن (۵۰۵۵) رن بنائے جبکہ ہندوستان میں ۶۴ ٹیسٹ میچوں میں صرف ۴۹۵۰ رن بنائے۔ سنچریوں کے معاملے میں بھی گواسکر نے ہندوستان کی بہ نسبت باہر ممالک میں زیادہ سنچریاں بنائی ہیں۔ ان سب ریکارڈوں سے ہم یہ پتہ لگا سکتے ہیں کہ گواسکر ہندوستان سے باہر کھیلنے میں زیادہ کامیاب رہے ہیں جبکہ زیادہ تر کھلاڑی اپنے وطن میں کھیلنے میں زیادہ آسانی محسوس کرتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ گواسکر کا مقابلہ پہلے کے بلّے بازوں سے ہمیشہ کیا جاتا ہے اور ان میں سب سے اہم نام ہے آسٹریلیا کے سرڈان بریڈمین کا جنھیں کرکٹ کا بادشاہ بھی مانا جاتا ہے۔ ایک بار سرڈان بریڈمین نے گواسکر کے متعلق کہا "مجھے اس بات کا بہت دکھ ہے کہ میں گواسکر کے خلاف نہ کھیل سکا لیکن میں کھیلتا بھی کیسے، سنیل گواسکر کے پیدا ہونے سے قبل ہی میں ریٹائرمنٹ لے چکا تھا۔"

ایک بار جب ڈان بریڈمین گواسکر سے ملے تو انھوں نے چند کھلاڑیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "ان لمبے چوڑے کھلاڑیوں

کے پاس کرکٹ کھیلنے کے لیے جسم اور طاقت ہے جب کہ ہم لوگوں کے
پاس ذہنی صلاحیت زیادہ ہے"۔ یہ بات غور طلب ہے کہ مسٹر ڈان
بریڈمین گواسکر کی طرح بہت ہی چھوٹے قد والے کھلاڑی نہیں ہیں
پھر بھی انھوں نے اپنے آپ کو گواسکر کے برابر بتانے کے لیے ایسی بات
کہی۔ یہ بات کسی بھی کھلاڑی کے لیے قابلِ فخر ہوسکتی ہے جہاں تک
گواسکر اور سرڈان بریڈمین کے مقابلے کا سوال ہے اب تک بہت
سے کرکٹ نقادوں نے کوششیں کیں مگر ناکام رہے۔ گواسکر نے
سرڈان بریڈمین کے ۲۹ سنچریوں والے ریکارڈ کی برابری تو کرلی
لیکن اپنے ۹۵ ٹیسٹ مکمل کرنے کے بعد جبکہ ڈان بریڈمین نے یہی
کارنامہ صرف ۵۲ ٹیسٹ میچ کھیلتے ہوئے انجام دے دیا تھا جہاں
گواسکر کا ٹیسٹ اوسط ۵۲ رن فی ٹیسٹ کے قریب ہے۔ وہاں سرڈان
بریڈمین کا ٹیسٹ اوسط ۹۴ء ۹۹ رن فی ٹیسٹ ہے۔ یہ ایک عجیب
اتفاق ہے کہ سرڈان بریڈمین اپنی آخری ٹیسٹ اننگ میں صفر پر
آوٹ ہوگئے ورنہ ان کا اوسط ۱۰۰ رن فی ٹیسٹ بلاشبہ ہوتا۔

جہاں تک گیند بازوں کو کھیلنے کا سوال ہے کوئی بھی یہ نہیں
کہہ سکتا کہ کس نے زیادہ تیز گیند بازوں کا مقابلہ کیا آیا گواسکر نے
یا بریڈمین نے؟ لیکن یہ بات طے ہے کہ بریڈمین نے اپنی جارحانہ
بلے بازی سے اپنے وقت کے تمام گیند بازوں کی صلاحیتوں کو تہس
نہس کردیا تھا۔ بریڈمین کی اس جارحانہ بلے بازی کا مقابلہ کرنے
کے لیے انگلینڈ کے گیند بازوں کو پہلی بار باڈی لائن بالنگ
(Body line Bawling) کی دریافت کرنی پڑی۔

باڈی لائن بالنگ شروع کرنے والے پہلے بالر لاروڈ (Larwood)
تھے اور انھوں نے شارٹ پچ بال اور باونسر پھینک پھینک کر
بریڈمین کو ڈرانے اور پریشان کرنے کی کوشش کی۔ مگر بریڈمین
کے چوکوں اور چھکوں کی رفتار کے سامنے اپنے مقصد میں ناکام
رہے۔ جہاں بریڈمین نے لاروڈ اور اپنے وقت کے بے حد خطرناک
بالروں کا مقابلہ کیا وہیں گواسکر نے بھی ۱۰ سالہ لمبی کرکٹ زندگی میں
۱۵ سے زیادہ تیز گیند بازوں کا مقابلہ کیا۔ بریڈمین کے زمانے میں
ہیلمٹ، ایلبو گارڈ (Elbow guard) اور تھائی گارڈ
(Thigh guard) جیسی چیزیں نہیں تھیں لیکن آج ان چیزوں کے
موجود ہوتے ہوئے بھی گواسکر نے ان کا استعمال بہت ہی کم کیا۔ بریڈمین نے
انگلینڈ اور آسٹریلیا ہی میں کرکٹ کھیلی اور کسی بھی دوسرے مل
دورہ نہیں کیا لیکن گواسکر نے دُنیا کے ہر کرکٹ کھیلے جانے وا
میں اپنی فن کارانہ صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔

جب ایک روزہ بین الاقوامی کرکٹ ۱۹۷۰ء کے اوائ
شروع ہوا تو ایسا لگا کہ گواسکر اس طرح کے کرکٹ کے لیے موزوں
ہیں اور گواسکر نے اس بات کا ثبوت کچھ اس طرح دیا بھی تھ
ہوا یوں کہ ۱۹۷۵ء میں ہونے والے پہلے ورلڈ کپ میں کھیلتے
انھوں نے پورے ۶۰ اوور میں صرف ۳۰ رن بنائے اور جب
ہندوستانی کرکٹ بورڈ نے ان سے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیوں ک
تو گواسکر کا جواب تھا کہ وہاں پچ پر کھڑے ہو کر اس طرح کا کرکٹ
کھیلتے ہوئے میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں رن کس طرح بناؤ
اور جب میں نے آوٹ ہونا چاہا تو اپنے آپ کو آوٹ بھی نہ کر
لیکن اس واقعے کے بعد آج گواسکر ایک روزہ بین الاقوامی کرک
کے ایک اہم کھلاڑی ثابت ہو رہے ہیں اور دو ہزار سے زائد
رن بھی بنا چکے ہیں مگر آج تک ان کے نام سے ایک روزہ میچوں
کوئی بھی سنچری نہیں جُڑی ہے۔ پھر بھی ہمیں یہ اُمید ہے ک
اس سال ہونے والے ورلڈ کپ میں گواسکر اس کمی کو بھی
پورا کردیں گے۔

جہاں گواسکر کی اتنی ساری خوبیاں ہیں وہیں چند واقعا
ان کے کیریر میں ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے کرکٹ شائقین
بُرے تاثرات چھوڑے ہیں جیسے کہ ۸۱-۱۹۸۰ء کے آسٹریلیائی
دورے میں ڈینس للی کی گیند پر ان کو ایل بی ڈبلیو قرار دیا گیا تو
انھوں نے ایک زبردست فساد کھڑا کردیا امپائر سے لڑائی کی
اور ساتھی بلے باز چیتن چوہان کو لے کر فیلڈ سے باہر نکل گئے۔
ٹیم کے منیجر عابد علی نے اس ماحول کو خوش اسلوبی سے سنبھالا او
چیتن چوہان کو کھیلنے کے لیے واپس میدان میں بھیجا گیا۔ یاد ر
کہ اس وقت گواسکر ٹیم کے کپتان بھی تھے۔

۱۹۸۵ء میں انگلینڈ کے خلاف جب اظہرالدین نے اپنے ابتدائی
تین ٹیسٹ میچوں میں لگاتار تین سنچریاں بنائیں تو یہ ایک نیا عالمی
ریکارڈ بن گیا۔ لیکن سنچری پوری ہونے پر گواسکر کا کہیں پتہ نہیں
تھا۔ جبکہ ہندوستان کے سارے کھلاڑی پویلین کی بالکنی میں کھڑے

ہوکر اظہرالدین کے کھیل سے خوش ہوکر تالیاں بجارہے تھے۔ پوچھے جانے پر گواسکر نے بتایا کہ میرا قد اتنا چھوٹا ہے کہ ٹیم کے باقی کھلاڑیوں کے پیچھے دکھائی نہ دے سکا۔ اپنے اس بیان سے گواسکر تضحیک کا موضوع بن کر رہ گئے اور ابھی حال ہی میں پاکستان کے ساتھ ٹیسٹ سیریز میں انھوں نے کلکتہ ٹیسٹ کھیلنے سے انکار کردیا۔ ٹیسٹ نہ کھیلنے کی وجہ انھوں نے کوئی ذاتی معاملہ بتایا۔ لیکن سبھی جانتے ہیں کہ ۱۹۸۵ء میں انگلینڈ کے خلاف کلکتے میں کھیلتے ہوئے جب تماشائیوں نے ان کی کافی ہوٹنگ کی تھی تب گواسکر نے اعلان کردیا تھا کہ وہ آئندہ کلکتے میں نہیں کھیلیں گے۔ اس سے پہلے بھی وہ ویسٹ انڈیز کے جمائیکا میدان میں ہوٹنگ ہونے کے بعد تماشائیوں کو گالیاں دے چکے ہیں اور آئندہ نہ کھیلنے کی بات بھی کہہ چکے ہیں لیکن اس کے بعد بھی وہ جمائیکا کھیلنے گئے۔ ان ساری باتوں کے باوجود گواسکر کے کھیل کی عظمت سے کسی کو کوئی انکار نہیں۔

جہاں تک گواسکر کی نجی زندگی کا سوال ہے بہت خوشگوار گزر رہی ہے۔ ان کی شادی مارشنیل نامی لڑکی سے ہوئی جو کہ قد میں ان ہی کے برابر ہے۔ ان دونوں کی پہلی ملاقات ہندوستان کے ٹیسٹ اسپنر دلیپ دوشی نے کروائی۔ جب گواسکر دلی کے فیروز شاہ کوٹلا گراؤنڈ پر میچ کھیل رہے تھے اور مارشنیل کانپور سے بطور خاص ان کا کھیل دیکھنے دلی آئی ہوئی تھی یہ ملاقات دوستی میں بدلی اور پھر انجام شادی کی شکل میں سامنے آیا یہ بات اور ہے کہ گواسکر نے دلیپ دوشی کو کبھی بھی پسند نہیں کیا۔ پاکستان میں میچ کھیلتے ہوئے جب گواسکر ٹیم کے کپتان تھے انھوں نے دلیپ دوشی کو سارے کھلاڑیوں کے بیچ ڈانٹا اور کہا مسٹر دلیپ دوشی آپ کو نیٹ پر بالنگ پریکٹس کی بہت ضرورت ہے۔ گواسکر کا ایک اکلوتا بیٹا بھی ہے جس کا نام انھوں نے روہن رکھا جو کہ کرکٹ میں اتنی ہی دلچسپی رکھتا ہے مگر اپنے والد کی طرح افتتاحی بلے باز نہیں بننا چاہتا بلکہ ایک تیز گیند باز کی حیثیت سے ملک کی خدمت کرنا چاہتا ہے اور یہ بات ہندوستان کے کرکٹ کے لیے بہت بڑھیا ہے کیونکہ ہندوستان ہمیشہ سے تیز گیند باز کی تلاش میں رہا ہے۔

●●

بقیہ: افسانے میں بیانیہ اور کردار کی کشمکش

حال اور مستقبل کے ادغام کے ساتھ لکھیے تو فرق معلوم ہو جائے۔ مظہرالزماں خاں کی عبارت میں زیادہ تناؤ ہے۔ اگر حرکت بڑھ جائے تو ان کے یہاں امکانات اور روشن ہوں۔

نئے افسانہ نگار نے پریم چندی افسانے کو مسترد کرکے ادب کی ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ اس نے بڑی قربانیاں دے کر یہ سبق سیکھا ہے کہ کردار محض ایک کھونٹی ہے جس پر کسی بھی قسم کا لباس ٹانگا جا سکتا ہے۔ لیکن پریم چندی افسانے سے اس کو ابھی پوری طرح گلوخلاصی نہیں ملی ہے۔ دوسری طرف اسے نثری نظم کا خطرہ ہے۔ نثر کا ہفت خواں طے نہ کر سکنے کے باعث اس کا قافلہ نثری نظم کے نخلستان میں ٹھہرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ نثری نظم میں آسانی یہ ہے کہ بات کم لفظوں میں کہہ دی جاتی ہے۔ لیکن افسانہ لفاظی مانگتا ہے۔ پروست نے یہ بات سمجھتے سمجھتے بیس برس لگا دیے۔ ہمارے افسانہ نگاروں کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش، اردو افسانے میں مزدور کی پیش کش، اردو افسانے میں عورت کی پیش کش، اردو افسانے میں نفسیات، اردو افسانے میں فلسفہ، یہ سب تو ہو چکا۔ اب ذرا واقعہ بیان ہو جائے۔

●●

گاہے گاہے باز خواں

البیرونی نے کتاب الہند میں ہندوستان کے شہروں کی ایک کمزوری کا تفصیل [illegible] ذکر کیا ہے۔ راجپوتوں کے زمانے میں شہری زندگی کی تنظیم میں ذات پات کے تصورات کو بڑا دخل تھا۔ اعلیٰ ذات کے لوگوں کے سوا کسی کو شہر کی چار دیواری کے اندر رہنے کی اجازت [illegible] نیچے پیشے کے لوگ شہر سے باہر رہتے تھے۔ مسلمانوں کے آنے کے بعد شہروں کا نقشہ [illegible] بدلنے لگا۔ شہر کے دروازے سب پر کھول دیے گئے اور اب اعلیٰ ادنیٰ ہر [illegible] پہلو بہ پہلو دکھائی دینے لگے۔ پروفیسر مجیب نے اس تبدیلی کو شہری انقلاب سے تعبیر [illegible]

[illegible] حسن دہلوی

[illegible]

احترام اسلام

ـا سفـــر خود کو سدا دیکھتے رہنا
باـئے گا منزل کا پتا دیکھتے رہنا

ـ صورت نظر آئے کہ نہ آئے
کوئی خواب نیا دیکھتے رہنا

ـ ـ پھسل جائیں کریں کب کسے برباد
ـی چٹانوں کو ذرا دیکھتے رہنا

ـ بھی واٹھہری ہوا اس کا مقدر
ـ کوئی تازہ وبا دیکھتے رہنا

ـہ تدبیر کو تم روند تو آؤ
ـوق سے قسمت کا لکھا دیکھتے رہنا

شفیع اللہ خاں راز

پانیوں سے ریت پر جو آگیا میری طرح
زندگی کی دھوپ میں جلتا رہا میری طرح

اس کے ہونٹوں سے بھی امرت کی مہک آنے لگی
غالباً زہر بلا ہل پی لیا میری طرح

آپ کو وہ اپنی رحمت سے نوازے گا ضرور
صدق دل سے مانگیے اس سے دعا میری طرح

کوئی پردے سے نکل کر سامنے آجائے گا
شرط لیکن یہ ہے تم بھی دیکھنا میری طرح

ساحلوں کی قید سے آزاد ہو سکتا ہے تو
اپنے دریا میں کوئی طوفاں اٹھا میری طرح

انجمن در انجمن تفریق خاص و عام ہے
ہے کوئی جو راز کہہ دے برملا میری طرح

رئیس الدین رئیس

منحرف ہوں ذات سے اپنی مگر زندہ ہوں میں
اس مسافت میں بلا رختِ سفر زندہ ہوں میں

دشتِ غربت میں بھی تیرے بام و در سب یاد ہیں
اور کچھ دن جاگنا اے میرے گھر زندہ ہوں میں

اک وجود ناتواں چکّی کے دو پاٹوں کے بیچ
کس طرح اے گردشِ شام و سحر زندہ ہوں میں

رکھ سرِ دہلیز اک روشن دیا میرے لیے
لوٹ آؤں گا ضرور اک دن اگر زندہ ہوں میں

ہیں دروغِ مصلحت کے سلسلے لیکن رئیس
اس جہانِ باہنر میں بے ہنر زندہ ہوں میں

547 - اتر سوکیا، الہ آباد 211003
ایس۔ این کالج کٹرہ چندال خاں اٹاوہ 206001 یوپی
15/1728 دہلی گیٹ علی گڑھ 202001

نئی کتابیں

مری صدا کا غبار

شاعر : رفعت سروش

صفحات : ۱۷۵

قیمت : پچاس روپے

تقسیم کار : نورنگ کتاب گھر ڈی اے ۲ منیرکا ' نئی دہلی ۶۷ ۔

"مری صدا کا غبار" رفعت سروش کا دسواں شعری مجموعہ ہے اس مجموعے میں بھی ان کے پیشتر مجموعوں کی طرح نظمیں غزلیں اور منظوم ڈرامے شامل ہیں۔ ویسے رفعت سروش کی نگارشات کا دائرہ اب اتنا پھیل گیا ہے کہ اس کا احاطہ و تجزیہ دشوار گزار کام ہوگیا ہے۔ بمبئی کی چار دہائیوں پر محیط نوکری کے دوران انھوں نے لاتعداد فیچرز، منظوم و غیر منظوم ڈرامے اور جانے کیا کیا لکھا' نوکری سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنی خود نوشت سوانح عمری "بمبئی کی بزم آرائیاں" بھی جو ترقی پسند ادب کے سیاق و سباق میں بعض زاویوں سے موضوع بحث بن گئی ہے۔ سوانحی سلسلے کی دوسری کڑی "اور بستی نہیں دلی ہے" قسط وار شائع ہو رہی ہے۔

"مری صدا کا غبار" میں ۳۴ نظمیں، ۷۰ غزلیں اور دو منظوم ڈرامے شامل ہیں۔ بعض نظمیں طویل ہیں اور منظوم ڈرامے اسٹیج پر پیش کیے جا چکے ہیں۔

رفعت سروش کی شاعری پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اپنی فہم کی حد تک اس مجموعے کے بارے میں ایک مخصوص زاویے سے میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ پورے مجموعے میں "لفظ" کی اہمیت مرکزی ہے۔ ان کے ہاں لفظ کا تخلیقی استعمال نہ صرف تخلیقی سرچشموں کا ماحصل ہے بلکہ کہیں وہ ماضی سے استمراری بند و بست کا نقطۂ عروج ہے کہیں سوالیہ نشان بن کر (اکثر) شاعر کی خود طوافی کا سبب بنا ہے اور شاعر کو بہت سے حصاروں اور خوش فہمیوں کی حدود سے نکال کر احتساب و تجزیہ کی منزل پر لا کھڑا کیا ہے۔

ابابیل

شاعر : اویس احمد دوراں

صفحات : ۱۵۶

ملنے کا پتا : بک امپوریم ' سبزی باغ ' پٹنہ

اویس احمد دوراں کے نئے شعری مجموعے کی نظموں میں ایسے شاعر کا دل دھڑک رہا ہے جس کی سیاست پر گہری نظر ہے۔ جو غزل کا مزاج شناس بھی ہے۔ اسے زبان پر عبور ہے اور اس کا مدھم لہجہ نرم گفتاری پر دلالت کرتا ہے مگر کہیں کہیں اس میں جھنجھلاہٹ بھی شامل ہوگئی ہے اور بعض مقامات پر لہجے کی بلند آہنگی نعرے کی حدوں میں داخل ہوگئی ہے۔ نعرے بازی کو شاعری میں بھلے ہی کوئی

دیا جائے اور خطابت کو تنقید نقص گردانے مگر سیاست میں
ی زبردست اہمیت ہے۔ اور دوراں کی بعض نظمیں کھلا سیاسی
ا ہوتے ہوئے بھی اپنی ٹریٹمنٹ کے سبب وقار وزن کی حامل ہیں۔
ناعری میں مقامی سطح کے مسائل کا بھی اظہار ہوا ہے یعنی وہ مسائل
ان کے صوبے، شہر اور علاقے کے عوام دو چار ہیں۔ یہ ان کی شاعری
زی وصف ہے، فیض کی شاعری عالمی پس منظر میں کتنا ہی بلند
تی ہو مگر اس کی مقامیت مشتبہ ہے۔ نظریاتی وابستگی کے تہ نشین
ان کی پوری شاعری میں جاری و ساری نظر آتے ہیں ؎

یہ دورِ المناک ــــ اگر یوں ہی رہے گا
آئینے تو مل جائیں گے چہرہ نہ ملے گا

اے خاکِ وطن تو نے ہمیں جب بھی پکارا
سر اپنا ہتھیلی پہ لیے آگے بڑھے ہم

تمھارے شہر میں بولو یہ کون آیا ہے
نئی سحر کی بشارت جواب بھی دیتا ہے

مانا دلِ پُرخوں پر بڑا ظلم کرے گی
یہ غم کی سیہ رات مگر ڈھل کے رہے گی

اچھے شعری مجموعے اب برسوں میں کبھی کبھار آتے ہیں اور ان میں
ر اغلاط راہ پا جائیں تو افسوس ہوتا ہے۔ دوراں کہنہ مشق شاعر ہیں
ی اس مجموعے میں بعض خامیاں کھٹکتی ہیں مثلاً: صفحہ ۱۷۱ کی نظم
ر کا آخری مصرع ؎

بتا اے دل یہ غم کی رات ہے یا روزِ محشر ہے

ا اس کی چنداں ضرورت نہیں تھی کیوں کہ ؎

اقلیت جہاں بھی ہے یہی اس کا مقدر ہے
یہ زخمی بے اماں مخلوق ہر سو زیرِ خنجر ہے

مکمل ہو جاتی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے بھی غم کی
ے کا یہاں کوئی تک ہی نہیں ہے۔ نظم کا اختتام کے
جاری رہنا بہت بڑا نقص ہے جوش کی کئی بہترین نظمیں اسی سبب
کھو بیٹھی ہیں۔

؎ یہ اُداس اُداس گیسو یہ پھٹے پُرانے آنچل
کب اثر کریں گے دوراں مرے شاعروں کے دل پر

اُردو غزل سے علاقہ نہیں رکھتا۔

؎ اِک امن پسند انساں رہتا ہے یہاں اکثر

اکثر بھی یہاں حشوِ محض ہے۔ رہتا ہے تو رہتا ہے اکثر چہ معنی؟

؎ ہاتھ بڑھاؤ توڑ دو اس کو بھاگ کے مت جانے دو

اس مصرعے کو یوں کر دیا جائے تو بہت فصیح اور رواں دواں ہو جائے گا ؎

ہاتھ بڑھا کر توڑ دو اس کو بھاگ کے مت جانے دو

؎ محفل کے یہ پیاسے بھی طرف دار ہیں اس کے

یہاں "یہ" کی نہ تو محاورتاً ضرورت تھی نہ یہ ضرورتِ شعری ہے۔

نئی غزل نئی آوازیں
مصنف: اسعد بدایونی
صفحات: ۱۱۲
قیمت:
ملنے کے پتے: مکتبہ جامعہ
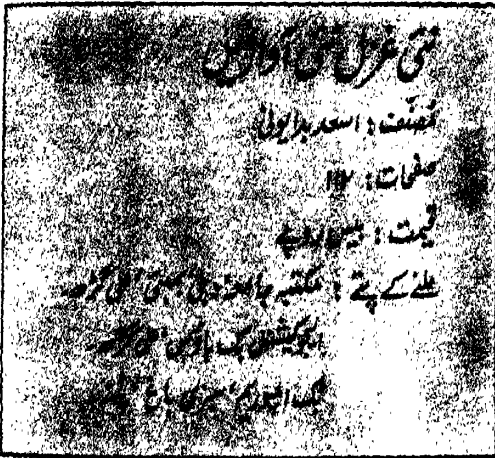
"نئی غزل نئی آوازیں" جدید غزل سے متعلق سات مضامین کا مجموعہ ہے۔ پانچ مضامین جدید غزل پر بہ حیثیت مجموعی اور دو اسی سلسلے کی کڑی کے طور پر دو جدید شاعروں کی شاعری پر وضاحت و صراحت کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ مصنف اپنے پیش لفظ میں مضامین سے متعلق وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میرے یہ مضامین جدید غزل کو سمجھنے کی طالب علمانہ کوشش سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔"

کتاب میں بنیادی حوالہ جدید غزل ہی کا ہے اور اپنے طور پر انھوں نے جو مسائل اٹھائے ہیں انھیں اس دور کے نام نہاد اُردو اساتذہ اور نقاد عام طور پر نہیں اُٹھاتے اور بالعموم اپنے مفروضوں اور مغربی تنقید کے اُلٹے سیدھے تراجم اور ان کی تشریحات کے نام پر اپنی

تاویلات گھسے پٹے الفاظ میں ایسے بیان کرتے ہیں کہ اگر خود ان سے وضاحت کرائی جائے (جو عام طور پر نہیں کرائی جاتی) تو وہ اس وضاحت کو بر سکیں گے اس میں شک کی پوری گنجائشیں موجود ہیں۔ "آٹھویں دہائی کی غزل" میں مصنّف نے غزل کی حمایت میں جامع بحث کی ہے یہ موضوع کا تقاضہ بھی تھا اور غزل کا قرض بھی جو ہماری مہتمم بالشان شعری روایت کے نہ صرف تسلسل بلکہ عہد بہ عہد ارتقا کی نشاندہی کرتی ہے اور ہمارے کلاسیکل ادبی سرمایے کا بڑا حصّہ اس پر مشتمل ہے۔

مگر مصنّف کی تحریر میں ہر قدم پر الجھاؤ اور تضاد موجود ہے وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ شاید ان کے ذہن میں پوری طرح واضح نہیں ہے یا پھر وہ اپنے مافی الضمیر کے اظہار پر قادر نہیں۔ وہ جتنے ادق مباحث اٹھاتے ہیں ان پر اتنی تفصیلی بحث نہیں کرتے جس کے وہ متقاضی ہوتے ہیں۔

مصنّف کے بیان میں جو تضادات نظر آتے ہیں۔ اس کا سبب وہ مفروضے ہیں جنھیں صحیح ثابت کرنے کے لیے وہ تاویلات تراشنے پر مائل ہیں۔ کتاب میں اس کے مختصراً چند مظاہر دیکھیے:

"وہ شعرا، جو ۱۹۷۰ء میں تیس پینتیس برس کے تھے
اب خود سٹھیانے کے قریب پہنچ چکے ہیں اور ان کے تخلیقی
عمل میں سڑاند پیدا ہوگئی ہے" (صفحہ ۷)

یہ صرف اور صرف مفروضہ ہے جو شاعر ۱۹۷۰ء کے آس پاس تیس پینتیس برس کے تھے (اور کسی حد تک محترم تھے) اگر ان کا تخلیقی سفر جاری رہا ہے تو وہ آج بھی نہ صرف اُردو شاعری کا محبوب و محترم نام ہیں بلکہ نصف آخر کی ادبی تاریخ کا ناقابلِ فراموش حصّہ ہیں۔ کیا مصنّف شاعری کی شروعات کے لیے سرکاری استصواب کی عمر اور خاتمے کے لیے سرکاری و نیم سرکاری نوکریوں سے سبکدوشی کی عمر کا تعین کرنا چاہتے ہیں۔ سردار جعفری، منیر نیازی، مخمور سعیدی، مظفر حنفی اور بشیر بدر ایسے بہت سے محترم شعرا کم و بیش عمر کی انھی حدود میں آتے ہیں۔ پوری کتاب میں منیر نیازی کہیں نظر نہیں آئے ممکن ہے ان کی شاعری مصنّف کے نزدیک قابلِ اعتنا نہ ہو یا پھر وہ انھیں جدید اور نئے شعری رویّوں کا شاعر تصوّر نہ کرتے ہوں۔ جبکہ ایسے کئی نام مصنّف نے جدید شاعری کے اہم نام تصوّر کیے ہیں جنھیں کبھی کوئی اہمیت حاصل نہیں رہی اور ان کے وہی اشعار حوالوں میں مندرج ہیں جو شعریت ہی نہیں زبان کے اعتبار سے بھی محلِ نظر ہیں۔

تضاد کی ایک اور مثال:

"نئی نسل نے غالب کو اپنے سامنے تو ضرور رکھا لیکن
اس نے غالب کو اس طرح من و من نہیں اپنایا
جس طرح ترقی پسند تحریک کے پیش رو غزل گو شعرا
نے کیا تھا۔" (صفحہ ۲۲)

"لیکن ترقی پسند تحریک' جو راست بیانی پر زیادہ اصرار
کرتی رہی ہے اس نے غالب سے قدرے انحراف کی
کوشش کی" (صفحہ ۹)

"ترقی پسندوں کے نزدیک شاعری کو جن مقاصد کا
پابند ہونا چاہیے وہ ہرگز نہیں۔ شاعری داخلی جذبوں
کا اظہار ہے" (صفحہ ۶۰، ۶۱)

دونوں حوالوں کا تضاد واضح ہے۔

ایک اور مفروضہ ملاحظہ ہو:

"نئی غزل میں عشق کا تصوّر اس تصوّر سے قطعی
مختلف ہے جو ماضی قریب میں صوفی شعرا یا اُن سے
متاثر شاعروں کے یہاں نظر آتا ہے اور مجاز سے حقیقت
تک کے سفر کا وسیلہ بنتا ہے" (صفحہ ۳۰)

اس مفروضے کا اطلاق جدید شاعروں پر دس فیصد سے زیادہ نہیں ہوتا۔ جدید شاعری کے خیمے میں ایسی ہزاروں مثالیں موجود ہیں ۔

سنگ بھی پھینکتا رہتا ہے کہیں ساحل سے
اور پانی میں بھی ہلچل نہیں ہونے دیتا
عالمِ ذات میں درویش بنا دیتا ہے
عشق انسان کو پاگل نہیں ہونے دیتا
(سلیم کوثر)

جو تری روح ترے جسم سے آزاد کرے
اور تجھے یاد نہ آئے اسے رب کہتے ہیں
(ظفر اقبال)

اُردو کتابیں اغلاطِ کتابت کی ایک روایت رکھتی ہیں اور اس سے انقطاع کے امکانات مستقبل قریب میں تو نظر نہیں آتے۔ اس کتاب میں بھی ایسی متعدد اغلاط موجود ہیں مثلاً CRAZE کی جگہ CREAZ

اور DIMENSION کی جگہ DEMANSION عجب بہار دکھاتے ہیں۔ نئی غزل سے متعلق بالکل نئے چند معروف اور معتبر نام برسبیلِ تذکرہ بھی کتاب میں کہیں نظر نہیں آئے۔

عکسِ تخیل
شاعر: شاکر انصاری
صفحات: ۱۶۸
قیمت: پندرہ روپے
ملنے کا پتا: شاکر انصاری، ۳۸۸ انصاریان، سکندرآباد

آزادی کے بعد اردو سے متعلق بلند بانگ سیاسی نعروں سے اگر اردو کو کوئی ضمنی فائدہ ہوا بھی تو اس کی تمام تر سوغاتیں بڑے شہروں تک ہی محدود رہیں۔ مفروضے جب خاص حدود سے گزر کر حقیقت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو ان کی تردید مضحکہ خیز بن جاتی ہے اور تردید کرنے والا تماشہ۔ اور یہ بات اردو کے نئے شعری رویوں پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ جدید شاعری ہو یا ترقی پسند شاعری، یا پھر دوسرے شعری و ادبی میلانات اور رویے۔ ان کا بہت تھوڑا حصہ ان قدیم قصبات تک پہنچا جنھوں نے زبان کو زندہ رکھا اور عقیدوں کی طرح اس کی حفاظت کی۔

سکندرآباد یوپی کا ایک قدیم قصبہ ہے۔ یہاں نویں دہے سے قبل مشاعری کا مطلب طرحی غزلوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ کلاسیکل حصاروں نے کسی نئے میلان سے یہاں کے شعرا کو متعارف نہ ہونے دیا۔ شاکر انصاری بھی انھی لوگوں میں ہیں جو شعر و ادب کی قدیم ترین روایات کے امین ہیں اور ان کی حفاظت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ ان کی شاعری ان کے مذہبی عقیدوں کی ترجمان ہے۔ ان کے یہاں غزل کا ستھرا ذوق اور اسے اس کی روایت سے منقطع نہ کرنے کا پرخلوص جذبہ کارفرما نظر آتا ہے ؎

زلف پیچاں ہٹائیے رُخ سے
ایک مرکز پہ آگئے دن رات

جدید رنگ تمدن کو ساز ہے درکار
تم آج طرزِ کہن کا رباب لے کے اٹھو

مدھم نظر آنے لگے اب زیست کے سائے
خوں اپنا چراغوں میں جلانے کے لیے دے

راز کھل جائے محبت کا نہ دھڑکن سے تری
دلِ بیتاب ٹھہر جا کوئی آتا ہوگا

لیکن شاکر انصاری جب دانستہ ناصح بننے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کی شاعری کا وقار بری طرح مجروح ہو جاتا ہے۔

چند خامیوں کے باوجود یہ مجموعہ تازہ ہوا کا ایسا جھونکا ہے جو اپنے اندر پرانے موسموں کی خوشبوئیں سمیٹے ہوتے ہے۔
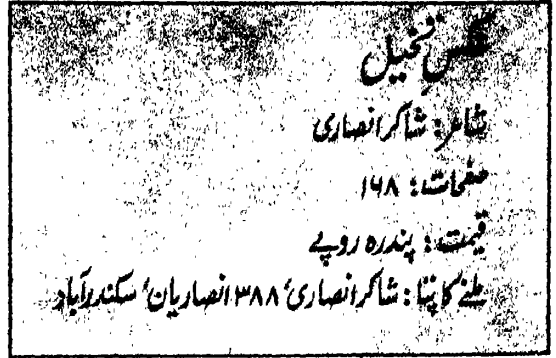
صحرا کی دھوپ
شاعر: ساحر شیوی
صفحات: ۱۳۶
قیمت: چالیس روپے
ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، گولا مارکیٹ، دریا گنج
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ساحر شیوی ارضِ کوکن کے معروف شاعروں میں ہیں اور جہاں جہاں اردو شاعری سے دلچسپی رکھنے والے لوگ موجود ہیں، وہاں وہاں ان کا نام اور کلام جانا پہچانا ہے۔ "صحرا کی دھوپ" ان کا تیسرا مجموعۂ کلام ہے جس میں شاعری کی قریب قریب سبھی مروجہ اصناف شامل ہیں۔ اس سے ساحر صاحب کی پُرگوئی اور قدرتِ کلام کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شاعر کسی خاص صنفِ سخن میں زیادہ کامیاب نظر آتا ہے لیکن ساحر صاحب غزل، نظم، رباعی، قطعہ ہر جگہ اپنی مزاجی کیفیات اور اپنے رجحانِ طبع کے مطابق ایک ہی سطح پر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے آزاد غزلیں بھی اس مجموعے میں شامل کی ہیں جسے محض ایک ایسے فیشن کے اتباع کا نام دیا جا سکتا ہے جو اب خاصا باسی ہو چکا ہے۔

کتاب اسی خوش سلیقگی کے ساتھ شائع کی گئی ہے جس کے لیے موڈرن پبلشنگ ہاؤس معروف ہے۔

—— اطہر فاروقی

امیر خسرو پر بین الاقوامی کانفرنس/ اقبال — اُردو اور ہندوستان/ عالمی سیمینار/ بابو جگ جیون رام اُردو کے مخالف تھے/ اُتر پردیش میں تعلیم بالغان کا پروگرام/ مسلم اقلیت کے اضلاع تک اُردو کو محدود کرنا درست نہیں/ معلّم اُردو بی ایڈ کے مساوی/ بشیر بدر ہندو دوستوں کی خبرسگالی سے متاثر۔

اُردو کا خبرنامہ

امیر خسرو پر بین الاقوامی کانفرنس

امیر خسرو سوسائٹی امریکہ کے زیر اہتمام، شکاگو میں پہلی بین الاقوامی کانفرنس ۲۹ مئی سے ۲ جون ۱۹۸۷ء تک ہوئی۔ اس میں نو ملکوں کے مندوبین اور محققین نے شرکت کی۔ کانفرنس کا افتتاح ہارورڈ یونیورسٹی کی مشہور جرمن مستشرق، پروفیسر انماریہ شمل نے کیا۔ جنھوں نے امیر خسرو کی شعری تخلیقات اور نثری نگارشات کو انسانیت کی آواز بتایا۔ کانفرنس کے کُل دس اجلاس ہوئے۔ اجلاسوں میں امیر خسرو کی تخلیقی شخصیت کے مختلف جہات زیر بحث آئے۔ جہات تھے: برصغیر ہند میں فارسی ادب کی روایت، تہذیب و ثقافت پر امیر خسرو کے اثرات، ایرانی شعری روایت سے تقابلی مطالعہ، اُردو اور ہندی کے ارتقا میں امیر خسرو کا حصّہ، صوفی روایت اور امیر خسرو، امیر خسرو پر تحقیق کے نئے امکانات، ہندوستانی موسیقی پر امیر خسرو کے اثرات: خیال گایکی اور موسیقی کی روایت پر اثر ——— ایک پینل مباحثہ "اعجاز خسروی" اور اُس کے انگریزی ترجمے سے متعلق مسائل پر بھی ہوا۔

یہ کانفرنس شکاگو یونیورسٹی، اور نارتھ ایسٹرن ایلی نائے یونیورسٹی کے تعاون سے منعقد ہوئی، اور اس کے اجلاس اورینٹل انسٹی ٹیوٹ اور انٹرنیشنل ہاؤس شکاگو یونیورسٹی میں ہوئے۔ ۳۰ مئی کو ایک تقریب میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تازہ کتاب "امیر خسرو کا ہندوی کلام بمعہ نسخہ برلن، ذخیرۂ اشپرنگر" اور ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کی ہندی کتاب: "امیر خسرو کی ہندی شاعری" کی رسم اجرا بھی عمل میں آئی۔ یہ دونوں کتابیں امیر خسرو سوسائٹی آف امریکہ نے شائع کی ہیں۔

اس یادگار تقریب میں ممتاز محققین کو ایوارڈ بھی دیے گئے: "شانِ خسرو" ایوارڈ پروفیسر انماریہ شمل کو سرپرستی اور تعاون کے لیے دیا گیا۔ "نذرِ خسرو" ایوارڈ چار دانشوروں کو پیش کیے گئے: پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر شہاب سرمدی، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی۔ موسیقی کی ممتاز خدمات کے لیے "نذرِ خسرو" ایوارڈ شیو کمار شرما کو "سنتور" کے لیے اور ذاکر حسین کو "طبلہ" کے لیے دیے گئے۔

اس موقع پر پروفیسر واین بیگلے نے امیر خسرو کے مزار سے متعلق معلومات افزا سلائیڈ ——— لیکچر دیا، اور ڈاکٹر آصفہ زمانی نے امیر خسرو کی غزلیں باللحن پیش کیں۔ موسیقی پر دو اجلاس ہوئے، اور امیر خسرو سے منسوب مقامات اور پردوں کے ضمن میں "اعجاز خسروی" کے متعلقہ باب کا انگریزی ترجمہ بھی زیر بحث آیا۔ زائچوں کی مدد سے، علم ہیئت و نجوم کے وہ مسائل جو امیر خسرو کی شاعری میں اُبھر کر سامنے آتے ہیں اُن

، پہلی بار غور کیا گیا ۔ مزید تحقیق کے بارے میں طے پایا کہ سوسائٹی
بازخسروی" کی پانچوں جلدوں کو بہ تصحیح و حاشیہ شائع کرے گی،
ہ کہ مندرجات کی تلخیص اور اُس کا ترجمہ انگریزی میں بھی مرتب
جائے گا۔ اس کے علاوہ فارسی دواوین اور "خمسۂ خسرو" کو
نیا تکملہ دے کر دوبارہ شائع کیا جائے گا، کیوں کہ یہ مجموعے اب
نہیں ۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے زیرِ اہتمام علامہ
ل پر ایک چار روزہ بین الاقوامی سمینار منعقد ہوا۔ اس سمینار کا
اد یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے ایما پر ہوا اور اس کے لیے مالیہ بھی
ن نے فراہم کیا۔ پروفیسر آل احمد سرور نے کلیدی خطبہ دیا جس میں
ں نے اقبال کا وہ بیان یاد دلایا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ میرا
کلام فارسی میں ہے۔ پروفیسر سرور نے کہا کہ اقبال کا کلام شاعری
منظوم فلسفہ ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر سید ہاشم علی
حاضرین کا خیر مقدم کیا۔

سمینار میں ملک اور بیرونِ ملک کے اکیاون فارسی اور اُردو کے
وں نے شرکت کی۔ اقبال کی شاعری اور حیات سے متعلق چوالیس مقالے
ے گئے۔ پاکستان اور افغانستان سے دو دو اور ایران سے ایک مندوب
شرکت کی۔ سمینار کے ڈائرکٹر پروفیسر وارث کرمانی تھے۔

ایران کے سابق رکنِ مجلس ڈاکٹر فخرالدین حجازی اور مہندس
م رضا اربابی نے اور افغانستان کے پروفیسر عبدالاحمد (سابق وائس
سلر کابل یونیورسٹی) اور پروفیسر محمد صالح پروتہ نے اپنے اپنے ممالک پر
ل کی شاعری کے اثرات پر روشنی ڈالی۔

پاکستان سے بھی دو اسکالر تشریف لائے تھے۔ ڈاکٹر نذیرِ علامہ اقبال
ن ایر یونیورسٹی اسلام آباد میں شعبۂ اُردو کے صدر ہیں۔ انھوں نے غالب
اقبال کا موازنہ پیش کیا اور کہا کہ غالب کی اُردو شاعری اقبال سے
ہے جبکہ اقبال کی فارسی شاعری غالب کی فارسی شاعری پر فوقیت رکھتی

ہے۔ غالب صرف ہندوستان اور ایران کے علوم و فنون کے نمائندہ تھے
لیکن اقبال ہندوستان، ایران اور یورپ کے فلسفے کی نمائندگی کرتے تھے۔
پاکستان کے دوسرے مندوب بھی اسی یونیورسٹی میں شعبۂ اقبالیات کے
صدر ہیں۔ ڈاکٹر محمد ریاض نے اقبال کے شاعرانہ اسلوب اور الفاظ کے
استعمال کی نزاکتوں پر سیر حاصل بحث کی اور کہا کہ جہاں انھیں فارسی میں
مناسب و موزوں الفاظ نہ ملے وہاں انھوں نے نئے الفاظ اور ترکیبیں وضع
کرلیں مثلاً "جنگاہ" (جنگ گاہ کا مخفف) وغیرہ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ
اقبال کو فارسی زبان پر کتنا عبور تھا۔

دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے "اقبال کے خطوط"
پر اپنے مقالے میں ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک پر تنقید کی اور کہا
کہ آزادی کے بعد ہندوستان میں اقبال کو نظر انداز کر دیا گیا اور پاکستان
میں انھیں حکیم الامت، مفکرِ پاکستان اور خالقِ پاکستان بنا دیا گیا اور فراعنہ
مصر کی ممیوں کی طرح ان کو بھی ممی بنا لیا کیوں کہ پاکستان کو ان کی ضرورت ہے۔
پاکستانی کہتے ہیں کہ سرسید اور شبلی تک نے پاکستان کا تصور دیا تھا اور
پاکستان موہنجوداڑو کے زمانے سے قائم ہے۔ جو مضحکہ خیز بات ہے۔ پروفیسر
خواجہ احمد فاروقی نے اپیل کی کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں مل کر ایک
منصوبے کے تحت اقبال کی سوانح پر ایک جامع کتاب مرتب کریں جس سے ان
کے خطوط تاریخ وار سامنے آسکیں۔ جن سے ان کی شخصیت کے وہ پہلو سامنے
آئیں جو پوشیدہ ہیں۔ پاکستان کے تصور سے متعلق اقبال سے جو باتیں منسوب
کی جاتی ہیں ان کی تردید کرتے ہوئے پروفیسر فاروقی نے اقبال کے دو خطوط کے
حوالے دیے۔ ایک کلکتے کے راغب احسن کے نام ہے اور دوسرا ایک — انگریز
اسکالر ایڈورڈ تھامسن کے نام ہے۔ تھامسن نے اقبال کی کتاب (SNLUCTURES)
پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اقبال پاکستان کا پرچار کر رہے ہیں۔ اس کے
جواب میں اقبال نے لکھا کہ "پاکستان میری اسکیم نہیں ہے۔" اقبال نے لکھا کہ
"شمالی مغرب میں مسلم اکثریت کا ایک صوبہ بنایا جائے جو انڈین فیڈریشن
کا حصہ ہو۔" یہ ان کی تجویز تھی۔ جبکہ پاکستان ایک علاحدہ مملکت کا تصور تھا۔
اقبال کی وطن دوستی اور ہندوستان پرستی کی نظموں کے متعلق ایک
مقالے پر بحث کے دوران کسی نے کہا کہ یہ نظمیں اقبال کی "نابلوغتِ فکر" کے
زمانے کی ہیں۔ جگن ناتھ آزاد نے اس سلسلے میں اقبال کی مختلف کتابوں اور
نظموں کا حوالہ دے کر ثابت کیا کہ آخری ایام تک اقبال ہندوستان کی
وحدت کے خواہاں تھے۔ انھوں نے اس امر پر اظہارِ افسوس کیا کہ جب

بھی اقبال کی وطن پرستی کا سوال اٹھتا ہے تو اس کو سیاسی بحث میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔

پاکستانی مندوب ڈاکٹر ریاض نے پروفیسر تارا چرن رستوگی کے اس بیان سے اتفاق کیا کہ اقبال کا پیغام صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ ساری دنیا کے مظلوموں کے لیے تھا۔

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین نے اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کے مذہبی اور سیاسی تصورات کا ایک تقابلی جائزہ پیش کیا اور کہا کہ اقبال کا خطاب مسلمانوں سے ہے لیکن ان کی مخاطب ساری دُنیا کی مظلوم اقوام ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان میں جب تک مسلمان ترقی نہیں کریں گے اس وقت تک ملک بھی ترقی نہیں کر سکتا۔ اور یہی تصور مولانا آزاد کا بھی تھا۔ دونوں فرقہ پرستی کے خلاف تھے۔

مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ فزکس کے ڈاکٹر حبیب انصاری نے اقبال اور سائنس کے عنوان سے بے شمار اشعار پیش کیے اور ثابت کیا کہ یہ شاعر کے مبالغے اور تصور کا کرشمہ نہیں بلکہ علمی حقائق کا سادہ سا بیان ہیں۔ کیوں کہ اقبال کا سائنسی مطالعہ بہت وسیع تھا۔

ڈاکٹر انور رضوی نے تین تجاویز پیش کیں جنھیں اتفاق رائے سے منظور کیا گیا۔ ایک تجویز اقبال انسٹی ٹیوٹ کے قیام سے متعلق تھی۔ دوسری تنقیدی نوٹس کے ساتھ اقبال کے کلام کی اشاعت اور تیسری اقبال پر انسائیکلو پیڈیا کی تدوین سے متعلق تھی۔

بابو جگ جیون رام اردو کے مخالف تھے

جناب اندر کمار گجرال سابق مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات نے انکشاف کیا ہے کہ آں جہانی جگ جیون رام "گجرال کمیٹی" کی سفارشات کو روبہ عمل لانے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ ایمرجنسی کے نفاذ کے کچھ عرصے بعد جب اس وقت کی وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی نے اُردو کی بقا و ارتقا کے سلسلے میں گجرال کمیٹی رپورٹ مرکزی کابینہ میں پیش کی تو حیرت انگیز طور پر شری جگ جیون رام نے گجرال کمیٹی کی رپورٹ کی شدید مخالفت کی۔ وہ رپورٹ کو دیکھنا تک نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے برہمی کے ساتھ یہاں تک کہہ دیا تھا کہ "آپ چور دروازے سے اُردو کو ہندی کے برابر لانا چاہتے ہیں۔" مسٹر آئی۔ کے۔ گجرال نے کہا کہ اس وقت کے وزیر تعلیم پروفیسر نورالحسن (موجودہ گورنر مغربی بنگال) نے شری جگ جیون رام کو سمجھانے کی کوشش کی کہ رپورٹ میں ایسی بات نہیں ہے جو اُردو اور ہندی کے درمیان تصادم کا سبب بن سکے۔ لیکن بابوجی کچھ سننے سمجھنے کو تیار نہ تھے۔ وہ صرف "نہیں نہیں" کہتے رہے۔ مسٹر گجرال نے ملک میں اُردو کی حیثیت، مقام اور اس کے درجے کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اُردو بولنے والوں کے لیے تعلیمی ثقافتی اور انتظامی سہولتیں مہیا کرنے کے طریقۂ کار کے متعلق تجاویز پیش کرنے کے سلسلے میں ۱۷ رکنی کمیٹی کے ساتھ بہ حیثیت چیئرمین سارے ملک کا دورہ کیا تھا۔ کمیٹی اُتر پردیش اور بہار کے دو وزرا سربرآوردہ شخصیتوں، یونیورسٹیز کے تین وائس چانسلرز، چوٹی کے صحیفہ نگاروں، چار مرکزی جوائنٹ سیکریٹریز اور دو پروفیسروں پر مشتمل تھی۔ مسٹر گجرال نے آگے چل کر کہا کہ جب کابینہ کے اجلاس میں شری جگ جیون رام شدت کے ساتھ مخالفت کر رہے تھے۔ اس وقت شریمتی اندرا گاندھی بالکل خاموش تھیں، چونکہ وہ ایمرجنسی کا ابتدائی دور تھا اس لیے شاید شریمتی گاندھی کوئی نیا مسئلہ کھڑا کرنے سے گریز کر رہی تھیں۔ بالآخر شریمتی گاندھی نے پروفیسر نورالحسن سے کہا کہ ہم اس پر بعد میں غور کریں گے اور پھر محنت شاقہ سے تیار کی گئی یہ رپورٹ سرد خانے میں ڈال دی گئی۔ مسٹر گجرال نے ایک اور حیرت انگیز انکشاف کیا کہ نوکر شاہی کو اس بات کا یقین تھا کہ رپورٹ کی تمام کاپیاں اس نے واپس لے لی ہیں۔

لیکن پارلیمنٹ کے چند ممبران نے اس تعلق سے آواز بلند کی۔ ان میں مرحوم سکندر علی وجد اکثر راجیہ سبھا میں پروفیسر نورالحسن سے رپورٹ کے بارے میں دریافت کرتے رہے۔ ہر بار یہی نپا تُلا جواب دیا جاتا کہ رپورٹ پر غور کیا جارہا ہے۔ بالآخر وجد نے یہ مصرع چست کر دیا ؎

تنگ آگئے ہیں سستی نورالحسن سے ہم

مسٹر گجرال نے کہا کہ ۱۹۷۷ء میں جب جنتا پارٹی برسرِ اقتدار آئی تو یہ بھی اُردو کی عاشقِ زار نہ تھی۔ اس کے وزیر تعلیم پی۔ سی۔ چندر نے اس معاملے میں پروفیسر نورالحسن ہی کے نقش قدم پر چلنے میں عافیت محسوس کی۔ انھوں نے گجرال کمیٹی رپورٹ کو زیادہ مضبوطی سے باندھے رکھا۔ لیکن برسرِ اقتدار پارٹی کے صدر مسٹر چندر شیکھر نے ایک پریس کانفرنس میں رپورٹ کو جاری کر دیا۔ پھر وزیر تعلیم کے لیے اس کے سوا

دئی چارہ نہیں تھا کہ رپورٹ کو پارلیمنٹ میں پیش کیا جاتا۔ رپورٹ
ن کردی گئی۔ طرفہ تماشا یہ تھا کہ رپورٹ چھپوانے کی بجائے صرف
ئیکلو اسٹائل کا بیان تقسیم کردی گئیں۔ مسٹر گجرال نے کہا کہ ۱۹۸۰ء
عام انتخابات میں مسلمانوں نے ایمرجنسی کے دوران "ماں بیٹے" کی
ادتیوں کو معاف کر دیا اور کانگریس پھر سے برسرِ اقتدار آگئی۔ اس نے
دو کے ساتھ انصاف کا تیقن دیا۔ لیکن انتخابی منشور میں گجرال کمیٹی
وئی ذکر تک نہیں تھا۔ انھوں نے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ
دو کے معاملے اور مسئلے میں کانگریس میں دو گروپ ہیں۔ ایک حامی
سرا مخالف ہر اس معاملے میں جس کا تعلق فرقوں سے ہو، کانگریس
یشہ دو حصّوں میں بٹ جاتی ہے۔

اتر پردیش میں تعلیمِ بالغاں کا پروگرام

اتر پردیش کے وزیرِ تعلیم جناب سیّد سبط رضی نے محکمۂ تعلیم کے
ام کو ہدایت کی ہے کہ ریاست کے تیرہ اضلاع میں جہاں اقلیتی فرقے کی
ادستی ہے، وہاں اُردو ذریعۂ تعلیم کے ساتھ تعلیم بالغاں کے پروگرام پر
ل کریں۔

جناب سبط رضی نے بتایا کہ سہ لسانی فارمولے کے تحت جونیئر ہائی
کولوں میں درجۂ ششم سے درجۂ ہشتم تک اُردو تعلیم کا انتظام ہے۔ انھوں
کہا کہ اتر پردیش میں ۸۱۴ ایسے مکتب ہیں جنھیں سرکاری امداد ملتی ہے۔
نیئر ہائی اسکولوں میں اُردو تعلیم کی سہولت کے لیے مجموعی طور پر پانچ ہزار
دو اساتذہ کے لیے جگہیں پیدا کی گئی ہیں اردو اساتذہ کی دستیابی کو
نظر رکھتے ہوئے لکھنؤ، میرٹھ، آگرہ اور وارانسی میں اُردو ٹیچروں کے لیے
بی ٹی سی ٹریننگ سینٹر قائم ہیں۔

مسلم اقلیت کے اضلاع تک اُردو کو محدود کرنا درست نہیں

اُردو رابطہ کمیٹی کے چیئرمین رام لعل نے وزیرِ تعلیم اُتر پردیش
ب سیّد سبط رضی کے اس اعلان کو کہ ریاست میں صرف تیرہ اضلاع
جہاں مسلم اقلیت کے لوگ زیادہ تعداد میں رہتے ہیں' اُردو کو تعلیم
بالغان کے لیے ذریعۂ تعلیم بنایا جائے گا' ایک افسوس ناک اقدام قرار
دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس سے ریاست میں فرقہ واریت کو تقویت ملے گی جو پہلے
ہی کشیدگی کے دَور سے گزر رہی ہے اور اس کے لیے کانگریس حکومت
ہی ذمّے دار ہوگی۔

انھوں نے کہا کہ کانگریس نے آزادی کے بعد اُردو کو صرف ایک
فرقے کی زبان قرار دے کر مسلم لیگ کے اس موقف کو صحیح ثابت کر دکھایا
ہے کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ رام لعل نے کہا کہ زبانی طور پر
تو کانگریس اُردو کو سارے فرقوں کی زبان کہتی ہے لیکن عملی طور پر اسے
صرف ایک فرقے کی زبان قرار دے کر اس کی ترقی کے جھوٹے وعدے کرتی رہی
ہے۔ انھوں نے کہا کہ ۱۹۷۳ء اور ۱۹۸۵ء میں آل انڈیا غیر مسلم اردو
مُصنّفین کانفرنس نے ایک قرار داد کے ذریعے حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ
اُردو کے وارثوں میں ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی سبھی شامل ہیں۔
اس لیے اُردو کی تعلیم کا انتظام سارے فرقوں کے لیے کیا جانا چاہیے ورنہ
اُردو کی ترقی ممکن نہیں ہوگی۔

معلّمِ اُردو بی ایڈ کے مساوی

جامعہ اُردو (علی گڑھ) کے امتحان معلّمِ اُردو کو دہلی ایڈمنسٹریشن نے
بی ایڈ کے مساوی تسلیم کر لیا ہے۔ حکومت ہند (مرکزی) اور حکومتِ اتر پردیش
نے معلّمِ اُردو پاس شدہ کو ہائر سیکنڈری درجات تک اُردو پڑھانے کے لیے
تقرر کا مجاز قرار دیا ہے۔

بشیر بدر ہندو دوستوں کی خیر سگالی سے متاثر

اُردو کے مشہور شاعر بشیر بدر اپنے ہندو دوستوں اور پڑوسیوں
کی خیر سگالی سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ میرٹھ کے حالیہ فرقہ وارانہ فسادات
کے دوران شاستری نگر محلّے میں ان کے ہندو دوستوں نے ان کے اہل
خاندان کی جانیں بچائی تھیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ اگرچہ وہ اپنے گھر سے
محروم ہوگئے جسے فسادیوں نے لوٹنے کے بعد نذرِ آتش کر دیا تھا لیکن
املاک کے نقصان سے وہ مایوس نہیں ہوئے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ
اس المیے نے انھیں زیادہ انسان بنا دیا ہے۔

یہ کالم آپ کے اظہارِ خیال کے لیے ہے۔ "ایوانِ اُردو دہلی" میں شائع شدہ تحریروں پر اپنی رائے اس کالم میں ظاہر کیجیے اور کوئی اختلافی نکتہ ہے تو اس کا اظہار بھی کیجیے۔ اختصار کو ضرور ملحوظ رکھیے۔

● کسی ادبی رسالے کا آغاز ہی اس کے مستقبل اور انجام کی خبر دے دیتا ہے۔ "ایوانِ اُردو دہلی" کا آغاز اس کے خوش آیند مستقبل کا آئینہ دار ہے۔

رسالے میں دہلی ایڈمنسٹریشن کے کئی حکّام کے پیغامات اُردو اسکرپٹ میں نہیں بلکہ اُردو زبان میں اور خود انھی کی تحریر میں دیکھ کر حیرت انگیز مسرّت ہوئی۔

—— شہپر رسول، علی گڑھ

● آپ نے جس محنت اور لگن سے "ایوانِ اُردو دہلی" کو ترتیب دیا ہے مجھے اُمید ہے یہ پیش کش ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔ اور اسے قبولِ عام حاصل ہوگا۔ انشاء اللہ!

—— عرفان زیدی، رامپور

● "ایوانِ اُردو دہلی" کے اہلِ قلم کی کامیاب کاوشوں پر میرا پیغام تہنیت اپنے مؤقر جریدے کے توسّل سے پہنچا کر شکر گذاری کا موقع عنایت کریں۔ فرداً فرداً مبارکباد دینے کے ارمان پتّے کی عدم موجودگی کی وجہ سے مچل کر رہ گئے۔

—— آس محمد، ٹیٹا گڑھ

● "ایوانِ اُردو دہلی" بہت پسند آیا۔ اس کے مشتملات باوقار اور مُفید ہیں اور ادبی معیار پر بھی پورے اترتے ہیں۔ بلاشبہ اُردو اکادمی دہلی گذشتہ چند برسوں سے بہت سرگرم اور فعّال ہے۔ اس نے اُردو زبان وادب کے لیے جو کچھ بھی کرنے کی کوشش کی ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ لیکن "ایوانِ اُردو دہلی" کا اجرا ہم اُردو قارئین پر اکادمی کا ایک بڑا احسان ہے۔

—— ایم۔ اے۔ مشتاق، شکری، مدھوبنی

● اتنا شاندار پرچہ نکالنے پر اُردو اکادمی قابلِ تعریف ہے۔ ایک چھوٹا سا مشورہ پیش ہے کہ ہر فنکار کے نام کے ساتھ اس کا پتا بھی درج ہو تو شاید مغالطہ نہ ہو کیوں کہ آج کل ایک ہی نام یا تخلّص کے بہت سے ادیب اور شاعر ہیں۔

—— غلام احمد، تما پور

● "ایوانِ اُردو دہلی" بہت پسند آیا۔ مشمولات کے تعلّق سے ادارے کی جانب سے اہمیت خیز اشارے ساری تحریریں پڑھوا لیتے ہیں۔ دہلی سے ایسے ہی علمی اور تحقیقی پرچے کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔

—— رونق شہری، جھریا

● "ایوانِ اُردو دہلی" نظر نواز ہوا۔ پرچے کا حُسن و معیار دیکھ کر آپ حضرات کی کاوشوں کی داد دینی پڑتی ہے۔ آپ نے ہر صنفِ ادب کا احاطہ کرنے کی قابلِ تعریف کوشش کی ہے۔

—— نیاز جے راج پوری، علی گڑھ

● "ایوانِ اُردو دہلی" بہت ہی دلکش اور جاذبِ نظر ہے۔ حصّۂ نثر اور حصّۂ نظم دونوں قابلِ تعریف ہیں۔ "ساقی" اور "تحریک" کے بعد دِلّی سے شائع ہونے والا تیسرا معیاری رسالہ یقیناً "ایوانِ اُردو"

ہی ہے۔ ادبی رسائل میں اتنا متنوع مواد عام طور پر کہاں ہوتا ہے۔

—— ڈاکٹر ہلال فرید، علی گڑھ

● "ایوانِ اُردو دہلی" کا پہلا شمارہ پڑھ چکا تھا۔ آج دوسرا شمارہ بھی بک اسٹال سے خریدا۔

محترم خلیق انجم نے دہلی کے بارے میں اچھا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس کے بعد ہندوستان کے دیگر شہروں کے بارے میں مکمل مضامین لکھوائے جاسکتے ہیں۔ جن سے تہذیب اور تاریخ کے سفر کا اندازہ ہوسکے۔

شمارۂ دوم میں رشید حسن خاں صاحب کا مضمون "اردو میں کبت" معلوماتی اور تحقیقی ہے۔ شفق اور انور خاں کے افسانے پسند آئے۔ "ایک ہاتھ کا آدمی" گہرے تاثر کا حامل ہے۔ انجم عثمانی کو مبارکباد۔ یوسف ناظم صاحب کا انشائیہ "دروازے" ہلکے پھلکے طنز و تبسم کے ساتھ عصرِ موجودہ کی ہجو بھی ہے۔ شعری حصّہ میں شہاب جعفری، مصوّر سبزواری، مظہر امام، مظفر حنفی کی غزلیں پسند آئیں۔

"ایوانِ اُردو" کے حُسنِ صوری پر تو کچھ لکھنا الفاظ ضائع کرنا ہے۔

—— حامد اکمل، ایڈیٹر "ایقان"، گلبرگہ

● دوسرے شمارے میں "یاد بسیرے" میں انور خاں نے بلا وجہ طوالت کو راہ دی ہے۔ محترمہ قرۃ العین حیدر نے تاریخی پس منظر یا اپنے خاندان کو افسانوی رنگ دے کر کتنے ہی اچھے خاصے افسانہ نگاروں کو نقالی کرنے پر اکسا دیا اور وہ اپنی چال بھول کر...... انور خاں نے کتابوں کے نام گنوانے میں ذرا بخل سے کام لیا ہے۔ کچھ اور ناموں کا اضافہ کسی کتب خانے کی فہرست دیکھ کر کرسکتے تھے۔ شفق نے "کانچ کا بازیگر" میں جو تحریر کیا تھا ان کا افسانہ "خواب" اُسی کا EXTENTION معلوم ہوتا ہے۔ انجم عثمانی کا افسانہ "ایک ہاتھ کا آدمی" کوئی دیر پا تاثر نہیں چھوڑتا۔

خلیق انجم صاحب دہلی کے آثار قدیمہ کو پیش کرکے نہ صرف ادبی کام کررہے ہیں بلکہ وہ ایک ایسی ثقافت و تہذیب کو زندگی بخشنے کا کام کررہے ہیں جو لوگوں کے دلوں سے مٹتی جارہی تھیں۔

—— م۔ ق۔ خاں، گیا

● جون ۸۷ء کا شمارہ زیرِ مطالعہ رہا۔ "اُردو میں کبت" (رشید حسن خاں) ایک چونکا دینے والا مضمون ہے۔ محمد خلیل کا "پُرشور ماحول" مفید اور کارآمد ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہے۔ افسانوں میں انجم عثمانی کا "ایک ہاتھ کا آ[دمی]" بے حد متاثر کرتا ہے۔ غزلوں میں مظہر امام، مظفر حنفی، شہاب جعفری کی غ[زلیں] اپنی فنکارانہ پختگی و معنی آفرینی سے آنکھوں کو خیرہ کرتی چلی جاتی ہیں۔

—— فہیم نادر، در[بھنگہ]

● جون ۸۷ء کے شمارے میں مضامین، انٹرویو، انشا[ئیے]، افسانے، غزلیں اور نظمیں سب ہی ایک مخصوص معیار کے ہے۔ تخلیقات نے خاص طور سے متاثر کیا۔

—— عظیم امروہوی، امر[وہہ]

● "ایوانِ اُردو دہلی" پر تبصرہ، قطعے کی صورت میں حاضر [ہے] قبول کریں:

مبارک مہینے سے آغاز کرکے
بڑھائی ہے کیا آپ نے شانِ اُردو
کتابت، طباعت، مضامین کی ندرت
بھئی خوب تحفہ ہے "ایوانِ اُردو"

—— ظہیر صدیقی، پٹنہ

● اُردو دُنیا میں ایک اعلیٰ معیاری رسالے کی کمی کا احساس بڑی شدّت کے ساتھ کیا جاتا رہا ہے۔ آپ نے ایک بڑی کمی پور[ی] کی جو لائق صد تعریف ہے۔

—— محمد اختر حسین، پھوارہ، مدھوبنی

● مجھے کہنے دیجیے کہ بلاشبہ آپ کا نام کسی بھی رسالے کی مقبولیت کی دلیل ہے اور آپ جانتے ہی ہیں یہ صرف رسمی تعریف نہیں۔ محض اپنے کھرے پن کی وجہ سے بے حساب نقصانات ادبی دُنیا میں میرے حصّے میں آئے۔ لیکن سچ کو سچ نہ کہوں ایسا کم از کم مجھ سے ممکن نہیں۔ کوئی خوش ہو کہ خفا — خیر! "ایوانِ اُردو" کو آپ — آپ کو "ایوانِ اُردو" اور ہم ادب کے پیاسوں کو آپ دونوں مبارک۔

—— آمنہ ابوالحسن، نئی دہلی

● "ایوانِ اُردو دہلی" شمارہ نمبر ۲ بابت جون ۱۹۸۷ء میں جناب رشید حسن خاں نے اپنے مضمون میں جو لکھا ہے کہ باغ و بہار ۱۸۰۳ء میں پہلی بار چھپا تھا، وہ سراسر غلط ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۸۰۱ء میں چھپا تھا۔ جناب سکھ دیو شرما رشک سے درخواست ہے کہ براہِ کرم وہ غزل بھی "ایوانِ اُردو" میں چھپوادیں جس کی شان میں ان کا یہ قصیدہ چھپا ہے۔

کاغذ اچھا ہے، کتابت اچھی ہے، چھپائی روشن ہے، مگر سجاوٹ بچکانہ ہے۔ ایک صفحے پر زیادہ سے زیادہ تحریری مواد لانا چاہیے۔

—— اقبال کرشن، کلکتہ

● "سرودِ رفتہ" کا سلسلہ بہت ہی عمدہ ہے لیکن اس کی شروعات تاریخی اعتبار سے ہونی چاہیے تھی۔ اور دہلی میں رہ کر یہ کام کوئی مشکل بھی نہیں۔ دوسرے شمارے میں "اُردو میں کبت" (رشید حسن خاں) اچھا مقالہ ہے۔ رشید حسن صاحب کا شمار اُردو کے چند گنے چنے محققوں میں ہوتا ہے۔ لیکن کبت کے سلسلے میں انھوں نے تحقیق کا حق ادا نہیں کیا۔ انھوں نے اُردو میں کبت کی تاریخ اور تنقید تو لکھی مگر اُس کی تعریف نہ کی جس کی وجہ سے مقالے کی اہمیت کم ہو گئی ہے۔

—— منصور عمر، دربھنگہ

● میں "ایوانِ اُردو دہلی" کے خریداروں کے اُس ہراول دستے سے تعلق رکھتا ہوں کہ جس نے "ایوانِ اُردو دہلی" کے اجرا کا اعلان ہوتے ہی زرِ سالانہ روانہ کر کے خریداری قبول کر لی تھی۔

دوسرے شمارے کے پہلے مقالے "اُردو میں کبت" کے بارے میں جس کے مصنّف جناب رشید حسن خاں ہیں، یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ "کبت" کے صحیح تلفّظ کے لیے اسے ROMAN URDU میں بھی لکھا جائے تو بہتر ہوگا۔ مضمون اپنی جگہ مکمّل ہے لیکن اس مضمون کی دوسری قسط بھی آنی ضروری ہے جس میں اس کی ابتدا، قطعے اور رباعی سے اس کا تقابل، اس کے وضعی اوزان کی اشکال کا احاطہ کیا جائے۔ اِس مضمون کی اتنی اہمیت ہے کہ اس پر پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کا مقالہ بھی تحریر کیا جا سکتا ہے اور یہ واقعی لائقِ تحسین کام ہوگا۔

—— قادر جاوید، حیدرآباد

● "ایوانِ اُردو دہلی" جس نے بھی دیکھا اور پڑھا تعریفی کلمات سے نوازا۔ تمام مشمولات قابلِ مطالعہ ہیں دوسرے شمارے میں جناب شفق کی کہانی بطورِ خاص پسند آئی۔

—— فردوس گیاوی، گیا

● "ایوانِ اُردو دہلی" بہت پسند آیا۔ خُدا اس کی عمر دراز کرے۔ غزلیں، نظمیں اور مضامین سبھی معیاری ہیں۔ اُردو خبر نامہ ہم جیسے دُور دراز کے لوگوں کے لیے بڑا سود مند ہے۔ دوسرے شمارے میں شفق کا افسانہ "خواب" اور انجم عثمانی کا افسانہ "ایک ہاتھ کا آدمی" تاثراتی افسانے ہیں، جو آخر تک قاری کو پکڑے رکھتے ہیں۔ مگر انور خاں کا افسانہ "یاد بسیرے" بے مقصد اور سپاٹ ہے۔ صفحہ ۳۴ کے دوسرے کالم میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

"خورشید کے ذہن میں پیش امام کی صورت گھوم گئی۔ کیسے نورانی بزرگ تھے۔ عالمِ دین۔ مذہب پر کیسی گہری نظر تھی۔ ہر جمعہ کو ظہر کی نماز کے بعد تفسیر بیان کرتے تھے۔" جمعہ کو ظہر کی نماز پہلی بار نظر سے گزرا۔

یوسف ناظم کے "دروازے" بہت دلکش ہیں۔

یہاں کچھ لوگ "ایوانِ اردو دہلی" کی مستقل خریداری قبول کر رہے ہیں۔

—— خلش بڑودوی، بڑودہ

● جون کے شمارے میں یوسف ناظم صاحب کا انشائیہ "دروازے" پسند آیا۔ مظہر امام صاحب، مظفر حنفی صاحب اور شہاب جعفری صاحب کی غزلیں بھی عمدہ ہیں۔ مظہر امام صاحب کا یہ شعر بے حد پسند آیا ؎

یہ سزا کیا ہے کہ جلنے کے لیے شعلے نہ ہوں
ڈوبنے جاؤں تو دریاؤں میں گہرائی نہ ہو

شہاب جعفری صاحب کے دو اشعار بے حد پسند آئے ؎

آگہی تو نے ہمیں کن وسعتوں میں گُم کیا
بے نشاں ہر مُلک میں، بے آسرا ہر گھر میں ہم
زہر کا پیالہ ہو پینا یا اُٹھانی ہو صلیب
صدیوں بعد آئیں مگر ہوتے ہیں اس منظر میں ہم

افسانوں میں شفق اور انور خاں کے افسانے پسند آئے۔ شفق علامتی کہانیاں لکھتے ہیں اور بہت سی باتیں اس پیرایے میں کہہ جاتے ہیں جو دل کو چھو لیتی ہیں۔

"نذرِ جوہر" ظہیر احمد صدیقی صاحب کا پسند آیا۔ یقیناً ایسے لوگوں کو وقتاً فوقتاً نذرانۂ عقیدت پیش کرنا چاہیے چاہے اس کی صنف جو بھی ہو۔

میں جناب محمد اظہر صاحب کے اس خیال سے متفق ہوں کہ تخلیق کار کا مکمّل پتہ بھی درج ہونا چاہیے۔

—— شبیر حسن شبیر، پٹنہ

● "ایوانِ اُردو دہلی" اپنی آپ مثال ہے اور پھر اتنی کم قیمت میں شاید ہی کوئی دوسرا رسالہ ہم کو میسّر ہو سکتا۔

—— اختر عبدالجلیل، محبوب نگر

● کاغذ، گیٹ اپ اور MATTER "ایوانِ اُردو دہلی" ہر طرح سے اچھا لگا۔ مضامین کے اقتسام پر جو مختلف اقتباسات دیے گئے ہیں وہ خوب ہی نہیں بہت خوب ہیں یہ گویا ایک طرحِ نو ہے جو آپ نے ڈالی ہے۔

سرودِ رفتہ کے تحت اساتذہ کی تصویریں اور کلام محفوظ کرنے لائق چیزیں ہیں۔

—— صابر فخرالدین، یادگیر

● "ایوانِ اُردو دہلی" ہمارے شہر میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ کافی خوب صورت اور معیاری رسالہ نکالا ہے آپ نے۔

—— اختر آزاد، جمشید پور

● "ایوانِ اُردو دہلی" بہت پسند آیا۔ خوش نما سرورق، باسلیقہ ترتیب، مضامین کا انتخاب قابلِ صد تحسین ہیں۔ آپ نے یہ رسالہ نکال کر ہم قارئین پر بہت بڑا احسان کیا ہے اس کے لیے ہم آپ کے شکر گذار ہیں۔

—— محمد جاوید، سمستی پور

● اُردو قاری کے مبلغ علم کے تناظر میں مضامین کا تنوع آپ کے بالیدہ فنّی شعور کا غمّاز ہے۔ کتابت، طباعت کی دیدہ زیبی کے لیے بھی دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

—— سیّد اقبال احمد حسنی، شہر گیا (بہار)

● پہلے شمارے میں کیے گئے تمام وعدے وفا ہوئے۔ نظمیں، غزلیں، افسانے سب بیش قیمت ہیں۔

—— فیضان عزیزی، گیا

● "ایوانِ اُردو دہلی" مطالعہ کے بعد طبیعت خوش ہوگئی۔ اگر ادبی سوال وجواب کا سلسلہ جاری کر دیں تو اور بہتر ہو۔

—— عبدالحق انصاری، رانچی

● اُردو اکادمی دہلی نے بڑا ہی خوب صورت دیدہ زیب معیاری پرچہ شائع کیا ہے۔

—— گوربچن سنگھ، جمشید پور

● "ایوانِ اُردو دہلی" بہت عمدہ رسالہ ہے۔ خدا کرے کہ وقت کی پابندی سے منظرِ عام پر آتا رہے۔

—— ممتاز حسین، مظفّر پور

● "ایوانِ اُردو دہلی" نظر نواز ہوا۔ پرچہ بہت شاندار ہے۔ قیمت بھی مناسب ہے۔ سبھی مضامین، افسانے اور غزلیں معیاری ہیں، ایسا اچھا رسالہ نکالنے پر میری طرف سے اور میرے تمام احباب کی طرف سے مبارک باد قبول فرمائیں۔

—— اعجاز احمد، مظفّر پور

● انشاءاللہ تعالیٰ ادبی ذوقِ سلیم کے لیے "ایوانِ اُردو دہلی" تسکین بخش ثابت ہوگا۔ آپ لوگوں کی کاوشیں قابلِ داد ہیں۔

—— محمد ضیاءالحق ضیا، صاحب گنج، بہار

● جلیل القدر اور نامور قلم کاروں کی شمولیت "ایوانِ اُردو دہلی" کے اعلیٰ معیار کی ضامن ہے۔

—— اصغر امام اشک، جمشید پور

● اُردو اکادمی دہلی پہلے سے ہی اُردو کی بیش بہا خدمات انجام دے رہی ہے۔ ماہنامہ "ایوانِ اُردو" شائع کرکے اس نے ایک کمی جو محسوس کی جا رہی تھی، پوری کر دی ہے یہ اُردو کا ایک معیاری رسالہ ہے جو مستقبل میں اُردو کو اس کا جائز مقام دلانے میں نمایاں کردار ادا کرے گا اور مقبولِ عام ہوگا۔

—— نورالحق

(سیکریٹری اترپردیش اُردو ٹیچرز ایسوسی ایشن آنولہ)

● جس معیار و وقار کے ساتھ آپ پرچہ سیٹ اپ کر رہے ہیں، وہ ہر قاری کو متاثر کرے گا۔ ہاں ایک اعتراض ضرور ہے کہ اس کی قیمت کم ہے۔ اگر ہو سکے تو کچھ اضافہ کر دیجیے۔

اُردو کا خبرنامہ اچھا سلسلہ ہے اسے جاری رکھیے۔ کم از کم ہم ایسوں کا سینہ تو پھول جاتا ہے کہ اُردو پر اچھا خاصہ اور معیاری کام ہو رہا ہے۔ نیز دوسرے اِداروں کو بھی حوصلہ عطا ہوتا ہے۔

—— لطیف جعفری، مالیگاؤں

● اُردو خبرنامے کے کالم سے دہلی اور دوسرے شہروں کے اُردو کے تعلق سے آگاہی ہوتی ہے۔ آپ سے گذارش ہے کہ اُردو خبرنامے کے صفحات میں اضافہ کریں اور پوری اُردو دُنیا کی خبریں محبانِ اُردو تک پہنچائیں۔

—— رشید وقار، بمبئی

●●

اُردو اکادمی دہلی کا ماہانہ رسالہ

ایوانِ اردو دہلی

مجلس مشاورت

خلیق انجم، حکیم عبدالحمید، خواجہ حسن ثانی نظامی، بیگم ریحانہ فاروقی

ادارۂ تحریر

سید شریف الحسن نقوی

مخمور سعیدی

جلد : ۱، شمارہ : ۵

ستمبر ۱۹۸۷ء

فی کاپی : ۵۰ر۲ روپے

سالانہ : ۲۵ روپے

مشمولات

حرفِ آغاز ــــــ سید شریف الحسن نقوی ــ ۴

مضامین :

مرزا غالب پر ایک پُرانا مضمون ــ اکبر حیدری کاشمیری ــ ۶

دِلّی کے آثارِ قدیمہ ــــ خلیق انجم ــــ ۲۰

۱۹۸۶ء کا اُردو ادب ــــ شیخ سلیم احمد ــــ ۳۳

ومبلڈن: آغاز سے آج تک ــــ تنویر احسن ــــ ۴۴

طنز و مزاح :

ہمارے خاں صاحب ــــ شیخ رحمٰن آکولوی ــــ ۲۸

افسانے :

علامت کے آر پار ــــ سریندر پرکاش ــــ ۱۴

پرامتھیوس ــــ سلام بن رزّاق ــــ ۲۶

گھبرائے ہوئے لوگ ــــ منظور وقار ــــ ۴۱

نظمیں :

ساغر نظامی / ندا فاضلی ــــ ۵

غزلیں :

حسن نعیم / حامدی کاشمیری ــــ ۱۳

خلش بڑودوی / اختر نظمی / والی آسی ــــ ۱۹

منوّر رانا / عنبر بہرائچی / ساحل سحری ــــ ۲۵

سید شاہد حسن کمال / ظہیر رحمتی / فردوس گیاوی ــــ ۳۲

نئی کتابیں : مخمور سعیدی / قمر رئیس / اطہر فاروقی ــــ ۴۸

اُردو کا خبرنامہ ــــ ادارہ ــــ ۵۲

آپ کی رائے ــــ قارئین ــــ ۵۵

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ : ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی، اُردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
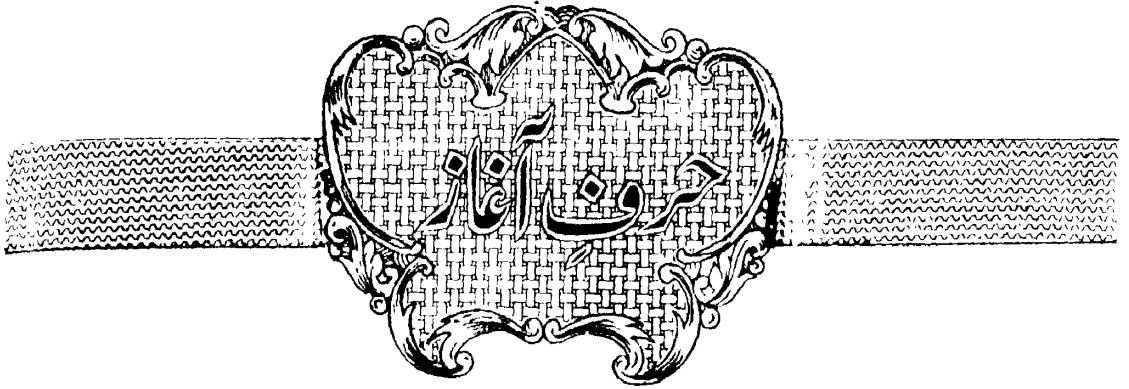
اس سال ہم اپنی آزادی کی چالیسویں سالگرہ منا رہے ہیں ۔ اس موقعے پر ذہن از خود اُن مجاہدوں کی طرف منتقل ہوتا ہے جن کی بے مثال قربانیوں اور جاں فشانیوں کے صلے میں ہمیں یہ نعمت ملی ہے ۔ ان قربانیوں پر نظر ڈال کر ہی ہمیں آزادی کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکتا ہے اور اس نعمت کے تحفّظ کے لیے ہماری جو ذمّہ داریاں ہیں انھیں ہم محسوس کر سکتے ہیں ۔

ہندوستان جس سامراج کے پنجۂ استبداد میں اسیر تھا اُس کی طاقت بے پناہ تھی لیکن مہاتما گاندھی اور دوسرے قومی رہنماؤں کی قیادت میں ہندوستانی عوام نے متّحد ہو کر اس طاقت سے لوہا لیا اور بالآخر اسے ہندوستان سے نکل جانے پر مجبور کر دیا ۔ اگر عوام میں اتّحاد اور یک جہتی نہ ہوتی تو اتنے بڑے سامراج سے چھٹکارا پانا اور وہ بھی پُرامن ذرائع سے ، شاید مشکل ہو جاتا ۔

آج ہم آزاد ہیں لیکن یہ آزادی ہمارے راستے کا محض ایک پڑاؤ ہے ، منزل نہیں ۔ ہماری منزل ایک مضبوط ، متّحد ، مہذّب اور خوشحال قوم کی تشکیل ہے اور یہ منزل ابھی ہم سر نہیں کر سکے ہیں ۔ اگر ہمیں اس منزل کو سر کرنا ہے تو اس کے لیے بھی اسی خلوص اور ایثار اور اسی اتّحاد اور یک جہتی کی ضرورت ہے جس کا مظاہرہ ہمارے بزرگوں نے جدوجہدِ آزادی کے دوران میں کیا تھا ۔

ایک جمہوری سماج میں اختلافِ رائے کی بھی بہت گنجائشیں ہیں اور سیاسی گروہ بندی کی بھی لیکن سیاسی گروہ بندی اگر اعلیٰ تر قومی مقاصد کو پس پشت ڈال کر کی جائے تو اس کے نتائج نراج اور انتشار کی صورت میں سامنے آتے ہیں جن کی ضرر رسانی سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے ۔ یہاں مختلف مذہبی فرقے آباد ہیں ، جن کے الگ الگ کلچر ہیں ، الگ الگ زبانیں ہیں ، ان میں سے بعض کے مفادات بھی مختلف ہو سکتے ہیں لیکن ہمارا آئین جمہوری حدود میں رہتے ہوئے ہر فرقے کے مفادات کے تحفّظ کی ضمانت دیتا ہے ۔ یوں بھی صدیوں سے ہندوستانی سماج کی رنگا رنگی میں یک رنگی کے پہلو نمایاں رہے ہیں ۔ ضرورت ہے کہ ان پہلوؤں کو نظر سے اوجھل نہ ہونے دیا جائے اور اس حقیقت کو ہر وقت سامنے رکھا جائے کہ ہمارے مذہبی یا سیاسی عقائد خواہ کچھ بھی ہوں ، ہم کوئی بھی زبان بولتے ہوں ، کسی بھی علاقے کے رہنے والے ہوں لیکن ہیں سب ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں اور اس زنجیر کا نام ہے ہندوستانیت ۔

——— سیّد شریف الحسن نقوی

ساغرؔ نظامی (مرحوم)

اتحاد

...ت سے ہوا ہے نازشِ دوراں آزاد
...کو بخشا ہے یہاں جذبۂ نفرت نے سکوں
...جذبۂ نفرت جو محبت بن جائے
...گل میں یہ چہکتے ہوئے معصوم طیور
...گل کی خموشی کے حریف ناطق
...گاتے ہیں تو شاہیں کا جگر ہلتا ہے
...ایک ہی ٹہنی پہ بسر کرتے ہیں
...روں میں یہ امواج رواں دوش بدوش
...کے مرغابیوں کا حسن سد...
...در خول بیاباں میں یہ ہرنوں کا خرام

کہ تنفر پہ نہیں فطرتِ انساں کا مدار
کہ تجھے آئے گا اس آگ کے پہلو میں قرار
تیری جلتی ہوئی دنیا میں بھی آجائے بہار
جن کے نغموں سے ہے ایوان ترنم گلزار
یہ پر و بال کے بربط یہ فضاؤں کے ستار
ساتھ اڑتے ہیں تو ہوتا ہے قفس زیرِ غبار
بادۂ قرب سے سرشار ہیں اضداد بہار
جرم ہے مسلکِ فطرت میں جدائی کا شعار
سینۂ آب پہ یہ سوزِ اخوت کے شرار
سوچ اس قافلۂ رم کے رموز و اسرار

...قربت سے دمکتے ہیں ستاروں کے کنول
...ے ملتے ہیں تو ہوتا ہے سمندر پیدا
...صدیوں پیوستگیٔ خاک نے پایا ہے فروغ
...مل کے ہنستے ہیں تو بنتا ہے چمن بزمِ نجوم

کششِ قرب سے ہے محفلِ انجم کی بہار
وصلِ ذرّات کا مرہون ہے طغیانِ غبار
مستقل قرب کا سنگین عمل ہیں کہسار
کہیں اک جگنو سے ہوتا ہے چراغانِ بہار

اصل ساون تو وہی ہے کہ جھڑی لگ جائے
دامِ نفرت سے ہوا ہے نازشِ دوراں آزاد
کس کو بخشا ہے یہاں جذبۂ نفرت نے سکوں

سازِ بشکستہ ہے بکھری ہوئی بوندوں کا ستار
کہ تنفر پہ نہیں فطرتِ انساں کا مدار
کہ تجھے آئے گا اس آگ کے پہلو میں قرار

(بہ شکریہ بیگم ذکیہ سلطانہ نیرؔ)

ندا فاضلی

ایک لٹی ہوئی بستی کی کہانی

بجیں گھنٹیاں
اونچے مینار گونجے
سنہری صداؤں نے اجلی ہواؤں کی بیشانی پر
رحمت کے
برکت کے پیغام لکھے
وضو کرتی تہذیب
کمسن کتابوں تک
منور ہوئیں
جھلملاتے اندھیرے
بھجن گاتے آنچل سے
پوجا کی تھالی سے
ننھے سویرے
کھلے دوار — بچوں نے بستہ اٹھایا
بزرگوں نے پیڑوں کو پانی پلایا
نئے حادثوں کی خبر لے کے
بستی کی گلیوں میں اخبار آیا
خدا کی حفاظت کی خاطر
پولس نے
پجاری کے مندر میں
ملا کی مسجد میں / پہرا لگایا۔

۱۰۳، امر اپارٹمنٹس، دان پارا، کھار (ویسٹ)، ...

مرزا غالب پر ایک پرانا مضمون

حکیم محمد علی اُردو کے معروف ناول نگار تھے۔ مولوی نذیر احمد اور سرشار کے بعد ناول نگاری میں ان کا نام آتا ہے۔ انھوں نے کئی ناول تصنیف کیے ہیں جن کے نام یہ ہیں: عبرت، حُسن سرور، دیول دیوی، گورا، رام پیاری، جعفر و عباسہ، اختر و حسینہ...... بعض ناول انگریزی کتابوں کے ترجمے ہیں، مثلاً "نیل کا سانپ" جو رائڈر ہیگرڈ کی کلوپیٹرا کا ترجمہ ہے۔ دیول دیوی اور جعفر و عباسہ تاریخی ناول ہیں۔ محمد علی شعر بھی کہتے تھے اور طبیبؔ تخلص کرتے تھے[1] سید علی عباس حسینی لکھتے ہیں کہ:

"مولانا عبدالحلیم شرر کی طرح ہردوئی کے حکیم محمد علی طبیب بھی اس زمانے کے مشہور ناول نگار گزرے ہیں۔ ان دونوں حضرات کی زندگی میں اُردو داں طبقہ انیسیوں اور دبیریوں کی طرح شرری اور طبیبی گروہوں میں منقسم تھا کوئی "دلگداز" پڑھتا تو کوئی "مرقع عالم" کوئی "فلپانہ" کو سراہتا تو کوئی "عبرت" کو، کوئی "عزیز و رجنا" کو بڑھاتا تو کوئی "جعفر و عباسہ" کو۔ کوئی "حسن انجلینا" کی خوبیاں گناتا تو کوئی "نیل کے سانپ" کی، کوئی "منصور موہنا" پر جھومتا، تو کوئی "خضر خاں" "دیول دیوی" پر۔ طبیب نے اسی مقابلے اور سابقے پر اکتفا نہیں کی وہ معاشرت و اصلاح کے میدان میں بھی دوڑے۔ انھوں نے "حُسن سرور" میں عشق کی سرگرمیاں دکھائیں اور "گورا" میں عقدِ بیوگان کی ضرورت ظاہر کی۔"[2]

طبیب کے حالاتِ زندگی زیادہ نہیں معلوم ہو سکے۔ وہ ہردوئی کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۸۸ء میں وہاں آنریری مجسٹریٹ کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ اسی سال ان کی ادارت میں ہردوئی سے ایک ادبی ماہنامہ "مرقع عالم" کے نام سے شائع ہونے لگا۔ "مرقع عالم" ہر مہینے باقاعدہ "مرقع عالم پریس" ہردوئی سے چھپتا تھا۔ راقم الحروف کی نظر سے اگست ۱۹۰۷ء تک کے متعدد شمارے لکھنؤ یونیورسٹی اور ندوۃ العلما لکھنؤ کے کتب خانوں میں گزرے ہیں۔ یہ "دلگداز" کے بعد منظرِ عام پر آیا تھا یعنی "دلگداز" ۱۸۸۷ء میں اور "مرقع عالم" ۱۸۸۸ء میں چھپنا شروع ہوا تھا۔

راقم حروف نے اس زمانے کے متعدد ادبی رسالے دیکھے ہیں جن میں شرر کا "دلگداز"، سید اکبر علی فیروز آباد ضلع آگرہ کا "ادیب"، نوبت رائے نظر کا "ادیب" الٰہ آباد، سید احمد شفیع کا "اُردوئے معلّٰی" دہلی، "خدنگِ نظر" لکھنؤ، "زمانہ" کانپور، "مخزن" لاہور، "عصرِ جدید" لکھنؤ، "دکن ریویو" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام رسالوں میں "مرقع عالم" نہایت ہی صاف ستھرا چھپتا تھا۔ کتابت اور طباعت بڑی شاندار ہوتی تھی اور کاغذ ولایتی تھا۔ یہ رسالہ ابتدا سے آخر تک غلطیوں سے پاک ہوتا تھا۔

"مرقع عالم" کا سائز ۱/۲ ۲۱ × ۱/۲ ۱۳ سینٹی میٹر تھا۔ ہر صفحے پر خوب صورتی کے لیے جدول کھینچی رہتی تھی۔ متن ۸ × ۱۰ سینٹی میٹر میں چھپتا تھا۔ ایک صفحے میں ۱۲ سطریں ہوتی تھیں

اگست ۱۸۹۶ء کے شمارے میں صفحہ ۷۳ سے ۸۸ تک ایک مضمون "مرزا اسد اللہ خاں غالب" کے عنوان سے چھپا ہے۔ مضمون نگار فرید آباد ضلع دہلی کے نواب سید احمد شفیع خاں بہادر تخلص نیّر ہیں۔ موصوف ہز ہائی نیس نواب امین الدین خاں بہادر والیِ لوہارو کے داماد اور مرزا غالب کے رشتے دار تھے۔ نیّر نے نومبر ۱۸۹۷ء میں ایک ادبی ماہنامہ

۳۲۸۔ نرسنگ گڑھ۔ سری نگر (کشمیر)

"اردوئے معلّٰی" کے نام سے شائع کیا تھا۔ یہ
پرچہ محمد علی طبیب کے مطبع "مرقع عالم ہردوئی"
میں چھپتا تھا۔ اس کے کئی شمارے ندوۃ العلما
لکھنؤ شبلی کتب خانے میں میری نظر سے گزرے
ہیں۔ ستمبر ۱۸۹۷ء جلد ایک نمبر ایک کے صفحہ
... پر نیّر نے "مرقع عالم" کا اشتہار ذیل کے
... میں شائع کیا ہے:

"مرقع عالم (جو آٹھ برس سے جاری ہے)
... لٹریچر سے اگر آپ کو مذاق ہے تو علمی مضامین
... حسن وعشق کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوں اگر
آپ ... چھپا پسند کرتے ہیں تو آپ ضرور "مرقع عالم"
کو ایک نظر دیکھ لیں۔"

اسی طرح محمد علی طبیب "مرقع عالم" مطبوعہ
۱۸۹۸ء جولائی کے شمارے میں صفحہ ۳۷ میں لکھتے
ہیں کہ:

"نواب سید احمد شفیع نے ۱۸۹۷ء میں
"اردوئے معلّٰی" نامی رسالہ اپنے اہتمام سے
جاری کیا۔ ابتدا میں اس پرچے میں ایک ناول کا
ہی سلسلہ جاری تھا۔ بعد ازاں اس میں علمی
اور اخلاقی مضامین اور عربی تاریخوں کے ترجمے
بھی چھپتے تھے۔ پہلے اس رسالے میں اردو ناول
"کنولا" چھپا تھا۔ رسالے کی ظاہری حالت
لکھائی، چھپائی اور کاغذ کے اعتبار سے بھی
قدر دانی والی نظروں میں کسی حسین کی پیاری
صورت سے کم نہیں۔ سالانہ عہ نیّر دہلی کے
ایک معزز طبقے سے ہیں اور ہز ہائنس نواب
صاحب بہادر لوہارو کے داماد۔ ان کے پرائیوٹ
حالات سے جہاں تک ہم کو واقفیت ہے وہاں
تک ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے "اردوئے معلّٰی"
کو اپنے کسی ذاتی نفع اور بہبود کے خیال سے
کبھی جاری کیا نہ ہوگا۔ اور نہ خدا کے فضل
سے ان کو اس کی ضرورت ہے۔ بلکہ وہ اس
ذریعے سے اپنے ملک اور قوم کی خدمت کرنا
چاہتے ہوں گے۔"

نیّر کا جو مضمون محمد علی طبیب نے
"مرزا اسد اللہ خاں غالب" کے عنوان سے
اپنے رسالے "مرقع عالم" میں اگست ۱۸۹۷ء کے
شمارے میں شائع کیا تھا وہ بڑا معلوماتی اور
دلچسپ ہے۔ "مرقع عالم" کے پرچے اب نایاب
ہیں اور اس میں غالب پر جو مضمون ہے اس کا
حوالہ کہیں بھی میری نظر سے نہیں گزرا ہے۔ چونکہ
اس میں مرزا غالب کے بارے میں بعض نئی باتوں
کا انکشاف کیا گیا ہے اس لیے مناسب سمجھا
گیا کہ پورا مضمون "غالبیات" میں اضافے کے
طور پر ذیل میں من وعن درج کیا جائے:

"مرزا اسد اللہ خاں غالب"

گرد ہم شرح ستم ہائے عزیزاں غالب
رسمِ اُمّید ہما نا ز جہاں برخیزد

"چونکہ ہم نے اپنے مضمون کو ایک
شعر سے شروع کیا ہے۔ اس سبب سے ہمیں
خیال ہے کہ "مرقع عالم" کے ناظرین کہیں خیالی
مضمون نہ سمجھ لیں۔ اور کہنے لگیں کہ لیجیے خیالی دنیا
کی سیر ہونے لگی۔ یا حسن وعشق کے منظروں میں
جا پھنسے۔ ہم اپنے دوستوں کو اطمینان دلاتے
ہیں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے اور خود شعر بھی تو بتا رہا
ہے کہ کن واقعات پر مملو ہے۔ اگرچہ ہمیں یہ
دعوی تو نہیں ہے کہ ہم کوئی تاریخی مضمون پیش
کرتے ہیں مگر ہاں یہ ضرور کہیں گے کہ اس شعر
کے ضمن میں ہمارے احباب کو شاعر کے واقعات
اور مختصر حالات سے ضرور آگہی ہو جائے گی اور
پھر موثر الفاظ میں یہ بھی بتایا جائے گا کہ یہ
شعر کہاں اور کس موقع پر لکھا گیا تھا اور
اس کے جذبات کس قدر سچے ہیں۔ یہ مرزا
اسد اللہ خاں صاحب کا مقطع ہے۔ مرزا غالب
نام آج بزم سخن میں جس اعزاز کا مستحق ہے
اس کے بیان کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں۔
افسوس زمانہ بڑا ہی ناقدر داں ہے۔ اس
نیلی چھت کے سایے میں اہل کمال کو ہمیشہ
مصیبت ہی کا سامنا رہا۔ شعرائے مغرب
حال الیور گولڈ سمتھ نے بہت تفصیل کے
ساتھ موثر الفاظ میں لکھا ہے۔ اس وقت ہم
اس کی تو ضرورت نہیں ہے کہ ہم ان شعرا
حال الیور کی زبانی تفصیل کے ساتھ لکھیں
لیکن یہ ضرور بتا دینا چاہیے کہ باوجود اس
کے جو انھیں حاصل تھا سب فاقے کرتے کر
اور چکیاں پیستے پیستے مر گئے۔ انگلستان کے
شاعر ڈرائڈن، اسپنسر، اٹلی کے ٹیسو، پالو بورگ
فرانس کا کسنڈری اور یونان کے ہومر، ٹرنس
پلاٹس، ان سب کا حال دیکھنے سے معلوم ہوتا
ہے کہ بے چاروں پر کیا کیا مصیبتیں بیت گئیں
اور زمانے کے ہاتھوں انھیں کن کن ذلتوں
سے سابقہ پڑا۔

ایران کے جادو نگار شعرا کچھ ان سے
زیادہ بُری حالت میں آئیں گے، فردوسی
عصائری، انوری، حافظ شیرازی۔ بغور دیکھیے
تو سب ہی ایک ہی رنگ میں ڈوبے ہوئے
اوروں نے تو پردے میں کہا ہے۔ حافظ
تو صاف الفاظ میں کہہ دیا۔

مصرع:

اسپِ تازی شدہ مجروح بزیرِ پالان

اب ذرا اپنے اردو شعرا کا حال سرسری
نظر سے دیکھ جائیے۔ نیّر جن کو خدائے سخن
سچا خطاب دیا گیا ہے غ کیا تھے اور ان کی ع

کس طرح گزری۔ دلّی سے لکھنؤ جاتے وقت جس قدر دماغ جوہرِ سخن سے بھرا ہوا تھا اس سے زیادہ ان کی آشفتہ بیانی، افلاس اور تہی دستی سے بھری ہوئی تھی۔ سب کو پورا کرایہ بھی نہ جڑا۔ آخر ساجھے پر گاڑی کرایہ کی۔ انشاء اللہ خاں، سوداؔ اور سب سے زیادہ ذوقؔ کو لیجیے جن کو بادشاہ کے اُستاد بننے کا بھی فخر حاصل تھا۔ جناب ذوقؔ کی حالت ہم سے پوچھیے کہ کس طرح گزری۔ اور وہ کس قدر اپنی ضروریات سے فارغ اور مستغنی تھے۔ اگرچہ ہمیں ابراہیم ذوقؔ کے دیکھنے کی نوبت نہیں آئی لیکن معتبر ذرائع سے جس قدر ہمیں معلوم ہوا وہ اسی قدر ہے کہ ان کی عمر نہایت تنگ دستی کی حالت میں گزری۔ ان سب سے قطع نظر کرکے ہمیں مرزا غالبؔ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ مرزا غالبؔ کے حالات لکھنے کا ہمیں بوجہ ایک دُور کے رشتے کے سب سے زیادہ حق حاصل ہے۔ ہمیں مرزا کی زیارت کا شرف تو حاصل نہیں ہوا جس کا افسوس ہے لیکن اپنے بزرگان کی زبانی ایسے سچّے واقعات ہمیں معلوم ہوئے ہیں جن کا مختصر بیان بھی لطف سے خالی نہ ہوگا۔

جس مسند پر امیر خسرو عرصے تک بیٹھ کر مانے کو اپنی نغمہ سنجیوں سے والہ و دیوانہ بنائے ہے تھے اور پھر دُنیا کو چھوڑتے وقت آئندہ کسی اس کے لائق نہ سمجھ کر صندوق میں بند کرکے وڑ گئے تھے۔ اپنے دور میں مرزا صاحب نے صندوق کا قفل کھولا اور خندہ جبینی کے تھ اسی مسند پر اپنا مبارک قدم رکھا۔ سچ پوچھیے تو وجد میں آکر اور جھوم جھوم کر ایسی دل میں پیوست ہونے والی آواز اور لہجے میں نغمہ سرائی کی کہ اہلِ دل کے دلوں ہی میں جاکر ٹھہری اور چاروں طرف سے آوازِ تحسین آنے لگی۔ قصائد میں اپنے زمانے کے مستند شاعر عرفیؔ کے قصائد پر مرزا غالبؔ نے غائر نظر ڈالی، اور خود بھی اسی طرف جھک پڑے۔ یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ عرفیؔ سے ان کا پلّہ بھاری رہا مگر یہ کہہ دینا بھی سراسر ناانصافی ہے کہ قصائد کی دُنیا میں وہ عرفیؔ سے بہت پیچھے ہیں۔ مرزا صاحب بہت ہی سیدھے سادے بزرگ تھے۔ مذاق اور سر دلعزیزی ان کے مزاج میں تھی۔ جناب نواب صاحب والیِ ریاست رامپور اس وقت بہت کم عمر تھے کبھی کبھی مرزا صاحب کی خدمت میں جاتے رہتے تھے اور مرزا صاحب بھی ان سے بہت محبت کرتے تھے اکثر فرمایا کرتے "سنو میاں! نواب امین الدین خاں صاحب تمھارے دادا ہیں اور میں تو دلدادہ ہوں۔"

مرزا صاحب کا مکان دہلی میں بلّی ماروں کے محلّے میں تھا۔ ایک شہر کے امیرزادے سے جو کوچہ چیلان میں رہتے تھے مرزا صاحب کو بہت محبت تھی۔ یہ صاحب اعتدال سے زیادہ نازک مزاج اور ضعیف الاعضا تھے۔ شام کے وقت گھر سے باہر نکلتے تھے کبھی یا روزانہ مرزا صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے تھے۔ مرزا ان سے کہا کرتے تھے "کیوں صاحب! ہماری آنکھیں تمھارے دیکھنے کو ترستی ہیں اور تم ایک وقت کے سوا فقیر غالب علی شاہ کے تکیے پر تشریف نہیں لاتے۔ گرمی کے موسم میں تمازت اور حدّت آفتاب کی مانع ہے۔ سردی میں زکام اور نزلے کا اندیشہ نہیں آنے دیتا۔ برسات میں تو بجلی کے ڈر کے مارے آپ گھر سے باہر قدم بھی رکھتے ڈرتے ہو۔ گزرے گی تو کیوں کر؟ آپ کی نزاکت ہمارے لیے وبالِ جان ہوگئی۔ تم مجھے جانتے ہو میں گربہ کشتاں میں رہتا ہوں۔" وہ صاحب سُن کر جُھپ ہوگئے۔ کیوں کہ فی الواقع وہ اپنے مزاج سے مجبور تھے۔

مرزا صاحب کے ہاں ایک بلّی پلی ہوئی تھی۔ اس سے آپ کو بہت محبت تھی۔ بلکہ آپ کے دیوان میں ایک قطعہ بھی لکھا ہے۔ ایک دن گربہ موت نے اس بلّی کا ٹیٹوا آدبایا۔ جاڑوں کا موسم تھا۔ رات کے گیارہ بجے تھے۔ مینھ برس رہا تھا۔ اندھیری چھائی ہوئی تھی۔ سردی کے سبب سے دانت بجتے تھے۔ آپ نے مکان کا چراغ گل کر دیا۔ پلنگ پر مُردہ ہو کر لیٹ گئے اور خدمت گار کو آواز دی۔ حاضر ہوا تو گھبرائی ہوئی اور سہمی ہوئی آواز سے کہنے لگے "ارے کم بخت! کچھ تجھے میری خبر بھی ہے؟" وہ نمک حلال ملازم آج کل کے نمک خواروں کی طرح نمک حرام نہ تھا۔ گھبرا گیا۔ پوچھنے لگا "حضور کیا ہے؟" آپ نے کہا "کوئی دم کا مہمان ہوں۔ لالٹین لے جا کوچہ چیلان میں فلاں صاحب کو بُلا لا۔ کہہ دیجیو کہ اگر مرزا غالبؔ کو دیکھنا ہے تو میرے ساتھ چلے چلو۔" یہ کہہ کر کراہ سے ایسی سانس دی کہ نوکر ڈر گیا۔ لالٹین لے کمبل سنبھال ہانپتا کانپتا ان صاحب کے مکان پر پہنچا۔ کُنڈی کھٹکھٹائی۔ دروازہ دھم دھمایا اور بے تحاشا چیخنے لگا "کُنڈی کھولو!"

گھر والے ڈر گئے۔ الٰہی کیا آفت آئی۔ ماماں نے ڈیوڑھی پر آکر پوچھا کون ہے۔ کہاں سے آیا ہے۔ خیریت تو ہے؟ نوکر نے کہا "میاں کو بھیج دو۔ مرزا غالبؔ کا نوکر ہوں۔ باقی حال ان سے کہوں گا۔" ماماں نے میاں سے کہا۔ وہ

سب بدحواس دوڑتے ہوئے دروازے پر آئے۔ اور کہنے لگے "ارے خیر تو ہے؟ مرزا غالب پر کیا گزری؟" نوکر رونے لگا اور کہا آپ ہی چل کر دیکھئے کوئی دم اور ساعت کے مہمان ہیں۔ وہ بھی اور اہل وفا لوگ تھے۔ یہ سُن کر بیتاب ہوئے۔ ایک دہتڑ اپنے سر پر ماری اور ہائے ہائے کہہ کر رونے لگے۔ مزاج کے ہاتھوں مجبور تھے مگر یہ ایسی کشش نہ تھی جو بیٹھ رہتے۔ دو گرم کپڑے اُوپر تلے پہنے۔ پاجامے کا گھٹنا بنایا۔ ننگے سر ننگے پاؤں بھیگتے ٹھوکریں کھاتے نوکر کے ساتھ ہوئے۔ پاؤں زخمی ہوگئے۔ ناخنوں سے خون جاری ہوگیا۔ بدحواس اور پریشان مرزا صاحب کے مکان پہنچے۔ پلنگ کے قریب جاکر آواز دی "غالب! غالب!" جواب ندارد۔ "مرزا غالب ہائے ہائے۔ للہ کچھ تو بولو"۔ ایک لڑکھڑاتی اور مدھم آواز میں جواب ملا "کیا ہے؟" وہ صاحب کہنے لگے "آخر بتاؤ تو کیا ہوا؟" آواز آئی — "ذرا قریب لاؤ۔ لحاف اٹھا کر دیکھ لو۔" وہ قریب آئے۔ لحاف اٹھایا تو دیکھا آپ چت پڑے ہیں۔ بلّی مری ہوئی پڑی ہے۔ وہ صاحب نہ سمجھے۔ پھر پوچھا "کیا حال ہے؟" کہا "دیکھو نا۔ یہ بلّی مرگئی۔ ہائے غالب کو سخت صدمہ ہوا" یہ کہا اور اُٹھ بیٹھے۔

مرزا غالب ایبکی تُرک تھے۔ بڑے خاندانی اور شریف بزرگ تھے۔ چنانچہ ایک قطعہ میں لکھتے ہیں:

ایبکم از جماعۂ اتراک
در تمامی زماہ دہ چندیم

بعض حضرات حیرت سے فرمایا کرتے ہیں کہ "مرزا صاحب نے تو اچھّا زمانہ اور قدرداں پبلک پائی تھی۔ پھر وہ اس قدر تنگ دست کیوں رہے"۔ بے شک ایک ناواقف کو جس قدر حیرت ہو وہ حق بجانب اس کے ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ بعض اوقات ہم خود حیرت میں آجاتے اور سوچتے ہیں کہ مرزا غالب تو بڑے ہر دلعزیز بزرگ تھے۔ وہ اس قدر پریشان حال کیوں رہے؟ خصوصاً اس حیرت کو بعض بزرگان کے اقوال اور ترقی دلاتے ہیں جس جلیل القدر بزرگ کو زوجِ بتول اور امام ہونے کا مرتبہ حاصل ہوا اور جو بہت آنے والے اماموں کے مورث اعلیٰ ہونے والے تھے وہ اپنی زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ "علّمنی حرفاً فقد صیّرنی عبداً" یعنی "جس نے مجھے ایک حرف بتایا اس نے غلام بنالیا"۔ یہ ارشاد زوجِ بتول قبلۂ آلِ رسولؐ حضرت علیؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے۔

اب ایک سرسری نظر مرزا صاحب کے تلامذہ کی طرف دوڑائیے۔ اس فہرست میں آپ والیانِ ملک اور سردارانِ قوم اور اکثر صاحبانِ اقتدار بزرگان کے نام نامی دیکھیے گا۔ جنّت آرامگاہ نواب یوسف علی خاں صاحب والیِ ریاست رامپور سے مرزا صاحب کو جو تعلّق تھا اس کا بیان کرنا طول امل ہے۔ دو شعر سُن لیجیے۔ آپ جان جائیں گے کہ جنّت آرامگاہ سے مرزا کو کیا تعلّق تھا۔ فرماتے ہیں ؎

نواب مہر مہر منو چہر چہر را
حاصل جمال یوسف و قرب کلیم باد

ایک شعر چھوڑ کر لکھا ہے ؎

ہردم ترا بخلوتِ راز و بہ بزم انس
روح الامیں مصاحب و غالب ندیم باد

جنّت آرامگاہ کے سوا نواب ضیاء الدّین احمد خاں صاحب، نواب علاء الدّین احمد خاں صاحب بہادر مرحوم، مغفور نواب مصطفیٰ خاں صاحب، مرزا تفتہ وغیرہ وغیرہ کو جو مرزا صاحب سے حسنِ عقیدت تھا وہ محتاجِ بیان نہیں مگر ہم اپنے ان احباب کی خدمت میں عرض کرتے ہیں جو متحیّر ہوکر پوچھتے تھے کہ غالب نے اچھّا زمانہ پایا، پھر کیوں اس افلاس کی مصیبت میں مبتلا رہے۔ جناب والا! اگر نظر کو آگے بڑھا کر اور خیال کو وسیع کرکے دُنیا کی عام حالت پر غور فرمائیے گا تو آپ کی حیرت رفع ہوجائے گی۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ہر دور اور ہر عصر میں بادشاہ امیر وزیر غریب سبھی ہوتے آئے ہیں۔ اور دُنیا کی یہی رفتار ہے۔ فردوسی نے کیسا زمانہ پایا؛ اور اس کے ساتھ عصائری نے۔ حافظ نے تو کس زمانے میں اپنے جوہرِ کلام سے دُنیا کی عام سوسائٹی کو بے خود کیے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں کیا دنیا بادشاہوں اور دولت مندوں سے خالی تھی؟ ہرگز نہیں۔ اور نہ ایسا ہوسکتا ہے۔ اچھا پھر؟ بات رونا اس کا پڑا ہے کہ ہر زمانے میں ان صاحبانِ کمال کی دل جوئی ہوسکتی تھی مگر ہوئی نہیں۔

اگرچہ مرزا صاحب کے معتقدوں کی فہرست پر آپ کی نظر پہنچ چکی ہے۔ مگر مرزا کی حالت آپ کو بھی نہایت سقیم اور قابلِ رحم ہی نظر آئے گی۔

مصرع:
خجلے نیست اگر بے سروساماں رفتم

کا نالۂ جانکاہ سُنیے گا۔ کہیں ترک وطن پر آٹھ آٹھ آنسو روتے پائیے گا۔ کہیں عزیزوں اور دوستوں کی بے مہری کی داستان دل سے پار ہوجانے والے الفاظ میں سنیے گا۔

حاصل کلام یہ کہ غریب کو ان ہی داستان ہائے غم کے دکھڑوں میں مبتلا پائیے گا۔

عام طبائع کے خواص سے بھی بڑھ کر مرزا صاحب کو دہلی سے بوجہ وطن ہونے کے نہایت محبت تھی۔ جس طرح مرزا رفیع کے تیور دہلی چھوڑنے سے پہلے ترکِ وطن کے خیال سے بل کی لیتے تھے۔ مرزا صاحب آخر تک اسی خیال پر قائم رہے۔ آخر مجبوریوں کے ہاتھوں دہلی چھوڑنا ہی پڑی۔

لکھنؤ پہنچ کر جو قصیدہ لکھا ہے اس کے پڑھنے کے بعد آدمی اپنے ہوش میں نہیں رہ سکتا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

چہرہ اندودہ بہ گرد و مژہ آغشتہ بہ خوں
خود گواہم کہ ز دہلی بچہ عنواں رفتم

آگے چل کر لکھتے ہیں ؎

داغِ حسرت بہ دل و شکوۂ اختر بہ زباں
منّت از بخت کہ بسیار بہ ساماں رفتم

میٹھی زبان فارسی سے جن اصحاب کو شوق ہے انھوں نے مرزا غالب کا فارسی دیوان ضرور دیکھا ہوگا۔ مگر جس غائر نظر سے ان کے کلام دیکھنے کی ضرورت ہے شاید اس نظر سے بہت کم احباب نے ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ یوں تو اس دیوان کا ایک ایک مصرعہ نشتر و خنجر سے کم نہیں (ہمارے وہ احباب معاف فرمائیں گے جن کا تخلّص نشتر یا خنجر ہے) مگر اس قصیدے کے اشعار میں جو بے خود کر دینے والی کیفیت ہے اس کا مزہ کچھ ہمارا ہی دل اچھی طرح لے رہا ہے۔

میرے ایک معزز دوست نے اپنے واجب التعظیم بزرگ کی زبانی یہ حکایت مجھ سے بیان کی کہ جب مرزا صاحب دہلی کو آخری نگاہ سے خیرباد کہنے پر آمادہ ہو گئے تو میں نے ان سے بوجہ اس تقرّب کے جو مجھے مرزا غالب صاحب سے

اور ترکِ وطن کیوں فرماتے ہیں۔ اوّل تو عادتاً کے موافق ہوں' ہاں پر ٹالتے رہے۔ اور جب میرا اصرار حد سے بڑھا تو کہا "او میاں تم نے ابوالفرج بن ہند وطبیبؒ کا وہ قطعہ بھی سُنا ہے۔ جس میں اس نے ہدایت کی ہے کہ جب آدمی کو اپنے وطن میں ذلّت کا سامنا ہونے لگے تو اُسے ترکِ وطن پر آمادہ ہونا چاہیے۔ وہ صاحب خاموش ہو رہے۔ اپنے دوست کی زبانی میں ایک دوسرا واقعہ بھی بیان کرنا چاہتا ہوں۔ جو انھوں نے اپنے عالی قدر بزرگ سے سُن کر مجھ سے بیان کیا۔ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں مرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان روزوں مرزا غالب کو مختلف افکار کا سامنا تھا۔ میں نے دیکھا تو مرزا صاحب اسی طرح جو ان کی عادت تھی ہنس بول رہے ہیں۔ میری حیرت حد سے گزرنے لگی تو مرزا صاحب سے میں نے کہا "جناب باوجود ایسے معاملات کے روکش ہونے کے میں آپ کو بے فکر دیکھتا ہوں"۔ مرزا صاحب نے فرمایا "ہاں درست ہے' میری جان! میری نظر سے وہ واقعات گزرے ہیں جن کے خیال کرنے سے آدمی کے روئیں کھڑے ہو جاتے ہیں"۔ اور پھر فرمایا کہ "میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ ایک شریف زادے سے جو جوہر شرافت کے علاوہ زر و جواہر دُنیا سے بھی مستغنی تھا ایک شخص نے مراسم اتحاد بڑھانے شروع کیے۔ بڑھاتے بڑھاتے یہاں تک نوبت پہنچی کہ اپنی بیوی کی بہن سے اس کا نکاح کہو یا جو کچھ سمجھو کر دیا۔ اس غریب خاتون کو جس قدر خدا نے صورت دلفریب دی تھی اسی قدر دُنیا کے منظروں کی زیارت سے اُسے بے نصیب رکھا تھا۔ اس درمیان میں اس پاجی خصائل خود غرض دوست نے اپنا

زادے نے اپنے ذاتی اختیار میں بھی اس کو دخل دے دیا۔ قصّہ تو بڑا ہے مگر مختصر یہ ہے کہ اس شخص کے ہاتھوں جو کسی طرح پندرہ روپے سے زیادہ کا آدمی نہ تھا اس شریف زادے کو وہ مصیبتیں گوارا کرنی پڑیں جن کا بیان نہیں ہو سکتا"۔

مرزا صاحب کے بزرگ عالم شاہ کے زمانے میں دہلی آئے تھے۔ بادشاہ کے دربار میں بہت اعزاز کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ خود مرزا غالب کو دربار گورنر جنرل میں کرسی ملتی رہی۔ خلعت ہمیشہ پایا۔ ۱۷۹۶ء میں مرزا صاحب پیدا ہوئے۔ ۷۳ برس کی عمر پائی۔ ۱۸۶۹ء میں انتقال کیا۔

باوجود اس تنگ دستی کے مرزا صاحب نے ۱۸۴۲ء میں گورنمنٹ انڈیا کو دہلی کالج کا انتظام فرمانا منظور ہوا۔ ٹامسن صاحب جو اضلاع مغربی و شمالی کے لیفٹننٹ گورنر بھی رہے اس وقت سکریٹری تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جس طرح عربی کے مدّرس کو سو روپیہ تنخواہ ملتی ہے اسی تنخواہ پر ایک فارسی کا مدّرس مقرر ہو تو اچھا ہے۔ مرزا غالب کا حال سُن کر صاحب بہادر نے آپ کو بلایا۔ یہ کوٹھی پر گئے۔ اطلاع ہوئی۔ صاحب نے کہا۔ آنے دو۔ مرزا صاحب نہ گئے۔ دوسری دفعہ تاکید ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ میرے استقبال کو صاحب تشریف لائیں تو میں حاضر ہوں۔ خدمت گار کی زبانی سُن کر صاحب چق اُٹھا کر باہر آئے اور تعظیم کے ساتھ اندر کوٹھی میں لے گئے۔ کرسی پر بٹھایا اور کہا "جناب جس وقت آپ گورنری دربار میں تشریف لائیں تو استقبال کے اُمیدوار رہیں۔ اب تو آپ ملازمت کی غرض

سرکاری ملازمت کو باعثِ ازدیادِ عزّت جانتا
ہوں، اگر میری بچی کھچی عزّت میں بھی فرق آتا
ہے، تو ایسی نوکری کو سلام ہے۔" یہ کہا اور
اٹھ کر چلے آئے۔

مرزا نے یہ غزل جس کا مقطع ہمارے
مضمون کا عنوان ہے لکھنؤ میں لکھی تھی۔ جب
وہ دلّی[4] کی ناقدر دانی، احباب کی بے مہری،
اہلِ دلّی کی دل آزاری سے دلّی چھوڑ کر لکھنؤ
تشریف لے گئے تھے[5] اور وہاں کی قدر دان پارٹی
نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لے کر اپنے سروں پر بٹھایا
تو مرزا کے حواس بجا ہوئے۔ کچھ دنوں وہاں رہے
اور شعر و سخن، لطائف و ظرائف سے اپنے میزبان
احباب کی دل جوئی کرتے رہے۔ ایک روز چند
زندہ دل اصحاب جمع تھے اور مرزا صاحب اپنی
دلنشیں تقریر سے حاضرینِ جلسہ کو لبھا رہے تھے
کہ ایک صاحب نے اپنے کسی ہمراز دوست کی
طرف کان میں جھک کر کہا "یہ شخص تو ایسا لائق
خوش گو اور ہر دلعزیز شاعر ہے کہ اسے آنکھوں
میں بٹھایا جائے تب بھی کم ہے۔ افسوس دلّی
میں اس قدر بھی صلاحیت نہیں رہی کہ ایسے
نابغۂ روزگار کی قدر کرتی۔" وہ صاحب ابھی
جواب بھی دینے نہ پائے تھے کہ مرزا صاحب بول
اٹھے "کیوں جناب کیا ارشاد ہوتا ہے؟" سوال
کرنے والے سمجھے کہ مرزا صاحب نے سُن لیا۔ ندامت
سے کہا، حضرت خیریت ہے اور پھر اپنا خیال
ظاہر کیا۔ مرزا غالب صاحب سُن کر بیتاب
ہو گئے۔ ایک ٹھنڈی سانس لی۔ دیر تک
گردن جھکائے بیٹھے رہے جس سے معلوم ہوتا
تھا کہ کسی سخت اور نہ برداشت ہونے والے
غم کو ضبط کر رہے ہیں۔ آخر نہ رہا گیا۔ پھر
بولے "مجھ ہیچ میرز کی مجھ سے زیادہ قدر کرنے
والے دوستو! میں جس وقت عالمِ وجود میں آیا
ہوں تو میرے شفقت کرنے والے والدین نے
اسی شفقت اسی محبت سے ہدیۂ رحمت سمجھ کر
گود میں اٹھا لیا جس طرح ہر بچے کے وہ
والدین جن کو قدرت سے پہلے پہل ایسی نعمت
غیر مترقبہ عطا ہوئی ہو اٹھا لیتے ہیں۔ زمانے
کے موافق ہونے کے سبب سے میرے
ماں باپ نے دولت کا کھیل دولت کے ڈھیر
میں مجھے کھلایا۔

ابھی میں پانچ برس کا تھا کہ میرے
باپ عبداللہ بیگ خاں نے جو نواب
آصف الدّولہ مرحوم کے عہد میں یہاں
(لکھنؤ) بھی آئے تھے، الور کی لڑائی میں اس
دُنیا سے رحلت کی۔ اس کے بعد سے اپنے
چچا نصر اللہ بیگ کے دامنِ محبّت میں میں
پرورش پاتا رہا۔ چند روز بعد میرے چچا
بھی مرگِ ناگہانی میں مر گئے۔ جاگیریں ضبط
ہو گئیں۔ پھر بھی ہزاروں لاکھوں روپیہ موجود
تھا۔ اب بھی میری نظر نے بہت سے عزیزوں کو
اپنے حال پر شفقت کرتے دیکھا اور میں بے فکر
رہا اور اس طرح میں بچپن کی بیخودی اور خود
فراموشی کے زمانے سے نکل کر جوانی کے باغ
کی ہوا کھانے لگا۔ میرے چند روز کے
روشناس دوستو! میرے ان عزیزوں نے
جو فی الحقیقت دولت کو عزیز رکھتے تھے جو
برتاؤ میرے ساتھ کیا میں بیان نہیں کر سکتا۔
آہ کس زبان سے بیان کروں، نہیں، مجھ سے
بیان نہیں کیا جائے گا۔ بس اسی قدر عرض
کر دینا کافی ہے ؎

گر دہم شرحِ ستم ہائے عزیزاں غالب
رسمِ اُمید ہمانا زجہاں برخیزد"

خود مرزا غالب کا جو حال ہوا اس کے
لکھنے کے واسطے دل چاہیے۔ وہ بھی پتھر کا نہیں
فولاد کا۔ اللہ اکبر! کیا پُر تاثیر کلام تھا۔ اس
وقت بھی اگر دیکھا جائے تو وہی اثر ہے۔ ذرا
اپنے دلوں کو دیکھیے۔ اُف اُف بے طرح دھڑک
رہا ہے۔ کلیجہ ہے کہ چھاجوں اُچھل رہا ہے۔
بے شک سچّے واقعات اثر دار الفاظ میں موزوں
ہو جانے کے بعد بغیر رنگ دکھائے نہیں رہتے

خاکسار۔ احمد شفیع از فیض آباد۔

حواشی

[1] تاریخ ادب اُردو، ص ۱۳۶، حصّہ نثر، مرزا محمد عسکری طبع پنجم ۱۹۶۹ء۔

[2] ناول کی تاریخ و تنقید، ص ۲۹۲۔

[3] ہمارا مطلب شعر و سخن کی مسند سے ہے۔ حضرات صوفیہ کچھ اور نہ سمجھ لیں۔ (نیّر)

[4] کوچہ چیلان بلّی ماران سے ایک میل کے فاصلے پر ایک محلّہ ہے۔ (نیّر)

[5] یہ ایک مزیدار لطیفہ ہے کہ ایک طہرانی نے اپنے وطن جاتے وقت مرزا سے کہا اپنا پتا لکھ دیجیے۔ انھوں نے ہندوستان شہر دہلی، 'بلّی ماران' لکھ دیا۔ اُن بزرگ نے وطن پہنچ کر لفافے پر لکھا "ہندوستان، شہر دہلی محلّہ گربہ کُشان"۔ پوسٹ مین حیران تھا کہ یہ کون سا محلّہ ہے مگر مرزا غالب ایک مشہور آدمی تھے۔ اس سبب سے خط مل گیا۔ (نیّر)

[6] کلیاتِ غالب (مرتبہ: امیر حسن نورانی قطعہ ۱۹، ص ۲۴۶) میں بغیر کسی

عنوان کے ایک قطعہ ہے۔ اس میں گیارہ شعر ہیں۔ قطعے میں مرزا غالب نے بلّی کی تعریف کی ہے۔ چند شعر یہ ہیں ؎

دارم بجہاں گربۂ پاکیزہ نہادے
کز بالِ پری زاد بود موجِ رمِ او
سرمستِ ادا چوں بہ زمیں باز خرامد
از خاک دمد غنچہ ز نقشِ قدمِ او
چوں صورتِ آئینہ ز افراطِ لطافت
آید بہ نظر بچۂ او از شکمِ او
ہر بچّہ کہ کنجشک بوے باز سپارد
در پرورشِ او نہ خورد غیر قسمِ او
در عربدہ چوں بند زدُم باز کشاید
لرزد شکنِ طرّۂ خوباں زخمِ او
تا بہرہ کشِ صفحۂ افلاک بود مہر
باد اکفِ دستِ من و پشت و شکمِ او

(ا - ح)

۵۷ "میرے نزدیک مرزا صاحب کا مطلب اسی ابوالفرج بند ہند و سے ہے جو بغداد میں پیدا ہوا تھا۔ اور ابوالخیر بن خمّار کا شاگرد تھا۔ جس نے ۴۵۵ ہجری میں ایک سخت مرض میں مبتلا ہوکر جان دی۔ یہ حکیم بڑا ادیب تھا۔ شاعری میں اس کو بڑا کمال حاصل تھا۔ اس کے اکثر اشعار مشہور ہیں۔ اکثر اطبّا نے اس کی تعریف کی ہے۔ ابنِ رضواں جو کہ اعلیٰ درجے کا طبیب تھا ابوالفرج کی ہمیشہ تعریف کرتا رہا۔ کتاب منافع میں ابوالفرج کے اقوال سے بہت کچھ دلائل پیش کیے ہیں۔ اس حکیم کے عروج کا زمانہ القائم بامر اللہ عبّاسی کے عہد میں تھا جن اشعار کے معنی تصرف کے ساتھ مرزا غالب نے بیان کیے ان کا ترجمہ یہ ہے کہ :
"جب تجھ کو تیرے ہم وطنوں سے آزار پہنچے تو تجھ کو ترکِ وطن کر دینا چاہیے۔ کیوں کہ اپنے وطن میں عزّت حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس موقع پر وہ ایک مثال دیتا ہے کہ کیا دیکھا نہیں کہ صندل ہندوستان میں ایک معمولی لکڑی کا نام ہے مگر دوسرے ممالک میں وہ کس درجہ قابلِ قدر ہوتی ہے۔" (احمد شفیع نیّر)

۵۸ "ہمیں ڈر ہے کہ اہلِ دہلی خفا نہ ہو جائیں۔ ہم کیا کریں کہ واقعات کے لکھنے میں ہم طرف داری کرنے سے بالکل مجبور ہیں۔ نہیں ہمیشہ بغیر کسی خیال کے ہم سچ لکھ دینے سے دریغ نہیں کریں گے۔ اب اعتراض کرنے والے چاہے کچھ ہی فرمائیں کسی کا مُنہ بند نہیں کیا جاتا۔" (احمد شفیع نیّر)

۵۹ مرزا جب مقدمۂ پینشن کے سلسلے میں دِلّی سے کلکتے کے لیے روانہ ہوگئے راستے میں انھیں لکھنؤ میں گیارہ [illegible] تک قیام کرنا پڑا۔ وہ محرم ۱۲۴۲ھ مطابق اگست ۱۸۲۶ء میں لکھنؤ پہنچے تھے (ذکر غالب مالک رام، ص [illegible]) اور یہاں سے ۲۶ ذی قعدہ [illegible] مذکور کو کانپور کے لیے سوار ہو [illegible] (کلیاتِ نثر غالب، ص ۷۵ [illegible] ۱۸۸۸ء) تفصیل کے لیے [illegible] کا مقالہ "مرزا غالب اور شا[illegible]" ص ۳۴۳، مطبوعہ نقوش لاہور نمبر ۱، ۱۹۶۹ء دیکھا جا سکتا ہے۔ (ا - ح)

دِلّی کے ضمن میں

دِلّی کے ضمن میں سینکڑوں ایسی باتوں کا ذکر کیا جاسکتا ہے جو تاریخی نقطۂ نظر سے بہت اہم ہیں۔ ان میں سے کچھ نے ہمارے ذہن اور مزاج کو متاثر بھی کیا ہے۔ پانڈوؤں کی راست بازی، راجپوتوں کی شجاعت اور وضعداری، ترکوں کی زندہ دلی، پٹھانوں کی صلابت و حمیّت اور مغلوں کی وسیع المشربی کے نقوش اہلِ دہلی کی تاریخ کے مطالعے سے دریافت کیے جاسکتے ہیں۔ محکمۂ آثارِ قدیمہ نے چند ایسی عمارتیں بھی محفوظ کر رکھی ہیں جہاں دِلّی کی سنگ و خشت کے نمونے مل جاتے ہیں

—— سیّد ضمیر حسن دہلوی
(دِلّی کی تہذیب کے بُنیادی عناصر)

حسن نعیم

جان بھی نکلی ہے اپنی تو اُصولوں پر اڑا ہوں
میں غزل کی تیغ لے کر حکمرانوں سے لڑا ہوں
کتنی صدیاں مجھ پہ بیتیں، کتنے دریا گم ہوئے
میں ابھی تک کربلا میں فی سبیل اللہ کھڑا ہوں
کس لیے قہرِ خدا پر اتنا شرمندہ ہوا ؟
جنت نکلی جب زمیں تو آسمانوں میں گڑا ہوں
ہر ہیمبر میں نظر آتا ہے کیوں گو تم مجھے ؟
کس لیے اس ملک کی تاریخ سے اِتنا جُڑا ہوں
ڈھونڈنے نکلیں گے مجھ کو صبح دم میرے انیس
میں ابھی کوئے عدو میں بےحس و حرکت پڑا ہوں
میرا رتبہ جانتے ہیں حاسدانِ خوش نگاہ
میر و غالب سے تو چھوٹا ہوں، یگانہ سے بڑا ہوں
میں بظاہر موم ہوں، تہذیبِ نغمہ سے نعیم
جنگ کا نعرہ سنوں تو دیکھنا کتنا کڑا ہوں

سی ۳۹، شالیمار، نوینگ نگر، دہیسر (ایسٹ) بمبئی ۶۸

حامدی کاشمیری

طوالت شب کی شاید کم بہت ہے
چراغِ دل کی لو مدّھم بہت ہے

وہی قزّاق پھر آئے ہیں شاید
سمندر شام سے برہم بہت ہے

جو دیکھو سطحِ دریا پُرسکوں ہے
سُنو تو گریۂ ماتم بہت ہے

ستاروں کو کہاں جاکر میں ڈھونڈوں؟
فروغِ دیدۂ پُرنم بہت ہے

کروگے اِس کی تاویلات کب تک ؟
مرا طرزِ سُخن مبہم بہت ہے

اُن سے جو ہوسکا نہ، ہم کرتے
اپنے ہاتھوں سے سر قلم کرتے

تھی نہ تابِ مقاومت، مانا
کم سے کم شکوۂ ستم کرتے

اتنی مہلت تو اے اجل دیتی
دشت کو خون سے ارم کرتے

اک طلسمی نگارخانہ تھا
دیدہ و دل کو کیا بہم کرتے

لوگ بھٹکیں گے دشت میں کب تک
حالِ شب ریت پر رقم کرتے

شالیمار، سری نگر، کشمیر

سریندر پرکاش

علامت کے اُس پار

میں نے اپنے ہمسفر سے دریافت کیا۔
"اِس ندی کا نام خُونی ندی کیونکر پڑا۔؟"
وہ چونک کر میری طرف پلٹا۔ دراصل وہ اپنے خیالوں میں کھویا ہوا سیدھا ونڈسکرین میں دیکھ رہا تھا۔ اور بس 'خُونی ندی' پر بنے پُل پر سے گذر رہی تھی ــــ یہ پُل انگریزوں کے زمانے میں تعمیر ہوا تھا ــــ لیکن پُل کے دونوں طرف ایک' ایک سائن بورڈ لگا تھا جس پر لکھا تھا ــــ "یہ پُل پہلی پنچ ورشیہ یوجنا کے انترگت نرمان کیا گیا۔"
میرے ہم سفر نے میری طرف پلٹ کر دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ صورت سے میرے جیسا ہی ہے ــــ ایسے لگا جیسے اپنے آپ سے ہی ہم کلام ہوں۔ اُس نے مجھے بتایا کہ کہتے ہیں۔ ایک برس کے ۳۶۵ دنوں میں ایک رات ایسی آتی ہے۔ اور وہ رات اماوس کی رات ہوتی ہے ــ جب ندی کا پانی خُون کی طرح سُرخ ہو جاتا ہے۔ اور ندی کے بہاؤ کے ساتھ اَن گِنت چمگادڑیں اُڑتی پھرتی ہیں۔ اِسی لیے اِسے 'خونی ندی' کہتے ہیں۔
"مگر ایسا کیوں ہوتا ہے؟" میں نے پھر سوال کیا۔
"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ جہاں سے دریا کا سُوتا پھوٹتا ہے۔ وہیں کوئی قتل کی واردات ہوتی ہے۔ اور سارے پانی میں خُون شامل ہو جاتا ہے۔"
"کیا یہ قتل کی واردات ہر سال ہوتی ہے؟"
"آج تک تو کوئی برس خالی نہیں گیا۔ کہتے ہیں وہاں اُونچائی پر دو پنچھی رہتے ہیں۔ جو ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔ ایک اماوس کی رات ایسی آتی ہے۔ جب اندھیرے کے کارن اُن میں کوئی غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے اور اُن کی محبت نفرت میں بدل جاتی ہے۔ اور اُن میں سے ایک دوسرے کو قتل کر دیتا ہے۔ اور کبھی دُوسرا پہلے کو۔"
میرا ہم سفر اپنی بات کہہ چُکا تو بس پُل پار کر گئی تھی۔ اب سڑک بائیں طرف مُڑ کر ایک وادی میں داخل ہو گئی جس کے دونوں طرف پہاڑ تھے۔ اور اُن پہاڑوں پر اُگی ہوئی جھاڑیوں کو بھیڑ، بکریاں چَر رہی تھیں۔
پہاڑی کے کئی چکر کاٹنے کے بعد بس اُس قصبے کے مضافات میں داخل ہو گئی جہاں مجھے جانا تھا۔ یہ قصبہ بڑا خوب صورت۔ دُور سے کیلنڈر پر چھپے منظر ایسا لگا۔ بس اپنے سٹاپ پر جاکر رُک گئی ــــ میرے دوست روی شنکر کا پیٹرول پمپ یہاں سے قریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ جہاں پیٹرول پمپ تھا۔ وہاں قصبہ ختم ہو جاتا تھا اور سُرمئی سڑک آگے جاکر پہاڑی بھول بھلیوں میں کھو جاتی تھی۔
میں اپنا جھولا اُٹھاتے ہوئے سڑک پر آگے بڑھ رہا تھا اور قصبے کا نظارہ بھی کرتا جا رہا تھا۔ یہاں ہر سب کچھ موجود تھا جو کسی بڑے شہر میں ہوتا ہے ــــ لیکن چھوٹے پیمانے پر۔ ہوا میں بڑی تازگی تھی اور فضا پیڑوں، پتھروں اور پانی کی خوشبو سے معطر تھی۔ اب پیٹرول پمپ سامنے نظر آرہا تھا۔
چھوٹی سی چوکور عمارت جس کے کھلے آنگن میں سُرخ رنگ کے دو پمپ کھڑے تھے گاڑیوں کے داخل ہونے اور باہر نکلنے کے لیے کشادہ سڑک بنی تھی اور جگہ جگہ پھُول پودے

۱۵/۱۸، شاستری نگر، سانتا کروز (ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۵۴

لگے تھے۔ ایک کار ابھی ابھی پٹرول بھرواکر پہاڑی سڑک پر بھاگتی ہوئی نکل گئی تھی ـــ پمپ کے قریب ہی ایک ملازم وردی پہنے کھڑا تھا جس نے پائپ کا نوزل (NOSEL) ابھی ابھی ٹینک میں لٹکایا تھا ـــ میں کمپاونڈ میں داخل ہوا۔ اور میں نے اُسی ملازم سے پوچھا۔

"روی شنکر ہیں؟"

"جی صاحب، بابو صاحب تو اپنے سسرال گئے ہیں۔ کل تک آجاویں گے۔" ملازم نے جواب دیا ـــ اور پھر میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"آپ جی صاحب ـــ؟"

"میں اُن کا دوست ہوں، شہر سے آیا ہوں۔" میں نے قدرے مایوس ہو کر جواب دیا۔

"تو براجیں ـــ آپ اسے اپنا ہی گھر سمجھیں جی صاحب۔ آپ کی خدمت میں کوئی کمی نہ رکھی جائے گی۔ کل تک تو آہی جاویں گے مالک۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے جواب دیا اور اس کی راہنمائی میں اُس جوکور عمارت میں داخل ہوا جو دراصل پٹرول پمپ کا آفس تھا۔

پٹرول پمپ کے پچھواڑے ایک لمبی سی عمارت تھی۔ جس کے آگے برآمدہ تھا۔ اُسی عمارت میں روی شنکر کا گھر تھا۔ اُونچی چھتوں والے بڑے بڑے کمرے تھے، جن میں پرانی وضع کے چار چار بلیڈوں والے بجلی کے پنکھے لگے تھے ـــ دائیں طرف کے ایک بڑے سے کمرے میں بلونت سنگھ کا ورکشاپ تھا ـــ

بلونت سنگھ اپنا پُرانا یار تھا۔ اور اچھا ذوق رکھتا تھا۔ میں نے ژاں ژینے کے بارے میں لکھی ہوئی سارتر کی کتاب اُسی سے لے کر پڑھی تھی۔ کتاب دیتے ہوئے اُس نے سارتر اور ژینے کے سلسلے میں مجھے بہت کچھ بتایا تھا ـــ اُس نے کہا تھا کہ سارتر جینے کا ایک رویّہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب میں نے کتاب پڑھی تو مجھے معلوم ہوا کہ بلونت سنگھ نے جو کچھ بھی مجھے بتایا تھا۔ وہ سب اُس کتاب میں لکھا تھا۔

میں نے پانی پیا اور ملازم سے پوچھا ـــ

"کیا بلونت سنگھ جی اپنے ورکشاپ ـــ میں ہیں ـــ؟"

"جی ہاں ـــ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ یہاں وال کلاک پر وقت دیکھنے آئے تھے۔"

میری نظر بھی اچانک وال کلاک پر اُٹھ گئی۔ دوپہر کے اڑھائی بج رہے تھے۔

میں اُٹھا اور بلونت سنگھ کے ورکشاپ کی طرف بڑھا۔ جو چند ہی قدم کے فاصلے پر تھا ـــ

موسم سرما کا تھا مگر سورج کی تپش پھر بھی کافی تھی۔ اِدھر اُدھر چلتے پھرتے لوگ بڑے شہر کی طرح بھاگ دوڑ کے مارے نہ تھے ـــ بلکہ بڑے اطمینان سے قدم زمین پر جما جما کر بڑے آرام سے چل پھر رہے تھے۔

ورکشاپ کے اندر خراد کے پاس بچھے ہوئے بنچ پر بلونت سنگھ لیٹا ہوا تھا۔ اُس کی پگڑی قریب ہی پڑے سٹول پر پڑی تھی اور سینے پر کوئی کھلی ہوئی کتاب اُلٹی رکھی تھی۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں۔

میں اُس کے قریب پہنچ کر اُسے دیکھ کر مسکرایا۔ پھر آہستہ سے کہا۔

"کیوں سرکار، آرام فرمایا جارہا ہے؟"

بلونت میری آواز سُن کر ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور اُس کا چہرہ کھل گیا ـــ اور بولا۔

"ہے شاباش اے۔ کب آئیں سنگتیں؟"

اور دوسرے ہی لمحے ہم دونوں ایک ـــ دوسرے سے بغل گیر ہو کر مل رہے تھے۔

بلونت سنگھ مجھے پاکر جیسے نہال ہو گیا تھا۔

"بڑے اچھے آئے ہو یار تم ـــ اب کی شوہنہ بہت بور ہو رہا تھا۔ اردگرد کی ہر چیز کھانے کو دوڑنے لگی تھی ـــ"

ہم نے آمنے سامنے بیٹھ کر چائے پی۔ اور وہ کہنے لگا۔

"تیری بھرجائی تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہو گی۔ وہ بھی مردم بیزار بیٹھی ہے ـــ کئی دن سے اُس نے کسی انسان کا مُنہ نہیں دیکھا۔"

"تم بھی تو انسان ہی ہو بلونت ـــ"

میں بولا ـــ

"نہیں ـــ میں انسان نہیں رہ گیا ہوں، میں تو ہسبنڈ (HUSBAND) ہوں۔"

پھر ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

میں نے اُس کتاب کی طرف دیکھا جو اُس نے اپنے سینے پر رکھی ہوئی تھی

"ارے کچھ نہیں یہ کلاسیکل پورنوگرافی ہے۔ آج کل اسی سے جی بہلاتا ہوں ـــ کچھ پڑھنے کو جی ہی نہیں کرتا۔ مگر تمھارے لیے میں نے کوچک کی کتاب رکھی ہے۔ تم جانتے ہو کوچک کو پڑھے بغیر مارکس کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔" وہ کہتا چلا گیا۔

میں کارل مارکس سے آل ریڈی چڑا ہوا تھا۔ جس کو سمجھنے کے لیے دوسروں کو پڑھنا پڑتا ہے۔ نان سنس! (NONSENSE)۔ میں نے دل ہی دل میں کہا ـــ اور پھر اُس سے کہنے لگا۔

"اچھی بات ہے۔ کل لے لیں گے کتاب۔ مگر تم اتنے اُچاٹ کیوں نظر آتے ہو؟"

"یار بات یہ ہے۔ جب بڑے بھائی سے الگ ہو کر یہاں ورکشاپ بنایا تو سوچا تھا۔ کچھ وقت کام میں کٹ جائے گا، کچھ پڑھنے پڑھانے میں، کچھ یار دوستوں کے ساتھ، کچھ دارُو میں اور کچھ بیوی کے ساتھ ـــ مگر عجیب اتفاق ہے۔ آہستہ آہستہ ہر چیز سے جی بھر گیا ـــ ہر چیز، ہر جذبے اور ہر شوق کا ڈی کے (DECAY) آ گیا ـــ اب کچھ بھی کرنے کو جی نہیں چاہتا....."

بلونت کہتا چلا جا رہا تھا ـــ اور میں سُن رہا تھا۔ مگر اُس کے الفاظ میرے کان تک پہنچتے پہنچتے اپنی آواز اور اپنے معنی کھو دیتے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے کسی پرندے کے پنکھ کھڑے کھڑے جھڑتے جاتے ہیں۔

شام ہوتے ہی شراب کی بوتل آ گئی اور بلونت کے گھر سے بھُنی ہوئی چانپیں۔ شراب کے دوران روی شنکر کا بھی ذکر آ گیا۔ جو اپنے سُسرال گیا ہوا تھا اور کل تک واپسی کی امید تھی۔ بلونت نے مجھے بتایا کہ میرے سونے کا انتظام روی شنکر کے ہی شاندار مہمان خانے میں کر دیا گیا ہے ـــ کیوں کہ بلونت کا گھر ورکشاپ سے کافی دُور ہے۔

باتیں کرتے کرتے اور شراب پیتے پیتے رات کے گیارہ بج گئے ـــ بلونت نے مجھے روی شنکر کے مہمان خانے میں پہنچایا اور خود اپنی بائسیکل پر سوار ہو کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اچھی خاصی سرد رات تھی۔ اِرد گِرد کے پہاڑ اور قصبہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا ٹھٹھرتا سا محسوس ہونے لگا۔ صرف پیٹرول پمپ پر بتی جل رہی تھی جس کی روشنی کمزور اور زرد تھی۔

میں جس کمرے میں داخل ہوا وہ بہت کشادہ تھا۔ پُرانے زمانے کا ـــ تعمیر کا انداز قریب قریب گوتھک ہی تھا ـــ فرنیچر پر سفید روغن تھا جس کے میلا ہو جانے سے لکڑی پر کندہ بیل بوٹے مدھم پڑ چکے تھے ـــ ایک دیوار کے ساتھ طویل و عریض پلنگ لگا ہوا تھا۔ جس پر دُھلی ہوئی تازہ چادر بچھی تھی، اور تکیوں کے غلاف بھی ابھی ابھی بدلے گئے تھے۔ پلنگ کے ساتھ ہی ایک سائڈ ٹیبل تھا جس پر پڑا ہوا ٹیبل لیمپ جل رہا تھا۔ یہ سب اُسی کی روشنی میں دکھائی دے رہا تھا۔ جو آدھی دیواروں تک پہنچتی تھی۔ اور دیواروں میں بنی الماریوں میں رکھی پُرانے زمانے کی چیزیں اور کتابیں واضح طور پر دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ چھت کافی اُونچی تھی۔ اُس کے ساتھ ایک بڑا سا پنکھا ضرور لٹک رہا تھا مگر اُس کے ساتھ بلیڈز نہیں تھے۔ مَیں نے خُوب پی رکھی تھی ـــ پیٹ خُوب بھرا ہوا تھا۔ لہٰذا منظر کافی پُراسرار لگ رہا تھا۔

میں نے دیکھا ـــ میرے سامان کا جھولا پلنگ کے ایک کونے میں رکھا تھا۔ اور قریب ہی ایک سٹول پر شیشے کی پانی سے بھری صراحی رکھی تھی جس پر شیشے ہی کا گلاس اُلٹا رکھا تھا۔

مَیں نے بڑھ کر ایک گلاس پانی پیا ـــ کپڑے تبدیل کیے اور پلنگ پر دراز ہو کر سگریٹ سُلگایا ـــ تھوڑی ہی دیر میں، مجھے نیند آ گئی۔ میں نے سگریٹ فرش پر پھینکا اور لحاف اوڑھ لیا۔

آنکھیں بند کر کے میں سوچنے لگا کہ یہاں آنے کا میرا مقصد کیا تھا؟

ایک تو روی شنکر کی دیرینہ خواہش تھی کہ میں اُس کے پاس چند دن گُذاروں۔ بڑے شہر کی بھیڑ بھاڑ شور شرابے سے دُور ایک پُرامن جگہ پر۔ جہاں سوائے باتیں کرنے، کھانے پینے اور سونے کے اور کوئی کام نہ ہو۔ اور پھر یہاں بلونت سنگھ جیسا پیارا دوست بھی تھا جو اَب اپنے ماحول سے بالکل اُوب چکا ہے۔ اور اِس پر طرّہ یہ کہ مَیں بھی اپنے ماحول سے گھبرا گیا تھا۔

یہ سب سوچتے سوچتے میرے ذہن پر نیند کا غلبہ طاری ہونے لگا ـــ اچانک اِس طرح کی آواز آئی جیسے پہاڑ پر بڑی سی ڈرلنگ مشین سے سوراخ کیا جا رہا ہو۔ آواز بہت دُور سے آ رہی تھی۔ لیکن پھر وہ آواز قریب ہوتی گئی۔ ایسے لگنے لگا جیسے یہ کھدائی کا کام میرے ساتھ والے کمرے میں ہو رہا ہے۔ اور چند سیکنڈ کے بعد وہ آواز مجھے اپنے وجود کے اندر سے آنے لگی۔ ایک ہی لے کے ساتھ۔ میں نے سوچا کہیں یہ سوراخ میرے اندر تو نہیں ہو رہا ـــ؟

میں نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں اور لحاف چہرے پر سے اُلٹ دیا۔ آواز بدستور آ رہی تھی۔ لیکن ساتھ والے کمرے میں سے ـــ میں نے سائڈ ٹیبل پر رکھا ٹیبل لیمپ روشن کیا۔ کمرے میں سب ویسے ہی تھا جیسا میں نے سونے سے پہلے دیکھا تھا۔ میں نے اپنی کلائی کی گھڑی روشنی کے ہالے میں لے جا کر دیکھی دو بج کر ۲۴ منٹ ہوئے تھے ـــ ڈرلنگ مشین کی مدھم سی آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ چند ہی سیکنڈ کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اِس آواز کے ہوتے اب مجھے نیند نہیں آئے گی۔

میں پلنگ پر سے اُترا، شال جسم کے گرد لپیٹی اور باہر غلام گردش میں نکل آیا ـــ

آہستہ آہستہ اُس کمرے کی طرف بڑھا جس میں سے آواز آرہی تھی۔ وہ کمرہ ایک بڑا ہی کشادہ رسوئی گھر تھا۔ جس میں دیواروں اور پلیٹ فارم پر سفید ٹائیلیں لگی تھیں۔ ٹائیلوں کے جوڑوں والی جگہ مٹ میلی ہو چکی تھی۔ جس سے اندازہ ہوتا تھا، رسوئی گھر کافی پرانا بنا ہوا ہے۔ آواز اسی رسوئی گھر میں سے آرہی تھی۔ اور وہ آواز اُس کیروسین سٹو کی تھی جو سامنے پلیٹ فارم پر رکھا جل رہا تھا۔ اس کا پیتل کا پیندہ چمک رہا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُسے آج ہی مانجا گیا ہے۔ سٹو کے اوپر ایلومینیم کی ایک کیتلی رکھی تھی جس میں سے اُبلتے ہوئے پانی کی بھاپ نکل رہی تھی ــــ ریکوں میں چند برتن رکھے تھے جو مانجے دُھلے ہوئے تھے ــــ مگر وہاں کوئی شخص دِکھائی نہ دیتا تھا ــــ تو پھر یہ پانی اُبلنے کے لیے کس نے رکھا ہے؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

اُس سے اگلے کمرے میں سے دروازہ بند کرنے کی ہلکی سی آواز آئی ــ میں آگے بڑھا ــــ اگلے کمرے کا دروازہ بھڑا ہوا تھا مگر دونوں پٹوں میں اتنی جھری ضرور تھی کہ اندر جھانک کر دیکھا جا سکتا تھا ــــ

میں نے اندر جھانک کر دیکھا ــــ

ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا زیبائش کا سامان۔ ایک تپائی پر نٹنگ وُول اور بُننے کی سلائیاں۔ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے کپڑے اور جُوتے.... یہ سارا سیٹ اَپ ایک عورت کے کمرے کا تھا ــــ مگر عورت تو کہیں دِکھائی نہیں دیتی تھی ــــ میں حیران سا وہاں کھڑا سوچنے لگا۔ بلونت سنگھ نے یا روی شنکر کے کسی ملازم نے تو بالکل ذکر ہی نہیں کیا تھا کہ مہمان خانے میں کوئی اور بھی ٹھہرا ہوا ہے۔

اچانک کمرے کے اندر سے کسی عورت کے انگریزی میں گانا گانے کی مدھم سی آواز آئی ــــ جیسے کوئی نہاتے ہوئے گنگنا رہا ہو۔

I am away from you
my Sons, But, I am Sonny.
It is a fate,
I am digging to fetch
food for you my Sons,
I may be late but I am
Sonny.

آواز بالکل عورت کی تھی ــ کسی جوان عورت کی۔ جس کی آواز کافی مستحکم تھی ــ اوہ! شاید وہ باتھ رُوم میں ہے ــــ نہا رہی ہوگی ــــ مگر اس وقت رات کے تین بجے ــــ اتنی سردیوں میں!!!

میں اُلٹے پاؤں واپس اپنے کمرے میں آ گیا ــ بستر پر لیٹا کروٹیں بدلیں مگر نیند نہیں آرہی تھی۔ اچانک چائے پینے کی خواہش من میں پیدا ہوئی۔ سوچا اُس عورت نے ضرور چائے بنانے کے لیے پانی سٹو پر رکھا ہوگا۔

"May I Come in Gentle man"

ایک باوقار زنانہ آواز سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا ــــ وہاں ایک ادھیڑ عمر کی انگریز عورت کھڑی تھی' جو ابھی ابھی نہا کر آئی تھی۔ اُس کے ترشے ہوئے سفید بال گیلے ہو کر ایک دوسرے میں اُلجھے ہوئے تھے۔ وہ کافی مضبوط جُثے کی تھی۔ دراز قد تھی۔ پیشانی کُشادہ اور پُرکشش لمبا ناک' پتلے پتلے گلابی ہونٹ۔ سفید رنگ جس میں ہلکی سی زردی کی جھلک تھی ــــ وہ بیڈنگ گاؤن پہنے ہوئے تھی۔ مرمر کے ستونوں جیسی پنڈلیاں دِکھائی دے رہی تھیں اور وہ پاؤں سے بالکل ننگی تھی ــــ

"you are well come Madame"

میں نے بے اختیار کہا ــ جب وہ چل کر میری طرف بڑھنے لگی تب مجھے احساس ہوا کہ وہ اندھی تھی ــــ اُس کی آنکھیں بڑی بڑی اور خوب صورت تھیں مگر اُس کی پتلیوں میں بالکل حرکت نہ تھی۔

وہ میرے بستر کے قریب آ کر رُک گئی۔ اُس نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

"I am Mangenate oxford"

ہم دونوں نے ہاتھ ملایا اُس کا ہاتھ بڑا ملائم تھا۔

"May I Know yourgood name please?"

اُس نے پوچھا ــــ۔

"کلیان راج ہنس" میں نے اپنا نام بتایا۔

So we are partners in This guest house.

I am deligted realy deligted

اُس کے چہرے پر مُسکراہٹ پھیل گئی

میں نے پوچھا ــــ "تو آپ یہیں رہتی ہیں روی شنکر کے مہمان خانے میں؟"

"For the last one and a alf Century would you ike to have a cup of hot ea, I will prepare for ou"

اُس نے کہا ــــ چائے کی خواہش

بھڑک اٹھی۔

"Thank you very much——

——سٹو پر پانی اُبلتا دیکھ کر۔ چائے کی طلب ہوئی تھی۔ اگر آپ بنا ہی رہی ہیں تو۔ ۔ ۔"

میں نے بڑی عاجزی سے کہا۔۔۔

"Its my pleasure"

اُس نے کہا اور پلٹ کر دروازے میں سے باہر نکل گئی۔ اتنی پھرتی سے، جیسے وہ اِس گھر کے چپّے چپّے سے واقف ہو۔ اور بالکل اندھی نہ ہو۔

اچانک میں اُس کے اِس جواب سے حیران ہو اُٹھا کہ وہ یہاں پچھلی ڈیڑھ صدی سے رہ رہی ہے۔

دوسرے کمرے میں سے سٹو جلنے کی آواز آنا بند ہوگئی تھی۔ پھر چائے کے برتنوں کے ٹکرانے کی آواز آئی —— میں نے سوچا ابھی وہ چائے لے کر آئے گی یا مجھے آواز دے گی — کہ چائے تیار ہے — مگر کافی وقت گذر گیا۔ چائے کا کہیں ذکر سنائی نہ دیا۔ اور سارے مکان میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

آخر میں خود ہی اُٹھ کر رسوئی گھر میں گیا۔ وہاں ایک کپ ساسر پڑا تھا جس میں کسی نے ابھی ابھی چائے پی تھی۔ اور قریب ہی ایک ٹی کوزی کے نیچے ایک شیشے کا گلاس ڈھکا ہوا تھا —— میں نے گلاس اُٹھایا اور چائے پینے لگا — چائے ابھی تک گرم تھی اور کافی مزیدار تھی —— میں چائے پیتا ہوا اُس کے کمرے کی طرف بڑھا۔

اِس بار دروازہ سپاٹ کھلا ہوا تھا —— میں نے اندر جھانک کر دیکھا —— وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سٹول پر آئینے کی طرف رُخ کیے بیٹھی تھی —— ارے یہ کیا —! اُس کی گردن کے اُوپر اُس کا سر تو تھا ہی نہیں۔ میں بھونچکا سا رہ گیا —— ذرا آگے بڑھ کر دیکھا تو اُس کا سر ڈریسنگ ٹیبل کے ٹاپ پر رکھا تھا اور وہ کنگھی لے کر اپنے آگے رکھے سر پر بال بنا رہی تھی —— مجھ پر یکدم خوف طاری ہوگیا اور میں گھبرا کر وہاں سے بھاگنا چاہتا تھا کہ میرے پاؤں مَن مَن کے بھاری ہوگئے

میرے قدموں کی آہٹ سے اُس پر کوئی ردِّ عمل نہ ہوا تھا۔ وہ اپنے کام میں بدستور مشغول رہی۔

میرے حلق میں سے گھُٹی گھُٹی چیخ سی نکلنے والی تھی کہ میں بھاگ —— کر مہمان خانہ کے باہر آگیا۔

باہر شدید سردی تھی —— مہمان خانہ کے کمپاؤنڈ میں جہاں درختوں کا ایک گھنا جھنڈ تھا۔ اُس کے قریب ہی ایک چھوٹا سا الاؤ جل رہا تھا۔ جس کے گرد چند چوکیدار قسم کے لوگ —— اپنے قریب اپنی لاٹھیاں رکھے بیٹھے آگ —— تاپ رہے تھے اور مُسکرا مُسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔ میں بھاگتا ہوا اُن کے قریب —— پہنچا —— خوف ابھی تک مجھ پر طاری تھا۔ میں نے ہکلاتے ہوئے اُن سے کہا۔

"بھ... بھ... بھیّا جی —— اندر ایک —— انگریز عورت..."

وہ سب میری طرف متوجہ ہوئے —— ایک نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا بات ہے صاحب —— آپ بہت پریشان لگت ہیں۔"

"وہ، وہ اندر ایک اندھی انگریز عورت ہے —— اُس نے اپنے سر کو گردن پر سے اُتار کر اپنے آگے رکھا ہے... اور آئینے کے سامنے بیٹھی بال بنا رہی ہے..."

وہ سب حیرانی سے مجھے دیکھنے لگے۔ پھر اُنھوں نے کریدنے والی نظروں سے ایک —— دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اچانک —— کھِلکھلا کر ہنس پڑے۔ میں مزید گھبرا گیا۔

"یہ کونو گھبرانے کی بات نا ہے مالک۔"

اُن میں سے دُوسرا بولا۔ "بڑی معمولی بات ہے اے تو —— یہ دیکھو —— اپنا سر تو ہم بھی اُتار سکت ہیں۔"

اور اُس نے اپنی گردن پر سے اپنا سر پگڑی سمیت اُتار کر اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ میں نے ایک خوفناک چیخ ماری اور وہاں سے بے تحاشہ بھاگا۔ پھر —— کمپاؤنڈ کے گرد اُگی جھاڑیوں میں اُلجھ کر مُنہ کے بل زمین پر گرا۔

ہوش آنے کے بعد جب میں نے آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو مقامی ہسپتال میں پایا۔ میرے بیڈ کے گرد روی شنکر، بلونت سنگھ، ایک ڈاکٹر، نرس اور روی شنکر کے چند ملازمین موجود تھے ——

میرے ہوش میں آنے پر سب —— کے چہروں پر اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی۔ جب ذرا طبیعت سنبھلی تو میں نے اُن سب کو پچھلی رات کا سارا قصّہ سُنایا۔

سب میری بات پر حیرانی کا اظہار کرنے لگے —— روی شنکر نے میرے چہرے پر اپنی نظریں جمائے رکھیں —— وہ کافی فکر مند نظر آ رہا تھا۔ پھر اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور آہستہ سے دبا ڈالا۔ اور بیٹھی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔

"کلیان —— یہ سب غلط ہے تم نے ضرور کوئی خواب دیکھا ہے۔ وہ مہمان خانہ میرے بزرگوں کی ملکیت ہے۔ آج سے نہیں جب سے اُس کی تعمیر ہوئی ہے۔ وہاں کوئی اندھی انگریز عورت نہیں رہتی۔"

غزلیں

خلش بڑودوی

بغیر برسے یہ کہہ کر چلا گیا ساون
کہ لوگ شہر کے رکھتے نہیں ہیں اب آنگن

اب اتنی تیز بھی اے میری زندگی مت چل
کہ چھوٹ جائے مرے ہاتھ سے ترا دامن

محل شباب کا تاریکیوں میں ڈوب گیا
ہم اک چراغ بھی اس میں نہ کر سکے روشن

سکون ہوگا تو ہم سے جیا نہ جائے گا
ہمیں تو چاہیے ہر روز اک نئی اُلجھن

تعلقات کی زنجیر میں جکڑ کے مجھے
نہ چھین مجھ سے زمانے مرا اکیلا پن

خلشؔ یہ بات تو اب عام ہے زمانے میں
تلک لگائے کوئی اور کوئی گھسے چندن

یاقوت پورہ، بڑودہ ۳۹۰۰۰۶

اختر نظمی

دریا مجھے نزدیک بھی آنے نہیں دیتا
ہے مجھ سے خفا، پیاس بجھانے نہیں دیتا

شوخ ایسا ہے ہر آن بدلتا ہے نیا رنگ
تصویر کسی رُخ سے بنانے نہیں دیتا

وہ بات اُسے یاد ہے، بھولا نہیں وہ بھی
جو بات مجھے یاد دلانے نہیں دیتا

وہ کچھ بھی ہو لیکن مرا ہمدرد نہیں ہے
جو مجھ کو مرا بوجھ اُٹھانے نہیں دیتا

کہتا ہے کہ اس عمر کا یہ کھیل نہیں ہے
مٹی کے گھروندے بھی بنانے نہیں دیتا

تعبیر بتا دیتا ہے پہلے ہی سے نظمیؔ
خواب اُس کو سناؤ تو سنانے نہیں دیتا

صدر شعبۂ اُردو، کملا راجہ گرلس کالج، گوالیار (ایم پی)

والی آسی

سُنو! یہ غم کی سیہ رات جانے والی ہے
ابھی اذان کی آواز آنے والی ہے

تجھے یقین تو شاید نہ آئے گا لیکن
یہ صبح کوئی کرشمہ دکھانے والی ہے

کسے خبر ہے کہ آندھی چلائے، پیڑ گرائے
یہی ہوا جو پتنگیں اُڑانے والی ہے

تجھے بھی ظلم سے فرصت نہ مل سکے گی کبھی
مری انا بھی کہاں سر جھکانے والی ہے

سمیٹ بکھرے ہوئے کاغذات کو اپنے
کوئی صدا تجھے واپس بلانے والی ہے

مری غزل پہ نئے لوگ کیوں تڑپتے ہیں
مری غزل تو پُرانے زمانے والی ہے

مکتبہ دین و ادب، امین الدولہ پارک، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸

خلیق انجم

دلّی کے آثارِ قدیمہ

بستی حضرت نظام الدّین

لال محل، مرزغن اور دار الامان

لال محل :

بستی حضرت نظام الدّین میں بہت قدیم زمانے سے آبادی ہے۔ میں نے "ایوانِ اُردو" کے پچھلے شمارے میں عرض کیا تھا کہ یہ بستی جسے صدیوں تک غیاث پور کہا جاتا رہا ہے، ۱۲۶۵ء میں عہدِ غیاث الدّین بلبن میں آباد ہوئی تھی، گویا اس بستی کو آباد ہوئے کم سے کم سوا سات سو سال ہوگئے ہیں۔ اس کا بھی امکان ہے کہ اس سے پہلے کسی اور نام سے آباد ہو۔

مرزا سنگین بیگ نے "سیر المنازل" میں لکھا ہے کہ "سلطان غیاث الدّین بلبن نے اپنی حکومت کے دوران ۶۶۶ ہجری (۶۸-۱۲۶۷ء) میں ایک دوسرے قلعے کی بنیاد رکھی، جو مرزغن کے نام سے مشہور ہوا۔ اس بادشاہ نے ایک شہر بھی بسایا، جس کا نام غیاث پور تھا۔ یہ شہر اُسی جگہ واقع تھا، جہاں حضرت نظام الدّین کی درگاہ ہے۔"(۱)

کئی مؤرخوں نے لکھا ہے کہ غیاث الدّین بلبن نے کوشک لال، مرزغن اور دار الامن یا دار الامان کی عمارتیں تعمیر کی تھیں۔ لیکن یہ کسی نے نہیں بتایا کہ یہ عمارتیں کس کس مقام پر تعمیر ہوئی تھیں۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے مؤرخوں نے محض قیاس آرائی سے کام لے کر ان عمارتوں کے مقامات کا تعیّن کیا ہے۔ غالباً سر سیّد احمد خاں نے پہلی بار کوشک لال کا ذکر کرتے ہوئے "آثار الصنادید" میں لکھا ہے کہ "اس کوشک کو سلطان غیاث الدّین بلبن نے اپنے بادشاہ ہونے سے پہلے بنایا تھا اور جب وہ بادشاہ ہوا تو اسی کوشک کے پاس قلعہ مرزغن بنایا۔ تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جب سلطان جلال الدّین فیروز خلجی سے دلّی کے رئیس موافق ہوگئے اور کیلو کھڑی میں سے لاکر پُرانی دلّی کے تخت پر بٹھایا تو بادشاہ وہاں سے کوشک لال میں آیا اور اُس کے دروازے پر سے پیادہ پا ہوا۔ امرا نے عرض کیا کہ آپ سواری پر سے کیوں اُترے ہیں۔ سلطان نے کہا کہ یہ کوشک میرے آقا سلطان غیاث الدّین بلبن کا بنوایا ہوا ہے کہ اُس نے بادشاہ ہونے سے پہلے بنایا تھا مجھے لازم ہے کہ جو ادب اس کا اس زمانے میں کرتا تھا اب بھی کروں۔ اس تمہید سے معلوم ہوا کہ یہ کوشک ۶۶۴ھ مطابق ۱۲۶۵ء سے دس پانچ برس پہلے کا بنا ہوا ہے مگر بادشاہ ہونے کے بعد بھی پھر بادشاہ اکثر اسی کوشک میں رہتا تھا اور جس زمانے میں اس کو شکار کا شوق ہوا ہے، بہر رات رہے، اسی کوشک میں سے سوار ہوتا تھا اور سلطان علاء الدّین خلجی کوشک سیری بنانے سے پہلے اسی کوشک میں رہتا تھا اور سلطان غیاث الدّین تغلق شاہ اسی کوشک میں تخت پر بیٹھا تھا۔ اس کوشک کی عمارت کی تفصیل کسی کتاب میں نظر نہیں پڑی کہ کس قطع کی عمارت تھی لیکن اب اس میں کچھ شک نہیں رہا کہ سلطان جی کی درگاہ کے پاس لال محل کر کر جو عمارت مشہور ہے، یہ اسی کوشک میں کا ایک ٹکڑا ہے۔ یہ محل بہت خوشنما نرا سنگِ سرخ کا بنا ہوا ہے۔ ستون لگا کر دو منزلہ عمارتیں بنائی ہیں، لیکن خراب ہے اور دن بدن اور خراب ہوتا جاتا ہے، اس محل میں چند قبریں بھی بن گئی ہیں اور

جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو (ہند) راؤز ایوینیو نئی دہلی ۲

سلطان نے فرمایا میں مصلحتِ چند روزہ کے واسطے قواعدِ اسلام سے کیوں کر باہر جاؤں اور نفس الامر کے برخلاف ایک کام کروں:

کُجا عقلِ باشرع فتویٰ دہد
کہ اہلِ خرد دیں بدنیا دہد

پھر پا پیادہ لال محل کے اندر جا کر جن مقاموں میں کہ بادشاہ غیاث الدّین بلبن بیٹھتا تھا حفظِ مراتب اور پاسِ حُرمت کے سبب سے اس مکان میں نہ بیٹھا اور صفہ میں کہ مخصوص امرا کے واسطے تھا جلوس فرمایا۔"(۵)

غالباً تاریخ فرشتہ کی مذکورہ عبارت ہی کی وجہ سے اسٹیفن اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سرخ محل جو غیاث الدّین بلبن نے بنایا تھا، غیاث پور میں نہیں، پرانے شہر میں تھا۔ جلال الدّین خلجی کے زمانے میں نیا شہر اُس شہر کو کہتے تھے، جسے غیاث الدین بلبن کے پوتے معزالدّین کیقباد نے جمنا کے کنارے آباد کیا تھا اور پُرانے شہر سے مُراد رائے پتھورا کا شہر تھا۔

فرشتہ نے لکھا ہے کہ جلال الدّین خلجی پہلے "نئے شہر" میں آیا اور پھر "دہلی کہنہ" میں آیا اور پھر اپنے آقا کے بنائے ہوئے سُرخ محل (لال محل) میں پہنچا۔ فرشتہ کے اس بیان سے ہرگز یہ مطلب نہیں نکلتا کہ "لال محل" "دہلی کہنہ" میں تھا۔

سرسیّد کا بیان درست ہے یا غلط؟ یہ بحث تو الگ ہے، لیکن یہ **حقیقت** ہے کہ فرشتہ نے کوئی ایسی بات نہیں کہی، جس سے لال محل کے بارے میں سرسیّد کے بیان کی تردید ہوتی ہو۔

مرزغن:

اب رہا سوال مرزغن کا ــــ سرسیّد نے اس قلعے کا ذکر آئینِ اکبری اور سجان رائے بھنڈاری کی خلاصۃ التواریخ کے حوالے سے کیا ہے۔ سرسیّد نے قلعۂ مرزغن کی تفصیل اور اس کا محلّ وقوع بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "جب سلطان غیاث الدّین بلبن بادشاہ ہوا تو اُس نے ۶۶۶ ہجری مطابق ۱۲۶۷ء میں اُسی کوشک لال کے پاس ایک قلعہ بنایا اور اُس کا مرزغن نام رکھا کہ اب غیاث پور کرکر مشہور ہے اور سلطان المشائخ نظام الدّین اولیا کا وہیں مزار ہے۔ لکھا ہے کہ سلطان غیاث الدّین بلبن کے عہد میں یہ دستور تھا کہ جو مجرم **اِس قلعے** میں جا چُھپتا تھا، تو وہاں سے نہ **پکڑتے تھے**، لیکن اِس کا سبب معلوم نہ ہوا کہ اس قلعے کا یہ نام کیوں رکھا۔ اس واسطے کہ "مرغزن" اور "مرزغن" کے معنی دوزخ کے ہیں، مگر اس مقام کے مناسب نہیں۔ کچھ عجیب نہیں کہ بادشاہ نے یہ نام نہ رکھا ہو، بلکہ ایک مدت بعد کسی سبب سے لوگوں نے اس نام سے مشہور کر دیا ہو اور اصلی نام اِس کا غیاث پور ہو، جیسے اب مشہور ہے۔"

میں نے آئینِ اکبری شروع سے آخر تک پڑھی لیکن مجھے اُس میں مرزغن کا نام نہیں ملا۔ ہاں خلاصۃ التواریخ مرتّبہ ظفر حسن میں یہ نام "مرزمن" اور پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری کے ایک قلمی نسخے میں "سرزغن" ہے(۶)۔ اس کے بعد سیر المنازل میں اس کا ذکر آتا ہے۔ مرزا سنگین بیگ نے لکھا ہے کہ "غیاث الدّین بلبن نے اپنے عہد میں ایک اور قلعہ ۶۶۴ ہجری میں تعمیر کیا، جو مرزغن کے نام سے مشہور ہوا اور غیاث پور کے نام سے ایک شہر آباد کیا"(۷)۔

سیر المنازل کے مرتّب ڈاکٹر شریف حسین قاسمی نے جب سیر المنازل کا تنقیدی اڈیشن تیار کیا تو اُن کے پیشِ نظر دو مخطوطے تھے۔ ایک مخطوطے میں یہ نام "مراغیبت" اور دوسرے میں "مرزغن" ہے۔ اب گویا تاریخوں میں اِس قلعے کے چار نام ملتے ہیں۔ سرزغن، مرزمن، مراغیبت اور مرزغن۔ ظاہر ہے کہ ان چار ناموں میں سے ایک ہی نام دُرست ہوگا۔ اور قوی امکان یہی ہے کہ مرزغن دُرست ہو۔ مرزغن کے لفظی معنی ہیں قبرستان اور دوزخ۔ صاحبِ ہوش انسان اپنے بنائے ہوئے قلعے کا نام قبرستان یا دوزخ نہیں رکھے گا۔ امکان یہی ہے کہ جب بلبن کا قلعہ کھنڈر ہوگیا تو لوگوں نے وہاں قبریں بنانی شروع کر دیں اور قلعے کا نام مرزغن رکھ دیا۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ سرسیّد پہلے مورّخ ہیں، جنھوں نے مرزغن کا محلِ وقوع بیان کیا ہے، اور اُس کے بارے میں لکھا ہے کہ "اُس (سلطان غیاث الدّین بلبن) نے ایک مکان بنوایا تھا، اِس کا نام دارالامن رکھا تھا...... اس بادشاہ

کی قبر بھی اسی مکان میں بنائی گئی تھی۔"(۸)

دارالامن:

غیاث الدین بلبن کے مزار کے بارے میں فرشتہ نے صرف اتنا لکھا ہے کہ "غیاث الدین بلبن تیسرے دن آخر شہور ۶۸۵ ہجری میں اس جہانِ پرشور و شین سے سفری ہوا اور پیکرِ خاکی اس کا دارالامان میں مدفون ہوا۔"(۹) جملۂ معترضہ کے طور عرض کردوں کہ فیروز شاہ نے لکھا ہے کہ "دارالامان میں مخدوموں کی قبریں ہیں۔ ہم نے ان کے دروازے، چوب صندل کے بنوائے اور اُن خداوند زادوں کی قبروں پر خانہ کعبہ کے پردوں سے سائبان بنایا۔"(۱۰) جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ کار اسٹیفن کا دعوٰی ہے کہ لال محل، رائے پتھورا کے قلعے میں تھا۔ اس دعوے کی بنیاد ضیاء الدین برنی کے اس بیان پر ہے کہ "سلطان بلبن (کی میت) کو رات کے آخری حصے میں کوشک لال سے باہر لائے اور دارالامان (یا دارالامن) میں لے جاکر دفن کردیا۔"(۱۱) یہ درست ہے کہ بلبن کو جہاں دفن کیا گیا تھا، وہ رائے پتھورا کے شہر کا علاقہ ہے۔ ابن بطوطہ (جس کا اقتباس نقل کیا جاچکا ہے) نے بھی یہی کہا ہے کہ بلبن اپنے بنائے ہوئے محل دارالامان (دارالامامن) میں مدفون ہوا۔(۱۲) ابن بطوطہ اور برنی کے بیانات سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بلبن نے صرف دارالامان یا دارالامن نام کا محل بنوایا تھا اور کوئی دوسری عمارت تعمیر نہیں کی تھی۔

تمام مؤرخین کے بیانات کی روشنی میں، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بلبن نے اپنی وزارت کے زمانے میں اصل شہر یعنی رائے پتھورا کے شہر سے دُور غیاث پور نام سے ایک شہر آباد کیا، جسے آج کل بستی حضرت نظام الدین کہا جاتا ہے۔ بلبن نے اس شہر میں ایک قلعہ بھی بنایا تھا جس کا بعد میں مرزغن نام پڑ گیا۔ غالباً بادشاہ بننے کے بعد جب دارالسلطنت پر بلبن کا قبضہ ہوگیا تو اُس نے دارالامن یا دارالامان کے نام سے اس علاقے میں ایک محل بنایا جس میں بعد میں اُسے دفن کیا گیا۔

سرسید نے مرزغن کے بارے میں لکھا ہے کہ اگر اس میں مقروض داخل ہوتا تھا، تو اس کا قرض ادا کردیا جاتا تھا اور اگر قاتل پناہ لیتا تو مقتول کے وارثوں یا مظلوم کو راضی کرکے اُسے معاف کرا دیا جاتا۔ یہی بات ابن بطوطہ نے دارالامن کے بارے میں لکھی ہے۔ کننگھم نے سرسید کے حوالے سے یہی بات دہرائی ہے۔(۱۳) امکان یہی ہے کہ ابن بطوطہ کا بیان درست ہے اور سرسید کو سہو ہوا ہے۔

(باقی آئندہ)

حواشی

سیرالمنازل، ص ۱۴۷۔ غیاث پور کا نام مغل پورہ بھی رہا ہے۔ ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ جب چنگیز خاں ملعون کا نواسہ الغو چند مغل امیروں کے ساتھ سلطان جلال الدین خلجی کا تابع ہوگیا (تاریخِ فیروز شاہی اُردو ترجمہ، ص ص ۲۳۳-۲۳۴) تو جلال الدین خلجی نے الغو کو دامادی میں لے لیا اور غیاث پورے میں ان لوگوں کی بود و باش مقرر کردی۔ اس نسبت سے غیاث پورے کو مغل پورہ اور مغلوں کو نو مسلم کہنے لگے (خلاصۃ التواریخ، اُردو ترجمہ، ص ۲۷۶)۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ "الغو خاں اور تمام امرائے مغل کا کہ ساتھ نو مسلم کے شہرت پائی تھی، حوالی غیاث پور کہ مقبرہ شیخ نظام الدین اولیا قدس سرہ وہاں ہے، مسکن تعین ہوا اور اس گروہ نے وہاں عماراتِ عالی شان اور محل وسیع تعمیر کیے اور اس کا نام مغل پورہ رکھا۔" (فرشتہ، ص ۱۵۲)۔ مرزا سنگین بیگ نے بستی حضرت نظام الدین کو کم سے کم چار دفعہ کوٹلہ حضرت نظام الدین یا صرف کوٹلہ لکھا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ مرزا سنگین بیگ کے زمانے میں اس بستی کا نام "کوٹلہ حضرت نظام الدین" بھی تھا۔ دیکھیے: سیرالمنازل ص ص ۸۳، ۸۴، ۸۷ اور ۹۰ — یہاں یہ اور بتادوں کہ پندرہ بیس سال قبل تک اس بستی کو "سلطان جی" کہا جاتا تھا۔ اب بھی کچھ پرانے لوگ "سلطان جی" ہی کہتے ہیں۔ مرزا سنگین بیگ نے بھی اس بستی کو "سلطان جی" کہا ہے (سیرالمنازل ص ۱۳۳)۔

۲۔ آثار الصنادید، مطبوعہ ۱۸۵۴ء، ص ۲

۳۔ آثارالصنادید، مطبوعہ ۱۸۴۷ء، باب پہلا، ص ۱۰۵۔

۴۔ Monumental Remains of Delhi, Cannstephen, Repnint, Allahabad, 1967, PP. 79-80.

۵۔ تاریخ فرشتہ، "اردو ترجمہ" جلد ۱، لکھنؤ ۱۹۳۳ء، ص ص ۱۴۴-۱۴۵۔

۶۔ خلاصۃ التواریخ، مترجمہ ناظر حسین زیدی، لاہور ۱۹۶۶ء، ص ۵۰۔

۷۔ آثارالصنادید، مطبوعہ ۱۸۵۴ء، ص ۱۴۔

۸۔ سفرنامہ ابن بطوطہ، مترجمہ محمد حسین، دہلی، ص ۶۲۔

۹۔ فرشتہ، ص ص ۱۳۵-۱۳۶۔

۱۰۔ سلطان فیروز شاہ، فتوحاتِ فیروز شاہی، مرتبہ شیخ عبدالرشید، ۱۹۵۴ء، ص ص ۱۴-۱۵۔

۱۱۔ برنی، ص ۲۰۷۔

۱۲۔ ابن بطوطہ، ص ۶۲۔

۱۳۔ Anchaeological Sun-vey of India Repont, vol. I (Repnint) Cunn-ingham, 1972-Vana-nasi, P. 136.

غزلیں

عنبر بہرائچی

تری ہنسی کے اُجالے کھلے ہوئے تھے بہت
سفید پھول فضا میں سجے ہوئے تھے بہت

لہو کا اپنے کرشمہ تھا، اتفاق نہ تھا
ہمارے باغ پھلوں سے لدے ہوئے تھے بہت

وہ بے نیاز خلا در خلا سفر میں رہا
قدم قدم پہ ستارے بچھے ہوئے تھے بہت

مری حیات، بسانے میں اُن کو بیت گئی
سمندروں میں جزیرے پڑے ہوئے تھے بہت

وہی ہوا کہ یہاں بھی دھواں اتر آیا
ہمارے گھر کے دریچے کھلے ہوئے تھے بہت

کسی پہ یوں بھلا کرتا یقین کیوں عنبرؔ
تری گلی میں اُسے تجربے ہوئے تھے بہت

بی ۵ آفیسرز کالونی، اناؤ

منوّر رانا

جھوٹ کیسے حلق سے اُترے نوالے کی طرح
میری غیرت چیختی ہے مُنہ کے چھالے کی طرح

ایسے موسم میں برہنہ پھر رہا ہوں میں کہ جب
اوڑھ لیتا ہے شجر پتّے دوشالے کی طرح

پیاس کی شدّت سے مُنہ کھولے پرندہ گر پڑا
سیڑھیوں پر ہانپتے اخبار والے کی طرح

مجھ کو پڑھنا کیا کہ اب تو دیکھتا کوئی نہیں
در بدر پھرتا ہوں میں اُردو رسالے کی طرح

ایک قیدی کی طرح میری انا بے بس رہی
خواہشیں گھیرے رہیں مکڑی کے جالے کی طرح

اِک سُلگتے شہر میں بچّہ ملا ہنستا ہُوا
سہمے سہمے سے چراغوں کے اُجالے کی طرح

یُوں تو دُنیا میں بہت سے آئے پیغمبر مگر
کون رحمت بن کے آیا کملی والے کی طرح

رانا ٹرانسپورٹ کمپنی، ۲۱- زکریا اسٹریٹ، کلکتہ ۷۳-۷۰۰۰

ساحل سحری

شہر میں سارے اچھے بُروں سے شناسائیاں بھی ہوئیں
اِس قدر شہرتیں پائیں ہم نے کہ رسوائیاں بھی ہوئیں

سیپیاں صاف ہی یوں تو ہم کو نظر آرہی تھیں مگر
پانیوں میں جو اُترے تو محسوس گہرائیاں بھی ہوئیں

چند ہی روز میں سیکڑوں سال کے تجربے بھی ملے
خلوتوں میں بھی گزرے ہیں دن بزم آرائیاں بھی ہوئیں

بارہا نفرتوں کا نشانہ بھی ہم کو بنایا گیا
بارہا محفلوں میں ہماری پذیرائیاں بھی ہوئیں

بھیڑ دیوار کے سائے میں بھی کوئی کم نہیں تھی مگر
دھوپ میں جلنے بیکر رہے اُتنی پرچھائیاں بھی ہوئیں

ڈبلو ۵۷، گریٹر کیلاش ۱، نئی دہلی ۱۱۰۰۴۸

پراِمتھیوس

اُس وسیع، بے آب وگیاہ، سیاہ پہاڑی کی بلند چوٹی پر کھڑے ہو کر پراِمتھیوس نے نشیب میں اُفق تا اُفق پھیلی ہوئی دُنیا پر نگاہ کی۔ اور لمحے بھر کو وہ اپنا شدید اضطراب بھول گیا جو مسلسل اُس کے وجود میں سُلگتا رہتا تھا۔ اُسے لگا اُس کے چاروں طرف پھیلا ہوا فطرت کا یہ لازوال حُسن ایک عظیم جسم ہے جس میں خود اُس کا وجود کسی مضطرب دل کی مانند دھڑک رہا ہے۔ آسمان پر چاروں طرف بھورے رنگ کے گھنے بادل چھائے ہوئے تھے جن میں وقفے وقفے سے کوئی بجلی کوند جاتی۔ اُس نے سوچا وہ کسی بہت بڑے راکشس کے دماغ سے گزر رہا ہے اور جب اُس دماغ میں معاً کوئی انوکھا خیال آتا ہے تو بجلی کوند جاتی ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے خود اُس کے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوا۔ آخر اس ویران پہاڑ پر وہ کیا کر رہا ہے؟ اُس کے دل میں چلچلاتی دھوپ کی مانند یہ بے اطمینانی کیوں پھیلی ہوئی ہے؟ اُس کے سبھی ساتھی کوہ اَلمپس کی خنک، جاں بخش فضا میں زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ خُدائے لایزال کی حمد گا رہے ہیں۔ مگر وہ ——— وہ اس قدر مضطرب کیوں ہے؟ حالانکہ اُسے موت کا بھی کوئی غم نہیں کہ وہ امر ہے۔ عزیز واقارب، دوست احباب سے دُور وہ اس ویران پہاڑ پر کس جُرم کی پاداش میں بھٹک رہا ہے؟ اس خشک پہاڑ سے اُسے کیوں اتنی قربت محسوس ہوتی ہے؟ کسی ازلی ان دیکھی کشش سے بندھا وہ اس وسیع وعریض فلک بوس پہاڑی کی طرف کیوں کھنچا چلا آتا ہے؟ ایسے کتنے ہی سوال یکے بعد دیگرے اُس کے ذہن میں اُبھرتے اور ڈوبتے رہے۔ معاً نیچے ایک ایسے منظر پر اُس کی نگاہ پڑی کہ اُس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ نیچے وادی میں درجنوں مُردار خور گدھوں کا غول غالباً کسی لاش پر ٹوٹا پڑ رہا تھا۔ پراِمتھیوس پہاڑی سے نیچے اُتر آیا۔ اُس نے دیکھا وہ ایک مُردہ جانور کے جسم میں اپنی تیز نکیلی چونچیں گھونپ رہے تھے۔ مگر جلد ہی ایک دوسرے حیرت ناک منظر نے اُس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔

لمبے سیاہ پَروں والے گِدھ اپنے پَر پھڑپھڑاتے، مُردہ ڈھور کے جسم سے بوٹیاں نوچ رہے تھے اور اُن سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک تنہا گِدھ اُن سب سے بے نیاز ایک طرف خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کا جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ لگتا تھا اُس نے ایک طویل عرصے سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ آنکھوں کے سوا اُس کا پورا جسم بے جان تھا۔ گویا اُس کی جان سمٹ کر اُس کی آنکھوں میں دو نقطوں کی شکل میں متحرک ہو گئی تھی۔ پراِمتھیوس نے اپنے دل میں اُس تنہا گِدھ کے لیے ایک عجیب وغریب کشش محسوس کی۔ اُس نے سوچا یہ گِدھ بھی اُسی کی طرح اپنے جھُنڈ سے کس قدر الگ اور تنہا ہے۔ وہ اُس کے قریب آیا اور بولا۔

”سُن! یہ دوسرے گِدھ اس طرح چونچیں بھر بھر کر اپنی بھوک مٹا رہے ہیں مگر تو ان سب سے الگ تھلگ بھوکا پیاسا بیٹھا ہے۔ مُسلسل فاقوں نے تیرے جسم کو کس قدر لاغر کر دیا ہے۔ اس کے باوجود تو اُس طرف غلطی سے بھی نگاہ نہیں کرتا آخر کیوں؟“ اُس تنہا گِدھ نے گردن گھما کر پراِمتھیوس کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ قدرے توقف کے بعد وہ بولا۔

۱/۱۱، ایل۔ آئی۔ جی۔ وی بھاؤ نگر، کرلا (ویسٹ)، بمبئی ۴۰۰۰۷۰

"کیوں کہ میں مجذوب ہوں اور اپنی مجذوبیت پر زندہ ہوں۔ میری بھوک اِن مُردار خوروں سے مختلف ہے۔ میری اشتہا مُردہ گوشت کے ٹکڑوں سے نہیں مٹ سکتی۔"

"اس کا مطلب ہے تجھے اس وادی میں بسنے والے زندہ انسانوں کا گوشت درکار ہے۔" پرامتھیوس نے کانپ کر کہا۔

"وحشت ـــــ" گدھ نے حقارت سے کہا۔ "اُن غریب لاچار انسانوں کا جسم تو اور بھی بے وقعت ہے۔ اگر ہم چار گدھ مل کر کسی آدمی پر ٹوٹ پڑیں تو اُس بے چارے کو جان کے لالے پڑ جائیں۔ وہ تو آگ تک پیدا نہیں کر سکتا۔ اس لیے اندھیرا ہوتے ہی خوف و دہشت سے کانپنے لگتا ہے۔ دہکتی آنکھوں والے وحشی جانور اُس کی نظروں کے سامنے اس کے بچوں کو گردنوں اور ٹانگوں سے پکڑ کر لے جاتے ہیں اور وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ ایسے بے بس اور لاچار انسان کے گوشت سے مجھے کوئی رغبت نہیں۔ میری طلب اِن سب سے جدا ہے۔ میں کسی ایسے شخص کے گوشت سے اپنی بھوک مٹانا چاہتا ہوں جو امر ہے۔ بالخصوص میں اس کے دھڑکتے دِل کا طلب گار ہوں۔ جب میں اپنی منقار اُس مرد جری کے گرم دھڑکتے دل میں پیوست کر دوں تو اُس کے بدن کی تھرتھراہٹ کو محسوس کر سکوں۔ اُس وقت اُس شخص کے چہرے پر پیدا ہونے والا موت کا کرب میں اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا متمنی ہوں۔"

پرامتھیوس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ایسا لگا جیسے کوئی زبردست موج کسی چٹان سے ٹکرائی ہو۔ پوری وادی اُس کی ہنسی کی گونج سے بھر گئی۔

"تو دیوانہ ہے۔" وہ بولا۔ "بھلا کون امر پُرش ہوگا جو تیرے سامنے سینہ تان کر کہے گا لے میرے دل میں اپنی منقار گاڑ دے۔ یہ تیرا ایک خواب ہے جو کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ اور تو یہ خواب دیکھتے دیکھتے ایک دن فاقوں سے گھُل گھُل کر مر جائے گا۔"

"شاید ایسا ہو ـــــ شاید ایسا نہ بھی ہو۔" گدھ نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "مستقبل کے بارے میں کون یقین سے کچھ کہہ سکتا ہے۔ لیکن اگر میرا خواب پورا ہو گیا تو اس سرزمین پر اُس انوکھے تجربے سے آشنا ہونے والا میں واحد پرندہ ہوں گا۔ بالفرض ایسا نہیں ہوا تو کم از کم مجھے اپنی اِس دیوانگی کے لیے یاد تو رکھو گے۔"

پرامتھیوس وہاں سے ہنستا ہوا رخصت ہو گیا۔ مگر اُس تنہا گدھ کی ایک بات نے اسے افسردہ کر دیا تھا۔ آہ بے چارہ انسان اس ظلمت کدے میں آج بھی آگ ـــــ کی دولت سے محروم ہے۔ روشنی کے بغیر اُس کی زندگی کس قدر اجیرن ہے۔ اچانک اُسے بھی اپنا ایک پُرانا خواب یاد آ گیا۔ جیسے سیاہ گھنے بادلوں میں بجلی سی کوندگئی ہو۔ اُس کا جنون ایک بار پھر بیدار ہو گیا۔ اُس نے سوچا۔ گدھ جیسا بے بضاعت پرندہ اپنے جنون کی سلامتی کی خاطر زندہ ہے جبکہ میرے بازوؤں میں دیوتاؤں جیسی قوت موجود ہے اور میں موت پر بھی فتح پا چکا ہوں۔ میں چاہوں تو اس کُرۂ ارض کو ایک گیند کی مانند ستاروں کی جانب اُچھال سکتا ہوں۔" تبھی اُس کا یقین پختہ ہو گیا اور وہ تیزی سے آلمپس پہاڑ کی طرف روانہ ہو گیا۔ سامنے دیوتاؤں کے مقدس آتش کدے میں آگ دہک رہی تھی۔ اُس نے آتش کدے میں ہاتھ ڈال دیا اور تھوڑی سی آگ ـــــ لے کر انسانوں کی بستی کی طرف لوٹ گیا۔ پرامتھیوس آگ لیے ہوئے زمین پر ایک سورج کی مانند طلوع ہوا جس نے مجبور اور بے بس انسانوں کی راتیں بھی روشن کر دیں۔ وہ جوں ہی آگ لیے ہوئے زمین پر اُترا تاریکی سے بے شمار احسان مند بے بس اور لاچار ہاتھ آگے بڑھے۔ اندھیرے میں شکرگزاری کے کلمات گونجے اور اُن الفاظ کی لرزش سے رات کا مخملی پردہ تھرتھرانے لگا۔

پرامتھیوس کا دل جوشِ مسرت سے بھر گیا۔ لیکن اُس مسرت کے لمحے میں بھی اُسے وہ فاقہ زدہ گدھ اچھی طرح یاد تھا جو اُس ویران بلند پہاڑی کی وادی میں دوسرے مُردار خور گدھوں سے الگ تنہا بیٹھا تھا۔

(جی۔ اے۔ کلکرنی کا مراٹھی افسانہ)

فراخ دل دِلّی

دہلی میں جو بھی آیا دہلی والا ہو گیا۔ صدیوں سے دہلی باہر والوں کو اپناتی رہی۔ بڑا دل ہے اس کا، یہی اس کی عظمت و تہذیب کا راز ہے۔ یہ گنگا جمنی تہذیب کا سنگم ہے۔ یہاں کے رہنے والوں کا اس شہر سے محبت اور عقیدت کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے مذہبی اور ذات پات کے رشتوں سے بالاتر ہو کر اپنے آپ کو صرف دہلی والا کہلانے پر فخر کیا ہے۔

ـــــ پرشوتم گوئل (دلّی کی تہذیب)

ہمارے خاں صاحب

معصومیت برساتا ہوا چہرہ۔ دھندلی دھندلی آنکھیں جن پر ہر وقت موٹے کانچ کی عینک چڑھائے رہتے ہیں۔ (سُنا ہے، سوتے وقت بھی عینک نہیں اتارتے کہ خواب دھندلے نظر آئیں گے)۔ قد اتنا کہ نہ فخر کا مقام، نہ شرمندگی کی نوبت۔ جسم فربہ اُوپر سے ڈھیلا ڈھالا کُرتا پائجامہ۔ راستہ چلتے وقت رکشے والوں کے ذریعے پہلوان کہے جانے کا دُکھ اُٹھاتے ہیں۔ چال غیر متوازن۔ دائیں طرف جھکاؤ زیادہ، اس پتنگ کی طرح جو اڑتے وقت ایک خاص سمت میں جھکی جاتی ہے۔ ایک آستین چڑھی ہوئی، ایک ڈھلکی ہوئی، جیسے ایک شعر کے دو بے وزن مصرعے۔

عموماً دو دوست اپنی دوستی کو پُرانی ثابت کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ وہ لنگوٹی یار ہیں، میری اور ضیا احمد خاں صاحب کی دوستی اس سے بھی آگے کی ہے یعنی جب ہمارے لنگوٹ نہیں ہوا کرتے تھے۔

چنگیز خاں جلالی خان تھے۔ کرنل محمد خاں کمالی ہیں اور ضیا احمد خاں ہلالی۔ بہت جلد دوسروں سے ہل جاتے ہیں۔ ہِل جانا گویا ان کی ہابی ہے۔ اس ہابی کے بطن سے ایک دوسری ہابی نے جنم لیا اور یہ قدیم سِکّے اور ڈاک ٹکٹ جمع کرنے لگے کہ جان پہچان بڑھے۔ یہ شوق ہنوز جاری ہے اور جنون کی حدوں کو چھُو رہا ہے ممکن ہے آگے چل کر اس سلسلے میں انھیں مجنون قرار دے دیا جائے۔ بہت دنوں تک کوئی پُرانا سکّہ ہاتھ نہ لگے تو نئے سکّے کو زمین میں دفنا کر پُرانا کر لیتے ہیں اور اپنے ذخیرے میں شامل کر لیتے ہیں۔ ایک دن ہم نے انھیں ایک تازہ ترین ڈاک ٹکٹ بڑے چاؤ سے خریدتے دیکھا تو تشویش ہوئی۔ ہم نے کہا "آپ کیا کر رہے ہیں؟ آپ کی طبیعت تو خراب نہیں؟ آپ تو اپنے ذخیرے کے لیے ہمیشہ پُرانے ٹکٹ خریدتے ہیں؟" اطمینان سے جواب دیا "نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ ایک دن یہ ٹکٹ بھی تو پُرانا ہو جائے گا نا؟" اور ہم ہونّق بنے انھیں دیکھتے رہے۔

پیشے کے لحاظ سے ٹیچر ہیں اور واقعی ٹیچر ہیں (واقعی کا لفظ ہم نے دانستہ استعمال کیا ہے کہ ویسے تو ٹیچر ہم بھی ہیں) جو بات ایک بار بچّوں کو سمجھاتے ہیں ان کی سمجھ میں فوراً آجاتی ہے۔ ایک بار ہماری بچّی نے ہم سے کہا "پاپا ماضی، حال، مستقبل سمجھائیے اور مثالیں دیجیے"۔ ہم نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "بیٹے ببّو ماضی پالنے میں دُودھ پی رہا ہے"۔ ہم نے دوسری بچّی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو پالنے میں لیٹی بوتل سے دُودھ پی رہی تھی۔ پھر بیگم کی طرف دیکھ کر، جو اس وقت آٹا گوندھ رہی تھیں کہا "یہ تمھارا حال ہوگا چند برسوں بعد اور مستقبل تمھارے سامنے ہے" اب ہمارا اِشارہ خود اپنی طرف تھا، بیمار، لاغر، کمزور، چھاچھ پیتا ہوا۔ بچّی بولی "ماضی پالنے میں دُودھ پی رہا ہے۔ حال چند برسوں بعد آٹا گوندھے گا۔ مستقبل چھاچھ پی رہا ہے۔ پاپا مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکی"۔ آخرکار ہم نے اپنی بچّی کو سیانے نمبر ۲ یعنی ضیا احمد خاں صاحب کے ہاں بھیج دیا کہ صاحب اسے ماضی، حال، مستقبل سمجھائیے۔ اور مثالیں بھی دیجیے۔

تھوڑی دیر بعد ٹُمن لوٹ آئی تو ہم نے کہا "ماضی، حال، مستقبل سمجھائیے اور مثالیں دیجیے" وہ بولی "منی لال کرانہ مرچنٹ نے ہمیں ادھار دینا بند کر دیا کہ ہم نے پچھلا بِل ادا نہیں کیا، یہ تھا ماضی۔ ببّن

دیپک چوک، نزد ہارون چال، اکولا ۴۴۴۰۰۱۔

بھیا اُدھار دیے جا رہے ہیں، ان کا بل ادا کرنا ہے جو اس ماہ کسی طرح ممکن نہیں، یہ ہے حال۔ بہن بھیا سے لین دین بند ہونے پر جبّار بھائی کے یہاں کھاتہ کھولنا پڑے گا یہ ہوگا مستقبل۔"
(بچی کی باتیں سُن کر ہم نے جھٹ سے چادر اوڑھ لی اور لیٹ گئے۔ ہمارے پاؤں چادر سے باہر نکل آئے تھے)۔

ایک دن دوستوں کی محفل میں کسی نے کہہ دیا کہ آج کل ریڈیو سے بڑے اچھے اچھے گیت نشر ہو رہے ہیں۔ خاں صاحب دوسرے ہی دن ایک قیمتی ریڈیو خرید لائے۔ چار پانچ دن بعد ملے تو ریڈیو بیچنے کے لیے گاہک کی تلاش میں تھے۔ وجہ پوچھی تو بولے "یہ ریڈیو ٹھیک نہیں ہے۔ چار پانچ دن سے ایک گیت اچھا نہیں سُنایا۔ کسی دوسری کمپنی کا خرید دوں گا۔" بعد میں معلوم ہوا کہ کسی کے مشورے سے ریڈیو واپس کر کے ٹیپ ریکارڈر لے لیا ہے۔ اور من پسند فلمی گیت سُن سُن کر محظوظ ہو رہے ہیں۔ فلمی گیتوں سے اوب گئے تو غزلیں سُننے لگے۔ پھر غزلیں سُننا چھوڑ دیں کہ اُونگھنے کی عادت سی ہو چلی تھی۔ کرکٹ کامنٹری سُننے لگے۔ کچھ دن بعد یہ بھی بند کر دیا کہ اس میں گول اور پنلٹی کارنر وغیرہ نہیں ہوتے تھے۔ پڑوسی نے احساس دلایا کہ صاحب ملک و قوم کی بھی خبر لیجیے۔ لہٰذا پھر ریڈیو خرید کر خبریں سُننے لگے۔ ایک دن پڑوسی کو خبروں کے وقت گہری نیند میں سوتا دیکھ لیا، جگا کر بُری طرح خبر لی کہ ہم کو قوم کا واسطہ دے کر باخبر رہنے کی تلقین کرتے ہو اور خود بے خبر سوتے ہو۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ہم نے تمھاری طرح قوم سے بے خبری نہیں برتی، ورنہ پتا نہیں کیا ہو جاتا۔

ان کی حُبّ الوطنی میں مزید شدّت آگئی ہے اب خبریں سُننے کے ساتھ دیکھنے بھی لگے ہیں۔ ٹی۔ وی گھر لے آئے ہیں۔ یہ کب کیا کر بیٹھیں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

نئے نئے کپڑے پہننے کا شوق ہے۔ ایک مرتبہ پینٹ سلوائی۔ ٹیلر نے کمر میں بہت زیادہ ڈھیلی کر دی (ہمارا خیال ہے کہ اس نے غلطی سے کسی دوسرے ناپ کی سی کر ان کے متھے مار دی تھی) پہن کر پریشان ہوتے رہتے کہ اسے نیچے سے اُوپر کھینچتے رہنا پڑتا۔ ہم نے کہا۔

"اسے دوبارہ ٹیلر کو دے کر ٹھیک کیوں نہیں کرا لیتے آپ!"

"وہ کیا ٹھیک کرے گا کم بخت۔ ناپ لے کر بھی تو گڑبڑ کر دی۔"

"لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ آپ کا ٹیلر ہے کمال کا۔" ہم نے انھیں چھیڑا۔

"وہ کیسے؟"

"ایسے کہ ناپ لے کر غلط سینا کمال ہی تو ہے۔"

"ہماری پینٹ پر بن آئی ہے اور آپ کو مذاق سُوجھ رہا ہے۔"

"تو کسی دوسرے ٹیلر سے ٹھیک کرا لیجیے۔"

"کسی دوسرے ٹیلر کے پاس جاؤں گا تو وہ میرے بارے میں کیا سوچے گا؟ وہ سوچے گا کہ میں نہایت کنجوس آدمی ہوں۔ کم داموں، کسی چمار سے بھی کپڑے سلوا لیتا ہوں۔ ویسے میں جلد ہی اس کا کوئی حل نکال لوں گا۔" یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے یہ جا وہ جا ہو گئے۔ ہم نے بھی اپنی راہ لی۔

کچھ دنوں بعد ملے تو خوشی خوشی کہنے لگے "میں نے اس پینٹ کا مسئلہ صرف اپنی ذہانت کے بَل پر حل کر لیا ہے۔ اب اسے پہنتا ہوں تو اُوپر کھینچنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

"وہ کیسے؟"

"اسے اب میں صرف سوتے وقت پہنتا ہوں۔"

فرصت میں انھیں اکثر مذاق سوجھتا ہے اور اس کے لیے کہیں نہ کہیں سے کسی نہ کسی طرح گنجائش نکال لیتے ہیں۔ ایک مرتبہ ان کی بھانجی ترنّم بلا وجہ اسکول نہیں گئی۔ دوسرے دن اسکول جاتے وقت کہنے لگی "ٹیچر کے نام پُرزہ لکھ دیجیے کہ گھر میں ضروری کام نکل آیا تھا، اس لیے اسکول نہ آسکی۔" انھوں نے بڑے پیار سے پُرزہ لکھ کر دے دیا۔ مضمون تھا "محترمہ ٹیچر صاحبہ، بعد سلام کے عرض ہے کہ کل ترنّم بلا وجہ اسکول سے غیر حاضر رہی۔ سارا گھر اس سے ناراض ہے اسے سخت سزا دے کر ہمیں ممنون فرمائیے۔"

نہ صرف انسان بلکہ فرشتے بھی ان کے مذاق کی زد میں آتے رہتے ہیں کسی سے مذاقاً جھوٹ بات کہہ دیں گے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اصلیت ظاہر کر دیں گے۔ جھوٹ کا حساب لکھنے والا فرشتہ ان کے اعمال نامے میں جھوٹ لکھ کر کاٹتے کاٹتے پریشان ہو[تا] رہتا ہے۔

کچھ عادتیں انھیں دوسروں سے منفرد رکھتی ہیں۔ ٹھنڈے مشروب (COLD DRINKS) انھیں بہت مرغوب ہیں اس لیے ہر موسم میں پیتے ہیں۔ دوست احباب انھیں ٹوکتے رہتے ہیں کہ سردی اور برسات میں ٹھنڈے مشروب پینے کا کیا تُک ہے؟ لیکن اثر اُن

ذرا نہیں ہوتا۔ اس معاملے میں اُس مثل پر اڑے ہوئے ہیں کہ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔

ان کے ہاتھ ہمیشہ بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔ دوستوں میں بیٹھے ہیں ہاتھ بندھے ہوتے ہیں۔ باتیں ہو رہی ہیں، راستہ چل رہے ہیں، پیچھے ہاتھ بندھے ہیں۔ ادب کا مطالعہ بھی ادب کے ساتھ کرتے ہیں، کتاب میز پر کھلی رکھی ہے کرسی پر دونوں ہاتھ باندھے بیٹھے پڑھ رہے ہیں۔ ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ سوتے وقت بھی ان کے ہاتھ بندھے ہوتے ہیں۔ اتنا با ادب آدمی کوئی دوسرا ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔

پڑھتے وقت چشمے کو پیشانی پر چڑھا لیتے ہیں۔ کوئی پوچھے کہ ایسا کیوں کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ میری دُور کی نظر کمزور ہے۔ بات میں بات یہ پوچھ لیا جائے کہ کتنے فاصلے کی چیز آپ کو صاف نظر نہیں آتی تو کہتے ہیں "بس یہی ایک میل دُور کی"۔ پھر زوردار قہقہہ لگاتے ہیں کہ مقابل کا اچھا مذاق بنایا۔

موڈ خوشگوار ہو تو گلابی انگریزی بولتے ہیں۔ مثلاً انھیں یہ کہنا ہو کہ میں تیار نہیں ہوں تو کہیں گے۔ I AM NOT NOT READY
ان کا دعویٰ ہے کہ NOT لفظ کی گردان سے جملے میں جو فورس، جو شدتِ بیان پیدا ہوتی ہے وہ کسی اور طریقے سے ممکن نہیں۔ اور اگر کوئی ایسا کر دکھائے تو وہ اسے مرید ہونے کا شرف بخشیں گے۔ ہم نے انھیں گلابی انگریزی سے باز رکھنے کے لیے کہا کہ یہ انگریزی زبان کے ساتھ زنا بالجبر ہے تو بُری طرح بگڑ گئے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ ہمیں GET OUT OUT کر دیتے ہم خود ہی وہاں سے نو دو گیارہ ہو گئے۔ البتہ تیز چلنا انھوں نے چھوڑ دیا ہے۔ ایک مرتبہ مومن پورہ سے بہت تیزی سے گذر رہے۔ ہم نے آواز دی، ایک مرتبہ، دو مرتبہ لیکن وہ گذرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ہمیں تشویش ہوئی ان کے گھر گئے کہ دیکھیں سب خیریت ہے نا۔ گھر میں حالات نارمل تھے۔ ان کی تلاش میں نکلے کہ خدانخواستہ وہ خود تو کسی پریشانی میں مبتلا نہیں۔ اِدھر اُدھر تلاش کیا وہ تو نہ ملے۔ ان کے دوست شیخ رزّاق صاحب مل گئے۔ ان سے سارا ماجرا کہہ سُنایا تو وہ بولے، "آدھ گھنٹے پہلے وہ میرے ساتھ ہوٹل میں بیٹھے چائے پی رہے تھے اور چائے کی چُسکیوں کے دوران اخبار میں شائع شدہ "زیادہ دِنوں تک جوان رہنے اور بڑھاپے کو دُور رکھنے کا نسخہ" پڑھ رہے تھے کہ تیز چلنے سے آدمی زیادہ دن جوان رہتا ہے۔ اس کے بعد وہ یک لخت اٹھے اور بغیر کچھ کہے سُنے تیزی سے چل پڑے۔ میں سمجھا شاید انھیں کوئی بہت ضروری کام یاد آ گیا ہوگا۔ اس لیے میں نے ان کے اس طرح چلے جانے کا کوئی نوٹس نہیں لیا"۔

رزّاق صاحب کی بات سُن کر سارا معاملہ ہماری سمجھ میں آ گیا۔ انھوں نے اخبار میں ایک نسخہ پڑھا اور دوسرے ہی لمحے اس پر عمل شروع کر دیا۔ اس کے بعد اِدھر میں کچھ ایسا مصروف رہا کہ کئی دن تک ـــــ خاں صاحب کی کوئی خبر نہ لی۔ اُدھر تیز چلنے کی وجہ سے ایک دن ان کا دایاں پیر بُری طرح موچ کھا گیا۔ دس دن BED REST لینے، پندرہ دن لنگڑا کر چلنے اور چار سو روپے خرچ کرنے کے بعد وہ شفایاب ہوئے اور انھوں نے زیادہ دِنوں تک جوان رہنے کا خیال ترک کر دیا۔

گھر میں سب سے چھوٹے ہیں۔ اس لیے بے جا لاڈ پیار کے شکار ہیں۔ اس لاڈ پیار نے انھیں عملی زندگی میں ضرورت سے بہت زیادہ محتاط بنا دیا۔ نوجوانی میں جو مشغلے من بھاتے ہوتے ہیں ان سے وہ ہمیشہ دُور رہے۔ مثلاً تیرنا اس لیے نہیں سیکھا کہ ڈوب جائیں گے۔ شروع شروع میں تو سمندروں اور آبشاروں کی تصویریں دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتے تھے۔ دوستوں نے ہمّت بندھائی تو اس خوف کی شدّت میں کمی آئی۔ اب ذرا فاصلے سے یہ تصویریں برداشت کر لیتے ہیں۔

گھر کے لوگ انھیں پیار سے شبّو میاں، شبّو میاں کہتے رہے اور یہ شبّو میاں بنے رہے۔ یہاں تک کہ ۳۵ برس کے ہو گئے لیکن نہ خود انھیں اپنی شادی کا خیال آیا نہ ان کے گھر والوں کا دھیان اس طرف گیا۔ جب اُن کے کئی دوست اُن سے چھوٹے ہونے کے باوجود دو دو بچّوں کے باپ ہو کر بزرگی حاصل کر چکے تو ان کے گھر والے چونکے اور لڑکی کی تلاش شروع کر دی۔ اس قدر تیزی سے کہ ایک ہفتے کے اندر کئی لڑکیوں نے ان کو اور کئی لڑکیوں کو انھوں نے رد کر دیا۔ نتیجتاً معاملہ ٹھپ ہو گیا۔ ایک دن آبدیدہ ہو کر بولے "رحمٰن میرے کنوارپن پر ترس کھاؤ اور کچھ کرو یار۔ لوگ شادی کے نام پر میرا مذاق اڑانے لگے ہیں۔ کہتے ہیں۔ لڑکیوں کی کیا کمی ہے لڑکے ہی میں عیب ہوگا۔ ورنہ آج کل تو ایک لڑکی دیکھنے جاؤ تو چار لڑکیاں خود سامنے آجاتی ہیں کہ صاحب ایک نظر اِدھر بھی"۔ ہم نے انھیں تسلّی دی اور لڑکی کی تلاش شروع کر دی۔ بات بنتی نظر نہ

آتی تھی۔ ہم جہاں کہیں انھیں بر دکھاوے کے لیے لے جاتے لڑکی والے ان سے پوچھتے۔ "آپ کے صاحبزادے اب تک کیوں نہیں پہنچے ہیں" اور ان بیچاروں کا بُرا حال ہوجاتا۔ لڑکی والوں سے کہا جاتا کہ صاحبزادہ یہ خود ہیں تو کہتے کہ ہر آدمی کسی نہ کسی کا صاحبزادہ ہوتا ہے۔ جب سمجھایا جاتا کہ یہ خود بَر ہیں تو وہ یقین نہ کرتے اور بات آئی گئی ہوجاتی۔ پہلوان جیسا ڈیل ڈول۔ اس پر موٹی کانچ کی عینک اور ڈھیلا ڈھالا کرتا پاجامہ، لڑکی والے انھیں بَر ماننے کے لیے تیار ہی نہ ہوتے۔ آخرکار اللہ کا کرم ہوا اور ہم ایک جگہ انھیں بَر ثابت کرنے میں کامیاب ہوگئے اور ان کا رشتہ طے ہوگیا۔

اسے حُسنِ اتفاق کہیے کہ عشقِ اتفاق کہ اپنی زندگی میں ہم نے کئی عدد خاں صاحبوں کو بہت قریب سے دیکھا اور برتا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ضیا احمد خاں صاحب ہی اصل خان ہیں باقی سب ایسے ویسے خان ہیں اور ان کی چھاتی اور پشت پر یہ پوسٹر چسپاں کردینے کو جی چاہتا ہے کہ "نقلی مال سے ہوشیار" منقوطہ نون اور نون غنہ میں جو فرق ہے وہی ہمارے خان صاحب اور دوسرے خانوں میں ہے۔ یعنی یہ ٹھوس اور وہ بالکل کھوکھلے۔ ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ معاملہ چاہے کسی کا ہو یہ غیر جانبداری سے اس کا تجزیہ کرتے ہیں اور سچائی کو نہ صرف محسوس کرتے ہیں بلکہ ضرورت پڑنے پر اس کا عملی اظہار بھی کرتے ہیں نیشنل گروپ آکولہ کا وجود اس کا تازہ ترین ثبوت ہے۔ ان کی یہی ادا ہم کو بھاتی ہے جب کہ فی زمانہ ہر معاملے کو ذاتی مصلحت کے چشمے سے دیکھنے کا چلن عام ہے

ظہیر رحمتی

عظیم حوصلے بوسیدہ سائباں کے ہیں
کہ سائے ننگے سروں کے لیے مکاں کے ہیں

یتیم چاند کی محفوظ ہے ردا اب تک
ابھی زمیں پہ فرشتے کچھ آسماں کے ہیں

اُٹھا کے پھینک دیے ٹکڑے سوکھی روٹی کے
یہ بھوکے بچے کسی اُونچے خاندان کے ہیں

بچائی گاؤں کے لوگوں کی جس نے کل عزت
یہ کھیت جلتے ہوئے آج اُسی کسان کے ہیں

جو سوکھ کر بھی مہکتے ہیں میرے ہاتھوں میں
یہ پھول توڑے ہوئے شاید اس کے لان کے ہیں

جھلس گئے ہیں سبھی بال و پر ظہیر مگر
کبوتروں میں ابھی حوصلے اُڑان کے ہیں
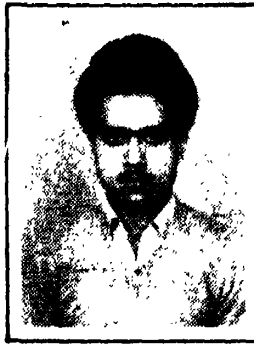
سیّد شاہد حسن کمال

بسترکے نجھ سے مجھے ہجر کا ملال رہا
اس کے بعد یہ موسم ہی لازوال رہا

کوئی اور نہیں تھا تمھی تو تھے صاحب
جس سے مل کے بہت دیر تک نہال رہا

اکے لے گیا طوفان سب خس و خاشاک
نظر میں فقط عالمِ وصال رہا

ئی سمجھ نہ سکا اُس کی نامرادی کو
ام عمر جو مشتاقِ عرضِ حال رہا

ا رہی ہے یہ دیوار و در کی ویرانی
اِس مکاں میں رہا بے نیازِ حال رہا

فردوس گیاوی

جو کھنچ رہا ہے ذہن میں خاکہ عجیب ہے
دُنیائے بے ثبات کا نقشہ عجیب ہے

تعبیر اس کی کیا ہے ذرا آپ ہی بتائیں
کل رات میں نے خواب جو دیکھا عجیب ہے

دیکھا ہے جس کو سب نے تبسّم بہ لب سدا
کہتے ہیں لوگ اُس کا بھی قصّہ عجیب ہے

ہم اہلِ دل تھے تیر کر اُس پار تک گئے
سب کہہ رہے تھے آگ کا دریا عجیب ہے

فردوس آؤ چل کے ذرا ہم بھی دیکھ لیں
سب لوگ کہہ رہے ہیں تماشا عجیب ہے

۵/۸۳ - اے - ۴ لانڈھی نمبر ۵، کراچی
مدرسہ ٹھوٹھر، نائیوں والی گلی، جیل روڈ، رام پور ۲۴۴۹۰۱
نھے خاں کی گلی، پنچایتی اکھاڑا، گیا ۸۲۳۰۰۱

۱۹۸۶ء: اُردو ادب ـ مختصر جائزہ

اُردو ادب کا یہ جائزہ جو گذشتہ سال مطبوعہ تخلیقات پر پھیلا ہوا ہے ہرگز مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ یہ صرف ان کتابوں یا مطبوعہ چیزوں تک محدود ہے جن کے بارے میں میں نے پڑھا یا جن تک میری رسائی ہوسکی۔ اس جائزے میں بلاشبہ بہت سے ادیب و شاعر چھوٹ گئے ہوں گے جن کی تخلیقات ۱۹۸۶ء میں منظرِ عام پر آئیں اور جن پر میری نظر نہیں پڑسکی بہت سی کتابوں کے محض نام لکھنے پر اکتفا کرنا پڑا اس لیے کہ نام ہی میرے سامنے تھے اصل کتابیں نہیں۔

اُردو میں ایک اندازے کے مطابق ۷۰۰ سے ۱۰۰۰ تک ادبی کتابیں ہر سال شائع ہوتی ہیں۔ یہ اندازہ زیرِ تبصرہ سال کے لیے بھی درست ہے۔ جہاں تک کتابوں کی معیار بندی کا سوال ہے تازہ ہواؤں کی کمی کی شکایت ہمیشہ رہی ہے۔ اُردو میں اوریجنل فکر کا فقدان ہے تازہ کاری کی مثالیں بھی ہیں مگر خال خال۔ ہندوستان میں اُردو ادب بے جہتی کا شکار ہے۔ ہمارے قلم کاروں کے سامنے کوئی مقصد نہیں، کوئی چیلنج بھی نہیں ہے کہ جس کے لیے سردھڑ کی بازی لگائی جا سکے۔ اُردو میں لکھنے والے بیشتر اقلیتی طبقے سے تعلّق رکھتے ہیں جو اپنے کو سیاسی، سماجی اور اقتصادی سطحوں پر بہت سی محرومیوں کا شکار پاتے ہیں۔ اس کا رونا بھی روتے ہیں، اپنے حقوق پانے کے لیے ہنگامے بھی کرتے ہیں لیکن اس طرح کی کوئی بے چینی اور ہیجان اور غیر محفوظ ہونے کا کوئی اجتماعی شعور ہمارے ادب پاروں میں نظر نہیں آتا۔ کیا یہ محض بے حسی کا نتیجہ ہے یا جن مسائل کو ہم نے سیاسی، سماجی اور اقتصادی سطحوں پر اُٹھایا ہے وہ فرضی ہیں ورنہ ان کی دھمک ادب میں بھی ضرور سنائی دیتی۔ محمد حسن کا کہنا ہے:

"کتابوں کے جگمگاتے سرورق کے پیچھے ویرانیاں دکھائی دیتی ہیں۔ کہیں یہ ویرانیاں بے حسی کے راستے تو در نہیں آئیں۔ ادب، دانش وفکر ہی نہیں احساس سے بھی محروم ہو رہا ہے۔"

شمس الرحمٰن فاروقی کو تیسرے مسیحا کا انتظار ہے۔ ان کے مطابق ترقی پسند بہت پہلے اپنا بستر بوریا سمیٹ چکے۔ جدیدیوں نے بھی اپنا راگ الاپ لیا ہے۔ اب کوئی نئی بات کہنے والا پیدا ہو۔ میری رائے میں یہ آواز تو تاریخ کے بطن سے خود بخود ہی پیدا ہوگی۔ وقت نے جدیدیت کے بھی بہت سے فارمولوں کو رد کر دیا ہے۔ کلاسیکیت ترقی پسندی اور جدیدیت کی راگنیوں کے امتزاج سے ایک نئی لے پیدا ہونے والی ہے۔ ادب میں اس نئی صبح کے آثار دکھائی بھی دے رہے ہیں۔ ردّ و انکار کی شروعات ہوچکی ہے۔ آٹھویں اور نویں دہائی کا ادب چھٹی اور ساتویں دہائی کے ادب سے بلاشبہ مختلف ہے گو ابھی اس کے کنٹورس واضح نہیں ہیں۔

مغرب سے تازہ ہوا کا جھونکا

پاکستان کو میں نے اس جائزے میں شامل نہیں کیا ہے کیوں کہ ان کے ادب تک رسائی کے وسائل محدود ہیں۔ البتہ مغرب جانب سے نیا سورج طلوع ہو رہا ہے مغربی ممالک کینیڈا، امریکہ، انگلینڈ، ڈنمارک، فرانس، جر سوئیڈن اور خلیجی عرب ملکوں سے نئی خوشبو آ رہی ہیں وہاں بسنے والے تارکین وطن نئی تو سے سامنے آئے ہیں۔ ان میں فکر و فن کی رعن ہے۔ ہجرت نے انھیں نئے نئے مسائل —

۱۵۰۔ بستی حضرت نظام الدین۔ نئی دہلی

دو چار کیا ہے۔ سماجی و معاشی زندگی میں انھیں بنیادی تبدیلیوں کا سامنا ہے۔ ان دیکھی اور نامانوس تہذیبوں سے واسطہ ہے۔ اس لیے ان کے یہاں نئے تجربات اور خیالات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ یہ ان لوگوں کی آواز ہے جو پندرہ بیس سال پیشتر بھوک اور افلاس کے عفریت سے ڈر کر ان ملکوں میں جا بسے تھے۔ اب معاشی استحکام حاصل ہوا ہے خوشحالی و فراغت نصیب ہوئی ہے تو شعر و ادب کی طرف رجوع ہوئے ہیں۔ وہاں سے اُردو اخبارات اور رسائل شائع ہونے لگے ہیں۔ کنیڈا سے "اُردو انٹرنیشنل" نکلتا ہے اشفاق حسین جس کے ایڈیٹر ہیں۔ انگلینڈ سے دو روز نامے "جنگ" اور "وطن" شائع ہوتے ہیں۔ شکاگو سے "اُردو اسٹڈیز" نام کا سہ ماہی رسالہ نکلتا ہے۔ کنیڈا سے شاہین نے "اُردو کنیڈا" نام سے سہ ماہی جریدہ نکالا جو انگریزی زبان میں اُردو ادب کا واحد ترجمان ہے۔ اس کے تین شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ ہماری نثر کے سب سے بڑے طنز و مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی لندن میں آباد ہیں۔ منیب الرحمٰن امریکہ میں ہیں۔ لندن سے بخش لائلپوری کا تازہ مجموعۂ کلام "لہو کا خراج" شائع ہوا ہے۔ فارغ بخاری بھی لندن میں بسے ہوئے ہیں، جو مہاجر زندگی کا نوحہ اس طرح بیان کرتے ہیں ۔

آنے والی نسلیں بزرگوں سے اتنا تو پوچھیں گی
کیسے لوگ تھے کون تھے آخر کیوں وہ یہاں سے چلے گئے

ہمارے شاعروں اور ادیبوں کی خاصی بڑی تعداد لندن میں آباد ہے جن میں عاشور کاظمی، احمد فراز، ساقی فاروقی، افتخار عارف، زہرہ نگاہ، عبداللہ حسین، سوہن راہی، موج فرازی، عباس اطہر، مصطفیٰ کریم، قیصر تمکین، اطہر راز وغیرہ ہیں۔

ایران میں مقیم علی ظہیر کا تازہ مجموعۂ کلام "انگلیوں سے خون" اور نیویارک سے حمیرا رحمان کا تازہ مجموعۂ کلام "اندمال" شائع ہوئے ہیں۔ کنیڈا اور امریکہ میں اشفاق حسین، نعیم صدیقی، چودھری محمد نعیم، شاہین، خالد سہیل، عبدالقوی ضیا، سحر بارہ بنکوی، فاروق حسن۔ ناروے میں سعید انجم، ہرچرن چاولہ ہیں۔ اُردو جریدہ "شاعر" بمبئی نے ناروے میں بسنے والے ادیبوں، شاعروں پر خاص نمبر شائع کیا ہے۔ "اُردو کی نئی بستیاں" کے نام سے جس میں سعید انجم، شاہدہ وسیم، ارشد اقبال، شگفتہ انور، خالد حسین خالد، نوید انجم اور علی اصغر شاہد کی کہانیاں شامل ہیں۔

لندن میں آباد حیدرآباد کی ایک شاعرہ صدیقہ شبنم حال ہی میں ہندوستان آئی تھیں۔ انھوں نے یہاں پر اپنا تازہ مجموعۂ کلام "تنہائی" چھپوایا جس کی رسم اجرا دہلی اور حیدرآباد دونوں جگہوں پر عمل میں آئی۔ نعیم صدیقی امریکہ میں آباد ہیں۔ وہ انگریزی کے اُستاد ہیں۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام "پیمانۂ امروز" حیدرآباد سے چھپا ہے جو اپنے دامن میں انوکھے تجربات کو سمیٹے ہوئے ہے۔ سائرہ ہاشمی غالباً فرانس میں ہیں۔ ہجرت کے موضوع پر ان کے تین معرکتہ الآرا ناولٹ "سیاہ برف" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ اس موضوع پر یہ کتاب فکشن میں اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے۔ ہجرت کے موضوع پر کہانیاں بھی بے شمار لکھی گئی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں۔ شاعری میں بھی یہ درد کسی نہ کسی طرح در آتا ہے آیئے اب ذرا دبستانِ مغرب سے چند شعری جھلکیاں بھی دیکھ لیں۔

پتھر کے ہیں انسان یہ پتھر کا جہاں ہے
اب ایسے خرابے میں بھلا کس کو صدا دیں

ہاتھوں میں تمنّا کی صلیبوں کو اٹھائے
ہر شام چلے آتے ہیں یہ درد کے سائے

کیوں دے دیا ہے مجھ کو کڑی دھوپ کا سفر
ابرِ بہار! سایۂ رحمت کو کیا ہوا
پھرتے ہیں آج صورت دشنام سب یہاں
ان ساکنانِ شہر کی غیرت کو کیا ہوا
(صدیقہ شبنم)

اب تو یوں لگتا ہے فارغ کہ عیاذاً باللہ
جیسے اسلام یزیدوں کے لیے آیا ہے
(فارغ بخاری)

مٹی سے ہوا منسوب مگر آتش خانہ ساجلتا
کئی سورج مجھ میں ڈوب گئے مرا سایہ کم کرنے کے لیے
آج اپنے زہر سے کاٹ دیا سب زنگ پرانے لفظوں کا
آئندہ کے اندیشوں کی تاریخ رقم کرنے کے لیے
وہ یاد کے ساحل پر سارے موتی بکھرائے بیٹھی تھی
اک لہر لہو میں اٹھی تھی مجھے تازہ دم کرنے کے لیے
(ساقی فاروقی)

کتابیں
قلم
چند کاغذ کے ٹکڑے
شکن سے بھرا ایک بستر
آخر ہفتہ کی اک اداسی بڑھاتی ہوئی
کہر آلود صبح
ایک کانسی کے برتن سے
لٹکی ہوئی بیل
ایک لمس کا سا مکمل سکوت
کلائی پہ بیٹھے ہوئے

یک شکرے کی مانند
ے زار دل
—— کہر آلود صبح
(شاہین)

نکھوں کو اشک درد کو شنوائی چاہیے
ے مرکز سخن مجھے گویائی چاہیے
ترا ہے میرے شہر پہ کیسا عذابِ کذب
ے صادقِ جہاں مجھے سچائی چاہیے
(زہرہ نگاہ)

کھل کے ملتا ہے نہ بالکل ہی جدا ہے ہم سے
ان دنوں شہر میں ہر شخص خفا ہے ہم سے
(موج فرازی)

اپنے تو تصوّر میں کوئی شخص نہیں تھا
یہ کس کا سراپا تھا جو دیوار پہ آیا
(سیّد عطا جالندھری)

نیلگوں درد کی وسعت میں کوئی
دہ بر فاب تمنّا کو سہارا دے کر
فصلِ گریہ کا سنائے مژدہ
منجمد جھیل میں لہروں کی طرح
ے وجدان کا نیلم پگھلے
ہ سی چشم سیہ کا افسوں
بد کوئی رکھ دے مرے زخم ہنر کی صورت
ک الماس پہ خورشید کا جام گلگوں
ست موسم کا سبو ٹوٹ گرے
بھتے عنبر کی طرح شام کے ویرانوں میں
پھر محبت کی مصوّر آنکھیں
رنگ بھر دیں مری تنہائی کے پیمانوں میں
کوئی تصویر ابھر آئے فصیلِ دل پر
سوزِ اُلفت کو جگائے کوئی
برف پگھلے تو لہو گیت سنائے کوئی
—— برف پگھلے تو
(عرفانہ عزیز)

آئیے اب دیس لوٹ چلیں —— مدھیہ پردیش سرکار نے اقبال اعزاز قائم کیا ہے جو ہر سال تخلیقی ادب پر دیا جائے گا۔ اس اعزاز کی رقم اکیاون ہزار روپے ہے۔ ۱۹۸۶ء کا اقبال اعزاز علی سردار جعفری کو دیا جا چکا ہے اُردو میں یہ سب سے بڑا ایوارڈ ہے۔ ۱۹۸۶ء میں حیدرآباد اور بھوپال میں اقبال پر کئی سمینار بھی کیے گئے بھوپال میں اقبال کے نام پر ایک اقبال پارک بنایا گیا ہے جس میں اقبال کی شاعری کے شاہین کا مجسمہ نصب کیا گیا ہے۔ ساہتیہ اکادمی انعام شمس الرحمٰن فاروقی کے حصّے میں آیا ہے جو ان کی کتاب "تنقیدی افکار" کو ملا ہے۔

ہریانہ، اڑیسہ اور گجرات میں بھی اُردو اکادمیاں قائم ہوگئی ہیں سال گذشتہ میں اُردو کی چند نامور ہستیوں کو موت نے ہم سے چھین لیا ہے۔ غیاث احمد گدّی، سبط حسن، محمد طفیل، برق آشیانوی، اظہر علی فاروقی، ضیا فتح آبادی، بلونت سنگھ، صادق اندوری اب ہم میں نہیں رہے۔

بنگلہ دیش میں جہاں سے اُردو اور اُردو کے نام لیواؤں کو دیس نکالا مل چکا تھا اب وہاں بھی زندگی کے آثار نظر آرہے ہیں. وہاں سے بیک وقت کئی رسالوں کا اجرا زندگی کی علامت کی نشاندہی کرتا ہے۔ ذاکر عزیزی اور ایم نعیم کی ادارت میں انتخاب نام سے ایک ضخیم جریدہ شائع ہوا ہے۔ ایک اور رسالہ الاخبار کے نام سے شائع ہونے لگا ہے جس کے مُدیر زین العابدین ہیں۔

۱۹۸۶ء میں ترقی پسندوں نے لندن، لکھنؤ اور دلّی میں اپنی گولڈن جُبلی کے جشن منائے۔ ادبی رسائل بھی شائع ہوتے رہے جن میں "شب خون" "کتاب نما" "زبان و ادب" "شاعر" اور "عصری ادب" کے علاوہ احمدآباد سے "گلبن" حیدرآباد سے "شگوفہ" "سب رس" کلکتہ سے "انشا" مالیگاؤں سے "جواز" دلّی سے سرکاری رسالہ "آج کل" کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ "بیسویں صدی" اور "شمع" کے خصوصی شمارے جوان کے سالنامے تھے ادبیات کے حامل تھے۔

شاعری

شاعری ادب کی اعلیٰ ترین صنف ہے لیکن نہایت بدنام۔ اس کے اعجاز کا عالم تو یہ ہے کہ شاعر ایک مصرعے میں، ایسی بات کہہ دینے پر قادر ہے جو ایک ناول یا کہانی میں بھی بیان نہیں کی جا سکتی۔ شاعر کبھی کبھی تو پیغمبری کے مرتبے پر فائز نظر آتا ہے مگر شاعر اور شاعری بے وقعت بھی اتنے ہی ہیں۔ اس لیے کہ شعر موزوں کر لینا آسان ہے اور جو بھی دو مصرعے موزوں کرنا جان گیا وہ شاعر کے مرتبے پر فائز ہونے کا دعویٰ کرنے لگتا ہے۔ زیر تبصرہ سال ہر سال کی طرح شاعری کی فراوانی کا سال ہے۔ بے شمار شعری مجموعے سامنے آئے ہیں۔ شعری مجموعے جو چھپتے ہیں ان میں سے زیادہ تر کی رونمائی بھی ضرور ہوتی ہے اُردو میں اب یہ روایت کافی جڑ پکڑ گئی ہے جس کتاب کی رسم اجرا ادا نہیں ہوئی گویا وہ کتاب چھپی ہی نہیں۔

شاعری میں غزل اہم ترین صنف —— شاعری ہے اس نے بڑے اُتار چڑھاؤ دیکھے ہیں. لوگوں نے اسے مار مار کر ادھ موا کر دیا. ترقی پسندوں نے اس پر ایسی بے دردی سے آرا چلایا کہ اس کے بچنے کے کوئی آثار باقی نہیں رہے تھے۔ مگر یہ کچھ ایسی سخت جان واقع ہوئی ہے کہ مرنے

میں نہیں آتی۔ بلکہ جتنا اسے مارنے کی کوشش کی جاتی ہے اتنی ہی یہ توانا و طاقتور ہوتی ہے۔ غزل نے سارے وار جھیل لیے ہیں۔ اندرونی بھی اور باہری بھی۔ اب یہ پھر نئی آب و تاب کے ساتھ ہمارے سامنے ہے۔ اس کے اندرونی ڈھانچے میں جذب و انجذاب کی ایسی صلاحیت موجود ہے کہ باہر سے آنے والے ہر جھٹکے کو شاک ابیزرور کی طرح اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ آٹھویں اور نویں دہائی کی غزل عصری تقاضوں کے ہر چیلنج کو قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ۸۳-۱۹۸۲ء میں آزاد غزل کا جو شوشہ چھوڑا گیا تھا وہ دم توڑ رہا ہے۔ گو بحث چل رہی ہے کہ آزاد غزل کا تجربہ کس حد تک ناکام یا کامیاب رہا۔ ظہیر غازی پوری نے اس تجربے کو قطعی ناکام بتایا ہے جبکہ کچھ لوگ آزاد غزل لکھ بھی رہے ہیں جن میں علیم صبا نویدی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

نثری نظم کا چلن بڑھا ہے۔ جاپانی صنف شاعری ہائیکو کو بھی شاعروں نے اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ نثری نظم کے ذیل میں ڈاکٹر محمد یعقوب عامر کا مجموعۂ کلام "رقصِ خیال" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

اب ہم ان کچھ شعری مجموعوں کے نام تحریر کرتے ہیں جو ۱۹۸۶ء میں منظرِ عام پر آئے:

سرو سامان (اختر الایمان)۔ برف، شجر، آواز (حمید الماس)۔ آنکھ اور خواب کے درمیان (ندا فاضلی)، پردہ سخن کا (مظفر حنفی)۔ آمد (بشیر بدر)۔ مصرعۂ ثانی (شجاع خاور)۔ نگاہ (اختر سعید خاں)۔ خیمۂ سیاہ (افضل احمد سید)۔ سمندر پیاسا ہے (شباب للت)۔ شہر شہر تنہائی (افضال ملک مالیر کوٹلوی)۔ بے نشان (شاہین)۔ دھوپ کا آخری ٹکڑا (سیّد عارف)۔ حرف حرف روشنی (حمایت علی شاعر) گورکھ روے پھول (ظفر گورکھپوری) نگار حکمت (محمد فضل الرحمٰن) تنہائی (صدیقہ شبنم)۔ شوخیٔ تحریر (سید محمد جعفر)۔ شیشے کا سفر (رضا رشک)۔ سوالوں کی بوچھار (رؤف جاوید)۔ دردِ نارسا (میر ہاشم)۔ سرائے میں شام (نشتر خانقاہی)۔ رقصِ خیال (ڈاکٹر محمد یعقوب عامر)۔ بازیافت (محبوب راہی)۔ دھوپ اور سفر (حفیظ آتش)۔ خطِ غبار (قیصر حیدری) زخموں کے سلسلے (عبداللہ تبسم)۔ صد چاک (دواکر راہی)۔ سوئے غزل (پنالال سریواستو انور)۔ فصیل (تسکین زیدی)۔ متاعِ دیدۂ تر (نصیبہ پرواز)۔ ذائقۂ سنگ (سرفراز دانش)۔ موجِ صبا (مہر چند کوثر)۔ حساب لفظ لفظ کا (کیف احمد صدیقی)۔ اوجِ عرش (اوج یعقوبی)۔ روشنی کے پھول (انور مینائی)۔ مالک یوم الدین (ف۔ س۔ اعجاز)۔ چنگاریاں (رضی بدایونی)۔ خارزار (خار دہلوی)۔ درد و غم (غمگین قریشی)۔ ایک صفحۂ برہم (زاہد ابرول)۔ میری صدا کا غبار (رفعت سروش)۔ حرف حرف (شررِ فتح پوری)۔ سبز و تازہ نہالوں کے انبوہ میں (بدیع الزماں خاور)۔ قربتوں کی خوشبو (آفاق احمد)۔ کہرے کی دھول (ظہیر غازی پوری)۔ نقوشِ بہزاد (بہزاد فاطمی)۔ جل ترنگ (مرتب: مناظر عاشق ہرگانوی، شاہد نعیم' ۱۹۸۵ء کی ڈھائی سو شعرا کی معیاری غزلیں)۔ شہرِ قلم (شوکت مجید)۔ حرف و نوا (جنید حزیں) چاک (زیب غوری مرحوم) لہو پکارے گا (اندر سروپ نادان) موم کا شہر (قمر اقبال)۔ متاعِ آخرِ شب (حفیظ میرٹھی)۔ گلریز (شارق ایرایانی)۔ شمیم (شمیم جے پوری)۔ جنبشِ لب (حق کانپوری)۔ شفق رنگ چاندنی (بشیر فاروقی)۔ لہریں (راجندر بہادر موج)۔ اوراقِ گل (چندر پرکاش جوہر)۔ روشنی اور خوشبو (سیّد حیات وارثی)۔ تارِ نفس (مسلم انصاری)۔ رشتوں کی مہک (صلاح الدین نیّر)۔ گل و… (اخلاق حسین عارف)۔ شیشہ کا لہو (شاکر…)۔ شاخ بشاخ (شورش صدیقی)۔ حصار (ناظر جعفری)۔ افکارِ پریشاں (اسلم بارہ بنکوی)۔ ترسیلے (علیم صبا نویدی)۔ نقشِ قدم (پرواز اعظمی)۔ آگہی کی دھوپ (مبارک اللہ انصاری)۔ شیرازۂ حیات (انور قدوائی)۔ سرورِ قلب (ودیا سکسینہ)۔ جام و سبو (نرائن پرشاد طالب لکھنوی)۔ آوارہ لکیریں (جوہر صدیقی)۔ گل گشت (سہیل کاکوروی)۔ گردِ سفر (عرفان بارہ بنکوی)۔ رُباحیات کوکب (شاہ کوکب القادری)۔ نغمہ نو بہار (کانتی گرو ور شبنم)۔ لفظوں کا بدن (شفیع اللہ خار راز اٹاوی)۔ نغمۂ نور (ہنومان پرساد سریواستو جگر بستوی)۔ قطرہ قطرہ (سعید اٹاوی)۔ بکھرے پھول (جوہر رحمانی)۔ خوشبوئیں (نسیم فاطمہ… لکھنوی)۔ نذرانے (اشرف مالوی)۔ ہنستی شبنم روتے پھول (ہنومان پرساد شرما عاجز مانوی)۔ پرتوِ خیال (آشفتہ شاہجہانپوری)۔ میری غزلیں میرا پیام (پی پیام بلرامپوری)۔ نغموں کی کسک (مصطفیٰ فطرت)۔ نغمۂ حیات (اختر لکھنوی)۔ زمزمہ (حیدر حسین فضا لکھنوی)۔ گل و خار (فاطمہ حسن)۔ منظر منظر (عامر قدوائی)۔ غزل نما (حاتم سیدن پوری)۔ کائنات (ہوش نعمانی)۔ دھوپ چھانو (مرتب: دھرم پال عاقل)۔ آزادی کے ترانے (ڈاکٹر راجیش کمار پرتی، ضبط شدہ نظموں کا مجموعہ)

چھنی چھنی سائباں (تنہا تمّا پوری)، تصرف ... عزیز وارثی)، افکار گریزاں (حقیر آستانی)، آشوبِ غم (خالد کفایت)، سورج خیال (طلعت ... عرفانی)، سکوتِ گل (ثاقب امروہوی) سب کہاں کچھ (امان اللہ خاں شیروانی)۔ لحن توفیق ... ولی احمد صدیقی)، متاعِ زنداں (قاری سیف الدین)۔

... اشعار۔

نئی شاعری کا لب و لہجہ سمجھنے کے لیے ۱۹۸۷ء میں مطبوعہ چند نمونے پیش ہیں۔

رضا نقوی واہی کی ایک طنز و مزاح کی حامل خوبصورت نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

انسپیکشن جب کلیم الدین احمد نے کیا
دیکھ کر غزلوں کا انبار ان کا سر چکرا گیا

غیظ میں آ کے یہ حکم خاص جاری کر دیا
جس نے جینا ہی غزل سازوں کا بھاری کر دیا

دس برس تک مارشل لا کا نفاذ عام ہو
مثل نس بندی غزل گوئی کا چکّا جام ہو

بلکہ اب تک آ چکا اسمگل ہو کر جو کلام
اس کی بو بھی سونگھنے پائیں نہ ناقد یا عوام
(رضا نقوی واہی)

لفظ کی پہچان گویا
موت ہے لفظ کی
اس لیے کم سوال حل طلب کہتا ہوں

راحت کدے سے کم نہ تھی
کل تک زمین فکر
اب اس کے نرم سینے میں قبریں ہیں
(حمید الماس)

بار بار اپنی آہٹ پر خود چونک اٹھوں
میرے رستے کی دیوار، ڈر ہے مرا
تم سنو گے تو کہتا چلا جاؤں گا
یوں تو قصہ بہت مختصر ہے مرا
جا بسوں گا میں مخمور اک دن وہیں
بستیوں سے پرے جو کھنڈر ہے مرا
(مخمور سعیدی)

دل جل رہا ہے تو میاں آہ و فغاں جلدی کرو
کل تک بدل جائے گا یہ طرز بیاں جلدی کرو

کچھ نہیں بولا تو مر جائے گا اندر سے شجاع
اور اگر بولا تو پھر باہر سے مارا جائے گا
(شجاع خاور)

مجھے الجھا دیا دانش کدوں نے صرف خوابوں میں
کوئی تعبیر رکھ دو میرے بچوں کی کتابوں میں
(عرفان صدیقی)

کبھی تو شام ڈھلے اپنے گھر گئے ہوتے
کسی کی آنکھ میں رہ کر سنور گئے ہوتے

ساری رات برسنے والی بارش کا میں آنچل ہوں
دن میں کانٹوں پر پھیلا کر مجھے سکھایا جاتا ہے
(بشیر بدر)

جو پائے وہ کھوئے اسے جو کھوئے وہ روئے اسے
یوں تو سبھی کے ساتھ ہے کس کی ہوئی ہے زندگی
(ندا فاضلی)

گھلی ملی ہے ہوا میں بارود کی مہک بھی
ہرن پیاسا ہے اور چشمہ ابل رہا ہے
(مظفر حنفی)

جمع کرتی ہے مجھے رات بڑی مشکل سے
صبح کو گھر سے نکلتے ہیں بکھرنے کے لیے
(جاوید شاہین)

فکشن

وہی پرانا رونا کہ اردو میں ناول کم لکھے جا رہے ہیں اس سال بھی یہی رونا ہے لیکن فکشن میں ایک خوش آئند رجحان یہ ہے کہ کم از کم کہانی میں بیانیہ بحال ہوا ہے اور بقول شمیم حنفی فیشن ایبل موضوعات پر کہانیاں لکھنے کا چلن اب دھیرے دھیرے کم ہو رہا ہے چھوٹی سی بات جو تخلیقی آدمی کا تجربہ بن جائے اس بڑی بات سے بہتر ہے جو تخلیقی تجربہ بننے کی قوت سے محروم ہو۔ تکنیک میں بھی تصنع کی بجائے سیدھے سادے طریقے پر قصے بیان کرنے کی جانب رجحان ہے لیکن ابھی افسانہ اپنی صحیح فارم میں آیا نہیں ہے۔ افسانے کی تنقید پر بھی توجہ کم ہے۔ زیر تبصرہ سال میں طنز و مزاح اور انشائیوں پر مشتمل ادب زیادہ تخلیق ہوا ہے۔ چند سفرنامے بھی لکھے گئے ہیں۔ ڈرامے ہر سال کی طرح بہت کم ہیں بلکہ نہیں کے برابر سامنے آئے ہیں۔

ناول

قاضی عبدالستار کا ناول غالب اور عصر حاضر کی سیاست پر ظفر پیامی کا ناول "فرار" خصوصیت سے قابل ذکر ہیں جو ادبی حلقوں میں موضوع بحث ہیں۔ "دل دریا" کے نام سے شرون کمار ورما کا نیا ناول بھی شائع ہوا ہے بشریٰ رحمٰن کے ناولوں کو بہت شہرت ملی ہے جو ہندوستانی رسائل نے بالاقساط شائع کیے ہیں۔ ڈاکٹر نریش کا ناول "پتھروں کا شہر" اور اوپندر ناتھ اشک کا ناول "بڑی بڑی آنکھیں" بھی اسی سال منظر عام پر آئے ہیں۔ چپ

دوسرے ناولوں کے نام درج ذیل ہیں۔
ہر بار کہا دل نے (اودے سرن شرما)۔
سماج (نفیس بانو شمع)، فرحی (فرزانہ نصیر)۔
شہزادہ (قاضی مشتاق احمد)، آخری زمین
(مظہر الزماں خاں)، یہ میرا ظرف دیکھ (عطیہ پروین)۔
زنجیر (اسما اعجاز)، شکست (اسما اعجاز)۔
پہچان کی نوک پر (جتیندر بلّو)۔ پیاسی شبنم
(عفت افضل)۔ بیت گیا دن (سیدہ ماجدہ
خاتون)، چاند رات (دیبا خانم)، کھلاڑی
(الف صدیقی)، مفرور (اقلیم علیم)، شعلۂ
کاہن (ترجمہ شیخ سلیم احمد)، دلدل (نورجہاں
سلیم)۔

جدید افسانوں کے انتخابات کم شائع
ہوئے ہیں۔ البتہ رسائل میں جدید افسانے کی
بازگشت ضرور سنائی دیتی رہی۔ شبِ خون
نے جدید افسانے کے لیے اپنا ایک پورا شمارہ
وقف کیا۔ شمع کا سالنامہ افسانہ نمبر تھا جسے
خاصی مقبولیت ملی۔ ۱۹۸۶ء میں جن اہم افسانہ
نگاروں کے مجموعے منظرِ عام پر آئے ان میں
جوگندر پال کا "کتھا نگر"، شکیلہ اختر کا "آخری
سلام"، رتن سنگھ کا "در بدری"، رفیعہ منظور الامین
کا "دستک سی در دل پر"، انیس رفیع کا "اب وہ
اترنے والا ہے"، کمال احمد کا "موڑ کے پاؤں"
رحمٰن جمیدی کا "بکھرے رُخ کی تصویر"، خواجہ احمد
عبّاس کا "سونے چاندی کے بُت"، کشمیری لال
ذاکر کا "میرا آنچل میلا ہے" اور "ڈوبتے سورج
کی کتھا"، فخر الدین عارفی کا "سلگتے خیموں کا شہر"
سیّد احمد قادری کا "ریزہ ریزہ خواب"
کرنل بھیم سین تیاگی کا "بندر کے پنجے"
اکرام باگ کا "کوچ"، بنگلہ دیش کے شام
بارکپوری کا "سورج مکھی"، اشفاق احمد کا "صبح
کا بھولا"، ابنِ کنول کا "تیسری دُنیا کے لوگ"
رام شرما کا "ایک قدم اور"، اکرم فاروقی کا "ہیلنگر
پرلٹی زندگی"، تسکین زیدی کا "فصیل"، دیش
چتر کار کا "شمشیر و سناں اوّل"، عظیم اقبال کا
"جو کہا نہیں جاتا"، عرفان عارف کا "صدیوں بعد
کے لوگ"، ساجدہ عابد کا "درد پنہاں" شامل ہیں۔

طنز و مزاح

طنز و مزاح کا میدان کافی ہرا بھرا رہا۔
اس صنف کے قلم کار اپنا لوہا منواتے رہے۔ احمد
جمال پاشا، مجتبیٰ حسین، فکر تونسوی، شفیقہ
فرحت، نریندر لوتھر، یوسف ناظم،
دلیپ سنگھ، رام لال نابھوی اور پرویز یداللہ
مہدی نے اچھے انشائیے تحریر کیے۔ حیدرآباد میں زندہ
دلان حیدرآباد کی جانب سے بین الاقوامی مزاح
کانفرنس منعقد کی گئی۔ زندہ دلان حیدرآباد کا
ترجمان شگوفہ برابر شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۸۶ء کا
سب سے زیادہ مقبول انشائیہ نگار عاصی سعید
رہا جس کے انشائیوں کا مجموعہ "چٹخارے" کے نام
سے شائع ہوا جس نے برصغیر میں دادِ تحسین حاصل
کی۔ اس صنف میں دلیپ سنگھ کو بھی خاصی شہرت
ملی۔ چند اہم مزاح نگاروں کے جو انتخابات
شائع ہوئے وہ درج ذیل ہیں:
رانگ نمبر (شفیقہ فرحت)، الف تماشا (نریندر
لوتھر)، الف سے قطب مینار (شیخ رحمٰن اکولوی)۔
فی الحال (یوسف ناظم)، ادب گزیدہ (معین اعجاز)۔
کف گیر نظمیں (نظر برنی)، چچا (ہاشم عظیم آبادی)۔
گُل خنداں (کشن لال خنداں)، خاکے خاکے (عوض سعید)

ڈرامے

صلیب زندہ ہے (رشید انجم)، کرچی
دھوپ گھنی چھاؤں (آفاق احمد)، پڑوسن کا
کوٹ (اوپندر ناتھ رشک)، مجھے گھر یاد آ
ہے (شمیم حنفی)، مرزا غالب لندن میں (ایس۔
آئی۔ آغا)، اور بھی غم ہیں زمانے میں (اودے
سرن شرما)، راجو کی داستان (عتیق اللہ شیخ)۔

سفرنامے

پشکن کے دیس میں (جگن ناتھ آزاد)
سفر ہے شرط (علی احمد فاطمی)، لندن کی آخری
رات (شکیل الرحمٰن)۔

خودنوشت

کیا دن تھے (قاضی جلیل عبّاسی)۔
بمبئی کی بزم آرائیاں (رفعت سروش)۔
یادوں کا اُجالا (بھگوان سنگھ، ترجمہ شمیم حنفی)۔
یادوں کا جشن (کنور مہندر سنگھ بیدی سحر)۔
آتشِ چنار (شیخ محمد عبداللہ)۔

بچّوں کا ادب

راہن ہُڈ کے کارنامے (ایم ندیم)، وسطی
جنوبی افریقہ اور بالا گاسی کی مزیدار کہانیاں
(ایم این)، بے زبان ساتھی (وکیل نجیب)۔
بازیچۂ اطفال (مہر رحمٰن)، بچّوں کی کہانیاں
(اکبر رحمانی)، امیر خسرو (مکتبہ جامعہ)، خطرناک
سفر (ریاض احمد خاں)، پری رانی (صالحہ خاتون)۔
سہانے ترانے نظمیں (شان الحق حقی)، اندھے
کا بیٹا (ترجمہ شعیب اعظمی)، جنگل کی ایک رات
(ریحان احمد عبّاسی)، ٹوٹے کھلونے، نظمیں
(سطوت رسول)۔
بچّوں کے رسالوں میں "کھلونا" اور
"پیامِ تعلیم" قدیم ماہنامے ہیں جو پابندی سے

شائع ہو رہے ہیں۔ بچّوں کا ادبی ٹرسٹ نام سے ایک سوسائٹی بھی قائم ہوئی ہے جس نے بچّوں کے ادب پر ایک سیمینار منعقد کیا۔ غلام حیدر جو بچوں کے معروف ادیب ہیں اس سوسائٹی کے روحِ رواں ہیں۔

تنقید و تحقیق

تنقید و تحقیق میں سب سے زیادہ کساد بازاری نظر آتی ہے۔ زیادہ تر کتابیں یونیورسٹیوں میں تیار شدہ تحقیقی مقالوں پر مشتمل ہیں۔ کسی زندہ یا مردہ شاعر و ادیب کو لے لیا اور اس کے نام کے ساتھ حیات اور کارنامے کا اضافہ کر کے کتاب تیار کر دی۔ یہ ایک آسان نسخہ ہے۔ جو ہمارے باقاعدہ تنقید نگار یا محقق ہیں انھوں نے بھی کوئی قابلِ ذکر کارنامہ انجام نہیں دیا ہے۔ ۱۹۸۶ء میں جو کتابیں سامنے آئی ہیں ان کے مضامین وہی ہیں جو انھوں نے پچھلے دس پانچ برس میں لکھے ہیں اور مختلف ادبی رسائل میں چھپ چکے ہیں باقاعدہ کوئی تنقیدی یا تحقیقی کتاب نظر نہیں آتی۔ چند مستثنیات ضرور ہیں جیسے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی کتاب "سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ"۔ باقاعدہ تنقید کے ذیل میں ایک اور نام فضیل جعفری کا لیا جا سکتا ہے "کمان اور زخم" کے نام سے جن کی نئی کتاب شائع ہوئی ہے جو تنقیدی رویوں سے بحث کرتی ہے شمس الرحمٰن فاروقی کی دو کتابیں سامنے آئی ہیں "تنقیدی افکار" اور "اثبات و نفی"۔ فکشن کی تنقید میں ایک اچھی کتاب عزیز احمد کی ناول نگاری سے متعلق سلیمان اطہر جاوید نے تحریر کی ہے مکاتیب غالب تین جلدوں میں خلیق انجم کا ایک اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ تنقید میں ایک اور اہم کتاب "ہمارے عہد کا ادب مستقبل کے روبرو" ہے جو دیویندر اسر کی تصنیف ہے جس میں اہم موضوعات پر مضامین ہیں۔

علاوہ بریں محمد حبیب الدّین کی کتاب "اقبال کا نظریۂ تعلیم"۔ سیّد مسعود حسین رضوی کی "مشاہیر کے خطوط"۔ ڈاکٹر محمد کمال الدین کی "بیسویں صدی میں اُردو قصیدہ نگاری"، ڈاکٹر مرزا صفدر علی بیگ کی کتاب "تصوف اور اُردو کی صوفیانہ شاعری" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس سال شائع ہونے والی مزید کچھ کتابیں جن کی ہم تک رسائی ہو سکی یہ ہیں:

"نئی تحریریں" عبدالستار دلوی۔ "تخلیق و تنقید" امیر اللہ شاہین۔ "اردو کی تین مثنویاں" خان رشید۔ "پریم چند کی ناول نگاری" یوسف سرمست۔ "دکنی غزل کی نشو و نما" محمد علی اثر۔ "تلاش و تجزیہ" حامد چھپروی۔ "سر دہلیز" حمید الماس۔ "شعریاتِ اقبال" عبدالرحمٰن عرشی۔ "فراق گورکھپوری" (ایک سیمینار میں پڑھے گئے مضامین) علی احمد فاطمی۔ "کوکن کے سپوت" انجم عباسی / شیخ اسماعیل۔ "فن اور فنکار" سیّد احمد قادری۔ "میر اسد علی خاں تمنا — حیات و کارنامے" ڈاکٹر مہر جہاں۔ "علی عباس حسینی۔ حیات و کارنامے" ڈاکٹر تہمینہ اختر۔ "مخدوم محی الدین — حیات و کارنامے" شاذ تمکنت "پطرس بخاری — حیات و کارنامے" میمونہ وحید "سعادت حسن منٹو — حیات و کارنامے" برج پریمی۔ "تذکرہ کاملان رامپور (۱۹۳۹)" حافظ احمد علی خاں شوق۔ "رباعیات انیس" علی جواد زیدی۔ "یادوں کی پرچھائیاں" (گجرات کے شعرا کا تذکرہ) رحمت امروہوی۔ "ہند آریائی اور اُردو" سیّد حمید الدّین قادری۔ "پیام اقبال" محمد بدیع الزماں۔ "اُردو مختصر افسانہ — فنی و تکنیکی مطالعہ" نگہت ریحان خاں۔ "یگانہ" ساحل احمد۔ "زندہ کتبے" عروج زیدی۔ "سیّد سلیمان ندوی"۔ علی گڑھ سیمینار کے مضامین۔ "تر و تازہ" نئے افسانے پر تنقید و انتخاب۔ تاج انور۔ "ہندی ڈرامے کا ارتقا"۔ مدھیہ پردیش سرکار۔ "دہلوی مرثیہ گو" علی جواد زیدی۔ "بہار کا اُردو ادب آٹھویں دہائی میں" ارتضیٰ کریم۔ "انگریزی ادب کی مختصر تاریخ" (انگریزی کتاب کا ترجمہ) ذکی کاکوروی۔ "سلولائیڈ کی دنیا" پریم پال اشک۔ "اصلاح سخن" محمد عبدالعلی سندیلوی۔ "اُردو میں طنز و مزاح کی روایت اور ہم عصر رجحانات" (اُردو اکادمی کے جشن بہاراں میں پڑھے گئے مضامین) ڈاکٹر قمر رئیس۔ "قرآن اور اقبال" ابو محمد صالح۔ "بنے بھائی" عبدالقیوم ابدالی۔ "بھیم سین ظفر ادیب" یوگندر بہل تشنہ۔ "جوش شناسی" (لکھنؤ میں منعقدہ سیمینار میں پڑھے گئے مضامین) کاظم علی خاں۔ "حالی، فن اور شخصیت" (ہریانہ ساہتیہ اکادمی کے زیرِ تحت منعقدہ سیمینار کے مضامین) شمیم فاروقی۔ "شمیم کرہانی — حیات و شخصیت" سیّد خواجہ علی انجم۔ "عصمت چغتائی کا سماجی شعور" عشرت آرا سلطانہ۔ "علّامہ جمیل مظہری" قمر سلطانہ۔ "کرشن چندر" جیلانی بانو / مخمور سعیدی۔ "ایک مطالعہ" اطہر فاروقی۔ "محمد علی جوہر کی اُردو خدمات" ظہیر احمد صدیقی۔ "مشفق خواجہ ایک مطالعہ" ڈاکٹر خلیق انجم۔ "کالی داس ایک مطالعہ" شہانہ شبنم۔ "تاریخ نقد ادب" محمد فضل الرحمٰن۔ "پریم چند اور تصانیفِ پریم چند" مانک ٹالا۔ "اُردو ہندی کے جدید مشترکہ اوزان" ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی۔ "نیم تحریر" ڈاکٹر محمد منصور

سانیات کے بنیادی اصول" ڈاکٹر اقتدار حسین.
دو افسانے کی نئی فضا" رام لعل" رام لعل
و شخصیت" نریندر ناتھ" مہدی افادی حیات
ہیت و ادبی کارنامے" ڈاکٹر فیروز احمد
ہم الدین احمد کی تصانیف کا تنقیدی جائزہ"
وارث الرحمن" محمد مجیب حیات اور اُردو
خدمت" صادقہ ذکی" مجاز شخص و شاعر"
یزہ عثمانی" یادگاری خطبات" ڈاکٹر عابد حسین/
ر احمد فاروقی" گلشن نوبہار" سید سلیمان حسین.
بی نگارشات" معین الدین حسن کاکوروی.
سن بلاغت" اختر حسین اختر" تذکرہ شعرائے
غ آباد" شکنتلا موج" اقبال کا فلسفۂ حیات"
ہ فیاض عالم" مسند صدارت سے"
با فتح آبادی" پروین اعتصامی اور شاعری"
ہر محمد تقی علی عابدی" شناخت" "تبسّم"
حرائے لندن" جواہر زاہری" بیدی نامہ"
س الحق عثمانی" تخلیقی تجربہ" ابوالکلام قاسمی.
را الحلیم شرر بحیثیت ناول نگار" ڈاکٹر علی احمد
لمی" پریم چند کی ناول نگاری" ڈاکٹر یوسف.
ریحات و اشارات" شاہ مقبول احمد" فکر و نظر
وران علی گڑھ" نورالحسن نقوی" متاع
رو نظر" محمد آفاق صدیقی" ڈاکٹر اعجاز
بین حیات و کارنامے" سید علی حیدر" چند
باب کمال" ضیاء الدین اصلاحی" اُردو ناول
ی خاندانی زندگی" فخرالکریم صدیقی" ناول
ے پہلے" ملیحہ سمیع الزماں" تاریخ اور افسانہ"
ہت سمیع الزماں" مثنوی قطب مشتری کا
قیدی مطالعہ" ابوالبرکات کربلائی" فراق
رکھپوری" علی احمد فاطمی" مالک رام ایک
طالعہ" علی جواد زیدی" بنگال میں اُردو
ے مسائل" شانتی رنجن بھٹاچاریہ" صہبائی.

مختصر تعارف" محمد انصار اللہ" صوفیانہ شاعری میں عشق کا تصور" سید محمد حسن" لہجۂ غزل" کمال لکھنوی" سائنس کی باتیں" محمد اسلم پرویز" ہریانوی برج کے میگھ ملہار" جاوید وششٹ" تحلیل نفسی کے پیچ و خم" سلامت اللہ" مختصر فرہنگ ــــ اصطلاحات و تلمیحات" ساحر لکھنوی.

اُردو اکادمی دہلی نے چند اہم تنقیدی، تحقیقی کتابوں کے جدید اڈیشن شائع کیے ہیں جن کے نام ہیں" رسوم دلّی" سید احمد دہلوی مرتب خلیق انجم" دلّی کا آخری دیدار" سید وزیر حسن دہلوی مرتب سید ضمیر حسن" دلّی کی آخری شمع" مرزا فرحت اللہ بیگ مرتب صلاح الدین. "بزم آخر" منشی فیض الدین مرتب کامل قریشی "قلعہ معلیٰ کی جھلکیاں" عرش تیموری مرتب اسلم پرویز.

ترقی اُردو بورڈ نے زیر تذکرہ سال میں کئی اہم کتابیں شائع کی ہیں جن میں "فسانۂ آزاد" رتن ناتھ سرشار (چار جلدیں)

"ناوابستگی" رشید الدین احمد" انسان اپنی تلاش میں" ارمولے" ترجمہ زاہدہ زیدی" ہندو فلسفہ ــــ مذہب اور معاشرت" ڈاکٹر سید حامد حسین" تحلیل نفسی کا اجمالی جائزہ. فرائڈ خاص طور پر قابل ذکر ہیں.

خدا بخش لائبریری نے" خدا بخش شعری دستاویز ۱۹۸۶ء" کے نام سے ایک شعری انتخاب شائع کیا ہے. نیاز فتح پوری نے ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک شاعروں کا ایک نمائندہ انتخاب تیار کیا تھا. لائبریری نے اب یہی انتخاب شاعروں کے فوٹو و سوانح کے ساتھ دوبارہ شائع کیا ہے.

"پہچان" معیاری شعر و ادب کا کتابی سلسلہ ہے. ۱۹۸۶ء کا شمارہ منظر آگیا ہے جس کے مرتبین ہیں ــ نعیم اشفاق اور عشرت بیتاب.

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے موصولہ اشعار

گزشتہ ماہ "ایوانِ اُردو دہلی" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر شائع کی گئی تھی اس کے عنوان کے طور پر قارئین نے صرف اشعار ہی تجویز کیے ہیں. موصولہ اشعار میں سے پسندیدہ چند اشعار بالترتیب درج ذیل ہیں:

سو جاؤ عزیزو کہ فصیلوں پہ ہر اک سمت ہم لوگ ابھی زندہ و بیدار کھڑے ہیں (نامعلوم)
مرسلہ: ناہید یاسمین، دہلی

دلاورانِ تیغ زن بڑھے چلو بڑھے چلو مجاہدانِ صف شکن بڑھے چلو بڑھے چلو (جوشؔ)
مرسلہ: رئیس اعظم، لکھنؤ

ہم وطن کے نوجواں ہیں ہم سے جو ٹکرائے گا وہ ہماری ٹھوکروں سے خاک میں مل جائے گا (شکیل بدایونی)
مرسلہ: قیصر جہاں، امروہہ

تم وطن کی شان ہو اے سرفروشانِ وطن ہے تمہارے خون سے شاداب بُستانِ وطن (فدا فاخری)
مرسلہ: محمد امین خاں، برہانپور

منظور وقار

گھبرائے ہوئے لوگ

پلنگ پر جب میں بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگا تو میری بیوی نے مجھ سے پوچھ ہی لیا "مہاویر! تم آج کل کچھ پریشان سے نظر آنے لگے ہو آخر کیوں ...؟"

"لکشمی! ایک بات بہت دنوں سے تم سے چھپاتا آرہا ہوں ... میں ایک سُرخ آنکھوں والے آدمی کو دیکھتے ہی گھبرا جاتا ہوں ... خوف سے میرے ہاتھ پیر کانپنے لگتے ہیں بہت کوشش کرتا ہوں کہ وہ نظر نہ آئے ... مگر ... وہ مجھے کہیں نہ کہیں نظر آ ہی جاتا ہے" میں نے ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔

"وہ آج تمھیں کہاں نظر آیا ...؟"

لکشمی کو میرے اس عجیب و غریب خوف سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔

"آج جب میں حسبِ معمول آفس کے بعد شام سبزی خریدنے کے لیے مارکیٹ میں داخل ہوا تو وہ گاہکوں کی بھیڑ میں پھنسا ہوا تھا۔ میری جب اس پر نظر پڑی تو مارے خوف کے میرا دل دھڑکنے لگا، اور ہاتھ پیر کانپنے لگے۔ وہ مجھے اپنی سُرخ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے مُسکرانے لگا۔ میں اس کی پُر اسرار مسکراہٹ کی تاب نہ لاسکا، اور فوراً مارکیٹ سے باہر نکل آیا۔" میری ان باتوں کو سُن کر لکشمی بھی کچھ خوف زدہ سی ہوگئی اُس کے خوب صورت چہرے پر بھی حیرت و استعجاب کے آثار نمودار ہوگئے۔ اس نے تھرتھراتی ہوئی آواز میں پوچھا "کیا وہ بہت بھیانک شکل و صورت کا آدمی ہے ... یا ... یا ... کوئی تمھارا دُشمن ...؟"

"نہیں لکشمی وہ تو ایک عام شکل و صورت کا آدمی ہے۔ میری اُس سے دُشمنی تو کیا جان پہچان بھی نہیں مگر اُس کی آنکھیں بڑی خوفناک ہیں جب وہ مُسکراتا ہے تو مجھے محسوس ہوتا ہے اُس کی مُسکراہٹ میرے وجود کو چھلنی کر دے گی۔"

"ایسا ہے تو پھر یہ ایک اتفاق ہی ہو سکتا ہے کہ وہ تمھیں کہیں نہ کہیں نظر آجاتا ہے۔ تم اُس اجنبی سے خواہ مخواہ گھبرانے لگے ہو ... وہ اگر تمھاری طرف دیکھ کر مُسکراتا ہے تو ہو سکتا ہے تمھیں جانتا ہو۔ اگر تم اُسے نہیں جانتے تو اس میں حیرت کی کون سی بات ہے ... ہم خود کئی لوگوں کو جانتے ہیں ... وہ ہمیں نہیں پہچانتے ... بھول جاؤ اس اجنبی کو اور آئندہ کہیں نظر بھی آجائے تو نظر انداز کر دو۔"

لکشمی کی باتیں واقعی درست تھیں اس کی باتوں نے میرے اندر ایک ہمت سی پیدا کر دی میں نے اُس کے خیال کو اپنے دماغ سے جھٹک ڈالا۔

کچھ دن بعد میں ہمیشہ کی طرح اپنے دفتر میں بیٹھا فائلیں دیکھ رہا تھا کہ ... ہمارے دفتر کے چپراسی رامو نے مجھے بتایا کہ ایک آدمی جس کی آنکھیں سُرخ ہیں وہ باہر کھڑا ہوا ہے پوچھنے پر بتاتا ہے کہ اُسے آپ سے ملنا ہے۔ میں لپک کر دفتر کے باہر آیا۔ بڑ کے پُرانے درخت کے نیچے کھڑے ہوئے آدمی پر میری نظر پڑی تو دل بُری طرح اچھلنے لگا ہاتھ پیر کانپنے لگے میں واپس دفتر میں آکر دھڑام سے اپنی کرسی میں گر پڑا۔ رامو سے ٹھنڈا پانی منگوا کر غٹا غٹ دو تین گلاس پانی پی گیا ... درخت کے نیچے وہی سُرخ آنکھوں والا آدمی کھڑا تھا جسے دیکھتے ہی خوف سے میرے ہاتھ پیر کانپنے لگتے ہیں۔

مکان نمبر ۲-۷-۱۳، ۵ محبوب نگر کالونی، گلبرگہ شریف۔

جس کی پُر اسرار مُسکراہٹ میری جان لینے لگتی ہے ... اُن چند لمحوں میں میرا تمام جسم پسینے میں ڈوب چکا تھا۔ راموبیری اُس اچانک بدلی ہوئی حالت کو دیکھ کر حیران تھا ... وہ سُرخ آنکھوں والا آدمی شاید میرا دشمن ہوگا یہ سوچ کر راموؔ نے اس آدمی کو وہاں سے بھگا دیا ... تقریباً ایک گھنٹہ گذر جانے کے بعد میں نارمل ہو گیا۔ اور شام تک میں اُس آدمی کو تقریباً بھول گیا۔

آفس کے بعد میں اُسی شام چھ بجے اپنے آفس کے دوست رمیشؔ کے ساتھ سینما چلا گیا۔ سینما ہال تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا ہم دونوں اپنے اپنے نمبر کی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ مگر میرے پیچھے کی ایک سیٹ خالی تھی شاید کوئی ٹکٹ خرید کر فلم دیکھنے کا ارادہ ترک کر چکا تھا۔ خیر کچھ بھی ہو مجھے کیا کوئی فلم دیکھے یا نہ دیکھے۔ میں تو آج کل معمولی معمولی باتوں پر خواہ مخواہ سوچنے لگا ہوں مجھے اپنے آپ پر ہنسی بھی آئی غصّہ بھی۔ جب صابن، ٹلکم پوڈر، لپ اسٹک، ٹوتھ برش اور ٹوتھ پیسٹ کے اکتا دینے والے ٹریلر ختم ہو گئے تو اصل فلم شروع ہوئی۔ فلم دلچسپ تھی، یوں تو فلم میں کوئی کامیڈین نہیں تھا مگر فلم کا ہیرو ہی کچھ ایسی مضحکہ خیز حرکتیں کر رہا تھا کہ تمام سینما ہال قہقہوں کی آواز سے گونج رہا تھا میں اور رمیشؔ بھی ہنستے ہنستے بے قابو ہو رہے تھے۔ قہقہوں کے درمیان ہی انٹرول ہو گیا۔ رمیشؔ کو پان کھا کر جگالی کرنے کی عادت تھی اس لیے وہ پان کھانے کے لیے سینما ہال کے باہر گیا۔ میں اپنی سیٹ پر بیٹھا سینما ہال کی دیواروں اور چھت کے نقش و نگار اور سجاوٹ کا جائزہ لینے لگا ... اچانک مجھے میرے پیچھے کی خالی سیٹ کا خیال آیا اور میں نے جب گردن گھما کر پیچھے دیکھا تو دل مارے خوف کے اچھل کر رہ گیا، ہاتھ پیر کانپنے لگے میں بجلی کی سی تیزی سے سینما ہال سے باہر نکل آیا ... میرے پیچھے کی خالی سیٹ پر وہی سُرخ آنکھوں والا آدمی بیٹھا میری طرف دیکھ کر مُسکرا رہا تھا جس کو دیکھ کر میرے ہاتھ پیر کانپنے لگتے ہیں۔ رمیشؔ باہر ایک پان شاپ کے قریب کھڑا پان چباتے ہوئے سگریٹ کے کش لے رہا تھا ... مجھے اس طرح اچانک سینما ہال سے نکلتے ہوئے دیکھ کر بولا "کیوں مہاویر تم اس طرح اچانک سینما ہال سے باہر کیوں چلے آئے کوئی خاص بات ہے کیا؟ کیا تمھیں بھی پان سگریٹ وغیرہ کچھ چاہیے ...؟"

"رمیشؔ تم تو جانتے ہی ہو مجھے پان سگریٹ کی عادت نہیں ... دراصل دوست وہ آدمی جسے دیکھتے ہی پتا نہیں کیوں مجھ پر ہیبت سی طاری ہو جاتی ہے وہ میرے پیچھے ہی بیٹھا ہوا تھا اُس پر جب میری نظر پڑی تو وہ مُسکرانے لگا میں اُس کی مسکراہٹ کی تاب نہ لا سکا اس لیے باہر نکل آیا" رمیشؔ نے ایک بلند قہقہہ فضا میں داغ دیا تو پان کے باریک باریک چھینٹے میرے سفید کپڑوں پر بکھر گئے "اچھا تو وہ آدمی ہمارے پیچھے ہی بیٹھا ہوا تھا جسے دیکھ کر تمھارے ہاتھ پیر کانپنے لگتے ہیں"

"کیا تمھیں یہ بات پہلے ہی سے معلوم تھی؟" میں نے قدرے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں! کل ہی لکشمی بھابی سے معلوم ہوا کہ تم آج کل ایک سُرخ آنکھوں والے آدمی سے خواہ مخواہ گھبرانے لگے ہو ... مہاویر تم ایک تعلیم یافتہ اور چھ بچّوں کے باپ ہو کر بھی بچّوں کی طرح ایک انجان آدمی سے ڈرنے لگے ہو۔ شرم کی بات ہے۔ ایسا لگتا ہے تم نفسیاتی مریض ہونے جا رہے ہو، خیر کچھ بھی ہو چلو میں بھی دیکھتا ہوں وہ کون ہے جو تمھیں ڈرنے پر مجبور کر رہا ہے" رمیشؔ مجھے تقریباً گھسیٹتے ہوئے سینما ہال میں لے گیا ... مگر وہ تو اب وہاں نہیں تھا ... فلم کے اختتام تک وہ نہیں آیا ... انٹرول کے بعد کی ڈیڑھ گھنٹے کی فلم میں نہیں دیکھ پایا کیوں کہ میں بار بار گردن گھما کر اپنے پیچھے کی اس خالی سیٹ کی جانب دیکھتا تھا جس پر انٹرول سے پہلے سُرخ آنکھوں والا آدمی بیٹھ چکا تھا۔

ادھر چند برسوں سے میں آفس کے بعد ایک کمیشن ایجنٹ کی فرم میں جز وقتی نوکری کرتا آرہا تھا ... میں حسبِ معمول اپنے کام میں مصروف تھا کہ ... میری نظر سڑک پر پڑی دل دھڑکنے لگا ہاتھ پیر کانپنے لگے ... اس لیے کہ سڑک پر وہی سُرخ آنکھوں والا آدمی کھڑا میری طرف دیکھ کر مُسکرا رہا تھا جسے دیکھ کر میرے ہاتھ پیر خود بخود کانپنے لگتے ہیں۔ اُس وقت میں نے اپنے آپ میں اس بات کا فیصلہ کر لیا کہ میں آج اس سے ہرگز نہیں گھبراؤں گا البتّہ اس سے یہ ضرور دریافت کروں گا کہ وہ کون ہے کہاں رہتا ہے اور وہ مجھے دیکھ کر کیوں مُسکراتا ہے ...؟ میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر باہر آنا ہی چاہتا تھا کہ اُسی وقت سٹی بس آکر اُس آدمی کے قریب رُکی اور وہ بس میں سوار ہو کر یہ جا وہ جا۔ میں نڈھال پسینے میں شرابور آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا گھر کی جانب بڑھنے لگا ... دل و دماغ میں اُسی کا خوف اور خیال چھایا ہوا تھا آخر وہ کون ہے ...؟ کون ہے ...؟ کون ہے ...؟

کچھ کچھ یاد آنے لگا تھا کہ میں اُسے جانتا ہوں جب سے میں نے جنم لیا ہے وہ میرا تعاقب کر رہا ہے۔ نہیں نہیں وہ میرا نہیں میں ہی ایک ربع صدی سے اس کا تعاقب کر رہا ہوں مگر کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟ یہ سوال میرے ذہن کو ہتھوڑے مارنے لگا تھا کہ ایک بُلند آواز نے میرے قدموں کو روک دیا میں نے پلٹ کر دیکھا تو خوشی سے اچھل پڑا میرے سامنے میرے بچپن کا دوست امجد کھڑا تھا... ہم دونوں فرطِ مسرّت سے ایک دوسرے سے لپٹ گئے پھر ہم دونوں ایک ریستوران میں داخل ہو کر خالی کیبن میں بیٹھ گئے... ہم ایک طویل عرصے کے بعد مل رہے تھے لہٰذا ہم دونوں کے درمیان بہت سی باتیں ہوئیں کاروبار کی... نوکری کی... شادی بیاہ کی... بچّوں کی... سیاست کی... مکانات کی تنگی اور بڑھتے ہوئے کرائے کی امجد نے بتایا کہ وہ پہلے پہل ایک تیل کے کارخانے میں بہ حیثیت کلرک شریک ہوا اور ترقّی کرتے کرتے کارخانے کا ہاف پارٹنر بن گیا. اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کے پاس موٹر کار، بنگلہ، خوب صورت بیوی اور تین بچّے بھی ہیں۔ میں بہت ساری باتیں اس سے دریافت کرنے کے بعد بولا "امجد تم واقعی بہت خوش قسمت ہو بھگوان نے تمھیں دولت، سکون اور آرام سب کچھ دیا ہے تمھیں کسی کا خوف ہے اور نہ کوئی پریشانی" اتنا کہہ کر میں اپنی عجیب و غریب پریشانی کا ذکر کرنے ہی والا تھا کہ اچانک امجد کا چہرہ مرجھا گیا ہونٹ خشک ہو گئے وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا "مہاویر اللہ کے فضل و کرم سے اور سب کچھ تو ٹھیک ہے مگر تمھیں یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ میں آج کل ایک عجیب و غریب پریشانی میں مبتلا ہوں، ایک آدمی ہے جس کی آنکھیں سُرخ ہیں مگر شکل و صورت عام انسانوں جیسی ہے میری اُس سے کوئی جان پہچان نہیں مگر اُسے دیکھتے ہی میرا دل دھڑکنے لگتا ہے اور ہاتھ پیر کانپنے لگتے ہیں وہ آدمی کہیں نہ کہیں مجھے ضرور نظر آجاتا ہے، وہ جب بھی مجھے دیکھتا ہے مُسکراتا ہے اس کی مُسکراہٹ بڑی پُراسرار ہوتی ہے میں اپنی اس پریشانی کا ذکر جب بھی کسی سے کرتا ہوں تو سب ہنسنے لگتے ہیں اور میرا مذاق اڑایا جاتا ہے" امجد نے جب اپنی بات پوری کی تو ادھر میں بھی پسینے میں ڈوب چکا تھا اور میرے ہونٹ خشک ہو چکے تھے امجد میری اس اچانک بدلی ہوئی حالت کو دیکھ کر حیران تھا اور میں بھی امجد کا خوف زدہ چہرہ تک رہا تھا اور ہم دونوں ہی کے ہاتھ پیر ایک ساتھ کانپ رہے تھے...!!!

سپاہ اور تنخواہ

مغلیہ سلطنت گھٹتے گھٹتے اور سکڑتے سکڑتے لال قلعے کی چار دیواری میں ٹھٹھر کر رہ گئی۔ دانایانِ فرنگ کی تدبیر و شمشیر سے کوئی راجہ، کوئی حاکم، کوئی رئیس، کوئی نواب عہدہ برآنہ ہو سکا۔ شاہ عالم بادشاہ نے فرنگیوں کو بیٹا بنا لیا، ان کی دی ہوئی پنشن کو اللہ آمین کر کے قبول کر لیا، کیوں کہ مرتا کیا نہ کرتا۔ جان بچی لاکھوں پائے۔ ایک شاہ عالم بادشاہ کے دل میں فرنگیوں نے گھر نہیں کر لیا تھا بلکہ ہندوستانی عموماً انھیں اچھا جاننے لگے تھے اور ان کی سپاہ اور شاہراہ اور تنخواہ کی بچے بچے کی زبان پر تعریف تھی۔ یعنی فرنگیوں کی فوج جرّار ہوتی ہے۔ دس ہزار پر ایک ہزار بھاری ہوتی ہے۔ شاہراہ یعنی کلکتہ سے جہاں تک ان کی حکومت ہے پکّی سڑک، اور سڑک کے ساتھ ساتھ ریل اور ڈاک بھی اڑی چلی جاتی ہے، اور تین دن میں خط پتّر ملک کے اس سرے سے اُس سرے تک پہنچا دیتی ہے۔ تنخواہ کی تعریف یہ ہے کہ جسے نوکر رکھتے ہیں اُس کا درماہہ یا طلب یا وظیفہ بے قال، بے چون و چرا پہلی کی پہلی کو دے دیتے ہیں، راجہ مہاراج نواب اور بادشاہوں کی سرکار سے نوکر کی تنخواہ تین تین برس نہیں ملتی تھی اور نوکر کا گھرانے کا گھرانہ فاقے کر کے برباد ہو جاتا تھا۔

— سید ناصر نذیر فراق (لال قلعے کی ایک جھلک)

تنویر احسن

ومبلڈن: آغاز سے آج تک

ٹینس کی دُنیا کا سب سے بڑا میلہ ومبلڈن لندن میں آج سے ۱۱۰ سال پہلے ۱۸۷۷ء میں شروع ہوا۔ اُس وقت اس میں کُل ۲۲ کھلاڑیوں نے حصّہ لیا تھا اور دیکھنے والوں کی تعداد ... سو تھی۔ دیکھنے والے کھیل سے زیادہ رس بیری اور آئس کریم کھانے میں لُطف لے رہے تھے، کیونکہ میدان کے بیچ میں جو کھلاڑی کچھ زیادہ ہی ڈھیلی ڈھالی پتلونیں پہنے کھیل رہے تھے ان کا کھیل اتنا مزیدار اور تیز نہ تھا جتنا آج کل ہوا کرتا ہے۔ اور اس سارے تماشے کو دیکھنے کے لیے ٹکٹ کی کُل قیمت تھی ایک شیلنگ۔ اُس سال یعنی ۱۸۷۷ء میں ومبلڈن کے سب سے پہلے چیمپئن ہوئے ایم گورے۔ ومبلڈن جیتنے کے بعد گورے نے یہ کہہ کر ٹینس کھیلنا چھوڑ دیا کہ اس کھیل میں لُطف نہیں آتا اور پھر کرکٹ میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔

آج ۱۱۰ سال بعد بھی ومبلڈن میں رس بیری اور آئس کریم اتنی ہی ضروری ہے جتنی پہلے تھی۔ بنا رس بیری کھائے ومبلڈن دیکھنے کی بات کوئی سوچ ہی نہیں سکتا لیکن سوائے اس کے اور سب کچھ بدل چکا ہے۔ ڈھیلی ڈھالی پتلون کی جگہ چُست نیکر اور ٹی شرٹ نے لے لی ہے۔ تماشائیوں کی تعداد دو سو سے بڑھ کر بیس سے بائیس ہزار ہو گئی ہے۔ ٹکٹ کی قیمت ایک شیلنگ سے بڑھ کر دس ڈالر، پچاس ڈالر اور ڈیڑھ سو ڈالر تک پہنچ گئی ہے لیکن سب سے زیادہ تبدیلی جیتنے والے کھلاڑی کو انعام کا دیا جانا ہے۔ ۱۸۷۷ء میں انعام کے طور پر کچھ بھی نہیں ملتا تھا جبکہ آج ایک جیتنے والے کھلاڑی کو ۳۵ لاکھ روپے اور ویمنس سنگل جیتنے والی کھلاڑی کو ۳۰ لاکھ روپے ملتے ہیں۔

ومبلڈن میں اور بھی میچ ہوتے ہیں جیسے ڈبلس (مردوں اور عورتوں کا) اور مکس ڈبلس جسے ہم ملا جُلا ڈبل بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس میچ میں ایک طرف ایک مرد اور ایک عورت اور دوسری طرف بھی ایک مرد اور ایک عورت مدِّمقابل ہوتے ہیں۔ ان میچوں کی پیسہ کمانے کے سوا اور کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اہمیت اور پسندیدگی کے حامل صرف سنگلس میچ ہوتے ہیں چاہے مردوں کا ہو چاہے عورتوں کا۔ لیکن تقریباً سبھی کھلاڑی اس خیال سے کہ اگر سنگلس میں ہار گئے تو ڈبلس یا مکس ڈبلس میچوں میں آگے بڑھنے اور پیسہ ملنے کی اُمید رہے گی کھیلتے ہیں۔ کتنے ہی ایسے بہترین کھلاڑی ٹینس نے پیدا کیے جن کا کوئی ثانی نہیں لیکن ان میں بہت سے ومبلڈن نہیں جیت پائے۔ اس کی ایک تازہ مثال آج کا نمبر ایک کھلاڑی ایوان لنڈل ہے وہ پچھلے تین سال سے دُنیا کا نمبر ایک کھلاڑی ہے اور پانچ سال سے ومبلڈن میں اپنی قسمت آزما رہا ہے لیکن ایک بار بھی اسے فتح نصیب نہیں ہوئی۔ وہ ومبلڈن ٹرافی کے بدلے میں امریکن اوپن (U. S. OPEN) یا فرینچ اوپن (FRENCH OPEN) ٹرافی دینے کے لیے بھی تیار ہے۔ دراصل ومبلڈن گھاس کے میدان میں کھیلا جاتا ہے اور لنڈل کلے کورٹ یا مٹی کے میدان پر کھیلنے والے کھلاڑی ہیں اسی لیے وہ ومبلڈن جیت نہیں پا رہے ہیں۔ ایک بار جب وہ ومبلڈن میں ہارے تو انھوں نے چڑ کر کہا تھا "گھاس گائے کے کھانے کے

لیے ہوتی ہے ٹینس کھیلنے کے لیے نہیں"، لیکن آج وہ اسی ٹرافی کو حاصل کرنے کے لیے اپنی دوسری ٹرافیاں دینے کو تیار ہیں۔ اسی سے ہمیں فرق محسوس ہوتا ہے اس ومبلڈن کا جو ۱۸۷۷ء میں گورے نے جیتا اور آج کے ومبلڈن کا۔

دُنیا میں فی الحال چار بڑے ٹورنامنٹ ہیں جن کے نام ومبلڈن، امریکن اوپن، فرینچ اوپن اور آسٹریلین اوپن ہیں۔ ان چاروں ٹورنامنٹ جیتنے والے کھلاڑیوں کو زیادہ پیسہ اور عزت ملتی ہے۔ ان میں صرف ایک یعنی ومبلڈن ہی گھاس پر کھیلا جاتا ہے۔ بقیہ تینوں ٹورنامنٹ مٹی کے میدان پر کھیلے جاتے ہیں۔ گھاس کے میدان پر گھاس اُگی ہوتی ہے اور کلے کورٹ یا ہارڈ کورٹ ایک خاص قسم کی مٹی سے بنا ہوتا ہے جو فرش کی طرح سخت ہوتی ہے۔ گھاس کے میدان پر کھیل بہت تیز ہوتا ہے اور زیادہ لمبی ریلی دیکھنے کو نہیں ملتی (لمبی ریلی کا مطلب ہے: ایک سروس پر دونوں کھلاڑی بہت دیر تک ایک دوسرے کے پاس گیند پھینکتے رہیں جب تک کہ گیند کورٹ سے باہر نہ چلی جائے یا نیٹ سے نہ ٹکرا جائے)۔ گھاس کے میدان پر گیند کافی نیچی رہتی ہے اور کھلاڑی سروس کرتے ہی نیٹ کی طرف بھاگتا ہے، دوسرے کھلاڑی کو دھوکا دے کر گیند اس کی پہنچ سے باہر مارنے کے لیے۔ اسی لیے گھاس پر لمبے کھیل کی اُمید بہت کم رہتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ گھاس کے کھیل کو سرو اور وولی (SERVE & VOLLY) یعنی "سروس کرو اور بھاگو" کا کھیل بھی کہتے ہیں۔

کلے کورٹ یا مٹی کے میدان میں کھیل کافی لمبا چلتا ہے گیند کافی اُونچی رہتی ہے اور کھلاڑیوں کو کورٹ کے پچھلے حصے میں رہتے ہوئے کافی بھاگ دوڑ کرنی ہوتی ہے اسے بیس لائن گیم (BASE LINE GAME) بھی کہتے ہیں کیونکہ اس میں کھلاڑی زیادہ تر بیس لائن کے پاس یا کورٹ کے پچھلے حصے میں ہی رہتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ وہیں سے دوسرے کھلاڑی کے کورٹ میں کوئی خالی جگہ ڈھونڈ کر اپنا شارٹ جمائے۔ گھاس اور مٹی کے میدانوں پر اس بنیادی فرق نے دُنیا کے تمام کھلاڑیوں کو بانٹ دیا ہے اور ہر کھلاڑی پر آج یہ لیبل چسپاں ہو گیا ہے کہ فلاں گھاس کے میدان کا کھلاڑی ہے تو فلاں مٹی کے میدان کا لیکن بہت سے ایسے بھی کھلاڑی ہوتے ہیں جن پر میدان کا کوئی اثر نہیں پڑتا اور وہ اپنا کھیل ہر میدان کے مطابق کھیلتے ہوئے صحیح معنوں میں عظیم بن جاتے ہیں۔ ان میں ایک کھلاڑی کا نام سرِفہرست ہے اور وہ ہیں سویڈن کے جان بورگ (BJORN BORG)۔ جنھوں نے گھاس پر جہاں لگاتار پانچ ومبلڈن جیتے وہیں مٹی کے میدان پر چھ فرینچ اوپن جیت کر اپنے آپ کو ٹینس کی دُنیا کا بے تاج بادشاہ بنا لیا۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد جہاں پوری دُنیا میں سیاسی، سماجی اور معاشی تبدیلیاں ہوئیں وہیں کھیل بھی متاثر ہوئے ۱۹۴۵ء کے بعد پیسے کا اثر ٹینس پر کافی بڑھتا چلا گیا۔ نئے نئے ٹورنامنٹ شروع ہوتے جن میں کھلاڑیوں کو اچھی خاصی دولت ملنے لگی۔ لیکن ومبلڈن پر پیسے کا زیادہ اثر نہیں پڑا۔ ومبلڈن پہلے ہی کی طرح معمولی انعام پر چلتا رہا لیکن ۱۹۶۰ء کے آس پاس پیشہ ور کھلاڑیوں کو لگا کہ اس ٹورنامنٹ کا معاشی اعتبار سے کوئی فائدہ نہیں ہے اور ۱۹۶۳ء میں سارے پیشہ ور کھلاڑیوں نے ومبلڈن کا بائیکاٹ کر دیا۔ یہ اس ٹورنامنٹ کے لیے ایک شدید صدمہ تھا کیونکہ ان کھلاڑیوں میں دُنیا کے ماہر کھلاڑی شامل تھے۔ ومبلڈن کے منتظمین کو جھکنا پڑا اور اس کے ساتھ ہی یہاں بھی پیسے کا زور بڑھتا گیا۔ آج یہ ٹورنامنٹ دُنیا کا سب سے مہنگا ٹورنامنٹ ہے کیوں کہ ومبلڈن جیتنے کے بعد کھلاڑی کو صرف ۳۵ لاکھ روپے ہی نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں روپے کے کونٹریکٹ بھی ملتے ہیں۔ آج کتنی ہی ایسی بڑی بڑی کمپنیاں ہیں جیسے پُوما، آدی داس، ڈنلپ اور سلینجر جو اُونچے کھلاڑیوں کو اپنا بنایا ہوا سامان جیسے کھیل کے ریکٹ، جُوتے، نیکر، ٹی شرٹ، کلائی اور بالوں پر باندھنے کی پٹی وغیرہ تو مفت دیتی ہی ہیں، اس سامان کے استعمال کے لئے بھی انھیں لاکھوں کا معاوضہ دیتی ہیں ہوتا یوں ہے کہ دُنیا کے جو دس بڑے کھلاڑی ہوتے ہیں، یہ بڑی کمپنیاں انھیں اپنے وابستہ کرنے کی دوڑ میں لگ جاتی ہیں اور ہیں کہ ہمارا سامان استعمال کرو بدلے میں تمھیں لاکھوں ڈالر دیں گے یہ سمجھوتہ ایک سے لے کر پانچ سال کے وقفے تک کا ہوتا اس سے ان کمپنیوں کا مقصد اپنے سامان پبلسٹی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ومبلڈن پر بیٹھے ہوئے بائیس ہزار لوگ

کھلاڑیوں کو اس سامان کے ساتھ نہیں دیکھتے بلکہ ٹی وی کے ذریعے دُنیا بھر کے ٹاپ کھلاڑیوں کو یہ چیزیں استعمال کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہ تو کھلاڑیوں اور کمپنیوں کا معاملہ ہوا۔ اب رہا یہ سوال کہ ومبلڈن کے منتظمین کی کمائی کی کیا صورت ہوتی ہے تو ومبلڈن کی کمائی کے لیے ایک ذریعہ تو گیٹ ٹکٹ ہے دوسرے ومبلڈن ساری دُنیا کی پرائیوٹ اور گورنمنٹ ٹی وی ایجنسیوں کو براہِ راست میچ دکھانے کے RIGHTS بیچتا ہے۔

ابھی ایک سال پہلے دو بار ومبلڈن جیتنے والے دُنیا کے سب سے کم عمر کھلاڑی بورس بیکر (BORIS BECKER) کو کھیل کا سامان بنانے والی ایک کمپنی پُوما نے صرف اپنا جوتا چار سال پہننے کے لیے بیس لاکھ ڈالر کا کونٹیکٹ دیا۔ ٹینس کے کھیل میں پیسے کا کتنا دخل ہے۔ ان سب باتوں سے آپ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

جب سے ٹینس کے کھیل میں پیسہ آ گیا ہے کھلاڑیوں کے رویّے میں زبردست فرق آیا ہے۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ اگر ایمپائر غلطی سے کسی کھلاڑی کے حق میں فیصلہ دیتے تھے اور وہ پوائنٹ اس کا نہیں ہوتا تھا تو وہ ایمپائر کو اس کی غلطی سے آگاہ کرتے ہوئے ملا ہوا پوائنٹ لوٹا دیا کرتا تھا مگر اب یہ منظر معدوم ہو چکا ہے۔ کھلاڑی شہرت اور پیسے کی خاطر ہر اس پوائنٹ کو اپنا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے جو صاف صاف اس کے حق میں نہیں نظر آتا۔ اس کے لیے اگر ضرورت پڑے تو وہ ایمپائر سے لڑ پڑتا ہے اپنے ریکٹ کو زمین پر پٹک کر لوگوں کی طرف مُنہ کر کے گالیاں دے کر وہ اپنے غصّے کا اظہار کرنے لگتا ہے۔

یوں تو ومبلڈن میں شروع سے ہی ایک سے ایک بہتر کھلاڑی نے اپنے کھیل کا مظاہرہ کیا اور خطابات جیتے ہیں لیکن اس وقت ہم سب کھلاڑیوں کا ذکر یہاں نہیں کر سکتے۔ ہم گذشتہ دس بارہ سال کے بہترین کھلاڑیوں کا ہی ذکر کریں گے۔ اس دوران جس کھلاڑی کا نام سب سے زیادہ مقبول ہوا وہ ہے سویڈن کا جان بورگ۔ اس کھلاڑی نے ۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۰ء تک لگاتار ۵ بار ومبلڈن خطاب جیتا یہ ایک عالمی ریکارڈ ہے جس کو توڑنے کے لیے تمام کھلاڑی کوشاں ہیں۔ جان بورگ نے آٹھ سال تک ومبلڈن کھیلا اور اس دوران وہ صرف تین ہی کھلاڑیوں سے ہارا۔ ان کے نام جمی کارنرس، جان میکنرو اور آرتھر ایشے ہیں۔ جمی کارنرس نے دو بار، جان میکنرو نے تین بار اور آرتھر ایشے نے ایک بار ومبلڈن خطاب جیتا۔ آرتھر ایشے پہلے اور اب تک اکیلے سیاہ فام کھلاڑی ہیں جنھوں نے ومبلڈن جیتا۔ ان تینوں کو چھوڑ کر دُنیا کا اور کوئی کھلاڑی ومبلڈن میں بورگ کو نہیں ہرا سکا۔ بورگ پرائیوٹ کمپنی میں کام کرنے والے ایک کلرک کا لڑکا ہے۔ جب بورگ کے والد نے اپنی کمپنی کی طرف سے کھیلتے ہوئے ایک چھوٹی سی چیمپین شپ جیتی تو انھیں ٹینس کا ریکٹ بطور انعام ملا، بورگ اسی ریکٹ سے پریکٹس کرنے لگا۔ اس کی ماں ہمیشہ اسے ٹوکا کرتی تھی کہ یہ کھیل مت کھیلو اور کچھ کام کر کے پیسے کماؤ لیکن بورگ دُھن کا پکّا تھا ایک بار پھر جب اس کی ماں نے اسے ٹوکا تو اس نے ہندی فلم کے ہیرو کی طرح جواب دیا "ماں میں تمھیں اسی ریکٹ سے اتنا پیسہ کما کر دوں گا کہ تمھارے پاس رکھنے کو جگہ نہ ہوگی" اور پھر بورگ نے اپنی کہی بات پوری کر کے دکھا دی۔ اسی ریکٹ سے کروڑوں روپے کمائے اور ۱۹۸۱ء میں صرف ۲۶ سال کی عمر میں ٹینس کے مقابلوں سے ریٹائرمنٹ لے لی۔ آج بھی بورگ صرف نمائشی میچ کھیل کر سالانہ بیس لاکھ روپے سے اوپر کما لیتا ہے۔

جمی کارنرس کا ذکر بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا بورگ کا۔ جمی کارنرس امریکہ کا ۳۴ سالہ کھلاڑی ہے اور اسے ومبلڈن کھیلتے ہوئے تقریباً ۱۸ سال ہو گئے ہیں لیکن اس میں اب بھی اتنا دم ہے کہ وہ آج بھی ومبلڈن کے کوارٹر فائنل یا سیمی فائنل تک آسانی سے پہنچ سکتا ہے ومبلڈن خطاب وہ صرف دو بار ہی جیت سکا ہے لیکن ہر میچ پوری لگن سے کھیلتے ہوئے جیتنے کی کوشش کرتا ہے۔ جان بورگ کا کارنرس کے بارے میں کہنا ہے کہ "یہ کھلاڑی تب تک کھیلتا رہے گا جب تک کوئی آ کر اس سے یہ نہیں کہہ دیتا کہ سنو بھائی اب تم بس کرو اب تم اور نہیں کھیل سکتے۔"

اس کے بعد امریکہ ہی کے اور ایک مایۂ ناز کھلاڑی جان میکنرو کا نام آتا ہے جس نے تین بار ومبلڈن جیتا ہے اس کی جیت کا ریکارڈ اور ہوتا اگر وہ لڑائی

جان میلنرو

یا گالی گلوچ میں اتنی زیادہ دلچسپی نہ دکھاتا وہ ایک بہترین مگر بدنام کھلاڑی ہے۔ اس کے جھگڑالو پن نے اس کے کھیل کو حد سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ بورگ کو ٹینس سے ریٹائرمنٹ دلوانے کا سہرا اسی کے سر ہے۔ آج کل وہ دوبارہ ومبلڈن میں آنے کے لیے جی جان سے کوشش کر رہا ہے۔

اس کے بعد نام آتا ہے ویسٹ جرمنی کے کم عمر کھلاڑی بورس بیکر کا۔ اس لڑکے نے جب ۱۹۸۵ء میں صرف ۱۷ سال کی عمر میں ومبلڈن خطاب جیتا تو ساری دنیا میں ایک تہلکہ سا مچ گیا کیوں کہ تب تک بورس بیکر کو کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ یہ خطاب جیت کر اس نے ایک ساتھ دو عالمی ریکارڈ بنائے۔ اوّل: سب سے کم عمر کھلاڑی کا ومبلڈن جیتنا۔ دوسرے: بنا کسی درجے (RANKING) کا کھلاڑی ہوتے ہوئے ومبلڈن جیتنا۔ پچھلے سال ۱۹۸۶ء میں اس نے دوبارہ ومبلڈن جیتا اور اس وقت ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ لڑکا جان بورگ کا لگاتار ۵ بار ومبلڈن جیتنے کا عالمی ریکارڈ برابر کر سکتا ہے۔ لیکن ان دو لگاتار جیتوں نے اس کا دماغ اتنا خراب کر دیا کہ اس سال حد سے زیادہ اعتماد کے نشے میں چور ہو کر وہ ومبلڈن کے دوسرے راؤنڈ میں ہار گیا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ بورس بیکر ایک بہترین کھلاڑی ہے اور وہ آنے والے برسوں میں ومبلڈن خطاب جیتتا ہوا ملے گا۔

سب سے آخر میں ومبلڈن کے ۱۹۸۷ کے چیمپئن آسٹریلیا کے ۲۲ سالہ پیٹ کیش (PAT CASH) کا نام آتا ہے۔ جس نے ۱۷ سال بعد آسٹریلیا کو یہ خطاب جتوایا ہے۔ اس سے پہلے ۱۹۷۰ء میں آسٹریلیا کی طرف سے ومبلڈن جیتنے والے آخری کھلاڑی نیوکومب تھے۔ پچھلے سال پیٹ کیش کا دنیا میں ۴۰۳ واں نمبر تھا لیکن اب پیٹ کیش آسٹریلیا کا ہیرو ہے۔ اس کی زندگی پر مبنی فلم بھی بنائی جا رہی ہے۔ سڑکوں اور چوراہوں پر آسٹریلیا میں روزانہ اس کے شو ہوتے ہیں۔ ناروے کی ماڈل بریتی (BRIETTE) اس کی بیوی ہے اور ایک ۱۴ ماہ کا لڑکا ڈینیل بھی ہے۔

دیکھیے اگلے سال ومبلڈن چیمپئن کون بنتا ہے!

نئی کتابیں

پشکن کے دیس میں ○ سائنس کی باتیں ○ حرف حرف آئینہ ○ دیوانِ حالی ○ محرّک ○ احساس کے پھول ○ ادبی تنقید کے اصول

پشکن کے دیس میں (سفرنامہ)

مصنف: جگن ناتھ آزاد
سائز: $\frac{18 \times 22}{8}$، صفحات: ۱۰۴
قیمت: ۲۵ روپے
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی

پروفیسر جگن ناتھ آزاد شاعر بھی ہیں، ادیب بھی اور ماہرِ اقبالیات بھی۔ نظم و نثر میں ان کی جتنی بھی کتابیں شائع ہوئی ہیں، اہلِ ذوق نے انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے اور ان کتابوں کے صفحات پر آزاد صاحب کی تخلیقی اور تحقیقی صلاحیتوں نے جو پائدار نقش ثبت کیے ہیں ان کا وزن و وقار پوری اُردو دُنیا میں محسوس کیا گیا ہے۔

آزاد صاحب کی علمی مصروفیتوں کا ایک حصہ وہ غیر مُلکی دورے بھی ہیں جو وہ عالمی ادبی تقریبات میں شرکت کی غرض سے وقتاً فوقتاً کرتے رہے ہیں۔ وہ جہاں جہاں بھی گئے ہیں کچھ یادیں لے کر واپس ہوئے ہیں جن میں علم و ادب کے شائقین کو شریک کیا جا سکتا ہے اور وہ اپنے سفرنامے قلم بند کر کے ایسا کرتے بھی رہے ہیں۔ یہ سفرنامے مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب ان کے سفرِ رُوس کے حالات پر مبنی ہے جہاں وہ ۲۱ دن تک سرکاری مہمان کی حیثیت سے مقیم رہے اور سرکاری اہتمام میں انھوں نے اس وسیع و عریض ملک کے مختلف حصّوں کی سیاحت کی۔

جیسا کہ آزاد صاحب نے "حرفِ اوّل" میں لکھا ہے، وہ رُوسی انقلاب اور اس کی فتوحات سے لڑکپن ہی سے متاثر ہیں اور اس ملک کے لیے اپنے دِل میں عقیدت کا جذبہ محسوس کرتے ہیں۔ نوعمری کی یہ تاثر پذیری اس کتاب کے ہر صفحے پر اپنی جھلک دِکھاتی ہے اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ مشاہدات ایک متجسّس ناظر کے نہیں، ایک ارادت مند زائر کے ہیں۔ رُوس میں ادیبوں اور شاعروں کو جو مراعات حاصل ہیں آزاد صاحب نے ان کا بہ طورِ خاص ذِکر کیا ہے اور اس کا موازنہ ان حالات سے کیا ہے جن میں ہندوستان کے ادیب یا شاعر زندگی گزارتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اگر اقبالؔ یا پریم چند ہندوستان کی جگہ رُوس میں پیدا ہوئے ہوتے تو نہ اقبالؔ کو آخری عمر میں ایک قدر داں والیِ ریاست سے وظیفہ حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی نہ پریم چند فلاکت کی موت مرتے لیکن یہ سب کچھ لکھتے ہوئے آزاد صاحب کی نظر ان قدغنوں کی طرف نہیں گئی جو رُوسی مصنّفوں اور دانشوروں کے ذہن و ضمیر پر لگائی جاتی رہی ہیں اور جن کا ذِکر خود پاسترناک اور سولزے نتسن جیسے رُوسی ادیبوں نے کیا ہے۔ اگر آزاد صاحب جویائے حق کی نظر سے کام لیتے تو یہ کتاب [illegible] معنی میں ان کتابوں سے مختلف ہوتی جو اس نوع کی سیاحتوں کے بعد اکثر اہلِ قلم حضرات چھپواتے رہے ہیں، بصورتِ موجودہ اس کا امتیاز صرف اتنا ہی ہے کہ یہ آزاد صاحب کے قلم کی مرہونِ منّت ہے اور ان کے دلکش طرزِ تحریر سے ہمیں لُطف اندوزی کا موقع بخشتی ہے۔

——— مخمور سعیدی

سائنس کی باتیں

مصنف: ڈاکٹر محمد اسلم پرویز
سائز: $\frac{18 \times 22}{8}$، صفحات: [illegible]
قیمت: ۳۰ روپے
[illegible]

"سائنس کی باتیں" کے مضامین کا مَیں نے

جستہ جستہ مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ اُردو میں شائع ہونے والی سیکڑوں نیم ادبی اور نیم مذہبی کتابوں سے زیادہ وقیع اور کارآمد کتاب ہے۔ ہماری زندگی کے ہر شعبے میں آج سائنس اور ٹیکنالوجی اہم ترین رول ادا کر رہی ہیں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم سائنس اور اس کی دی ہوئی سہولتوں سے فیض تو اُٹھاتے ہیں لیکن ان کی ماہیت سے ذرا بھی واقفیت نہیں رکھتے۔ سائنسی مزاج تو دُور کی بات ہے سائنسی انکشافات اور ترقیات کے بارے میں ہم ابتدائی معلومات بھی نہیں رکھتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ذہنی اور فکری طور پر ہم انیسویں صدی میں رہتے ہیں اور مادی طور پر بیسویں صدی میں۔ اور یہ خلیج دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے، جس کے المناک نتائج کا سامنا ہمیں بہت سی شکلوں میں کرنا پڑ رہا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم بدلتی ہوئی زندگی کے معروضی حقائق کے بارے میں کوئی علمی اور غیر جذباتی رویّہ اختیار کرنے سے معذور ہیں۔

اس لیے ڈاکٹر اسلم پرویز صاحب دِلی تہنیت کے مستحق ہیں کہ وہ اُردو والوں کی سب سے بڑی ضرورت کو پورا کرنے کی دُھن میں لگے ہیں اور اُردو کے قارئین میں سائنسی آگہی کی مشعل جلانے کی پُرخلوص کوشش کر رہے ہیں۔

اس کتاب میں شامل مضامین ہمارے اردگرد کی زندگی کے مختلف پہلو[illegible] سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے بارے میں [illegible]ہ ترین اور مستند علمی معلومات فراہم کر[illegible]یں۔ اہم بات یہ ہے کہ اتنے خشک اور بے کیف موضوعات پر انھوں نے نہایت سادہ اور شگفتہ اسلوب میں اظہارِ خیال کیا ہے بلکہ کہیں کہیں تو ان کی عبارت میں ادبیت کی شان پیدا ہو گئی ہے۔

ضرورت اس کی ہے کہ اکادمیاں اور دوسرے اشاعتی ادارے سائنس کے مسائل پر لکھی ہوئی ایسی کتابوں کی ترجیحی طور پر حوصلہ افزائی کریں۔ جتنی زیادہ تعداد میں ایسی کتابیں شائع ہوں گی سائنسی علم و آگہی میں اتنا ہی اضافہ ہوگا۔ سائنسی عرفان کی یہ روشنی انسان دوستی کے ایک نئے تصوّر کو جنم دیتی ہے۔ جو کم از کم توہم پرستی، ظلمت پرستی، علیحدگی پسندی اور فرقہ پرستی کے جذبات اور تصوّرات سے پاک ہوتا ہے۔

——— قمر رئیس

حرف حرف آئینہ
شاعر: مختار شمیم
صفحات: ۸۰ قیمت: ۱۴ روپے
ملنے کا پتا اور ناشر: مدھیہ پردیش اُردو اکادمی بھوپال۔

مختار شمیم ان محققین میں ہیں جن کا تحقیقی کام [میری ناقص معلومات کی حد تک] ان الزامات سے بری ہے جن سے اُردو تحقیق کی موجودہ مخدوش صورتِ حال میں کم ہی محقق بچ سکے ہیں ان کا دامن وسیع استفادے کے نام پر سرقے اور دیگر تحقیقی اصولوں اور علمی و اخلاقی ضابطوں کی پامالی سے داغدار نہیں ہوا ہے۔ میں ان کی شخصیت کے اس پہلو پر یوں بھی زور دے رہا ہوں کہ انھوں نے تحقیقی ضابطوں کا اطلاق اپنے اس شعری مجموعے پر بھی کر دیا ہے اور حاشیوں میں وہ اشعار نکھ دیے ہیں جو ان کے بعض اشعار کا تخلیقی پس منظر فراہم کرتے ہیں۔ ایسے ہر شعر کا حوالہ متعلقہ شعر کے ساتھ درج ہے۔ اور بعض مقامات پر تو یہ نشاندہی انھوں نے شعر میں ہی کر دی ہے۔

'حرف حرف آئینہ' غزلوں کا مجموعہ ہے ممکن ہے ہمارے کچھ سخت گیر [غزل کے تحفظ پر کمر بستہ] نقاد اس میں شامل کچھ چیزوں کو ہیئت اور اسلوب کے اعتبار سے غزل نہ گردانیں۔ مگر ہیئت کے اعتبار سے وہ غزلیں ہی ہیں۔ مختار شمیم کلاسیکل غزل کی مستحکم اور ہمہ گیر روایت کے امین ظہیر دہلوی پر تحقیقی مقالہ لکھ چکے ہیں اور حواشی میں مندرج ظہیر اور ذوق کے اشعار یہ نشاندہی کرتے ہیں کہ میر اور ظہیر کا ان پر گہرا اثر ہے مگر یہ تاثر پذیری اس انداز کی نہیں کہ اپنا لہجہ ہی کہیں کھو جائے یہ چند اشعار دیکھیے:

جو دیکھیے تو یہ عالم [illegible] حیرت ہے
جو سوچیے تو یہ [illegible] حقیقت ہے

چپکے سے غمِ دل کا [illegible] بتا دے گا
وہ میرے لہجے میں اک شعر سنا دے گا

احساس کے ہر مرحلۂ کرب و بلا میں
دل معتقد و تبع حسین ابن علی ہے

عنوان خواب نوحۂ مرگ شام دوستہ
اور صبح جیسے سادہ ورق ہے کتاب

بس! ایک مرحلۂ زیست اور ہے
عدم کی راہ تو پیچھے ہی چھوڑ آئے

مختار شمیم کا لہجہ جہاں نئے پن کی نمونہ مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے وہیں مقامات پر مسلمہ تلازمات سے بے نیاز کا استعمال بھی انھوں نے کیا ہے ایسے

پر ان کا لہجہ ان کی شاعری کے وقار کو مجروح کر گیا ہے۔ کتاب میں متعدد مقامات ایسے بھی ہیں جہاں اس لیے نظر ٹھہرتی ہے کہ وہاں ملاقات مختار شمیم کے بجائے کسی بہت ہی غیر محتاط شاعر سے ہوتی ہے۔ مثلاً جو تقابل ردیف کا عیب لیے ہوتے ہیں۔

ہاں مدح کس سے مجھے معراجِ سخن ہے
خاکم بدہن ورنہ یہ پامال زمیں ہے

لاشعور میں کیسی روشنی جھلکتی ہے
ذہن کے دریچوں میں کون مسکراتا ہے

کچھ شمیم مت پوچھو ہم پہ کیا گزرتی ہے
جب خیال آتا ہے کیا خیال آتا ہے

اور:

رات ہے رات کی یہ چیختی خاموشی ہے
دشت ہے دشت کا سہما ہوا سناٹا ہے

کتاب میں کئی مقامات پر املا کی بے ترتیبی بھی قاری کو تذبذب میں مبتلا کر دیتی ہے کہیں تو اِملا جدید ترین اور کہیں بالکل قدیم، اس انداز میں نظر آتا ہے کہ مدعیہ پر دلی اُردو اکادمی کی دیدہ زیب کتاب کو اس زاویے سے کم معیار کر دیتا ہے۔
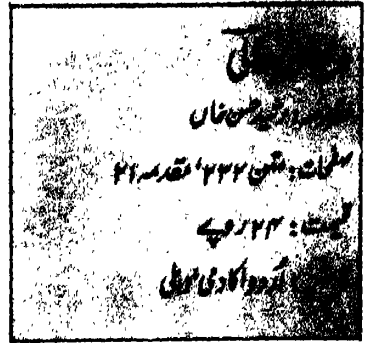
دلی اُردو اکادمی ان کتابوں کی از سرِ نو اشاعت کا اہتمام کر رہی ہے جو دلی کی ادبی و تہذیبی زندگی سے علاقہ رکھتی ہیں۔ لیکن پُرانی کتابوں کی اشاعت کا مرحلہ بہت دُشوار گزار ہوتا ہے تمام تر احتیاط کے باوجود متن میں اغلاط راہ پا جاتی ہیں۔ غالباً اسی سبب سے اُردو اکادمی دہلی نے یہ فیصلہ کیا کہ کتاب کا سب سے مستند نسخہ ہی آفسیٹ کے ذریعے چھاپ دیا جائے تاکہ اغلاط کے امکانات نہ رہیں۔ اور ایسے حضرات سے مقدمات لکھائے جائیں جو موضوع سے کما حقہٗ واقفیت رکھتے ہوں۔

رشید حسن خاں صاحب کا شمار اُردو کے ممتاز محققین میں ہوتا ہے اور وہ اپنی ناقدانہ صلاحیتوں کا بھی لوہا منوا چکے ہیں۔ اپنے مقدمے میں خاں صاحب نے حالی کی شاعری کا جائزہ اس پس منظر میں لیا ہے جو حالی کی شخصیت اور شاعری میں کارفرما ہے۔ مقدمے میں خاں صاحب نے حالی کے شعری رویّوں سے بہت جامع بحث کی ہے:

"اندازِ نظر کی تبدیلی ان کی فطرت کو نہیں بدل سکی [فطرت کو کون بدل سکا ہے] کلاسیکی اندازِ سخن ان کی فطرت کا تقاضا تھا، اس سے بالجبر قطع تعلق کر کے انھوں نے نئے عقیدے کے تحت، قومی اصلاح کی خاطر، شاعری شروع کی۔ عقیدہ بدل جانے سے مزاج یکسر بدل نہیں پاتا۔ اندازِ نظر اور فطری مناسبت میں اس طرح فاصلہ بڑھتا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جدید انداز کی غزلیں بے رنگی میں ڈوب گئیں۔"

(مقدمہ صفحہ ۲)

"حالی نے غزلوں کے علاوہ بھی بہت کچھ کہا ہے۔ اس دیوان میں بھی ایسی بہت سی چیزیں موجود ہیں۔ نظموں میں حبِ وطن اور اصلاحِ قوم کے مضامین کے دریا بہا دیے ہیں۔ اور قطعوں اور رُباعیوں میں بھی ان مضامین شامل کیا ہے یہاں تک کہ اکثر شخصی مرثیے بھی اس جذبے کے تحت کہے گئے ہیں کہ ان میں شخص سے زیادہ ملکی حالات کا ماتم ہے اور ان حالات سے متعلق نقصانات کا تذکرہ ہے۔ ایسی اکثر نظمیں کم اثری سے قریب ہیں مگر جو بے رنگی غزلوں پر نمایاں ہوئی ہے وہ زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔"

(مقدمہ صفحہ ۲)

"حالی صوفیوں سے زیادہ تقدس رکھتے تھے، اور پیش دستی سے بظاہر ان کے مزاج کو دور کا بھی ربط نہ تھا۔ لیکن تصوف سے بھی ان کو عملی یا ذہنی لگاؤ نہیں تھا۔"

(بالترتیب صفحہ ۱۱)

یہ دیوان پہلی دفعہ معہ مقدمۂ شعر و شاعری کے چھپا تھا آج بھی اُردو تنقید اس کے حصاروں سے نہیں نکل پائی ہے۔ اگر اُردو اکادمی مقدمۂ شعر و شاعری کو بھی خاں صاحب کے تفصیلی مقدمے کے ساتھ شایع کر دے تو ہندوستان کے ان لاکھوں طلبہ پر احسان ہوگا جو اِنٹرمیڈیٹ سے لے کر ایم۔ اے تک تنقید کا پرچہ پڑھتے ہیں اور تنقید کے نام پر ان کے خاک پلّے نہیں پڑتا۔
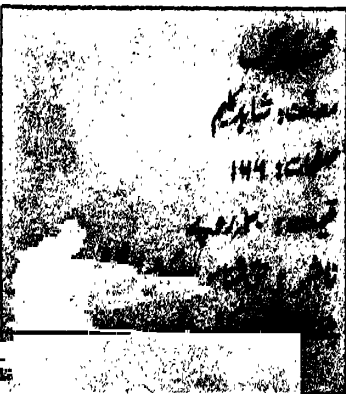
"محرک" شاہد کلیم کے آٹھ ادبی مضامین کا

مجموعہ ہے۔ اُردو ادب کے مختلف پہلوؤں پر لکھے گئے یہ مضامین کئی اعتبار سے اہمیت و افادیت کے حامل ہیں۔ اُردو کے سکّہ بند نقادوں کی عام روش سے ہٹے ہوئے یہ مضامین اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ مصنّف نے مضامین لکھنے سے قبل مفروضات قائم کر کے انھیں صحیح ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ اپنے وسیع مطالعے کی روشنی میں وہ جن نتائج تک پہنچے ہیں انھیں بلاکم و کاست رقم کر دیا ہے۔ مصنّف کی کاوشیں اس لیے بھی زیادہ قابلِ قدر ہیں کہ وہ ادب کے باقاعدہ طالب علم نہیں ہیں نہ ہی درس و تدریس سے جڑے ہوئے ہیں مگر ان کا متوازن اندازِ فکر ہمارے بہت سے ان اُستاد نقادوں کے لیے قابلِ تقلید ہے جو زنگ خوردہ خنجر سے تنقید کو ذبح کر کے اس کا دائرہ محدود کر رہے ہیں۔

مصنّف کی تحریر میں نظریاتی تعصب کی جلوہ گری بھی نہیں، وہ جدیدیت کو اس کے مثبت زاویوں سے قابلِ قبول سمجھتے ہیں اور ترقی پسند ادب کو بھی سرے سے قابلِ استرداد نہیں ٹھہراتے۔

ان کا دوسرا وصف انگریزی ادب پر گہری نظر ہے۔ اُردو میں بالعموم ہوتا یوں ہے کہ مغربی ناقدین کے حوالے دیے تو خوب جاتے ہیں مگر عام طور پر وہ اُردو کے کسی ایسے نقاد کی تحریر کی مسخ شدہ شکل ہوتے ہیں جس نے انگریزی ادب کا سیدھا مطالعہ کیا ہو مگر اس کی تحریر اُردو میں بہر حال بالواسطہ ہوتی ہے پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ انگریزی میں بجائے خود وہ تحریر، جس سے اس نقاد نے استفادہ کیا ہے معتبر ہی ہو۔ مطالعے کے بالواسطہ ذرائع کا استعمال جتنا آسان ہے اتنا ہی نقصان دہ بھی۔ اُردو میں یہ طریق کار عام ہے۔ شاہد کلیم نے انگریزی ادب سے براہ راست استفادہ کیا ہے۔ بیشتر مقامات پر تراجم کا اسلوب اس امر کا شاہد ہے اور اگر وہ تراجم کہیں سے نقل بھی کیے گئے ہیں تو بغیر کسی تصرف کے جس سے قاری اُلجھتا نہیں۔ اُردو شاعری کے حوالے میں مندرج اشعار بھی ان کے بلند ذوق کے غماز ہیں اور خواہ مخواہ کسی کی تعریف یا تنقیص کے پہلو انھوں نے نمایاں نہیں کیے ہیں۔

بعض الفاظ کا استعمال کئی مقامات پر غیر فصیح اور نامانوس معلوم ہوتا ہے۔ بعض مضامین کے بعد انھوں نے ناقدین کی رائے بھی اس مضمون کے بارے میں شامل کتاب کر دی ہے۔ یہ کوئی قابلِ ستایش اور علمی انداز نہیں ہے کیونکہ اب زیادہ حضرات مضمون اور کتاب کے بارے میں اپنی رائے پڑھے اور سمجھے بغیر الفاظ کے گورکھ دھندے کی شکل میں دینے لگے ہیں۔

احساس کے پھول

شاعر: ع۔م۔کوثر
صفحات: ۶۴ قیمت: پندرہ روپے
ناشر: انجمن ترقی پسند مصنّفین سکندرآباد، یوپی

یہ مسلمہ امر ہے کہ اس صدی میں اُردو شعر و ادب کی اصلاحی تحریکیں اور ان کی سوغاتیں ان قصبات و مضافات تک نہ پہنچ سکیں جنھوں نے اُردو زبان کو اس کی اصل شکل میں برقرار رکھا۔ کلاسیکل ادب کے تحفظ میں بھی ان مقامات کا ناقابلِ فراموش کردار ہے۔

سکندرآباد ضلع بلند شہر بھی ایک ایسی ہی قدیم بستی ہے مگر پچھلے چند برسوں میں یہاں کی ادبی فضا میں انقلابی تبدیلیاں رُونما ہوئی ہیں اور فکر و فن کے نئے میلانات سے شناسائی رکھنے والے نئے نوجوانوں کی ایک پوری نسل سامنے آئی ہے۔ اس نسل میں ایک اہم نام ع۔م۔کوثر ہے۔ "احساس کے پھول" ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جس میں فکر و اظہار کی سطح پر سکندرآباد کی حد تک اپنے ہم عمروں میں وہ نمایاں نظر آتے ہیں۔

حیرت نہیں جلیں جو غریبوں کے جھونپڑے
اس رات پی اے سی کا بسیرا تھا شہر میں

یہ کیسے موڑ پر لائی ہے قسمت
نہ منزل ہے نہ کوئی راستہ ہے

سُرخیٔ خون شہیداں کی نمایش کے لیے
وقت کے ہاتھ میں کچھ رنگ حنا رہنے دو

کتابت کی اغلاط اُردو کتابوں کا مقدر بن گئی ہیں اس کتاب میں بھی کتابت کی متعدد اغلاط موجود ہیں۔ مگر لیتھو پر شایع شدہ یہ کتاب دیدہ زیب سرورق سے مزیّن ہے۔

ادبی تنقید کے اصول

مصنّف: ایل۔ ایبر کرومبی
مترجم: ڈاکٹر اشفاق محمد خاں، قیمت: ۱۲ روپے
صفحات: ۱۶۶، ناشر: اشفاق محمد خاں
ملنے کا پتا: اُردو گھر، ایم۔ یو مارکیٹ، علی گڑھ

یہ پروفیسر ایل۔ ایبر کرومبی (لندن) کی مشہور کتاب "Principles of Literary Criticism" کا سلیس اُردو ترجمہ ہے۔ فنِ شاعری اور تنقید کے اصول، مقصد و منصب جاننے اور مختلف تنقیدی نظریات سے واقف ہونے کے لیے یہ بڑی مفید کتاب ہے۔ یونیورسٹی کے طلبہ کے لیے اُردو میں ایسی کتابوں کی کمی ہے۔ اور اسی کمی کی تلافی کے مقصد سے شایع کیا گیا ہے۔ — اطہر فاروقی

○ ۱۹۸۶ء کی اُردو مطبوعات پر اکادمی کے انعامات ○ مرکزِ کتابت میں نئے داخلے ○ کویت میں یوم غالب ○ "نقوش" کے طفیل نمبر کا اجرا ○ بین الملکی جشنِ سالگرہ ○ گورو گرنتھ صاحب کا اُردو ترجمہ ○ اقبال ایوارڈ ○ خطاطی ایوارڈ ○ ہندی اور اُردو کا رشتہ ○ رفتید و لے نہ از دلِ ما

۱۹۸۶ء کی اُردو مطبوعات پر اکادمی کے انعامات

اُردو اکادمی، دہلی نے ۱۹۸۶ء میں شایع شدہ پندرہ کتابوں پر انعامات دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ جن کتابوں کے لیے یہ انعام منظور ہوئے ہیں ان کی فہرست درج ذیل ہے۔

شاعری:

۱۔ پردہ سخن کا، ڈاکٹر مظفر حنفی، (۳۰۰۰ روپے)

۲۔ گل خنداں، کشن لال خنداں دہلوی (۳۰۰۰ روپے)

۳۔ رہبر اعظم، ناز مانکپوری (۱۵۰۰ روپے)

افسانہ، ناول، ڈراما:

۴۔ فرار (ناول)، ظفر پیامی، (۳۰۰۰ روپے)

تنقید و تحقیق و دیگر اصناف:

۵۔ ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک (جامعہ ملیہ اسلامیہ)، شمس الرحمان محسنی، (۳۰۰۰ روپے)

۶۔ بیدی نامہ (راجندر سنگھ بیدی کی شخصیت اور فن کا مطالعہ) شمس الحق عثمانی (۳۰۰۰ روپے)

۷۔ شعریات اقبال، قاضی عبید الرحمان (۳۰۰۰ روپے)

۸۔ دُنیا کے بڑے مذہب، عماد الحسن آزاد فاروقی، (۳۰۰۰ روپے)

۹۔ بہادر شاہ ظفر، ڈاکٹر اسلم پرویز (۳۰۰۰ روپے)

۱۰۔ اُردو مختصر افسانہ (فنی و تکنیکی مطالعہ) ڈاکٹر نکہت ریحان خاں، (۳۰۰۰ روپے)

انشائیہ، طنز و مزاح، سفرنامہ، سوانح:

۱۱۔ میری یادیں، طالب چکوالی، (۳۰۰۰ روپے)

۱۲۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن، غفران احمد، (۱۵۰۰ روپے)

بچوں کا ادب

۱۳۔ سائنس کی باتیں، ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، (۱۵۰۰ روپے)

۱۴۔ پھلواری، کرن شبنم صاحبہ، (۱۵۰۰ روپے)

۱۵۔ اکادمی ہر سال معیاری کتابوں کی طباعت پر ناشرین کو بھی انعام دیتی ہے۔ ۱۹۸۶ء کا ناشر ایوارڈ (جس کا نام منشی نول کشور ایوارڈ رکھا گیا ہے) سیما آفسیٹ پریس دہلی کی کتاب "رخت سفر" پر دیا گیا۔ (۳۰۰۰ روپے)

مرکزِ کتابت میں نئے داخلے

اُردو اکادمی، دہلی اور ترقی اُردو بیورو کے اشتراک سے چلنے والے مرکزِ کتابت میں اس سال اُنیس ۱۹ نئے طلبہ کو داخلہ دیا گیا ہے۔ انھیں مرکز میں دو سال تک اُردو کتابت کی تعلیم دی جائے گی۔ اور دورانِ تعلیم ہر طالب علم کو سو روپے ماہانہ وظیفہ بھی دیا جائے گا۔ مرکز میں نستعلیق اور نسخ کے دو ماہر خوش نویس طلبہ کو خوش نویسی کے فن کی تعلیم دیتے ہیں۔ داخلہ اُن امیدواروں کو دیا جاتا ہے جنھوں نے اُردو مضمون کے ساتھ ہائی اسکول کیا ہو یا جو کسی عربی مدرسے کے فارغ التحصیل ہوں۔ مدرسے کے اوقات دو بجے سے شام پانچ بجے تک ہیں۔

کویت میں یومِ غالب

حلقۂ فکر و فن کویت کی جانب سے مرزا غالب کی یاد میں ڈاکٹر مسعود عالم شمسر صاحب کی رہایش گاہ پر ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت جناب نُور پرکار نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر مسعود عالم شمسر

نے انجام دیے۔ شرکا میں ممتاز دانشور، شعرا، ادبا اور حلقۂ فکر و فن کویت کے ارکان شامل تھے۔

مہمان خصوصی ڈاکٹر حبیب الدین احمد صاحب نے مرزا غالب کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ مرزا صاحب کا دیوان اپنے اندر پوری کائنات کا رنگ و بو سمیٹے ہوئے ہے۔ کون سا ایسا دل ہوگا جس کی دھڑکن دیوان غالب کے اندر موجود نہیں اور کونسا ایسا جذبہ ہوگا جس کی ترجمانی کلام غالب سے نہیں ہو جاتی۔ وہ زمانے کے نشیب و فراز اور انسانی کردار کی بلندی و پستی پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں کہ قاری کے دل و دماغ جگمگا اٹھتے ہیں اور وہ زندگی کی تلخیوں کے باوجود زندگی سے پیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

"نقوش" کے طفیل نمبر کا اجرا

۶ جولائی کو لاہور میں "نقوش" کے طفیل نمبر کے اجرا کا جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاالحق نے کی۔ اس تقریب میں ہندوستان سے جناب رشید حسن خاں اور ڈاکٹر مختار الدین آرزو نے خصوصی دعوت پر شرکت کی۔

رشید حسن خاں صاحب نے اپنی تقریر میں تجویز پیش کی کہ ریسرچ اسکالرز کی آسانی کے لیے "نقوش" کے مختلف شماروں میں تحقیق کے حوالے سے شایع شدہ مضامین کو یکجا کر کے شایع کیا جائے کیونکہ تحقیقی مراحل پر تحقیقی کام کرنے والے لوگ نقوش کے بعض نمبروں کو ہزار جدوجہد کے بعد بھی حاصل نہیں کر پاتے۔ انھوں نے قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر مصطفےٰ خاں کے بعض اہم مضامین کی نشاندہی کی جو "نقوش" کے شماروں میں محفوظ ہیں۔

صدرِ پاکستان نے اپنی تقریر میں اس تجویز کی پُرزور تائید کی کہ "نقوش" میں شایع شدہ اہم مضامین کو یکجا کر کے شایع کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ وہ اس کے اخراجات خود ادا کریں گے کیوں کہ سرحد پار یعنی ہندوستان سے آنے والے محقق نے جو کچھ کہا ہے وہ ہمارے لیے بہت اہمیت اور توجہ کا مستحق ہے۔ صدرِ پاکستان نے سرحد پار سے آنے والی آواز کے لیے نقار خانے کی آواز کا استعارہ وضع کیا اور اپنے ملک کی آواز کو گنبد کی آواز سے تعبیر کیا جو اپنے حصاروں میں قید ہو کر رہ گئی ہے۔

اس جلسے میں پاکستانی محققین میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ڈاکٹر جمیل جالبی اور اشفاق احمد خاں نے شرکت کی اور طفیل مرحوم کی ادبی زندگی اور شخصیت کے گوشوں پر روشنی ڈالی۔

صدرِ پاکستان نے ہندوستانی مندوبین کے اعزاز میں "مری" میں لنچ کا اہتمام کیا اور وقت رخصت اعلیٰ درجے کی خصوصی طباعت سے آراستہ قرآن کریم اور ایک قیمتی قالین پیش کی۔

بین الملکی جشنِ سالگرہ

انجمن ترقی اُردو کراچی کے زیرِ اہتمام مشہور افسانہ نگار جناب ابوالفضل صدیقی کی ۸۰ ویں سالگرہ منائی گئی۔ اس جشن میں ہندوستان سے پروفیسر جگن ناتھ آزاد بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ انھوں نے ابوالفضل صدیقی کے علامتی افسانوں کا ذکر کرتے ہوئے اُن کی ایک کہانی "یزداں بہ کمند آور" کا خاص طور سے ذکر کیا اور کہا کہ یہ کہانی ہندو مائتھالوجی کے گرد گھومتی ہے اور ہندو مائتھالوجی میں زماں یا وقت کے معنی ہیں، زمانِ حقیقی نہ کہ زمان تسلسلی۔ اس افسانے میں ابوالفضل صدیقی نے زمانِ حقیقی کے ایک لمحے کو گرفت میں لے کر (جس میں نہ ماضی ہے نہ مستقبل) کہانی میں ایک طلسماتی حرکت پیدا کی ہے اور اس حرکت میں اس کہانی پن کو جنم دیا ہے جو بالعموم ہماری علامتی کہانیوں میں مفقود ہے۔

اس موقعے پر انجمن ترقی اُردو پاکستان کے صدر جعفری صاحب نے پاکستان کی طرف سے اور جگن ناتھ آزاد نے ہندوستان کے اہل قلم کی طرف سے ابوالفضل صاحب کی گُل پوشی کی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، جناب شمیم احمد اور جناب مختار زمن نے ابوالفضل صدیقی اور اُن کے فن پر مقالے پڑھے۔

گورو گرنتھ صاحب کا اُردو ترجمہ

جالندھر کے روزنامہ "جگ بانی" کے مسٹر ایچ۔ ایس حامی نے سکھوں کی مقدس کتاب گورو گرنتھ صاحب کا اُردو ترجمہ کیا ہے۔ اس کے رسم اجرا کے موقع پر سابق صدر جمہوریۂ ہند جناب گیانی ذیل سنگھ نے کہا کہ لوگوں کو گورو گرنتھ صاحب کے نسخے اور تراجم مُفت دیے جائیں اور وہ عقیدت کے ساتھ اس کا مطالعہ کریں۔

اقبال ایوارڈ

اقبال اکادمی حیدرآباد نے اپنا سالانہ اقبال ایوارڈ اس سال پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ ایوارڈ جس کی ابتدا ۱۹۸۵ء میں ہوئی تھی پہلے سال پروفیسر غُلام دستگیر رشید کو اور دوسرے سال ڈاکٹر عالم خوندمیری کو (پس از مرگ) د یا گیا تھا۔

مغربی بنگال اُردو اکادمی نے گورنرس خطاطی ایوارڈ سال ۱۹۸۶ء کے لیے محمد الیاس صاحب ۸ رحمان منشن احاطہ سورت سنگھ تمباکو منڈی چوپٹیاں لکھنؤ کا انتخاب کیا ہے۔

بذریعہ اشتہار ملک بھر سے خطاطی کے نمونے طلب کیے گئے تھے کُل ۲۷ نمونے موصول ہوئے تمام نمونوں کا بغور جائزہ لینے کے بعد محمد الیاس صاحب کو ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا جو پانچ ہزار روپے پر مشتمل ہے۔

خدا بخش لائبریری پٹنہ کے زیرِ اہتمام اُردو، ہندی، ہندوستانی کے باہمی تعلق پر اُردو اور ہندی زبان کے ودوانوں اور دانشوروں کے درمیان تبادلۂ خیال کے لیے مذاکرے کا انعقاد کیا گیا ابتدا میں ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے اُردو، ہندی اور ہندوستانی کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اُردو اور ہندی دونوں زبانیں اپنے رسم الخط اور ادبیات کے لحاظ سے الگ الگ ہوتے ہوئے بھی بول چال کی حد تک ایک ہی ہیں انھوں نے کہا کہ اُردو اور ہندی کے دانشوروں کو اسی لیے ایک جگہ جمع کیا گیا کہ ہم اس امکان پر غور کریں کہ کیا کوئی ایسی صورت نکل سکتی ہے کہ یہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کے قریب آئیں۔

ہندی زبان کے نوجوان اہلِ قلم کی نمائندگی کرتے ہوئے اپوربانند نے اُردو، ہندی کے متعلق نے واضح خیالات پیش کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ جو لوگ ہندوستان کی تقسیم کا ذمہ دار اُردو کو ٹھہراتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ اور جو لوگ اُردو کو مسلمانوں کی زبان سمجھتے ہیں وہ بھی غلط فہمی کے شکار ہیں۔ مسٹر اپوربانند نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا کہ اُردو اور ہندی اگرچہ ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں لیکن اب یہ دونوں زبانیں اپنا مستقل وجود رکھتی ہیں۔ اور دونوں کو اپنی اپنی خوبیوں کے ساتھ زندہ رہنا اور ترقی کرنا ہے جو لوگ اُردو میں شامل فارسی اور عربی الفاظ اور ہندی میں شامل مشکل سنسکرت کے الفاظ پر اعتراض کرتے ہیں ان کا اعتراض کرنا صحیح نہیں ہے۔ ہندی ہماری مادری زبان ہے پھر بھی اس کے بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کے معنی کے لیے ہمیں شبد کوش کا سہارا لینا پڑتا ہے پھر جب ہم دوسری زبان کو پڑھنا چاہتے ہیں تو ہم یہ کیوں مطالبہ کریں کہ اس میں کٹھن شبد نہ آئیں۔ یہاں بھی ہم ڈکشنری سے مدد لے سکتے ہیں۔

شری رام درین جی (پٹنہ یونیورسٹی) نے یہ مشورہ دیا کہ اُردو میں جو قیمتی ادبی سرمایہ ہے اس کو دیوناگری اسکرپٹ میں شایع کرنا چاہیے اسی طرح ہندی کی رچناؤں کو اُردو میں چھاپنا چاہیے اس سے دونوں زبانوں کے بولنے والے ایک دوسرے کے قریب ہوں گے اور دونوں زبانوں کے بولنے والوں کو فائدہ پہنچے گا۔

شری کیسری کمار سنگھ (صدر مگدھ اکیڈمی) نے اس بات پر زور دیا کہ ہندی، اُردو سے متعلق اخلاقی مسئلے کو اُبھارنے اور پُرانے گڑے مردے اکھاڑنے سے کچھ حاصل نہیں، ہمیں اس مسئلے پر علمی اور ادبی نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر محمد محسن نے کہا کہ زبان کلچر کا حصہ ہے اس لیے جب مشترکہ تہذیب یا ہندوستانی زبان کی بات کی جاتی ہے تو اقلیت کو یہ خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ اکثریت ہم پر اپنا کلچر لادنا چاہتی ہے۔ پروفیسر محسن نے امریکہ کی مثال دے کر بتایا کہ مشترکہ تہذیب کی کوشش امریکہ میں ناکام ہو چکی ہے اور اس سے طرح طرح کے مسائل اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔

رفتید ولے نہ از دلِ ما

اُردو کے ممتاز انشا پرداز، ڈرامہ نگار اور ادیب آل عبا آوارہ کا ۲۴ جولائی کو آبائی وطن مارہرہ میں انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر سو سال تھی۔ وہ سیتاپور میں پیدا ہوئے اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت اختیار کر لی، جہاں لکھنؤ، دہلی اور حیدرآباد میں وہ ایک لمبے عرصے تک مامور رہے۔

ان کے مضامین کا مجموعہ "بے پرکی" اور خاکوں کا مجموعہ "اپنی موج میں" قبولِ عام کی سند پا چکے ہیں۔

گزشتہ ۱۶، ۱۷ جولائی کی درمیانی شب میں عالم اسلام کی ایک مشہور شخصیت مولانا محمد عبدالحئی کا رامپور میں انتقال ہو گیا۔ مولانا مرحوم ایک عالم باعمل تھے۔ مولانا نے یکم جنوری ۱۹۴۳ء سے ایک دینی ماہنامہ "الحسنات" جاری کیا اس کے بعد خواتین کے لیے ماہنامہ "بتول"، نوجوانوں کے لیے ماہنامہ "نور" اور بچوں کے لیے ماہنامہ "ہلال" جاری کیا۔ یہ رسالے باقاعدگی سے نکل رہے ہیں۔ مولانا محمد عبدالحئی صاحب نے ۱۹۵۲ء میں مسلمان لڑکیوں کے لیے ایک مدرسہ "بچیوں کا مدرسہ" کے نام سے قایم کیا جو آج جامعۃ الصالحات کی حیثیت سے اسلامی یونیورسٹی بن چکا ہے جہاں ہندوستان کے بہت سے شہروں کی لڑکیوں کے علاوہ نیپال اور بھوٹان کی لڑکیاں عالم و فاضل کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ مولانا کا ایک اہم کارنامہ قرآن پاک کے ہندی ترجمے کی اشاعت ہے۔

○ کیا خوب ماہنامہ آپ نے نکالا ہے ۔

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

مُبارکباد!

——— جگن ناتھ آزاد، جموں

○ اُردو رسالوں کا تاخیر سے شایع ہونا مُقدّر ہو چکا ہے مگر آپ نے اپنے حسن تدبیر سے تقدیر بدل ڈالی شریعتِ صحافت میں یہ بدعت ہے مگر بدعتِ حسنہ۔ خُدا کرے اس میں استقامت ہو۔

لڑکپن میں ایک قصّہ پڑھا تھا جس کا ماحصل یہ ہے کہ کوئی شخص ہر شخص کو یکساں طور پر خوش نہیں کرسکتا۔ طبائع مختلف ہوتے ہیں اور پسند جُملہ رائے شماری پر فیصلے کا انحصار ہے۔ رائے عامّہ آپ کے حق میں ہے۔

ایک مراسلہ نگار کو یہ شکایت ہے کہ عام اُردو رسالوں کی طرح "ایوانِ اُردو" میں بھی تحقیقی مقالوں کی کمی ہے۔ مانا کہ ہے تحقیق کوئی کھلونا نہیں کہ ہر کس و ناکس اس سے کھیلے لکھنے والے بھی کم اور سمجھنے والے اس سے بھی کم عمدۂ منتخبہ سے متعلق جو مضمون ہے اس پر فیصلہ ناطق یہ کیا گیا ہے کہ اس کو تحقیق سے کوئی لگاؤ نہیں۔ اگر واقعی ایسا ہی ہے تو پھر آخر تحقیق ہوتی کیسی ہے؟ کیا صرف "بہ خط مصنّف" ہی کے تعارف پر تحقیق کا انحصار ہے؟ جن کو "غالبیات" سے ذرا بھی واسطہ ہے انھیں قاضی عبدالودود کی غالب کے غیر مطبوعہ اشعار کی نشاندہی کا علم ہے۔ قاضی صاحب نے لندن والے نسخے کو اس وقت دیکھا جب وہ میدانِ تحقیق میں نئے نئے اُترے تھے۔ اس نسخے کے ترقیمے پر ان کی نظر نہ گئی کہ ۱۲۴۳ھ میں غالب کے ایسے اشعار کس طرح درج ہوتے۔ گپتا رضا صاحب نے ایک دوسرے نسخے سے اس گتھی کو بحسن و خوبی سُلجھایا ہے جو قابلِ داد ہے۔ میرے خیال میں مراسلہ نگار نے اس مضمون کو غور سے نہیں پڑھا اور اگر پڑھا تو سمجھا نہیں اور اگر سمجھا تو غلط سمجھا۔ مراسلہ نگار کا یہ فرمان کہ "بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ادبا اور اساتذہ تحقیق کے صحیح مفہوم سے واقف نہیں"۔ معلوم نہیں مراسلہ نگار نے اپنے کو بھی اس جماعت میں شامل کیا ہے یا اپنے کو مستثنیٰ رکھا ہے۔

"کیا دُھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے"
مضمون کے لحاظ سے بھی خوب ہے اور اس سے زیادہ حُسن بیان نے بڑا لُطف بخشا۔

غزل اُردو ادب کی البیلی صنف ہے۔ شیشے سے بھی نازک۔ چھُوئی مُوئی۔ بڑا رکھ رکھاؤ چاہتی ہے۔ سب غزلوں پر رائے زنی کرنا مشکل ہے اور ممکن بھی نہیں۔ صرف ایک مثال کی نشاندہی اشارتاً کافی ہے۔ جون ۸۷ء کے شُمارے میں صفحہ ۴۲ پر ایک غزل شایع ہوئی ہے جس میں ایک مصرع اس طرح ہے۔ ع

دل کا آئینہ کہو کہ عکسِ فکر و غم اسے

اس میں لفظ "کہ" تبھی کھپ سکتا ہے جب اس کو "کے" تلفظ کے ساتھ پڑھا جائے اور یہ سقم ہے "کہ" کو اگر "یا" سے بدل دیا جائے تو عیب مٹ جائے گا۔

ایک بات اور نظیر اکبرآبادی کا سال ولادت کیا ۱۷۳۰ء محقق ہے؟ سو سال کی عُمر کیسے متعین ہوئی؟

——— عطا کاکوی، پٹنہ

○ اس بھاگ دوڑ اور مصروفیت کے زمانے میں بھی پرچے میں اتنا دم ہے کہ شروع سے آخر تک اپنے کو پڑھوا لیتا ہے۔ یہ امتیاز کیا کم ہے۔ مندرجات سے پتا چلتا ہے کہ آپ لوگوں نے "ایوانِ اُردو" کو عوام و خواص دونوں میں مقبول بنانے کا منصوبہ بنایا ہے۔ ہر شمارے میں اس کی پہچان واضح ہوتی جا رہی ہے۔

تبصرے کا حصّہ بھی اچھا ہے۔ یہ اطہر فاروقی کون صاحب ہیں؟ آدمی ذہین اور باخبر معلوم ہوتے ہیں۔

——— فاروق شفق، کلکتہ

○ "ایوانِ اُردو" دہلی، بہت پسند آیا۔ دُعا گو ہوں کہ برابر ترقی کرتا رہے۔

——— حاجی محمد انور، وارانا سی

"ایوانِ اُردو" تیزی کے ساتھ راہ ترقّی پر
مزن ہے۔ یہ اچھا ہے کہ پرچے کا دائرہ صرف شعر و سخن
ـر افسانہ نگاری تک محدود نہیں اور اس کے
ـراق اِن اصنافِ ادب کے علاوہ تحقیق، شخصیات
ـر سیر و سیاحت جیسے موضوعات کا بھی احاطہ
یے ہوئے ہیں۔ جولائی کے شمارے میں جناب
ـج نرائن رازؔ نے نامور مصوّر، نقاش اور شاعر
ـناب صادقین (مرحوم) کی شخصیت کے اُن
ـہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جو عام طور پر لوگوں
ـی نظر سے اوجھل رہے ہیں۔ جناب کنور مہندر سنگھ
ـبدی سحر کا سفرنامہ معلوماتی ضرور ہے مگر اس میں
ـسفرنامے جیسی چاشنی پیدا نہیں ہو سکی۔
ـسعد بدایونی اور قاسمی صاحب کی غزلیات
ـذب ہیں۔

—— ہیرانند سوزؔ، فرید آباد

" ایوانِ اُردو" کا پہلا، دوسرا اور تیسرا
ـمارہ نظر نواز ہوا۔ رسالہ ہر اعتبار سے قابلِ قدر
ـہے۔ اگرچہ یہ مزید معنوی حسن کا طالب ہے لیکن
ـام ادبی رسالوں کی روش سے الگ ہونے کے
ـسبب، یہ اُمید بندھتی ہے کہ 'ایوانِ اُردو' کے سر
ـقبولیت کے نئے معیار قائم کرنے کا سہرا بندھے
ـا۔ خُدا کرے جلد ایسا ہو۔

جولائی کے شمارے میں ہیرانند سوزؔ کا افسانہ
'آخری انعام' پڑھ کر دل کے سوئے ہوئے زخم
ـیدار ہو گئے۔ تین سال قبل کا رُوح فرسا واقعہ
ـنکھوں کے آگے رقص کرنے لگا۔ شہر دربھنگہ میں
ـقیام کے دوران میرے ایک محسن نے میرے پیچھے
ـمیری ذاتی لائبریری کی کتابوں کو چوہے کی غذا
ـبنا دیا۔ حال میں ایک اور جھٹکا اس وقت لگا
ـجب میرے گھر کے لوگوں نے میری تمام کتابوں
ـکو بوریوں میں بند کر کے اُوپر برساتی میں پہنچا
دیا۔ واقعے کی آگاہی کے بعد میری جو کیفیت ہوئی
ہوگی اس کا اندازہ وہی لگا سکتے ہیں جن کی عزیز
ترین چیز کی بے حرمتی بے دردی سے کی گئی ہو۔

المختصر، ہیرانند سوزؔ کا یہ افسانہ میرے ساتھ
گزرے ہوئے حادثے کا عکاس ہے اور اس وجہ
سے یہ افسانہ دِل کی انتہائی گہرائی میں اُتر گیا ہے۔
کاش، لوگوں کو کتابوں کی قدر و قیمت سمجھنے
کی توفیق میسّر ہو۔

—— عطا عابدی، ململ، مدھوبنی

اس قدر نفیس اور عُمدہ جریدہ اُردو میں
پہلی بار دیکھا جسے ہم فخر سے دوسری زبانوں کے
مقابل پیش کر سکتے ہیں۔ افسانوں میں "آخری
انعام" نے بے انتہا متاثر کیا۔ اُردو کی ابتدائی تعلیم
اور آنے والی نسل سے اس کے رشتے کی نزاکت کو
ہیرانند سوزؔ صاحب نے اُجاگر کر کے اُردو والوں
کو بیدار کرنے کی سعی کی ہے کاش وہ جاگ سکیں۔
حقیقت میں ہم اپنی تہذیب اپنی زبان کو خود ہی
مٹانے پر کمر بستہ ہیں اور قصور وار سرکار کو اور
انتظامیہ کو ٹھہرا کر اپنی ذمّہ داری سے سبکدوش
ہونا چاہتے ہیں۔ زیادہ شکایت ان حضرات سے
ہے جو اُردو سے روزی روٹی کماتے ہیں مثلاً شعرا
جو مشاعروں سے ہزاروں روپے کما کر اپنے بینک
بیلینس میں اضافہ کر رہے ہیں اور ان کے بچے
اُردو زبان سے نابلد ہیں پھر وہ اساتذہ ہیں جو
پرائمری سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک اُردو
پڑھانے کے لیے مقرر ہوتے ہیں اور پابندی سے
کلاس نہیں لیتے ان کا سارا وقت کانفرنسوں،
سیمیناروں اور ورکشاپوں میں گزرتا ہے یا شعبہ
جاتی جھگڑوں میں۔ پرائمری اسکول کے ٹیچر
اسکولوں میں اُردو طلبا کی غیر موجودگی کے سبب
دوسرے مضامین پڑھا رہے ہیں ایسا کیوں؟ ہم
پہلے سہولتیں فراہم کرنے کی مانگ کرتے ہیں پھر سہولتیں
مل جانے پر اپنی آنکھیں مُوند لیتے ہیں قصور وار دوسروں
کو ٹھہراتے ہیں۔ ہمیں خود اپنا محاسبہ کرنا چاہیے۔ خُدا کے
لیے اپنے بچّوں کی ابتدائی تعلیم کی طرف توجہ دیجیے اپنے
گھر میں اُردو کے اخبار اور رسائل منگوائیے اسکول
کالجوں میں اُردو مضمون بچّوں کو دلوائیے تبھی اُردو
زندہ رہ سکتی ہے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ صاحب کا
سفرنامہ امریکہ دلچسپ ہے زبان بھی دِلکش ہے۔

—— تسکین زیدی، کانپور

"ایوانِ اُردو" کے تین شمارے میرے پاس
ہیں۔ اتنے صاف سُتھرے، معیاری اور پُر رونق رسالے
کی اشاعت پر مُبارک باد دیں قبول کیجیے یقین ہے کہ اس
کی تابانیوں میں برابر اضافہ ہوگا۔ ممکن ہو تو اس کی
کتابت تھوڑی باریک کرائیے[1]۔ اس سے میٹر بھی کچھ
اور زیادہ آ سکے گا۔

[1] ایسا کر دیا گیا ہے۔

—— اختر یوسف، رانچی

کنور صاحب کا سفرنامۂ امریکہ ایک دلچسپ
اور معلوماتی مضمون ہے لیکن حاصلِ شمارہ ہیں
خلیق انجم صاحب کا تاریخی اور دستاویزی مضمون
"دِلّی کے آثارِ قدیمہ" اور عالمی شہرت کے مصوّر صادقین
پر محترم راج نرائن رازؔ کا مضمون "کیا دُھوپ تھی کہ
ساتھ گئی آفتاب کے"۔ مضامین کے ساتھ ساتھ افسانے،
غزلیں دوسرے پرچوں سے منفرد اور ایک الگ
مزاج کی حامل ہیں۔

—— صغیر اشرف، ہلدوانی

ہیرانند سوز کی کہانی کافی اچھی ہے۔ موضوع
میں انفرادیت کے ساتھ تاثر بھی ہے۔

—— ظفر اقبال، فتحپور

مشتاق مومن کا افسانہ "عورت نامہ"
(جولائی ۸۷ء) بہت خوب ہے۔

—— منظور علی عاقب، پیرسیہ

○ جولائی کے شمارے میں جناب خلیق انجم کا مضمون "دِلّی کے آثارِ قدیمہ"۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا سفرنامہ۔ راج نرائن رازؔ کا خاکہ۔ بیرانند سوز کا افسانہ: "آخری انعام"۔ وقار واثقی کے دوہے اور جناب حیاتؔ، اسعدؔ، قاسمیؔ، حقیرؔ، شبنمؔ اور جبیںؔ کی غزلیں خوب ہیں۔ صحت سے متعلق مضمون بھی اچھا ہے۔

____ بیتاب علی پوری، سونی پت

○ جو مثبت قدم اُردو اکادمی، دہلی نے "ایوانِ اُردو" کی اشاعت کے سلسلے میں اُٹھایا ہے وہ یقیناً اُردو کے شیدائیوں کے لیے تسکین کا باعث ہے۔ ہر مذاق کے معیاری مضامین باذوق ناظرین یقیناً دلچسپی سے پڑھیں گے۔ جولائی ۱۹۸۷ء کی اشاعت میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا سفرنامہ امریکہ دلچسپی سے پڑھا۔

____ سعود احمد شروانی، حیدرآباد

○ مصور سبزواری کی غزل نمبر دو (جون ۸۷ء) کے پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ

تیرے دھیان میں سارا ساون بھیگ گیا

اگر اس کا دھیان نہ ہوتا تو کیا ساون اپریل، مئی کا کوئی موسم ہوتا۔ جو اس کے دھیان میں بھیگ گیا ساون کی رات تو گیلی اور بھیگی ہوتی ہے پھر اُس کے بھیگنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے ویسے سبزواری ایک اچھے شاعر ہیں، مگر اس قسم کی بھرتی زیب نہیں دیتی۔

"تذکرہ گلابوں کا" والا مضمون بہت اچھا تھا۔ افسوس کہ پہلی قسط نظر سے نہیں گذری۔ "پُرشور ماحول" مختصر اور تشنہ مضمون ہے۔ مگر اچھا ہے۔ کاش کہ آپ اس پرچے کے صفحات دُگنے تگنے کر سکیں اور قیمت بھی بڑھا دیجیے۔

"ایوانِ اُردو" یقیناً اس دَور میں مینارۂ نور ہے اور صحرا میں نخلستان۔

____ عبدالغفار، احمد نگر

○ ایوانِ اُردو میں نے اپنے ایک دوست کو خط لکھ کر پٹنہ سے منگوایا۔ واہ، واہ پڑھ کر جی خوش ہو گیا میں نے اپنی لائبریری (ادارہ فیضِ ادب، گیاری) کے تمام ممبروں کو باری باری پڑھوایا۔ سب نے اسے بہت پسند کیا۔

اگر مناسب ہو تو قلمکاروں کے مکمل پتے شائع فرمائیں۔[1]

[1] اب پتے شایع کیے جا رہے ہیں۔

____ ہارون رشید غافل، گیاری، اریا

○ تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے ساتھ ساتھ ایسے مضامین کو بھی ترجیح دی جائے جن سے قارئین کے علم میں اضافہ اور خیال میں وسعت پیدا ہو۔ امید ہے اہلِ ذوق "ایوانِ اُردو" کو شوق کے ہاتھوں سے لیں گے اور عزت کی آنکھوں سے پڑھیں گے۔

____ سرداری لال نشتر، شملہ

○ "ایوانِ اُردو" اُردو دُنیا میں ایک سنگِ میل ہے جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

____ ایم حسین، لہریا سرائے

○ "ایوانِ اُردو" دیکھ کر ایسا محسوس ہوا کہ ابھی اُردو کی شان و شوکت باقی ہے۔ خدا سے دُعا ہے کہ یہ ماہنامہ دن دُگنی رات چوگنی ترقی کرے۔

____ عبدالنعیم شبانہ، اُرومانہ، حیدرآباد

○ ہر روز کتنے ہی رسالے اور اخبار شائع ہوتے رہتے ہیں ان میں اپنی پسند کا رسالہ جو اپنے ذوق سے میل کھائے کبھی کبھار ہی پڑھنے کو ملتا ہے۔ "ایوانِ اُردو دہلی" میں یہ تمام باتیں بدرجہ اتم موجود ہیں جن کو پڑھ کر دل باغ باغ ہوا دونوں حصّے نثر و نظم اپنی اپنی جگہ خوب سے خوب تر ہیں۔

____ اکرام کاوش، میسور

○ "ایوانِ اُردو" آپ لوگوں کے خلوص اور سعیِ پیہم کا آئینہ دار ہے۔ اُردو کی ترقی و اشاعت اور بقا کے لیے آپ لوگ جو محنت کر رہے ہیں اس میں ہم نوجوان نسل کے طلبہ کو آپ کا ساتھ دینا چاہیے۔ "ایوانِ اُردو" کا باقاعدہ مطالعہ ہمیں اس نیت سے بھی کرنا چاہیے کہ اس سے ہمارے ذہن و ذوق کی تربیت میں مدد ملے گی۔

____ افضال عاقل، کارولیا، گیز

○ "ایوانِ اُردو" چشم بددور اسمِ بامسمّیٰ ہے خُدا اس کی ترقی و ترویج میں آسانیاں پیدا کرے۔

____ قیصر عادل، ریاض، سعودی عرب

○ آپ کی رائے کالم میں سیّد محی رضا کی رائے پڑھ کر مسرت ہوئی کہ نہ اب ایسے بے لاگ رائے دینے والے قارئین رہے اور نہ ہی ایسی رایوں کو اشاعت پذیر کرنے والے مُدیر۔ یقیناً آپ دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں۔

____ طیب احسن تابش، رانچی

○ "ایوانِ اردو دہلی" کے دوسرے شمارے میں انور خاں صاحب کا افسانہ "یاد بسیرے" کا دوبارہ بغور مطالعہ کیا۔ اس سے قبل میں علامہ اقبال کلچرل سوسائٹی سکندرآباد سے شائع شدہ کتاب "مخمور سعیدی ایک مطالعہ" مرتبہ اطہر فاروقی مطالعہ کر چکا تھا۔ اس میں رشید حسن خاں صاحب کا مضمون "ذہن کا سفر" میں مخمور صاحب کی ایک نظم ہے "گھر"۔ اسی طرح ان کی ایک نظم ہے "یادوں کا و... انور خاں صاحب کا افسانہ ان دونوں نظموں کی تفسیر معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ محض اتفاق ہے حیرت انگیز ہے اور اگر استفادہ ہے تو انو... کو اس کا اعتراف کرنا چاہیے تھا۔

____ امام آسکر،

○ "ایوانِ اُردو" ہر لحاظ سے معیاری، باوقار
رقابلِ ستایش رسالہ ہے۔ اس کی درازیِ عُمر
، دُعا کرتا ہوں۔

—— رضا نقوی واہی، پٹنہ

○ اگست کے شمارے میں اقبال کرشن صاحب
للہ) کا مراسلہ نظرنواز ہوا۔ اس میں انھوں نے
رکیا ہے کہ باغ و بہار کا پہلا ایڈیشن ۱۸۰۱ء
، شائع ہوا تھا اور رشید حسن خاں صاحب نے یہ
اشاعت ۱۸۰۲ء لکھا ہے جو سراسر غلط ہے
ب نگار کی رائے باغ و بہار کے ضمن میں ہوئی
تک کی تحقیق کے مطابق [میری ناقص معلومات
مد تک] غلط فہمی پر مبنی ہے۔

باغ و بہار کے سنہ اشاعت کے متعلق کوئی
اف نہیں ہے۔ اور اشاعت اوّل کے نسخے پر
ہی سنہ درج ہے۔ البتہ اس میں اختلاف
ہے کہ باغ و بہار مکمل کب ہوئی۔ محمد عتیق
ں کی کتاب "گلکرسٹ اور اس کا عہد" اس
ع پر سب سے اہم کتاب ہے۔ باغ و بہار کے
قین نے اسے سند مانا ہے۔ اس متنازعہ مسئلے
ن کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"باغ و بہار کے اعداد اور خود میرامّن کے
ے مطابق اس کا سنہ تالیف ۱۲۱۷ھ مطابق
ء ہے۔"

(صفحہ ۱۳۰)

"کتاب کے تاریخی نام کی وجہ سے نیز مولّف
رجہ بالا واضح بیان کے پیشِ نظر باغ و بہار
الیف مابہ النزاع ہونے کا بہ ظاہر کوئی سبب
، آتا لیکن بعض ایسی دستاویزی شہادتیں
ہیں جن سے گمان ہوتا ہے کہ چار درویش
کے اواخر میں مکمل ہو چکی تھی۔"

(صفحہ ۱۳۱)

اصل میں یہ بحث بہت تفصیل طلب ہے
اور جیسا میں نے عرض کیا کہ باغ و بہار کی تکمیل سے
متعلق تو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن سنہ اشاعت
سے نہیں کیونکہ:

(i) جب میرامّن نے اسے ۱۸۰۲ء میں تالیف
کیا ہوا لکھا ہے تو پھر یہ ۱۸۰۱ء میں اشاعت
پذیر ہو ہی نہیں سکتی۔

(ii) باغ و بہار انعام کے لیے ۳۱ اگست
۱۸۰۲ء کو کالج کونسل کے سامنے گلکرسٹ
نے پیش کی اور اسی روز اس پر پانچ سو روپے
کا انعام تفویض ہوا میرامّن کی انعام کی عرضی پر
تاریخ درج نہیں ہے۔

(iii) ۱۸۰۲ء میں فورٹ ولیم کالج کی طرف سے
ایک انتخاب ہندی مینول (Hindi Manual)
کے نام سے شایع ہوا تھا۔ یہ ان کتابوں کا انتخاب تھا
جو اس وقت زیرِ اشاعت تھیں اور ان کے کچھ حصے
طبع ہو چکے تھے۔ اس انتخاب میں چار درویش
(باغ و بہار کا پہلا نام) کے ۱۰۲ صفحات بھی
شامل تھے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب
اس وقت تک شایع نہیں ہوئی تھی۔

—— اطہر فاروقی، سکندرآباد

○ اگست کے شمارے میں شمس الرحمٰن فاروقی
صاحب کا مضمون پڑھا۔ جانتا ہوں کہ کسی نقاد کو
چیلنج کرنے کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے لیکن فطرت ہے کہ
مصلحت پر حاوی ہوئی جاتی ہے۔

فاروقی صاحب کو بیانیے سے متعلق بات
کرنے کا شوق ہے لیکن انھیں بیانیے کے طول و عرض
کا علم کچھ کم ہے۔ وہ بیانیے کی قوت اور اس کے سحر سے
نابلد ہیں۔ شاید انھوں نے ان شہ پاروں کا مطالعہ
نہیں کیا جن میں بیانیہ اپنا جلوہ دکھاتا ہے اور اس
کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ شاید وہ یہ بھی نہیں جانتے
کہ افسانہ کسی بھی طور اپنے کو بیانیے سے آزاد نہیں
کر سکتا۔ اُنھیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ بیانیہ سے
چھٹکارا پانے کی شعوری اور لاشعوری کوشش اُن کے
زمانے کے نامور افسانہ نگار دیوندر ستیارتھی سے
زیادہ کسی نے نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں
نے اپنے مضمون میں دیوندر ستیارتھی کی تخلیقات
کا استعمال کرنے کی بجائے حسبِ عادت اور حسب
توفیق مغربی نقادوں کی تحریرات کے اقتباسات
کا سہارا لیا ہے۔

مضمون میں پریم چندی افسانے کی
استرداد یت کا اعلان ڈھول پیٹ کر کیا گیا ہے۔
پریم چند کا زمانہ، اس زمانے کے سماجی، سیاسی،
تہذیبی، معاشرتی اور لسانی تقاضے، اس میں
ہونے والے واقعات اور اُن کا تاثر، اس وقت
کی صورتِ حال اور اس کی عکاسی جس زبان و بیان
کے متقاضی تھے اُن کا شعور فاروقی صاحب کو
نہیں ہے۔ ورنہ وہ پریم چندی افسانہ، جیسی خود
گھڑنت اصطلاح استعمال کر کے اس کا خاکہ نہ
اُڑاتے۔ فاروقی صاحب پریم چندی افسانے کو
مسترد کرنے کا اعلان کرنے سے پہلے اگر اپنے سے یہ
سوال کریں کہ کیا آج بھی افسانے میں پریم چند کو مسترد
کرنے کا حوصلہ ہے تو اُن کے دماغ میں سے نام نہاد
جدیدیت کا بھوت نکل جائے گا اور وہ اپنے مطالعے کو
وسیع کرنے کا عزم کریں گے۔

فاروقی صاحب نے افسانے پر
اپنے مضامین میں کہیں بھی تنقید کے صالح اور اعلیٰ
تقاضوں کو پورا نہیں کیا۔ بس لے دے کر ہمنوا
افسانہ نگاروں کو نوازنے کی کوشش کی ہے۔
آنے والی نسلیں یہ مضامین پڑھیں گی تو یقیناً
مایوس ہوں گی۔

—— کنور سین، نئی دہلی

سید شریف الحسن نقوی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے ثمر آفسیٹ پریس دہلی ۶ سے چھپوا کر دفتر اُردو اکادمی نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

نمبر:
۲۷۶۱ اور ۲۶۳۴۴۸

اُردو اکادمی دہلی کا ماہانہ رسالہ

ادارۂ تحریر
سیّد شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی

جلد: ۱، شمارہ: ۶ ● فی کاپی ۵۰ر۲ روپے، سالانہ قیمت ۲۵ روپے ● اکتوبر ۱۹۸۷ء

حرفِ آغاز ———— سیّد شریف الحسن نقوی ———— ۴

مضامین:

غالب کا نظریۂ وجود ———— نثار احمد فاروقی ———— ۵
دلّی کے آثارِ قدیمہ ———— خلیق انجم ———— ۱۷
امیر خسرو اور سلاطین دہلی ———— رفعت سروش ———— ۳۰
ساغر نظامی — میرے مرحوم شوہر ———— ذکیہ سلطانہ نیّر ———— ۳۴
اطلاع تحقیق اور ہمارا معاشرہ ———— محمد منصور عالم ———— ۴۳
نیوکلیائی کثافت ———— محمد اسلم پرویز ———— ۴۷

افسانے:

چوڑی والا ———— صالحہ عابد حسین ———— ۱۳
اگر ———— آمنہ ابوالحسن ———— ۲۴
مٹھی بھر خاک ———— انل ٹھکّر ———— ۳۸

طنز و مزاح: اکیسویں صدی (نظم) ———— رضا نقوی واہی ———— ۲۲

نظم: اُردو ———— ذکیہ سلطانہ نیّر ———— ۲۸

غزلیں:

غلام ربّانی تاباں / ساحر ہوشیار پوری ———— ۱۲
اعزاز افضل / صبا اکرام / کرشن ادیب ———— ۲۹
مختار شمیم / محمد احمد رمز / رئیس انصاری ———— ۳۷
ضامن علی خاں / مخمور جمالی سنبھلی / نثار نیپالی ———— ۴۶

اُردو خبر نامہ ———— ادارہ ———— ۵۰
آپ کی رائے ———— قارئین ———— ۵۵

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ:
ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی
اُردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خوشنویس: تنویر احمد

سیّد شریف الحسن نقوی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے شمر آفسیٹ پریس دہلی ۶ سے چھپوا کر دفتر اُردو اکادمی نئی دہلی ۲ سے شائع کیا۔

ہماری شروع ہی سے یہ کوشش رہی ہے کہ ہم "ایوانِ اُردو دہلی" کو صرف ادبیات تک محدود نہ رکھیں اور اپنے پڑھنے والوں تک زندگی سے قریبی تعلق رکھنے والے دوسرے علوم وفنون کے بارے میں بھی معتبر معلومات بہم پہنچاتے رہیں۔ ہمیں اس کوشش میں تھوڑی بہت کامیابی ہوئی ہے لیکن ہم اس سے مطمئن نہیں ہیں۔ اب ہم نے مختلف علمی شعبوں سے تعلق رکھنے والے کچھ اور ممتاز حضرات سے رابطہ قائم کیا ہے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ ہم ان سے اُردو ہی میں لکھوا سکیں لیکن جہاں یہ ممکن نہ ہوسکے گا، وہاں ہم کسی دوسری زبان مثلاً انگریزی یا ہندی میں بھی مضامین قبول کرلیں گے اور ان کا ترجمہ خود کرالیا کریں گے۔ ہماری تمنا ہے کہ آزاد ہندوستان میں اُردو ایک ادبی زبان کی حیثیت ہی سے نہیں، علمی زبان کی حیثیت سے بھی پھولے پھلے اور آگے بڑھے۔

زیادہ سے زیادہ قلم کاروں کے ساتھ ساتھ ہم "ایوانِ اُردو دہلی" میں قارئین کی سرگرم شرکت کے بھی خواہش مند ہیں۔ اس کے لیے ہم نے تصویر کے لیے عنوان مانگنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس ماہ سے ہم دو کالم اور شروع کررہے ہیں۔ یہ دونوں کالم قارئین ہی کے لیے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ قارئین ان میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیں گے۔ ان کی تفصیل صفحہ نمبر ۲۱ پر ملاحظہ فرمائیں۔

ہمارے لیے یہ بات مسرت اور اطمینان کا موجب ہے کہ "ایوانِ اُردو دہلی" کو پسند کرنے والے قارئین کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ ہر روز ہمیں ہندوستان کے گوشے گوشے سے ایسے خطوط موصول ہوتے ہیں جن میں رسالے کے اجرا پر اکادمی کو مبارکباد دی جاتی ہے اور اس کی کامیابی کی تمنائیں کی جاتی ہیں۔ ان خطوط میں سے کچھ خطوط ہم ہر مہینے "آپ کی رائے" کے زیرِ عنوان شائع کرتے رہے ہیں۔ اب ایسے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ سے اس کالم میں صرف انھی خطوط کو جگہ دی جائے جن میں رسالے کے مشمولات پر اختصار مگر جامعیت کے ساتھ کوئی مدلل بات کہی گئی ہو، کسی نکتے کی وضاحت کی گئی ہو، کسی سہو وخطا کی طرف اشارہ کیا گیا ہو یا رسالے کو مزید بہتر بنانے کے سلسلے میں کوئی ایسی تجویز رکھی گئی ہو جس پر ہم دوسرے قارئین کی رائے جاننا بھی ضروری خیال کریں۔ اُمید ہے آئندہ "ایوانِ اُردو دہلی" پر اپنی رائے بھیجتے ہوئے آپ ہماری اس گزارش کو ملحوظ رکھیں گے۔

ہم نے خواجہ احمد عباس کے انتقال کے موقع پر اُن کی یاد میں خاص نمبر نکالنے کا اعلان کیا تھا۔ اس نمبر کی تیاریاں جاری ہیں اور امید ہے کہ ہم نومبر میں یہ نمبر پیش کرسکیں گے

بچوں کا رسالہ بھی، امید ہے کہ نومبر میں منظرِ عام پر آجائے گا۔ اس کے لیے اہلِ قلم حضرات سے مضامینِ نظم ونثر بھجوانے کی درخواست ہے۔

ـــــ سید شریف الحسن نقوی

نثار احمد فاروقی
عربک ڈپارٹمنٹ، دہلی یونیورسٹی، دہلی

غالب کا نظریۂ وجود

مذہب کے بارے میں مرزا غالب
یہ تشکیک اور بے یقینی سے زیادہ قلندری و
ی کا ہے۔ وہ خدا کے قائل ہیں، رسالت کے
نا ہیں، امامت کے معتقد ہیں، مگر اعمال و
ت سے انھیں کوئی رغبت نہیں، گو ان کی
ت اور ثواب کے منکر نہیں ہیں:

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

جنّت اور دوزخ کے وجود کا بھی یقین ہے۔
مطلب یہ ہے کہ وہ اسلام کے نظریۂ آخرت
، مانتے ہیں۔ اپنی اس بے عملی کے باوجود
شوخیِ طبع آخرت میں کسی سزا سے پہلے
دہ گناہوں کی حسرت" کی داد طلب کرتی

کردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
رب یہ اگر کردہ گناہوں کی سزا ہے

یہ بھی گمان ہے کہ وہ جنّت میں جائیں گے
سے کوچۂ محبوب کے مقابلے میں ویران
وہاں سے نکل بھاگنے کی کوشش
گے تو رضوان سے خوب جھگڑا

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خُلد میں گر یاد آیا

اس دُنیا کے پری زاد جنھوں نے یہاں غالب کو مُنہ نہیں لگایا، اگر جنّت میں حور بن کر اُنھیں مل گئے تو اُن سے خوب انتقام لینے کا بھی تہیا کیے ہوئے ہیں:

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں

ان حسینانِ جہاں میں جو حرکت، حرارت اور تنوّع پسندی ہے اس سے وہ جنّت میں بھی اُوب جائیں گے، اس تصوّر سے وہ زندگی ہی میں نڈھال ہوتے جاتے تھے کہ:
"وہی ایک زمرّدیں کاخ، وہی طوبیٰ کی ایک شاخ، چشمِ بد دور وہی اِک حور . . ."
یہ سب تو شاعرانہ شوخیاں ہیں، لیکن ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مذہبی عقائد کی بنیادی باتوں پر ان کا ایمان ہے۔ بس ذرا عمل میں آزادگی کا رجحان پایا جاتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد جب دہلی میں مارشل لا نافذ ہوا، تو غالب بھی ایک دن پکڑے گئے اور فوجی کرنیل برن کے سامنے پیش ہوئے تھے۔ اس نے پوچھا: "ویل ٹم مسلمان ہے؟" انھوں نے کہا: "حضور آدھا۔" کرنل نے پوچھا: "آدھا مسلمان کیا ہوتا ہے؟" اُنھوں نے کہا کہ: "حضور میں شراب پیتا ہوں اور سؤر نہیں کھاتا ہوں، اس لیے آدھا مسلمان ہوں۔" اور محذوف شوخی یہ کہ سؤر کھالوں تو میں بھی آپ ہی جیسا ہوں۔!
غالب اپنے صوفی ہونے کا دم بھی بھرتے ہیں۔ وہ حضرت شاہ فخرالدین نظامی محب النبی دہلوی کے پوتے میاں کالے صاحب سے اپنی عقیدت و ارادت کا اظہار بھی کرتے ہیں، کہیں کہیں اپنی شیعیت کا اعلان بھی کیا ہے، مگر ایک دوسرے سیاق میں یہ بھی کہتے ہیں کہ:

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو جو کہ ہووے صوفی
شیعی کیوں کر ہو ماوراء النہری

وہ فلسفی تو نہیں ہیں مگر فلسفیانہ مضامین سے انھیں دلچسپی ہے، اس لیے ان کا نظریۂ حیات و کائنات اُردو کے دوسرے کلاسیکی

شاعروں کے مقابلے میں زیادہ واضح ہے انھوں نے فلسفہ وتصوف کے موضوعات کو مخلوط بھی کیا ہے جس سے اشعار میں گہرائی اور فکر انگیزی پیدا ہوئی ہے :

یہ مسائل تصوّف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

مگر ان کے متداول اُردو دیوان میں ایسے اشعار ۶۰ تا ۷۰ سے زیادہ نہیں ہیں جن میں مسائلِ تصوّف بیان کیے گئے ہوں ۔ البتہ بعض ایسی علامتیں اور محاکاتی حوالے ضرور آگئے ہیں جنھیں مسائلِ تصوّف پر منطبق کیا جا سکتا ہے ۔ اسلامی تصوّف اور عقائد کے مسئلوں میں توحید ایک ایسا موضوع ہے جس سے غالبؔ کو فلسفیانہ دل چسپی رہی ہے ۔ وہ خود کو موحد کہتے ہیں :

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

توحید کو صوفیا نے رأس الطاعات کہا ہے اور رسوم اسی کے ظواہر ہیں جن سے ملّتوں اور فرقوں کی پہچان ہوتی ہے ۔ رسوم وظواہر کی قید اٹھ جانے کو اصطلاح میں کفر، یا کفرِ عشق بھی کہا جاتا ہے ، جو رسموں سے آزاد ہوا اس کے پاس صرف توحید باقی بچے گی ، یعنی ہر اضافت ساقط ہو جائے گی تو ایک بے اضافت حقیقت باقی رہ جائے گی التَّوحیدُ اسقاطُ الاضافاتِ اسی کا نام ہے ۔ غالبؔ نے اس نہایت گہرے اور دقیق مسئلے کو نہایت سہل اور پُراثر انداز میں بیان کیا ہے :

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

توحید اسلام کی بنیاد ہے ، لیکن یہ محض وحدتِ عددی نہیں ہے ۔ فلاسفہ ، متکلمین ، صوفیا اور اصولِ عقائد سے بحث کرنے والے علما نے اس پر اتنی دیدہ ریزی سے بحث کی ہے کہ یہ فلسفے کا نہایت دقیق موضوع بن گیا ہے ۔ اس میں ذات وصفات ، تشبیہ وتنزیہہ ، حدوث وقدم جیسے بہت سے متقاطع مسائل بھی شامل ہوگئے ہیں ۔ فلسفہ جب ان الجھے ہوئے سوالوں کو حل کرنے سے عاجز ہوا ہے تو ہمارے صوفیا نے کشفی اور وجدانی طور پر اسے حل کرنے کا راستہ پایا ہے ۔ شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربی ، امام غزالی اور حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کے بہت سے مباحث کی بنیاد کشف ووجدان ہی پر ہے ۔ ہمارے لیے دو ہی صورتیں ممکن ہیں : یا تو ہم کشف و وجدان کو جھٹلائیں یا اُن کی تصدیق کریں ۔ پہلی صورت میں ہم صرف فلسفے سے استشہاد کر سکتے ہیں جس سے عقیدے کو کچھ زیادہ سروکار نہیں ، دوسری صورت یعنی تصدیق کرنے میں بحث کی گنجایش نہیں رہتی ۔ وجدان سے دلیل حاصل کرنا قرآن کریم سے بھی ثابت ہے ، حضرت یوسف کے قصّے میں حضرت یعقوب علیہ السّلام کا قول موجود ہے : انّی لاجد ریح یوسف لولا ان تفنّدون (یوسف ۹۴) اور حضرتِ موسیٰ کی حکایت میں حضرت خضر کی ساری دلیلیں کشفی اور وجدانی ہیں ۔

آدابِ سلوک میں مقامِ توحید کا مکشوف ہو جانا غایتِ کبریٰ سمجھا جاتا ہے ۔ ان اسرار کو سمجھنے کے تین ممکنہ وسائل ہیں : بحث وعلم کے ذریعے سے ، مشاہدہ وعرفان کے وسیلے سے اور کشف و وجدان کے واسطے سے ۔ جن حضرات پر توحید مکشوف ہوئی ہے انھیں مرتبۂ حق الیقین کشف ہی سے حاصل ہوا ہے اور پھر وہ عالمِ بے رنگی میں پہنچ گئے ہیں جہاں کلام بھی حرف وصوت کا محتاج نہیں رہتا :

اے خدا بنما تو جان را آن مقام
کاندران بے حرف می روید کلام

غالبؔ کا توحیدی ذوق فلسفہ وتصوّف کی کوئی گہری بنیاد نہیں رکھتا ، اس کا تعلّق کشف و وجدان یا مشاہدہ وعرفان سے بھی نہیں ہے ۔ تصوّف کے کچھ روایتی مسائل ہیں جنھیں غالبؔ نے اپنے نظریۂ حیات وکائنات کے دائرے میں دیکھا اور پرکھا ہے ، انھیں مسائل کو شاعرانہ لطافت اور حکیمانہ ذہانت کے ساتھ بیان کر دیا ہے ۔ اُن کے فکر میں ویدانت کا پرتو بھی ہے اور یہ بالواسطہ آیا ہے ۔ اپنشد کہتے ہیں کہ واجب الوجود ایک حقیقتِ مطلقہ وحقیقتِ اعلیٰ ہے جس کا کوئی شریک نہیں ، اس کے سوا دوسرا کچھ موجود نہیں ، باقی سارے وجود "مایا" ہیں یعنی محض اعتباری ہیں ، بقول میرؔ :

یہ توہّم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

"ایکم برہم دویتو ناستے" غالبؔ اپنے خطوں میں بار بار لاموجود الا اللہ ولا موثّر فی الوجود الا اللہ کا نعرہ بلند کرتے ہیں ۔

مسئلہ دراصل یہ ہے کہ فنا وبقا کیا ہے اور خالق ومخلوق کا رشتہ کیسا ہے ؟ صوفیا ایک حدیث قدسی کثرت سے بیان کرتے ہیں جسے گروہ محدثین ضعیف کہتا ہے : کنتُ کنزاً مخفیاً فاَحببت ان اُعرف فخلقت الخلق کہ میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا ، میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں تو میں نے خلق کو پیدا کیا ۔

جو فلسفیانہ اشکال پیدا ہو۔ ے
نے بڑی خوبی سے بیان کیا ہے:

صلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
یراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

وجود یا شہود ایک ہی ہے تو جو شاہد ہے شہود ہے تو آخر مشاہدہ کون کس کا کر رہا ہے؟ نہ غیبی کی پہچانے جانے کی خواہش تو وجودِ غیر طالبہ کرتی ہے۔ اسی نے یہ سوال پیدا کیا کہ ب الوجود ایک ہی ہے تو وہ ازلی وابدی بھی اس کی صفات کیا اس کی ذات سے الگ ہے؟ اگر یہ مان لیں تو ذات بحت سے حادث پیدا ہونا لازم آتا ہے۔ اپنشد کہتے ہیں کہ صفاتِ وندی بالفعل ظاہر ہیں شیخ اکبر انھیں وراتِ علمیہ اور اعیانِ ثابتہ کا نام دیتے ہیں یدانت اسی کو "مایا" کہتا ہے۔ حضرت مجدد رح فرماتا ہے وجود ایک نہیں ہے، دیکھنے میں ایک علوم ہوتا ہے اسی کو وحدتِ شہود کہتے ہیں خدا نے کائنات کو مرتبۂ وہم میں خلق کیا ہے، ہم سے موجود سمجھتے ہیں مگر وہ درحقیقت وہوم ہے:

ہست از پسِ پردۂ گفتگوے من و تو
چون پردہ بیفتد نہ تو مانی و نہ من

یہ وہمِ ہستی ایسا ہے کہ اس کی نمود تو ہے وجود نہیں ہے۔ غالب کہتا ہے:

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ "ہے" پر ہمیں منظور نہیں

یہ وہی مرتبۂ وہم میں خلق ہونے کا مسئلہ ہے کہ محبوب کی کمر ہے بھی اور نہیں بھی۔

شیخ اکبر نے ایک اور لطیف نکتہ پیدا کیا ہے۔ عربی میں آدمی کو انسان کہتے ہیں اور انسان آنکھ کی پتلی کو بھی کہا جاتا ہے۔ اور عجیب اتفاق ہے کہ فارسی میں مردم کا بھی یہی حال ہے کہ دونوں معنی رکھتا ہے، عجیب تر یہ کہ اردو اور ہندی میں پتلی اور پتلا بھی یہی دونوں مفہوم رکھتے ہیں۔ شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ خدا حسن مطلق اور تجلّی ازلی تھا لیکن اپنے آپ کو دیکھنے کی خواہش رکھتا تھا، اس نے "انسان" کو پیدا کیا جو گویا ذاتِ مطلق کی آنکھ کی پتلی ہے۔ اسے غالب نے یوں کہا ہے:

جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

آئینہ وجودِ ازلی ہے اور یہ کائنات اس آئینے کا زنگار ہے اور جوہرِ آئینہ پلکوں کی شکل بن گیا ہے، جو "تقاضائے دیدار" کا اثر ہے۔

خلق اور خالق کے رشتے کو صوفیا اور فلاسفہ نے متعدد تشبیہوں سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ نوفلاطونی فلسفے میں اسے اشراق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن میں بھی خدا کو نور السمٰوات والارض کہا گیا ہے، صوفیا جب ذات بحت کی تجلّی کا مشاہدہ کرنے کی منزل میں پہنچتے ہیں تو وہاں تاریکی ہی تاریکی بتاتے ہیں اور جدید سائنس بھی یہ کہتی ہے کہ جب نور کا وفور اپنی ایک خاص غایت کو پہنچتا ہے تو وہ سیاہی میں تبدیل ہو جاتا ہے کسی نے وجودِ کائنات کو برف سے تشبیہ دی ہے جس کا وجود پانی کے سوا کچھ اور نہیں، پھر بھی پانی سے الگ نمود رکھتا ہے اور تحلیل یافتہ ہو کر پھر پانی بن جاتا ہے۔ اسی طرح کائنات میں وجودِ غیر محض اعتباری ہے۔ اسے اصل اور ظلّ کا رشتہ بھی بتایا گیا ہے۔ سایے کا اپنا مستقل وجود نہیں، وہ اصل سے الگ بھی نہیں اور خود اصل بھی نہیں، وہ فنا بھی ہو جاتا ہے، اصل اور ظلّ پر دوئی کا شبہ بھی ہوتا ہے، مگر یہ دوئی محض وہمی و اعتباری ہے۔ بعض شعرا نے ہستیِ ممکن کو ہستیِ واجب الوجود کا خواب کہہ دیا ہے:

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

یعنی ایک نظریہ تو یہ کہ ہم عالمِ خواب میں ہیں اور سارے کارخانے کو ہم اسی کے۔ نہ چلتا ہوا دیکھ رہے ہیں، موت ہماری بیداری ہوگی اور یہ خواب ٹوٹ کر معدوم ہو جائے گا۔ حضرت علی سے یہ قول منسوب ہے کہ الناس نیام فاذا ماتوا انتبھوا (لوگ سو رہے ہیں، مر گئے تو گویا بیدار ہو جائیں گے)۔

دوسرا نظریہ یہ کہ ہستیِ واجب الوجود خواب دیکھ رہی ہے، یا حقیقتِ مطلقہ عالمِ خواب میں ہے، ہم سب اس خواب کے کردار ہیں، جب وہ ہستی بیدار ہوگی تو ہم نابید ہوں گے۔

زندگی اور اس میں کثرتِ مظاہر کو سمندر سے بھی تشبیہ دی گئی ہے۔

ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

سمندر ایک وسیع حقیقت ہے، اس میں لہریں بھی اٹھ رہی ہیں، حباب بھی پیدا ہو رہے ہیں، قطرہ بھی اسی سمندر سے نکلتا ہے اور پھر اپنی نمود کھو کر سمندر کا حصہ بن جاتا ہے، لیکن ان سب اشکال وصور کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہے۔

یہ علامت غالب کا پسندیدہ موضوع ہے :

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

دوسری جگہ کہتے ہیں :

دل ہر قطرہ ہے سازِ "انا البحر"
ہم اُس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا

اور :

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

غالب نے شبنم و خورشید کی علامتوں میں بھی فنا و بقا کے اس رشتے کو بیان کیا ہے :

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

شبنم کا وجود بھی حادث اور وہمی ہے اور اس کا اشتیاق بھی ایک بڑی ہستی میں ضم ہونے کے لیے ہے جب تک وہ مہرِ حقیقت طلوع نہیں ہوتا، 'شبنم' 'موجود' ہے، لیکن خورشید کی نظرِ عنایت اُسے مقصدِ اعلیٰ سے ہمکنار کر دیتی ہے۔

کائنات کی کثرت اور ذاتِ مطلق کی احدیت کو 'ذرّہ و خورشید' کی تمثیل میں بھی بیان کیا جاتا ہے۔ سورج کی روشنی کہیں سے چھن کر آتی ہے تو چھوٹے چھوٹے ذرّے وجد و کیف کے عالم میں رقص کرتے ہوئے اور کرنوں کے سہارے خورشید کی طرف صعود کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بعض صوفیا نے کائنات کی قوتِ محرکہ عشق کو بتایا ہے۔ زمین کی گردش، لیل و نہار کا انقلاب، ستاروں کا طلوع و اُفول، یہ سب عشق ہی کے مظاہر ہیں۔ اس کیفیت کو ذرّہ و خورشید کی علامتوں سے بہت سے شاعروں نے بیان کیا ہے مگر غالب نے اس میں فلسفیانہ گہرائی کے ساتھ شاعرانہ نفاست بھی پیدا کر دی ہے :

ہے تجلّی تری سامانِ وجود
ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں

جہاں روشنی ہوگی وہیں ذرّے نظر آئیں گے، یہ نہ ہو تو وہ بھی نہ ہوں گے :

ہوئے اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پُرافشاں جوہر آئینے میں مثلِ ذرّہ روزن میں

از مہر تا بہ ذرّہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

ایک اور استعارہ رشتہ و گرہ کا ہے۔ کسی ڈورے میں گرہ ڈال دیجیے تو اس کی اپنی نمود ہوگی، مگر وجود کچھ نہیں ہے گرہ کھول دیں تو وہ دھاگا ہی باقی بچے گا۔ صورِ علمیہ کا شیخ اکبر کا نظریہ یہ ہے کہ لکڑی سے ہزاروں چیزیں بنتی ہیں، میز، کرسی، کواڑ، الماری وغیرہ۔ ان کے وجود کی اصل لکڑی ہے۔ اگر کوئی چاہے کہ کرسی کی شکل کو لکڑی سے جُدا کر کے دیکھ سکے تو وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔

وجود کی ایک اور تشبیہ لوہے اور آگ سے بھی دی گئی ہے۔ لوہا آگ میں رہ کر خود بھی سُرخ ہو جاتا ہے اس میں آگ کی صفات بھی پیدا ہو جاتی ہیں، پھر وہ اپنی اصلی حالت پر واپس آتا ہے تو وہ کیفیات زائل بھی ہو جاتی ہیں۔ یہ تشبیہ وحدت الشہود کے نظریے کی ترجمان ہے۔ غالب کا پسندیدہ استعارہ عکس اور آئینے کا ہے اور یہ بھی شہود کی وحدت یا ظلّیت کو بتاتا ہے۔

غالب کا رجحان وحدت الوجود کی طرف ہے مگر اس میں اُن کا ذہن بہت زیادہ واضح نہیں ہے نہ وہ اس فلسفے کی باریکیوں میں جاتے ہیں۔ کبھی وہ ویدانتی نظریے کے ترجمان ہیں، کہیں فلسفے سے اخذ کرتے ہیں، کبھی وحدت الشہود کے قائل نظر آتے ہیں۔ مگر انھوں نے ان مضامین کو شاعرانہ آب و رنگ دے کر بہت دل نشیں ضرور بنا دیا ہے۔ حقیقتِ مطلقہ عیاں بھی ہے اور مستور بھی :

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

سارے مظاہرِ کائنات اسی کی تجلّی کی صفات ہیں :

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے
آئینہ داریِ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

ہر شے میں اُسی کا جلوہ ہے پھر بھی وہ سب سے جُدا سب سے الگ ہے :

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

پھر وہ عالم بے رنگی کی سرحد تک پہنچ کر پکار اٹھتے ہیں :

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب
آخر تو کیا ہے ؟ اے "نہیں ہے"

ویدانتی اثر سے وہ دُنیا کو مایا جال اور لیلا بھی سمجھنے لگتے ہیں :

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے
جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

…ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں کثرتِ جلوہ …اب بن گئی ہے، اس لیے کوئی اُسے دیکھ …ہیں سکتا:

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیمروز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں مُنہ چھپائے کیوں

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز
تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

رؤیتِ باری کا مسئلہ بھی فلسفہ و کلام کے اُلجھے ہوئے مباحث میں سے ایک ہے۔ انسان کی آنکھ خدا کو دیکھ سکتی ہے یا نہیں دیکھ سکتی، دونوں کے بارے میں مختلف شواہد دیے گئے ہیں۔ حضرت موسیٰ نے جب خواہش دیدار کی اور رَبِّ اَرِنِیْ کہا تو اُنھیں جواب ملا کہ لَنْ تَرَانِیْ "تم مجھے نہیں دیکھ سکتے"، پھر قرآن شریف میں ہے "لاتدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار" اس نورِ مطلق کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں مگر وہ آنکھوں کو دیکھ سکتا ہے۔ فلاسفہ کہتے ہیں کہ رؤیت کے لیے مکان، جہت اور لون کی شرط ہے، اس سے خدا کا محدود ہونا لازم آتا ہے مگر قرآن ہی میں "وجوہٌ یومئذٍ ناضرۃٌ الیٰ ربّھا ناظرۃ" بھی آیا ہے کہ قیامت کے دن خوشی سے دمکتے ہوئے چہرے خدا کو دیکھتے ہوں گے۔ متکلّمین کہتے ہیں کہ آخرت کی رؤیت کو ہم دُنیا کی رؤیت پر قیاس نہ کریں، خدا ہی جانتا ہے کہ وہاں دیدار کس شکل میں ہوگا۔ نورِ حقیقت کا ایک ہلکا سا پرتو اِن مجازی مظاہر میں نظر آتا ہے، مجرّد کیفیت میں اُسے کہاں دیکھا جا سکتا ہے:

منظور تھی یہ شکل تجلّی کو نور کی
قسمت کُھلی ترے قد و رُخ سے ظہور کی

مظاہر کی یہ رنگا رنگی حیرت کے سبب سے ہے کہ اس تجلّی کا تحمّل دشوار ہے:

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ ترے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالمِ شبنمستاں کا

لاکھ پردوں میں چُھپنے کی کوشش کے باوجود وہ ہر طرف عیاں ہے، اس کی مستوری میں بھی ایک لبھانے والی ادا ہے:

مُنہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے مُنہ پر کھلا

ان پردوں سے بھی ایسی مسحور کن پُر اسرار آوازیں سُنی جا سکتی ہیں جو حقیقتِ مطلقہ کا پتا دیتی ہیں:

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

اُسے دیکھنا اس لیے ممکن نہیں کہ اس کے سوا غیر کا وجود ہے ہی نہیں:

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بُو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ کائنات اور اس میں جو کچھ ہے دائمی تگ و دو میں لگے ہیں اور حقیقتِ مستورہ کی تلاش میں سرگرداں ہیں:

تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک
بے اختیار دوڑے ہے گُل در قفائے گُل

غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گُلِ جیبِ قبائے گُل

غالب جانتے ہیں کہ وہ حسنِ ازلی وہ حقیقتِ مطلقہ وراء الورا ثم وراء الورا ہے، احاطۂ ادراک میں نہیں آسکتا لیکن یہ سب مظاہر اُسی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اور حسنِ کائنات ہی میں حسنِ ازلی کو تلاش کیا جا سکتا ہے؛ رسوم و ظواہر مقصود بالذّات نہیں ہیں:

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

ہمارے اور حسنِ مطلق کے درمیان ایک حجاب تو اپنی ہستی ہی ہے بقول میرؔ:

ہستی اپنی ہے بیچ میں پردہ
ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں

دوسرا حجاب "وہمِ غیر" ہے، یہ عرفانِ نفس میں مانع ہوتا ہے اور من عرف نفسہٗ فقد عرف ربّہٗ

آتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اس کے اسرار بھی عجیب ہیں، الآن کما کان اور کلّ یومٍ ھو فی شان دونوں باتیں بیک وقت صادق آتی ہیں حالانکہ ان میں منطقی تضاد موجود ہے۔ کائنات میں جو تغیّر ہے، زوال اور فنا کے جو مناظر ہم دیکھ رہے ہیں ان کی غالب ایک اور توجیہ کرتا ہے؛ جیسے حسنِ ازلی اپنی آرائش میں مصروف ہے اور کائنات کا ذرّہ ذرّہ تمنائے دیدار میں سرشار ہے جب وہ اپنی نقاب اُلٹے گا تو اس کی ذات کے سوا یہاں کچھ بھی نہ ہوگا:

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

وہ ذاتِ واجب الوجود جو ستّر ہزار پردوں میں چھپ کر بھی ہر شے میں آشکارا ہے، ہر شے کا مطلوب و مقصود بھی ہے اُسے پالینا اسی لیے دشوار ہے کہ وہ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ نحن اقرب الیہ من حبل الورید غالب نے اس

نکتے کو سہلِ ممتنع میں بیان کیا ہے :

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

پھر وہ ایک دلچسپ مضمون عاشقانہ رنگ میں سنوارتا ہے۔ آخر یہ معمّا کیا ہے کہ بقول شاعر :

بے حجاب اتنا کہ جلوہ اس کا ہر ذرّے میں ہے
اور حجاب اتنا کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

جب وہ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اور دل بھی اُسی کی جلوہ گاہ ہے (فی انفسکم افلا تبصرون) روح بھی اسی کی صدا پر وجد کر رہی ہے تو درمیان میں یہ پردہ آخر کیوں ہے؟ یہ کہہ سکتے ہو "ہم دل میں نہیں ہیں؟" پر یہ بتلاؤ کہ جب دل میں تمھیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو؟ جواب — ملاکہ تمھارے جذبے میں اخلاص کی کمی معلوم ہوتی ہے۔ سچّے دل سے لگن کے ساتھ ہمیں ڈھونڈھو گے تو پا جاؤ گے غالبؔ جیسا شوخ طبع شاعر ان طفل تسلّیوں سے بہلنے والا کہاں کہتا ہے :

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے؟
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو؟

وحدت الوجود کا فلسفہ تمام تر ذوقی اور کشفی چیز ہے، عام آدمی تو اسے کبھی بھی نہیں سمجھ سکتا، خواص میں علمائے ظاہر تضاد اور تناقض کے خارزار میں اُلجھ کر رہ جاتے ہیں، علمائے باطن یعنی صوفیا پر یہ بقدرِ ظرف مکشوف ہوتا ہے۔ اگر گوشۂ نقاب ذرا سا زیادہ سرک جائے تو وہ عالم ہوتا ہے جیسے عبدالرحیم خان خاناں نے یوں کہا ہے :

رحیمن بات اگم کی کہن سنن کی ناہیں
جانت ہیں سو کہت نہیں کہت سو جانت ناہیں

ساری پہنائیوں کے ہوتے ہمارا خیال بہرحال محدود ہے، اس میں وہ لامحدود کیسے سما سکتا ہے؟ جب ہم قید وجود سے آزاد ہوں گے تو خیال کا تنگ دائرہ بھی ٹوٹ جائے گا، اب اس کا ادراک آسان ہوسکے گا۔ اس نہایت لطیف اور دقیق مضمون کو مولانا روم نے ایسی خوبی سے بیان کر دیا ہے کہ الفاظ معدوم اور معنی مجسم ہوگئے ہیں :

من زتن عریاں شدم او از خیال
می خرامم در نہایت الوصال

غالبؔ بھی عجز ادراک کے معترف ہیں :

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

لیکن طالب کی نظر اپنے مطلوب پر رہنی چاہیے۔ پریشاں نظری سے پراگندہ دلی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا یہاں کثرت میں وحدت ہے کیفیات میں تضاد اور تخالف ہے، تجلّی اسمار کی ہر آن نرالی شان ہے، اس میں سررشتۂ مقصود کا تلاش کر لینا ہی کمال ہے۔ وہی دلیلِ وحدت بن جاتا ہے :

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے
سر پائے خم پہ چاہیے ہنگامِ بے خودی
رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے
یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے

غالبؔ کے کلام میں حیرت، استعجاب، تشکیک اور استفہام کا مصدر و منبع دراصل یہی مسئلۂ وجود ہے اور اسی عینک سے وہ اپنے گرد و پیش کی کائنات کو دیکھتے ہیں :

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آتے ہیں
ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے

یہ سوالات سیدھے سادے ہیں مگر ان کے جواب بہت اُلجھے ہوئے ملتے ہیں، غالبؔ مایوس نہیں ہوتے نہ طلب سے دست بردار ہونا چاہتے، یہ صحیح ہے کہ اُسے کوئی نہ پا سکا :

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

لیکن مقصود طلب کی لذت ہے اس میں اپنے سے گذر جانا اس سے اچھا ہے کہ تھک بیٹھ جائیں :

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

اسی کشاکش طلب سے یہ کارخانۂ ہستی رواں پذیر ہے، فنا کی جبلّت ہی نے بقا کی صلاحیت پیدا کی ہے :

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو فرصت روانی کی

یہی طلب ہمیں زندہ رکھے ہوئے ہے اور ہمارا سامانِ مرگ بھی ہے :

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہوگئے
کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہوگئے

اپنے ایک قصیدے کی تشبیب میں انھوں مسئلۂ وجود کو غیر معمولی حسنِ بیان سے منظوم کیا ہے :

ہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں
بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنّا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
[illegible]رزہ ہے نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم
[illegible]غو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں
نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت
سخنِ حق : ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں
[illegible]فِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے، چہ دنیا و چہ دیں
مثلِ مضمونِ وفا، باد بہ دستِ تسلیم
صورتِ نقشِ قدم، خاک بہ فرقِ تمکیں
عشق بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس
وصل، زنگارِ رخِ آئینۂ حسنِ یقیں
کوہکن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بے ستوں آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں
کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز
کس نے پایا اثرِ نالۂ دلہائے حزیں
[illegible] توحید انھیں مرتبۂ تسلیم تک پہنچاتی ہے :

[illegible]سد سودائے سر سبزی سے ہے تسلیم رنگیں تر
[illegible]کشتِ خشک اس کا، ابرِ بے پروا خرام اس کا

اے اسد بے جا ہے نازِ سجدۂ عرضِ نیاز
عالمِ تسلیم میں یہ دعویٰ آرائی عبث

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

[illegible]ور :

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اسی پر ان کے نظریۂ حیات و کائنات کی اساس ہے، وحدت میں کثرت آرائی ان کی آنکھیں کھولتی ہے اور انھیں جزو میں کُل کا جلوہ دیکھنے کے قابل نگاہ عطا کرتی ہے :

اسد بندِ قبائے یار ہے فردوس کا غنچہ
اگر وا ہو تو دکھلا دوں کہ یک عالم گلستاں ہے

اور یہی وہ موضوع ہے جو لطیف ترین احساسات کو بیدار کرتا ہے، ذوقِ تماشا ابھارتا ہے، تمنائے چیدن پیدا کرتا ہے، یہی اُن کے حکیمانہ افکار کا منبع ہے، اسی میں وہ کرب پوشیدہ ہے جس کی زیریں لہر ہمیں ان کی شاعری میں جا بجا نظر آتی ہے اسی نے انھیں فکر کا وہ گداز بخشا ہے کہ :

آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جاتے ہے

اور :

ہجومِ فکر سے دل مثلِ موج لرزاں ہے
کہ شیشہ نازک و صہبا ہے آبگینہ گداز

انھیں مضامین کے سہارے وہ آکاش سے پاتال تک سیر کرتے ہیں یہی اُردو کے تمام شاعروں کے مقابلے میں ان کے غالب ہونے کا راز ہے۔

○

رفتید ولے نہ از دلِ ما

اس شمارے کی کاپیاں پریس جا رہی تھیں کہ تین اندوہناک حادثوں کی خبر ملی۔ مہادیوی ورما ہندی کی عظیم شاعرہ تھیں، انھیں دیگر اعزازات کے علاوہ ہندوستان کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ گیان پیٹھ پرسکار بھی ملا تھا اور پدم بھوشن کا خطاب بھی۔ موجودہ صدی کی ہندی شاعری کو جن لوگوں نے نئے ابعاد دیے ان میں سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا، سمترا نندن پنت اور مہادیوی ورما کے نام سرفہرست تھے۔ ۱۱ ستمبر کو چند ماہ کی علالت کے بعد الہ آباد میں ان کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر لگ بھگ اسّی برس تھی۔ سالِ پیدائش ۱۹۰۷ء تھا۔

فکر تونسوی اُردو کے مقبول ترین طنز و مزاح نگار تھے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز لاہور سے ہوا لیکن تقسیمِ ملک کے بعد وہ ہندوستان آ گئے اور دِلّی کو اپنا مستقر بنایا جہاں وہ سالہا سال تک روزنامہ "ملاپ" میں "پیاز کے چھلکے" کے عنوان سے طنزیہ و مزاحیہ کالم لکھتے رہے۔ اس کالم میں وہ ان ریاکاریوں کو بے نقاب کیا کرتے تھے جو ہمارے سماج کے ہر شعبے میں سرایت کر گئی ہیں اور ہماری قومی اور عوامی زندگی کو گھن کی طرح چاٹ رہی ہیں۔ فکر صاحب کو متعدد انعامات و اعزازات حاصل ہوئے اور ان کی بہت سی تصانیف نے قبولِ عام پایا۔ فکر صاحب نے ۱۲ ستمبر کی رات کو ۷۰ سال کی عمر میں دلی کے جی۔ بی۔ پنت اسپتال میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ان پر تیسری بار فالج کا حملہ ہوا تھا۔

فکر صاحب نے اپنے انتقال سے پہلے "ایوانِ اُردو دہلی" کے لیے ایک مضمون "دوستوں کے نام" عنایت کیا تھا۔ اسے ہم اگلے شمارے میں شائع کر رہے ہیں۔ یہ غالباً ان کی آخری غیر مطبوعہ تحریر ہو گی۔

دیوراج دنیش ہمعصر ہندی شاعری کا ایک اہم نام تھا۔ ۱۸ ستمبر ہی کو دِلّی میں ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ دل کا دورہ پڑنے کے بعد انھیں آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں داخل کیا گیا تھا جہاں چند گھنٹے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ ۵۸ برس کے تھے۔

غلام ربّانی تاباں

بستیوں میں ہونے کو حادثے بھی ہوتے ہیں
پتھروں کی زد پر کچھ آئینے بھی ہوتے ہیں

عافیت سفینوں کی سیلِ آب میں معلوم
بات یہ ہے کچھ مانجھی سرپھرے بھی ہوتے ہیں

شہرِ آشنائی کی رِیت کچھ نرالی ہے
قُربتوں کے پیمانے فاصلے بھی ہوتے ہیں

گود میں بیاباں کے تشنگی بھی پلتی ہے
دُور تک سرابوں کے سلسلے بھی ہوتے ہیں

دشتِ شوق میں کس کو دادِ خستگی دیجے
ہمسفر مسافر کے راستے بھی ہوتے ہیں

موجِ گُل کے موسم سے موجِ خوں کے موسم تک
طے کئی غمِ دل کے مرحلے بھی ہوتے ہیں

گردِ رہگذر تاباںؔ ننگِ رہگذر کیوں ہو
گرد میں چھپے اکثر قافلے بھی ہوتے ہیں

ساحر ہوشیارپوری

بہاروں کا پرتو خزاؤں میں ہے
اثر کچھ تو اپنی دُعاؤں میں ہے

مَیں کیوں اپنے سایے سے ڈرتا رہوں
کہ یہ تو مرے آشناؤں میں ہے

سمجھتے ہیں ہر شخص کو دیوتا
بڑا عیب یہ دیوتاؤں میں ہے

زمیں پر بھی ہیں کچھ خُدا تو، مگر
رعونت بڑی اِن خداؤں میں ہے

ستاروں پہ ڈالی ہے کس نے کمند
یہ کیا غلغلہ سا خلاؤں میں ہے

بڑے تیرہ و تار ہیں قصر و بام
مگر روشنی کچھ گپھاؤں میں ہے

یہ کس شہر میں آگئے ہیں میاں
یہ خوشبو سی کیسی فضاؤں میں ہے

خطا ہم کریں اور تو بخش دے
بڑا لُطف ایسی خطاؤں میں ہے

امارت نہیں پھر بھی ہیں نام ور
کرامت یہ ہم بے نواؤں میں ہے

کسی خوش ادا ہی کا ہے یہ کرم
جو شہرت مری خوش نواؤں میں ہے

کبھی رِندِ مشرب تھا ساحرؔ، مگر
شمار اُس کا اب پارساؤں میں ہے

۱۱۰ - اے، ذاکر نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔
۲۲۶۹ - سیکٹر ۲۸، فرید آباد ۱۲۱۰۰۳۔

صالحہ عابد حسین

عابد وِلا، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۔

چوڑی والا

"چوڑیاں" کانچ کی چوڑیاں، سیشے
گلاس، بچّوں کے کھلونے "گولیاں" شام کا وقت،
ب ہوتے سورج کی سُرخ و سنہری کرنیں ہرے ہرے
ے پر سونا بکھیر رہی تھیں۔ گھر والیاں، سارے دن
کاموں سے تھک کر بیٹھی سُستا رہی تھیں — گلی
چوڑی والے کی آواز سُن کر چونک پڑیں۔ بھلا کون
اَگن ہوگی جسے چوڑیوں کی چاہ نہ ہو؟ اِدھر سے
سر سے عورتوں نے جھانکنا شروع کیا اور سب سے
صحن والے چودھرائن کے گھر میں بوڑھے چوڑی والے
بلالیا بلکہ وہ خود ہی آگیا۔ عادت جو تھی اور چار چھ
نہ اس کے بڑے سے ٹوکرے کو سہارا دینے کو بڑھے۔

چوڑی والے نے گردن پھیر کر دیکھا۔ ایک حسین
نوجوان لڑکی، سُرخ کنارے کی ساڑھی کا چھوٹا سا
گھونگھٹ ماتھے تک نکالے جس میں مانگ کا سُرخ
سِندور جھلک رہا تھا۔ ناک میں ننّھی سی کیل دمک
رہی تھی۔ کانوں میں سونے کی بالیاں ہلکورے لے رہی
تھیں جن کی دمک اس کے سنہرے رنگ کے چہرے سے
ماند پڑ گئی تھی اور چہرے پر وہ دلکش مسکراہٹ تھی
جو دیویوں کا حصّہ ہوتی ہے۔

"چوڑی والے تمھارے پاس لال چوڑیاں ہیں؟"

"ہاں ہاں ہر رنگ کی ہیں — تمھیں کس کے
لیے چاہئیں؟"

لڑکی ہچکچائی — "تم چوڑیاں دے دو میں
خود پہن لوں گی" شرما کر لڑکی نے کہا۔

"نہیں ماں میں اپنے ہاتھ سے تمھیں چوڑیاں
پہناؤں گا۔ بالکل ایسی جیسے انگوٹھی پر نگ — ان
پھول جیسے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ سے چڑھاؤں گا۔ یہ
میرا سو بھاگیہ ہوگا — ماں" اس بستی میں بوڑھے
لڑکیوں کو بھی ماں کہتے — کبھی نہیں —

چوڑی والے کے ذہن میں، جب سے اس
نے یہ کاروبار شروع کیا تھا اس وقت سے لے کر
آج تک کے واقعات چکّر لگا رہے تھے۔ اس نے
ہزاروں گھروں میں چوڑیاں پہنائی ہوں گی۔ محلّوں
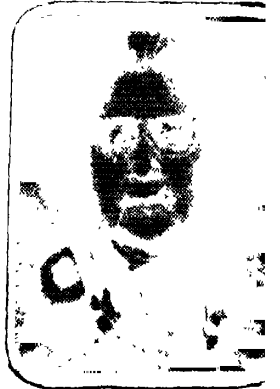
مر بچّوں نے دھاوا بولا، اُدھر ماؤں نے للچائی نظروں
رنگ برنگی، کامدار، شیشے کی چوڑیوں کو جو دسیوں
ح کی تھیں آنکنا شروع کر دیا۔ بوڑھے نے بچّوں کے
پر ہاتھ پھیرا، عورتوں کو سہاگ کی دُعائیں دیں —
جو، جو جو پسند کرتا گیا اُسے اس کی پسند کی چیزیں
اگیا..... اور جب وہ وہاں سے نکلا تو گلی کے
طرف کھڑکی میں ایک چہرہ چمکا۔ ایک شیریں آواز
— "چوڑی والے اِدھر آؤ" کمرے کے اس
ے پر ایک لڑکی کھڑی اُسے اشارے سے بلا رہی تھی۔
ڑی والے — اے چوڑی والے" ڈھلتی عمر کے

"اپنے لیے — لال لال — خوب صورت
لال۔"

"بیٹی تمھاری ان صندلی کلائیوں پر تو کالی
چوڑیاں بہت بھلی لگیں گی۔" چوڑی والا تھا تو خاصا
بڈھا مگر ایسی حسینہ کو دیکھ کر اس کا دِل بھی
مچل اُٹھا۔

"نہیں بابا — ہمیں لال چوڑیاں دو۔"

"بہت شوقین ہو لال چیزوں کی" بڈھے
چوڑی والے نے ہنس کر کہا — "ذرا ہاتھ تو
دِکھاؤ —"

میں، کوٹھیوں میں، معمولی گھروں میں، جھونپڑیوں میں،
کیسی کیسی حسین، مہ پارہ، دلکش لڑکیاں، بہوویں،
ادھیڑ عورتیں اور بوڑھی شوقین سہاگنیں اس کی نظر
سے نہ گزری تھیں۔ مگر اس حسینہ کے چہرے پر کچھ
ایسی دلکشی، کچھ ایسی شانتی، کچھ ایسی مسکراہٹ
اور ایسی روحانیت تھی۔ اس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں
میں کچھ ایسی چمک اور گھٹنوں کو چھوتے کالے بالوں
میں جنھوں نے اس کا آدھا جسم ڈھک رکھا تھا، ایسا
جادو تھا کہ اس کا جی چاہتا تھا کہ بس وہ اُسے دیکھے
جائے۔ اُسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اگر اس وقت

اس نے اس پیاری سی پھول سی لڑکی کو چوڑیاں نہ پہنائیں تو سب کیا کرایا سارا پیشہ، ساری عمر اکارت گئی۔ ایسے ہی ہاتھوں کی جستجو میں تو جیسے اس نے زندگی بتائی تھی، کالا سر سفید کیا تھا۔ ان ہی کی تلاش میں تو جوانی گنوائی تھی اور اس کے بوڑھے جسم میں خون گردش کرنے لگا۔ یہ ـــ یہ ـــ پیاری سی لڑکی اس کی ماں ہے، بہن ہے، بیٹی ہے، دیوی ہے ـــ جس کی وہ پوجا کر سکتا ہے۔ "نہیں ماں میں خود تمھیں چوڑی پہناؤں گا، نہیں تو یہ کام ہی چھوڑ دوں گا ـــ" اس نے کچھ مسکرا کر کچھ بھرائی آواز میں کہا ـــ لڑکی شرما گئی۔ گندمی رنگ میں سرخی کی جھلک آگئی مگر کچھ کہا نہیں اور اپنا چھوٹا سا، موزوں، گلابی گلابی ہاتھ چوڑی والے کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے بڑے پیار، بڑے ادب، بڑی محبت سے اس ہاتھ کو تھاما اور چوڑیاں چھانٹنے لگا۔ وہ بہت سی الگ ڈال دیتا۔ جیسے وہ اس کے قابل نہ ہوں۔ لڑکی کا کنول جیسا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا اور اس کا جی چاہتا تھا کہ اس ہاتھ کو اپنے آنسوؤں سے دھو ڈالے۔ جانے کیوں اس کا دل امنڈا آرہا تھا ـــ جانے کیوں اُسے وہ اپنی چار سالہ بچی ایک ایک دم یاد آگئی جو وبائی بیماری کا شکار ہوگئی تھی ایسی ہی نرم، نازک، حسین، کومل کنول اور گلاب کے میل سے بنے اس کے ننھے ننھے ہاتھ بھی تھے ـــ وہ ان کو اپنے بوڑھے ہونٹوں سے چھونا چاہتا تھا، وہ ان پر مقدس پاک بوسوں کی بوچھاڑ کرنا چاہتا تھا ـــ مگر نہیں ـــ وہ اُونچے گھرانے کی ایک شریف گھر کی نوعمر بہو یا بیٹی تھی اور وہ ایک غریب نچلے طبقے کا پھٹے حال بوڑھا چوڑی والا اللہ نور ـــ اس نے اپنے آنسو پی لیے، سر جھکا لیا اور اس کے ہاتھ کی لال لال کامدار حسین چوڑیاں اور نازک بانہوں کا جوڑ ملا کر وہ کومل ہاتھ تھام لیا اور دھیرے دھیرے خاصی تنگ چوڑیاں چڑھانی شروع کر دیں۔ لڑکی کے چہرے پر ذرا سی تکلیف نظر آئی تو وہ بے چین ہوگیا "ماں جی کیا تمھیں بہت تکلیف ہو رہی ہے؟"

"نہیں تو ـــ" لڑکی نے چھوٹی سی سسکی لی مگر چہرے پر مسکراہٹ بھی تھی مسکراتے سمے اس کے گالوں پر دو ننھے ننھے گڑھے عجب بہار دے رہے تھے۔

دونوں ہاتھوں کی بھری بھری سڈول کلائیوں میں سرخ باریک کامدار چوڑیوں کے بیچ میں سادی سرخ بانکیں ـــ آدھی کلائیوں تک بھری ہوئی۔ ایسی حسین لگ رہی تھیں کہ آسمان کے فرشتے بھی اپنا تقدس قربان کر دیں مگر پھر اس نے دل میں توبہ توبہ کی۔ اور ٹوکرے میں سے کانچ کے کھلونے اور طرح طرح کی پیالیاں اور جانے کیا کیا نکال کر لڑکی کے سامنے ڈال دیں ـــ "ماں یہ تمھارے لیے ہیں ـــ نہیں ماں ـــ تمھارے بچے کے لیے ہیں۔"

حسینہ نے شرم سے سرخ ہو کر سر جھکا لیا۔

اس کی ساس جو ذرا دُور کھڑی یہ سب تماشا دیکھ رہی تھی ہنس پڑی ـــ "بڑے میاں ـــ اس کے ابھی کوئی بچہ نہیں۔ ابھی تو چھ مہینے سے بیاہ ہوا ہے۔ یہ کھلونے رکھ لو۔" اور چند روپے اس کی طرف بڑھا دیے۔ بڈھا چوڑی والا مسکرایا۔ "بچہ! ارے وہ خود ابھی بچہ ہے۔ پھر آج نہیں تو کل بچہ بھی ہو جائے گا۔ اور وہ خود بھی تو ان سے کھیلے گی ـــ"

"اچھا ان کے دام تو بتا دو ـــ"

"اماں جی چوڑی کے دام دے دو ـــ کھلونے تو میں نے اپنی ماں کو اپنی طرف سے بھینٹ کیے ہیں۔"

"نہیں نہیں بڑے میاں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"ماں جی ـــ یہ کھلونے میں بابا سے لوں گی ـــ" لڑکی نے متاثر ہو کر کہا ـــ اور ہاتھ بڑھا دیا۔ بڈھے کے چہرے پر مسرت کھل اٹھی ـــ اور وہ ٹوکرا اٹھا، سر پر رکھ، مڑ گیا ـــ ساس پکارتی رہی "یہ کیا بچپن ہے بہو ـــ ارے چوڑی والے ـــ ارے بابا ـــ سنو تو ـــ سنو تو ـــ ارے چوڑی والے" ـــ مگر وہ دُور جا چکا تھا ـــ کئی گھروں سے آوازیں آرہی تھیں مگر وہ کسی طرف نہیں مڑا ـــ اور سڑک پر ہو لیا۔ اب دُور سے آوازیں آرہی تھیں "کانچ کی ہری لال چوڑیاں کانچ کے کھلونے ـــ گلدان، گولیاں ـــ کانچ کی ہری لال چوڑیاں!"

یہ چوڑی کوئی روز روز پہننے کی خریدنے کی چیز تو ہے نہیں۔ بوڑھا اللہ نور روز گلی کے سرے پر آوازیں لگاتا مگر کوئی اُسے اندر نہ بلاتا۔ یہ تو تیج تہوار عید بقر عید پر سہاگنوں کے شوق کی چیز ہوتی ہے نا۔ وہ جب اس کی آواز سنتی تو ایک منٹ کے لیے کھڑکی میں کھڑی ہو جاتی۔ چوڑی والا دونوں ہاتھوں سے ٹوکرا اُونچا کرتا، سر اٹھا کر اُسے دیکھتا، اشارے سے دعا دیتا دونوں کی نظریں ملتیں تو نوجوان اور بڈھے چہروں پر ایک سی مسکراہٹ کھل جاتی۔ جیسے دو معصوم بچے مسکرا رہے ہوں۔ ایک دن کی ملاقات میں خلوص اور راستی کا یہ کیسا بندھن بندھ گیا تھا اس کو دونوں میں سے کوئی بھی نہ سمجھ سکا تھا۔ حسینہ کی ساس ہنس کر کہتی "بہو وہ تیرا سفید داڑھی والا بیٹا کیا آگیا ہے؟" لڑکی حجاب آمیز انداز میں مسکراتی مگر کچھ بولتی نا۔ بس کھڑکی میں سے ذرا دیر میں ہٹ آتی اور چوڑی والے کی آواز دُور ہوتی جاتی۔

چوڑی والا سوچتا وہ چوڑی بیچنا چھوڑ دے۔ ترکاریاں، پھل، مٹی کا تیل یا اور ایسی چیزیں بیچے کہ روز گھر میں بلایا جاسکے ـــ مگر پھر وہ

کنول جیسے لچک دار ہلکے گلابی حسین ہاتھوں میں چوڑیاں
چڑھانے اور اس معصوم چہرے کو دیکھنے کی مسرت کا
خیال کرتا پھر وہ اس خوشی سے محروم نہ ہو جائے
گا؟ ــــ اس مسرتِ قلبی سے جو جانے کہاں سے
اس کے دل میں ابل پڑی تھی، تو وہ اس خیال کو
ذہن سے جھٹک دیتا اور پھر دوپہر میں سر پر بھاری
ٹوکرا اٹھائے آوازیں لگاتا پھرتا رہتا۔

اور پھر کچھ دن بعد ایسا ہوا کہ کھڑکی میں اس
کی حسین "ماں" اس کی پیاری "بیٹی" کا چہرہ نظر
آنا بند ہو گیا۔ وہ آوازیں لگاتا زور زور سے آوازیں
لگاتا مگر وہ معصوم حسین چہرہ نظر نہ آتا اور
مایوس ہو کر وہ آگے بڑھ جاتا مگر اس کے پاؤں
بوجھل ہو جاتے۔ دل کانپنے لگتا ــــ جانے کیسے وہ
قدم بڑھا پاتا تھا۔

اور پھر کتنے ہی دن گزر گئے لیکن چوڑی
والے کی آوازیں فضا میں کھوتی رہیں ــــ وہ چہرہ
ــــ وہ چہرہ ــــ وہ آواز دونوں کہاں کھو
گئیں مولا؟

ایک دن ــــ پھر ایک دن ہمت کر کے
وہ اسی ڈیوڑھی کے سامنے جا کھڑا ہوا اور زور
سے چلایا ــــ "ماں جی چوڑیاں چاہئیں"۔

ایک عورت کی کرخت آواز آئی "نہیں ــــ"

اس نے ٹھنڈی سانس بھری ــــ پھر
ہمت کی دروازے سے اندر صحن میں چلا آیا اور
ڈرتے ڈرتے کرخت چہرے والی بوڑھی عورت
کو دیکھا جس کے بال سفید ہو گئے تھے اور آنکھیں
دھندلی "بڑی ماں ــــ میری ماں جی کہاں
ہے ــــ" "یہاں نہیں ہے"۔

چوڑی والا سینکڑوں سوال کرنا چاہتا تھا مگر
اس کی ہمت نہیں پڑی ــــ وہ افسردہ، مغموم دھیمی
چال سے چلتا ہوا گلی سے باہر نکل گیا اور اس امید
موہوم پر کہ وہ کبھی تو گھر واپس آئے گی وہ روز اس
گلی میں آتا اُس کھڑکی کو دیکھتا جہاں دونوں کی نظریں
ملتی تھیں مگر کھڑکی بند تھی اور گھر میں سناٹا۔ اس
کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں، دل دھڑکنے لگتا، ٹھنڈی
سانس بھر کر بڑی بڑی چال سے وہ واپس مڑ جاتا۔
مگر اگلے دن پھر آتا ــــ امید بھی کیا چیز ہے! اور
اسی طرح کئی مہینے بیت گئے۔

درگا پوجا کا تہوار آن پہنچا ــــ چوڑیوں
کی مانگ بڑھی۔ اس تہوار کے سمے پر تو سبھی عورتیں
چوڑیاں ضرور پہنتی ہیں۔ بوڑھی سہاگنیں، نوجوان
بہوویں، نو عمر لڑکیاں، ننھی بچیاں ــــ امیر،
غریب سبھی کو وہ پہناتا چوڑیاں مگر وہ خوشی ــــ
وہ مسرت، وہ ہاتھ ــــ وہ کنول کی ڈنڈی جیسی کلائی
وہ صندلی رنگ میں خوشی کی سرخی، وہ لال چوڑیوں
میں پھنسی حسین کلائیاں کہاں ہیں؟ اُسے کوئی خوشی
نہ ہوتی ــــ بس وہ اپنی "ماں" کو یہ چوڑیاں پہنائے
گا تب!! درگا پوجا پر تو وہ آئے گی جہاں بھی ہوگی ــــ
روز نت نئی حسین لال چوڑیاں لاتا اس امید پر کہ
وہ پھر اُسے پہنائے گا۔

انتظار سے تھک کر پھر ایک دن بوڑھا
اللہ نور وہیں جا پہنچا "چوڑیاں لو ــــ چوڑیاں ــــ
چوڑیاں لال، لال، سبز، کامدار"۔

لیکن کسی نے کھڑکی میں سے اُسے نہیں پکارا۔
کھڑکی بند تھی۔ چوڑی والا ہمت کر کے گھر میں
گھس آیا۔ اور اندر سے چلایا ــــ

"ماں جی چوڑیاں ــــ چوڑیاں چاہئیں"۔

ایک ملازمہ لڑکی نے جھلّا کر کہا "سو مرتبہ
کہہ دیا چوڑیاں نہیں چاہئیں، بڈّھے کی عقل ماری
گئی ہے۔ سنتا ہی نہیں ــــ سو مرتبہ کہہ دیا مگر
روز آ کر پریشان کرتا ہے۔ جب ضرورت ہوگی خود
بلا لیں گے ــــ"

شرم، خوف، ذلّت کے احساس سے لرزتا ہوا
چوڑی والا مڑا اور دھیرے دھیرے واپس ڈیوڑھی
کی طرف جانے لگا کہ یکایک اس کی نظر اُس لڑکی کی
ساس پر پڑی جو کہا کرتی تھی "بہو تیرا سفید داڑھی
والا بیٹا نہیں آیا" وہ بے اختیار مڑا اور بے قرار
ہو کر اس نے کہا ــــ "ماں جی ــــ کیا میری ماں
واپس آگئی"؟

ساس نے غمگین نظروں سے اُسے دیکھا اور
کانپتی آواز میں کہا "ہاں چوڑی والے وہ واپس
آگئی ہے"۔

چوڑی والے کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا،
آنکھوں میں مسرت کی چمک آگئی آواز خوشی سے
کانپنے لگی "ماں جی ــــ کیا میں ایک بار اپنی ماں کو
دیکھ سکتا ہوں۔ میں اتنی بار آیا ایک بار جھلک تک
نہیں دیکھی۔ ایک بار بس کیا ایک بار بھی میں اُسے
نہیں دیکھوں گا۔ جب آتا ہوں مایوس ہو کر جاتا
ہوں۔ ماں جی میں اپنی ماں سے ملنا چاہتا ہوں"۔

ساس کچھ دیر بت بنی کھڑی رہی۔ اس
کی آنکھیں بھر آئی تھیں، لب کانپ رہے تھے چہرہ
زرد تھا۔

"نہیں بڑے میاں"۔

بڈّھے کا خوشی سے دہکتا چہرہ ماند پڑ گیا جیسے
جلتا چراغ بجھ جائے۔ اس نے پُر آب آنکھوں سے
بوڑھی کو دیکھا ــــ اپنے لڑکھڑاتے قدموں کو سنبھالا
اور جانے کو مڑا۔ پوجا کے تہوار کے لیے اس نے سارا
بازار چھان کر اس کے لیے بہترین سُرخ چوڑیوں کا
جوڑا خریدا تھا۔ وہ اُسے اپنے ہاتھوں سے اُسے
پہنائے گا۔ وہ اگر اس کی اپنی بیٹی ہوتی ــــ کیا
اسی طرح یہ بڑھیا اس کا اور بڈّھے کا دل توڑ کر

نکار کر دیتی۔ غصے کی ایک لہر اس کے جسم بھر کو رزا گئی۔ اس نے اپنی میلی آستین سے آنسو پونچھے اور باہر کی طرف جانے لگا۔ ساس اب تک برامدے میں کھڑی تھی۔ اس نے مڑکر کانپتے ہوئے لہجے میں کہا ماں جی میں اب کبھی چوڑی بیچنے نہیں آؤں گا مگر یک بار میری "ماں" کو دکھا دو" اور آنکھوں سے آنسوؤں ی جھڑی لگ گئی۔

جو بھی رکاوٹ بہو کو یہاں لانے میں تھی وہ ن آنسوؤں کی بوچھار نے دُور کر دی۔ اس نے بڈھے و دیکھا' آسمان کو دیکھا' زمین کو دیکھا اور کانپتی آواز میں چلائی — " چھوکری — لڑکی کو — بہو کو — یہاں لے آ"

چند لمحے بعد دھیرے دھیرے پہلے لڑکی کے یر' پھر جسم اور پھر سارا سراپا اندر سے باہر آتا نظر یا — اور وہ آکر بڈھے کے سامنے کھڑی ہوگئی مگر چوڑی والے کو اس کا ہوش کہاں تھا وہ تو اس ایاب حسین چوڑیوں کے جوڑے کو تلاش کر رہا تھا جو وہ اس کے لیے لایا تھا۔ اور پھر اس نے ہاتھ بڑھایا "ماں — میں تمھارے لیے دیکھو کیسا خوب صورت ال جوڑا لایا ہوں"۔ یہ کہتے کہتے چوڑی والے نے سکراتے ہوئے سر اٹھایا۔ اور پتھر کا بُت بنا کھڑا رہ لیا۔ نوعمر حسینہ' گھر کی بہو' اللہ نور کی ماں' چوڑی والے ی چہیتی بیٹی — سامنے کھڑی تھی۔ مگر — مگر س کے جسم پر کوئی زیور نہ تھا' لال کناری کی ساڑھی نہ تھی' نہ مانگ میں سندور' نہ پیروں میں مہاور' نہ ہاتھ میں چوڑی — نہ لبوں پر لاکھا اور نہ وہ دنیا بھر کو مسحور کرنے والی پیاری مسکان۔!

سفید دھوتی جسم پر لپیٹے رنج و غم کی مجسم مورتی جو ایک طرف کو جھکی تھی' اس کے سامنے کھڑی تھی! اس دیش کی ایک کم سن بیوہ!!

چوڑی والے نے چوڑی کا جوڑا اپنے ہاتھ سے زمین پر پھینک دیا اور چوڑی کے ٹوٹے ٹکڑوں کی سی روتی آواز — ہچکیوں سے لرزتی آواز بلند ہوئی۔!

"ہائے — ہائے میری ماں جی — یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ ہائے اللہ میں یہ سب — دیکھنے سے پہلے مر کیوں نہ گیا — کیوں نہ مر گیا مولا —"

نوجوان لڑکی نے اپنا سر اور جھکا لیا اس کی آنکھوں سے جو آنسو موتیوں کی لڑیوں کی طرح ٹپک رہے تھے اس نے اس کی سفید دھوتی اور کنول جیسے ہاتھوں کو تر بتر کر دیا تھا۔!

پھر وہ آہستہ — اور آہستہ — بہت آہستہ مڑی اور اندر کی طرف چلی۔ پیچھے پیچھے اس کی ساس بھی چلی گئی۔

کانپتے ہاتھوں سے بڈھے نے ٹوکرا سر پر اٹھایا' اور دل شکستہ غریب' غم نصیب' چوڑی والا گھر سے نکل گیا۔

اس سے نہ اپنا بوجھ اٹھ رہا تھا نہ ٹوکرے کا نہ آواز نکل رہی تھی — اس نے اپنا سر ٹوکرے پر جھکا دیا —

اس کا سارا جسم ہچکیوں سے لرز رہا تھا۔

(ٹیگور کی کہانی سے ماخوذ)

○

سرِورق کے اندرونی صفحے کے لیے موصولہ عنوانات

گزشتہ ماہ "ایوانِ اُردو دہلی" کے سرِورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر شائع کی گئی تھی اس کے عنوان کے طور پر قارئین نے جو اشعار یا نثری ٹکڑے تجویز کیے ہیں ان میں سے چند بالترتیب درج ذیل ہیں:

اُس حریمِ ناز کی وہ جلوہ سامانی کہ بس ۔۔۔ دیدہ و دل کی بڑھی اس درجہ حیرانی کہ بس (یعقوب بدرؔ)
مرسلہ: اختر ندیم' میرٹھ سٹی

آج اندھیروں سے وہ سمجھوتا کیے بیٹھے ہیں ۔۔۔ آفتابوں کی جو تخلیق کیا کرتے تھے (علی احمد جلیلی)
مرسلہ: غلام احمد' نماپور

سب کہاں کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہوگئیں ۔۔۔ خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں (غالبؔ)
مرسلہ: لبنیٰ خدیجہ' علی گڑھ

کہاں ہیں اب وہ حویلی میں آن بان کے لوگ ۔۔۔ وہ پاندان کی خوشبو وہ خاندان کے لوگ (منوّر امروہوی)
مرسلہ: قیصر جہاں' امروہہ

آنے کا وعدہ اس نے کیا ہو تو میں کہوں ۔۔۔ کچھ خُو ہی پڑ گئی ہے مجھے انتظار کی (ناظمؔ رامپوری)
مرسلہ: محمد فضل الرحیم' محبوب نگر

میں بھی عورت ہوں یہی میرا مقدّر ٹھہرا ۔۔۔ مجھ پہ الزام لگاؤ' مری تذلیل کرو (رفیعہ شبنم)
مرسلہ: نشاطہ فاطمہ' الہ باد

"یک شہرِ آرزو" (غالبؔ کے ایک مصرعے کا ایک ٹکڑا) مرسلہ: محمد عمران خان ساکت' بھاگلپور

"اداس نسلیں" (عبداللہ حسین کا ناول) مرسلہ: ارشاد الحق' پٹنہ

دلی کے آثارِ قدیمہ

خلیق انجم
جنرل سکریٹری انجمن ترقیٔ اُردو (ہند)، راؤز ایوینیو، نئی دہلی ۲۔

بستی حضرت نظام الدین

لال محل:

بستی حضرت نظام الدین کا ایک نام نظام پور بھی تھا۔ مسلم اور ہندو آثارِ قدیمہ کی فہرست کے آخر میں دہلی کا ایک نقشہ دیا گیا ہے، جس میں نظام پور نام سے ایک گاؤں دکھایا ہے۔ اس نظام پور میں سبز برج، ہمایوں کا مقبرہ اور درگاہ حضرت نظام الدین شامل ہیں۔ فہرست میں نظام پور کے جن مقبروں اور عمارتوں کی تفصیلات دی گئی ہیں، اُن میں وہ عمارتیں بھی ہیں، جو اب گورنمنٹ کی سندر نرسری کے احاطے میں آگئی ہیں۔ مرزا مظفر حسین کا مقبرہ، جسے بتاشا محل بھی کہا جاتا تھا، سندر نرسری کے احاطے میں ہے، اسے بھی نظام پور میں دکھایا گیا ہے[1]۔ خان جہاں تلنگی کے مقبرے کا ذکر کرتے ہوئے بشیر الدین احمد نے لکھا ہے کہ "یہ مقبرہ غیاث پور کی فصیل سے ملا ہوا ہے، جو اب نظام پور کہلاتا ہے"[2]۔ "فہرست" میں بہت بڑے اور "واقعاتِ دارالحکومت" میں بہت محدود علاقے کو نظام پور کہا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ "فہرست" میں جو تفصیل بیان کی گئی ہے، وہ درست ہے، کیوں کہ یہ فہرست حکومت نے سرکاری مقاصد کے لیے تیار کرائی تھی۔ انیسویں صدی سے قبل کی تاریخوں میں اس بستی کا نام نظام پور میری نظر سے نہیں گزرا۔ اس کا پورا امکان ہے کہ اس بستی کا نام نظام پور بیسویں صدی، اور زیادہ امکان یہ ہے کہ بیسویں صدی کے آخر میں، پڑا ــــ گویا اس بستی کا نام مختلف زمانوں میں غیاث پور، نظام پور، نظام الدین گاؤں، بستی حضرت نظام الدین اور سلطان جی رہا ہے۔ آج کل اسے بستی حضرت نظام الدین اور بول چال میں نظام الدین کہا جاتا ہے۔

نظام الدین میں دو فصیلیں تھیں۔ ایک ــــ فصیل خان جہاں تلنگی کے مقبرے کے گرد تھی اور دوسری پوری بستی کے چاروں طرف۔

اندر کی فصیل بہت چھوٹی تھی اور فصیل کے اندر کی بستی کوٹ کہلاتی تھی۔ کوٹ میں درگاہ حضرت نظام الدین کے پیرزادے اور اُن کے خاندان رہتے تھے۔ اس کوٹ کی دلچسپ روایت یہ تھی کہ کنواری لڑکیاں تو کنوارے لڑکوں سے پردہ کرتی تھیں لیکن کوٹ کی کوئی عورت کوٹ میں رہنے والے مردوں سے پردہ نہیں کرتی تھی۔ کوٹ کے اندر کوئی غیر مرد نہیں جا سکتا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ خوانچے والوں کو بھی اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اب کوٹ کی تقریباً تمام فصیل گر چکی ہے فقط ایک دروازہ باقی ہے اور ایک برج ــــ دروازہ بہت شکستہ حالت میں ہے۔ اگر آرکیالوجیکل سروے اس کی مرمت کرادے تو یہ یادگار تاریخی دروازہ کچھ دن کے لیے اور محفوظ ہو جائے گا۔ (دیکھیے تصویر نمبر ۱)۔

اس دروازے کے علاوہ فصیل کا ایک برج بھی باقی ہے۔ یہ برج بہ قول خواجہ حسن ثانی نظامی طویل عرصے تک درگاہ حضرت نظام الدینؒ کا توشک خانہ رہا تھا۔ پھر جب لوگوں نے فصیل کو توڑ کر رہنے کے گھر بنانے شروع کیے تو کسی نے ایک ایسا گھر بھی بنایا، جس کے احاطے میں یہ برج شامل ہو گیا۔ پھر اس مکان کی ملکیت ایک غیر مسلم صاحب کے نام منتقل ہو گئی۔ ۱۹۴۷ء میں خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب کی والدۂ محترمہ نے یہ مکان خرید لیا۔ اس مکان کی ملکیت اب اسی خاندان میں ہے۔ (دیکھیے تصویر نمبر ۲)۔

چوں کہ یہ فصیل خان جہاں تلنگی المخاطب بہ جونا نشہ کے مقبرے کے گرد ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فصیل مقبرے کے ساتھ ہی بنائی گئی ہوگی۔ چوں کہ مقبرہ ۷۷۲ھ (مطابق ۱۳۷۰ء — ۱۳۷۱ء) میں تعمیر ہوا تھا، اس لیے یہ فصیل بھی چھ سو سولہ سال قبل یعنی ۷۷۲ھ میں تعمیر ہوئی ہوگی۔

کوٹ کا دروازہ — جسے دونوں طرف دکانوں نے گھیر رکھا ہے۔

دوسری فصیل جو بستی حضرت نظام الدین کے چاروں طرف تھی کلیتہً منہدم ہوچکی ہے۔ اس کا صرف ایک دروازہ باقی ہے۔ یہ فصیل پتھر اور چونے کی بنی ہوئی تھی۔ بہت کوشش کے باوجود یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ یہ فصیل کب اور کس نے بنائی تھی۔ ہاں یہ ضرور معلوم ہے کہ ۱۲۲۳ھ (مطابق ۱۸۰۸ء — ۱۸۰۹ء) میں فیروز پور کے نواب احمد بخش خاں نے اس فصیل کی مرمت کرائی تھی۔ اس فصیل کے مغرب، شمال اور مشرق میں دروازے تھے، جو ۱۹۲۲ء میں بہت خستہ حالت کو پہنچ چکے تھے۔ سید اخلاق حسین صاحب کی عمر اب تقریباً اسّی سال ہوگی۔ اس فصیل پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ اُن کے ہوش سنبھالنے تک فصیل کا بہت بڑا حصہ باقی تھا چونکہ اس کی مرمت نہیں ہوئی، اس لیے اس کا بڑا حصہ برساتوں میں گر گیا اور کچھ حصہ لوگوں نے گرا دیا۔ اس پوری فصیل پر اب مکان بن چکے ہیں۔ بہ قول سید اخلاق حسین صاحب اور حسن مثنٰی صاحب فصیل کے تین دروازے اور دو کھڑکیاں تھیں۔ دروازوں کے نام تھے۔ (۱) قطبی دروازہ (۲) بیسک دروازہ اور (۳) نالہ دروازہ — (اس دروازے کا نام نالہ دروازہ اس لیے تھا کہ اس کے پاس ایک نالہ بہتا تھا، جو اب بھی موجود ہے)۔ سید صاحب نے بتایا کہ بیسک دروازہ ۱۹۲۵ء میں گرا، اس کے پاکھے ۱۹۴۷ء تک موجود تھے۔ اسی سال یہ بھی گرا دیے گئے —

اس فصیل کا ایک دروازہ ابھی تک محفوظ ہے، وہ ہے: قطبی دروازہ — یہ دروازہ اس لیے بچ گیا کہ خواجہ حسن نظامی مرحوم نے ۱۳۴۵ھ (مطابق ۱۹۲۶ء — ۱۹۲۷ء) میں اس کی مرمت کرادی تھی۔ خواجہ صاحب نے اس دروازے پر جو کتبہ نصب کیا تھا، وہ آج بھی محفوظ ہے، اس پر یہ عبارت کندہ ہے:

کوٹ کی فصیل کا برج

قطبی دروازہ
حسین خانہ خواجہ حسن نظامی
مرمت ۱۳۴۵ ہجری

(تصویر نمبر ۳)

غالب اکیڈمی کے شمال میں ایک قدیم عمارت کے کچھ کھنڈر ہیں، جسے لال محل کہا جاتا ہے، اس لال محل یا کوشک لال کے بنانے والے کے بارے میں پچھلی قسط میں تفصیل سے گفتگو کی جا چکی ہے۔ آج کل اس محل میں حکیم سید حسین صاحب اور سید اخلاق حسین صاحب رہتے ہیں رہیں ان دونوں حضرات اور ایک اور بزرگ حسن مثنیٰ صاحب کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں، جنھوں نے لال محل اور بستی حضرت نظام الدینؒ کے بارے میں مجھے اہم معلومات فراہم کیں۔

قطبی دروازہ ــ بستی حضرت نظام الدین کی فصیل کا بس یہی حصہ بچا ہے۔

حکیم سید حسین صاحب نے مجھے ۱۸۵۷ء کی ایک دستاویز کی زیروکس کاپی عنایت فرمائی۔ جس کی رو سے ۱۸۵۷ء میں لال محل کالے صاحب کی بیوی افضل زمانی بیگم کی ملکیت تھا۔ کالے صاحب[۴] حضرت شاہ فخر الدین کے پوتے اور حضرت غلام قطب الدین کے صاحبزادے تھے۔ کالے صاحب کے بارے میں سر سیّد احمد خاں نے لکھا ہے: "اس زمانے میں ایسا نامی گرامی شیخ نہیں ہے، حضورِ والا اور تمام سلاطین و جمیع امرا عظام آپ کے نہایت معتقد ہیں"۔ ۱۸۴۵ء میں کالے صاحب کا انتقال ہوا تو اُن کے صاحبزادے غلام نظام الدین سجادہ نشین بنت پر بیٹھے۔ انھی کے زمانے میں ۱۸۵۷ء کا ناکام انقلاب۔ اس خاندان کی تمام جائداد بحق سرکار ضبط ہوگئی۔ چوں کہ لال محل غلام نظام الدین کی والدہ اور میاں نصیر الدین عرف کالے صاحب کی بیوی افضل زمانی بیگم کے نام تھا، اس لیے انھوں نے برطانوی حکومت سے اس کی واگزاری کی درخواست کی۔ یہ درخواست قبول کرلی گئی اور لال محل کو واگزار کر دیا گیا۔ حکیم سیّد صاحب نے جو دستاویز مجھے عنایت فرمائی ہے، اُس کی رو سے اُس زمانے میں یعنی ۱۸۵۷ء میں یہ قبرستان تھا۔ اس کا امکان ہے کہ حضرت شاہ فخر الدین کے خاندان کے کچھ لوگ یہاں دفن ہوتے ہوں۔ اگرچہ خود شاہ فخر الدین اور اُن کے صاحبزادے غلام قطب الدین درگاہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ میں مدفون ہیں۔[۵]

جناب اخلاق دہلوی کے قول کے مطابق افضل زمانی بیگم سے قبل اس محل کے مالک حضرت شاہ فخر الدین کے مرید اور اُردو کے مشہور شاعر میر محمدی بیدار تھے۔ شاہ صاحب ۲۷ رمضان کو شب قدر میں شرکت کے لیے عرب سرائے تشریف لاتے تھے، کچھ دیر لال محل میں بھی قیام کرتے تھے۔ غلام قادر روہیلہ نے جب شاہ عالم کو اندھا کر دیا اور دہلی کے سیاسی حالات بہت خراب ہوگئے تو میر محمدی بیدار آگرے چلے گئے۔ انھوں نے جاتے ہوئے اس عمارت کی ملکیت اپنے مرشد حضرت فخر الدین کے نام کردی۔ افضل زمانی بیگم کی وفات کے بعد یا ممکن ہے اُن کی زندگی ہی میں اس عمارت کی ملکیت شاہ فخر الدین کے نواسے اور حضرت شاہ عبدالسلام کے صاحبزادے میاں عبدالصمد کے نام منتقل ہوگئی۔ ۱۹۱۹ء (سنہ طباعتِ واقعاتِ دارالحکومت دہلی) میں بہ قول بشیر الدین احمد، اس محل میں غریب سقّے وغیرہ رہتے تھے، جنھوں نے اسے خوب پیٹ بھر کے بگاڑا اور خراب کیا ہے۔[۶]

لال محل کے جو حصّے منہدم ہونے سے بچ گئے ہیں، انھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لال پتّھر کا بہت شاندار محل رہا ہوگا لیکن سر سیّد احمد جب ۱۸۴۷ء میں آثار الصنادید لکھ رہے تھے تو اس کی حالت بہت خستہ ہو چکی تھی۔ کچھ ہی حصّے باقی تھے، ورنہ ساری عمارت گر چکی تھی۔ سیّد احمد خاں نے آثار الصنادید کے دوسرے اڈیشن میں اس محل کے بارے میں جو اطلاعات دی ہیں وہ پچھلی قسط (ایوانِ اردو، ستمبر ۸۷ء) میں آچکی ہیں۔[۶] سر سیّد کے اس بیان سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ۱۸۴۷ء سے قبل یہ عمارت قبرستان کے طور پر استعمال ہونی شروع ہوگئی تھی۔

میں نے بہت لوگوں سے دریافت کیا لیکن یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ اس میں دوبارہ رہائش کب سے شروع ہوئی۔ یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد لال محل میں لوگوں نے رہائش اختیار کرلی ہوگی۔ بشیر الدین احمد لال محل کی خستہ حالی پر افسوس کرتے ہوئے ۱۹۱۹ء میں لکھتے ہیں: "ساٹھ ستّر برس کے اوّل تو کچھ تھا بھی، اب وہ رہا سہا بھی مٹ گیا۔ شہر میں بہت سی نئی عمارات بننے لگیں۔ سنگِ سرخ کی مانگ کثرت سے ہونے لگی۔ مالِ مُفت دلِ بے رحم ـــ بے رحم گاؤں والوں کو غیبی خزانہ ہاتھ آیا۔ دھڑی دھڑی کرکے لوٹا اور من مانے پتّھر اکھاڑ اکھاڑ کرلے گئے اور ایک لوٹ مچادی۔ اب ـــ جو کچھ ان لٹیروں سے بچ رہا ہے وہ صرف ایک گنبد دار حجرہ ہے، جس کے چاروں طرف چار چار ستونوں کی برجیاں تھیں، اس کے علاوہ ایک بڑا دومنزلہ دالان محل کی وسیع عمارات کے حصۂ زیریں میں رہ گیا ہے۔ کچھ شکستہ محرابیں جا بجا کھڑی ہیں۔ جن کی تراش خراش پکار رہی ہے کہ علاء الدین کے زمانے کی ہیں۔ دالان کی بالائی منزل تمام تر سنگِ سرخ کی ہے اور اسی وجہ سے لال محل نام رکھا تھا۔ بالائی منزل بالکل کھلے ہوئے دروں کا ایک وسیع ہال ہے، جس کی شکل بہت سی چھوٹی چھوٹی برجیوں کی سی ہے، جس کی چھتیں سیڑھی دار ڈھلواں ہیں، جو گنبد کے اطراف تھیں۔ چوٹی پر پہنچ کر مکان کی شکل بیضوی ہوگئی ہے۔ عمارت کا طرز اس کے نقش و نگار اور گل کاری سب قطب صاحب کے "علائی دروازے" سے ملتی جلتی ہے اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ دونوں عمارتیں قریب قریب ایک ہی زمانے کی بنی ہوئی ہوں گی اور یہی بڑی وجہ ہمارے اس خیال کی ہے کہ ہم اس عمارت کو علاء الدین خلجی سے منسوب کرتے ہیں۔ اکبر یا جہانگیر کے عہد میں اس محل میں کچھ کچھ ترمیمات بھی کی گئی تھیں، لیکن اس بات کا پتا چلانا کہ زمانۂ مابعد میں کیا کیا ردو بدل ہوا ناممکن ہے کیوں کہ اس عمارت ہی کی وہ حیثیت نہ رہی، جو پہلے تھی اور اب تو بالکل ایک تباہ حالت میں ہے۔ یہ محل کوشک لال بھی کہلاتا ہے اور بارہ کھمبے کے پاس ہے۔ پہلے کیسا تھا ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ موجودہ حالت یہ ہے کہ ایک ـــ مختصر سی عمارت سرتاپا سنگِ سرخ کی باقی رہ گئی ہے، جس کے بیچ میں ایک پست اور پھیلا ہوا گنبد ہے اور چاروں طرف دومنزلہ سہ درے، نیچے حجرے اور تہ خانہ ہے۔ تمام ستون سنگِ سرخ کے ہیں۔ غریب لوگ سقّے وغیرہ رہتے ہیں، جنھوں نے خوب بیٹ بھر کے بگاڑا اور خراب کیا ہے، قرینہ دال ہے کہ لال محل کا یہ کوئی بچا کھچا حصّہ رہ گیا ہے۔ اُس کو اس عالی شان محل کا ایک ـــ نمونہ سمجھیے اور اسی پر سے اس سابقہ حالت کا مُجملی تصوّر اپنے ذہن میں کرلیجیے۔ لال محل کے دروازے کا حصّہ جو اب باقی ہے۔ وہ یہ ہے کہ صرف ایک چوپہل چھتری برجی دار چار فٹ دس انچ مربع شمال رویہ کھڑی ہے۔ چار ستون سنگِ خارا کے ہیں۔ چھت میں پتّھر کی سلوں کا پٹاؤ کرکے اس کے اوپر سنگِ سرخ کی ایک خوش قطع برجی بنادی ہے۔ یہ دروازہ ڈیوڑھی دار ہے۔

آج کل لال محل کے مالک حکیم سیّد حسین ہیں، جو ۱۹۴۸ء سے اس میں رہ رہے ہیں۔ کچھ عرصے قبل انھوں نے میاں عبدالصمد کے خاندان کے لوگوں سے یہ مکان خرید لیا۔ حکیم صاحب کے ساتھ اس مکان میں اُردو کے مشہور اور بزرگ ادیب اخلاق دہلوی بھی رہتے ہیں۔

اب لال محل کا بہت کم حصّہ باقی رہ گیا ہے۔ ایک مختصر سی عمارت محفوظ ہے، جس پر سفید رنگ کا اینٹوں اور چونے کا بنا ہوا ایک پست گنبد ہے، جس کا طرزِ تعمیر خلجیوں کے دور کا ہے۔ پہلے بیچ میں ایک کمرہ تھا اور اس کے چاروں طرف کھلے دالان تھے۔ اب اینٹوں سے دیواریں کھڑی کرکے دالانوں کو کمروں میں تبدیل کردیا گیا ہے۔ اس عمارت کے شمال مشرق میں ایک دومنزلہ چوپہل چھتری برجی د[ار] ہے۔ اُوپر کی منزل میں ستون، چھجہ اور برجی سب لا[ل] پتّھر ہے، اس کے برعکس نچلی منزل میں سنگِ خارا کے ستون ہیں۔ اب نچلی منزل میں دیواریں کھڑی کرکے دروازہ لگادیا گیا ہے۔ لال محل کی جو مختصر سی عما[رت] بچی ہے، اس پر چار سمتوں پر اسی طرح کی لال پتّھر کی چوپہل چھتریاں تھیں۔ سرسیّد اور بشیر الدین ا[حمد] نے اس عمارت کے جو نقشے دیے ہیں، وہ شمال کی طرف سے بنائے گئے تھے (میرا خیال ہے کہ بشیر الدّ[ین] احمد نے خود نقشہ نہیں بنایا بلکہ سرسیّد ہی کے بنائے ہوئے نقشے کو شائع کردیا ہے) نقشوں میں شم[ال] اور مغرب میں دو چھتریاں دکھائی دے رہی ہیں۔ گو مشرقی چھتری اُس وقت گر چکی تھی۔ اور جنوبی برج گ[نبد] کے پیچھے چھپ گیا تھا، یہ اس وقت موجود تھا اور ا[ب] بھی ہے۔ اس میں بھی چاروں طرف دیواریں بنا کر ک[مرہ] بنالیا گیا ہے۔

شمالی اور مغربی سمتوں کی چھتریاں گر چکی ہ[یں] بقول جناب اخلاق دہلوی ۱۹۴۷ء سے قبل چھتریاں مخدوش حالت میں تھیں۔ اس لیے نئی د[ہلی] میونسپل کارپوریشن نے دو چھتریاں گرادی تھیں۔ بشیر الدین احمد نے لال محل کے جس دروازے کا ذ[کر] کیا ہے، وہ منہدم ہوچکا ہے۔

(باقی آئندہ)

حواشی

۱۔ مسلم اور ہندو آثارِ قدیمہ کی فہرست جلد دوم، ۱۹۱۹ء، دہلی، آخری صفحہ
[LI]ST OF MUHAMMADAN AND HINDU [MO]NUMENTS, VOL. II, 1922, CAL. LAST PAGE.

۲۔ بشیر الدین احمد، واقعاتِ دارالحکومت

جلد ۳، ۱۹۱۹ء، دہلی، ص ۸۷۳۔
۱۰۔ Zafar Hasan, A Guide to Nizamuddin, Calcutta, 1922, p. 7.
۱۱۔ حضرت نصیر الدین کالے صاحب اور اس خاندان کے دوسرے افراد کے لیے ملاحظہ ہو: خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، ۱۹۸۵ء، دہلی، ص ص ۲۴۰۔۲۹۵ اور سید احمد خاں، آثار الصنادید، مرتبہ سید معین الحق، کراچی، ۱۹۶۶ء، ص ص ۲۱۸۔۲۲۱۔
۱۵۔ List of Mohammadan and Hindu Movements, vol. II, pp. 109-122. اس فہرست میں پیر عبدالصمد کو اس مکان کا مالک بتایا گیا ہے۔
۱۶۔ واقعاتِ دارالحکومت دہلی، جلد ۲، ص ص ۴۷۔۴۹۔

○

صلائے عام ہے...

اگلے شمارے سے قارئین کی دل چسپی کے لیے ہم دو نئے مستقل عنوانات قائم کر رہے ہیں — "ہم طرح اشعار" اور "ناقابلِ فراموش":

"ہم طرح اشعار" کے لیے ایک مصرعہ بہ طور طرح ہر مہینے دیا جائے گا۔ اس بار کا مصرعۂ طرح ہے:

جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
(قافیہ — ردیف)

آپ سے گزارش ہے کہ اس زمین میں اپنی پسند کا کوئی ایک شعر، شاعر کے نام کے ساتھ ہمیں اس طرح بھجوائیں کہ آپ کا خط ہمیں ۱۲ر اکتوبر تک ضرور مل جائے۔

آپ کی زندگی میں کبھی نہ کبھی کوئی ایسا واقعہ ضرور پیش آیا ہوگا جس کی یاد آپ کو آج بھی آتی ہوگی۔ آپ وہ واقعہ مختصر ترین لفظوں میں ہمیں لکھ بھیجیے۔ واقعہ سبق آموز اور دلچسپ ہوا تو ہم اسے "ناقابلِ فراموش" کے کالم میں شائع کر دیں گے۔

ان دونوں کالموں میں جن حضرات کے ارسال کردہ اشعار اور واقعات قابلِ شمولیت قرار پائیں گے، انھیں اکادمی کے زیرِ اہتمام ہونے والے کُل ہند مشاعروں کا "گلدستہ" ہدیۃً پیش کیا جائے گا۔ "یہ گلدستہ" مشاعروں میں پڑھے جانے والے کلام اور شعرا کی تصاویر پر مشتمل ہے۔

ہم آپ کے خطوط کے منتظر ہیں۔

——— ادارہ

رضا نقوی واہی
گردنی باغ، پٹنہ

اکیسویں صدی

طنزیہ

عالم میں ہیں چار دانگ صدائے نقیب ہے
اکیسویں صدی کی ولادت قریب ہے
خوش نرس ہے تو شاد سیاسی طبیب ہے
وہ غلغلہ ہے جیسے کہ گھمسان رن پڑے
ہیں محوِ انتظار منجھلے ہوں یا بڑے
قد آوروں کے غول میں بونے بھی ہیں کھڑے
لیزر شعاع کا کوئی درپن لیے ہوئے
اسٹار وار کا کوئی ایندھن لیے ہوئے
واہی کھڑا ہے صرف ایرگن لیے ہوئے
کچھ لوگ تو ہیں عازمِ تسخیرِ کائنات
ہے دل میں ان کے جستجوئے حلِ مشکلات
ہم ہیں اسیرِ گیسوئے مفعول و فاعلات
اِس بیسویں صدی میں مچی وہ اُتھل پُتھل
حالاتِ زندگی جو تھے یکسر گئے بدل
ہم نے بھی خوب خوب لکھی نو بہ نو غزل
انساں کے پاؤں روند چکے چاند کی زمیں
ٹکنولوجی پہنچ گئی مریخ کے قریں
ہم رویتِ ہلال پہ بھی متفق نہیں

گزریں تمام قومیں عروج و زوال سے
غافل ہمیشہ رہ کے خود اپنے مآل سے
چمٹے ہیں ہم رسوم و عقائد کی ڈال سے
انگڑائی لے کے تیسری دُنیا بھی جاگ اُٹھی
قرنوں سے جو دبے تھے اُنھیں روشنی ملی
کی ہم نے خوب بحرِ رجز میں سخنوری
اوروں نے پائی منزلِ عرفان و آگہی
سائنس ہر قدم پہ معاون بنی رہی
ہم نے زباں کی نوک پلک ٹھیک ٹھاک کی
وہ اور ہیں کہ جن کے عزائم ہیں معتبر
امکاں کو جو بناتے ہیں جولانگہِ بشر
ہم تو ہیں صرف اپنے مقدّر کے نوحہ گر
غیروں کا کہکشاں پہ ہے جانے کا حوصلہ
ہم سے تو صحنِ مسجدِ اقصیٰ بھی چھن گیا
جو کل بنا تھا زینۂ معراجِ مصطفےٰؐ
ہم خواب دیکھتے ہی رہے رام راج کا
ڈھانچا بدل سکا نہ ذرا بھی سماج کا
اپنا لیا ہے قوم نے رستہ تراج کا

دعویٰ تو کر رہے ہیں کرپشن مٹائیں گے
یہ بھی پکار ہے کہ غریبی ہٹائیں گے
جو آج کہہ رہے ہیں وہ کل بھول جائیں گے

بس ہم تو یوں دکھائیں گے اپنی چلت پھرت
ہوگی کچھ اور تیز قدم فرقہ واریت
آپس میں اور بڑھتی رہے گی منافرت

صدیوں سے زہر پیتے چلے آ رہے ہیں ہم
اے کاش، آنے والی نئی نسلِ تازہ دم
امرت کا جام پی کے بڑھاتی رہے قدم

مزاحیہ

گزرے گا انقلابی اُلٹ پھیر سے سماج
تبدیل ہو کے مطلب و مفہومِ ازدواج
ہوگا نئی صدی میں فقط عورتوں کا راج

کل تک پڑوسنوں سے جو ہوتی تھی لفظی جنگ
قانون ساز بزم میں بدلے گا اس کا ڈھنگ
کٹھ حُجتی بڑھے گی تو برسیں گے خشت و سنگ

اب تک تھے زن مُرید ہی محکوم بیگمات
آئے گی ان کے دام میں اب پوری کائنات
تابع رہے گا ان کا ہر اک شعبۂ حیات

دولہا کے گھر برات، دُلہن لے کے جائے گی
رخصت کرا کے ڈولی پہ دولہا کو لائے گی
اپنی سہیلیوں کو ولیمہ کھلائے گی

صدیوں کا بغض دل سے نکالیں گی بی بیاں
مَردوں کو کرسیوں سے اُچھالیں گی بی بیاں
دفتر کا کام کاج سنبھالیں گی بی بیاں

دولہا کا باپ دے گا نہ پورا جہیز اگر
نوشہ میاں کے جسم پہ پٹرول ڈال کر
بھیجے گی خود دلہن اُنھیں شمشان گھاٹ پر

اب صنعتی اداروں کا بدلے گا خطّ و خال
کُل یونٹوں میں اب وہی تیار ہوگا مال
جو کام آسکے پئے آرائشِ جمال

شوہر کے ذمّے ہوگی گھر آنگن کی دیکھ بھال
چولھے کے پاس رہ کے پکائیں گے بھات دال
اور بی بیاں دکھائیں گی بیرونِ در، کمال

حجّام خانے جتنے ہیں ان سب کو توڑ کر
ان کی جگہ کُھلیں گے نئے بیوٹی پارلر
نائی کے بدلے آئیں گی واں نائنیں نظر

ہوگی نہ ماں پہ خلقتِ اولاد منحصر
جر ثومۂ حیات کو نلکی میں ڈال کر
کھٹکا دبایا اور برآمد کیا پسر

مردوں کے دور میں تھی جو مقبول بے خلل
متروک ہو کے شہر بدر ہوگی اب غزل
اس کی جگہ پہ ریختی کا راج ہوگا کل

ان نلکی زادگاں کی نگہ داشت کے لیے
ہاتھوں میں اپنے دودھ پلائی لیے ہوئے
اک پیر پر رہیں گے کھڑے مرد لب سیے

ہوگی اسمبلی میں کھڑی کوئی بحث جب
میزائلوں سے تیز چلیں گے زبان و لب
اک دوسرے کو نوچنے دوڑیں گی سب کی سب

اب تک گزر رہے تھے شب و روز موج سے
"اکبر دبے نہ تھے کسی دشمن کی فوج سے
لیکن شہید ہو گئے بیگم کی نوج سے"

آمنہ ابوالحسن
۳۷ پٹودی ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱۔

گلی میں کھیلتا ہوا ننھا شمیم زمین پر بکھرے ہوئے کنچے سمیٹ کر لپکا اور ٹوٹے ہوتے برآمدے میں پہنچا، بولا — "وہ لوگ آرہے ہیں ابّا —"

کام سے سر اُٹھا کر رحیم نے پوچھا —

"کون لوگ بیٹے ؟"

"وہی جو چند دن پہلے بھی آئے تھے آپ کے پاس ۔"

اتنے میں وہ آگئے ۔

"نمسکار — ست سری اکال رحیم بھائی —"

"آداب — آداب — آیئے آیئے —"
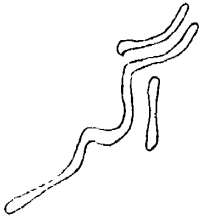
رحیم نے مرمت کرنا چھوڑ کر سائیکل دیوار سے ٹکائی اور سب برآمدے کی منڈیر پر بیٹھ گئے ۔

شمیم جو کنچے مٹھی میں دبائے ایک طرف کھڑا تھا جھٹ بولا — "اب میں کھیلنے جاؤں ابّا — ؟"

"جاؤ —" رحیم نے اُس کی طرف بغیر دیکھے کہا —

"چلو پاس کے ڈھابے پر چائے پیتے ہیں ۔"

"مگر کیا اتنے پیسے ہیں تمھارے پاس رحیم بھائی — ؟"

"پروردگار کی مہربانی ہے — اِس وقت نہ بھی ہوئے تو نہ سہی جب آجائیں ادائگی ہو ہی جاتی ہے — ڈھابے والا پڑوسی جو ہے —"

"ہاہاہا —" سُریش نے ایک اڑتا ہوا قہقہہ لگایا —

"یہ بھی کوئی پہچان ہوتی یار — ڈھابے والے کی ؟ زندگی میں کاروبار میں صرف اچھے ملاقاتی گنے جاتے ہیں یار رحیم — تم یہ بات سوچتے کیوں نہیں —"

"سوچنے سے کیا فائدہ جی ۔ اچھے ملاقاتی لاؤں کہاں سے — غریب ہوں ، غریبوں سے ہی ملاقات رہے گی میری ۔ امیروں کبیروں سے تھوڑی —"

"انسان کوشش کرے تو سب ممکن ہے بھائی ۔ ہماری تو تم مانتے نہیں ورنہ منٹوں میں امیر بن جاتے ۔ خود دیکھ لیتے کیسے کیسے لوگ تمھارے آس پاس ہوتے —"

"تمھارا کہا دُرست سہی سُریش بھائی — کام بے شک مناسب ہے لیکن میں گھر سے دُور چلا گیا تو میرے ضعیف باپ، پردہ نشیں بیوی اور کم عمر لڑکے کو کون دیکھے گا ۔ تینوں توجّہ کے محتاج ہیں اس وقت ۔ تمھارا کہنا ہے چھٹی جلد جلد نہیں ملے گی اس نوکری میں — مہینے کے آخر میں صرف ایک بار — ؟"

"تو پھر — سرکاری نوکری تھوڑی ہے جو باقاعدہ چھٹی ملا کرے ۔ پرائیوٹ نوکری ہے یار اور پرائیوٹ نوکری میں تو سب کچھ مالک کی مرضی سے ہی چلتا ہے ۔"

"اسی لیے تو نا منظور ہے مجھے سُریش بھائی ۔ خفا مت ہونا ۔ دن بھر کی محنت کے بعد روکھا سوکھا جو بھی ملتا ہے سب کے حلق تھوڑے بہت گیلے ہو جاتے ہیں —"

"لیکن رحیم بھائی ہماری لائی ہوئی نوکری میں تو نہ صرف سوکھے حلق گیلے ہوں گے بلکہ پیٹ بھر روٹی کا سکون بھی ملے گا ۔ تم گھر سے دُور رہوگے یہ ٹھیک ہے البتّہ —"

اُسی وقت رحیم کے بڈّھے بابا فہیم باہر سے آتے ہوئے قریب سے گذرے تو سریش اور جیتندر سنگھ بولے — "نمسکار باباجی — ست سری اکال باباجی —"

"جیتے رہو — جیتے رہو —" بڈّھے بابا

ہی ٹوٹی کوٹھری میں چلے گئے۔

"دُور رہنے سے میں ڈرتا نہیں سُریش بھائی لیکن فکر صرف گھر والوں کی ہے ——"

"سوچ لو بھئی —— ابھی تھوڑا وقت ہے ہمارے پاس۔ مان لو تو تمھیں نوکری ملے گی ہمیں انعام ورنہ تم جانو پھر —— ہم تو یہ سوچ کر گھبراتے ہیں کہ جی کس طرح لیتے ہو ایسے —— سائیکلوں کی مرمّت سے ملتا ہی کتنا ہے ——"

"جیسے تیسے گذر رہی ہے —— اللہ کی مرضی" یہ سُن کر سُریش اور سنگھ کے چہرے تمتما گئے۔

اُلّو کا پٹّھا —— احمق —— !! اُنھوں نے سوچا 'اب اللہ نے یہ تو نہیں کہا ہوگا کہ اچھی نوکری ملے تب بھی اسی پھٹیچر دُکان سے چمٹے رہنا۔ تف ہے کمبخت کی سمجھ پر —— بُڈّھا باپ' چھوٹا بچّہ اور پردہ دار بیوی جس نے کبھی کوٹھری سے قدم باہر نہیں نکالا —— اونہہ —— مرے سالا —— ہمیں کیا —— دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے ——

"اچھا یار —— سوچ لینا۔ دو چار روز بعد ہم پھر آئیں گے ——"

منڈیر سے اُٹھ کر رحیم دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہوا تو کوٹھری سے سر نکال کر فہیم بابا نے دریافت کیا —— "یہ گھر سے دُور جانے کی کیا بات ہو رہی تھی بیٹا ——؟"

رحیم نے دیکھا اُس کے بُڈّھے باپ کے چہرے کی ہر سلوٹ میں بے شمار اُلجھنیں پھنسی ہوئی تھیں اور اُترتی دھوپ میں سلوٹوں کے اس جال نے بُڈّھے بابا کے تمام چہرے کو ڈھک رکھا تھا۔ وہ ملائمت سے بولا —— "ایک ملازمت کی بات تھی ابا —— رد کر دی میں نے کیوں کہ آپ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا ——"

فہیم بابا نے تشکّر سے اُسے دیکھا اور اپنے شبہات کو اندر رہی اندر دبوچ کر کھنکھنارے ——

"میں نے گھر چھوڑ کر اچھی ملازمت کی تو تمھارا یہ حال ہوا رحیمو۔ میری غیر موجودگی میں نہ تم اسکول گئے نہ پڑھائی کی ورنہ آج کلرک تو بن ہی جاتے۔ اب پرائیوٹ نوکری پر تم گھر چھوڑ کر جاؤ گے تو شمیم کا یہی حال ہوگا بیٹا —— اُسے کلرک بنتا دیکھے بغیر میری رُوح ہرگز ہرگز جسم نہ چھوڑ سکے گی۔"

"بنے گا ابّا —— شمیم ضرور کلرک بنے گا۔ آپ اُداس فکرمند نہ ہوں۔ سُنا ہے آج کل سرکار غریبوں کو پڑھائی کی کافی سہولتیں دے رہی ہے ورنہ ہمارے پاس کہاں اتنا بچتا ہے بھلا کہ شمیم پڑھ سکے۔ آپ کی خواہش پوری کرنے کے لیے سرکاری سہولت کا ہی فائدہ اٹھاؤں گا انشاء اللہ ——"

شمیم ضرور اسکول جائے گا۔ یہ بات ایک مضبوط لاٹھی بن کر فہیم بابا کے بُڈّھے ضعیف ہاتھوں میں تھم گئی۔ اس خیال کے تحت فہیم بابا کو لگا جیسے لمبی لمبی ہری ہری بیلیں اُن کی جگہ جگہ سے ٹوٹی پھوٹی شکستہ کوٹھری سے لپٹ گئی ہیں اور اُن کی تازگی اور لہلہاہٹ بیچاری سوکھی پیاسی تنگ داماں کوٹھری میں سرسرا کر خوشگوار مہک پیدا کر رہی ہے۔ اور ہوا اُنھیں جُھلا جُھلا کر سائبان کی طرح کوٹھری کی بے بضاعت بوسیدہ چھت پر پھیلا رہی ہے ——

فہیم بابا نے کبھی خواب نہیں دیکھے تھے۔ اُنھیں خواب دیکھنے والوں سے چڑ تھی۔ کام ان کی زندگی کا مسلک تھا۔ صرف دو حرف بھی وہ پڑھ نہیں پائے تھے مگر ایمانداری اُن کی روح تھی۔ خود کام کرتے ہوئے اور دوسروں کو کام میں مصروف دیکھ کر ڈھیروں توانائی اُن میں پیدا ہو جاتی تھی اسی لیے بہتر سے بہتر طریقے پر وہ ہمیشہ اپنی ڈیوٹی بجا لائے تھے۔ اپنے گھر سے دُور ایک بڑے افسر کے گھر کی دیکھ بھال کرتے تھے تاکہ گھر کے گذارے اور رحیم کی تعلیم کے لیے پیسے کی تنگی نہ ہو۔ رحیم پڑھ لکھ کے کچھ بنے مگر باپ کی غیر موجودگی' باپ کے ڈر سے آزاد اور بے فکر ہو کر رحیم نے اپنی ماں اور دادی کی کبھی نہیں مانی۔ گلی محلّے کے بیکار بے پروا بچّوں کے ساتھ ہر وقت ہلڑ بازی میں مصروف رہا —— چُھٹّی میں گھر آ کر جب جب فہیم بابا نے اُسے پیٹا اُس نے آئندہ پڑھائی کا وعدہ کیا لیکن پٹنے سے پڑھائی کا شوق ہونے کی بجائے پڑھائی سے نفرت ہی ہو گئی۔ لہٰذا تمام وعدوں کے باوجود رحیم نے کبھی پڑھائی نہ کی —— تھک کر۔ ریٹائر ہو کر فہیم بابا نے اپنی جمع پونجی سے اُسے سائیکلوں کی مرمّت کی ایک چھوٹی سی دُکان کھول دی اُسی میں وہ اب تک پھنسا ہوا تھا —— فہیم بابا چاہتے تو ریٹائرمنٹ کے بعد رحیم اُن کی جگہ لے سکتا تھا مگر فہیم بابا نہیں چاہتے تھے کہ رحیم کی طرح شمیم بھی محتاجی کی زندگی گذارے۔ برائے نام روزگار کی اس دُکان پر بیٹھے بیٹھے رحیم شمیم پر نگاہ تو رکھ سکے گا۔ خود کچھ نہ بن سکا لیکن شمیم کو ضرور کچھ بنا سکے گا۔ یہی فہیم بابا نے دور اندیشی کی ——

علم نے اُن کے ذہن کو اُجالے نہیں بخشے تھے مگر تجربوں نے اُن کی فکر پر جِلا ضرور کر دی تھی۔ اچھے گھرانے کی ملازمت نے زندگی کو سنوارنے کے طریقے اُنھیں ضرور سمجھا دیے تھے۔ اب جب کہ وہ ریٹائر ہو چکے تھے کام کرنے کی اُن کی صلاحیت باقی نہیں رہی تھی۔ رحیم کو کام میں مشغول دیکھ کر اپنی ضعیفی بھول جاتے —— زیرِ لب مُسکراتے رہتے اور گاہکوں کے علاوہ جو کوئی رحیم سے ملنے آتا اُس پر نظر رکھتے' وہ جانتے تھے غریبی اُس ٹھیکرے کی طرح ہوتی ہے جسے ہر کوئی ٹھوکر مار سکتا ہے۔ کوئی

بھی ٹھوکر رحیمو کو اکھاڑ سکتی ہے۔ پٹخ سکتی ہے۔
کہیں بھی پہنچا سکتی ہے اور جو چیز ایک بار اکھڑ
جائے وہ ضرور ختم ہو جاتی ہے پھر پنپ نہیں سکتی
اسی لیے اہم بات یہی ہے کہ اپنی جگہ نہ چھوڑی
جائے۔ وہ کتنی چھوٹی کیوں نہ ہو اُس پر اپنا قبضہ
ضروری۔ دُنیا بڑی تیزی سے بدل گئی تھی۔ اب تو
قانون کے ساتھ ساتھ لاقانونیت بھی حکمراں تھی
اسی خوف اسی خدشے کے تحت فہیم بابا ہر وقت
رحیم کے ارد گرد منڈلایا کرتا اور خدا کا شکر بجالاتا
کہ رحیم لالچی نہیں۔

ننھا شمیم صبح دوپہر شام "کنچے" کھیلتا ہوتا
اور دادا سے شکوہ کرتا۔ "ہم غریب کیوں ہیں دادا۔
ہمارے پاس اچھا کھانا۔ اچھے کپڑے کیوں نہیں"
شمیم مُنہ لٹکاتا ــــــ

"اللہ کی مرضی بیٹے ــــــ دوسروں کو دیکھنے
کی بجائے خدا جو ہمیں دے اُسی میں خوش رہنا
چاہیے بچے ــــــ"

وہ آہستہ آہستہ اپنی باتوں اپنے ارادوں
سے پہلے تو خدا تعالیٰ کو شمیم کے وجود میں بھرتے رہتے
پھر اُس کے دل میں محلّے ٹولے کی سرگرمیوں کو دبا کر
مدرسے کو اُبھارتے۔ کتابوں کو سنوارتے رہتے۔ اسی
کوشش کے نتیجے میں جس روز شمیم نے محلّے کے
چھوٹے سے مدرسے میں اپنے قدم رکھے فہیم بابا نے
ترکِ ملازمت کے وقت اتارے ہوئے اپنے عمامے
کو شان سے دوبارہ اپنے سر پر جمالیا اور اسکول
سے شمیم کے لوٹنے تک سارا وقت بازار کی مختلف
دُکانوں پر بیٹھے اتراتے رہتے۔ اپنے پوتے شمیم کے
اسکول جانے کی بات کوئی سُنے نہ سُنے سب کو سُناتے
رہتے۔ اسی طرح جس روز شمیم نے دسویں جماعت
پاس کرلی فہیم بابا مُسکراتے اِس جہاں
سے رخصت ہوگئے۔ اِس اطمینان کے ساتھ کہ اُن کا
نصب العین پورا ہو چکا ــــــ

فہیم بابا خوشی خوشی مرگئے تو رحیم نے
اُن کا عمامہ اپنے سر پر تو نہیں لپیٹا لیکن احتیاط
سے رکھ ضرور لیا۔ وہ ایک معمولی میکانک' اُس
پر عمامہ سجتا بھلا؟ وہ اپنے غریب والد کے چھوٹے
سے وقار کی توہین نہیں برداشت کرسکتا تھا۔ اُس
کے ناتراشیدہ غیر تربیت یافتہ ذہن میں عمامے
کا بڑا بُلند بڑا خاص مقام تھا۔ وہ اِس عمامے کو
شمیم کے سر پر بھی نہیں سجا سکتا تھا کیوں کہ اگرچہ
ترقی کی دوڑ میں شمیم حسبِ حیثیت کافی بڑھ چکا
تھا اور ایک اہم دفتر کے اعلیٰ افسر کا خصوصی چپراسی
بنا ہوا تھا پھر بھی عمامہ پہننے کے لائق تھوڑی تھا۔ اب
بالکل فہیم بابا کی طرح رحیم بھی شمیم کی تمام حرکات
پر کڑی نظر رکھتا۔ وہ کب کہاں جاتا کس کس سے
ملتا جلتا۔ کب گھر لوٹتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہ تمام معلومات شمیم کے دفتر کا دوسرا
چپراسی جو اتفاق سے اُن کا ہم محلّہ تھا۔ رحیم کو
روز پہنچایا کرتا۔ ایک طرح سے رحیم نے اُس لڑکے
کو اِس کام پر مامور ہی کر رکھا تھا جس کے عوض
اُس کی سائیکل کا پنکچر وپنکچر وقتِ ضرورت مُفت
جوڑ دیا کرتا تھا۔

زندگی اطمینان سے گذر رہی تھی کہ ادھر
چند روز سے ایک انجانا گروہ ملازمت کے بعد
تھکے ہارے شمیم کے پاس آتا اور اُسے یاد
دلاتا ــــــ

"تمھارے دادا گذر گئے نا ــــــ؟"

"جی ہاں ــــــ"

"تمھارے ابّا کی آمدنی بہت مختصر
ہے نا ــــــ؟"

"ہاں ــــــ"

"آج کل کی بڑھتی ہوئی مہنگائی کو دیکھتے
ہوئے خود تمھاری تنخواہ ناکافی ہے نا ــــــ؟"

"شاید ....."

"تمھاری والدہ بوڑھی اور بیمار
نا ــــــ؟"

"ہاں ہاں ــــــ"

"تمھاری یہ بوسیدہ کوٹھری ناقابلِ ر
اور خطرناک ہے نا ــــــ؟"

"تو ــــــ؟"

"تو تم کچھ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ان مذ
پر قابو پاکر آرام سے جی سکو ــــــ؟"

"آرام ہم غریبوں کی قسمت میں کہ
بھائی صاحبو ــــــ زمانے سے لڑنے کا حوص
ہے نہ قابلیت ہے ہمارے پاس۔ صرف غریبی
غریبی ہے۔"

"تمھیں زندگی کا آرام اطمینان سب
مل سکتا ہے۔ اگر ترقّی کی باتوں کو سمجھو اور اُ
عمل کرو تو ــــــ"

"ترقّی کی باتیں کیسی ہوتی ہیں صاحبو۔
شمیم نے آنکھیں جھپک کر دریافت کیا ــــــ

"اس سلسلے میں بہت سے منصوبے
ہمارے پاس ــــــ ہر ایک کی اہلیت کے مطا
ایسے پلان جو غریبوں کو دلدلوں سے نکال کر ز
زمینوں تک پہنچا دیں۔ جو جُھگّی جھونپڑیوں۔
پکّی کوٹھریوں تک لے جاسکتے ہیں کام کرنے
کو ــــــ"

"کیا سچ مچ ــــــ؟" تعجب سے ش
کا مُنہ کُھلا کا کُھلا رہ گیا ــــــ "کیا واقعی ایسا
ہے؟"

"کیوں نہیں بھائی صاحب۔ آزما
دیکھ لو خود ــــــ زیادہ کیوں کہیں ہم ــــــ"
اور شمیم نے فوری فیصلہ کیا وہ ضرور

...ہوبوں کو آزمائے گا۔ اُن لوگوں نے شمیم کو
دفتر کے ایڈریس کا کارڈ دیا اور اگلے روز آنے
عدہ لے کر روانہ ہوئے ——

اگلی صبح تیار ہو کر شمیم جانے لگا تو ایک
اُسے دیکھ کر رحیم نے سوچا پُوچھ لے کہاں کے
رہے ہیں پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ خاموش
رہا مگر گلی کے نکڑ پر بیٹھے فقیرا دادا اُس کی
ج دھج دیکھ کر خاموش نہ رہ سکے۔

"کہاں کے ارادے ہیں بٹوا۔ آج دفتر
اتے تو نہیں لگتے تم ——"

"سچ پہچانا فقیرا دادا آپ نے —— میں
ج دفتر نہیں جا رہا ہوں بلکہ ایک نئے کام کو
ے کرنے جا رہا ہوں۔ دیکھیے یہ رہا اُس دفتر
کے پتے کا کارڈ ——" شمیم نے دفتر کا اتا پتا اپنے
ذہن میں جما کر رعب سے کارڈ فقیرا دادا کی ہتھیلی
پر رکھ دیا۔ "اُن لوگوں نے اس وعدے سے بلایا
ہے دادا کہ ہم غریبوں کو اب غریب نہ رہنے
دیں گے۔ ترقی کرا کے مطمئن انسان بنا دیں گے۔
ذرا دیکھوں تو ترقی کے اُن کے پلان ——" مُسکرا کر
شمیم چل پڑا ——

ترقی کے پلان —— ؟ فقیرا بُدبُدایا ——
جانے کیسے ہوتے ہیں۔ کیسے غریب کو سُکھی کر سکتے
ہیں۔ لمحہ بھر کے لیے اس تصوّر سے اُس کی ماند ماند
آنکھیں خیرہ ہوئیں پھر ہاتھ میں تھما کارڈ لے کر
وہ فوراً رحیم کے پاس پہنچا اور بے صبری سے
بولا ——

"اب دیکھنا کہ ہماری یہ چھوٹی اندھیری
غلیظ کوٹھریاں کیسی صاف ستھری اور پکّی بن
جائیں گی۔"

"کیا —— ؟" کچھ نہ سمجھ کر رحیم نے
پُوچھا ——

"ہاں ہاں یہی کہتے ہیں وہ لوگ ——"

"کون لوگ —— ؟"

"یہ کارڈ دینے والے جنھوں نے بٹوا شمیم
کو اپنے دفتر بلوایا ہے آج۔ ترقی کے پلان
بتلانے کو ——"

یہ سُنتے ہی مرمّت کا کام چھوڑ کر کارڈ ہاتھ
میں لیے رحیم سرپٹ بھاگا —— جانے کون لوگ
ہیں —— ؟ کیا کروانا چاہتے ہیں شمیم سے —— ؟
کچھ اُلٹ پلٹ ہو گیا تو پھر شمیم کی چپراسی کی
سرکاری نوکری کا کیا بنے گا بھلا —— ؟

لپکتا لپکتا —— ٹھہر ٹھہر کے راستے کے
لوگوں سے کارڈ پر لکھا اتا پتا پُوچھتا بالآخر وہ اُس
دفتر پہنچ ہی گیا۔ چوڑے احاطے کا آہنی سلاخوں
والا بڑا پھاٹک بند تھا جس کے ساتھ کُرسی
بچھائے بندوق ہاتھ میں تھامے گُل مُچھّوں والا
سنتری بیٹھا باہری راستے کو گھور رہا تھا۔ مارے
ڈر کے رحیم کو تھر تھری چھوٹ گئی۔ یہ سنتری اُسے
اندر تھوڑی جانے دے گا بھلا —— چپکے سے وہ
دفتر کی عمارت کی پچھلی جانب کھسک لیا ——

شمیم کتنا بھی سمجھدار سہی مگر اس عمر کے
لڑکوں کی سمجھداری اُس خنجر کی طرح ہوتی ہے جو
کبھی کبھی خود مارنے والے کو بھی چُبھ کر زخمی کر سکتا
ہے۔ پوری خاموشی سے عقبی دیوار سے سٹ کر
رحیم نے سلاخوں والی کُھلی کھڑکی سے اندر
جھانکا —— ایک لمبا کمرہ نوجوانوں سے بھرا تھا۔
کُرسی پر بیٹھا افسر اُنھیں بتلا رہا تھا: "پیسے کی
ہمارے پاس کمی نہیں۔ ہم کام کرنے والوں کے
دامن پیسے سے بھر دیں گے مگر کام آپ کو وہی
کرنا ہوگا جو ہم چاہیں گے جس طریقے سے جب
ہم چاہیں گے۔ کام کے لیے رات دن کی کوئی
تخصیص نہیں ہوگی۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے ہم تیار ہیں ——"
کئی بے حد غریب نوجوانوں نے اثبات میں سر
ہلائے۔ اُن سب سے فوراً کاغذوں پر انگوٹھے
لگوا لیے گئے —— لیکن کچھ نوجوانوں نے کام کی
وضاحت چاہی ——

"آپ سب کو نزدیکی اور دُور دراز دونوں
جگہوں پر ہمارا دیا ہوا مال سپلائی کرنا ہوگا۔ جو
بھی چیز دی جائے اُسے مکمّل حفاظت سے پہنچانا
ہوگا۔ ہمارے کارخانوں میں ضرورت کے مطابق
کام کرنا ہوگا اور سخت ضرورت پڑنے پر اپنا نام
بھی بدلنا ہوگا۔"

"کیا —— ؟" رحیم کے دیکھتے دیکھتے شمیم
اسپرنگ کی طرح اُچھلا ——

"ہم نام نہیں بدلیں گے۔ نام ہماری
پہچان ہے صاحب ——"

"تو پھر تمھیں کام بھی نہیں ملے گا ——"

"نہ ملے ——"

"اے نام بدلنے سے ہم خود تو نہیں
بدل جائیں گے۔ یہ تو بس کام بھر کی مجبوری ہوگی
جیسے ہی کام ختم ہوگا ہمارے نام ہمیں مل
جائیں گے۔ ہے نا صاحب —— ؟"

مگر کُرسی پر بیٹھے افسر نے اس بات کا
کوئی جواب نہیں دیا ——

"احمقو ——" شمیم ایک دم دھاڑا ——
"مجھے تو کچھ دال میں کالا نظر آ رہا ہے یہاں ——
چلو یہاں سے، نہیں چاہیے ہمیں نام کے عوض
کام ——"

شمیم نے وہ فارم جن پر کام کے خواہش مند
لوگوں نے انگوٹھے لگائے تھے افسر کے سامنے سے
جھپٹ لینے کی کوشش کی ——

"پکڑو پکڑو —— مارو اِسے ——"

یہ سرپھرا خواہ مخواہ سب کو بہکا رہا ہے۔ خود چپراسی ہے تو سمجھ رہا ہے دوسرے سبھی کام سے لگے ہوتے ہیں — خبردار جانے مت دینا اسے —"

"بند کرو بیکار بکواس —" بڑے افسر کا نائب جو لوگوں کے ساتھ کھڑا تھا بولا —

"معمولی چپراسی ہو کر صاحبوں جیسے تیور مت دکھلاؤ۔ پہلے افسر بنو پھر ایسی بات کرنا —"

"بے شک میں ایک معمولی چپراسی ہوں جی۔ مگر کیا چپراسی انسان نہیں ہوتے جناب؟"

"جناب کے بچے" بے روزگار غم زدہ افلاس کے ستائے ہوتے دکھی لوگوں نے شمیم پر یلغار کی "تم کون ہوتے ہو ہمیں مجبور کرنے والے — نہیں کرنا چاہتے کام تو دفع ہو جاؤ یہاں سے — آخر نام نے کیا دیا ہے ہمیں۔ اگر نام بدلنے سے آرام کی چند سانسیں میسّر آ سکتی ہیں تو کیوں نہ بدلیں نام — ضرور بدلیں گے تم نہیں روک سکتے ہمیں —"

کسی نے شمیم کا کالر کھینچا کسی نے آستین۔ کوئی اُس کے بال کھسوٹنے لگا کوئی اُس کی پیٹھ پر دوہتّھڑ مارنے لگا — "دفع ہو — دفع ہو — تم کوئی خدائی فوجدار نہیں ہو —"

مارے طیش کے شمیم نے خود پر جھپٹتے ہوئے جانوروں جیسے لوگوں کو پوری طاقت سے مخالف سمتوں میں دھکیلا اور بڑے افسر کی جارحانہ دھمکیوں سے بے پروا کمرے سے کود کر صحن میں اترا اور لپکتا ہوا بند پھاٹک کی طرف جانے کی بجائے قریبی پیڑ کے سہارے اُوپر چڑھ کر احاطے کی دیوار پھلانگ گیا — اُسے کمرے سے نکلتا دیکھ کر رحیم کھڑکی چھوڑ کر بھاگا۔ آہنی تار لگے عقبی حصّے میں گھسنے کی کوشش میں اُس کی پھٹی ہوئی قمیض اور کندھوں کی خراشوں سے خون رِس رہا تھا مگر یہ خوشی کہ پیسے کی چمک دمک سے شمیم نے خود کو منسوخ نہیں کیا۔ اپنے باپ دادا کو ذلیل نہیں کیا۔ قوت کا زبردست خزانہ بن گئی اُس میں۔ وہ بے تحاشہ بھاگا اور دوڑتا ہوا شمیم تک پہنچا۔ پھر قبل اس کے کہ بند پھاٹک کھول کر بے رحم سنتری اُن تک پہنچتا یا مشتعل لوگ اندر سے نکل کر اُنھیں جھپٹ لیتے رحیم نے سہارا دے کر شمیم کو اُٹھایا اور پورا زور لگا کر دوڑتے ہوئے دونوں پاس والی گلی میں گھس کر پیچ در پیچ سنسان راستوں سے ہوتے ہوئے آخر کار اپنی کوٹھری پہنچ لیے — ہانپتے کانپتے جیسے تیسے اپنی اندھیری سیلی ہوئی کوٹھری میں داخل ہو کر اپنی بیوی کی حیران پریشان نظروں سے بے نیاز رحیم نے چھت سے بندھے ہوئے ایک کپڑے میں احتیاط سے لپٹا ہوا عمامہ نکالا اور بلا تاخیر شمیم کے سر پر رکھ دیا —

"یہ لے اپنے دادا کا عمامہ۔ اب تُو حقدار ہے اُس کا — غریبی دلدل ضرور ہے بیٹا مگر ایمان وہ روشنی ہے جو ہر اندھیرے کو آسان کر دے۔ اللہ پاک تیرے اندر بسا ہوا ہے یہ اطمینان ہی میری زندگی کا حاصل ہے۔ اب میں مر بھی جاؤں تو کوئی پروا نہیں —"

یہ سُن کر خوشی کے آنسو پونچھ کر شمیم نے سوچا — اگر وہ دادا فہیم کو بھول جاتا تو شاید اپنے مفاد کے لیے خدا کو بھی بھول سکتا تھا مگر دادا فہیم تو "کنچے" کھیلتے وقت ہی اُس کے بچپن کو بڑا پن عطا کر چکا تھا —

○

ذکیہ سُلطانہ نیّر

اُردو

دلِ خواص ہے روحِ عوام ہے اُردو
زباں نہیں ہے مکمّل نظام ہے اُردو

ہر اِک مقام ہے دارالخلافۂ اُردو
اور اِس پہ لطف یہ ہے بے مقام ہے اُردو

کمالِ حسن و فصاحت، جمالِ نطق و بیاں
یہ مقتدی ہیں اور ان کی امام ہے اُردو

غزل سرا ہے زمانہ حیات نغمہ کناں
وظیفۂ سحر و روز و شام ہے اُردو

ہمارے شمس و قمر اس سے نور پاتے ہیں
سحر کی جوت تجلّیِ شام ہے اُردو

ندیم چاند پہ بھی خاک پڑ سکی ہے کبھی
سپہرِ عصر پہ ماہِ تمام ہے اُردو

ہے تلخ کامیِ دشمن میں بھی اسی کا سرور
کوئی بتاؤ کہ کس جا حرام ہے اُردو

عزاز افضل

ز ساحل کی جگہ منجدھار رکھ جاتا ہے کون
ے دریا ہر ندی کے پار رکھ جاتا ہے کون

نطع کیوں ہو چلے سب رشتہ ہائے اعتماد
گمانی کی چھری پر دھار رکھ جاتا ہے کون

ل دے گردن نہ تیشہ بھی کہیں تھک ہار کے
ستے میں روز اک دیوار رکھ جاتا ہے کون

ند کی تقدیر میں زنداں کی راتیں بھی نہیں
زنوں پر صبح کے آثار رکھ جاتا ہے کون

شکستہ ساز، یہ ٹوٹے ہوتے جام و سبو
ی خلوت کو سر بازار رکھ جاتا ہے کون

نسب سے کون پوچھے ایک ساغر کے عوض
کدے میں جبہ و دستار رکھ جاتا ہے کون

۹۸، لورچت پور روڈ، کلکتہ ۷۳۔

صبا اکرام

تمام شب جگی آنکھوں میں خواب کیسا ہے
تہجدوں کا صلہ یہ عذاب کیسا ہے

اگر نہیں تھی کوئی پاپ تشنگی میری
تو بارشوں کا یہ جل تھل عذاب کیسا ہے

یہاں تو آتے ہیں پتھر ہی سب دِشاؤں سے
یہ شہر اے دلِ خانہ خراب کیسا ہے

گھروں میں رہ کے گھروں کو ترستے رہتے ہیں
نہ جانے صدیوں سے ہم پر عذاب کیسا ہے

میں تیرے شہر کو سمجھا تھا اپنی حد لیکن
یہ راستہ، یہ سفر، یہ سراب کیسا ہے
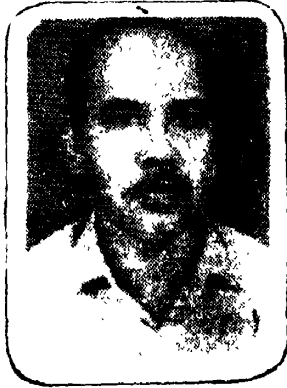
۱۷/۱۹۲-۲۱-اے، فیڈرل بی۔ ایریا، کراچی ۳۸، (پاکستان)

کرشن ادیب

پھول باتوں کے چُنیں، شبنمیں لہجہ دیکھیں
گیت کی جھیل پہ آواز کا بجرا دیکھیں
ہر گھڑی سامنے اک چاند سا چہرا دیکھیں
بند آنکھوں سے کوئی جاگتا سپنا دیکھیں
بھولی بسری سی کوئی ساعتِ شیریں ڈھونڈیں
اس خرابے میں کوئی نقش پرانا دیکھیں
تو ہمیشہ ہی رہے، یاد کے جگنو کی سفیر
شب کی ظُلمت میں کبھی تجھ کو نہ تنہا دیکھیں
کشتیاں بھر کے جو لاتا تھا، حسیں خوابوں کی
کن جزیروں کو ہُوا، آج روانہ دیکھیں
جانے کس جسم کی خوشبو ہے گھُلی پانی میں
کن گلابوں کو بہا لے گیا، دریا دیکھیں

۱۲/۱۴، بی۔ اے۔ یو۔ لدھیانہ

١

چند ہزار سال کی تہذیبی زندگی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر انسان نے جو ترقی کی اور تہذیب و تمدن کی جس معراج کو وہ آج پہنچا ہے اس کا سہرا دنیا کے عالموں، مفکروں، فلسفیوں اور دانشوروں کے سر ہے۔ ہر زمانے میں انسانی زندگی ترقی پذیر رہی کبھی سست رفتار سے اور کبھی تیز رفتار کے ساتھ۔ اور ہر زمانے میں اس ترقی پذیری کا باعث صاحب علم و فضل اور اہل فکر و دانش رہے۔ مگر یہ بھی تلخ حقیقت ہے کہ ہر دور میں اہل علم و فضیلت کی زندگی پر بادشاہوں شہنشاہوں اور حاکمانِ وقت کا تسلط رہا۔ مطلق العنان

غلام اپنے آقا کو تہ تیغ کرتا ہے۔

یہ تیرھویں صدی کا ہندوستان ہے اور ذکر ہے اس شہر کا جو اس وقت علم و فنون کا ایک اہم مرکز ہے۔ دہلی ــــ اور اس شہر میں ایک ایسا شخص اپنے تمام کمالِ فن کے ساتھ سانس لے رہا ہے جس کے فکر و فن کے نقوش شعر و موسیقی کی دنیا میں شاید ابد تک زندہ رہیں گے۔ وہ صاحبِ کمال ہے امیر خسرو۔ عماد الملک کا نواسہ جنھوں نے دس بیس سال نہیں پورے ستر برس حکومتِ دہلی کے اہم رکن کی حیثیت سے باوقار زندگی گزاری اور عمر کی ایک سو تیرہ بہاریں دیکھیں۔ جب ان کا سایہ

محبوب الٰہی کا دامنِ محبت و شفقت۔

امیر خسرو کے سوانح نگار ڈاکٹر وحید مرزا نے لکھا ہے کہ خسرو پیدائشی شاعر بھی تھے اور پیدائشی مصاحب بھی۔ اور ان کی یہ دوہری زندگی آخری دم تک قائم رہی۔ ان کی شاعرانہ عظمت میں کلام نہیں۔ ان کے متصوفانہ خیالات اس مادّی دنیا کے دھندلکے میں مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں اور ایک عالم ان کا عقیدت مند ہے۔

حضرت امیر خسرو کی درباری زندگی کے بیان کو ایک دفتر چاہیے۔ مگر میں صرف چند تاریخی حقائق کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ امیر خسرو

رفعت سروش

اے/۲- ڈی، ڈی۔ ڈی۔ اے فلیٹس، مُنیرکا، نئی دہلی ۶۷۔

امیر خسرو اور سلاطینِ دہلی

بادشاہوں نے عام انسانوں کی زندگی اور ان کی محنت، اور اس محنت کے حاصل کو اپنی جاگیر سمجھا اور اُسے جس صورت سے چاہا اپنے تصرف میں لائے۔ یہ سلسلہ کسی نہ کسی صورت میں آج بھی باقی ہے اور علم و فضل اور فکر و دانش حکومتوں کے تابع فرمان ہیں۔

جس دور کا اس وقت تذکرہ ہے وہ بادشاہوں کی مطلق العنانی کا دور تھا۔ انسانی تاریخ کا ایسا دور کہ تخت و تاج کے لیے بیٹا باپ کو قتل کرتا ہے۔ بھائی بھائیوں کی آنکھیں نکلواتا ہے۔

امیر خسرو کے سر سے اُٹھ گیا اور اُنیس[19] سال کی عمر میں اس نوجوان شاعر کو فکرِ معاش دامن گیر ہوئی تو دامنِ حکومت سے وابستہ ہوا۔ سلطنتیں تباہ و برباد ہوئیں، پھر بنیں، پھر بگڑیں مگر یہ ہوش مند عمر کے آخری سانس تک حکومت کا ملازم اور ہر بادشاہ کا مقرب رہا۔ اس نے اس شغل میں نصف صدی گزار دی۔ شاید وہ ایسا اس لیے کر سکا کہ دنیاوی زندگی کی آلودگیوں کو دُور کرنے کے لیے اس کے پاس ایک نسخۂ کیمیا تھا۔ اپنے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیا

نے ۱۲۷۳ء سے دربارداری کا سلسلہ شروع کیا جب ان کی عمر صرف اُنیس سال تھی لیکن وہ بحیثیت شاعر مقبول ہو چکے تھے اور ان کا پہلا دیوان "تحفۃ الصغر" شائع ہو چکا تھا۔ وہ پہلے غیاث الدین بلبن کے بھتیجے علاؤ الدین محمد کشلی خاں کے دربار سے وابستہ ہوئے۔ پھر چار سال بعد سلطان بلبن کے فرزند بغرا خاں کے مصاحبِ خاص کی حیثیت سے ملتان میں رہے۔ پھر فرزند سلطان محمد قاآن ملک کی مصاحبت اختیار کی، اس دوران جنگی مہموں میں قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں ــــ پھر

حاکم اودھ کی مصاحبت اختیار کی۔ اور جب بغرا خاں اور اس کے بیٹے کیقباد (جو تخت دہلی پر متمکن تھا) میں مصالحت ہوگئی تو دربار دہلی سے بحیثیت مصحف دار وابستہ ہوگئے اور شاہ کی فرمائش پر اپنی پہلی شاہکار مثنوی قران السعدین مکمل کی جس میں باپ بیٹے کی صلح کا حال ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ انھیں اس مثنوی کا صلہ ان کی توقع کے مطابق نہیں ملا۔ انھوں نے لکھا، "جو کچھ مجھے دیا گیا وہ تو کاغذ کے دام بھی نہیں"۔ ۱۲۹۰ء میں دہلی کی تاریخ نے ایک اہم موڑ لیا۔ کیقباد کو قتل کر دیا گیا اور خلجی خاندان کا پہلا بادشاہ جلال الدّین فیروز شاہ خلجی تخت نشین ہوا۔ خسرو اس انقلاب کی زد میں نہیں آئے بلکہ نئے دور میں ان کی قدر و منزلت میں اور اضافہ ہوگیا ستّر سال کا بوڑھا فیروز خلجی علم و فن کا قدر دان تھا اور چونکہ خود بھی شاعر تھا اس لیے شعر خسرو کی عظمت کو سمجھتا تھا۔ اس نے نہ صرف امیر خسرو کو عہدۂ مصحف داری پر بحال رکھا بلکہ انھیں امارت کا درجہ عطا کیا اور اپنے مقربین کے زمرۂ خاص میں شامل کیا اور بارہ سو ٹنکہ سالانہ پنشن بھی مقرر کر دی۔

فیروز خلجی نے سپاہیانہ زندگی گذاری تھی۔ قسمت نے بڑھاپے میں اسے مسند شاہی عطا کر دی تھی۔ چنانچہ وہ اپنی زندگی کے باقی ایّام عیش و عشرت میں گذارنا چاہتا تھا۔ مشہور مورّخ برنی کا بیان ہے کہ ہر رات شراب و شعر و نغمہ و سرود کی محفلیں جمتی تھیں اور فیروز خلجی اپنے مخصوص مصاحبوں کے ساتھ ان محفلوں میں شریک ہوتا تھا۔ خوبصورت غلام، کنیزیں اور رقّاصائیں زینتِ محفل ہوتی تھیں۔ امیر خسرو روز تازہ غزل لکھ کر لاتے اور خسرو اور حسن سنجری کا کلام مشہور موسیقار گاتے۔ اپنے وقت کا مشہور موسیقار محمد شاہ ساز چھیڑتا۔ فتوحہ اور نصرت خاتون غزل گاتیں اور نصرت بی بی اور مہر افروز جیسی رقّاصائیں اپنے رقص سے اہلِ محفل کے دلوں کو مسحور کر دیتیں۔ یہ فنکار اس وقت بھی بادشاہ کے ہمراہ ہوتے جب وہ جنگی مہموں پر جاتے۔

جلال الدّین فیروز خلجی کو تین جنگوں سے سابقہ پڑا۔ اور ان مہموں میں امیر خسرو بادشاہ کے ہم رکاب رہے۔ انھیں ملک کشلی خاں گورنر کڑہ اور امیر علی حاتم خاں گورنر اودھ کی بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلے امیر خسرو ان دونوں کے مدح خواں رہ چکے تھے، مگر اب فیروز خلجی کی فتوحات سے متعلّق مثنوی "مفتاح الفتوح" میں ان دونوں کی مذمت کی۔

فیروز خلجی علم دوست بادشاہ تھا۔ اس نے امیر خسرو کی قدر و منزلت میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی لیکن وہ اپنے بھتیجے اور داماد علاؤ الدّین خلجی کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہوگیا۔ علاؤ الدّین کڑہ کا گورنر تھا۔ وہ دیوگری کی مہم سے کامیاب لوٹا تو فیروز خلجی نے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ مگر علاؤ الدّین نے بے رحمی سے اسے قتل کرا دیا اور اس کا سر معہ سفید داڑھی کے کڑہ کے بازاروں میں گھمایا تاکہ لوگوں پر علاؤ الدّین کی عظمت کا سکّہ بیٹھ جائے۔ یہ قتل ۱۲۹۵ء میں ہوا۔ دارالسلطنت میں کھلبلی مچ گئی۔ ملکہ نے بادشاہ کے چھوٹے بیٹے کو گدّی پر بٹھایا۔ مگر علاؤ الدّین ایک ہاتھ میں تلوار اور ایک ہاتھ میں سونا لیے دہلی کی طرف بڑھا اور جب راستے کے کانٹے صاف کر کے وہ سلطنت دہلی کے تخت پر بیٹھا تو شاعر امیر خسرو ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا اور اس کامیابی پر مبارکباد دی۔

اسے جبرِ حالات کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ عام لوگوں کی طرح امیر خسرو نے بھی اُس تبدیلی کو قبول کر لیا۔ وہ علاؤ الدّین کے ساتھ چتوڑ کی جنگی مہم پر گئے اور صعوبتیں برداشت کیں۔ لیکن آگے چل کر انھوں نے محسوس کیا کہ علاؤ الدّین خلجی ان کی خاطر خواہ قدر افزائی نہیں کر رہا ہے۔ چنانچہ اس کی تخت نشینی کے چار سال بعد امیر خسرو نے ایک منظوم عرضداشت بادشاہ کی خدمت میں پیش کی جس میں اس کی تعریف کے بعد اپنا مدّعا بیان کیا۔ اس کا نفسِ مضمون یہ ہے:

"افسوس کا مقام ہے کہ آپ جیسے شہنشاہ کے ہوتے ہوئے مجھ جیسا شاعر مفلوک الحال رہے۔ مجھے جو کچھ دربار سے تنخواہ کے طور پر ملتا ہے وہ تو میری محنت کا صلہ اور میرا حق ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ آپ کو اس کا علم نہ ہو کہ فیاض بادشاہ شعرا کے اشعار پر خزانے لٹا دیتے ہیں۔ خاقانی نے ایک قصیدے کے ایک ایک شعر پر ہزار ہزار دینار پائے۔ فردوسی نے شاہنامہ لکھا تو بادشاہ نے اسے ہاتھی پر لاد کر سونا دیا، پھر بھی اس بادشاہ کی کنجوسی ضرب المثل بن گئی ہے۔ عنصری کو سلطان محمود سے اس قدر دولت ملی کہ اس کے گھر کا ساز و سامان سونے کا تھا۔ میں بھی اپنے وقت کا عنصری ہوں اور اگر آپ مجھے مالا مال کر دیں تو میری شاعری عنصری کی شاعری سے برتر ہو جائے۔ گھاس بارش کے

پانی سے اُگتی ہے اور شاعری
بادشاہوں کی نوازشوں سے پروان
چڑھتی ہے۔ مجھے میری فنی
صلاحیتوں کے اعتبار سے صلہ ملنا
چاہیے۔ آج سے سو سال بعد دُنیا
بدل چکی ہوگی لیکن جو کچھ میں آج
آپ کی شان میں لکھوں گا اُس کی
قدر و منزلت سو سال بعد معلوم
ہوگی۔ جب دُنیا آپ کو میرے
شعروں کی وجہ سے یاد رکھے گی اور
آپ کا نام زمانے میں روشن
ہوگا۔"

لیکن اس کا جواب سلطان علاؤ الدین خلجی نے صرف یہ دیا کہ امیر خسرو کو دربار میں روز حاضر ہونا چاہیے اور اپنے فرائضِ منصبی انجام دینے چاہئیں۔

اس کے بعد خسرو نے بادشاہ کی خدمت میں ایک اور نظم پیش کی جس کا نفسِ مضمون یہ تھا:

"آپ کے سامنے دن رات
ہزاروں لوگ سر جھکاتے ہیں اگر
ایک میں نہ حاضر ہوں تو کیا فرق
پڑتا ہے۔ ویسے ملازمت کے آداب
جانتا ہوں اور ہمہ وقت آپ کے
سامنے ہاتھ باندھے کھڑا رہ سکتا
ہوں، میں آپ کے دربار میں اپنے
شعر کا جادو جگا سکتا ہوں۔ وقت
پڑنے پر تلواروں اور نیزوں سے
بھی کھیل سکتا ہوں لیکن اگر میری
حاضری لازمی قرار دی جائے تو
میں فکرِ سخن کیسے کر سکوں گا۔ اشعار
کے جواہر ریزے اسی وقت میسر
آسکتے ہیں جب ذہن تازہ اور
تخیل آزاد ہو۔"

لیکن امیر خسرو کو خصوصی مراعات نہیں ملیں۔ برنی کا بیان تو یہ ہے کہ سلطان نے خسرو کو بندھی ٹکی تنخواہ کے سوا کچھ نہیں دیا مگر خسرو نے اعتراف کیا ہے کہ ایک قصیدے کے صلے میں انھیں ایک گاؤں بطور جاگیر ملا تھا۔

میرا خیال ہے کہ سلطان علاؤ الدین خلجی کا یہ رویہ امیر خسرو کے حق میں بہتر ثابت ہوا۔ ان کی آمد و رفت اپنے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیا کی خانقاہ میں بڑھ گئی۔ وہ باقاعدہ محبوبِ الٰہی کے مرید ہوگئے اور روزانہ اپنے پیر کی قدمبوسی کے لیے جانے لگے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب خسرو کی شاعری انتہائے کمال پر ہے اور وہ اپنے دیوان "غرۃ الکمال" کی تکمیل میں مصروف نظر آتے ہیں۔ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا کی عظمت ایک دنیا جان چکی ہے اور خود بادشاہ وقت ان کا معتقد ہے۔ خانقاہ چشتیہ کا یہ عالم ہے کہ اس کے دروازے امیر و غریب، ہندو، مسلمان، عالم، درویش، فقیر، بادشاہ۔ سب کے لیے کھلے پڑے ہیں۔ تصوّف دارالسلطنت کا مزاج بن گیا ہے۔ ایک صلائے عام ہے جو بادشاہ اور رعایا کو نیکی، راست بازی اور خدمتِ خلق کی دعوت دے رہی ہے۔ علاؤ الدین نے شراب نوشی ممنوع قرار دے دی۔ شراب جو اُم الخبائث ہے —— بازاروں میں چیزوں کی قیمتیں مقرر کیں اور اخلاقی ضابطے قائم کیے۔

امیر خسرو نے "خزائن الفتوح" کے عنوان سے علاؤ الدین خلجی کے کارناموں کو قلم بند کیا اور ان کی یہ تصنیف تاریخ علائی کہلائی۔ خسرو نے علاؤ الدین کی نسبت لکھا ہے کہ سات سو سال بعد حضرت عمر کا انصاف دیکھنے میں آیا ہے۔

یہی وہ دَور ہے جب امیر خسرو نے اپنے تیسرے دیوان "غرۃ الکمال" میں خدا اور رسول کے ذکر کے بعد حضرت نظام الدین اولیا کی مدح پہلے لکھی اور بادشاہ کی تعریف بعد میں۔ اس کتاب میں ان کی قلبی کیفیات خون کی بوندیں بن کر دیباچے کی صورت میں ٹپکی ہیں:

"افسوس صد افسوس! ان چند
شعبدوں میں، جھوٹ کی اس
پوٹ میں اپنی عمر کی نفیس ترین
سانسیں خالی کر دیں اور عمرِ عزیز ان
پر ضائع کر دی۔ شعر سے میرے
ہاتھ وہی آیا جو گرد و غبار سے
آدمی کی مٹھی میں آتا ہے۔ اس
خبط زدہ اندھیرے میں بہت
مکّے چلائے۔ اب چاہوں کہ ہاتھ
دھولوں تو میں ہوا سے ہاتھ بھی
نہیں دھو سکتا۔ کفر و زندقہ میں
اتنی فکر صرف کر دی۔ اُسے
کسی اچھے کام میں لگانا چاہیے
تھا۔"

دربارِ علاؤ الدین سے ایک گونہ بے تعلقی نے خسرو کے ذہن کو نئی سمت میں موڑا۔ انھوں نے نظامی گنجوی کی پانچ مثنویوں کے جواب میں خمسۂ خسرو لکھا۔ صرف تین سال میں پانچ مثنویاں، اور انھیں اپنے روحانی پیشوا حضرت نظام الدینؒ کی نذر کیا۔ یہی علاؤ الدین کی جنگی فتوحات کا زمانہ ہے —— خسرو کی مثنوی "لیلیٰ مجنوں" ۱۲۹۹ء میں مکمل ہوئی وہ اس مثنوی کے اختتام میں اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہیں ؎

کانہ زموگرہ کشائی
شنی تنا سرائی
ن نشوی کہ ہر زمانے
م بہ دروغ داستانے

صحت پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اپنی زندگی کا تجزیہ پیش کرتے ہیں جو اس زمانے کے آج کے مجبور اور نوکر پیشہ انسان کے کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ حسّاس انسان اور فن کار کی قسمت ایک ہے چاہے تیرھویں صدی ہو یا بیسویں صدی۔ خسرو لکھتے ہیں :

"مجھ جیسا مسکین، حاجت مند، بے سروسامان جو کھولتی ہوئی ریگ میں تپ رہا ہے۔ رات سے صبح تک اور صبح سے شام تک گوشۂ غم میں چین نہیں پاتا۔ خود غرضی کے ہاتھوں یہ ذلّت اٹھاتا ہوں کہ جیسے ایک آدمی کے سامنے باادب کھڑا رہنا پڑتا ہے جب تک پاؤں سے سر کو خون نہیں چڑھ جاتا کسی کے پانی سے میرا ہاتھ تر نہیں ہوتا۔"

اس منزل تک آتے آتے امیر خسرو اپنے سوز دروں میں تپ کر کندن بن چکے تھے اور اس سونے کو نکھارا ان کے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیا نے جو انھیں سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

خسرو علم و عمل کا پیکر تھے۔ وہ علم و ادب کی خدمت کرتے رہے کہ یہ ان کی خلاقانہ فطرت کا تقاضہ تھا۔ وہ دربارِ شاہی سے آخر دم تک منسلک رہے کہ وہ ان کے لیے دار العمل تھا۔

تخت دہلی خون سے بار بار لال ہوتا رہا۔ بادشاہتیں بدلتی رہیں خسرو نے سلطان قطب الدین مبارک خلجی کی مدح سرائی کی کہ فرض منصبی تھا اور مثنوی "نہ سپہر" لکھی جس میں قطب الدین کی فتوحات کا تذکرہ ہے۔ یہ مثنوی خسرو کے بہترین شعری کارناموں میں سے ایک ہے۔ اس مثنوی کے صلے میں خسرو کو شاہی دربار سے واقعی ہاتھی پر لاد کر سونا انعام کے طور پر ملا — مگر شاید اب شاعر اس منزل سے گزر چکا تھا جسے سونا پاکر بے پایاں خوشی ہوتی۔

پھر تاریخ نے ایک اور کروٹ بدلی اور دلی کے تخت پر ایک نیا خاندان قابض ہوا تغلق خاندان۔ سلطان محمد تغلق سے بھی خسرو کا وہی معاملہ رہا جو دیگر شاہانِ دہلی سے تھا۔ مثنوی "تغلق نامہ" کی تصنیف اور جنگی مہموں میں بادشاہ کے ہم رکاب رہنا۔ لیکن اب وہ دربارِ شاہی کے کھوکھلے پن اور درباری داری کی مکروہات کو سمجھ چکے تھے۔ ان کا دل اپنے پیر کے آستانے پر کھنچا اور ہو چکا تھا اور وہ دراصل اپنی غزلوں میں تصوّف کے وہ رموز آشکار کر رہے تھے جو شیخ نظام الدین اولیا نے اپنی توجہ سے ان کے سینے میں اتار دیے تھے۔

میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ بادشاہوں اور امیروں کی شان میں لکھے ہوئے قصیدے ان کی شاعری کا صدقہ ہیں۔ ان کا لازوال شعری کارنامہ ان کی وہ غزلیں اور مثنویاں ہیں جن میں انھوں نے انسان کی عظمت، زندگی کی طہارت، پاکیزگی اور محبّت کے گیت گاتے ہیں اور اعلیٰ انسانی اقدار پیش کی ہیں۔

۱۳۲۵ء میں حضرت نظام الدین اولیا کا وصال ہوا خسرو بہ سلسلہ ملازمت بادشاہ کے ساتھ جنگی مہم پر گئے ہوئے تھے۔ واپس لوٹے تو اس سانحہ کی تاب نہ لا سکے اور اسی سال دنیا کے ہر دربار کو چھوڑ کر اس ابدی دربار میں پہنچ گئے جہاں ان کے پیر و مرشد نے ان کے لیے پہلے سے جگہ محفوظ کر لی تھی۔

○

صبحِ دلّی

بنارس کی صبح تو واقعی دلکش ہوتی ہے مگر اہلِ نظر جانتے ہیں کہ ہماری دلّی کی صبح اس سے کچھ کم نورانی، دلفریب، دلکش نہیں ہوتی۔ جب شاہدرہ کی طرف سے پو پھٹتی ہے اور تڑکا ہونے لگتا ہے تو اس کا نورِ جناجی، لال قلعے اور جامع مسجد کے اُوپر ایسی آبداری پیدا کرتا ہے جس کا لطف آنکھوں سے دل اور دل سے رُوح میں شامل ہو جاتا ہے اور سیر کرنے والا تھوڑی دیر اس تصور میں ڈوب جاتا ہے کہ میں اس وقت جنّت کی بہار دیکھ رہا ہوں۔

——— خواجہ ناصر نذیر فراق (مشمولہ مرحوم دلّی کی ایک جھلک)

ساغر کی نگاہ سے پون صدی گذری اور پون صدی کے ہجوم سے ساغر گذرے۔ خواب اور حقائق عزائم اور مقاصد' روایات اور اجتہادات' ناکامی و کامیابی اور امید و بیم کا ایک طلسم زمانے کے ساتھ ساتھ رنگارنگ انداز سے ان کی نگاہوں کے سامنے آتا رہا۔ اور اپنی کیفیتوں کے ساحرانہ پرتو ساغر پر ڈالتا رہا۔ اور ساغر فطرت اور وقت کی ہر عطا پر لبیک کہتے رہے ہر آنے والا لمحہ انھیں ادراک و بصیرت کی دولت بخشتا رہا۔ ساغر کے اشعار خود ساغر کے پیکر معنوی ہیں جن میں فکر و فلسفہ' حسن و عشق اور موت و زندگی آتے رہے۔

ساغر ایک خود ساز شخصیت تھے انھوں نے اپنی زندگی کی عمارت خود تعمیر کی۔ ساغر نے اپنی تعلیم و تربیت' معاشی اور کفالت اور شہرت و کامیابی کا مجسمہ زندگی کی سنگین چٹان سے خود ہی تراشا تھا۔ ساغر نے شروع ہی سے فکر و خیال کی نئی راہیں نکالیں۔ نئے الفاظ اور ان کے استعمال کا نیا انداز اختیار کیا۔ نئی تہذیب کی کھلے دل سے پذیرائی ' وقت سے ہم دوشی کا ولولہ' مستقبل کی ہم رکابی کا حوصلہ اور زندگی کے ہر موڑ پر شداید زندگی سے پامردی کے شروع سے آخیر تک ایک بالیدگی پائی جاتی ہے۔

ساغر کی تخلیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ اک نئے آغاز کا جشن مسرت ہو رہا ہے۔ ان کے کلام میں انسانیت کے ارتقا کے متعلق یقین کی نشان دہی ملتی ہے' ساغر کی شاعری محرک ہے اُن کے نغمے انسان کے اندر جینے کا ولولہ پیدا کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ ساغر کی شاعری میں آپ ایک نشاط اور سرشاری پائیں گے۔ دنیا کے غم و الم سہنے کی طاقت پائیں گے۔ اور ظرفِ غم ساغر کی شاعری میں سب سے زیادہ ہے۔ تبھی تو وہ کہہ سکتے ہیں :

ساغر نظامی

میرے مرحوم شوہر

ذکیہ سلطانہ نیر

بلاک اے، کوارٹر نمبر ۷۲، الکنندہ، نیل گری اپارٹمنٹ
گریٹر کیلاش، نئی دہلی۔

کی عریاں صداقتیں اپنے جمال و جلال کے ساتھ نمایاں ہوتی ہیں۔

ساغر ایک ہمہ صفت موصوف شخصیت کے مالک تھے۔ شاعر بھی' انشا پرداز بھی' ڈرامہ نگار بھی' اور افسانہ نویس بھی۔ صحافی اور مقرر بھی۔ خدا نے انھیں ذوقِ سلیم اور فہمِ رسا کی دولت عطا کی تھی۔ تخیّل کی بلند پروازی' عقل کی تیزی' ذہن کی رسائی' قوتِ اجتہاد' خوب سے خوب تر کے لیے مسلسل جہد' مسرت اور غم دونوں حالتوں میں لبوں پر ایک خندۂ سرشار۔ زندگی کے ہر موڑ پر' حیات کے ہر مرحلے پر ساغر رنگارنگ صفات کے ساتھ نظر ساتھ مقابلہ ساغر کے کردار کی نمایاں خصوصیات تھیں :

دھارے کے موافق بہنا کیا توہینِ دست و بازو ہے
پروردۂ طوفاں کشتی کو دھارے کے مخالف بہنے دے

ساغر نظامی کے کلام میں غم کا عنصر کم ہے۔ اور جتنا ہے وہ بھی کسی صوفی یا تپسّی کا غم نہیں ہے بلکہ اس انسان کا الم ہے جو دُنیا اور دُنیا کی چیزوں کو دنیاوی نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ان کا فن فکر کی آماجگاہ ہے۔ ساغر کی شاعری محض مجلسی نہیں بلکہ انسانی فکر و آلام کی ترجمان ہے۔ ان کی شاعری میں بلیغ اشارے ملتے ہیں۔ ان کے خیالات و جذبات میں

آنسو تو وہی ہے جو رواں ہونے نہ پائے

وہ کسی عمر میں بھی شکست کھانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کی قوتِ ارادی ہمیشہ نیا زرہ بکتر پہن کر زندگی کے مقابلے کے لیے تیار رہتی۔ ان کی ذات کی طرح ان کی شاعری میں بھی ہمیشہ نئی قوتیں ابھرتی رہی ہیں۔

اپنی غزل میں وہ وقت کے نئے میلانات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ساغر نے غزل کے ساتھ دوسرے اسالیب بھی اختیار کیے۔ وہ نظم بھی لکھتے تھے اور گیت بھی لکھتے تھے۔ تخیل کی نغمگی اور جذبے کی رجائیت ان کے کلام کی خصوصیت تھی۔ اسلوب

ے نقطۂ نظر ان کی فکر کسی ایک خانے میں محدود نہیں تھی۔ وہ جدید سے جدید تر کے قائل تھے۔ اصل میں ...گی اتنی تہہ دار ہوگئی ہے کہ کوئی شخص اکہری زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ ساغر نے اس راز کو خوب سمجھا اور ہمہ جہت جدوجہد جاری رکھی۔ ساغر انقلاب اور ترقی کے علمبردار تھے۔ اور ان کا ہاتھ ہمیشہ کروٹ بدلتی ہوئی قدروں کی نبض پر رہا وہ زندگی کے سنگین حقایق سے لاپروا اور بیگانہ نہیں بلکہ ان حقایق کے رازداں ہیں، وہ رجعت پسند سماج اور شکست خوردہ ذہن سے سخت نفرت کرتے تھے۔ ساغر یہ بات علانیہ کہتے تھے کہ غزل کو بہت نیا لباس پہنانا مشکل ہے مگر وہ غزل کے عشاق میں سے تھے۔ ساغر کی غزل میں ایک کیف ہے، وجد ہے، رقص ہے، ترنّم ہے، محویّت ہے وارفتگی ہے۔ اور روایت کے خلاف ایک عاشقانہ رجزیت بھی۔ ساغر اپنی اچھائیوں اور برائیوں کے سب سے بڑے پارکھ تھے۔ ترک و اختیار پر انھیں قدرت کاملہ حاصل تھی اس کے باوجود کہ ساغر موجودہ بے حس اور بے ذوق سوسائٹی کے اطوار و انداز کے سخت مخالف تھے اور اس سے ان کی نفرت روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ ان کے اندر مایوسی اور جمود پیدا نہیں ہوا۔ اور وہ پر امید رہے کہ ان کو نہیں تو آنے والی نسلوں کو ایک بامعنی حسّاس اور خوش ذوق سوسائٹی ضرور نصیب ہوگی اور اس سماج کی بنیاد خوشحالی اور آسودگی پر رکھی جائے گی۔

ساغر نے اپنے رسائل "پیمانہ" اور "ایشیا" میں بہت سے شاعروں کے محاسن کا اعتراف ہی نہیں کیا اشتہار بھی دیا مگر دوسروں کا تو کیا ذکر خود ساغر نے ساغر کی طرف سے تقریباً ۴۰ برس آنکھ بند رکھی۔ ساغر نے شکنتلا، انارکلی، نہرو نامہ اور مشعلِ آزادی جیسی طویل نظمیں لکھیں اور یہ شائع ہوئیں لیکن تقریباً ۴۰ برس کی مدت میں کہا ہوا

بیگم ساغر اور ساغر نظامی ۱۹۴۴ء

دوسرا کلام ابھی نقل بھی نہیں ہوا ہے — اور یہ ساغر کا شاعرانہ استغنا تھا۔

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد غیر ملکی حاکموں نے ناقابلِ بیان مظالم ہندوستانیوں پر ڈھائے اور بالآخر کامل غلبہ حاصل کرلیا۔ اب ایک پرسکون ماحول مغربی تعلیم و تمدّن کے پھیلنے کے لیے میسّر آگیا لیکن یہی وہ وقت تھا جب رفتہ رفتہ ہندوستانیوں کا سماجی اور سیاسی شعور جاگا۔ اُردو شاعری میں "وطنیت" کا تصور مغربی ادب سے پیدا ہوا لیکن آزادی کا تصوّر۔ فرد کی اہمیّت اور ایسے ہی دوسرے نئے موضوع ہمیں صرف مغربی ادب کے مطالع نے نہیں دیے بلکہ یہ انگریزی اقتدار و تسلّط کا نتیجہ تھے۔ ساغر ان اُردو شاعروں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں جنھوں نے شروع سے آخیر تک قومی تحریکوں کا ساتھ دیا۔

ساغر باغیانہ احساسات کو ہمیشہ اُبھارتے رہے۔ ملک آزاد ہو جانے کے بعد بھی ساغر کا باغیانہ آہنگ قائم رہا مگر اب ان کی بغاوت سماجی نابرابری، ناانصافی اور رجعت پرستی کے خلاف تھی۔

ساغر صرف سماج کے ظالم عناصر ہی کو نہیں للکارتے کبھی کبھی ان کی للکار سماج اور سماج سے گذر کر آفاق کو بھی پار کر جاتی ہے:

اے کاتبِ تقدیر ہماری بھی رضا پوچھ
یوں نامۂ تقدیر رقم ہونے نہ دیں گے

ساغر زندگی کا ایک اصول رکھتے تھے اور اس اصول کے مطابق جینا یا مرنا چاہتے تھے۔ وہ خوددار تھے لیکن خود پرست نہیں وہ اِس کے قائل تھے کہ ادب کو سیاست سے الگ نہیں کیا جاسکتا مگر شاعر کو عملی سیاست میں نہیں پڑنا چاہیے۔ ایسا کرنا اس کی موت ہے۔ وہ ادب کے مقابلے میں عملی سیاست کو کمتر درجے کی چیز سمجھتے تھے۔

ساغر قدامت سے صرف چند چیزیں انتخاب کرنے ہی کو عقلمندی سمجھتے تھے ورنہ وہ ماضی کی سوسائٹی کو جو جاگیردارانہ سوسائٹی تھی اِس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ اس کو یاد کیا جائے ان کا خیال تھا انسان کی موجودہ نسل کو اجتماعیت کا احساس ہے

اور یہ وقت کا سب سے بڑا انعام ہے۔ ساغر ہندوستان میں مذہبی سماج اور مذہبی حکومت کو یہاں کے مختلف العقیدہ باشندوں کے لیے نامناسب خیال کرتے تھے اور اس کے مدعی لوگوں کو ہندوستان کا دوست نہیں سمجھتے تھے۔

ساغر ایک آزاد خیال فنکار تھے ان کا جمالیاتی ذوق اور انسان دوستی کا جذبہ سرحدوں کا پابند نہیں تھا۔ وہ یہ نہیں مانتے تھے کہ مشرقی اور مغربی عوام میں کوئی فرق ہے۔ کالے گورے میں کوئی امتیاز ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، عیسائی برہمن اور ہریجن میں کسی نہج سے بھی کوئی دوری ہے۔ ساغر کہتے تھے "انسانیت کی بقا اور دنیا کے تمام سماجوں کے امن اور خوشی کے لیے ضروری ہے کہ ایسی پُرانی تاریخیں نذرِ آتش کر دی جائیں جو اس عہد کی افواہیں پھیلاتی ہیں جبکہ قومیں بالغ نہیں ہوئی تھیں۔ اور ان سے بہت سی غلطیاں سرزد ہوئی تھیں۔ جب تک ان کتابوں کا ورد ہوتا رہے گا نوعِ انسان ماضی کے تعصبات سے آزاد نہیں ہوگی" ساغر کے تفکرات اور خیالات ہی سے ہم ان کے فن کا پس منظر سمجھ سکتے ہیں۔

ساغر ہندوستان میں رہنے والوں کے دلوں کو سمندر کی طرح وسیع چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ حکومت اور اقتدار حصولِ مسرت کا ذریعہ نہیں بلکہ یہ تصور نشاطِ ابدی کا ضامن ہے کہ سارے انسان ایک خاندان کے فرد ہیں۔ مجلسی نظام کی باقی جتنی تعریفیں ہیں وہ غلط ہیں اور اب اپنی عمر پوری کر چکی ہیں۔

ساغر زندگی کا صاف ستھرا ذوق رکھنے والے شاعر تھے۔ اور ان کے فن کی اساس محض رومانیت پر نہیں گہری فکر پر ہے۔

○

مختار شمیم

کچھ ایسے ڈولتا ہے دل طبیعت کی روانی میں
کہ جیسے چھوڑ دیں کاغذ کی کشتی بہتے پانی میں

کبھی لشکر غموں کا ہے، کبھی فتنے تمنّا کے
عجب کہرام برپا ہے یہ دل کی راجدھانی میں

کھلا جب آخری درِ گنبدِ بے در میں نیند آئی
پھر اس کے بعد کیا تھا شاہزادے کی کہانی میں!

کفِ افسوس ملتے ہیں تماشا دیکھنے والے
شناور کو گہر ملتے ہیں آخر گہرے پانی میں

شمیم اِک چیز اپنے پاس تھی سو وہ بھی چھوڑ آئے
ہم اپنی زندگی دے آئے ہیں اُس کو نشانی میں

گورنمنٹ گرلز پوسٹ گریجویٹ کالج (موتی تاویلا) اندور ۴۵۲۰۰۴

محمد احمد رمز

عدم کے عکس ہوں جس میں وہ آئینہ رکھ دو
ہمارے پاس کوئی زہر سی دوا ــــ رکھ دو

کسی نشیب میں لے جاؤ ورنہ تہذیب
کرخاک وخوں کی تہوں میں یہ کیمیا رکھ دو

تم اپنے چہرے کو اب دے دو دوسری آنکھیں
ہمارے دوش پہ سر کوئی دوسرا رکھ دو

سواد ذہن میں بڑھنے لگے ہیں سنّاٹے
نواحِ جاں میں کوئی غنچۂ صدا رکھ دو

درونِ ذات بہت ــــ ہو چکی ہے تارا جی
نیام امن میں اب ــــ خنجرانا رکھ دو

سُلگتے لالۂ و گُل پر نگاہ ڈالو ــــ کبھی
برہنہ شاخ پہ پتّا کوئی ہرا ــــ رکھ دو

بتاؤ پوچھنے والوں کو رمز حال اپنا
ہوا کے دوش پہ جلتا ہوا دیا ــــ رکھ دو

معرفت فوٹو آرٹ اسٹوڈیو، ۴۰/۶، پریڈ، کانپور ۲۰۸۰۰۱

رئیس انصاری

میں اپنے ظرف سے گرتا نہیں ہوں
سمندر ہوں کوئی قطرا نہیں ہوں

یہ کہہ دو شہر کے لوگوں سے جا کر
میں ٹوٹا ہوں ابھی بکھرا نہیں ہوں

اُجالا ہوں میں کچّے آنگنوں کا
تمہارے لان کا کُہرا نہیں ہوں

تُو مُنصف ہے تو دے سب کو سزائیں
میں مُجرم ہوں مگر تنہا نہیں ہوں

غزل کہتا ہوں ذاتی تجربوں سے
کسی اِسکول میں پڑھتا نہیں ہوں

ہینڈلوم کارنر نزد پاور ہاؤس امین آباد، نعمت اللہ روڈ، لکھنؤ
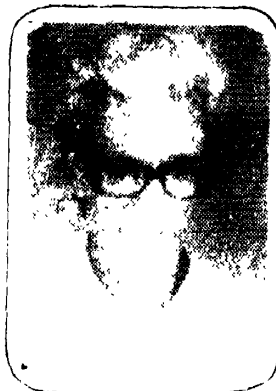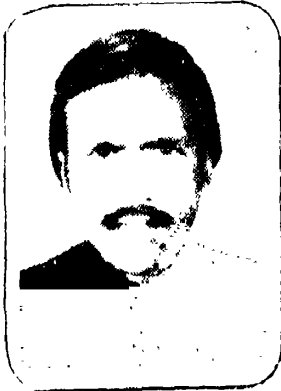
گھنٹی بجی ———

شہد کے چھتے کو جیسے کسی نے چھیڑ دیا، مکھیوں کی بھنبھناہٹ کے مانند بچّوں نے پھسپھسانا شروع کر دیا۔ وہ کلاس روم سے باہر نکلا، کلاس روم کی پھسپھساہٹ شور وغُل میں بدل گئی۔ چند لمحوں کی اُس آزادی کو بچّے اپنا پیدائشی حق سمجھ کر استعمال کرتے تھے۔ گورکھار جمینٹ جیسے اُصول پسند گنگاپور مڈل سکول کے ماحول نے بھی اُس آزادی کو خاموشی سے قبول کر لیا تھا۔ وہ اگلی کلاس لینے کے لیے ہیڈ ماسٹر کے دفتر کے پاس سے گذرا ہی تھا کہ ہیڈ ماسٹر نے اُسے آواز دی۔ وہ رُکا۔ ابھی وہ پلٹا بھی نہ تھا کہ

اٹھائی۔ نم آنکھوں سے اپنے بھائی کی لاش کو آخری بار دیکھنے کے لیے قبر کی گہرائی میں نظریں جھکائیں تو وہاں بھائی کی لاش کی جگہ پتھّر کی سل اُسے نظر آئی۔ بھائی کی لاش اور اپنی نظروں کی بیچ پتھّر کی اُس چادر کو دیکھ کر اُس نے آہ بھرتے ہوئے اپنے بھائی کو الوداع کہا۔ وہ گونگی الوداع کی صدا قبر کی سل سے ٹکرا کر ایسے واپس پلٹی جیسے کسی لاوارث کنوئیں سے ڈرا ہوا کبوتر پر پھڑپھڑاتے ہوئے آسمان کی جانب اُڑا ہو۔ اُس نے مٹّی سے بھری مُٹھی کھول دی مٹّی قبر کی گہرائی میں گری جیسے سمندر میں ابر سے ایک قطرہ گرا ہو۔

بچپن کی اُس درد بھری یاد کو جھاڑ پونچھ کر ذہن میں سجاتے ہوئے وہ سوچ کی اُس پُرانی گتھی کو سلجھانے لگا کہ کوئی کسی کا بھائی ہوتے ہوئے سوتیلا کیسے ہو سکتا ہے؟ ایک عورت کا شوہر اُس کے سینے پر مونگ دلنے کو دوسری بیوی لے آئے تو وہ اس کی سوت تو ہو سکتی ہے مگر بھائی بھائی یا بہن بھائی بھلا کیسے ایک دوسرے کے لیے سوتیلے ہو سکتے ہیں۔ جب جب بھی وہ اس گتھی کو سلجھانے میں ناکام ہوتا تو اُس کے دل میں ایک ہی بات آتی کہ دُنیا کی ہر زبان کی لغت سے لفظ "سوتیلا" خارج کر دیا جانا چاہیے۔

انل ٹھکّر

۸۔ اشوک نگر، ممبئی ۵۸۰۰۳۲۔

مٹھی بھر خاک

ہیڈ ماسٹر نے اُس کی بغل میں آ کر کہا ———

"آپ جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔"

اُس نے پلٹ کر ہیڈ ماسٹر کی نظروں میں نظریں ڈالیں تو ہیڈ ماسٹر سہم کر رہ گیا۔ ہیڈ ماسٹر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اُس کی آنکھوں میں حقارت کا دریا ہے یا درد کا کنواں۔ "پینتالیس منٹ میں کیا فرق پڑ جائے گا ———" اتنا کہہ کر وہ ساتویں جماعت کے کمرے میں چلا گیا۔

کُھدی ہوئی مٹّی کے ڈھیر پر پاؤں جما کر اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک مُٹھی مٹّی

اپنے بھائی کو مُٹھی بھر مٹّی دے کر دوسروں کے لیے جگہ بناتے ہوئے وہ ایک طرف ہٹ کر ٹھہر گیا اور نہاں خانۂ دل میں محفوظ یادوں پر سے وقت کی گرد جھاڑ کر انھیں سلسلہ وار سجانے لگا۔

وہ اپنے بھائی کی پیٹھ پر پیدا ہُوا تھا۔ اس کے بعد دو بہنوں اور تین بھائیوں نے آنکھیں کھولی تھیں۔ جب اُس نے ہوش سنبھالا تو ایک جملہ بار بار اُس کے کانوں سے ٹکرایا کرتا تھا۔ "تمھارا بڑا بھائی ہے نا ——— وہ تمھارا سوتیلا بھائی ہے۔"

یہ جذباتیت اُس کے ماحول کی دین نہیں تھی بلکہ اُس کے معاشرے کی اُس کو بددُعا تھی۔ کیوں کہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے وقت اُس سے ایک غلطی سرزد ہوئی تھی۔ اُس نے ممتا بھرے دل سے ایک یاد کو اُٹھایا۔ جذبات کی پلکوں سے اُسے پُونچھ کر صاف کیا اور حسرت سے اس کے ایک صفحے کو پلٹ کر دیکھا تو اُس یاد نے کروٹ لی۔

آٹھویں جماعت پاس کر لی تھی اس نے۔ چہرے پر سبز کونپلیں سی اُگ آئی تھیں۔ بچپن

بڑھنے کی تیاری کر چکا تھا اور جوانی سامنے باہیں پھیلائے اُس کا استقبال کرنے کو تیار کھڑی تھی۔ انھی دنوں اُس نے اپنے چند تازہ اشعار اپنے اُستاد پنڈت شیوشرن گنگا پوری کی خدمت میں اصلاح کے لیے پیش کیے۔ اُستاد محترم نے اُن اشعار سے متاثر ہو کر اُسے بطور انعام ایک چونّی دی اور اس کے لیے پرارتھنا کرتے ہوئے کہا" بیٹے یقیناً تم شاعر بنو گے" اور جب یہی جملہ معاشرے کی زبان سے نکلا" تم شاعر بنو گے" تو بددعا بن گیا۔ نہ جانے یہ معاشرے کی بددعا کا اثر تھا یا اس چونّی کا جسے وہ آج تک تعویذ کی طرح اپنی زندگی سے باندھے ہوئے تھا کہ وہ حسّاس ہوتا چلا گیا۔ اُس کے حسّاس ہونے سے اُس کی شاعری میں تو پختگی آنے لگی مگر وہ سماج سے اپنے لوگوں سے یہاں تک کہ اپنے گھریلو معاملات سے بھی دُور ہونے لگا۔ اُن کے بیچ فاصلہ بڑھتا گیا اور وہ سلسلہ آگے چل کر دریا کے کناروں کے مانند پھیل گیا۔ ایک طرف دُنیاوی کاروبار اور دوسری طرف وہ بیچ میں پانی کی طرح بہتے صاف ستھرے جذبات۔ وہ اپنے جذبات کے ذریعے اپنے ماحول سے تو جُڑا رہا مگر ذہنی طور پر تنہا ہو گیا۔ تنہائی کے اس غلاف میں اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرنے لگا۔

دُودھ پیتے پیتے بچّہ جب ماں کی چھاتی کو چباتا یا کاٹتا ہے تو ماں چڑ کر ایک جھٹکے کے ساتھ اُسے اپنی چھاتی سے الگ کر کے اس کی پیٹھ پر دو چار تھپڑ رسید کرتی ہے۔ ویسے ہی اس نے ایک یاد کو اپنے سے الگ کیا تو وہ یاد بلبلا اُٹھی۔ اُس نے اُس بلکتی ہوئی یاد کو ممتا بھرے جذبے سے سہلایا کیوں کہ اُسے تیس برسوں سے اپنا خونِ جگر پلا پلا کر پال رہا تھا۔ آج اُسے پہلی بار ایسا محسوس ہوا کہ اس نے تیس برس پہلے ایسا فیصلہ کر کے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ تیس برس پہلے میٹرک پاس کرتے ہی دوسرے جھمیلوں میں پڑنے کے بجائے اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنے ہی گاؤں کے سرکاری اسکول میں مدرّس بننا قبول کر لیا تھا۔ وہ مدرّس تو بنا مگر آجکل کے عام اساتذہ سے ہٹ کر اپنا ایک الگ انداز لیے۔ ایک مقصد کو سامنے رکھ کر والد نے جو زمین تیار کی تھی اُسے اپنے پسینے سے سینچ کر زرخیز بنانے کی دُھن لیے۔ مگر آج تیس برسوں کے بعد اُس کی محنت کا کیا صلہ ملا! کیا ملا؟ یہی نا کہ . . .

" چلیے بھائی صاحب سب ختم ہو گیا" اس کے چھوٹے بھائی نے یہ کہہ کر اسے سوچ کی اتھاہ گہرائی سے باہر نکالا۔ اُس نے آہستہ سے نظریں اُٹھا کر چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا۔ سینے پر بندھے ہاتھوں کو کھولا۔ ایک نظر مٹّی کے نیچے نو ابیدہ اپنے بھائی کے چہرے کے عکس کو مٹّی کے ذروں میں ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پلٹا اور قبرستان سے باہر جاتے ہوئے لوگوں کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

وہ ابھی تو تھا . . . اب نہیں ہے!!

کہاں گیا؟

کیوں گیا؟؟

کیسے گیا؟؟؟

کبھی کسی کی سمجھ میں نہ آنے والی بات۔

ازل سے ابد تک چلنے والا یہ سلسلہ۔ ایک اَن بُوجھا مُعمّہ۔ اولادِ آدم اتنی سمجھدار اور چالاک ہو گئی ہے کہ اس نے تازہ واردوں کی آمد کا راز تو معلوم کر لیا مگر آج تک اپنے لوٹنے کی اندھی گلی کا اتاپتا نہیں ڈھونڈ پائی۔

بادل جیسے ہر پل اپنی شکل وصورت بدلتے ہیں، اُس کی سوچ کی اُمڈتی گھٹائیں لمحہ لمحہ اپنا روپ بدل رہی تھیں۔ "صبح تک تو وہ میرا بھائی تھا اور اب ــــ اب بھی وہ میرا بھائی ہے مگر اب وہ میرا مرحوم بھائی ہے۔ لفظ مرحوم بھائی کے آگے حقیقت کی چٹان بن کر اٹک آیا ہے۔ وہ میرا بھائی جو مجھے نظر آتا تھا۔ چلتا تھا، پھرتا تھا، ہنستا بولتا تھا اور اب ــــ منوں مٹّی کے نیچے خاموش لیٹا ہے۔ سانس کیا رُکی رشتے ٹوٹ گئے۔ ناطے بکھر گئے۔ جان سے بھی پیاری چیز مٹّی کے گوں ہو گئی۔ چند ہی لمحوں میں اتنی تبدیلی!!ــــ منوں مٹّی کے نیچے وہ کیسا محسوس کر رہا ہو گا؟" اتنا سوچتے سوچتے اس کا دم گھٹنے لگا۔ جیسے خود اُسے زندہ دفنا دیا گیا ہو۔ اور وہ مٹّی کے بوجھ تلے ہلنے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔ اُس کے مُنہ سے چیخ نکلنے کو تھی کہ مرحوم بھائی کی بیٹی نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا" اندر چلیے چاچا، سب لوگ چلے گئے۔" اُس نے دیکھا جنازے کو کندھا دینے والے اپنا فرض ادا کر کے لوٹ چکے تھے۔ اور وہ اُداس گلی میں مرحوم بھائی کے در پر سوکھے پیڑ کے مانند کھڑا تھا۔ اُس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دالان میں اڑوس پڑوس اور رشتے کی عورتوں میں گھری اُس کی بیوہ بھابی سر جھکائے گٹھری بنی بیٹھی تھی۔ سب نے خاموشی کو اوڑھ رکھا تھا۔ شاید اسی لیے بیوہ بھابی کی سسکیاں تھک کر ہچکیاں لے رہی تھیں۔

" امّی سے کہنا میں پھر آؤں گا" اتنا کہہ کر وہ چاہتے ہوئے بھی اپنی یتیم بھتیجی کی طرف دیکھنے کی ہمّت نہیں کر سکا۔ وہ مڑ کر چل دیا۔ معصوم دو ویران آنکھیں اس سونی گلی کے موڑ تک اُس کے ہمراہ رہیں اور پھر اُن آنکھوں کی کواڑیں دھیرے سے بند ہوئیں اُن کی چوکھٹ پر آنسو کے دو دیے ٹمٹمانے لگے۔ تب تک وہ موڑ مڑ چکا تھا۔

دسمبر کا مہینہ، جاڑے کا موسم۔ دُھندلکا اوڑھ کر سونے کی تیاری کرتی ہوئی شام۔ ایسے میں وہ اپنے سینے پر ایک لاش کا بوجھ اُٹھائے اپنی گلی میں داخل ہوا تو لگا جیسے اُس لاش کو دفنانے کے لیے اُسے دوگز زمین بھی نصیب نہیں ہوئی ہے اُس لیے وہ مایوس ہو کر اُسے گھر واپس لا رہا ہے۔ کچھ موتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو پوری دُنیا کو ہلا کر رکھ دیتی ہیں۔ اور کچھ ایسی بھی موتیں ہیں جن کے بُلانے کے لیے مرنے والے اور اُن کے اعزّہ کی آنکھیں بار بار دُعا کرتے ہوئے آسمان کی طرف اُٹھتی ہیں اور گڑگڑا کر التجا کرتی ہیں یا اللہ۔ بس کر۔ اب چھٹکارا دلا دے۔ جب ایسی موت آتی ہے تو گھر والے آنسو تو بہاتے ہیں مگر ساتھ ساتھ آہ بھرتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں کہ چلو اچھا ہوا بے چارہ چھوٹ گیا۔ مگر ایک موت ایسی بھی ہوتی ہے جس کے آنے سے دُنیا تو دُنیا کسی پیڑ کا پتّہ تک نہیں ہلتا اور نہ ہی کوئی آنکھ آسمان کو تکتی ہے۔ پھر بھی وہ موت آتی ہے۔ آتی ہے تو مرنے والے کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ کیوں کہ اس موت سے مرنے والے کا جسم نہیں مرتا بلکہ اس کے جذبات مر جاتے ہیں۔ اور ایسے جذبات کی لاش کو دفنانے کے لیے دوگز زمین کسی کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔ اُس کے نصیب میں تو جیسے بندریا اپنے بچّے کو سینے سے چپکائے بھٹکتی ہے ویسے ہی اس لاش کو سینے سے لگائے بھٹکنا ہی ہوتا ہے۔

وہ اپنے جذبات کی لاش کو سینے سے لگائے گھر میں داخل ہوا تو اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ اس نے دھیرے سے اس لاش کو نیچے اُتارا اور سسک سسک کر روتے ہوئے کربلا کا ماتمی منظر پیدا کر دیا۔ اُس کا رونا سُن کر اس کا چھوٹا بیٹا دوسرے کمرے سے ڈرا ہوا باہر آیا۔ اپنے ابّا کو بے حال ہوتے دیکھ کر سہم گیا اور بھاگ کر مرحوم کے گھر آہ وزاری کرنے گئی اپنی امّی کو بُلا لایا۔

بیوی نے آکر اپنے شوہر کا یہ حال دیکھا تو ٹھوڑی پر اُنگلی رکھ کر بولی "ہائے ہائے۔ یہ کیا بچپنا لے کر بیٹھ گئے۔ آپ کے رونے سے مرنے والا تو لوٹ کر آنے سے رہا اور لوٹ کر بھی کیا کرنا ہے اُسے؟ بیماری کی دوزخ میں ہی تو جلنا ہے" اتنا کہہ کر وہ اُس کے چُپ ہونے کا انتظار کرنے لگی مگر وہ اس بات کو سُن کر اور دہاڑیں مار کر رونے لگا۔

"اب بس بھی کرو۔ اس عمر میں آپ کی عقل ماری گئی ہے کیا؟ گاؤں بھر کی عورتیں یہی کہہ رہی ہیں کہ چلو اچھا ہوا، چُھٹ گیا بیچارہ۔ اب قبر میں چین کی نیند سوئے گا۔ اور ایک آپ ہیں کہ بے وقت کا راگ الاپ کر رات کو آفتاب کے نکلنے کا خواب دیکھ رہے ہیں"

بیوی کے اس وعظ کے بعد بھی جب اس کا رونا بند نہیں ہوا تو وہ غصّے سے اندر چلی گئی۔ پھر لوٹ کر اُسے پوچھا تک نہیں۔ اور وہ روتے ہوئے سوچنے لگا۔ یہ میری بیوی جس کے ساتھ میں نے اتنے سال کی زندگی جی ہے وہ بھی کیوں سمجھ نہیں سکتی کہ میں کیوں رو رہا ہوں؟ اسے بھائی کی موت پر آنسو بہانے ہوتے تو وہ دوپہر ساڑھے بارہ بجے ہی رو دیا ہوتا جب وہ اسکول سے آکر کھانا کھا رہا تھا اور اس کی بھتیجی نے آکر بھائی کی وفات کی خبر سنائی تھی۔ تب تو وہ ہاتھ کا نوالہ چھوڑ کر ہاتھ دھوتے ہوئے بچّی سے یہ کہہ کر کہ "تم چلو میں اسکول سے چُھٹی لے کر ابھی آتا ہوں" اسکول کی طرف چل دیا تھا۔ اسکول جاتے ہوئے راستے بھر وہ یہی سوچتا رہا کہ کفن دفن کے خرچ کا انتظام کیسے کیا جائے۔ تین چار سو روپے تو لگ ہی جائیں گے۔ کون ہے جس کے سامنے ہاتھ پھیلایا جائے؟ چلتے چلتے یک بیک اُسے یاد آیا۔ آج سے ٹھیک ایک سال پہلے اسی دن اپنے باپ کو دفنانے کے لیے وہ بند مٹّھی لیے گاؤں میں گھوما تھا۔ یہی سوچ کر کہ مٹّھی کھول کر کس کے سامنے ہاتھ پھیلایا جائے ـــــ پہلے والد پھر بڑے بھائی، اب کے بعد میری باری آئی تو میرے پیچھے ایسا کون بھائی ہے جس کی مٹّھی کھلتے ہی اس کی ہتھیلی پر میری تدفین کا خرچ کوئی رکھ دے گا۔

وہ پسینے سے تر اسکول پہنچا۔ بچّے کھیل کود میں مشغول تھے کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ وہ ہیڈ ماسٹر کے دفتر میں داخل ہوا۔ ہیڈ ماسٹر کسی رجسٹر کو پھیلائے کچھ خانہ پُری کر رہا تھا۔ دفتر کے دروازے سے آتی ہوئی روشنی سے اس کی پرچھائیں ہیڈ ماسٹر کے رجسٹر پر بچھ گئی۔ ہیڈ ماسٹر نے نظر اُٹھا کر اسے دیکھا۔

"آیئے" ہیڈ ماسٹر نے قلم ایک طرف رکھا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"جی، مجھے آدھے دن کی رخصت چاہیے" اس نے کہا۔

ہیڈ ماسٹر نے پُوری بات سُننے سے پہلے ہی بھنویں تان لیں اور حیرت سے سوال کیا۔

"رخصت!"

"ہاں ـــ میرے بھائی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے"

ہیڈ ماسٹر کی بھنوؤں کی کمان کچھ ڈھیلی پڑی اور پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھر آئیں۔ اس نے جسم کو ذرا پھیلا کر کرسی کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

"ہونہہ، بیٹھیے"

ہیڈ ماسٹر اس سے کم عمر اور ناتجربہ کار تھا مگر وہ بی۔ اے۔ کر کے اس طبقے کی نمائندگی کرتا تھا جن کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے ہمارے

ں کی کسی بھی پارٹی کی سرکار کچھ بھی بھلا بُرا کر رنے کو تیار ہو سکتی ہے۔ وہ ناتجربہ کار گریجویٹ ں کی سینئرٹی کو پھلانگ کر ہیڈ ماسٹر کی کرسی پر تھا اس سے بیٹھنے کو کہہ رہا تھا۔ ہیڈ ماسٹر کے ہنے پر وہ بیٹھ تو گیا مگر اس کے پاؤں بھائی کے ر کی طرف جانے کو بے قرار ہو رہے تھے۔ وہ جانتا تھا اگر وہاں پہنچنے میں دیر ہوئی تو گاؤں کی گدھ نما ریں مرحوم بھائی کی لاش کے روبرو ہی اس یوہ کو طرح طرح کے طعنوں کی چونچوں سے نوچنا روع کر دیں گی۔

کچھ دیر کے بعد پیشانی کی سلوٹوں کو سمیٹتے ہوئے ہیڈ ماسٹر نے کہا —— "یہ تو آپ نے بڑی درد ناک خبر سنائی ہے۔"

اس نے سوچا اس کی رخصت منظور ہو رہی ہے۔ اس لیے وہ جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ ہیڈ ماسٹر نے بات کا سلسلہ آگے بڑھایا "مگر مولوی صاحب! یہ دسمبر کا مہینہ ہے اور پھر آپ کے حصے میں آدھے دن کی بھی رخصت باقی نہیں ہے۔" یہ سن کر وہ پھسلتی ریت کی طرح پھر کرسی پر آگرا

"تین چار اساتذہ پہلے ہی چھٹی پر ہیں۔ ابھی آج کے تین پیریڈ باقی ہیں۔ آپ ہی سوچیے میں آپ کو کیسے ریلیو کر سکتا ہوں۔"

"مگر سر! میرا بھائی —— اور ابھی مجھے کچھ رقم کا انتظام بھی کرنا ہے۔" اس نے اپنی غربت کی مٹھی اس ناتجربہ کار لونڈے کے سامنے کھول کر رکھ دی۔

"یہ کام تو اسکول کے بعد بھی ہو سکتا ہے اور پھر آپ تو اس اسکول کے سینئر موسٹ ٹیچر ہیں، سرکاری قاعدے قانون سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔"

اس سے پہلے کہ ہیڈ ماسٹر آگے کچھ کہے اُس نے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہوئے کہا —— "سر میں نے تیس سال کی ملازمت میں کبھی۔"

"دیکھیے، اتنا کہنے کے بعد بھی اگر آپ جانا چاہیں تو میں آپ کو باندھ کر تو رکھ نہیں سکتا مگر خدا نہ کرے کوئی افسر وزٹ کو آ گیا تو اپنی غیر حاضری کے ذمّے دار آپ ہی ہوں گے۔"

اس کے جوڑے ہوئے ہاتھ کس گئے۔ اس کی زبان میں کچھ کہنے کو لرزش ہوئی کہ کھانے کی چھٹی ختم ہونے کی گھنٹی بجی۔ بچے بھاگ کر اپنی اپنی جماعت کے کمروں کی طرف جانے لگے۔ ہیڈ ماسٹر کھڑا ہو گیا۔ اس کے کس کر جوڑے ہوئے ہاتھ ڈھیلے پڑنے لگے۔ اُس نے سر جھکا لیا اور دھیرے سے ہیڈ ماسٹر کو پیٹھ دکھائی اور چھٹی جماعت کے کمرے کی طرف جانے لگا۔

بچوں کو پڑھاتے ہوئے کبھی گھڑی کی طرف نہ دیکھنے والا اُستاد آج بار بار گھڑی کی رینگتی ہوئی سوئی کو دیکھنے لگا۔ بھائی کے گھر سے بلاوے پر بلاوے آنے لگے مگر اُس نے کسی کو بھی ملنے کی اجازت نہیں دی اور درد بھرے دل سے اپنی تیس سالہ محنت کو سہلاتا رہا۔ ان ہنگاموں کے دوران تعلقے سے ٹرانسفر ہو کر آئے نوجوان ٹیچر کو جب ان باتوں کا علم ہوا تو اس نے ہیڈ ماسٹر کو یوں آڑے ہاتھ لیا کہ مجبوراً ہیڈ ماسٹر نے دوسرا پیریڈ ختم ہونے کے بعد اُسے ساتویں جماعت میں جاتے ہوئے روک کر کہا —— "مولوی صاحب آپ جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔" مگر اس وقت اُس کی گھائل غربت نے اپنے جذبات کے قاتل کے سامنے جھک کر اپنے بھائی کو کندھا دینے کے لیے جانا منظور نہیں کیا اور وہ ساتویں جماعت میں چلا گیا۔

ساون بھادوں کے ابر بھی برس برس کر تھک جاتے ہیں۔ یہ تو ایک گھایل انسان کی آنکھیں تھیں، کتنی دیر برستیں۔ اس نے گالوں پر خشک ہوتی ہوئی آنسوؤں کی نمی کو آستین سے پونچھا اور طے کر لیا کہ وہ اب اس اسکول میں نوکری نہیں کرے گا۔ تعلقے کے بس کے اڈّے پر حمالی کرے گا مگر ماسٹری نہیں کرے گا۔ وہ اٹھا اور اپنے ٹیبل پر استعفےٰ لکھنے بیٹھ گیا۔ استعفےٰ لکھنے کے بعد ایک بار بڑھا پھر ٹیبل پر رکھے لفافوں میں سے ایک لفافہ اٹھایا جن لفافوں میں وہ رسالوں کے مدیروں کو اپنی تخلیقات بھیجتا تھا یا دوست احباب کو محبت بھرے خط لکھتا تھا آج انھیں لفافوں میں سے ایک بدنصیب لفافے کو اُٹھا کر اس میں استعفےٰ کا کاغذ ڈالا۔

آنگن میں دروازے پر دستک کی آواز سن کر چھوٹا بیٹا باہر آیا۔ بیٹے کو دیکھ کر اس نے کہا —— "دیکھو تو کون ہے؟"

لڑکے نے جا کر دروازہ کھول کر دیکھا اور واپس آ کر بولا —— "قبر کھودنے والے آئے ہیں کھدائی کی مزدوری مانگ رہے ہیں۔"

اُس نے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر قرض کے بچے ہوئے روپے نکال کر گنے تو اُسے علم ہوا کہ مقرّر مزدوری سے بیس روپے کم ہیں۔ ڈوبتا تنکے کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ اس نے داڑھی کو کھجاتے ہوئے تنکا ڈھونڈنے کی کوشش کی اور بولا —— "ماموں کی دُکان کو چلیں میں ابھی آیا۔" قبر کھودنے والوں کے جانے کے بعد وہ ماموں کی پان کی دُکان کو، جہاں سے وہ مہینے بھر بیڑی اُدھار خریدا کرتا تھا۔ جانے کے لیے گھر سے نکلا۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے دروازہ زور سے دھکیل دیا۔ کواڑ سے کواڑ ٹکرائے۔ دروازے کی کنڈیاں کھنکیں۔ یہ کھنک سن کر اسے یوں لگا جیسے وہ کھنک ہنس کر اُسے طعنہ دے رہی ہو —— "مولوی صاحب! قبر کی کھدائی کی مزدوری ادا کرنے کے لیے آپ کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اور آپ ہیں کہ استعفےٰ دینے چلے ہیں!!"

اسے خیال آیا کہ وہ استعفے کا لفافہ بھی ساتھ لے کر چلا ہے۔ اس نے لفافے کو مضبوطی سے تھاما اور آگے بڑھ گیا۔ دھند اور گہری ہو گئی تھی گلی کے کھمبے پر جلتا ہوا بلب دم توڑتے جگنو کی طرح بجھا بجھا سا لٹک رہا تھا۔ دھند میں ڈوبی گلی سے گذرتے ہوئے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے پہیلیوں سے گھری یہ گلی وہ گلی نہیں ہے جس کی دھول میں کھیل کر اس کی غربت جوانی کے منڈھے چڑھی تھی۔ یہ وہ گلی نہیں ہے جس میں چلتے چلتے اُس کی زندگی آبلہ پا ہو گئی تھی۔ جس کی دھوپ میں اُس کی عمر کے بال سفید ہو گئے تھے۔ یہ گلی گلی نہیں قبر ہے۔ اس کی قبر ہے اور وہ لفافہ ایک مُٹھی مٹّی ہے۔ جسے وہ اپنی لاش پر ڈالنے کے لیے اٹھائے ہوئے ہے۔ مگر ایک مُٹھی مٹّی سے تو لاش دفن نہیں ہو سکتی۔ بظاہر دوسری مٹّی بھری مٹھیاں نظر نہیں آرہی ہیں۔ صرف آوازیں آرہی ہیں جو اس کی لاش کے کانوں سے ٹکرا کر چمگادڑوں کی طرح چیخ کر کہہ رہی ہیں "مولوی صاحب۔ آپ کی قبر کی کھدائی کی رقم کون ادا کرے گا؟"

اس قبر نما گلی میں اس کا دم گھٹنے لگا۔ دم سانس لینے رکا ایک نظر لفافے پر ڈالی لفافہ کھول کر استعفے کا کاغذ نکالا اور اسے پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اُن ٹکڑوں کو کئی مٹّی بھری مٹھیاں سمجھ کر اپنے جذبات کی لاش پر ڈال دیا اور کسی اپاہج کیڑے کی طرح رینگتا ہوا اس دُھند میں کھو گیا۔

بچوں کی ماسک پتریکا "نندن" (ہندی)
مارہ جولائی ۸۶ء میں ایک لطیفہ میری نظر
زرا تھا۔ وہ یہ ہے: ——
ایک میجر نے حولدار کو بُلا کر کہا۔
"دیکھو! بیرک میں جا کر اعلان
کر دو کہ آج بہت ضروری
میٹنگ ہے۔ چوں کہ آج سورج
گرہن ہے، اس لیے اگر پانی گرا
تو میٹنگ ہال میں ہوگی ورنہ باہر
میدان میں۔"
حولدار نے بیرک میں پہنچ کر اعلان کیا۔

۳۔ غلط رپورٹنگ
۴۔ رپورٹ کی بے جرح قبولیت
۵۔ افواہوں کو تقویت
۶۔ ذہنی اور فکری انحطاط
۷۔ معاشرے کا خسران

میجر نے اعلان کا جو حکم دیا، اس میں سورج گرہن کے ذکر کی قطعی ضرورت نہ تھی۔ صرف بارش کا ذکر کافی تھا، کیوں کہ بارش پر ہی میٹنگ کے میدان میں ہونے یا نہ ہونے کا انحصار تھا۔ سورج گرہن کا ذکر کر کے غلط فہمی کی بنیاد فراہم کر دی گئی۔ بظاہر یہ حشو نہیں

تحقیق میں اطلاع کی بڑی اہمیت ہے۔ لیکن محض اطلاعات کافی نہیں ہوتیں۔ اطلاع کا اسلوب ناموزوں رہا، جو بات کہنی تھی اس کی ادائیگی کے لیے مناسب الفاظ کا انتخاب نہیں ہوا، مافی الضمیر کی پوری وضاحت نہیں ہوئی۔ کئی باتیں پیش کرنی تھیں تو ہر بات ایک خاص ترتیب سے سامنے نہیں آئی یا حقیقت میں افسانویت پیدا ہوگئی تو لازماً غلط فہمی ہوگی۔ ایسی صورت میں ایک اطلاع کثیر المفاہیم ہو جاتی ہے اور اصل واقعہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ تحقیق ایسی اطلاعات کا تجزیہ کرتی ہے۔ اسے

محمد منصور عالم
ریڈر، شعبۂ اُردو، ایچ۔ ڈی۔ جین کالج، آرہ (بھوجپور)

اطلاع کی تحقیق اور ہمارا معاشرہ

—— "میجر صاحب
کے حکم سے آج سورج گرہن ہوگا۔
بارش ہوئی تو ہال میں ہوگا،
نہیں تو باہر میدان میں ہوگا۔"
مجھے اُمید ہے کہ بیرک والوں نے یقین کر لیا ہو۔

اس لطیفے سے نہایت تشویش ناک اثرات کی طرف اشارے ہوتے ہیں ——

غلط اطلاع یا اعلان
غلط تفہیم

معلوم ہوتا۔ ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ سورج گرہن میں میٹنگ اگر ہال میں ہوگی تو اندھیرا رہے گا۔ اس لیے میدان میں میٹنگ ہونی چاہیے۔ لیکن اگر پانی گرا تو میدان میں کیسے ہو سکے گی۔ اسی لیے سورج گرہن کا ذکر کیا گیا۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کسی پیش خیمہ کے بغیر آسمان سے یک بیک پانی نہیں گرتا۔ حقیقتاً میٹنگ کا سورج گرہن سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سراسر موسم پر منحصر ہے، لہٰذا سورج گرہن کی جگہ پر ابر و باد کا ذکر ہونا تھا۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ تحقیق اطلاعات کی صداقت کی پیمائش کرتی ہے۔ اگر ہم تحقیق سے کام نہ لیں تو معاشرے میں مختلف قسم کی خبریں ضرور موجود ہوں گی مگر کوئی تحقیقی بات سامنے نہ ہوگی۔ لازماً ہر طرف خیال آرائیوں کا ایک دُھندلا ماحول ہوگا۔

حولدار اگر فہیم ہوتا تو سورج گرہن پر ہرگز توجہ نہ دیتا، وہ میجر کے حکم کی روح کو ٹھیک سے سمجھ کر بیرک میں اعلان کرتا۔ لیکن اس نے حکم کو اچھی طرح سمجھا نہیں اور بیرک میں جا کر اعلان

کر دیا۔ اس نے نہیں سمجھا تھا تو مکرر پوچھنے کی ہمّت بھی نہیں کی۔ یہ صورت حال دراصل اس کی دوں ہمتی، کند ذہنی، عجلت پسندی اور مرعوبیت کی مظہر ہے۔ یہ معائب ہمیں معاشرے میں ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ علم کی روشنی پھیلنے کے باوجود آج کا انسان حولدار سے کچھ زیادہ بہتر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تحقیق و تنقید سے عام الرجی ہے۔ اگر ہم دوسروں سے مرعوب رہیں گے، طرز و فکر سے خود کام نہ لیں گے، تحقیق و تنقید کی ضرورت و اہمیت کو بذاتِ خود نہ سمجھیں گے تو ہماری کند ذہنی، عجلت پسندی، کم نظری کبھی ختم نہ ہوگی۔

ادب میں شعر و افسانہ ہی سب کچھ نہیں، مگر ہم نے اسی کو سب کچھ سمجھ لیا ہے اور تحقیق کی قطعیت اور تنقید کی کھری وضاحت کی افادیت پر کبھی توجہ نہیں دی۔ شعر و افسانہ کی حقیقت کیا ہے بقول اقبال :

حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکے روبرو

شاعری کی دُھن اور افسانہ کی فسوں سازی سے ہمارے معاشرے کا عام مزاج مبہم و موہوم ہوگیا ہے، ہمارا معاشرہ کسی موضوع پر تحقیق کا زیادہ اہل نہیں اور نہ اسے حالات کے سنجیدہ تنقیدی تجزیے کا واضح شعور ہے۔ جو حضرات محقق کے اوصاف رکھتے ہیں اور جن کا تنقیدی شعور بالیدہ اور تہہ رس ہے، جن کی فطرت میں جلد بازی نہیں، جو کسی سے مرعوب نہیں ہیں، جن کا ادراک تیز اور تخیل بلند پرواز ہے، جو اپنے خیالات کو واضح لفظوں میں ظاہر کرتے ہیں، انھیں زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی اور دلیل یہ دی جاتی ہے کہ وہ تخلیقی فنکار نہیں۔ ہر تحریر لفظوں سے عالم وجود میں آتی ہے۔ اور لفظ ہی تحریر میں تخلیقیت پیدا کرتے ہیں۔ نقاد اور محقق بھی لفظ ہی استعمال کرتا ہے اس لیے تخلیق کا جادو وہ بھی جگا سکتا ہے اور جگاتا ہے۔ لیکن پُر اسرار فضا بندی اس کی تحریر کا مقصد نہیں۔ کیوں کہ وہ بالطبع سنجیدہ متوازن قطعیت پسند اور واضح بیان ہوتا ہے۔ اگر عالم اور جاہل یکساں نہیں ہوسکتے اور علما کو جہال پر فوقیت حاصل ہے تو غور تو کیجیے اُردو میں شعرا کی تعداد کتنی زیادہ رہی ہے اور کتنے شعرا صحیح معنی میں صاحبِ علم رہے ہیں۔ مگر ہر تک بند اور فسانہ طراز اپنے تئیں تخلیقی فنکار ہونے پر نازاں ہے۔ حالانکہ علمیت اور تنقیدی شعور کو کبھی اس نے اعلیٰ فنکاری کی شرط نہیں سمجھا۔ محقق و نقاد علم کی بصارت اور شعور کی بصیرت دونوں رکھتا ہے۔ لیکن اسے کیا کیجیے کہ معاشرے میں تحقیق و تنقید کو اس کا صحیح مقام حاصل نہیں ہے۔ تو یہ کس کا نقصان ہے؟ جیسا کہ میں نے پہلے کہا شعور و آگہی، سنجیدگی، قطعیت، حق بینی اور حق بیانی صرف محقق و نقاد کے مزاج کی خاصیتیں ہیں چونکہ ہمارے معاشرے کو ان کی افادیت و اہمیت کا احساس نہیں، اس لیے ان کے خاطر خواہ نتائج معاشرے میں کم سے کم نظر آتے ہیں۔ ان کے فقدان کے سبب ہی ہمارا معاشرہ عقل و دانش میں زوال روز افزوں کا شکار ہے۔

حولدار نے حکم کو غلط طور پر سمجھا، اس لیے رپورٹنگ بھی غلط ہوئی۔ اور رپورٹنگ عام طور پر غلط ہی ہوتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ رپورٹنگ میں رپورٹر اپنے الفاظ شامل کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ لفظ ہی مفہوم پیدا کرتے ہیں۔ اگر الفاظ کے استعمال میں ہوشیاری نہیں برتی گئی تو اصل واقعے کا رُوپ بدل سکتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ رپورٹر کے لفظوں میں شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کی افتادِ طبع شریک ہوتی ہے، چونکہ حولدار میجر کا وفادار ہے اور اس کی وفاداری پر مرعوبیت حاوی ہے۔ اس لیے نفسیاتی طور پر وہ ہر جگہ میجر کا حکم چلتا دیکھتا ہے۔ ورنہ وہ یہ نہ کہتا کہ میجر صاحب کے حکم سے آج سورج گرہن ہوگا۔ ایک نفسیاتی اثر کی وجہ سے بات کچھ سے کچھ ہوگئی۔ اور میٹنگ کی جگہ سورج گرہن نے لے لی۔ کہہ سکتے ہیں کہ حولدار کسی نفسیاتی مرض میں گرفتار ہے۔ اگر وہ صحیح الدماغ ہوتا، صحیح الدماغ سے میری مراد یہ ہے کہ وہ تحقیقی ذہن رکھتا تو ایسا غلط اعلان ہرگز نہ کرتا۔ اس کے اعلان میں وہی الفاظ ادا ہوتے جو میجر نے استعمال کیے تھے۔ تحقیق میں بالواسطہ رپورٹنگ کی اہمیت کم سے کم تر ہے۔ بلاواسطہ رپورٹنگ البتّہ قابلِ توجہ ہوتی ہے۔ اس میں بھی راوی کی سیرت، شخصیت اور روایت کو درایت کی چھلنی سے چھان کر دیکھ لینے کے بعد ہی قبول کرنے کی منزل آتی ہے۔ مگر عام طور پر لوگوں کو اتنی زحمت گوارا نہیں ہوتی۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ مبالغہ آرائی انسانی فطرت میں داخل ہے۔ کسی واقعہ کو ہم جب تک مبالغہ کے ساتھ بیان نہ کریں۔ ہمیں تشفی نہیں ہوتی۔ ہمارا یہ مزاج ایسا راسخ اور ہمہ گیر ہوگیا ہے کہ اپنی تسکین کے لیے ہم مبالغہ آرائی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اسی کیفیت کی وجہ سے کوئی واقعہ اپنی اصلی شکل میں ہمارے ذہن میں محفوظ نہیں رہتا۔ اس نے ردِّ عمل کے طور پر ہمارے اجتماعی اور قومی حافظے کو نقصان پہنچایا ہے۔ اور ہمارا حافظہ کمزور ہو تو ہم حال کی آرائش میں ماضی سے کیا مدد لے سکتے ہیں۔ یہ تو اُسی وقت ممکن ہے جب ہمارا مزاج تحقیقی ہو جائے اور ہم اپنے حافظے سے مدد لینا سیکھ لیں۔

مذکورہ بالا لطیفے پر راقم السطور کا تبصرہ یہ ہے : —

"اور مجھے امید ہے کہ بیرک والوں

نے یقین کر لیا ہوگا۔"

آپ اس جملے پر تعجب نہ کریں۔ اس طرح کے مغالطہ آمیز اعلانات آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ غلط اطلاعیں بھی ملتی رہتی ہیں اور یقین کرنے والوں کی کمی نہیں ہوتی۔ عام نفسیات یہ ہے کہ کسی کو کچھ معلوم ہوا تو وہ جلد سے جلد دوسروں کو گوش گذار کر دینا چاہتا ہے اور دوسرے ہیں کہ بے جرح قبول بھی کر لیتے ہیں۔ ان کا اندیشہ انھیں شوخیِ افکار پر مجبور نہیں کرتا۔ نہ راوی سوچتا ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور نہ سامع ہی کچھ سوچتا ہے کہ وہ کیا سُن رہا ہے۔ تقریباً بلا چون و چرا ہر اطلاع قبول کر لی جاتی ہے۔ لازماً اطلاع کو افواہ کا رُوپ مل جاتا ہے اور پورا معاشرہ اس کی زد میں ہوتا ہے۔ مگر ہم یہ کبھی غور نہیں کرتے کہ افواہوں کا انسانی فکر و اعمال پر کیا اثر پڑتا ہے اور اس کا مؤثر تدارک کیا ہے۔ میں کہنا چاہتا ہوں کہ ہم جب تک تحقیق کو غیر ضروری شغل سمجھتے رہیں گے، افواہوں کے بُرے اثرات کا اندازہ ہمیں نہیں ہوگا۔ افواہوں کا مؤثر تدارک تحقیق سے ہی ممکن ہے۔

تحقیق کے فقدان یا عدم استعمال سے افواہیں تیزی سے پھیلتی ہیں۔ یہ صرف پھیل کر رہ جائیں تو زیادہ حرج نہ تھا مگر یہ تو پورے معاشرے کو بدگمانیوں کی لو سے جھلسا دیتی ہیں۔ ایسی صورت میں کیا عوام کیا خواص، سب ذہنی اور فکری لحاظ سے انحطاط پذیر ہو جاتے ہیں، اور اگر عین وقت پر کچھ ایسے واقعات رونما ہو جائیں جن کا اصل واقعے سے حقیقتاً کوئی تعلق نہیں مگر چند تشابہات کی بنا پر بدگمانیوں کو تقویت ملتی ہو تو اور بھی موجب خرابی ہے۔ انفرادی اور اجتماعی تعلّقات اس صورتِ حال سے کافی بُری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ اور اس میں پڑھا لکھا طبقہ کچھ کم رول ادا نہیں کرتا ہے۔ پڑھے لکھے لوگ اپنی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے واقعات کی کڑیاں پرونے میں تو مہارت رکھتے ہیں مگر معروضی طور پر سنجیدگی سے حالات کا تجزیہ شاذ و نادر ہی کرتے ہیں حالانکہ ان سے نسبتاً بہتر تجزیہ کی توقع رہتی ہے مگر وہ ضرورت سے زیادہ حسّاس ہو کر تخلیقی اور تخیلی رو میں بہہ جاتے ہیں۔ حالات کا سنجیدہ معروضی تجزیہ اور حقیقت رسی کی پرخلوص کوشش اسی وقت ممکن ہے جب ہمارا مزاج تحقیقی ہو۔ جو حضرات یہ صفت رکھتے ہیں وہی بیجا تخیّل اور تخلیقِ خیال کی کارستانیوں سے معاشرے کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

جب کوئی غلط اطلاع افواہ بن کر عوام و خواص دونوں کو فکر کی ایک ہی راہ پر ڈال دے تو یہ معاشرے کا سب سے بڑا خسران ہے۔ قسم ہے زمانے کی یہ انسان خسارے میں ہے، بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے اور حق پر رہے اور صبر کے ساتھ رہے ـــــ یہ قرآن کریم کی ایک سورہ والعصر کا ترجمہ ہے۔ اس میں خسرانِ دائمی سے بچنے کے چار نکتے بیان کیے گئے ہیں:

۱۔ ایمان ۲۔ نیک اعمال ۳۔ حق ۴۔ صبر

موخرالذکر دو کا تعلّق واضح طور پر تحقیق سے ہے۔ تحقیقی مزاج رکھنے والے حضرات ہی حق اور صبر کے ساتھ قائم رہ سکتے ہیں۔ اگر ہمارے اندر یہ چاروں صفات ہوں تو دنیا اور آخرت دونوں جگہوں کی فلاح یقینی ہے۔ فرض کیجیے کسی میں ایمان نہیں، صرف تین خوبیاں ہیں تو آخرت میں اس کا جو حشر ہو، ہمارے معاشرے کی انفرادی اور اجتماعی فلاح میں تو وہ معاون ہو ہی سکتا ہے اور ہمیں پہلے فکر ہے تو اسی معاشرے کی کیوں کہ یہی آخرت کی کھیتی ہے۔

مذکورہ بالا لطیفہ تجزیہ اور حوالہ کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے۔ لیکن میرا روئے سخن کسی خاص طبقے، گروہ یا قبیلے کی طرف نہیں۔ دوست احباب ہوں یا اہلِ خاندان، استاد و طالب علم ہوں یا بایع و مشتری، ڈاکٹر اور مریض ہوں یا وکیل و موکّل، سیاست داں اور عوام ہوں یا حکومت اور اس کے عملے اس لطیفے کے آئینے میں جو صورتِ حال منعکس کی گئی ہے وہ ہر جگہ نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں گھر اور باہر ہر جگہ شکوک و شبہات اور غلط فہمیوں کی نہایت تکلیف دہ فضا قائم ہے۔ لیکن اس کا واقعی احساس کم سے کم لوگوں کو ہے اور اسے دور کرنے کی فکر تو تقریباً ناپید ہے۔ معاشرے کے بیشتر افراد ایک دوسرے کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور کسی نہ کسی معاملے میں ان کے نکتہ چیں اور شاکی نظر آتے ہیں۔ کیا ہماری شکایتیں دور نہیں ہو سکتیں؟ کیوں نہیں! صحیح صورتِ حال سامنے آجائے اور مناسب و موزوں الفاظ میں قطعیت و وضاحت کے ساتھ آئے تو شکوک رفع ہو جائیں گے، شکایتیں ختم ہو جائیں گی اور مبہم و مہمل صورتِ حال قائم نہ رہ سکے گی مگر اس کا واحد مدار تحقیقی افتادِ طبع ہے۔ ابرِ ابہام و اشتباہ بادِ تحقیق سے ہی چھٹ سکتا ہے۔

○

ضامن علی خاں ضامن

شاہی ہے اور فطرتِ شاہانہ اور ہے
رندی ہے اور جرأتِ رندانہ اور ہے

ہم جانتے ہیں رشک و حسد میں ہے فرق کیا
بے داد اور جذبِ رقیبانہ اور ہے

پہلی نظر میں حُسن کو پہچانتے ہیں ہم
ہاں بوالہوس کی چشمِ حریصانہ اور ہے

کرتا نہیں کسی بھی جگہ مستقل قیام
کچھ دن تمھارے شہر میں دیوانہ اور ہے

اے شیخ تیری بات پہ ہو کیسے اعتبار
جو کچھ سُنا ہے ہم نے وہ افسانہ اور ہے

ضامن، عروجِ آدمِ خاکی کا علم ہے
عرفان کیف ذات کا پیمانہ اور ہے

ضامن کبھی یہ سوچا ہے تم نے کہ کس لیے
اب کے فضائے کوچۂ جانانہ اور ہے

۱۰۴/۱۴۸-ای، قمر منزل، ذاکر نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

مخمور جمالی سنبھلی

ستم پر یہ ستم اچھا نہیں ہے
ابھی اک حادثہ بھولا نہیں ہے

حوادث در پہ دستک دے رہے ہیں
مگر کوئی مکیں جاگا نہیں ہے

اُڑانوں میں مگن ہیں جو پرندے
اُنھیں موسم کا اندازہ نہیں ہے

اُفق پر جس کو نظریں ڈھونڈتی تھیں
وہ سُورج آج بھی اُبھرا نہیں ہے

اُدھر مخمور صاحب چل پڑے ہیں
جدھر کوئی قدم اُٹھا نہیں ہے

مرکز ادب، عیدگاہ، نہٹور، بجنور۔

نثار نیپالی

تم کیا جانو کیسے کاٹی تنہا رات فقیروں نے
خوابوں کے اس کھیل میں آخر کھائی مات فقیروں نے

جنگل جنگل صحرا صحرا شہر کی ویراں گلیوں میں
غم کی کالی چادر اوڑھے دیکھی رات فقیروں نے

دیکھ نہ پائے خود اپنے ہاتھوں کی لکیروں کا لکھا
یوں تو ساری عُمر گزاری پڑھتے ہات فقیروں نے

اہلِ جہاں نے قدر نہ جانی درد کے سچے موتی کی
شعر کی صُورت بانٹ دی آخر یہ سوغات فقیروں نے

رمتا جوگی بہتا دریا دونوں ہی ہرجائی ہیں ـــــ
رفتہ رفتہ دُنیا بھر کا چھوڑا ساتھ فقیروں نے

لٹل اینگلز ہوم، ریلوے اسٹیشن روڈ، بانرہاٹ، جلپائی گوڑی

نیوکلیائی کثافت

محمد اسلم پرویز
ذاکر حسین کالج، دہلی

اٹیمی یا نیوکلیائی توانائی کے بارے میں
ـ عام تصوّر یہ پایا جاتا تھا کہ محض بم کی شکل اختیار
لینے کے بعد ہی یہ تباہ کن ہوتی ہے ورنہ پُرامن مقاصد
واسطے اس کا استعمال بالکل بے ضرر ہے۔ ۷۰ء کے
ائل تک لوگ اِس خوش فہمی میں مبتلا رہے لیکن
ج صورتِ حال مختلف ہے۔ اٹیمی بجلی گھر جو کہ پُرامن
ی توانائی کے علامتی نشان سمجھے جاتے تھے اُن میں
، بعد دیگرے ہونے والے حادثات نے تصویر کا دوسرا
خ دکھا دیا ہے۔ یہ بھیانک رُخ اپنی پوری تباہیوں
، ساتھ گذشتہ کچھ حادثوں میں ہی ظاہر ہوا ہے۔
ریکہ، برطانیہ اور دیگر کئی مغربی ممالک میں لگاتار
ی ایسے حادثات ہوئے جنھوں نے اٹیمی بھٹّیوں کا بھرم
ول دیا۔ رہی سہی کسر گذشتہ سال روس میں ہونے
ے چرنوبل حادثے نے پوری کر دی۔ اِس حادثے
نتیجے میں اگرچہ موقعے پر صرف ۳۱ لوگ ہلاک ہوئے
ے لیکن اِس اٹیمی بھٹّی میں لگنے والی آگ نے فضا میں
نیوکلیائی کثافت پھیلائی ہے اُس سے یہ خطرہ
ق ہے کہ ہزاروں افراد رفتہ رفتہ اور دُور دراز کے
قوں میں موت کا شکار ہوں گے۔

نیوکلیائی کثافت تمام جانداروں کے لیے
مضر ہے۔ چاہے وہ پیڑ پودے ہوں یا کیڑے مکوڑے،
چرند پرند ہوں یا انسان، سبھی متاثر ہوتے ہیں۔ یہ
کثافت محض کسی حادثے کی وجہ سے ہی ظاہر نہیں ہوتی۔
اگر ایسا ہوتا تو بھی صبر تھا کہ چلو کسی حادثے کے بعد
ہی فضا میں نیوکلیائی کثافت کا ڈر ہوگا لیکن حقیقت
تو یہ ہے کہ وہ بنیادی عمل جس کے نتیجے میں اٹیمی توانائی
پیدا ہوتی ہے وہی اس خطرناک کثافت کو پیدا کرتا ہے۔
جس طرح ایندھن کے جلنے سے دھواں پیدا ہوتا ہے
بالکل اُسی طرح اٹیمی ایندھن کے جلنے کے بعد جو فضلہ
بنتا ہے وہ نیوکلیائی کثافت کا سب سے خطرناک ذخیرہ
ہوتا ہے۔ نیوکلیائی کثافت پیدا کیسے ہوتی ہے۔ یہ جاننے
کے لیے اِس عمل کے متعلّق کچھ بنیادی باتوں سے واقفیت
ضروری ہے۔ ایٹم کے مرکز میں واقع نیوکلیس کو جب
دو حصّوں میں توڑا جاتا ہے تو اِس عمل کے نتیجے میں
کافی توانائی حاصل ہوتی ہے جو روشنی یا حدّت
کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ نیوکلیس کو توڑنے کے لیے
اُس پر کچھ ننھّے ذرّات کی بارش کی جاتی ہے جن کو نیوٹرون
کہتے ہیں۔ نیوٹرون بھی ایٹم کا ہی ایک حصّہ ہوتے
ہیں اور عام حالات میں نیوکلیس کے اندر ہی پائے
جاتے ہیں۔ ان کی ٹکّر سے جب نیوکلیس ٹوٹتا ہے تو اس
میں مقیّد اور نیوٹرون تیزی سے باہر نکلتے ہیں اور
دوسرے کسی نیوکلیس پر حملہ کر کے اُسے توڑتے ہیں۔ یہ
عمل بہت تیزی کے ساتھ ہوتا ہے اور اگر اِس کو
کنٹرول نہ کیا جائے تو ان کے نتیجے میں جو بے پناہ
توانائی، حدّت اور روشنی کی شکل میں نکلتی ہے وہ تباہ کن
ثابت ہو سکتی ہے۔ وہی تباہی جو ایک ایٹم بم پھیلا
سکتا ہے۔ ایٹم بم میں ایک محدود جگہ میں یہی عمل کیا
جاتا ہے جس کی وجہ سے لامحدود توانائی نکل کر تباہی
پھیلاتی ہے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کا ماضی اِس تباہی
کا چشم دید گواہ ہے۔ نیوٹرون کے ذریعے نیوکلیس کو توڑنے
کے اِس عمل کو ۱۹۳۸ء میں جرمنی کے دو سائنسدانوں
اوٹوہان اور فرِز اسٹراسمان نے دریافت کیا تھا۔
اس عمل سے وابستہ ایک اور خاص بات یہ ہے کہ نہ
صرف اِس عمل کے دوران کچھ خاص قسم کی اٹیمی شعاعیں
نکلتی ہیں بلکہ اس کے مکمّل ہونے کے بعد بھی جو مادّہ بچارہ
جاتا ہے جس کو اس عمل کا فضلہ کہہ سکتے ہیں، اُس
میں سے بھی یہ شعاعیں نکلتی رہتی ہیں۔ اور ان کا
اخراج دس بیس سال نہیں بلکہ اوسطاً ۳۰۰ سال
سے ایک ہزار سال تک ہوتا رہتا ہے۔ یہ ایک اہم
بنیاد ہے جو نیوکلیائی کثافت کو دیگر اقسام کی کثافتوں
سے الگ کرتی ہے۔ نیوکلیائی کثافت کی سب سے اہم
وجہ یہی اٹیمی یا نیوکلیائی شعاعیں ہیں اور ان کی
تباہ کاری اِس بات میں پوشیدہ ہے کہ ان کے

اخراج کی عمر بہت لمبی ہوتی ہے دوسرے یہ کہ ان کے اثرات دیرپا اور نسل در نسل چلتے ہیں۔

عموماً کثافت کسی بھی جاندار کو وقتی طور سے متاثر کرتی ہے۔ اگر یہ اثر دیرپا بھی ہو، جیسا کہ عموماً کثافت کی وجہ سے پیدا ہونے والی بیماریوں میں دیکھا جاتا ہے، تو بھی اس سے محض وہی جاندار اور اُس کی زندگی کا تھوڑا سا حصہ متاثر ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے نیوکلیائی کثافت کا شکار اگر بالفرض زندہ رہ جاتا ہے تو وہ عموماً کسی نہ کسی اعتبار سے اپاہج کی زندگی گزارتا ہے یا کینسر کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں، اُس کی اگلی نسلیں بھی متاثر ہوتی ہیں کیوں کہ یا تو وہ جاندار افزائش نسل کے قابل ہی نہیں رہے گا یا پھر اُس سے نسل آگے چلی تو ۸۰ فی صد امکان یہ ہوتا ہے کہ اس کی اولاد میں پیدائشی اپاہج، ناقص، کم عقل یا مردہ ہوں گی۔ اس بات کا بیّن ثبوت اب بھی ہیروشیما اور ناگاساکی کے اُن متاثرہ خاندانوں میں ملتا ہے جو ایٹم بم کا شکار ہوئے تھے۔ اُن کی نسلیں آج بھی تھوڑی بہت مسخ ہیں۔ یہی خطرہ اس وقت چرنوبل حادثے سے متاثرہ لوگوں کو لاحق ہے۔ ان شعاعوں میں ایسا کیا ہے کہ یہ آنے والی نسلوں تک کو متاثر کر دیتی ہیں؟ اس کا سب سے آسان اور عام فہم جواب یہ ہے کہ یہ شعاعیں جاندار کے بنیادی ڈھانچے میں تبدیلی پیدا کر دیتی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر جاندار کا جسم خلیوں سے بنا ہے جن کے اندر کروموزوم نامی عضلات ہوتے ہیں۔ ہر جاندار میں ان کروموزوموں کی تعداد اور ساخت یکساں ہوتی ہے جو کہ نسل بہ نسل محفوظ رہتی ہے۔ انھی کروموزوموں میں ہر جاندار کی شکل و ساخت اور حرکات کی تفصیل چھپی رہتی ہے۔ مثلاً انسان کے جسم کے ہر خلیے میں ۴۶ کروموزوم ہوتے ہیں۔ جب ماں باپ کے خلیے مل کر ایک نیا خلیہ بناتے ہیں تو اس سے بننے والا بچہ دونوں کی مشترکہ خصوصیات لے کر پیدا ہوتا ہے کیوں کہ دونوں طرف کے کروموزوم مل کر اس کی تشکیل کرتے ہیں۔ ایٹمی یا نیوکلیائی شعاعیں ان کروموزوموں میں ہی تبدیلی لاتی ہیں یا اُن کے متاثرہ حصّوں کو یکسر تباہ کر دیتی ہیں۔ چونکہ کروموزوم ایک نسل سے دوسری نسل تک سفر کرتے ہیں اس لیے ان میں آئی ہوئی خرابی بھی کئی نسلوں تک چلتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیوکلیائی کثافت کو سب سے تباہ کن کثافت تسلیم کیا گیا ہے۔ ستمبر ۱۹۸۶ء میں ویانا میں بین الاقوامی ایٹمی توانائی ایجنسی کی میٹنگ میں حکومت روس نے ۳۸۸ صفحات پر مشتمل ایک رپورٹ چرنوبل حادثے کے متعلق پیش کی تھی۔ اس رپورٹ کے مطابق چرنوبل حادثے کی وجہ سے پیدا شدہ نیوکلیائی کثافت کے باعث کم از کم ساڑھے چھ ہزار افراد کینسر کا شکار ہوں گے۔ یہ اثرات آج سے پانچ سال بعد سے لے کر آئندہ ستّر سال تک موجود رہیں گے۔ اور یہ تو شعاعوں کے سیدھے اثرات ہیں۔ ان شعاعوں سے متاثرہ پانی یا خوراک کھانے والوں پر جو اثرات ہوں گے وہ الگ ہیں۔ چرنوبل حادثے نے یہ بات مزید واضح کر دی ہے کہ نیوکلیائی کثافت صحیح معنوں میں ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے کیوں کہ باوجود اس کے کہ یہ حادثہ روس میں ہوا تھا اس کے اثرات دُنیا کے دور دراز کے ممالک میں مل رہے ہیں جہاں فصلیں، پھل، پانی اور دودھ وغیرہ ان شعاعوں سے متاثر پایا گیا ہے۔ خود روس میں ہی ۱۰۰۰ مربع میل کے علاقے میں زمین کی اُوپری مٹّی کو اس خوف سے ہٹا دیا گیا ہے کہ یہ شعاعوں سے کثیف ہو چکی ہوگی۔ اگرچہ یہ بات تعجب خیز لگتی ہے لیکن بہرحال حقیقت ہے کہ اس حادثے کے باعث پیدا شدہ کثافت نے بین الاقوامی تجارت کو بھی بڑی حد تک متاثر کیا ہے۔ بیلجیم، جرمنی، ہالینڈ، ڈنمارک اور آئرلینڈ سے آئے دودھ کو، فرانس کے پنیر کو، برطانیہ اور سوئزرلینڈ کے چاکلیٹوں کو اور اٹلی کے گیہوں کو مقررہ حد سے زیادہ کثافت سے متاثر پایا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ ناقابلِ استعمال اور صحت کے لیے خطرناک قرار دے دیے گئے ہیں۔

شروع میں جب ایٹمی بھٹّیاں بنائی گئی تھیں تو اُن میں پیدا شدہ فضلے کو جمع رکھنے کی گنجائش رکھی گئی تھی لیکن یہ جگہ صرف اتنی تھی کہ حد سے حد تک تین یا پانچ سال کے دوران جمع شدہ فضلے کو ہی محفوظ کیا جا سکتا تھا۔ چونکہ اس فضلے سے بھی تباہ کن شعاعیں نکلتی ہیں اس لیے اس کے آس پاس بھی کسی انسان کا جانا موت کو دعوت دینا ہے۔ میکینکل طریقوں سے اس فضلے کو کنکریٹ کے بہت موٹے اور ٹھوس ڈبوں میں بند کیا جاتا ہے جن کو بھی اسٹیل کے بڑے بڑے بکسوں میں بند کر کے پانی کے نیچے یا زمین کے اندر رکھا جاتا ہے تاکہ مہلک شعاعیں ان سے باہر نہ آ سکیں۔ ان شعاعوں کو چیک کرنے کے لیے باقاعدہ آلات ہیں جن پر لگی ہوئی سوئی کسی میٹر کی طرح فضا میں ان شعاعوں کی مقدار بتاتی رہتی ہے۔ ایٹمی توانائی سے متعلق اداروں میں جگہ جگہ اور مختلف لوگوں کے پاس ایسے آلات ہوتے ہیں۔ کچھ آلات کو خودکار الارم سے جوڑ کر بھی رکھا جاتا ہے۔ جیسے ہی فضا میں شعاعوں کی مقدار حد سے تجاوز کرتی ہے یہ الارم خود بج اُٹھتے ہیں۔ اب تک طریقہ کار یہ تھا کہ ایٹمی بھٹّی کا استعمال شدہ ایندھن چار پانچ سال بعد وہاں سے اُٹھا کر یا تو زمین میں گہرائی پر دفن کر دیا جاتا تھا یا کسی ریگستان کے قلب میں دبا دیا جاتا تھا یا پھر سمندر کی گہرائیوں میں ڈال دیا جاتا تھا لیکن کچھ عرصے بعد ہی سائنسدانوں نے محسوس کیا کہ اس سے رسنے والی شعاعیں قدرتی ذخائر کو متاثر کر کے زہریلا بنا سکتی ہیں۔ اس لیے اس میں احتیاط برتنے کی ضرورت پیش آئی۔ دوسرے عوام میں، خاص طور سے مغربی ممالک کے لوگوں میں جب اس مہلک کثافت کی جانکاری بڑھی تو اُنھوں نے مزاحمت کرنی شروع کی کہ ہمارے ملک کے سمندر یا زمین میں یہ

طرناک زہر دفن نہیں ہوگا۔ یہ صورت حال دیکھتے ہوئے
قی یافتہ مغربی ممالک نے کچھ معاشی طور پر کمزور ممالک
بھاری قیمت دے کر اس بات پر راضی کر لیا کہ اُن
مالک کے ویرانوں میں یا سمندروں میں یہ تباہ کن
لین ظاہری طور سے بے ضرر مادّے دبا دیے جائیں۔
لین ان کی تباہی کی داستانیں ان ممالک تک بھی
سلہ ہی پہنچ گئیں عوام میں احتجاج کی لہر دوڑ گئی
ر یہ راستہ بھی بند ہوگیا۔ فی الوقت صورتِ حال یہ
ہے کہ ہر ملک کے سامنے چاہے وہ امریکہ ہو یا روس،
برازیل ہو یا ہندوستان یہ مسئلہ ہے کہ اِس
خطرناک ایندھن کا کیا کیا جائے تاکہ اس کی ہلاکت
خیزی کثافت کی شکل میں نہ پھیلے۔ ابھی تک تو اس کو
محض جمع ہی کیا جا رہا ہے اور روز بہ روز اس کے
ذخیروں میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ بین الاقوامی ایٹمی
توانائی ایجنسی (I A E A) کے تخمینے کے مطابق ۲۰۰۰ء
تک دُنیا میں ۲۰ لاکھ میٹرک ٹن استعمال شدہ ایٹمی
ایندھن ہوگا۔ اِس ممکنہ خطرے یا کثافت سے بچنے کا
کوئی طریقہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ نیوکلیائی
توانائی کا استعمال ہی بند کر دیا جائے۔ لیکن توانائی
کی بین الاقوامی صورت حال کو دیکھتے ہوئے یہ ناممکن سا
لگتا ہے کہ کوئی ملک نیوکلیائی توانائی کا راستہ
ترک کر دے گا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ کچھ ممالک، جن
میں ہندوستان بھی شامل ہے، نیوکلیائی توانائی
کا استعمال ترک کرکے یا کم کرکے بھی اپنی ضروریات
پوری کر سکتے ہیں بشرطیکہ توانائی کے دیگر ذرائع پر
بھی اتنی ہی توجہ اور وسائل صرف کیے جائیں جتنے
کہ نیوکلیائی توانائی پر کیے گیے ہیں۔

○

اُردو سرٹیفکیٹ کورس کے امتحانات

اُردو اکادمی، دہلی نے دہلی کے مختلف علاقوں میں، ایسے لوگوں کو جو تعلیم یافتہ ہیں لیکن اُردو نہیں جانتے اردو سکھانے کے سینٹر کھول رکھے ہیں جہاں ایک سالہ اردو سرٹیفکیٹ کورس پڑھایا جاتا ہے۔ ان سینٹروں میں ہر سال اُردو سیکھنے کے خواہش مند بہت سے افراد داخلہ لیتے ہیں۔ سال پورا ہونے پر ان کا امتحان لیا جاتا ہے اور کامیاب ہونے والوں کو سرٹیفکیٹ کے علاوہ ایک اسٹیڈ، ہر سینٹر میں، پہلی، دوسری اور تیسری پوزیشن لانے والوں کو بالترتیب پانچ سو روپے، چار سو روپے اور تین سو روپے کے نقد انعامات بھی دیے جاتے ہیں۔ اب تک ایسے پانچ سینٹر کام کر رہے ہیں۔ پانچوں سینٹروں کے طلبہ میں جو طالب علم سب سے زیادہ نمبر حاصل کرتا ہے، اسے پانچ سو روپے مزید بطور انعام دیے جاتے ہیں۔ طلبہ سے پڑھائی کی کوئی فیس نہیں لی جاتی اور جن طلبہ کی حاضری ۷۵ فی صد رہے انھیں پچاس روپے مہینہ کنوینس الاؤنس بھی دیا جاتا ہے۔

اس سال اکادمی کے دفتر میں واقع سینٹر سے ۲۳، اور اُردو گھر، ذاکر حسین کالج، قدوائی نگر، پنجابی باغ کے سینٹروں سے بالترتیب ۱۶، ۱۴، ۱۲، ۱۲ طلبہ امتحان میں شریک ہوئے۔ ستمبر کے اواخر تک نتائج آجانے کی امید ہے۔

اُردو اُستادوں اور اُستانیوں کا تقرر

اُردو اکادمی، دہلی ہر تعلیمی سال میں دہلی کے اُردو میڈیم اسکولوں، نیز ان اسکولوں میں جہاں اُردو بطور ایک مضمون کے یا تیسری زبان کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے، لیکن اُردو ٹیچر موجود نہیں ہوتے، ضرورت کے مطابق اپنی طرف سے ٹیچروں کا تقرر کرتی ہے۔ گزشتہ سال اکادمی نے اُردو بطور زبان اور اُردو کے ذریعے مختلف مضامین پڑھانے والے ایسے اسّی اُستادوں اور اُستانیوں کا تقرر کیا تھا۔ ۸۸-۱۹۸۷ء کے تعلیمی سال کے لیے ۹۰ تقررات کیے گئے ہیں۔ اس سال اس اصول پر سختی سے عملدرآمد کیا گیا کہ لڑکوں کے اسکولوں کے لیے مرد ٹیچر اور لڑکیوں کے اسکولوں کے لیے لیڈی ٹیچر ہی رکھی جائیں۔ ان استادوں اور استانیوں کی مدّتِ کار ایک سال ہوگی۔ اگلے سال نئے تقررات عمل میں لائے جائیں گے۔

پاکستانی مہمان اکادمی کے دفتر میں

پاکستانی ادیب، فیض احمد فیضؔ کے قریبی دوست اور ان کے سوانح نگار ڈاکٹر ایوب مرزا پچھلے دنوں دہلی آئے ہوئے تھے۔ ۲۰، اگست کی شام کو اکادمی کی طرف سے انھیں استقبالیہ دیا گیا، استقبالیہ تقریب کی صدارت پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی۔ اکادمی کے سیکریٹری سید شریف الحسن نقوی نے ڈاکٹر ایوب مرزا اور تقریب میں شریک دوسرے معزز مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور اکادمی کی مختلف سرگرمیوں پر اختصار کے ساتھ مگر جامع انداز میں روشنی ڈالی۔ پروفیسر قمر رئیس نے نقوی صاحب کی گزارش پر ڈاکٹر ایوب مرزا کے بارے میں تعارفی تقریر کی، انھوں نے مرزا صاحب کی کتاب "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" کا خصوصیت سے ذکر کیا اور کہا کہ اس میں اکثر باتیں خود فیضؔ صاحب کے بیانات پر مبنی ہیں اس لیے اسے فیضؔ کی مستند سوانح عمری

اردو خبرنامہ

دائیں سے: پروفیسر قمر رئیس، ڈاکٹر ایوب مرزا (تقریر کرتے ہوئے) اور پروفیسر گوپی چند نارنگ۔

کہا جا سکتا ہے۔ خود ڈاکٹر ایوب مرزا نے بھی شرکا کو خطاب کیا۔ انھوں نے "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" کے علاوہ اپنے ناول "دامِ موج" کا بھی تعارف کرایا اور اس کے کچھ حصّے بھی پڑھ کر سنائے۔ یہ ایک سوانحی انداز کا ناول ہے جو ایک پُرانے انقلابی کی زندگی کے گرد گھومتا ہے اور ہندوستان کی تقسیم سے پہلے اور بعد کے زمانے کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی فضا کا احاطہ کرتا ہے۔ آخر میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ایوب مرزا صاحب کی شخصیت اور ان کی دونوں کتابوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ ایوب مرزا صاحب عمرِ بزرگی کو پہنچ کر ادب کے ایوان میں داخل ہوتے ہیں لیکن ان کی تحریریں پڑھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ادب سے ان کا تعلق خاطر پُرانا ہے اور لکھنے پڑھنے کے کام سے وہ فطری مناسبت رکھتے ہیں۔

اس سے قبل ایوب مرزا صاحب نے اکادمی کے دفتر کے مختلف شعبوں کو دیکھا اور اکادمی کے عملے کے ساتھ چائے پی۔

مشاعرہ جشنِ آزادی

ہر سال کی طرح اس سال بھی اکادمی نے یومِ آزادی کی تقریبات کے سلسلے میں ایک کل ہند مشاعرے کا اہتمام کیا۔ یہ مشاعرہ ۲۲ اگست کی شام کو تالکٹورہ انڈور اسٹیڈیم نئی دہلی میں ہوا۔ مشاعرے کا افتتاح دہلی کے لیفٹننٹ گورنر اور اکادمی کے چیئرمین جناب ایچ۔ ایل۔ کپور نے کیا۔

مسندِ صدارت کو ایگزیکیٹو کونسلر (تعلیمات) اور اکادمی کے وائس چیئرمین جناب کلانند بھارتیہ

جناب کیفی اعظمی کلام سناتے ہوئے

اسٹیج کا ایک منظر، دائیں سے : جناب حسرت جے پوری، جناب جگن ناتھ آزاد، جناب عالم فتحپوری، جناب کلانند بھارتیہ، جناب ایچ۔ ایل۔ کپور، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور بیگم ممتاز مرزا۔

نے رونق بخشی۔ دلّی اور بیرونی دلّی کے ۲۲ ممتاز شعرا نے اپنے کلام سے ہزاروں سامعین کو محظوظ کیا۔

اُردو رسم الخط کا تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ استاد شعبۂ لسانیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے پٹنہ میں "اُردو رسم الخط کا تجزیاتی مطالعہ" کے موضوع پر اپنا لکچر پیش کرتے ہوئے کہا کہ اُردو کے ۱۹ اساسی حروف اور ۱۸ بنیادی ترکیبی شکلیں سیکھنے کے بعد اُردو رسم الخط کا سیکھنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔

انھوں نے اُردو رسم الخط کا تجزیہ کرتے ہوئے پورے اُردو رسم الخط کو تین اجزا میں تقسیم کیا اور ہر ایک پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ انھوں نے اُردو حروف تہجی کی کل تعداد ۳۶ بتائی۔ انھوں نے مفرد حروف ترکیبوں اور اعراب و علامات پر مفصل روشنی ڈالی اور اُردو کے ۳۶ حروف کو ۱۹ گروپوں میں تقسیم کر کے اُردو کے ۱۹ بنیادی یا اساسی حروف متعیّن کیے۔ ڈاکٹر بیگ نے اپنے لکچر کی تفہیم و تشریح کے لیے چارٹ اور بلیک بورڈ سے بھی مدد لی۔ اور حروف کی تقسیم ان کی صوری خصوصیات کے لحاظ سے کر کے ان کی شناخت کو آسان کر دیا۔

تحریری علامات کا ذکر کرتے ہوئے تحریری تمام علامتوں کو انھوں نے مصوتی مصمتی، تمنائی اور اضافی علامتوں میں تقسیم کیا۔ اس طرح تمام علامتوں کی تعداد انھوں نے ۱۸ بتائی۔

اُردو رسم الخط کی خصوصیات میں ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ بعض حروف دوسرے حروف کے ساتھ ملتے ہی اپنی شکل بدل دیتے ہیں یہ بدلی ہوئی شکلیں سخت الجھن میں مبتلا کر دیتی ہیں ڈاکٹر بیگ نے اس طرح کی تمام الجھنوں کو دُور کرنے کی کوشش کی اور اُردو رسم خط کا تجزیہ کر کے اُردو آموزی کو اس قدر آسان بنا کر پیش کیا کہ ایک ہفتے میں اُردو لکھنا پڑھنا سیکھا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر بیگ نے تکلمی زبان کی صوری یا تحریری نمائندگی کرنے والی علامات کے نظام کو رسم الخط قرار دیا۔ زبان اور رسم خط کے باہمی رشتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ تحریر زبان نہیں بلکہ

ن کی نمائندگی کرنے والی چیز ہے۔ اصل زبان تو
ی یا تقریری زبان ہے جو مجموعہ ہے مختلف
ازوں کا۔

ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ نے اپنی تقریر میں
دو کی ہیئتی اور ساختی تشکیل کا ایک بالکل نیا نظریہ
ن کیا اور کہا کہ اُردو کے تمام مفرد صرف کھڑی،
ی، ترچھی لکیروں اور دائرے اور نیم دائرے اور
من نیز ان کے امتزاج سے تشکیل پاتے ہیں۔ ان اقلیدسی
کلوں کو انھوں نے پروٹو شکلوں کا نام دیا۔ اُردو
م الخط کے اس تجزیاتی مطالعے سے اُردو داں سامعین
ے علاوہ غیر اُردو داں طلبا بھی کافی محظوظ ہوئے۔

(خبر نامہ بہار اُردو اکادمی)

اُردو جنوبی ہندوستان میں

بنگلور میں جنوبی ہندوستان اُردو اکادمی
کرناٹک شاخ کے صدر مسٹر ابراہیم خلیل اللہ نے
اکادمی کے سمینار سیشن میں صدارتی خطبہ دیتے ہوئے
کہا کہ اُردو زبان کے فروغ اور بقا کے لیے ضروری ہے
کہ اُردو اکادمی ایک لائحہ عمل اور وقت کا پابند ایک
پروگرام مرتب کرے اس کے بعد حکومت سے یقین دہانی
حاصل کی جاسکتی ہے۔ اُردو مدارس کے کنڑ مدارس
میں تبدیل ہونے کے واقعات پر گہرے دُکھ کا اظہار
کرتے ہوئے مسٹر ابراہیم خلیل اللہ نے کہا کہ ایسی
صورتِ حال اُردو کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔
انھوں نے اُردو اثاثے کے تحفظ پر زور دیا اور کہا کہ پرانی
ڈگر کو چھوڑ کر جدید تعلیمی اسلوب کو اپنایا جائے۔ روزنامہ
"سالار" کے چیف اسسٹنٹ ایڈیٹر ضیا میر نے ہندی
رسم خط کے غلبے کو اُردو کے لیے انتہائی خطرناک قرار دیا
اور کہا کہ رومن اور دیوناگری رسم الخط کی آندھی اُردو
کو اڑا لے جائے گی۔ لہٰذا اس سلسلے میں فوری اقدامات
ناگزیر ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں دینیات ناگری
میں پڑھائی جارہی ہے۔ ملّی اداروں کا یہ حال اُردو کے
تاریک مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے۔ دیہی علاقوں میں
اُردو مدارس سے غفلت تباہ کن انجام سے دوچار
کردے گی۔ ہندوستان میں ہر لسانی فرقہ اپنے علیٰحدہ
تشخص کی جدوجہد کرتا ہے۔ ہم کو بھی اسی طرح اپنی
زبان کی بقا کے لیے محنت کرنا ہے۔

سید وفا الدین مدیرِ اعلیٰ "رہنمائے دکن"
حیدرآباد نے کہا کہ اردو، جسے مسلمانوں کی زبان سمجھا
جانے لگا ہے، مسلمانوں کی نہیں بلکہ تمام باشندگانِ
ہند کی زبان رہی ہے لیکن اب سمٹ کر صرف مسلمانوں
تک محدود ہوگئی۔ تاہم آج بھی غیر مسلموں میں اس
کی مقبولیت قائم ہے۔

جنوبی ہندوستان اُردو اکادمی کی تامل ناڈو
شاخ کے جنرل سیکریٹری مسٹر عطاء الرحمٰن نے کہا کہ تامل ناڈو
میں دو لسانی فارمولا اُردو کے لیے مضرت رساں ہے۔
دستوری ضمانت کے باوجود اُردو کی زبوں حالی اس
امر کی متقاضی ہے کہ موجودہ صورتِ حال کو بدلنے کے لیے
آئینی حدود میں پُرامن طریق کار کو اپناتے ہوئے نئی
سمتوں کا تعیّن کیا جائے۔

صدر شعبۂ اُردو فاروق کالج کالی کٹ سید قدرت اللہ
حسینی نے کہا کہ کیرالا جیسے بنجر علاقے میں دو ہزار سے زائد طلبہ
ادیب فاضل کا امتحان پاس کرچکے ہیں جو اس بات کا
ثبوت ہے کہ اُردو کے لیے کام کیا جاسکتا ہے۔

اکادمی کے گوا یونٹ کے صدر مسٹر اشرف آغا ایڈوکیٹ
نے بتایا کہ گوا میں اُردو کے محاذ پر کامیابی کے لیے انھیں ریاستی
گورنر جناب گوپال سنگھ کا تعاون حاصل ہے۔

(آزاد ہند، کلکتہ)

نئی تعلیمی پالیسی اور اُردو

گلبرگہ میں جناب راز امتیاز، ایگزیکٹو ایڈیٹر
روزنامہ "سالار" نے اس امر پر اظہار تاسف کیا کہ اُردو
داں طبقہ اور خصوصاً دانشور اور عالم اُردو زبان کو
معاشی اور سماجی افادیت کا حامل بنانے پر توجہ نہیں
دے رہے ہیں۔ جناب راز امتیاز کرناٹک راجیہ ٹیچرس
ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام منعقدہ نئی تعلیمی پالیسی
اور اُردو کے تعلیمی مسائل پر ایک سمینار کا افتتاح کر رہے
تھے۔ انھوں نے اُردو کی بقا اور اسی کام کے لیے نچلی سطح
سے اقدامات کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔

جناب محمد عبدالعظیم (صدر انجمن ترقی اُردو گلبرگہ)
نے اپنے کلیدی خطبے میں نئی پالیسی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا
کہ آزادی کے بعد سے جتنی تعلیمی پالیسیاں بنی ہیں ان پر
مخلصانہ عملدرآمد نہیں کیا گیا اور لسانی جنون، علاقائی
عصبیت اور فرقہ پرستی نے تعلیمی ترقی کو متاثر کیا۔
انھوں نے نئی تعلیمی پالیسی میں اقلیتوں اور پسماندہ افراد
کی فلاح کے لیے فراہم کردہ سہولتوں سے بھرپور استفادے
کی ضرورت پر زور دیا۔

مسٹر عبدالعلیم الامین (جنرل سیکریٹری کراٹا بنگلور)
نے اپنی تقریر میں کرناٹک میں علیٰحدہ اُردو ڈائرکٹوریٹ
کے عاجلانہ قیام کے اپنے مطالبے کا اعادہ کیا اور اُردو
اساتذہ اور اُردو داں طبقے سے اپیل کی کہ وہ اس
مطالبے کو منوانے میں کراٹا سے تعاون کریں۔

(سالار، بنگلور)

کلام پاک کا منظوم اُردو ترجمہ

سیماب اکبرآبادی کے بعد کیف بھوپالی اُردو
کے دوسرے شاعر ہیں جنھیں مکمل قرآن کریم کا منظوم ترجمہ
کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ ۲۷ پاروں کے
منظوم ترجمے شائع ہوچکے ہیں اور آخری تین پارے وِلا
اکیڈمی حیدرآباد سے جلد ہی شائع ہونے والے ہیں۔
انھوں نے سب سے پہلے پارۂ عم کا منظوم ترجمہ کیا تھا۔

کیف بھوپالی کا پورا نام خواجہ ادریس احمد ہے۔ ۱۹۲۰ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے لیکن پرورش بھوپال میں ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۵۸ء میں وہ شدید بیمار ہوگئے اور ان پر غشی کے دورے پڑنے لگے۔ ایسا لگا کہ زندگی کی ڈور اب ٹوٹنے ہی والی ہے گھر والوں نے ایسی صورت میں قرآن شریف ان کے سینے پر رکھ دیا۔ اللہ کا کرم ہوا اور وہ اس کی عنایتوں سے بالکل ٹھیک ہوگئے۔ اس کے بعد انھوں نے قرآن شریف ترجمے کے ساتھ پڑھا اس مطالعے کے بعد انھیں خواہش ہوئی کہ وہ قرآن پاک کا منظوم ترجمہ کریں چنانچہ انھوں نے سب سے پہلے سورۂ فاتحہ کا منظوم ترجمہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں بہت گناہ گار ہوں اور میں نے بہت گناہ کیے ہیں۔ یہ کہتے کہتے ان کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ رو پڑے۔ پھر انھوں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ رحمٰن و رحیم ہے لیکن پھر بھی یہ اس کی مرضی پر ہے کہ جس کو چاہے بخشے اور جس کو چاہے سزا دے۔ ہوسکتا ہے کہ میرا یہ کام (قرآن شریف کا منظوم ترجمہ) اس کی بارگاہ میں قبول ہو۔

(حرفِ آخر، دہلی)

دیوانِ حافظ کا نادر نسخہ دریافت

حافظ کی غزلوں کا ایک بہت قدیم مجموعہ خدا بخش لائبریری میں دریافت ہوا ہے۔ یہ دُنیا میں حافظ کا دوسرا قدیم ترین نسخہ ہے جو کسی بادشاہ کے لیے، اس کے سفر میں ساتھی بننے کے لیے لکھا گیا ہے۔ کتابت بے حد باریک ہے، ایسی کہ پچاس سے اُوپر کا کوئی پڑھنے والا اسے محدب شیشے کے بغیر نہیں پڑھ سکتا۔ حروفِ علت کے بعد دال کو ذال سے لکھنے کی روش اور بعض دوسری قدیم املائی خصوصیات جو فارسی مخطوطات کی قدامت کی تعیین میں مدد دیتی ہیں، اس میں موجود ہیں یعنی اگر اس میں تاریخ نہ بھی ہوتی تو بھی اسے ایک قدیم نسخہ یقیناً قرار دیا جاتا، لیکن خوش بختی سے اس میں دو جگہ تاریخ بھی موجود ہے جس سے معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ ذیقعدہ/ذی الحجہ ۸۱۴ھ میں لکھا گیا۔ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر خدا بخش لائبریری نے اس کو ہو بہو عکسی ایڈیشن میں شائع کر دیا ہے۔

یاد رہے کہ اس سے قبل کا قدیم ترین متن اس سے صرف دو سال قبل کا لکھا ہوا اب تک ہمارے سامنے آیا ہے اور وہ ہے نسخہ خانلری، جو مشہور اسکالر پرویز ناتل خانلری نے برٹش میوزیم کے نسخے کو اساس بنا کر شائع کیا ہے، جو ۸۱۳ھ میں لکھا گیا۔

خدا بخش لائبریری میں دیوانِ حافظ کا ایک اور نسخہ قبل ازیں دریافت ہوچکا ہے۔ یہ وہ نسخہ ہے جس سے مغل بادشاہ فال نکالا کرتے تھے اور جس کا ذکر دارا شکوہ نے اپنی تصنیف میں کیا تھا کہ "ایسا ایسا نسخہ ہمارے شاہی کتاب خانے میں محفوظ ہے"۔ خدا بخش لائبریری کی طرف سے اس شاہی نسخے کی عکسی طباعت بھی ہوچکی ہے۔ چند ماہ میں منظرِ عام پر آجائے گا۔ اس پر ہمایوں اور جہانگیر کے ہاتھ کی تحریریں ہیں۔ یہ تحریریں متعدد صفحوں پر ملتی ہیں۔

(مراسلہ: خدا بخش لائبریری، پٹنہ)

جاں نثار اختر کی یاد

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے زیرِ اہتمام ۱۲، اگست ۸۷ء کو جاں نثار اختر کی گیارھویں برسی کے موقع پر ایک نشست شاعر اور ناقد باقر مہدی کی صدارت میں منعقد ہوئی ۔ فضیل جعفری نے جاں نثار اختر کی شاعری پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ آخری دنوں میں اختر صاحب کی شدید خواہش تھی کہ ان کے والدِ محترم مضطر خیر آبادی کا دیوان شائع ہوجائے، لہٰذا میری تجویز ہے کہ اُن کی خواہش کے احترام میں وہ دیوان اکادمی کے تعاون سے شائع کیا جائے، دوسرے اکادمی کے رسالے 'امکان' کا ایک خصوصی شمارہ جاں نثار اختر کی یاد میں شائع کیا جائے، تاکہ ان کی یادیں خطوط اور دیگر ادبی اہمیت کی حامل چیزیں محفوظ ہوجائیں۔ ڈاکٹر ظ انصاری نے اختر صاحب کی یادیں اور واقعات پیش کیے، انھوں نے کہا کہ جاں نثار اختر کی نسل کے بیشتر شعرا پر اختر شیرانی اور جوش ملیح آبادی کا اثر حاوی رہا ہے، جاں نثار کی شاعری پر بھی اختر شیرانی کا اثر تھا، بنیادی طور پر وہ غنائی شاعر تھے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد ان میں غیر محسوس تبدیلی آنی شروع ہوگئی تھی، ۱۹۷۰ء کے بعد نمایاں تبدیلی نظر آتی، حالانکہ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ بیانیہ ہے، مگر غنائیت اور تاثر نے ان کی غزلوں کو منفرد درجہ دے دیا ہے ۔ ان کی رُباعیاں جوش اور فراق کی رباعیوں سے مختلف ہیں جنھوں نے اُردو شاعری کا ایک بہت بڑا خلا بھرا ہے، صدرِ جلسہ باقر مہدی نے کہا کہ ۱۸، دسمبر ۱۹۵۴ء کو جب میں بمبئی آیا تو پہلی بار جاں نثار سے ملا تھا، اور پھر ایک عرصہ تک ہم لوگ ساتھ رہے، وہ اس شہر کے آدمی نہیں تھے اُن کا مزاج قصباتی تھا۔ روایت، وضعداری اور خلوص کے آدمی تھے اپنے عقیدے اور یقین کی وجہ سے انھیں بہت سی اذیتوں اور مصیبتوں کو جھیلنا پڑا۔ ان کے ساتھیوں نے انھیں نظر انداز کرنے کی پوری کوشش کی ہے، ان کا ایک شعر بیانیہ ہونے کے باوجود مجھے بے حد پسند ہے:

کوئی آسودہ نہیں اہلِ سیاست کے سوا
یہ صدی دشمنِ اربابِ ہنر لگتی ہے

انھوں نے کہا کہ ہماری نظمیہ شاعری بہت مختصر ہے اور اس مختصر ذخیرے میں 'ستاروں کو سلام'، 'امن'، 'خاموش آواز' جیسی نظمیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

(مراسلہ: مہاراشٹر اسٹیٹ اُردو اکادمی، بمبئی)

آپ کی رائے

"ایوانِ اُردو دہلی" کے چار شمارے ملے۔ تہہ دل سے مشکور ہوں۔ رسالہ ہر طرح سے اطمینان بخش اور دیدہ زیب ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کا سلسلۂ مضامین 'دِلّی کے آثارِ قدیمہ' بہت مفید اور معلوماتی ہے۔ رشید حسن خاں کا مضمون 'اُردو میں کتبے' بھی بہت معلوماتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ میں اس موضوع پر کچھ جانتا تھا۔ ان کے مضمون سے اُردو کے اور بہت سے کتبوں کے بارے میں معلومات ہوئی۔

— گیان چند جین، حیدرآباد

میرے ایک دوست نے ہزاری باغ (بہار) سے "ایوانِ اُردو دہلی" بطور تحفہ بھجوایا ہے۔ واقعی بڑا قیمتی تحفہ ہے یہ میرے لیے۔ میری جانب سے ایسا معیاری رسالہ نکالنے پر دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

— صبا اکرام، کراچی

"ایوانِ اُردو دہلی" ہر لحاظ سے منفرد اور متنوع ہے اس لیے کہ اس میں صرف غزلیں، نظمیں افسانے ہی نہیں ہوتے، تاریخ و تہذیب اور زندگی کی دوسری دلچسپیوں کے مرقعے بھی ہوتے ہیں۔ مگر یہ دعا کس خدا سے مانگوں کہ اس کی عمر نہ

صرف لمبی ہو، مثالی بھی ہو۔

اب شمارہ نمبر ۴ کے سلسلے میں ایک بات۔ حسین الحق صاحب کی کہانی 'کہرا'، بمبئی سے نکلنے والے "قلم" کے مشترکہ شمارہ نمبر ۶، ۷، ۸ میں "واسترتا" کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے اگر آپ نے وہیں سے ڈائجسٹ کی ہے تو پھر عنوان بدلنے کی ضرورت تھی اور نہ کہیں کہیں سے بعض جملوں کو حذف کر کے کہانی کو ذرا سا چھوٹا کر دینا ضروری تھا۔ کیوں کہ حسین الحق کی کہانیوں میں ہر جملہ اور ہر لفظ کہانی کی ضرورت ہوتا ہے حسین الحق کا شوقِ بیان نہیں۔ اور اگر حسین الحق نے یہ شائع شدہ کہانی عنوان بدل کر اور کچھ جملوں کو چھٹی دے کر آپ کو بھیجی تو اس کی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ اچھے لوگوں کی اچھی تخلیقات کو پڑھنے والوں کے سامنے بار بار مختلف صورتوں میں آنا چاہیے۔[1]

— پرکاش فکری، رانچی

[1] افسانہ ہمیں براہِ راست حسین الحق صاحب نے غیر مطبوعہ ظاہر کر کے بھجوایا تھا، عنوان ہم نے تبدیل کیا تھا — ادارہ

"ایوانِ اُردو دہلی" نظر نواز ہوا۔ چشمِ بد دور، کیا کتابت، کیا طباعت اور کیا مضامین، ہر چیز اپنی جگہ خوب ہے۔

"حرفِ آغاز" (اگست ۸۷ء) سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ دہلی کی اُردو تنظیم کی تجاویز خوب ہیں، لیکن کیا ان پر عمل بھی کیا جا سکتا ہے؟ خطوں پر اُردو میں پتے میں لکھ تو دوں، لیکن وہ خط منزلِ مقصود تک پہنچیں گے بھی؟[1] گھروں پر نام کی تختی اور دکانوں پر سائن بورڈ صرف اُردو میں لگائے جا سکتے ہیں لیکن کتنے لوگ انھیں پڑھ پائیں گے؟ نیم پلیٹ اور سائن بورڈ لگانے کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔[2] ہاں، اپنے بچوں کو اُردو کی تعلیم ضرور دلوانی ہے، لیکن کیسے؟ بچوں کو عام تعلیم دلوانا ہی اکثر والدین کے لیے جوئے شیر لانے کے برابر ہو گیا ہے۔ اپنے طور پر وہ ایسا کوئی انتظام کیسے کر پائیں گے؟ اور ہر آدمی میں پڑھانے کی صلاحیت ہوتی بھی نہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اُردو کی تعلیم کے لیے محلّے محلّے فری کلاسیں شروع کی جائیں؟ چلیے "فری" نہ سہی، کم سے کم فیس پر تو ایسا کیا ہی جا سکتا ہے۔ اور پڑھانے کی صلاحیت رکھنے والے اشخاص اپنے مصروف اوقات میں سے تھوڑا سا وقت نکال کر اس کام کو دے دیں؟ اگر کوشش کی جائے تو ایسا ہو جانا کوئی بڑی بات تو ہے نہیں۔

— بلقیس ظفیر الحسن، نئی دہلی

[1] تاخیر سے سہی پہنچیں گے ضرور — ادارہ

[2] اُردو کے ساتھ دوسری زبان بھی لکھی جا سکتی ہے۔ اوّلیت اُردو کو

قارئین کی دلچسپی کے لیے آپ نے متنوع انداز کی چیزیں جمع کی ہیں، مگر ان سب میں معیار کو ملحوظ رکھا ہے۔ دہلی کے آثارِ قدیمہ پر ڈاکٹر خلیق انجم کی تحریر تاریخی دلچسپی کی حامل ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اُردو افسانے میں بیانیہ اور کردار کی بحث اُٹھائی ہے اور واقعہ نگاری کی ضرورت کا احساس دلایا ہے۔ ڈاکٹر عبدالمغنی ایک عرصے سے اُردو میں باماجرا افسانہ نگاری کی صدا لگا رہے ہیں، خوشی ہے کہ اب اس کے مثبت نتائج بھی سامنے آرہے ہیں۔ اسی شمارے میں م۔م۔ راجندر کا افسانہ "شیش محل" باماجرا اور بیانیہ کی خوب صورت مثال ہے، بدلتے زمانے کے باوجود انسانی روایات اور سماجی قدریں نہیں بدلتیں، یہ وہ اٹل حقائق ہیں جن کے سہارے انسان زندگی بسر کرتا ہے۔ حسین الحق کا افسانہ "کہرا" علامتی طرزِ تحریر کے باوجود اپنے اندر ایک ماجرا رکھتا ہے، گرچہ یہاں بیانیہ اور کردار کی کشمکش بڑی شدید ہے اور اسی لیے یہ تخلیق کامیابی اور ناکامی کے درمیان فضا میں جھولتی محسوس ہوتی ہے۔ اور ہاں خطوط کے کالم میں رسالے کے مشمولات پر تنقید و تبصرہ اور مختلف ادبی مسائل پر مباحث ضرور شائع کیجیے تاکہ رسالہ میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کی شمولیت ہو سکے۔ آخر میں اتنا خوبصورت بامعنی اور معیاری ادبی مواد پیش کرنے پر مبارک باد قبول فرمائیے۔

—— شاہ رشاد عثمانی، جمشید پور

میری کتاب "نئی غزل نئی آوازیں" پر اطہر فاروقی کے تبصرے میں حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی کوشش نظر آتی ہے۔

موصوف نے لکھا ہے کہ کتاب میں بے شمار تضادات ہیں۔ اس سلسلے میں دو اقتباس بھی پیش کیے ہیں مگر سمجھے بغیر، میں نے لکھا تھا "ترقی پسند تحریک کے پیش رو غزل گو" آپ سمجھتے ہیں "ترقی پسند غزل گو" میں ترقی پسند نظریۂ شاعری سے اختلاف کرتا ہوں اور آپ کی فہم و فراست کا یہ عالم ہے کہ اُسے اتفاق پر محمول فرماتے ہیں۔ اصلاح کے شوق میں انھوں نے DIMENSION کو کتاب میں DE سے لکھا ہوا بتایا ہے جو بالکل غلط ہے۔ کتاب دوبارہ دیکھیں۔

موصوف لکھتے ہیں "نئی غزل سے متعلق چند نئے معروف اور معتبر نام برسبیلِ تذکرہ بھی کتاب میں کہیں نظر نہیں آئے"۔ کیا عرفان صدیقی، فرحت احساس، صابر ظفر، جمال احسانی، شہپر رسول، عشرت ظفر، سلیم کوثر، اطہر عنایتی، عبداللہ کمال، ثروت حسین، آشفتہ چنگیزی وغیرہ میر کلو کے زمانے کے شاعر ہیں؟

یہ مانا تم نہ سمجھو گے مگر سمجھائے جاتے ہیں

—— اسعد بدایونی، علی گڑھ

"ایوانِ اُردو دہلی" عقیدت و محبت کی نظروں سے دیکھا، احباب کو دکھایا، اپنی ادبی، علمی اور ثقافتی حیثیت سے خاصے کی چیز معلوم ہوا، دل خوش ہوگیا، بہت دنوں کے بعد علمی، تاریخی اور ثقافتی مضامین سے بھرپور ماہنامہ مطالعے میں آیا، دہلی اُردو اکادمی جو ادبی و تعمیری خدمات انجام دے رہی ہے "ایوانِ اُردو" ان میں ایک اضافۂ بہار کے مترادف ہے۔

—— سید منظور الحسن برکاتی، ٹونک

"ایوانِ اُردو دہلی" کے سب شمارے ملے۔ رسالہ سنجیدہ بھی ہے اور معیاری بھی۔ اُمید ہے اسی سج دھج سے نکلتا رہے گا۔

—— اعزاز افضل، کلکتہ

طویل مُدّت سے ایک ایسے ادبی جریدے کی کمی محسوس ہو رہی تھی جس کی اشاعت باقاعدگی سے ہوتی ہو۔ لہٰذا ہم جیسے شاعروں کو اپنی تخلیقات برائے اشاعت پاکستان ارسال کرنا پڑتی تھیں۔ یہ اَمر باعثِ مسرت ہے کہ آپ لوگوں کی کوششوں سے ایک ایسا جریدہ منظرِ عام پر آیا، جو علمی، ادبی حیثیت لیے باقاعد بروقت اشاعت پذیر ہو رہا ہے۔

—— کرشن ادیب، ل

جہاں تک میں نے محسوس کیا "ایوانِ دہلی" کی خصوصیت یہ نہیں ہے کہ یہ ایک نیا ماہنامہ ہے بلکہ اس کی اصل خوبی یہ ہے کہ اُردو ادبی رسالوں کے درمیان میں یہ نیا ادبی رسالہ سے کسی قدر مختلف اور بہت جامع ہے۔ مضا تنوّع اور افادیت ہے۔ جس چیز نے بہت زیاد کیا وہ ہے "اُردو خبر نامہ" یہ ایک ایسا گوشہ جس نے "ایوانِ اُردو" کو دوسرے ادبی رسائل ممتاز بنا دیا ہے۔ قارئین کا کالم تو ہونا ہی چا تھا۔ آپ نے اسے اچھے انداز میں پیش کیا ہے

—— ڈاکٹر شکیل احمد، متوناتھ

"ایوانِ اُردو دہلی" اپنے سرورق سے آ تک جو حسن و دلکشی رکھتا ہے وہ عصرِ حاضر کے اُردو رسالوں میں ذرا کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ صفحات کی کتابت و طباعت کے حسن کے علاوہ نظم و نثر کا انتخاب اور ان کا تنوّع بکھیر تزئین و ترتیب میں جدّت و انفرادیت اور "خبر نامے" کا اضافہ یہ سبھی قارئین کے دامنِ نظ اپنی طرف کھینچ کر صدا دیتے ہیں "کہ جا ایں جا است" آخری صفحے پر اگر آپ "سرودِ رفتہ" کو خوبصورتی کے ساتھ پیش کرتے رہے تو یہ صف کرائے نہ صرف اُردو لائبریریوں میں بلکہ ہر اُ مکانِ اُردو میں محفوظ رکھنے اور سجائے جانے ہے۔ دہلی اُردو اکادمی نے اب تک ——— اُر خدمتیں انجام دی ہیں بیرونی حضرات اس ہی واقف ہوں گے مگر اب اکادمی کے کارنا سرگرمیوں کے متعلق "ایوانِ اُردو" کے ذریعے پڑھے لکھے حضرات کو معلومات بھی فراہم ہو ر

کچھ افادہ و استفادہ کے مواقع بھی خادمانِ اردو کو حاصل ہوں گے۔

—— وفا ملک پوری، یونیورسٹی

○ "ایوانِ اُردو دہلی" دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ رسالہ اتنا نفیس اور خوب صورت نکلا ہے کہ اُردو صحافت کی ایک بڑی کمی پوری ہوگئی ہے کاغذ و کتابت سے لے کر مواد و معیار تک ایک خصوصی رکھ رکھاؤ نظر آتا ہے۔ اس کا مطالعہ ہر صاحب ذوق پر واجب ہوگیا ہے۔

—— ظفر غوری، کوٹہ

○ "ایوانِ اُردو دہلی" اُردو حلقے میں مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ ہر شمارے میں کوئی نہ کوئی ادبی مضمون جس کا تعلق یونیورسٹی نصاب سے ہو ضرور شاملِ اشاعت کریں۔

—— منظر امام، مظفر پور

○ ڈر لگ رہا ہے کہ اب "ایوانِ اُردو دہلی" کو اُردو دشمنوں کی نظر نہ لگ جائے۔ کیوں کہ ان کا پہلا مقصد اُردو کی ترویج کے امکانات کو ختم کرنا ہے اور "ایوانِ اُردو دہلی" انھیں روز بہ روز روشن کر رہا ہے۔

تبصرے کا کالم اپنے غیر جانبدارانہ اور متوازن انداز کے سبب اکثر رسائل کو پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ اطہر فاروقی صاحب نے فیض کی شاعری کے بارے میں جو تبصرہ کیا ہے وہ ترقی پسندوں کی جانبدارانہ تنقیدی تحریروں کی پول کھول گیا: "فیض کی شاعری عالمی پس منظر میں کتنا ہی بلند مقام رکھتی ہو مگر اُس کی مقامیت مشتبہ ہے"۔ لیکن اطہر صاحب کو جوش کی شاعری کے بارے میں اپنے وسیع مطالعے کی روشنی میں تجزیہ کرنا چاہیے کہ کیا جوش کی کسی نظم میں واقعی کوئی تاثر ہے؟

—— ڈاکٹر صبیحہ خانم، جمشید پور

○ اکادمی پہلے سے ہی اُردو کی بیش بہا خدمات انجام دے رہی ہے ماہنامہ "ایوانِ اُردو دہلی" شائع کر کے اس نے جو ایک کمی دورِ حاضر میں شدت سے محسوس کی جا رہی تھی پوری کر دی۔ حصۂ نثر اور حصۂ نظم دونوں قابلِ تعریف ہیں۔

—— حسن کاظمی، کانپور

○ "ایوانِ اردو دہلی" رفاہِ عام لائبریری میں نہایت ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ "ایوانِ اُردو" کم قیمت میں ایک بہترین ماہنامہ ہے۔

—— فخر الدین فخر، تاج پور

○ اپنے شہر کے ایک بک اسٹال پر سب سے پہلے میں نے ہی "ایوانِ اُردو دہلی" کا پہلا شمارہ دیکھا تھا، خود خریدنے کے بعد اپنے دوستوں کو بھی اس کا خریدار بنایا۔ اب یہ حالت ہے کہ ہم "ایوانِ اُردو" کے شمارے کا کئی دن پہلے سے انتظار کرنے لگتے ہیں۔

—— مہاراجکر سنگھ اثیر، راجوری

○ آپ "ایوانِ اُردو دہلی" کے ٹائٹل پر جس عمارت کی تصویر دیا کریں، اس کا نام ضرور لکھا کیجیے کیوں کہ "ایوانِ اُردو" کے سبھی قارئینِ کرام تو اسے نہیں پہچانتے۔[1]

—— شاکر انصاری، سکندر آباد

[1] اس مشورے پر عمل کیا جائے گا۔

○ ماہنامہ "ایوانِ اُردو دہلی" اوّل تا شمارہ حال پابندی سے پڑھا، یہی بات رسالے کے پسندیدہ ہونے کی کم دلیل نہیں۔

—— قاصر مجیبی، گیا

○ سرزمینِ دہلی سے شائع ہونے والے "ساقی"، "تحریک" اور "آج کل" کے بعد صرف "ایوانِ اُردو" ہے جسے ایک معیاری ادبی رسالہ کہا جائے۔ اس کی اشاعت سے اُردو زبان و ادب کے روشن مستقبل کی اُمیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔

—— سید محمد عارف لکھنوی، علی گڑھ

○ ایک عرصے سے دل میں یہ خواہش تھی کہ "سرودِ رفتہ" جیسا سلسلہ شروع ہو۔ اب جا کر یہ ملال کم ہوا۔

—— فضل افضل، یادگیر

○ معیاری مضامین، اعلیٰ منظومات، اُردو دُنیا کی اہم خبریں، نئی کتابوں کی واقفیت، دلّی کے آثارِ قدیمہ کی تاریخ اور سرودِ رفتہ سب ایک جا ہو کر بنا "ایوانِ اُردو دہلی"۔ اگر ابھی سے اس کا ہر شمارہ محفوظ رکھا جائے تو وہ دن دُور نہیں جب کہ ریسرچ کرنے والوں کی بھرپور مدد کرے۔

—— ممتاز حسین، مظفر پور

○ "حرفِ آغاز" (شمارہ نمبر ۴) میں اُردو سے متعلق تجاویز موثّر انداز میں پیش کی گئی ہیں۔ کاش ہم ان تجاویز پر عمل کر پائیں!

—— محمد فیضان عزیزی، گیا

○ "ایوانِ اُردو دہلی" کا پانچواں شمارہ نظر سے گذرا۔ منظور وقار کا "گھبرائے ہوئے لوگ"، اکبر حیدری کشمیری کا "مرزا غالب پر ایک پُرانا مضمون" نثری مواد میں جاذبِ توجہ ہیں۔

حصۂ نظم میں کچھ نئے نام بھی پڑھنے کو ملے جن سے مستقبلِ ادب کی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں لیکن حسن نعیم صاحب کی غزل سمجھ سے باہر ہے اس کے مطلع کو چھوڑ کر شعروں کا ہر مصرعۂ اولا مصرعۂ ثانی سے آدھا "رکن" کم ہے۔ اصنافِ شاعری میں روایتی غزل، جدید غزل، آزاد غزل تو پڑھی ہے لیکن اس "لنگڑی" غزل کی ابتدا کب سے ہوئی اور اس کا موجد کون ہے؟

—— فرید شمسی، رامپور

○ اگست کے شمارے میں نئی کتابوں کے زیرِ عنوان جو تبصرے کیے گئے ہیں ان میں سے بیشتر تشفی بخش ہیں البتہ "میری صدا کا غبار" کے حوالے

سے جو کچھ سپردِ قلم ہوا ہے میری نظر میں تشنہ سا ہے۔ اُردو خبرنامہ قارئین کو ہمہ جہت ادبی، علمی سرگرمیوں سے باخبر رکھنے کا زبردست وسیلہ ہے۔

—— مخمور جمالی سنبھلی، نہٹور، بجنور

( ) آپ کا موقر ماہنامہ والد محترم سید منظور الحسن صاحب برکاتی کے نام موصول ہوا تو میری نظر اس کے دیدہ زیب سرورق پر پڑی، اسکول کے مشقی سوالات، اور ہوم ورک اتنا ہوتا ہے کہ طالب علمانہ زندگی میں رسائل و جرائد کے مطالعے کے مواقع بہت کم حاصل ہوتے ہیں، لیکن "ایوانِ اُردو" کی خوب صورت جھلک نے فرصت کا وقت فراہم کر ہی دیا، اور میں اتوار کی چھٹی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے "ایوانِ اُردو" کی دید میں محو ہو گئی۔ کچھ دیر تک تو سرورق ہی سے لطف اندوز ہوتی رہی، اور جب دل و دماغ اس کے فرحت افزا نظارے سے تر و تازہ ہو گیا تو پھر "ایوانِ اُردو" کا دروازہ کھول کر ادبستان کی سیر کی جانب مائل ہوئی۔

"حرفِ آغاز" میں بڑی مفید اور کارآمد تجاویز نقوی صاحب نے ارقام فرمائی ہیں۔ کاش ان کو عملی جامہ پہنایا جا سکے۔

پھر ادبی، تاریخی، تنقیدی و تحقیقی تختوں اور کیاریوں کا سلسلہ جاذبِ نظر ہوا، افسانوں میں م۔م۔ راجندر کا "شیش محل" (شمارہ اگست) دل کو لگا، افسانہ کیا ہے حقیقت کو افسانے کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ ریاستی عہد، نوابوں، راجاؤں اور رئیسوں کے محلات کی بربادی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ اور خود اپنے ٹونک کے محل نذرباغ اور اس کے وسط میں واقع سنہری کوٹھی کی موجودہ حالت نظروں میں گھوم گئی۔

خبرنامہ سے "معلم اُردو جامعہ اردو علی گڑھ" کے امتحان کو بی ایڈ کے مساوی تسلیم کرنے کی خوش خبری ملی۔ ابھی ہمارے صوبے کی حکومت نے اس کو تسلیم نہیں کیا، کوشش جاری ہے۔ انشاء اللہ حکومتِ راجستھان بھی اس کو بی ایڈ کے مساوی درجہ دے دے گی۔ اور اس طرح راجستھان کے نوجوانوں کو معاشی مسئلے کے حل میں مدد ملے گی۔

—— صوفیہ برکاتی، ٹونک، راجستھان

( ) "ایوانِ اُردو دہلی" دن بہ دن نکھر رہا ہے۔ ستمبر ۸۷ء کے شمارے میں ندا فاضلی صاحب کی نظم "ایک لٹی ہوئی بستی کی کہانی" بہت پسند آئی۔ منظور وقار کا افسانہ "گھبرائے ہوئے لوگ" بھی خوب ہے۔

—— ظہیر رحمتی، رامپور

( ) بزرگوار کنور سین کا خط کافی دلچسپی کا باعث بنا۔ اُن کی صاف گوئی پر عش عش کرنے کو جی چاہا —— بیچارے کافی برسوں سے بیچ والی اُنگلی کھڑی کیے گھر سے نکلتے ہیں، مگر کوئی اُن کے کام نہیں آتا۔ وہ چاہتے ہیں، کوئی اُن سے اُلجھ جائے۔ اُن کے خط کا جواب دے اور وہ اپنے اندر دبے کُچلے بخارات —— باہر نکالیں۔ اور یہ ثابت کر دیں کہ وہ بھی کسی سے کم نہیں ہیں —— اگر اس کے بجائے وہ ایک اچھا افسانہ ہی لکھ دیں —— تو زیادہ بہتر ہوگا مگر یہ مشکل کام وہ کیوں کریں ہم اُن کی خدمت —— میں یہ شعر عرض ہے:

یہ دین ہے اللہ کا، [illegible]
کچھ علم سے اعجاز بیانی نہیں آتی

—— سریندر پرکاش، بمبئی

( ) "ایوانِ اُردو دہلی" ستمبر ۱۹۸۷ء میں شیخ رتن آکولوی صاحب کا "ہمارے خاں صاحب" پسند آیا۔ انھیں مبارک باد پیش کیجیے۔ افسانوں میں "علامت کے آر پار" از سریندر پرکاش اور "پرامتھیوس" ترجمہ سلام بن رزاق دونوں نے کافی دیرپا اثر چھوڑا۔ شاعری میں حسن نعیم، حامدی کاشمیری، ندا فاضلی، خلش بڑودوی، اختر نظمی، والی آسی، عنبر بہرائچی اور ساحل سحری نے متاثر کیا۔

—— م۔ ق۔ خاں، اگیب

( ) یوں تو "ایوانِ اُردو دہلی" کے مضامین، انشائیے غزلیں، نظمیں، افسانے میں سے ہر ایک "کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست" کا مصداق ہے مگر "سرودِ رفتہ" کا عنوان اور اُس کے ماتحت منتخبہ اشعار خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ امید ہے کہ آپ اس سلسلے کو ضرور جاری رکھیں گے۔

—— اقبال انصاری، علی گڑھ

( ) "ایوانِ اُردو دہلی" نے یہاں تہلکہ مچا رکھا ہے اور ہر شخص چاہے وہ ادیب شاعر ہو یا نہ ہو "ایوانِ اُردو" ایک بار پڑھ لے تو خریدے بغیر چھوڑتا نہیں اور اسے اپنے پاس سے جانے نہیں دیتا۔ کوئی بھی پرچہ چاہے وہ خالص ادبی ہو، عام نوعیت کا اتنی جلدی نہیں فروخت ہو پاتا جتنی جلدی "ایوانِ اُردو" فروخت ہو رہا ہے۔

—— عرفان علی فہیم، مراد آباد

( ) ستمبر کے شمارے میں خلش بڑودوی صاحب اور اختر نظمی کی غزلیں۔ اکبر حیدری کشمیری صاحب کا مضمون اور منظور وقار صاحب کا افسانہ "گھبرائے ہوئے لوگ" پسند آیا۔

—— محمد اظہر، برہانپور

( ) ستمبر کے شمارے میں شیخ عبدالرحمٰن آکولوی کا خاکہ مزہ دے گیا۔ شیخ سلیم احمد نے ادب ۱۹۸۶ء کے جائزے میں کچھ زیادہ ہی اختصارانہ ہے۔ اچھا ہو اگر جائزہ اصناف ادب کے اعتبار سے مسلسل لیا جاتا رہے۔ ۱۹۸۷ء کے لیے ابھی سے تیاری کر لیں۔

—— محمد خضر حیات، ناگپور

اُردو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

فون نمبر: ۲۷۶۲۱۱ اور ۲۶۳۴۴۸

ایوانِ اُردو دہلی

ادارۂ تحریر
سیّد شریف الحسن نقوی
مخمور سعیدی

دوسرا ایڈیشن

جلد: ۱، شمارہ: ۸ — فی کاپی ۲/۵۰ روپے، سالانہ قیمت ۲۵ روپے — دسمبر ۱۹۸۷ء

حرفِ آغاز — سیّد شریف الحسن نقوی — ۴
مصوّر صفحات:
خواجہ صاحب اُردو اکادمی، دہلی کے مہمان — ۶
خواجہ صاحب اپنے افرادِ خاندان کے درمیان — ۷
ادبی محفلوں میں — ۸
خواجہ صاحب اور ان کی بیگم کے خطوط کا عکس — ۹
رُو بہ رُو ـــ شخصیت کے خط و خال:
خواجہ احمد عبّاس ایک نظر میں — نزہت مہدی — ۱۲
آئینہ خانے میں — خواجہ احمد عبّاس — ۱۳
عبّاس صاحب — حیات اللہ انصاری — ۱۸
باچھو اور مَیں — صالحہ عابد حسین — ۲۳
آئی جو اُن کی یاد تو... — یوسف ناظم — ۲۹
ماموں باچھو ـ خواجہ احمد عبّاس — زاہدہ زیدی — ۳۳
دھرتی کا لال — راجیو مرزا — ۳۸
حرف بہ حرف ـــ فکر و فن کے نقوش:
خواجہ احمد عبّاس — محمد حسن — ۴۴
خواجہ احمد عبّاس: حقیقت اور کہانی — حنیف فوق — ۴۷
عبّاس کا آزاد قلم — رفعت سروش — ۵۰
"گیہوں اور گلاب" ـــ ایک تجزیہ — حامد حسین — ۵۲
خواجہ احمد عبّاس کی ناول نگاری — غلام حسین — ۵۵
'انقلاب' ـــ ایک اجمالی جائزہ — کہکشاں یاسمین — ۵۹
بچّوں کے خواجہ احمد عبّاس — خوشحال زیدی — ۶۳
لوح و قلم ـــ ایک پیش لفظ کا اقتباس اور تین کہانیاں:
مجھے کچھ کہنا ہے... — خواجہ احمد عبّاس — ۶۶
تین مائیں ایک بچّہ — خواجہ احمد عبّاس — ۶۷
ایک لڑکی سات دیوانے — خواجہ احمد عبّاس — ۷۳
نیلی ساری — خواجہ احمد عبّاس — ۷۸
اُردو خبر نامہ — ادارہ — ۸۷
ہم طرح اشعار — قارئین — ۹۱
سرورق کے اندرونی صفحے کے عنوانات — قارئین — ۹۲
آپ کی رائے — قارئین — ۹۳

یک موضوعی شمارہ: خواجہ احمد عبّاس نمبر

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ:
ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی
اُردو اکادمی گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سرورق اور تزئین: ارشد علی، خوشنویس: تنویر احمد

سیّد شریف الحسن نقوی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے ثمر آفسیٹ پریس دہلی ۶ سے چھپوا کر دفترِ اُردو اکادمی، نئی دہلی ۲ سے شائع کیا۔

خواجہ احمد عباس نمبر پیشِ خدمت ہے۔

اس نمبر کو ہم نے تین حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصّے "رُو بہ رُو" میں وہ مضامین شامل کیے گئے ہیں جو خواجہ صاحب کے خاندانی حالات اور ان کے شخصی کوائف پر مشتمل ہیں۔ ان میں ایک مضمون خود خواجہ صاحب کے قلم سے ہے جو برسوں پہلے ماہنامہ "افکار" کراچی میں شائع ہوا تھا اور عام طور پر لوگوں کے ذہنوں سے محو ہو چکا ہے۔ یہ گویا خواجہ صاحب کے خود نوشت سوانحی حوالے ہیں جن کی اہمیت ہمیشہ باقی رہے گی۔ دیگر مضامین میں جناب حیات اللہ انصاری، محترمہ صالحہ عابد حسین، جناب یوسف ناظم، محترمہ زاہدہ زیدی، جناب راجیو مرزا اور محترمہ نزہت مہدی کی تحریریں شامل ہیں۔ حیات اللہ انصاری صاحب نے اس زمانے کی یادیں تازہ کی ہیں جب وہ اور خواجہ صاحب دونوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ خواجہ صاحب انھی دنوں اپنا مستقبل صحافت سے وابستہ کر چکے تھے اور دوسرے لوگوں نے بھی ان میں مستقبل کے ایک بڑے صحافی کی جھلک دیکھ لی تھی۔ محترمہ صالحہ عابد حسین خواجہ صاحب کی قریبی رشتے دار ہیں۔ انھوں نے خواجہ صاحب کے خاندانی پس منظر کے ساتھ ساتھ ان کے بچپن اور لڑکپن کے حالات، ان کے اطوار و عادات، ان کی نوجوانی کی ترجیحات اور پھر ان کی شادی اور ان کی رفیقۂ حیات مجتبائی بیگم کا ذکر بڑے دل پذیر پیرایے میں کیا ہے۔ کیا خواجہ صاحب کے کوئی اولاد بھی ہوئی؟ اس کا ذکر اس مضمون میں نہیں ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، مجتبائی بیگم کے بطن سے خواجہ صاحب کے کوئی اولاد نہیں ہوئی لیکن ان کی ایک صاحبزادی اوشی عبّاس ہیں جو بمبئی میں رہتی ہیں اور شادی شدہ ہیں۔ زاہدہ زیدی صاحبہ اور نزہت مہدی صاحبہ بھی خواجہ صاحب کی رشتے دار ہیں۔ زاہدہ زیدی صاحبہ نے اپنے ماموں کو کس طور دیکھا، ان کی شخصیت کے کیا نقوش ان کے ذہن پر مرتسم ہوئے اور ان کے کارناموں سے کس طرح وہ متاثر ہوئیں، یہ ساری تفصیلات ان کے مضمون میں اس طرح بیان ہوئی ہیں کہ پڑھنے والوں کے لیے نشاطِ مطالعہ کا سامان بھی فراہم ہو گیا ہے اور ان کی معلومات میں قیمتی اضافہ کا بھی۔ نزہت مہدی صاحبہ نے اختصار کے ساتھ خواجہ صاحب کی زندگی کے اہم واقعات یکجا کر دیے ہیں اور ان کی کتابوں اور فلموں اور انھیں ملنے والے اعزازات و انعامات کی تفصیلات بھی فراہم کر دی ہیں۔ یوسف ناظم صاحب خواجہ صاحب کے مدّاح بھی رہے اور خلوت و جلوت کے شریک بھی۔ خواجہ صاحب کے انتقال سے پہلے بھی وہ ان سے ملے تھے اور اپنے مضمون کا آغاز انھوں نے اسی ملاقات کے ذکر سے کیا ہے۔ کسی مرحوم شخصیت کے ذکر میں قلم کی شگفتگی عام طور پر قلم کار کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے لیکن یوسف ناظم صاحب کا یہ مضمون اس سے مستثنیٰ ہے اور یہی اس کی سب سے نمایاں خوبی ہے۔ راجیو مرزا صاحب پہلی بار ایک دَور کے عقیدت مند کی حیثیت سے خواجہ صاحب سے ملے تھے اور ان کی شخصیت کا کوئی اچھا تاثر لے کر نہیں لوٹے تھے لیکن دھیرے دھیرے یہ ابتدائی تاثر کس طرح ختم ہوا اور وہ دوبارہ خواجہ صاحب کے حلقۂ ارادت میں کس طرح شامل ہوئے، ان کا مضمون ہمیں یہی دلچسپ کہانی سناتا ہے اور ایک اچھوتی کہانی ہی کی طرح دل کو چھو لینے والا ہے۔

دوسرا حصّہ جسے ہم نے "حرف بہ حرف" کا نام دیا ہے، ان مضامین پر مشتمل ہے جو خواجہ صاحب کے فکر و فن کے نقوش روشن

کرتے ہیں۔ ان میں پہلا مضمون پروفیسر محمد حسن کا ہے جو خواجہ صاحب کی افسانہ نگاری اور ناول نگاری پر عمومی تبصرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ خواجہ صاحب ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن ان کی تخلیقات ہمارے پاس موجود ہیں اور اب ان کا محاکمہ معروضی انداز میں ہونا چاہیے تاکہ ان کی صحیح قدر و قیمت سامنے آسکے۔ محمد حسن صاحب کا مضمون اس عمل کا نقطۂ آغاز ثابت ہو سکتا ہے۔ دوسرا مضمون ڈاکٹر حنیف فوق کا ہے، انھوں نے ان عوامل کی نشاندہی کی ہے جو خواجہ صاحب کے تصنیفی اور تخلیقی کاموں کے محرک بنے اور جنھوں نے ان کے ذہن و فکر کو ایک جہت دی۔ رفعت سروش صاحب نے خواجہ صاحب کی ایمانداری، راست گوئی اور ادب ہو، صحافت ہو یا فلم سازی، ہر شعبے میں اپنے ضمیر کی آواز پر قدم بڑھانے کی اخلاقی جرأت پر بہ طورِ خاص زور دیا ہے اور اس ضمن میں ایک دو واقعات بھی بیان کیے ہیں۔ ڈاکٹر سیّد حامد حسین نے خواجہ صاحب کے ایک افسانے "گیہوں اور گلاب" کو بنیاد بنا کر ان کی افسانہ نگاری کی بنیادی خصوصیات سے بحث کی ہے اور اہم نتائج تک پہنچے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ "گیہوں اور گلاب" میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جنھیں ہم خواجہ صاحب کی افسانہ نگاری کی پہچان مان سکتے ہیں۔ ڈاکٹر غلام حسین نے خواجہ صاحب کی ناول نگاری کا عمومی جائزہ پیش کیا ہے اور خواجہ صاحب نے ناول کی تکنیک میں جو تبدیلی لانے کی کوشش کی ہے، اس سے بھی بحث کی ہے۔ ان کے اس خیال سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اسے یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ خواجہ صاحب کے اکثر ناول پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ فلمی نقطۂ نظر کے تابع ہیں۔ ڈاکٹر کہکشاں یاسمین نے خواجہ صاحب کے مشہور ترین ناول "انقلاب" کا جائزہ لیا ہے اور اس کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی بعض خامیوں کی طرف بھی اشارے کیے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ ناول اور اچھا ہو سکتا تھا اگر مقصد فن پر غالب نہ آگیا ہوتا۔ یہ ایک ایسی بحث طلب بات ہے جو خواجہ صاحب کی بیشتر تحریروں کے بارے میں بیشتر ناقدین نے کہی ہے۔ آخری مضمون ڈاکٹر خوشحال زیدی کا ہے۔ انھوں نے خواجہ صاحب کی ان تحریروں پر قلم اٹھایا ہے جو انھوں نے بچّوں کے لیے لکھی ہیں۔

"لوح و قلم" کے زیرِ عنوان نمبر کے اور آخری حصّے میں خواجہ صاحب کے ایک پیش لفظ کا اقتباس اور ان کی تین کہانیاں شامل کی گئی ہیں۔ یہ اقتباس خواجہ صاحب کے فنّی نقطۂ نظر اور ان کے تخلیقی کاموں کے پیچھے جو محرّکات کارفرما ہیں، انھیں خود ان کے لفظوں میں سامنے لے آتا ہے۔ تینوں کہانیاں بھی ایسی منتخب کی گئی ہیں جو خواجہ صاحب کے افسانوی فن کی بنیادی خصوصیات کی حامل ہیں۔ اس حصّے میں خواجہ صاحب کی پہلی کہانی "ابابیل" کو بھی شامل کرنے کا خیال تھا لیکن اسے حال ہی میں ایک معاصر نے شائع کر دیا ہے اس لیے اس کی مکرر اشاعت غیر ضروری سمجھی گئی۔

اس طرح ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ یہ نمبر خواجہ صاحب کی شخصیت اور ان کے فکر و فن کے سبھی پہلوؤں کا جامع ہو اور عام قارئین کے ساتھ ساتھ ادب کے ان طالب علموں کے لیے بھی دلچسپی کا حامل اور کارآمد ثابت ہو جو خواجہ صاحب پر تحقیقی اور تنقیدی کام کرنا چاہیں۔

"ایوانِ اردو دہلی" کے بعض مستقل کالم اس شمارے میں بھی قائم رکھے گئے ہیں اور انھیں ترتیب میں آخر میں جگہ دی گئی ہے۔

—— سیّد شریف الحسن نقوی

خواجہ صاحب اُردو اکادمی، دہلی کے مہمان

اردو اکادمی، دہلی نے ۱۹۸۴ء کا خصوصی کُل ہند ایوارڈ خواجہ صاحب کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس ایوارڈ میں دس ہزار روپے نقد، شال، سند اور اکادمی کا نشان شامل تھے۔ خواجہ صاحب ازراہِ کرم اپنی بیماری اور کمزوری کے باوجود یہ ایوارڈ حاصل کرنے بہ نفسِ نفیس بمبئی سے دہلی تشریف لائے تھے۔ اس موقعے کی چند یادگار تصویریں:

دہلی کے سابق لیفٹننٹ گورنر اور اکادمی کے سابق چیرمین جناب ایم۔ ایم کے۔ ولی خواجہ صاحب کو ایوارڈ پیش کرتے ہوئے — درمیان میں کھڑے ہیں دہلی کے چیف ایگزکٹو کونسلر جناب جگ پرویش چندر۔

دہلی کے ایگزکٹو کونسلر تعلیمات اور اُردو اکادمی دہلی کے وائس چیرمین جناب کلانند بھارتیہ خواجہ صاحب کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے۔

آغاز سے پہلے خواجہ صاحب اکادمی کے سیکریٹری سیّد شریف الحسن نقوی سے گفتگو کرتے ہوئے

اکادمی کی کارکن نزہت مہدی خواجہ صاحب کو ہال میں لے کر آرہی ہیں

(تصاویر: سیّد فدا علی)

دائیں سے بیٹھے ہوئے: انور عباس (بھانجا) خدیجہ عظیم (رشتے کی بھانجی) احمد فاطمہ (بہن) ناہید (بھانجی) اظہر عباس (بھتیجی)۔
کھڑے ہوئے: خواجہ صاحب اور نرجس (بھانجی) سب سے آگے خدیجہ عظیم کے بچے، جو مشہور افسانہ نگار انور عظیم کی اہلیہ ہیں۔
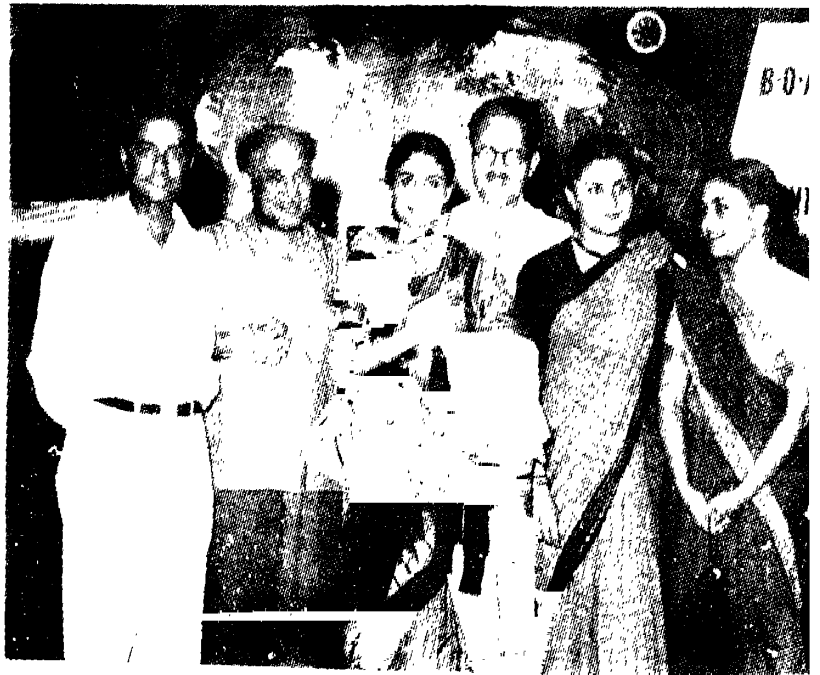
الطاف حمید، ذکیہ ظہیر (رشتے کی بھتیجی، خواجہ غلام السیدین کی صاحبزادی) خواجہ غلام السیدین (چچازاد بھائی)
زہرہ سیدین (سیدین صاحب کی صاحبزادی) خواجہ صاحب اور کاظم ظہیر (ذکیہ صاحبہ کے شوہر)۔

خواجہ صاحب کی رفیقۂ حیات: مجتبائی بیگم عرف مجی۔
(تصاویر: بہ شکریہ محترمہ نزہت مہدی)

ادبی محفلوں میں

کیفی اعظمی، حسن کمال، قیصر الجعفری، (مائک پر) خواجہ احمد عباس اور بائیں طرف آخر میں یوسف ناظم

دائیں سے: پروفیسر محمد حسن، خواجہ احمد عباس اور کرشن چندر

دائیں سے بائیں: خواجہ عبدالغفور، عزیز قیسی، یوسف ناظم، علی سردار جعفری، راجندر سنگھ بیدی (صدر جلسہ)، خواجہ احمد عباس، ڈاکٹر عبدالستار دلوی اور ڈاکٹر منشی

(تصویریں: بہ شکریہ جناب یوسف ناظم)

مرادآباد کے عبدالحمید شمسی صاحب کے ساتھ ادبی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے۔
(تصویریں: بہ شکریہ جناب عبدالحمید شمسی)

آکاش وانی گورکھپور پر انٹرویو دیتے ہوئے، پروفیسر محمود الٰہی اور ڈاکٹر عبدالخالق کے ساتھ

خواجہ صاحب اور ان کی بیگم کے خطوط کا عکس

لندن۔
۱۷ فروری

پیاری باجی صغرا جی۔ سلام اور دعا

میں پاکستان
سے دنیا کی ریڈیو میں سو ہوم یہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔
اس لئے ماسکو سے لائے ہوئے ذاتی کاغذ سے ایئر
میل کر رہا ہوں۔ شاید یہ کاغذ اور لفافہ
ملفوف ہے۔

عابد صاحب سے بعد از
سلام کہنا کہ ان کی کتاب کی اشاعت روس میں
"دنیا نو کے فی صدی" منظور ہوگئی ہے۔ کتنے ہی
مصنفوں اور ماہرین سیاست نے اس کو پڑھ کر
پسند کیا ہے۔ لیکن بقول کیمیا گروں کے ابھی
"ایک آنچ کی کسر" رہ گئی ہے۔ مگر سفیر ہند
مینن صاحب کا خیال ہے کہ وہ بھی پوری ہو جائیگی۔
ان کی کتاب بھی دو سال کی تاخیر اور لیت و لعل کے بعد
ابھی ابھی شائع ہوئی ہے۔ سنا ہے کہ خدا کی خدائی
اور کمیونسٹ راج دونوں میں دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔
واللہ اعلم۔

حامدہ اور شوکت (جن کے ہاں میں مقیم ہوں)
تمہیں اور عابد صاحب کو سلام کہتے ہیں۔

تمہارا بھائی
باچو

۶/۱/۰

میری پیاری باجی صغرا و عابد صاحب۔

ٹیکسی کے حادثے کی خبر تو آپ لوگوں کو
ہو چلی ہوگی۔ آپ خود ایسے حادثے سے دوچار ہو چکے ہیں۔ تفصیل اردو
"بلٹز" کے ذریعے آپ کو مل چکی ہوگی۔

اس لئے یہ خط صرف اس لئے لکھ رہا
ہوں کہ آپ کو اطمینان ہو جائے کہ میں بقید ہوش و حواس یہ خط لکھ
رہا ہوں اور وہ بھی اپنے داہنے ہاتھ سے۔ ویسے خدا کا فضل
ہے کوئی اعضائے رئیسہ مجروح نہیں ہوئے۔ ویسے دو پسلیوں
کا فریکچر ہے اور ایک پاؤں میں موچ اور دوسری ٹانگ میں زخم ہے۔
باقی خیریت ہے۔ پسلیوں کو باندھ جوڑ دیا گیا ہے یعنی پلاسٹر
تو نہیں لگایا پھنسا کر دیا گیا ہے۔ اس سے کبھی کبھی الجھن
ہوتی ہے۔

ٹیکسی کے حادثے میں نہ میرا کوئی قصور تھا نہ
ٹیکسی والے کا۔ —— شاید فلم کے لئے
جو car chase کا سین فلمایا تھا اور جس میں تیس
رات کا موٹریں دوڑا کر ایک بھی ایکسیڈنٹ نہیں ہوا
(سوائے نقلی ایکسیڈنٹ کے) اس کا خمیازہ بھگتنا رہا
ہے۔ یعنی کسی کو تو اس کی سزا ملنی چاہیئے۔ سو ڈائریکٹر
کو کیوں نہ دی جائے۔

آپا خیرہ، خالہ کالے، صغرا وغیرہ کو سلام دعا۔

آپ کا
باچو

اکبر آپ کو "پیار" کہہ رہے ہیں

अन्तर्देशीय पत्र

इस पत्र के अन्दर कुछ न रखिये

Mr. & Mrs. Abid Husain,
Dodhpore
ALIGARH
(U. P.)

Sonja Abbas
Bombay – 23

ALIGARH

کے ای ایم ۸۶ء

۱۸ جولائی

پیاری باجی مصداق اور بھائی صاحب

آداب

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے

میں اب بالکل اچھی ہوں۔ چلنے پھرنے کی

اجازت مل گئی ہے۔ ابھی کچھ دنوں اور ہسپتال

میں ہوں

بھائی صاحب کی قیمتی مشورے اور آپ کی د

نے اتنی ہمت بندھائی۔ خدا نے سب مرحلے آسانی سے ط

فرصت ہو تو مجھے خط لکھئے گا۔ بڑی باجی کی خدمت

آداب

میری پیاری دوست صابرہ کو سلام۔

اور زاہدہ، ساجدہ کو دعائیں

ساجدہ کے بچوں کو پیار۔

اور علیگڑھ میں سب جاننے والوں کو

سلام۔

آپ کی چھوٹی بہن

سونیا (جو پہلے جمی تھی)

(جنبائی بیگم کا خط)

(یہ تینوں خط محترمہ صالحہ عابد حسین کے نام ہیں اور انھی کے شکریے کے ساتھ شائع کیے جا رہے ہیں)

رُو بہ رُو

شخصیت کے خط و خال

خواجہ احمد عبّاس : ایک نظر میں	نزہت مہدی
آئینہ خانے میں	خواجہ احمد عبّاس
عبّاس صاحب	حیات اللہ انصاری
باچھو اور مُنّی	صالحہ عابد حسین
آئی جو اُن کی یاد تو . . .	یوسف ناظم
ماموں باچھو ــــ خواجہ احمد عبّاس	زاہدہ زیدی
'دھرتی کا لال'	راجیو مرزا

خواجہ احمد عباس ـــــ ایک نظر میں

نزہت مہدی

نام: خواجہ احمد عباس

تاریخ پیدائش: ۷ جون ۱۹۱۴ء

مقام پیدائش: پانی پت

تعلیم کی ابتدا: ختم قرآن ساڑھے چھ سال کی عمر میں

اسکولی تعلیم کی ابتدا: حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت۔

گریجویشن: بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

صحافتی زندگی کا آغاز: ۱۹۳۶ء بمبئی کرانیکل سے۔ اس کے بعد ۱۹۴۷ء میں ہفت روزہ بلٹز سے وابستگی۔ آخر تک LAST PAGE لکھتے رہے۔

شادی: ۱۹۴۲ء (مجتبائی بیگم سے) ۱۹۵۹ء میں بیوی کا انتقال، بعارضۂ قلب۔

اولاد: ایک لڑکی ـــــ اوشی

ادبی زندگی کا آغاز: ۱۹۳۶ء میں پہلی کہانی "ابابیل" لکھی جو رسالہ جامعہ دہلی میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ آخر تک جاری رہا۔

فلمی کہانیاں: نیا سنسار، ڈاکٹر کوٹنس، آوارہ، شری چار سو بیس، میرا نام جوکر، بوبی، رام تیری گنگا میلی اور آخری جنا۔

۱۹۵۱ء میں "نیا سنسار" کے نام سے اپنا

اور کتابیں بھی شائع کیں۔ فلمیں جو ڈائرکٹ اور پروڈیوس کیں ان میں "دھرتی کے لال" میں انھوں نے مشہور اداکار بلراج ساہنی کو متعارف کرایا۔ دوسری فلم "شہر اور سپنا" کو ۱۹۶۴ء میں پریسیڈنٹ گولڈ میڈل ملا۔ "سات ہندوستانی" "دو بوند پانی" کو قومی یک جہتی کا انعام ملا۔ بچوں کی فلم "ہمارا گھر" کو ۱۹۶۶ء میں اسپین، چیکوسلواکیہ اور امریکہ سے انعامات حاصل ہوئے "نکسلائٹ" کو اٹلی سے گولڈ میڈل ملا۔

اردو، ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں میں لکھتے تھے۔

افسانوں کے مجموعے: ۱۔ ایک لڑکی ۲۔ پاؤں میں پھول ۳۔ زعفران کے پھول ۴۔ میں کون ہوں ۵۔ کہتے ہیں جس کو عشق ۶۔ دیا جلے ساری رات ۷۔ پیرس کی ایک شام ۸۔ گیہوں اور گلاب ۹۔ بیسویں صدی کے لیلیٰ مجنوں ۱۰۔ نیلی ساری ۱۱۔ نئی دھرتی اور نئے انسان۔

ناول: ۱۔ چار دل چار راہیں ۲۔ بمبئی رات کی بانہوں میں ۳۔ سات ہندوستانی ۴۔ میرا نام جوکر ۵۔ دو بوند پانی ۶۔ تین پیسے ایک پرانا ٹب اور دنیا بھر کا کچرا ۷۔ فاصلہ ۸۔ انقلاب، نومبر ۱۹۷۵ء ـــــ خواجہ صاحب کا بیان ہے کہ: ناول انقلاب کی ابتدا اگست ۱۹۴۲ء میں ہوئی اور ۱۹۴۹ء تک صرف تیرہ (۱۳) باب انگریزی میں مکمل ہو سکے۔ اس کے بعد راس کماری میں جاکر مکمل کیا۔ پھر اس کی اشاعت کی اصل جدوجہد شروع ہوئی۔ کوئی بھی پبلشر اتنی ضخیم کتاب چھاپنے پر تیار نہ تھا (ہندوستان میں) سب کا اصرار تھا کہ مختصر کیا جائے۔ ۱۹۵۴ء میں جب پہلی بار روس گئے تو ان لوگوں نے ناول پڑھنے کے بعد اسے روسی زبان میں "سین اندی" یعنی "ہندوستان کا بیٹا"

ہزار کا ایڈیشن شائع ہوا۔ ۱۹۵۵ء میں جرمن زبان میں یہ ناول منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد بمبئی کے ایک پبلشر نے ۱۹۵۶ء میں ڈیڑھ سو صفحات کم کرنے کے بعد پہلی بار ہندوستان میں چھاپا۔ ۱۹۸۶ء میں منیش نرائن سکسینہ نے اس کا ہندی میں ترجمہ کیا اس کو راج پال اینڈ سنز نے شائع کیا۔ ۱۹۷۵ء میں مختلف لوگوں کے تعاون سے آخر کار یہ اردو زبان میں قارئین کے سامنے آیا۔

ڈرامے: ۱۔ زبیدہ ۲۔ یہ امرت ہے ۳۔ میں کون ہوں ۴۔ اناس اور ایٹم بم ۵۔ لال گلاب کی واپسی۔

سیاحت اور سیاست نامے: ۱۔ مسافر کی ڈائری ۲۔ خروشچیف کیا چاہتا ہے ۳۔ مسولینی ۴۔ محمد علی۔

خود نوشت سوانح: I AM NOT AN ISLAND

سفر: ۱۹۳۸ء اور ۱۹۶۶ء میں ساری دنیا کا۔ ۱۹۵۱ء میں چین کا۔ ۱۹۵۴ء میں پہلی بار سوویت یونین کا۔ اس کے بعد نو مرتبہ پھر گئے۔

اعزاز و اکرام:

۱۔ ۱۹۶۹ء میں پدم شری۔

۲۔ ۱۹۶۹ء میں ہریانہ سرکار کی جانب سے ادبی خدمات کے صلے میں اعزاز۔

۳۔ ۱۹۸۱ء میں یوپی فلم جرنلسٹ ایسوسی ایشن ایوارڈ۔

۴۔ ۱۹۸۳ء میں سوویت یونین کا وورووسکی (VOROUSKY) ادبی اعزاز۔

۵۔ ۱۹۸۴ء میں مودی غالب ایوارڈ۔

۶۔ ۱۹۸۴ء۔ اردو اکادمی دہلی کا خصوصی ایوارڈ۔

۷۔ ۱۹۸۵ء میں ہند سوویت دوستی اور امن عالم کے لیے سوویت ایوارڈ۔

۸۔ مہاراشٹر اردو اکادمی کی جانب سے اردو ادب و صحافت کی خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ۔

آئینہ خانے میں

ماہنامہ "افکار" کراچی نے ۶۰ء کی دہائی میں اپنے صفحات پر ایک کالم شروع کیا تھا — "آئینہ خانے میں" اس کے تحت بہت سے معروف و ممتاز اہلِ قلم نے، جن میں راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور خواجہ احمد عبّاس بھی شامل تھے، خود اپنی شخصیت کا تعارف اور اپنے فکر و فن کے جائزے اپنے اپنے انداز میں پیش کیے تھے۔ خواجہ صاحب کا یہ مضمون "افکار" کے دسمبر ۱۹۶۳ء کے شمارے میں چھپا تھا، اسی سے نقل کیا جا رہا ہے۔

—— ادارہ

اُنچاس برس تک وہ مجھ سے کتراتا رہا، مگر پھر آخر ایک دن ہمارا آمنا سامنا ہو ہی گیا۔

میں نے کہا۔ بات کیا ہے؟ میں نے تو کبھی تمہیں قرض نہیں دیا۔ پھر ہمیشہ مجھ سے کیوں آنکھیں چُراتے ہو؟

اس نے کہا۔ میں تم سے شرماتا بھی ہوں، ڈرتا بھی ہوں، مگر میں تم سے نفرت نہیں کرتا۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ میں اگر کسی سے محبت کرتا ہوں تو صرف تم سے۔ محبت کیا ہے اور نفرت کیا ہے؟ سچ پوچھو تو یہ مجھے بھی نہیں معلوم۔ محبت اور نفرت دونوں ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں۔ شاید اسی لیے میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تم سمجھتے ہو میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔

میں نے کہا۔ آج مل ہی گئے ہو تو دو دو باتیں ہو جائیں۔ میں تمھارے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتا ہوں، سب کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔

یوں کہو میرے ڈھول کا پول کھولنا چاہتے ہو؟ اس نے کہا۔ تب ہی تو میں تمھارا سامنا کرنے سے کتراتا تھا۔ کیوں میرے سامنے میری مٹی پلید کرنا چاہتے ہو؟ بہت سے ایسے چہرے ہیں جن پر پردہ ہی پڑا رہے تو بہتر ہے۔

مگر میں نے تو کبھی کسی آئینے پر پردہ پڑا نہیں دیکھا اور کہا جاتا ہے آئینہ جھوٹ نہیں بولتا۔

وہ بولا۔ کون کہتا ہے آئینہ جھوٹ نہیں بولتا۔ ایک آئینہ ہوتا ہے جس میں دُبلا آدمی موٹا نظر آتا ہے۔ دوسرا آئینہ ہوتا ہے جس میں چھوٹے قد کا آدمی لمبا دکھائی دیتا ہے۔ بدصورت سے بدصورت آدمی کو آئینے میں اپنا چہرہ خوب صورت ہی لگتا ہے۔ اگر آئینے سچ بولتے تو دُنیا میں ایک آئینہ بھی نہ بچتا۔ سب چکنا چور کر دیے جاتے۔

میں نے کہا۔ تو پھر مجھے ایک آئینہ سمجھو۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو۔ پھر بتاؤ کیا دکھائی دیتا ہے؟

اس نے کہا۔ ایک چھوٹے قد کا گنجا سا آدمی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی۔ آنکھوں کے گرد کالے کالے حلقے۔ جیسے کتنی ہی راتوں سے نہ سویا ہو۔ چہرے پر بڑھاپے کی جھرّیاں تو نہیں ہیں مگر ماتھے کی گہری لکیریں بتا رہی ہیں کہ غم کے کتنے ہی طوفان اس پر سے گزر گئے ہیں جیسے اس کی زندگی کا ہر برس سات سو تیس دن کا گزرا ہو۔

میں نے پوچھا کیا تم اسے پہچانتے ہو؟ پہلے کبھی دیکھا ہے اُسے؟

اس نے کہا۔ صورت جانی پہچانی لگتی ہے، مگر یاد نہیں آتا کہاں اور کب دیکھا ہے؟

میں نے کہا۔ غور سے دیکھو کہیں آئینے میں اپنی صورت تو نہیں دیکھ رہے۔

اس نے کہا۔ لاحول ولاقوۃ۔ کیا تم مجھے اتنا بدصورت سمجھتے ہو؟ انٹلیکچولز کی طرح میرا ماتھا اُونچا ضرور ہے۔ مگر میں گنجا نہیں ہوں۔ مانا کہ بیل جیسے دیدے نہیں ہیں میرے، مگر آنکھیں اتنی چھوٹی بھی نہیں ہیں جیسے کسی نے ریت میں تھوک دیا ہو۔ نہیں جی، میں اس گنجے کھوسٹ کو نہیں جانتا۔

میں نے کہا۔ دوست یہی تو مشکل ہے۔ انسان چاند کا جغرافیہ جانتا ہے مگر اپنا چوکھٹا نہیں پہچانتا۔

وہ چڑ کر بولا۔ کیا کہا۔

کچھ نہیں، میں تو تمھاری زندگی کے حالات جاننا چاہتا تھا۔

کیوں؟

ایک مضمون لکھنا ہے اپنے بارے میں، مطلب یہ کہ تمھارے بارے میں۔

کیا اس مضمون کے پیسے ملیں گے؟

شاید۔

تو یوں کہو مجھے بیچنا چاہتے ہو؟ اور سب تو بیچ چکے ہو۔ اپنا قلم، اپنا دماغ۔ سُنا ہے اپنا دل بھی کئی بار گروی رکھ چکے ہو۔ اب رہ کیا گیا ہے؟ چلو مجھے بھی بیچ ڈالو۔

تو پھر اپنے حالاتِ زندگی بتاؤ۔

تاریخ پیدائش جون ۱۹۱۴ء۔ تاریخ وفات

خواجہ احمد عبّاس

ابھی معلوم نہیں۔

ان دو تاریخوں کے درمیان میں کیا ہوا؟

سچ بتاؤں؟ اس نے پوچھا۔

ہاں بالکل سچ۔

سچ تو یہ ہے کہ کچھ نہیں ہوا۔

کیا مطلب؟

مطلب یہ کہ میری ہستی سے دُنیا میں کوئی انقلاب نہیں آیا۔ کوئی لیلیٰ مجنوں جیسا لازوال عشق نہیں ہوا۔ کوئی لافانی کتاب نہیں لکھی گئی۔ آرٹ کا کوئی شاہکار تخلیق نہیں ہوا۔ کوئی نیا برّاعظم دریافت نہیں ہوا۔

تو پھر اُنچاس برس کی زندگی میں تم نے کیا کیا۔

جھک ماری۔ پچاس ہزار گھنٹے دوستوں کے ساتھ گپ کی، پچاس ہزار چائے کی پیالیاں پیں۔ ایک لاکھ سفید کاغذ کے ورق سیاہ کیے۔ پندرہ ہزار گھنٹے سنیما کے اندھیرے میں کاٹے۔ سوسوا سو فاؤنٹن پن خریدے۔ گھِسے اور کھوئے۔ سات ٹائپ رائٹروں کو پیٹ پیٹ کر کھٹارہ بنا دیا۔ پانی پت، علی گڑھ، دہلی اور بمبئی، ہانگ کانگ، شنگھائی، ٹوکیو، پیکنگ، لندن، پیرس، نیو یارک اور ماسکو کی سڑکیں ناپیں۔

اس سب اوٹ پٹانگ پروگرام سے تو یہ پتہ نہیں چلتا کہ تم کرتے کیا رہے؟ آخر تمھارا پیشہ کیا ہے؟

ادیب اور تنقید نگار کہتے ہیں میں ایک اخباری ہوں۔ جرنلسٹ کہتے ہیں کہ میں فلم والا ہوں۔ فلم والے کہتے ہیں ایک سیاسی پروپگنڈسٹ ہوں۔ سیاست داں کہتے ہیں کہ میں کمیونسٹ ہوں۔ کمیونسٹ کہتے ہیں میں بورژوا ہوں.....

مگر تم سچ مچ ہو کیا؟

کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا؟ سچ یہ ہے کہ مجھے خود نہیں معلوم کہ میں کیا ہوں؟

پھر بھی سنا ہے تم نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔

یہ الزام تو لگایا گیا ہے مگر آپ ثابت نہیں کر سکتے۔ ایک تنقید نگار نے تو میری پہلی کتاب پڑھ کر فتویٰ دے دیا تھا کہ کتاب میں نے کسی اور سے لکھوا کر اپنے نام سے چھپوا دی ہے۔

سُنا ہے تم نے کئی فلمیں بھی بنائی ہیں۔

آہستہ بولو۔ کہیں کوئی فنانسر نہ سُن لے اور ڈگری لے کر میرا پلنگ اور تین کُرسیاں اور ستائیس من پُرانی کتابیں اور سترہ من ردّی کاغذ قرقی کرنے نہ آجائے۔

اچھا یہ بتاؤ تمھارے دل کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟

"ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے" دل چاہتا ہے کہ میرے سر پر گھنے سیاہ بال اُگ آئیں اور ایک بار پھر میں جوان ہو جاؤں۔ دل چاہتا ہے کہ میں ٹالسٹائے کے WAR AND PEACE جیسا ناول لکھ دوں۔ دل چاہتا ہے کہ میں ایک ایسا فلم بنا دوں جس کا ساری دُنیا میں چرچا ہو۔ دل چاہتا ہے میں ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھ جاؤں۔ اسپوتنک میں بیٹھ کر چاند کی سیر کر آؤں۔ دل چاہتا ہے میرے پاس ایک خاص اپنا کمرہ ہو جس میں چاروں طرف کتابوں کی الماریاں ہوں اور ایک ریڈیو گرام ہو اور دُنیا کی بہترین موسیقی کے ریکارڈ ہوں اور زمین پر چٹائی کا فرش ہو اور لیٹنے کے لیے ایک گدّا ہو، ایک بجلی کا سماوار ہو جس میں ہر وقت چائے بنتی رہے، کئی فاؤنٹن پن ہوں، ایک بہت بڑی روشنائی کی بوتل ہو اور تھو رِم کاغذ ہو اور وقت ہو۔ اپنی پسند کی کتابیں پڑھنے کے لیے، اپنی پسند کی کتابیں اور کہانیاں لکھنے کے لیے، اپنے خاص دوستوں سے گپ کرنے کے لیے، سونے کے لیے وقت ہو اور کبھی کبھی سوچنے کے لیے بھی وقت ہو۔

تو پھر یہ بھی بتاؤ کہ تم نے لکھنا کب شروع کیا؟ اور کیوں؟

میں نے لکھنا شروع کیا جب میں کالج میں پڑھتا تھا، مگر کیوں؟ اس کی تین وجہیں تھیں میرا ٹھگنا قد اور دبلا پتلا جسم۔ کرکٹ، فٹ بال، ہاکی، ٹینس میں لمبے قد والوں کو اہمیت دی جاتی تھی اور یونیورسٹی میں صرف کھلاڑیوں ہی کی قدر کی جاتی تھی مگر میرا جی چاہتا تھا کہ میرا بھی نوٹس لیا جائے۔ میں بھی کوئی ایسا کام کروں کہ یونیورسٹی میں میرا چرچا ہو۔ سو میں نے یونین کی ڈیبیٹس میں حصّہ لینا شروع کیا۔ پھر یونیورسٹی میگزین میں لکھنا شروع کیا۔ پھر یونیورسٹی ہی سے اپنا ہفتہ وار پرچہ نکالا۔ پھر دہلی اور بمبئی کے اخباروں میں لکھنا شروع کیا۔ پھر افسانے لکھے۔ پھر کتابیں۔

دوسری وجہ، برٹش سامراج جس نے مجھے پہلے مقرّر پھر جرنلسٹ اور پھر مُصنّف بنا دیا۔ جلیانوالہ باغ والے قتلِ عام سے اگلے برس کا ذکر ہے، میں شاید پانچ چھے برس کا تھا جب ہمارے قصبے کے سیکڑوں بچّوں کو جرنیلی سڑک کے کنارے کھڑا کیا گیا۔ صبح سے شام تک سڑک پر فوج کے گھوڑ سوار رسالے گزرتے رہے اور لال مُنہ کے انگریز سپاہی، ان کی بندوقیں، رائفلیں، سنگینیں، مشین گنیں، توپیں دیکھ دیکھ کر بچّوں کے دل دہلتے رہے اور یہی اس پریڈ کا مقصد تھا کہ بچّوں کے دل میں سامراج کی فوجی طاقت کی دہشت بٹھا دی جائے، مگر نتیجہ اس کا اُلٹ نکلا۔ ایسی ہی ایک پریڈ پنجاب کے ایک اور قصبے میں ہوئی تھی۔ ایک بچّے کے دل میں انگریزی سامراج کے لیے ایسی نفرت بیٹھ گئی کہ بڑا ہو کر وہ دہشت پسند انقلابی بن گیا۔ اس کا نام بھگت سنگھ تھا۔ ہزاروں اور بچّوں نے بڑا ہو کر کسی انگریز پر پستول نہیں چلایا مگر ان کے دلوں میں بھی انقلابی، سیاسی

خیالات پروان چڑھتے رہے۔ ان ہی میں سے ایک یہ بھی تھا۔ میں کمزور تھا، پستول اور بم نہیں چلا سکتا تھا۔ میں نے سوچا سامراج کے خلاف میرا ہتھیار میری آواز ہوگی، میرا قلم ہوگا۔

تیسری وجہ، اٹھارہ برس کی عمر میں مجھے کسی سے محبت ہوگئی (اور باوجود اور بہت سی محبتوں کے وہ پہلی محبت تیس برس بعد اب بھی جوان ہے) اور اکیس برس کی عمر میں مجھے اس محبت میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ایسی حالت میں ناکام عاشق کے سامنے تین راستے ہوتے ہیں یا تو وہ خودکشی کرتا ہے (مگر میں موت سے ڈرتا تھا اور اب بھی ڈرتا ہوں) یا وہ شاعری کرتا ہے اور شراب پیتا ہے (مگر مجھے شاعری سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی اور شراب مجھے کڑوی اور بدبودار لگتی تھی) اور یا وہ افسانے لکھتا ہے اور ان افسانوں میں اپنے ناکام عشق کی داستان کو ڈھال کر اپنے گھائل دل کو تسلی دینے کی کوشش کرتا ہے (سو یہی میں نے کیا)۔

میں نے پوچھا۔ تو کیا تم سمجھتے ہو ہر ناکام عاشق افسانہ نگار بن سکتا ہے؟

اس نے جواب دیا۔ ہر ایک ناکام عاشق افسانہ نگار نہیں بن سکتا، مگر اس کو افسانہ نگار بنانے میں اس کی محبت کی ناکامی بھی مدد کر سکتی ہے۔ اسی لیے میں نے اپنے قلم کار بننے کی تین وجہیں بتائی ہیں۔ ان تینوں کو اپنے ذاتی معاملے سے ہٹا کر ایک عام اصول کی طرح بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ ادب کی تخلیق کے تین محرک ہو سکتے ہیں۔ لکھنے والے کی اپنی انفرادیت اور خودی۔ اس کے اپنے جذباتی تجربات اور حادثات ـــ اور اس کا سماجی، اقتصادی اور سیاسی ماحول۔

میں نے کہا۔ تم اپنی کہانیوں اور ناولوں میں سماجی اور اقتصادی اور سیاسی ماحول پر اتنا زور دیتے ہو شاید اسی لیے لوگ کہتے ہیں تم محض ایک جرنلسٹ ہو ادیب نہیں ہو۔

میری تخلیقات پر لوگ جو لیبل چاہیں لگائیں، مگر وہ وہی ہیں (اور وہی ہو سکتی ہیں) جو میں ہوں۔ اور میں جو بھی ہوں وہ جادو یا کسی معجزے کا نتیجہ نہیں ہے۔ ایک انسان اور اس کے سماج کے عمل اور ردعمل سے تخلیق ہوا ہے۔ انسان کا کیرکٹر ہی نہیں، اس کی قسمت بھی داخلیت اور خارجیت دونوں کے تانے بانے سے بنتی ہے اور اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، چاہے وہ مارکس کا چیلا ہو یا فرائڈ کا پیرو۔ بھلا کون کہہ سکتا ہے کہ زندگی کی بناوٹ میں نفسیات کا تانا زیادہ اہم ہے یا معاشیات کا بانا۔

اب میں اس کی باتوں سے خاصا بور ہو چکا تھا۔ اس لیے میں نے انٹرویو کا آخری سوال پوچھا۔ کیا تم کوئی واقعہ بتا سکتے ہو جس کا تمہارے کیریکٹر اور زندگی پر گہرا اثر پڑا ہو؟

ایسے تو ہزاروں واقعات ہیں۔ ہر ایک کی زندگی میں ہر روز کوئی نہ کوئی چھوٹا بڑا واقعہ ہوتا ہے جو بظاہر ہم بھول جاتے ہیں مگر جو دل اور دماغ پر اپنی انمٹ چھاپ چھوڑ جاتا ہے۔ ان سب کو یاد کرنے اور بیان کرنے کے لیے تو پوری کتاب چاہیے، پھر بھی وہ فوجی بریڈ والا واقعہ تو میں بتا ہی چکا ہوں۔ ایک اور سنائے دیتا ہوں۔ چاہو تو اسے ایک کہانی سمجھو مگر یہ ایک سچی کہانی ہے جس کا عنوان ہے.....

اندھیرے کا ہم راہی

ستمبر یا اکتوبر ۱۹۴۷ء ـــ جب آزاد ہندوستان اور پاکستان میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔

شیواجی پارک کے علاقے میں جو چند مسلمان خاندان رہتے تھے وہ سب اپنے اپنے گھر چھوڑ کر محفوظ "مسلم علاقوں" میں چلے گئے صرف میں اور میری بیوی مجی اپنے سمندر کے کنارے والے فلیٹ میں اکیلے رہ گئے۔

چند سنگھی سورماؤں اور لیگی مجاہدوں نے کوشش کی کہ ڈرا دھمکا کر ہمیں بھی مجبور کیا جائے کہ یہ علاقہ چھوڑ دیں۔ لیکن مجی نے (جو آج اس دنیا میں نہیں ہے) کہا، اگر شیواجی پارک میں ہمارے لیے زندہ رہنا ناممکن ہے تو پھر زندہ رہنا ہی بے کار ہے، اور سو ہم وہیں رہے۔

میں ان دنوں "بمبئی کرانیکل" اخبار میں کام کرتا تھا۔ ایک رات کو میں دادر کے اسٹیشن پر ریل سے اترا، دیکھا بازار سب اندھیرے اور سنسان ہیں۔ کرفیو لگا دیا گیا ہے اور نو بجے کے بعد کسی کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس وقت تقریباً پونے نو بجے تھے۔ میں نے جلدی جلدی قدم بڑھائے کہ کرفیو کے وقت سے پہلے اپنے گھر پہنچ جاؤں۔

راستے میں دادر کی ایک اندھیری گلی میں سے گزر رہا تھا کہ میں نے محسوس کیا کہ کوئی پیچھے چلا آ رہا ہے (میں فطرتاً کوئی بہادر نہیں ہوں۔ اگر میں اس خطرناک زمانے میں اندھیرے اجالے اس طرح اکیلا گھومتا تھا تو اس میں بہادری سے زیادہ ضد کو دخل تھا) میں نے سوچا آج میری موت آگئی، مگر اب تو بھاگنے سے بھی کوئی فائدہ نہیں۔ یہ سوچ کر میں نے اپنے قدم دھیمے کر دیے اور جب مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے بالکل قریب آگیا ہے میں ایک دم ٹھہر کر مڑا۔ ایک لمحے کے لیے وہ بیچارا ڈر کر ٹھٹک گیا کہ شاید میں اس پر حملہ کرنے والا ہوں۔

اس کو اطمینان دلانے کے لیے میں نے پوچھا "کیوں کرفیو لگا ہے کیا؟"

اس نے کہا "ہاں نو بجے کا کرفیو ہے ادھر مگر شیواجی پارک میں نہیں ہے۔"

اب ہم دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے مگر کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے جا رہے تھے۔

"کیوں بھئی تم کہاں جا رہے ہو؟" میں نے

پوچھا۔

"شیواجی پارک۔ اور تم؟"

"میں بھی شیواجی پارک۔"

"وہاں رہتے ہو کیا؟"

"ہاں۔"

"کون ہو تم، نام کیا ہے تمھارا؟"

میں اس سوال کا انتظار کر ہی رہا تھا اور اس سوال سے ڈر بھی رہا تھا۔ اب کیا جواب دوں؟ کہوں کہ میرا نام گوپال راؤ ہے یا موہن لال ہے یا وسنت ڈیسائی ہے اور اگر اس نے جرح شروع کر دی اور بھانڈا پھوٹ گیا تو؟ یا یہ کہوں کہ تم کون ہوتے ہو میرا نام پوچھنے والے۔ اس سے تو اسے شبہ کیا، یقین ہو جائے گا کہ میں اپنا نام چھپا رہا ہوں۔

سو میں نے کہا "میرا نام ہے احمد عبّاس — خواجہ احمد عبّاس۔"

اس نے کہا "تم پیپر میں کام کرتے ہو نا؟"

میں نے کہا "ہاں بمبئی کرانیکل میں۔"

"اور تم ابھی تک شیواجی پارک میں رہتے ہو؟"

میں نے کہا "ہاں کئی برس سے یہیں ہم رہتے ہیں۔"

اور اتنے میں ہم پولیس کے سپاہیوں کی ایک ٹولی کے پاس سے گزر کر شیواجی پارک والی سڑک پر آگئے۔ یہاں کرفیو نہیں تھا۔

میرے ہم راہی نے کہا "میٹنگ میں چل رہے ہو عبّاس بھائی؟"

میں نے پوچھا "کون سی میٹنگ؟"

"سورکشن دل بنا رہے ہیں۔ سب شیواجی پارک کے رہنے والے اکٹھے ہوں گے۔"

میں نے کہا "تو ضرور چلتا ہوں۔"

سو ہم دونوں اکٹھے اس جلسے میں داخل ہوئے۔ سو سوا سو آدمی موجود تھے اور ان میں سے اکثر مجھے جانتے تھے۔

"آؤ آؤ عبّاس بھائی آؤ۔"

چاروں طرف سے آوازیں آئیں۔

تجویز پیش کی گئی کہ اپنے علاقے میں امن قائم رکھنے کے لیے ایک سورکشن دل بنایا جائے۔ کمیٹی کے ممبروں کا چناؤ ہوا۔ پہلا ممبر جس کو چُنا گیا اس کا نام تھا — خواجہ احمد عبّاس۔

اور جن لوگوں نے میرے نام پر اپنے ہاتھ اٹھائے ان میں وہ بھی تھا جس کو چند منٹ پہلے میں اپنا قاتل سمجھ رہا تھا۔

میں نے سوچا جلسے کے بعد اس سے ملوں گا مگر جلسے کے ختم پر جو افراتفری ہوتی ہے اس میں وہ کھو گیا اور آج تک مجھے اس کا نام نہیں معلوم، مگر اس آدمی نے میری زندگی کے ایک نہایت نازک موقعے پر انسانیت میں میرا اعتقاد (جو اس وقت ڈگمگا سکتا تھا) پھر مستحکم کر دیا۔

اور اپنی یادوں کے اندھیرے میں اب بھی اس گمنام، انجانے ہم راہی کے قدموں کی آواز سنتا ہوں اور جب میں مڑتا ہوں اور ہم آمنے سامنے ہوتے ہیں تو اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔

"کون ہو تم؟ نام کیا ہے تمھارا؟"

اور میں بے خوفی اور کسی قدر فخر سے جواب دیتا ہوں۔

"احمد عبّاس — خواجہ احمد عبّاس جو اُنچاس برس ہوئے پانی پت میں پیدا ہوا تھا۔ میرے پڑنانا[1] تھے خواجہ الطاف حالی حسین جن کی "مسدس حالی" کے تین سو ایڈیشن چھپ چکے ہیں، لیکن جنھوں نے کبھی اپنے لیے یا اپنی اولاد کے لیے اس کی رائلٹی کا ایک پیسہ نہیں لیا، کیوں کہ وہ کتاب انھوں نے قوم کو جگانے کے لیے لکھی تھی۔ اس کی بکری سے پیسے بنانے کے لیے نہیں۔ اور میرے باپ تھے غلام السبطین جنھوں نے مجھے سچ بولنا سکھایا، کسی کے سامنے سر نہ جھکانا سکھایا۔ جنھوں نے ایک بار گھر کے نوکر چھوکرے کو "اُلّو کا پٹھا" کہنے کی یہ سزا دی تھی کہ بارہ گھنٹے تک اندھیرے کمرے میں بنا کھانے پانی کے بند کر دیا تھا جب تک میں نے ہاتھ جوڑ کر اس نوکر سے معافی نہ مانگی تھی۔ اور اس طرح انھوں نے مجھے سکھایا تھا کہ سب انسان برابر ہیں۔ کوئی اُونچا اور نیچا نہیں ہے اور جنھوں نے مرتے دم میرے لیے کوئی جائداد نہیں چھوڑی تھی سوائے انسانیت کے چند اصولوں کے اور میری والدہ تھیں مسرورۃ النساء بیگم، جنھوں نے اسکول کالج میں تعلیم نہ پائی تھی، نہ کسی سیاسی پارٹی میں شریک ہوئی تھیں، لیکن جو آخری دم تک — تنگ نظری اور فرقہ پرستی کا شکار نہ ہوئیں اور فسادات کے دنوں میں کتنی ہی تکلیفیں اٹھا کر بھی انسانی دوستی کا دامن نہ چھوڑا، مگر میں اپنے خون کے رشتے داروں ہی کی اولاد نہیں ہوں۔ میں اپنے ملک اور قوم کی بھی اولاد ہوں۔ میرے عزیز اور رشتے دار پاکستان میں تو ہیں ہی مگر انسانیت اور سوشلزم کے ناتے یہ میرے رشتے دار ساری دُنیا میں — امریکہ اور روس میں، انگلستان اور چین اور جاپان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور جو کچھ دُنیا میں ہوتا ہے وہ مجھ پر (اور ہر شخص پر) اثر انداز ہوتا ہے۔ کیوں کہ جیسا کہ ایک یوروپین شاعر جان ڈون (JOHN DONNE) نے کہا ہے:

"کوئی انسان جزیرہ نہیں ہے
ہر انسان سمندر میں ایک قطرہ ہے
ہر انسان زمین کا ایک ذرّہ ہے
ہر انسان کی موت میری موت ہے

---

[1] اکثر کتب و رسائل میں خواجہ احمد عبّاس کو مولانا الطاف حسین حالی کا پوتا لکھا جاتا رہا ہے جو غلط ہے۔ بقول عبّاس وہ حالی کے پڑنواسے تھے۔

کیوں کہ میں اور انسانیت جدا جدا نہیں ہیں"
یہ کہہ کر آخر کار وہ خاموش ہوگیا ،
تب میں نے کہا "بے شک ساری انسانیت
تمھارے اندر سمائی ہوئی ہے ، لیکن یہ نہ بھولو کر اور
کسی سے زیادہ تم پر میرا حق ہے ۔ اگر تم نے کبھی مجھے اپنے
آپ سے جدا کیا تو تم کروڑوں میں سے صرف ایک
اکائی رہ جاؤگے ۔ انسانیت عظیم ہے ۔ اس لیے کہ
ہر انسان کی ایک خودی ہے ۔ کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں
کہ اس خودی میں خدائی بھی ہے ، لیکن تم بھی اتنا
تو مانوگے کہ انسان میں خودی ہے اور ہر خودی میں
ایک انسان ہے ، یعنی تم میں میں ہوں ، جیسے مجھ میں تم ہو"
یہ کہہ کر میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا
اور اس نے میری آنکھوں میں ۔ اور پھر "وہ"
میری نگاہ کے آئینے میں ایسے کھو گیا جیسے "میں" اور
"وہ" کبھی الگ ہوئے ہی نہیں تھے ۔

شرائطِ ایجنسی

ایوانِ اردو دہلی

(۱) ایجنسی کم سے کم دس کاپیوں سے شروع کی جا سکتی ہے ۔

(۲) کمیشن کی شرح :

دس سے پچیس کاپیوں تک	۲۵ ٪
چھبیس سے پچاس کاپیوں تک	۳۰ ٪
اکیاون سے سو کاپیوں تک	۳۵ ٪
سو سے زیادہ کاپیوں پر	۴۰ ٪

(۳) پچاس کاپیاں تک ڈاکخانے سے بھیجی جا سکیں گی ۔

(۴) پچاس سے زیادہ کاپیاں ریل سے ارسال کی جائیں گی اس لیے اگر آپ کا آرڈر پچاس کاپیوں سے زیادہ کا ہے تو اپنے قریب ترین ریلوے اسٹیشن کا نام ضرور لکھیے ۔

(۵) ڈاک سے بھیجے جانے والے پیکٹ کمیشن کاٹ کر باقی رقم کے لیے وی ۔ پی سے ارسال ہوں گے ۔

(۶) ریل سے بھیجے جانے والے بنڈلوں کی بلٹی ڈاکخانے سے بذریعہ وی ۔ پی ۔ ارسال ہوگی ۔ بینک سے نہیں بھیجی جائے گی ۔

(۷) آرڈر کے ساتھ فی کاپی دو روپے بطور زرِ ضمانت بذریعہ منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ جو "سیکریٹری اردو اکادمی دہلی" کے نام ہو بھیجنا لازمی ہے ورنہ ایجنسی کے خط پر غور نہیں کیا جا سکے گا ۔

(۸) زرِ ضمانت دفتر میں محفوظ رہے گا اور کبھی ایجنسی بند کی گئی تو واپس کر دیا جائے گا ۔

(۹) ایجنسی کے دوران میں کسی مہینے وی ۔ پی ۔ واپس ہوئی تو پوسٹیج وغیرہ کا جو نقصان ہوگا ، وہ زرِ ضمانت میں سے منہا کر لیا جائے گا اور ایجنسی بند ہونے پر باقی ماندہ رقم ہی واپس کی جائے گی ۔

(۱۰) جو ایجنسیاں "ایوانِ اردو دہلی" کی کم سے کم سو کاپیاں باقاعدگی سے سال بھر تک منگوائیں گی ، انھیں سال پورا ہونے پر اردو اکادمی دہلی کی شائع کردہ ایک سو روپے قیمت کی کتابیں بلا قیمت تحفتہً پیش کی جائیں گی ــــــ صرف ڈاک خرچ متعلقہ ایجنسی کو ادا کرنا ہوگا ۔

(۱۱) "ایوانِ اردو دہلی" کے پیکٹوں پر پورا ڈاک خرچ ہم ادا کریں گے ۔

ایجنٹ حضرات ان شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ کاپیوں کا آرڈر بھجوائیں اور اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں ہمارا ہاتھ بٹائیں ۔
آپ کی تھوڑی سی کوشش سے "ایوانِ اردو دہلی" آپ کے شہر میں بے حد مقبول ہو سکتا ہے ۔ اتنی کم قیمت میں ایسا معیاری رسالہ اور کوئی نہیں ۔

اردو اکادمی ، دہلی
گھٹا مسجد روڈ ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

عبّاس صاحب

"عبّاس جب انگریزی میں تقریر کرتا ہے تو اس کے چہرے پر انگریزوں کی سی شان آجاتی ہے۔"

"مجھے یقین ہے کہ وہ رٹ کر بولتا ہے۔"

"کیسی بات کہتے ہو۔ ڈبیٹ کا جواب بھی تو دیتا ہے۔ وہ رٹ کر کیوں کر دے سکتا ہے؟"

جب مَیں مُسلم یونیورسٹی میں گیا ہوں تب ڈبیٹ پر دو طالب علم چھائے ہوئے تھے۔ ایک خواجہ احمد عبّاس اور دوسرے نفیس احمد۔ ان میں سے ایک موافقت میں بولتا اور دوسرا مخالفت میں۔ کبھی کبھی ڈبیٹ میں امیر عنایت اللہ بھی آجاتے تھے۔ وہ بھی اہم فرد تھے ڈبیٹ کے۔

یہ زمانہ تھا ۱۹۳۳ء کا جبکہ نمک ستیہ گرہ ہو چکی تھی اور اس سے انگریزی راج کا اور انگریزی کلچر اور زبان کا رعب جو ہندوستان پر تھا گھٹ چکا تھا۔ لیکن مُسلم یونیورسٹی پر ابھی تک وہ رعب کسی حد تک باقی تھا۔ اس وجہ سے یہ بات بھی قابلِ تعریف سمجھی جاتی تھی کہ کون طالب علم انگریزی بولنے میں کتنا انگریز لگتا ہے۔ عبّاس انگریزی بولتے تو تھے فرّاٹے سے اور تلفّظ بھی اچھا ہوتا تھا لیکن وہ کسی انگریز کی جو کہ یونیورسٹی کے تعلیمی اسٹاف میں موجود تھے، نقل نہیں کرتے تھے۔ اس زمانے میں عبّاس کے چچا زاد بھائی خواجہ غلام السیدین ٹیچرز ٹریننگ کالج کے پرنسپل تھے۔ وہ لیڈز یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے اور اسی لہجے میں انگریزی بولتے تھے۔ ان سے عبّاس نے انگریزی بولنا اور تقریر کرنا سیکھا تھا۔

ڈبیٹ میں بولنے کا انداز عبّاس، نفیس اور امیر عنایت اللہ تینوں کا الگ الگ تھا۔ امیر کے انداز میں تو ذرا بناوٹ تھی، لیکن عبّاس اور نفیس کا انداز قدرتی تھا۔ جب کسی یونیورسٹی میں ڈبیٹ کا مقابلہ ہوتا تھا تو وہاں جو طلبا بھیجے جاتے تھے ان میں ان تینوں میں سے ایک ضرور ہوتا تھا۔ اور وہ اکثر و بیشتر انعام لے کر واپس آتا تھا۔ عبّاس نے چار پانچ انعام حاصل کیے تھے۔

مُسلم یونیورسٹی میں ڈبیٹ انگریزی میں ہوا کرتے مگر سال میں ایک بار اُردو میں بھی ہو جاتا تھا۔ اس میں بھی خواجہ احمد عبّاس اور نفیس احمد حصّہ لیتے تھے لیکن اُردو میں ان سے اچھے بولنے والے بھی موجود تھے۔

مُسلم یونیورسٹی کے طلبا جس طرح ہاکی اور کرکٹ کے کھلاڑیوں کی قدر دانی کرتے تھے، اسی طرح اپنے مقرّروں کی بھی قدر دانی کرتے تھے۔ اس وجہ سے عبّاس کی بڑی دُھوم تھی۔ ہوسٹلوں میں ان کی باتیں ہوا کرتی تھیں اور بعض طلبا تو انگریزی بولنے میں ان کی نقل کرتے تھے۔

میری اور عبّاس کی دوستی ذرا دیر میں ہوئی۔ وہ تھے ایم۔ اے اور قانون کے طالب علم اور مَیں تھا بی۔ اے کا طالب علم، یعنی جونیر۔ مُسلم یونیورسٹی میں بھی اور یونیورسٹیوں کی طرح جونیر اور سینیر کا مرتبہ دیکھا جاتا تھا۔ لیکن پھر ہوا یہ کہ سید سبطِ حسن نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور انھوں نے بھی عبّاس کی طرح ایم۔ اے اور قانون ساتھ لیا۔ پھر ان کی عبّاس سے دوستی ہو گئی اور عبّاس ان کے کمرے میں جو کہ آفتاب ہوسٹل میں تھا آنے لگے۔ میرا کمرہ سبطِ حسن کے کمرے سے ملا ہوا تھا اور سبطے سے میرے دوستانہ تعلقات جم چکے تھے۔ اس طرح عبّاس سے میری دوستی ہو گئی۔ بے تکلّفی تو نہیں تھی لیکن رسمی ملاقات سے ہم دونوں کافی آگے تھے۔ یونیورسٹی میں خواجہ احمد عبّاس، عبّاس کہلاتے تھے یا عبّاس صاحب لیکن ان کے قریبی دوست سبطے وغیرہ ان کو اُن کے گھریلو نام باچھو سے پکارتے تھے۔ مَیں عبّاس تک تو پہنچ گیا تھا لیکن باچھو تک نہیں پہنچا تھا۔

جرنلسٹ بھی

اچانک مقرّر عبّاس صحافی بھی بن گئے۔ ان کو جانے کیونکر خبر ملی کہ فلاں ٹرین سے فلاں فلاں کانگریسی لیڈر کسی شہر کے جیل سے کسی دوسرے شہر کے جیل میں منتقل کیے جا رہے ہیں۔ عبّاس اپنے چند دوستوں کو لے کر راستے کے ایک اسٹیشن پر پہنچ گئے اور جیسے ہی ٹرین وہاں سے چلنے لگی، یہ لوگ بھاگ بھاگ کر اس ڈبّے میں گھس گئے جس میں لیڈر تھے۔ پہرے پر جو پولس والے تھے وہ نہ تو ان طلبا کو دھکّے دے کر چلتی ٹرین سے نکال سکے اور نہ مذکورہ لیڈروں کو ان سے گفتگو کرنے سے روک سکے۔ عبّاس نے لیڈروں سے طرح طرح کے سوالات کر کے ایک انٹرویو تیار کر لیا۔ عبّاس کا یہ کارنامہ ایسا تھا جس کا ہر ہر جز طلبا کے لیے حیرت انگیز تھا۔ اس زمانے میں سیاسی قیدیوں کی نقل و حرکت راز میں رہتی تھی۔ عبّاس کو اس کا علم ہو جانا اور پھر ڈبّے میں پہنچ کر لیڈروں سے معقول سوال و جواب کر لینا یہ بڑی بڑی باتیں

حیات اللہ انصاری

۲۴-۲۵ ویسٹرن کورٹ، جن پتھ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱۔

ہیں۔ اس زمانے میں طلبا کے سیاسی معلومات ایسے ناقص ہوتے تھے کہ اگر ان کا کوئی گروہ اتفاق سے اس کمرے میں پہنچ بھی جاتا تو سو میں سے شاید دو ایک ایسے نکلتے جو چند معقول سوال کر سکتے۔

عبّاس کے اس کارنامے کا یونیورسٹی بھر میں چرچا ہوا اور جب ان کا انٹرویو کسی اخبار میں چھپ گیا تو عبّاس صرف طلبا ہی کی نظروں میں نہیں اساتذہ کی نظروں میں بھی بلند ہو گئے۔

اسی زمانے میں ایک موقعے پر کسی نے عبّاس سے پوچھا تم کیا بنو گے؟ انھوں نے کہا جو قسمت بنا دے لیکن جرنلسٹ بننے کو جی چاہتا ہے۔ کسی نے کہا کہ پھر قانون کیوں پڑھ رہے ہو؟ جواب ملا یہ علم جرنلسٹ کے لیے ضروری ہے۔

ہم طلبا میں سے ایسے بہت کم تھے جن کی زندگی کی راہ اس طرح متعین ہو۔ اس جواب سے متعدّد طلبا رشک کھا کر سوچنے لگے کہ کاش ان کے سامنے بھی کوئی ایسا ہی صاف ستھرا مقصد ہوتا۔

عبّاس کے مقصدِ زندگی میں اس وقت صرف جرنلزم ہی نہیں نیشنلزم بھی تھا یعنی وہ اس قسم کے جرنلسٹ نہیں بن سکتے تھے جیسے اس دور کی زبان میں "ٹوڈی" کہا جاتا تھا۔

یونیورسٹی میں ایسے طلبا کی اکثریت تھی جو سرکاری افسر بننا چاہتے تھے۔ ان میں سے چند عبّاس اور سبط حسن کے گروہ میں بھی شامل تھے۔ اس گروہ سے عبّاس کی اکثر مزیدار بحثیں اور جھڑپیں ہوا کرتی تھیں مگر ان میں تلخی کبھی نہیں آتی تھی۔

عبّاس کے خاندان والے چاہتے تھے کہ وہ آئی سی ایس کے مقابلے کے امتحان میں بیٹھیں لیکن انھوں نے اپنے لیے جرنلزم کا میدان پسند کیا تھا۔ بی۔ اے کا امتحان دے کر وہ دہلی چلے گئے تھے اور وہاں اپنے کو ایک انگریزی روزنامہ نیشنل کال میں ٹریننگ پانے والے اسٹاف میں شامل کرا لیا تھا۔ وہاں ان کی ڈیوٹی تھی شہر کے تھانوں میں جا کر جرائم کی خبریں حاصل کر کے ان کی رپورٹ تیار کرنا۔ انھوں نے یہ کام صرف چند مہینے کیا۔ اتنی معمولی ٹریننگ پا کر ایسا اہم انٹرویو حاصل کر لینا کمال تھا۔

عبّاس کے لکھنے کی ابتدا تو بچپن میں ہی ہو چکی تھی۔ کہنے لگے کہ ان کے گھر یعنی مولانا حالی کے خاندان میں پڑھنے لکھنے کا بڑا چرچا تھا۔ عبّاس کے لیے بچّوں کا رسالہ "پھول" منگوایا جاتا تھا۔ ایک دن کسی نے ان سے کہا تم صرف پڑھتے رہتے ہو اور لکھتے نہیں ہو۔ یہ تو حرام خوری ہوئی۔" اس فقرے سے عبّاس کو جوش آ گیا اور انھوں نے کچھ لکھ کر "پھول" کو بھیج دیا۔ وہ چھپ گیا۔ عبّاس کہتے تھے کہ جتنی خوشی ہوئی اس زمانے میں اپنی تحریر کو چھپا ہوا دیکھ کر پھر اتنی خوشی زندگی میں کم نصیب ہوئی۔

ایک بار ایسا ہوا کہ سبطے نے کچھ لوگوں کو چائے پر بلایا۔ اتفاق سے میں اس دن کسی اور کے یہاں چائے پر مدعو تھا۔ ذرا دیر میں سبطے کا پرچہ آیا کہ "فوراً آؤ باچھو (عبّاس) اکیلا پڑ گیا ہے۔" جب میں سبط حسن کے کمرے پر پہنچا تو بڑی گھمسان کی بحث ہو رہی تھی۔

اس واقعے کا ایک خاص پسِ منظر ہے۔ وہ یہ کہ سبطے جب یونیورسٹی میں آئے تو زبردست مذہبی تھے اور طلبا میں مذہب کی تبلیغ کیا کرتے تھے ایکا ایکی وہ اتنے ہی زبردست کمیونسٹ اور مذہب مخالف بن گئے۔

عبّاس معتدل قسم کے مذہبی طالب علم تھے اور ساتھ ساتھ نیشنلسٹ بھی۔ پھر تو ان سے اور سبطے سے بحثیں ہونے لگیں۔ عبّاس سبطے کو اپنے معلوماتی فقروں سے کافی تنگ کیا کرتے تھے۔ جس دن کا یہ قصّہ ہے اس دن کی صحبت میں اختر رائے پوری بھی موجود تھے جو اس زمانے میں بے حد زبردست کمیونسٹ اور اتنے ہی زبردست مذہب مخالف تھے اور بحث میں خوب خوب زہر میں بجھے تیر چلاتے تھے۔

جب عبّاس اختر کے مقابل میں کمزور پڑنے لگے تو سبطے نے کہا "میں تمھارے لیے زبردست کمک ہوتا ہوں" اور انھوں نے مجھے بلوا لیا۔ یہ سبطے کی شرارت تھی کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ میں نیشنلسٹ تو ہوں اور گاندھی جی کو مانتا ہوں اور اس حد تک تو عبّاس کا ساتھی ہوں لیکن میں مارکس کو بھی مانتا ہوں۔ اس لحاظ سے عبّاس سے دو رہوں۔ سبطے کی صحبت میں میرے پہنچ جانے سے عبّاس کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا البتہ بحث چوتی ہو گئی۔ یعنی کبھی ادھر ڈھلک جاتی تو کبھی ادھر۔ کیونکہ ابھی تک میرے ذہن میں گاندھی اور مارکس کا نقطۂ اتحاد تعمیر نہیں ہوا تھا۔ اس موقعے پر عبّاس کی معلومات جس طرح ہم لوگوں کے سامنے آئیں اس کا بڑا رعب پڑا۔ وہ بتاتے رہے کہ گاندھی جی نے فلاں موقعے پر کیا کہا اور کیا کیا؟ اور یہ کہ انقلاب روس میں فلاں وقت کیا ہوا تھا اور لینن نے اس موقعے پر کیا کہا تھا؟ اس سے ہم لوگ سمجھے کہ عبّاس پیدائشی جرنلسٹ ہیں۔

ترقّی پسندی

کچھ دنوں کے بعد ہم لوگوں نے کمیونزم کے مطالعے کے لیے ایک خفیہ اسٹڈی سرکل بنائی جس کے گرو تھے ڈاکٹر اشرف۔ عبّاس اس میں شامل نہیں ہوئے مگر آگے چل کر تین سال کے بعد جب انجمن ترقّی پسند مصنّفین وجود میں آئی تو عبّاس اس میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء کے فسادوں پر عبّاس نے ایک مضمون لکھا جس میں کہہ دیا کہ فسادوں کا اصل سبب عوام کی فرقہ پروری تھی۔ اس پر ترقّی پسند مصنّفوں کی ایک کانفرنس میں عبّاس کی زبردست کھنچائی ہوئی یہاں تک کہ ان کے خلاف

ب رزولیوشن بھی باضابطہ پاس کیا گیا۔ پھر عباس نے
نی غلطی کا اعتراف کرلیا اور مان لیا کہ عوام بے قصور تھے۔
مروہ معاف کر دیے گئے۔ اس کے بعد وہ ترقی پسند تو
ہے لیکن ڈھیلے ڈھالے۔ ایسے کہ گاندھی جی اور جواہرلال
، کو بھی مانتے رہے اور مذہبی بھی رہے اور کمیونسٹ
رٹی کی خوبیوں کے بھی قائل رہے

ستند جرنلسٹ

یونیورسٹی کے اولڈ بوائز نے یہ محسوس کرکے
ر یونیورسٹی کے طلبا کا زور فیشن پر بڑھ گیا ہے
ور علم پر گھٹ گیا ہے، آفتاب ہوسٹل قائم کیا تھا،
ہاں اچھی لیاقت کے طلبا داخل کیے جاتے تھے۔ اس
ی ایک الگ یونین بھی بنادی گئی جس کا نام تھا
فتاب مجلس۔ اس کا پہلا صدر منتخب مَیں ہوا۔ اسی
ِمانے میں خبر آئی کہ دہلی میں کانگریس اعلا کمان کا
ِلسہ ہو رہا ہے اور جواہرلال جی آئے ہوئے ہیں۔ مَیں
ے پروفیسر حبیب سے جو آفتاب مجلس کے نگراں تھے
ہا کہ آفتاب مجلس کی طرف سے جواہرلال جی کو کیوں نہ
لایا جائے کہ آکر ہم لوگوں کو خطاب کریں۔ حبیب صاحب
کو یہ خیال پسند آیا اور انھوں نے جواہرلال جی کو
ط لکھا کہ حیات اللہ صاحب آفتاب مجلس کے جس کا
یں نگراں ہوں، صدر ہیں اور یہ آپ کو یہ دعوت دینے
رہے ہیں کہ آپ آفتاب مجلس کو خطاب فرمائیں۔ خط
ے کر مَیں دہلی گیا اور جواہرلال جی سے ملا۔ انھوں نے
لی گڑھ آنا منظور کرلیا۔ مَیں نے فوراً حبیب صاحب کو
نار دے دیا۔ تار پاکر حبیب صاحب نے وائس چانسلر
سر سید راس مسعود سے بات کی۔ ان کو پسند نہیں آیا
جواہرلال جی کا بُلایا جانا۔ مگر اب تو وہ آہی رہے تھے۔
اس لیے انھوں نے حبیب صاحب سے کہا کہ (۱) یہ
جلسہ آفتاب ہال میں نہیں، اسٹریچی ہال میں، جو کہ
اس زمانے میں یونیورسٹی کا سب سے اہم ہال تھا،
منعقد ہوگا۔ (۲) وہ خود جلسے کی صدارت کریں گے، (۳)
جواہرلال جی کی تقریر انگریزی میں ہوگی (۴) اور شہر
میں جلسے کا اعلان نہیں کیا جائے گا۔ ساتھ ساتھ انھوں
نے اخباری نمائندوں کو شرکت کی اجازت نہیں دی۔
وائس چانسلر صاحب کا ذہن اس بات کی طرف نہیں
گیا کہ خود یونیورسٹی میں ایک نوخیز عمدہ جرنلسٹ
موجود ہے یعنی عباس۔ ہوا یہ کہ اس جلسے کی رپورٹ
عباس نے تیار کی جو دہلی کے ایک بڑے اخبار میں اور
بمبئی کرانیکل میں شایع ہوگئی۔ اوّل تو اس جلسے کے
بارے میں کوئی اور رپورٹ تھی ہی نہیں اور دوسرے
یہ کہ رپورٹ بہت اچھی بھی تھی۔ اس کارنامے سے
عباس مستند جرنلسٹ قرار پا گئے۔

عباس یونیورسٹی سے تکمیل کرکے بمبئی چلے گئے
اور بمبئی کرانیکل کے اسٹاف میں شامل ہوگئے لیکن
اس زمانے میں انھوں نے دو اور کام کیے۔ ایک تو فلمی
کہانیاں لکھنے لگے اور دوسرے یورپ اور امریکہ کا
ایک سفر کر ڈالا۔ اور وہاں سے واپس آکر سفرنامہ لکھا
جو فوراً ہی شایع ہوگیا۔ اور چند اخباروں میں اس
پر اچھے تبصرے ہوئے۔

سفرنامہ

اس وقت تک جو صحافتی سفرنامے آئے تھے،
ان میں سے مَیں نے دو ایک پڑھنے کی نیت سے اُٹھائے
تھے لیکن وہ چلے نہیں۔ عباس کا سفرنامہ ایسا گھریلو
سا لگا کہ مَیں نے چند نشستوں ہی میں پڑھ ڈالا۔ میرا
خیال ہے کہ وہ کافی مقبول بھی ہوا۔

اس زمانے میں ایک بحث زوروں سے چل
رہی تھی وہ یہ کہ ملک کی اقتصادی حالت اگر بہتر
ہو سکتی ہے تو صرف آزاد تجارت سے جس میں مقابلہ
ہوتا ہے اور ہر تاجر سستے سے سستا مال فروخت
کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یعنی ایڈم اسمتھ کا نظریہ
لیسی فیر صحیح ہے۔

ہم لوگ جو سوشلسٹ خیالات کے تھے وہ اس
نظریہ کا نظریاتی جواب دیتے تھے عباس نے اپنے سفرنامے
میں لکھا کہ امریکہ میں بازار کے بازار ایسے ہیں جنھوں نے
طے کر رکھا ہے کہ قیمت میں مقابلہ نہیں ہوگا۔ یہ ایک
نیا پہلو سامنے آیا، ایڈم اسمتھ کے نظریے کے جواب
کا۔ یعنی یہ کہ کاروبار میں لوگ مقابلے کے نقصانات
سے بچنے کے لیے مقابلے کا مقابلہ ہی کرسکتے ہیں۔

جب جان گنتھر کی دو کتابیں ان سائڈ یورپ
اور ان سائڈ ایشیا آگئیں تو انھوں نے صحافتی
سفرناموں کا معیار جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔
پھر آئی ورڈکٹ آن انڈیا مصنفہ بی ورلی نکلس۔
یہ کتاب تھی تو تعصب سے بھری ہوئی لیکن لکھنے کا
انداز کچھ ایسا دلنشین تھا کہ پڑھنے والے کو سفر اور
مشاہدے دونوں کا لطف ملتا چلا جاتا تھا۔ اس کے
بعد تو سفرناموں کی بارش ہونے لگی۔ اس طوفان میں
کون ٹکتا؟ پھر یورپ اور امریکہ میں تو روز حالات
بدلتے رہتے تھے۔ اس وجہ سے عباس کے سفرنامے کا
دوسرا ایڈیشن شایع نہیں ہوا۔ اور نہ اُردو ترجمہ
شایع ہوا جیسا کہ عباس کا ارادہ تھا۔

ایک ناکام تجربہ

عباس نے ایک ہندی میگزین بھی نکالا تھا
جو کچھ دنوں چل کر بند ہوگیا۔ مگر اس نے یہ ثابت
کر دیا کہ عباس ہندی لیکھک بھی بن سکتے تھے۔ ہندی
والوں نے مجھے بتایا میگزین چل سکتا تھا لیکن عباس
کو فلم والوں سے اشتہارات کی جو توقع تھی وہ پوری
نہیں ہوئی اور دوسری بات یہ کہ وہ تقاضے کرکے
نادہندہ ایجنٹوں اور اشتہار والوں سے
روپیہ وصول کرنے کا فن نہیں جانتے
تھے۔

فلمی کہانیاں

عبّاس نے فلمی کہانیاں لکھنا شروع کیں تو بمبئی ٹاکیز پر چھا گئے۔ ان کی تمام کہانیاں کامیاب ہوتی تھیں۔ جب بمبئی ٹاکیز ختم ہوگئی تو عبّاس کی کہانیوں کو راج کپور فلمانے لگے جن میں سے بعض تو زبردست ہٹ ہوئیں۔

لیکن عجیب بات تھی کہ عبّاس کی فلمی کہانیاں دوسرے کے ہاتھوں میں تو ہٹ ہوتی تھیں مگر جب وہ خود بناتے تھے تو ناکامیاب ہوتی تھیں۔ حالانکہ متعدد ایکٹر اور ایکٹرس عبّاس کی فلموں میں شوق سے رعایتی اُجرت پر کام کرتے تھے۔ اور موسیقی والے تو سب ہی ان کا کام کرنے کو ہر وقت تیار رہتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود عبّاس کی بنائی ہوئی کوئی فلم کامیاب نہیں ہو سکی۔ ایک فلم "آسمان محل" کے بارے میں سنا ہے کہ اس سے کچھ آمدنی ہوئی تھی۔ مگر اس کی کامیابی میں خاص دخل تھا پرتھوی راج کی ایکٹنگ کا۔

عصمت صاحبہ عبّاس کو اس بات پر کافی چھیڑا کرتی تھیں کہ تمھاری کہانی جب دوسروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے تو پھول کھلاتی ہے مگر جب تمھارے ہاتھ میں آتی ہے تو کانٹے چبھوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ عبّاس بہت حقیقت پسند آدمی تھے مبالغے کو ناپسند کرتے تھے اور اس اصول پر عمل کرتے تھے کہ باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیّاد بھی۔ وہ کہنے کو تو کمیونسٹ اور ترقی پسند تھے لیکن ساتھ ساتھ مذہبی بھی تھے۔ اس مزاج کی بنا پر ان کی بنائی ہوئی فلموں میں "ولین" کبھی پکّا ولین نہیں بن سکا اور اس وجہ سے ہیرو بھی زیادہ بلندی تک نہیں جا سکا۔ اس طرح ان کی فلموں میں کشمکش مدھم رہتی تھی۔

ان کا ناول "انقلاب" بھی اسی وجہ سے ایک خاص سطح سے بلند نہ ہو سکا۔ وہ اس حد تک ہموار ہے، اس کے کردار بڑے بڑے حادثوں سے چپ چاپ گزر جاتے ہیں گویا کہ وہ روزمرّہ کی باتیں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ناول اپنی حقیقت پسندی کی وجہ سے پُراثر اور دلنشیں ہے۔

ایک واقعے سے عبّاس کے مزاج کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایک زمانے میں ان کے پاس ایک ایسا مکان تھا جس سے آ آکر سمندر کی لہریں ٹکراتی تھیں اور ایک خاص موسم میں چاندنی رات میں اس کا نظارہ بڑا پیارا ہوتا تھا۔ ایک بار عبّاس نے ایک ایسی ہی رات کو چند دوستوں کو کھانے پر بلایا۔ اس زمانے میں میری ایک فلمی ڈائرکٹر اور ایک پروڈیوسر سے اپنی کہانی کے بارے میں باتیں چل رہی تھیں۔ دونوں میں ایک بمبئی میں رہتا تھا اور دوسرا بمبئی کے ایک دُور دراز علاقے میں۔ فون پر یہ طے پایا کہ عبّاس کے گھر کھانے کے موقعے پر دس منٹ کے لیے ہم تینوں الگ جا کر گفتگو کر لیں گے۔ عبّاس کے گھر جا کر ایسا ہی کیا۔ ساڑھے آٹھ بجے رات کو ہم تینوں پہنچے تھے اسی وقت باتیں شروع کر دیں۔ لیکن باتیں اتنی لمبی شروع ہوگئیں کہ گیارہ بج گئے۔ عبّاس اور سب مہمان گھبرا گئے۔ ہم لوگوں نے جب گفتگو ختم کی تو بہت شرمندہ تھے کہ ہماری وجہ سے عبّاس کی پارٹی خراب ہوگئی۔ اور دوستوں میں پہنچ کر معذرت کرنے لگے۔ عبّاس نے صرف اتنا کہا۔

"جو ہوا سو ہوگیا۔ آیندہ آئیے تو ایسا نہ ہو۔"

عبّاس کی تیوری پر بل تک نہ تھے۔ حالانکہ میرے دونوں ساتھیوں کا خیال تھا کہ اگر ان کے ساتھ کسی نے ایسی حرکت کی ہوتی تو وہ باقی مہمانوں کو کھانا کھلا کر رخصت کر دیتے اور اس طرح دیر کرنے والوں کو شرمندہ کرتے۔

پیوپلس تھیٹر

عبّاس نے پیوپلس تھیٹر کے ڈرامے بھی ڈائرکٹ کیے۔ لیکن ان کی ڈائرکٹ کی ہوئی فلموں کے برخلاف وہ کامیاب رہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ڈراموں میں جو لوگ پارٹ کرتے تھے وہ اصرار کرتے تھے کہ "اپنے انداز پر ایکٹنگ کریں گے" اور عبّاس کی ہدایات کی زیادہ پروا نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ عبّاس اور بلراج ساہنی میں میرے سامنے بحث ہو رہی تھی۔ بلراج کا اصرار تھا کہ میں اپنا پارٹ اسی طرح کروں گا۔ پھر شاید علی سردار جعفری نے عبّاس کو راضی کر دیا کہ جس طرح ساہنی کہہ رہے ہیں اسی طرح ان کو چلنے دو۔ ساہنی کا پارٹ کافی پُراثر رہا۔ یہ ڈراما تھا "دھرتی کے لال"

میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا کہ عبّاس اتنے بھانت بھانت کے کام جن میں سے ہر ایک بہاڑ پہاڑ ہوتا تھا کیوں کر کھٹا کھٹ کر ڈالتے ہیں۔ اخبار کے لیے مضمون لکھا، پھر فلم کے لیے کہانی لکھی۔ پھر جا کر ڈراما ڈائرکٹ کیا۔ وہاں سے نکل کر ترقی پسند ادب کے جلسے میں تقریر کی۔ اور پھر کسی فلم کا آزمائشی شو دیکھا۔ وہاں سے اُٹھ کر سیاسی دوستوں سے بحثیں کیں۔ اس طرح آدھی رات کے بعد گھر پہنچے۔

میں نے ایک دوست سے جو ادبی اور صحافی دوستوں کی عشق بازی کے قصّے سنا رہے تھے، پوچھا کہ عبّاس بھی کبھی رومان کا شکار ہوا ہے؟ وہ قہقہہ لگا کر بولے۔

"وہ سالا رومان کیا چلا سکتا ہے۔ اپنی محبوبہ کے پاس جائے گا تو صرف ساٹھ منٹ نکال کر۔ اور اس کو بھی اس طرح خرچ کرے گا۔ اور پندرہ منٹ پہلے اُٹھ آئے گا کہ کہیں شوٹنگ میں دیر نہ ہو جائے اور جلدی کی وجہ سے چلتے وقت کس ادھورا چھوڑ دے گا۔"

ایسا سوچتے تھے عبّاس کے دوست ان کے بارے میں۔

۱۹۴۲ء کے آخر سے ۱۹۴۳ء تک بمبئی سے ایک خفیہ براڈکاسٹ ہوتا تھا جس میں حکومت کے ان مظالم کا تذکرہ کیا جاتا تھا جو وہ قوم پرست تحریک کے دبانے کے لیے کر رہی تھی۔ خفیہ ریڈیو کے اصل کارکنوں کو میں نہیں جانتا تھا۔ ایک دوست کی معرفت مجھے اس کا رپورٹر بنا دیا گیا اور ہدایت کی گئی کہ اس کام کے لیے آپ کو اپنا نام اور بھیس بدل کر جانا ہوگا اور یہ کہ اگر آپ پکڑے گئے تو سارا انتظام خطرے میں پڑ جائے گا۔ یہ کام بالکل نئی قسم کا تھا۔ اس لیے مجھے کچھ مشورے کی ضرورت ہوئی۔ میں نے اس کے لیے عبّاس کو چُنا، حالانکہ اس زمانے میں وہ ان لوگوں سے قریب تھے جو جنگ کو عوامی جنگ مانتے تھے اور کانگریس کو غدّار۔ لیکن میں نے ان پر بھروسا کیا۔

میں نے عبّاس سے پوچھا کہ یہ بتاؤ کہ آج کل ایسے لوگ کافی ہیں جو بنتے تو ہیں کانگریسی لیکن ہوتے ہیں سرکاری مخبر۔ ان کو کیوں کر پہچانا جائے۔ عبّاس نے عجیب مشورہ دیا۔ کہنے لگے:

"ایسے لوگوں کے پاس پیسہ آجاتا ہے تو ان میں شان آجاتی ہے۔ عام طور سے وہ اس قیمتی برانڈ کا سگریٹ پینے لگتے ہیں جو ان کے آئی۔سی۔ایس۔ آقا پیتے ہیں۔" عبّاس نے ایسے سگرٹوں کے نام مجھے بتا دیے۔ پھر کہا کہ "آپ سگریٹ نہیں پیتے ہیں اس لیے برانڈ پہچاننے کا طریقہ یہ رکھیے گا کہ ایسے لوگ اس بات کو دکھانا بھی چاہتے ہیں کہ وہ ایسا ایسا سگریٹ پیتے ہیں۔ وہ آپ کو سگریٹ ضرور پیش کریں گے۔ آپ قبول کر لیجیے گا۔ اور پھر برانڈ دیکھ لیجیے گا۔"

میں اس جادو بھری پہچان سے فائدہ نہیں اُٹھا سکا۔ کیونکہ میں ان لوگوں سے ملتا رہا جو بیڑی پیتے تھے۔ اور بیڑی میں عجیب بات یہ ہوتی ہے کہ معمولی آمدنی والے لوگ اگر دولت مند ہو جاتے ہیں تب بھی اگر بیڑی پیتے تھے تو وہی پیتے رہتے ہیں۔

عبّاس کے ایسے مشوروں میں یہ بھی تھا کہ چہرہ بدلنا تو ممکن نہیں۔ ایسی باتیں تو صرف فلموں میں چلتی ہیں۔ اگر آپ داڑھی مونچھ رکھ لیں اور بال دوسری طرح بنا لیں اور لباس بدل لیں تو لوگوں کو پہچاننے میں کافی دُشواری ہوگی۔ اصل تبدیلی تو ہوتی ہے لباس بدلنے میں۔ مثلاً آپ اگر سُوٹ پہنیں اور مونچھیں رکھ لیں تو جاننے والے بھی پہلی نظر میں نہیں پہچانیں گے۔

عبّاس کے سیاسی خیالات کا کچھ اندازہ اس واقعے سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ جب میں دس دن کے بعد بلیا کی خبر لے کر بمبئی آیا تو عبّاس نے مجھ سے ملاقات کی اور وہاں کی خبریں پوچھیں اور یہ بھی پوچھا کہ کن ذرائع سے خبریں ملیں۔ میں نے کہا کہ بنارس پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ بلیا کے خاص خاص لوگ پولیس سے بچنے کے لیے بنارس اور دوسرے شہروں میں آگئے ہیں۔ میں نے ان سے ملاقات کرکے سب ضروری باتیں تفصیل سے معلوم کر لیں اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اب بلیا شہر میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو کٹی کٹی خبروں کے علاوہ کچھ اور بتا سکے۔ پھر میں نے بلیا شہر کا ایک چکر اس غرض سے لگا لیا تاکہ حادثات کے محل وقوع کو دیکھ لوں اور شہر پر جو اثرات رہ گئے ہیں ان کا اندازہ کر لوں۔ عبّاس نے کہا کہ رپورٹ کی ایک نقل ان کو بھی دے دی جائے۔ وہ نقل میں نے دے دی۔ لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ انھوں نے وہ کس طرح استعمال کی۔ یہ واضح رہے کہ یہ وہ زمانہ ہے جب کمیونسٹ پارٹی بلیا کے قسم کے انقلابوں کی مذمت کرتی تھی۔ **لیکن عبّاس ان کو اسی طرح سراہتے تھے جیسے میں سراہتا تھا۔**

برسوں ہوئے جب عبّاس بُلٹز سے وابستہ ہو گئے۔ اور اس کا آخری صفحہ آخر تک لکھتے رہے ہر ہفتے ایک صفحہ لکھنا وہ بھی ایسا جس میں یہاں وہاں کی باتیں اور ان پر تبصرے ہوں۔ ساتھ ساتھ اس میں رنگینی بھی اور چٹخارے بھی ہوں، یہ بے حد مشکل کام ہے کیوں کہ لکھنے والے کا مزاج ایک نہیں رہتا ہے۔ اس پر دھوپ چھاؤں بھی آتی رہتی ہے اور سردی اور گرمی بھی۔ لیکن عبّاس نے یہ کام برسوں نبھایا اور کبھی اس کالم کو اپنے قایم کیے ہوئے معیار سے گرنے نہ دیا۔

عبّاس کے ایک دوست کہنے لگے کہ عبّاس اپنے مخالفوں کو کاٹنا نہیں جانتے۔ پھر کہنے لگے کہ فلمی دنیا میں زبردست سیاست چلتی ہے۔ اگر عبّاس سیاست کے ماہر ہوتے تو وہ آج لکھپتی ہوتے۔

عبّاس میں جو استغنا تھا اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ امریکہ کے سفر میں عبّاس کا پاؤں وہاں کے کسی اسکیلیٹر میں دب گیا تھا۔ لوگوں نے مجھے بتایا کہ اس کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ اسکیلیٹر میں کوئی نقص تھا۔ اگر عبّاس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس خرابی کا ہرجانہ وصول کرنے کے لیے مقدمہ چلاتا اور لاکھوں وصول کر لیتا لیکن عبّاس مقدمہ بازی کے جھگڑے میں نہیں پڑے اور ستائیس ہزار روپے [illegible] کر پاؤں کا علاج کراتے رہے۔ آخر آپریشن کرانا پڑا۔

عبّاس کی مسلسل محنت کا پھل ہیں ان کی ستر کتابیں جبکہ سن ہوا ہے صرف تہتر سال کا۔

ایک سال ہوا عبّاس کو میرے دوستوں نے استقبالیہ دیا تھا اس میں ان سے ملاقات ہوئی تھی مجھے ایسا لگا جیسے کہ ان پر ایک نامعلوم سی تھکن طاری ہے اور یہ محسوس کرکے دُکھ ہوا۔ کیونکہ دل نے کہا کہ شاید اب ان سے ملاقات نہ ہو۔ وہی ہوا حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کا منٹ منٹ تصنیف میں صرف کر دیا۔ ہمارے لیے ان کی ساری زندگی موجود ہے ان کی کتابوں میں۔ جب چاہیں ان کی معرفت عبّاس سے ملاقات کر سکتے ہیں۔ بقول وکٹر ہیوگو کے "ہمارے محبوب مر کر غائب نہیں ہو جاتے ہیں، صرف نظر نہیں آتے ہیں۔"

پاچھو اور مجّی

مدینۂ منورہ میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلّم کے میزبان حضرت ابو ایّوب انصاری جدِ اعلےٰ۔ ان کی اولاد میں تھے خواجہ عبداللہ جو پیر ہرات کہلاتے تھے اور والیِ ریاست کی طرف سے رشد و ہدایت کے منصب پر بھی فائز تھے ان کے دو بیٹے ہندوستان آ گئے تھے۔ ایک بیٹے کا نام ملک علی تھا یہ بڑے عالم فاضل اور قابل انسان تھے۔ بادشاہِ وقت نے قدر و منزلت کی اور پانی پت میں بڑی زمین جائیداد جسے "معافی" کہتے تھے عنایت کی اور ساڑھے سات سو سال تک ان ملک علی کی اولاد پانی پت کے مشہورِ عالم شہر میں آباد رہی اور ایک سے بڑا ایک عالم فاضل، صوفی، مجتہد، شاعر اور ادیب اس خانوادے میں پیدا ہوتا رہا۔۔ ان کے ایک بیٹے کا نام خواجہ ایزد بخش تھا۔ ان کی اولاد نے اس شہر، اس ملک اور بعض نے دُنیا کے بڑے حصّے میں اپنا نام مشہور کیا انھی خواجہ ایزد بخش کی اولاد میں الطاف حسین حالی بھی ہیں جو خواجہ احمد عبّاس اور مجتبائی خاتون کے پرنانا تھے۔ اسی خاندان میں خواجہ غلام الحسنین اور خواجہ غلام الثقلین پیدا ہوئے عبّاس کے بڑے چچا، اور اسی گھر میں خواجہ غلام السبطین نے جنم لیا، عبّاس کے والد، اسی کو خواجہ سجّاد حسین نے چار چاند لگائے، عبّاس اور مجّی کے نانا۔۔۔ اسی قصبے کی خاک سے خواجہ غلام السیّدین نے جنم لیا۔ عبّاس کے بڑے (چچا زاد) بھائی اور مجّی کے خالہ زاد بھائی ۔۔ نہایت نیک شریف اور اپنے زمانے کی پڑھی لکھی خاتون عبّاس کی والدہ مسرور جہاں حالی کی پوتی، مجّی کی والدہ صدیقہ خاتون حالی کی پوتی... یہ ایک بہت بڑا خاندان تھا۔ سینکڑوں افراد پر مشتمل جو شیر و شکر کی طرح گھلا ملا رہتا تھا۔ عبّاس کے چچا کے دو بیٹے تھے مگر خود عبّاس اولادِ نرینہ میں غلام السبطین کا اکلوتا بیٹا تھا (تین بیٹیاں تھیں) مجتبائی کے صرف دو بہنیں تھیں ایک بڑی، ایک چھوٹی اِس کے والد خواجہ احمد حسین بھی حالی کے قریبی عزیز تھے اور اس کے دادا خواجہ تصدق حسین اپنے زمانے کے بڑے تعلیم یافتہ انسان تھے۔ اور اس دور میں بھی کے عہدے تک پر فائز ہوئے تھے قابلیت کے ساتھ دیانت داری میں دُور دُور مشہور تھے۔ حالی کے پروردہ اور محبوب بھتیجے تھے! لیکن افسوس کہ بیٹے باپ پر بالکل نہ گئے ۔۔ مگر مجّی کی ماں میں اپنے خاندان کی بہت سی خصوصیات بڑی خوبی سے سموئی ہوئی تھیں۔ ان کی پرورش بڑی بہن نے کی تھی کہ ان کی والدہ ان کے بچپن ہی میں فوت ہوگئی تھیں اور یہ پس منظر یا بہت مختصر خاندانی تعلّق کا خاکہ پاچھو[2] اور مجّی[3] کا۔ آگے میں اپنے خاندان کے ان گُم شدہ گوہر نایاب کی تھوڑی کہانی سنانا چاہتی ہوں جن کا تصور اب اگر میرا دل خون کرتا ہے تو میرے دماغ اور ذہن کو ناز اور غرور سے بھی بھر دیتا ہے کہ ایسے تھے یہ میرے دونوں بھائی بہن (بھائی۔ بھاوج بھی)

ان دونوں میں عمر کا چھ یا سات برس کا فرق تھا۔ عبّاس خاندان بھر کا بے حد لاڈلا! خوبصورت گورا چٹّا، مزاج کا تیز، ذہین، اپنی بات پر اڑ جانے والا جسے ضدی بچہ کہا جاتا ہے! مجّی ایک سانولی سلونی، بے حد بھولی بچّی جس کے چہرے کی دلکشی عمر کے ساتھ بڑھتی گئی۔ کم گو اور نرم آواز جس کی زبان کی شیرینی، غیر معمولی ذہانت **صدف میں موتی** کی طرح چھپی ہوئی رفتہ رفتہ ظاہر ہوئی۔!

عبّاس ننھیال ددھیال **دونوں کا لاڈلا** پیارا بیٹا جس پر صرف باپ تنبیہہ کر سکتے تھے سگی خالہ کے صرف ایک لڑکی تھی جس کے باپ حالی کے نواسے تھے اور ماں حالی کی پوتی۔ حالی یوں تو خاندان میں سب کو چاہتے تھے مگر لڑکیوں کو جن میں خاندان بھر کی لڑکیاں شامل تھیں بے حد محبّت کرتے۔ تربیت کرتے اور تعلیم کی کوشش! سیّدین، عبّاس، مجّی کی مائیں انھیں میں تھیں۔ حالی دُنیا سے چلے گئے تو ہم میں سے کوئی بھی باشعور نہ تھا۔ سوا سیّدین صاحب اور میری **دونوں بڑی بہنوں** کے۔ میں دو سال کی پاچھو سال بھر کا تھا۔ مجّی پیدا بھی نہ ہوئی تھی۔

مجّی نے اپنی ماں کی بہت سی صفات ورثے میں پائی تھیں اور عبّاس نے باپ کی اور ماں دونوں کی مگر سب سے زیادہ اثر اس نے اپنے بھائی سیّدین صاحب کا قبول کیا تھا جس کا اس نے اپنی خود نوشت ہی میں نہیں بہت سے مضامین میں بھی ذکر کیا ہے!

صالحہ عابد حسین

عابد ولا، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

---

۱ والدہ غلام السیّدین

۲ عبّاس کا پیار کا نام۔

۳ مجتبائی خاتون کا پیار کا نام۔

بچپن کے دور سے نکلتے ہی پانی پت کے حالی مسلم اسکول میں بچّے کو داخل کیا گیا جو حالی کے بیٹے خواجہ سجّاد حسین نے ان کی یاد اور نام پر قائم کیا تھا اور پانی پت بھر میں جھولی پھیلا پھیلا کر اس کے لیے "بھیک" مانگی تھی۔ اسکول اگرچہ مالی لحاظ سے غریب تھا مگر اس کے کرتا دھرتا ماہر تعلیم خواجہ سجّاد حسین، اس کے ہیڈ ماسٹر سرحد کے شاہ عالم خاں جن کا ذکر سیدین صاحب نے بہت احترام سے کیا ہے۔ اس کے اُستاد خواجہ غلام الحسنین عربی، فارسی، انگریزی، اُردو کے ماہر اور عالم دین اور دوسرے بہت سے۔ ایسے اُستاد جن کا ثانی اب ڈھونڈو بھی تو نہ ملے گا — شاید آج کے پبلک اسکول اس کا مقابلہ نہ کر سکیں — میٹرک تک کا یہ غریب اسکول — جس کا اب نام بھی صرف خاندان کی لکھی کتابوں میں باقی رہ گیا ہے — کیا تھا؟ ملک بھر کے تعلیم یافتہ بڑے بڑے عالم فاضل اس کی قدر کرتے تھے۔ جس اسکول سے خواجہ غلام السیدین اور خواجہ احمد عباس جیسی دُنیا میں شہرت پانے والی ہستیاں پیدا ہوں اس کے لیے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔

یہی اسکول تھا جہاں کم سن باچھو نے اپنے دِل میں مُلک کی آزادی کی للک اور غلامی کی لعنت کی ذلّت کو محسوس کیا تھا — یہی اسکول تھا جہاں اس نے لکھنے کے ساتھ تقریر کرنا بھی شروع کر دیا تھا، یہی اسکول تھا جہاں اس نے امیر غریب، بڑے چھوٹے، چھوٹی ذات، بڑی ذات کی تفریق مِٹتے دیکھی تھی، یہی اسکول تھا جہاں اس نے اپنے بزرگوں سے ہندوستان کی تابناک تاریخ سُنی تھی اور غلامی کی لعنت کے اثرات سے واقف ہوا تھا — ہاں یہی حالی مُسلم ہائی اسکول تھا جہاں خواجہ احمد عبّاس کے مستقبل کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تھا!

اور پھر جب ۱۹۲۶ء میں سیدین صاحب علی گڑھ ٹریننگ کالج کے پرنسپل ہو کر علی گڑھ چلے گئے تو خاندان کے بہت سے لوگ ان کے ساتھ تھے۔ جن میں لڑکے لڑکیاں سب سے زیادہ خوش اور پُرجوش تھیں۔ وہ گھر ایک بورڈنگ ہاؤس تھا۔ باہر بڑے سے کمرے میں بہت سے لڑکے اور اندر لڑکیاں اور بزرگ خواتین اور سیدین کی والدہ حالی کی پوتی اس "زنانہ" "مردانہ" بورڈنگ کی کرتا دھرتا۔

باچھو سب سے چھوٹا تھا حالی مُسلم ہائی اسکول سے اعلےٰ نمبروں میں مڈل پاس کر کے آیا تھا۔ اُسے علی گڑھ یونیورسٹی کے ہائی اسکول کی نویں کلاس میں داخل کر دیا گیا جہاں اس وقت سیّد بشیر حسین زیدی کیمبرج سے بیرسٹری کرنے کے بعد ہیڈ ماسٹر تھے۔

اور اسی اسکول ہی سے اس کے جوہر کھلنے شروع ہوئے۔ تقریر کی مشاقی تحریر کی سادگی اور بے تکلفی۔ چھوٹا قد ہونے اور باچھو نام کی ایک جھجک جو اس میں تھی وہ علی گڑھ آ کر ختم ہونے لگی اور جب امتیاز کے ساتھ میٹرک کرنے کے بعد انٹر کالج میں داخل ہوا تو جوہر اور چمکے۔ اور وہ اس شعر کے معنی اپنے اندر پیدا کر رہا تھا: آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی — اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی۔ یونین میں اس کی بے تکلف، پُرجوش، بے باک تقریروں کی دھوم تھی — وہ یونین کا سیکریٹری بھی رہا اور جانے کتنے فنکشن میں انگریزی اور اُردو میں تقریریں کیں۔

اس کے گرد ذہین، شوقین مزاج، لسّان، شاعر، ادیب، خوش مزاج، زندہ دل ہندوستان کی آزادی کے خواہش مند اور شہرت اور نام پانے کے طالب نوجوانوں کا، دوستوں کا حلقہ جمع ہو گیا تھا جن میں دو ایک لڑکیاں بھی تھیں — ان سب کا لیڈر اور رہبر و عبّاس تھا۔ کئی نے حکومت کے وفادار والدین کے حکم یا اصرار سے مجبور ہو کر آئی سی ایس یا پی سی ایس یا بیرسٹری وغیرہ کر لی۔ کئی نے قومی خدمت اور قومی یک جہتی کا کام تحریر کے ذریعے کرنے کا فیصلہ کیا مگر جو عزّت، شہرت اور مقبولیت ادیب، مقرّر اور آزادی کے قوم پرست سپاہی کی حیثیت سے عبّاس نے اس چھ سال میں علی گڑھ میں حاصل کی وہ بے مثال تھی — اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ علی گڑھ کے وہ صاحبان اقتدار جو انگریز دوست تھے وہ اس پوری پارٹی، عبّاس اور اس کے چچا زاد بھائی اظہر عبّاس اور ان کے قوم پرست ساتھیوں کے سخت خلاف تھے۔

مگر یہ نڈر نوجوان جو ابھی اٹھارہ سال ہی کا تھا کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اصول اور حق کی خاطر اس نے اپنے باپ تک کی بات نہ مانی۔ جن کی وہ بے حد عزّت کرتا تھا۔ وہ اُسے وکیل بنانا چاہتے تھے مگر اس نے جرنلزم کرنے کا فیصلہ کیا اور اسی پر اڑا رہا۔ ان کی دلداری کی خاطر 'لا' میں داخلہ ضرور لیا مگر ۔۔ ی لگ ہی نہیں سکتا تھا چھوڑ دیا۔ ماں تو بیٹے کے لیے جو وہ کہنا کرنے کو تیار تھیں سولہ سترہ برس کی عمر سے اس کے لیے "بہترین" لڑکیاں تلاش کرنا شروع کر دی تھیں یعنی جن کو مائیں "بہترین" سمجھتی ہیں۔ لڑکے سمجھیں یا نہیں۔ بس ایک شادی کا معاملہ ایسا تھا جس میں وہ بیٹے سے متفق نہ تھیں وہ شادی کے مسئلے پر بزرگوں کی ضد مان لینے کا قائل نہ تھا مگر اس کی ابھی عمر ہی کیا تھی۔ یہ اور بات ہے کہ جب لڑکیاں ہی مردانہ بن جائیں تو مرد بہت متاثر ہوتا ہے اور وہ بھی مرد تھا اور خاصا دل پھینک مرد۔

مجتبائی خاتون جیسا کہ میں نے لکھا مولانا حالی کے بڑے بیٹے کی چھوٹی بیٹی تھی یعنی عبّاس اور وہ ایک ہی شاہ بلوط سے نکلی ٹہنیاں تھے۔ بظاہر دونوں میں زیادہ مشابہت نہ تھی، کہنا چاہیے

بالکل مختلف لگتے تھے۔ ہندوستانی اعتبار سے وہ خوب صورت نہ تھی (اگرچہ باہر کے ملکوں میں اس کے حُسن و دلکشی کو بہت سراہا گیا) وہ نرم مزاج شیریں آواز، خاموشی پسند تھی۔ ذہانت میں وہ کسی طرح باچھو سے کم نہ تھی اور نہ قابلیت میں مگر اس نے کبھی اپنی ذہانت اور قابلیت کا اظہار نہیں کیا۔ باچھو نسبتاً آسودہ حال ماں باپ کا لاڈلا بیٹا تھا اور اس کی ماں، وہ نوعمری میں قدم ہی رکھ رہی تھی جو بھری جوانی میں دُنیا سے رُخصت ہوگئیں۔ ایک بڑی بہن اور ایک چھوٹی بہن۔ بظاہر بڑی بہن کو اس نے ماں مان لیا اور چھوٹی کو بیٹی مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اس عمر میں دونوں کی ماں بن گئی۔ باپ پہلے ہی کون سی زیادہ پروا کرتے تھے اب اور زیادہ بے تعلق ہوگئے۔ ددھیال والوں کو جانے کیوں ان بچّوں سے کوئی لگاؤ نہ تھا ___ البتہ ننھیال میں سبھی اُسے بہت چاہتے اور اس کی قدر کرتے تھے مگر خاص طور پر خواجہ سجّاد حسین، خواجہ غلام السیّدین، ان کی بہن اور بیوی اُسے بے حد چاہتی تھیں اس کی ذہانت اور شوق دیکھ کر اس کو پانی پت کے لڑکیوں کے اسکول میں داخل کر دیا گیا تھا اور وہ وہاں بہت شوق سے تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ ماں کی وفات کے بعد جب وہاں آگے تعلیم پانے کی صورت نہ رہی تھی تو خواجہ سجاد حسین اور سیدین صاحب کی کوشش اور مدد سے اُسے عبداللہ گرلز کالج علی گڑھ میں داخلہ دلوایا گیا۔ یہ ہمارے خاندان کی پہلی لڑکی تھی جو پانی پت سے نکل کر علی گڑھ آئی، کالج میں داخل ہوئی اور اپنی ذہانت اور لیاقت کا سکّہ بٹھا دیا۔[1] جب بی۔اے میں اس نے فرسٹ کلاس فرسٹ (اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی) پوزیشن بھی تھی) پایا تو بدباطن اور حاسد لوگوں نے کہا کہ اصل میں اس کے کئی عزیز یونیورسٹی کے اعلےٰ عہدوں پر ہیں۔ یعنی وہی پُرانا قصہ مگر ظاہر ہے کہ بہت کم لوگوں نے اس کا یقین کیا کہ وہ سارے کالج ہی میں نہیں پورے علی گڑھ میں ہر دل عزیز تھی۔ البتہ گرلز کالج کی بعض صاحب اقتدار اس سے خفا تھیں کہ غلط بات پر وہ اپنے دھیمے انداز میں احتجاج کرتی تھی اور لڑکیاں ساتھ دیتی تھیں۔ ایک بار انتہائی خراب کھانے پر لڑکیوں نے اسٹرائک کی مجّی اور اس کی سہیلیاں اس کی سربراہ تھیں اس پر کالج کے ارباب حل و عقد نے بہت نازیبا باتیں کہیں مگر فتح ان لڑکیوں کی ہوئی!

مطلب یہ کہ عبّاس اگر اپنے پرشور انداز میں آواز حق بلند کرتا تھا تو مجّی خاموشی سے احتجاج کرتی تھی!

بہرحال ___ یہاں مجّی تعلیمی منزلیں اور ہر دل عزیزی حاصل کر رہی تھی اور باچھو اور مجّی کی شادی کا خیال بھی کم سے کم باچھو کے خاندان میں کسی کو نہ تھا ___ حالاں کہ سیّدین اور ان کا خاندان اور خود اس کے نانا خواجہ سجّاد حسین یوں تو تینوں لڑکیوں کو مگر سب سے زیادہ اسے چاہتے تھے اس پر فخر بھی کرتے تھے مگر کسی ذمہ داری کو نہ اٹھا سکتے تھے۔

اُدھر عبّاس نے بمبئی میں قدم جما لیے۔ پہلے وہ دو ایک اور دوست حارث صاحب کے چھوٹے سے گھر میں رہے۔ اور جیسا کہ سب جانتے ہیں بریلوی صاحب کے ساتھ بمبئی کرانیکل سے اپنا جرنلزم کا کریئر شروع کیا۔ ایسا اُستاد اور ایسا شاگرد اور ایسا اخبار ___ ترقی اور قابلیت کے اظہار کے لیے کوئی کوشش کیا کرنی پڑی ہوگی۔ اور پھر عبّاس کی قابلیت کی شہرت بڑھتی گئی۔ افسانہ نگار اور مضمون نگار وغیرہ کی حیثیت سے تو پہلے ہی مشہور ہو چکا تھا۔ پہلا افسانہ 'ابابیل' جو بقول اس کے شروع میں ۷ جگہ سے واپس آیا، آج اس کے بہترین افسانوں میں گنا جاتا ہے۔ مگر واہ رے "ضد" کہ اس نے ہار نہ مانی یہاں تک کہ وہ ۱۹۳۶ء میں چھپا اور پھر بہت مقبول ہوا۔ افسانوں کے پہلے مجموعے "ایک لڑکی" نے بھی بہت شہرت پائی "ایک مسافر کی ڈائری" اس کے اس سفر نامے کا نام ہے جو دُنیا کے پہلے سفر کے بعد اس نے ۱۹۳۸ء میں قلم بند کیا تھا۔ مولانا محمد علی کی مختصر سوانح عمری جو اس نوجوان کی گہری عقیدت اپنے اس ہیرو سے ظاہر کرتی ہے، شاید ان کی سوانح عمریوں میں پہلی ہے۔ اسی زمانے میں آر۔ کے۔ کرنجیا نے ہندی کا بلٹز شروع کیا اور بعد میں اُردو کا بھی۔ عبّاس نے اس میں لکھنے کی پیش کش کی اور آزاد قلم کے نام سے "لاسٹ پیج" لکھنا شروع کیا۔ اس نے بلٹز کے ایڈیٹر سے یہ بھی منوا لیا کہ وہ جو چاہے گا لاسٹ پیج میں لکھے گا اس میں کاٹ چھانٹ کی اجازت نہ ہوگی۔ اور اس کا "تاوان" وہ یہ دے گا کہ بہت کم معاوضہ لے گا (بلٹز کے معیار سے) اور یہ شرط چالیس سال تک قائم رہی۔ خواجہ احمد عبّاس نے جو بھی لکھا، جس کے خلاف لکھا، جتنا سخت لکھا، بلٹز کی پالیسی کے موافق لکھا یا مخالف ___ لکھا اسے جُوں کا تُوں شائع کیا گیا۔ اپنے اس کارنامے پر اُسے بجا طور پر فخر نہ ہوگا کیا؟ تبھی تو اس نے کہا کہ آخری سفر کے وقت ان صفحات کی چادر بنا کر اس کے جسم پر اوڑھا دی جائے ___ شاید خدا کو وہ یہ دکھانا چاہتا ہو کہ دیکھ تیرے اس فقیر بندے نے حق و صداقت سے کسی وقت اور کسی حال میں مُنہ نہیں موڑا۔ مجھے عبّاس کے کارناموں پر مضمون لکھنا نہیں صرف اشارے کرنا چاہتی ہوں ___ اسی بمبئی میں اس نے فلم بنانے کی ابتدا کی۔ "نیا سنسار" کے نام سے ایک فلم بنائی علی گڑھ

---

[1] اس کے بعد بہت سی اور لڑکیوں نے وہاں تعلیم اور نام پایا اور شہرت پائی جن میں صابرہ زیدی صفِ اوّل میں تھی۔

کی ایک لڑکی خورشید کو ہیروئن بنایا اتفاق سے یا قسمت سے یہ فلم کامیاب ہوئی کہ اس میں ایک جرنلسٹ ہی کی کہانی تھی۔ پھر اس نے اپنی فلم کمپنی کا نام ہی "فلم سنسار" رکھ دیا۔ اور مجھے یاد نہیں بارہ یا چودہ فلمیں بنائیں جن میں تقریباً سبھی سنجیدہ حلقوں میں بے حد پسند کی گئیں لیکن گھٹیا مذاق رکھنے والوں کی وجہ سے چل نہ سکیں۔ کبھی ننھے بچوں اور ان کے مسائل پر فلم بن رہی ہے تو کبھی بچوں کو یک جہتی اور آپسی محبت کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ کبھی بغیر گانوں کے فلم بنانے کا تجربہ ہو رہا ہے، کبھی بمبئی کے فٹ پاتھ پر رہنے والوں کی زندگی دکھائی جا رہی ہے۔ کبھی چار کہانیاں جوڑ کر چھوت چھات اور غریبی کی لعنت کی تصویر کشی کی جا رہی ہے اور کبھی صحرا میں "دو بوند پانی" تک نہ ملنے کا مرثیہ سنایا جا رہا ہے۔ کبھی قومی اتحاد، آزادی اور آپسی محبت اور رفاقت پر "سات ہندوستانیوں" کو دنیا کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے — اور کبھی "انہونی" جیسی دل کش مگر پاک صاف تصویر بنا کر لوگوں کو حیرت زدہ کیا جا رہا ہے۔ فلم بنانے کے لیے پیسے کہاں سے آتے ہیں — تو فلمی کہانیاں لکھ کر اونے پونے داموں پر فلم پروڈیوسر کو دی جا رہی ہیں اور جو پیسہ ملتا ہے وہ ایک فلم کا قرضہ ادا کرنے اور دوسری کی داغ بیل ڈالنے میں صرف ہو رہا ہے۔ فلموں کو سراہا جا رہا ہے، جواہر لال، اندرا گاندھی، ذاکر صاحب اور ایک سے ایک بڑے ماہر تعلیم اور بڑے دماغ فلم کو پسند کر رہے ہیں — مگر فلمیں اکثر "فلاپ"! ایک بار اپنے ہی چاہنے والوں میں سے کسی نے پوچھا "باچھو صاحب آپ "فلاپ" فلم بنا کر اتنا دکھ کیوں اٹھاتے ہیں؟ ادب اور جرنلزم آپ کے پیام کو دنیا تک پہنچاتے ہی ہیں۔" بے ساختہ۔ ایک لمحے سوچے بغیر جواب ملا۔

"کامیاب سے کامیاب کہانی، ناول وغیرہ چند ہزار آدمی پڑھتے ہیں اور آپ جانتے ہیں فلاپ فلم بھی لاکھوں آدمی دیکھتے ہیں —" یعنی اصلی مقصد اپنا پیام، اپنی بات دوسروں تک پہنچانا ہے۔ ادب، جرنلزم، فلم اور دنیا کی سیاست کے گرد اس کی زندگی کے تقریباً پچاس بلکہ اس سے بھی زیادہ سال گزرے — مگر کیا وہ کبھی ایک ٹکے کے لیے پچھتایا؟؟

اس کی فلم ایک ٹیم ورک ہوتا، اکثر بغیر معاوضے یا برائے نام معاوضے پر نوجوان ہونہار لڑکے لڑکیاں لی جاتیں اس شرط پر کہ جو بھی آمدنی ہوگی وہ سب میں تقسیم ہو جائے گی۔ "شہر اور سپنا" میں زیادہ تر نئے نوجوان تھے۔ جب اسے پریزیڈنٹ ایوارڈ ملا تو نقد پچیس ہزار روپیہ بھی حسبِ دستور سے ڈائرکٹر کو دیا گیا۔ عباس نے اپنی بڑی بہن احمد فاطمہ جو ان کے ساتھ ہی رہتی تھیں پچیس ریشمی (چھالیہ الائچی والے) بٹوے سلوائے اور ان میں ہر ایک میں ایک ہزار روپیہ نقد رکھا۔ ڈائرکٹر احمد عباس سے لے کر جمعدار (وہ سب ۲۵ ہی تھے) تک کو وہ ایک ایک بٹوا پیش کر دیا گیا۔ یہ اور بات ہے کہ عباس نے دلی میں اس خوشی میں 'موتی محل' میں دلی کے دوستوں عزیزوں کو ایک ہزار سے زیادہ کی دعوت پہلے ہی کھلا دی تھی۔ جب کوئی فلم ریلیز ہوتی تو اس قسم کی دعوت ہوا کرتی تھی۔

مگر یہ تو میں بہت آگے نکل آئی۔ ابھی تو باچھو کی شادی بھی نہیں ہوئی۔

پانی پت کے عزیزوں اور دوستوں اور علی گڑھ اور دوسری جگہوں کی لڑکیوں کے کئی پیام تھے، جن میں سے کچھ ماں کو بہت پسند، کچھ باپ کی پسند، ایک آدھ خود عباس کی پسند — تینوں متفق ایک پر بھی نہ ہو سکے تھے۔ اس زمانے میں سیدین صاحب کشمیر میں تھے اور جیسا میں نے کہا وہ مجی کو بے حد چاہتے تھے۔ اس کے انتقال پر ان کا پمفلٹ، مجی اور اس کی حسین سیرت ہی کا مرقع نہیں خود سیدین صاحب کا بھی اعلیٰ درجے کا مضمون ہے۔ سیدین صاحب کو ان کی بہن نے خیال دلایا، وہ پہلے ہی سے دل میں سوچے بیٹھے تھے اور انھوں نے چچا ابا سے تحریک کی کیوں نہ آپ مجی سے باچھو کی شادی کر دیں — اب کیسے یہ سب طے ہوا میں نہیں جانتی۔ بہرحال چند ماہ میں عباس کا پیام مجتبائی کی دادی کو دے دیا گیا۔ اس دوران میں باچھو نے مجی کو سمجھنے کے لیے اس سے خط و کتابت بھی کی اور آخر خود باچھو بھی اس سے اتنا متاثر ہوا کہ اس سے شادی کرنے پر تیار ہو گیا اور خود مجی بھی اس طرح خاندان کے یہ دو متضاد مزاج والے مگر بہترین دل دماغ والے نوجوان ایک ہو گئے! پانی پت میں شادی ہوئی۔ اگرچہ بعض خاندان والے اس لیے ناراض تھے کہ ان کی کہیں زیادہ حسین، یا امیر، یا قریبی عزیز لڑکی کو نظر انداز کیا گیا مگر عام طور پر سب لوگ خصوصاً سیدین اور ان کا خاندان بہت خوش تھا اور دونوں کا جوڑا بہترین سمجھتا تھا۔

مجی علی گڑھ میں بی۔ اے کے غالباً آخری سال میں تھی، خاندان بھر کی طرح باچھو کی قدر اور عزت کرتی اور اسے اڈمائر بھی کرتی ہوگی۔ بہت سی اور لڑکیاں بھی کرتی تھیں۔ وہ اس کا خالہ زاد بھائی بھی تھا۔ یوں تو عباس کی شادی کے لیے

باچھو — اور مجی — ان دونوں کی زندگی یاد کرتی ہوں، مشکلیں، پریشانیاں، خوشیاں، تفریحیں، یک جہتی، محبت، قدردانی، اختلافِ خیال — ہم خیالی — ہم مذاقی اور مذاق کا سخت اختلاف تو کبھی محسوس ہوتا ہے کہ اجتماعِ ضدین تھا اور

ہیں اس کی چھوٹی بہن ارشاد فاطمہ (چھادی) جاگتے اور خدمت اور دلداری کرتے رہتے۔

اور پھر — پھر اس کے دل کا کامیاب آپریشن کسی بہت بڑے باہر کے ڈاکٹر نے بمبئی میں کیا۔ وہ اچھی ہوکر گھر آگئی۔ ایک بہت پُرانی خاندانی چاہنے والی بڑی بی خادمہ کے اور عبّاس کے سوا کوئی اور پاس نہ تھا۔ بہن بھی بچّوں کو لے کر اور مطمئن ہوکر واپس دلّی آگئی تھی کہ پندرہ یا بیس دن بعد نمونیے کا حملہ ہوا اور سکون اور آرام سے اس نے جان جان آفریں کو سپرد کر دی۔ اس کی جدائی کا صدمہ یوں تو سبھی کو ہوا ہر شخص جو اس سے ملا اس کے فیض سے فیض یاب ہوا اس کی خدمت کا احسان مند تھا اس کی محبّت کے بوجھ سے دبا تھا۔ اور یہ ہزاروں تھے، کئی ملکوں اور بیسیوں شہروں میں تھے، اپنے تھے، غیر تھے، بڈھے تھے، جوان تھے، مرد تھے، عورتیں تھیں، بچّے تھے، نوکر تھے، غریب اور امیر ہمسایہ تھے۔ اور بھائی بہن تو تھے ہی سب کو بے حد صدمہ ہوا۔

لیکن جس کی زندگی سونی اور ویران ہوگئی وہ ایک شخص تھا جس کا نام عبّاس تھا۔ یہ شادی عشق کی شادی نہ تھی مگر ان دونوں میں وہ گہری دلی محبت اور خاموش یک جہتی تھی جس کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ وہ شرمیلی تھی، میاں کی تعریف یا محبّت کا ذکر بہت کم کرتی تھی۔ آخری بار اس کے سدھارنے سے چند ماہ پہلے میں اس کی زیادہ بیماری کی اطلاع ملنے پر بمبئی گئی۔ اس وقت اس نے باچھو کا ذکر کافی کیا اور آخر میں جیسے دل کی گہرائیوں سے کہا "باجی آپ کے بھائی بہت — اچھے ہیں" اور ہم دونوں نے اپنے آنسو پی لیے۔

مجّی کا دل کا آپریشن ہوا — وہ بظاہر تندرست ہوگئی تو عبّاس نے "لاسٹ پیج" لکھا "موت اور زندگی کی جنگ" لیکن جب پندرہ دن بعد وہ نمونیے میں مبتلا ہوکر ختم ہوگئی تو اس نے لکھا "اے موت اپنی جیت پر نازاں نہ ہو" اور اس میں یہ واقعہ لکھا کہ جب وہ آخری سانسیں لے رہی تھی اور اس کا بدنصیب شوہر اس کا ہاتھ پکڑے بیٹھا ہوگا اور اس کی آخری نظریں اس کے چہرے پر ہوں گی اس کے منہ سے نکلا "اب کوئی فکر نہیں" اور باچھو سے فرمائش کی کہ اپنا لاسٹ پیج مجھے سناؤ۔ باچھو نے زندگی اور موت کی جنگ والا لاسٹ پیج اسے سُنانا شروع کیا تو وہ آہستہ سے بولی۔

"اب کوئی مضائقہ نہیں" پھر بولی "اب اگر نہ بچوں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ میں جانتی ہوں جو کچھ تم نے لکھا ہے اس کی وجہ سے لوگوں کو اس طرف زیادہ توجّہ ہوگی (یعنی دل کے علاج یا آپریشن کی طرف) اور اس طرح دوسروں کی جانیں بچیں گی تمھارا شکریہ ..." اور یہ کہہ کر اس نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور بھری جوانی میں نہایت سکون اور طمانیت سے جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

باچھو اور مجّی کو بجلی کے اس بلب اور سوکٹ سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے جو مل کر دُنیا کو روشنی پہنچاتے ہیں۔ باچھو کی شہرت اور کامیابی کے پیچھے اس شرمیلی خاموش لڑکی کی حسین تصویر چھپی تھی جس نے اُسے اس اُونچے درجے تک پہنچایا۔ ان دونوں نے جو نقش چھوڑے وہ آسانی سے نہیں مٹ سکتے۔

مجّی کی محبّت کا ذکر کیا کروں جس کی محبّت کے گھیرے میں ہر وہ شخص آجاتا تھا جو کسی طرح کسی وجہ سے اس سے ملا ہو — پھر شوہر — عبّاس جیسا شوہر۔ یوں دونوں ہی شاید تنہائی میں بھی لفظوں میں کبھی اظہار نہ کرتے ہوں محبّت کا مگر مجّی کے بعد — عبّاس نے اپنے مشہور ناول "انقلاب" کا انتساب یوں کیا ہے:

اپنی بیوی دوست اور ساتھی
مجتبائی خاتون مرحومہ کے نام
"وہ جو پاس ہوکر دُور ہوگئی
وہ جو دُور ہوکر اور پاس ہوگئی"

عبّاس کے قلم سے جو بات نکلتی تھی۔ وہ دل سے نکلتی تھی یہ چند لفظ اس محبّت اور قدر کے غماز ہیں جو اپنی جان نثار بیوی کی اس کے دل میں تھی۔

اس مضمون میں میں نے اپنے پیارے بھائی اور بہت ہی پیاری بہن کی ادھوری سی تصویر کشی کی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ میں عبّاس کی قابلیت ذہانت اور کارناموں کی پوری کیا ادھوری بھی تصویر کشی نہیں کر سکی ہوں اور مجتبائی خاتون پر تو پوری ایک کتاب بھی لکھوں تو شاید اس کی تصویر نہ کھینچ سکوں۔

ہو سکتا ہے اس مضمون میں انجان لوگوں کو مبالغہ یا محبّت کی فراوانی معلوم ہو لیکن میں یہ اقرار کرتی ہوں کہ میں نے ان کی کمزوریاں نہیں دکھائیں یا کمیاں ظاہر نہیں کیں تو اس لیے نہیں کہ میں انھیں فرشتہ سمجھتی ہوں۔ کمیاں ان میں بھی تھیں۔ کمزوریوں سے وہ بھی مبّرا نہ تھے شکایتیں ان کو بھی لوگوں سے ہوتی تھیں۔ لیکن ان کو وہ دکھا گئے جن کو یہ سب سہارنا پڑا ہوگا میں نے تو جیسے سمجھا اور پرکھا اور برتا وہ دکھایا ہے۔

البتّہ یہ جانتی ہوں کہ خوبیاں اور نیکیاں جس پلّے کی بھاری ہوتی ہیں وہی جھکتا ہے اور ان دونوں ہی کے یہ پلّے بھاری تھے۔ شاید مجّی کا پلّا باچھو کے پلّے سے جھکتا ہوا تھا۔

آئی جرأت کی یاد تو ۰۰۰

قدرت کو شاید منظور تھا کہ میں خواجہ
حب سے اُن کے انتقال سے ڈیڑھ دن پہلے آخری
مل لوں، بس یہ اتفاق ہی تھا کہ میں اُن کے گھر
سامنے سے گذر رہا تھا۔ مئی کی ۲۹ ، تاریخ تھے،
ید کا دوسرا دن) شام کے کوئی ۶ بجے ہوں گے،
ے ایک دوست ساتھ تھے بلکہ میں اُن کی اسکوٹر
ن کے ساتھ تھا۔ فلومینا سے (یہی خواجہ صاحب
ھر کی عمارت کا نام ہے) اسکوٹر کوئی پچاس قدم
ے نکل گئی ہوگی کہ مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ خواجہ
احب سے عید کی ملاقات کر لی جائے۔ واقعی عید
ئی۔ خواجہ صاحب بے حد ہشاش بشاش تھے،
، البتہ نرسنگ ہوم بنا ہوا تھا، اُن کا کمرہ بالکل
ی دواخانے کا فزیوتھریپی کا کمرہ معلوم ہوا، جگہ جگہ
زش کا سامان رکھا ہوا تھا، ایک سائیکل بھی تھی
ں پر بیٹھ کر پاؤں چلانے پڑتے ہیں (لیکن سائیکل
تی نہیں ہے کسی پس ماندہ ملک کی ترقی کی طرح اپنی
کہ رُکی رہتی ہے) ، نرس بھی موجود تھی اور خواجہ صاحب
غذات دیکھ رہے تھے غالباً مراسلوں کے جواب بھی
ھوا رہے تھے ــــ خواجہ صاحب حسبِ معمول
ے تکلفی سے ملے، عید کی مبارک باد کے ایجاب و قبول
ے بعد میں نے سائیکل کی طرف اشارہ کرکے پوچھا

آپ کو یہ بھی کرنا پڑتا ہے، بولے مجھے تو اور بھی بہت
کچھ کرنا پڑتا ہے ــــ ہنسے اور داد چاہی خواجہ صاحب
کو اتنا مسرور و مطمئن بلکہ زندگی سے بھرپور دیکھ کر
حیرت انگیز خوشی ہوئی ــــ ورنہ اس سے کچھ ہی دن
پہلے میں اُن سے ولے پارلے کے ایک نرسنگ ہوم میں
ملا تھا، وہ بالکل فریش تھے اور اُس وقت ان کے
دل پر اتنا شدید حملہ ہوا تھا کہ اُن کے معالج نے
انھیں تقریباً قلم زد (رائٹ آف) کر دیا تھا اور
ڈاکٹر کو یہ توقع نہیں تھی کہ وہ دوپہر میں گھر جا کر
شام کو جب ڈیوٹی پر آئے گا تو خواجہ صاحب سے
ملاقات ہوگی۔ خواجہ صاحب زندہ دل نہیں شیر دل
آدمی تھے۔ وہ اس سے پہلے بھی فرشتۂ اجل کو ایک
دو مرتبہ واپس کر چکے تھے، پتہ نہیں یہ اُن کی شخصیت کا
سحر تھا یا اُن کی قوت ارادی کہ یہ فرشتہ بھی اُن کی
بات سُن لیتا تھا، اس مرتبہ بھی اس نے خواجہ صاحب
کو ــــ اور خواجہ صاحب سے زیادہ اُن کے چاہنے
والوں کو، ناراض نہیں کیا، خاموش واپس چلا گیا
اور خواجہ صاحب کے معالج کو اپنے علم تجربے اور
تجزیے پر قدرے شرمندگی ہوئی (خوشی تو ظاہر ہے
ہوئی ہی ہوگی) اس کی لیکن یہ مہلت بس چند روزہ تھی،
نرسنگ ہوم سے فلومینا واپس آئے خواجہ صاحب کو
زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ ۳۰ مئی کی رات میں
انھیں پھر اُسی نرسنگ ہوم پہنچانا پڑا اور پہلی جُون
کا سورج طلوع ہونے سے پہلے اُن کی زندگی کا چراغ
گُل ہوگیا ــــ ۲۹ مئی ۱۹۸۷ء کی یہ تاریخ مجھے
اس لیے یاد رہے گی کہ اُس دن خواجہ صاحب سے
آخری ملاقات ہنستے بولتے ہوئی تھی ورنہ نرسنگ ہوم
میں جب میں اُن سے ملا تھا ان کی آنکھیں آنسو تھے،
بات تو انھوں نے اُس دن بھی کی تھی لیکن اُن سے
بات کی نہیں جاتی تھی۔

خواجہ صاحب کیا نہیں تھے، صحافی، ادیب،
مقرر، فلم ساز، سوشل ورکر اور نہ جانے کیا کیا،
بس شاعر نہیں تھے، قانون کی ڈگری بھی ان کی جیب
میں پڑی تھی لیکن وہ وکیل بھی نہیں تھے، شاعری کی
ہوتی تو زندگی کی آدھی سے زیادہ راتیں شاعروں کی
نذر ہو جاتیں اور وکالت کی ہوتی تو دن کے ۱۶، ۱۸
گھنٹے مؤکلوں کی صحبت ناجنس میں گزر جاتے،
(محنتانہ بھی وہ وصول کر پاتے یا نہیں ٹھیک سے
نہیں کہا جا سکتا) اپنے خلاف فیصلے الگ سُننے
پڑتے، نجی زندگی میں ممکن ہے خواجہ صاحب کے
کوئی اصول نہ ہوں اور اگر ہوں گے تو بھی ان میں لچک
(شاخِ گل والی لچک نہیں) کی گنجائش ہوگی لیکن
جہاں تک اُن کی بیرون خانہ زندگی کا تعلق ہے انھوں
نے اپنی ایک ڈگر بنالی تھی، وہ اسی راستے پر چلتے رہے،
کبھی مُڑ کر نہیں دیکھا کہ کوئی ساتھ چل رہا ہے یا نہیں،
شاید انھوں نے سوچا ہی نہیں کہ زندگی اور سفر میں
"ساتھ" بھی کوئی چیز ہوتی ہے، اتنا سخت تجرد شاید
ہی کسی نے برتا ہوگا، قولاً بھی اور فعلاً بھی، اپنے اصول
کے پکّے تھے، فلمیں بھی بنائیں تو اس بات کا خیال رکھا کہ
کوئی فلم باکس آفس پر ہٹ نہ ہو جائے، عوام کے
آدمی تھے لیکن اپنی فلموں میں کبھی عوام کے" بلند ذوق"
کو پیشِ نظر نہیں رکھا، میرا اُن سے پہلا رابطہ فلم ہی کی
بدولت ہوا وہ اس طرح کہ خواجہ صاحب ۱۹۶۲ء کے
اردگرد اپنی فلم ــــ غالباً " شہر اور سپنا" بنا رہے تھے
اور اُس میں ایک شاٹ امپلائمنٹ ایکسچینج کا بھی تھا
میں محکمۂ لیبر میں مامور تھا (یوں سمجھیے محکمۂ لیبر مجھ سے
معمور تھا) اور اُس زمانے میں یہ امپلائمنٹ ایکسچینج اسی

یوسف ناظم

۱۹ - الہلال - باندرہ ریکلیمیشن، بمبئی ۴۰۰۰۵۰

محکمے کے تحت (انتظامی طور پر) تھا۔ خواجہ صاحب نے کرشن جی کی زبانی مجھ سے کہلوایا کہ میں اس شاٹ کے لیے سرکاری اجازت حاصل کروں۔ شاید خود بھی آفس آگئے تھے۔ بعد میں اپنے اسسٹنٹ (اطہر فاروقی) کے ذریعے کاغذات بھی بھجوائے۔ یہ اجازت انھیں مل گئی اور جہاں تک مجھے یاد ہے اُن سے کوئی رقم وصول نہیں کی گئی۔ (یہ شاٹ تو امپلائمنٹ اکسچینج کا ایک اشتہار ہوگیا)۔

معروف تو سبھی ہوتے ہیں کیوں کہ بمبئی شہر ہے ہی معروف لوگوں کا شہر لیکن خواجہ صاحب بے حد معروف آدمی تھے۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے لیے مصروفیتیں پیدا کرتے تھے۔ بامبے کرانیکل سے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا اور آخر دم تک اس کمبل سے اپنا رشتہ نبایا لکھتے بھی تو "آخری صفحہ" تھے۔ انگریزی میں الگ اُردو میں الگ۔ خواجہ صاحب کا ذہن اتنا زرخیز تھا کہ انھیں لکھنے کے لیے کسی موضوع کی تلاش نہیں کرنی پڑتی تھی صرف قلم اٹھانا پڑتا تھا ـــ وہ شاید ہی تقریبوں اور دعوتوں میں جاتے ہوں گے۔ ٹھیک ہی کرتے تھے ورنہ وہاں جاکر بھی وہ کاغذ قلم لے کر **لکھنے بیٹھ جاتے** ـــ یوں سارا ملک اُن کا دوست ہوگا لیکن **بمبئی میں** بھی انھوں نے اپنے آپ کو دو چار گھروں کی **حد تک محدود** رکھا ـــ یہ بات مجھے اس لیے یاد رہی کہ **بیدی صاحب** کی تو شکایت ہی رہی کہ وہ کبھی اُن کے گھر جاتے۔

لیکن ایسا نہیں ہے کہ خواجہ صاحب کسی تقریب میں جاتے ہی نہیں تھے۔ جاتے ضرور تھے لیکن انتظار ساغر کھینچنے کا کام وہ نہیں کرسکتے تھے (یوں بھی ساغر سے اُن کا تعلق تھا بھی کہاں) ـــ اور شادی بیاہ کی تقاریب میں تقریب تو کم ہوتی ہے انتظار ہی زیادہ ہوتا ہے۔ کئی سال پہلے (۲۰ سال تو ہو ہی گئے ہوں گے) وہ گورنمنٹ کالونی باندرہ میں اپنے کسی اسسٹنٹ کے یہاں ایک تقریب میں شریک ہوئے۔ جو وقت بتایا گیا تھا اُس سے بھی کوئی ۱۵ منٹ پہلے پہنچے (اس کی کیا ضرورت تھی؟)۔ وہاں اُن کی حیرانی پریشانی اضطراب بے چینی قابلِ دید تھی۔ اُس محفل میں اُن کا شناسا صرف میں تھا اور تو اور جنھوں نے انھیں بلایا تھا وہ خود عدم موجود تھے۔ خواجہ صاحب نے بڑی رحم طلب نظروں سے مجھے دیکھا اور ایک لفافہ میرے حوالے کرتے ہوئے تاکید کی کہ یہ میں اُن کے میزبان کے حوالے کردوں عجلت میں تھے لیکن اس کے باوجود دو تین مرتبہ پوچھا کہ آپ دے دیں گے نا ـــ حالاں کہ وہ لفافہ میں نے ملفوف الیہ کو پہنچا دیا تھا لیکن شاید خواجہ صاحب تک رسید نہیں پہنچی۔ اس کا انھیں اتنا صدمہ ہوا کہ وہ پھر کسی ایسی تقریب میں شریک ہی نہیں ہوئے۔

ریاست حیدرآباد کی تقسیم کے نتیجے میں جب مُلازمین سرکار، کا ایک مجمع شہر بمبئی آکر سکونت پذیر ہوا تو خواجہ صاحب اتنے سارے اُردو والوں کو یکمشت ایک جگہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے (حیدرآباد کی سرکاری زبان اُردو تھی اور اچھی اُردو) گورنمنٹ کالونی باندرہ مشرقی میں بسنے سے پہلے اِن مُلازمین سرکار کو 'کاٹن گرین' کی ہاؤزنگ بورڈ کی عمارتوں میں رکھا گیا تھا۔ (اس علاقے کا نام کاٹن گرین اس لیے رکھا گیا تھا کہ یہاں روئی تھوک کے حساب سے فروخت ہوتی تھی اور صرف روئی ہی نہیں یہاں کی ساری آبادی **دُھنکی جاتی تھی**) **کاٹن گرین** میں بھی کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا تھا لیکن گورنمنٹ کالونی **باندرہ** میں تو باضابطہ سالانہ مشاعرے ہونے لگے تھے۔ ایک مشاعرے میں خواجہ صاحب نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی اور بڑی زوردار تقریر کی۔ یہ بھی ۱۹۶۶ء کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں مضافات میں کسی مشاعرے کا منعقد ہونا ذرا اچنبھے کی بات تھی۔ خواجہ صاحب کو خوشی اسی بات کی تھی کہ مضافات بھی آباد ہو رہے ہیں اور رعایا شاد ہے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں مشاعرے کے سامعین سے یہ بھی کہا تھا کہ مُصنّفوں کی کتابیں خرید کر پڑھی جائیں۔ (اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ اس کے بعد کتابیں اور بھی کم فروخت ہونے لگیں اور اب تو اُردو کی ہر کتاب ساڑھے سات سو ہی چھپتی ہے) ـــ بعد میں خواجہ صاحب نے خود ہی اس قسم کی ہدایت دینا ترک کردیا اور ہدایت کاری کو اپنا شغل بنا لیا۔

خواجہ صاحب کے متعلق بمبئی میں یہ خبر مشہور تھی کہ روس میں ان کی اتنی کتابیں چھپیں اور فروخت ہوئی ہیں کہ وہ ہندوستان میں تو نہیں لیکن روس میں بے حد متمول آدمی ہیں۔ (روس سے یہاں سب کچھ آسکتا ہے لیکن کتابوں کی رائلٹی کی رقم نہیں آسکتی) یہ بھی کہا جاتا تھا کہ روس میں اگر عزت و آبرو کے ساتھ گھومنا پھرنا ہے تو خواجہ صاحب کی چٹھی لے کر جاؤ اور دیکھو کہ تمھاری کتنی قدر و منزلت ہوتی ہے۔ یہ خبریں یقیناً خواجہ صاحب تک بھی پہنچتی ہی ہوں گی۔ اس بارے میں اُن کا کیا ردّعمل تھا کسی کو پتہ نہیں ہے کیوں کہ خواجہ صاحب ردّعمل کے نہیں عمل کے آدمی تھے۔

خواجہ احمد عبّاس اپنے آپ کو 'خورد' ظاہر کرکے کافی خوش ہوا کرتے تھے۔ فیض احمد فیض جب آخری مرتبہ بمبئی آئے تو اُن کے ایک استقبالیہ میں خواجہ صاحب نے تقریر کی (غالباً یہ فیض صاحب کی سترویں سالگرہ کا جلسہ تھا) تو صاحبِ محفل کی تعریف میں ایسے ایسے جُملے کہے کہ فیض ایک نئی نویلی دُلہن کی طرح شرما کر رہ گئے۔ مدھیہ پردیش اُردو اکادمی کا ایوارڈ بھی خواجہ صاحب نے فیض ہی کے ہاتھوں حاصل کیا تھا اس کا ذکر بھی اس طرح کیا کہ نظام دکن کے ہاتھوں دربار شاہی سے کوئی فیض حاصل کیا ہو۔ ساحر لدھیانوی کے گھر پر سجاد ظہیر کی تعریف میں تقریر کی تو مرحوم سے کھانا نہیں کھایا گیا۔ انھوں نے انکساری اور عاجزی کے بیچ میں

ی لکیر نہیں کھینچی۔ یہ اُن کی خاص ہابی تھی۔ کرشن ندر کے تو وہ عاشق تھے۔ جشن کرشن چندر میں وہی جشن کرشن چندر جس میں اندرا گاندھی نے شن جی کو شاعر کہا تھا) انھوں نے اپنے عشق کے لہار میں کوئی تسمہ لگا نہیں رکھا۔ اُن کی تقریر شن ۔ بہارو پھول برساؤ مرا محبوب آیا ہے گانا یاد آگیا۔

خواجہ صاحب کو اس بات کا احساس تھا کہ اُن کی 'ہمہ جہتی' نے اُن کا کوئی مخصوص امیج بنے نہیں دیا۔ فلم سازوں کی محفل میں انھیں ادیب کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ صحافیوں کے یہاں وہ بسا اچھے ہدایت کار مشہور تھے اور ادیبوں نے نھیں ایک اعلیٰ درجے کا جرنلسٹ مانا۔ اس کا وہ اُٹھاتے تھے۔ لطف تو انھوں نے دھوکے دینے میں بھی بہت اُٹھایا۔ دُور دُور سے آنے والے انھیں بہت دولت مند سمجھتے تھے۔ اُن کے گھر جاتے۔ اپنی جیب کے کٹ جانے کی ناول نہایت درد انگیز انداز میں سناتے اور بمبئی سے لکتہ جانے کا کرایہ طلب کرتے اور خواجہ صاحب ودکہیں سے قرض حاصل کر کے اس شخص کو کلکتہ بھیجتے ——— خواجہ صاحب کو بڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ بمبئی میں جب کسی شخص کی جیب کٹ جاتی ہے خواہ وہ مفروضہ ہی کیوں نہ ہو) تو پھر وہ شخص بمبئی ہی میں سکونت اختیار کر لیتا ہے۔ اس طرح خواجہ صاحب کی جیب کئی مرتبہ کٹی اور اس کا نتیجہ دوسروں کے حق میں اچھا نہیں نکلا جس شخص کو خواجہ صاحب نے کلکتہ کا ٹکٹ منگوا کر دیا وہ بھی بمبئی سے باہر نہیں گیا۔ دس فی صد نقصان سے ٹکٹ فروخت کر کے اُن کی نظروں کے سامنے گھومتا رہا۔

خواجہ صاحب نے کچھ دنوں کے لیے ایک کار بھی رکھی لیکن اس میں اُن کا وقت بھی بہت ضایع ہوا۔ کار میں انھیں گھومنا پڑتا تھا۔ خواہ مخواہ کار تو ہر صورت میں مہنگی ہی پڑتی تھی۔ نہ گھومو تو بھی کھڑے کھڑے ہی مہنگی پڑے گی۔ خود تو چلا نہیں سکتے تھے۔ ایک ڈرائیور بھی رکھا تھا۔ ایک مرتبہ مجھے بھی اس کار میں سفر کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔۔۔ مہاراشٹر اُردو اکادمی کا کوئی جلسہ تھا۔ چکبست کی یاد میں۔ قیصر باغ بھی بھلا کوئی جلسہ کرنے کی جگہ ہے یہاں پہنچنے کے لیے اتنی گلیوں سے ہو کر جانا پڑتا ہے کہ پوری جوانی گذر جائے۔ جلسے سے واپس ہونے کے وقت انھوں نے اس پورے مجمع میں سے مجھے چنا اور اپنے ساتھ چلنے کی ہدایت کی۔ (کار موجود ہو تو بزرگ کاری پر آمنّا و صدقنا کہنے کو جی چاہتا ہے) گاڑی مختلف گلیوں میں سے لہراتی ہوئی بائیکلہ پہنچی ہی تھی کہ اُن کے شوفر نے غلط "شارٹ" دے دیا۔ بمبئی میں ٹریفک کے قواعد و ضوابط ساعت بہ ساعت بدلتے رہتے ہیں۔ جس راستے سے آپ ۷ بجے گذر رہے ہوں اُس راستے سے آٹھ بجے نہیں گذر سکتے۔ بمبئی میں گاڑیوں کے شوفر کی معلومات وسیع، اور حافظہ قوی ہونا چاہیے۔ ٹریفک کے معاملات میں "ری ٹیک" بھی نہیں ہوا کرتا۔ گاڑی جوں ہی حدودِ ممنوعہ میں داخل ہوئی ایک کانسٹیبل فی الفور اسٹیج پر نمودار ہوا اور اُس نے بڑے سخت مکالمے ادا کیے (سرکاری مکالموں میں شاعری نہیں ہوا کرتی) ۵۰ روپے ادا کرنے پڑے۔ خواجہ صاحب نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا لیکن اُن کے انداز سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ اس واقعہ فاجعہ کا ذمہ دار مجھے قرار دے چکے۔ باندرہ تک کا سفر ایک عالمِ انقباض میں کٹا یوں اُنھوں نے پوچھا ضرور کہ آج کل آپ کیا لکھ رہے ہیں لیکن یہ ایک ایسا جملہ معترضہ تھا جس کے آگے پیچھے کچھ نہ تھا ——— غالباً اسی سفر کے بعد خواجہ صاحب اس بات کے قائل ہو گئے کہ بمبئی جیسے شہر میں کار رکھنا اپنے آپ کو از کار رفتہ بنا لینا ہے۔ ٹیکسی مفید ہوتی ہے۔

"آج کل" میں راج نرائن راز نے "منکہ" کا سلسلہ شروع کیا تو خواجہ صاحب کے "منکہ" کے سلسلے میں انھوں نے بڑی لجاجت سے لکھا کہ میں اُن کا منکہ کسی طرح بھی حاصل کر کے انھیں روانہ کروں۔ خواجہ صاحب اُن دنوں وُرجیشوری چلے گئے تھے۔ (ورجیشوری بسین کے قریب ایک مقام ہے جہاں گرم پانی کے چشمے ہیں)۔ بس ہفتے میں ایک آدھ دن کے لیے بمبئی آتے تھے۔ یوں پیغام رسانی کا سلسلہ باقاعدہ جاری رہا۔ میں دو مرتبہ اُن کے گھر گیا۔ دونوں حملے ناکام ہوئے لیکن میرا پیغام بہرحال اُن تک پہنچا دیا گیا اور ورجیشوری سے اُن کی واپسی پر ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ اپنا منکہ انھوں نے بصیغۂ راز راج دہانی کے پتے پر بھیج دیا تھا (۱۹۷۵ء کے کسی شمارے میں یہ چھپ بھی گیا تھا) خواجہ صاحب میں یہ بات بڑی اچھی تھی کہ اُن کے پاس اُن کی ہر نوعے کی تصویر موجود رہتی تھی۔ (کتنے کیمرہ مین تو اُن کے اردگرد ہی رہتے تھے) ورنہ ادیبوں شاعروں کی بالعموم ایک ہی تصویر گردش میں رہتی ہے اور تصویر کے قارئین کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ شاعر کی عمر بڑھتی کیوں نہیں ہے۔ خواجہ صاحب' اس فیوڈل سسٹم کے برخلاف' اپنی تصویروں کے سلسلے میں ہمیشہ تازہ کلام پیش کرتے تھے۔ (اُن کے تازہ دم ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی تھا)۔

پچھلے کئی سالوں سے اُن کے پیروں میں سکت نہیں رہی تھی۔ گھر پر اپنے ملاقاتیوں سے کرسی پر بیٹھے بیٹھے ملتے لیکن بتا دیتے کہ کھڑے ہو کر ملنے سے قاصر ہیں۔ مشرقی آداب کو سلیقے کے ساتھ برتنے کے وہ بے حد شوقین تھے البتہ مجبوری کی بات اور تھی لیکن ہمّت ان کی ٹوٹی نہیں تھی اِس عالم میں بھی

دُور دُور کا سفر کرتے۔ غالب ایوارڈ لینے دلّی چلے گئے اور ایوانِ غالب میں دو مددگاروں کے سہارے داخل ہو کر محفل کو حیران کر دیا۔ اسی محفل میں انعام پانے والوں کی طرف سے کچھ کہنے کے لیے انھیں دعوتِ سخن دی گئی تو آواز میں وہی کراراپن تھا۔ پانی پت جنگوں کا میدان رہا ہے وہیں کی مٹی نے خواجہ صاحب کو نبرد آزمائی کا سبق اُس وقت پڑھایا ہوگا جب وہ دیوارِ دبستاں پر کچھ لکیریں کھینچا کرتے ہوں گے۔

خواجہ صاحب نے لکھنے کو بہت کچھ لکھا حتیٰ کہ اپنی وصیت بھی لکھ ڈالی۔ ان کی وصیت بھی حالی کی تحریر تھی، بالکل تازہ کلام۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وصیت لکھنے کی بات اُن کے ذہن میں ابھی ابھی آئی یا نئی نئی وصیتیں لکھنے کے عادی تھے۔ غالب تو اپنی تاریخ وفات دو تین مرتبہ کہہ چکے تھے اور جانتے ہیں کہ خواجہ احمد عباس، حالی کے رشتے واسطے سے غالب کے کس قدر قریب تھے۔

قلعۂ معلّٰی کی جھلکیاں

یہ کتاب آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے زمانے کے لال قلعے کی تہذیبی زندگی کا دلچسپ مرقع ہے۔ جس میں لال قلعے کے رسم و رواج، روز و شب کے معمولات اور مغل دور کے آداب کا ذکر بڑے دل پذیر انداز میں کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مؤلف عرش تیموری ہیں۔ عرش صاحب تیموری خاندان کی یادگار ہیں۔ اگرچہ انھوں نے قلعۂ معلّٰی کی وہ شان اور چہل پہل نہیں دیکھی جس کی یاد ان کے دل کو گدگدا رہی تھی لیکن انھوں نے اپنے دادا اور دوسرے بزرگوں اور بڑے بوڑھوں سے جو کچھ سنا تھا وہ اس کتاب میں محفوظ کر دیا ہے۔ اس میں بعض ایسی باتیں ملیں گی جو نہ تاریخوں میں ہیں نہ تذکروں میں۔ اس مختصر سی کتاب میں آپ کو بادشاہ، بیگمات اور شہزادے چلتے پھرتے نظر آئیں گے۔ ان کے اختیارات اور ان کی مجبوریوں کی جھلک دکھائی دے گی۔

دلچسپ اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ "قلعۂ معلّٰی کی جھلکیاں" ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔ جب عرش تیموری کی عمر صرف سولہ سال تھی۔ سولہ سال کی عمر میں "قلعۂ معلّٰی کی جھلکیاں" جیسی کتاب تصنیف کر دینا ناممکن نہ سہی غیر معمولی اور حیران کن ضرور ہے۔ بات صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتی عرش تیموری نے اس کتاب سے پہلے اپنے شعری مجموعے "خورشید خاور" کے علاوہ چار کتابیں اور مکمل کر لی تھیں۔

اس دور کے دوسرے مصنفین کی طرح عرش تیموری نے اپنے زمانے کے انگریز حکام کے بارے میں کوئی نازیبا بات نہیں کہی ہے۔ لیکن ۱۸۵۷ء سے قبل لال قلعے میں انگریزوں نے اپنی سازشوں کا جو جال پھیلا رکھا تھا اور جس سے قلعے کا امن چین رفتہ رفتہ تہ و بالا ہوتا جا رہا تھا اس کی نشان دہی انھوں نے صاف صاف لفظوں میں کی ہے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز نے اس کتاب کو اپنے مختصر لیکن جامع مقدمے کے ساتھ مرتب کیا ہے۔

مصنّف : عرش تیموری
مرتّب : ڈاکٹر اسلم پرویز
صفحات : ۷۲
قیمت : ۱۷ روپے

داغ دہلوی: حیات اور کارنامے

داغ کی تربیت اور ان کے ادبی مزاج کی پرورش لال قلعے میں اس زمانے میں ہوئی تھی جب بہادر شاہ اور مغل شاہزادے جانتے تھے کہ مغل حکومت کی شمع کے گل ہونے کا وقت آگیا ہے۔ اس عہد کے معاصر خاص طور سے بادشاہ کی شاعری کے نشاطیہ لب و لہجے میں حزن و ملال اور مایوسی کی لے تھی۔ وہ اپنے ذہنی کرب کو نغمہ و شعر میں ڈھال رہے تھے۔ اس کے برعکس داغ کی رگوں میں مغل خون تھا۔ وہ قلعے کے نہیں، قلعے کے باہر کے آدمی تھے ان کی والدہ چھوٹی بیگم نے ولی عہد مرزا فخرو سے شادی کی ان کے ساتھ قلعے میں داخل ہوئے جہاں انھیں اپنے عہد کے بہترین علوم و فنون حاصل کرنے کا موقع ملا۔ انھوں نے میر تقی میر کے شاگرد غلام حسین شکیبا کے بیٹے سید احمد حسین سے تعلیم حاصل کی۔ محمد امیر پنجہ کش سے خطاطی کا فن سیکھا، مرزا عبداللہ بیگ نے بانک بنوٹ پر قدرت حاصل کرائی۔ سجن خاں اور ... سے گھوڑ سواری اور خود مرزا فخرو سے تیراندازی اور بندوق بازی کا فن سیکھا۔ بہادر شاہ ظفر اور ولی عہد مرزا فخرو کے استاد محمد ابراہیم ذوقؔ نے شعری ذوق کی تربیت کی۔

آسودگی کی زندگی نے داغ کو فکر کی سطح پر زندہ دلی، شگفتگی، رجائیت اور لذت اندوزی اور لال قلعے کے ماحول نے اظہار کی سطح پر زبان کی سلاست، فصاحت، محاورے اور روزمرہ دیا اور انھیں الفاظ کا مزاج شناس بنایا۔

اردو اکادمی، دہلی نے داغ پر دو روزہ سیمینار منعقد کیا تھا۔ اس سیمینار کے ڈائرکٹر کامل قریشی تھے۔ انھوں نے اردو کے ممتاز محققوں اور ناقدوں سے داغ کے سوانح، شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں پر مقالے لکھوائے، جو سیمینار میں پڑھے گئے۔ اس کتاب میں یہی مقالے جمع کر دیے گئے ہیں۔

مرتّب : ڈاکٹر کامل قریشی
صفحات : ۲۳۸
قیمت : ۳۱ روپے۔ (مجلد)

ماموں یاچھو : خواجہ احمد عبّاس

خواجہ احمد عباس کی شخصیت اس قدر پہلودار، دلکش، دلنواز، گہری اور شفاف ہے اور ان کے ادبی، فنی، صحافتی اور ثقافتی کارنامے اتنے ہمہ گیر، ۔ح اور شاندار ہیں کہ ایک مختصر مضمون میں ان کا احاطہ کرنا تو درکنار، سرسری جائزہ بھی ممکن نہیں۔ ایک ناول نگار اور افسانہ نگار کی حیثیت سے، وہ ترقی پسند تحریک کی بہترین روایات کے علمبردار رہیں۔ اُن کی حقیقت نگاری کو ان کے جذبے کے خلوص، انقلابی رومانویت اور آیڈیلزم نے جلا بخشی ہے۔ اور ان کے سیاسی اور سماجی شعور کو ان کی انسان دوستی، دردمندی، اور کچلے ہوئے انسانوں کے ساتھ گہری ہمدردی نے شدت اور تاثیر عطا کی ہے۔ مشاہدے کی توانائی، وسعت نظر، حق گوئی، بے باکی ان کے تمام ادبی اور فنی کارناموں کی پہچان ہے۔ ان کے متعدد ناول مثلاً "انقلاب"۔ "دُنیا میرا گاؤں"، "سات ہندوستانی" "ڈاکٹر کوٹنس اور TOMORROW is OURS اپنی فنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ تاریخی دستاویزوں کی اہمیت بھی رکھتے ہیں۔ ان کا شاہکار ناول "انقلاب" (اور اس کا دوسرا حصہ "دُنیا میرا گاؤں" جو ابھی تک صرف انگلش میں شایع ہوا ہے) تاریخی اور سیاسی حقیقت نگاری اور ذاتی اور داخلی تجربات کے ایک دلکش سنگم کی کامیاب مثال ہے۔ ان کا ایک آخری دور کا ناول "تین پہیے" ایک بڑے شہر میں سیدھے سادے لوگوں اور مظلوم طبقوں کے المناک تجربات کی دل شکن داستان ہے جس کی حقیقت نگاری کو جذبات کی شدت اور سماجی اور وجودی احتجاج کی زیریں لہر نے دو آتشہ بنا دیا ہے۔ اپنے دوسرے ناولوں، افسانوں اور ڈراموں میں بھی انھوں نے انسانی زندگی کے کسی نہ کسی اہم پہلو کی عکاسی کی ہے اور عصری زندگی میں ظلم، ناانصافی، روایت پرستی، تنگ نظری، ریاکاری، بے حسی اور کرپشن کے گھناونے چہرے سے نقاب اُٹھائی ہے۔ ان کی اچھی کہانیاں، ڈرامے اور ناول فنی نظم و ضبط کی بھی کامیاب مثالیں ہیں۔ اور اس زمرے میں "انقلاب"۔ "دُنیا میرا گاؤں"۔ "تین پہیے"۔ "ابابیل"۔ "سردار جی"۔ "ایک لڑکی"۔ "زعفران کے پھول"۔ "نیلی ساری" اور "مونتاژ" وغیرہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ ان کے افسانے اور ناول ہندی میں بھی کافی مقبول ہیں اور انڈین انگلش فکشن رائٹر کی حیثیت سے بھی ان کا شمار صفِ اوّل کے ادیبوں میں کیا جاتا ہے۔

خواجہ احمد عباس کے فلمی کارنامے بھی ان کے ادبی کارناموں کی طرح شاندار ہیں۔ سنجیدہ، باشعور اور فنکارانہ فلموں کی ترویج اور ترقی میں انھیں اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔ ان کی کئی فلمیں مثلاً "دھرتی کے لال"۔ "منا"۔ "ہمارا گھر"۔ اور "شہر اور سپنا" نہ صرف ہندوستانی فلم کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں بلکہ بین الاقوامی فلمی کارناموں میں بھی انھیں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ ان کی ایک اور خوبصورت فلم "آسمان محل" جسے پرتھوی راج کپور کی بے مثال اداکاری نے چار چاند لگا دیے تھے، فلمی کامیابی کی ایک تابندہ مثال ہے۔ جس میں نہ صرف ایک بوسیدہ سماج اور اس کی کرم خوردہ اقدار کی جاں کنی کا کرب ہے بلکہ جو ایک نئے سماج کی اُبھرتی ہوئی قدروں اور نئی نسل کے خوابوں اور ارادوں کا اشارہ بھی ہے۔ دوسری کئی اہم فلموں مثلاً "سات ہندوستانی"۔ "دو بوند پانی"۔ "کسلاٹ" اور "بمبئی رات کی باہوں میں" میں بھی خواجہ احمد عباس نے کسی نہ کسی اہم قومی اور سماجی مسئلے کی طرف توجہ دلائی جن کی اہمیت خود وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور بھی نمایاں ہو گئی ہے۔ "میرا نام جوکر" ایک بے حس سماج کے پس منظر میں وجودی اور ذاتی تجربات کی حساس اور پُراثر تصویر کشی ہے۔ ان کی ایک اور اہم فلم "پردیسی" ہند روس دوستی کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی فلمی کہانیاں بھی جن پر دوسرے اہم ڈائرکٹروں نے فلمیں بنائیں مثلاً "نیا سنسار"۔ "ڈاکٹر کوٹنس کی امر کہانی"۔ "آوارہ"۔ "شری چار سو بیس"۔ اور "ادبی" وغیرہ میں بھی عصری زندگی کے کسی نہ کسی اہم پہلو اور عوام کے درد و غم، خوابوں اور مسرتوں کی حساس اور فنکارانہ تصویر کشی کی گئی ہے، مجموعی طور پر ہندوستانی فلم کی بالیدگی اور اسے ایک اعلیٰ مقام عطا کرنے والی شخصیتوں میں عباس کا نام سرفہرست رکھا جا سکتا ہے۔

خواجہ احمد عبّاس کے صحافتی کارناموں پر میرا کچھ اظہار خیال کرنا سورج کو چراغ دکھانے سے بھی زیادہ اوچھی بات ہوگی لیکن یہاں اس بات کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ ضروری ہے کہ عبّاس کی متنوع اور مختلف تخلیقی کاوشوں میں ایک گہرے تسلسل ہم آہنگی اور یکجہتی کے نقوش دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کے جرنلزم میں بھی انھی اصولوں اور اقدار کی کارفرمائی ہے جو ان کے ادبی، ڈرامائی اور فلمی کارناموں کی پہچان ہے۔ یہ تحریریں بھی حقیقت

زاہدہ زیدی

۲۲ ـ ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (یو۔پی)

کافی زور سے چلّانا شروع کیا کہ جس جس کو جشن دی دیکھنا ہے وہ فوراً ان کے ساتھ چلے "جلدی و بچّیو" انھوں نے کہا "سجنے بننے، تیار ہونے کی ئ ضرورت نہیں کوئی تمھیں نہیں دیکھے گا" اور ہم ے جو پہلے ہی سے تیار بیٹھے تھے جلدی سے دوڑ کر ی میں بیٹھ گئے۔ اور آن کی آن میں ماموں باچھو ساتھ نظروں سے غائب ہو گئے ہماری امّاں اور د ان کی دوسری خواتین حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

طرح جب ہندوستان کو آزادی ملی تو ہم نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا اور اس انقلابی ام میں ماموں باچھو ہمارے ساتھ تھے۔

ماموں باچھو سے ایک اور دلچسپ مُلاقات ۱۹ء میں ماسکو میں ہوئی، مَیں وہاں کیمرج سے فیسٹول میں شرکت کے لیے آئی ہوئی تھی اور ماموں سو ایک فلمی یونٹ کے ساتھ ماسکو آئے تھے میری بہنیں کچھ عرصے سے ماسکو ہی میں قیام پذیر ہیں۔ ماموں باچھو دن بھر بیحد مصروف رہتے ن رات کو اکثر میری بہنوں کے ہاں محفل جمتی عزیزوں اور دوستوں کے جمگھٹ میں ماموں باچھو ح محفل ہوتے، میری بڑی بہن صابرہ زیدی کی طرح شراب کو ہاتھ نہ لگاتے لیکن پُر لطف اور سنجیدہ گفتگو، ہنسانا، لطیفہ گوئی گویا انھیں دونوں کا حصّہ تھا۔ ں زمانے میں یہ بھی سُنا کہ ماموں باچھو کھانا پکانے فن میں ماہر ہو گئے تھے۔ اور بقول خود بالکل اورجنل از سے کھانا پکاتے تھے لیکن اس وقت ان کے تھ کا پکا کھانا کھانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اس واقعے سالہا سال بعد یعنی شاید صرف نو۔ دس سال لے میں اور میری بہن ساجدہ شاید کسی مشاعرے سلسلے میں بمبئی گئے ہوئے تھے۔ اور حسب معمول سوں باچھو کے ہاں ٹھہرے تھے۔ ماموں باچھو اب نی کمزور اور معمر ہو گئے تھے۔ وہ جوش اور ولولہ باقی نہیں رہا تھا۔ اکثر خاموش رہتے اور ہر وقت کام میں مصروف رہتے۔ ان کو ذرا خوش کرنے کے لیے ہم نے ان کے کھانا پکانے کا تذکرہ چھیڑ دیا اور شکایتاً کہا کہ ہماری تو انھوں نے کبھی دعوت نہیں کی۔ ماموں باچھو مُسکرائے۔ اور کتنی حسین تھی ان کی مسکراہٹ مسکراتے ہوئے وہ اب بھی کافی کم عمر اور بہت خوبصورت لگتے تھے۔ دوسرے دن صبح سے ماموں باچھو انتظامات میں مصروف ہو گئے کچھ ٹیلیفون کیے، کچھ سامان منگایا اور پھر نوکروں کو سو روپے کا ایک نوٹ دے کر رخصت کر دیا اور ان سے کہا کہ گھومیں پھریں سنیما دیکھیں یا جو چاہیں کریں لیکن شام سے پہلے گھر میں قدم نہ رکھیں۔ ہم لوگوں کو حُکم ملا کہ خواتین کمروں میں بیٹھی رہیں۔ باورچی خانے میں قدم نہ رکھیں۔ اور خود کم عمر لڑکیوں اور بچّوں کو لے کر کچن میں داخل ہو گئے۔ دوپہر کے قریب مہمان آنا شروع ہوئے۔ اندر راج آنند اور ان کے خاندان کے لوگ، آپا پھادی اور ان کی لڑکیاں، اور کچھ اور مخصوص اور بے تکلّف دوست۔ دیکھتے دیکھتے گھر مہمانوں سے بھر گیا۔ ٹھیک ایک بجے ماموں باچھو کے کم عُمر مددگاروں نے میز سجانا شروع کی اور انواع و اقسام کے کھانے میز پر لگا دیے گئے۔ (روٹیاں بازار سے منگائی گئی تھیں) کھانا واقعی بہت لذیذ تھا۔ ماموں باچھو خود بڑی محبت سے سب لوگوں کو کھانا کھلا رہے تھے اور شرما شرما کر سویٹ ڈش کے کچھ خراب ہو جانے کی معذرت کر رہے تھے، تو یہ تھے ہمارے باچھو فلسفی کی طرح گمبھیر، مزدور کی طرح جفاکش، ایک بچّے کی طرح معصوم اور سادہ دل۔ سمندر کی طرح گہرے اور نیلے آسمان کی طرح شفّاف۔

لیکن یہ معمر دانشور اور فنکار، جس کی پیری میں بھی مانند تحریر رنگ شباب تھا اگر حلقۂ یاراں میں بریشم کی طرح نرم تھا تو رزم حق و باطل میں فولاد بھی بن سکتا تھا۔ اور اس سلسلے کا بھی ایک واقعہ سُن لیجیے جو شاید بارہ تیرہ سال پہلے پیش آیا تھا۔ اس وقت ماموں باچھو عبداللہ گرلز کالج پر ایک فلم بنانے علی گڑھ آئے ہوئے تھے لیکن اسلام کے خود ساختہ ٹھیکیدار اس بات سے بہت ناخوش تھے اور روزانہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ کھڑا رہتا یہاں تک کہ ایک دن کچھ طالب علم زبردستی گرلز کالج میں گھس آئے، ان کے فوٹو گرافر سے کیمرہ چھین لیا اور یونٹ کے دوسرے لوگوں سے دست و گریباں ہو گئے۔ دوسرے دن ماموں باچھو کو یونیورسٹی کے کچھ سینئر اساتذہ نے "دوستانہ گفتگو" کے لیے اسٹاف کلب میں مدعو کیا۔ ہم لوگ (میں اور ساجدہ) وقت مقرّرہ پر ماموں باچھو کو لے کر پہنچے۔ اسٹاف کلب میں تمام اہم اور مخصوص پروفیسروں کا مجمع تھا۔ اور وائس چانسلر صاحب خود بھی بہ نفس نفیس موجود تھے۔ سب سے پہلے وائس چانسلر صاحب نے جلدی جلدی ایک گول مول سی تقریر کی اور اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔ اس کے بعد ایک کے بعد ایک سب مخصوص پروفیسروں نے تقریریں کیں جن کا لب لباب یہ تھا کہ حال ہی میں بلٹز میں علی گڑھ یونیورسٹی کے بارے میں ایک نامناسب رپورٹ چھپی تھی اور یہ بڑے افسوس کی بات تھی کہ خواجہ صاحب کے ہوتے ہوئے یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور اب ایک اولڈ بوائے کی حیثیت سے ان کا فرض تھا کہ وہ اس رپورٹ کی پُرزور تردید کریں اور ہمارے دشمنوں کی ریشہ دوانیوں کا پردہ چاک کریں۔ ماموں باچھو بڑے مؤدب انداز سے سب پروفیسروں کی تقریریں سنتے رہے۔ اور آخر میں بڑے نرم لہجے میں کہا کہ "میں خود تو اس رپورٹ کی تردید نہیں کر سکتا کیونکہ بلٹز سے میرا معاہدہ ہے کہ وہ میری ہر تحریر کو بغیر کسی تبدیلی یا کمی بیشی کے شایع کریں گے اور میں بلٹز میں شایع ہوئی کسی رپورٹ کی تردید نہیں کروں گا۔ ہاں مَیں نجی طور سے

ر کافی زور سے چلاّنا شروع کیا کہ جس جس کو جشنِ
زادی دیکھنا ہے وہ فوراً ان کے ساتھ چلے۔ "جلدی
رو بچّیو" انھوں نے کہا "سجنے بننے، تیار ہونے کی
وئی ضرورت نہیں کوئی تمھیں نہیں دیکھے گا"۔ اور ہم
ں جو پہلے ہی سے تیار بیٹھے تھے جلدی سے دوڑ کر
بلسی میں بیٹھ گئے۔ اور آن کی آن میں ماموں باچھو
، ساتھ نظروں سے غائب ہو گئے ہماری امّاں اور
ندان کی دوسری خواتین حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔
ں طرح جب ہندوستان کو آزادی ملی تو ہم نے
ی اپنی آزادی کا اعلان کر دیا اور اس انقلابی
دام میں ماموں باچھو ہمارے ساتھ تھے۔

ماموں باچھو سے ایک اور دلچسپ مُلاقات
۱۹۷ء میں ماسکو میں ہوئی، مَیں وہاں کیمرج سے
تھ فیسٹول میں شرکت کے لیے آئی ہوئی تھی اور ماموں
بھو ایک فلمی یونٹ کے ساتھ ماسکو آئے تھے میری
ن بہنیں کچھ عرصے سے ماسکو ہی میں قیام پذیر
ییں۔ ماموں باچھو دن بھر بیحد مصروف رہتے
ن رات کو اکثر میری بہنوں کے ہاں محفل جمتی
ر عزیزوں اور دوستوں کے جمگھٹ میں ماموں باچھو
مع محفل ہوتے، میری بڑی بہن صابرہ زیدی کی طرح
ہ شراب کو ہاتھ نہ لگاتے لیکن پُر لطف اور سنجیدہ گفتگو،
نسنا ہنسانا، لطیفہ گوئی گویا انھیں دونوں کا حصّہ تھا۔
ں زمانے میں یہ بھی سُنا کہ ماموں باچھو کھانا پکانے
ے فن میں ماہر ہو گئے تھے۔ اور بقول خود بالکل اوریجنل
داز سے کھانا پکاتے تھے لیکن اس وقت ان کے
تھ کا پکا کھانا کھانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اس واقعے
ے سالہا سال بعد یعنی شاید صرف نو، دس سال
ہلے مَیں اور میری بہن ساجدہ شاید کسی مشاعرے
ے سلسلے میں بمبئی گئے ہوئے تھے۔ اور حسب معمول
موں باچھو کے ہاں ٹھہرے تھے۔ ماموں باچھو اب
افی کمزور اور معمر ہو گئے تھے۔ وہ جوش اور ولولہ

باقی نہیں رہا تھا۔ اکثر خاموش رہتے اور ہر وقت
کام میں مصروف رہتے۔ ان کو ذرا خوش کرنے کے لیے
ہم نے ان کے کھانا پکانے کا تذکرہ چھیڑ دیا اور شکایتاً
کہا کہ ہماری تو انھوں نے کبھی دعوت نہیں کی۔
ماموں باچھو مُسکرائے۔ اور کتنی حسین تھی ان کی مسکراہٹ
مسکراتے ہوئے وہ اب بھی کافی کم عمر اور بہت
خوبصورت لگتے تھے۔ دوسرے دن صبح سے ماموں باچھو
انتظامات میں مصروف ہو گئے کچھ ٹیلیفون کیے، کچھ
سامان منگایا اور پھر نوکروں کو سو روپے کا ایک
نوٹ دے کر رخصت کر دیا اور ان سے کہا کہ گھومیں پھریں
سنیما دیکھیں یا جو چاہیں کریں لیکن شام سے
پہلے گھر میں قدم نہ رکھیں۔ ہم لوگوں کو حُکم ملا کہ خواتین
کمروں میں بیٹھی رہیں۔ باورچی خانے میں قدم نہ
رکھیں۔ اور خود کم عمر لڑکیوں اور بچّوں کو لے کر کچن
میں داخل ہو گئے۔ دوپہر کے قریب مہمان آنا شروع
ہوئے۔ اندر راج آنند اور ان کے خاندان کے لوگ
آپا پھادی اور ان کی لڑکیاں، اور کچھ اور مخصوص اور
بے تکلف دوست۔ دیکھتے دیکھتے گھر مہمانوں سے
بھر گیا۔ ٹھیک ایک بجے ماموں باچھو کے کم عُمر مددگاروں
نے میز سجانا شروع کی اور انواع و اقسام کے کھانے میز
پر لگا دیے گئے۔ (روٹیاں بازار سے منگائی گئی تھیں)
کھانا واقعی بہت لذیذ تھا۔ ماموں باچھو خود بڑی
محبت سے سب لوگوں کو کھانا کھلا رہے تھے اور شرما
شرما کر سویٹ ڈش کے کچھ خراب ہو جانے کی معذرت
کر رہے تھے، تو یہ تھے ہمارے باچھو فلسفی کی طرح
گمبھیر، مزدور کی طرح جفاکش، ایک بچّے کی طرح معصوم
اور سادہ دل۔ سمندر کی طرح گہرے اور نیلے آسمان
کی طرح شفّاف۔

لیکن یہ معمر دانشور اور فنکار، جس کی پیری میں
بھی مانند سحر رنگ شباب تھا اگر "حلقۂ یاراں" میں
بریشم کی طرح نرم تھا تو رزم حق و باطل میں فولاد بھی

بن سکتا تھا۔ اور اس سلسلے کا بھی ایک واقعہ سُن لیجیے
جو شاید بارہ تیرہ سال پہلے پیش آیا تھا۔ اس وقت
ماموں باچھو عبداللہ گرلز کالج پر ایک فلم بنانے
علی گڑھ آئے ہوئے تھے۔ لیکن اسلام کے خود ساختہ
ٹھیکیدار اس بات سے بہت ناخوش تھے اور روزانہ
کوئی نہ کوئی ہنگامہ کھڑا رہتا۔ یہاں تک کہ ایک دِن
کچھ طالب علم زبردستی گرلز کالج میں گھس آئے، ان کے
فوٹوگرافر سے کیمرہ چھین لیا اور یونٹ کے دوسرے
لوگوں سے دست و گریباں ہو گئے۔ دوسرے دن
ماموں باچھو کو یونیورسٹی کے کچھ سینئر اساتذہ نے
"مذاکراتی گفتگو" کے لیے اسٹاف کلب میں مدعو کیا۔ ہم
لوگ (میں اور ساجدہ) وقت مقررہ پر ماموں باچھو
کو لے کر پہنچے۔ اسٹاف کلب میں تمام اہم اور مخصوص
پروفیسروں کا مجمع تھا۔ اور وائس چانسلر صاحب
خود بھی بہ نفس نفیس موجود تھے۔ سب سے پہلے
وائس چانسلر صاحب نے جلدی جلدی ایک گول مول
سی تقریر کی اور اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔ اس
کے بعد ایک کے بعد ایک سب مخصوص پروفیسروں
نے تقریریں کیں جن کا لب لباب یہ تھا کہ حال ہی میں
بلٹز میں علی گڑھ یونیورسٹی کے بارے میں ایک نامناسب
رپورٹ چھپی تھی اور یہ بڑے افسوس کی بات تھی کہ خواجہ
صاحب کے ہوتے ہوئے یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور اب
ایک اولڈ بوائے کی حیثیت سے ان کا فرض تھا کہ وہ
اس رپورٹ کی پُر زور تردید کریں اور ہمارے دشمنوں
کی ریشہ دوانیوں کا پردہ چاک کریں۔ ماموں باچھو
بڑے مؤدب انداز سے سب پروفیسروں کی تقریریں
سنتے رہے۔ اور آخر میں بڑے نرم لہجے میں کہا کہ "میں
خود تو اس رپورٹ کی تردید نہیں کر سکتا کیونکہ بلٹز سے
میرا معاہدہ ہے کہ وہ میری ہر تحریر کو بغیر کسی تبدیلی یا کمی
بیشی کے شایع کریں گے اور میں بلٹز میں شایع ہوئی کسی
رپورٹ کی تردید نہیں کروں گا۔ ہاں مَیں نجی طور سے

ان لوگوں سے کہہ دوں گا کہ اپنا ایک نمایندہ یہاں بھیجیں اور ہر پہلو سے صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد ایک متوازن اور معقول رپورٹ شایع کریں"۔ لیکن کچھ لوگ مطمئن نہیں ہوئے اور اس بات پر مصر رہے کہ اس سازش کا پردہ انھیں خود چاک کرنا چاہیے۔ اس پر ماموں باچھو نے کہا کہ "کیا یہ سچ نہیں ہے کہ یونیورسٹی کے بعض عناصر نے کافی تنگ نظری کا ثبوت دیا ہے اور یہاں کلچرل سرگرمیوں اور دوسرے ترقی پسند اور لبرل اقدامات پر اکثر حملے ہوتے رہے ہیں؟" اس پر ایک پروفیسر صاحب جن کی عادت اپنی بات کو ذرا گھما پھرا کر کہنے کی ہے یوں گویا ہوئے۔ کہ "اگرچہ مجھے کہنا تو نہیں چاہیے لیکن ایسا اکثر ہوتا ہے اور یہ بڑے افسوس کی بات ہے لیکن کیا کیا جائے شاید یہی انسانی فطرت ہے اس لیے اگر مجھے اجازت ہو تو عرض کرنے کی جرأت کروں کہ آپ کو کچھ غلط اطلاعات دی گئی ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں" اب ماموں باچھو پورے جوش میں آگئے اور کہنے لگے کہ "ہو سکتا ہے کہ مجھے کچھ غلط اطلاعات دی گئی ہوں لیکن پچھلے دس دن سے خود میرے ساتھ جو ہو رہا ہے کیا اسے بھی اپنی نظروں کا دھوکا سمجھوں' اور اگر میں خود یہ سب باتیں LAST PAGE میں لکھ دوں تو کیا آپ اس وقت بھی یہی کہیں گے کہ یہ سب آپ کے دشمنوں کی ریشہ دوانیاں ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں"۔ اب تو یہ عالم تھا کہ صرف ماموں باچھو بول رہے تھے اور سب پروفیسر حضرات دم بخود تھے۔ علی گڑھ سے واپس جانے کے بعد ماموں باچھو نے وائس چانسلر صاحب (اے۔ ایم خسرو) کو ایک خط لکھا جس میں سب واقعات کا ذکر کرنے کے بعد درخواست کی گئی تھی کہ جن لڑکوں نے نازیبا حرکتیں کی ہیں ان کے خلاف ضروری کارروائی کی جائے (اس خط کی ایک کاپی انھوں نے مجھے اور ساجدہ کو بھی بھیج دی) غالباً اس خط کا کوئی ردِ عمل نہیں ہوا تو ماموں باچھو نے خود اپنے علی گڑھ کے تجربات اور تاثرات کو انتہائی بے لاگ اور دلچسپ انداز سے اور آزاد قلم میں LAST PAGE میں پیش کیا۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے بعض حلقے آگے کی طرف دیکھنے کی بجائے پیچھے کی طرف دیکھ رہے ہیں اور تاریخ کے دھارے کو عہدِ وسطیٰ کی طرف موڑ دینا چاہتے ہیں۔ لیکن پھر شاید انھیں خود خیال آیا کہ تنقید ذرا زیادہ کڑوی ہو گئی ہے اس لیے چند دن بعد اسی کالم میں علی گڑھ یونیورسٹی پر ایک اور مضمون لکھا جس میں علی گڑھ کی روشن اور ترقی پسند روایات کی نشاندہی کی گئی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ یونیورسٹی میں سائنس اور بعض دوسرے شعبوں میں غیر معمولی ترقی ہوئی ہے اور اس کے علاوہ بھی بہت سی خوشگوار تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ اور اگر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تنگ نظر رویوں سے دامن بچا کر اپنے تمام امکانات کو بروئے کار لائے تو قومی زندگی میں ایک اہم رول ادا کر سکتی ہے۔

یادوں اور تاثرات کا سلسلہ بہت طویل ہے اس لیے آخر میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میرے تاثر کے مطابق ماموں باچھو ایک نہایت دلچسپ، ذہین، با اصول، پُرخلوص، پُرجوش اور سچے انسان تھے جن کا دل محبت کا ایک ساگر تھا جس سے ہر شخص اپنے حوصلے اور صلاحیت کے مطابق فیض یاب ہو سکتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ وہ ایک رنگا رنگ انسان بھی تھے۔ خاندان کے چھوٹے بچوں سے وہ بے حد محبت کرتے اور انھیں ہر وقت چڑاتے اور مذاق کرتے رہتے۔ میرا بھانجا جب انھیں "نانا باچھو" کہہ کر پکارتا تو کہتے "نانا ہو گا تیرا باپ میں تو تیرا باچھو بھائی جان ہوں" لیکن دوسری طرف ہم بہنوں کو وہ اپنے سے بہت چھوٹا ظاہر کرتے اور اکثر ہمیں لڑکیو یا بچیو کہہ کر مخاطب کرتے۔ جب میں ذرا کم عمر تھی تو اپنے دوستوں سے کچھ اس طرح میرا تعارف کراتے، "شاید آپ کو یقین نہ آئے یہ اتنی سی لڑکی فرسٹ کلاس ایم۔ اے ہے (یا کیمبرج سے ڈگری لے آئی ہے) اور شاعری بھی کرتی ہے"۔ وہ اکثر کہا کرتے کہ ہمارے خاندان میں مولانا حالی کے بعد یہ دو شاعر (میں اور ساجدہ) پیدا ہوئی ہیں۔ جب میں انھیں یاد دلاتی کہ ہماری اماں بھی شاعر ہیں تو وہ کہتے کہ بڑی باجی تو پرائیویٹ شاعرہ ہیں لیکن تم لوگ پبلک فگر بنتی جا رہی ہو کبھی کبھار وہ خود بھی شعر و تک بندی کرتے۔ ایک بار جب بہت دن بعد علی گڑھ آئے تو ایک دلچسپ اور بے تکی سی نظم لکھی جس کا شعر تو یہ تھا:

غازی آباد آگیا اے دوست
پھر کوئی یاد آگیا اے دوست

اور باقی زیادہ تر شعر ٹوٹتے ہوئے تھے۔ یہ نظم خاندانی حلقوں میں بے حد مقبول ہوئی جب ہم لوگ اُن کو سنتے تو ماموں باچھو بہت خوش ہوتے اور سب سے زیادہ خود اپنا مذاق اُڑاتے۔

ماموں باچھو کو اپنے رشتہ داروں کو بڑھا چڑھانے کا بالکل شوق نہ تھا بلکہ وہ اصولاً اس کے خلاف تھے۔ اس لیے عملی طور پر یا ایک مشہور اہلِ قلم کی حیثیت سے تو انھوں نے ہم بہنوں کی ادبی سرگرمیوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی (بلکہ ادبی حلقوں میں اکثر لوگ یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ ہمارے اتنے قریبی رشتہ دار تھے) لیکن نجی طور پر ہماری ادبی کاوشوں کو کافی سراہتے اور ہمت افزائی کرتے رہتے۔ جب میں اپنی کوئی کتاب انھیں پیش کرتی تو شوق سے پڑھتے اور تعریف کرتے اگر میرا کوئی اچھا مضمون یا ڈراما ان کی نظر سے گزرتا فوراً خط لکھتے اور اس قسم کی چیزیں لکھتے رہنے کا مشورہ دیتے۔ جب میں بمبئی جاتی تو اکثر اپنی کوئی نئی کتاب اور کوئی خاص کتاب شایع ہوتی تو بذریعہ ڈاک کرتے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اپنی کتابوں کا سب سے بڑا خریدار میں خود ہوں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ

کافی بڑی تعداد میں اپنی کتابیں خرید کر خاص خاص
دوستوں اور عزیزوں کو بھیجتے رہتے۔ اگر ہم لوگ کبھی
ان سے ان کی کوئی نئی فلم دکھانے کی فرمائش کرتے تو
بہت خوش ہوتے اور فوراً تیار ہو جاتے کبھی کسی
چھوٹے موٹے ہال میں خاص ہم لوگوں کے لیے فلم شو
کراتے اور اگر ہال کا انتظام نہ ہو سکتا تو گھر پر ہی فلم
دکھاتے۔ لیکن اگر ہم لوگ انھیں کوئی مشورہ دیتے مثلاً
یہ کہ اپنی فلاں ناول پر فلم کیوں نہیں بنائی یا آپ
ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر فلم کیوں نہیں
بناتے تو فوراً خفا ہو جاتے اور زور زور سے چلّانا شروع
کر دیتے کہ تم لوگ کچھ نہیں سمجھتیں، ویسے ہی میری سب
فلمیں فلاپ ہو جاتی ہیں کیا صرف تم لوگوں کو دکھانے
کے لیے فلم بناؤں وغیرہ وغیرہ جتنا جتنا وہ خفا ہوتے
ہم لوگ ہنستے اور آخر میں وہ خود بھی ہنسنے لگتے۔

اور اب اگر مجھے اس بات پر مجبور کیا جائے کہ
میں ذاتی یادوں کے دائرے سے نکل کر معروضی طور پر
ان کی شخصیت کے بارے میں اظہار خیال کروں تو
میں صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ خواجہ احمد عباس
صحیح معنوں میں ایک CREATIVE PERSONALITY
یا تخلیقی شخصیت تھے۔ ذہانت، ذکاوت، فکر کی توانائی،
جذبے کا خلوص، مشاہدے کا اچھوتا پن، بے ساختگی،
جذبات کی فراوانی، ظرافت اور سنجیدگی کا انوکھا سنگم،
بچوں جیسی معصومیت، وسعت نظر اور ایک ہمہ گیر
وژن، یعنی وہ سب خصوصیات جو ایک عظیم تخلیقی شخصیت
کی پہچان ہیں ان میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ اور ساتھ
ہی وہ ایک کمٹڈ انسان اور فنکار بھی تھے (اور یہ بھی
میری نظر میں ایک عظیم تخلیق کار کی پہچان ہے) جس نے
اپنی تمام زندگی ان اعلیٰ قدروں اور آدرشوں کی نذر
کر دی جن سے انھیں گہری وابستگی تھی۔ ان کا آخری
وصیت نامہ جو ان کے انتقال کے بعد بلٹز کے آخری صفحے
اور "آزاد قلم" میں شایع ہوا میری نظر میں ایک "مختصر
شاہکار" ہے جس میں خواجہ احمد عبّاس کی شخصیت اور ان
کے فلسفۂ حیات کے کچھ دلکش، واضح اور شفاف نقوش
اُبھرتے ہیں اور اگر اس "وصیت نامے" کو اور زیادہ مختصر
کر کے شعری پیرائے میں بیان کیا جائے تو وہ اس شعر کے
قالب میں ڈھل جائے گا ؂

حاصل عمر نثار رہ یارے کردم
شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

خواجہ احمد عباس کی وطن دوستی اور
انقلاب پرور سیکولر ... پر بہت کچھ لکھا جائے
گا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ ... پیش کیا گیا
گزری اس کا علم اس کے ساتھیوں کو ہے۔ ایک
واقعہ ... جنگ کا ... تھا
بوری بندر کے علاقے میں ہم ایکسلسیر سینما میں کوئی
انگریزی فلم دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ فلم ختم ہونے پر
جب لوگ باہر نکلے تو پانچ چھ انگریز نوجوانوں نے
عباس کو گھیر لیا اور ان سے شناختی کارڈ طلب کرنے
لگے لیکن شناختی کارڈ رکھنے کا کوئی قانون نہ تھا
عباس حیران تھے کہ اس ہنگامے کا مقصد
کیا ہے لیکن نوجوانوں کو تو چھیڑ خانی سے غرض تھی۔
انھوں نے عباس پر گھونسوں کی بارش شروع کر دی
بہت سے لوگ ادھر اُدھر ... سے نکلے تھے
اور دور سے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے ہم عباس کی مدد
کرنے ان کی طرف دوڑے، ایک شور برپا ہوا اور
نوجوانوں نے لوگوں کا رش دیکھ کر وہاں سے دور ہونے
ہی میں عافیت دیکھی۔ جب ہم لوگ عباس کے پاس
پہنچے تو وہ نہایت اطمینان سے اپنے کوٹ کی شکن
درست کرتے کچھ کہے بغیر وہاں سے چلے گئے۔
ایسا معلوم ہوا کہ جیسے عدم تشدد کے سپاہی ہی کی طرح
وہ گاندھی جی کے آدرش پر عمل پیرا تھے۔

خواجہ احمد عباس کی شخصیت اور ان کے فن پر
بہت کچھ لکھا جائے گا۔ ان سب تحریروں میں عباس
کا سب سے مضبوط پہلو اس کا کردار دکھائی
دے گا۔

سید شہاب الدّین دسنوی
ہماری زبان، خواجہ احمد عبّاس نمبر

جری آدمی

احمد عباس مرحوم کے نانا مولانا الطاف حسین
حالی تھے، ان کے والد خواجہ غلام السبطین بڑے
دیندار، باعمل، سوشل ورکر، اصلاح رسوم کے
زبردست حامی، محب وطن اور اصولوں کے معاملے
میں حد درجہ کٹر تھے۔ ان کا کچھ عرصے تک حکیم اجمل
خاں کے ہندوستانی دواخانہ اور ان کے قائم کردہ
طبیہ کالج دہلی سے بحیثیت جوائنٹ سکریٹری کے
تعلق رہا۔ بعد میں خود اپنا دواخانہ قائم کیا۔
احمد عباس کے چچا زاد بھائی خواجہ غلام السیدین تھے
اور چھوٹی بہن صالحہ عابد حسین جو بہ فضل خدا ابھی
ہمارے درمیان موجود ہیں۔ علم و فضل، روشن
خیالی، اعلیٰ کردار، وطن پرستی اور انسان دوستی
کے ماحول میں پلا یہ لڑکا غالباً ۱۹۲۶ء میں پانی پت
سے آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کر کے علی گڑھ
میں نویں جماعت میں داخل ہوا۔ یہ بہت ذہین
اور ہونہار تھے اور بہت جلد ترقی کی منزلیں طے
کرنے لگے۔ مزاج میں متانت اور سنجیدگی تھی مگر
خشکی کی بجائے شگفتگی اور ملنساری تھی۔ تقریر و
تحریر دونوں میں طبعی ملکہ تھا۔ بہت جلد اپنے ہم
چشموں میں امتیاز حاصل کر لیا۔ تقریری قابلیت
کی علی گڑھ ہی میں کافی شہرت حاصل ہو گئی تھی۔

تحریر میں پہلی کہانی "ابابیل" اور پہلی کتاب ایک
لڑکی" بہت مقبول ہوئیں۔ بی اے فرسٹ ڈویژن
میں کیا تو والد اور دیگر متعلقہ افراد چاہتے تھے کہ
وہ آئی سی ایس کے امتحان میں شرکت کریں یا
قانونی پیشہ اختیار کرنا طے کریں۔ کچھ دن ایل ایل
بی میں پڑھا لیکن جلد ہی بمبئی جا کر دنیائے صحافت
میں داخل ہو گئے اور بریلوی صاحب کے ساتھ
بمبئی کرانیکل میں کام کرنا شروع کیا۔ سیاست،
پبلک لائف اور جرنلزم سے انھیں طبعی دلچسپی تھی
کچھ ہی دنوں میں اپنی قابلیت اور صلاحیت کا
لوہا منوا لیا کچھ مدت گزرنے پر بلٹز کے ایڈیٹر مسٹر
کرنجیا کی درخواست پر "لاسٹ پیج" لکھنا شروع
کیا۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ ان کی تحریر پر کوئی
پابندی عائد نہ کی جائے۔ اس لاسٹ پیج کی
بے انتہا شہرت ہوئی اور وہ بلٹز کا مقبول عام ضمیمہ
رہا۔ جسے وہ آخری دم تک لکھتے رہے۔ جرنلزم کے
ساتھ انھوں نے فلم بنانے کا کام بھی شروع کیا مگر
یہ پیشہ انھوں نے روپیہ کمانے یا سستی شہرت حاصل
کرنے کے لیے نہیں بلکہ اعلا مقصد اور آدرش کی
خاطر اپنایا۔ ان کا مقصد تھا کہ وہ ایسی فلمیں بنائیں
جو ملک کی آزادی کی تحریک کو تقویت پہنچائیں
ناانصافی اور سوشل برائیوں کی پردہ دری کریں

اور مفلسوں، اچھوتوں اور پسماندہ لوگوں کی پریشان
حالی اور پراگندگی سے سماج کو آگاہ کر کے ان کے
ضمیر کو بیدار کریں۔ فلموں سے انھیں کوئی فائدہ نہ
ہوا بلکہ یہ گھاٹے کا سودا رہا کیونکہ عوام جس قسم کی
فلمیں دیکھنا پسند کرتے ہیں، ان کا بنانا احمد عباس
کے بس میں نہ تھا۔ اُن کی فلموں کا فحاشی عریانی
اور ہیجانی مکالموں، رقص اور گانوں سے دور کا
واسطہ بھی نہ تھا۔ اس لئے ان کی اکثر فلمیں ناکام
رہیں مگر اس تلخ تجربے کے باوجود وہ ایک اعلا
جذبے کا ماتحت فلمیں بناتے رہے اور ساری عمر
بجائے عیش کے پریشانیاں اُن کا پیچھا کرتی رہیں
ان کی شہرت ہندوستان سے بہت زیادہ دوسرے
ملکوں خاص کر سوویت روس میں ہوئی۔ انھوں نے
انگریزی، ہندی اور اردو میں متعدد کتابیں لکھیں
جو بہت مقبول ہوئیں۔ احمد عباس بڑے جری
اور دل گردے کے آدمی تھے۔ دس بارہ برس
بیماریوں اور بیماریوں سے لڑتے رہے، نہ صحت کی
پرواہ کی نہ آرام کی۔ فرض شناسی کی دھن میں
اپنا کام کرتے رہے اور آخر اپنے خالق کے حضور
میں پہنچ گئے۔ خدا انھیں اپنی رحمت سے نوازے
اور جرنلزم اور فلموں کی دنیا میں ان کی زندگی
اور اصول پرستی مشعل راہ کا کام کرے۔ ●●

کرنل بشیر حسین زیدی

ہماری زبان، خواجہ احمد عبّاس نمبر

دھرتی کا لال

وہ دن آج بھی ایک واضح اور خوبصورت خواب جیسا میری یادوں کی پلکوں پر ایک شبنمی قطرے کی طرح ٹھہرا ہوا ہے۔ . . اُس دن جُوہُو (بمبئی) کی ساحلی کائنات ایک اطالوی پینٹنگ کی مانند حسین تھی۔ تیز خرام گہرے سُرمئی بادل، دھیمی دھیمی بارش، ایک بہت بڑی سبز رنگ ساڑھی کی طرح لہراتا سمندر اور سلیٹی سے رنگ کا ساحل . . . ساڑھی کا گوٹا! پام اور ناریل کے درخت آہستگی سے رقص کناں، لمحہ لمحہ بھیگتی ہوا جب قدرے تیز چلتی تو موجوں کا آورگن بلند آہنگ ہو جاتا اور پام کے لامبے پتّے سرگوشیاں کرنے لگتے . . . . . وہ سماں اس قدر کیف آگیں تھا کہ زکام کے باوجود بارش میں بھیگنا گراں نہیں گذرا۔ میں بس چلتا جا رہا تھا۔ ایک بس اسٹینڈ کے قریب سے گذرتے ہوئے مجھے اُس کے نیچے پناہ لینے کا خیال بھی نہیں آیا۔ اس وقت وہ مقام خوابوں کا جزیرہ شاید اس لیے بھی تھا کہ مجھ مُردم بیزار کو اپنے سوا وہاں کوئی اور بشر نظر نہیں آیا۔ قطرہ قطرہ شرابور ہوتی سڑک پر کبھی کبھی کوئی کار، ٹیکسی یا لال رنگ کی بس گذر جاتی تھی۔ . . . .

. . . . اور پھر میں جُوہُو چرچ روڈ پر آ گیا۔

راستہ، موسم اور دل، سب پر سرشاری تھی۔

'کتنے خوش نصیب ہیں یہاں کے مکیں . . .!' میں نے سڑک کے دونوں جانب بنے خوبصورت بنگلوں پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا۔ شہر کی غلاظت، ہجوم اور شور شرابے سے دُور، سمندر کے قریب اور ہریالی سے گھری یہ بستی . . . یہی تو شہرِ آرزو ہے!

معاً میری نظر ایک گیٹ کی تختی پر پڑی اور میرے پورے جسم میں ایک خوشگوار سنسناہٹ دوڑ گئی! تختی پر درج تھا ——

کے۔ اے عبّاس

فلومینا لوج

ارے عبّاس صاحب یہاں! . . . ہاں، انو (انور عبّاس) نے بتایا تھا کہ ماموں جان جُوہُو میں رہتے ہیں۔ (میرے پاس اُنُو کا ٹیلی فون نمبر تھا)۔ ایک اُردو ادیب شہر کے پوش ایریے کے ایک خوبصورت بنگلے میں رہائش رکھتا ہے . . . یہ انکشاف میرے لیے حیرت آمیز مسرت کا حامل تھا۔ فلومینا لوج کے آگے سے گذرتے ہوئے میں نے سوچا: کیا عبّاس اس وقت اندر ہیں؟ کچھ لکھ رہے ہوں گے، شاید کوئی افسانہ، ناول یا بلٹز کا آزاد قلم، یا کسی فلم کا اسکرپٹ . . . . ! لکھنے کے لیے کس قدر موزوں ماحول ہے —— خاموش، تنہا، خوبصورت۔

دل میں تمنا جاگی کہ اس یک منزلہ عمارت کو اندر سے بھی دیکھا جائے۔

. . . سچ پوچھیے تو مجاز، منٹو، بیدی، عصمت، عبّاس، قرۃ العین، ساحر، کیفی، سردار اور کرشن چندر ہی میرے دیوتا تھے، جن کی تخلیقات نے میرے کردار اور 'ایمان دھرم' کی تشکیل میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔

جیسا کہ نوعمروں میں ہوتا ہے، اپنی پسندیدہ اور مشہور ہستیوں کو قریب سے دیکھنے کی آرزو میری بھی تھی۔ یہ ۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ میں سینٹ اسٹیفن کالج (دلّی یونیورسٹی) میں سیکنڈ ایر کا طالب علم تھا۔ ایک دن اُردو کے پروفیسر مسٹر مجیب الرحمٰن نے کلاس میں مجھ سے کہا: "اے جنرل سیکریٹری بزمِ ادب، تمھارے تمام محبوب اہلِ قلم آج کل دلّی میں ہیں، کیوں نہ کالج میں ایک ادبی نشست کر لی جائے!" یہ اطلاع اور اس سے وابستہ وہ امکان میرے لیے بہت بڑی بات تھی۔ لہٰذا اس زرّیں موقعے سے فیضیاب ہونے کے لیے دیگر اُردو طلبا کے ساتھ میں کالج کے ریڈنگ روم میں ایک شامِ افسانہ کا انعقاد کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس محفل میں سجاد ظہیر، کرشن چندر، حبیب تنویر اور منور لکھنوی کے علاوہ کسی اور قابلِ ذکر مصنّف نے شرکت نہیں کی۔ مگر میں اپنے دیگر دیوتاؤں کے درشن کرنے پر بضد تھا۔ لہٰذا، اس تقریب کے دو دن بعد جب چاندنی چوک کے ٹاؤن ہال میں کہیں عظیم تر پیمانے پر ایک ادبی تقریب منعقد ہوئی تو میں وہاں موجود تھا اور —— پہلی بار وہاں میں نے فراق گورکھپوری، عصمت چغتائی، بیدی، ساحر لدھیانوی، مجروح سُلطان پوری، امرتا پریتم، واجدہ تبسم اور خواجہ احمد عبّاس کو دیکھا بھی، سُنا بھی۔ عبّاس افسانہ پڑھنے لگے تو میں نے پایا کہ اُن کے چہرے، آواز اور لب و لہجے میں بھی وہی تلخی ہے جو میں نے اُن کی تحریروں اور فلموں میں محسوس کی تھی۔ افسانہ پڑھنے کے دوران موصوف ایک بار فراق سے ایسے اُلجھے کہ سامعین دو گروہ میں بٹ کر ہاتھا پائی پر اُتر آئے۔ ادبی محفل کی اس بے ادبی کو ساحر نے اپنی نظم "خون پھر خون ہے" پڑھ کر شانت کیا تھا۔ عبّاس نے دوبارہ افسانہ پڑھنا شروع کیا

راجیو مرزا

سی ۴/۳، رانا پرتاپ باغ، دہلی ۱۱۰۰۰۷

ے پھونے بے موقعہ تالی بجادی۔ اس پر
ر پھر مائک کے سامنے سے ہٹ کر اپنی نشست
ے بڑے زور سے انھوں نے فرش پر اپنے
ے کو پٹکا تھا۔ اور ہاں! جو افسانہ انھوں نے
وہ بھی افریقی رہنما (غالباً ممباسا) کے قتل پر
ناراضگی کا ہی اظہار تھا۔

اس رات گھر پہنچ کر اپنی ڈائری میں اُس
یں دیکھے اور نے ہر فنکار کو مَیں نے ایک ایک نام
عباس صاحب کو نام دیا تھا ـــــــــــ
ڑا ایکٹری ہیں!'

اسے اتفاق ہی کہیے کہ ۱۹۶۴ء میں بمبئی جانے
بل اور بی۔اے فائنل کے امتحانات کے بعد جو
درجن کتابیں مَیں نے بڑے انہماک سے پڑھیں
ں چھ عباس صاحب کی تھیں۔ یعنی جب
نگاراں پہنچا تو 'عباسیت' میرے ذہن پر خاصی
ی تھی، اور سپنوں کے اُس شہر میں جو فلم میں نے
ت پہلے دیکھی وہ ''شہر اور سپنا'' تھی۔ بڑے
ٹارز، ننگے سیٹس، بھڑکیلے رقص، ذومعنی مکالموں
بک پبلسٹی جیسی نعمتوں سے محروم ہوتے ہوئے
یہ لو بجٹ فلم ایک نہایت خوبصورت اور اعلیٰ
جے کی فنی تخلیق تھی۔ اِس فلم کے ہر فریم میں عبّاس
، وہ عبّاس جو پوری سچّائی سے زندگی بھر ہر
جی بُرائی اور ظُلم کے خلاف جنگ کرتا رہا۔ 'شہر اور سپنا'
بھی اُس نے یہی جنگ لڑی تھی بہ حیثیت
فنکار!

اور یہ فلم دیکھنے کے دوسرے دن ہی میں بہ عالمِ
ارگی اور قطعی اتفاقاً 'فلومینا لوج' کی طرف جا نکلا
۔ تو ــــ مَیں عبّاس سے ملنے کے لیے بیقرار کیوں
ہوتا، جبکہ 'پرچھائیوں کے دیس' میں داخلے کا
تمنّی مَیں بھی تھا۔

اگلے دن مَیں نے فون پر انور کو بتایا کہ اُس کے
ماموں سے ملنا چاہتا ہوں۔

''پرسوں گیارہ بجے آجاؤ'' اُس نے کہا۔

اور دو دن بعد جب مَیں گیارہ بجے لوج کے
برآمدے میں بیٹھا عبّاس صاحب کے وارد ہونے کا
انتظار کر رہا تھا میرے اضطراب کا اندازہ آپ
کر ہی سکتے ہیں۔ کچھ ہی لمحوں بعد زندگی میں پہلی بار
میں اپنی محبوب اور ایک مشہور ہستی کو قریب سے دیکھنے
والا تھا، اُس سے بات کرنے والا تھا!

میرے ساتھ اس دن وہاں خاصی رونق تھی۔
اندر ڈرائنگ روم میں، میرے ساتھ برآمدے میں اور
باہر چھوٹے سے لان میں موجود لوگوں میں کچھ کو بنا کبھی
پہلے ملے میں پہچان گیا تھا، مثلاً ڈیلوڈ، جینت،
نانا پلیسکر اور جگدیش کنول کو، جنھیں سینکڑوں بار پردۂ
سیمیں پر دیکھ چکا تھا۔

مجھے یاد ہے اس وقت انور (جو سینٹ اسٹیفنس)
کالج میں میرے ساتھ پڑھ چکا تھا، کہہ رہا تھا:
''تمھیں معلوم ہے کبیر بیدی اور اجے (پریکشت) ساہنی
اسٹیفنینس (Stephenians) ہیں اور اب
روشن سیٹھ (فلم گاندھی کا نہرو) بھی بمبئی آنے
والا ہے۔''

''اور مَیں بھی تو آچکا ہوں!'' مَیں نے
اِترا کر کہا۔

''مگر کیوں آئے ہو؟!!''

مَیں نے چونک کر پیچھے مُڑ کر دیکھا، یہ آواز
انور عبّاس کی نہیں اُس کے ماموں کی تھی، جو غالباً
ایک لمحہ پہلے ہی اُدھر آئے تھے۔ وہی کرخت آواز،
وہی سخت چہرہ! مَیں نے اُٹھ کر آداب کیا تو میرا
کندھا دبا کر بولے: ''بیٹھیے، بیٹھیے۔ کتنے دن ہو گئے
بمبئی آئے ہوئے؟''

''جی ... آج دسواں دن ہے'' میں
نے جواب دیا۔ اور اسی لمحے انور اُٹھ کر چلا گیا۔

''جتنی فلم انڈسٹری میں ہیروز کی کمی نہیں
ہے'' انھوں نے غالباً مُسکراتے ہوئے تبصرہ کیا جس
پر میرا سبز بز ہونا لازمی تھا۔ بھلا ہیرو یا ایکٹر بننے
کی بات کہاں سے آگئی؟ کالج کے ڈراموں میں تو
میری طرح انور نے بھی حصّہ لیا تھا۔

''جی میں ..... میں ہیرو نہیں، میں
..... میں تو .....''

''آپ کی پسندیدہ فلم پرسنلٹیز کونسی ہیں؟''
یہ سوال بھی بہت غیر متوقع اور اٹ پٹا لگا۔

''جی ... جیون، سپرو، ڈیوڈ، کنہیالال
افتخار ... اُلہاس، جینت، اور ...''

''ارے واہ!'' عبّاس اُچھل پڑے۔ ''کیوں
صاحب آپ دلیپ کمار، راج کپور، دیو آنند کا نام
نہیں لے رہے۔ آپ کو یہ گلیمر کے دیوتا ہیرو لوگ
پسند نہیں؟''

مجھے یہ تینوں بھی پسند تھے، لیکن میں نے
چڑھ کر کہہ دیا:

''جی نہیں!''

''سُنیے حضرات!'' وہ ڈرائنگ روم کی طرف
مُڑ کر بولے:

''میرے لیے ایک حیرت انگیز اور آپ صاحبان
کے لیے حوصلہ خیز اطلاع ہے۔ پورے ہندوستان
میں آخر ایک ایسا شخص نکل آیا جو لاکھوں لینے
والے اسٹار ہیروز کا نہیں، چند ہزار پر صبر کرنے
والے کریکٹر ایکٹروں کا پرستار ہے۔ صاحب ایک
معاملے میں تو ہماری آپ کی پسند یکساں ہے۔''

تبھی ان کا ملازم جعفر ایک لفافہ لے کر آگیا۔
''معذرت چاہتا ہوں'' کہہ کر وہ لفافے سے ایک
کاغذ نکال کر پڑھنے لگے۔ یہ مہلت ملتے ہی پہلا خیال

دھرتی کا لال

وہ دن آج بھی ایک واضح اور خوبصورت خواب جیسا میری یادوں کی پلکوں پر ایک شبنمی قطرے کی طرح ٹھہرا ہوا ہے... اُس دن جُوہُو (بمبئی) کی ساحلی کائنات ایک اطالوی پینٹنگ کی مانند حسین تھی۔ تیز خرام گہرے سُرمئی بادل، دھیمی دھیمی بارش، ایک بہت بڑی سبزگوں ساڑھی کی طرح لہراتا سمندر اور سلیٹی سے رنگ کا ساحل... ساڑھی کا گوٹا! پام اور ناریل کے درخت آہستگی سے رقص کناں، لمحہ لمحہ بھیگتی ہوا جب قدرے تیز چلتی تو موجوں کا آورگن بلند آہنگ ہو جاتا اور پام کے لامبے پتّے سرگوشیاں کرنے لگتے..... وہ سماں اس قدر کیف آگیں تھا کہ زکام کے باوجود بارش میں بھیگنا گراں نہیں گذرا۔ میں بس چلتا جا رہا تھا۔ ایک بس اسٹینڈ کے قریب سے گذرتے ہوئے مجھے اُس کے نیچے پناہ لینے کا خیال بھی نہیں آیا۔ اس وقت وہ مقام خوابوں کا جزیرہ شاید اس لیے بھی تھا کہ مجھ مُردم بیزار کو اپنے سوا وہاں کوئی اور بشر نظر نہیں آیا۔ قطرہ قطرہ شرابور ہوتی سڑک پر کبھی کبھی کوئی کار، ٹیکسی یا لال رنگ کی بس گذر جاتی تھی.....

..... اور پھر میں جُوہُو چرچ روڈ پر آگیا۔

راستہ، موسم اور دل، سب پُرسرشاری تھی۔

"کتنے خوش نصیب ہیں یہاں کے مکیں...!"

میں نے سڑک کے دونوں جانب بنے خوبصورت بنگلوں پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا۔ شہر کی غلاظت، ہجوم اور شور شرابے سے دُور، سمندر کے قریب اور ہریالی سے گھری یہ بستی... یہی تو شہرِ آرزو ہے!

معاً میری نظر ایک گیٹ کی تختی پر پڑی اور میرے پورے جسم میں ایک خوشگوار سنسناہٹ دوڑ گئی! تختی پر درج تھا ——

کے۔ اے عبّاس
فلومینا لوج

ارے عبّاس صاحب یہاں!... ہاں، انوّ (انور عبّاس) نے بتایا تھا کہ ماموں جان جُوہُو میں رہتے ہیں۔ (میرے پاس انوّ کا ٹیلی فون نمبر تھا)۔ ایک اُردو ادیب شہر کے پوش ایریے کے ایک خوبصورت بنگلے میں رہائش رکھتا ہے... یہ انکشاف میرے لیے حیرت آمیز مسرّت کا حامل تھا۔ فلومینا لوج کے آگے سے گذرتے ہوئے میں نے سوچا: کیا عبّاس اس وقت اندر ہیں؟ کچھ لکھ رہے ہوں گے، شاید کوئی افسانہ، ناول یا 'بلٹز' کا 'آزاد قلم' یا کسی فلم کا اسکرپٹ... یہ لکھنے کے لیے کس قدر موزوں ماحول ہے —— خاموش، تنہا، خوبصورت۔

دل میں تمنّا جاگی کہ اس یک منزلہ عمارت کو اندر سے بھی دیکھا جائے۔

... سچ پوچھیے تو مجاز، منٹو، بیدی، عصمت، عبّاس، قرۃ العین، ساحر، کیفی، سردار اور کرشن چندر ہی میرے دیوتا تھے، جن کی تخلیقات نے میرے کردار اور 'ایمان دھرم' کی تشکیل میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔

جیسا کہ نوعمروں میں ہوتا ہے، اپنی پسندیدہ اور مشہور ہستیوں کو قریب سے دیکھنے کی آرزو میری بھی تھی۔ یہ ۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ **میں سینٹ اسٹیفن کالج** (دلّی یونیورسٹی) میں سیکنڈ ایر کا طالب علم تھا۔ ایک دن اُردو کے پروفیسر مسٹر مجیب الرحمٰن نے کلاس میں مجھ سے کہا: "اے جنرل سیکریٹری بزمِ ادب! تمھارے تمام محبوب اہلِ قلم آج کل دلّی میں ہیں، کیوں نہ کالج میں ایک ادبی نشست کر لی جائے!" یہ اطلاع اور اُس سے وابستہ وہ امکان میرے لیے بہت بڑی بات تھی۔ لہٰذا اس زرّیں موقعے سے فیضیاب ہونے کے لیے دیگر اُردو طلبا کے ساتھ میں کالج کے ریڈنگ روم میں ایک شام افسانہ کا انعقاد کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس محفل میں سجّاد ظہیر، کرشن چندر، حبیب تنویر اور منوّر لکھنوی کے علاوہ کسی اور قابلِ ذکر مصنّف نے شرکت نہیں کی۔ مگر میں اپنے دیگر دیوتاؤں کے درشن کرنے پر بضد تھا۔ لہٰذا، **اس تقریب کے دو دن بعد** جب چاندنی چوک کے ٹاؤن ہال **میں کہیں عظیم** تر پیمانے پر ایک ادبی تقریب منعقد ہوئی تو میں وہاں موجود تھا اور —— پہلی بار وہاں میں نے فراق گورکھپوری، عصمت چغتائی، بیدی، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری، امرتا پریتم، واجدہ تبسم اور خواجہ احمد عبّاس کو دیکھا بھی، سُنا بھی۔ عبّاس افسانہ پڑھنے لگے تو میں نے پایا کہ اُن کے چہرے، آواز اور لب و لہجے میں بھی وہی تلخی ہے جو میں نے اُن کی تحریروں اور فلموں میں محسوس کی تھی۔ افسانہ پڑھنے کے دوران موصوف ایک بار فراق سے ایسے اُلجھے کہ سامعین دو گروہ میں بٹ کر ہاتھا پائی پر اُتر آئے۔ ادبی محفل کی اس بے ادبی کو ساحر نے اپنی نظم "خون پھر خون ہے" پڑھ کر شانت کیا تھا۔ عبّاس نے دوبارہ افسانہ پڑھنا شروع کیا

راجیو مرزا

سی ۲/۴، رانا پرتاپ باغ، دہلی ۷، ۱۱۰۰۰۷

بھیڑ میں سے کچھ نے بے موقعہ تالی بجا دی۔ اس پر وہ ایک بار پھر مائک کے سامنے سے ہٹ کر اپنی نشست پر جا بیٹھے۔ بڑے زور سے انھوں نے فرش پر اپنے ... کو پٹکا تھا۔ اور ہاں! جو افسانہ انھوں نے پڑھا، وہ بھی افریقی رہنما (غالباً ممباسا) کے قتل پر ان کی ... ناراضگی کا ہی اظہار تھا۔

اس رات گھر پہنچ کر اپنی ڈائری میں اُس بزم میں دیکھے اور سنے ہر فنکار کو میں نے ایک ایک نام دیا۔ عباس صاحب کو نام دیا تھا —— 'ڈا اونلڈ اینگری مین'!

اسے اتفاق ہی کہیے کہ ۱۹۴۶ء میں بمبئی جانے سے قبل اور بی اے فائنل کے امتحانات کے بعد جو ڈیڑھ درجن کتابیں میں نے بڑے انہماک سے پڑھیں ان میں چھ ... عباس صاحب کی تھیں۔ یعنی جب شہر نگاراں پہنچا تو 'عباسیت' میرے ذہن پر خاصی حاوی تھی۔ اور سپنوں کے اُس شہر میں جو فلم میں نے سب سے پہلے دیکھی وہ "شہر اور سپنا" تھی۔ بڑے اسٹارز، مہنگے سیٹس، بھڑکیلے رقص، ذومعنی مکالموں اور بگ پبلسٹی جیسی نعمتوں سے محروم ہوتے ہوئے بھی یہ لو بجٹ فلم ایک نہایت خوبصورت اور اعلیٰ درجے کی فنی تخلیق تھی۔ اس فلم کے ہر فریم میں عبّاس تھا، وہ عبّاس جو پوری سچائی سے زندگی بھر ہر سماجی بُرائی اور ظلم کے خلاف جنگ کرتا رہا۔ 'شہر اور سپنا' میں بھی اُس نے یہی جنگ لڑی تھی بہ حیثیت ایک فنکار!

اور یہ فلم دیکھنے کے دوسرے دن ہی میں بعالمِ آوارگی اور قطعی اتفاقاً 'فلومینا لوج' کی طرف جا نکلا تھا۔ تو —— میں عبّاس سے ملنے کے لیے بیقرار کیوں نہ ہوتا، جبکہ 'پرچھائیوں کے دیس' میں داخلے کا متمنی میں بھی تھا۔

اگلے دن میں نے فون پر انور کو بتایا کہ اُس کے ماموں سے ملنا چاہتا ہوں۔

"پرسوں گیارہ بجے آجاؤ" اُس نے کہا

اور دو دن بعد جب میں گیارہ بجے لوج کے برآمدے میں بیٹھا عبّاس صاحب کے وارد ہونے کا انتظار کر رہا تھا میرے اضطراب کا اندازہ آپ کر ہی سکتے ہیں۔ کچھ ہی لمحوں بعد زندگی میں پہلی بار میں اپنی محبوب اور ایک مشہور ہستی کو قریب سے دیکھنے والا تھا، اُس سے بات کرنے والا تھا!

میرے ساتھ اس دن وہاں خاصی رونق تھی۔ اندر ڈرائنگ روم میں، میرے ساتھ برآمدے میں اور باہر چھوٹے سے لان میں موجود لوگوں میں کچھ کو بنا کبھی پہلے ملے میں پہچان گیا تھا، مثلاً ڈبلوڈ، جینت، نانا پلسیکر اور جگدیش کنول کو، جنھیں سینکڑوں بار پردۂ سیمیں پر دیکھ چکا تھا۔

مجھے یاد ہے اس وقت انور جو سینٹ اسٹیفنس کالج میں میرے ساتھ پڑھ چکا تھا، کہہ رہا تھا: "تمھیں معلوم ہے کیہ بیدی اور اے (پرکٹیکت) سائنی اسٹیفینیئنس (Stephenians) ہیں اور اب روشن سیٹھ (فلم گاندھی کا نہرو) بھی بمبئی آنے والا ہے۔"

"اور میں بھی تو آچکا ہوں!" میں نے اترا کر کہا۔

"مگر کیوں آئے ہو؟!!"

میں نے چونک کر پیچھے مُڑ کر دیکھا، یہ آواز **انور عبّاس کی نہیں اُس کے ماموں کی تھی،** جو غالباً **ایک لمحہ پہلے ہی اُدھر آئے تھے۔** وہی کرخت آواز، **وہی سخت چہرہ!** میں نے اُٹھ کر آداب کیا تو میرا کندھا دبا کر بولے: "بیٹھیے، بیٹھیے۔ کتنے دن ہوگئے بمبئی آئے ہوئے؟"

"جی ... جی آج دسواں دن ہے" میں نے گھبرا کر جواب دیا۔ اور اُسی لمحے انور اُٹھ کر چلا گیا۔

"بھئی فلم انڈسٹری میں ہیرو بنے کی تو کوئی نہیں ہے" انھوں نے غالباً مسکراتے ہوئے تبصرہ کیا جس پر میرا چڑ جانا لازمی تھا۔ بھلا ہیرو یا ایکٹر بننے کی بات کہاں سے آگئی؟ کالج کے ڈراموں میں تو میری طرح انور نے بھی حصّہ لیا تھا

"جی میں ..... میں ہیرو نہیں، میں ..... میں تو ......"

"آپ کی پسندیدہ فلم پرسنلٹیز کون سی ہیں؟"

یہ سوال بھی بہت غیر متوقع اور اٹ پٹا لگا۔

"جی ... جیون، سپرو، ڈیوڈ، کنہیالال افتخار ... الیاس، جینت، اور ..."

"ارے واہ!" عبّاس اُچھل پڑے۔ "کیوں صاحب آپ دلیپ کمار، راج کپور، دیوآنند کا نام نہیں لے رہے۔ آپ کو یہ گلیمر کے دیوتا ہیرو لوگ پسند نہیں ہیں؟"

مجھے یہ تینوں بھی پسند تھے۔ لیکن میں نے چڑھ کر کہہ دیا:

"جی نہیں!"

"سُنیے حضرات!" وہ ڈرائنگ روم کی طرف مڑ کر بولے:

"میرے لیے ایک حیرت انگیز اور آپ صاحبان کے لیے حوصلہ خیز اطلاع ہے۔ پورے ہندوستان میں آخر ایک ایسا شخص نکل آیا جو لاکھوں لینے والے اسٹار ہیرو کا نہیں، چند ہزار پر صبر کرنے والے کریکٹر ایکٹروں کا پرستار ہے۔ صاحب ایک معاملے میں تو ہماری آپ کی پسند یکساں ہے۔"

تبھی ان کا ملازم جعفر ایک لفافہ لے کر آ گیا۔

"معذرت چاہتا ہوں" کہہ کر وہ لفافے سے ایک کاغذ نکال کر پڑھنے لگے۔ یہ مہلت ملتے ہی پہلا خیال

ٹکٹ بھاگ لینے کا آیا۔ مجھے عبّاس صاحب کا رویّہ
سخت ناگوار گذر رہا تھا، میں اُٹھنے کو ہی تھا کہ میری
نظر مین گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہوئے پُرانے
وقتوں کے مشہور ہی مین ہیرو اور آج کے گُمنام ــــ سے
کریکٹر ایکٹر جیراج پر پڑی۔ تمام پُرانے اداکار میرے
لیے خاص کشش رکھتے ہیں۔ مختصر یہ کہ تین چار منٹ
بعد میرے میزبان پھر مجھ سے مخاطب تھے: "اچھا
صاحب تو کیوں آئے ہیں آپ بمبئی؟"

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے ڈائریکشن میں دلچسپی
ہے۔"

"بھئی آفیشلی اور ان آفیشلی میرے ایک
درجن معاون ہیں۔"

"ماموں جان میں تو ۔ ۔ ۔" میں نے جھلّا کر
کہا "میں تو آپ کا دیدار کرنے چلا آیا تھا۔" کہتے
ہوئے میں نے اُٹھنے کا انداز اختیار کیا۔

"دیدار؟" اُن کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ
آئی مگر طنزیہ۔

"بھئی میں کوئی ہیرو تو ہوں نہیں، جس
کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے لوگ ہزار جتن کرتے
ہیں۔ میری شکل دیکھ کر تو آپ کو مایوسی ہوئی ہوگی۔
اچھا آپ ڈائریکشن کی بات کر رہے تھے؟ فلم
میکینک پر آپ نے کتنی کتابیں پڑھی ہیں؟"

"جی ابھی تک تو ایک بھی نہیں ۔ ۔ ۔"

"کیوں نہیں؟" اُنھیں غصّہ آ گیا۔

"اب تک میں اسٹوڈنٹ ۔ ۔ ۔"

"تو کیا صرف کورس کی کتابیں پڑھتے
تھے؟"

"کتابیں تو میں نے ماموں جان دُنیا
بھر کی ۔ ۔ ۔ ۔"

"مگر صرف فلم کی نہیں!" وہ ایک بار پھر
میری بات کاٹ کر تیز لہجے میں بولے "فلم لائن اختیار
کرنے سے پہلے میں نے اس زمانے میں، جب اس موضوع
پر کتابیں بڑی مشکل سے دستیاب ہوتی تھیں، تو نجانے
کہاں کہاں سے ڈھونڈ کر، مانگ کر، چُرا کر اور مفلسی کے
باوجود خرید کر ایک سو تریپن کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔۔۔"

تبھی ڈیوڈ ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئے تو انھیں
مخاطب کر کے بولے: "مسٹر ڈیوڈ آپ کو یاد ہے: 'فلم
از بورن': نام کی کتاب حاصل کرنے کے لیے میں نے
۔ ۔ ۔" ــــ وہ کتاب حاصل کرنے کا قصّہ خاصہ طویل
ثابت ہوا۔ پھر ڈیوڈ بھی عبّاس صاحب کی ایام جوانی
کی گوناگوں مصروفیات کے متعلق بتانے لگے کہ کس
طرح موصوف بیک وقت ڈھیر سارے کام کیا کرتے
تھے۔ نیز کہ ڈائریکشن اُنھوں نے کتنی محنت ــــ سے
سیکھی ہے۔

"اور آپ کو تو یہ بھی خبر نہیں ہوگی کہ مسٹر
ستیہ جیت رے نے زمانۂ طالب علمی میں ہی فلم سازی
پر سینکڑوں کتابیں پڑھ لی تھیں۔ ایک آپ ہیں کہ
آپ نے ایک بھی کتاب پڑھنے کی زحمت گوارہ نہیں
کی۔ نہیں جناب، آپ بھی صرف فلمی گلیمر سے متاثر
ہیں! آپ بھی یہی سوچ کر بمبئی تشریف لائے ہیں کہ
دولت، شہرت اور مقبولیت آپ کا یہاں بے چینی سے
انتظار کر رہے ہیں۔"

جب موصوف دیر تک اسی تحقیر آمیز انداز
میں بولتے رہے تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔
تب میں نے بھی خاصے غُصّے سے کہا: "ماموں جان،
محبوب خاں نے فلم سازی پر ایک بھی کتاب نہیں
پڑھی تھی!"

یا تو میرا پلٹ کر جواب دینا ہی اُنھیں
ناگوار گذرا یا میری بات ہی از حد احمقانہ تھی کہ
عبّاس غُصّے سے بے قابو ہو گئے۔

"آپ!" اُنھوں نے میز پر مُکّا مار کر کہا۔
"جاہلوں کے زمانے کی بات کر رہے ہیں؟ آپ کو
آگے بڑھنا ہے یا پیچھے لوٹنا ہے۔ آپ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !!!"

ــــ غیض و غضب کی مورت بنے عبّاس مجھے اسی
طرح ذلیل کرتے رہے۔ شدید غُصّے کے ساتھ ساتھ مجھے
یہ احساس مارے ڈال رہا تھا کہ درجنوں لوگوں کے
رُوبرو میری ایسی کی تیسی کی جا رہی ہے۔

کیا محض اس لیے کہ میں ایک گُمنام، بے مقام،
نوعمر شخص ہوں؟ ساتھ ساتھ میں حیرانی سے یہ بھی
سوچ رہا تھا کہ آخر میں نے ایسا کیا کہا کہ وہ اس
قدر مشتعل ہو گئے؟؟

عبّاس صاحب کو اندر سے بُلاوا آیا تو راحت
کی سانس لے کر میں نے اُٹھتے ہوئے رُخصتی سلام
کیا۔ سرپٹ بھاگنے کو میرے پیر بیتاب تھے۔

"آپ کھانا کھا کر جائیں گے!" 'بلٹز' کا آخری
صفحہ لکھنے والے نے مجھے اُسی خوفناک انداز میں مدعو
کیا اور پیر پٹختے ہوئے اندر چلے گئے۔ کھانا کس کمبخت
سے کھایا جاتا۔ کئی لوگوں کے روکنے کے باوجود میں
لوج سے باہر نکل گیا۔ میں تیزی سے جوہو بیچ کی
طرف جا رہا تھا ــــ

بے سروسامانی اور بے گھری کا عالم، بمبئی جیسا
بے رحم، بے حس، بے مروّت، مہانگر اور اتنی بڑی خواہش
۔ ۔ ۔ ۔ ایسے میں انور کی دوستی بہت بڑا سہارا تھی،
لیکن اس کے ماموں سے میں اس قدر متنفّر اور
خائف ہو چکا تھا کہ دوبارہ 'فلومینا لوج' کے خیال
پر ہی لعنت بھیجی۔ اب عبّاس میرے ناپسندیدہ
افراد میں تھے۔ بھئی، آدمی کتنا بھی بڑا ہو، اُسے
چھوٹوں سے، نوجوانوں سے شفقت سے پیش آنا
چاہیے، اُن کا حوصلہ بڑھانا چاہیے، نہ کہ بلاوجہ ذلیل
اور پست ہمّت کیا جائے۔

او گاڈ! اپنے محبوب اپنے آدرش اور کسی
مشہور شخص سے میرا اوّلین سابقہ ۔ ۔ ۔ یہ کیسا

شکستِ خواب تھا!

عروس البلاد مشرق بمبئی میں ڈھائی سال تک رہا۔ اُس ناکام، بیکار اور آوارہ دور میں، میں بہر حال پی۔ ایل سنتوشی کا فلم اسسٹنٹ ڈائریکٹر بننے میں کامیاب ہوا تھا اور کرشن چندر کا نقل نویس، مترجم اور کسی حد تک سیکریٹری بھی۔

دوسری بار مجھے سترہ سال بعد سپنوں کے اُسی شہر میں جانے کا موقعہ ملا، جسے پتھروں کا نگر بھی کہتے ہیں اور جو آج بھی بہتوں کے لیے ایک کشش، ایک بلاوا، ایک چیلنج ہے!

سترہ سال ——

اِس طویل مدّت میں مَیں کچھ اور بہت مشہور فنکاروں، ادیبوں، شاعروں، حتیٰ کہ رہنماؤں اور عام آدمیوں سے بھی مل لیا تھا۔ خوابوں نے کچھ اور بے وفائی کی تھی، حقیقتوں نے کچھ اور ڈسا تھا۔ اضطراب کو سوچنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ کتنے ہی عقاید اوہام ثابت ہوئے تھے۔ اِن سترہ برسوں میں مَیں نے دیکھ لیا تھا سیاست، مذہب، فن اور ادب کے اُن دیوتاؤں کو جن کے آدرش کے بُت مشکلات کی ذرا سی آنچ سے پگھل گئے تھے یا طمع کے بازار میں بہت سستے بک گئے تھے۔

ان سترہ برسوں میں مجھے بتا دیا گیا تھا کہ کچھ حیات بخش دواؤں میں زہر بھی ڈالا جاتا ہے۔ مَیں نے دیکھ لیا تھا کہ گلاب سے مُلایم ہاتھ مسلسل محنت کرنے سے بد وضع پتھر بن جاتے ہیں۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ سقراط نے زہر، عیسیٰ نے صلیب اور گاندھی نے گولی قبول کرنے سے انکار کیوں نہیں کیا!

ان سترہ برسوں میں —— مَیں نے بے شمار تحریریں پڑھ ڈالی تھیں، عبّاس صاحب کی اور دوسروں کی بھی۔

بے شمار فلمیں دیکھ لی تھیں، عبّاس صاحب کی اور دوسروں کی بھی۔

اور مَیں نے دیکھ لیا تھا کہ دیر تک جلنے والے چراغ کو چھُوا جائے تو اس کی کالکھ سے ہاتھ میلے ہی نہیں ہوتے، اس کی تپش سے جل بھی جاتے ہیں۔

اسی لیے اب میں عبّاس صاحب کے تئیں شرمندہ تھا، اور اب میرے دل میں ان کے لیے عقیدت پہلے سے زیادہ تھی، پھر بھی . . . . .

. . . . پھر بھی ایک سال تک ان سے مُلاقات کرنے کی میری ہمّت نہیں ہوئی، جبکہ اُن دنوں تقریباً روز 'فلومینا لوج' کے سامنے سے گذرتا تھا۔ ایک تو غالباً میرے لاشعور میں اب تک وہی خوف سکونت پذیر تھا۔ دوسرے، آزاد قلم کے مُصنّف کے روبرو بیٹھنے کی اوقات یا حیثیت میری اب بھی نہیں ہوئی تھی۔

لیکن (مختصر یہ کہ) ایک سال کے تذبذب اور اٹھّارہ سال بعد مَیں ایک دن پھر فلومینا لوج میں داخل ہوا۔

وہاں موجود عبّاس صاحب کے معاون (اب آزاد مُصنّف اور صحافی) شفیق احمد نے میری چند نگارشات کے حوالے سے میرا تعارف کروایا تو مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ گفتگو کا آغاز چونکہ خوشگوار تھا، اس لیے مَیں نے اپنی پہلی مُلاقات کا ذکر چھیڑا۔ عبّاس صاحب نے چونک کر میری طرف غور سے دیکھا: "اوہ! محبوب خاں کے حامی!"

مجھے سخت حیرت ہوئی ان کی یادداشت پر۔ مَیں تو سوچ رہا تھا، فقط ان اٹھّارہ سالوں میں ہی نہ جانے کتنے ہزار نوجوان اُن سے مل چکے ہوں گے۔ کس کس کو یاد رکھا جا سکتا ہے؟

گفتگو کے دوران عبّاس صاحب اُٹھ کر ڈرائنگ روم سے ملحق ایک کمرے میں جا کر لوٹے تو میرے دل میں ایک درد کی لہر اُٹھی۔ وہ فالج زدہ تھے! یہ مجھے معلوم تھا، مگر اُن کے چہرے، آواز اور گفتگو کے انداز سے یہ بات مجھے یاد ہی نہیں آئی تھی۔

گفتگو —— مختلف موضوعات پر ہوتی ہوئی 'نیا سنسار' کی فلموں تک آ گئی۔ اور میں نے وہ بات کہہ دی جو مدّت سے میرے دل میں تھی۔ وہ بات تھی نازک، اس لیے پوری احتیاط برتتے ہوئے، ایک مدحیہ تمہید کے بعد، میں نے نہایت حلیمی و ملائمت سے کہا: "ماموں جان، آپ کی فلموں کے شیدائی اور ہندوستان میں صحت مند سینما کے طرفدار آپ سے ایک گذارش کرتے ہیں۔ آپ کی ہر فلم میں ایک پیغام ہوتا ہے، اور یقیناً آپ چاہتے ہیں کہ وہ پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے؟"

"یقیناً چاہتا ہوں۔" عبّاس صاحب نے قدرے چونک کر کہا۔

"تو اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ کی فلمیں عوام میں بھی مقبول ہوں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ہندوستانیوں کی ذہنیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے فلموں میں کم از کم ایک چیز ایسی ڈالی جائے جو سینما ہالوں تک انھیں کھینچ تو سکے۔"

"مثلاً؟" میزبان کا چہرہ اب یک دم سنجیدہ تھا۔

"اور کچھ نہیں، اگر آپ اپنی فلموں میں صرف مقبول اسٹارز . . ."

"میں ایسا نہیں کر سکتا!!" وہ بھڑک کر کھڑے ہو گئے، "آپ مجھے بے ایمانی اور حماقت سے سمجھوتا کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں!" پھر اُن کی آواز تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ "میں اپنی فلمیں اسٹاروں کی نہیں اپنی مرضی اور اپنے پلان کے مطابق بنانا

چاہتا ہوں۔ فنی شعور اور تعمیری نظریات سے عاری
اسٹاروں کے آگے میں گھٹنے نہیں ٹیک سکتا!" وہ
غصّے سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ "ان کے چمچوں کے لیے
وہسکی اور اُن کے کُتّوں کے لیے پیسٹری فراہم نہیں کر سکتا!
سیٹ پر بیٹھا گھنٹوں اُن کا انتظار نہیں کر سکتا! میں
کبھی ان کے در پر ماتھا ٹیکنے نہیں جا سکتا ـــــ سمجھے
آپ! میں کبھی اسٹاروں، فنانسروں، ڈسٹری بیوٹروں
اور ناقدروں کے حکم کے مطابق فلم نہیں بنا سکتا!"
عبّاس بول نہیں رہے تھے، چیخ رہے تھے۔ وہ ایک
غضبناک مجذوب معلوم ہو رہے تھے۔ اور میں ہکّا بکّا
تھا۔ مجھے لگا آج بھی وہی اٹھارہ سال پہلے کا زمانہ
ہے۔ وہی لمحات ہیں اور میں عبّاس صاحب کے اندر
جاتے ہی باہر نہیں بھاگا، غلطی سے وہیں برآمدے
میں بیٹھا رہ گیا اور ان کے دوبارہ آتے ہی سلسلۂ
کلام جاری ہو گیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی۔
خوف، کبیدگی اور احساسِ ذلّت کی مجھ پر وہی
کیفیات طاری ہو گئیں، مگر بس چند لمحوں کے
لیے۔ میرا اضطراب یکلخت سکون میں بدل گیا۔
چند ثانیوں قبل جس سے ڈر محسوس ہو رہا تھا، اُس
پر پیار آنے لگا۔ سر، بصد احترام اس کے قدموں
پر جھک جانا چاہتا تھا۔ اچانک مجھ پر عرفان ہوا کہ
اس گھائل زمینی فرشتے کی یہ جنونی حالت، وہ بھی
ایک مجھ سے بے بضاعت شخص کے روبرو، اُس کے
دیانت دار فنکار ہونے کی دلیل ہے۔ مجھے لگا میں
اپنے سامنے ساری دُنیا کے اس واحد شخص کو دیکھ
رہا ہوں، جس نے کبھی مصلحت کی قبا نہیں اوڑھی
کبھی سمجھوتے کی ڈھال ہاتھ میں نہیں لی...

سمجھوتا ـــــ کیا اسی خوبصورت لفظ
نے آج پورے عالم میں ابنِ آدم کی خود داری،
عزّتِ نفس، تہذیب اور شخصی آزادی و انفرادیت
کو ڈس نہیں لیا؟؟

..... رفتہ رفتہ عبّاس نارمل ہو گئے
اور ایک عجیب سی مُسکراہٹ کے ساتھ بولے: "مرنے
والا ہوں نا، اس لیے اتنا چیختا چلّاتا ہوں"۔ پھر
وہ پہلے جیسے خوشگوار موڈ میں آگئے۔

فلومینا لوج سے باہر آیا تو اس بار بھی
میرے قدم جُوہو بیچ کی طرف اُٹھنے لگے۔ چند
منٹ بعد پُر ہجوم ساحل پر کھڑا میں سمندر کو
دیکھ رہا تھا ـــ مچلتے، تڑپتے، کف آلود ہوتے
سمندر کو۔ پام اور ناریل کے درخت تانڈو نرت
کر رہے تھے، ہوا پاگل اور ہر موج بے چین تھی۔
سمندر میں وہ زلزلہ کیوں تھا ـــ؟

بمبئی کا رُخ کرنے والوں (بشمول مالکانِ
ادبِ عالیہ) میں بیشتر کی منزل گلیمر کے تھالوں میں
رکھی دولت بھری شہرت ہی ہوتی ہے۔ ہزار جتن
کے بعد بھی وہاں ناکام رہے تو کہہ دیا، ہم وہاں کے
بازاری پن سے سمجھوتا نہیں کر سکے۔ کامیابی ملنے لگی
تو زیادہ کی ہوس میں بازاری پن کے ساتھ ہر طرح
کے گھٹیا پن پر بھی اُتر آئے۔

مگر عبّاس اُدھر گئے تو اس لیے کہ ان کے
پاس ایک صالح پیغام تھا، جسے وہ دُور تک پہنچانا
چاہتے تھے۔ اور اپنے اس پیغام سے اُنھوں نے
کبھی بے ایمانی نہیں کی: دھرتی کے لال، راہی،
انہونی، چار دل چار راہیں، مُنّا، شہر اور سپنا،
ہمارا گھر، سات ہندوستانی، آسمان محل، فاصلہ،
دو بُوند پانی، بمبئی رات کی باہوں میں، اور نکسلائٹ
نامی فلمیں سیلولائیڈ پر ثبت خواجہ احمد عبّاس کا وہ
کلام ہے جسے سمجھنے اور سراہنے کے لیے ہندوستانی
ذہن کو ابھی مزید پچاس برس درکار ہیں۔ فلمی مشاعرے
میں سیلولائیڈ کے اس شاعر کی ہر غزل ہوٹ ہوتی

رہی، مگر نہ تو اس نے کبھی اپنا رنگ بدلا
آفس کے مصرعۂ طرح یا فرمائش پر کچھ کہا
تمام اشعار بامعنی پھر بھی چلے او
سے اس قدر بیگانہ کون ہو سکتا ہے!
دیکھیے فلمی دُنیا وہ دُنیا ہے جہا
بقا کے لیے اچھے اچھے اپنے اعلیٰ اصولوں
خودداری اور شرافتِ نفس کی بلی چ
میں زیادہ تامل سے کام نہیں لیتے۔ پور
میں مجھے ناقابلِ شکست کردار کا مالک کوئی
ملا۔ مرحوم میں کئی انسانی خامیاں، کمیا
تھیں۔ کبھی کسی لغزش کا شکار وہ بھ
ہوں گے، مگر آج کے اس پاگل اور کم
کوئی جتنا مخلص فنکار ہو سکتا۔
وہ تھے!!

تجارتی پیمانے پر عبّاس صاحب
فلمیں ناکام رہیں۔ اس ناکامی کے لیے
وہ خود بھی ذمّہ دار تھے۔ اُن کی اس ز
بُنیاد دلیں تھی ـــ ضد!
دراصل اُنھیں فلم انڈسٹری
اور فلموں میں پیش کیے جانے والے
اور اُن کے اندازِ پیشکش سے سخت
اُن جیسے وطن پرست، انسان نواز
فنکار کی یہ نفرت بڑی فطری اور
اس جذبے نے جب ضد کا رُوپ دھ
گڑبڑ ہونے لگی۔ مثلاً اپنی فلمو
سنگیت اور پبلسٹی پر اُنھوں نے
توجہ نہیں کی۔
مگر فلموں میں عبّاس صا
ناکامی یعنی مخلص سنیما کی شکست
طور پر ذمّہ دار ہے ہماری وہ فلم

حرف بہ حرف

فکر و فن کے نقوش

خواجہ احمد عبّاس — (پروفیسر) محمد حسن
خواجہ احمد عبّاس : حقیقت اور کہانی — (ڈاکٹر) حنیف فوق
عبّاس کا آزاد قلم — رفعت سروش
گیہوں اور گلاب ـــ ایک تجزیہ — (ڈاکٹر) سیّد حامد حسی[illegible]
خواجہ احمد عبّاس کی ناول نگاری — (ڈاکٹر) غلام حسین
انقلاب ـــ ایک اجمالی جائزہ — (ڈاکٹر) کہکشاں یاسمی[illegible]
بچّوں کے خواجہ احمد عبّاس — (ڈاکٹر) خوشحال زید[illegible]

خواجہ احمد عباس

خواجہ احمد عباس کی شخصیت بڑی تو رنگا رنگ تھی اور ان کے کارنامے صحافت سے لے کر فلم سازی تک پھیلے ہوئے تھے لیکن اُردو ادب کے لیے ان کی حیثیت بنیادی طور پر افسانہ نگار ہی کی ہے۔ انھوں نے ناول بھی لکھے اور کم سے کم ایک ناول "انقلاب" کا ادبی دُنیا میں خاصا چرچا بھی ہوا لیکن افسانہ نگار احمد عباس ناول نگار احمد عباس پر غالب ہی رہا۔

خواجہ احمد عباس اب ہم میں نہیں ہیں لیکن یہاں والٹیر کا یہ قول دہرانے کے لایق ہے کہ مُردوں کا بھی ہم پر اتنا ہی حق ہے جتنا کہ زندوں کا جس طرح ہم ہر زندہ ادیب کی محض اس وجہ سے تحسین اور تعریف نہیں کر سکتے کہ وہ زندہ ہے اسی طرح ہر مرحوم ادیب کی تعریف بھی ہم پر محض اس کے اس دُنیا سے رُخصت ہو جانے کی وجہ سے لازم نہیں۔ یہ غلط ہوگا کہ صرف اس بنا پر کسی ادیب کی تعریف و تحسین ہی تک خود کو محدود رکھیں۔

کسی ادیب کے لیے اتنا ہی خراجِ عقیدت کافی ہے کہ مجروح کے لفظوں میں یہ کہا جائے ؎

مرے پیچھے یہ تو محال ہے کہ زمانہ گرمِ سفر نہ ہو
کہ نہیں مرا کوئی نقشِ پا کہ دلیلِ راہ گزر نہ ہو

خواجہ احمد عباس نے اُردو کے افسانوی ادب کے دورِ زرّیں میں لکھا ان کے معاصرین میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری اور غلام عباس جیسے افسانہ نگار تھے جنھوں نے کہانی کو نیا موڑ دیا اُردو کہانی ہی کو نہیں ہندوستان اور پاکستان کی کہانی کو نئی معنویت بخشی۔ خواجہ احمد عباس ان بلند قامت فنکاروں کی دُنیا میں بے نام نہیں رہے۔

یقیناً خواجہ احمد عباس منٹو کی طرح کہانی بُننے اور زندہ جاوید قسم کے کردار ڈھالنے والے فنکار نہ تھے یقیناً کرشن چندر کی طرح کی خواب آلود فضا اور شعریت سے بھرپور نثر احمد عباس کے بس کی نہ تھی نہ وہ بیدی کی طرح انسانی شخصیت کی نفسیاتی گہرائیوں تک پہنچ سکتے تھے نہ عصمت کی طرح پردے کے پیچھے کی ہندوستانی مُسلم خواتین کی فطرت کی عکاسی کر سکتے تھے کیونکہ وہ احمد عباس تھے ـــــ صرف احمد عباس۔

ان کا کارنامہ یہ تھا کہ وہ اپنے فن کو اپنے دَور اور اپنے وطن کی حقیقت سے قریب رکھتے تھے اور پھر حقیقت خواہ کتنی ہی سنگین کیوں نہ ہو اس کو اپنے اُوپر طاری کرنے یا اس سے مغلوب ہونے کے بجائے ایک سچے مگر رومانویت پسند وطن پرست کی طرح انسان کی اس صلاحیت پر یقین رکھتے تھے کہ ایک نہ ایک دن وہ ان سنگین حقیقتوں کو خوبصورت خوابوں کی تعبیر کی شکل میں ڈھال ہی لے گا۔

یہ اعتماد اور امید ان کا کارنامہ بھی ہے اور ان کی کمزوری بھی۔ کارنامہ اس لیے کہ سنگین حقیقتوں کے آگے سپر ڈالنے کا عام طور پر انجام حقیقت پسندی کے نام پر مریضانہ مایوسی یا عفونت پسندی کو گلے لگا کر اس میں کھو جانا ہی ہوتا ہے بڑے بڑے فن کار بھی اس اندھیرے کا شکار ہو چکے ہیں جن میں ایملی زولا سے لے کر سعادت حسن منٹو تک کا نام لیا جا سکتا ہے سوال یہ اُبھرتا ہے کہ حقیقت خواہ کتنی ہی بھیانک، ہمت شکن اور سنگین کیوں نہ ہو، کیا یہ حقیقت ابدی اور ناقابلِ تغیر ہے۔ بقول فیض ؎

اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بارِ ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

کمزوری اس لیے کہ حقیقت پر فتح کے خواب دیکھتے دیکھتے ادیب اور شاعر فارمولوں کا شکار ہو جاتا ہے اور اپنے کو اور اپنے پڑھنے والوں کو جذباتی تسکین پہنچانے کی خاطر خوشگوار انجام خواہ مخواہ ڈھونڈھ نکالتا ہے اس سے پڑھنے والا کہانی پڑھ کر اطمینان سے سوچتا ہے کہ آخر کار حق دار کو حق مل ہی گیا اور بے خواب نگاہوں کی بالآخر سن لی گئی مگر افسانہ ایسا کانٹا نہیں بن پاتا جو پڑھنے والے کے دل میں مدتوں کھٹکتا رہے۔

یہ کمزوری شاید خواجہ احمد عباس کے ہاں صحافت اور فلم سے آئی ہے جس سے وہ ادب میں بھی پیچھا نہیں چھڑا سکے ہیں ان کی کہانیوں میں ایک خاص قسم کی عجلت کا نشان ملتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں "ممدو بھائی" یا "سوگندھی" یا حیات اللہ انصاری کی "آخری کوشش" کا سا کوئی یادگار کردار نہیں ملتا "سردار جی" بھی نہیں "بارہ گھنٹے" کا وہ انقلابی بھی نہیں جو پھانسی کے تختے پر چڑھنے سے پہلے ایک بار جنسی آسودگی کی تمنّا کرتا ہے۔

خواجہ احمد عباس ایسے فنکار نہ تھے جنھوں نے زندگی کو محض تماشائی کے طور پر دیکھا ہو۔ وہ زندگی کو محض اتفاقات کا ہجوم نہیں سمجھتے تھے بلکہ آدرشوں اور خوابوں میں سانس لینے والے انسان تھے کوئی بات نہیں اگر یہ آدرش بار بار ٹوٹیں اور بار بار خواب کا بوس بن کر پیچھا کریں کیونکہ آدرش اور خواب ایک ایسا نشہ ہیں جو نجات بھی فراہم کرتا ہے کم سے کم انسان اپنی زندگی اور اس کی قدروں کی معنویت پر یقین کر سکتا ہے اور ان کے سہارے

محمد حسن

۷۔ ڈی، ماڈل ٹاؤن، دہلی ۱۱۰۰۰۹

زندگی گزار سکتا ہے۔

خواجہ احمد عبّاس نے اسی طرح زندگی گزاری۔

ان کی پہلی کہانی جس کا نقش آج بھی میرے ذہن پر ہے " ایک لڑکی" تھی کہانی علی گڑھ کی تھی جب علی گڑھ کا چھوٹا سا تعلیمی قصبہ کلاس اور ہوسٹل لڑکیوں کے وجود سے بھی خالی تھے قصہ صرف اتنا سا ہے کہ لق و دق میدان میں طلبا اور اساتذہ جمع ہیں اور وائس چانسلر فارغ التحصیل طلبا کو خطاب کر رہے ہیں ایک ہجوم زوروں پر ہے کہ ایک لڑکا پیالی ہاتھ میں لیے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور زوردار آواز میں کہتا ہے" ایک لڑکی" اور اس ایک لڑکی کو دیکھنے کے لیے (جو دُور سڑک پر گزر رہی ہے) طلبا اور اساتذہ کا پورا مجمع کھڑا ہو جاتا ہے۔

کہانی چھوٹی سی ہے مگر اس سے یہ تو ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار روایت کے پرانے بندھنوں کو توڑنے والا نوجوان ہے جو مرد اور عورت کی مساوات کا قائل ہے جو انسانیت کی ان قدروں کو اپنانا چاہتا ہے جو زمانے کی ترقی اور رفتار اسے بخش رہی ہے اس کہانی میں منٹو کی جنس زدگی ہے اور نہ انگارے کی کہانیوں کی سی طوفانی کیفیت ــــ ایک اعتدال کی کیفیت ہے جو خواجہ احمد عبّاس کی پہچان بن گئی۔ لبرل فنکار کی پہچان۔

فیض احمد فیض نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ "میر کے کلام میں بلند اشعار بہت بلند ہیں اور پست اشعار بہت پست مگر سودا کے کلام میں ہمواری ہے یہ درست ہے کہ بلند اشعار بہت بلند نہیں ہیں لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ پست اشعار بہت پست نہیں ہیں سبھی اشعار ایک سطح یا تقریباً ایک سطح کے ہیں۔

خواجہ احمد عبّاس کا بھی یہی حال ہے کہانی کا نام کچھ ہو فلم کا نام کچھ ہو، مگر ان سب کا موضوع ایک ہی ہوتا ہے وہ موضوع ہے ــــ انسان کا استحصال انسان کے ہاتھوں یا پھر عدم مساوات اور ان کو دُور کرنے کے لیے انسانوں کی جدوجہد۔ دوسری کہانی ہے "دو پائیلی چاول"۔ جو دوسری جنگ عظیم کے آخری چند سالوں میں لکھی گئی بنگال میں قحط پڑ چکا تھا اور راشن کی دُکانوں کے آگے نادار خریداروں کی قطاریں لمبی ہوتی جا رہی تھیں "دو پائیلی چاول" اسی دور کی کہانی ہے جب ضرورت مند انسان، مرد اور عورتیں جان دے سکتے تھے مگر قطار میں اپنی جگہ نہیں چھوڑ سکتے تھے انسانیت کی اس بپتا کو احمد عبّاس نے اپنے ڈھنگ سے لکھا ہے فضا تو آ گئی مگر اس کے پیچھے کارفرما انسانوں کی انفرادی شخصیتیں نہیں آئیں ۔ شاید "دو پائیلی چاول" کا بحران پریم چند کے ناول گئودان سے کہیں بڑا تھا مگر یہاں بات اجتماعی بپتا ہی پر ختم ہو گئی کوئی ہوری، کوئی گھیسو، کوئی مادھو نہیں اُبھرا۔

اور یہاں بات آتی ہے احمد عبّاس کی قدروں کی۔ احمد عبّاس کو زندگی کے معمولات اور اس کی حُسن کاری بہت عزیز ہے وہ ایسے نوجوانوں کے متوالے ہیں جو زندگی کی اچھی چیزوں سے نعمتوں اور برکتوں سے پیار کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں عشق و محبت کے خواب دیکھ سکتے ہوں اور ان خوابوں میں زندگی بسر کر سکتے ہوں۔ وہ ایک ایسے سیکولر ہندوستان کے متوالے ہیں جہاں جہالت اور بھک مری سے لوگ آزاد ہو چکے ہوں، جہاں مختلف زبانوں اور مختلف علاقائی تہذیبوں کے تفرقوں سے لوگ آزاد ہو چکے ہوں جہاں توہم اور کٹرپن اور ذات پات کے بندھنوں سے لوگ آزاد ہو چکے ہوں اور سب لوگ بلاتفریق مذہب و ملت ایک دوسرے سے مل جُل کر ہندوستان کی صنعتی ترقی میں لگے ہوں اسے پسماندگی سے، اُبھار کر ایک ترقی یافتہ ملک بنانے کی جدوجہد میں مصروف ہوں اور نوجوان مرد اور عورتیں محنت اور محبت کی اس جدوجہد کے دوران زندگی کی خوبصورت چیزوں سے لگاؤ رکھتے ہوں اور اس طرح انسانی شخصیت عظمت کی راہ طے کر رہی ہو۔

یہاں دو باتیں اہم ہیں ایک یہ کہ خواجہ احمد عبّاس کے نزدیک وحدت جبری یکسانیت کا نام نہیں کہ سب کو ایک وردی پہنا دی جائے سب کو ایک زبان بولنے پر مجبور کیا جائے یا سب کا ایک مذہب ہو۔ یہ وحدت بلاجبر و اکراہ رغبت اور رضامندی سے پیدا ہونے والی ہے جس میں ہر علاقے کی پہچان برقرار رہتی ہے ہر تہذیبی اور لسانی اکائی قائم رہتی ہے اور یہ سب اکائیاں اپنی رضامندی سے مل جُل کر ایک اکائی بناتی ہیں ــــ اور یہی وہ کرب ہے جس سے خواجہ احمد عبّاس کا وطن پچھلے چالیس سال سے گزر رہا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ خواجہ احمد عبّاس کے افسانوں میں عشق ذرا ماڈرن طرز کا لُطف و لذّت والا عشق ہے اس میں شدّت اور والہانہ پن نہیں ہے اس میں شعریت اور رومانویت نہیں ہے۔ وہ شہر اور سینما کے نوجوان عاشق اور محبوبہ کا تصور تو کر سکتے ہیں لیکن دیوداس یا انارکلی اور سلیم کا تصور نہیں کر سکتے۔ والہانہ پن کی یہی کمی، گہرائی کا یہ فقدان ہی خواجہ احمد عبّاس کو عظیم فنکار نہیں بننے دیتا۔

پھر تیسری کہانی آئی جو "سنترے" کے عنوان سے "نقوش" لاہور میں چھپی۔ اس کہانی کا مرکزی کردار دراصل شہر ناگپور ہے۔ ناگپور ہمیشہ سے سنتروں کے لیے مشہور رہا ہے ایک زمانے میں رات کے بارہ بجے ہندوستان کی چاروں سمتوں سے ہوائی جہاز آ کر ناگپور کے ہوائی اڈے پر ملا کرتے تھے اور پھر اپنی اپنی سمتوں کے لیے روانہ ہو جاتے تھے پھر ناگپور اس زمانے میں انجینئرنگ کی تعمیرات کا اہم مرکز بن گیا تھا جو نئے ہندوستان کی تقدیر بدلنے والے تھے جواہرلال نہرو کے لفظوں میں ــــ نئے ہندوستان کی یہی نئی عبادت گاہیں تھیں خواجہ احمد عبّاس نے ناگپور کی انہی تینوں چاروں حیثیتوں کو لے کر کہانی کی شکل دے دی اور اسے ایک ایسے نوجوان ہندوستانی انجینئر کی آپ بیتی بنا دیا جو صنعتی ہندوستان کی تعمیر میں پوری لگن اور تندہی سے لگا ہوا ہے۔

اس کہانی کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ خواجہ احمد عباس کے افسانوں کی بناوٹ کا اندازہ ہو سکے ان کے اندر کا صحافی ان کے اندر کے ادیب پر ہمیشہ غالب رہا ہے صحافی کے لیے معلومات کی اہمیت ہے ادیب کے لیے کیفیت کی۔ یہ درست ہے کہ دونوں میں کوئی بہیر یا تضاد نہیں ہے مگر یہ بھی بھولنا چاہیے کہ جس طرح انگور سے نچوڑا ہوا رس جب تک تخمیر کے عمل سے نہ گزرے شراب نہیں بن سکتا اسی طرح جب تک معلومات ذات کے احساس اور جذبے کی گرمی سے نہ گزریں کیفیت میں نہ ڈھلیں ادب نہیں بن سکتیں۔

ایک اور کہانی جسے شاید دوسری کہانیوں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت حاصل ہوئی 'سرداری' کے نام سے چھپی یہ ایک متعصب تنگ نظر مسلم لیگی کردار کی زبانی بیان ہوئی ہے جو غیر مسلموں سے سخت نفرت کرتا ہے اور جب ہندو مسلم فسادات میں اس کا پڑوسی سکھ اس تنگ نظر مسلم لیگی کے خاندان کو اپنی جان دے کر بچاتا ہے تب بھی وہ اس عظیم قربانی کو ان کی بھول ہی پر محمول کرتا ہے ـــــ کہانی چونکہ واحد متکلم میں بیان ہوئی ہے اس لیے اکثر پڑھنے والے جو کہانی کے آرٹ سے پوری طرح واقف نہیں، اسے خواجہ احمد عباس کا بیان سمجھے اور اسی سے غلط فہمی پیدا ہوئی سکھوں نے اسے اپنی توہین سمجھا اور مقدمہ دائر کیا گیا۔ مگر یہ شاید ایسی مثال ہے جہاں احمد عباس اپنے توازن اور اعتدال کے باوجود پڑھنے والوں میں وہ توازن اور اعتدال پیدا نہ کر سکے۔

خواجہ احمد عباس نے عظیم کہانیاں نہیں لکھیں ان کے افسانوں اور ناول میں ایسا کوئی کردار نہیں جو مدتوں زندہ رہنے والا ہو مگر جو چیز ان کہانیوں کو شاید مدتوں بعد بھی پڑھے جانے کے قابل رکھے وہ ایک صحت مند معاشرے کی پُرخلوص تلاش ہے جو ان کی ہر سطر میں ملتی ہے۔

خواجہ احمد عباس کی پہلی محبت ہندوستان ہے اور دوسری محبت انسانیت۔ ان دونوں میں تضاد نہیں ہے ایک تسلسل ہے ہندوستان کی محبت نے انھیں ایک تو کٹر قسم کا سامراج دشمن بنا دیا۔ وہ انگریزوں سے کسی قسم کی مفاہمت کے لیے تیار نہیں تاج برطانیہ سے وفاداری ان کے لیے جرم عظیم سے کم نہیں دوسرے اس محبت نے انھیں یہ سکھایا کہ ہندوستان' ہندوستان کا ترانہ گاتے رہنا یا جے ہند' کہہ کر سلامی دیتے رہنا کافی نہیں ہندوستان کی سچی خدمت ہے تو یہی کہ اسے ترقی یافتہ صنعتی ملک بنایا جائے اور صنعتی اور ترقی یافتہ ملک بنتا ہے ترقی یافتہ ذہن کے ڈسپلن والے انسانوں سے اور یہ انسان بنتے ہیں بہتر اقدار کے ذریعے بہتر آدرش اور معنی خیز خوابوں کی مدد سے۔ اور اپنے فن کو انھوں نے اسی فریضے کے لیے معنون کیا۔

بقول اقبال ؎

تری دُعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دُعا ہے تری آرزو بدل جائے

اپنے دور کے ہندوستان کے لوگوں کی آرزوؤں اور خوابوں کو بدلنے ہی کی کوشش وہ اپنے افسانوں اور فلموں کے ذریعے کرتے رہے۔

انسانیت سے بے پناہ محبت نے انھیں سکھایا عدم مساوات کے خلاف لڑنا استحصال اور بے انصافی کے خلاف آواز بلند کرنا۔ یہ آواز بلند کرنا کتنا ہی بے اثر کیوں نہ ہو اس سے فرد میں مقابلے کی قوت، ایثار کی ہمت، قربانی کا حوصلہ اور اپنے آدرش کے لیے لڑنے اور مرنے کی لگن تو بیدار ہوتی ہی ہے جو شخصیت کو نیا وزن اور وقار دیتی ہے اسے نئی توانائیوں سے روشناس کراتی ہے ـــــ انھیں گاندھی جی پسند تھے تو اس بنا پر کہ ان کی شخصیت میں ایسی قوت تھی جو ناانصافیوں اور استحصال کے پہاڑوں سے ٹکرا سکتی تھی اور اس آویزش سے انفرادی عظمت کی تعمیر کرتی تھی انھیں نہرو سے محبت اور عقیدت تھی تو اسی لیے کہ نہرو نئے صنعتی دور کے ہندوستان کا خواب دیکھتے تھے اور سوشلسٹ ہندوستانی سماج کا تصور پیش کرتے تھے وہ بین الاقوامی امن، عالمی تعاون اور عالمگیر اشتراکی سماج کا خواب دیکھتے تھے تو اسی لیے کہ انسانیت جن زنجیروں میں آج جکڑی ہوئی ہے ان سے آزاد ہو۔ ان کا ڈراما 'انساس اور ایٹم بم' اسی کی علامت تھا۔

یہ درست ہے کہ خواجہ احمد عباس اس سب کو عظیم آرٹ میں تبدیل نہ کر سکے مگر مجاہدوں کے کارنامے بقول رشید احمد صدیقی مالِ غنیمت سے نہیں جانچے اور پرکھے جاتے بلکہ ٹوٹی ہوئی تلوار، میدانِ جنگ کے گرد و غبار اور خون آلود لباس سے جانچے اور پرکھے جاتے ہیں خواجہ احمد عباس کی زندگی مبارک ہے کہ اس عظیم الشان جدوجہد میں گزری، یہ الگ بات ہے کہ اس جدوجہد میں فنکار کی حیثیت سے ان کو کس قدر کامیابی ملی۔ بقول فیض ؎

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ آن سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جان کی کوئی بات نہیں

محفوظ مقام

(پروفیسر) عبدالمغنی، مضمون: خواجہ احمد عباس' ایک تنقیدی تاثر

اردو افسانہ نگاروں کی دوسری صف میں خواجہ احمد عباس کی جگہ محفوظ ہے، انہیں انسانیت سے ہمدردی تھی۔ وہ کمزوروں، محروموں اور مجبوروں کی دادرسی کرنا چاہتے تھے، ان کے خیال میں موجودہ سماج ناانصافیوں سے بھرا ہوا تھا اور اس ظلم و ستم سے نجات کی صورت یہ تھی کہ ماحول میں ایک انقلاب ہو۔ اس انقلاب کا راستہ ہموار کرنے کے لیے انھوں نے فلم اور صحافت کے ساتھ ادب کے وسیلۂ اظہار سے بھی کام لیا اور چند ایسی تخلیقات پیش کیں جنہیں پڑھ کر کچھ نقطۂ نظر پر سبق لیا جا سکتا ہے یقیناً یہ ایک نظریاتی ادب ہے اور اس کے نظریے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، کیا جاتا ہے، کیا جانا چاہیے۔ مگر اس کے تحت جو ادب پیدا ہوا ہے، وہ ادب ہی ہے۔ اس کا وصف اور درجہ جو بھی ہو۔ وہ ادب کے نام پر ناقدانہ ادب کی شکست و ریخت نہیں ہے۔ لہٰذا اس ادب کی قدر شناسی ممکن ہے اور ہماری ادبی روایت میں اس کا ایک مقام ہے۔

خواجہ احمد عبّاس: حقیقت اور کہانی

حالی کا مسدّس برِّصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی اور تہذیبی بیداری کی علامت تھا۔ اسے صرف سرسید کے اعمالِ حسنہ ہی میں نہیں اس دور کے سب سے مؤثر محرکات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ حالی سے نہ صرف جدید اُردو شاعری کی سب سے مستحکم روایت قائم ہوتی ہے بلکہ جدید اُردو تنقید کا آغاز بھی ہوتا ہے اور سوانح نگاری کو حقیقت پسندی کی نئی بنیادیں ملتی ہیں۔ برِّصغیر کے مُسلمانوں کے لیے حالی کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اقبال نے اپنے شاعرانہ انداز میں کہا تھا ؎

آں لالۂ صحرا کہ خزاں دید و بیفسرد
سید دگر اور انجے از اشکِ سحر داد
حالی ز نوا ہائے جگر سوز نیاسود
تا لالۂ شبنم زدہ را داغِ جگر داد

اقبال کے لالۂ صحرا کو ایک سرزمینِ تازہ کی ہوائیں میسّر آ گئی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ قیامِ پاکستان کے بعد برِّصغیر میں اردو کی روایت حالات کے مخصوص تقاضوں کے تحت دو حصّوں میں بٹ گئی ہے، لیکن حسن و خیر و صداقت کی تلاش کا حوالہ جہاں ملتا ہے، وہ سرمۂ اہلِ نظر بن جاتا ہے۔ یہی نہیں ماضی کی وہ درخشاں تہذیب جس نے خسرو، تان سین، مغل مصوّری اور غالب کو جنم دیا تھا اُردو میں گھل مل گئی ہے۔ اسی لیے آج اُردو کی آواز چین، نیپال، کناڈا یا برطانیہ جہاں سے اٹھتی ہے ہمیں اپنی آواز معلوم ہوتی ہے۔ اُنیس سال کی عمر میں قدسی کی نعتیہ غزل پر تضمین لکھنے والے حالی نے ہماری معاشرت کی اصلاح کی آواز اٹھائی، مسلمانوں کو تحصیلِ علم کی تلقین، زمانے کو شانِ ربّانی کہا، بلقان و طرابلس کے سلسلے میں ظفر علی خان کی کوششوں کو سراہا، چپ کی داد اور مناجاتِ بیوہ میں اس وقت عورتوں کی مظلومیت کا احساس دلایا جب یہ احساس بڑوں میں موجود نہ تھا، حبّ الوطنی کی تلقین کی اور اسے اہلِ وطن کی محبّت سے مشروط قرار دیا۔

دراصل حالی آج کے لیے بھی انسان دوستی، حبّ الوطنی، اصلاحِ معاشرت اور نئی زندگی کا اہم حوالہ ہیں۔ خواجہ احمد عبّاس نے اپنے ذکر میں اپنے پرنانا حالی کو یاد کیا ہے۔ خانوادۂ حالی کے فیضِ تربیت اور خود حالی کی اس بے نفسی کا حوالہ دیا ہے کہ مسدّسِ حالی کی وسیع اشاعت کے باوجود حالی نے اس کی کوئی رائلٹی قبول نہ کی۔

خواجہ احمد عبّاس کو یاد کرنے کا ایک حوالہ حالی ہیں، دوسرا حوالہ اُردو زبان و ادب ہے، تیسرا حوالہ مسلم تہذیب کو موجودہ دُنیا میں پیش آنے والے مسائل ہیں اور چوتھا شاید سب سے بڑا حوالہ وہ ہے جس کے بارے میں اقبال نے کہا تھا کہ "من اوّل آدم بے رنگ و بو ئیم"۔ خواجہ احمد عبّاس نے انسان اور اس کے معاشرتی یا اجتماعی وجود کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں بہ حیثیت مجموعی دلِ دردمند اور فکرِ روشن دونوں کی جھلک ملتی ہے۔

خواجہ احمد عباس نے فلم، صحافت، مضمون نگاری، ڈراما نگاری اور افسانہ نگاری، غرض یہ کہ متعدد اصنافِ اظہار میں اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ اپنی فلم "شہر اور سپنا" میں خواب اور حقیقت کا جو حسین امتزاج خواجہ احمد عبّاس نے پیش کیا ہے، اسے بین الاقوامی طور پر شہرت حاصل ہوئی۔ یہی امتزاج ان کے کامیاب افسانوں اور ڈراموں کی بنیاد ہے۔ اُردو میں مختصر افسانے نے عصری زندگی کی حقیقتوں اور تہذیبی زندگی کے نمونوں کی نمائندگی کا کام بڑی خوبی سے انجام دیا ہے۔ رومان سے حقیقت تک جو مختلف رنگ اُردو افسانے میں بکھرے ہوئے ہیں وہ انسانی ذہن اور خارجی زندگی کے مختلف جلووں کو منظرِ عام پر لاتے ہیں۔ مختصر افسانہ جزو میں کُل کا تماشا دکھاتے ہوئے "ذرہ آفتاب تابانیم" کے مصداق ہے۔ سجاد حیدر یلدرم اور پریم چند سے لے کر، انگارے کے لکھنے والوں، ترقی پسند تحریک کی وسیع المشربی اور بعض صورتوں میں اس کی انتہا پسندی کے ترجمانوں اور ذات کی بھول بھلیوں میں گم ہو جانے والے جدید افسانوں تک اُردو افسانے نے کئی مراحل طے کیے ہیں اور اس میں متعدد قابلِ ذکر نام ملتے ہیں کہ جن کے بعض افسانے اُردو ادب میں ناقابلِ فراموش حیثیت رکھتے ہیں۔ ناموں کے اس سلسلے میں خواجہ احمد عبّاس بھی ایک اہم نام ہے۔ ان کے افسانوں کے پہلے مجموعے "ایک لڑکی" کے بعد کئی مجموعے شائع ہوئے اور ان کے افسانے ایک طویل زمانے تک ادبی رسالوں خاص طور پر "ادبِ لطیف"، "افکار"، "نقوش"، "سپیپ" اور "نیا دور" کی زینت بنتے رہے۔ خواجہ احمد عبّاس کے پہلے مشہور افسانوں میں "ابابیل" ہے جو کسان کی زندگی سے متعلق ہے اور اسے براہِ راست تجربے کے بجائے مشاہدے کا نتیجہ یا اجداد کی ان یادوں کا کرشمہ کہنا

حنیف فوق
معرفت افکار فاؤنڈیشن، رابسن روڈ، نزد اُردو بازار،
کراچی (پاکستان)

جا سکتا ہے کہ جن کی مدد سے کرشن چندر اور ان کی گفتگو کے مطابق یہ ابابیل پکڑی گئی ہے۔ اس افسانے کا دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں اپنے ماحول کی نمائندگی اور دوسری متوازی تہذیبوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ دراصل حقیقت نگاری انسان اور ماحول کے تعلّق کی صداقت کا انکشاف ہے، محض کسی ماحول کا روڑا بن جانے سے کام نہیں چلتا۔ چنانچہ جہاں کوئی افسانہ نگار اس میں کامیاب نہیں ہوا ہے وہاں دیہات، قصبہ یا شہر سے وابستگی، بعض خیالات یا نظریات کی ترجمانی اور اسالیب جدّت یا اوضاعِ روایت کی پیروی سے اس کی فنی ناکامی کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

خواجہ احمد عبّاس نے مونتاژ اور "باقی کچھ نہیں" جیسی بعض دوسری شکلوں میں بھی تجربے کیے ہیں، لیکن ان کے زیادہ تر افسانے وضعِ تراش رکھتے ہیں۔ صحافت سے ان کے تعلّق نے انھیں بعض خبروں سے افسانہ کشید کرنے کی طرف مائل کیا ہے یا افسانے کو صحافتی بیان کی سطح سے ادبی تخلیق کی سطح تک پہنچانے کی ترغیب دی ہے۔ چنانچہ "نیلی ساڑھی" میں چند سطری خبر سے شروع ہونے والی سلیمہ کی کہانی دیہات کی سنیما بینی سے بمبئی کی جبری عصمت فروشی تک کئی منزلیں طے کر کے اس آدمی تک پہنچتی ہے جو انسان کا چہرہ نہیں اس کی روح دیکھتا ہے۔ خواجہ احمد عبّاس کے اکثر افسانوں کے کردار سادہ رنگوں میں ڈھالے گئے ہیں اور ان کی پیچیدگی واقعات کی پیدا کردہ ہے جس طرح دیہات کی سیدھی سادھی معاشرت سے صنعتی شہر کی زندگی کا سفر ان کے بعض افسانوں کا موضوع رہا ہے۔ قحط بنگال اور فسادات کے پس منظر میں لکھے ہوئے ان کے بعض افسانوں میں سادگی، افسانہ تراشی کا ہنر اور انسانی ہمدردی کی یک جائی ملتی ہے۔

خواجہ احمد عبّاس کے فلم اور صحافت کے تعلّق نے جہاں انھیں اظہار کے نئے وسیلے عطا کیے، وہاں ان کے متعدد افسانوں کو سطحی تحیّر خیزی اور خبر کے افسانے بھی بنا دیا، لیکن افسانوں کے ڈرامائی انجام میں خود یہ قوت نہیں کہ کردار و واقعات کی ہم آہنگی کے بغیر فنی تاثر پیدا کر سکے اور نہ ہر خبر میں، خواہ وہ واقعی زندگی میں رونما ہونے والی صداقت پر کیوں نہ مبنی ہو، فنی صداقت بننے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ پھر خواجہ احمد عبّاس کے کئی افسانے زندگی سے ابھرنے کے بجائے ایک نکتے یا خیال کی افسانوی تشریح پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ اسی لیے افسانے کے نقادوں نے ان کے الگ الگ افسانوں کے تجزیے کی تکلیف گوارا کیے بغیر انھیں کم مایہ ٹھہرایا یا نظر انداز کر دیا۔ مثال کے طور پر فلمی پس منظر میں لکھا ہوا ان کا افسانہ "ماں کا دل" ایک سطحی بیانیہ طنز ہے تو اسی پس منظر میں "کایا کلپ" کچھ افسانوی خصوصیات بھی رکھتا ہے۔ اگرچہ دونوں میں موت کے ڈرامائی انجام کو پیش کیا گیا ہے۔ خواجہ احمد عبّاس نے "زبیدہ"، "یہ امرت ہے" اور "اناس اور ایٹم بم" جیسے قابلِ ذکر ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ان کے اکثر ڈرامے کھیلے جا چکے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ خواجہ احمد عبّاس کی فنی تخلیقات کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے اور ان کا انتخاب پیش کیا جائے۔

خواجہ احمد عبّاس فطری انسان سے زیادہ معاشرتی انسان کی تصویر کشی کرتے ہیں اور اس تصویر کشی میں ظلم کے خلاف ان کا سیاسی نقطۂ نظر نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔ وہ "میری زندگی کا پہلا موڑ" میں انگریز حاکم کے استقبال کے لیے بچّوں کے جمع کیے جانے اور انگریزی قوت کے مظاہرے سے پیدا ہونے والے ردّ عمل کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس طرح کا کوئی نہ کوئی واقعہ ضرور رونما ہوتا کہ "یہ تاریخ کا موڑ تھا" جب بچّوں میں بھی "اے، بی، سی، ڈی کہاں گئی تھی، مر گیا انگریز میں رونے گئی تھی" کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ خواجہ احمد عبّاس نے زعفران کے پھولوں اور سنگترے کی فصلوں کے پس منظر میں افسانے لکھے اور ٹیری لین کی پتلون پہن کر اپنے آپ کو بدلنے کی خواہش رکھنے والی اچھوت منگو کی کہانی سنائی۔ "سردار جی" اور "بارہ گھنٹے" ان کی متنازعہ کہانیوں میں شامل ہیں لیکن سردار جی کو سراہا گیا ہے اور "بارہ گھنٹے" کے خام اخلاقی (یا غیر اخلاقی) تصوّر کی مذمّت کی گئی ہے۔ اسی طرح ان کی بعض دوسری کہانیوں میں پیش کردہ تصوّرات بھی نشانۂ اعتراضات بنے ہیں۔ خواجہ احمد عبّاس کو احساس تھا کہ دانشور طبقہ ان کے فن کو صحیح حق نہیں دیتا۔ چنانچہ اپنے افسانہ نما مضمون "انٹلکچوئل اور بینگن" میں وہ اس کا بدلہ لیتے ہیں۔ اس احیائی رجحان کے پس منظر میں جو بنارس کا نام بدل کر وارانسی رکھتا ہے، وہ (بھگت) کبیر کو بنارس کے ٹھگ کے روپ میں پیش کرتے اور طنز کے تیر برساتے ہیں۔ ان کا یہ طنزیہ انداز "ڈیڈ لیٹر"، "بمبئی رات کی باہوں میں" اور "لیلیٰ مجنوں ۱۹۷۴" میں بھی نمایاں ہے۔ آخری افسانے میں لیلیٰ للی ڈی سوزا بن جاتی اور مجنوں موہن کا قالب اختیار کر لیتا ہے۔ "شکر اللہ کا" بھی طنز کا حامل ہے، لیکن اسی کو زیادہ وسیع تناظر میں "کہتے ہیں جس کو عشق" کے رُوپ میں پیش کیا گیا ہے۔ مؤخر الذکر اور "چڑھاؤ اُتار" میں رومانی جذبے کو معاشرتی طنز کی افسانوی صورتیں دی گئی ہیں۔ موپاساں کے افسانے "محبّت — ایک اسپورٹس مین کی کتاب کے تین صفحے" میں محبّت کے موضوع کو اس کی فطری حیوانی جبلّت کی شدّت کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے اور انسانی سطح پر قتل اور خودکشی سے اس کی صداقت کا اشارا کر کے حیوانی سطح پر موت کے خوف کے مانع نہ بننے سے تشریح کی گئی ہے۔ اس کے برخلاف خواجہ احمد عبّاس نے خود زندگی کی مختلف صورتوں کو اس جذبے کی راہ میں حائل بنایا ہے۔ چنانچہ "کہتے ہیں جس کو عشق" میں متوسط طبقے کی مجبوری، اہلِ زر کی ہوسِ زر اور

...نگال کی انسانیت کا گلا گھونٹ دینے والی سفا کی
...جذبے کی راہ میں زبردست موانع ہیں اور جہاں
...جذبے کے آثار ملتے ہیں، وہ فوری جذبے سے زیادہ
...ینہ رفاقت کے کرشمے ہیں۔ خواجہ احمد عبّاس کے
...نوں میں انسان کا ارتقا سماج کے ارتقا سے وابستہ
...ور اس کے جذبوں کی صداقت مثبت انسانی جدوجہد
...کھرتی ہے۔ سیاسی خیالات سے زیادہ دراصل انسان
...اس تصوّر میں خواجہ احمد عبّاس کے فن کی پیش قدمی
...رہے۔ اگرچہ اپنے افسانے "سیاہ سورج سفید سائے"
...وہ بین الاقوامی انسانیت کا وہ تصور پیش کرتے ہیں
...ن کے خیال میں سورج کو اندھیرے کی قید سے
...د کرنے والا ہے۔

...رامانند ساگر کی کتاب "اور انسان مرگیا" کا
...باچہ لکھتے ہوئے خواجہ احمد عباس نے فسادات کی
...داری برطانوی سامراج پر ڈال کر بری الذمّہ ہوجانے
...ملط ٹھہرایا اور تمام سیاسی جماعتوں کی غلط روش
...علاوہ عوام میں تہذیب کی کمی پر سخت تنقید کی تھی۔
...یباچہ ان کے بعض افسانوں سے زیادہ ہدفِ مذمّت
...لیکن اس کا حوالہ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے
...س سے خواجہ احمد عبّاس کے حساس ضمیر کا پتہ چلتا
...اس میں شک نہیں کہ ان کی اس تحریر میں بہت سی
...ناگفتہ بہ رہ گئی تھیں، لیکن اب تک کے حالات
...ود ان کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ تقسیم کے بعد بھی
...سل اور منظم طور پر فسادات کا سلسلہ کسی طرح
...نوی سامراج کے سر نہیں منڈھا جا سکتا۔ پھر ایک
...خطّہ تہذیب میں جو "شکنتلا" کی سی مکمّل شائستگی
...ارث ہو اور جس نے مہاتما بدھ جیسے عظیم گیانی کو
...دیا ہو، یہ فسادات خود اپنے تہذیبی ورثے کی تکذیب
...نے نظر آتے ہیں۔ خواجہ احمد عبّاس جس نقطۂ نظر کے
...تھے، خود اس کے ماننے والوں میں بعد کے حالات
...سبب جو اضطراب و اضطرار پیدا ہوا، اس کی تلافی

کوئی کرشماتی قیادت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کرشن چندر نے اپنے افسانے "برہمن" میں مکانوں کی پگڑیوں کے پھیر میں سیٹھوں کی شہ پر پٹو ردھن کے ممتاز کو قتل کرنے کے بعد یہ کہہ کر کہ "میں گوشت نہیں کھاتا" گوشت کی پلیٹ ریستوران کے مالک کے مُنہ پر مار دینے کی جو کہانی سنائی ہے، وہ اس تضاد کو پوری شدّت سے واضح کرتی ہے۔ خواجہ احمد عبّاس نے بھی "اجنتا" میں شانتی دل سے ایک مُسلمان کے اخراج کی کوشش کو پیش کیا ہے، لیکن بودھ بھکشوؤں کے بے خواہش نمود، اجنتا کے غاروں میں مُسلسل اور انتھک محنت کے رویائی منظر نے انھیں یہ امید بخشی ہے کہ انسان کا سفر زندگی کے حسن کی طرف ہے۔ خواجہ احمد عبّاس کے متعدّد افسانے صحافیانہ بیان کا شکار ہو گئے ہیں، لیکن وہ چند جن میں زندگی کے حسن کو فنی تکمیل ملی ہے، ان کا نام زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔

انسان دوست ادیب

پچپن سال پُرانی بات ہے۔ یعنی ۱۹۳۲ء کا ذکر ہے۔ میں کلکتہ سے حصول تعلیم کے لیے علی گڑھ آیا تو جن لوگوں سے پہلے پہل تعارف ہوا، ان میں خواجہ احمد عبّاس بھی تھے۔ پھر بارہا ملاقاتیں ہوئیں، تا آنکہ وہ تعلّق خاطر استوار ہوا جو جیتے جی باقی رہا۔ اُن کی شگفتہ مزاجی اور صاف گوئی کا تاثر ہنوز ذہن میں محفوظ ہے۔

۱۹۳۵ء میں احمد عبّاس بمبئی کرانیکل کے ادارۂ تحریر سے وابستہ ہوئے۔ ان کی عملی زندگی انگریزی صحافت، فلم سازی اور اُردو افسانہ نگاری میں صَرف ہوئی۔ ان کی فطری انسان دوستی کا تقاضا تھا کہ وہ ترقّی پسند رُجحانات کی علم برداری کرتے۔

گزشتہ چند سال سے ان کی صحت خراب رہنے لگی۔ پہلے بصارت نے ساتھ چھوڑا پھر پاؤں جواب دے گئے۔ لے دے کر فگار اُنگلیاں اور خوں چکاں خامہ باقی رہ گیا۔

ہمارے ادیبوں کا یہی مقدّر ہے۔

احمد عبّاس نے انگریزی کے علاوہ اُردو میں بہت کچھ لکھا ہے اور اگر اس کا مناسب انتخاب شایع ہو جائے تو ان کے ادبی مرتبے کا تعیّن ہو سکے گا۔

—— ڈاکٹر اختر حُسین رائے پوری

عبّاس کا آزاد قلم

قوم پرستی کے جذبات سے بھرپور بے باک صحافت، ترقی پسند نظریات کی ترجمان افسانہ نگاری اور غریب اور کچلے ہوئے عوام کی زندگی کے حقائق سے لبریز فلم کاری ـــــ غالباً یہ تین اجزائے ترکیبی تھے جن سے خواجہ احمد عبّاس کے ذہن کی تشکیل ہوئی تھی۔ ان کی خلّاقانہ طبیعت نے ہر میدان میں اپنے جوہر دکھائے ہیں، اور ان کا خلوص ہر رنگ میں جلوہ گر ہے۔ فن کی ایک 'تری مورتی' کی حیثیت سے عبّاس تاریخ کا ایک حصّہ بن گئے ہیں۔

جس زمانے میں عبّاس منظرِ ادب پر آئے وہ اُردو افسانے کا زرّیں دور تھا۔ منٹو، کرشن، عصمت، بیدی ـــــ ان چار ناموں کی گردان کی جاتی تھی ـــــ مگر ان سے الگ دو عبّاس بھی تھے۔ غلام عبّاس اور خواجہ احمد عبّاس۔ منٹو کا افسانہ جنسی بے راہ روی کے نفسیاتی عمل کی گرہ کشائی کرتا تھا، کرشن چندر لطیف شاعرانہ زبان میں رومان و انقلاب کے فسانہ گو تھے۔ عصمت کا چٹخارے دار اسٹائل سفید پوش معاشرے کے گھناؤنے پن کو بے نقاب کرتا تھا، بیدی کا نکتہ رس ذہن، سماج کے ٹیڑھے میڑھے کرداروں کی جذبات نگاری کا جادو جگاتا تھا۔ غلام عبّاس کے افسانے قدرے اصلاحی رنگ لیے ہوئے تھے اور خواجہ احمد عبّاس کا افسانہ فنّی تہہ داریوں کی گنجلک سے پاک دوٹوک لفظوں میں معاشرے کی بدحالی پیش کرکے ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کی جرأت عطا کرتا تھا۔ عبّاس کا لفظ ان کے ذہن کی طرح صاف، ان کے کردار کی طرح شفّاف اور نوکیلا، اور ان کی شخصیت کی طرح جامع تھا۔ ان کی شخصیت کے تمام پہلو ایک دوسرے میں پیوست تھے اس لیے ان کے افسانے میں کبھی کبھی ان کی صحافت کا رنگ اور صحافت میں افسانے کا رنگ جھلکتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ وہ ایک اچھے مقرر بھی تھے اور لفظوں کا جادو جگانا جانتے تھے۔ اپنے سامعین کو اپنے جذبات کی رو میں بہالے جانے کا فن انھیں ورثے میں ملا تھا۔ اس لیے ان کا لفظ دائرۂ تحریر میں آنے کے بعد اور بھی زود اثر ہو جاتا تھا۔ انھیں اس کی پروا نہیں تھی کہ ان کا شمار اپنے دور کے صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں میں ہو یا نہ ہو۔ وہ تو ہر کام ایک خاص مشن کے تحت کرتے تھے اور ان کی صحافت اور فلم کاری بھی اسی زمرے میں آتی تھی۔

مجھے سب سے پہلے ۱۹۴۶ء میں ان سے ملنے کا شرف حاصل ہوا ـــ کاؤس جی جہانگیر ہال بمبئی کے ایک ادبی جلسے میں ان سے ملاقات ہوئی ـــ میری شاعری کا ابتدائی زمانہ تھا۔ عبّاس صاحب نے میری نظم 'زندگی' کی تعریف کی اور اس کے اقتباسات اپنی رپورٹ میں شامل کیے جو ظاہر ہے میرے لیے عزّت افزائی کی بات تھی۔ اور اس کے بعد جب بھی ملے ایک شفیق مسکراہٹ کے ساتھ ـــ یہ پتلی سی مسکراہٹ ان کی شخصیت کا خوبصورت حصّہ تھی۔

وہ بمبئی کے بہروپیوں کی بھیڑ میں الگ نظر آتے تھے۔ اکثر ترقی پسند مصنّفین کا مرکز کمیونسٹ پارٹی کا دفتر تھا۔ مگر عبّاس اور عصمت شواجی پارک میں رہتے تھے اور انجمن کی ہفتہ وار نشستوں میں بھی بہت کم آتے تھے۔ ہاں ان دنوں وہ ۹۶ والکیشور روڈ اکثر آتے جب آزادی کے بعد فساد زدہ ہو کر راما نند ساگر اپنا ناول 'اور انسان مر گیا' لے کر بمبئی وارد ہوئے تھے۔ عبّاس صاحب نے اس ناول کا دیباچہ لکھا جو کافی دنوں تک بحث و مباحثہ کا موضوع بنا رہا۔ ذکرِ انجمن کا آگیا تو یہ عرض کرتا چلوں کہ عبّاس صاحب کا انجمن ترقّی پسند مصنّفین سے بہت گہرا اور دیرینہ تعلّق تھا۔ وہ ۱۹۳۹ء میں نوجوانان علی گڑھ کے ساتھ انجمن کی دوسری کُل ہند کانفرنس میں شرکت کرنے کلکتہ پہنچے تھے۔ اس کانفرنس میں عبّاس صاحب کی فعّال شمولیت کا ذکر ان کے تعزیتی جلسے میں کامریڈ شانتی موئے رائے نے بڑے مؤثر انداز میں کیا ـــ انجمنیں، بالخصوص ادبی انجمنیں صحت مند بحث و مباحثہ اور پُرخلوص اختلافات کی چھاؤں میں پروان چڑھتی ہیں۔ کیونکہ اس طرح اپنے اصولوں اور پالیسیوں کو بار بار کسوٹی پر کسنے کا موقع ملتا ہے اور کھرے کھوٹے کی تمیز وقت کے تقاضوں کے اعتبار سے کرنی پڑتی ہے۔ عبّاس صاحب ایک شلسٹ ذہن رکھتے تھے ساتھ ساتھ گاندھی جی اور جواہر لال جی سے بھی متاثر تھے اس لیے ان کے یہاں نظریات کے معاملے میں انتہا پسندی نہ تھی ـــ اور وہ بیرونی آوازوں کے ساتھ اپنے ضمیر کی آواز کو بھی اہمیت دیتے تھے۔ شاید ضمیر کی آواز ان کے لیے ایک پیمانۂ حیات تھی۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ چوتھی دہائی کے آخر اور پانچویں دہائی کے ابتدائی برسوں میں انجمن انتہا پسندی کا شکار ہو گئی اور ایک بار جب عبّاس کی شخصیت اور ان کے فن پر انتہا پسندی کی ضرب کاری پڑی

رفعت سروش
ڈی ۲ - اے، ڈی. ڈی. اے. فلیٹس،
منیرکا، نئی دہلی ۶۷۔

جھنجلائے نہیں ــــ انھوں نے اپنے معترضین سے صرف یہ کہا کہ آپ لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں، اپنے ضمیر سے بھی پوچھ کر دیکھئے کہ کیا یہ سچ ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ ان کے معترضین نے اس وقت ضمیر کی اہمیت کو ہی ماننے سے انکار کر دیا ــــ مگر اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عباس صاحب کی نظر میں ضمیر کی آواز کے کیا معنی تھے وہ تمام عمر اپنے ضمیر کی آواز کی روشنی میں قدم بڑھاتے رہے اور انھوں نے وقتی طوفانوں کے ساتھ اس لیے سمجھوتہ نہیں کیا کیونکہ انھیں یقین تھا کہ وہ حق پر ہیں۔ ضمیر فروشی ان کے خمیر میں نہ تھی ــــ وقت گذرا۔ اور دنیا نے دیکھا کہ عباس صاحب کا جماعتی طور پر احترام کیا گیا اور ابھی کل کی بات ہے کہ وہ انجمن کے پچاس سالہ جشن کے روح و رواں تھے۔ قلم کار کی سب سے بڑی پہچان ہوتی ہیں اس کی تخلیقات۔ ان کے 'انقلاب' اور 'سیاہ سورج اور سفید سائے' جیسے ناول اور 'زعفران کے پھول' 'گیہوں اور گلاب' 'پاؤں میں پھول' 'نئی دھرتی نئے انسان' جیسے افسانے جو ایک درجن کے قریب مجموعوں میں پھیلے ہوئے ہیں، اُردو ادب میں ان کی دائمی شہرت کے ضامن ہیں۔

ڈراما بھی عباس صاحب کے اظہار کا موثر ذریعہ تھا۔ بمبئی میں IPTA سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ وہ ہنگامی موضوعات پر تیزی سے ڈرامے لکھتے تھے اور ڈائرکٹ کرتے تھے۔ اور ضرورت پڑنے پر خود بھی ایکٹنگ کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کے رفیق کار تھے بلراج ساہنی جو باقاعدہ فلموں میں جانے سے پہلے IPTA کی روح و رواں تھے۔ ۱۹۴۷ء کے ہولناک فسادات اور تقسیم وطن کے بعد رونما ہونے والے واقعات پر انھوں نے ایک نہایت عمدہ ڈراما لکھا۔ 'میں کون ہوں' اس ڈرامے میں انھوں نے ایک ایسے کردار کی زبانی ہندوستان کی گھائل روح کی کہانی بیان کی، جو ہند و پاک سرحد پر زخمی ہو کر بے ہوش ہو جاتا ہے اور ہوش میں آتا ہے تو اسے یاد نہیں رہتا کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان ــــ یہ ڈراما اس قدر اثر انگیز تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اور ریڈیو پر سننے والوں نے اس ڈرامے کی تعریف میں اس قدر خطوط لکھے تھے کہ ان کی گنتی کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

اور فلم ــــ! فلم جیسے میڈیا کو عباس صاحب نے روپیہ بٹورنے کے لیے نہیں، بلکہ اپنے خیالات کی ترویج اور اپنی بات ہندوستان ہی کیا، دُنیا کے کروڑوں عوام تک پہنچانے کے لیے استعمال کیا اور 'دھرتی کے لال' سے لے کر 'ڈاکٹر کوٹنس کی امر کہانی' 'راہی' 'شہر اور سپنا' 'آسمان محل' 'بمبئی کی رات کی باہوں میں' 'چار دل چار راہیں' 'سات ہندوستانی' جیسی فلموں میں عباس صاحب نے کسی نہ کسی اہم سماجی اور عصری مسئلے کو پیش کیا۔ بہ قول گجرال صاحب انھوں نے تاریخی تقاضوں کے تحت فلمیں بنائیں اور یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ صحافت ہو یا افسانہ، ڈراما ہو یا فلم۔ ان کا ایک ہی مقصد تھا۔ اپنی بات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا ــــ ایک بار انھوں نے کہا ــــ

"میں تو دراصل فلموں میں کہانیاں
لکھنے آیا تھا۔ جب دیکھا کہ ڈائرکٹر
کہانی کو مسخ کر دیتا ہے فلم بناتے
وقت تو میں نے طے کیا کہ خود ڈائرکٹ
کروں گا ــــ لیکن ڈائرکٹر بننے
کے باوجود محسوس ہوا کہ پروڈیوسر
دخل در معقولات کرتا ہے تو پھر
میں نے خود پروڈیوسر بننے کا
تہیہ کیا۔"

گویا فلم میں کہانی سے لے کر پروڈکشن تک کا سفر اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے تھا۔ روپے کی فراہمی کے لیے نہیں۔

صحافت ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ پہلے وہ عبداللہ بریلوی کے بمبئی کرانیکل سے متعلق تھے۔ پھر 'بلٹز' سے وابستہ ہو گئے اور آخری دم تک اس کا "آخری صفحہ" لکھتے رہے۔ انگریزی میں بھی اور اُردو میں بھی ــــ اس چالیس سال میں کوئی ایسا تاریخی واقعہ نہیں جس پر عباس صاحب کے قلم نہ اُٹھایا ہو۔ قومی زندگی کا کوئی ایسا موڑ نہیں جس سے گذرنے کے لیے عباس صاحب کے قلم کی روشنی نے اپنا فرض انجام نہ دیا ہو ــــ کوئی ایسا المیہ نہیں جس پر عباس صاحب کے قلم نے مضمحل قدموں کو حرارت نہ بخشی ہو۔

ایک دو سال نہیں ــــ پورے چالیس سال۔

بلٹز کے شری رگھون کے بیان کے مطابق عباس صاحب کا قلم ایک دن بھی نہیں تھکا۔ اپنے کام سے لگن کا یہ عالم تھا کہ چاہے ہندوستان میں ہوں یا ہندوستان سے باہر کہیں بھی ــــ کسی نہ کسی ذریعے سے (بلٹز) کے آخری صفحے کا مواد دفتر میں بروقت پہنچ جاتا تھا۔

وہ لکھتے رہے۔ لکھتے رہے۔ لکھتے رہے۔ اور اب میں تصور کرتا ہوں کہ جب ان کی انگلیاں تھک گئی ہوں گی، اور اپنے دل کی دھڑکنوں کو وہ آزاد قلم تک نہ پہنچا سکے ہوں گے تو انھوں نے اس لمحے کیا محسوس کیا ہوگا ــــ اس احساس کی ایک نظم ہے

رات ڈھلنے لگی،
نیند آنے لگی
اُنگلیوں سے قلم چھوٹ جانے کو ہے،
موت آواز دینے لگی ہے مجھے
کوئی ہے اس قلم کو جو گرنے نہ دے
اس امانت کو جو نسل آدم کی میراث ہے
مجھ سے لے کر نئی نسل کو سونپ دے

عباس کا آزاد قلم نہیں گرا۔ گر ہی نہیں سکتا۔ اور جب تک یہ قلم زندہ ہے۔ عباس زندہ ہے۔ وقت نے عباس کے آزاد قلم کو ان ہزاروں ہاتھوں کو سونپ دیا ہے جو عباس کے سنہرے خوابوں کی تکمیل کا عزم کیے ہوئے ہیں، جو انسانیت کے درخشاں مستقبل کے لیے لکھ رہے ہیں ــــ اور لکھتے رہیں گے۔

گیہوں اور گلاب: ایک تجزیہ

خواجہ احمد عباس کا افسانہ "گیہوں اور گلاب" ۱۹۵۵ء کے قریب لکھا گیا تھا۔ گو کہ یہ افسانہ خواجہ صاحب کے شاہکاروں میں شمار نہیں کیا جا سکتا تاہم یہ خواجہ صاحب کے افسانوی فن کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لئے ایک مفید مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ خواجہ صاحب کی فنی انفرادیت دراصل اُن کی قوّت اختراع اور تکنیکی جدّت پسندی سے مرتب ہوتی ہے۔ مقصد کے ساتھ اُن کی پُرخلوص وابستگی اور واقعات زندگی سے معنی اخذ کرنے کی صحافیانہ دسترس سے اُن کے افسانوں کو سادہ بیانی کے ... پیدا کرنے کی ضمانت ملی ہے۔ اور اس سادہ بیانی کو موثر بنانے کے لیے خواجہ صاحب نے اپنی تکنیکی جدّتوں سے کام لیا ہے۔

خواجہ صاحب کے افسانوں کی اکثر ایک واضح نظریاتی سمت ہوتی ہے لیکن ذہنی سطح پر وہ نظریات میں توازن و تناسب تلاش کرنے کا رُجحان رکھتے ہیں۔ اور اسی نتیجے میں اُن کے فن کو انتہا پسندانہ اثرات سے نقصان نہیں پہنچتا۔ وہ ادب کے ساتھ ساتھ صحافت کا بھی تجربہ رکھتے ہیں۔ جہاں وہ ایک فنکار کی طرح زندگی کے مظاہر سے دلچسپی رکھتے ہیں وہیں وہ ایک صحافی کی طرح حوادث زمانہ سے معنی اخذ کرنے کا رُجحان رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں فنکارانہ تخیلیت کی بجائے صحافیانہ حقیقت پسندی کا رنگ زیادہ نظر آتا ہے۔ خواجہ صاحب کے فن میں کرشن چندر کے فن جیسی جگمگاہٹ، تخیئل آفرینی کی دلآویزی، گہری جذباتیت اور جذبہ کی موسیقیت نہیں لیکن اس کے باوجود ان کی سادگی میں ایک پُرکار اور موثر ادا ہے۔ اُن کا فن سلجھا ہوا اور پُرکشش ہے اور اُن کا خیال گہرائی لیے ہوئے اور ٹھہرا ہوا ہے۔ خواجہ صاحب نے تخیئل کے رنگوں سے زندگی کی تصویر کو دلآویز بنانے کی کوشش نہیں کی لیکن انھوں نے زندگی کو حسین اور پُرکشش بنانے والے نرم و نازک احساسات سے آنکھیں چُرانے کا بھی گُن نہیں ... اُن کے یہاں زندگی میں نرمی بھی ہے اور کرختگی بھی۔ جادو بھی ہے اور رومان بھی۔ وہ مصاف زندگی میں سیرت فولاد کے بھی خواہاں ہیں اور شبستان محبت میں حریر و پرنیاں کے متلاشی بھی۔ وہ صرف گلاب ہو کر زندہ رہ سکتے ہیں ... زندگیوں کی پامالی کا بار ان کی تمناؤں کا مقدر ہے۔ انھیں گیہوں اور گلاب دونوں چاہئیں لیکن ان کی اپنی ضرورتوں کے ساتھ۔

خواجہ صاحب کے فن کی تازگی ان کے تکنیکی تجربوں کی مرہون منت ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں "زعفران کے پھول"، "پھرٹے چڑیا کی کہانی"، "میں کون ہوں" اور "مونتاژ" میں جو مختلف تکنیکی اسالیب اختیار کیے ہیں وہ اُن کا ہی حصّہ ہے۔ "گیہوں اور گلاب" بھی ایک ایسی تکنیک کا مالک ہے جو افسانہ اور فلم اسٹوری کے عناصر اپنے اندر جذب کیے ہوئے ہے اور افسانہ اپنے تاثر اور موضوع کی وحدت کے باوجود پھیلاؤ رکھتا ہے۔ افسانے میں ہر کردار کا شخصیتی پس منظر واضح اور مکمل ہے کسی کردار کو اُٹھانے سے اس کے ساتھ اس کی پوری سیرت اُبھرتی چلی آتی ہے۔ جب کہ افسانے میں کردار مرکزی ماجرے کا اپنی ایک مخصوص نفسیاتی اور سیرتی سطح پر ساتھ دیتے ہیں اور اُن کا کردار اُسی حد تک نمایاں کیا جاتا ہے جتنا وہ مرکزی ماجرے پر اثر انداز یا اُس سے متاثر ہوتا ہے۔ "گیہوں اور گلاب" بیک وقت کردار اور واقعہ کی کہانی ہے جس میں کردار اپنے پورے نمو کو ظاہر کرتے ہیں اور مرکزی تاثر اور بنیادی مقصد بھی اپنے نقطۂ عروج کی جانب حرکت کرتا ہے۔

خواجہ صاحب کے فن پر فلمی تجربہ کا اثر اس تخلیق سے بہت نمایاں ہے۔ افسانہ "مونتاژ" میں انھوں نے فن مصوّری کی تکنیک کو فلم سازی کی معرفت اختیار کیا تھا لیکن اپنی بے ربطی کی وجہ سے مونتاژ زیادہ مقبولیت حاصل نہیں کر سکا۔ گیہوں اور گلاب' میں انھوں نے یک بارہ فلم سازی کے تجربے سے فائدہ اُٹھایا ہے فلم سازی کا فن تخیئل کی تجسیم کا فن ہے۔ وہ ایک متحرک اور زندہ فن ہے جس میں ایک ہدایت کار فلم سازی کے دوران خیال اور حقیقت کی گہری ہم آہنگی، تاثر آفرینی اور فنی انتخابیت کا کڑا تجربہ حاصل کرتا ہے۔ خواجہ صاحب نے افسانے کو اپنے فلمی تجربے سے سیراب کرنے کی کوشش کی ہے۔ گیہوں اور گلاب' میں کرداروں کی بڑی مکمل تجسیم کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس کہانی میں کئی دھارائیں ہیں لیکن ان کے بہاؤ کی سمت ایک ہے۔ تجسیم کی یہ تکمیل اور کہانی کی پہلو دار صلاحیت افسانے کے فن میں نئی چیزیں ہیں جن کا خواجہ صاحب نے اتنے اعتماد کے ساتھ استعمال اپنے فلم سازی کے تجربے کی بنا پر کیا ہے۔ اس کہانی میں کئی ... بیانیہ وہ عام بیانیہ تسلسل سے تھوڑا مختلف ہے بیانیہ اسلوب عام طور پر ایک ہی قسم کے واقعاتی ماحول یا چند کرداروں کے ساتھ گتھے ہوئے واقعاتی بیان کے تسلسل کو پسندیدہ قرار دیتا ہے۔ خواجہ صاحب نے اس کہانی میں بیانیہ اسلوب کے روایتی انداز سے ہٹ کر توجہ کے فوکس (FOCUS) کو بدل بدل کر اپنا بیانیہ تیار کیا

سید حامد حسین
ای - ۲/۱۸۴، پروفیسرز کالونی،
بھوپال (مدھیہ پردیش)

جس طرح فلم اسٹوری چھوٹے چھوٹے مناظر کے ذریعے دی جاتی ہے اُسی طرح اس کہانی میں خواجہ صاحب نے اپنے بیانیہ کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں [illegible] SHOT [illegible] [illegible] ایک کردار پر چھوٹے سے [illegible] لیے [illegible] اس کی [illegible] کوششوں کو [illegible] ہوتی ہے اور اس [illegible] منتقل ہو جاتی ہے افسانے [illegible] کرداروں پر [illegible] وقتی مرکزیت [illegible] جا سکتی ہے۔ اسی طرح منظر کا [illegible] کے باوجود [illegible] کی مدد [illegible] افسانے میں مختلف سمتوں اور ابعاد (DIMENSIONS) کا تصور پیدا کیا گیا ہے وہ [illegible] افسانے کی انفرادیت ہے۔

اس [illegible] میں مرکزی تاثر کا ارتقا [illegible] سے نہیں ہوتا ہمارا افسانہ [illegible] تکنیک میں ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کرداروں کی ہیئت [illegible] اور [illegible] ضمنی تفصیلات کے بیان میں کہانی تھوڑے وقفے [illegible] کردار کے پیچھے چلتی ہے اس کی وجہ سے کہانی میں تاثر کے [illegible] تسلسل پر بعض اوقات اثر پڑتا ہے اور یہیں پڑھے جانے والے میڈیم اور دیکھے جانے والے میڈیم یعنی افسانے اور فلم کا فرق سامنے آجاتا ہے افسانہ الفاظ کی مدد سے ایک ذہنی تصویر پیدا کرتا ہے اور اُسے ذہن کے سادہ پردے پر [illegible] تفصیل ایک ایک کر کے ترتیب سے چلانا پڑتی ہے جب کہ فلم پردے پر پورا منظر اپنی بھرپور تفصیلات کے ساتھ یکجائی طور پر پیش کرنے پر قادر ہے اور آناً فاناً ایک نظر میں پورا ہما یا منظر ماحول [illegible] سچویشن ذہن میں منتقل کر دیتی ہے۔ اس طرح فلم منظر کی تبدیلی کے باوجود تاثر کے بلا وقفہ تسلسل کو برقرار رکھ سکتی ہے لیکن افسانے میں بیانیہ ضرورتیں تاخیر کا سبب بنتی ہیں اور اس سے کہانی کی گرفت ڈھیلی پڑنے کا اندیشہ رہتا ہے۔

اس کہانی میں خواجہ صاحب نے فلم اور افسانے میں پیش کش کے اس بُعد کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے جہاں ایک طرف منظری تکمیل کے لیے بعض ضمنی حقائق کو اپنے افسانے میں داخل کیا ہے وہیں بعد میں ان تفصیلات کی مدد سے انھوں نے اپنے کرداروں کی تجسیم کو زیادہ مکمل بنانے میں مدد لی ہے تفصیل نے اس تجسیم میں [illegible] پیدا کر دی ہے اور ان کے ماحول [illegible] کرداروں کو طبقے کا کردار نہیں بننے دیا ہے۔ کرداروں کے انفرادی ارتقا کی بنا پر مرکزی تاثر میں جو کہیں کہیں فصل پیدا ہوا ہے اُس نے بنیادی نظریے اور ایک ٹھوس طبقاتی مسئلے کی گرفتگی کا احساس پیدا ہونے سے روک لیا ہے اور اس طرح اُسے ایک افسانوی موضوع بننے میں آسانی ہوئی ہے۔

"گیہوں اور گلاب" میں ایک لطیف رمزیت ہے۔ یہ رمزیت واضح اور [illegible] بھی ہوئی ہے اور زندگی کی دو بڑی حقیقتوں، فرض اور خواہش، عمل اور رومان کو نمایاں کرتی ہے۔ اس تخلیق کو جانے نظریے نے زندگی کی کہانی بنانے کے لیے اشاریت کی بنیادی ضرورت تھی اور یہ اشاریت اس لیے بھی ہوئی ہے کہ یہ زندگی کی جانب نظریے کی اشاریت ہے۔

یہ کہانی جو ۱۹۵۵ء کے قریب لکھی گئی ہے ایک ایسے ماحول میں اُبھرتی ہے جس میں ترقیاتی منصوبوں کے تحت دھیرے دھیرے کروٹ بدلتی ہندوستانی معیشت کی تصویر نظر آتی ہے۔ خواجہ صاحب نے کہانی کے مرکزی کردار رمیش کے جذبۂ خدمت کو قدرت [illegible] کے ساتھ اور تعمیری منصوبوں کے عملی پہلو کو اُبھارا ہے۔ خواجہ صاحب رمیش کو نئے ہندوستان کی علامت کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں اور اس کے ذریعے اس جانب اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ ترقیاتی جدوجہد میں کیونکہ ابھی رمیش کی طرح جذبہ اور روح داخل نہیں ہو پایا ہے اس لیے اس قسم کے سارے منصوبے صرف حکومت کے منصوبوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور اجتماعی مفاد انفرادی مفاد پر غالب نہیں آسکا ہے۔

اوشا کا کردار اونچے طبقے کی آسائش پسند ذہنیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ سہل پسندی ہماری آج کی سوسائٹی میں بڑا عام رُجحان بن گیا ہے۔ سماجی عمل سے گریز اور سہولت پسندی کی طرف رغبت [illegible] کی خصوصیت بن گئی ہے خواجہ صاحب اس افسانے میں رمیش اور اوشا دونوں کرداروں کو ایک متوازن نظریۂ حیات کی طرف لانا چاہتے ہیں جو اوشا کے کردار میں ایک بڑی تبدیلی کی حیثیت رکھتا ہے لیکن رمیش کے کردار میں محض ایک اضافہ ہے۔

یہ افسانہ دراصل ایک سماجی مسئلے کی افسانوی تعبیر ہے۔ خواجہ صاحب اس جانب توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ جب تک ذاتی آسائش کا جذبہ عمل اور جدوجہد پر حاوی ہے سارے ترقیاتی پروگرام بے روح ہیں۔ ایک ترقی پسند ادیب کی حیثیت سے وہ انسانی ترقی اور خوش حالی کے خواب کو جھٹلانا نہیں چاہتے لیکن اس کے لیے صرف کاغذی منصوبہ بندی ہی کافی نہیں۔ وہ اس میں عمل کی رُوح اور اجتماعی مقاصد کے لیے جذبے کو بھی بنیادی اہمیت کا مالک سمجھتے ہیں اور عمل کی یہ لگن اور اجتماعی رُوح اپنا عملی اور تعمیری رُخ اُس وقت اختیار کرتی ہے جب اجتماعی مفاد انفرادی مفاد کی انتہا پسندیوں پر حاوی ہو جاتا ہے جب اوشائیں اپنے گلابوں کی خاطر گیہوں کی پیداوار کو ہیچ سمجھنا چھوڑ دیتی ہیں۔

جیسا کہ ابتدائی جملوں میں عرض کیا جا چکا ہے "گیہوں اور گلاب" کو خواجہ صاحب کی بہترین تخلیقات کی فہرست میں بہت اوپر جگہ نہیں دی جا سکتی

لیکن اُس سے خواجہ صاحب کی افسانوی تخلیقات کے بنیادی ترکیبی عناصر کے بارے میں اچھی طرح سے واقفیت حاصل ہوسکتی ہے۔ خواجہ صاحب کے بعض ناقدین کی یہ رائے ہے کہ اُن کے افسانوں میں بیشتر صحافیانہ سطحیت ہوتی ہے اور اس قسم کے ناقدین بعض اوقات "گیہوں اور گلاب" جیسی کہانیوں کو بطور مثال کے پیش کرتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں اس قسم کی تخلیقات میں شعری تخئیلیت اور افسانوی اختراع پسندی سے پیدا ہونے والی کشش و آراستگی اور تحیّر کی کیفیت پیدا کرنے والی صلاحیت کی کمی ہے۔ دراصل خواجہ صاحب کے افسانوی اسلوب کا امتیاز ان کا صحافیانہ انداز کا راست اظہار ہے اور وہ قاری اور ناقد جو افسانے میں داستانوی اسلوب کی پرچھائیں دیکھنے کی توقع رکھتے ہیں انھیں یقیناً خواجہ صاحب کے افسانوی اسلوب سے بہت زیادہ تشفی نہیں ہوتی۔ لیکن یہ سمجھنا کہ خواجہ صاحب کی کہانیاں واقعات کے محض سپاٹ بیانیہ پر مشتمل ہیں خواجہ صاحب کے فن کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ ان کے سادہ، غیر آراستہ اور راست اظہار کو جو دو باتیں ادبی وقعت اور ناقابلِ فراموش انسانی معنویت عطا کرتی ہیں وہ ان کا اپنے واقعاتی مواد کے ساتھ عمل (یعنی تکنیک) اور اُن کا انسانی اقدار پر بھرپور اعتماد (یعنی خلوص) ہیں۔ خواجہ صاحب نے اپنے بیانیہ کو تکنیک کی گوناگوں جدتوں سے مالامال کیا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے اظہار کے دوسرے (غیر ادبی) وسائل میں رائج اسالیب سے بھی استفادے کی راہیں کھولی ہیں اور پیش کش کے فن میں تجربوں کے لیے نئی نئی گنجائشیں پیدا کی ہیں۔ آپ کو اُن کی کہانی "باقی کچھ بھی نہیں" یاد ہوگی جس میں خواجہ صاحب نے ایک کردار کے صرف آمد و خرچ کے حساب سے (بلا مُسلسل بیانیہ کا سہارا لیے) ایک بھرپور تاثر پیدا کیا ہے۔

دوسری بات جس نے خواجہ صاحب کو ایک فنکار کی حیثیت سے ایک قابلِ قدر مقام دلایا ہے وہ اُن کا انسانی اقدار پر زبردست بھروسہ اور یقین ہے۔ خواجہ صاحب کی تحریریں اُن کی نظریاتی پختگی کی آئینہ دار ہیں۔ اُن کی تخلیقات کا نظری پہلو بہت واضح اور نمایاں ہے۔ اسی بنا پر ان کے بعض ناقدین، ان کے کمال کو عاقلانہ زیادہ اور ناقلانہ کم خیال کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک خواجہ صاحب سنجیدہ موضوعات سے عاقلانہ بحث کی جانب فطری رُجحان رکھتے ہیں۔ جب کہ نقلِ داستان کا فن محض برائے بیت ہے۔ افسانہ دراصل اُن کے نظریات کو پیش کرنے کا محض ایک اسلوب ہے۔ اصل تو نظریہ ہے لیکن خواجہ صاحب کے افسانوی فن پر یہ تبصرہ یک طرفہ ہے۔ خواجہ صاحب جس طرح اپنے نقطۂ نظر کے ساتھ مخلص ہیں، اُسی طرح وہ اپنے فن کو پورے خلوص کے ساتھ استعمال کرنا جانتے ہیں۔ ان کے اچھے افسانے خیال، تاثر اور فن تینوں سطحوں پر ان کے تخلیقی کمال کو نمایاں کرتے ہیں "گیہوں اور گلاب" جیسی اُن کی اوسط درجے کی تخلیقات ہی نظر، احساس اور تکنیک میں توازن کے لیے اُن کی تلاش کو نمایاں کرنے کو کافی ہیں۔ دراصل خواجہ صاحب کی مختلف الجہت اور متنوع تحریروں نے اُن کے کمال کو مرکزیت حاصل نہیں ہونے دی اور آج ہم ان کی ادبی، صحافیانہ، فلمی فنکار اور ہدایت کار کی شخصیتوں کو اکثر خلط ملط کر دیتے ہیں۔

خواجہ احمد عبّاس کی ناول نگاری

خواجہ احمد عبّاس نے ناول نگاری کی ابتدا ۱۹۴۲ء میں اپنے ناول "انقلاب" سے کی لیکن یہ ناول آزادی کے بہت بعد منظرِ عام پر آیا اور اردو میں تو ۱۹۷۵ء میں شایع ہوا۔ سچ پوچھیے تو خواجہ احمد عبّاس ناول نگاری کے میدان میں آزادی کے بعد آئے۔ بنیادی طور پر وہ فلم ساز ہیں بعد میں ناول نگار۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فلم ہی کے لیے ناول لکھتے ہیں۔ تقریباً ان کے سبھی ناولوں پر فلم بن چکی ہے۔ ان کے ناولوں کو پڑھتے وقت قاری کو یہ احساس ہوتا ہے کہ قلم فنکار کے ہاتھ میں ہے اور دماغ اسکرین پر۔ اس کے علاوہ صحافتی اندازِ بیان کا رنگ غالب ہے جس کی وجہ سے ان کے ناول فنی بلندیوں تک نہیں پہنچ پاتے۔ احمد عبّاس کے ناولوں پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

> "خواجہ احمد عبّاس ہمارے پُرانے
> پختہ مشق ناول نگار ہیں لیکن اس
> عرصے میں بھی ان کا کوئی ایسا ناول
> اُردو ادب کے حصّے میں نہیں آیا
> جو ادبی شہ کار کی حیثیت رکھتا ہو
> یا اپنے مصنّف کی صلاحیتوں کا
> پوری طرح اظہار کر سکتا ہو۔
> نام گنانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔
> لیکن خواجہ احمد عبّاس کے صحافتی
> رنگ نے اور آسانی سے اور جلد اثر
> دکھانے کی کوشش نے ان کے ناولوں
> کو اعلیٰ سنجیدگی کی سطح تک
> پہنچنے نہیں دیا[1]

یہ بات سچ ہے کہ احمد عبّاس کے یہاں گہری فنّی بصیرت اور اعلیٰ سنجیدگی کی کمی ہے پھر بھی تکنیک اور زبان و بیان کو برتنے میں انھوں نے بڑی ہی چابکدستی سے کام لیا ہے۔

خواجہ احمد عبّاس کے ناول زیادہ تر منظم پلاٹ سے آراستہ ہیں اور پلاٹ نگاری میں مقامی رنگ کے ساتھ ساتھ جغرافیائی حقیقت جو پلاٹ نگاری کا طرۂ امتیاز ہے۔ جغرافیائی حقیقت اور مقامی رنگ کے امتزاج سے جب قاری کا مزاج ہم آہنگ ہوتا ہے تو اسے وہ بالکل اپنی چیز سمجھ کر پڑھتا ہے مثلاً جب ہم "دو بُوند پانی" کا مطالعہ کرتے ہیں تو ذہن میں راجستھان کے ریگستانی گاؤں کا تصوّر اُبھرتا ہے اور وہاں جو پانی کی قلّت ہے اس کا احساس ہوتا ہے۔ "تین پہیے"، "بمبئی رات کی باہوں میں" اور "فاصلہ" میں بمبئی کے ہوٹل، سڑک اور مقام کا صحیح نام اور فٹ پاتھ کی زندگی کی سچّی تصویر پیش کی گئی ہے۔ داستان نویس اور رومانی ناول نگار کی طرح مقام کے نام میں انھوں نے دماغی اختراع سے کام نہیں لیا۔

جن لوگوں نے ادبیات کے ذریعے قومی یکجہتی کے حصول کی بھرپور کوشش کی ہے ان میں نمایاں نام احمد عبّاس کا ہے۔ ہندو مسلم ایکتا کے علاوہ زندگی کے بہت سے ایسے گوشے ہیں جن پر احمد عبّاس کی گہری نگاہ ہے جیسے لسانی، معاشی اور صوبائی یکجہتی کی طرف بھی انھوں نے خاص توجّہ کی ہے وہ انھیں مسائل کے خمیر سے اپنے کردار کی پیکر تراشی کرتے ہیں۔

ویسے احمد عبّاس کے کردار وہاں نکھرتے ہیں جہاں سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان تصادم ہوتا ہے وہ چاہتے ہیں کہ محنت و مشقت کرنے والا انسان بھی اپنی عزّتِ نفس کو پہچان سکے اور استحصال کرنے والے سرمایہ دار بے نقاب ہو کر عوام کے سامنے آجائیں۔

سپاٹ کردار کا استعمال زیادہ تر تاریخی ناولوں میں ہوتا ہے اور اس میں کردار تخلیقی نہیں بلکہ تاریخی اعتبار سے حقیقی ہوتا ہے لیکن احمد عبّاس نے اس روایت سے انحراف کیا ہے۔ "انقلاب" ایک تاریخی ناول ہے اس میں مرکزی کردار انور ہے جو تخلیقی کردار کے ساتھ ساتھ تاریخی کردار بھی ہے۔ خواجہ احمد عبّاس کے زیادہ تر کردار مثلاً گوتم، آشا، انور، گوندا، چاولی، امر کمار، جانی، روزی وغیرہ تہہ دار کردار ہیں۔

احمد عبّاس بمبئی شہر سے اچھی طرح واقف ہیں۔ فٹ پاتھ کے غریبوں کا رہن سہن، فلیٹوں اور محلوں میں رہنے والے عیّاش سیٹھ اور گندی بستی کی جھونپڑیوں میں رہنے والے مل مزدور، وہ سب سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس لیے ایسے ماحول میں سانس لینے والے کرداروں میں زندگی کی لو روشن ہے۔

ناول نگار احمد عبّاس کی نگاہ میں عورت چار دیواری کے اندر قید ہو کر زندگی گذارنے والی نہیں بلکہ مرد کی ہم سفر ہے۔ ان کے ناولوں میں "آشا" جیسی لڑکی کا کردار ملتا ہے جو تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہے۔ وہ کچہری میں وکالت کرتی اور دفتر میں پریس رپورٹر کا کام انجام دیتی دکھائی دیتی ہے "سات ہندوستانی"

غلام حسین
معرفت مِنین احمد، بسنت پور نزد چکی سرائے،
گورکھپور (یو۔پی)

ہیں ناریہ ایک لڑکی ہے جو چھ نوجوانوں کے ساتھ اپنے ملک کو آزاد کرانے کے لیے فوجی وردی پہنتی ہے۔ "دو بوند پانی" میں گنگا مستانہ کی بہن سوکی، جسے منگل سنگھ اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے تو وہ اسے گولی کا نشانہ بنا دیتی ہے۔ چاولی دلِوی نیچ ذات کی عورت ہے مگر اب وہ گونگی نہیں بلکہ اس میں بھی طاقت گویائی ہے۔ وہ ظلم و جبر کو برداشت کرنے والی نہیں۔ جب ٹھیکیدار تیمور لن سنگھ اسے زبردستی اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہتا ہے تو وہ صرف زبان ہی نہیں کھولتی بلکہ اس کا سر بھی پھوڑ دیتی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ عورت جسے شرم و حیا کی دیوی سمجھا جاتا ہے، احمد عبّاس کے ناولوں میں وہ اپنے عاشق کی تلاش میں نکل پڑتی ہے اور سماج کے بندھنوں کو توڑ کر نئی زندگی کا آغاز کرتی ہے۔

خواجہ احمد احمد عبّاس نے اپنے کرداروں کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور وہ ان کے عیوب و محاسن کو اُجاگر کرنے میں بڑی چابک دستی سے کام لیتے ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ فنکار کردار کی تخلیق اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر کرتا ہے کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فنکار اور کرداروں کوئی فرق ہی نہیں۔ "انقلاب" میں انور کے کردار کا مطالعہ کرنے پر ایسا لگتا ہے کہ انور کے قالب میں فنکار کا دل دھڑک رہا ہے۔

خواجہ احمد عبّاس کا تعلق فلمی دُنیا سے تھا اس لیے مکالمے کی تراش خراش میں انھیں کافی مہارت حاصل ہے۔ انھوں نے نہ صرف دیہاتی، شہری، پڑھے لکھے اور ان پڑھ کے مکالموں میں امتیاز برتا ہے بلکہ مذہب اور سوسائٹی کا بھی خیال رکھا ہے۔ ان کے مکالمے سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ کردار کا تعلق کس مذہب اور کس طبقے سے ہے۔

احمد عبّاس کی یہ کوشش رہی ہے کہ فلم اور ناول کے درمیان جو خلیج ہے اس کو کم کیا جائے۔ اور یہ تبھی ممکن ہے جب ناول میں مکالمے کی نوعیت بدل جائے۔ اس نوعیت کا ناول "ساحل اور سمندر" (ہندی ایڈیشن) ہے جو لٹریری سینریو فارم میں لکھا گیا ہے۔ اگر فنکاروں نے اس تکنیک کو موزوں سمجھا تو فلم اور ناول کے درمیان جو دُوری ہے بہت حد تک کم ہو جائے گی۔

احمد عبّاس ایک جہاندیدہ فنکار ہیں۔ ان کے ناولوں میں نفسیاتی تجزیے کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ ان کی تیز اور تجربہ کار نگاہیں سماج کے ہر طبقے، ہر فرد، مرد، عورت، بوڑھے اور بچّے تک پہنچتی ہیں۔ احمد عبّاس کی تخلیقات میں جنسی نفسیات کا اثر بھی ہے مگر عریانی اور ابتذال سے مبّرا ہے۔ جب احمد عبّاس کسی کردار کی نفسیات کا تجزیہ کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کردار کی نبض پر ہاتھ رکھے ہوئے ہیں اور اس کے دل کی دھڑکنوں کو سُن رہے ہیں۔ 'گو وندا' اور 'اوشا' کی پہلی ملاقات کو وہ اس طرح پیش کرتے ہیں:

> "پھر تھالی بجنے کی آواز آئی پھر
> کانچ کی نیلی چوڑیاں کھنکیں اور
> کانسی اترواتے ہوئے دو پہلے
> مُلائم ہاتھ ایک پل کے لیے میرے
> سخت کُھردرے کالے ہاتھوں سے
> چُھو گئے۔ مجھے ایسا لگا جیسے ایک
> مدھم سی بجلی میرے بدن میں کوند
> گئی ہو۔ مگر دِل ہی دِل میں مَیں
> نے "جے ہنومان" کا جاپ کر کے
> اپنے ڈگمگاتے ہوئے برہمچریہ آشرم
> کو سہارا دے دیا [۲]"

عورت کی نفسیات کی عکاسی وہ اس طرح کرتے ہیں:

> "میرا خیال ہے کہ ہر عورت کی فطرت
> میں تضاد پایا جاتا ہے کہ ایک طرف
> تو وہ چاہتی ہے کہ اس کے حُسن کو
> سراہا جائے، لیکن جب حُسن پرست
> دیدہ بازی سے آگے بڑھ کر پیش
> دستی پر آتے ہیں تو وہ برداشت
> نہیں کر پاتی۔ جیسے جیسے ایسے
> موقعوں پر عورت کا غصّہ کم ہوتا
> جاتا ہے اور اسے زیادہ مزہ آنے لگتا
> ہے، وہ طوائف بن جاتی ہے....
> خواہ وہ کوٹھے پر رہتی ہو یا کسی
> کوٹھی میں۔ خواہ وہ پشواز پہن کر
> محفل میں مُجرا کرتی ہو یا سلیکس
> پہن کر بال روم میں انگریزی ناچ
> ناچتی ہو..... [۳]"

بچّوں کی نفسیات کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

> "بچّے کس سے خفا ہوتے ہیں،
> کب اسے معاف کر کے دوستی
> کر لیتے ہیں، یہ بھگوان جانتا ہے
> یا بچّے ہی جانتے ہیں [۴]"

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ احمد عبّاس کے ناول تمام فنی اجزا سے مزیّن ہیں مگر ان کی جلد بازی اور عدیم الفرصتی اُن کے ایک عظیم ناول نگار بننے میں حائل رہی ہے۔ احمد عبّاس کے حسبِ ذیل ناول شایع ہوئے ہیں۔

(۱) شیشے کی دیوار (۲) بمبئی رات کی بانہوں میں (۳) فاصلہ (۴) چار دل چار راہیں (۵) سات ہندوستانی (۶) دو بوند پانی (۷) میرا نام جوکر (۸) رقص کرتا ہے اگر۔

(۱۰) انقلاب (۱۰) تین پہیے اور دنیا بھر کا پھیرا (۱۱) ساحل اور سمندر (ہندی) (۱۲) چار یار (ہندی)۔

احمد عباس کارل مارکس کے اقتصادی فلسفے سے متاثر ہیں اور اس کی بازگشت تقریباً ان کے ہر ناول میں سنائی دیتی ہے۔ وہ معاشی مساوات کے حامی ہیں۔ ان کے نزدیک استحصال اور مفت خوری سب سے بڑا گناہ ہے۔ انھوں نے ہمیشہ دولت مندوں کی مذمت کی ہے "فاصلہ" کا پہلا جملہ ——— "گوتم چندر رائے پاس بھگوان کا دیا یا انسان سے لیا سب کچھ تھا"

خواجہ احمد عباس زیادہ دولت کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں اور روسو کے اس مقولے "ہر بڑی دولت مندی کے پیچھے کوئی نہ کوئی جرم چھپا رہتا ہے" سے متفق ہیں۔ ان کی نگاہ میں دولت رحمت نہیں بلکہ زحمت ہے۔ "مایا موہ کے راستے پر چل کر بہت سے لوگوں نے اپنی جان گنوائی"۔ "کٹھ اپنیشد"۔ "بمبئی رات کی بانہوں میں" کا مرکزی خیال ہے۔

خواجہ احمد عباس کے ناولوں میں ایک صحتمند سماج کا تصور ہے۔ جہاں ذات پات، اونچ نیچ، امیر غریب، کالے گورے کی کوئی تفریق نہیں۔ وہ سماج کی بنیاد محبت اور اخوت پر رکھنا چاہتے ہیں جس کا حاوی عنصر انسانیت ہو۔

خواجہ احمد عباس ایک روشن خیال اور انسان دوست ناول نگار ہیں۔ کوئی بھی نظریہ جو انسان کی ترقی میں معاون ثابت ہوتا ہو اسے وہ سچے دل سے تسلیم کرتے ہیں اور ظلم و استحصال کے خلاف ہمیشہ صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ وہ کمیونزم سے متاثر ہیں لیکن مقلدانہ حد تک نہیں۔ وہ گاندھی جی کے عدم تشدد اور پنڈت نہرو کے سیکولر خیالات سے بھی اتفاق کرتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر بھی کہا گیا احمد عباس کے ناولوں کی ایک اہم خصوصیت قومی یکجہتی پر زور ہے احمد عباس نے اپنے ناولوں میں قومی یکجہتی کے تصور کو نمونے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ انھوں نے قومی یکجہتی کی ہر شکل کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً مذہبی لسانی، علاقائی، اقتصادی اور طبقاتی وغیرہ۔

احمد عباس کی ناول نگاری اور فلم سازی کو الگ نہیں کیا جا سکتا یہ احمد عباس کا ایک ادبی عیب بھی ہے لیکن بدلتے ہوئے حالات کا تقاضا اور ناول نگاری کا ایک نیا راستہ بھی۔ احمد عباس اچھی طرح جانتے ہیں کہ موجودہ حالات کے کچھ اور تقاضے ہیں جنھیں پرانے ادبی سانچے میں نہیں ڈھالا جا سکتا۔ نئی جہت کی تلاش میں وہ فلم کا سہارا لیتے ہیں اور اس کی تکنیک کو ناول میں سمونا چاہتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ احمد عباس کی یہ کوشش رہی ہے کہ ناول اور فلم کے بیچ کی دوری کو کم کیا جائے۔ اس لیے انھوں نے "لٹریری سنیریو فارم" میں ناول لکھا۔ ہندوستان میں نہیں لیکن روس وغیرہ میں "اسکرین پلے" کو ادبی صنف کی حیثیت دے دی گئی ہے آج کے اس تیز رفتار زمانے میں ناول کی تکنیک اور فارم میں تبدیلی ایک ناگزیر عمل ہے۔ کیونکہ اب انسان کے پاس وقت بہت کم ہے جس کی وجہ سے وہ ضخیم ناول پڑھنے سے قاصر ہے۔ ظاہر ہے ناول صرف طالب علم اور استاد ہی کے پڑھنے کی چیز نہیں بلکہ سبھی لوگوں کو اس جمالیاتی حظ اور انسانی بصیرت کی طلب ہے جو ناول سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ناول میں منظر نگاری، نفسیات نگاری اور ماحول نگاری پر صفحے کے صفحے سیاہ کر دینے کی بجائے اسے ایکشن اور مکالمے کے ذریعے پیش کیا جائے تو یہ ایک نیا تجربہ ہوگا۔ احمد عباس نے اپنے ناولوں میں اس تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ اسی تکنیک کو "لٹریری سینریو فارم" کہا جاتا ہے۔

احمد عباس کے یہاں رومانیت بھی ہے اور حقیقت اور رومانیت کا امتزاج بھی لیکن اس امتزاج کو اس چابکدستی کے ساتھ کبھی کبھی وہ پیش نہیں کر پاتے جو ان کے ہم عصر بعض مشہور ناول نگاروں کا طرۂ امتیاز ہے!

حواشی

۱ صفحہ ۵۸ "جدید اردو ادب" ۔ ڈاکٹر محمد حسن۔
۲ صفحہ ۱۲ "چار دل چار راہیں" خواجہ احمد عباس۔
۳ صفحہ ۵۰ "چار دل چار راہیں" خواجہ احمد عباس۔
۴ صفحہ ۴۰ "فاصلہ" خواجہ احمد عباس۔

غیر کمیونسٹ ترقی پسند

سید سجاد ظہیر "روشنائی" میں

..... انجمن ترقی پسند مصنفین کی چوتھی کل ہند کانفرنس بمبئی میں منعقد ہوئی ..... اس کانفرنس میں جو قراردادیں منظور ہوئیں ان میں سب سے زیادہ اہم اعلان (مینی فسٹو) تھا جس میں جنگ سے پیدا ہونے والے قومی اور بین الاقوامی حالات کے پیش نظر ملک کے ادیبوں کے فرائض کا عام طور پر اور ترقی پسند مصنفین کا خاص طور پر تعین کیا گیا تھا..... ہم نے یہ مناسب سمجھا کہ کانفرنس کی قرارداد کا مسودہ ہمارا ایک ایسا رکن تیار کرے جو غیر کمیونسٹ ہو لیکن جس کی حب الوطنی اور ترقی پسندی پر عام طور سے بھروسہ کیا جاتا ہو..... چنانچہ خواجہ احمد عباس نے جو اس زمانے میں کمیونسٹ سیاسی پالیسی کے بہت سے پہلوؤں پر سختی سے نکتہ چینی کرتے تھے اور کسی سیاسی جماعت کے رکن نہیں تھے۔ کانفرنس کی اس قرارداد کا مسودہ تیار کیا۔

[بقیہ صفحہ ۲۲ سے آگے]

تمام ڈھانچہ اس تماش کا ہے کہ وہاں پھوہڑ گلیمر اور تجارتی ہوس آج بھی فنّی معیار اور اعلیٰ مقصدی کو سر اُٹھانے کا موقعہ نہیں دے رہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔

اور آج جب میں بمبئی اور دِلّی سے بہت دُور، کشمیر کے ایک کوہستانی دیہات میں واقع ایک کاٹیج میں دریچے کے قریب دیر سے بیٹھا بظاہر باہر کے خوشنما منظر پر نظریں مرکوز کیے ہوں تو میرے ذہن کی اسکرین پر کہیں بہت دُور کے ڈھیر سارے گوناگوں مناظر اُبھر مِٹ رہے ہیں ۔ میری یادوں کا پروجیکٹر بڑی تیزی سے گھوم رہا ہے ۔ ۔ ۔

(دو دِن پہلے ریڈیو پر خواجہ صاحب کے انتقال کی خبر ۔ ۔ کوئی غیر متوقع واقعہ تو نہیں تھی مگر تبھی سے اِک چُپ لگ گئی ہے) ۔ ۔ ۔ اور اب احساس کے پردۂ سیمیں پر اس رائٹر، ڈائرکٹر، پروڈیوسر سے آخری ملاقات کا سین چلا آیا ہے ۔ یکایک ساؤنڈ بند ہوگئی، بس مشتعل و مضطرب، مُرغِ بسمل سا ایک شخص آرہا ہے ۔ یہ سین دوسرے سین میں ڈزولو ہوا ۔ ۔ ۔ اب میں ایک سمندر دیکھ رہا ہوں ۔ مچلتا، تڑپتا، کف آلود، چیختا ہوا ۔ ۔ ۔ تنہا سمندر ۔ ۔ ۔ آہ اب یہ کیسا ڈریم سیکوئنس ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سوگوار ساحل کی سُرمئی پٹّی قرطاس بن گئی ہے اور سمندر سے اُبھن اُبھن کر اس پر گرنے والی بیقرار سیکڑوں موجیں تحریریں بنتی چلی جارہی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دھرتی ماں کے آنچل پر یہ کون لکھ رہا ہے ؟ کیا لکھ رہا ہے ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاید یہ سیلولائیڈ کے انقلابی شاعر کا کوئی گیت ہے ۔ اور یہ کسی فلم کی رومانی سچویشن کے لیے نہیں، انسانی فرسٹریشن کے نروان کے لیے رچا گیا ہے ۔ یہ سب سے مدھر، پُر تر گیت کب مقبول ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ ؟

اکادمی کی مطبوعات — ایک نظر میں

۱۹۸۶ء کی مطبوعات

مولانا ابوالکلام آزاد؛ شخصیت اور کارنامے — مرتب؛ ڈاکٹر خلیق انجم، قیمت ۴۸ روپے
بزمِ آخر — مصنف؛ منشی فیض الدین ۔ مرتب؛ ڈاکٹر کامل قریشی، قیمت ۲۱ روپے
دہلی کی آخری شمع — مصنف؛ مرزا فرحت اللہ بیگ ۔ مرتب؛ ڈاکٹر صلاح الدین، قیمت ۲۳ روپے
دہلی کا آخری دیدار — مصنف؛ سیّد وزیر حسن دہلوی ۔ مرتب؛ سیّد ضمیر حسن دہلوی، قیمت ۱۴ روپے
دِلّی والے — مرتب : ڈاکٹر صلاح الدین، قیمت ۳۶ روپے
قلعۂ معلّیٰ کی جھلکیاں — مصنف؛ عرش تیموری ۔ مرتب : ڈاکٹر اسلم پرویز، قیمت ۱۷ روپے
رسومِ دہلی — مصنف؛ سیّد احمد دہلوی ۔ مرتب؛ ڈاکٹر خلیق انجم، قیمت ۲۸ روپے
داغ دہلوی؛ حیات اور کارنامے — مرتب؛ ڈاکٹر کامل قریشی، قیمت ۳۱ روپے

۱۹۸۷ء کی مطبوعات

عالم میں انتخاب؛ دِلّی ۔ مصنف : مہیشور دیال، قیمت ۵۲ روپے
سوانحِ دہلی — مصنف؛ شاہزادہ مرزا احمد اختر گورگانی ۔ مرتب : مرغوب عابدی، قیمت ۱۷ روپے
خواجہ حسن نظامی؛ حیات اور کارنامے — مرتب؛ خواجہ حسن ثانی نظامی، قیمت ۲۹ روپے
دیوانِ حالی — مصنف؛ مولانا الطاف حسین حالی ۔ مقدمہ : رشید حسن خاں، قیمت ۲۴ روپے
چراغِ دہلی — مصنف : میرزا حیرت دہلوی، قیمت ۲۹ روپے
اُردو صحافت — مرتب؛ انور علی دہلوی، قیمت ۳۲ روپے
دہلی کے اسکولوں میں اُردو نصاب کے مسائل — مرتب : صدیق الرحمان قدوائی، قیمت ۲۳ روپے
نوبتِ پنج روزہ یعنی وداعِ ظفر — مصنف؛ علّامہ راشد الخیری ۔ مرتب؛ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، قیمت ۲۳ روپے
دِلّی کی آخری بہار — مصنف : علامہ راشد الخیری ۔ مرتب : سیّد ضمیر حسن دہلوی، قیمت ۲۰ روپے
لال قلعے کی ایک جھلک — مصنف؛ حکیم خواجہ سیّد ناصر نذیر الدین فراق دہلوی ۔ مرتب؛ ڈاکٹر انتظار مرزا، قیمت ۱۹ روپے
ڈائرکٹری اُردو ناشرین و تاجرانِ کتب — مرتب؛ انور علی دہلوی، قیمت ۵۰ روپے
دِلّی کی تہذیب — مرتب؛ ڈاکٹر انتظار مرزا، قیمت ۱۷ روپے
اُردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب — مرتب؛ ڈاکٹر کامل قریشی، قیمت ۳۹ روپے
اُردو غزل — مرتب؛ ڈاکٹر کامل قریشی، قیمت ۳۱ روپے، صفحات ۳۵۹ ۔

اکادمی کی زیرِ طبع کتابیں

نیا اُردو افسانہ ورکشاپ/سیمینار	مرتبہ	پروفیسر گوپی چند نارنگ
آثار الصنادید	مرتبہ	ڈاکٹر خلیق انجم
حواشی ابوالکلام آزاد	مرتبہ	سید مسیح الحسن
مصنّفین و شعراء کی ڈائرکٹری	مرتبہ	[پروفیسر گوپی چند نارنگ / جناب عبداللطیف اعظمی
انتخابِ مضامین مرزا محمود بیگ	مرتبہ	ڈاکٹر کامل قریشی
انتخابِ مضامین مرزا فرحت اللہ بیگ	مرتبہ	ڈاکٹر اسلم پرویز
نئی تعلیمی پالیسی اور اُردو تدریس	مرتبہ	سیّد شریف الحسن نقوی
ڈاکٹر ذاکر حسین؛ حیات اور کارنامے	مرتبہ	ڈاکٹر کامل قریشی
اُردو شاعری میں ہندی اصناف	مرتبہ	پروفیسر گوپی چند نارنگ
بارہ ماسہ	مصنف	ڈاکٹر تنویر احمد علوی
دہلی اور اس کے اطراف	مرتبہ	ڈاکٹر صادقہ ذکی
دہلی کے مشائخ کی ادبی خدمات	مصنف	بیگم ریحانہ فاروقی
دِلّی والے (جلد دوم)	مرتبہ	ڈاکٹر صلاح الدین
اُردو مرثیہ	مرتبہ	ڈاکٹر شارب ردولوی
اُردو ریسرچ اسکالرز سیمینار	مرتبہ	پروفیسر گوپی چند نارنگ
مقالاتِ طنز و مزاح	مرتبہ	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی
آنند نرائن ملاّ کے کلام کا انتخاب	مرتبہ	ڈاکٹر خلیق انجم
انتخابِ داغ	مرتبہ	بیگم ممتاز مرزا
دہلوی اُردو کی کرخنداری بولی	مصنف	پروفیسر گوپی چند نارنگ

انقلاب: ایک اجمالی جائزہ

جدید اردو ناول نگاری کی تاریخ میں خواجہ احمد عباس کا ناول "انقلاب" ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ناول کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ "بادل گھر آتے ہیں" دوسرا "طوفان کی آمد آمد" تیسرا "بادل کی گرج، بجلی کی کڑک" اور چوتھا "طوفان اور طوفان کے بعد" عنوانات پر مشتمل ہے۔ جنگ آزادی کا زمانہ اس ناول کا پس منظر ہے۔ ناول کا عنوان انقلاب ہے۔ یہ انقلاب زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتا ہے — وقت کا انقلاب موسم کا انقلاب، خیالات کا انقلاب، جذبات کا انقلاب، جس کا تناظر ہندوستان کی سیاست ہے۔ پہلا حصہ "بادل گھر آتے ہیں" میں وہ اس پس منظر کی نشاندہی کرتے ہیں جب آزادی کے حصول کے لیے جدوجہد کی فضا ہموار کی جا رہی تھی۔ ناول کا مرکزی کردار "انور" ہے جو خواجہ احمد عباس کا آئیڈیل ہے۔ وہ بچپن ہی سے کافی ذہین ہے اور سیاسی باتوں میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اس ضمن میں عباس صاحب رولٹ بل، مارشل لا، ہڑتال، کانگریس اور مسلم لیگ وغیرہ پر تبصرے کرتے ہیں۔ پھر طوفان کی آمد آمد ہوتی ہے۔ مہاتما گاندھی، شوکت علی، محمد علی وغیرہ سے قاری کا تعارف کرایا جاتا ہے۔ جلیانوالہ باغ کے واقعے کی المناک منظر کشی کی گئی ہے۔ انور صرف نو سال کا کمسن بچہ ہے مگر اس کے ذہن پر اس حادثے کا اثر بہت گہرا پڑتا ہے۔ انور بہت ہی حساس ہے۔ وہ کسی پر ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتا جس کی کئی مثالیں اس ناول میں موجود ہیں۔

سارے ملک میں سرکار کے خلاف نفرت اور نافرمانی کا جذبہ بڑھتا جا رہا تھا:

"سارے ملک میں نافرمانی کا ایک عجیب سا جذبہ پھیل گیا تھا۔ ہر طرف بغاوت پھیلی ہوئی تھی اور اس بغاوت کا اظہار ان سمتوں سے ہو رہا تھا جہاں سے اس کی کوئی امید نہیں تھی۔ جن لوگوں کو سیاست میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، جو نرم دل اور امن پسند تھے، جو مطلبی اور دبو تھے، جنھوں نے زندگی بھر سرکاری افسروں کے تلوے چاٹے تھے اور ان کی خوشامد کی تھی۔"

ان کے علاوہ کسان اور غریب لوگ بھی اس تحریک کے حامی تھے۔

انور کے دل میں حب الوطنی کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے والد اکبر علی کے اقدامات کی تقلید کرتا ہے۔ اپنی پیاری ریشمی شیروانی کو خود اپنے ہاتھوں سے جلاتا ہے اور جیل خانے کے شوق میں کوسوں اسے پیدل چلنا پڑتا ہے۔

جب گاندھی جی سول نافرمانی کی تحریک واپس لیتے ہیں تو انور کے والد اکبر علی کو گاندھی جی کا یہ قدم ناپسند ہے۔ وہ کاروبار میں خود کو منہمک کر دیتے ہیں۔ اب ان کی دوستی اور ساجھے داری رامیشور دیال کے بجائے چودھری محمد عمر کے ساتھ زیادہ پائدار ہو جاتی ہے:

"اس درمیان میں جو کچھ ہوا تھا وہ صرف اتنا ہی نہیں تھا کہ اکبر علی اور رامیشور دیال کی پرانی ساجھے داری ختم ہو گئی تھی، ہندوؤں اور مسلمانوں کی ساجھے داری بھی خلافت اور سوراج کی ملی جلی تحریک کے دوران مضبوط ہونے والا ان کا اتحاد بھی خطرے میں پڑ گیا تھا۔"

انور بھی اب معاملے کی باریکیوں کو سمجھنے لگا ہے مگر اسے چودھری محمد عمر اور ان کا لڑکا شفیع جاوید پسند نہیں آتے اور نہ ہی اسے اپنے چچازاد بھائی اور بہنوئی عارف سے کوئی دلچسپی ہے۔ عباس صاحب نے انور کو عمر کے اس دور میں ہی سمجھدار اور سچا وطن پرست دکھایا ہے۔ وہ اہنسا، ہنسا اور بہت سی باتوں کا مطلب سمجھنے لگا ہے لیکن یہ دیکھ کر قاری کو تعجب ہوتا ہے کہ وہ رتن کی دعوت پر کانگریس کے اتنے بڑے اجلاس میں صرف اس لیے نہیں جاتا کہ اس دن اس کی بہن انجم کی شادی کی بات طے ہوئی ہے۔ ناول نگار نے ایک غیر فطری انداز میں کہانی کو آگے بڑھایا ہے۔

انجم کی شادی کے بعد انور کو اپنی تنہائی کا احساس شدت کے ساتھ ہوتا ہے۔ اپنا غم غلط کرنے کے لیے وہ تفریح میں مشغول ہو جاتا ہے اور اس کی ملاقات گوپال سے ہوتی ہے۔ اسی دوران اچانک ہندو مسلم فساد کی خبر گرم ہو جاتی ہے اور وہ دونوں

کہکشاں یاسمین
۱۹ نیو پی۔ جی۔ وومنز ہوسٹل، لال باغ، بھاگلپور، بہار۔

خود کو ایک طوائف کے گھر میں پاتے ہیں۔ گو یاں تو وہاں کے ماحول میں گھُل مِل جاتا ہے مگر انور ان باتوں کو ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھتا ہے اور وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ انور کے اس عمل کے درپردہ دراصل وہ گھر اور ماحول ہے جس میں اس کی پرورش و پرداخت ہوئی۔

انور ہندو مسلم فساد کو لے کر سخت پریشان رہتا ہے اور اس مسئلے کے حل کے لیے وہ بڑی دلیری کا ثبوت دیتا ہے۔ وہ خود مہاتما گاندھی سے مل کر اس سلسلے میں بات چیت کرتا ہے اور مہاتما گاندھی کی کوشش اتحاد کی تحریک کے نشاۃ الثانیہ کا سبب بنتی ہے۔

ان دنوں سیاست کے میدان میں بدستور خاموشی چھائی ہوئی تھی مگر اس خاموشی کو ایک نئی طاقت نے توڑ ڈالا اور یہ تھی مزدور طبقے کی طاقت۔

انور بھی اپنی ذاتی الجھنوں اور پریشانیوں میں گھرا ہوا ہے۔ اس کی کمسن بہن انجم زچگی کے دوران مر چکی ہے۔ انور میٹرک فرسٹ ڈویژن سے پاس کرنے کے بعد اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم ہے۔ یہیں اس کی دوستی عثمان سے ہوتی ہے جو اپنی بات بڑے تیقن کے ساتھ کہتا ہے اور اپنے عقیدے کا بہت پکا ہے۔ وہ صاف گو اور مضبوط قوتِ ارادی کا مالک ہے۔ انور اس کی ان خصوصیات سے بہت متاثر ہے اور اس کے ساتھ اکثر شامیں سیاسی موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے گذارتا ہے اور پھر ناول میں دو کردار اصغر حسین اور رازؔ اُبھرتے ہیں جو انور کے روم میٹ ہیں۔ اصغر حسین کو کھیل کود میں زیادہ دلچسپی ہے اور رازؔ کو شاعری سے شغف ہے۔ ایک فنکشن میں مشاعرہ کے دوران میں جب رازؔ اپنی نظم "محبوبہ سے شاعر کا خطاب" پڑھتا ہے تو انور کے سوئے ہوئے جذبات جاگ پڑتے ہیں اور وہ اپنے قریب بیٹھی ہوئی سلمیٰ کے متعلق عجیب قسم کے جذبات سے دوچار ہوتا ہے۔ پھر وہ مباحثے میں شریک ہوتا ہے جس میں اسے نمایاں کامیابی ملتی ہے۔ سلمیٰ اس موقعے پر اس سے کافی متاثر ہوتی ہے اور پھر سلمیٰ اور انور ایک دوسرے سے والہانہ محبت کرنے لگتے ہیں۔

اسی دوران جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس جیسے نوجوان لیڈروں کی رہنمائی میں "انڈی پنڈنس آف انڈیا لیگ" بن گئی جس نے کانگریس کے پُرانے لیڈروں کو مکمّل آزادی کے انقلابی مقصد کی طرف موڑنے کے لیے ملک کے نوجوانوں کو تیار کرنا شروع کر دیا۔

انور اپنے چچا امجد علی کے یہاں سلام پور میں رتن کا خط پاتا ہے جو علامتی انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ پھر رتن انور کے پاس آجاتا ہے۔ انور یہ اندازہ لگا لیتا ہے کہ رتن دہشت پسند ہو گیا ہے مگر پھر بھی انور اس کا استقبال بڑی گرمجوشی سے کرتا ہے۔ رتن اس کے پاس رام لعل کے نام سے رہتا ہے۔ پروفیسر سلیم اور سلمیٰ اسے رتن کا ساتھ چھوڑ دینے کی تلقین کرتے ہیں لیکن وہ اپنے ارادے پر ڈٹا رہتا ہے لیکن ہوسٹل جانے پر اسے معلوم ہوتا ہے کہ رتن جا چکا ہے۔

انور سجان عرف سجا نوسکی کے ساتھ میرٹھ جاتا ہے جہاں اس کی ملاقات ایک کارل مارکسی سے بھی ہوتی ہے اور پنڈت جواہر لال نہرو سے بھی۔ وہ دونوں کے آٹو گراف لیتا ہے۔

نوجوان انقلابی جواہر لال نہرو نے لکھا تھا:

"جان ہتھیلی پر لے کر چلو۔"

جواہر لال یہ بھی صلاح دیتے ہیں:

"صرف کتابوں میں ہی الجھ کر نہ رہ جانا۔ ذرا باہر نکل کر تاریخ کی اور اپنی پُرانی تہذیب کی شاندار یادگاروں کو بھی دیکھنا، جو کنیا کماری سے لے کر ٹکسیلا تک جگہ جگہ دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن ان سب چیزوں سے بڑھ کر عوام کو دیکھنا کیوں کہ ان میں تمھیں جیتی جاگتی تاریخ ملے گی۔"

انور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ تاریخی مقامات کی سیر کرتا ہے۔ وہ رتن کے لیے خفیہ کام بھی کرنے لگتا ہے ـــ یومِ آزادی کے موقعے پر لگ بھگ چار سو لڑکوں نے غیر قانونی میٹنگ میں حصّہ لیا جن میں انور، رازؔ، سجان اور عثمان بھائی فضل پیش پیش ہیں۔ انور نے آزادی کا عہد نامہ پڑھتے ہوئے جو شیلی تقریر کی جو صفحہ ۳۹۴ سے ۳۹۸ تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس جرأت کی سزا میں تقریباً درجن بھر لڑکوں کو یونیورسٹی چھوڑنا پڑی خاص طور سے انور کو تو دوہری سزا ملی۔ اسے سلمیٰ کے دل سے بھی نکلنا پڑا۔

انور جب دوبارہ دلّی کی سرزمین پر آتا ہے تو اس کی بیماری کے پیشِ نظر ڈاکٹر انصاری (جو کانگریس کے اہم لیڈر بھی ہیں) اسے کوئی بھی ایسا کام کرنے سے روکتے ہیں جس کی وجہ سے اسے جیل جانا پڑے یا کوئی خطرہ ہو۔ پھر وہ ڈاکٹر انصاری ہی کی رائے پر امریکی نامہ نگار رابرٹ ملس کے ساتھ کام کرنے لگتا ہے ناول نگار نے بطور خاص امریکی نامہ نگار کو چنا ہے اس لیے کہ ان کے خیال میں:

"گاندھی جی کے خیالات کو ڈھالنے میں ہم امریکیوں کا بھی کچھ ہاتھ رہا ہے، انھوں نے خود ایمرسن

کا اتنا ہی احسان ماننا ہے جتنا ٹالسٹائی کا۔"

عباس صاحب پکّے گاندھی وادی ہیں:

"اگر ہم سچ مچ گاندھی جی کے کہنے پر چلیں تو ایک دن ہمارے دشمن بھی ہماری بات کو ماننے لگیں گے اور سمجھیں گے کہ ہماری مانگیں صحیح ہیں۔"

اور گاندھی جی سے وفورِ عقیدت میں کبھی کبھی نامناسب بات بھی کہہ جاتے ہیں مثلاً حضرت عیسیٰ کا موازنہ گاندھی جی سے کر دیتے ہیں جو کسی بھی طرح درست نہیں قرار دیا جا سکتا۔

ہمارے یہاں کے بعض ادیب اپنی وسیع النظری کا ثبوت اس طرح دیتے ہیں کہ جو ہندو ہے وہ ہندو مت اور ہندو روایات کو مذاق کا نشانہ بناتا ہے اور جو مسلمان ہے وہ اسلام اور اسلامی روایات کی تضحیک کرتا ہے۔ چوں کہ خواجہ احمد عباس تہذیبی طور پر مسلمان ہیں اس لیے انھوں نے اسلام کو ہدف بنایا ہے۔ اس ناول میں اس قسم کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔

"انور" کی شخصیت جن عناصر کے مرکّب سے ترتیب پاتی ہے وہ:

"انسانیت کا ایک ایسا سنگم جس میں خون اور تہذیب کی کئی دھارائیں آکر ملی تھیں۔"

خواجہ احمد عباس نے تجارت کو ناول میں خاص طور سے اہمیت دی ہے۔ اکبر علی، رامیشور دیال، چودھری محمد علی اور رتن کے والد ان سبھی کا پیشہ تجارت ہے۔ ان کے نزدیک تجارت سیاست کا ایک زبردست ہتھکنڈہ ہے:

"انگریزوں کو دیکھو صرف تجارت کے بل پر وہ دُنیا کے مالک بن بیٹھے۔"

انھوں نے دوستی کی بنیاد تضاد کو قرار دیا ہے:

"اصغر اور راز میں سے وہ دل ہی دل میں اصغر کو زیادہ پسند کرتا تھا کیوں کہ اصغر میں ہر وہ چیز تھی جو انور میں نہیں تھی ـــ"

انور اور گوپال کی دوستی کے متعلق لکھتے ہیں:

"ان کی دوستی ایک جیسی چیزوں کو پسند کرنے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے تھی کہ اگر ایک پورب تو دوسرا پچھم۔ گوپال مست بے فکر قسم کا لڑکا تھا۔ انور دل ہی دل میں گوپال سے بہت متاثر تھا کیوں کہ گوپال میں خود اعتمادی تھی۔ دوسری طرف گوپال بھی اس دُبلے پتلے، بھولے اور جھینپو لڑکے کی طرف اس لیے کھنچتا تھا کہ اُسے کھیل کے مقابلے میں کتابوں سے زیادہ دلچسپی تھی۔"

اس ناول میں خواجہ احمد عباس کی نظریاتی روش کئی جگہوں پر قابلِ اعتراض ہے۔ ناول کے ایک کردار پروفیسر سلیم اپنی بیٹی سلمیٰ کو جس قسم کی آزادی دیتے ہیں اسے ہندوستانی سماج میں معیوب ہی سمجھا جائے گا:

"پروفیسر صاحب اپنا عجیب شکل کا پائپ، جو وہ پچھلی بار سوئزر لینڈ سے لائے تھے، مُنہ میں لگائے ہوئے بڑی دریا دلی سے مُسکرا کر یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ جب کوئی لڑکی پہلی بار اپنے ادھ درجن مدّاحوں سے ملے تو اس کے شریف باپ کو یہی صورت اختیار کر لینی چاہیے۔"

ناول نگار جنسی آزادی کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا خیال ہے کہ:

"مجھے تو اعتراض اس بات پر ہے کہ کوئی کسی دوسرے کی لیبیڈو (LIBIDO) پر بحث کیوں کرے۔"

لیکن جب وہ نواب صاحب کی زندگی کو پیش کرتے ہیں تو اسی جنسی آزادی کو بُرائی قرار دیتے ہیں۔ ایک طرف لوسی لاٹوشی انور کا بوسہ لیتی ہے:

"اس نے اپنے لال لال گیلے ہونٹ اُس کے ہونٹوں پر رکھ دیے۔ لپ سٹک کا مزہ، بھوکے، جذباتی اور تجربہ کار ہونٹوں کا مزہ۔"

دوسری طرف سلمیٰ اسی حرکت کی مرتکب ہوتی ہے:

"سلمیٰ کے ہونٹ جن پر لپ سٹک کی ایک بہت ہی ہلکی سی تہہ تھی، سلمیٰ نے بھی مست ہو کر اُس کا پوری طرح ساتھ دیا اور اُس کے اس ردِ عمل سے جوش پا کر انور نے کئی بار اُس کے ہونٹوں کو چُوما... ایک خواہش کے خاتمے نے دوسری خواہش کو جنم دیا تھا۔ جو رہ رہ کر کانٹے کی طرح چبھتی تھی اور جو پہلی خواہش سے زیادہ زور دار اور زیادہ ڈرا دینے والی تھی۔"

دونوں ہی اقتباسات میں خود سپردگی کا جذبہ کارفرما ہے مگر ناول نگار نے ایک جگہ اس جذبے کو "بھوکا اور جذباتی" قرار دیا ہے اور دوسری جگہ یہی تجربہ گیلی مٹی کا سوندھا پن اور موسم گرما کی صبح میں بہنے والی ٹھنڈی ہوا' جیسا محسوس ہوتا ہے جو سراسر جانبدارانہ رویّہ ہے۔

جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے عبّاس صاحب زیادہ کامیاب نظر نہیں آتے ہیں۔ خود "انقلاب" کا مرکزی کردار "انور" جسے انھوں نے سیاست کے میدان کے انقلابی ہیرو کی حیثیت سے پیش کیا ہے، عملی جدوجہد کا ثبوت نہیں دیتا۔ اس کی سرگرمیاں صرف تقریروں اور سیاسی علمی' ادبی مباحثوں پر مبنی ہیں یا پھر وہ اپنا زیادہ تر وقت سلمیٰ سے محبّت کرنے اور اس کے ساتھ سیر و تفریح کرنے میں گذار دیتا ہے یا آشا کے ساتھ وقت بتاتا ہے۔ خواجہ احمد عبّاس نے اسے شروع ہی سے بیمار اور پھیپھڑے کا مریض بنا دیا ہے تاکہ وہ کوئی ہم جویانہ کام نہ کرنے پائے اور پھر یہ کہ اُسے رامیشور دیال کا حقیقی بیٹا قرار دیا جا سکے۔

کارل مارکس' گاندھی جی اور پنڈت نہرو کے علاوہ خان عبد الغفار خاں' سبھاش چندر بوس' راج گوپال اچاریہ اور سروجنی نائیڈو وغیرہ اہم شخصیتوں سے بھی قاری کی ملاقات ہوتی ہے۔ ناول نگار سبھاش چندر بوس اور نہرو جی کا موازنہ کچھ اس طرح کرتے ہیں:

"حالاں کہ دونوں سوشلسٹ تھے لیکن بوس آزادی اور سماجی انصاف کی طرف، اپنے جوشیلے رویّے کی وجہ سے دل کے جذبات کو چھو لیتے تھے، لیکن نہرو کی بات دماغ کو چھوتی تھی اور انیسویں صدی کے سیاسی فلسفیوں کی طرح وہ علم سے دماغوں میں تبدیلی کے ذریعے دُنیا کو بدلنا چاہتے تھے۔"

دیہات کی منظر کشی میں عباس صاحب نے پیکر تراشی سے کام لے کر نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ ناول میں تحریک کے دنوں کے بہت سارے سچّے واقعات کی کامیاب تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ تحریک میں شامل ہونے والے ملک کے انگنت جانبازوں کی تصویریں بھی نظر آتی ہیں۔ بھگت سنگھ کی سزائے موت کا بیان اور اس کی تصویر کشی بے حد متاثر کن ہے۔

تاریخی اعتبار سے یہ ایک کامیاب ناول ہے مگر فنّی معیار پر یہ پورا نہیں اُترتا۔ ناول کی ابتدا میں تو قاری کی دل چسپی قائم رہتی ہے لیکن جیسے جیسے پلاٹ آگے بڑھتا جاتا ہے خواجہ احمد عبّاس کا نقطۂ نظر ناول کے فنّی تقاضوں پر حاوی ہوتا جاتا ہے۔ اور فن مقصد تلے دب کر کراہنے لگتا ہے۔ بہت سی باتیں ناول میں محض بھرتی کی معلوم ہوتی ہیں جو ناول کے بے ساختہ اسلوب کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ ناول نگار نے اپنے نقطۂ نظر کو کچھ اس طرح واضح کیا ہے کہ ناول اس کی شخصیت کا انعکاس ہو کر رہ گیا ہے۔

بچوں کے خواجہ احمد عباس

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہمارے ملک کو غلامی
ملی اور ہم آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہوئے۔
تان کو نئے تقاضوں کے تحت لاتعداد مسائل کا بھی
بڑا۔ سیاسی، سماجی، اقتصادی، اخلاقی
ے ملک میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اس
اثر ہندوستان کی تمام زبانوں پر پڑا خصوصاً
ل سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ نئے ہندوستان
ے نئی نسلوں کو ہم آہنگ کرنے کے لیے
ل کو وسیلہ بنایا گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو
ر حسین جیسے رہنماؤں کی خصوصی توجہ کے
ں کا میلہ، بچوں کی کتابوں کا میلہ اور
، اچھی اور صحت مند کتابیں تیار کرنے والے
کیے گئے۔ اردو میں کرشن چندر، عصمت چغتائی،
یدر، صالحہ عابد حسین اور خواجہ احمد عباس
نے بچوں کے لیے اچھا اور معیاری نثری
خواجہ احمد عباس نے بچوں کے لیے متعدد
ے اور کہانیاں تخلیق کیں۔ ان کی ضروریات،
پیسوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اچھی فلمیں
احمد عباس کی تخلیقات موضوع، زبان
بہر اعتبار بچوں کے اچھے ادب میں شامل
استحقاق رکھتی ہیں۔

خواجہ احمد عباس، پنڈت نہرو کی شخصیت سے بیحد متاثر تھے۔ پنڈت نہرو کی خصوصی توجہ بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف تھی۔ خواجہ احمد عباس نے صرف بچوں کے لیے ڈرامے، کہانیاں اور مختلف النوع دلچسپ مضامین قلمبند کیے۔ بلکہ پنڈت جواہر لال نہرو کی شخصیت کے مختلف پہلو بچوں کے سامنے رکھے۔ ان کی زیادہ تر تخلیقات "پیام تعلیم" (نئی دہلی) "کھلونا" (نئی دہلی) اور "نور" (رامپور) جیسے رسائل میں شایع ہوئیں۔ خواجہ احمد عباس نے بچوں کے ادب کو ایک مخصوص زاویے سے دیکھا۔ اور ادب اطفال میں، اپنے نوع کی اچھوتی تخلیقات پیش کیں۔

خواجہ احمد عباس کو بچوں کی نفسیاتی پیچیدگیوں کا پورا پورا احساس تھا۔ موصوف کو بچپن سے ڈراما اسٹیج کرنے میں بھی دلچسپی تھی۔ ان کی ادبی سوسائٹی مختلف چھوٹے چھوٹے ڈرامے اسٹیج کیا کرتی تھی۔ جس میں انگریزی سے ترجمہ کیے ہوئے ڈرامے ہوتے کبھی اور آغا حشر کے ڈراموں کا اختصار بھی۔ صالحہ عابد حسین نے اسی طرح کے ایک ڈراما کا ذکر کیا ہے جس میں عباس صاحب ایک جاں باز مجاہد بنے تھے اس مجاہد نے ایک ظالم عیسائی بادشاہ کے استبداد کے سامنے سر جھکانا منظور نہیں کیا اور اس کی پاداش میں پہلے اپنی بہن کی جان نچھاور کی اور پھر خود "کلمۃ الحق" بلند کرتا ہوا دار پر چڑھ گیا[1]۔ بچپن کے ڈراما اسٹیج کرنے کے اس شوق نے ان کو کامیاب ڈراما نویس، ہدایت کار اور فلم ساز بنا دیا لیکن وہ بچوں کو نہیں بھولے اور بچوں کے لیے بھی کئی اچھی فلمیں تخلیق کیں۔ ان فلموں کی کہانیاں خود لکھیں اور ایک مشاق ہدایت کار کی حیثیت سے ان فلموں کی ہدایت کاری کی۔ ان فلموں کے موضوعات بچوں کی دلچسپیوں اور ضروریات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھے عباس صاحب کی ایسی فلموں میں "ممتا" اور "اپنا گھر" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان فلموں کے کردار بچے ہی تھے فلم "ممتا" میں مشہور نونہال اداکار ماسٹر روی نے اہم رول ادا کیا۔ اس فلم کی باتصویر کہانی ماہنامہ 'کھلونا' (نئی دہلی) نے بھی شایع کی تھی۔ عباس صاحب کی بنائی ہوئی ایسی فلموں پر حکومتِ ہند نے انعامات بھی دیے ہیں۔

خواجہ احمد عباس سچے ہندوستانی تھے۔ وطن کی محبت اور انسان دوستی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ قومی یگانگت، قومی یکجہتی اور حب الوطنی کو اپنے تمام ہم وطنوں کے دل و دماغ تک پہنچانے کے لیے، موصوف نے دلکش اسلوب اپنائے۔ اپنے ایک مضمون 'چاچا نہرو کا چوڑی دار پاجامہ' میں پنڈت نہرو کے مخصوص لباس کے بارے میں بچوں کو بتایا ہے درجِ ذیل اقتباس سے موصوف کے اسلوب اور طرزِ تحریر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

> "چوڑی دار پاجامہ اور شیروانی نہ
> ہندوؤں کا لباس ہے نہ مسلمانوں
> کا بلکہ ہندوستانی لباس ہے۔
> ہندو اور مسلم تہذیب و تمدن
> اور رہن سہن کے میل ملاپ سے
> جن چیزوں نے ہندوستان میں
> جنم لیا ان میں یہ لباس بھی شامل
> ہے۔ گویا چوڑی دار پاجامہ اور
> شیروانی پہن کر چاچا نہرو اعلان
> کرنا چاہتے تھے کہ نہ مجھے ہندو سمجھو نہ
> مسلمان، مجھے صرف ہندوستانی

خوشحال زیدی

۸۰ غفار منزل ایکسٹنشن، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۔

دونوں ہی اقتباسات میں خود سپردگی کا جذبہ کارفرما ہے۔ مگر ناول نگار نے ایک جگہ اس جذبے کو "بھوکا اور جذباتی" قرار دیا ہے اور دوسری جگہ یہی تجربہ "گیلی مٹّی کا سوندھاپن اور موسم گرما کی صبح میں بہنے والی ٹھنڈی ہوا" جیسا محسوس ہوتا ہے جو سراسر جانبدارانہ رویّہ ہے۔

جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے، عبّاس صاحب زیادہ کامیاب نظر نہیں آتے ہیں۔ خود "انقلاب" کا مرکزی کردار "انور" جسے انھوں نے سیاست کے میدان کے انقلابی ہیرو کی حیثیت سے پیش کیا ہے، عملی جدوجہد کا ثبوت نہیں دیتا۔ اس کی سرگرمیاں صرف تقریروں اور سیاسی، علمی، ادبی مباحثوں پر مبنی ہیں یا پھر وہ اپنا زیادہ تر وقت سلمیٰ سے محبّت کرنے اور اس کے ساتھ سیر و تفریح کرنے میں گذار دیتا ہے یا آشا کے ساتھ وقت بتاتا ہے۔ خواجہ احمد عبّاس نے اسے شروع ہی سے بیمار اور پھیپھڑے کا مریض بنا دیا ہے تاکہ وہ کوئی ہم جویانہ کام نہ کرنے پائے اور پھر یہ کہ اُسے رامیشور دیال کا حقیقی بیٹا قرار دیا جا سکے۔

کارل مارکس، گاندھی جی اور پنڈت نہرو کے علاوہ خان عبدالغفّار خاں، سبھاش چندر بوس، راج گوپال اچاریہ اور سروجنی نائیڈو وغیرہ اہم شخصیتوں سے بھی قاری کی ملاقات ہوتی ہے۔ ناول نگار سبھاش چندر بوس اور نہرو جی کا موازنہ کچھ اس طرح کرتے ہیں:

"حالاں کہ دونوں سوشلسٹ تھے
لیکن بوس آزادی اور سماجی
انصاف کی طرف، پنے جوشیلے رویّے
کی وجہ سے دل کے جذبات کو چھوتے
تھے، لیکن نہرو کی بات دماغ کو چھوتی
تھی اور انیسویں صدی کے سیاسی
فلسفیوں کی طرح وہ علم سے دماغوں
میں تبدیلی کے ذریعے دُنیا کو بدلنا
چاہتے تھے۔"

دیہات کی منظر کشی میں عباس صاحب نے پیکر تراشی سے کام لے کر نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ ناول میں تحریک کے دِنوں کے بہت سارے سچّے واقعات کی کامیاب تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ تحریک میں شامل ہونے والے ملک کے انگنت جانبازوں کی تصویریں بھی نظر آتی ہیں۔ بھگت سنگھ کی سزائے موت کا بیان اور اس کی تصویر کشی بے حد متاثر کن ہے۔

تاریخی اعتبار سے یہ ایک کامیاب ناول ہے مگر فنّی معیار پر یہ پورا نہیں اُترتا۔ ناول کی ابتدا میں تو قاری کی دل چسپی قائم رہتی ہے لیکن جیسے جیسے پلاٹ آگے بڑھتا جاتا ہے، خواجہ احمد عبّاس کا نقطۂ نظر ناول کے فنّی تقاضوں پر حاوی ہوتا جاتا ہے۔ اور فن مقصد تلے دب کر کراہنے لگتا ہے۔ بہت سی باتیں ناول میں محض بھرتی کی معلوم ہوتی ہیں جو ناول کے بے ساختہ اسلوب کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ ناول نگار نے اپنے نقطۂ نظر کو کچھ اس طرح واضح کیا ہے کہ ناول اس کی شخصیت کا انعکاس ہو کر رہ گیا ہے۔

بچوں کے خواجہ احمد عباس

۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کو ہمارے ملک کو غلامی سے نجات ملی اور ہم آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہوئے۔ لیکن [illegible]تان کو نئے تقاضوں کے تحت لاتعداد مسائل کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ سیاسی، سماجی، اقتصادی، اخلاقی تغیرات نے ملک میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اس انقلاب کا اثر ہندوستان کی تمام زبانوں پر پڑا خصوصاً ادبِ اطفال سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ نئے ہندوستان کے تقاضوں سے نئی نسلوں کو ہم آہنگ کرنے کے لیے ادبِ اطفال کو وسیلہ بنایا گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے رہنماؤں کی خصوصی توجہ کے نتیجے میں بچوں کا میلہ، بچوں کی کتابوں کا میلہ اور بچوں کے لیے اچھی اور صحت مند کتابیں تیار کرنے والے دارے قایم کیے گئے۔ اُردو میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، صالحہ عابد حسین اور خواجہ احمد عباس جیسے ادیبوں نے بچوں کے لیے اچھا اور معیاری نثری ادب پیش کیا۔ خواجہ احمد عباس نے بچوں کے لیے متعدد مضامین، ڈرامے اور کہانیاں تخلیق کیں۔ ان کی ضروریات، مسائل اور دلچسپیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اچھی فلمیں بنائیں۔ خواجہ احمد عباس کی تخلیقات موضوع، زبان اور اسلوب ہر اعتبار بچوں کے اچھے ادب میں شامل کیے جانے کا استحقاق رکھتی ہیں۔

خواجہ احمد عباس، پنڈت نہرو کی شخصیت سے بیحد متاثر تھے۔ پنڈت نہرو کی خصوصی توجہ بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف تھی خواجہ احمد عباس نے صرف بچوں کے لیے ڈرامے، کہانیاں اور مختلف النوع دلچسپ مضامین قلمبند کیے۔ بلکہ پنڈت جواہر لال نہرو کی شخصیت کے مختلف پہلو بچوں کے سامنے رکھے۔ ان کی زیادہ تر تخلیقات "پیامِ تعلیم" (نئی دہلی) "کھلونا" (نئی دہلی) اور "نور" (رامپور) جیسے رسائل میں شایع ہوئیں۔ خواجہ احمد عباس نے بچوں کے ادب کو ایک مخصوص زاویے سے دیکھا۔ اور ادبِ اطفال میں، اپنے نوع کی اچھوتی تخلیقات پیش کیں۔

خواجہ احمد عباس کو بچوں کی نفسیاتی پیچیدگیوں کا پورا پورا احساس تھا۔ موصوف کو بچپن سے ڈراما اسٹیج کرنے میں بھی دلچسپی تھی۔ ان کی ادبی سوسائٹی مختلف چھوٹے چھوٹے ڈرامے اسٹیج کیا کرتی تھی۔ جس میں انگریزی سے ترجمہ کیے ہوئے ڈرامے ہوتے بھی اور آغا حشر کے ڈراموں کا اختصار بھی۔ صالحہ عابد حسین نے اسی طرح کے ایک ڈراما کا ذکر کیا ہے جس میں عباس صاحب ایک جاں باز مجاہد بنے تھے اس مجاہد نے ایک ظالم عیسائی بادشاہ کے استبداد کے سامنے سر جھکانا منظور نہیں کیا اور اس کی پاداش میں پہلے اپنی بہن کی جان نچھاور کی اور پھر خود "کلمۃ الحق" بلند کرتا ہوا دار پر چڑھ گیا؎ بچپن کے ڈراما اسٹیج کرنے کے اس شوق نے ان کو کامیاب ڈراما نویس، ہدایت کار اور فلم ساز بنا دیا لیکن وہ بچوں کو نہیں بھولے اور بچوں کے لیے بھی کئی اچھی فلمیں تخلیق کیں۔ ان فلموں کی کہانیاں خود لکھیں اور ایک مشّاق ہدایت کار کی حیثیت سے ان فلموں کی ہدایت کاری کی۔ ان فلموں کے موضوعات بچوں کی دلچسپیوں اور ضروریات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھے عباس صاحب کی ایسی فلموں میں "منّا" اور "اپنا گھر" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان فلموں کے کردار بچے ہی تھے فلم "منّا" میں مشہور 'نونہال' اداکار ماسٹر رومی نے اہم رول ادا کیا۔ اس فلم کی باتصویر کہانی ماہنامہ 'کھلونا' (نئی دہلی) نے بھی شایع کی تھی۔ عباس صاحب کی بنائی ہوئی ایسی فلموں پر حکومتِ ہند نے انعامات بھی دیے ہیں۔

خواجہ احمد عباس سچے ہندوستانی تھے۔ وطن کی محبت اور انسان دوستی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ قومی یگانگت، قومی یک جہتی اور حب الوطنی کو اپنے تمام ہم وطنوں کے دل و دماغ تک پہنچانے کے لیے، موصوف نے دلکش اسلوب اپنائے۔ اپنے ایک مضمون "چاچا نہرو کا چوڑی دار پاجامہ" میں پنڈت نہرو کے مخصوص لباس کے بارے میں بچوں کو بتایا ہے درج ذیل اقتباس سے موصوف کے اسلوب اور طرزِ تحریر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

> "چوڑی دار پاجامہ اور شیروانی نہ ہندوؤں کا لباس ہے نہ مسلمانوں کا بلکہ ہندوستانی لباس ہے۔ ہندو اور مسلم تہذیب و تمدن اور رہن سہن کے میل ملاپ سے جن چیزوں نے ہندوستان میں جنم لیا ان میں یہ لباس بھی شامل ہے۔ گویا چوڑی دار پاجامہ اور شیروانی پہن کر چاچا نہرو اعلان کرنا چاہتے تھے کہ نہ مجھے ہندو سمجھو نہ مسلمان، مجھے صرف ہندوستانی

خوشحال زیدی

۸۰ غفار منزل ایکسٹنشن، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۔

سمجھو۔"

عبّاس صاحب نے بچّوں کے لیے جو فلمیں بنائیں، مضامین اور کہانیاں لکھیں۔ ان کی زبان صاف، سادہ اور رواں ہے۔ موضوع اور اسلوب دونوں میں ہم آہنگی ہے۔ درج ذیل سطور پڑھ کر ایسا لگتا ہے گویا کوئی ہم جولی، ہم عمر بچّہ اپنے ساتھیوں کو چاچا نہرو کے لباس کے بارے میں بتا رہا ہے:۔

"جب سے چاچا نہرو وزیرِاعظم بن کر
دہلی آئے تھے۔ ان کی شیروانیاں اور
پاجامے، کُرتے دہلی کے ایک بوڑھے
ٹیلر ماسٹر صاحب سیتے تھے۔ چاچا
نہرو کو بھلا کہاں فرصت تھی کہ وہ
اپنے کپڑوں لتّوں کی طرف توجہ دیں۔
ہر برس ٹیلر ماسٹر صاحب خود آتے
چاچا نہرو کی اجازت سے ان کے
کپڑوں کی الماریاں کھولتے، جو
شیروانیاں، پاجامے، کُرتے ڈھل ڈھل
کر پُرانے ہوگئے تھے یا جن کا رنگ
اُڑ گیا تھا ان کو علاحدہ کرتے۔"

اس قسم کے دوسرے مضامین میں "ساٹھ سال کا بچّہ" (ماہنامہ "کھلونا" نئی دہلی ستمبر ۱۹۵۴ء) "چاچا نہرو فلم اسٹاروں کے اسٹار" ("کھلونا" ستمبر ۱۹۵۷ء) اور "چاچا نہرو کیا تھے؟" ("کھلونا" فروری ۱۹۷۶ء) بھی قابلِ ذکر ہیں۔

بچّوں کے ادب میں کہانی اپنی امتیازی خصوصیات کی بنا پر سب سے زیادہ مقبول صنف ہے۔ جس کی خاص وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بچّے کا کائنات سے اوّلین رابطہ کہانیوں ہی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ پرندوں کی کہانیاں، پریوں کی کہانیاں، درختوں کی کہانیاں، پھولوں کی کہانیاں، بادشاہوں کی کہانیاں یہ اور اسی قسم کی

اور یہ سب کچھ کتنا پیارا ہے۔ بادشاہ، وزیر، بادشاہوں کے دربار، بادشاہوں کا جاہ و جلال، شان و شوکت، طرزِ حکومت، عدل و انصاف کے مختلف دلچسپ واقعات بچّے کے لیے دلچسپی کے حامل رہے ہیں۔ بچّے ایسے واقعات اور کرداروں میں نفسیاتی طور پر دلچسپی لیتے ہیں۔ آج بھی روایتی قصّے اور اساطیری کہانیاں اسی طرح مقبول ہیں۔ خواجہ احمد عبّاس نے ان موضوعات پر ایک طرزِ خاص میں کچھ کہانیاں لکھی ہیں موصوف کی ایسی کہانیوں میں "ایک دن کی بادشاہت" خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ یہ کہانی — کہانی کے ساتھ ڈرامے کا لطف بھی دیتی ہے جس میں بچّوں کو اسٹیج کی تیاری کے بارے میں دلچسپ انداز میں بتایا گیا ہے۔ چند سطور بطور نمونہ پیش ہیں:

"بادشاہ تخت پر بیٹھا تھا اس کے
سر پہ سُنہرا تاج تھا، اس کے بدن
پر ریشمی پوشاک تھی اس کے پیروں
میں زرتار جُوتے تھے تخت کے
نیچے شیر کی کھال بچھی ہوئی تھی اور
بادشاہ کے پیر مردہ شیر کے سر پر
دھرے تھے۔

سپہ سالار، وزیر، امیر درباری،
بادشاہ کے حضور میں ہاتھ باندھے
مؤدب اور سرنگوں کھڑے تھے۔
کسی کی ہمّت نہیں تھی کہ حضورِ ملکِ معظّم
کے سامنے سر بھی اُٹھا سکے۔ ہر ایک
شاہی حکم کا منتظر تھا۔"[۲]

ڈرامے کے فن سے بچّوں کو روشناس کرانے کی غرض سے، عبّاس صاحب نے کئی کہانیاں اور مضامین قلمبند کیے ہیں۔ اپنی ایک مختصر کہانی "انقلاب زندہ باد" میں ایک مزدور کا خاکہ اس

"ہوا میں دو ہاتھ بلند ہوئے ایک
ہاتھ میں ہتھوڑا تھا اور دوسرے میں
درانتی۔ اور اس انقلابی نشان کی
پرچھائیں انقلابی نوجوان کی چمکیلی
آنکھوں میں تھی۔ اس کی آواز میں
کروڑوں مزدوروں اور کسانوں
کے انقلابی نعروں کی بازگشت تھی۔"[۳]

عبّاس صاحب بچّوں کے ادیب ہی نہ تھے، بچّوں کے اچھے دوست بھی تھے — بچّوں میں بچّہ بن جاتے تھے کبھی کوئی ایسا تاثر نہ چھوڑتے جس سے بچّہ ان کو اپنا دوست نہ سمجھ کر بزرگ سمجھے۔ عبّاس صاحب بچّوں کو کسی قسم کی پند و نصیحت کرنے کے لیے ناصحانہ انداز نہیں اپناتے تھے۔ نفسیاتی طریقوں کا سہارا لے کر وہ اپنی بات بچّوں کے ذہن میں اس طرح اُتار دیتے جیسے کیپسول۔

حواشی

۱ صالحہ عابد حسین، "خواجہ احمد عبّاس" مشمولہ "نقوش" شخصیات نمبر، جنوری ۱۹۵۵ء۔

۲ خواجہ احمد عبّاس، "ایک دن کی بادشاہت" مشمولہ ماہنامہ "نور" بچّوں کا ڈائجسٹ، رامپور نومبر ۱۹۸۷ء، ص ۹۷۔

۳ خواجہ احمد عبّاس، "انقلاب زندہ باد" مشمولہ ماہنامہ "نور" رامپور، نومبر ۱۹۸۷ء، ص ۹۸۔

کمال احمد صدیقی

"خواجہ احمد عباس کی دو خوبیاں اس
ملک کی ادبی تاریخ میں نمایاں مقام حاصل
کریں گی۔
۱۔ ظلم سے نفرت اور اس کا برملا اظہار۔
وہ چاہے عیاں ظلم ہو یا سات پردوں
میں پنہاں۔
۲۔ دو ٹوک بات کہنا۔ اس منفرد
اسلوب کو نکھارا ہے ادبی اخبار نویسی

لوح و قلم

ایک پیش لفظ کا اقتباس اور تین کہانیاں

مجھے کچھ کہنا ہے...	خواجہ احمد عبّاس
تین مائیں ایک بچّہ	خواجہ احمد عبّاس
ایک لڑکی سات دیوانے	خواجہ احمد عبّاس
نیلی ساری	خواجہ احمد عبّاس

مجھے کچھ کہنا ہے...

ادیب اور نقّاد کہتے ہیں: خواجہ احمد عبّاس ناول یا افسانہ نہیں لکھتا۔ وہ محض صحافی ہے۔ ادب کی تخلیق اُس کے بس کی بات نہیں ہے۔

فلم والے کہتے ہیں: خواجہ احمد عبّاس کو فلم بنانا نہیں آتا۔ اُس کے فیچر فلم بھی محض ڈاکومنٹری ہوتے ہیں۔ وہ کیمرے کی مدد سے صحافت کرتا ہے۔ آرٹ کی تخلیق نہیں۔

اور خواجہ احمد عبّاس خود کیا کہتا ہے؟

وہ کہتا ہے: مجھے کچھ کہنا ہے..... اور وہ میں ہر ممکن طریقے سے کہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کبھی بلٹز میں "آخری صفحہ" (LAST PAGE) اور "آزاد قلم" لکھ کر۔ کبھی دوسرے اخباروں اور رسالوں کے لیے مضمون لکھ کر۔ کبھی افسانے کی شکل میں۔ کبھی ناول کی۔ کبھی ڈاکومنٹری فلم بنا کر۔ کبھی دوسروں کی فلموں کی کہانی یا ڈائیلاگ لکھ کر۔ کبھی کبھی خود اپنی فلم ڈائرکٹ کر کے۔

اور جو مجھے کہنا ہے وہ صرف یہی ہے کہ انسان کی اندرونی زندگی، اس کے ذاتی نفسیاتی مسائل اور اس کی بیرونی، سماجی اور اقتصادی زندگی میں ایک گہرا تعلّق اور رشتہ ہے۔ جو کچھ دُنیا میں، اُس کے اپنے ملک اور اُس کے سماج میں ہوتا ہے، اُس کا اثر اُس کے اپنے کردار پر اور اُس کے افعال پر پڑتا ہے۔ جیسے جیسے دُنیا، سماج، ملک کا اقتصادی، سیاسی اور سماجی نظام بدلتا جاتا ہے اُسی طرح انسان بھی بدلتے رہتے ہیں۔

آج کے انسان وہ نہیں ہیں جو آج سے چار سو پانچ سو سال پہلے تھے۔ پُرانے ادبی سانچوں میں وہ فٹ نہیں بیٹھتے۔ ان کو نئے ڈھنگ سے دیکھنے کی، دِکھانے کی، جانچنے کی، پرکھنے کی ضرورت ہے۔

آزادی کے بعد تو یہ سماجی اور نفسیاتی تبدیلیاں اور تیزی کے ساتھ ہو رہی ہیں۔ اَن پڑھ کسانوں کے بیٹے زراعتی یونیورسٹیوں میں پڑھ رہے ہیں جن کے باپ آج بھی لکڑی کے ہل چلاتے ہیں وہ ٹریکٹر اور بڑے بڑے کرین اور بل ڈوزر چلا رہے ہیں جن کے باپ دادا زمیندار اور ساہوکاروں کے آگے ماتھا ٹیکتے تھے وہ آج سر اُٹھا کر اپنا حق مانگ رہے ہیں۔

یہ بدلتا ہوا ہندوستان اور بدلتے ہوئے ہندوستانی میرے افسانوں کا موضوع ہیں خصوصاً اُن افسانوں کا جو اس مجموعے میں شامل ہیں۔

مگر سماجی اور نفسیاتی تبدیلیاں یکساں رفتار سے نہیں ہوتیں۔ انسان کے کردار اور افع[...] پر مختلف سماجی طاقتیں اور نفسیاتی اُلجھنیں اپنا اثر ڈالتی ہیں کوئی انسان زیادہ اثر قبول کرتا ہے کم۔ کوئی جلدی بدل جاتا ہے کوئی دیر میں، کوئی [...] بھی ہوتا ہے جو بدلنے کو تیار نہیں ہوتا۔ میر[...] ان افسانوں میں آپ کو ایسے ہر قسم کے ہندو[...] ملیں گے۔ اچھے، بہت اچھے، ذہین، بہت ذہین، بُ[...] بے وقوف، ظالم، مظلوم۔ اپنی قسمت آپ بن[...] والے۔ اپنی محرومیوں اور اُلجھنوں سے رونے و[...] اور وہ بھی جنھوں نے قسمت کے آگے ہتھیار [...] دیے ہیں۔ جو آج بھی سماج کے ذات پات کے و[...] اور ڈھکوسلوں کے غلام ہیں میں ان تمام ہندو[...] سے محبّت کرتا ہوں، سب سے ہمدردی رکھتا [...] سب کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس لیے کہ [...] میرے ہم وطن ہیں، میرے ہم عصر ہیں۔ میں ا[...] افسانوں میں ان کے چہرے اور کردار دکھانا چا[...] ہوں۔ نہ صرف اوروں کو بلکہ خود اُن کو، انسا[...] سماج کو، شیشہ دکھانا بھی ایک انقلابی فعل ہو[...] ہے۔ کیوں کہ خوش فہمی نہیں بلکہ خود فہمی، اپنی ذ[...] کو سمجھنا بھی، بڑی سماجی اور نفسیاتی تبدیلیو[...] حرکت میں لا سکتا ہے۔

—— خواجہ احمد عبّاس

تین مائیں ایک بچہ

خواجہ احمد عباس

بچّہ ایک تھا..... چار پانچ برس کا ہوگا۔ خوبصورت تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں مگر ان آنکھوں میں دُنیا بھر کا غم بھرا ہوا تھا۔ جیسے ایک بڑے گمبھیر فلاسفر کو پاکٹ سائز کا بنا دیا گیا ہو۔ جسم بھی لاغر تھا۔ جو تعجب کی بات نہیں تھی کیوں کہ وہ بچپن ہی سے ایک بھکارن کے یہاں پلا تھا جو اُسے نہ دُودھ ہی دے سکی تھی نہ انڈا۔ نہ کوئی وٹامن۔ نہ پروٹین۔ نہ مچھلی۔ نہ چکن۔

بچّہ کا مقدمہ سارے ملک میں مشہور تھا۔ ٹیلی ویژن پر جن بھکاری اور لاوارث بچّوں کی تصویریں آئی تھیں' ان میں یہ بچّہ بھی تھا۔ سارے ملک میں ایک ہمدردی اور شفقت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ جب بچّے نے اپنی توتلی زبان سے کہا تھا: "میری ماں بھگوان کے پاس چلی گئی ہے۔"

ان ٹیلی ویژن دیکھنے والوں میں دو خوشحال بڑے خاندانوں کی عورتیں بھی تھیں۔ بچّے کو دیکھتے ہی اُن کی مامتا اُبل پڑی۔ ایک بمبئی میں تھی۔ ایک دہلی میں۔ لیکن دونوں نے فوراً کہا: "یہ تو میرا بچّہ ہے۔" اگرچہ ایک نے کہا: "یہ تو میرا بچّہ گوپال ہے۔" اور دوسری نے کہا: "یہ تو میرا بچّہ حامد ہے۔"

جو بمبئی میں تھیں۔ وہ مسز لکشمی جے سوریہ تھیں۔ جو اصل میں وزیاگ پٹنم کی رہنے والی تھیں' مگر اب چند سال سے بمبئی میں مقیم تھیں کیوں کہ اُن کے شوہر مسٹر جے سوریہ ایک پانی کے جہاز بنانے والی کمپنی میں انجینئر تھے۔ پہلے وہ دو ہزار ماہوار پر گورنمنٹ کے ملازم تھے اور وزیاگ پٹنم کے شپ یارڈ میں کام کرتے تھے۔ وہاں سے ایک پرائیویٹ فرم کو لاکھوں کا فائدہ پہنچانے کے الزام میں SUSPEND کیے گئے اور اسی پرائیویٹ فرم نے ان کو بڑی تنخواہ پر ملازم رکھ لیا۔ ایک بڑی امپورٹیڈ کار اور سمندر کے کنارے سجا سجایا فلیٹ مفت۔ اب وہ پہلے سے زیادہ ٹھاٹ باٹ سے رہنے لگے تھے۔ گھر میں ہر قسم کا اعلا سامان تھا۔ جاپانی گڑیاں اپنے شیشے کے گھروں میں سے اپنی مُردہ نیلی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔ پلاسٹک کے پھول گلدانوں میں سجے تھے جن میں سے نہ بو آتی تھی نہ باس۔ نہ ہی پانی دینے کی ضرورت تھی۔ لیکن دیکھنے میں بالکل اصل لگتے تھے۔ لیکن جب کبھی گھر میں پارٹی ہوتی تھی تو مسز لکشمی جے سوریہ اُن کے پتوں پر پانی چھڑک دیتی تھیں اور پھولوں پر سینٹ کی پچکاری سے سینٹ چھڑک دیتی تھیں۔ گھر میں بس ایک ہی چیز کی کمی تھی۔ وہ ایک بچّہ تھا۔

سو لکشمی جے سوریہ نے جیسے ہی بڑی بڑی افسردہ آنکھوں والے بھکاری بچّے کو دیکھا اور ان کو یقین ہوگیا کہ یہ اُن کا ہی کھویا ہوا گوپال ہے' وہ بچّے پر اپنا حق ثابت کرنے کے لیے اپنے شوہر کے تمام رُسوخ استعمال کرنے کے لیے تیار ہوگئیں۔

اُدھر دہلی میں اُن کی ہی عمر کی بیگم شہناز مغل مرزا نے جب بچّے کو دیکھا' جن کے شوہر کی ساری جایداد دلّی اور نئی دہلی میں بکھری پڑی ہوتی تھی کیوں کہ اُن کے بارے میں مشہور تھا کہ شاہی خاندان سے ہیں۔ اصل میں وہ شاہی خاندان سے تو نہیں تھے لیکن ان کے پڑدادا و کڑدادا بادشاہ سلامت کے حقّہ بردار ضرور تھے جو اپنے حقّے کی آواز کی مناسبت سے گڑگڑ بیگ کہلاتے تھے اور اس لیے محل کے ماحول سے اور محل کی زبان سے اچھی طرح واقف تھے۔ غدر کے بعد جب بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو رنگون جلاوطن کیا گیا تو اُن کے حقّہ بردار نے کھلّم کھلا انگریزوں کا ساتھ دیا اور بادشاہ کے بہت سے راز اور بہت سے خزانے انگریزوں کے سامنے ظاہر کر دیے۔ جس کے انعام میں انگریزوں نے بہت سی شاہی جایداد ان کے نام کر دی اور اعلان کر دیا کہ شہزادہ ("گڑگڑ بیگ" سے حقّے کی بو آتی تھی اس لیے انھیں "گُل گُل بیگ" بنا دیا گیا تھا۔) گُل گُل بیگ اُن اصل شہزادوں میں سے ایک ہیں جو آخر وقت تک برٹش گورنمنٹ کے وفادار رہے۔ غرض اب کہ صاحب جایداد ہو گئے تھے، انھوں نے اور ان کے بیٹوں پوتوں نے اس جایداد کو سوا سو برس میں کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ (ایک حویلی گلی قاسم جان میں' ایک حویلی بلیماران میں۔ ایک باغ سبزی منڈی میں' جو اب مغل باغ کہلاتا تھا۔)

نئی دہلی بننے کا اعلان ہوتے ہی انگریز افسروں کے اشارے پر انھوں نے زمین کے بہت سے ٹکڑے خرید لیے۔ اب وہاں اُونچی اُونچی بلڈنگیں بن گئی تھیں: "مرزا ٹیرس"، "مغل پیلس ہوٹل" اور "حویلی اپارٹمینٹس"۔ چند عمارتیں تھیں جو یا تو مرزا مغل بیگ کی اپنی تھیں یا جن میں ان کا بڑا حصّہ تھا۔

ان کا اپنا گھر "گُل گُل محل" (جو انھوں نے اپنے جدِّ امجد کے نام پر رکھا تھا) ایک فرانسیسی آرکی ٹیکٹ نے مغل اسٹائل میں تعمیر کیا تھا۔ اس لیے اس میں مغل

نفاست اور نزاکت کے ساتھ یوروپین FUNCTION-
ALISM- کا امتزاج تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھنے میں مغل
پیلس لگتا تھا لیکن اندر اسٹین لیس اسٹیل اور شیشے
سے کام لے کر بیڈ روم، ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم،
باتھ روم وغیرہ بنائے گئے تھے۔ اس گھر میں بھی بس
ایک ہی کمی تھی، مرزا مغل بیگ کا کوئی جانشین نہیں
تھا۔ ایک بچّہ تھا جو گورنیس کی غفلت سے یا اُس کے
مجرمانہ تغافل سے چھ مہینے کی عمر میں ہی کھو گیا تھا۔ مغل
بیگ نے تقریباً ایک لاکھ روپے تو بچّے کو ڈھونڈنے میں
ہی لگا دیے تھے لیکن وہ نہ ملا تھا۔ یہاں تک کہ پانچ
سال بعد جب ایک دن وہ جم خانہ کلب میں رمی کھیل
رہے تھے اور بیگم صاحبہ گھر میں ٹیلی ویژن دیکھ رہی تھیں،
ان کے گھر سے ٹیلی فون آیا۔

"کون شہناز! ابھی کتنی بار کہا ہے کہ جب
ہم گیم کھیل رہے ہوں تو ٹیلی فون نہ کیا کرو۔ یہاں
ہزاروں کی بازی لگی ہوئی ہے۔"

مگر شہناز بیگم کا جواب پا کر وہ اچنبھے میں
رہ گئے۔ "بھاڑ میں جائے تمھاری ہزاروں کی بازی۔
ہمارا شہزادہ مل گیا ہے۔"

"ہمارا شہزادہ مل گیا ہے؟ کہاں ملا؟"

"بمبئی میں ہے۔ وہاں ہمیں جانا پڑے گا
اُسے لانے کے لیے پولس کمشنر کے نام ایک لیٹر آف
انٹروڈکشن لے لینا۔"

اگلے دن سویرے ہی وہ ہوائی جہاز سے بمبئی
پہنچ گئے۔

یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ایک اور ماں نے
دعوا کیا ہے کہ بچّہ اس کا ہے۔ وہ لوگ بھی بڑے
ذی اثر معلوم ہوتے ہیں، کسی شپنگ کمپنی میں
انجینئر ہیں۔

معاملہ کورٹ میں پہنچا۔

مسز لکشمی جے سوریہ کو بلایا گیا۔

"آپ کا نام" سرکاری وکیل نے پوچھا۔

"مسز لکشمی جے سوریہ۔"

"آپ کا دھرم؟"

"ہندو۔ برہمن۔"

"معاف کیجیے گا۔ آپ شادی شدہ ہیں؟"

"جی کیا مطلب! میرے شوہر مسٹر جے سوریہ
ہیں۔ شپنگ انجینئر۔"

"صرف جو بات پوچھی جائے، اُس کا جواب
دیجیے۔ کتنے سال ہوئے ہیں آپ کی شادی کو؟"

"جی چار برس۔ نہیں نہیں..... پانچ برس۔"

"ٹھیک ٹھیک بتائیے۔"

"ٹھیک یاد نہیں۔ کوئی چار پانچ برس ہوئے
ہوں گے۔"

"اپنی شادی کی تاریخ آپ کو یاد نہیں؟"

"جی تاریخ تو یاد ہے۔ اونم کے دن ہماری
شادی ہوئی تھی، میناکشی مندر میں۔"

"میں صرف تاریخ اور سنہ پوچھ رہا ہوں۔ کہاں
ہوئی تھی، یہ میں نے ابھی نہیں پوچھا ہے .....
کس سنہ میں آپ کی شادی ہوئی تھی وہ آپ کو یاد
نہیں؟"

"ہاں سنہ یاد نہیں ہے۔"

"اگر ۷۴ میں آپ کی شادی ہوئی تھی تو کیا
یہ کہنا غلط ہوگا کہ شادی سے پہلے ہی آپ ماں
بن چکی تھیں۔"

"جی نہیں۔ ہماری شادی ۷۵ میں
ہوئی ہوگی۔"

"ہاں اگر ۷۵ میں ہوئی ہے تو ٹھیک ہے۔
مگر آپ کو تو یاد نہیں۔ کیا میناکشی مندر میں کوئی رکارڈ
نہیں رہتا۔"

"جی نہیں۔ میرے خیال میں تو رکارڈ
نہیں رہتا۔"

"کیا اسی لیے آپ نے میناکشی مندر
تھا اپنی شادی کے لیے۔ میناکشی مندر ہے کہاں
"مدورا۔"

"اتنی دور آپ گئیں جب کہ اتنا بڑ
خود وڑیاگ پٹنم میں موجود ہے؟ خیر یہ کیسے
مہینے بعد ہی آپ کا بچّہ کھو گیا۔"

"جی وہ گورنیس لے کر بھاگ گئی تھ
یاد ہے اچھی طرح سے۔ نیو ایر ڈانس ہو رہا تھ
رات کو ۲ جب ہم آئے تو وہ بچّے سمیت
غائب تھی۔"

"آپ نے پولس میں رپورٹ کی تھی
رکارڈ میں ہونی چاہیے۔"

"جی نہیں۔ رپورٹ شاید نہیں کی تھ

"کیوں؟"

"اس لیے کہ اس میں بدنامی ہوتی

"بدنامی کیوں ہوتی ہے؟"

"کیوں کہ بچّہ ذرا جلدی ہو گیا تھا۔
ATURE BIRTH- کہتے تھے ڈاکٹر صاحب،

"کون سے ڈاکٹر صاحب؟"

"ڈاکٹر..... نام تو یاد نہیں۔"

"شادی کی تاریخ آپ کو یاد نہیں
آپ کو یاد نہیں..... دُودھ کتنے دن پلایا
نے؟"

"دُودھ تو آج کل کوئی نہیں پلاتا

"یقین ہے آپ کو؟ اگر میں لاکھوا
یہاں بُلا کر یہی سوال پوچھوں کہ انھوں نے
دُودھ پلایا کہ نہیں؟"

"وہ معمولی عورتیں ہوں گی۔ میرا،
سوسائٹی لیڈیز میں کوئی دودھ نہیں پلا

"سوسائٹی لیڈیز سے آپ کی کیا

"لیڈیز جو ہائی سوسائٹی کو BELONG
ہیں۔"
"ہائی سوسائٹی کا مطلب؟"
"جو لوگ امیر ہیں، خوش حال ہیں۔ جن کے
بڑی پوزیشن رکھتے ہیں۔"
"اچھا تو آپ کے شوہر کو بلانا پڑے گا۔"
مسٹر جے سوریہ کو گواہوں کے کٹہرے میں پیش
کیا۔
"آپ کا نام؟"
"رماکانت جے سوریہ۔"
"کتنے عرصے سے آپ گولڈن شپنگ کمپنی
ہیں؟"
"کوئی تین برس سے۔"
"اس سے پہلے کہاں تھے؟"
"وزیاگ پٹنم شپنگ یارڈ میں انجینئر تھا۔"
"کیا تنخواہ ملتی تھی؟"
"وہاں دو ہزار ماہوار۔"
"یعنی اب زیادہ ملتی ہے؟"
"جی ہاں۔"
"کتنی ملتی ہے؟"
"چار ہزار روپے ماہوار، فلیٹ اور فری کار
علاحدہ ہیں۔"
"یعنی چھ ہزار کے قریب ہوں گے ——"
جی ہاں، آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں، مگر انکم ٹیکس میں
چار ہزار پر ہی دیتا ہوں۔"
"وزیاگ پٹنم آپ نے کیوں چھوڑا؟"
"بمبئی سے بہتر آفر آگئی۔"
"کوئی اور وجہ نہیں تھی؟"
"جی۔ ایک انکوائری ہوئی تھی، اُس میں کچھ
غلط فہمیاں تھیں۔"
"ان کی بنا پر آپ کو SUSPEND کیا گیا؟"

"ہاں، آپ کہہ سکتے ہیں۔ دراصل میں خود
بھی RESIGN کرنے کی سوچ رہا تھا۔"
"مگر پھر بھی آپ کو SUSPEND کیا گیا؟
سچ سچ بتائیے۔"
"جی..... ہاں۔"
"کس کمپنی کا نام لیا گیا تھا اس انکوائری
میں جس کی بنا پر آپ کو معطل کیا گیا؟"
"یاد نہیں۔ میں نے کہا نہیں کہ وہ غلط فہمیوں
کی بنا پر تھا۔"
"میں یاد دلاتا ہوں آپ کو۔ کیا گولڈن شپنگ
کمپنی کا نام لیا گیا تھا اس انکوائری میں؟"
"جی شاید۔"
"شاید نہیں۔ ٹھیک ٹھیک بتائیے۔ ورنہ مجھے
کورٹ سے کہہ کر گورنمنٹ کا رکارڈ منگوانا پڑے گا
یا مینا کشی ٹیمپل کی طرح وہاں بھی رکارڈ نہیں رکھے
جاتے۔ کہئیے گولڈن شپنگ کمپنی ہی تھی یا نہیں۔"
"جی ہاں شاید گولڈن شپنگ کمپنی ہی تھی؟"
"شاید نہیں۔ یقیناً۔"
مجسٹریٹ نے وکیل سے پوچھا: "آپ —— ان
سوالوں سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟"
"جناب والا، میں مسٹر جے سوریہ کا کیریکٹر
دکھانا چاہتا ہوں کہ یہ ماں باپ بننے کے قابل ہیں کہ
نہیں۔ بس ایک سوال اور ہے، مسٹر جے سوریہ آپ نے
اپنی گورنیس کے خلاف پولس میں رپورٹ کیوں نہیں
درج کرائی؟"
مسٹر جے سوریہ اس سوال کے لیے تیار نہیں
تھے۔ بوکھلا گئے۔ "جی وہ بات یہ تھی کہ....." پھر
رُک گئے۔
"ہاں ہاں۔ بات کیا تھی؟"
"میں اُس کو PROVOKE نہیں کرنا چاہتا
تھا۔"

"یعنی وہ ایسی باتیں جانتی تھی جو آپ کے
کیریر کو تباہ کر سکتی تھیں۔"
"جی ہاں، یہی سمجھیے۔"
"کیا آپ کے اس گورنیس سے کچھ خاص قسم کے
تعلّقات تھے؟"
"جی نہیں۔"
"ٹھیک ٹھیک بتائیے ورنہ آپ کو CONT-
EMPT OF COURT - میں بھی دھرا جا سکتا ہے۔"
"جی ہاں یہی سمجھیے۔"
کیا یہ سچ نہیں ہے کہ وہ آپ کے بچّے کی ماں
بننے والی تھی، اگر آپ پولس میں رپورٹ کرتے تو وہ بات
باہر جاتی۔"
مسٹر جے سوریہ کا رنگ اُڑ گیا۔
"جی ہاں، یہی سمجھیے۔"
"مطلب یہ کہ آپ نے اپنے بچّے کو قربان کر دیا
اپنے کیریر کی خاطر۔ اس وقت آپ کا خیال ہوگا کہ
دوسرا بچّہ ہو جائے گا مگر آپ کے کوئی دوسری اولاد
نہیں ہوئی۔"
"نہیں۔"
"یہ آپ کو قدرت کی طرف سے سزا ملی۔ بس
مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔ آپ جا سکتے ہیں۔"

اب نواب مغل مرزا اور اُن کی بیگم کی باری
تھی۔
پہلے بیگم صاحبہ عدالت کے سامنے پیش ہوئیں۔
"آپ کا نام؟"
"مسز مہ ناز بیگم مغل مرزا۔"
"عمر کیا ہے؟"
"عورتوں کی عمر نہیں پوچھا کرتے۔ یہ بیڈ مینرز
کہلاتا ہے۔"
"بیگم صاحبہ یہ عدالت ہے۔ یہاں آپ کی

سوسائٹی کے میز نہیں چلتے۔ ٹھیک ٹھاک [illegible]

کیا عمر ہے؟"

"کوئی پینتیس ۳۵ چھتیس ۳۶ کی ہوگی۔" [illegible]

"اگر میں کہوں کہ آپ کی عمر پینتالیس [illegible]

کی ہے تو آپ کیا کہیں گی؟"

"یہی کہوں گی کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں چالیس سے ایک برس بھی زیادہ نہیں ہوں۔"

"تھینک یو۔ میں بھی یہی جاننا چاہتا تھا... آپ کی شادی مرزا صاحب سے کس عمر میں ہوئی؟"

"جب میں تیس برس کی تھی۔"

"اور آپ کے شوہر۔ وہ کتنے سال کے تھے؟"

"وہ کوئی باون برس کے ہوں گے۔"

"یہ آپ کی پہلی شادی تھی؟"

"جی.... نہیں" بیگم صاحبہ نے دھیمے سے کہا: "یہ میری دوسری شادی تھی۔"

"آپ کوئی بچہ بھی ساتھ لائی تھیں؟"

"جی ہاں ایک لڑکا۔"

"کیا عمر ہے اس کی اب؟"

"ماشا اللہ اٹھارویں برس میں ہے؟"

"وہ کیا کرتا ہے؟"

"اپنے ابا کا ہاتھ بٹاتا ہے اُن کے بزنس میں۔"

"تنخواہ کیا ملتی ہے؟"

"تنخواہ کیوں ملتی؟ برابر کا پارٹنر ہے اپنے باپ کا۔"

"مگر مرزا صاحب اس کے باپ تو نہیں ہیں۔؟"

"اب تو وہی ہیں۔ اور کسی باپ کو وہ جانتا ہی نہیں۔"

"آپ کے پہلے شوہر کیا کرتے تھے؟"

"اُس سے آپ کو کیا لینا ہے؟"

[illegible] ی۔

"ہوٹل کی بزنس۔ کیا نام بتایا اُن کے ہوٹل کا؟"

"اُن کے ہوٹل کا.... اُن کے ہوٹل کا نام.... دراصل وہ اُن کا ہوٹل نہیں تھا۔ وہ پارٹنر شپ میں چلاتے تھے۔"

"اُن کا پارٹنر کون تھا؟"

"اُن کے پارٹنر تھے.... مرزا مغل بیگ۔"

"یعنی آپ کے موجودہ شوہر؟"

"جی ہاں۔"

"تو شاید آپ کی ملاقات مرزا صاحب سے پہلے سے ہوگی؟"

"ہاں۔ ہوٹل میں تو آتے جاتے ملاقات ہو ہی جاتی تھی۔"

"اگر میں کہوں کہ آپ کے پہلے شوہر آپ کے موجودہ شوہر کے پارٹنر نہیں تھے۔ بلکہ ملازم تھے تو کیا یہ غلط ہوگا؟"

بیگم صاحبہ کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ بولیں: "جی ہاں۔ آپ ایسا بھی کہہ سکتے ہیں۔ دراصل وہ ایک قسم کے مینیجر تھے۔"

"اچھی طرح سے یاد کیجیے.... مینیجر تھے یا نان بائی تھے؟"

"تو کیا ہوا؟ مسلمانوں میں ذات پات نہیں چلتی۔ اُن کے ہاتھ میں ہُنر تھا۔"

"وہ تو ظاہر ہے۔ "ننھے میاں کی نان" کی شہرت تو بمبئی تک پہنچ چکی تھی۔ جب ان کے انتقال کی خبر پڑھی تو ہم کو بھی افسوس ہوا تھا۔ یہ حادثہ کیسے ہوا؟"

بیگم صاحبہ اپنے سابق شوہر کی موت کے ذکر کو برداشت نہ کر سکیں۔ آبدیدہ ہوگئیں اور عطر حنا سے معطّر ایک فرانسیسی لیس کا رومال نکال کر آنسو پونچھنے پڑے۔

"معاف کیجیے۔ بیگم صاحبہ کبھی کبھی عدالت میں بڑے تکلیف دہ سوال کرنے پڑتے ہیں..... مگر دہلی کی عدالت میں یہ معاملہ کافی دنوں تک کھنچا تھا۔ مرزا صاحب کو بھی عدالت میں پیش کیا گیا تھا۔"

"جی ہاں۔ مالک کی حیثیت سے گواہی دینی پڑی تھی انھیں۔" وکیل نے ذرا سخت لہجہ اختیار کیا: "گواہ کی حیثیت سے نہیں ملزم کی حیثیت سے۔"

اُس کی نگاہ اب نواب مرزا پر گئی جو گھبرا کر اپنی کرسی سے اُٹھ رہے تھے۔ "نواب صاحب تشریف رکھیے۔ ابھی آپ سے بھی چند سوال کرنے ہیں۔"

مرزا صاحب نے بھی اپنی جیب سے ایک سفید رومال نکالا اور اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھنے لگے۔

اب نواب مرزا مغل کو گواہوں کے کٹہرے میں پیش کیا گیا۔

"آپ کا نام؟"

"آپ جیسے نہیں جانتے؟"

"پھر بھی آپ کی زبان سے آپ کا نام جاننا چاہتا ہوں؟"

"نواب مغل مرزا دہلوی۔"

"یہ مغل مرزا عجیب نام معلوم ہوتا ہے!"

ممکن ہے آپ کو عجیب نام معلوم ہوتا ہو۔
... کو جانتے ہیں؟"
... میں مرزا کو جانتا ہوں۔ مرزا
... تو آپ بھی جانتے
ہوں گے؟"

"غالب کو کون نہیں جانتا؟"

"اس لیے کہ غالب شاعر تھے۔ کوئی حقہ بردار نہیں تھے۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ کے جدِ امجد کا نام کیا تھا جو بادشاہ کے زنگون جلاوطن ہونے کے بعد دہلی میں ترقی کی منزلیں طے کر رہے تھے؟"

"مرزا گل گل بیگ۔"

"کہ ایک گُل تو ہم سمجھے۔ گُل کے معنی گلاب کے پھول کے بھی تو ہوتے ہیں اور وہ گُل بھی ہوتا ہے جو حقّہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔"

"حقّہ سے اس کیس کا کیا تعلّق ہے؟"

"حقّہ سے ایسا ہی تعلّق ہے جیسا کہ تندور سے ہے۔ جہاں روٹیاں اور نان سینکی جاتی ہیں اور جس میں کسی وقت انسان کو پھینک دیا جائے تو منٹوں میں اُس کا بھی کباب بن جاتا ہے۔"

نواب صاحب دہلی میں بڑی اونچی سوسائٹی میں گھومتے تھے۔ عہدیداروں کے ساتھ تاش کھیلتے تھے۔ اُسی رُعب کو اس وقت استعمال کر کے انھوں نے مجسٹریٹ سے کہا: "یور آنر۔ اپنے وکیل کو سمجھائیے۔ سنبھل کے سوال جواب کرے ورنہ....."

"ورنہ کیا ہوگا؟" وکیل نے جلدی سے کہا "اُس کا بھی کباب بنا دیا جائے گا۔" اور پھر اُس نے مجسٹریٹ سے کہا: "یور آنر۔ میں جو الفاظ استعمال کر رہا ہوں یہ دہلی کی پہلی عدالت کی رپورٹ میں موجود ہیں۔ اگرچہ سیشن کورٹ نے مرزا صاحب کو BENEFIT OF DOUBT دیتے ہوئے رہا کر دیا۔ صرف BENEFIT OF DOUBT مگر DOUBT تو رہا اور رہے گا۔" یہ سب سُن کر نواب صاحب دھیمے پڑے۔

وکیل نے اب ترپ کا اِکّہ نکالا۔ "آپ کے نان بائی کا حادثہ کس سال میں ہوا تھا؟"

"سنہ چھیتر میں۔"

"شاید اپریل کا مہینہ تھا؟"

"شاید" نواب صاحب نے اقرار کیا۔

"اور پہلی مئی کو آپ کی شادی خانہ آبادی مرحوم نان بائی کی خوب صورت بیوہ سے ہوگئی اور صرف پانچ مہینے بعد اُن کی گود میں ایک بچّہ کھیلنے لگا۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ وہ پہلے بھی شادی شدہ تھی۔"

"مگر دہلی کی عدالت میں یہ بات ثابت کی جاچکی ہے کہ قتل، سوری موت سے چھ مہینے پہلے سے شہناز بیگم کے تعلّقات اپنے شوہر کے ساتھ منقطع ہو چکے تھے۔"

نواب صاحب کو پسینہ آرہا تھا۔ وہ اپنی جیب سے رومال نکال کر پیشانی پونچھنے لگے۔

"معاف کیجیے نواب صاحب کہ مجھے بعض ذاتی سوال بھی پوچھنے پڑے۔ اب آپ تشریف رکھ سکتے ہیں..... اب میں بیگم صاحبہ کو تکلیف دوں گا۔"

بیگم صاحبہ پھر گواہوں کے کٹہرے میں پیش ہوئیں۔

"بیگم صاحبہ۔ آپ کا کہنا ہے کہ یہ بچّہ آپ کا کھویا ہوا بیٹا ہے۔"

"جی ہاں..... مگر....."

"کچھ شک ہے آپ کو؟ آپ کا بچّہ کیسے اور کب کھو یا گیا تھا؟"

"کوئی آٹھ مہینے کا ہوگا اس وقت وہ۔ یہ نومبر ۱۷ء کی بات ہے۔ اس کی گورنیس مس ولیم حسب معمول اس کو پرام میں بٹھا کر پارک میں لے گئی تھی۔ وہاں پارک کی ایک بنچ پر وہ بیٹھ گئیں اور پرام اپنے قریب کر لیا۔ وہاں اُن کی آنکھ لگ گئی۔ جب آنکھ کھلی تو پرام خالی تھا۔ بچّہ اس میں نہیں تھا..... جب مجھے پتا چلا تو میں نے پولس کو فون کیا۔ نواب صاحب کو کلب میں فون کیا۔ وہ پولس افسروں کو ساتھ لے کر آئے۔ انھوں نے مجھ سے اور نواب صاحب سے پوچھا کہ آپ کو کس پر شُبہ ہے؟ ہم نے کہا کہ بچّہ کِڈنیپ تو کیا جاسکتا ہے مگر یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا۔ خدا نے کھیلنے کے لیے ایک کھلونا دیا تھا، شاید اب واپس لے لیا۔"

"کتنے عرصے کھیلی تھیں آ سس کھلونے سے آپ؟"

"کوئی وقت مقرر تھوڑا ہی تھا۔ جب وقت ملتا تھا میں نرسری میں ہو آتی تھی۔ تو بچّے کا زیادہ تر وقت مس ولیم کے پاس ہی گزرتا تھا۔"

"اب مس ولیم کہاں ہیں؟"

"وہ انگلینڈ واپس چلی گئی ہیں۔"

"بس اب مجھے کوئی سوال نہیں کرنا۔"

بیگم صاحبہ اپنی اُونچی ایڑی کے جوتوں کو کھٹکھٹاتی ہوئی واپس چلی گئیں۔

"اب حضور فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ کون سی ماں اس بچّے کی جائز حق دار ہے۔" وکیل یہ کہہ ہی رہا تھا کہ باہر سے کچھ ہنگامے کی آوازیں آئیں اور اگلے لمحے ایک عورت جو شکل صورت سے بھکارن لگتی تھی اور شاید پاگل بھی، میلی پھٹی ہوئی ساری پہنے عدالت میں بھیڑ کو چیرتی ہوئی آئی "ہجور ہماری ارج بھی سُن لیں۔ یہ بچّہ ہمارا ہے۔ پولس نے جبردستی ہم سے چھین لیا اور کہا کہ تو چُرا کر لائی ہے۔"

سوسائٹی کے مینرز نہیں چلتے۔ ٹھیک ٹھیک بتائیے، کیا عمر ہے ؟"

"کوئی پینتیس چھتیس کی ہوگی۔"

"اگر میں کہوں کہ آپ کی عمر پینتالیس سال کی ہے تو آپ کیا کہیں گی ؟"

"یہی کہوں گی کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں چالیس سے ایک برس بھی زیادہ نہیں ہوں۔"

"تھینک یو۔ میں بھی یہی جاننا چاہتا تھا۔۔۔ آپ کی شادی مرزا صاحب سے کس عمر میں ہوئی ؟"

"جب میں تیس برس کی تھی۔"

"اور آپ کے شوہر۔ وہ کتنے سال کے تھے ؟"

"وہ کوئی باون برس کے ہوں گے۔"

"یہ آپ کی پہلی شادی تھی ؟"

"جی۔۔۔۔نہیں" بیگم صاحبہ نے دھیمے سے کہا: "یہ میری دوسری شادی تھی۔"

"آپ کوئی بچہ بھی ساتھ لائی تھیں ؟"

"جی ہاں ایک لڑکا۔"

"کیا عمر ہے اس کی اب ؟"

"ماشا اللہ اٹھارویں برس میں ہے ؟"

"وہ کیا کرتا ہے ؟"

"اپنے ابا کا ہاتھ بٹاتا ہے اُن کے بزنس میں۔"

"تنخواہ کیا ملتی ہے ؟"

"تنخواہ کیوں ملتی ہے برابر کا پارٹنر ہے اپنے باپ کا۔"

"مگر مرزا صاحب اس کے باپ تو نہیں ہیں ؟"

"اب تو وہی ہیں۔ اور کسی باپ کو وہ جانتا ہی نہیں۔"

"آپ کے پہلے شوہر کیا کرتے تھے ؟"

"اُس سے آپ کو کیا لینا ہے ؟"

مجسٹریٹ نے بیگم صاحبہ کو تنبیہہ کی کہ وکیل صاحب کے سوالوں کے صاف صاف جواب دیں۔

"اُن کی ہوٹل کی بزنس تھی۔"

"ہوٹل کی بزنس۔ کیا نام تھا اُن کے ہوٹل کا ؟"

"اُن کے ہوٹل کا۔۔۔۔ اُن کے ہوٹل کا نام۔۔۔۔ دراصل وہ اُن کا ہوٹل نہیں تھا۔ وہ پارٹنر شپ میں چلاتے تھے۔"

"اُن کا پارٹنر کون تھا ؟"

"اُن کے پارٹنر تھے۔۔۔۔ مرزا مغل بیگ۔"

"یعنی آپ کے موجودہ شوہر ؟"

"جی ہاں۔"

"تو شاید آپ کی ملاقات مرزا صاحب سے پہلے سے ہوگی ؟"

"ہاں۔ ہوٹل میں تو آتے جاتے ملاقات ہو ہی جاتی تھی۔"

"اگر میں کہوں کہ آپ کے پہلے شوہر آپ کے موجودہ شوہر کے پارٹنر نہیں تھے۔ بلکہ ملازم تھے تو کیا یہ غلط ہوگا ؟"

بیگم صاحبہ کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ بولیں: "جی ہاں۔ آپ ایسا بھی کہہ سکتے ہیں۔ دراصل وہ ایک قسم کے مینیجر تھے۔"

"اچھی طرح سے یاد کیجیے۔۔۔۔ مینیجر تھے یا نان بائی تھے ؟"

"تو کیا ہوا ؟ مسلمانوں میں ذات پات نہیں چلتی۔ اُن کے ہاتھ میں ہنر تھا۔"

"وہ تو ظاہر ہے۔ "ننھے میاں کی نان" کی شہرت تو بمبئی تک پہنچ چکی تھی۔ جب ان کے انتقال کی خبر پڑھی تو ہم کو بھی افسوس ہوا تھا۔ یہ حادثہ کیسے ہوا ؟"

"اللہ کی مرضی۔ نان نکال رہے تھے ایک دن تندور میں جا گرے۔"

"اُس روز پہلی رپورٹ جو پولیس میں دی گئی تھی، اس میں تو لکھا ہے کہ کسی نے انھیں پیچھے سے دھکا دیا تھا۔"

بیگم صاحبہ اپنے سابق شوہر کی موت کے ذکر کو برداشت نہ کرسکیں۔ آبدیدہ ہوگئیں اور عطر حنا سے معطر ایک فرانسیسی لیس کا رومال نکال کر آنسو پونچھنے پڑے۔

"معاف کیجیے۔ بیگم صاحبہ کبھی کبھی عدالت میں بڑے تکلیف دہ سوال کرنے پڑتے ہیں۔۔۔۔۔ مگر دہلی کی عدالت میں یہ معاملہ کافی دِنوں تک کھنچا تھا۔ مرزا صاحب کو بھی عدالت میں پیش کیا گیا تھا۔"

"جی ہاں۔ مالک کی حیثیت سے گواہی دینی پڑی تھی انھیں۔" وکیل نے ذرا سخت لہجہ اختیار کیا۔ "گواہ کی حیثیت سے نہیں ملزم کی حیثیت سے۔"

اُس کی نگاہ اب نواب مرزا پر گئی جو گھبرا کر اپنی کرسی سے اُٹھ رہے تھے۔ "نواب صاحب تشریف رکھیے۔ ابھی آپ سے بھی چند سوال کرنے ہیں۔"

مرزا صاحب نے بھی اپنی جیب سے ایک سفید رومال نکالا اور اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھنے لگے۔

اب نواب مرزا مغل کو گواہوں کے کٹہرے میں پیش کیا گیا۔

"آپ کا نام ؟"

"آپ جیسے نہیں جانتے ؟"

"پھر بھی آپ کی زبان سے آپ کا نام جاننا چاہتا ہوں ؟"

"نواب مغل مرزا دہلوی۔"

"یہ مغل مرزا عجیب نام معلوم ہوتا ہے !"

"ممکن ہے آپ کو عجیب نام معلوم ہوتا ہو۔ آپ کتنے اور مرزاؤں کو جانتے ہیں؟"

"میں تو ایک ہی مرزا کو جانتا ہوں۔ مرزا اسداللہ خاں غالب۔ اُن کو تو آپ بھی جانتے ہوں گے؟"

"غالب کو کون نہیں جانتا؟"

"اس لیے کہ غالب شاعر تھے۔ کوئی حقّہ بردار نہیں تھے۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ کے جدِّ امجد کا نام کیا تھا جو بادشاہ کے رنگون جلاوطن ہونے کے بعد دہلی میں ترقی کی منزلیں طے کر رہے تھے؟"

"مرزا گُل گُل بیگ۔"

"کہ ایک گُل تو ہم سمجھے۔ گُل کے معنی گلاب کے پھول کے بھی تو ہوتے ہیں اور وہ گُل بھی ہوتا ہے جو حقّہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔"

"حُقّہ سے اس کیس کا کیا تعلق ہے؟"

"حُقّہ سے ایسا ہی تعلق ہے جیسا کہ تندور سے ہے۔ جہاں روٹیاں اور نان سینکی جاتی ہیں اور جس میں کسی وقت انسان کو پھینک دیا جائے تو منٹوں میں اُس کا بھی کباب بن جاتا ہے۔"

نواب صاحب دہلی میں بڑی اونچی سوسائٹی میں گھومتے تھے۔ عہدیداروں کے ساتھ تاش کھیلتے تھے۔ اُسی رُعب کو اس وقت استعمال کرکے انھوں نے مجسٹریٹ سے کہا: "یور آنر۔ اپنے وکیل کو سمجھائیے۔ سنبھل کے سوال جواب کرے ورنہ....۔"

"ورنہ کیا ہوگا؟" وکیل نے جلدی سے کہا "اُس کا بھی کباب بنا دیا جائے گا۔" اور پھر اُس نے مجسٹریٹ سے کہا: "یور آنر۔ میں جو الفاظ استعمال کر رہا ہوں یہ دہلی کی پہلی عدالت کی رپورٹ میں موجود ہیں۔ اگرچہ سیشن کورٹ نے مرزا صاحب کو BENEFIT OF DOUBT دیتے ہوئے رہا کر دیا۔ صرف BENEFIT OF DOUBT مگر DOUBT تو رہا اور رہے گا۔" یہ سب سُن کر نواب صاحب دھیمے پڑے۔

وکیل نے اب ترپ کا اِکّہ نکالا۔ "آپ کے نان بائی کا حادثہ کس سال میں ہوا تھا؟"

"سنہ چھہتر میں۔"

"شاید اپریل کا مہینہ تھا؟"

"شاید" نواب صاحب نے اقرار کیا۔

"اور پہلی مئی کو آپ کی شادی خانہ آبادی مرحوم نان بائی کی خوب صورت بیوہ سے ہوگئی اور صرف پانچ مہینے بعد اُن کی گود میں ایک بچّہ کھیلنے لگا۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ وہ پہلے بھی شادی شدہ تھی۔"

"مگر دہلی کی عدالت میں یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ قتل، سُوری موت سے چھ مہینے پہلے سے شہناز بیگم کے تعلّقات اپنے شوہر کے ساتھ منقطع ہو چکے تھے۔"

نواب صاحب کو پسینہ آ رہا تھا۔ وہ اپنی جیب سے رومال نکال کر پیشانی پونچھنے لگے۔

"معاف کیجیے نواب صاحب کہ مجھے بعض ذاتی سوال بھی پوچھنے پڑے۔ اب آپ تشریف رکھ سکتے ہیں..... اب میں بیگم صاحبہ کو تکلیف دوں گا۔"

بیگم صاحبہ پھر گواہوں کے کٹہرے میں پیش ہوئیں۔

"بیگم صاحبہ۔ آپ کا کہنا ہے کہ یہ بچّہ آپ کا کھویا ہوا بیٹا ہے۔"

"جی ہاں..... مگر....."

"کچھ شک ہے آپ کو؟ آپ کا بچّہ کیسے اور کب کھویا گیا تھا؟"

"کوئی آٹھ مہینے کا ہوگا اس وقت وہ۔ یہ نومبر ۷۶ء کی بات ہے۔ اس کی گورنیس مِس ولیم حسبِ معمول اس کو پرام میں بٹھا کر پارک میں لے گئی تھی۔ وہاں پارک کی ایک بنچ پر وہ بیٹھ گئیں اور پرام اپنے قریب کر لیا۔ وہاں اُن کی آنکھ لگ گئی۔ جب آنکھ کھلی تو پرام خالی تھا۔ بچّہ اس میں نہیں تھا..... جب مجھے پتا چلا تو میں نے پولس کو فون کیا۔ نواب صاحب کو کلب میں فون کیا۔ وہ پولس افسروں کو ساتھ لے کر آئے۔ انھوں نے مجھ سے اور نواب صاحب سے پوچھا کہ آپ کو کس پر شُبہ ہے؟ ہم نے کہا کہ بچّہ کِڈنیپ تو کیا جا سکتا ہے مگر یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ خدا نے کھیلنے کے لیے ایک کھلونا دیا تھا، شاید اب واپس لے لیا۔"

"کتنے عرصے کھیلی تھیں اُس کھلونے سے آپ؟"

"کوئی وقت مقرّر تھوڑا ہی تھا۔ جب وقت ملتا تھا میں نرسری میں ہو آتی تھی۔ تو بچّے کا زیادہ تر وقت مِس ولیم کے پاس ہی گزرتا تھا۔"

"اب مِس ولیم کہاں ہیں؟"

"وہ انگلینڈ واپس چلی گئی ہیں۔"

"بس اب مجھے کوئی سوال نہیں کرنا۔"

بیگم صاحبہ اپنی اُونچی ایڑی کے جوتوں کو کھٹکھٹاتی ہوئی واپس چلی گئیں۔

"اب حضور فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ کون سی ماں اس بچّے کی جائز حق دار ہے۔" وکیل یہ کہہ ہی رہا تھا کہ باہر سے کچھ ہنگامے کی آوازیں آئیں اور اگلے لمحے ایک عورت جو شکل صورت سے بھکارن لگتی تھی اور شاید پاگل بھی، میلی پھٹی ہوئی ساری پہنے عدالت میں بھیڑ کو چیرتی ہوئی آئی "حجور ہماری ارج بھی سُن لیں۔ یہ بچّہ ہمارا ہے۔ پولس نے جبردستی ہم سے چھین لیا اور کہا کہ تو چُرا کر لائی ہے۔"

"تم کچھ بیان دینا چاہتی ہو تو گواہوں کے
میں آؤ اور کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔" وکیل نے
کہا اور پھر مجسٹریٹ سے "جناب والا! اب
دو مائیں تھیں۔ اب تین ہوگئی ہیں۔ اب آپ کو
کرنا ہے۔ میں اس سے بھی سوال کرتا ہوں۔"

"اپنا نام بتاؤ۔"

"بھکارن حجور۔ بچپن سے یہی نام سُنا ہے۔"

"تمھارا دھرم ذات کیا ہے؟"

"حجور دھرم میرا روٹی کا ٹکڑا ہے اور جات
کارن ہوں۔"

"بچہ تمھارے پاس کیسے آیا؟"

"بچہ جیسے آتا ہے حجور ویسے ہی آیا۔ میرے
سے نکلا۔"

"کیا تمھاری شادی ہوئی ہے؟"

"حجور بھکارنوں کے شادی بیاہ کہاں ہوتے
؟..... مگر ایک بڑا خوب صورت سا صاحب
رات میرے پاس آیا نشے میں دُھت تھا۔ کہنے لگا
بھکارن تجھے کیا چاہیے۔ میں نے کہا، ایک بچہ۔ کہنے
ایک بچہ۔ روپیا پیسا کچھ نہیں چاہیے۔ ساری بھی
ہں چاہیے؟..... میں نے کہا صاحب، نہیں مجھے
بس ایک بچہ چاہیے۔ کیوں کہ بچے کے بنا مجھے لگتا ہے
میں ادھوری ہوں۔"

"تم نے اُس صاحب سے کتنا روپیا لیا؟"

"روپیا کیوں لیتی۔ نو مہینے بعد۔ میں ادھوری
پوری ہوگئی۔ سرکار عورت بچہ جننے کے بعد ہی
ری ہوتی ہے..... ورنہ تو اُس کا جیون ہی ادھورا
دتا ہے۔"

"وہ صاحب تمھیں پھر ملا؟"

"نہیں صاحب۔ میں نے اُس سے ملنے کی
شش بھی نہیں کی۔ وہ تو مجھے پہچانے گا بھی نہیں۔
گر میں پھر بھی اس کی آبھاری ہوں کیوں کہ اس کے
کارن میں پوری ہوگئی۔ ماں بن گئی۔"

"کہاں ہے تمھارا بچہ؟" وکیل نے ڈرامائی انداز میں سوال کیا۔

"وہ ہے۔" بھکارن چلائی اُدھر اشارہ کرتے ہوئے جہاں نئے کپڑے پہنے بچہ کورٹ میں بیٹھا ہوا سب باتیں سُن رہا تھا۔

جرح ختم ہوگئی تھی۔

وکیل نے مقدمہ کا خلاصہ سناتے ہوئے کہا:

"یور آنر یہ مقدمہ کنگ سولومن کے انصاف کی یاد دلاتا ہے۔ وہاں تو دو مائیں تھیں جو دونوں ایک بچے کی ماں بننے کا دعوا کر رہی تھیں۔ یہاں تین مائیں ہیں جن میں سے ہر ایک کا کہنا ہے کہ بچہ اُس کا ہے۔ ایک بمبئی کے بڑے انجینئر کی بیوی ہے۔ ایک دہلی کے رئیس اعظم کی بیگم ہے۔ ایک بھکارن ہے۔ کنگ سولومن نے تو انصاف یہ کیا تھا کہ دونوں ماؤں سے کہا تھا کہ بچے کو تلوار سے آدھا کر کے دونوں کو آدھا آدھا دے دیا جائے گا۔ جس نے اس ظالمانہ انصاف سے بچے کی جان کی خاطر انکار کر دیا وہی اُس کی اصلی ماں قرار دی گئی۔ لیکن ہم اس بچے کے تین ٹکڑے کرنے کو بھی نہیں کہہ سکتے اس لیے کوئی اور فیصلہ کرنا پڑے گا جو اب میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔"

مجسٹریٹ نے کہا: "ہم سب حیوان کی اولاد ہیں۔ جتنا چھوٹا بچہ ہوگا اتنا ہی وہ جانوروں کے قریب ہوگا۔ بچھڑا ہو یا ہرن کا بچہ وہ اپنی ماں کو سونگھ سکتا ہے۔ اس لیے اس مقدمہ کا فیصلہ بھی اس بچے کی ناک کرے گی۔" پھر بچے سے مخاطب ہو کر کہا: "بچے، یہ تین عورتیں کہہ رہی ہیں کہ وہ تمھاری ماں ہیں۔ تم اُن کے پاس جاؤ۔ ان میں سے ہر اک کو سونگھو اور جو تمھاری ماں ہے اس کو پہچان لو۔"

بچہ پہلے مسز جے سوریہ کے پاس گیا۔ "مائی چائلڈ" انھوں نے کہا اور اُسے اپنے گلے لگا لیا۔ اُن کی چھاتی سے اور اُن کی ساری سے بچے کو ایک تیز فرانسیسی سینٹ کی خوشبو آئی۔

"نہیں۔" اُس نے کہا۔

پھر وہ بیگم مغل مرزا کے پاس گیا۔

انھوں نے اُسے اپنی باہوں میں سمیٹ لیا۔ ان کی پوشاک سے اور ان کے سارے بدن سے عطر حنا کی خوشبو آئی۔ یہ خوشبو بھی بچے کے لیے غیر مانوس تھی۔ وہ اُن سے بھی الگ ہوگیا۔

"نہیں۔" اُس نے پھر کہا۔

پھر وہ بھکارن کی طرف گیا۔ بھکارن نے اس ڈر کے مارے اُسے گلے نہیں لگایا کہ اُس کے اندر سے میلے کپڑوں اور پسینے کے بھپکے آ رہے تھے لیکن بچے کی ناک کے نتھنے پھڑپھڑائے۔ اس لیے کہ بھکارن کے اندر سے پسینے کی بدبو کے علاوہ ماں کی ممتا کی سوندھی سوندھی خوشبو بھی آ رہی تھی۔

"ماں۔" اُس نے کہا اور دوڑ کر بھکارن کے گلے لگ گیا۔

بھکارن کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

سرکاری وکیل کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔

مجسٹریٹ نے عینک کو رومال سے صاف کرنے کے بہانے اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھ لیے کیونکہ انصاف کی دیوی تو اندھی ہوتی ہے، اُس کی آنکھ میں نہ نظر ہوتی ہے، نہ آنسو۔

غیر طلبیدہ مضامین نظم و نثر کی واپسی کے لیے مناسب سائز کا ٹکٹ لگا لفافہ ساتھ آنا ضروری ہے۔

—— ایڈیٹر

ایک لڑکی سات دیوانے

لڑکی جوان ہوگئی تھی۔

لوگ کہتے تھے لڑکی خوب صورت ہے، چنچل ہے، طرح دار ہے، دُنیا اس کی دیوانی ہے، ہر کوئی اس ن خاطر جان دینے کو تیار ہے۔

ساتھ میں لڑکی گُنی بھی تھی۔ پڑھی لکھی تھی۔ دُنیا بھر کی زبانیں جانتی تھی ملٹن اور شیلی، ٹیگور اور قاضی نذرالاسلام، سبرامنیم بھارتی اور نرالا، جوش اور فیض کی نظمیں اُسے زبانی یاد تھیں لنکن اور گیری بالڈی، زولا اور مارکس، اینجلز اور لینن، گاندھی اور جواہر لال نہرو کی کتابیں پڑھے ہوئے تھی۔ اُس کی زبان میں جادو تھا۔ اُس کی ایک آواز پر لاکھوں کروڑوں مرنے مارنے کو تیار ہو جاتے تھے۔

جب اُس کی پچیسویں سال گرہ قریب آئی تو سب نے کہا کہ اب تو لڑکی کو گھر بسانا چاہیے۔ بچپن کا لاابالی پن کب تک چلے گا۔ دُنیا کے لوگ اُنگلیاں اُٹھا رہے ہیں۔ جتنے مُنہ اتنی باتیں۔ پچیس برس کی لڑکی کو یوں ہی واہی تباہی نہیں گھومنا چاہیے۔ آج اِس کے ساتھ کل اُس کے ساتھ۔ اب تو اسے ایک کو پسند کرکے اسے شریکِ زندگی بنا لینا چاہیے۔

ہر سو اعلان ہوگیا کہ لڑکی اپنا شریکِ زندگی چُنے گی۔ جتنے اُس کے چاہنے والے ہیں سب سوئمبر کے لیے اکٹھے ہو جائیں۔ جس خوش قسمت کو وہ اُس قابل سمجھے گی، اس کے گلے میں جے مالا ڈالے گی۔

یوں تو کون لڑکی کا دِلدادہ نہیں تھا، مگر اُن سب میں سات ایسے تھے جو اُس پر دل و جان سے فدا تھے اور اُس کو اپنانا چاہتے تھے، اپنی بنانا چاہتے تھے۔ ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ لڑکی اس کو پہلے سے ہی پسند کر چکی ہے۔ صرف دُنیا کے سامنے اقرار کرنے کی ضرورت ہے۔

پہلے تو ایک صاحب سامنے آئے۔ "مجھے دھرم دیو کہتے ہیں۔" انھوں نے اپنا تعارف کرایا۔ لمبے چوڑے۔ اونچا ماتھا۔ سر پر لمبے لمبے بال۔ گیروے رنگ کا سلک کا لمبا کُرتا اور دھوتی پہنے ہوئے۔ پیچھے پیچھے چیلوں اور چیلیوں کا ایک گروہ کیرتن کرتا، کھڑتالیں بجاتا ہوا۔ "دھرم دیو کی جے" کے نعرے لگاتا ہوا۔

"بالکا" انھوں نے لڑکی کو مخاطب کرکے کہا۔ "اگر تم مایا موہ کے جال سے نکلنا چاہتی ہو تو مجھے اپنا لو، دھرم دیو بلکہ دھرم کی شرن میں آجاؤ۔ اور لوگ جو کچھ تمھیں دے سکتے ہیں۔ پریم، دھن، دولت، عیش و عشرت۔ وہ سب میں بھی تمھیں دے سکتا ہوں۔ مگر ساتھ میں تمھیں مکتی بھی پراپت ہوگی۔ جو تمھیں اور کوئی نہیں دے سکتا۔ کیا جواب ہے تمھارا، بالکا؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "مہاراج ــــ من تو چاہتا ہے جیون آپ کے چرنوں میں ہی بتا دوں، مگر اوروں سے بھی مل لوں، اُن کی بھی سُن لوں پھر جواب دوں گی۔"

دھرم دیو نے ہاتھ اُٹھا کر لڑکی کو آشیرواد دیا اور کہا "کوئی چنتا نہ کرو، بالکا ــــ تم بے شک اوروں سے ملو، اُن کو بھی پرکھو، مگر تمھارے بھاگیہ میں میرا جیون ساتھی بننا ہی لکھا ہے۔"

لڑکی نے نظریں جھکا کر کہا۔ "جو بھاگیہ میں لکھا ہے وہ تو ہوگا ہی مہاراج۔"

اس کے بعد مہاراجا مان سنگھ شان سنگھ کی سواری آئی۔ زرق برق شاہانہ لباس۔ سفید گھوڑے پر سوار، کمر میں تلوار بندھی ہوئی راجپوتی شان کی بڑی بڑی مونچھیں۔ اُن کے جلوس میں کتنے ہی غلام، باندیاں لونڈیاں، گانے والیاں، ناچنے والیاں، طبلہ بجانے والے، سارنگی بجانے والے۔

گھوڑا روک کر انھوں نے لڑکی سے کہا۔ "اے سندری۔ آؤ اور میرے راج محل کی شوبھا بڑھاؤ میں تمھیں مہارانی بنا کر رکھوں گا۔"

لڑکی نے جواب میں کہا۔ "مہاراج کی جے ہو لگتا ہے آپ نے آنے میں دیر کر دی میں نے تو سنا کہ آپ کی پریوی پرسز بند کر دی گئی ہیں، آپ کے خاص حقوق ختم کر دیے گئے ہیں۔ پھر آپ کی پہلے ہی بہت سی بیویاں ہیں۔ کیا آپ ایک اور بیوی کا خرچہ برداشت کر سکیں گے؟"

مہاراجا نے مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا۔ "سند[ری] تم چنتا نہ کرو۔ پریوی پرسز کے بند ہو جانے کے بعد بھی میرے پاس اتنا کچھ ہے کہ سینکڑوں برس تک صرف میں اور تم اور میری سب رانیاں بلکہ سب رانیوں سے میری اولاد اتنے ہی شان اور اتنے ہی آ[رام] سے رہ سکتی ہے جس آرام اور جس شان سے میں ر[ہتا] ہوں۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ ہمارا دور ابھی خ[تم] نہیں ہوا۔ پہلے میرے پاس کروڑوں ایکڑ بنجر زمین تھ[ی] رعایا کی دیکھ بھال کرنے کا دردِ سر تھا۔ اب میرے پاس ہزاروں ایکڑ کا فارم ہے۔ جہاں ٹریکٹر چلتے ہ[یں] شراب بنانے کی فیکٹری میں میرے حصّے ہیں۔ موٹروا

خواجہ احمد عبّاس

رخانے میں میری ساجھے داری ہے۔ میری آمدنی
ے کہیں زیادہ ہے۔ تمھیں آج بھی ہیرے جواہرات
دسکتا ہوں۔"

"مہاراج سے یہی اُمّید ہے۔" لڑکی نے کہا۔
یہاں اتنا انتظار کیا ہے تھوڑا اور انتظار کیجیے۔
یقین دلاتی ہوں کہ فیصلہ ہونے سے پہلے جے مالا
بول باسی نہ ہونے پائیں گے۔"

اس کے بعد ایک بڑی شاندار، لمبی چوڑی
بالا موٹر آکر رُکی۔ اس پر سیٹھ کروڑی مل پکوڑی مل
جمان تھے۔ موٹر پھولوں کی جھالروں سے سجی ہوئی تھی
وں کہ سیٹھ صاحب تو لڑکی کے ساتھ سات
پھیرے کروانے کا فیصلہ کرکے ہی گھر سے چلے تھے۔

موٹر کا دروازہ کھلا اور سیٹھ صاحب سہرا
باندھے اپنی توند سنبھالتے ہوئے نیچے اُترے۔

"لڑکی،" انھوں نے دیکھتے ہی کہا۔ "تو تو میرے
ساتھ آجا۔ پنڈت پروہت سب کا پربندھ کروا رکھا
ہے میں نے۔ ایک بار میری ہوگئی تو تیری ایسی حفاظت
کروں گا جیسی اپنی تجوریوں کی کرتا ہوں۔ بلکہ تجوری
ہی میں بند کرکے رکھ دوں گا۔ کوئی سورا تیری طرف
آنکھ اُٹھاکر بھی نہیں دیکھ سکے گا۔ ہاں!"

"ایسی بھی کیا جلدی ہے سیٹھ صاحب،" لڑکی
نے بڑے انداز سے مسکراکر کہا۔ "آپ کے تو مجھ پر پہلے ہی
بڑے احسان ہیں۔"

"ہیں تو،" سیٹھ جی بولے۔ "میں نہ ہوتا تو تجھے
کون جانتا۔ جنم سے لے کر آج تک تیرا خرچہ کس نے
اٹھایا ہے؟ میں نے۔ تیرے سولہ سنگار کس کے پیسے
سے ہوئے؟ میرے۔ تیرے کپڑے لتّے۔ یہ سارا تیرا تام
جھام کس کے پیسے سے آیا؟ میرے۔ اور بول تجھے کیا
چاہیے۔ موٹروں کا کارخانہ چاہیے؟ لے تیرے نام کردیا۔
ساڑھیاں چاہییں؟ پوری ریشمی ساڑھیوں کی دکان
ہی گھر بھجوادوں گا۔ تین کوٹھیاں ہوں گی تیرے واسطے۔
ایک دِلّی میں، ایک بمبئی میں، ایک مسوری میں۔ اور
تین موٹریں....."

لڑکی نے کہا۔ "یہ سب تو مہاراجا مان سنگھ
شان سنگھ بھی دینے کو کہہ رہے ہیں!"

"ارے وہ راجا کیا کھا کے میرا مقابلہ کرے
گا۔ میرے ہی کارخانوں میں تو چھوٹا موٹا حصّہ ہے
اُس کا۔ اب اس کی شان دیکھنے ہی دیکھنے کی رہ گئی ہے۔
اصل تو ہمارے پاس ہے۔ اصل مال اور اصلی طاقت
بینک کارخانے، انگریزی ہندی کے بڑے بڑے اخبار
اور چھاپے خانے، افسر، منسٹر سب میری جیب میں ہیں۔
حکم دوں تو ساری دُنیا میں تیری سُندرتا کے چرچے
ہوں گے اور اگر اُلٹا حکم دے دوں تو کوئی تیرا نام بھی
نہ جانے گا۔ یہ ہے ہماری شکتی۔ یہ کہہ دے اپنے سب
چاہنے والوں سے۔ جی چاہے تو طاقت آزما کے
دیکھ لیں!"

"سیٹھ جی،" لڑکی نے اٹھلا کے کہا۔ "بھلا کس
کی ہمّت ہے کہ آپ کا مقابلہ کرسکے؟ بس ذرا سی دیر
کی بات ہے۔ پھر آپ کو کیا فکر ہے۔ آپ کے سر تو سہرا
پہلے ہی بندھا ہوا ہے۔"

کروڑی مل پکوڑی مل اپنی موٹر میں جا بیٹھے۔
دروازہ بند کرلیا۔ موٹر روانہ ہوگئی اور پھولوں کی جھالروں
کے پردے میں چھپ کر انھوں نے اپنا بیگ کھولا اور
ہزار ہزار روپے کے نوٹوں کے پلندوں کو گننا شروع
کردیا۔

اب پگڑی باندھے ایک ہٹّا کٹّا نوجوان آیا جو
ایک ٹریکٹر پر سوار تھا۔ لڑکی کے سامنے آتے ہی
دس دس کے نوٹوں کا بنڈل نکالا اور لڑکی کے سر پر
سے وار کر اِدھر اُدھر پھینکنے لگا۔ اڑوس پڑوس کے
چھوکرے، لوفر، لفنگے سب دوڑ دوڑ کر نوٹ
بٹورنے لگے۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" لڑکی نے بظاہر کسی
قدر بگڑ کر (مگر دل ہی دل میں خوش ہوکر) کہا۔
"لگتا ہے تمھیں روپے کی قدر نہیں ہے؟"

نوجوان جس کا نام "دھرتی پتی کرلاک" تھا،
ایک بے باک اور نودولیتے انداز میں بولا "میری جان
قدر کیوں نہیں ہے؟ روپے کی قدر کرتا ہوں تب ہی
تو تم پر سے نچھاور کر رہا ہوں۔ تمھاری قدر و قیمت
کوئی میرے دل سے پوچھے۔ ہائے!" اور یہ کہہ کر اس
نے نہایت بے شرمی سے ایک آنکھ بند کرکے منہ میں
انگلی ڈال کر لوفروں کی طرح سیٹی بجائی۔

لڑکی نے بھی بے باکی سے جواب دیا۔ "تم کیا۔
یہاں جو ہے وہ میرا دیوانہ ہے! دھرم دیو ہوں یا راجا
مان سنگھ شان سنگھ ہوں یا سیٹھ کروڑی مل پکوڑی مل
ہوں۔ ایک سے ایک بڑھ کر قیمت لگا رہے ہیں میری!
تم بھی بولی لگاؤ۔"

"وہ تو میں لگاؤں گا ہی، میری جان۔"
دھرتی پتی کولاک نے کہا۔ "یہ سب تو اگلے وقتوں کے
لوگ ہیں، بڈّھے کھوسٹ۔ میں ہوں ایک تمھاری عمر کا۔
جب تم پیدا ہوئیں اُدھر میں پیدا ہوا۔ تمھارے ساتھ
ہی کھیل کود کر میں جوان ہوا۔ پُرانے جاگیرداروں کی جاگیریں
تم نے مجھے دیں۔ زمینداروں کی زمینداری ختم کرکے تم
نے مجھے زمینیں الاٹ کیں۔ میں تو جو کچھ بھی ہوں تمھارا
ہی بنایا ہوا ہوں۔ تم نہ ہوتیں تو مجھے کون پوچھتا اور
میں نہ ہوتا تو تمھارا اس دُنیا میں کون ہوتا۔ بولو۔ تم
میری ہو اور میں تمھارا، میری جان! ایک دفعہ بس
ہاں کہہ دو پھر دیکھو۔ کس دھوم دھام سے بیاہ رچاتا
ہوں۔ ہماری شادی کی دعوت میں تو کم سے کم ایک لاکھ
آدمی کھانا کھائیں گے۔"

"ایک لاکھ؟" لڑکی نے تعجّب سے کہا۔ "اتنے
آدمیوں کے لیے اتنا چاول، اتنا گھی، اتنی شکر کہاں

سے آئے گی؟"

"وہ سب میرے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ تمھاری سلامتی چاہیے۔ میرے فارم میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ اپنی بہن کی شادی میں میں نے تین ہزار مہمان بلائے تھے۔ وہ بھی معمولی مہمان نہیں ایک سے ایک بڑا افسر اور منسٹر تھا! جس دن تمھیں بیاہ کے لے جاؤں گا اُس دن تو میں دودھ، دہی، گھی اور شراب کے دریا بہادوں گا، دریا!"

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔" لڑکی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "مگر تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑے گا۔"

"جیسا تمھارا حکم" دھرتی پتی کولاک نے ٹریکٹر کو اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا "میرا تمھارا تو جنم جنمان کا رشتہ ہے!"

اب ایک اور اُمّیدوار آئے اور بڑی شان سے آئے۔ آگے آگے لال پٹیاں باندھے ہوئے چپراسیوں کی ہراول فوج، پیچھے ایک لمبا چوڑا تخت جسے ایک سو ہیڈ کلرک اپنے سروں پر اُٹھائے لا رہے تھے۔ تخت پر قالین، قالین پر ایک بہت بڑی میز جس پر پانچ ٹیلی فون رکھے ہوئے تھے اور نوٹوں کی گڈیوں پر سونے چاندی کے پیپر ویٹ رکھے ہوئے تھے کہ وہ ہوا میں اُڑ نہ جائیں۔ کرسی پر مسٹر "دفتر شاہی افسر" گلا بند کوٹ اور پتلون پہنے اکڑے ہوئے بیٹھے تھے۔

کلرکوں نے تخت لڑکی کے عین سامنے لاکر رکھ دیا کیوں کہ مسٹر دفتر شاہی افسر کی گردن اکڑی ہوئی تھی۔ وہ لڑکی کو صرف اُس وقت دیکھ سکتے تھے جب وہ عین اُن کی نظروں کے سامنے ہو۔

مسٹر دفتر شاہی افسر کے ایک سب اسسٹنٹ ڈپٹی سکریٹری نے لڑکی سے آکر کہا "آپ کو صاحب سے بات کرنی ہے؟"

لڑکی نے بڑی شانِ بے نیازی سے کہا "اگر وہ بات کرنا چاہیں تو بات کر سکتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے" سب اسسٹنٹ ڈپٹی سکریٹری نے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا "لائیے پانچ ہزار روپے دلوائیے۔ صاحب کا وقت بڑا قیمتی ہے پانچ منٹ کی ملاقات کروائے دیتا ہوں۔"

لڑکی نے غصّے سے کہا "صاحب جائے تمھارا چولھے میں میری جوتی اس سے بات کرنا چاہتی ہے!"

"سیکشن کلرک!" سب اسسٹنٹ ڈپٹی سکریٹری نے آواز دی اور کہا "جاؤ صاحب سے کہہ دو کہ لڑکی اس قابل نہیں ہے کہ اُسے کوئی پرمٹ یا لائسنس دیا جائے۔ انٹرویو بھی دیا تو وقت ضائع ہوگا۔"

"ایڈیٹ" دفتر شاہی افسر چلّایا "بات کرنے کی تمیز نہیں۔ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں نکل جاؤ یہاں سے۔ ہم اس لیڈی سے اکیلے میں بات کرتے ہیں۔"

جب وہ دونوں اکیلے رہ گئے تو دفتر شاہی افسر نے اپنی ٹیڑھی گردن کا پینچ ڈھیلا کرتے ہوئے کہا۔ "ڈارلنگ"!

لڑکی نے بڑے طنز بھرے لہجے میں جواب دیا۔ "کیوں خیریت تو ہے آج تو بڑے پیار کا اظہار کر رہے ہو۔ انگریزوں کے زمانے میں تو تم مجھے گولی مار دینا چاہتے تھے!"

"پُرانی باتوں کو بھول جاؤ ڈارلنگ۔ آج کی بات کرو میں پچیس برس سے تمھاری سیوا کر رہا ہوں۔"

"میری سیوا؟" لڑکی نے پوچھا "یا اپنی سیوا؟"

"وہ ایک ہی بات ہے ڈارلنگ۔ میں اور تم الگ الگ تھوڑا ہی ہیں۔ تم میرے لیے بہت لکی ثابت ہوئی ہو۔ پہلے میری اُوپر کی آمدنی پانچ چھ سو روپے تھی اب پانچ ہزار روپے مہینہ ہے۔ کبھی کبھی تو بھگوان پرمٹ کا چھپّر پھاڑتا ہے تو اس میں سے لاکھوں روپے مل جاتے ہیں۔ یہ سب تمھاری ہی برکت ہے، تمھاری ہی دین ہے!"

"پھر اب کیا چاہتے ہو؟" لڑکی نے پوچھا "تم تو میرے بغیر بھی مزے کر رہے ہو!"

"نہیں ڈارلنگ۔ تمھارے بغیر نہیں تمھاری وجہ سے مزے کر رہا ہوں۔ تم ہمیشہ کے لیے میری ہو جاؤ گی تو ہم دونوں عیش کریں گے۔"

"اچھا!" لڑکی نے بے دلی سے کہا "تو کچھ دیر اور انتظار کرو۔"

"تمھاری خاطر یہ بھی کر لوں گا، ڈارلنگ۔"

دفتر شاہی افسر صاحب نے اپنے کلرکوں کو واپس بلاتے ہوئے کہا "ورنہ میں تو اور سب کو انتظار کراتا ہوں۔ میں کسی کا انتظار نہیں کرتا!"

اب ایک نئے ڈھنگ کی برات آئی۔

آگے آگے بینڈ۔ آدھا بینڈ انگریزی باجے بجا رہا تھا۔ آدھا ہندوستانی ایک طرف وائلن۔ دوسری طرف سارنگیاں۔ ایک طرف طبلے دوسری طرف بونگوا اور کیٹل ڈرم۔

دولھا ننگے پاؤں مگر پتلون پہنے ہوئے پتلون کے اُوپر جوگیا رنگ کا سلک کا کرتا۔ سر پر ہیٹ۔ ایک پاؤں کار میں دوسرا چھکڑے میں۔

برات لڑکی کے سامنے آکر رُک گئی — دولھا نے اپنا تعارف کرایا — "مجھے نیتا خاں بھارت سیوک انڈیا والا کہتے ہیں۔ ہم آپ کے پُرانے چاہنے والوں میں ہیں۔ سوچا آج سات پھیرے بھی ہو جائیں۔ نکاح بھی پڑھوالیں اور رجسٹرار کے دستخط بھی ہو جائیں۔"

"یعنی ایک چھوڑ تین تین ڈھنگ کی شادیاں"

لڑکی نے حیرت سے کہا۔

"جی ہاں۔ انڈیا یعنی بھارت یعنی ہندوستان

کی مکمل کالونی میں ایسا ہی ہونا چاہیے۔"

"یہ آپ کو کیسے خیال ہوا کہ میں آپ سے شادی کروں گی؟" لڑکی نے پوچھا۔

"شادی تو ایک طرح سے ہماری آپ کی ہوچکی ہے۔" نیتا خاں بھارت سیوک انڈیا والا نے کہا۔ کیا ہماری قربانیوں کو آپ نے بھلا دیا ہے؟ ہمارے خون سے ہی آپ کی مانگ میں سیندور بھر اگیا تھا، آپ کے ہاتھ پاؤں میں سہاگ کی مہندی لگی تھی!"

"اُس کا بدلہ بھی میں نے چکا دیا تھا،" لڑکی نے کہا۔ "برسوں میں نے آپ کی عنایات کے بدلے میں آپ کی سیوا کی ہے۔ کیا آپ ہمیشہ کی غلامی کرانا چاہتے ہیں؟"

"آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں؟" نیتا خاں بھارت سیوک انڈیا والا نے کہا۔ "غلامی نہیں یہ تو بھارتیہ استری کا دھرم ہے کہ اپنے پتی کی سیوا کرے۔ پھر ہمارا آپ کا سمبندھ تو پُرانا ہے۔ ہم نے ہی آپ کو یہ رنگ روپ، یہ نکھار، یہ انداز دیا۔ بدلے میں کیا آپ کا فرض نہیں ہے کہ آپ ہماری اور صرف ـــــ ہماری ہو کر رہیں؟"

لڑکی نے بظاہر لاجواب ہو کر کہا۔ "تب تو آپ کو بھی کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ مجھے فیصلہ کرنے میں تھوڑا وقت لگے گا۔"

اس کے بعد یکایک ایک بہت بڑا دھماکہ ہوا۔ کئی بم ایک ساتھ پھٹے دھواں ہٹا تو دیکھا کہ ایک نوجوان موٹر سائیکل پر سوار چلا آرہا ہے۔

"لڑکی!" اُس نے موٹر سائیکل روکتے ہوئے ڈانٹ کر پوچھا "کیا تم ہی وہ لڑکی ہو؟"

"جی ہاں" لڑکی نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"ویری گڈ! میرا نام ہے کرانتی کاری پُورکر۔ چنگ۔ پانگ۔ ناؤ۔ ناؤ۔ پاؤ۔ پاؤ۔"

"جی؟" لڑکی نے تعجب کا اظہار کیا۔

"اس کا مطلب ہے لال سلام۔ کیا تم چنگ پانگ نہیں سمجھتیں؟"

"جی نہیں۔" لڑکی نے اقرار جرم کیا۔

"کوئی بات نہیں۔ لال کتاب تمھیں سب پڑھا دے گی، سب سمجھا دے گی۔ تو تم مجھ سے شادی کے لیے تیار ہو؟" کرانتی کاری پُورکر نے سوال کیا۔

"مگر" لڑکی نے کہا۔ "میں تو سمجھتی تھی آپ شادی کے خلاف ہیں۔"

"بالکل غلط۔ وہ امریکی بورژوا اور روسی REVISIONIST ہیں جو شادی کے خلاف ہیں" اور پھر جیب سے لال کتاب نکال کر اس کا ایک ورق پلٹتے ہوئے بولا۔ "کتاب کہتی ہے شادی کرو۔ بہت سے بچے پیدا کرو تاکہ انقلاب کے سپاہیوں کی تعداد بڑھے۔ تم فیملی پلاننگ جیسے بورژوا ڈھکوسلوں میں تو وشواس نہیں رکھتیں؟"

لڑکی نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "مگر ملک کی آبادی تو خطرناک حد تک بڑھتی جا رہی ہے۔"

"یہ سب بورژوا لوگوں اور سامراجی ایجنٹوں کا پروپیگنڈا ہے تاکہ کرانتی کاریوں اور انقلاب کے سپاہیوں کی تعداد نہ بڑھے۔"

"شادی کے بعد کیا ہوگا؟" لڑکی نے پوچھا۔

کرانتی کاری پُورکر نے کہا۔ "سُرخ سویرا آئے گا۔ مشرق کی کوکھ سے لال سورج نکلے گا۔ مغرب ـــــ میں اندھیرا چھا جائے گا۔ تمھاری گود میں سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں بچے کھیلیں گے۔"

"مگر ان سب کو ہم کھلائیں گے کیسے؟" لڑکی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"نیتا سب کا پالن ہار ہے۔"

"تب تو تھوڑی دیر انتظار کرو میرے لال ساتھی" لڑکی نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے مُسکرا کر کہا۔ اور کرانتی کاری پُورکر بولا۔ "میں انتظار نہیں کر سکتا۔ مگر تمھاری خاطر یہ بھی سہی" اُس نے کہا اور ایک ہینڈ گرینیڈ کے دھماکے کے ساتھ اُس کے دھوئیں میں گم ہو گیا۔

لڑکی ابھی فیصلہ نہ کر پائی تھی کہ ان امیدواروں میں سے کسے اپنائے کہ ایک طرف سے بھاگتا ہوا ایک نوجوان آیا۔ میلے کھدر کا کُرتا پاجامہ پیوند لگا چپل جو دوڑنے میں بالکل ٹوٹ گیا تھا۔ دو تین دن کی داڑھی بڑھی ہوئی۔ اُس کے پیچھے پیچھے ایک پوری فوج دوڑتی ہوئی۔ اُن میں دھرم دیو، راجا مان سنگھ شان سنگھ، سیٹھ کروڑی مل پکوڑی مل، دھرتی پتی کولاک ـــــ، مسٹر دفتر شاہی افسر، کرانتی کاری پُورکر اور نیتا خاں بھارت سیوک انڈیا والا اور اُن کے حالی موالی سب تھے اور سب چلّا رہے تھے۔

"مارو ـــــ مارو۔"

"پکڑو ساتھیو، بچنے نہ پائے۔"

"چور ہے۔"

"یہ ڈاکو ہے۔"

"یہ گُنڈا ہے۔"

"یہ موالی ہے۔"

"یہ چار سو بیس ہے۔"

"یہ ہندو ہے۔"

"یہ مسلمان ہے۔"

"یہ کرسٹان ہے۔"

"یہ انقلابی ہے۔"

"یہ کرانتی کاری ہے۔"

"یہ کرانتی کاری ورودھی ہے۔ انقلاب دشمن ہے۔"

دوڑتا دوڑتا، ہانپتا کانپتا نوجوان لڑکی کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

"لڑکی اب تم ہی مجھ کو بچا سکتی ہو۔"
لڑکی نے پوچھا "تم کون ہو؟"
نوجوان نے کہا "میں نہ چور ہوں، نہ ڈاکو، نہ موالی، نہ گنڈا، نہ کرانتی کاری، نہ کرانتی ورودھی۔ میں ایک سیدھا سادا انسان ہوں جو آزادی اور انسانیت کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے اور جس کا پیچھا یہ سب کر رہے ہیں۔ بھاگتے بھاگتے میں تھک چکا ہوں، مروں گا تو نہیں کیوں کہ سخت جان ہوں لیکن مجھے لگتا ہے، انسانیت میں، آزادی میں وشواس ہمیشہ کے لیے کھو دوں گا۔"

"میری طرف دیکھو" لڑکی نے کہا "مجھے پہچانتے ہو؟"

تھکے ہارے نوجوان نے لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا آہستہ آہستہ اس کی بجھی ہوئی آنکھوں میں ایک نئی چمک، امید کی ایک نئی لہر ابھر آئی۔ اس نے آہستہ سے سر ہلا کر کہا "اب پہچان گیا"

اتنے میں جتنے لوگ نوجوان کا پیچھا کر رہے تھے وہ سب لڑکی کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے اور نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چلّانے لگے۔

"یہ چور ہے"
"یہ ڈاکو ہے"
"یہ گنڈا ہے"
"یہ موالی ہے"
"یہ چار سو بیس ہے"
"یہ ہندو ہے"
"یہ مسلمان ہے"
"یہ کرسٹان ہے"
"یہ انقلابی ہے"
"یہ کرانتی کاری ہے"
"یہ کرانتی ورودھی ہے۔ یہ انقلاب دشمن ہے!"

اور اب لڑکی نے اُن سب کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جن میں شعلے بھڑک رہے تھے۔

نوجوان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑتے ہوئے وہ بولی "یہ میرا ہے اور میں اس کی ہوں، شکر ہے پچیس برس انتظار کرنے کے بعد میں اسے مل گئی ہوں۔ اور یہ مجھے"

اور پھر اُن سب کی حیرت بھری آنکھوں کے سامنے لڑکی اور وہ نوجوان دونوں فضا میں تحلیل ہو گئے --- اور پھر وہاں نہ دھرم دیو تھا، نہ راجا مان سنگھ شان سنگھ، نہ سیٹھ کروڑی مل پکوڑی مل، نہ دھرتی پتی کولاک، نہ مسٹر دفتر شاہی افسر، نہ کرانتی کاری گرو کر، نہ نیتا خاں بھارت سیوک انڈیا والا سب نہ جانے کہاں گم ہو گئے تھے۔ صرف برسات کی ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی اور مشرق میں ایک دھندلا سا سویرا گھنے کالے بادلوں کا دل چیرتا ہوا چلا آ رہا تھا۔

یہ پندرہ اگست کی صبح تھی، یہ آزادی کا دھندلکا تھا۔

(۱۹۷۲)

سادہ نگار قلم کار

میں جب اپنے افسانے پڑھتا ہوں اور عصمت بیدی اور منٹو کے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگ ایک نہایت خوبصورت رتھ پر بیٹھے چلے جا رہے ہیں اور عباس ہوائی جہاز پر سفر کر رہا ہے۔ اپنے ہاں شعریت ہے۔ خوبصورتی ہے پہیے منقش ہیں جودھ مطلا ہے گھوڑوں کے گلے میں نقرئی گھنٹیاں ہیں۔ لیکن چال میں قیامت کی سست رفتاری ہے اور سڑک کچی ہے۔ جگہ جگہ ہچکولے لگتے ہیں لیکن عباس کی تحریروں میں کہیں ہچکولے نہیں ہیں سڑک صاف سیدھی اور پختہ ہے، اور قلم میں ربڑ کے ٹائر لگے ہوئے ہیں۔ ہوا کی روانی اور تیز رفتاری دونوں اس میں موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ موجودہ دور اور آنے والے زمانے کے مسائل ہم رتھ پر بیٹھ کر نہیں طے کر سکیں گے۔ اس کے لئے ہمیں ہوائی پرواز سے کام لینا پڑیگا شعریت کو کم کرنا ہوگا اور جاگیردارانہ تکلفات کو خیرباد کہنا ہوگا کہ جمہوریت کا تقاضا یہی ہے کہ ادیب زیادہ سے زیادہ صاف آسان اور سلیس زبان استعمال کریں جو جمہور کی سمجھ میں آسکے اسے بھاری بھرکم الفاظ سے مرعوب کرنے کی کوشش نہ کریں۔ مغرب میں تو ادب کے ڈانڈے باندھ صحافت سے ملتے جا رہے ہیں اور رپورتاژ کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ جملے چھوٹے اور سلیس تر ہوتے جا رہے ہیں لیکن ان کی فکری رفتار تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ .... اپنے یہاں یہ رنگ صاف عباس کے یہاں ملیگا......... لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عباس سادگی اور سلاست پر حسن اور شعریت کو قربان کر دیتے ہیں۔ حسن اور شعریت کے وہ بھی قائل ہیں اور اسے سچے ادب کے اوصاف میں شمار کرتے ہیں لیکن وہ ظاہری حسن اور ظاہری شعریت کے پرستار نہیں۔ ان کے خیال میں محض خوبصورت جملوں سے خوبصورت ادب کی تخلیق نہیں ہوتی۔ وہ حسن اور شعریت کی تخلیق ایسے ادب میں رکھتے ہیں جو موضوع اور انداز نگارش کے باطنی امتزاج سے پیدا ہوتا ہے وہ فقروں کے رنگ و روغن کے قائل نہیں۔ وہ موضوع کی لے کو دیکھتے ہیں جو موجودہ دور میں اکثر و بیشتر تلخ ہے اور تیز رفتار ہے اور پھر بھی وہ اپنی زبان سے زرق برق لباس اتار دیتے ہیں اور پھر ان کی زبان اور ان کے جملے موضوع سے اس طرح ہم آہنگ ہو جاتے ہیں کہ موضوع کی رفتار جملوں کی رفتار بن جاتی ہے اور موضوع کا رنگ جملوں کا رنگ بن جاتا ہے اور اس طرح جو نئے حسن اور نئی شعریت کی تخلیق ہوتی ہے وہ جملوں کے اوپر نہیں آتی بلکہ زیر آب گویا اک ہلکی ہلکی نیلگوں روشنی کی طرح اندر ہی اندر جھلکتی نظر آتی ہے۔ ضیا جو نگینے کے سینے سے پھوٹ کر نکلے اس نور سے کہیں بہتر ہے جو خوبصورت جملوں سے مستعار لی جاتی ہے۔

کرشن چندر، تعارف: پانو میں پھول

نیلی ساری

> بمبئی: چونتیس کم عمر لڑکیاں تین قحبہ خانوں میں سے پچھلے ہفتے برآمد کی گئیں۔ ان میں سے تین کے چہرے کو ایذا پہنچانے کے لیے تیزاب سے جلا دیا گیا تھا۔ پولس نے پانچ عورتوں کو رنڈی خانوں کو چلانے اور طوائفوں کی آمدنی پر رہنے کے جرم میں گرفتار کرلیا ہے۔
>
> —— ایک خبر

حضور۔ مَیں سچ کہوں گی، سب سچ کہوں گی اور سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گی۔ مگر وقت ہے آپ کے پاس اور آپ کے سماج کے پاس میری باتیں سُننے کے لیے؟

میرا نام سلیمہ ہے۔ میرے والد کا نام۔ خُدا ان کی مغفرت کرے۔ کریم بخش تھا۔ میرے والد کیا کرتے تھے۔ سچّی بات یہ حضور کہ وہ کچھ نہیں کرتے تھے۔ کسی زمانے میں زمیندار تھے۔ بعد میں جب زمینوں پر سیلنگ لگی تو ان کے بدلے میں جو معاوضے کے کاغذات ملے ان کو بیچ کر کھاتے رہے۔

میری جائے پیدائش شکوہ آباد کی ہے۔

شکوہ آباد یوپی کا ایک قصبہ ہے۔ آگرے کے قریب۔ قصبہ کیا ہے۔ پُرانے کھنڈر جیسے مکانوں کا ایک مجموعہ ہے۔

انھیں میں سے ایک کھنڈر جیسے مکان میں میرا جنم ہوا تھا۔

میری ماں میری پیدائش کا بوجھ برداشت نہ کرسکیں۔ میرے پیدا ہوتے ہی مر گئیں بیچاری۔ پھر میرے والد نے دوسری شادی کرلی۔

میری سوتیلی ماں کا نام کریمن تھا۔ وہ ذات کی ناین تھی۔ مگر شکل وصُورت کی ذرا اچھی تھی جب ہی تو میرے والد نے بیوی کے مرنے کے دو مہینے بعد ہی اُس سے نکاح پڑھوالیا۔ محلّے والے یہ بھی کہتے تھے کہ اُن کا معاملہ کریمن کے ساتھ پہلے سے چل رہا تھا۔

کریمن میری سوتیلی ماں ضرور تھی مگر ایمان کی بات یہ ہے حضور کہ اس نے کبھی سوتیلی ماں جیسا سلوک نہیں کیا مجھ سے۔ اس کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لیے مجھے اسکول پڑھنے بھیجا۔ وہ مجھے ہمیشہ سینما ساتھ لے جاتی تھی اور ہر طرح کے ناز اُٹھاتی تھی۔

جب تک مَیں پندرہ برس کی ہوئی تو سینما کی پکّی شوقین بن چُکی تھی۔ سچ بات یہ ہے کہ شکوہ آباد جیسے مُردہ قصبے میں اور کوئی تفریح کی جگہ بھی تو نہیں تھی۔ جب تک مَیں کوئی فلم دیکھتی رہتی تو ایسا لگتا کہ مَیں دوسری دُنیا میں ہوں۔ ایک رنگین رومانی دُنیا جس میں سب مرد خوبصورت تھے۔ نہ صرف ہیرو بلکہ ویلن بھی —— اور سب عورتیں اور لڑکیاں حسین تھیں اور سب نے اچھے اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ فلموں سے مَیں نے بہت کچھ سیکھا۔ حضور مگر خاص طور سے یہ سیکھا کہ اپنی زندگی کی کٹھنائیوں اور محرومیوں سے سینما کے اندھیرے میں کیسے بچا جا سکتا ہے۔ اور کچھ بھی سیکھا۔ مثلاً ہیروئن کی طرح کپڑے پہننا۔ ان کے جیسے بال بنوانا یا کٹوانا۔ اُس زمانے میں سادھنا نئی نئی ”لَو اِن شملہ“ میں آئی تھی۔ اس کی طرح ”فرنج“ مَیں نے بھی بنالی کہ میرا ماتھا بھی بڑا تھا اور فرنج یعنی کٹے ہوئے بالوں کی جھالر میرے چہرے پر بھی اچھی لگتی تھی۔

اگلے دن ہی میرے خالہ زاد بھائی محمود علی نے، جو مجھ سے عُمر میں پانچ چھ برس بڑے ہوں گے، پہلی ہی جھلک میں پہچان لیا کہ مَیں نے ”لَو اِن شملہ“ دیکھ کر ہی اپنے بال کاٹے ہیں۔ اس لیے وہ ہلکے سے مذاق میں کہنے لگے۔ ”کیوں سلیمہ ”لَو اِن شملہ“ تو دیکھا ”لَو اِن شکوہ آباد“ کے بارے میں کیا رائے ہے؟“ اتنی بے شرمی کی بات سُن کر میرا سارا چہرہ گُلابی ہوگیا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دوں؟ مَیں جلدی سے وہاں سے بھاگ گئی۔ محمود بھائی بھی دو چار پھبتیاں کَس کر وہاں سے چلے گئے۔ ہاں جاتے جاتے اتنا کہہ گئے کہ وہ دو دن کے بعد علی گڑھ جارہے ہیں۔ کسی کو سینما چلنا ہو تو ان کے ساتھ وہ کل چل سکتا ہے۔ مَیں نے امّاں سے پوچھا۔ مَیں کریمن کو امّاں کہتی تھی۔ ”چلو گی امّاں؟“ امّاں نے کوئی بہانا کر دیا۔ ابّا تو سینما جانے کو تیار نہیں تھے۔ امّاں نے کہا۔ ”اپنے گھر کا ہی تو لڑکا ہے۔ تُو اُس کے ساتھ چلی جا۔ بُرقع اوڑھ کے“۔

اگلے دن مَیں محمود بھائی کے ساتھ سینما ہولی۔ رات کا وقت تھا۔ وہ بھی آخری دسمبر کی رات۔ کڑاکے کی سردی تھی۔ تانگے میں بیٹھی تو محمود بھائی پاس بیٹھے تھے۔ اُن کا ہاتھ نہ جانے کس طرح میرے بُرقعے کے اندر آگیا۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولے ”اُفّو تمھارے ہاتھ تو بالکل ٹھنڈے ہو رہے ہیں“۔ اور اپنے ہاتھوں کی گرمی مجھے پہنچاتے رہے۔ تھوڑی دیر میں میرے ہاتھ بھی ان کے ہاتھوں کی طرح جلنے لگے۔

سینما آگیا تو وہ تانگے والے کو پیسے دے کر

خواجہ احمد عبّاس

مجھے اندر ہال میں لے چلے۔ میں حیران رہ گئی جب میں نے دیکھا انھوں نے ایک باکس ریزرو کر رکھا تھا۔ یہاں ہم دونوں اکیلے تھے۔ اس لیے فلم شروع ہونے پر محمود بھائی نے میرا بُرقع اُتار دیا اور آہستہ آہستہ اُن کا بازو میرے گرد حمائل ہو گیا۔ فلم کافی بکواس تھی، مگر ہیرو ہیروئن کی محبّت کے بہت سین تھے۔ جو میرے لیے کافی دلچسپی رکھتے تھے۔

جو نکتے میری سمجھ میں نہیں آتے تھے، محمود بھائی کا ہاتھ میری تربیت کرتا رہا۔ ایک سین تھا جس میں ہیروئن گر پڑتی ہے۔ ہیرو گھبرا کر بھاگتا ہے اور زمین پر بیٹھ کر پوچھتا ہے:

"چوٹ لگی ہے؟"

ہیروئن مُنہ بنا کر کہتی ہے "بہت لگی ہے"۔

"کہاں؟" ہیرو پوچھتا ہے۔

"یہاں" وہ ٹخنے کی طرف اشارہ کر کے جواب دیتی ہے ــــ وہ ٹخنہ دبانے لگتا ہے۔

پھر وہ کہتی ہے "یہاں" اور گھٹنے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

وہ گھٹنہ دبانے لگتا ہے۔

پھر وہ کہتی ہے "نہیں۔ وہاں نہیں... یہاں"۔

"کہاں" وہ پوچھتا ہے۔

وہ اپنے سینے کی طرف اشارہ کر کے جواب دیتی ہے "یہاں"۔

ہیرو کے ہاتھ بے اختیار سینے کی طرف بڑھتے ہیں... بڑھتے ہیں پھر ایک دم رُک جاتے ہیں، مگر محمود بھائی کا ہاتھ نہیں رُکا اور میں نے بھی لذّت بھرے درد کو محسوس کر کے اپنی آنکھیں زور سے بھینچ لیں۔

اگلے دن تو محمود بھائی علی گڑھ چلے گئے اور میں ان کی یاد کو سینے سے لگائے اسکول چلی گئی۔ اسکول سے لوٹی تو دروازے پر ہی میں نے بُرقع اُتارا اور اندر گھس رہی تھی کہ بندو سقّے سے مُڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ اندر سے خالی مشک کندھے پر لٹکائے باہر نکل رہا تھا اور میں اندر جا رہی تھی۔ ہم دونوں کا معانقہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ دو پَل کے لیے ہم ایک دوسرے کے مقابل ٹھٹھک کر رہ گئے۔ میں نے دیکھا کہ سقّے کا لونڈا مجھ سے ذرا ہی بڑا تھا اور جس کے ابھی مُونچھیں بھی نہ نکلی تھیں، مُنہ پھاڑے میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔ میں بھلا سقّے کے لونڈے کو کب خاطر میں لانے لگی تھی۔ پھر بھی گھبراہٹ میں اُس کو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ پھر چونکّی ہو کر اندر چلی گئی اور یہ واقعہ دوپہر کے سنّاٹے میں کھو یا رہا۔ کسی نے ہم کو دیکھا نہیں تھا لیکن نشۂ حُسن میں ڈوبی ہوئی میری خوشی کا کیا ٹھکانا کہ کل محمود بھائی جس صُورت پر مر مٹے تھے، آج اُس صورت کو دیکھ کر ایک سانولا سلونا سقّے کا لونڈا گھن چکّر ہو گیا تھا۔

سقّے کے لونڈے کو میں کب مُنہ لگانے والی تھی مگر مجھے یہ اچھا لگتا تھا کہ میرے حُسن کے پجاریوں میں ایک کا اور اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد جب بھی مجھے موقع ملتا میں کسی نہ کسی بہانے سے بندو کے سامنے آجاتی یا اُسے اپنی ایک جھلک دِکھا کر فوراً پردہ کر لیتی۔ جیسے غلطی سے سامنا ہو گیا ہو۔ وہ بے چارہ تو یہ امید ہی کبھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ معاملہ آگے بڑھے گا۔ ایک شریف زادی سے چھیڑ چھاڑ کی پاداش میں ابّا اُسے مار مار کے ادھ موا نہ کر ڈالتے مگر اس آنا کانی میں مجھے بڑا مزہ آتا۔ وہ مَرے یا جیے مجھے کیا غرض؟

گرمیوں کی چُھٹّی میں محمود بھائی پھر شکوہ آباد آئے۔

کبھی خالہ امّاں کے گھر جانے کے بہانے ہم اُن کے ہاں ملتے۔ کبھی کچھ نہ کچھ بہانہ نکال کر وہ ہمارے ہاں آجاتے۔ کبھی سینما ہم امّاں کو ساتھ لے کر چلے جاتے اور کبھی کبھی ہم خود ہی سینما چلے جاتے۔ اُس دن میں نیلی ساڑی پہنتی۔ نیلا میرا محبوب رنگ تھا اور محمود کو بھی بے حد پسند تھا اور تب "باکس" میں بیٹھ کر ہی پکچر دیکھتے۔ بلکہ پکچر برائے نام ہی دیکھی جاتی۔

ایک بار وہ سقّے کا لونڈا بندو ہمیں وہاں مل گیا اور میں نے محمود بھائی سے کہہ دیا کہ وہ بیچارہ میرا شکار ہو گیا ہے۔

"بہت خوب" محمود بھائی بولے "تو شادی کر ڈالو"۔

"اس سے شادی کرے میری جُوتی"۔

"پھر کس سے شادی کرو گی؟"

"آپ کو معلوم ہے"۔ میں نے اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بالکل ہیروئن والے انداز میں کہا۔

"پھر تو امّاں سے بات کرنی ہی پڑے گی" وہ ہنس کر بولے۔

اور میں نے اُن کے بازو میں گھُس کر کچھ کُھسر پُھسر کی۔

"سچ! پھر تو دیر نہیں کرنی چاہیے"۔

"ہاں محمود۔ ورنہ میں مر جاؤں گی"۔

"ارے مریں تمھارے دُشمن"۔

اس سے تیسرے دن محمود ہمارے گھر آیا اور ابّا کو بیٹھک میں دیکھ کر اور امّاں کو سوتا پا کر مجھ سے آہستہ سے بولے "امّاں انکار کر رہی ہیں"۔

"کیوں؟ مجھ میں کیا بُرائی ہے؟"

"تم میں کچھ بُرائی نہیں ہے، مگر امّاں کہتی ہیں خالہ کریمن نائی خاندان سے ہیں۔ سقّے نائیوں میں پٹھان لوگ شادی کرنا نہیں چاہتے"۔

"سقّے نائیوں کا ذِکر کیوں کیا؟"

"آہستہ بولو! امّاں اُٹھ جائیں گی۔ سقّوں میں شادی کرنے کے تم بھی خلاف ہو۔ ہو نا؟"

"ہائے اللہ اب کیا ہو گا؟ مجھے تو ابھی سے اُبکائیاں آنے لگی ہیں۔ نہ جانے کب بھانڈا پھُوٹ جائے"۔

"فکر کیوں کرتی ہو میری جان؟ ہم تو ابھی نہیں

مُرے۔ بس دو چار دن انتظار کرو۔ پھر مَیں کوئی ترکیب نکالتا ہوں۔"

اور وہ چلا گیا

اُس کے بعد مَیں اُس سے کبھی نہیں ملی۔

تین دن بعد جب بندو پانی کی مشک ڈالنے آیا تو نظر بچا کر ایک لفافہ میرے پاس سے گزرتے ہوئے ڈال گیا۔ اُس کی یہ ہمت؟ مَیں نے سوچا۔ مگر خط کے اُوپر پتا محمود کی لکھائی میں تھا۔

مَیں نے اپنے کمرے میں دروازہ بند کر کے لفافہ کھولا۔ اندر بس تین سطریں تھیں۔

"جانِ من۔ آج تم آدھی رات کے بعد کسی ٹرین سے آگرہ آجاؤ۔"

مَیں وہاں تمھیں ملوں گا۔ وہاں مَیں نے قاضی کا انتظام کر رکھا ہے۔

تمھارا محمود

نوٹ: "نیلی ساری پہننا۔"

مَیں نے خط کو کئی بار پڑھا۔ بالکل "مُسلم سوشل" کی فلمی سچوایشن تھی۔ مَیں نے بھی ویسی ہی تیاری کی جیسی مُسلم سوشل فلم کی ہیروئن کرتی ہے۔

دو تین جوڑے کپڑے نکالے جو میرے پاس بہترین تھے۔ کاٹن کی نیلی ساری رات کو پہننے کے لیے نکالی۔ جو زیور بھی میرے پاس تھے اُن کو اٹیچی میں رکھا اور سر درد کا بہانہ کر کے سویرے ہی سے لیٹ رہی۔

گرمی کی راتیں تھیں اور چبوترے پر میرے والد اور والدہ سو رہے تھے۔ مَیں نیچے صحن میں اپنے پلنگ پر پڑی تھی۔ پاس ہی بُڑھیا فتّو اپنی کھاٹ پر بے ہوش پڑی تھی۔ ہوش میں ہوتی بھی تو کیا کرتی۔ بیچاری بہری تھی اور آنکھوں میں موتیا بند اُترا ہوا تھا۔ سو جب رات کے بارہ بجے تو مَیں چپکے سے اُٹھی۔ کوٹھری میں جا کر نیلی ساری پہنی۔ بُرقع اوڑھا۔ اٹیچی کیس ہاتھ میں لیا اور ننگے پانو (جوتیاں ہاتھ میں اُٹھائے ہوئے تھی) باہر نکل گئی۔

گلی کے موڑ پر پہنچی تھی کہ سامنے بندو کھڑا دِکھائی دیا۔ یہ کمبخت یہاں اس وقت کیا کر رہا تھا؟ پاس گئی تو دیکھا کہ وہ تو میرے راستے میں اڑا کھڑا ہے۔ "بی بی جی۔ آپ اس وقت کہاں جا رہی ہیں؟"

"تم کون ہوتے ہو مجھ سے سوال جواب کرنے والے؟"

"یہ سمجھ لیجیے کہ آپ کے خاندان کا نمک کھایا ہے۔ اس نمک کا حق پورا کر رہا ہوں۔ بی بی جی واپس چلی جائیے۔"

مَیں بُرقع میں سے مُنہ نکالے ڈراتی ہوئی سیدھی چلی گئی۔ آخر وقت پر وہ راستے سے ہٹ گیا . . . . .

"بی بی جی . . . . . مت"، وہ وہیں کھڑا تھا اس لیے اُس کی آواز پوری نہ آئی۔ . . .

"بی بی جی . . . ."

"بی بی . . . . ."

پھر وہ آواز جو شاید میرے ہی ضمیر کی آواز تھی۔ آنا بند ہو گئی۔

اسٹیشن پہنچ کر مَیں نے دو بجے والی گاڑی سے آگرہ کا ٹکٹ خریدا اور ایک زنانے درجے میں بیٹھ گئی۔

آگرہ پر حسبِ وعدہ محمود میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ انتظار کی گھڑیاں بھی کتنی دلچسپ ہوتی ہیں، وہاں وہ میرے انتظار میں اسٹیشن کی گھڑی دیکھ رہا ہوگا کہ چار بجیں اور گاڑی وہاں پہنچے۔ اور یہاں مَیں بھی اسی انتظار کا شکار ہوں اور چلتی ہوئی ٹرین کے بند شیشے میں سے مستقبل کی جھلکیاں مجھے نظر آ رہی تھیں۔

گاڑی آگرہ اسٹیشن پر پہنچی ہے۔

چلتی ہی گاڑی میں سے میری نظریں دراز قامت محمود کو ڈھونڈھ نکالتی ہیں۔

"محمود" مَیں آواز دیتی ہوں۔

وہ ہلکی ہوتی ہوئی ٹرین کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگتا ہے۔ ڈنڈا پکڑ کر درجے میں گھُس آتا ہے۔ سب لوگوں کے سامنے کھینچ کر مجھے گلے لگا لیتا ہے۔

"سلیمہ! میری اچھی سلیمہ! تم آگئیں نا؟"

اُس کی ایک دن کی بڑھی ہوئی ڈاڑھی مجھے اپنے گالوں پر اچھی لگتی ہے۔

گاڑی ٹھہر جاتی ہے۔

وہ میرا اٹیچی کیس سنبھالتا ہے۔ مجھے پلیٹ فارم پر اُتارتا ہے۔ گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے کان میں کہتا ہے۔ قاضی جی۔ ہمارا بے چینی سے انتظار کر رہے ہوں گے۔ پورے سو روپے کا وعدہ کیا ہے ان کو دُوں گا اس بے وقت کی شادی کا۔"

ہم ٹیکسی میں بیٹھے اور ٹیکسی گھڑ گھڑ کرتی ہوئی روانہ ہو گئی۔

رات کے دھندلکے میں شہر کی روشنیاں عجیب عجیب لگ رہی تھیں اور ٹیکسی ایسی چلتی ہے جیسے ریل چل رہی ہو۔ کیا لوہے کے پہیے لگے ہیں اس میں۔

ارے یہ سب تو میرا تخیل تھا۔ ابھی تو مَیں ٹرین ہی میں تھی اور اس کی گھڑ گھڑاہٹ میرے کانوں میں۔ باہر آگے کے شہر کی دھندلی روشنیاں ہلکی ہوتی ہوئی ٹرین میں سے دِکھائی دے رہی تھیں۔ اس بار ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ ٹھہر گئی۔

مَیں نے نیچے اُترنے سے پہلے جھانک کر دیکھا۔ مسافروں کی بھیڑ بھاڑ میں کوئی ترکی ٹوپی پہنے ہوئے دوسرے سروں کے اُوپر سے جھانکتا ہوا دِکھائی نہیں دیا۔ اُترنے والے مسافر، چڑھنے والے مسافر، خونچے والے، ریلوے بابو گھمسان کا عالم تھا۔ کوئی تعجب نہیں کہ اس بھیڑ میں کوئی کھو جائے۔

مَیں جان کر کھُلے دروازے میں کھڑی رہی تاکہ میں خود بھیڑ میں نہ کھو جاؤں اور محمود کو دُور سے دیکھ کر پہچان جاؤں۔ مگر ٹرین چلنے لگی اور محمود نہ آیا۔ مَیں چلتی گاڑی سے اُتر گئی۔ اب پلیٹ فارم تقریباً خالی ہو چکا تھا۔

دُور دُور تک مجھے کوئی نظر نہیں آیا . . . .

سوا ایک پستہ قد آدمی کے جو مجھے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ جو شاید اسی طرح ہر اکیلی لڑکی کو گھور گھور کر دیکھتا ہوگا۔ میں جلدی جلدی قدم بڑھاتی ہوئی زنانہ ویٹنگ روم میں داخل ہوگئی۔ سوچا محمود کو بھی شاید کہیں دیر لگ گئی ہوگی۔ چند منٹ میں آتا ہوگا۔ تب تک میں منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہو جاؤں۔

ویٹنگ روم سے باہر نکلی تو اسی پستہ قد آدمی کو گھورتے دیکھا۔ وہ میلی سی پتلون پر ایک دھاری دار بش شرٹ پہنے تھا۔ اب وہ میری طرف بڑھا۔

میں اِدھر اُدھر دیکھ کر واپس جانے والی تھی کہ وہ آدمی بولا "سنیے"۔ میں ٹھٹھک کر رُک گئی۔ سوچا شاید محمود نے اسے مجھے لانے کے لیے بھیجا ہو۔

"آپ کسی کا انتظار کر رہی ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"کس کا؟"

"محمود علی صاحب کا۔ آپ انھیں جانتے ہیں؟"

"نہیں تو۔ میں انھیں نہیں جانتا۔ میں تو بمبے فلم کمپنی سے اِدھر فلم اسٹار کے قابل لڑکے اور لڑکیاں کھوجنے آیا ہوں . . . آپ دیکھنے میں قبول صورت دکھائی دیتی ہیں۔ میں نے سوچا شاید آپ کو دلچسپی ہو؟"

"جی نہیں۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے سوائے محمود علی صاحب سے ملنے میں۔ اگر کوئی لمبے سے صاحب کسی لڑکی کو ڈھونڈنے آئیں تو آپ مہربانی کرکے انھیں اِدھر بھیج دیجیے۔" یہ کہا اور میں اندر چلی گئی۔

وہ آدمی سگریٹ جلا کر سامنے ٹہلنے لگا۔

میں نے کہنے کو تو کہہ دیا کہ مجھے کوئی دلچسپی نہیں مگر فلم اسٹار بننے میں کسے دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے سوچا ممکن ہے یہ آدمی جھوٹا ہو . . . . . یا ممکن ہے سچ بولتا ہو۔ محمود آئے گا تو اس سے مشورہ کروں گی۔

مگر صبح سے شام ہوئی اور محمود نہیں آیا۔

میں نے وہیں کھانا منگوا کر کھایا۔

اب میں نے سوچا کسی وجہ سے علی گڑھ جانا پڑا ہوگا محمود کو۔ ممکن ہے یونیورسٹی کھل گئی ہو۔ سو میں رات کی گاڑی سے علی گڑھ کے لیے روانہ ہوگئی۔

مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا۔ یا شاید نہیں ہوا کہ وہ پستہ قد آدمی بھی اسی گاڑی میں سوار ہوا۔ مگر پھر اُس نے مجھ سے کوئی بات کرنے کی جرأت نہیں کی۔ علی گڑھ کے اسٹیشن پر میں اُتری۔ مجھے تعجب ہوا، یا شاید نہیں ہوا کہ وہ آدمی بھی اُترا۔ رات کا وقت تھا۔ میں ویٹنگ روم میں جاکر بیٹھ گئی اور صبح کا انتظار کرنے لگی۔ محمود کے ہوسٹل کا پتا میرے پاس موجود تھا۔ صبح ہوتے ہی میں ایک سائیکل رکشا پر سوار ہوکر وہاں پہنچی۔ یونیورسٹی سنسان پڑی تھی۔ اس کے کمرے میں اکثر کمروں کی طرح قفل لگا ہوا تھا۔

مگر برابر کا کمرہ کھلا ہوا تھا۔

اس میں سے چک ہٹا کر ایک نوجوان باہر نکلا۔ مجھے دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔

"آپ کسی کو ڈھونڈ رہی ہیں شاید؟"

"ہاں اپنے کزن محمود علی خاں صاحب کو۔"

"محمود کی کزن ہیں آپ؟ پڑوسی ہونے کے ناتے میرا فرض ہے آپ کی سیوا کروں۔ وہ تو ابھی واپس نہیں آیا۔ میں ہی اکیلا ہوسٹل میں ہوں۔ میرا کمرہ حاضر ہے۔ رکشا والے کو رخصت کیے دیتا ہوں۔"

نہ جانے کیوں اُس کی آنکھوں کی چمک مجھے اچھی نہیں لگی اور میں "جی نہیں شکریہ" کہہ کر برآمدے سے اُتر کر رکشا میں آکر بیٹھ گئی۔

"چلو واپس اسٹیشن۔"

جب واپس پہنچی تو اس پستہ قد آدمی کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ شام کی ٹرین سے میں شکوہ آباد چلی آئی۔ رات کو پہنچی۔ وہ آدمی بھی اسی ٹرین میں سوار ہوا۔ مگر اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔

رات کو شکوہ آباد پہنچ کر تانگے پر سوار ہوکر میں نے گلی کے نکڑ پر تانگہ کو رکوایا کیونکہ اب پیسے میرے پاس ختم ہوگئے تھے۔

سوچا گھر جاکر ماں باپ سے کہوں گی۔ کسی سہیلی کے ہاں گئی تھی اور ان سے تانگے کا کرایہ دلوا دوں گی۔ مگر ڈیوڑھی تک ہی پہنچی تھی کہ ارادہ بدل گیا۔

اندر سے ابا اور کریمن بُوا کی آوازیں آرہی تھیں۔

"اس لڑکی کو کبھی سوتیلی بیٹی نہیں سمجھا۔ اپنی بیٹی سے بڑھ کر پالا اور یہ ہمارے خاندان کی ناک کٹوا کر بمبئی چلی گئی فلم اسٹار بننے۔"

"ہاں بھئی۔ تو میں سینما دیکھنے کو اسی لیے منع کرتا تھا۔ محمود کہتا تھا کہ کب سے اُس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ اُس سے کہتی تھی دونوں ساتھ چلیں گے۔ تم ہیرو بننا۔ میں ہیروئن بنوں گی۔ مگر وہ شریف کا بچہ ہے۔ اُس نے منع کر دیا تو کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی ہے اب!"

"دو چار مہینوں میں ٹھوکریں کھا کر آجائے گی، اپنے چہیتے باپ کے پاس۔"

"کیا منہ لے کر آئے گی۔ اب آئی تو میں ٹانگیں توڑ دوں گا اُس کی . . . ."

میں یہیں تک سُن پائی تھی کہ مجھے فوراً تانگے کا خیال آیا۔ دبے پیروں وہاں سے لوٹی۔

"واپس اسٹیشن چلو" تانگے والے سے کہا۔

مگر راستے بھر سوچتی گئی کہ پیسا کیسے ادا کروں گی۔ شاید کوئی زیور گروی رکھنا پڑے۔ مگر اس وقت رات کو گروی کون رکھے گا؟

مجھے تعجب ہوا . . . . . یا شاید نہیں ہوا . . . . کہ پستہ قد آدمی اسٹیشن کے باہر ہی ٹہل رہا تھا۔ اس نے تانگہ رُکتے ہی اس کا کرایہ چکا دیا۔

"آپ نے اچھا کیا۔ وقت پر آگئیں۔ متھرا کی گاڑی آنے والی ہے۔ وہاں سے فرنٹیئر میل پکڑنی ہے ہمیں۔"

اُس نے میرا ٹکٹ نہیں خریدا۔ اُس کے پاس
میرا ٹکٹ پہلے سے موجود تھا۔ گاڑی آنے سے پہلے صرف
اتنا کہا "آپ مجھ پر بھروسا رکھیے۔ آپ کو ہاتھ نہیں
لگاؤں گا۔ زنانے ڈبے میں آپ سفر کریں گی۔ آپ کو کمپنی
والوں کے سپرد کرتے ہی مَیں تو کلکتہ چلا جاؤں گا...
کچھ بنگالی چہرے بھی لانے ہیں۔"

وہ اپنے قول کا پکّا نکلا۔

مجھے زنانے درجے میں سوار کراکے خود مردانے
درجے میں بیٹھ گیا۔ جب گاڑی کسی بڑے اسٹیشن پر
رُکتی تھی تو چائے اور کھانے کو پوچھنے آجاتا تھا۔

اور ہاں ایک بار بہت سے فلمی پرچے مجھے
دے گیا اور کہنے لگا "اب دیکھیے، اگلے مہینے ان سب
میں آپ کی تصویریں چھپیں گی۔" اور مَیں نے سوچا محمود
ان سب پرچوں کو پڑھتا ہے دیکھ کر کتنا جلے گا۔

میں نے اٹیچی کیس کو تکیہ بناکر بُرقع رات کو
اوڑھ لیا لیکن بمبئی پہنچتے پہنچتے اب وہ غیر ضروری ہو گیا
تھا۔ اس لیے مَیں نے اُسے وہیں ٹرین کے ڈبے میں
چھوڑ دیا۔

بمبئی پہنچ کر اُس نے مجھے ٹیکسی میں بٹھایا۔ خود
ڈرائیور کے پاس بیٹھا اور کہا "میرین ڈرائیو چلو۔"

"کیا کمپنی کا دفتر وہاں ہے؟"

"ہاں یہی سمجھو۔ اسٹوڈیو تو ہمارا دادر میں
ہے۔ یہ سیٹھانی جی کا فلیٹ ہے۔ وہ تمھیں اپنے پاس
ہی رکھنا چاہتی ہیں۔"

"تمھاری کمپنی کی مالکن عورت ہے؟"

"ہاں۔ جب ہی تو ہم جب کسی لڑکی کو لے کر آتے
ہیں تو راستے بھر اس کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔"

"کیا نام ہے تمھاری سیٹھانی کا؟"

"مس للیتا کماری۔ پہلے وہ بھی ہیروئن ہوتی
تھیں مگر کسی اور نام سے کام کرتی تھیں۔ اب ذرا موٹی
ہو گئی ہیں، سو کمپنی کھول لی ہے۔"

فلیٹ کے دروازے پر بورڈ لگا تھا: "مس
للیتا کماری۔ فلم پروڈیوسر"

مگر مَیں نے دیکھا ایک جنگلہ بھی لگا ہوا ہے۔
دروازے کے باہر گیلری میں۔ جسے ایک چوکیدار نے
کھولا اور پھر بند کر دیا۔ قفل لگا دیا۔ مجھے یہ دیکھ کر
تعجب تو ہوا مگر میرے پستہ قد ساتھی نے اطمینان
دلا دیا: "سیٹھانی بہت وہمی ہیں۔ ہمیشہ چوروں سے
ڈرتی ہیں۔ کوئی اُن کے ہیرے جواہرات چُرا کر نہ لے
جائے۔"

ایک بڑھیا روم میں لے جا کر بٹھایا گیا۔

پستہ قد آدمی برابر کے کمرے میں چلا گیا۔ دروازہ
بند کر لیا۔

نہ جانے کیوں مجھے یُوں محسوس ہوا کہ کوئی مجھے
دیکھ رہا ہے۔ پرکھ رہا ہے۔ مگر کمرہ خالی تھا۔ کوئی بھی
نہیں تھا۔ شاید یہ میرا وہم تھا۔

کچھ ہی دیر بعد دروازہ پھر کھلا اور وہی پستہ قد
آدمی ایک موٹی عورت کے ساتھ داخل ہوا جو کسی زمانے
میں بہت خوب صورت رہی ہوگی۔

"اچھا نیلی ساری"

"جی۔ اچھا گڈ بائی اور گڈ لک!"

اور یہ کہہ کر وہ آدمی چلا گیا۔

اور سیٹھانی میری طرف آئیں۔ مجھے بڑے غور سے
دیکھا۔ پھر اُن کے چہرے پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔

بڑے پیار سے میرے سر کو تھپتھپاتے ہوئے کہا،
ابھی تو تم تھکی ہوئی ہو۔ کچھ کھا پی کر آرام کرو۔ رات کو
تمھارا ٹیسٹ لیں گے۔ مجھے یقین ہے تم کامیاب ہوگی اور
للیتا کماری کا نام روشن کرو گی۔"

یہ کہہ کر انھوں نے تالی بجائی۔

ایک نوکرانی ایک ٹرے میں کچھ مٹھائی اور دُودھ کا
گلاس لے کر آئی۔

"کھاؤ۔ پیو۔"

"آپ نہیں کھائیں گی؟"

"نہیں۔ مَیں ابھی کھا پی کر اُٹھی ہوں۔ یہ سب
تمھارے لیے ہے۔"

یہ کہہ کر انھوں نے مٹھائی کی ایک ڈلی میرے مُنہ
میں ڈال دی۔ کہنے لگیں کہ یہ شگون کی مٹھائی ہے۔ میٹھا
کا مزہ تو اچھا تھا۔ مگر اُس میں کچھ کڑواہٹ
ہوئی تھی۔ مَیں نے سوچا پستہ و بادام شاید کڑ
ہوگا۔

پھر انھوں نے دُودھ کا گلاس میری طرف
بڑھایا۔

"پیو میری جان" انھوں نے بڑے پیار سے
دُودھ اپنے ہاتھ سے پلایا۔ دُودھ خوشبودار تھا۔ گلاب
کی سی خوشبو تھی۔ مگر ساتھ میں ہلکی سی کڑواہٹ
تھی۔ سیٹھانی نے اپنا ہاتھ نہ ہٹایا جب تک میں
دُودھ کا گلاس ختم کر لیا اور پھر اُن کی آواز ایک دو
دُنیا سے آئی "اور بھول جاؤ سب کچھ۔ اب تمھاری نئی زن
شروع ہوتی ہے۔۔۔"

ایک لامتناہی رات میں ایک ڈراؤنا خواب
دیکھتی رہی۔

دیکھتی ہوں کہ ایک ہاتھ میرے باپ نے پکڑا
ہے۔ دوسرا ہاتھ میری سوتیلی ماں نے۔

ایک ٹانگ محمود نے پکڑی ہوئی ہے۔

دوسری ٹانگ اس پستہ قد آدمی نے جو مجھے
لایا تھا۔

اور سیٹھانی کی نگرانی میں میرے بدن میں یہ
لمبے آگ کے سوئے گھونپے جا رہے ہیں۔

اور میرے بدن میں سے سارا خون پانی بن
نکل رہا ہے۔

نہ جانے کتنی دیر یہ خواب دیکھتی رہی۔

اُس کے بعد جب ہوش آیا تو مَیں ایک گد
پلنگ پر پڑی تھی۔

میرے سر کے نیچے ایک مخملی تکیہ تھا۔

جب مَیں نے اپنی تھوڑی کھجانے کے لیے اپنا ہاتھ ہلانا چاہا تو معلوم ہوا کہ ہاتھ بندھا ہوا ہے۔ دونوں ہاتھ بندھے ہوئے ہیں ٹانگ سکوڑنی چاہی تو ٹانگ بھی پائے سے بندھی ہوئی ہے۔ دوسری ٹانگ بھی۔ سر بھی۔ اسی طرح کسی چین سے باندھا گیا ہے کہ مَیں صرف سامنے سے دیکھ سکتی ہوں اور پیراہن کے بغیر آرام دہ سُولی پر چڑھا دی گئی ہوں۔

اتنے میں سیٹھانی میرے سامنے کھڑی تھی۔

کہنے لگی "عیش و آرام کرو گی یا تکلیف اُٹھاؤ گی اس کا فیصلہ تم پر ہے ؟ دیر یا سویر سب رام ہو جاتی ہیں۔ تم بھی ہو جاؤ گی۔ مگر ابھی یا کچھ اور دیر کے بعد ؟"

"مَیں آپ کا مطلب نہیں سمجھی ؟"

"مَیں چاہتی ہوں اس خوبصورت بدن کو انسانیت کو آرام پہنچانے کے لیے استعمال کرو۔ جو مجرّد ہیں ان کے لیے ایک رات کی بیوی بنو۔ جو اپنی بیویوں کی بدصورتی سے بھاگے ہوئے ہیں ان کے بدن کو تسکین پہنچاؤ۔ جو سیاسی، سماجی، اقتصادی ذمہ داریوں میں دبے ہوئے ہیں اُن کا دل بہلا کر ان کو اس قابل بناؤ کہ وہ ہمارے سماج کی ذمہ داریاں اُٹھا سکیں۔"

"تم چاہتی ہو کہ مَیں رنڈی بن جاؤں۔" مَیں نے سوال سیٹھانی سے کیا اور اپنے آپ سے بھی "ارے مَیں ماں بننے والی ہوں۔ ماں!"

"تم کبھی نہیں بنو گی۔ اس بار بھی نہیں۔ کسی بار بھی نہیں۔ دیکھنا چاہتی ہو۔ یہ آپریشن کس نے کیا ہے ؟ اور بغیر کسی لوہے کے آلے کے ؟"

اتنے میں اس کے اشارے پر ایک کے بعد ایک آدمی آتا گیا اور میرے پائنتی کھڑا ہو کر میری نگاہ کے دائرے سے اوجھل ہوتا گیا۔

ہندو، مسلمان، سکھ، کرسچین، پوربی بھیا، مدراسی۔

نہ جانے کہاں کہاں سے یہ مسٹنڈے اکٹھے کیے گئے تھے . . . .

اب مجھ میں چیخنے چلاّنے کی طاقت نہیں تھی۔ میرا کلیجہ مُنہ کو آیا اور ایک اُبکائی کے بعد مَیں نے قے کر دی اور بے ہوش ہو گئی۔

جب پھر ہوش آیا تو میری باقاعدہ ٹریننگ شروع ہوئی۔

ایک بار حکم کی خلاف ورزی کی سزا میں کوڑے پڑتے تھے اور کھانا بند۔

دو بار حکم کی خلاف ورزی کی سزا میں مُنہ کالا کرانا تھا۔

تین بار حکم کی خلاف ورزی کی سزا ایسڈ مُنہ پر پھینکنا تھا۔ اس کا مظاہرہ میرے سامنے ایک معصوم بلّی پر کر دیا گیا تھا جو ایسڈ سے جل کر لوٹ پوٹ کر وہیں میرے سامنے ڈھیر ہو گئی۔

مَیں نے ایک درخواست کی کہ مجھے یہ بتا دو کہ اس پستہ قد آدمی نے مجھے پہچانا کیسے کہ یہ گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی ہے۔ جواب مِلا "تمھاری نیلی ساری سے۔ تمھارے عاشق نے دو سو روپے لے کر یہ اطلاع دی تھی کہ اس ٹرین سے تم آؤ گی اور یہ کپڑے پہنے ہو گی۔"

یہ سُننے کے بعد مَیں تیار ہو گئی۔ اب رہ ہی کیا گیا تھا۔

اگر مَیں بتاؤں کہ اگلے چھ برس تک کیا ہوا تو ایک کتاب تیار ہو جائے گی۔

میرے گاہکوں میں کون نہیں تھا ؟

افسر، بڑے بڑے بیوپاری، راجا، مہاراجا، نواب، فلم اسٹار، فلم پروڈیوسر، پہلے میرے ساتھ ایک آدمی جایا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھ پر بھروسا ہونے لگا پھر مجھے جو روپیا ملتا تھا اس میں سے ایک تہائی اپنے پاس رکھنے کی اجازت مِل گئی۔

مَیں اپنا پُرانا نام بھول گئی۔ نیا نام ہی کافی تھا "نیلی ساری"۔ میرے پاس ہر شیڈ کی نیلی ساریاں تھیں شیفون کی نیلی ساری کنجی ورم کی نیلی ساری۔ جارجٹ کی نیلی ساری . . . . اور سُوٹ کیس کے سب سے نیچے کاٹن کی نیلی ساری۔

ایک دن مجھے چھُٹی تھی۔ (جمعہ کو یہ چھُٹی میں ضرور لیا کرتی تھی۔)

اس دن نہ جانے کیا ہوا کہ مجھے جُوہُو جانے کی سُوجھی اور نہ جانے کیوں مَیں نے وہی پُرانی کاٹن کی نیلی ساری پہنی۔ جُوہُو پہنچ کر مَیں نے ناریل کا پانی پیا۔ بھیل پوری کھائی۔ کوئی مجھے جانتا نہیں تھا اور مَیں اپنی گُمنامی کا فائدہ اُٹھا رہی تھی۔ اِدھر اُدھر گھومتی رہی۔

ایک جگہ ایک آدمی ریت کے پُتلے بنا رہا تھا۔ مَیں نے بھی اس کی پھیلی ہوئی چادر میں بیس پیسے پھینک دیے۔ اس کے آگے کو بڑھی تو کیا دیکھتی ہوں کہ زمین سے دو اُلٹی ٹانگیں اُگ آئی ہیں معلوم ہوا کہ کسی بے چارے کو اُلٹا زمین میں گاڑا گیا ہے۔ پاس ہی چادر پھیلائے ایک آدمی پیسے اکٹھا کر رہا ہے۔ مَیں نے اُسے ایک روپیا دیا اور پوچھا یہ آدمی کب نکلے گا۔ اس نے کہا سورج چھُپتے اسے یہاں سے نکالوں گا۔ ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی پر برسوں تپسیا کی ہے تب جا کر یہ کمال حاصل کر پایا ہے کہ شتر مُرغ کی طرح ریت میں سر دے کر دن بھر اُلٹا لٹکا رہتا ہے۔

مجھے نہ جانے کیا سُوجھی کہ سُورج جب سمندر میں ڈوبنے لگا تو پھر وہاں پہنچ گئی۔

وہ ڈھونگی ڈھول بجا رہا تھا کہہ رہا تھا، "دیکھو، دیکھو دُنیا کا سب سے بڑا کمال۔ بارہ گھنٹے ریت میں دفن رہ کر آدمی زندہ ہو رہا ہے . . . ."

ٹانگوں میں حرکت پیدا ہو رہی تھی اور پھر وہ آدمی جو ایک نیکر پہنے ہوئے تھا نکل آیا اور مَیں اُسے

دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ تو اپنی آنکھوں میں سے ریت نکال رہا تھا۔ لوگ تالیاں بجا رہے تھے پیسے کھنا کھن گر رہے تھے اور میں مُنہ پھاڑے دیکھ رہی تھی۔ جیسے سچ مچ کوئی مُردہ زندہ ہوگیا ہو اور میں ایک معجزہ دیکھ رہی ہوں کیونکہ میرے سامنے شکوہ آباد کا وہ سقّے کا لونڈا کھڑا تھا۔ بندو۔

تالیاں بجنی بند ہوگئیں۔

لوگ اُمڈتے ہوئے اندھیرے میں غائب ہوگئے۔ بندو اور اُس کا ساتھی پیسے بٹورنے لگے۔ آدھے اس آدمی نے لیے۔ آدھے بندو نے۔ پھر اُس آدمی نے کہا" اچھا بے میں چلتا ہوں۔ کل یہ تماشا چوپاٹی پر جمائیں گے۔"

یہ کہا اور وہ چلتا بنا۔

اور میں وہیں کھڑی بندو کو دیکھتی رہی۔ وہ بھی مجھے دیکھ رہا تھا۔

پھر وہ آگے بڑھ کر میری طرف دیکھتا رہا۔

میں نے کہا "بندو"

اُس نے کہا "جی بی بی جی"

"تم شکوہ آباد سے کب آئے؟"

"چھ سال ہوگئے۔"

"سب خیریت ہے؟"

اُس کے چہرے سے پتا چلتا تھا کہ سب خیریت نہیں ہے۔

"ابا تو خیریت سے ہیں؟" میں نے کُرید کر پوچھا۔

"ابا تو جنّت کو سدھارے۔"

میں نے دل ہی دل میں اِنّا للہ وَاِنّا الیہ راجعون پڑھا۔

"یہاں کہاں رہتا ہے؟"

اُس نے کہا" مہالکشمی کے پاس ایک جھونپڑی میں۔"

"مجھے وہاں لے جا سکتا ہے؟"

"بی بی جی . . ." اُس کا چہرہ خوشی اور تعجب سے پھٹا کا پھٹا رہ گیا۔

"تمھاری بی بی ساتھ رہتی ہے کیا؟"

"بی بی جی۔ میری شادی نہیں ہوئی۔"

"پھر تو ٹھیک ہے . . . . . میں تمھارے ساتھ رہ سکتی ہوں۔"

اُس کا حال تو یہ تھا کہ شادیٔ مرگ نہ ہو جائے۔

"چلیے۔ بی بی جی"

"چلو۔"

سو ہم مہالکشمی والی جھونپڑی میں آگئے۔

جھونپڑی اُن پایئوں سے اچھی تھی جو سڑک کنارے پھیلے ہوئے تھے اور جن میں بے گھر لوگ آباد ہوگئے تھے اور وہ لوگ ان سے اچھے تھے جو سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر سونے کے لیے مجبور تھے۔ جھونپڑی میں ایک ٹوٹی پھوٹی کھٹیا تھی۔ میں اُس پر ایسی سوئی جیسے دُنیا کی خبر نہ ہو۔ چھ سال کے بعد میں سچ مُچ کی چھُٹی منا رہی تھی۔

صبح کو میں نے دیکھا بندو جھونپڑی کے باہر سو رہا تھا۔

میں نے اُسے اُٹھایا۔

اندر آیا پوچھا" مجھے تو بہت اچھی نیند آئی تم بھی اندر کیوں نہیں آگئے؟"

"بی بی جی۔ اندر تو ایک ہی چارپائی تھی اور آپ اُس پر ایسی تھکی ہاری سو رہی تھیں جیسے ایک بچّہ سو رہا ہو۔"

"مجھے تو ساتھ سونے کی عادت ہے۔ تم ہی آجاتے۔"

"بی بی جی!"

"نام بتاؤں دو چار کے؟ اور میں بتانے ہی لگی تھی۔ مگر اس نے اتنی لجاجت سے "بی بی جی" کہا کہ میں چُپ رہ گئی۔

پھر وہ کہنے لگا" قاضی جی جب نکاح پڑھ دیں گے تب ٹھیک ہے۔"

"قاضی جی!" مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔

"قاضی جی!" میں ہنستی رہی۔

اُس کے چہرے پر ایسا بھولا پن تھا کہ مجھے اس پر غصّہ بھی آرہا تھا اور ہنسی بھی آرہی تھی۔

"کیا تمھیں نہیں معلوم کہ میں پچھلے چھ برس سے کیا کرتی رہی ہوں؟"

"بی بی جی۔ میں نہیں جاننا چاہتا۔"

". . . . کہ ایک ایک رات میں . . . ."

"بی بی جی۔ خُدا کے لیے چُپ رہیے۔ میں نہیں جاننا چاہتا . . . قاضی جی نکاح پڑھا دیں گے پھر جو جی چاہے مجھے بتا دینا۔"

"قاضی جی!" اور مجھے پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ اور میرے مُنہ سے نکل گیا" کیا تم سمجھتے ہو کہ میں ایک سقّے کے لونڈے سے بیاہ کروں گی؟"

یہ سُن کر وہ چُپ ہوگیا اور باہر چلا گیا۔

دو گھنٹے کے بعد کھانے کی چیزیں لے کر آیا اور میرے سامنے رکھ دیں۔ بغیر ایک لفظ کہے اپنا کھانا باہر لے گیا اور وہاں ہی کھایا۔

میرا جی تو اکیلے کھانے کو نہیں چاہتا تھا پھر بھی جب بھوک لگی تو زہر مار کرلیا۔ سہ پہر کو وہ آیا اور کہنے لگا" میں جا رہا ہوں۔ تم جھونپڑی کا دروازہ اندر سے بند کرلو میرے آنے تک کسی کے لیے نہ کھولنا۔"

"تم کہاں جاؤگے؟"

"روزی کمانے۔"

"سر ریت میں دے کر اُلٹے لٹکنے کو تم روزی کہتے ہو؟"

میں جانتی تھی وہ کیا جواب دے گا۔ میں اُسے

جواب کو سننا چاہتی تھی کہ وہ یہ کہ ہر آدمی کو اپنے اپنے ڈھنگ سے روزی کمانا پڑتی ہے۔ کوئی ریت میں سر دیتا ہے کوئی . . . . . مگر اُس نے کچھ نہیں کہا اور چلا گیا۔

مَیں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور کھٹیا پر لیٹی رہی۔

تھوڑی دیر میں باہر سے سیٹیاں سُنائی دینے لگیں۔

مَیں نے ایسی سیٹیاں پچھلے چھ برس میں بہت سُنی تھیں۔ مَیں اُن کا مطلب خوب سمجھتی تھی۔ دو ایک نے دروازہ پر ٹھک ٹھک بھی کی لیکن کسی کی ہمت نہ ہوئی تھی کہ وہ پُرانی لکڑی کا دروازہ جو رسّی سے بندھا ہوا تھا لات مار کر توڑ دے اور اندر چلا آئے۔ غریب بھی بُرائی کرتے ہیں اور امیر بھی۔ مگر غریب کی بُرائی میں امیروں کی سی بے حیائی نہیں ہوتی۔

وہ رات کو دیر میں آیا اور کچھ کھانا ساتھ لایا۔

میں نے کہا "کیا ہوا؟"

اس نے کہا، "وہی جو تم نے دیکھا تھا۔ شاید تمھارے آنے کی برکت ہے۔"

"برکت!" میرے جی میں آیا کہ کہوں کچو کے کیوں دیتے ہو۔ مگر اُس نے ایسے بھولے پن سے کہا تھا کہ مَیں چُپ رہی۔

اس رات مَیں سوچتی رہی کہ مَیں یہ کیا کر رہی ہوں۔ پھر مَیں نے سوچا کہ کر کیا رہی ہوں۔ چھٹّی پر ہوں چھ برس ہو گئے محنت کرتے کرتے۔ کچھ دِن تو چھٹّی کروں . . . . . یہاں جھونپڑی میں کون مجھے ڈھونڈنے آئے گا؟

بندو روز دو تین بجے جاتا اور رات گئے آتا۔

نہ مَیں اُس سے پوچھتی کیا ہوا؟

نہ وہ مجھ سے پوچھتا کہ مَیں نے کیا کیا۔

نہ ہی اُس نے پہلے دن کے بعد کبھی قاضی جی کی بات چھیڑی۔

وہ اپنے میلے کُچیلے بستر کا ڈھیر لیتا اور باہر جا کر بچھا دیتا۔ مگر وہ میرے لیے نئی دری، نئی چادر نیا تکیہ لے آیا تھا۔ کھٹیا کو بھی ٹھوک پیٹ کر ٹھیک کر لیا تھا۔

مَیں اس کھٹیا پر اکیلی سوتی تھی۔

وہ باہر فٹ پاتھ پر اکیلا سوتا تھا۔

اس طرح تین ہفتے بیت گئے۔

میری پڑوس میں دو تین عورتوں سے دوستی ہو گئی۔ مَیں نے انھیں بتایا کہ میرے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا اور مَیں بمبئی میں نوکری ڈھونڈنے آئی تھی۔ یہاں آ کر بندو سقّے سے مُلاقات ہو گئی تھی۔ جس نے اپنی جھونپڑی میں پناہ دی تھی۔ جھُوٹ بولنے کی مجھے عادت ہو گئی تھی۔

پھر ایک دن اُسے آنے میں دیر ہوئی تو میں نے سوچا کہ "آج اُس سے کہوں گی کہ تم یہ کام چھوڑ دو۔"

وہ کہے گا "روزی کمانے کا ایک ہی ذریعہ آتا ہے مجھے۔"

مَیں کہوں گی "مجھے بھی روزی کمانے کا ایک ہی ذریعہ آتا ہے۔ مگر مَیں چھوڑنے کو تیار ہوں۔"

پھر وہ کہے گا "قاضی جی کو بُلا لاؤں۔"

مگر وہ اس رات نہ آیا۔

اگلے دن نہ آیا۔

تیسرے دن نہ آیا۔

مَیں نے پڑوسی عورتوں سے کہا۔ انھوں نے اپنے مردوں سے کہا۔ انھوں نے کہا وہ معلوم کریں گے۔ اُس آدمی سے پوچھیں گے جس کے ساتھ وہ کام کرتا ہے۔

رات کو ایک آدمی اُن میں سے آیا اور کہنے لگا، "بندو تو جیل میں ہے۔"

"جیل میں! کیوں کیا کیا اُس نے؟"

"ریت میں دفن ہونا خودکشی کے برابر ہے۔ سپاہی کو ہفتہ نہیں کھلایا اس لیے وہ آتم ہتیا کے جُرم میں پکڑ لے گیا۔ دوسرا آدمی بھاگ گیا۔ اب بندو جیل میں ہے۔ ضمانت پر ہی باہر آ سکتا ہے۔"

"کتنی ضمانت دینی ہوگی؟"

"دو ہزار روپے۔" اُس آدمی نے کہا جیسے دو لاکھ روپے ہوں۔ مگر مَیں نے سوچا۔ اس سے کہیں زیادہ تو میں نے بچا کر رکھے ہیں۔ شاید پانچ چھ ہزار تو ہوں گے۔ مگر وہ تو پیڈر روڈ والے فلیٹ میں ہیں (ہماری جائے رہایش بدلتی رہتی تھی)

میں اُسی شام کو پیڈر روڈ والے فلیٹ میں پہنچی۔

مجھے دیکھتے ہی للیتا کماری آگ بگولہ ہو گئی۔

"مَیں تو سمجھی تھی تو مر گئی یا کوئی بھگا کر لے گیا تجھے۔"

مَیں نے آواز کو قابو میں کرتے ہوئے کہا، "مَیں جا رہی ہوں۔ اپنا روپیا لینے آئی ہوں۔"

یہ کہہ کر مَیں اندر اپنے کمرے میں گئی اور اپنا سُوٹ کیس کھول کر روپے اور اپنا زیور نکالا۔ یہ کر رہی تھی کہ اچانک میں نے دیکھا کہ ایک مُسٹنڈا پیچھے کھڑا ہے ہاتھوں پر لمبے لمبے کالے ربڑ کے دستانے چڑھائے ہوئے ہاتھ میں ایک بوتل ہے جس میں مجھے معلوم تھا تیزاب رہتا ہے۔

"کیا کر رہی ہے حرام زادی؟"

چھ سال کے بعد آج نہ جانے کہاں سے مجھ میں ہمت آ گئی۔ مَیں بولی، "اپنا روپیا اور زیور لے جا رہی ہوں اور دیکھتی ہوں، کون مجھے روکتا ہے؟"

اُس بدمعاش نے اپنے سڑے ہوئے دانتوں کی نمایش کرتے ہوئے کہا، "تو جاؤ میری جان۔"

اور جب مَیں اُس کے پاس سے گزرنے لگی تو اُس نے میرے مُنہ پر تیزاب کا وار کیا۔

جانتی تھی تیزاب کا اثر کیا ہوگا۔ مَیں دو ایک عورتوں کو دیکھ چکی تھی جو اپنا گلا سڑا چہرہ لیے اپنی زندگی کے آخری دن اُسی چکلے میں گزار رہی تھیں کیونکہ کہیں اور وہ اپنا مُنہ دِکھانے کے قابل نہیں رہ گئی تھیں، مگ

میں تو مرنے کے لیے ہی تیار تھی کیوں نہ اس ظالم کو بھی ساتھ لیتی جاؤں۔ میں نے اپنے چہرے کی ناقابلِ برداشت اذیت کے باوجود اُس کے ہاتھ سے بوتل چھین کر اُس کے سر پر دے ماری۔ بوتل ٹوٹ گئی اور آدھا تیزاب جو اس میں تھا وہ اس آدمی کے چہرے پر گر پڑا۔ ایک غضب کی چیخ اس کے مُنہ سے نکلی اور اس چیخ کا نکلنا تھا کہ اُس کے کُھلے ہوئے مُنہ میں بھی تیزاب گر گیا اور وہ آدمی پھر نہ چیخ سکا۔

میرا مُنہ جل رہا تھا۔ پُھک رہا تھا۔ مگر وہ روپیا اور زیور اب بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ اُسے لے کر میں باہر آئی تو دیکھا کہ پولیس کی ریڈ ہوئی ہے للیتا کماری بڑے غصے سے صوفے پر بیٹھی پولیس انسپکٹر سے بات کر رہی تھی۔ "انسپکٹر صاحب میری تو ڈانس کلاس کی ابھی چھٹی ہے۔ اس لیے لڑکیاں اپنے اپنے گھر جا رہی ہیں ۔۔۔۔۔ آپ کو کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔۔۔ کیا منگاؤں آپ کے لیے۔۔۔۔ ٹھنڈا یا گرم۔۔۔۔؟

"انسپکٹر صاحب"۔

اب میں اُن کے سامنے کھڑی تھی اور تیزاب میرے مُنہ پر بہہ رہا تھا اور میرے گوشت کے لوتھڑے لٹک رہے تھے۔ "اس سے پہلے کہ میں بے ہوش ہو جاؤں۔۔۔۔۔ یا شاید مر جاؤں۔ میں ایک بیان دینا چاہتی ہوں"۔

بس حضور یہی سب کہا تھا اس بیان میں میں نے۔ میرا چہرہ جس پر پٹیاں بندھی ہیں۔ اب اس قابل نہیں ہے کہ آپ دیکھیں لیکن ایک زمانہ تھا لوگ اس چہرے کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے۔ بس مجھے یہی کہنا ہے آپ سے۔۔۔۔۔ اب اجازت دیجیے۔

بندو میرا انتظار کر رہا ہے۔

وہی ایک آدمی ہے جو انسان کا چہرہ نہیں دیکھتا اُس چہرے کے پیچھے جو رُوح ہے اُس کو دیکھتا ہے اور اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ مجھے اس کے پاس جانا ہے کیونکہ قاضی صاحب ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔

دیوانِ حالی

مولانا حالی کے دیوان کی یہ اشاعت ان لوگوں کے لیے ایک نئی بشارت کا حکم رکھتی ہے جو نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، مگر کلاسکی رنگِ تغزل کے مارے ہوئے ہیں، اور آج بھی، یعنی سائنس اور ٹکنالوجی کے اس عافیت آشوب زمانے میں بھی غزلیہ شاعری کو حصولِ مسرت کا اور جمالیاتی احساس کی تسکین کا بے مثال وسیلہ سمجھتے ہیں۔

مولانا حالی کا یہ دیوان ایک اور اعتبار سے بھی ہماری توجہ کا طلب گار ہے۔ اس مجموعے میں رنگِ جدید کی ترجمان جو غزلیں ہیں، ان کی سطحیت اور بے رنگی اس پر دلالت کرتی ہے کہ غزلیہ شاعری کو جب سماجی افادیت اور قومی اصلاح کے مضامین سے گراں بار کیا جائے گا اور اسے وعظ و پند کا ترجمان بنایا جائے گا، تو یہ مقاصد خواہ حاصل ہوں یا نہ ہوں، غزل اُس لطافت اور نفاست سے محروم ہو جائے گی جو اُس کی امتیازی صفت رہی ہے۔ اُس میں نہ تہ داری ہوگی نہ تاثیر۔

مولانا حالی کے اِس دیوان میں غزلوں کے ساتھ ساتھ کچھ اور اصنافِ سخن بھی ہیں، مگر ان کی حیثیت ضمنی ہے، اصل حیثیت غزلوں کی ہے، اور یوں صحیح معنی میں اس کو غزلوں کا مجموعہ کہنا چاہیے۔

اِس دیوان میں مرثیۂ غالب بھی شامل ہے اور یہ واقعہ ہے کہ شخصی مرثیوں میں یہ بے مثال اور منفرد مرثیہ ہے۔ حالی نے گویا کاغذ پر کلیجا نکال کر رکھ دیا ہے۔ اُن کی طبیعت کا گداز اس کے ہر شعر میں سما گیا ہے۔

مصنّف : مولانا الطاف حسین حالی
مقدمہ : رشید حسن خاں
صفحات : ۲۳۲
قیمت : ۲۴ روپے

سوانحِ دہلی

بہادر شاہ ظفر کے پہلے ولی عہد ان کے صاحب زادے محمد دارا بخت میراں شاہ تھے۔ ظفر کی تخت نشینی کے سات آٹھ سال بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ محمد دارا بخت کے سب سے بڑے صاحب زادے مرزا احمد اختر تھے۔ جو اس کتاب کے مصنف ہیں۔ کتاب کی تصنیف کے وقت وہ اتر پردیش کے ضلع مظفر نگر کے شہر کیرانے میں مقیم تھے۔ اور آج تک اس خاندان کے لوگ وہاں موجود ہیں۔

"سوانحِ دہلی" میں اختصار کے ساتھ دہلی کے تاریخی حالات بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب سے پہلے اس موضوع پر دو اہم کتابیں سنگی بیگ کی "سیر المنازل" اور سید احمد خاں کی "آثار الصنادید" لکھی جا چکی تھیں لیکن اس کتاب کی اہمیت یہ ہے کہ مغل خاندان کے ایک فرد نے یہ کتاب لکھی ہے۔ اس میں کچھ ایسے واقعات اور حقائق بیان کیے گئے ہیں، جو لوگوں کی نظر سے اب تک نہیں گزرے۔ بعض ایسی معلومات بھی فراہم کی گئی ہیں، جن کے مآخذ تک ہماری رسائی نہیں تھی۔

مرزا الٰہی بخش نے بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کرانے میں انگریزوں کی مدد کی تھی، ان کے بارے میں مرزا احمد اختر نے معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"بعد غدر شاہزادہ ہدایت افزا مرزا الٰہی بخش مغفور کے دو ہزار روپے ماہوار نسلاً بعد نسلٍ مقرر فرمائے۔ اُن کی جاگیر و املاک برقرار رکھی۔ اعزاز قدیم مرعی رکھا۔ ان کے نقصان کے بدلے میں لاکھوں دیے۔ ان کی اولاد کی بدستور پرورش اور مراعات چلی آتی ہے۔"

مصنّف : شاہزادہ مرزا احمد اختر گورگانی
مرتّب : مرغوب عابدی
صفحات : ۶۴ قیمت : ۱۷ روپے

اُردو خبر نامہ

بیگم صالحہ عابد حسین کے ساتھ ایک شام

بیگم صالحہ عابد حسین اُردو کی مشہور و ممتاز ادیبہ ہیں۔ وہ ۱۸ر اگست ۱۹۱۳ء کو خواجہ غلام الثقلین کے گھر حالی کی پوتی کے بطن سے پانی پت میں پیدا ہوئیں اور شعور کی آنکھ کھولی تو اپنے خاندان میں ہر طرف علم و ادب کا ماحول نظر آیا۔ ۷ر اپریل ۱۹۳۳ء کو وہ ڈاکٹر سید عابد حسین کے ساتھ بیاہی گئیں جن کی رفاقت میں ان کا وہ علمی ادبی ذوق اور پروان چڑھا جو انھیں وراثت میں ملا تھا۔

بیگم صالحہ عابد حسین نے تقریباً پچاس کتابیں لکھی ہیں جن میں نو ناول، پانچ افسانوی مجموعے، آٹھ نو تنقیدی کتابیں، متعدد سوانح عمریاں اور بچوں کی دس بارہ کتابیں شامل ہیں وہ متعدد اہم کتابوں کی مرتب اور مولف ہیں۔

بیگم صالحہ عابد حسین کے ادبی کام کی اہمیت کا اعتراف اُتر پردیش اُردو اکادمی، بہار اُردو اکادمی، غالب انسٹی ٹیوٹ اور کئی دیگر اُردو اداروں نے ان کی کتابوں پر انعام و اعزاز دے کر کیا ہے جن میں کنیڈا اور شکاگو جیسے دُور دراز مقامات کے ادارے بھی شامل ہیں۔ وہ بہت سے علمی ادبی اداروں اور انجمنوں کی رکن رہی ہیں مثلاً ترقی اُردو بورڈ، انجمن ترقی اُردو (ہند)، اُردو اکادمی، دہلی اور اُردو اکادمی ہریانہ، یادگار انیس کمیٹی، سیدین میموریل ٹرسٹ، عابد حسین میموریل ٹرسٹ اور گجرال کمیٹی وغیرہ حکومتِ ہند نے انھیں پدم شری کے اعزاز سے بھی نوازا ہے۔

۱۹ر اکتوبر ۸۷ء کو اُردو اکادمی، دہلی کے زیرِ اہتمام غالب اکیڈمی کے آڈیٹوریم میں "بیگم صالحہ عابد حسین کے ساتھ ایک شام" منائی گئی۔ اس ادبی تقریب کی صدارت اقلیتی کمیشن کے چیئرمین جسٹس ایم۔ ایچ۔ بیگ نے کی۔ ممبر پارلیمنٹ جناب عزیز قریشی اور کرنل بشیر حسین زیدی مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ ڈاکٹر صغرا مہدی، بیگم ذکیہ ظہیر، جناب عبداللطیف اعظمی اور جناب ظفر پیامی نے بیگم صاحبہ کی شخصیت، سیرت اور ان کے ادبی کارناموں پر اظہارِ خیال کیا۔

اکادمی کی کلچرل اور سیمینار کمیٹی کے چیئرمین، جس کے زیرِ اہتمام یہ جلسہ ہوا، پروفیسر گوپی چند نارنگ نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں مختصر مگر جامع الفاظ میں بیگم صالحہ عابد حسین کی ذاتِ باصفات، ان کی علمی ادبی فتوحات اور سماجی خدمات کا تعارف بھی پیش کیا اور تجزیہ بھی۔ انھوں نے ان کے خاندانی پس منظر کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ

اردو اکادمی، دہلی
کی جانب سے
بیگم صالحہ عابد حسین کے ساتھ ایک شام

دائیں سے: کرنل بشیر حسین زیدی، محترمہ صالحہ عابد حسین، جسٹس ایم۔ ایچ۔ بیگ، جناب عزیز قریشی اور پروفیسر گوپی چند نارنگ۔
(تصویر: سید فدا علی)

مذہب و ملّت سے اُوپر اٹھ کر بے لوث ادبی، علمی اور سماجی کام اس خاندان کا امتیاز رہا ہے۔ اکادمی کے سکریٹری سید شریف الحسن نقوی نے جلسے کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے بیگم صاحبہ کو خراجِ تحسین پیش کیا اور کہا کہ ان کی تصنیفات میں موضوعات کا جو تنوع ہے' اس سے ادب کا ایک عام طالبِ علم بھی ان کے علم اور مطالعے کی ہمہ گیری اور ان کے ذوق کی وسعت کا بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے۔ اُردو اکادمی کے لیے یہ فخر و مسرّت کا موقع ہے کہ اس کی طرف سے "بیگم صالحہ عابد حسین کے ساتھ ایک شام" منائی جا رہی ہے۔

جلاوطن سوویت شاعر کو نوبل انعام

اسٹاک ہوم کی نوبل انعام کمیٹی نے اعلان کیا ہے کہ سوویت شاعر جوزف براڈسکی کو جو اس وقت امریکا میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں ادب کے لیے نوبل انعام دیا گیا ہے۔ ۴۷ سالہ براڈسکی ۱۹۷۲ء میں سوویت یونین کو خیر باد کہنے پر مجبور ہوئے تھے۔

(فیصل جدید، دہلی)

خود نوشت سوانح عمریوں کی اہمیت

خود نوشت سوانح عمریاں حالات اور واقعات کو سمجھنے کے لیے تاریخی و تحقیقی کتابوں سے زیادہ اہم ہیں' لہٰذا طلبا اور عام قارئین کو چاہیے کہ سماجی اور سیاسی تبدیلیوں نیز شخصیتوں کے ذہن اور رجحانات کو سمجھنے کے لیے ' آپ بیتیوں کا مطالعہ کریں۔ شعبۂ اُردو' بمبئی یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے پروگرام میں مشہور مورّخ ڈاکٹر ستو مادھو راؤ پگڑی نے اُردو میں خود نوشت سوانح عمریوں پر تقریر کرتے ہوئے مذکورہ خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر پگڑی نے انگریزی، مراٹھی اور اُردو کی مشہور آپ بیتیوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ سماجی زندگی اور عصری رجحانات کو سمجھنے کے لیے آپ بیتیاں کس طرح مفید ثابت ہوتی ہیں جو مسائل اور حالات دورانِ تحقیق سرکاری ریکارڈ سے دستیاب نہیں ہوتے وہ سوانح عمریوں میں مل جاتے ہیں۔

پگڑی صاحب نے دورانِ تقریر غالب کے خطوط کا بھی حوالہ دیا اور کہا کہ اگرچہ ان خطوط میں سوانحی حالات ملتے ہیں مگر یہ خود نوشت حوالے ہیں انھیں خود نوشت سوانح عمری نہیں کہا جا سکتا۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ خود نوشت سوانح عمریوں اور خود نوشت حوالوں- AUTOBIOGRA-PHICAL REFERENES- میں فرق کرنا ضروری ہے۔

ڈاکٹر پگڑی نے اُردو کی خود نوشت سوانح عمریوں پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے سید رضا علی کی "اعمال نامہ" مولانا حسین احمد مدنی کی "نقشِ حیات" احسان دانش کی "جہانِ دانش" صالحہ عابد حسین کی "سلسلۂ روز و شب" جوش کی "یادوں کی برات" اور شیخ عبداللہ کی "آتشِ چنار" کا خاص طور سے ذکر کیا اور کہا کہ احسان دانش کی سوانح عمری نے انھیں بے حد متاثر کیا ہے اس خود نوشت کو پڑھ کر انسان بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔

(پریس ریلیز' شعبۂ اُردو' بمبئی یونیورسٹی)

بیانیہ کی قوت

کانپور میں اُردو کے بزرگ افسانہ نگار ابوالفضل صدیقی کے انتقال پر ایک تعزیتی جلسہ ہوا جس میں شہر کے ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی۔ مولانا قمر اعظمی نے کہا کہ پاکستان میں مقیم ابوالفضل صدیقی کے انتقال کا سانحہ اس لیے ناقابلِ تلافی ہے کہ عصرِ حاضر میں ہم بیانیہ کی قوت سے غافل ہوتے جا رہے ہیں۔ اس پر آشوب دور میں چند ہی ایسے افسانہ نگار ہیں جو بیانیہ کے رمز آشنا نظر آتے ہیں اور جنھوں نے اُردو افسانے کا رشتہ قاری سے پوری طرح استوار رکھا ہے۔ ابوالفضل صدیقی ان معدودے چند افسانہ نگاروں میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔

عشرت ظفر نے کہا کہ ادب میں نئے تجربات کی اہمیت ہے مگر یہ تجربات اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک نئے افسانہ نگار ماضی کی زندہ اور صالح روایات سے پوری طرح واقف نہ ہوں۔ ابوالفضل صدیقی اسی روایت کا ایک روشن استعارہ ہیں اس لیے ان جیسے فنکاروں سے کسبِ فیض کرتے ہوئے ہی ہم تجربات کی منزل سے بخیر و خوبی گزر سکتے ہیں۔ شعیب نظام نے کہا کہ ہمارے نئے افسانہ نگار تجربے کی دھن میں اس بے راہ روی کا شکار ہوئے کہ علامت سازی حسن کے بجائے عیب نظر آنے لگی ہے۔ ابوالفضل صدیقی کے افسانوں میں قاری کردار کے جذبات سے اپنے دل کی دھڑکن کو ہم آہنگ ہوتے ہوئے محسوس کرتا ہے اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ان کے یہاں زبردستی علامت سازی کی کوشش نہیں کی گئی ہے بلکہ علامت فطری طور پر ان کے افسانوں سے برآمد ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

عرفان جعفری نے کہا کہ نئے افسانہ نگاروں کو زبان پر وہ قدرت نہیں' افسانہ نگاری جس کی متقاضی ہوتی ہے۔ ابوالفضل صدیقی کی افسانہ نگاری میں زبان کا استعمال کردار کی مناسبت سے

ہد فطری ہوتا ہے۔ اور وہ تصنع اور غیر ضروری
ارت آرائی سے افسانے کا دامن آلودہ نہیں کرتے۔
(قومی آواز، نئی دہلی)

مدھیہ پردیش کے اسکولوں میں اُردو دوسری اختیاری زبان

حکومت مدھیہ پردیش کے محکمۂ تعلیمات
۔ ایک سرکلر کے مطابق اب مڈل اسکولوں میں اُردو
دوسرے مضمون کی حیثیت سے پڑھانے کی سہولت
لور کر لی گئی ہے۔ اُردو پرائمری اسکولوں میں بھی
۔ داخلے میں آسانی ہوگی اور اُردو والوں کا یہ خدشہ
رہو جائے گا کہ اُردو پرائمری کے بچے آگے اُردو
.ین سکتے تو پھر اُردو پرائمری میں پڑھانے سے
یا فائدہ۔

اس سلسلے میں انجمن ترقی اُردو بلاسپور نے
ے سیکریٹری مقصود احمد مکّی اور صدر ایم۔ ایم۔
ہوترا کے دستخطوں سے مندرجۂ ذیل سرکلر جاری
ا ہے جس کے ساتھ حکومت کا سرکلر بھی شامل
ے :

نہایت مسرّت کے ساتھ اطلاع دی جارہی
۔ کہ اُردو والوں کی متواتر جدو جہد کے بعد حکومت
ھیہ پردیش (ایجوکیشنل ڈپارٹمنٹ) نے مندرجۂ ذیل
م نامے کے ذریعے اسکولوں میں اُردو پڑھائے جانے
سہولت منظور کرلی ہے۔ ضروری ہے کہ بچوں کے
رپرست صاحبان اسکول کے ذمّے داروں سے
بطہ قائم کریں اور اُردو تعلیم جاری کرانے کی کوشش
یں۔ آپ سے مکمّل تعاون کی درخواست ہے۔

محکمہ اسکولی تعلیم
ہرڈی ۷ ۸/۲-۲۰/۱۷/۶/۱۷
و پال مورخہ ۲۵ر جون ۸۷ء

بخدمت ڈائرکٹر تعلیمات عامہ
مدھیہ پردیش بھوپال
مضمون : مدھیہ پردیش میں اقلیتوں کی فلاح کے
لیے وزیر اعظم کا بیس نکاتی پروگرام
بحوالہ : راجیہ شکھشا انوسندھان اور پرشکشن
پریشد کی تحریر۔ نمبر پاٹھیہ کرم ۸۷/۱۶۵۴
مورخہ ۸۷/۳/۲۶

صوبائی حکومت، مدھیہ پردیش کے اسکولوں
میں سہ لسانی فارمولے کے تحت اقلیتی فرقے کے طلبہ
کو پہلی زبان ہندی اور دوسری زبان اُردو اور تیسری
زبان انگریزی لینے کی سہولت اور صوبائی لوک شکشن
پریشد کے ذریعے نصاب میں اس متبادل کو شامل
کرنے کی منظوری دیتی ہے۔

صحیح
مدھیہ پردیش کے گورنر کے نام اور حکم سے
دستخط
(جی۔ ایس۔ مشرا)
انڈر سکریٹری
حکومت مدھیہ پردیش، محکمہ اسکولی تعلیمات۔
(اُردو ایکشن، بھوپال)

اُردو کتابوں اور رسالوں کی نمائش

انجمن "ہم زبان آگرہ" اور سرکار بُک ڈپو
آگرہ نے مل کر حضرت ابوالعلار جہاں کے سالانہ
عُرس کے موقعے پر اُردو کتابوں اور رسالوں کی نمائش
کا اہتمام کیا جسے ہزاروں افراد نے دیکھا اور اُردو
کتابوں اور رسالوں کی تعداد، ان کے موضوعاتی تنوع
اعلیٰ معیار اور خوش نما گیٹ اپ کو دیکھ کر مسرّت
آمیز حیرت کا اظہار کیا۔ درگاہ حضرت ابُو العلار
کے سجّادہ نشین جناب سیّد محمد عارف نے
نمائش کو "کتاب کو ہماری زندگی میں اُس کا
جائز مقام دلانے کی کوشش" اور پروفیسر ایم۔ اے۔
شاہ (سینٹ جانس کالج) نے "ایک بڑے کام کا
آغاز" قرار دیا۔ "ہم زبان آگرہ" کی جانب سے
ایک گوشے میں اُردو مخطوطات کے ایسے نمونے بھی
رکھّے گئے تھے جو "برائے فروخت نہیں" تھے اور جن میں
سے زیادہ تر اب نایاب ہیں "تاثرات بُک" میں ناظرین نے
جو تاثرات ظاہر کیے ہیں اُن کا مفہوم یہ ہے کہ فروغ اُردو
کے لیے یہ طریقہ مشاعروں وغیرہ سے زیادہ کارگر ہے۔
اس کا مقصد یہ تھا کہ ناظرین کو یہ بتایا جائے کہ
اُردو کا دائرۂ اشاعت آج صرف ادبی ہی نہیں بلکہ
علمی بھی ہے۔

(خالد پرویز شمسی، سیکریٹری)

غزلوں کی کیسٹ کا اجرا

کتابوں کے اجرا کی رسم اُردو میں خاصی راسخ
ہو چکی ہے۔ اب کیسٹوں کے اجرا کا آغاز ہوا ہے۔
دِلّی کے مشہور غزل گو شاعر شجاع خاور کی سات
غزلیں دِلّی گھرانے کے گائک صلاح الدّین احمد نے
ایک ہی غزل کیسٹ میں صدا بند کی ہیں یہ کیسٹ
دِلّی کی میوزک کمپنی گولڈن میلوڈیز نے تیّار
کی ہے۔

"ایک شاعر ایک آواز" نامی اس غزل
کیسٹ کے اجرا پر کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر
پرمجیت سنگھ اور غزل آباد سوسائٹی کے جنرل
سیکریٹری سراج درپن کے اشتراک سے ایک
پُر لطف شام کا اہتمام کیا گیا۔ نئی دِلّی کے انڈیا
انٹرنیشنل سینٹر میں ۸ر نومبر ۸۷ء کی شام چھ بجے
اس تقریب کا آغاز ہوا۔ جنابِ خشونت سنگھ اس
تقریب میں بحیثیت مہمانِ خصوصی شریک تھے۔
ابتدا میں ناظمِ جلسہ رئیس عزیز صاحب

نے کیسٹ میں سے کچھ اشعار سامعین کے سامنے چلا کر پیش کیے۔

اس کے بعد صلاح الدین احمد اور ان کی رفیق گلوکارہ مدھو میتا بوس نے علیحدہ علیحدہ شجاع خاور کی چند غزلیں پیش کیں۔ سامعین میں دِلّی کی متعدّد اہم شخصیتیں موجود تھیں۔

غزل گائکی اور جاتے کے بعد شاعر اور گلوکار نے ایک پریس کانفرنس سے مختصر خطاب کیا۔ شجاع خاور نے اپنی اس بات کو دہرایا کہ ان کی غزلیں ــــ اسلوب کے لحاظ سے منفرد ہوتے ہوتے بھی گائے جانے کے لیے مناسب نہیں ہیں کیوں کہ گائکی میں آج کل سطحی شاعری ہی عام طور سے مقبول ہوتی ہے اور وہ سطحی شعر لکھنے پر مہینوں تک خاموش رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس کیسٹ میں اپنی غزلوں کو شش کر وہ اپنی غزلوں کو بھی گائکی کے لیے اب اتنا غیر مناسب نہیں سمجھتے۔

(پریس ریلیز، غزل آباد کلچرل سوسائٹی، دِلّی)

دہلی کی آخری شمع

سیّد وزیر حسن دہلوی نے دلّی کی ٹکسالی زبان میں دلّی کے لال قلعے اور اس کے مکینوں کے شب و روز کی جھلکیاں پیش کی ہیں۔ یہ کتاب آخری مغل دور کی معاشرتی فضا کا منہ بولتا مرقع ہے۔ مہذب انسانوں کی طرح ہر تہذیبی شہر کا بھی ایک مزاجِ زندگی بن جاتا ہے جو صدیوں کے تمدنی شعور اور ذہنی رویّوں کی دین ہوتا ہے۔ شاہ جہاں آباد جس قطعۂ زمین پر بسایا گیا وہ اس سرزمین کا ایک حصّہ تھا جس پر ہندوستان کے وسطی عہد کی تاریخ میں جنم لینے والے تہذیبی انقلاب نے اپنی نمو پذیری کے بہت سے مراحل طے کیے تھے۔ عہدِ وسطیٰ کی دہلی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے معاشرے کے مختلف طبقات کو یکجا کرکے اخوت وسیع النظری باہمی میل ملاپ اور فطری ارتقا کی راہیں ہموار کیں۔

قاعدہ ہے کہ جب چراغ بجھنے کو ہوتا ہے تو لو بھڑکتی ہے اسی طرح سلطنت تیموریہ کا چراغ جب گل ہونے کو ہوا تو اس نے وہ روشنی دکھائی اور ایسا سنبھالا لیا جس کی مثال مشکل سے تاریخ میں ملے گی سلطنت دم توڑ رہی تھی لیکن تہذیبی شعور ابھی مردہ نہ ہوا تھا یہاں خانقاہیں بھی تھیں اور شراب خانے بھی، مدرسے بھی تھے اور قمار بازی کے اڈے بھی، لوگ بڑی عقیدت کے ساتھ خانقاہوں اور مزارات پر حاضر ہوتے تھے پھر اسی جوش اور ولولے کے ساتھ طوائفوں کی محفلوں میں شرکت کرتے تھے۔ ان کی رندی اور مذہبیت ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ نہ رندی مذہبیت پر غالب آئی تھی نہ مذہبیت رندی پر۔

جس دلّی کا یہ کتاب قصّہ سناتی ہے وہ صرف ایک شہر ہی نہ تھی، ایک تہذیب کا نشان، ایک تمدن کا گہوارہ علم و ادب کا مرکز اور ایک ایسی گزرگاہِ فکر تھی جہاں علم و فن، تعلیم و تربیت، اخلاق و مذہب، حکومت و سیاست کے سانچے صدیوں تک ڈھلے تھے۔ سید ضمیر حسن دہلوی نے اپنے طویل مقدمے کے ساتھ اس کتاب کو مرتب کیا ہے۔

مصنّف : سید وزیر حسن دہلوی
مرتّب : سید ضمیر حسن دہلوی
صفحات ۷۴
قیمت : ۱۷ روپے

دِلّی کا آخری دیدار

"دلّی کا یادگار مشاعرہ عرف دہلی کی آخری شمع"، مرزا فرحت اللہ بیگ (مرحوم) کے ادبی کارناموں میں سے ایک ہے۔ مرزا صاحب کا شمار ان لوگوں میں ہے جنھوں نے ۱۸۵۷ء کے انقلاب دہلی کے بعد انقلاب سے پہلے کی آخری جھلک سب کو کچھ اس انداز سے دکھائی کہ ایک جیتی جاگتی محفل آراستہ ہو گئی۔

"دہلی کی آخری شمع" کے پیش لفظ میں مرزا فرحت اللہ بیگ لکھتے ہیں کہ "مجھے بچپن سے شعرائے اردو کے حالات پڑھنے اور سننے کا شوق رہا مگر کبھی کوئی ایسی تحریک نہیں ہوئی جو ان کے حالات کو ایک جگہ جمع کرنے کا خیال پیدا کرتی ... اتفاق دیکھیے کہ پرانے قدیم کاغذات میں مجھے حکیم مومن خاں دہلوی کی ایک قلمی تصویر ملی۔ قلمی تصویر کا ملنا تھا کہ یہ خیال پیدا ہوا تو بھی محمد حسین آزاد مرحوم کے نیرنگِ خیال کی محفلِ شعرا کی طرح ایک مشاعرہ قائم کر، مگر ان لوگوں کے کلام پر تنقید کرنے کے بجائے صرف ان کی چلتی پھرتی تصویریں دکھا۔ خیال میں رفتہ رفتہ پختگی ہوئی اور اس پختگی خیال نے ایک مشاعرے کا خاکہ پیش نظر کر دیا۔" آزاد نے "نیرنگ خیال" میں تاریخ کے اکثر مشاہیر کو لا جمع کیا ہے۔ چنانچہ اس دربار کی رونق نے مرزا فرحت اللہ بیگ کو اکسایا۔ دوسری طرف مولوی کریم الدین کے مشہور تذکرے "طبقات الشعرائے ہند" نے ایک مشاعرے کا پتہ دیا۔ چنانچہ ان دونوں تحریروں کی روشنی میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے اس ذہنی مشاعرے کی بنیاد رکھی۔ مولوی کریم الدین کا تذکرہ طبقات الشعرائے ہند ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اور دہلی کی آخری شمع پہلی مرتبہ ۱۹۲۸ء میں کتابی شکل میں شائع ہوئی۔

دہلی کے اس یادگار مشاعرے کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ قلعۂ معلّی اور اس کے باہر مشاعروں کے کیا آداب تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ اس مشاعرے کے سامع بھی ہیں اور راوی بھی۔ کلام اور شاعر کے پڑھنے کے انداز پر ان کے دلچسپ تبصرے اس بات کی دلیل ہیں کہ اگر وہ سنجیدگی سے تنقید کی طرف توجہ کرتے تو اردو ادب کو کیا کچھ دے جاتے۔ دلّی کے اس یادگار مشاعرے کا نیا اڈیشن ڈاکٹر صلاح الدین اپنے جامع مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ بعض ضروری حواشی اور فرہنگ کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔

مصنّف : مرزا فرحت اللہ بیگ
مرتّب : ڈاکٹر صلاح الدین
قیمت : ۲۲ روپے
صفحات : ۱۴۷

ہم طرح اشعار

گذشتہ ماہ ہم طرح اشعار کے لیے جو مصرع دیا گیا تھا وہ جگر مرادآبادی کا تھا لیکن اس زمین میں سب سے مشہور غزل مومن کی ہے چنانچہ زیادہ تر قارئین نے مومن کے اشعار ہی ارسال کیے اور بعض اشعار کی تکرار بھی ہوئی۔ موصول شدہ اشعار میں سے منتخب شعر یہاں دیے جا رہے ہیں۔ پہلے، دوسرے، تیسرے، چوتھے اور پانچویں نمبر پر درج اشعار بھیجنے والوں کو اکادمی کی طرف سے "گلدستہ" کی ایک ایک کاپی ارسال کی جا رہی ہے:

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی
پھر وہی پاؤں وہی خارِ مغیلاں ہوں گے
(مومن خاں مومن دہلوی)
مرسلہ: وقار احمد فخری، پٹنہ

تابِ نظارہ نہیں، آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے
(مومن خاں مومن)
مرسلہ: صائمہ نسرین، رامپور

گھر تو گھر، گھر کا تصور بھی نہیں ہے صفدر
اب وطن میں کبھی جائیں گے تو مہماں ہوں گے
(صفدر مرزا پوری)
مرسلہ: محمد رضی الدین معظم، حیدرآباد

ہیں وہ دشمن کے تو ہیں عشرتِ دشمن بن کر
میرے ہوں گے تو مرا حالِ پریشاں ہوں گے
(بسمل سعیدی)
مرسلہ: محمود علی خاں، جے پور

رشتۂ اُنس و محبت میں بندھے ہیں ہم سب
وہ بکھر جائیں گے اس سے جو گریزاں ہوں گے
(وِدّیا سکینہ)
مرسلہ: رادھے شیام پردھان، کانپور

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے کئی بے جاں ہوں گے
(مومن)
مرسلہ: سید اقبال احمد حسنی، گیا

ہم نکالیں گے سن اے موجِ ہوا بل تیرے
اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے
(مومن)
مرسلہ: تحسین احمد خاں، بدایوں

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

مومن کا یہ مقطع حضرات فرحان غنی، محمد کامران خاں، کلیم الدین احمد، آصف مظہر، عبدالاول نعمانی، سید غفران میاں، ساجدین اور دیگر کئی حضرات نے بھیجا۔

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہوں گے

مومن کا یہ شعر حضرات انوار ادیب، محمد عمران خاں، سید شبیر شبنم کے علاوہ کچھ اور حضرات نے بھی ارسال کیا۔

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے

مومن کا یہ شعر حضرات میر شفقت علی وفا، چودھری جسیم، محمد علیم الرحمٰن، محمد عبدالعلیم نے بھیجا۔

میں چھپاتا ترے اسرارِ محبت ظالم!
کیا خبر تھی مری رگ رگ سے نمایاں ہوں گے
(جگر مرادآبادی)
مرسلہ: شفیق رائے پوری، جگدل پور

عشق کی منزلِ اوّل پہ ٹھہرنے والو
اس سے آگے بھی کئی دشت و بیاباں ہوں گے
(حفیظ ہوشیارپوری)
مرسلہ: علیم الدین احمد ابن صفی، ٹٹلاگڈھ

حرف پیراہنی میں طاق ہیں اس شہر کے لوگ
یہ کسی حال میں اے دوست! نہ عریاں ہوں گے
(روشن لال روشن بنارسی)
مرسلہ: ایم۔ افسر آرٹسٹ، وارانسی

شکوۂ جور و ستم اے دلِ رنجور نہ کر
درد جب حد سے گذر جائیں گے درماں ہوں گے
(شاہد ساگری) مرسلہ: سید انور حسین، بھوپال

بزم سے ان کی یہی سوچ کے میں دُور رہا
آبرو جائے گی میری، وہ پشیماں ہوں گے
(رشید عارف) مرسلہ: رشید عارف، پٹنہ

آج تک وقت نے اِک حال میں رکھا کس کو
جو پریشاں نہیں ہیں وہ پریشاں ہوں گے
(اعجاز بن ضیا)
مرسلہ: سرفراز احمد اعجازی، پٹنہ

میں ہوں تاریخ کے ماتھے پہ الم ناک شکن
مجھ سے مل کر مرے احباب پشیماں ہوں گے
(بدر عثمانی) مرسلہ: اسلام الدین اسلام، دہلی

دن بدل جائیں گے، آئے گا لہو کا موسم
خاک کے ذرّے بھی طوفان بداماں ہوں گے
(محفوظ کیفی) مرسلہ: پرویز اختر پرویز، آسنسول

روشنی پائیں گے یہ بات تو سب جانتے تھے
کس کو معلوم تھا ہم شعلہ بہ داماں ہوں گے
(احترام اسلام)
مرسلہ: نسیمہ فاطمہ، الہ آباد

ساز چھیڑے گی کلی پھول غزل خواں ہوں گے
کل یہی گیت مرے جانِ گلستاں ہوں گے
(تصدیق اشہر)
مرسلہ: محمد شکیل الرّحمٰن، بھاگلپور

حشر کے باب میں باتیں تو بہت ہیں لیکن
ہم کو صرف اتنی خبر ہے وہاں انساں ہوں گے
(عبدالحمید عدمؔ)
مرسلہ: محمد قیصر امام، بھاگلپور

آئندہ کے لیے اس مصرعے پر اپنی پسند کے اشعار، شاعر کے نام کے ساتھ ہمیں اس طرح بھجوائیں کہ آپ کا خط ہمیں ۱۲ر دسمبر تک ضرور مل جائے۔ ایک صاحب/ صاحبہ ایک ہی شعر بھیجنے کی زحمت کریں۔ مصرعہ:

اگر آسانیاں ہوں زندگی دُشوار ہوجائے

قافیہ ردیف

——— (ادارہ)

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے موصولہ عنوانات

گزشتہ ماہ "ایوانِ اردو، دہلی" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی، قارئین کی طرف سے اس کے بہت سے شعری اور نثری عنوان آئے۔ ان میں سے چند یہ ہیں:۔

شعری عنوانات

عذاب یہ بھی کسی اور پر نہیں آیا
کہ ایک عمر چلے اور گھر نہیں آیا
(افتخار عارف)۔ مرسلہ: چودھری جسیم، بدایوں

کارواں کے سب مسافر سوچتے ہیں شام سے
صبحدم کس سمت، میرِ کارواں لے جائے گا
(محسن احسان)۔ مرسلہ: کلیم الدّین احمد، نلگنڈہ

یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائیں گے
(بہادر شاہ ظفر)۔ مرسلہ: محمد نعیم الرّحمٰن، ناگپور

اپنے عشرت کدۂ ناز سے باہر بھی تو دیکھ
غمزدوں نے ترے کیا جشن منا رکھا ہے
(قاسم شبیر نقوی)۔ مرسلہ: فاروق اعظم، گیا

اِک عُمر گزاری ہے غریب الوطنی میں
کیا پوچھو ہو بتلاؤں کہ کیا ہوتا ہے گھر بھی
(حسنی)۔ مرسلہ: نوشاد عالم صدیقی، گیا

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(جسٹس شاہ دین ہمایوں)۔ مرسلہ: ندیم الحق شمسی، رامپور

یہ کس بزم کے ہم نکالے ہوئے ہیں
کہ محرومیوں کے حوالے ہوئے ہیں
(مولانا حسرت موہانی)۔ مرسلہ: میر شفقت علی وفا، فیروز آباد

کارگاہِ ہستی میں، لالہ داغ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت، خونِ گرمِ دہقاں ہے
(غالبؔ)۔ مرسلہ: پرویز اختر پرویز، آسنسول

تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں
آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں
(اقبالؔ)۔ مرسلہ: ایم۔ اے۔ کریمی، آبگلہ۔ گیا

ہر اک موجِ صبا زنجیر سی معلوم ہوتی ہے
فضائے گلشنِ آزاد پہچانی نہیں جاتی
(شمیم کرہانی)۔ مرسلہ: الطاف عزیز دہلوی

نثری عنوانات

"کئی سال پہلے کا وہی دن" (افسانہ، رام لعل)
مرسلہ: محمد شکیل الرّحمٰن، بھاگلپور

"صدائے سکوت" (کیف صدّیقی کی ایک نظم کا عنوان)
مرسلہ: عمران خاں ساکت، بھاگلپور

"جنگل میں منگل" (شمس منیری کی نظم کا عنوان)
مرسلہ: مصباح الدّین طارق، گیا

"زندگی کے موڑ پر" (افسانوی مجموعہ، کرشن چندر)
مرسلہ: ایم۔ انور حسین، کُٹی (مغربی بنگال)

"سُلگتے خیموں کا شہر" (فخر الدّین عارفی کا افسانوی مجموعہ)
مرسلہ: محمد سراج الدّین افضل، گیا

"حسرتِ تعمیر" (اختر اُورینوی کی کتاب)
مرسلہ: جلال اصغر فریدی، مظفرپور

"ایسی بلندی ایسی پستی" (عزیز احمد کا ناول)
مرسلہ: چاند نسرین شاداب، بھاگلپور

"گلدستہ" ان تین قارئین کو بھیجا جارہا ہے: (۱) چودھری جسیم (۲) جناب محمد شکیل الرّحمٰن (۳) جناب کلیم الدّین احمد

آپ کی رائے

"ایوانِ اُردو دہلی" کا نومبر کا شمارہ ملا۔ یہ رسالہ جس تیزی سے دلوں میں جگہ بناتا جارہا ہے، اس کی مثال اس طویل زندگی میں مجھے کبھی پہلے نہیں ملی۔ قارئین کے خطوط بھی میرے خیال کی تائید کرتے ہیں۔

میری نظم "اکیسویں صدی" آپ نے اکتوبر کے شمارے میں شائع کی۔ اس سلسلے میں آپ کا خط آیا تھا اور میں نے رسیدی ٹکٹ لگاکر معاوضہ کی رسید بھیج دی تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ معاوضہ کی رقم بجائے مجھے بھیجنے کے آپ اسے میری جانب سے "ایوانِ اُردو دہلی" کی خریداری کے کھاتے میں جمع کردیں، یعنی مجھے اس محبوب رسالے کا سالانہ خریدار بننے کا موقع عنایت کریں۔

—— رضا نقوی واہی، پٹنہ

اس میں شک نہیں کہ "ایوانِ اُردو دہلی" منزل بہ منزل شاندار ہوتا جارہا ہے۔ آپ حضرات کی کوشش قابلِ داد و لائقِ ستائش ہے۔ کتابت، طباعت، ترتیب، تہذیب سب اعلیٰ درجے کی ہے۔ آپ نے قیمت کم کرکے بہت ہی اچھا اقدام کیا ہے۔ امید ہے کہ اس کی مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہوگا۔

نومبر کے شمارے میں ایک دو باتیں ایسی نظر آئیں کہ یہ تحسینِ ناشناس بھیجنے کو دل چاہا۔ ڈاکٹر گیان چند نے سوامی رام تیرتھ پر اچھا مضمون لکھا ہے، مگر اقبال پر یہ الزام لگانے کے لیے کہ انھوں نے سوامی جی کا مرثیہ صرف ظاہر داری میں لکھا تھا ورنہ ان کی اصل رائے اچھی نہیں تھی، دونوں بیان ناکافی ہیں، جب تک خود اقبال کا کوئی مستند بیان یا تحریر نہ ہو بیان کو ثقہ سمجھ کر قبول نہیں کیا جاسکتا۔ خود اقبال کے بارے میں لوگ کیا کیا کہنے لگے ہیں اس سے گیان چند صاحب بے خبر نہ ہوں گے۔

خلیق انجم نے نیلا برج یا سبز برج کے تحت لکھا ہے کہ ابھی تک معلوم نہیں ہوسکا یہ قبر کس کی ہے، مجھے دو باتیں عرض کرنا ہیں: کیا یہ وہی گنبد چینی کار ہے جس کے اشعار سیر المنازل میں نقل ہوئے ہیں؟ میرے علم میں یہ مرزا محمد عابد کا مقبرہ ہے، حوالہ اس وقت میں نہیں دے سکتا، مرزا عابد عہدِ اکبری کا امیر ہے اور عزیز کوکلتاش کے خاندان سے ہی متعلق ہے۔

صفحہ ۴۴ پر پہلا شعر وحید الہ آبادی سے منسوب کیا گیا ہے، یہ حفیظ جونپوری کا ہے اور پہلا مصرع یوں ہے: "بیٹھ جاتا ہوں ......" اس کا مقطع ہے:

پی لو تھوڑی سی کہ ساقی کی رہے بات حفیظ
صاف انکار سے خاطر شکنی ہوتی ہے

صفحہ ۵۴ پر آپ نے لکھا ہے کہ "ابوالفضل صدیقی ۱۹۰۲ء میں چٹا گاؤں کے موضع کھونچا میں پیدا ہوئے۔" اُن کا انتقال ۱۶ ستمبر ۱۹۸۷ء (چہار شنبہ) کو ہوا پاپوش نگر کے قبرستان میں دفن ہوئے، میں تدفین کے وقت اتفاق سے موجود تھا، ان کے بارے میں اخباروں میں جو سوانحی مواد شائع ہوا تھا اس میں کہا گیا تھا کہ وہ ۱۹۰۸ء میں اُتر پردیش کے شہر بدایوں میں پیدا ہوئے اور یہی صحیح ہے۔

—— نثار احمد فاروقی، دہلی

"ایوانِ اُردو دہلی" کا ایک الگ ادبی کردار تیزی سے بنتا جارہا ہے جس میں تہذیبی اقدار کو بھی نمایاں اہمیت دی جارہی ہے۔ ستمبر کے شمارے میں میری ایک غزل شائع ہوئی ہے جس کا مطلع ہے:

جان بھی نکلی ہے اپنی تو اصولوں پر اڑا ہوں
میں غزل کی تیغ لے کر حکمرانوں سے لڑا ہوں

مگر بعد کے اشعار میں یہ التزام رکھا گیا ہے کہ مصرعۂ اولیٰ میں ایک دو حرفی ٹکڑا (سبب) کم کردیا گیا ہے اور سارے دوسرے مصرعے مطلع کے وزن پر ہیں، اس جدت سے فرید شمسی صاحب کو خیال گذرا کہ باقی اشعار وزن سے خارج ہیں، حالاں کہ ایسا نہیں ہے، عربی اشعار میں اس قسم کی مثالیں ہیں اور ان کی عروضی صحت میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں جن میں مصرعۂ اولیٰ کا آخری رکن محذوف آتا ہے اور مصرعۂ دوئم کے رکن سالم آتے ہیں، مثلاً:

فاعلاتن۔ فاعلاتن۔ فاعلن
فاعلاتن۔ فاعلاتن۔ فاعلاتن

پھر بھی میں اسے "جدت" اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اُردو یا فارسی میں اس کا رواج نہیں مگر رودکی کے یہاں اس کی مثال موجود ہے جہاں مصرعۂ دوئم میں ایک دو حرفی ٹکڑا (سبب) مصرعۂ اولیٰ پر زائد ہے:

اے دل بہ تیز آتش پری
یا زیر چنگال عقابی (رودکی)

اے دل بتے —— زاتش پری، مستفعلن، مستفعلن
یا زیر چن —— گالے عقابی، مستفعلن، مستفعلاتن
اس میں مصرعۂ دوئم کے آخری رکن میں مصرعۂ اولیٰ

سے مختی زائد ہے جو عروضی اعتبار سے درست ہے،
یعنی مصرعۂ اولیٰ میں آخری رکن سالم ہے اور مصرعۂ
دوئم میں رکن آخر مُرفّل لائے ہیں۔

میری غزل لاشعوری طور پر دونوں بحروں پر
محیط ہے یعنی اہل مثمن ـــ اور رجز اور اس التزام
کے ساتھ کہ مصرعۂ اولیٰ میں ایک سبب کی تخفیف کو
جاری رکھا گیا ہے، مطلع میں چوں کہ قافیہ اور ردیف
کی پابندی ہوتی ہے لہٰذا استثنائی صورت میں قائم
رکھا گیا۔

بہرحال غزل کا وزن حسبِ ذیل ہے:
مصرعۂ اولیٰ۔ فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن
مصرعۂ دوئم۔ فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن (رمل)
کس لیے قہر ـ رے خدا پر ـ اتنا شرمن ـــ وہ ہوا
سخت نکلی ـــ جب زمیں تو ـ آسمانوں ـــ میں گرا ہوں
بحرِ رجز ـــ فاعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن
فاعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلاتن
کس لیے ـــ قہرے خدا ـ پر اتنا شر ـ منداہوا
سخت نک ـــ لی جب زمیں ـ تو آسما ـ نوں میں گرا ہوں
رکن اوّل مرفوع اور دوسرے مصرعے کا رکن آخر مُرفّل ہے۔
بہرحال یہ بات طے ہے کہ اس قسم کے تجربے
اُردو مزاجِ شعر کو قبول نہیں ہوں گے۔

ـــ حسن نعیم، بمبئی

○ "ایوانِ اُردو دہلی" کا اکتوبر کا شمارہ دیکھا،
پڑھا ـــ کچھ سمجھا، کچھ نہیں سمجھا۔ سب کا سب سمجھنے کے
لیے تو ـــ "اطلاع، تحقیق اور ہمارا معاشرہ" جیسے مضمون
(تخلیقی مضمون) کا مُصنّف ہونا پڑے گا اور اِس
رفعت پر پہنچنے کا یارا مجھ جیسے کی قسمت میں کہاں؟
ہندی زبان میں شائع ہونے والے بچّوں کے رسالے
کے ایک لطیفے سے یہ مضمون شروع ہوتا ہے۔ اس لطیفے سے
بقول مُصنّف ـــ "نہایت تشویش ناک امور و اثرات کی
طرف اشارے ہوتے ہیں ـــ" اور اس کے بعد تحقیق کی
عظمت اور جلال سے ناول نگار، افسانہ نگار، شاعر سب
کو ڈرایا گیا ہے: "باادب باملاحظہ ـــ جناب...
محقق اعظم تشریف لاتے ہیں ـــ"
اور دست بستہ ہومر، دوستوفسکی، ٹالسٹائی
گورکی، سارتر، شکسپیر، میر، غالب، اقبال، جوش،
مجاز، کرشن چندر، بیدی، منٹو صفوں میں کھڑے ہیں
اور ہر قدم پر کورنش بجالاتے ہیں کہ اقلیم ادب کے
شہنشاہ محقق کے آگے یہ سب کیا ہیں؟ اور پھر ان
سب شاعروں، ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں
کو بتایا گیا کہ ـــ تم سب کتنے خطرناک ہو معاشرے
کے لیے بمقالہ نگار محقق فرماتے ہیں:

"شاعری کی دُھن اور افسانہ (شاید
'افسانے' ہونا چاہیے) کی فسوں
سازی سے ہمارے معاشرے کا عام
مزاج مُبہم و موہوم ہو گیا ہے۔"

ـــ اور پھر ثابت کیا گیا ہے کہ محقّق بھی (یہ بھی غور طلب
ہے) تخلیقی کام کرتا ہے۔ کیسے؟

"ہر تحریر لفظوں سے عالم وجود میں
آتی ہے اور لفظ ہی تحریر میں
'تخلیقیت' پیدا کرتے ہیں۔ نقّاد
اور محقّق بھی لفظ ہی استعمال کرتا
ہے (کیا اُسے کچھ اور استعمال کرنا
چاہیے؟) اس لیے تخلیق کا جادو
وہ بھی جگا سکتا ہے۔"

یعنی ـــ جہاں لفظوں کے ذریعے تحریر وجود میں آئی
وہ تخلیق کا جادو جگانے لگتی یا جگا سکتی ہے۔
تھانے دار کے پاس اطلاعِ اوّل داخل کیجیے
اور آپ تخلیق کار ہیں!
تھانے دار نے اسٹیشن ڈائری یا کیس
ڈائری لکھی اور وہ ہو گیا ریڈر شعبۂ اُردو آئی۔ڈی۔
آئی۔ او۔ ٹی۔ کالج بہار ـــ!
کیا سنسنی خیز انکشاف ہے! چند اقوالِ زرّ
قابلِ غور ہیں:

۱۔ "محقّق و نقّاد علم کی بصارت اور شعور ک
بصیرت دونوں رکھتا ہے" اور حافظ وسع
شاید دونوں سے محروم تھے؟

۲۔ "آج کا انسان حولدار سے کچھ زیادہ بہتر نہ
گویا نقّاد و محقق "انسان" ہونے کی لعن
سے صاف بچ گئے!

۳۔ "یہی وجہ ہے، تحقیق و تنقید سے عام الرٗ
ہے۔"

میں نے سوچا میں انسان ہوں تو مجھے قاضی عبدالو
نارنگ، محمد حسن، کلیم الدین احمد سے ضرور الرٗ
ہونی چاہیے، مگر نہیں ہے! تو کیا میں بھی ریڈر شعب
اُردو کے مرتبے کو پہنچ گیا ـــ؟ ہزار ادب کا گنہگا
سہی مگر خدا اتنی کڑی سزا تو مجھے نہیں دے گا؟ ا
اپنا معائنہ کسی صدر شعبۂ اُردو فلاں کالج، بہا
سے کراؤں تو شاید یہ ناموجود بیماری بھی موجو
ثابت ہو۔

مقالہ نگار کا مقالہ تخلیق کی اعلیٰ مثال قا
کرتا ہے کیوں کہ اس میں الفاظ استعمال کیے گ
ـــ مگر الفاظ کو رونا ہے کہ اُنہیں کہاں استعمال
ہونا پڑا۔

اس گراں قدر مقالے کے مُصنّف کو میر
سلام پہنچا دیجیے اور جوگندر پال اور بلراج کو م
سے کہیے کہ یار تحقیق کرو اور سیدھے جنّت میں جا
شاعری اور افسانہ لکھ کر خود مر رہے ہو اور معاشر
کو موہوم اور مُبہم بنا رہے ہو۔
"ایوانِ اُردو دہلی" آپ کی نگرانی میں
چمک رہا ہے یہ اور بھی چمکے گا۔

ـــ کلام حیدری، گیا

○ یہ دیکھ کر انتہائی مسرّت ہوئی کہ آپ

معیاری افسانوں، صاف ستھری غزلوں اور بامقصد نظموں کے ساتھ ساتھ تاریخ وتہذیب، سائنس اور زندگی کی دوسری دلچسپیوں کے حسین مرقعے بھی "ایوانِ اُردو دہلی" میں شامل کر رکھے ہیں۔ شمارہ ۶ میں نثار احمد فاروقی کا مقالہ "غالب کا نظریۂ وجود" اور محمد اسلم پرویز کا "نیوکلیائی کثافت" پُرمغز اور معلوماتی مضامین ہیں۔ البتّہ محمد منصور عالم کا انشائیہ بعنوان "اطلاع، تحقیق اور ہمارا معاشرہ" مثبت اندازِ فکر کے باوجود عام انسانی نفسیات کا ضروری احاطہ اور تحلیل وتجزیہ کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس مضمون میں انھوں نے قرآنِ پاک کی ایک سورت "وال" کی جو تشریح کی ہے اس کو قطعی طور پر تفسیر بالرّ ے قرار دیا جاسکتا ہے جو حرام ہے۔ منصور عالم صاحب نے سورۃ میں مذکور "دائمی خسران" سے بچنے کے چار نکات میں سے مؤخرالذکر دو یعنی "حق" پر جم جانے اور "صبر" کی روش پر قائم رہنے کی مہتم بالشان صفات کا تعلّق "واضح طور پر تحقیق سے" ظاہر کیا ہے اور کہا ہے کہ "تحقیقی مزاج رکھنے والے حضرات ہی حق اور صبر کے ساتھ قائم رہ سکتے ہیں"۔ یہ انوکھی بات آج تک کسی مفسّرِ قرآن نے نہیں لکھی ۔۔۔ کیونکہ مذکورہ سورت میں واضح طور پر "تواصوا بالصبر" اور "تواصوا بالحق" ایمان کی صفات بتائی گئی ہیں۔ اور اس میں دو رائے نہیں کہ "ایمانیات" کا تعلّق محض "خبر" اور اس پر یقین و تصدیق سے ہوتا ہے نہ کہ تحقیق و تفتیش سے ۔۔۔!! ظاہر ہے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا ہے اور نہ ہی فرشتوں کے وجود کی تحقیق و تعیین ہمارے بس کا روگ ہے۔ اسی طرح جنّت، دوزخ، صور، قیامت، حشر ونشر اور اسی قسم کے دیگر امورِ غیب کو بھی ہم عقل و تحقیق کی ترازو میں نہیں تول سکتے۔ ان پر ایمان لانے کا باعث محض اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی "اطلاع و خبر" ہے اور آنحضرتؐ کے فرمان وارشادات کو بے چون وچرا سچ مان لینے ہی کا نام ایمان و یقین ہے اس یقین وایقان کے بغیر نہ تو انسان کو صحیح معنیٰ میں "نیک عمل" کی توفیق ہوسکتی ہے اور نہ ہی "صبر" کے ساتھ حق پر جمے رہنے کا حوصلہ! منصور عالم صاحب کے لیے میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ براہِ کرم آئندہ کبھی "بلا تحقیق" اپنے "اطلاعی مضامین" میں قرآنِ مجید کو "تختۂ مشق" بنانے کی کوشش نہ فرمائیں ۔۔۔!!

۔۔۔۔ سُہیل آذر، ہلدوانی، نینی تال

○ ماہِ اکتوبر ۸۷ء کے "ایوانِ اُردو دہلی" میں محمد منصور عالم کا مضمون بعنوان "اطلاع، تحقیق اور ہمارا معاشرہ" نظر سے گذرا۔ فاضل مضمون نگار نے یوں تو ایک اچھے موضوع پر قلم اٹھایا ہے، لیکن ایک لطیفے کی کمزور بنیاد فراہم کرکے اچھے خاصے مضمون کو کمزور اور بے اثر کر دیا، اور اس وقت تو میں خود چونک پڑا جب میں نے مضمون نگار کو بذاتِ خود غلط اطلاع فراہم کرنے والوں اور اس کو قبول کرنے والوں کی صف میں کھڑا پایا، صفحہ ۴۵ کے درمیانی پیراگراف میں قرآنِ کریم کی سورۃ والعصر کی ایک آیت کا ترجمہ اس طرح پیش کیا گیا ہے "قسم ہے زمانے کی یہ انسان خسارے میں ہے، بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے اور حق پر رہے اور صبر کے ساتھ رہے"۔ جب کہ دُرست ترجمہ کے مطابق "قسم ہے زمانے کی" کی جگہ "زمانہ شاہد ہے" چاہیے۔

اگر مضمون نگار کے پیش کردہ ترجمے کو درست مان لیا جائے تو مندرجۂ ذیل سوالات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی بات کا یقین دلانے کے لیے قسم کھانے یا قسم دلانے کی کیا ضرورت تھی؟

۲۔ قسم اس وقت کھائی جاتی ہے جب اطلاع فراہم کرنے والے کو یہ اندیشہ ہو کہ اس کی بات کا یقین نہیں کیا جائے گا، اللہ کو ایسے اندیشے میں مبتلا ہونے کی کیا ضرورت تھی؟

۳۔ اللہ حاکم ہے اور بندے محکوم اور کتاب اللہ کا ہر لفظ بندوں کے لیے حکم و ہدایت ہے، حاکم کو کیا ضرورت ہے جو وہ محکوم کو اپنی بات کا یقین دلانے کے لیے قسم کا سہارا لے؟

اگر متعلقہ آیت کے ترجمے کو "زمانہ شاہد ہے" کے ساتھ پڑھا جائے تب "قسم" کی جگہ "تنبیہ" لے لیتی ہے جو حاکم کا طرّۂ امتیاز ہے اور پھر مندرجہ بالا سوالات کے پیدا ہونے کا جواز باقی نہیں رہتا۔

افسوس کہ بعض اوقات کیسے کیسے قابل اور ذہین لوگ حوالدار بن جاتے ہیں۔

۔۔۔۔ ایم شفیق انصاری، مرادآباد

○ آپ کی یہ نیک خواہش کہ اُردو نہ صرف ادبی زبان کی حیثیت سے بلکہ علمی زبان کے رُوپ میں بھی ترقّی کرے قابلِ ستائش ہے۔ خدا کرے اُردو کا یہ رسالہ اِس زبان کو افسانہ وغزل کی دُنیا سے نکال کر سائنس اور علمی ماحول عطا کرنے میں معاون ہو۔

۔۔۔۔ حسیب اختر، گریڈیہہ

○ اُردو زبان کا مطلب محض اُردو افسانہ اور شاعری نہیں ہوتی، لہٰذا آپ کی یہ کوشش قابلِ ستائش ہے کہ آپ دیگر موضوعات پر بھی مضامین شائع کرنے جارہے ہیں۔ آج ترقّی یافتہ دَور میں ادب، فن، کلچر کے علاوہ سائنس اور ٹیکنولوجی، معاشیات
COMPUTER SCINCE, ATOMIC EN-
-ERGY, PUBLIC RELATION, IND-
-USTRIAL RELATION, MANAGE-
-MENT

جیسے سینکڑوں موضوعات ہیں جن پر اُردو میں مضامین شائع کرنا بڑی بات ہوگی اور یہ "ایوانِ اُردو دہلی" کا طرۂ امتیاز ہوگا۔

—— شمس ندیم، بردوان

○ "ایوانِ اُردو دہلی" پڑھ رہا ہوں اور مسرور ہو رہا ہوں۔ اُردو اکادمی مقامی انتظامیہ کا ادارہ ہوتے ہوئے بھی اتنا نفیس کھلا کشادہ اور بامعنی ماہنامہ نکال سکتی ہے علم نہیں تھا اسی لیے پہلے تین شمارے دیکھے تو تھے مگر پڑھے اس لیے نہ تھے کہ یہ گورنمنٹ گزٹ کی طرح مقامی حکمرانوں اور ان کے زیرِ اہتمام چل رہے اداروں کے خبرناموں کے علاوہ کیا ہوں گے۔ میں بھول گیا تھا کہ ہر پرچے کے پیچھے چند شخصیات ہوتی ہیں اور جب یہ لوگ نیک نیتی سے کوئی کام کرتے ہیں تو نتیجہ ہمیشہ اچھا ہی نکلتا ہے میں سمجھتا تھا یہ سلیقہ صرف "آج کل" کے ادارے کی ملکیت ہے۔ اب کہنا پڑے گا یہ سلیقہ سید شریف الحسن نقوی اور مخمور سعیدی کے پاس بھی ہے اور دونوں نے مل کر "آج کل" کو بھی مات دے دی ہے۔[1]

بھئی بے حد خوب صورت پرچہ نکال رہے ہیں آپ لوگ —— مضامین، افسانوں، نظموں اور غزلوں کے علاوہ خبریں بھی ہیں مگر یہ اُردو دُنیا کی خبریں ہیں جنھیں مناسب جگہ نہ دینا یقیناً غلط ہوتا۔

کیسے کیسے حضرات کا تعاون حاصل ہے آپ کو سارے نام گنوانے لگوں تو خط ایک فہرست بن جائے گا۔

—— بلراج ورما، نئی دہلی

[1] "آج کل" کا ایک اپنا مزاج و معیار ہے اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے "آج کل" ہی کیا کسی بھی اُردو کے رسالے سے مقابلہ آرائی مقصود نہیں —— ادارہ

○ آپ نے بے حد معیاری اور بہتر اعتبار قابلِ مطالعہ جریدے کا اجرا کیا ہے۔ سرورق انتہائی دیدہ زیب اور کتابت و طباعت قابلِ رشک —— سب سے اہم بات یہ ہے کہ ملک کے بیشتر مقتدر شعرا و ادبا کا تعاون آپ کو حاصل ہے۔

—— ظہیر غازی پوری، ہزاری باغ

○ آپ کی کوششوں سے "ایوانِ اُردو دہلی" مُعتبر و مُستند اور مُنفرد ادبی رسالہ بن گیا ہے۔ اس کی جامعیت، نفاست، جاذبیت اور ادبیت —— قابلِ رشک ہے۔ آپ حضرات کی محنت —— اور جاں فشانی کا اعتراف نہ کرنا ادبی بد دیانتی اور احسان فراموشی ہوگی۔

—— الطاف عزیز دہلوی، دہلی

○ "ایوانِ اُردو دہلی" جیسے خوب صورت —— جریدے کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ تجھ کو دیکھوں کہ تجھ سے بات کروں۔ لیکن یہ دیکھ کر بے حد کوفت ہوتی ہے کہ اتنے دل چسپ رسالے کو آپ لوگ دُہرا کر کے ربر لگا کر بھیج دیتے ہیں۔ جریدہ ایسا ہے کہ پڑھ کر محفوظ رکھنا پڑتا ہے۔ میری تو یہ بھی کوشش ہوگی کہ سال بھر کے شمارے اکٹھے ہو جائیں تو باقاعدہ خوب صورت جلد بندھواؤں۔

—— کرشن ادیب، لدھیانہ

○ خلیق انجم صاحب کا سلسلہ وار مضمون "دِلّی کے آثارِ قدیمہ" نہ صرف دل چسپ ہے۔ بلکہ معلوماتی بھی ہے۔ افسانوں کا انتخاب، ادب، سائنس، ٹکنالوجی اور تاریخ پر مضامین ہر مکتبۂ خیال کے قاری کو آسودگی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ اُردو خبرنامہ ہمیں گھر بیٹھے اُردو دُنیا کی اہم خبریں فراہم کرتا ہے خصوصاً باہر سے آنے والے ادیبوں کے متعلق معلومات فراہم ہوتی رہتی ہیں۔ نیز یہ بھی کہ ہمارے ملک سے باہر اُردو کے لیے کیا کام ہو رہا ہے۔

○ یوں تو ادب کے نام پر بے شمار رسائل نکلتے ہیں مگر ان سب میں ادب کی چاشنی تک موجود نہیں ہوتی۔ چہ جائیکہ ادبی ہوں مگر "ایوانِ اُردو دہلی" کے ورودِ مسعود نے دل کو فرحت و مسرت سے سرشار کر دیا اور بے ساختہ زبان سے ماشاء اللہ نکلا۔

خلیق انجم کی تاریخی سلسلہ وار تحریر "دِلّی کے آثارِ قدیمہ" بہت خوب ہے نایاب گوشے جو عام نظروں سے اوجھل تھے سامنے آ رہے ہیں۔

—— عابد حسین پورنوی، دارالعلوم دیوبند

○ "ایوانِ اُردو دہلی" کے شمارہ ۷ میں آپ نے گیان چند کا ایک مضمون "اقبال کی نظم سوامی رام تیرتھ" شائع کیا ہے جن مفروضات —— پر گیان چند صاحب نے اپنے مضمون کی بنیاد رکھی ہے، ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور نہ ہی تحقیق میں انھیں کوئی درجہ دیا جا سکتا ہے۔ گیان چند صاحب کی تحقیقی بصیرت مسلّم ہے لیکن ادھر چند برسوں میں ان کی نہایت کمزور تحریریں سامنے آ رہی ہیں۔

دیگر مشمولات میں "دِلّی کے آثارِ قدیمہ" کا سلسلہ بہت اچھا ہے۔ سماجی، نفسیاتی، سائنسی اور جغرافیائی مضامین کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

—— شاہد سعید خاں، بھوپال

○ "ایوانِ اُردو دہلی" جس انداز سے ترتیب دیا جا رہا ہے وہ آپ اپنی مثال ہے۔ لکھنے والوں میں کچھ نئے نئے نام بھی نظر آتے ہیں۔ آپ کا یہ عمل مستقبل کے ادب کے لیے شمعِ راہ ہے۔ نئے فنکاروں کی ہمت افزائی، اُن کو اُبھرنے کا موقع دینا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

—— وقار واثقی، احمد آباد

○ "آپ کی رائے" میں بلقیس ظفر الحسن صاحبہ نے ایک سوال کیا ہے: "خطوں پر اُردو میں

پتے میں لکھ تو دوں، لیکن وہ خط منزلِ مقصود تک پہنچیں گے بھی؟"

میرا تعلق کم و بیش پوسٹل ڈپارٹمنٹ سے ہر وقت رہا ہے۔ اور میں یقین سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ پوسٹل ڈپارٹمنٹ کسی بھی طرح کا کوئی خط چاہے اس پر پتا کسی بھی زبان میں ہو ضائع نہیں کرتا۔ بلکہ ایسے ایسے خط بھی جو بغیر پورے پتے کے کسی نے لیٹر بکس میں ڈال دیے ہوں، ضائع نہیں ہوتے۔ ایسے خطوں کے لیے ہر بڑے شہر میں ایک R.L.O. ہوتا ہے جہاں چھان بین کرنے کے بعد خط صحیح جگہ پہنچا دیا جاتا ہے۔

—— پرویز اختر پرویز، آسنسول

○ ہم اُردو والوں کی ایک شکایت کہ اُردو رسائل کا حلقہ دن بہ دن سُکڑتا جا رہا ہے۔ کہاں تک دُرست ہے؟ ہمارے یہاں جاسوسی، ایڈونچر، فلمی اور ڈائجسٹ ٹائپ کتنے رسائل ہاتھوں ہاتھ بِک جاتے ہیں، معلوم ہوا کہ خرید کر پڑھنے کی عادت ختم نہیں ہوئی بلکہ ذوق ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ریڈر شپ کا معیار باقی نہیں رہا —— لہٰذا کچھ ایسا کیا جائے جس سے قارئین معیاری اور صاف ستھری تحریریں پڑھنے کی طرف راغب ہوں۔ اِس مسئلہ پر "ایوانِ اُردو" کے بُلند ذوق قارئین سے اُن کی آرا حاصل کی جاسکتی ہیں تاکہ "چند قارئین" کی فہرست "بے شمار قارئین" کی فہرست میں تبدیل ہوسکے۔ معیاری ادب کو اہمیت دینے والے ذہنوں میں اضافہ ہوسکے۔

—— شاہد لطیف، بمبئی

○ اگر وقفے وقفے سے اسلامیات کے موضوع پر بھی مضامین شائع ہوتے رہیں جن میں اسلامی تاریخ اور سیرت کے ذریعے اسلام کی صحیح تصویر پیش کی جائے تو میری ناقص رائے کے مطابق اس سے ہندوستان میں بسنے والی مختلف قوموں کے درمیان ہم آہنگی اور خیر سگالی کا جذبہ پیدا ہوگا، ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد ملے گی اور دل و دماغ پر شبہات کی جو گرد جمی ہوئی ہے وہ بہت حد تک صاف ہوسکے گی۔[1]

—— شکیل احمد، دربھنگا

[1] یہ کام بعض دوسرے رسائل کر رہے ہیں۔ "ایوانِ اُردو" میں ان چیزوں کی گنجائش نکالنا مشکل ہے —— ادارہ

○ رسالہ تو کافی معیاری ہے۔ اگر اس میں کچھ اور اضافہ کر دیا جائے تو اس کی مقبولیت اور بھی بڑھ سکتی ہے۔ آپ اس میں ایک گوشہ ایسا نکالیں جس میں عنوان آپ کا ہو اور مضمون ہمارا۔[1] جو مضمون مقابلے میں زیادہ کھرا اُترے گا وہی اس گوشے کی زینت بنے گا۔ اس سے لوگوں میں مطالعے کا ذوق بھی بڑھے گا اور رسالے کی مقبولیت بھی ——

—— فیروزہ سلطان، رمضان پور

[1] "ناقابلِ فراموش" کے عنوان سے یہ گوشہ شروع کیا جاچکا ہے۔ آپ بھی اس میں حصّہ لیں —— ادارہ

○ اگر "ایوانِ اُردو دہلی" میں کم از کم ایک کالم عورتوں کے مسائل یا ان سے متعلق مضامین کے لیے بھی ہو تو رسالے کی افادیت میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ اس رسالے میں انشائیہ کی کمی بھی کھٹکتی ہے، جب کہ اس صنف کو پروان چڑھانے کی خاص ضرورت ہے۔[1]

—— نجمہ عزیز، بسی کرتپور

[1] انشائیے ہم شائع کرتے رہے ہیں —— ادارہ

○ "ایوانِ اُردو دہلی" اپنے اجرا کے بعد سے ہی دیگر اُردو جریدوں میں ایک انفرادی حیثیت کا حامل رہا ہے مگر افسانے بہت ہی کم شریک ہوتے ہیں۔ جس سے نثری ذوق رکھنے والوں کی تشنگی برقرار رہ جاتی ہے۔ اگر مناسب سمجھیں تو ان کی تعداد دوگنی کر دیں۔

خلیق انجم کا معلوماتی مضمون "دلّی کے آثارِ قدیمہ" سے بھی قارئین "ایوانِ اُردو" مستفیض ہو رہے ہیں۔ اس ضمن میں آپ سے درخواست ہے کہ ملک کے دوسرے بڑے شہروں کے آثارِ قدیمہ پر بھی مضمون حاصل فرما کر شائع کریں تو بلاشبہ ایک عظیم ناقابلِ فراموش احسان ہوگا۔

—— محمد انور حسین، کلٹی، مغربی بنگال

○ یہ حقیقت ہے کہ بُک اسٹال پر "ایوانِ اُردو دہلی" آتے ہی ہاتھوں ہاتھ بِک جاتا ہے۔ اگر رسالہ خریدنے میں ذرا بھی دیر ہوئی تو کفِ افسوس ملنا پڑتا ہے۔ یہ غیر معمولی مقبولیت ہے۔

اکتوبر کے شمارے میں ذکیہ سلطانہ نیّر نے اپنے مرحوم شوہر ساغر صاحب پر خالص تنقیدی مضمون سپردِ قلم کیا ہے۔ حالاں کہ ان سے کچھ شاعر کے بارے میں ذاتی معلومات حاصل کرنے کا قاری متمنّی تھا۔

—— انوار انصاری، رانچی

○ "ایوانِ اُردو دہلی" میرے گھر میں سبھی بھائی بہن اور ابّا شوق سے پڑھتے ہیں۔

—— فاخرہ شبنم، دھنباد

○ پُونا کے ایک قاری نے اِس طرف توجّہ دلائی ہے کہ آپ کی ایک نظم "یادوں کا وطن" اور میرے افسانے "یاد بسیرے" کے مرکزی خیال میں کافی مشابہت ہے۔ اگر مجھے اِس کا علم ہوتا تو کہانی میں آپ ہی کی نذر کرتا کہ بہرحال اوّلیت تو آپ ہی کو حاصل ہے بلکہ مجھے مسرّت ہوتی۔

اِس بار سریندر پرکاش کی کہانی نے مزا نہیں دیا۔ سلام بن رزّاق کا ترجمہ عمدہ ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ پرچہ کا ریسپانس بہت اچھا ہے۔ ورنہ اکا دُکا ادبی پرچے بہت محدود حلقے میں پڑھے اور بانٹے جاتے ہیں۔ آپ نے اِسے تمام ادبی حلقوں تک پھیلا دیا بلکہ عوام تک۔

—— انور خاں، بمبئی

اغراض و مقاصد

(۱) دہلی کی لسانی تہذیب کے مشترکہ حصے کے طور پر اردو زبان اور ادب کا تحفظ اور ارتقا۔

(۲) اردو میں ادبی اور معیاری تصنیفات اور بچوں کی کتابوں کی اشاعت اور حوصلہ افزائی۔

(۳) اردو میں ادبی اور سائنسی اور دوسرے موضوعات سے متعلق ایسی اہم کتابوں کے تراجم کا اہتمام کرنا جن کا ابھی تک اردو زبان میں ترجمہ نہ ہوا ہو۔

(۴) اردو میں حوالہ جاتی کتابوں کی تالیف و اشاعت۔

(۵) قدیم اردو ادب کی صحیح ترتیب و تدوین کے بعد اشاعت۔

(۶) اردو کے غیر مطبوعہ معیاری ادب پاروں کی اشاعت۔

(۷) اردو کے مستحق مصنّفین کی غیر مطبوعہ تصنیفات کی اشاعت میں تعاون۔

(۸) گذشتہ ایک سال کے دوران مطبوعہ اردو تصنیفات کے مصنّفوں کو انعامات کی تقسیم۔

(۹) اردو کے عمر رسیدہ اور مستحق مصنفین کی ماہانہ مالی اعانت

(۱۰) اردو اسکالروں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک مقررہ مدّت کے لیے مالی اعانت کے ساتھ دوسری سہولتیں بہم پہنچانا۔

(۱۱) مشہور اسکالروں اور دوسری اہم شخصیتوں کو جلسوں کو خطاب کرنے کے لیے دعوت دینا۔

۱۲. ادبی موضوعات پر سیمینار، سمپوزیم، کانفرنس اور نشستیں منعقد کرنا جن میں عالمی ادبی رجحانات کے منظر میں اردو کے مسائل پر بحث و مباحثہ ہو اس کے ساتھ اردو کی تدریس اور اس کے استعمال سے متعلق سرکاری احکامات کی تعمیل و تکمیل کا جائزہ اور ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے مختلف ایسی ادبی اور تہذیبی تنظیموں کو مالی اعانت دینا جو کہ اسی طرح کی نشستیں منعقد کرتی ہیں۔ لیکن یہ مالی اعانت ایک معاملے میں پانچ سو روپے سے زیادہ نہیں ہوگی۔

۱۳. اردو میں اعلیٰ معیار کے رسالے جریدے اور اسی طرح کی دوسری مطبوعات کی اشاعت۔

۱۴. اِن ضابطوں کے تحت مطبوعات کی فروخت کا اہتمام۔

۱۵. اکادمی کے لیے منقولہ اور غیر منقولہ جائداد حاصل کرنا لیکن شرط یہ ہے کہ غیر منقولہ جائداد کے حصول سے پہلے دہلی انتظامیہ کی پیشگی منظوری ضروری ہوگی۔

۱۶. اردو کی تعلیم، اس کے استعمال اور سرکاری احکامات کی تکمیل میں حائل دشواریوں اور اردو بولنے والوں کے مطالبوں کو دہلی انتظامیہ کے علم میں لانا۔

۱۷. ایسے سبھی جائز اقدامات کرنا اور قانونی کارروائیاں کرنا جن سے مذکورہ مقاصد کے فروغ و تکمیل میں مدد مل سکتی ہو۔

۱۸. سوسائٹی کی ساری آمدنی سوسائٹی کے اغراض و مقاصد کے حصول ہی کے لیے خرچ کی جائے گی۔

اُردو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

فون نمبر ۲۷۶۲۱۱، ۲۶۳۳۴۸

ادارۂ تحریر

سیّد شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی

جلد: ۱، شمارہ: ۱۱ — فی کاپی ۵۰ر۲ روپے، سالانہ قیمت ۲۵ روپے — مارچ ۱۹۸۸ء

حرفِ آغاز ــــ سیّد شریف الحسن نقوی ــــ ۴

مضامین:

محبِّ وطن حالی ــــ بیگم صالحہ عابد حسین ــــ ۵

مولانا ابوالکلام آزاد کی دانش وری ــــ عبدالمغنی ــــ ۱۲

دِلّی کے آثارِ قدیمہ ــــ خلیق انجم ــــ ۱۷

سائنس انسانیت نواز کیوں نہیں ــــ جلیس عابدی ــــ ۲۵

رشید احمد صدیقی کی خطوط نویسی ــــ شہناز انجم ــــ ۳۳

ذیابیطس ــــ گورد یپ سنگھ ــــ ۳۸

گوشۂ رفتگاں:

صالحہ عابد حسین ــــ صغرا مہدی ــــ ۴۲

انسانیت کا پرستار ــــ فکر تونسوی ــــ معین اعجاز ــــ ۴۵

اُردو کا شیدائی ــــ خوشتر گرامی ــــ نازہ انصاری ــــ ۴۷

افسانے:

موڑ ــــ کشمیری لال ذاکر ــــ ۹

خون خوار کتّے ــــ م۔ق۔ خاں ــــ ۲۲

لازوال ــــ محسن خاں ــــ ۲۹

انشائیہ:

خالہ شبّو ــــ نور جہاں ــــ ۳۶

دوہے ــــ وقار واثقی / بھگوانداس اعجاز ــــ ۳۲

غزلیں:

عُنوان چشتی / حکیم منظور ــــ ۸

ممتاز میرزا / عزیز بانو داراب وفا / سیّدہ شاہ معراج ــــ ۱۶

شاہد میر / صدیق مجیبی / سلیم انصاری ــــ ۲۴

کیفی سنبھلی / محمد عامر علوی عامر / شفیق رائے پوری ــــ ۴۰

ہم طرح اشعار ــــ قارئین ــــ ۵۰

شعری و نثری عنوانات ــــ قارئین ــــ ۵۲

نئی کتابیں ــــ بلراج کومل / اطہر فاروقی ــــ ۵۴

اُردو خبر نامہ ــــ ادارہ ــــ ۵۷

آپ کی رائے ــــ قارئین ــــ ۶۲

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ

ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی

اُردو اکادمی، دہلی ــــ گھٹا مسجد روڈ،

دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سرورق اور تزئین: ارشد علی

خوشنویس: تنویر احمد

سیّد شریف الحسن نقوی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے نیو آفسیٹ پریس دہلی ۶ سے چھپوا کر دفتر اُردو اکادمی نئی دہلی ۲ سے شائع کیا۔

۱۲ فروری کو ایوانِ غالب نئی دہلی کے آڈیٹوریم میں بین الاقوامی غالب سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے جمہوریۂ ہند کے نائب صدر ڈاکٹر شنکر دیال شرم
نے اُردو کے بارے میں بعض باتیں زور دے کر کہیں۔ انھوں نے کہا کہ اُردو ملک کی واحد زبان ہے جو مختلف فرقوں اور نسلوں کے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتی
رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا آغاز دہلی اور اس کے گرد و نواح میں ہوا لیکن یہ دھیرے دھیرے علاقائی حدیں پار کرتی گئی اور پورے ملک میں بولی اور سمجھی جانے
لگی۔ آزادی کی لڑائی میں دوسری ملکی زبانوں کی شمولیت سے انکار کرنا غلط ہوگا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس محاذ پر سب سے زیادہ مؤثر کردار اُردو نے ادا کیا
"انقلاب زندہ باد" کا نعرہ جس نے پورے ملک میں بیداری اور بغاوت کی لہر دوڑا دی اسی زبان کی دین تھا۔ انھوں نے کہا کہ اُردو کی مقبولیت اور ہر دلعزیز
کی وجہ اس کا روادارانہ مزاج ہے۔ اس روادارانہ مزاج کی تشکیل میں جو تاریخی عوامل کارفرما تھے وہ آج بھی برقرار ہیں۔ ملک کی تعمیر و ترقی اور اس
سلامتی کے لیے جس ذہنی اور جذباتی رواداری کی ضرورت کل تھی' آج بھی ہے بلکہ بدلے ہوئے حالات میں اس کی اہمیت کچھ اور بڑھ گئی ہے۔ ڈاکٹر شنکر
دیال شرما نے کہا کہ اُردو کی اس خصوصیت کو دیکھتے ہوئے ہر محب الوطن پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس زبان کی ترویج اور ترقی میں حصّہ لے کہ یہ حب الو
کے ایک اہم تقاضے کی تکمیل ہوگی۔

ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے ان کوششوں کا بھی ذکر کیا جو مرکزی اور صوبائی حکومتیں اُردو کی ترویج و ترقی کے لیے کر رہی ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ انھوں نے
اس پر بھی زور دیا کہ ان کوششوں میں عام لوگوں کو بھی شریک ہونا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ جو لوگ اُردو والے کہلاتے ہیں ان پر تو خصوصیت سے یہ ذمّہ داری عا
ہوتی ہے کہ وہ اس زبان کے فروغ کے لیے اپنے طور پر جو کچھ کر سکتے ہیں' کریں۔ یہ ان کا لسانی فریضہ ہی نہیں قومی فریضہ بھی ہے کیوں کہ ہم جس متحدہ قومیت کی بنیا
نئے ہندوستان کی تعمیر کر رہے ہیں اس کی تشکیل میں اُردو نے ناقابلِ فراموش کردار ادا کیا ہے اور اس کے استحکام میں بھی یہ زبردست معاون ثابت
ہو سکتی ہے۔

یہ ایسے حقائق ہیں جن سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ ہمیں خوشی ہے کہ ملک کی ایک مقتدر شخصیت نے ان کا وزن محسوس کیا۔ یہ احساس جتنا عا
ہوگا' اُردو کے پھولنے پھلنے کے امکانات اتنے ہی بڑھتے جائیں گے۔ جیسا کہ محترم نائب صدر جمہوریہ نے کہا اس احساس کو عام کرنے اور اس کے تقاضوں کو
کرنے کی بنیادی ذمّہ داری خود اُردو والوں کی ہے اور اس ذمّہ داری کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ ہم اپنی نئی نسلوں کو اُردو سے نابلد نہ رہنے دیں۔ اپنے بچّ
کو اُردو پڑھا کر ہی ہم اس زبان کو زندہ رکھ سکتے ہیں۔

پچھلے دنوں اُردو دُنیا اپنی کئی نامور شخصیتوں سے محروم ہو گئی۔ ان میں سے چند کی یادیں تازہ کرنے کے لیے ہم نے اس شمارے میں "گوشۂ رفتگا
کے عنوان سے کچھ صفحات مخصوص کیے ہیں' آئندہ شماروں میں ہم کچھ اور مرحومین کی یاد میں بھی مضامین شائع کریں گے اور جس طرح قیمت میں اضاف
بغیر اس بار یہ صفحے بڑھائے گئے ہیں' آئندہ بھی ایسا ہی کیا جائے گا۔

—— سیّد شریف الحسن نق

محبِّ وطن حالی

کچھ باتیں انسانی کی فطرت میں ہوتی ہیں، وطن کی محبت بھی انھی فطری جبلتوں میں سے ہے۔ انسان تو انسان ہے، حیوانات و نباتات تک میں جو جس دیس کی پیداوار ہوں اس میں جس طرح ان کی نشو ونما ہوتی ہے، رنگ رُوپ نکھرتا ہے۔ وہ کسی اور سرزمین میں ممکن نہیں۔ وہ اگر وہاں ختم نہیں بھی ہو جاتے تو اپنی خصوصیات کھو کر کسی اور رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی مشہور نظم حُبّ الوطنی میں اس خیال کو یوں ظاہر کیا ہے :

ٹکڑے ہوتے ہیں سنگ، غربت میں
سوکھ جاتے ہیں روکھ غربت میں
مچھلی جب چھوٹتی ہے پانی سے
ہاتھ دھوتی ہے زندگانی سے
حسنِ انسان کی حیات ہے تو
مرغ و ماہی کی کائنات ہے تو
سب کو ہوتا ہے تجھ سے نشو ونما
سب کو بھاتی ہے تیری آب و ہوا

چرند و پرند جمادات و نباتات پھل پھول سب اپنی زبانِ بے زبانی کی محبت کا جیتا جاگتا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ پھر انسان جو اشرف المخلوقات سمجھا جاتا ہے، جسے خرد کی بے بہا دولت اور نطق کی بے مثال طاقت کے ساتھ ساتھ محبت کا بے مثل جذبہ عطا ہوا ہے، کیسے ہوسکتا ہے کہ وطن کی محبت کا جذبہ اس کے دل میں موجود نہ ہو۔ چنانچہ ہزاروں سال کی انسانی تاریخ گواہ ہے؛ ہر زمانے، ہر دور، ہر دیس اور ہر قوم کے لوگ چاہے وہ جنگلی اور جاہل ہوں، چاہے متمدن اور مہذب حُبّ وطن کے جذبے سے سرشار رہے ہیں اور وطن عزیز پر کبھی کوئی سخت وقت آپڑا ہے، تو جان و مال سب کچھ وطن کی آن اور عزت کے لیے قربان کر دیا ہے۔ اور جن قوموں اور دیسوں نے ایسا نہیں کیا وقت کی بے پناہ طاقت نے انھیں صفحۂ تاریخ سے ہٹا دیا ہے یا غدار ہونے کی لعنت ان کے ماتھے کا کلنک بنی ہے۔

ادب انسانی جذبات کا آئینہ ہوتا ہے اور دُنیا کے ہر ادب میں وطن کی محبت کے ترانے گائے گئے ہیں۔ اُردو ادب میں اس کی جھلکیاں ابتدا ہی سے ملتی ہیں، مگر شعوری طور پر وطن کا ترانہ سب سے پہلے حالی کے زمانے میں گایا گیا۔ ۱۸۷۴ء میں مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا حالی نے لاہور میں نئے طرز کے مشاعروں کی بنا ڈالی۔ جس میں شاعر بجائے مصرعۂ طرح پر غزل کہنے کے ایک موضوع پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ ان میں سے ایک مناظمے کا عنوان حُبّ الوطن بھی تھا۔ اس میں جتنے شاعروں نے اپنی نظمیں پڑھیں ان میں حالی کی نظم سب سے زیادہ مشہور و مقبول ہوئی۔ حالی کی شاعری میں وطن کی محبت کی مثالیں پیش کرنے سے پہلے ایک بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتی ہوں۔ حالی کے زمانے میں، ایک صدی پہلے وطن اور قوم کا تصور وہ نہ تھا جو آج ہے۔ ہندوستان بدیسیوں کا غلام تھا ہندوستانی قوم اس وقت فرقوں اور ذاتوں میں بٹی ہوئی تھی۔ قومی محبت وطن کی وحدت کا وہ احساس جو آج عام ہے اس وقت اس کا تصور

بھی واضح نہ تھا۔ بقول ڈاکٹر ذاکر حسین کے "حالی نے جس وطن میں زندگی شروع کی وہ زیادہ سے زیادہ ایک جغرافیائی تصور تھا۔ اس کے باشندوں میں نہ مقاصد کا اتحاد تھا نہ اغراض کی یک جہتی نہ کوئی مشترک مطمحِ نظر نہ سیاسی تنظیم — حالی کی نسل کے لوگوں کا کام پہلے تو وطن کو وجود میں لانا تھا کہ جب یہ محفل میں آئے تو محفل ہی درہم و برہم ہو چکی تھی"۔ کوئی شک نہیں کہ حالی کے مخاطب زیادہ تر ان کے ہم مذہب مسلمان تھے کہ ان کی حالت اس وقت سب سے ابتر تھی مگر اس کے ساتھ ان کا خطاب اکثر تمام اہل وطن سے ہوتا تھا۔ حالی کی شاعری میں وطن کی محبت کا اصل مفہوم کیا تھا۔ کہتے ہیں :

اے سپہر بریں کے سیارو
اے فضائے زمیں کے گلزارو
اے پہاڑوں کی دل فریب فضا
اے لبِ جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
اے نسیمِ بہار کے جھونکو
دہر ناپائیدار کے دھوکو
تم ہر اک حال میں ہو یوں تو عزیز
تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز

بیگم صالحہ عابد حسین

(یہ مضمون محترمہ نے اپنے انتقال سے چند روز پہلے عنایت فرمایا تھا)

جب وطن میں ہمارا تھا رہنا
تم سے دل باغ باغ تھا اپنا
اُن اِک اِک تمھاری بھاتی تھی
جو ادا تھی وہ دل لبھاتی تھی

اور اب:

رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا
وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا
کاٹ کھاتا ہے باغ بن تیرے
گل ہیں نظروں میں داغ بن تیرے
سچ بتا کیا سبھی کو بھاتا ہے
یا کہ مجھ ہی سے تیرا ناتا ہے

اور پھر:

جان جب تک نہ ہو بدن سے جدا
کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جدا

وطن کا یہ محدود تصوّر یعنی اپنے شہر کی الفت کا یہ گہرا احساس جس میں ہر شخص حالی کے ساتھ شریک ہوسکتا ہے ان کے حسّاس اور محبّت بھرے دل میں بھی تھا مگر ان کے وطن کا مفہوم صرف پانی پت نہ تھا۔ دلّی سے انھیں اپنے پانی پت سے زیادہ پیار تھا۔ اس کا ذکر کرتے ہیں تو دل ہلا دیتے ہیں:

تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سُنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز
لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیّاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
چپّے چپّے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانا ہرگز

لیکن یہ محبّت صرف پانی پت یا دلّی تک محدود نہ تھی۔ وہ یوں تو ساری انسانیت کا درد اپنے دل میں رکھتے تھے لیکن خاص طور پر اپنے اہلِ وطن کی محبّت اور ان کے درد سے ان کا دل معمور تھا۔ بظاہر وہ خود اپنے آپ ہی کو چونکاتے ہیں مگر دراصل اہلِ وطن کو سمجھانا مقصود ہے:

نام ہے کیا اسی کا حُبّ وطن
جس کی تجھ کو لگی ہوئی ہے لگن
کیا وطن کی یہی محبّت ہے
یہ بھی اُلفت میں کوئی اُلفت ہے
اس میں انساں سے کم نہیں ہیں درند
اس سے خالی نہیں چرند و پرند

حالی کے یہاں وطن کی محبّت کے معنی اہلِ وطن کی محبّت سے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے اور بعد میں ہندوستان کی حالت بہت غیر ہوچکی تھی امن و اماں مفقود لوٹ مار اور قتل و غارت کا زور، اقتصادی بدحالی کا دور دورہ، سیاسی انتشار ـــــ اس کا نام ہندوستان تھا۔ اس پریشاں حالی کا حالی کے دل پر گہرا صدمہ تھا۔ اور جب کمپنی کی حکومت کے بعد ملکہ وکٹوریہ کی حکومت کا دور آیا اور عارضی سہی امن وسکون کی زندگی کی جھلک نظر آئی، اور تعلیم و ترقی کی اُمید بندھی تو نوجوان حالی انگریزی حکومت کی ان برکتوں سے ابتدا میں کافی متاثر ہوئے۔ مگر جب یہ طلسم ٹوٹا تو حالی نے صاف صاف دیکھا کہ یہ دھوکا تھا سراب تھا، ان کا حسّاس شاعر دل تڑپ اٹھا۔ اس دور میں کھل کر کہنے کی ہمّت بھلا کسے تھی مگر پھر بھی ان کے کلام میں ہمیں جا بجا اس کے اشارے ملتے ہیں کہ وہ اس بدیسی حکومت کی ناانصافی و تباہ کاری سے آگاہ اور بیزار تھے۔ "ایک کالے اور ایک گورے کے میڈیکل امتحان" اپنی چھوٹی سی ایک نظم میں انھوں نے صاف صاف ظاہر کر دیا ہے کہ وہ انگریزوں سے کسی انصاف اور رواداری کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ ایک اور چھوٹے سے قطعے میں انھوں نے انگریزی حکومت کی سیاست کے بحرِ ذخّار کو کوزے میں بند کر دیا ہے دیکھیے:

پھر گئے بھائیوں سے جب بھائی
جو نہ آئی تھی وہ بلا آئی
پاؤں اقبال کے اکھڑنے لگے
ملک پر سب کے ہاتھ پڑنے لگے
کبھی تورانیوں نے گھر لوٹا
کبھی درّانیوں نے زر لوٹا
کبھی نادر نے قتلِ عام کیا
کبھی محمود نے غلام کیا

اور جب وہ اہلِ وطن میں اتفاق و اتحاد کی جھلک دیکھتے ہیں، تو ان کا دل جو نا امیدی سے خون ہو رہا ہے اُمید سے جگمگا اٹھتا ہے:

صد شکر وطن سے کوچ نفرت نے کیا
گھر اہلِ وطن کے دل میں الفت نے کیا
تقریروں سے ہوسکا نہ تحریروں سے
وہ کارِ نمایاں کہ مصیبت نے کیا

بہشت کا منظر یوں دکھاتے ہیں:

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں
شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں کہ ہے جہنم دُنیا
وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

سودیشی کی تحریک جب ملک میں شروع ہوئی تو حالی نے اس کا دل سے خیر مقدم کیا اس لیے کہ وہ اہلِ وطن کی بدحالی کا بڑا سبب بدیسی مال کی درآمد کو مانتے تھے اپنی مشہور مسدّس میں اس کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

اگر اک پہننے کو ٹوپی بنائیں
تو کپڑا وہ اک اور دُنیا سے لائیں
جو سینے کو وہ ایک سوئی منگائیں
تو مشرق سے مغرب میں لینے کو جائیں

پھر کہتے ہیں:

نہ پاس اس کے چادر نہ بستر ہے گھر کا
نہ برتن ہیں گھر کے نہ زیور ہے گھر کا
نہ چاقو نہ قینچی نہ نشتر ہے گھر کا
صراحی ہے گھر کی نہ ساغر ہے گھر کا
کنول مجلسوں میں، قلم دفتروں میں
اثاثہ ہے سب عاریت کا گھروں میں

وہ جگہ جگہ صاحبانِ علم اور اہلِ ہنر کو، اہلِ دولت اور اہلِ سیاست کو یہ دعوت دیتے ہیں کہ اہلِ وطن کو پستی سے نکال کر ترقی کی راہ پر گامزن کرنا، جہالت کے اندھیارے سے روشنی میں لانا، بدحالی و غربت کے پنجے سے آزاد کر کے صنعت و حرفت، تجارت و خوشحالی کی راہیں ان کے سامنے کھولنا ہی وطن اور اہلِ وطن کی سچی محبت ہے :

ہے کوئی اپنی قوم کا ہمدرد
نوعِ انساں کا جس کو سمجھیں فرد
س پہ اطلاقِ آدمی ہو صحیح
جس کو حیواں پہ دے سکیں ترجیح
م پر کوئی زد نہ دیکھ سکے
قوم کا حالِ بد نہ دیکھ سکے
م سے جان تک عزیز نہ ہو
قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو

کہتے ہیں :

ے بے فکر کیسا ہو ہم وطنو
اٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو
ب کبھی زندگی کا لطف اٹھاؤ
دل کو دکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ
سلو مُدبروں کو یاد کرو
خوش دلو! غم زدوں کو یاد کرو؟
نے والے غافلوں کو جگاؤ
تیرنے والے ڈوبتوں کو تراؤ؟
اگر چاہتے ہو ملک کی خیر
نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر

پھر آگے چل کر اہلِ دولت، اہلِ علم اور شاعروں اور ادیبوں کو تنبیہہ کرتے ہیں :

تم نے دیکھا ہے جو وہ سب کو دکھاؤ
تم نے چکھا ہے جو وہ سب کو چکھاؤ
علم کو کر دو کوبہ کو ارزاں
ہند کو کر دکھاؤ انگلستاں
گر رہا چاہتے ہو عزت سے
بھائیوں کو نکالو ذلت سے

ایک اور رباعی میں اہلِ وطن سے کہتے ہیں :

یارو نہیں وقت آرام کا یہ
موقع ہے اخیرِ فکرِ انجام کا یہ
بس حُبِّ وطن کا جپ چکے نام بہت
اب کام کرو کہ وقت ہے کام کا یہ

ان کے یہاں ہلکا ہلکا طنز بھی ملتا ہے، جس کے پردے میں وہ اہلِ وطن کو جگانا چاہتے ہیں۔ کبھی نرم اور کبھی جوش۔ انھیں اپنے دیس کی آزادی پیاری تھی، یہ کہہ دینا آسان ہو سکتا ہے۔ جب تک ہم کچھ نہ کچھ ثبوت فراہم نہ کریں۔ اوپر ہم نے ان کی وطن اور اہلِ وطن سے محبت پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔ یہاں ان کے چند شعر (جو شعری لحاظ سے سپاٹ سہی مگر ان کے خیالات کے آئینہ دار ضرور ہیں) نقل کرتے ہیں، طنز کی گہرائی قابلِ غور ہے :

ایک مہندی نے کہا حاصل ہے آزادی جنھیں
قدرداں ان سے بہت بڑھ کر ہیں آزادی کے ہم
ہم کہ غیروں کے سدا محکوم رہتے آئے ہیں
قدر آزادی کی جتنی ہم کو ہو اتنی ہے کم
عافیت کی قدر ہوتی ہے مصیبت میں سدا
بے نوا کو ہے زیادہ قدرِ دینار و درم
"یعرف الاشیا بالاضداد" ہے قولِ حکیم
دے گا قیدی سے زیادہ کون آزادی پہ دم
سن کے اک آزاد نے یہ لاف چپکے سے کہا
"ہے سقر موری کے کیڑے کے لیے باغِ ارم"

آزاد سے مطلب مجذوب یا بے دھڑک سچ کہنے والا ہوتا ہے۔ جو کسی سے نہ ڈرے یہاں آزاد کے منہ سے مندرجہ بالا جملہ کہنے والوں پر غضب کا طنز ملتا ہے۔ جو کیڑے موری میں رہنے کے عادی ہو چکے ہیں بہشت ان کے لیے جہنم ہے۔

تقریباً سوا سو سال پہلے جب مکمل آزادی اور سوراج کا پورا احساس بھی نہ تھا حالی کے یہاں ہمیں وطن کی محبت اور اہلِ وطن کی بہبود کا گہرا جذبہ نظر آتا ہے۔ اس مختصر مضمون میں تفصیل کی گنجائش نہ تھی۔ ورنہ ان کی نثری تصانیف اور مسدس وغیرہ سے اس کی اور بہت سی مثالیں دی جا سکتی تھیں۔

غزلیں

عنوان چشتی

مرنا جینا ہنسنا رونا تیرے نام
جیون کا ہر رنگ سلونا تیرے نام

رات کو جاگنا شب کو سونا تیرے نام
خوابوں کو پلکوں میں پرونا تیرے نام

تنہائی ہو یا سنّاٹا تیرے لیے
باتوں میں موتی سے پرونا تیرے نام

اپنے پرائے غم ہیں ہزاروں، دل ہے ایک
کوزے میں دریا کو سمونا تیرے نام

یوں ہی کیا کم بوجھ تھا تن کی مٹّی کا
من کی چادر غم سے بھگونا تیرے نام

یوں تو فقیرِ عشق ہے خالی ہاتھ مگر
رُوح کا پارہ جسم کا سونا تیرے نام

راہِ طلب میں ہوش نہیں ہے سجدوں کا
سمتوں کا احساس بھی کھونا تیرے نام

قتل بھی ہیں، قاتل بھی ہیں، مقتول بھی ہیں
ہاتھ اپنے ہی خُون سے دھونا تیرے نام

اوّل و آخر، ظاہر و باطن، اللہ ہُو
میرا ہونا اور نہ ہونا تیرے نام

میرے لیے ہے اسمِ اعظم نام ترا
اپنے نام سے وحشت ہونا تیرے نام

تجھ کو دیکھ کے، غیر کو دیکھوں ناممکن
سوئیاں آنکھوں میں چبھونا تیرے نام

تیرے نام سے خُود کو پکاروں اے عنواؔن
اپنی یاد میں پاگل ہونا تیرے نام

سیدھے خوابوں کی اُلٹی تعبیریں کیوں
کس سے پوچھیں، لیکن ٹھہرو، پوچھیں کیوں

سوچنا اُن کا کام، جو قدموں سے اُلجھیں
سیدھے قدموں چلنے والے سوچیں کیوں

رکّھیں جلتے ہونٹوں کا ہی تازہ نام
اپنی سوچوں پر اِک دریا لکّھیں کیوں

سورج اب بھی مشرق مغرب اُلجھا ہے
صاحب آخر بولیں، یہ دیواریں کیوں

اب گُل اپنی خُوشبو خُود پی لیتے ہیں
سارے چُپ ہیں صرف ہوائیں بولیں کیوں

سوچنے والا ہو تو کیوں کر پُوچھے گا
روز بناتا ہوں تازہ تصویریں کیوں

تعمیرِ صحرا میں اپنا حصّہ ہے
صاحب جاہیں ہم رستوں پر بیٹھیں کیوں

دِل ہی نہ ڈوبے جب خوں بن کر آنکھوں میں
منظر کتنا ہی تازہ ہو دیکھیں کیوں

کس سے اے منظوؔر یہ پوچھوں، کون کہے
مہمل ہوتی جاتی ہیں تحریریں کیوں

حکیم منظور

موڑ

رتن کور سے پہلی ملاقات محض ایک ــــ نفاق تھا۔

ایک بہت بڑی کلچرل کانفرنس ہو رہی تھی بنڈی گڑھ میں۔ جس ادارے نے اس کانفرنس کا ہتمام کیا تھا دراصل تو وہ ایک ون مین اِدارہ ہی تھا جس کا پریذیڈینٹ یونیورسٹی کا ایک پروفیسر تھا ور سکریٹری اُس کی بیوی تھی جس کے بڑے چرچے تھے۔ یکن اِدارے کی ایک ایڈوایزری کمیٹی بھی تھی جس میں بچھ اُونچے لوگ شامل تھے۔ رتن کور اس کمیٹی کی ممبر تھی۔ یڈوایزری کمیٹی نے مدد کے لیے ایک استقبالیہ کمیٹی ھی تشکیل کر لی تھی اور مجھے اُس کمیٹی کا ممبر نامزد کیا تھا۔ اُسی کمیٹی کی پہلی میٹنگ تھی جو اُس کلچرل اِدارے ے پریذیڈینٹ نے اپنے آفس میں رکھی تھی۔ میں پہلی ار وہاں گیا تھا۔

یہ محض ایک اتفاق تھا کہ میٹنگ میں میری ساتھ والی کُرسی پر رتن کور بیٹھی تھی۔ جب سیلف ٹروڈکشن ہوئی تو مجھے معلوم ہوا کہ میرے ساتھ والی کُرسی پر نہایت ہی خُوب صورت کپڑے کی بہت ـــ چھی سِلی ہوئی بلیو رنگ کی شلوار قمیض پہنے جو خاتون بیٹھی تھی اُس کا نام رتن کور تھا اور وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور اُس کلچرل اِدارے کی تف ممبر بھی تھی اور اُسے کلچرل ایکٹی وِٹیز میں خاصی ل چسپی تھی۔

رتن کور کے بعد جب میں نے اپنی انٹروڈکشن رائی تو اُس نے مسکرا کر دھیرے سے کہا ـــــ

"تو آپ ہیں ماتھر صاحب"۔

"جی ــــ" اُس کی عمر کے لحاظ سے اُس کا چہرہ بہت زیادہ شگفتہ تھا۔ حالاں کہ اُس نے میک اَپ بھی نہیں کر رکھا تھا۔

"میری ایک دوست آپ کی بہت تعریف کرتی ہے"۔

کون ــــ؟" میں نے اُس کے پورے چہرے خوب صورت آنکھوں اور موتیوں جیسے آب دار دانتوں کو نہارتے ہوئے پُوچھا ــــ

"آپ کی ایک فین ہے۔ آپ کی آواز پر مرتی ہے"۔

"مگر وہ ہے کون؟" میں نے مُسکرا کر اُس کی تمام شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

"پھر کبھی بتاؤں گی"۔ اُس نے بڑے ہی پیارے انداز سے مُسکرا کر موضوع بدل ڈالا۔

اور پھر کمیٹی کی میٹنگ کی کارروائی شروع ہوگئی اور پریذیڈینٹ نے دو تین چھوٹی کمیٹیاں نامزد کردیں تاکہ کانفرنس کا کام بانٹا جاسکے اور کہیں کنفیوژن نہ ہو۔ مجھے لگا کہ اِدارے کا پریذیڈینٹ ایک اچھا آرگینایزر تھا اور ایک اچھا پی آر او بھی تھا۔ اُس نے بڑی مسکین آواز اور عاجزانہ لہجے سے اپنے سارے ہی کام دُوسروں کے ذمّے ڈال دیے۔ یہاں تک کہ باہر سے آنے والے مہمانوں کے قیام کا انتظام بھی دُوسروں کے ذمّے ڈال دیا۔ روپیہ بھی کم خرچ ہو اور بادریشن بھی زیادہ نہ ہو۔ ایڈوایزری کمیٹی اور استقبالیہ کمیٹی کے قریب قریب ہر ممبر نے ایک یا دو مہمانوں کو اپنے پاس ٹھہرانے کا وعدہ کرلیا۔ رتن کور نے پانچ سیکٹر کی اپنی چار کنال کی کوٹھی کا اُوپر والا سارا حصّہ کلچرل اِدارے کے مہمانوں کے لیے وقف کر دیا۔ اُس کے بڑا ہی فراخ دِلی کا وعدہ کرنے کے بعد پریذیڈینٹ نے مجھ سے پُوچھا ــــ

"ماتھر صاحب، آپ کے ذمّے پاکستان سے آنے والے دو مہمان کر دُوں؟"

"نہیں ــــ آئی ایم سوری"۔

"کیوں ــــ؟"

"میرے پاس زیادہ کاموڈیشن بھی نہیں اور زیادہ سہولت بھی نہیں"۔

پریذیڈینٹ نے مُسکرا کر میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک دُوسرے ممبر کو مخاطب کیا۔ لیکن رتن کور چُپ نہ رہ سکی اور دھیرے سے بولی، اپنے چہرے کو میرے کان کے قریب کرکے۔ "سہولت کیوں نہیں آپ کے پاس؟"

"میرے ساتھ میری بزرگ ماں رہتی ہیں اینڈ آئی ڈونٹ وانٹ ٹو ڈسٹرب ہر"۔

"اور کون ہے آپ کے ساتھ؟"

"مائی اون سیلف۔ اے وی آئی پی"۔

"آئی سی"۔ اُس نے بڑے ہی پیارے انداز

کشمیری لال ذاکر
سیکریٹری ہریانہ اُردو اکادمی، پنچ کولا (ہریانہ)

سے مُسکرا کر کہا ـــــ

اُس کے بعد میری اُس سے کوئی بات نہیں ہوئی۔

میٹنگ ختم ہوئی تو میں اپنا اسکوٹر اسٹارٹ کر کے چلا آیا اور لوگ ایک دُوسرے سے بات چیت کرتے رہے۔

شام کو میرے گھر کے سامنے ایک فیٹ کار رُکی۔

اُس میں سے رتن کور اُتری۔ اُس نے کار کی کھڑکی کا شیشہ بند کیا۔ میرے گھر کا گیٹ کھولا اور پھر اندر آ کر کال بیل بجائی۔

میں نے دروازہ کھولا تو وہ سامنے کھڑی تھی۔ ایک اور شیڈ کی پیاری سی شلوار قمیض پہن رکھی تھی اُس نے۔ اس کا چہرہ اور بھی شگفتہ لگ رہا تھا۔

"تشریف لائیے۔"

وہ اندر آئی۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے اُس نے کہا ـــــ

"آپ نے یہ تو پُوچھا ہی نہیں کہ میں کیوں آئی ہوں؟"

"صبح دی ہوئی سٹیٹمینٹ کو ویری فائی کرنے۔"

وہ بہت زور سے ہنسی۔ پھر ایک دم رُک کر بولی ـــــ

"ماں جی اتنی زور کی ہنسی سے ڈسٹرب تو نہیں ہوں گی؟"

"وہ ہنسی سے ڈسٹرب نہیں ہوتیں۔"

"صرف آپ کے ریاض سے ڈسٹرب ہوتی ہیں؟"

"یس ـــ وہ بھی اُس وقت جب میں غزلیں گاؤں۔ بھجن گانے سے ڈسٹرب نہیں ہوتیں۔"

"لیکن آپ غزلیں بہت پیارے انداز سے گاتے ہیں۔"

"میری آواز کی فین کون ہیں، جن کا آپ ذکر کر رہی تھیں؟"

"مجھے معلوم تھا۔ آپ یہ سوال ضرور پوچھیں گے؟"

"اچھا نہیں لگتا تو مت بتائیے۔"

"ریڈیو پر آپ کی آواز بہت ہی خوب صورت لگتی ہے۔ آپ ٹیلی ویژن پر کیوں نہیں گاتے؟"

"ٹیلی ویژن میں آواز کے ساتھ شکل بھی سامنے ہوتی ہے۔"

"تو اُس سے کیا ہوتا ہے؟"

"آواز کا امپیکٹ ختم ہو جاتا ہے۔"

"تو آپ ٹیلی ویژن پر کبھی نہیں گائیں گے۔"

"شاید نہیں۔"

"دُور درشن جالندھر کے ڈائریکٹر میرے واقف ہیں۔"

"میرے بھی واقف ہیں وہ۔ آپ اگر کوئی پروگرام لینا چاہیں تو دِلوا سکتا ہوں۔"

"میں اپنی شکل کا امپیکٹ خراب کرنا نہیں چاہتی۔" اُس نے بڑے ہی خوب صورت انداز سے مُسکرا کر جواب دیا ـــــ

"اگر آواز میری ہو جاتے اور چہرہ آپ کا؟"

"تو پھر سنسرز تباہ ہو جائیں گے۔"

"اور آپ کسی کو تباہ کرنا نہیں چاہتیں؟"

"نہیں، ایسی بات بھی نہیں۔ ڈی پینڈز۔"

"ڈی پینڈز اون وٹ؟"

"دی کنسرنڈ پارٹی۔"

پھر ہم دونوں زور سے ہنسے اور اُس لمحہ میری ماں ڈرائینگ رُوم میں داخل ہوئی۔

"میٹ مائی مدر۔"

رتن کور نے صوفے سے اُٹھ کر میری ماں کے پاؤں چھوئے۔

"جیوندی رہو۔" ماں نے رتن کور کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

میں نے ماں کے بیٹھنے کے لیے جگہ خالی کر دی اور ذرا ایک طرف ہو گیا صوفے پر۔

"کی ناؤں ایں دھیئے تیرا؟"

"جی رتن کور۔" اس نے مُسکرا کر کہا ـــــ

"تیرا ہنسنا بڑا سوہنا ایں۔"

رتن کور اور زور سے ہنسی۔

"تیرے ہسن دی واج سُن کے تے میں اندر آئی سی۔"

رتن کور اور بھی زور سے ہنسی۔

"توں پہلی وار آئی ایں ساڈے گھر؟"

"جی ماں جی۔"

"کی ناؤں دسیا ہے توں؟"

"رتن کور۔"

"رتن کور سوہنا ناؤں نہیں۔"

"تسیں بدل دیو ماں جی۔"

"رتنا رکھ لے۔"

"بس رتنا ہو گیا اج توں۔"

"تم تو سب کے نام بدلتی رہتی ہو ماں۔ میرا اچھا بھلا نام ہے راکیش۔ وہ بھی پسند نہیں میری ماں کو۔"

"لمبا ناؤں ایں۔ مُنہ تے نہیں چڑھدا۔" ماں نے کہا ـــــ

"کی ناؤں رکھیا ہے تُسیں اپنے پُت دا؟"

"راکی ـــــ"

"بہت چنگا ناؤں ایں۔"

"رتنا وی چنگا ہے ناں؟"

"بہت سونیا ہے ماں جی۔"

"کی پیویں گی دیکھیے ؟"
"آج نہیں ۔ اگلی واراں سہی ۔"
"چنگا ۔"
تھوڑی دیر کے بعد ماں ڈرائینگ رُوم سے چلی گئی اور جانے سے پہلے اُس نے رتن کور کو اپنے ساتھ چمٹایا اور اُسے پیار کیا ۔
"آپ کی صبح کی سٹیٹمینٹ ویری فانی ہوگئی ۔"
وہ بولی ——
"تھینکس ۔"
"آپ مہمانوں کو نہ لایا کریں اپنے گھر ۔"
"بہت اچھا ۔ لیکن اگر کوئی مہمان آپ سے آپ آجائے ۔"
"تو اُسے نکال دیجیے ۔"
"بٹ اِٹ ڈپینڈز ؟"
"ڈپینڈز اون ہُوٹ ؟"
"دی کنسرنڈ پارٹی ۔"
پھر وہ بہت زور سے ہنسی اور پھر اُس نے کہا ——
"جائے تو میں اگلی بار پیوں گی لیکن پانی تو بلوا دیجیے ۔"
"ویری سوری رتن کور جی ۔"
"رتنا از بیٹر ۔"
میں نے جب پانی کا گلاس ٹرے میں رکھ کر اُس کے سامنے کیا تو اُس نے لمحہ بھر میں خالی کر دیا ۔
"آپ کو تو بہت پیاس لگ رہی تھی ۔"
"اس کا خیال آپ کو ہونا چاہیے تھا ۔ نیور مائنڈ ۔"
اور پھر رتن کور جانے کو اُٹھی ۔ میں نے دروازہ کھولا ، پھر گیٹ کھولا اور پھر اُسے گاڑی تک چھوڑنے باہر آیا ۔ گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے اُس نے کہا ——
"آئی لو یور مدر ۔"
"تھینکس ۔"
"میں اب تمھارے لیے رتنا ہوں ، رتن کور نہیں —— یاد رکھنا ۔"
"آل رائٹ ۔"
"وہ جو تمھاری آواز کی فین تھی ۔ وہ میں ہی ہوں —— رتنا ۔"
پیشتر اس کے کہ میں کوئی جواب دیتا اُس نے کار اسٹارٹ کر دی ، مُسکرا کر ہاتھ ہلایا اور سڑک کا موڑ مڑ گئی ۔
میں نے اُس روز پہلی بار احساس کیا کہ مکان سڑک کے موڑ پر ہرگز نہیں ہونا چاہیے ۔ ورنہ سیدھی سڑک تو کبھی آئے گی ہی نہیں ۔ زندگی صرف موڑوں میں ہی اُلجھ کر رہ جائے گی ۔ اور زندگی کا سفر موڑوں سے نہیں راستوں سے طے ہوتا ہے ۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی دانش وری

دانش ور کا لفظ سکۂ رائج الوقت ہے، جب کہ ماضی قریب تک اس معنی میں دانش مند کا لفظ مروّج تھا۔ سعدی کا یہ بیان مشہور ہے کہ "نہ محقق بود نہ دانش مند، چار پایہ برو کتابے چند"۔ دانش مندی کے مفہوم میں خرد مند اور عقل مند جیسے الفاظ کا استعمال بھی ہوتا رہا ہے۔ لہٰذا لفظ دانش ور وقت کا ایک نیا سکّہ ہے اور چلا ہوا ہے۔ یہ انگریزی لفظ "انٹلکچوال" (INTELLECTUAL) کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے غور کیا جائے تو اُردو میں اس کا استعمال محلِّ نظر ہے۔ انگریزی لفظ "انٹلکٹ" (INTELLECT) ذہن و دماغ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، چناں چہ "انٹلکچوال" کا ترجمہ "صاحب دماغ" یا "ذہین" ہو سکتا تھا۔ لیکن شاید ایک دوسرے انگریزی لفظ "انٹلیجنٹ" (INTELLIGENT) کے مفہوم میں لفظ "ذہین" کے پہلے سے مروّج ہونے کے سبب لوگوں نے انٹلکچوال کا ترجمہ اس سے مختلف ایک لفظ "دانش ور" کی شکل میں کرنا ضروری یا مناسب تصوّر کیا۔

بہر حال، انٹلکچوال یا دانش ور کا مطلب ہے ایک ایسا شخص جو ذہنی قوت رکھتا ہو اور اس کی قوتِ ذہنی کا اظہار علم و ادب کی دُنیا میں ہوا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر معلّمین و مدرّسین کو دانش ور کہا اور سمجھا جاتا ہے اس لیے کہ تعلیم و تدریس قوتِ ذہنی کے بغیر ممکن نہیں۔ اس طرح لفظ دانش ور کا اطلاق بہت عام ہو جاتا ہے اور اس کے دائرے

عمومیت کے ردِّ عمل میں اُردو ادب کے کچھ بقراطوں نے دانش وری کے اطلاق کو اتنا محدود کر دیا ہے کہ ان کی نگاہ میں یہ معشوق کی موہوم کمر یا اقلیدس کا خیالی نقطہ بن کر رہ گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی بات کرنے والے صرف اپنے آپ کو دانش ور تصور کرتے ہیں، حالاں کہ یہ ان کی صریح بے دانشی ہے کہ وہ اُردو ادب میں دانش وری کی ایک طویل تاریخ اور عصرِ حاضر میں بھی اس کے نمایاں مظاہر کے باوجود شپرّہ چشم کی طرح اپنے ادب بالخصوص اس کے دورِ جدید میں دانش وری کی چہار سو بکھری ہوئی کرنوں کو دیکھ نہیں پاتے۔ یقیناً ایسے لوگ مغرب سے، مغرب کی بہت کم واقفیت رکھنے کے باوجود، اس درجہ مرعوب ہیں کہ مشرق میں انھیں دانش وری کی روایت یا موجودہ حقیقت کا سراغ نہیں ملتا۔ دراصل یہ ان کی ذہنی بے چارگی اور اس کے نتیجے میں احساس کم تری ہے جو انھیں دانش وری کو کوئی نادر الوجود چیز سمجھنے پر مجبور کرتا ہے۔ ایسی مرعوب ذہنیت کے فریب خوردہ افراد تو یقیناً دانش ور نہیں کہے جا سکتے۔

فی الواقع اصل انگریزی لفظ انٹلکچوال اور اس کے مروّج اُردو مترادف دانش ور کا اطلاق، انگریزی علم و ادب کی دُنیا کی طرح، اُردو میں بھی تمام ان ادیبوں، شاعروں، معلّموں اور خطیبوں پر ہو سکتا ہے جن کی علمی و ادبی کوششوں کا کوئی معیار ہو جس کے مطابق انھوں نے کچھ قابلِ ذکر کام کر کے دکھائے

کے ساتھ ساتھ اُردو میں بھی صدیوں سے دانش وری کی ایک مستحکم روایت پائی جاتی ہے اور اس کا تسلسل باقی ہے، چناں چہ عصرِ حاضر میں بھی اُردو زبان و ادب میں ابھرنے والے دانش وروں کی کمی نہیں۔ ان میں شاعر بھی ہیں، افسانہ و ناول نگار بھی، نقّاد و محقق بھی، طنز و مزاح نگار بھی، علما و مفکّرین بھی، معلّمین و مدرّسین بھی۔

مولانا ابوالکلام آزاد اُردو زبان و ادب میں نمایاں ہونے والے عظیم ترین دانش وروں میں ایک ہیں اور ان کے درمیان اپنا ایک مخصوص و ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ وہ اُردو کے ایک صاحب طرز ادیب اور زبردست خطیب ہیں۔ ان کے علم و فضل اور ذہانت و فطانت کے افسانے مشہور ہیں۔ ان کے تدبّر و تدبیر کے واقعات تاریخ کا حصّہ بن چکے ہیں۔ مولانا کے کمالات کا اظہار حسب ذیل دائروں میں ہوا۔

صحافت

یکے بعد دیگرے مولانا کے زیر ادارت نکلنے والے رسالوں، الہلال اور البلاغ نے عصرِ حاضر میں اُردو صحافت کی ایک تاریخ بنائی ہے۔ ہندوستان کی اجتماعی زندگی میں عہد آفریں

عبدالمغنی
وارثی کنج، عالم گنج، پٹنہ ۸۰۰۰۰۷

ثابت ہوتے ہیں۔ اعلیٰ پایے کی علمیت و ادبیت کے باوصف ان رسائل کی مقبولیت ایک عجوبے سے کم نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحافت کے ذریعے حالاتِ حاضرہ کی آگاہی کے ساتھ ساتھ عوام و خواص دونوں کی ذہنی و اخلاقی تربیت بھی کی جا سکتی ہے۔ یہی کام صحافت کا بہترین معیار ہے۔ اس لحاظ سے مولانا آزاد دُنیا کے عظیم ترین صحافیوں میں ایک ہیں اور ان کی عظمت کا ایک طرۂ امتیاز یہ ہے کہ ان کی صحافت علمیت پر مبنی تھی، جو آج کی عالمی صحافت ہیں، خواہ وہ کسی زبان اور ملک کی ہو، گویا مفقود ہے۔ دوسری بات یہ کہ الہلال و البلاغ کی صحافت برائے صحافت نہیں تھی، اس کا تعلق نہ تو پیشہ ورانہ کاروبار سے تھا نہ شخصی یا جماعتی گروہ بندی سے۔ اس کا مقصد شعور کی تربیت اور کردار کی تشکیل تھی۔ یہ انسان سازی کی ایک مہم تھی۔ اس نے غلامی، نفاق اور نابرابری کے دور میں پورے برصغیر کو حریت، اخوت اور مساوات کا پیغام اس طرح دیا کہ اس کی گونج ملک سے باہر بھی سنی گئی، اس لیے کہ اس نے وقت اور دُنیا کے تمام مسائل کو اپنا موضوع بنایا اور ہر معاملے میں بصیرت و جرأت کے ساتھ اظہارِ خیال کیا۔ یہ ایک صورِ اسرافیل تھا جس نے ہند اور مشرق کے خفتہ دماغوں کو اس وقت بیدار کیا جب اقبال کا نغمۂ جبرئیل یخ بستہ دلوں کو گرما رہا تھا۔

مکتوب نگاری

مولانا آزاد نے کچھ شاعری بھی کی اور چند افسانے بھی لکھے، مگر ان کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ وہ خطوط ہیں جو غبارِ خاطر اور کاروانِ خیال کے عنوانات سے لکھے گئے۔ ان مکاتیب میں متنوع موضوعات پر معلومات کا جو دریا قلم برداشتہ بہایا گیا ہے اس سے زیادہ اہم انشا پردازی کا وہ فصیح و بلیغ اسلوب ہے جو اپنی جگہ منفرد ہے اور جس کے موجد اور خاتم دونوں مولانا آزاد ہی ہیں۔ جن نکتہ چینوں نے ان شاندار مکاتیب کی زبان و بیان پر اعتراضات کیے ہیں انھوں نے زبان دانی کا ثبوت کم اور کم عقلی کا ثبوت زیادہ دیا ہے۔ ان ناصحانِ مشفق نے خاص کر خطوط کی عبارت میں عربیت و فارسیت پر تنقید فرمائی ہے اور یہ بھول گئے ہیں کہ اگر اُردو کے خمیر سے عربی و فارسی کو خارج کر دیا جائے تو وہ اس کے نتیجے میں ایک بے مزہ، بے رس اور محض کتابی زبان ہو جائے گی۔ ماہرینِ لسانیات و عمرانیات کو جاننا چاہیے کہ اُردو عہدِ وسطیٰ میں ابھرنے والی جدید ہندوستانی تہذیب کی وہ زبان ہے جس کا سانچہ ملکی پراکرتوں کے ساتھ عربی و فارسی کے نقوش سے ہی تیار ہوا ہے اور یہی نقوش آج بھی دُنیا کے ایک بڑے خطّے میں اُردو کی تازگی و تابندگی کا باعث ہیں۔ مقبول عام اُردو غزلوں اور گیتوں نیز تقریروں اور مکالموں کا سارا جادو انھیں نقوش کا مرہونِ منّت ہے، اور خطوط میں ظاہر ہونے والی مولانا آزاد کی ادبیت و خطابت بھی اُردو کی ایک جادوگری ہے۔ رہا تنقید کا یہ نکتہ کہ یہ خطوط غیر ذاتی قسم کے ہیں، ان کا مکتوب الیہ حقیقتاً مفقود اور قاصد عنقا ہے، لہٰذا ان میں وہ بے تکلفی نہیں جو مثلاً غالب کے خطوط میں ہے، تو جاننا چاہیے کہ مکتوب نگاری کا وہ معیار چند افراد کا خود ساختہ ہے، نہ کہ سب لوگوں کا مسلّمہ، جس کے مطابق خطوط میں شخصی بے تکلفی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ادبی خطوط کے لیے گھریلو خطوط ہونا ضروری نہیں۔ دُنیا کے ہر ادب کی تاریخ میں رقعات کی جو اہمیت ہے وہ ہرگز ان کے ذاتی ہونے پر مبنی نہیں۔ انگریزی اور فارسی میں اعلیٰ پایے کے ایسے ادبی خطوط بہ کثرت موجود ہیں جن کا مکتوب الیہ حقیقتاً کوئی خاص شخص نہیں، خواہ رسماً کسی کی طرف نسبت کر دی گئی ہو، جس طرح مولانا آزاد کے خطوط میں ہے، اور جن کا نامہ بر عنقا کے سوا کوئی اور نہیں۔

مولانا آزاد کے مکاتیب میں بلاشبہ ان کی انانیت کا اظہار ہوا ہے اور یہ ان خطوط کا عیب نہیں، حسن ہے۔ غبارِ خاطر اور کاروانِ خیال یقیناً ایک تاریخ ساز شخصیت کے اشاریے ہیں، اس کے ذہن و مزاج کے آئینے ہیں، اس کے طرز و انداز کے مجسّمے ہیں۔ ان مجسّموں کا سب سے نمایاں نقشِ علم و عرفان ہے۔ نفیس ترین ذوق اور بلند ترین شعور خطوطِ آزاد کی ہر سطر سے عیاں ہیں۔ دانش مندی اور دانش وری کا ایک بحرِ ذخّار ہے جو مکاتیب کے جملوں اور فقروں میں موج زن ہے۔ اس موج کی سطح پر اشعار کے بلبلے حسین قمقموں کی طرح جگمگا رہے ہیں۔ ایک متین کردار کی ساری نفاست، اپنے پورے جمال و جلال کے ساتھ، دل کے غبار اور خیال کے قافلے کی شکل میں آشکار ہے۔ یہ خطوط کسی دوسرے فرد کے ساتھ سرگوشی کرتے ہوں یا نہیں، اپنے آپ سے اتنی اونچی آواز میں سرگوشی ضرور کرتے ہیں کہ اس کی صدا کائنات میں سنی جاتی ہے۔ ان خطوط کا راز و نیاز انفرادی کم، آفاقی زیادہ ہے۔ ان کے ہر ہر لفظ اور ایک ایک ترکیب میں اس ابوالکلام آزاد کی روح بولتی ہے جو آزاد ہندوستان اور جدید مشرق کا ایک معمار ہے۔ ایسے خطوط ادبیاتِ عالم میں بہت تھوڑے ہیں اور اردو زبان و ادب کے لیے باعثِ فخر ہے کہ ان کے دو مجموعے ان میں پائے جاتے ہیں۔

سوانح

تذکرہ مولانا آزاد کے آبا و اجداد کی سوانح

ہے جو انھوں نے اپنے ایک خاص دور کے اسلوب
میں تحریر کی ہے، جب کہ انڈیا ونس فریڈم
(India wins Freedom) مولانا کی
سیاسی خود نوشت ہے جو اُردو میں املا کرائی گئی
اور انگریزی میں قلم بند ہوئی ہے۔ دونوں میں حافظے
کا کمال ہے، جب کہ آخرالذکر میں تحریکِ آزادی کے
دوران ملک کے انقلاب انگیز سیاسی احوال کا
نہایت حقیقت پسندانہ اور بصیرت مندانہ تجزیہ بھی
ہے۔ دونوں کتابوں کو ملا کر ایک تسلسل کے ساتھ
پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے اپنے شاندار ماضی
کے نامور اسلاف سے زندگی کا جو ورثہ پایا تھا اسے
انھوں نے اپنے زمانۂ حال کا بدرجہا عظیم تر اور
مشہور تر حصہ بنالیا، یہاں تک کہ اب مولانا کا
خاندان مولانا کے حوالے سے روشناسِ خلق ہے،
نہ کہ مولانا اپنے خاندان کے حوالے سے کہا جاسکتا
ہے کہ یہ تاریخ کی ترقی پذیر حرکت کا ایک نمونہ ہے۔
تذکرہ میں مولانا نے اپنے متعلق جو شاعری کی ہے
اس کے بعض شارحین نے اسے مسخ کرنے کی کوشش
کی ہے، لیکن یہ کوشش ان کی کم فہمی پر مبنی ہے۔
مولانا نے اپنے بعض احوال و کوایف کا اظہار چند
استعارات میں کیا ہے، جو اشعار کی طرح لطیف
ہیں، لہٰذا ان کا کوئی مفہوم متعین کرنا اتنا ہی
عبث ہے جتنا حافظ، غالب، خیام کے اشعار سے
ان کی سوانح مرتب کرنے کی کوشش۔ اس سلسلے میں
علامہ سید سلیمان ندوی نے خیام کی خمریات کو
جس طرح خرافات ثابت کیا ہے وہ بہت بصیرت
افروز ہے۔

انڈیا ونس فریڈم یا اُردو میں مرتب کے
دعوے کے مطابق مولانا آزاد کی املا کرائی ہوئی
خود نوشت "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" (مرتبہ
عبدالرزاق ملیح آبادی) وہ سوانحی تصانیف ہیں جن
سے مولانا آزاد کے ذہن و مزاج، شعور و کردار اور
کمالات و فتوحات کا سراغ ایک وسیع پس منظر
اور واضح تناظر میں ملتا ہے۔ ان تصانیف کا ہر صفحہ
مولانا آزاد کی عبقریت اور فطانت کی ایک تصویر
ہے۔ سوانح میں درج واقعات سے، جن کی صحت پر شبہ
کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں، واضح ہوتا ہے کہ مولانا
ایک نابغۂ روزگار تھے اور ان کی ذہانت نے ان کی
ریاضت سے مل کر ان کے دماغ و کردار کو ایک عجوبہ
بنادیا تھا۔ مولانا کے بہت ہی معروف و مستند معاصرین
مثلاً علامہ سید سلیمان ندوی اور پنڈت جواہر لال
نہرو نے بھی شہادت دی ہے کہ مولانا آزاد کی ذکاوت و
جودتِ طبع حیرت انگیز تھی۔ وہ بہت جلد کسی بات
کی تہہ کو پہنچ کر فی البدیہہ اس کا ایسا نقشہ مرتب
کر دیتے تھے کہ دوسرے لوگ کافی محنت و کاوش کے
بغیر نہیں کر سکتے تھے، خواہ علمی کتابوں پر تبصرے کا
معاملہ ہو یا اعلیٰ سیاسی مذاکرات کا، مولانا آزاد کا
ذہن ہر قسم کے دماغی کاموں کے لیے ہر وقت آمادہ
رہتا تھا اور مختلف علوم و فنون پر مولانا کی قدرت
کا عالم یہ تھا کہ وہ گویا اپنی ذات میں ایک
دائرۃ المعارف بن گئے تھے، ان کا مطالعہ قاموسی
تھا۔ ان کے حافظے میں کتب خانے آباد تھے اور ان
کے ادراک کی تیزی مشکل سے مشکل مسئلے کا حل چند
لمحوں میں نکال لیتی تھی۔ وہ جیلوں میں بیٹھ کر،
کتبِ حوالہ کے بغیر، علمی مضامین لکھا کرتے تھے اور
بڑی سے بڑی سیاسی دستاویز پر ایک نظر ڈال کر
فیصلہ کن گفتگو کر سکتے تھے۔

خطابت

مولانا آزاد کی خطابت مشہورِ زمانہ ہے۔ ان
کا شمار تاریخِ عالم کے عظیم ترین خطیبوں میں ہوتا ہے۔
ان کی تقریر ایک طلسم باندھتی تھی۔ اس کی سحر
انگیزی، اندازِ گفتگو کے وقار، اس کی روانی و برجستگی
اور اس کے زور و شوکت کے علاوہ لہجے کی دردمندی،
نظر کی بلندی، بیان کی وضاحت اور اظہارِ خیال کے
ربط و نظام پر مبنی تھی۔ اس خطابت کا وزن برمحل
اشعار، چست مصرعوں اور مناسبِ موقع آیاتِ قرآنی
سے قائم تھا۔ مولانا کی تقریریں بہ یک وقت دل و دماغ
دونوں کو اپیل کرتی تھیں، جذبات کو بیدار اور ارادات
کو مہمیز کرتی تھیں، انھیں سُن کر احساسات میں
تیزی اور خیالات میں روشنی پیدا ہوتی تھی۔ یہ
خطابت ذہانت، علمیت اور طلاقتِ لسانی کا ایک
نادر مرکب تھی۔ اس کے ذریعے مولانا نے ملک و ملّت
کی بہتیری گتھیاں سلجھائیں۔ ان کی مذہبی تقریروں
نے دین اسلام کے اسرار و رموز کا انکشاف کیا اور
سیاسی تقریروں نے سیاستِ وقت کے مسائل کا
حل پیش کیا۔ دونوں ان کی جرأتِ ایمانی اور فراستِ
عقلی کے شاہ کار ہیں۔

تفسیر

مولانا آزاد کی کتاب "ترجمان القرآن"
بہترین تفسیروں میں ایک ہے اور مولانا کا سب
سے بڑا علمی کارنامہ بھی یہی ہے۔ اس میں زندگی اور
انسانیت کے تمام امور کے متعلق آیاتِ قرآنی کی
جو تشریحات کی گئی ہیں ان سے حیات و کائنات کے
متعلق دین اسلام کی نہایت حکیمانہ ترجمانی ہوئی
ہے، جس کا مطالعہ حق اور حقیقت کے بہتیرے
اسرار و رموز کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ یہ ترجمانی جس
زبان میں کی گئی ہے وہی مولانا آزاد کا بہترین اسلوبِ
بیان ہے، جب کہ اس سے قبل الہلال و البلاغ
کی عبارتیں مولانا کے طرزِ نگارش کے ابتدائی نمونے
ہیں اور غبارِ خاطر کی نثر کو اس طرز کا ایک ارتقائی
مرحلہ کہا جاسکتا ہے۔ ترجمان القرآن فی الواقع تفسیر

کے ساتھ ساتھ ادب کا بھی ایک شاہکار ہے، جس سے اُردو کی علمی ثروت میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ اس کتاب میں مولانا نے دقیق ترین مسائل کی باریکیوں کا تجزیہ ایسی وضاحت و صراحت اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ کیا ہے کہ اس کو پڑھ کر ذوق و شعور دونوں سیراب اور شاداب ہو جاتے ہیں۔ اس تجزیے میں سلاست، روانی، شستگی اور شگفتگی کے ساتھ ایک وقار، متانت اور شوکت بھی ہے۔ اس طرح قیمتی، گہرے اور اہم نکات الفاظ و تراکیب کی جدّت و ندرت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، ایک ایک نکتے کی تمام تہیں کھول دی گئی ہیں اور سارے مضمرات واضح کر دیے گئے ہیں۔ یہ طرزِ بیان اُردو نثر کا نقطۂ عروج ہے۔ بلاشبہ اُردو کی بہترین نثر یا تو مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن میں تحریر کی گئی ہے یا مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تفہیم القرآن میں۔ دونوں اپنے اپنے مخصوص انداز میں قرآن مجید کی بہترین تفسیریں ہیں اور اُردو زبان یا کسی زبان میں ان تفسیروں سے بہتر ترجمانی کلامِ الٰہی کی نہیں کی گئی ہے۔ یہ دونوں تفسیریں عبقریت کی دستاویزیں ہیں، تلاشِ حقیقت اور جستجوئے حق میں ذہنِ انسانی کی بلند ترین پروازیں ہیں۔

علم و ادب کی دُنیا میں مولانا آزاد کی فتوحات کے اس مختصر تذکرے سے آشکار ہوتا ہے کہ مولانا ایک عالم و فاضل مدبّر تھے۔ ان کے علم و تدبّر کا مجموعی اظہار ان کی سیاست دانی اور عملی جدوجہد سے ہوتا ہے۔ وہ اپنے وقت کے ایک عظیم ترین قاید تھے۔ تحریک آزادی کی آزمایشوں میں انھوں نے مثالی صبر و تحمل، ایثار و قربانی، اولوالعزمی اور ثابت قدمی کا ثبوت دیا۔ موجودہ صدی میں نہ صرف غیر منقسم ہندوستان بلکہ دُنیا کا کوئی بڑے سے بڑا سیاست داں اجتماعی فکر و عمل کے میدان میں ان سے سبقت نہیں لے جا سکا ہے۔ مولانا کی یہ سیاسی عظمت ان کی علمیت پر مبنی ہے۔ ان کا تدبّر حکیمانہ تھا، وہ تاریخ پر ایک وسیع اور گہری نظر رکھتے تھے، انھوں نے اپنے زمانے اور ملک کے حالات و حقایق کا مطالعہ نہایت باریک بینی کے ساتھ کیا تھا، وہ ملّتوں کے مزاج اور لوگوں کی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھے، انھوں نے ایک طرف ماضی میں اور دوسری طرف مستقبل میں بہت دور دیکھا تھا، لہٰذا حال کا منظر ان کی نگاہوں میں آیینے کی طرح صاف و شفّاف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ برِّصغیر کے پیچیدہ سیاسی مسئلے کا جو حل انھوں نے تجویز کیا اور آزاد ہندوستان کا جو نقشہ انھوں نے ترتیب دیا اس سے بہتر حل اور نقشہ کوئی دوسرا سیاست داں نہیں پیش کر سکا۔ آزادی کے بعد جمہوریۂ ہند کے دستور کی تشکیل اور ملک کی خارجہ و داخلہ پالیسیوں کی تعمیر پر بھی مولانا آزاد کے ذہن رسا کی چھاپ بہت گہری ہے۔ ہندوستان کی قومی قیادت کے مثلّث میں ایک طرف گاندھی جی کے اقدامات تھے تو دوسری طرف پنڈت جواہر لال نہرو کے تخیلات، جب کہ دونوں کے بیچ میں مولانا آزاد کے افکار ان تصورات میں توازن قایم کر رہے تھے جن پر عصرِ حاضر کی سب سے بڑی جمہوریت کی بنا رکھی جا رہی تھی۔ اگر کسی ایک شخص کو ملک کی قومی قیادت کا ذہن کہا جا سکتا ہے تو وہ مولانا آزاد ہی تھے۔ یقیناً وہ نئے ہندوستان کے عظیم ترین معماروں میں ایک تھے اور جس حکمت عملی کے سبب آزاد ہندوستان پنڈت نہرو کی وزارت کے دور میں یورپ کے مقابلے پر ایشیا و افریقہ کا رہ نما بن کر ابھرنے لگا تھا وہ مولانا آزاد ہی کی بنائی ہوئی تھی۔

یہ ہے مولانا آزاد کی دانش وری کا ایک اجمالی خاکہ جس کے ایک ایک نقش پر کئی کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں اور ایک مبسوط کتاب میں کم از کم خاکے کے نقوش کی قدرے تشریح کی جا سکتی ہے۔ مولانا مروّجہ سیاسی اصطلاح میں ایک "فلسفی بادشاہ" (Phi-losopher-king) یا "عالم مدبّر" (Scholar Statesman) تھے۔ ان کی وفات پر پنڈت نہرو نے اسی معنی میں انھیں ساونت (Savant) کہا تھا۔ مولانا محقّق بھی تھے اور دانش مند بھی، ان کے حکیمانہ و منصفانہ خیالات دورِ قدیم کے خرد مندوں کی یاد تازہ کرتے ہیں، جب کہ ان کی گفتار و کردار میں جدید ترین دانش وروں کا انداز تھا۔

اس طرح وہ ایک جامع ذہن و شخصیت کے مالک تھے اور عہدِ حاضر کی نئی نسلیں فکر و عمل کے کتنے ہی سبق مولانا کے علم و اخلاق سے سیکھ سکتی ہیں۔ ہندوستان پر اسلامی تہذیب کے اثرات کا ایک مجسّم نمونہ مولانا ابوالکلام آزاد کی ذات تھی جس کی صفات اس کی زندگی ہی میں افسانہ بن چکی تھیں اور آج ضرورت ہے کہ اس افسانے کی حقیقت کا ادراک اور اتباع کیا جائے۔ مولانا آزاد کی دانش ورانہ و قایدانہ خدمات کا قرض ابھی آزاد ہندوستان کو ادا کرنا ہے۔

ممتاز میرزا

شکستہ دل ہی سازِ درد کی جھنکار ہیں
ں تہی دامن ہیں لیکن ابرِ گوہر بار ہیں

بھی ہو جا اب خموش اے شمعِ شامِ انتظار
ت ڈھلتی جا رہی ہے، صبح کے آثار ہیں

سے بچ کر چل زمانے، ہم سے کیا پہنچے گا فیض
ا کہ شہرِ درد کی گرتی ہوئی دیوار ہیں

ے غمِ دُنیا تجھے خاطر میں کب لائے ہیں ہم
ں مگر وہ غم کہ جو ناقابلِ اظہار ہیں

ر کوئی آئے عیادت کے لیے دیوانہ وار
ر نصیبِ دشمناں، ممتاز ہم بیمار ہیں

جی-۲، نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

○

کیا کروں بھاگ کے میں خود سے جدھر جاتی ہوں
ہر قدم پر کوئی آئینہ پڑا پاتی ہوں

میں تو کاغذ پہ بنی شاخ ہوں میرا کیا ہے
آندھیوں میں بھی کہاں جھومتی لہراتی ہوں

بیٹھ رہتا ہے الگ ہٹ کے مرا سایہ تک
جب بھی لگ کے کسی دیوار سے سستاتی ہوں

○

نکلنا خود سے مُمکن ہے نہ مُمکن واپسی میری
مجھے گھیرے ہوئے ہے ہر طرف سے بے رُخی میری

بُجھا کے رکھ گیا ہے کون مجھ کو طاقِ نسیاں پر
مجھے اندر سے پھونکے دے رہی ہے روشنی میری

میں اپنے جسم کے مُردہ عجائب گھر کی زینت ہوں
مجھے دیمک کی صورت چاٹتی ہے زندگی میری

عزیز بانو داراب وفا
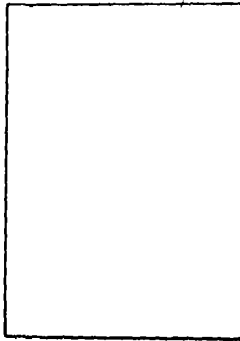
عزیز منزل، سبزی منڈی چوک، لکھنؤ

سیّدہ شانِ معراج

وسعتِ صحرا سے چھوٹے بام و در میں آگئے
صبح کے بچھڑے مسافر شام گھر میں آگئے

اوّل اوّل بے کراں تھیں آسماں کی وسعتیں
فاصلے پھر خود سمٹ کر بال و پر میں آگئے

دل میں پوشیدہ رہے وہ رازِ سربستہ مگر
بے سلیقہ چند آنسو چشمِ تر میں آگئے

رفتہ رفتہ رنگ لائے میرے سجدوں کے نشاں
عکس سارے پھر ابھر کر سنگِ در میں آگئے

شاعری کا غم، ادا جینے کی، اور آدابِ غم
یہ ہنر بھی شانؔ دستِ بے ہنر میں آگئے

ٹیرین بنگلہ، شاہجہاں پور ۲۴۲۰۰۱

دلی کے آثارِ قدیمہ

کالی مسجد

بستی نظام الدّین میں اُس مقام پر جو کبھی کوٹلہ نظام الدّین تھا اور کسی زمانے میں جس کے چاروں طرف فصیل تھی، خان جہاں کی بنائی ہوئی مسجد ہے۔ یہ مسجد جونا نشہ المخاطب بہ خان جہاں نے ۱۳۷۰ء میں تعمیر کی تھی۔ خان جہاں نے تقریباً اسی انداز کی دلّی میں سات مسجدیں بنوائی تھیں۔ خان جہاں کی بنائی ہوئی تمام مسجدیں سنگِ خارا کی بنی ہوئی ہیں۔ ان کی تعمیر بہت سادہ ہے، کسی طرح کی آرائش سے کام نہیں لیا گیا۔ تعمیر میں صرف چونے اور پتّھر سے کام لیا گیا ہے۔

اب مسجد کے چاروں طرف مکان بن گئے ہیں۔ پچھلے سال سے اس مسجد کی ایسی مرمّت کی جارہی ہے، جس سے مسجد کی قدامت اور تاریخی حیثیت کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے، مسجد کی قبلہ دیوار میں ٹائل لگائے جارہے ہیں، قبلہ دیوار کی محراب میں پلاسٹر کرکے اس میں ٹوٹے ہوئے رنگین ٹائل لگائے گئے ہیں۔ یہ آرائش پان والے اور چائے والوں کی دُکان کی ہوتی ہے۔ مسجد کے بیشتر حصّے پر سفیدی کردی گئی ہے۔ میں نے نواب قدسیہ کی تعمیر کردہ سنہری مسجد (لال قلعے کے دلّی دروازے کے قریب) کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ آثارِ قدیمہ کی مسجدوں میں مسلمانوں کو نماز پڑھنے کی اجازت ضرور دی جائے لیکن اس کی مرمّت کا کام آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا ہی کو کرنا چاہیے۔ اگر جدید تعمیر اور مرمّت کے نام پر مسجدوں کے قدیم کردار کو ختم کیا جارہا ہے تو اس کی ذمّہ دار آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا ہے۔ اس طرف فوری توجّہ کی ضرورت ہے۔ مسجد کے صدر دروازے پر یہ کتبہ لگا ہوا ہے:

"بکرم و فضلِ حق سبحانہ و تعالیٰ۔ د[ر عہد] سلطان السلاطین الزمان الواثق بتائید الرح[مٰن] ابوالمظفر فیروز شاہ السلطان خلد اللہ ملکہ و امرہ و شانہٗ، این مسجد بنا کردہ، بندہ زادۂ درگ[اہ] آسمان جاہ، عالم پناہ، جونا نشہ مسئول المملکۃ بہ خانِ جہاں ابن خان جہاں در سال ہفت[صد] صد و ہفتاد و دو ہجری پیغمبر صلی اللہ علیہ و آ[لہ] خدا بر آن بندہ رحمت کند۔ ہر کہ دریں مسجد نم[از] بگذارد این بندہ را بفاتحہ و دعائے ایمان یاد ک[ند]"

چھ سو گیارہ سال قبل بنی ہوئی یہ مس[جد] آج بھی پوری مضبوطی کے ساتھ کھڑی ہوئی ہے

نامعلوم گنبد

درگاہ کا صدر دروازہ شمال کی طرف
اس دروازے سے داخل ہونے کے لیے ایک ا[یسی] سڑک سے گزرنا ہوتا ہے، جس کے دائیں طرف ایک میدان ہے، جھگیاں پڑی ہوئی ہیں اور کچھ قبریں ہیں۔ بائیں طرف پہلے کار کی مرمّت ورکشاپ ہے اور پھر ایک نامعلوم مقبرہ ہے۔ مقبرے کی ساخت پٹھانوں کے عہد کی ہے۔ دو[...]

خلیق انجم
جنرل سکریٹری انجمن ترقّیٔ اُردو (ہند)، راؤز ایونیو، نئی د[ہلی]

جونا نشہ المخاطب خان جہاں کی کالی مسجد (بستی حضرت نظام الدّین)

درگاہ حضرت نظام الدین کے شمالی دروازے کے باہر ایک نامعلوم گنبد

سال قبل تک اس مقبرے میں رہائش تھی اور صدیقی صاحب نام کے ایک صاحب اس میں رہتے تھے۔ صدیقی صاحب اس مقبرے کا نام "شمع برج" بتاتے ہیں، لیکن مجھے کسی بھی کتاب میں اس مقبرے کا نام "شمع برج" نہیں ملا۔ ڈی ڈی اے نے صدیقی صاحب سے یہ مقبرہ خالی کروالیا تھا۔ اب اس کے باہر ڈی ڈی اے کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ ڈی ڈی اے کا تاریخی عمارتوں سے کیا تعلق ہے، یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اسے تو آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے زیر نگرانی ہونا چاہیے۔

اس مقبرے میں داخل ہونے کے لیے شمال، مشرق اور جنوب تینوں طرف راستے ہیں۔ مشرقی دروازے میں اندر کی طرف اُوپر جانے کے لیے سیڑھیاں ہیں۔

مقبرہ ایک کمرہ ہے، جس پر گنبد بنا ہوا ہے۔ کمرہ اکیس فٹ چھے انچ مربع ہے۔ تینوں دروازوں کے دونوں طرف اندر کے رُخ بڑے بڑے طاق بنے ہوئے ہیں۔ اور مغربی دیوار میں تین طاق ہیں۔ درمیانی طاق بڑا ہے اور دائیں بائیں جو طاق ہیں، اُن کا سائز وہی ہے، جو باقی طاقوں کا ہے۔ مقبرے کے اندر باہر پلاسٹر تھا، جو بہت جگہوں سے جھڑ گیا ہے۔ جہاں سے گنبد شروع ہوتا ہے اس سے ذرا نیچے گچ کے گول طغرے بنے ہوئے ہیں، جن پر قرآن کی آیتیں لکھی ہوئی ہیں۔ یہ طغرے اس کے آس پاس کی دیوار اور اندر کی طرف سے گنبد بالکل سیاہ ہوگیا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ دو تین سال قبل جو لوگ اس مقبرے میں رہتے تھے، وہ یہاں کھانا پکاتے تھے اور لکڑی کے دھوئیں نے دیواروں اور اندر سے گنبد کو بالکل کالا کر دیا ہے۔

مقبرے کے درمیان میں ایک قبر کا نشان ہے، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ قبر کس کی ہے؟ عہدِ لودھی کے کوئی ایسے امیر ہوں گے، جنھیں حضرت نظام الدین اولیاؒ سے عقیدت تھی اور جو حضرت سے قریب دفن ہونے کو اپنے لیے سعادت سمجھتے تھے۔

اس مقبرے کا فرش بالکل ٹوٹ گیا ہے۔ جو لوگ اس میں رہتے تھے، انھوں نے ادھر اُدھر کے پتھر لاکر فرش پر جما دیے ہیں۔ غرض مقبرہ بہت بُری حالت میں ہے۔ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کو چاہیے کہ اپنی نگرانی میں لے کر اس مقبرے کی مناسب مرمّت کرے۔

اس مقبرے کے بالکل سیدھ میں مغرب کی طرف لودھی روڈ کے نکڑ پر ایک اور مقبرہ ہے، وہ بھی تقریباً اسی انداز کا ہے۔ لیکن اس کے چاروں طرف سے داخل ہونے کے راستے ہیں۔ اس کے چاروں طرف لوہے کے گیٹ لگا دیے گئے ہیں اور ہر وقت تالے پڑے رہتے ہیں، میں دس بارہ دفعہ اس مقبرے پر گیا، لیکن کبھی کھلا ہوا نہیں ملا، اس لیے میں پیمائش نہیں کرسکا۔ مقبرے پر بہت بڑا گنبد بنا ہوا ہے۔ جنوبی دروازے کے بائیں طرف سے (باہر کی طرف) ایک زینہ اُوپر جاتا ہے۔

فرش دوبارہ بنایا گیا ہے۔ اس مقبرے پر بھی تعمیر کے وقت پلاسٹر کیا گیا تھا۔

مقبرے کی کچھ عرصے پہلے مرمّت کی گئی ہے بہت اچھی حالت میں ہے۔ لیکن یہ نہیں پتا چلتا یہ مقبرہ کس اتھارٹی کے زیر نگرانی ہے۔

درگاہ حضرت نظام الدّین اولیاؒ

درگاہ کا صدر دروازہ جسے خاص دروا
کہا جاتا ہے، شمال کی طرف ہے۔ اس درواز
کے دونوں طرف گل فروشوں کی دُکانیں ہیں۔ ا
صدی کے شروع میں درگاہ کی چار دیواری کی
بہت خستہ ہوگئی تھی۔ نواب احمد بخش خاں
والیِ فیروز پور جھرکہ نے جب درگاہ میں غلام گ
بنائی تو درگاہ کی چار دیواری کی بھی مرمّت کرادی
درگاہ کے اس دروازے پر سونے کے پانی سے
مصرع لکھوا دیا:

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را [۲]

۱۹۶۴ء میں اس دروازے کی مرمت
اب دروازے کے سب سے اُوپر "۷۸۶" لکھ
ہے۔ اس کے نیچے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" لکھا گ
ہے، اس کے نیچے درمیان میں سنگِ مرمر کی تخ

درگاہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کا شمالی دروازہ

ہوئی ہے، جس پر سنگِ موسی سے پچی کاری کے ذریعے "شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا" لکھا ہوا ہے اس مصرع کے دائیں طرف ایک دائرے میں "ماشا اللہ" اور بائیں طرف دائرے میں نصر من اللہ وفتح القریب لکھا ہوا ہے، اس کے نیچے ایک چوکور خانے میں یہ عبارت لکھی ہوئی ہے :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خاص دروازہ

درگاہ سلطان محبوبِ الٰہی حضرت نظام الدین اولیا

جدید ترمیم کردہ سنگِ آستانہ

باہتمام مطابق نقشہ بہ تکمیل یافت مستری الٰہی دہلوی

تاماہ شوال ۱۳۸۳ھ مطابق ۵ فروری ۱۹۶۴ء

اس عبارت کے نیچے یہ فارسی شعر لکھا ہوا ہے۔

چہ حسنت آنکہ در یکدم زحت را صد نظر بینم

ہنوزم آرزو باشد کہ یک بارِ دگر بینم

درگاہ کی باؤلی

درگاہ کے اس دروازے سے اندر داخل ہوں تو سامنے ہی ایک باؤلی ہے۔ اندر سے یہ باؤلی ۱۲۳ فٹ لمبی اور ۵۳ فٹ چوڑی ہے اور باہر سے ۱۸۰ فٹ لمبی اور ۱۲۰ فٹ چوڑی ہے۔ باؤلی میں اترنے کے لیے شمال کی طرف سیڑھیاں ہیں۔ باؤلی کے چاروں طرف سنگِ خارا کی اتنی مضبوط دیوار نما بندس ہے کہ تقریباً ساڑھے چھے سو سال گزرنے کے باوجود یہ دیواریں جُوں کی تُوں کھڑی ہیں۔ یہ پوری باؤلی سنگِ خارا سے بنائی گئی ہے۔ بشیر الدین احمد نے لکھا ہے کہ باؤلی کی "عموماً چالیس سیڑھیاں کھلی رہتی ہیں"[۳]۔ چار پانچ مہینے قبل باؤلی کی صفائی ہو رہی تھی۔ پمپ کے ذریعے پانی باہر نکالا جا رہا تھا۔ اُس وقت میں نے سیڑھیاں گنیں تو اکتالیس پانی سے باہر تھیں، اور ابھی پانی میں کچھ اور سیڑھیاں تھیں۔ میں نے اس حالت میں باؤلی کی جو تصویر لی تھی، وہ اس مقالے کے ساتھ شائع کی جا رہی ہے۔ سیڑھیاں اس انداز سے بنائی ہیں کہ ہر تین چھوٹی سیڑھیوں کے بعد ایک چوڑی سیڑھی ہے۔

سیڑھیوں پر ایک بہت بڑا پتھر رکھا ہوا ہے جسے نمازی پتھر کہتے ہیں آج کل باؤلی میں اتنا پانی ہے کہ وہ پتھر زیرِ آب ہے۔

۷۲۱ھ (مطابق ۱۳۲۱ء) میں باؤلی کی تعمیر مکمل ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان غیاث الدین تغلق اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کے درمیان اس باؤلی کی تعمیر کے سلسلے میں اختلاف ہوگیا تھا۔ جس زمانے میں تغلق نے اپنے نئے شہر تغلق آباد کا قلعہ تعمیر کرایا تھا، حضرت نظام الدین یہ باؤلی بنا رہے تھے۔ شہر میں مزدوروں کی کمی تھی۔ غیاث الدین تغلق نے جب سُنا کہ خاصی تعداد میں مزدور باؤلی کی تعمیر میں مصروف ہیں تو اس نے منادی کردی کہ کوئی مزدور باؤلی کا کام نہیں کرے گا اور یہ بھی حکم دیا کہ تمام مزدور قلعے کی تعمیر کا کام کریں گے۔ بادشاہ کے حکم کی وجہ سے مزدوروں نے قلعے کی تعمیر کا کام تو شروع کر دیا لیکن دن کو وہاں کام کرتے اور رات کو باؤلی کا۔ تغلق نے جب سُنا کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کا تعمیر کا کام بدستور جاری ہے تو اس نے تیل پر پابندی لگادی تاکہ رات کو چراغ نہ جلائے جا سکیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت نظام الدین نے دعا مانگی اور باؤلی کا پانی تیل کا کام کرنے لگا۔

باؤلی، درگاہ حضرت نظام الدین

حضرت نظام الدین اولیاؒ، حضرت سید محمود بحارؒ سے ملنے گئے ہوئے تھے، انھوں نے تغلق کی نامناسب حرکتوں کا ذکر کیا۔ حضرت اس وقت گارے کی دیوار بنوا رہے تھے۔ حضرت نظام الدین کی بات سُن کر انھیں غصہ آگیا اور انھوں نے پوری دیوار گروادی۔ اور کہا "لو ہم نے تغلق کی حکومت ہی ختم کردی۔"

بشیر الدین احمد نے لکھا ہے: "باؤلی جب صاف ہوئی تو دیکھا گیا کہ اس کے اندر چار سوتے ہیں، جن کے پیچھے چاروں طرف سے سیڑھیاں شروع ہوکر ایک ہشت پہل سیڑھی پر ختم ہوتی ہیں اور پھر اس کے نیچے سے مدوّر سیڑھیاں شروع ہوکر کنوئیں پر ختم ہوگئی ہیں۔ یہ کنواں آٹھ گز سے آٹھ گز مدوّر ہے اور تقریباً اسی قدر گہرا بھی ہے اور باؤلی میں عموماً سولہ سترہ گز پانی رہتا ہے۔"

باؤلی کی مشرقی اور مغربی دیواروں میں تین تین اور دیوار میں باؤلی کی سیڑھیوں پر چار طاق ہیں۔ آج کل یہ طاق زیرِ آب ہیں۔

باؤلی کے پانی کو بہت متبرک سمجھا جاتا ہے۔ بعض زائرین اس میں نہاتے اور اس کا پانی پیتے ہیں۔ عام خیال ہے کہ اس کے پانی سے بیمار صحت یاب ہوجاتے ہیں۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی زمانے میں باؤلی کے پانی میں گندھک ہو جس کا پانی کئی بیماریوں اور خاص طور سے کھال کی بیماریوں کے لیے مفید ہوتا ہے مگر اب ایسا کچھ نہیں ہے۔

کچھ سال پہلے تک باؤلی میں دن بھر تیراک نظر آتے تھے۔ اُستاد اپنے شاگردوں کو تیراکی کا فن سکھاتے تھے۔ ہر سال عُرس کے موقعے پر تیراکی کے مقابلے ہوتے تھے اور تیراک اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ بہت عرصے پہلے میں نے بھی اسی باؤلی میں تیراکی سیکھی تھی۔[۴]

فاطمہ بی بی اور زہرہ آغا کا مقبرہ

باؤلی کے شمال مغربی کونے پر ایک مقبرہ ہے۔ جس کے باہر تختی پر لکھا ہوا ہے۔ مزاراتِ خاندان نواب ابوالحسن۔ دراصل مقبرے کے مشرقی حصے کی طرف سائبان کی چھت ڈال کر اور چار دیواری کھڑی کرکے ایک کمرہ بنالیا گیا ہے۔ اس کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک قبر ہے، جس کے بارے میں پتا نہیں کس کی ہے پھر برابر برابر دو قبریں ہیں۔ ایک قبر نواب ابوالحسن کی اور دوسری اُن کی زوجہ نواب محمود النسا بیگم کی ہے۔ نواب ابوالحسن دلّی کے بہت مشہور رئیس تھے۔ اُن کے صاحبزادے نواب زادہ غالب حسن خاں اس مقبرے کے متولی تھے، اب اُن کا بھی انتقال ہوگیا ہے۔ اس کمرے سے مغرب کی طرف ایک راستہ مقبرے میں جاتا ہے۔ مقبرہ محض ایک گنبد ہے اور ایک مربع کمرے پر بنا ہوا ہے۔ جس میں تین قبریں ہیں۔ بشیر الدین احمد نے اسے "سیّد ابنوں کا مقبرہ" بتایا ہے۔

ایک قبر جو مرکزی ہے، یعنی گنبد کے تقریباً مرکز میں ہے۔ سنگِ مرمر کی ہے، یہ قبر فاطمہ بی بی کی ہے۔ اس قبر کے تعویذ پر خطِ نسخ میں لکھا ہوا ہے:

تاریخ وفات مرحومی مغفوری مسماۃ فاطمہ بی بی
بنت میر یوسف سنہ نہ صد و ہفتاد و پنج
کاتبہ حسین نقشی (۹۷۵ھ)

اس کے برابر میں لال پتھر کی ایک قبر ہے۔ بشیر الدین احمد نے اس قبر کا کتبہ نقل کیا ہے:

"زہرہ آغا امیر تغلق ز دنیا رحلت نمود
سنہ نہصد و ہفتاد و یک بود۔" (۹۷۱ھ)

اس قبر کے تعویذ کے گرد امیر خسرو کی یہ غزل کندہ ہے:

"اے بدر ماندگی پناہ ہمہ"

دونوں قبروں کے تعویذ پر قرآن شریف کی آیتیں لکھی گئی ہیں۔

سنگِ مرمر کی قبر کا تعویذ چھے فٹ چھے انچ لمبا، دو فٹ چھے انچ چوڑا اور ایک فٹ چھے انچ اونچا ہے۔ لال پتھر کی قبر کا تعویذ پانچ فٹ گیارہ انچ لمبا، دو فٹ چوڑا اور ایک فٹ چار انچ اُونچا ہے۔ ان دونوں خواتین کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہوسکا۔ اس کے بارے میں بشیر الدین احمد نے لکھا ہے کہ "یہ دراصل خواجہ فرحت اللہ خاں رئیس دہلی کا قبرستان ہے۔ اس مقبرے کے اندر صرف دو قبریں ہیں، باہر بہت سی ہیں۔"[۵] مقبرے کے باہر کی قبریں خواجہ فرحت اللہ

ان کے خاندان کی ہوں گی، لیکن اندر کی دو قبروں کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

گنبد کے اندر بالکل مغرب کی طرف ایک قبر ہے۔ اس قبر کے سرہانے سنگِ مرمر کا ایک چراغ دان نصب ہے اس چراغ دان پر صاحب قبر کا نام "حاجی مقبول الٰہی نظامی حبیبی" لکھا ہوا ہے۔ درگاہ کے ایک سجادہ نشیں نوجوان نے بتایا کہ یہ بزرگ دکن کے تھے اور دکن کے بزرگ حبیب علی شاہ دکنی کے مرید یا خلیفہ تھے۔ ان کے بارے میں اور کچھ معلومات فراہم نہیں ہو سکیں۔

باؤلی کے اوپر کے حصّے میں پھول والوں کی دکانیں ہیں۔ اس حصّے میں مشرق کی طرف ایک دروازہ ہے، جو درگاہ کو جاتا ہے۔ اس راستے کا حصّہ کھلا ہوا ہے۔ اور پھر چھتّہ شروع ہو جاتا ہے۔ پہلے حصّے میں خواجہ حسن نظامی مرحوم کے دادا حضرت خواجہ سیّد حسین علی شاہ کی قبر ہے۔ لوحِ مزار پر سنہ انتقال ۱۲۹۰ھ لکھا ہوا ہے۔ چھتّہ باؤلی سے مشرق اور پھر جنوب کی طرف ہے۔ جنوبی چھتّے کے اندر میں ایک کمرہ ہے جس میں قاضی سیّد صفدر علی مرحوم کا مزار ہے۔ ان کا انتقال چند سال قبل ہوا تھا۔ یہاں تک چھتّے کا رُخ مشرق و مغرب تھا۔ اس کے پاس سے چھتّے کا رخ شمال جنوب ہو گیا۔ چھتّے سے باہر نکل کر ہم درگاہ کے اُس دروازے پر آ جاتے ہیں، جسے مالن دروازہ کہا جاتا ہے۔ دروازے کے دونوں طرف پھول والوں کی دُکانیں ہیں۔ دروازے کے اُوپر وسط پر کُتبہ لگا ہوا ہے، جس پر لکھا ہوا ہے:

کرم کردی الٰہی زندہ باشی
خادمہ محمد جہاں بیگم نبت بابو
غلام حسین انسپکٹر، زوجۂ محمد
عبدالرحیم خاں ڈسٹرکٹ انجینئر دہلی

[illegible]

حواشی

۱۔ اس مسجد کے بارے میں تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:
(i) سیر المنازل، ص ۴۸۔
(ii) آثار الصنادید (کراچی ایڈیشن) ص ۵۶۔
(iii) واقعاتِ دار الحکومت، جلد ۲، ص ص ۸۲۳ - ۸۲۴۔

۲۔ آثار الصنادید (کراچی ایڈیشن) ص ۵۱۔

۳۔ واقعاتِ دار الحکومت، جلد ۲، ص ۸۰۵۔

۴۔ باؤلی پر تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:
(i) آثار الصنادید (کراچی ایڈیشن) ص ص ۴۹ - ۵۱۔
(ii) واقعاتِ دار الحکومت، جلد ۲، ص ص ۸۰۴ - ۸۰۶۔
(iii) List of Mohammadan and Hindu Movements, vol. II, pp. 139-140.
(iv) A Guide to Nizam-uddin, Zafar Hasan, 1919, Calcutta, p. 7.
(v) Archaeology and Monumental Remains of Delhi, Carr Stephen, Allabad Reprint, 1967, pp. 113-116.

۵۔ واقعاتِ دار الحکومت، جلد ۲، ص ۸۰۹۔

چھپتے چھپتے

اس شمارے کی کاپیاں پریس جا رہی تھیں کہ اُردو کے مشہور و ممتاز صحافی جناب جمیل مہدی کے انتقال کی خبر ملی۔ ان کی عمر ساٹھ برس کے قریب تھی اور وہ غیر شادی شدہ تھے۔ وہ ۱۹۲۸ء میں دیوبند میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد مہدی حسن ریشمی رومال تحریک کے وابستگان میں تھے۔ جنابِ جمیل مہدی کی ذہنی تربیت میں ان کے والد کے علاوہ مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا حسین احمد مدنی جیسے اکابرینِ ملک و ملّت نے حصّہ لیا تھا۔

جنابِ جمیل مہدی کی تحریریں جہاں ایک طرف حُب الوطنی اور قوم پرستی کے جذبے میں ڈوبی ہوئی ہوتی تھیں وہاں دوسری طرف وہ اقلیتوں کے مذہبی اور تہذیبی تشخّص کے بھی زبردست مؤیّد تھے۔ انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز بمبئی سے کیا جہاں وہ اُردو کے کئی اخبارات و رسائل سے وابستہ رہے۔ پھر وہ "قائد" کے ایڈیٹر ہو کر لکھنؤ چلے آئے۔ "قائد" کے بعد انھوں نے لکھنؤ ہی سے خود اپنا اخبار "عزائم" جاری کیا جو گزشتہ اٹھارہ سال سے باقاعدگی سے شائع ہو رہا تھا۔ خدا کرے ان کی یہ یادگار زندہ رہے۔

اُردو صحافت جو عام طور پر جذباتیت سے قریب نظر آتی ہے، جنابِ جمیل مہدی کے قلم نے اسے سنجیدہ رُخ دینے کی کامیاب کوشش کی۔ وہ لکھنؤ سے علاج کے لیے دہلی آئے تھے اور ۳ فروری کو یہاں کے پٹیل چیسٹ انسٹی ٹیوٹ میں داخل ہوئے تھے۔ ۱۱ فروری کو دل کی تکلیف کی وجہ سے انھیں رام منوہر لوہیا اسپتال میں داخل کیا گیا جہاں ۱۲ فروری کو انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ خداوند کریم ان کی مغفرت فرمائے۔

خوں خوار کتّے

اُن دنوں اخباروں کی سُرخیاں نئے اسلحوں کی ہلاکت خیزی اور میدانِ جنگ کی بربریت سے بھری رہتی تھیں۔ دھیرے ... خبریں بھی روزمرّہ کی باتیں ہوتی گئیں۔

انھیں خبروں کے درمیان لوگوں نے بڑی حیرت سے یہ خبر پڑھی کہ میدانِ جنگ اور اس کے گرد و نواح میں خوں خوار کتّوں نے حملہ کر دیا ہے۔ ان کی شکل و صورت کچھ اس طرح بیان کی گئی تھی کہ ان کی آنکھیں سُرخ انگاروں کی طرح ہیں۔ ان کے اگلے دانت اتنے لمبے اور تیز ہیں کہ سینہ ... ہوتے ہیں تو دوسری جانب بیٹھ ... تے ہیں۔ پنجے ایسے تیز ناخن سے لیس ہیں کہ انسان کی کھوپڑی پر ان کی گرفت ہو جائے تو کھوپڑی سر سے الگ ہو جاتی ہے۔

یہ خوں خوار کتّے نہایت بے رحمی سے مُردوں یا زندوں کو بھنبھوڑتے ہیں۔ یہ کتّے جب حملہ آور ہوتے ہیں تو لوگوں کی آہ و بکا کے ساتھ ہی قہقہے بھی گونج اُٹھتے ہیں اور عجیب ہیبت ناک منظر ہوتا ہے اور چشم زدن میں یہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

تحقیق و تفتیش کے شوقین لوگوں نے علم حیوانات کی تمام جدید و قدیم کتابوں کی ورق گردانی شروع کر دی۔ کافی عرق ریزی کے بعد ایک پتے کی بات کا انکشاف کیا گیا کہ کچھ ان سے ملتی جلتی قسم کے درندے پہلے بھی قحط زدہ سیلاب میں گھرے یا وبائی امراض میں مبتلا لوگوں پر حملہ آور ہوتے دیکھے جاتے تھے۔

عام لوگوں کی پیشانیوں پر بل آئے لیکن جلد ہی انھوں نے اپنے کانوں میں روئی کی موٹی بتیاں ڈال لیں اور آنکھوں پر ایسے شیشوں کی عینکیں چڑھا لیں کہ نہ وہ دُور کی آواز سن پائیں نہ دُور کی کوئی چیز دیکھ سکیں۔ اور تب انھیں اطمینان سا ہو گیا۔

ان کے ذہن نے طرح طرح کی تسلّیاں اختراع کیں ——

"ہم محفوظ ہیں کیوں کہ ہم ایسے خطّے میں رہتے ہیں جہاں کا ہر موسم نئی فصلوں اور اناج کا انبار مہیّا کرتا ہے۔ ہم ایسی اُونچی جگہوں پر بستے ہیں جہاں سیلاب کا پانی تو کجا طوفان نوح بھی آئے تو اس کا پانی ہمارے تلوؤں کو نہیں چھو سکتا ہم وَید اور حکیم کی اولاد ہیں۔ یہاں سنجیونی بوٹی، امرت اور آبِ حیات موجود ہے۔ یہاں مہلک امراض اور وبا کی بات تو دُور کوئی معمولی سا مرض بھی نہیں پنپ سکتا۔ اب رہی جنگ کی بات —— ہم امن پسند ہیں۔ ہم نے دُنیا کو امن اور عدم تشدّد کا پیغام دیا ہے۔ جہاں آگ جلانا گناہ ہو، جلتی آگ کو بجھانا تشدّد ہو وہاں جنگ و جدال؟ ہم تو دُشمنوں کو بھی اپنا مہمان بنا لیتے ہیں۔ ان تمام حالات کے پیش نظر ہمیں ہراساں اور پریشان ہونے کی کیا ضرورت پڑی ہے؟"

لیکن خبریں برابر اخباروں کی سُرخیوں پر سوار رہیں کہ قحط، سیلاب اور وبا میں گھرے یا جنگ میں ہلاک شدگان کے گوشت سے ان درندوں کو کوئی خاص رغبت نہیں۔ لوگ پھر بھی مطمئن تھے کہ ان کے حملے کی زد میں جنگجو لوگ آتے ہیں۔ خواہ وہ فاتح ہوں یا مفتوح! ہمارا کیا —— ؟ ہم بہرحال عدم تشدّد اور بقائے باہم کے پرستار ہیں۔

لیکن آنکھوں پر پٹّی باندھنے سے خطرے نہیں ٹلتے —— کانوں میں لاکھ انگلیاں اڑس لی جائیں آوازیں مصلوب نہیں ہوتیں!

خوں خوار کتّے ساری سرحدوں کو پار کرتے ہوئے ہر اس خطّے پر حملہ آور ہوتے جہاں وہ جاندار کی بُو سونگھ لیتے۔ اب ان کے دل میں نہ تو جانور کے لیے رحم تھا نہ انسانوں کے لیے ہمدردی!

یہ درندے یکساں طور پر ہر ذی روح پر حملہ آور ہوتے، سب سے پہلے جسم کا قطرہ قطرہ خون چوس لیتے، گوشت کا ریشہ ریشہ چاٹ ڈالتے اور ہڈّیوں کا پنجر وہاں موجود گیدڑوں اور گھر بلو کتّوں کے لیے چھوڑ جاتے۔ نیم مردہ اور مرنے والوں کے عزیز و اقربا شور و بین کرتے تو ان کی آواز ان کتّوں کے قہقہوں میں دب جاتی!

دیہی علاقوں اور دور دراز میں رہنے والے اب بھی مطمئن تھے کیوں کہ ان خوں خوار کتّوں نے ابھی صرف بڑے شہروں تک ہی اپنا رُخ محدود رکھا تھا، جہاں آبادی گنجان تھی۔

م۔ق۔خاں
حکیم عنایت کالونی، گیا ۸۲۳۰۰۱ (بہار)

لیکن بہت جلد ہی انھوں نے قصبوں اور گاؤں کا بھی رُخ کیا۔ اور تب اپنے کو خود ساختہ فصیلوں میں محفوظ سمجھنے والے بھی چیخ اُٹھے کیوں کہ ان کے پاس نہ تو محفوظ و مستحکم مکان تھے اور نہ مدافعت کے لیے اچھے اور کارگر ہتھیار! پھر بھی کچھ لوگ اپنے گھروں میں تالے لگائے بیٹھے رہے اور ہر اس راستے سے کترا کر نکلنے کی کوشش کرتے رہے جن پر ان کتّوں کے آنے کا خطرہ زیادہ تھا۔ ان کتّوں کا حال یہ تھا کہ وہ سب سے پہلے بچّوں کو، پھر بوڑھوں کو اور اس کے بعد عورتوں کو لقمۂ اجل بناتے اور بعد میں ان مردوں کو جو جوان ہوتے اور اپنی حفاظت کرتے۔ بچّوں کا نرم گوشت اور سارے امراض سے پاک خون اُنھیں بہت پسند تھا۔ ضعیفوں اور ناتوانوں کی مجبوری تھی کہ جب قویٰ کمزور ہوں اور امراض نے انھیں اپنے آہنی شکنجوں میں لے لیا ہو تو مدافعت کیسی ؟ عورتوں کے بارے میں یہ خیال تھا کہ وہ خود ان کی جانب کھنچی چلی جاتی ہیں۔ مرد اُنھیں لاکھ خبردار کرتے، ڈراتے لیکن وہ کسی نہ کسی طرح ان راستوں پر چل نکلتیں جہاں کتّے گھات لگائے بیٹھے رہتے۔

اپنی عقل و فہم کے مطابق لوگوں نے ان سے نجات کی ہر ممکن کوشش کی لیکن لاحاصل! آخر کار بادشاہ کے پاس فریاد لائی گئی۔ بادشاہ کو کسی ایسے درندے کے وجود کا یقین ہی نہیں ہوا۔ لیکن جب ہر طرف سے شور و ہنگامہ برپا ہوا تو بادشاہ نے ماہرین کو مقرّر کر دیا جو پہلے ان کے وجود کا پتہ چلائیں اور بعد میں ان کے تدارک کا۔

کتّے روپوش ہوگئے۔ ماہرین بادشاہ کے پاس لوٹ آئے اور ایک رپورٹ پیش کی۔ انھوں نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ لوگوں کی موت کا سبب لوگوں کی مرنے کی اپنی خواہش ہے۔ ظاہر بات ہے کہ بے عملی اور کاہلی جسم کے اعضا کو بیکار اور معطّل بنا دیتی ہے۔ یہی قانونِ قدرت ہے جس کی ضرورت اور افادیت ختم ہو جاتی ہے وہ صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتا ہے۔ کیا لوگ نہیں جانتے ہیں کہ جب متوازن ہو کر چلنے کا شعور ہو گیا تو دم کٹ گئی۔ ہو سکتا ہے ہاتھ پاؤں کو دیکھنے یا سننے کی طاقت عطا ہو جائے تو آنکھیں چھن جائیں، کان کے سوراخ بند ہو جائیں جب کھانے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی مُنہ کا غار پٹ جائے گا۔ اس لیے جنھوں نے اپنے دل و دماغ پر کتّوں کو مسلّط کر لیا ہے ان کے پاس ہی یہ کتّے جاتے ہیں ورنہ یہ کتّے محض خیالی ہیں، واہمہ ہیں۔

لوگوں نے ان کی باتوں پر یقین کر لیا اور اطمینانِ کلّی سے زندگی گزارنے لگے۔ ادھر کچھ دنوں سے کتّے بھی روپوش تھے کیوں کہ وہ وقت کے بہترین نباض تھے۔ وہ جانتے تھے کب، کہاں، کیسے اور کن پر حملہ اور ہونا چاہیے۔ اس لیے اس بار وہ محتاط تھے لیکن ان کا دوسرا حملہ شدید تھا۔ لوگ اس بار پھر بادشاہ کے پاس پہنچے۔ اپنی حالت زار کا رونا رویا۔ ان کی زبوں حالی دیکھ کر بادشاہ کو بھی یقین ہو گیا۔ اُس نے بہت کچھ کرنا چاہا لیکن کچھ کر نہ سکا کیوں کہ ان کتّوں نے ایسی ایسی شکلیں تبدیل کرنا سیکھ لیا تھا کہ تمیز کرنا مشکل تھا۔ بادشاہ نے اپنی جان چھڑانے کے لیے کہا کہ یہ کتّے ساری دُنیا میں ہیں، بین الاقوامی ہیں۔ ان پر روک لگانا بلکہ ان کا خاتمہ کرنا اس کے بس کا روگ نہیں۔ بادشاہ خطرات مول لینا نہیں چاہتا۔ کتّے بھوکے رہنا پسند نہیں کرتے۔ اور لوگ اپنی حفاظت کرنے سے معذور ہیں!

غزلیں

شاہد میر

ہزاروں میں رہے لیکن الگ پہچان رکھتا ہے
وہ آنکھوں میں چھپا کر موتیوں کی کان رکھتا ہے

شکستہ دل جوانوں، شاعروں کے دکھ سے ہے واقف
کھلی جو نصف شب تک چائے کی دوکان رکھتا ہے

زمانے سے نہ ہو خود سے تو ہے اُس کی شناسائی
یہ کیا کم ہے وہ اپنی ذات کا عرفان رکھتا ہے

سُلگتی ہے گئے لمحوں کی اُس میں کوئی چنگاری
سلیقے سے جو تھالی میں سجا کر "پان" رکھتا ہے

تبسم ریز تو مشہور ہے احباب میں شاہد
مگر وہ ساتھ اپنے میر کا دیوان رکھتا ہے

ہیڈ بوٹنیکل ڈپارٹمنٹ، گورنمنٹ کالج، بانسواڑا ۳۲۷۰۰۱ (راجستھان)

ہونٹوں پہ سخن آنکھوں میں نم بھی نہیں اب کے
اس طرح وہ بچھڑا ہے کہ غم بھی نہیں اب کے
خود کو دلِ سرکش نے بھی رکھا نہ کہیں کا
جینے پہ رضا مند تو ہم بھی نہیں اب کے
بے رحم جدائی کا سبب بھی نہیں معلوم
اک گونہ تعلق کا بھرم بھی نہیں اب کے
تنہا ہیں، تو در پیش ہیں خطراتِ سفر اور
یوں بے سروسامانیاں کم بھی نہیں اب کے
کیا کہیے کہ جو منہ میں زباں بھی نہیں اپنی
افسوس کہ ہاتھوں میں قلم بھی نہیں اب کے
کیا جانے مجیبی دلِ قاتل میں ہے کیا آج
محضر میں کوئی جرم رقم بھی نہیں اب کے

صدّیق مجیبی

ڈپارٹمنٹ آف اردو، رانچی یونیورسٹی، رانچی ۸۳۴۰۰۸

سلیم انصاری

بن گئیں شہرِ فسادات کا منظر لاشیں
سینۂ آب پہ بہتی ہوئی بے سر لاشیں

دیر تک جسم کے جنگل میں تعفن برسا
سڑ گئیں جب مرے احساس کی بے گھر لاشیں

کب تلک چہروں کی پہچان رہے گی زندہ
جلد ہی ڈھونڈ لے دریا سے شناور لاشیں

جن سے ٹوٹا تھا کبھی ظلم کے چہروں کا فسوں
اب بھی ہاتھوں میں لیے ہیں وہی پتھر لاشیں

چیخ اٹھتا ہے لہو ضربِ ہوا سے بھی سلیم
لوگ تہ خانوں میں رکھیں نہ چھپا کر لاشیں

۵۵۹، موتی نالا، نیا پل، جبلپور (ایم۔ پی) ۴۸۲۰۰۲

سائنس انسانیت نواز کیوں نہیں

اقبال نے ایک فارسی نظم میں اپنے مخصوص بلند آہنگ انداز کے ساتھ قدرت اور انسان کے ازلی ٹکراؤ کی روداد بیان کی ہے۔ کائنات کا رب انسان کو اس طرح ملامت کرتا ہے: میں نے ایک ہی آب و گِل سے یہ جہان پیدا کیا۔ تو نے اسے ایران و تاتار و زنگ میں بانٹ ڈالا۔ میں نے خاک سے فولاد نمودار کیا۔ تو نے شمشیر و تیر و تفنگ ایجاد کرلیے، چمن کے پیڑ پودوں کے لیے کلہاڑی اور نغمہ سرا پرندے کے لیے قفس بنا لیا۔ جواب میں پلک جھپکے بغیر انسان کہتا ہے: تو نے رات بنائی، میں نے چراغ۔ تو نے مٹّی بنائی، میں نے پیالہ۔ تو نے بیابان، کوہسار اور میدان بنائے، میں نے خیابان، گل زار اور باغ۔ میں وہ ہوں جس نے پتھّر سے آئینہ نکالا۔ میں وہ ہوں جس نے زہر سے تریاق برآمد کیا۔

انسانی خیر و شر کا یہ معرکہ بڑی حد تک سائنس کی دین ہے۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ سائنس داں، جو اس معرکہ کا مرکزی کردار ہے، اس بحث سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کا کام صرف تحقیق، انکشاف، دریافت اور ایجاد کرنا ہے۔ اس بات سے اس کا کوئی واسطہ نہیں کہ اس کی کاوش کا حاصل تعمیر کے لیے استعمال ہوتا ہے یا تخریب کے لیے۔ کافی مدّت سے یہی سمجھا جاتا رہا ہے کہ سائنس اور ٹیکنولوجی قدروں کے معاملے میں ناجانب دار ہیں، یعنی وہ نہ امیر کی بے جا پاس داری کرتی ہیں، نہ غریب کی۔ بعد میں جب کچھ حلقوں کی طرف سے ناقابلِ تردید ثبوت پیش کیے گئے تو ٹیکنولوجی کو قدر سے گراں بار مانا جانے لگا۔ لیکن سائنس کے قدر سے عاری ہونے کا تصوّر آج بھی قائم ہے۔

سائنس کے 'عصبیت سے خالی ہونے کا تصوّر' وقت کے ساتھ انسانی سماج کے لیے زیادہ ضرر رساں، زیادہ پُرخطر، زیادہ ہلاکت خیز امکانات کا حامل ہوتا جا رہا ہے۔ جب تک سائنس کی ترقّی کی باگ ڈور بڑی حد تک ان سائنس دانوں کے ہاتھ میں رہی جو پیشہ ور نہ تھے اور یا تو خود دولت مند تھے یا کسی دولت مند کی سرپرستی حاصل کرسکتے تھے، سائنس کے بے تعصّب ہونے کے تصوّر سے انسانی سماج کو بہت زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ لیکن یہ دَور پچھلی دو صدیوں تک ہی رہا۔ اب صورتِ حال بدل رہی ہے۔ آج کل سائنس کے لیے مالیات زیادہ تر حکومتیں فراہم کرتی ہیں۔ سائنسی تحقیق کے بڑے بڑے ادارے سرکاری ہوتے ہیں۔ خود کو فلاحی ریاست کہلوانے کی شوقین حکومتیں اپنے یہاں کے سائنس دانوں کو بظاہر کافی آزادی بھی دیتی ہیں، تاکہ وہ (مثلاً) کسان، بڑھئی، لوہار اور کمہار کے کام کو سہل بنانے کے لیے سائنسی تحقیق اور ایجاد کرسکیں، لیکن ان کا اصل زور ایسے مسائل پر ہوتا ہے جن کا 'بے زر' عوام سے کم اور 'زار دار' خواص سے زیادہ تعلّق ہوتا ہے۔ بنیادی نکتہ یہی ہے کہ سائنسی ترقّی سرکاری کنٹرول کے تابع رہتی ہے اور اس کی 'لنگڑی ترقّی' سے اصل فائدہ امیر کو اور صرف ضمنی فائدہ غریب کو حاصل ہوتا ہے۔ سائنس کی انتہائی تیز رفتار ترقّی کے باوجود اگر آج دُنیا میں بھوک، افلاس اور وبائی بیماریوں کا دور دورہ ہے تو اس کا ایک بڑا سبب یہی غلط تصوّر ہے کہ سائنس کسی سے کبھی جانب داری نہیں برتتی۔

سائنس کی جانب داری کا سب سے واضح ثبوت اس کا طریقۂ کار، اس کی منزلیں ہیں۔ جدید سائنس کے کچھ علم بردار اس عذر کے ساتھ خود کو بری الذمہ ٹھہرا لیتے ہیں کہ ساری خطا ان کی ہے جو سیاسی اقتدار کی باگ سنبھالے ہوئے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ نہیں۔ سیاست اور دولت کے خداؤں نے تو صرف اس تصوّر سے فائدہ اُٹھایا ہے کہ سائنس کا انسانی قدروں سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس لیے آج اس تصوّر کو ہی بدلنے کی ضرورت ہے۔

انسان کی بھلائی کے نقطۂ نظر سے سائنس کی ترقّی کی دیوار اگر آج ثریّا تک ٹیڑھی جاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے تو اس دیوار کی پہلی ٹیڑھی اینٹ سائنس کے قدر سے عاری ہونے کے تصوّر نے ہی

جلیس عابدی
۲۳۴۷، گلی شاہ کلّن، ترکمان گیٹ، دہلی ۶

رکھی تھی۔ جدید سائنس نے فرانسس بیکن کے نظریۂ علم کے کچھ حصّوں کو اپنی اساس بنایا تھا اور ابھی تک ان ہی حصّوں کی پیروی کر رہی ہے۔ بیکن کی نظر میں علم قوّت تھا اور وہ سائنس کے ذریعہ انسانی قوت کے قصر کی بنیاد رکھنا چاہتا تھا۔ "نیو اٹلانٹس" میں اس نے ستاروں کا مطالعہ کرنے، پرندوں کی طرح اُڑنے، پانی کے نیچے کشتیوں میں سیر کرنے، بلندی سے گرتے ہوئے پانی کی طاقت کو صنعت کے لیے استعمال کرنے، مختلف بیماریوں کے علاج کے لیے گیسیں بنانے، سرجری کے علم کے لیے جانوروں پر تجربے کرنے وغیرہ کے جو سپنے سجائے تھے، وہ ابھی تک جدید سائنس کی منزلوں کی حد بندی کر رہے ہیں۔

ستم ظریفی یہ رہی کہ جدید سائنس نے بیکن کے نظریۂ علم کے صرف ان حصّوں کو اپنایا جن میں سائنس کو قوت کا درجہ دیا گیا تھا، باقی سارے پہلوؤں کو اس نے بالکل نظر انداز کر دیا۔ مثلاً بیکن نے تاکید کی تھی کہ قدرت کی وحدت کا لحاظ رکھے بغیر الگ الگ حقیقتوں کا جائزہ لینا دُرست نہیں۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ قدرت پر حکم اسی صورت میں چلایا جا سکتا ہے جب اس کا کہنا مانا جائے۔ لیکن جدید سائنس نے ان باتوں کو التفات کا حق دار نہ سمجھا۔ چنانچہ سائنس کی منزلِ مراد صرف قدرتی مظاہر کی تسخیر ٹھیری اور بیکن کا یہ قول اس کے لیے ایک جنگی نعرے کی حیثیت اختیار کر گیا کہ سائنس کو "کائنات پر انسانی نسل کا اقتدار اور غلبہ بڑھانے" کے کام آنا ہے۔ پھر بیکن ہی کے ہم عصر فرانسیسی فلسفی رینے ڈیکارٹے نے قوّت کے تصوّر کو اور بھی زیادہ گونجتا ہوا نعرہ بنا دیا۔ اس نے نسلِ انسانی کو للکارا کہ "قدرت کا حاکم اور آقا" بن کر دکھا دے۔ اس طرح سائنسی ترقّی کی راہ تنگ سے تنگ تر ہو گئی۔ ظاہر ہے، اگر ہمارا مقصد کسی پر اپنا اختیار قائم کرنا ہو تو ہم سب سے پہلے اس کی کمزوریوں کی تاک میں رہیں گے لیکن اگر مقصد کسی کے ساتھ ہم آہنگی کا، دونوں کے لیے فیض رساں اور پائیدار رشتہ قائم کرنا ہو تو ہم اس کے بارے میں سب کچھ گہرائی سے، ہمدردی سے جاننے کے خواہاں ہوں گے۔ پہلی صورت میں علم محدود اور جزوی ہوگا، دوسری صورت میں بھرپور اور جامع۔ چوں کہ جدید سائنس نے پہلا راستہ چنا ہے، اس لیے سائنس داں قدرت کے طور طریقوں کو سمجھنے کی زیادہ پروا کیے بغیر کسی بھی طرح اس پر غلبہ پانے کی دُھن میں رہتے ہیں۔ یعنی سائنس قدرت کے بھیدوں کی کھوج کم اور قدرت کے خلاف جنگ زیادہ بن گئی ہے۔

سترہویں صدی کے ان دو فلسفیوں نے جس میلان کی شروعات کی تھی، اُنیسویں صدی میں چارلس ڈارون کے نظریۂ ارتقا نے اسے درجۂ کمال کو پہنچا دیا۔ ڈارون کو قدرتی مظاہر میں ہر طرف مقابلہ ہی مقابلہ نظر آیا تھا۔ لہٰذا سائنس دانوں نے سوچا کہ ایسی مقابلہ آزما قدرت پر غلبہ پانے کی جدوجہد کرنا کسی بھی اعتبار سے غلط نہیں ہے۔ اس طرح قدرت کے ساتھ تعاون کرنے کی بات انھیں کبھی سوجھی ہی نہیں۔

اس میلان کے نتیجے میں موجودہ دَور میں فزکس سائنسی تحقیق کا محور بنی ہوئی ہے اور سائنس کی دوسری تمام شاخیں پیچھے جا پڑی ہیں۔ یہ گویا عوام کے معیارِ زندگی کو اُونچا کرنے کے خلاف اسی قسم کی سازش ہے جیسی دورِ وسطیٰ میں کلیسائی اور شہنشاہی نظام نے رچائی تھی۔ اُس دور میں گرجا، خانقاہیں، مقبرے، عبادت گاہیں، شاہی محل اور باغات بنا بنا کر خزانے کے خزانے صرف کر دیے گئے، جب کہ عوام ایسے گھروں میں رہتے تھے جو جانوروں کے رہنے کے لیے بھی موزوں نہ تھے۔ آج یہ شان دار عمارتیں ہمارے لیے جمالیاتی حظ کا سرچشمہ بنی ہوئی ہیں، لیکن ان لاکھوں کروڑوں لوگوں کے لیے ان کا کیا جواز تھا جنھوں نے اصلاً ان کی قیمت ادا کی تھی؟ آج کے دور میں اسی طرح سائنسی تحقیق ان شعبوں میں خزانے کے خزانے صرف کر رہی ہے جن کا عوام کو سہولتیں پہنچانے سے زیادہ واسطہ نہیں۔ دفاعی (یا جنگی) تیاریوں سے لے کر خلا کی کھوج تک، ساری تحقیقی کاوشیں اسی زمرے میں آتی ہیں۔

کمزور کے مقابلے میں قوی کا ساتھ دینے کی ادا سائنس کے طریقۂ کار میں بھی جھلکتی ہے۔ ڈیکارٹے نے سائنسی طریقۂ کار کے چار اصول بیان کیے تھے، جو اس کی نظر میں "اشیا کا علم حاصل کرنے کے لیے کافی" تھے۔ ان میں سے پہلا اصول یہ تھا کہ کسی بھی بات کو درست نہ مانو جب تک وہ واضح طور پر درست ثابت نہ ہو جائے اور اس ضمن میں فیصلہ کرنے میں عجلت سے بچو۔ دوسرے اصول کے مطابق ہر مسئلے اور ہر مشکل کو جتنے زیادہ حصّوں میں ممکن ہو، بانٹ لینا چاہیے۔ تیسرے اصول کی رو سے غور و فکر کی شروعات ان باتوں سے کرنا چاہیے جو سادہ ہیں اور آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہیں۔ پھر بتدریج دشوار اور ایک سے زیادہ حصّوں پر مشتمل مسئلے زیادہ سہولت کے ساتھ قابلِ فہم ہو جائیں گے۔ چوتھے اصول میں یہ تاکید کی گئی ہے کہ ہر معاملے میں جانچ پڑتال اتنی مکمّل اور جائزہ اتنا ہمہ گیر ہونا چاہیے جس سے یہ یقین ہو جائے کہ کوئی بھی پہلو چھوڑا نہیں گیا ہے۔

طریقۂ کار کے ان رہ نما اصولوں میں اُس زمانے کے لحاظ سے کوئی بات قابلِ گرفت نہ تھی جب یہ اصول وضع کیے گئے تھے۔ حقیقتوں کا قطعی غیر جانب دارانہ مطالعہ اس لیے ضروری تھا کہ ہر بات کا جواز اور سند مذہبی کتابوں میں ڈھونڈنے کی روش سے اسی طرح چھٹکارا مل سکتا تھا۔ اس لحاظ سے یہ اصول فکری آزادی کی ضمانت بن گئے تھے۔ لیکن

جیسا کہ تاریخ میں اکثر ہوتا آیا ہے، سترہویں صدی میں جو اصول ہمہ جہت سائنسی ترقی کے سہارے ثابت ہوئے تھے، بعد میں وہی اصول ہمہ جہت سائنسی ترقی کی راہ میں دیوار بن گئے۔ عصبیت سے حقیقت کو الگ کرنے کا عمل حقیقت کو ہر قسم کی قدروں سے الگ کرنے کے عمل میں بدل گیا۔ طریقۂ کار سے قدروں کا کوئی تعلق نہ رہا تو سب سے پہلے زندگی کے مختلف مدارج کا احترام فنا کے گھاٹ اُترا۔ سائنس دانوں کے گناہوں پر طریقۂ کار کے قدروں سے عاری ہونے کا پردہ ڈالا جانے لگا۔ حقیقت کو حصّوں میں بانٹ کر مطالعہ کرنے کی عادت سے یہ تصوّر پیدا ہوا کہ ایسے مطالعہ سے مجموعی طور پر جو کچھ حاصل ہوگا اس سے کُل حقیقت کی آگاہی ہاتھ لگے گی۔ لیکن یہ تصوّر حیاتی عمل کی حد تک یک سر غلط ہے۔ اس کی وجہ سے نباتات اور جان داروں سے متعلّق حیاتی علوم ہی صحیح راہ سے نہیں بھٹکے، بلکہ ان تمام قدرتی وسیلوں (مٹّی، پانی، جنگل وغیرہ) سے متعلّق علوم بھی غلط راستوں پر چل نکلے جو زندگی کا سرچشمہ ہیں۔ ریاضی پر زور شروع میں اس لیے دیا گیا تھا کہ نتائج جہاں تک ممکن ہو، بالکل ٹھیک ہوں، لیکن بعد میں یہ کلیّہ بنا لیا گیا کہ "مقداری تعیّن کے بغیر قابلِ یقین علم حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔" آج کل علم کو ریاضیاتی مساوات کے سانچے میں ڈھالنے کے کام میں سائنس داں کی اتنی قوت اور توجّہ صرف ہو جاتی ہے کہ اسے قدرتی مظاہر کے براہِ راست مشاہدے کی مہلت ہی کم ملتی ہے۔ ریاضیاتی تجرید مشاہدے کا بدل بن گئی ہے اور سائنس داں کی اُپج کو زنگ لگا رہی ہے۔

حقیقت کا کل کی جگہ حصّوں میں جائزہ لینے اور مقداری تعیّن کرنے کی روش حیاتی علوم کی ترقّی میں خاص طور سے رُکاوٹ بنی، کیوں کہ یہ علوم ایسی جکڑ بند کی تاب نہیں لا سکتے تھے۔ سادہ ترین سطح یا حصّے سے مطالعہ شروع کرنے کے عمل سے جو افسوس ناک صورتِ حال پیدا ہوتی، معروف سائنس داں البرٹ زینٹ جیورجی نے اس کا ماتم اس طرح کیا ہے: "جو ماہرین اپنے نتائج کا اظہار ریاضیات کی زبان میں کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے نچلی سطحوں سے مطالعہ کی شروعات کرنا ٹھیک ہی ہے ... لیکن ہمیں سمتوں کی سُدھ بُدھ کسی بھی صورت میں نہیں گنوانا چاہیے، ورنہ ہم اس سادہ خیالی میں مبتلا ہو جائیں گے کہ تنظیم کی کسی بھی سطح کو اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس طرح ہم حیاتی علوم میں نچلی سے نچلی سطح کی طرف غوطے لگاتے جائیں گے اور وہاں زندگی کے اسرار کو پانے کی اُمید رکھیں گے۔ اس عمل کی بدولت خود میری زندگی گویا سراب کے تعاقب میں بیتی ہے۔ بیس برس تک میں سالمہ کی سطح پر تحقیق میں مصروف رہا تھا۔ اس تحقیق کے نتائج نے مجھے نوبل پرائز بھی دلایا، لیکن اس کے بعد بھی میری سمجھ میں کچھ زیادہ نہیں آیا۔ جتنا زیادہ مجھے علم ہوتا گیا، میرے سمجھنے کی صد اتنی ہی کم ہوتی گئی اور مجھے اندیشہ ہونے لگا کہ میری عمر ہر بات کو جاننے اور کسی بھی بات کو نہ سمجھنے میں ہی تمام ہو جائے گی۔ اس لیے اگر ہمیں اپنے کام کو ایک ہی سطح تک محدود رکھنا ہے تو بھی ہمارے ذہن میں کُل کا تصوّر ضرور رہنا چاہیے۔" لیکن جیورجی نے جو سبق سیکھا ہے، اس پر کُل کو حصّوں میں بانٹ کر صرف حصّوں یا سطحوں کا مطالعہ کرنے والے سائنس داں کبھی عمل نہیں کرتے۔

جدید سائنس کا طریقۂ کار دراصل ارسطو کے اس نظریہ کی نفی ہے کہ کُل ہی اپنے تمام حصّوں کا حاکم ہے۔ ارسطو کے نظریہ کی وجہ سے حصّوں کا مطالعہ پس پشت جا پڑا تھا۔ جدید سائنس نے اس غلطی کو سدھارنا چاہا، مگر اس سلسلے میں اس کا جوش جنون کی حد کو پہنچ گیا۔ اس نے کائنات اور اس کے اندر کے تمام مادّی مظاہر کو مشینوں کے مانند سمجھا، جن کے پُرزوں کو الگ الگ کر کے سمجھا جا سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حیاتی اعمال اور ماحولی نظام کے ضمن میں تحقیق اور مطالعہ غلط سمتیں

اختیار کر گئے۔ آج کیفیت یہ ہے کہ جدید سائنس [illegible] سامان اور اس کی ضمنی شہری برکتوں (تیز رفتا[illegible] نقل و حمل، مواصلاتی نظام وغیرہ) کی حد تک تو [illegible] بار آور ثابت ہوئی ہے، لیکن عام آدمی کو فائدہ پہنچ[illegible] کے منصوبوں میں اس کی کارکردگی زیادہ نمایاں نہیں رہی ہے۔ آلوں اور مشینوں پر انحصار نے اس [illegible] کم قیمت کے حل تلاش کرنے کی صلاحیت چھین لی [illegible] اس لیے یہ ہمیشہ بڑے بڑے پروجیکٹوں اور بیش [illegible] ٹیکنولوجی کی طرف مائل نظر آتی ہے۔ اس طرح یہ [illegible] ایک چیدہ طبقے کا ساتھ دیتی ہے، کیوں کہ بڑے [illegible] پروجیکٹ عوام کو بلیس کر رکھ دیتے ہیں اور بیش [illegible] ٹیکنولوجی تک عوام کی رسائی ممکن ہی نہیں ہے۔ چناں چہ آج سائنس صرف حکومتوں اور بڑی صنع[illegible] کی غلام بنی دکھائی دیتی ہے۔ عام آدمی کو صرف ذیلی فیض حاصل ہوتا ہے — وہ بھی صرف اس [illegible] تک جتنا حکومتیں اور ان سے سانٹھ گانٹھ کیے ہو[illegible] زردار چاہیں۔ بڑے پروجیکٹ یوں بھی انسانی زن[illegible] کے لیے کہیں امکانی، کہیں حقیقی خطرہ بنے ہوئے [illegible] روس میں ایٹمی کارگاہ سے تاب کار مادّے کا رِس[illegible] اور بھوپال کا گیس المیہ اس کی حالیہ مثالیں ہیں

اگر زندگی کے سارے آثار کو دھرتی سے مٹا[illegible] نہیں کرنا ہے، اگر زیادہ سے زیادہ انسانوں کی زندگ[illegible] سہولت، آرام اور سُکھ کے رنگ رچانے ہیں تو سائنس [illegible] اپنا منصب، اپنا طریقۂ کار، اپنی منزلیں اور اپنی ترج[illegible] نئے سرے سے طے کرنا ہوں گی۔ سائنس بلا شبہ [illegible] زبردست قوّت ہے، لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ یہ قو[illegible] صرف مزید طاقت کے خواہاں سیاست دانوں او[illegible] دولت کے خواہاں زرداروں کی باندی بنی رہے؟ [illegible] تیز ہتھیاروں کی ایجاد اور جنگی منصوبوں سے [illegible] خلائی تحقیق پر ہر سال جتنی رقمیں صرف ہو رہی [illegible] کیا انھیں (یا کم از کم ان کے ایک حصّے کو) دُنیا [illegible]

انسانوں کی زندگی کو بہتر اور خوش حال بنانے کی جُستجو میں صرف نہیں کیا جاسکتا؟ سائنس کو آج یہی فیصلہ کرنا ہے۔

اس انقلاب کو برپا کرنے کے لیے سب سے پہلے اس تصوّر سے دامن چھڑانا ہوگا کہ سائنس کا منشا قدرتی مظاہر پر فتح پانا اور غالب آنا ہے۔ ماحولی توازن کو درہم برہم کرنے والے "ترقیاتی" منصوبے تباہی مچاکر بار بار ہمیں تنبیہہ کرتے رہے ہیں کہ ہمیں قدرت سے جنگ آزما نہیں، ہم آہنگ ہونا ہے۔ کچھ سائنس داں قدرت سے لڑنے کی جگہ اسے سمجھنے کی روش اپنا بھی چکے ہیں۔ وہ قیمتی آلوں اور مشینوں کے محتاج رہنے کی جگہ نئے سادہ، کم قیمت طریقے ایجاد کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر "روس کی ٹیکنیک" اسرائیل میں ہزاروں نالوں میں پینے کا پانی فراہم کر رہی ہے۔ زمین کی سطح اور فضا کے درمیان توانائی کے تبادلے کے راز کو سمجھنے کے نتیجے میں رات کو ریگستانی ہوا میں تیرتے ہوئے آبی ابخرات پینے کے پانی کے طور پر کام آرہے ہیں۔ ایک اور مثال شمسی گرمی کو بجلی میں بدلنے کی ایک سادہ ٹیکنیک ہے جس کے ذریعے دیوار سے نیچے گرتے ہوئے پگھلے ہوئے کاربونیٹ نمک پر سورج کی کرنوں کو مرکوز کرکے بجلی حاصل کی جاتی ہے۔ یہ طریقے دُور افتادہ دیہات میں بھی آسانی سے آزمائے جاسکتے ہیں اور کروڑوں انسانوں کی زندگی کو بہتر بنانے کا وسیلہ بن سکتے ہیں۔ اس طرح قدرتی روئیدگی (فرن، آبی نباتات، کائی وغیرہ) میں نائٹروجن کا جو خزانہ موجود ہے، اس کے بارے میں مزید تحقیق کرکے کھاد کے مسئلے کو حل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد نہ کیمیائی کھادوں کے بڑے بڑے کثیر سرمایہ ہضم کرنے والے کارخانوں کی ضرورت رہے گی۔ نہ ان کیڑے مار دواؤں کی جو انسانی ہی نہیں، نباتاتی زندگی کے لیے بھی ضرر رساں ہیں۔ اس قسم کے امکانات کا افق بہت وسیع ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ قدرت کو حصّوں میں بانٹ کر نہیں، اسے وحدت سمجھ کر اس کے اسرار کی کھوج کی جائے۔

سائنس کی قوّت کو ایسا نیا رُخ دینے کے مواقع انسانی تاریخ میں پہلے بھی آچکے ہیں، لیکن بدقسمتی سے ان مواقع سے فائدہ نہیں اُٹھایا گیا اور ہر خطّے میں سائنس کی ترقّی کی دیوار ٹیڑھی ہی اُٹھتی گئی۔ سوویت یونین میں ایک الگ قسم کا سماج بنانے کا سپنا دیکھا گیا تھا۔ دعویٰ کیا جا رہا تھا کہ وہاں جو کچھ ہوگا، محنت کش عوام کے لیے ہوگا۔ لیکن عملاً وہاں بھی سائنس صرف اسٹیٹ کا آلۂ کار بن کر رہ گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سوویت یونین نے سائنس اور ٹیکنولوجی کے اسی نقشے کو جُوں کا تُوں اپنا لیا جو مغربی ملکوں میں موجود تھا۔ اس کے بعد مغرب کے سائنسی طریقۂ کار کو اختیار کرکے ہی سوویت سائنس داں مغربی ملکوں سے بازی لے جانے کی تاک میں رہنے لگے۔ مغربی سائنس کے طریقۂ کار اور منزلِ مراد کو جُوں کا تُوں قبول کرکے سوویت یونین نے مضمر طور پر اس کے تمام عواقب کو بھی قبول کرلیا۔ رہن سہن کے بارے میں تصوّر، توانائی کے استعمال کے ڈھنگ، شہر اور دیہات کی منصوبہ بندی، نقل وحمل، زراعت اور صنعت کی ٹیکنولوجی ـــــ سب کچھ سوویت یونین میں بھی ان ہی خطوط پر آگے بڑھا جن پر مغربی ملکوں میں آگے بڑھا تھا۔ اس طرح سائنس وہاں بھی ریاستی نظام کی غلام بن کر رہ گئی اور عوام کو وہاں سائنس سے اس سے بھی کم ضمنی فائدے پہنچے جتنے مغربی ملکوں میں عوام کے حصّے میں آئے۔

آزادی کے بعد سائنس کی قوّت کو قدرت سے متصادم کرنے کی جگہ ہم آہنگ کرنے کا مو ہندوستان کو بھی ملا تھا۔ لیکن یہاں بھی تن آسانی کی وجہ سے، کچھ مغرب کی اندھا دھ پیروی کے جوش میں اس موقعے کو گنوا دیا گ مرعوب ہوکر ہم نے بھی مغرب کے تحقیقی طریقۂ کے ماڈل کو جُوں کا تُوں اپنا لیا اور اپنے یہ کے فلسفے اور فکری میلانات کے ورثے کو یک نظر انداز کر دیا۔ ہندوستان کے فلسفیوں رشیوں نے جُز کا مشاہدہ ہمیشہ کل کے تنا میں کیا تھا۔ اس کے ساتھ انھوں نے یو فلسفیوں کے برعکس، خالص، فکر سے بھی د بچایا تھا، جس میں نظریہ کی تصدیق مشاہ اور تجربے سے نہیں کی جاتی۔ اس طرح ان سائنسی طریقۂ کار اجزا میں بیکار اور معر آرائی کی جگہ کائنات سے تال میل کی جُستجو رہتا تھا۔ مگر ہم نے اس روایت کو توجّہ قابل نہ سمجھا۔ ہم یہ بھی بھول گئے کہ حصّوں مطالعہ کرنے کی خوگر سائنس ہمارے جیسے گر خطّوں کے لیے اور بھی زیادہ تباہ کن ثابت ہوسکتی ہے، کیوں کہ ہماری زندگی کا قدرت مظاہر پر اور بھی زیادہ انحصار ہے۔ تاہم اگر بھی ہماری آنکھیں کھل جائیں تو ہندوس کے لیے ایک نئی صبح نمودار ہوسکتی ہے۔ خود ٹھ کھا کر سنبھلنے سے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ دوسرو حشر دیکھ کر سبق سیکھ لیا جائے؟

لازوال

خاں صاحب نے سر اٹھا کے درختوں کے
ِپار' اوسر کی طرف دیکھا اور ان کے چہرے پر غصّے
ِر دوڑ گئی ۔ سامنے کلوا آرہا تھا ۔ ململ کا کُرتا اور
ین کی نیکر پہنے، سر جھکائے، ہمیشہ کی طرح آہستہ روی
ساتھ ۔ مضمحل اور کچھ بیمار سا ___ کہ جیسے توانا جسم
اقابلِ برداشت وزن اٹھائے ہو ۔

کلوا کی چال کچھ اس سرکش جانور کی سی تھی جس
الک نے سرکشی کو زائل کرنے کی خاطر اس کے پیروں
رسّی باندھ کر اسے چلنے سے قدرے مجبور کر دیا
رسّی سے جکڑی ہوئی ٹانگوں والے اس جانور کی
بیں لڑکھڑاہٹ اور ایک بے ڈھنگا پن آجاتا
ہے ۔ یا اگر بات ذرا خُوب صورتی سے کہنا ہو تو
ں پرندے کی مثال پیش کر سکتے ہیں جس کے پَر
کے آنگن میں چھوڑ دیا گیا ہو ۔ پرواز سے محروم یہ
ہ کچھ سہما سہما رہے گا ساری کائنات اسے پنجرہ سی
ئے گی ۔ وہ ذرا ذرا اڑ کے چھتوں پر چھپروں پر
گا یا بہت ہو گا تو آنگن میں لگے ہوئے کسی کوتاہ درخت
اخوں میں اُلجھ جائے گا اور بس ___ لیکن یہ مثالیں
بے معنی اور بے تعلّق معلوم ہوتی ہیں کہ کلوا نہ تو
ں تھا کہ تیز دوڑنے کی خواہش کے عوض جکڑا جاتا
نہ دل کو بھانے والا خوش گلو اور خوش رنگ پرندہ
ئی اس کے پَر کتر کے اپنے آنگن میں چھوڑ دیتا ۔ وہ
انسان تھا اور یہ اس کی جبلّی یا محض اعصابی کمزوری
بہ تھا کہ وہ اس طرح سنبھل سنبھل کے چلتا تھا
اسے ہر قدم پر گر پڑنے کا خدشہ لاحق ہو ۔ کلوا کے
ے کی سیاہی اور اس پر چھائی ہوئی وحشت ناک

مُردنی اس کی زندگی کی ضمانت کو کم کرتی تھی ۔ کلوا کی
مفلسی اور تنگ دستی کے تمام راز اس بنیان اور نیکر
سے افشا تھے جو اس کے بے رنگ جسم سے چمٹی رہتی تھی ۔
لیکن اِدھر چند دنوں سے کلوا کا بدن گواڈین کی نیکر اور
ململ کے کرتے سے روشناس تھا ۔ خاں صاحب جب
بھی کلوا کو اس حیرت ناک تبدیلی کے ساتھ دیکھتے تو
ان کے چہرے پر مُسکراہٹ پھیل جاتی ۔ اس مُسکراہٹ کا
سبب کلوا کی شخصیت کی تبدیلی سے زیادہ ان کپڑوں
کے منظر اور پس منظر کا مضحکہ خیز تصادم تھا ۔ دراصل یہ
کرتا کسی زمانے میں خاں صاحب کے سُرخ و سپید جسم
پر سجتا تھا اور نیکر ان کی پینٹ ہوا کرتی تھی ۔ ہر چند کہ
یہ لباس اب ذرا مختلف شکل میں کلوا کے جسم کو ڈھانپے
ہوئے تھا لیکن ابھی اس میں خاں صاحب سے متعلّق
بہت سی یادیں پوشیدہ تھیں ۔ یوں تو انسان زندگی
میں ہزاروں کپڑے پہنتا اور ضائع کر دیتا ہے لیکن
ان میں چند کپڑے برسوں اس کے ساتھ رہتے ہیں ۔
انھیں پہن کر اپنا آپ مکمّل لگتا ہے ۔ ان پُرانے کپڑوں
میں ماضی کی خوشبو بس جاتی ہے اور انھیں پہنتے ہی
یادوں کے پھول کھل جاتے ہیں ۔ یہ کپڑے، خصوصاً
پینٹ، خاں صاحب کے ان کپڑوں میں سے تھی جو ان
کے بدن پر بہت مناسب اور جاذب نظر لگتی تھی لیکن
آہستہ آہستہ فیشن بدلے، خاں صاحب کی جسامت
بڑھی اور یہ پینٹ گزرے ہوئے لمحوں کی طرح پیچھے رہ گئی
مگر جب کلوا کی بار بار کی منت سماجت پر خاں صاحب
نے ایک دن ٹرنک کھول کر پُرانے کپڑے نکالے تو ان
کی نظر اس پینٹ پر جم کے رہ گئی ۔ بہت سی یادیں

ذہن کے تاریک گوشوں میں جگنوؤں کی طرح جلنے
بجھنے لگیں وہ دیر تک ان مانوس کپڑوں کو دیکھتے رہے
لیکن یادوں کے بے لمس پھولوں کو تاریک گوشوں میں
سجانے سے فائدہ بھی کیا اور پھر نئے فیشن کے مطابق
ان کپڑوں کو زیب تن کر کے نکلنا بھی کچھ معیوب سا
لگتا تھا ۔ خاں صاحب کے کوئی اولاد بھی نہیں تھی کہ
یہ کپڑے کتر بیونت کر کے اس کا لباس تیار کر دیا جاتا
لہٰذا انھوں نے یہ کپڑے کلوا کو دے دیے ۔ کلوا بہت
خوش ہوا ۔ اس کے لیے یہ ایک بڑی نعمت تھی اور
اس نے اس نعمت کو کئی حصّوں میں تقسیم کیا ۔ یعنی
کُرتا تو اس کی بیوی نے ہتھیا لیا اور پینٹ کا بالائی
حصّہ، جس نے کٹنے کے بعد براہِ راست نیکر کی صورت
اختیار کر لی تھی، کلوا کے حصّے میں آیا اور باقی دونوں
پائنچوں میں اس کی دو چھوٹی بیٹیوں کی نیکریں نکل
آئیں ۔ جب خاں صاحب نے پینٹ کی بدلی ہوئی
جون کو دیکھا تو وہ کچھ بے یقینی سے بولے ۔ "اے کلوا!
کیا یہ وہی پینٹ ہے؟"

"ہاں صاحب،" کلوا نے سر جھکا کے نیکر کی
طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔

"تعجب ہے" خاں صاحب نے ذرا سنجیدگی

محسن خاں

معرفت عمر حیات خاں، کنول ہار، ملیح آباد، لکھنؤ ۲۲۷۱۱۱

سے کہا۔" ابے اچھی خاصی پینٹ کا ستیاناس کر دیا۔"

کلوا کچھ شرمندگی کے ساتھ بولا۔" صاحب! پتلون تو ایک ہی آدمی پہن سکت تھا... ہم کہا کہ بچّن کے بھی دھڑ ڈھک جائیں۔"

"ہاں سالے رہوگے گنوار کے گنوار ـــــ اور کرتے کا کیا بنایا؟ لنگوٹ؟" خاں صاحب نے اسی سنجیدگی کے ساتھ پوچھا۔

"ناہیں صاحب۔" کلوا نے سر جھکا کے کہا۔

"پھر؟"

"ہمری مہریا دیکھ کے لہلوٹ ہوئی گئی بولی یہ ہم پہن با۔ ہم کہا تو ہی لیئی لے پر کبھوں کبھوں ہم ہو پہنب۔" کلوا نے کہا۔ خاں صاحب مسکرانے لگے۔

کلوا ایک اضمحلال کے ساتھ آ کے خاں صاحب سے کچھ دُور، زمین پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد جب خاں صاحب نے سر اٹھا کے دیکھا کلوا سر جھکائے اس طرح بیٹھا تھا کہ جیسے اسے خاں صاحب کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہو۔ اس کا چہرہ حسبِ معمول فکروں سے بوجھل اور رُستا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ ہی ایسا تاثر قائم رہتا کہ جیسے وہ دُھوپ میں چل کر دُور سے آیا ہو اور بہت پیاسا ہو۔ کلوا کے اس طرح سر جھکا کے بیٹھنے یا ساکت کھڑے ہو کے مُسکرانے کا مطلب خاں صاحب کو خوب معلوم تھا۔ وہ جب بھی ایسی مکروہ صورت بنا کے آتا تو خاں صاحب اسے بُرا بھلا کہتے، کاہلی کے طعنے دیتے اور پچھلی رقم کی ادائگی کا مطالبہ کرتے۔ کلوا سر جھکائے مجرموں کی طرح کھڑا رہتا۔ اگر کہتا بھی تو یہ کہ" صاحب! آپ مالک ہو۔ بچّے بھوک سے بلاّتے رہے ہیں۔"

کلوا کے بچے سدا بھوکے رہتے تھے یا کلوا ہمیشہ مکر کرتا تھا اسی لیے خاں صاحب کو اس سے ازلی چڑھ تھی ایک کلوا ہی کیا وہ اس قبیل کے تمام لوگوں سے بد دل رہتے تھے وہ انھیں مردود قرار دیتے اور کہتے کہ یہ لوگ جانوروں کی سی صفات رکھتے ہیں کاہل اور کام چور ـــــ ان کے اندر بغض بہت ہوتا ہے لیکن یہ اس کا اخراج نہیں کر پاتے ہیں بس سر جھکا کے پھنکارتے ہوئے چلتے رہتے ہیں آپ ہاتھ میں چابک لیے ان کے پیچھے چلتے رہیے اور ذرا ہوشیاری کے ساتھ ان کی سمتوں کا تعین کرتے رہیے لیکن اس دوران یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ بظاہر بے ضرر جانور کبھی کبھی پچھلی ٹانگیں بھی پھینکتے ہیں لہٰذا ایک فاصلہ برقرار رکھنا عین ہشیاری ہے۔ مگر چوں کہ کلوا خاں صاحب کے والد کے وقت سے ان باغوں کی دیکھ بھال کرتا آرہا تھا اس لیے حکمت عملی کے باوجود خاں صاحب کے دل میں کلوا کے لیے نرم گوشہ تھا وہ اس کی خطاؤں کو درگزر بھی کرتے اور اکثر زیادہ پیسے دے دیا کرتے۔ اِدھر جب سے باغوں کی گڑائی شروع ہوئی تھی کلوا مختلف بہانوں سے کام چوری کرتا رہا تھا۔

"کہو؟" خاں صاحب نے ذرا سختی کے ساتھ کہا۔" آج پھر بھوکے ہو گے؟"

کلوا نے گردن زیادہ جھکالی۔

"بولتا کیوں نہیں بے، اتنی دیر سے کیوں آیا؟"

خاں صاحب نے ذرا سختی سے پوچھا۔

"صاحب" کلوا نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکا۔

"یوں ہی ناٹک کرتا رہے گا یا کچھ بتائے گا بھی۔" خاں صاحب نے جھنجھلا کے کہا، جواب کے انتظار میں چند لمحوں تک کلوا کی طرف دیکھا پھر کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔

"جگوا مرگوا صاحب"۔ کلوا نے کہا اور وہ پھپھک پھپھک کے رونے لگا۔

"جگوا مر گیا؟" خاں صاحب نے حیرت کے ساتھ کلوا کی طرف دیکھا۔

"ہاں صاحب، ہمار بھیاّ مرگوا۔" کلوا نے دوبارہ بڑی بے چینی کے ساتھ کہا اور وہ زور زور سے رونے لگا۔

خاں صاحب ایک سکتے کے عالم میں بیٹھے کلوا کی طرف دیکھتے رہے اور کلوا سر جھکائے سسکیوں کے ساتھ روتا رہا۔

"کچھ بیمار ہو گیا تھا؟" طویل خاموشی کے بعد خاں صاحب نے پوچھا۔

"ناہیں صاحب، بالکل ہٹا کٹا رہنا۔ تڑکے اُٹھ کے نہائس، باسی روٹی کھائس کے ہمرے مجوری پر آئی گوا۔ آپ کے سبھے کہا رہنا ہن پھڑ چلات رہنا؟"

"ہاں، میں نے دیکھا تھا۔ خاصا تندرست آرہا تھا۔ تو کیا بس ایسے ہی، اچانک مر گیا؟" خ[illegible] صاحب نے پوچھا۔

"ناہیں صاحب، ـ ام کا یہاں تے لوٹ گوا اور گھر پہنچت پہنچت جمین پر لوٹ گوا۔ ہم[illegible] مطابک کو نوکریا کاٹ کھائس"۔ کلوا نے گھہرے کے ساتھ جواب دیا پھر سر اٹھا کے تشویش کے [illegible] اپنے اطراف دیکھتے ہوئے بولا۔" صاحب! اس [illegible] ماں بہت کھترناک کریا رہت ہے۔"

"تم نے دیکھا ہے؟" خاں صاحب نے اپنے اطراف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں صاحب، انیک بار دیکھا ہے۔ ا[illegible] بار تو وہ اس ہیٹر کے پاس پھن اٹھائے کے ہم[illegible] مکابل کھڑا ہوئی گوا رہنا۔"

"اچھا؟ تو تم نے اسے مارا کیوں نہ[illegible]" خاں صاحب نے پوچھا۔

"ہم نہتے رہے [illegible] ب۔" کلوا نے ج[illegible] دیا۔

"ہوں" خاں صاحب نے کچھ سوچا او[illegible] "تو تم جگوا کو کسی ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے؟"

"ہاں صاحب لیئی گئے تھے۔ گاؤں ماں ایک وید رہت ہویں ان ہن کو دکھاوا تہا وہ دوا دہن پر کونو پھائدہ ناہیں بھوا۔ مُنہہ تے پھین آئے لاگا تو وید جواب دے رہن۔ پھر ہم تُرنتے بھیا کو بیل گاڑی ماں ڈال کے سرکاری اسپتال لیئی گئے۔ پر صاحب" کلوا نے گلوگیر آواز میں کہا" اسپتال پہنچت پہنچت دم ٹوٹ گوا"۔ اور دکھ کے زیر اثر کلوا کا سر جھک گیا۔ وہ دیر تک سر جھکائے سوچتا رہا۔

"پچھلے برس دنگل ماں بھیا کستی ہار گوا تہا ـــ پر اب کی کھوب تیار ہوا تہا روج کہت رہے۔ اب کی دنگل ماں ہمرے مکابل کونو ناہیں ہوئی"۔ طویل خاموشی کے بعد کلوا نے کہا پھر سر اٹھا کے دُور آسمان کی طرف دیکھا اور بولا" پُوس ماں دنگل ہوئے والا ہے"۔

کلوا کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے اور سُتا ہوا سیاہ چہرہ دکھ کے گہرے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ کلوا دیر تک اپنے بیٹے کی جفاکشی، جرأت اور اس کی محبت کی باتیں کرتا رہا اور خاں صاحب کے ذہن میں اس کے جواں سال بیٹے کا عکس اُبھرتا رہا جو اپنے مضبوط ہاتھوں میں پھاؤڑا لیے سخت زمین کھود رہا تھا۔

سوچتے سوچتے خاں صاحب کو خیال آیا بولے۔ بیسوں کی ضرورت ہے؟"

کلوا کے ساکت بدن میں حرکت ہوئی۔ اس نے کندھے سے انگوچھا اتار کے آنکھیں پونچھیں، چہرے کا پسینہ خشک کیا پھر کن انکھیوں سے خاں صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا" ہاں صاحب، بہت ضرورت ہے"۔

خاں صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈال کے دس کا نوٹ نکالا اور کلوا کی طرف بڑھا دیا۔

کلوا نے لرزتا ہوا ہاتھ بڑھا کے نوٹ لیا اور کچھ توقف کے بعد بولا۔

"صاحب! ہم کرونوکل سے اپنے چھوٹکے کو مجُوری پر لینا آئی ہے"

"ہاں ہاں، ضرور لیتے آنا"۔ خاں صاحب نے کہا۔

"پر صاحب!" کلوا نے کچھ کہتے کہتے سر جھکا لیا۔

"ہاں ہاں کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟" خاں صاحب نے بہت نرمی کے ساتھ پوچھا

"صاحب ـــ اس کو بھی ہمرے برابر مجُوری ملی ہے" کلوا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

خاں صاحب نے کچھ توقف کیا پھر بولے" ہاں ہاں کیوں نہیں، اسے بھی تمھارے برابر ہی مزدوری دُوں گا"۔

"بہت مہربانی صاحب"۔ کلوا نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ خاں صاحب نے غور سے کلوا کی طرف دیکھا۔ کلوا کے سیاہ غم آلود چہرے پر اب ایک لازوال روشنی بیدار تھی۔ ایسی روشنی ـــ جو طلوع ہوتے ہوئے سورج کے اطراف ہوتی ہے۔

سے کہا۔ "ابے اچھی خاصی پینٹ کا ستیاناس کر دیا۔"

کلوا کچھ شرمندگی کے ساتھ بولا۔ "صاحب! پتلون تو ایک ہی آدمی پہن سکت تھا... ہم کہا کہ بچّن کے بھی دھڑ ڈھک جائیں۔"

"ہاں سالے رہوگے گنوار کے گنوار ــــ اور کرتے کا کیا بنایا؟ لنگوٹ؟" خاں صاحب نے اسی سنجیدگی کے ساتھ پوچھا۔

"ناہیں صاحب،" کلوا نے سر جھکا کے کہا۔

"پھر؟"

"ہمری مہریا دیکھ کے لہلوٹ ہوئی گئی بولی یہ ہم پہن با۔ ہم کہا تو ہی لیئی لے پر کبھوں کبھوں ہم ہو پہنب۔" کلوا نے کہا۔ خاں صاحب مسکرانے لگے۔

کلوا ایک اضمحلال کے ساتھ آکے خاں صاحب سے کچھ دُور، زمین پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد جب خاں صاحب نے سر اٹھا کے دیکھا کلوا سر جھکائے اس طرح بیٹھا تھا کہ جیسے اسے خاں صاحب کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہو۔ اس کا چہرہ حسبِ معمول فکروں سے بوجھل اور سُتا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ ہی ایسا تاثر قائم رہتا کہ جیسے وہ دُھوپ میں چل کر دُور سے آیا ہوا اور بہت پیاسا ہو۔ کلوا کے اس طرح سر جھکا کے بیٹھنے یا ساکت کھڑے ہو کے مُسکرانے کا مطلب خاں صاحب کو خوب معلوم تھا۔ وہ جب بھی ایسی مکروہ صورت بنا کے آتا تو خاں صاحب اسے بُرا بھلا کہتے، کاہلی کے طعنے دیتے اور پچھلی رقم کی ادائگی کا مطالبہ کرتے۔ کلوا سر جھکائے مجرموں کی طرح کھڑا رہتا۔ اگر کہتا بھی تو یہ کہ "صاحب! آپ مالک ہو۔ بچّے بھوک سے بلاّ رہے ہیں۔"

کلوا کے بچے سدا بھوکے رہتے تھے یا کلوا ہمیشہ مکر کرتا تھا اسی لیے خاں صاحب کو اس سے ازلی چڑ تھی ایک کلوا ہی کیا وہ اس قبیل کے تمام لوگوں سے بددل رہتے تھے وہ انھیں مردود قرار دیتے اور کہتے کہ یہ لوگ جانوروں کی سی صفات رکھتے ہیں کاہل اور کام چور ـــــ ان کے اندر بغض بہت ہوتا ہے لیکن یہ اس کا اخراج نہیں کر پاتے ہیں بس سر جھکا کے پھنکارتے ہوئے چلتے رہتے ہیں آپ ہاتھ میں چابک لیے ان کے پیچھے چلتے رہیے اور ذرا ہوشیاری کے ساتھ ان کی سمتوں کا تعین کرتے رہیے لیکن اس دوران یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ بظاہر بے ضرر جانور کبھی کبھی پچھلی ٹانگیں بھی پھینکتے ہیں لہٰذا ایک فاصلہ برقرار رکھنا عین ہشیاری ہے۔ چُوں کہ کلوا خاں صاحب کے والد کے وقت سے ان باغوں کی دیکھ بھال کرتا آرہا تھا اس لیے حکمت عملی کے باوجود خاں صاحب کے دل میں کلوا کے لیے نرم گوشہ تھا وہ اس کی خطاؤں کو درگزر بھی کرتے اور اکثر زیادہ پیسے دے دیا کرتے۔ اِدھر جب سے باغوں کی گرانی شروع ہوئی تھی کلوا مختلف بہانوں سے کام چوری کرتا رہا تھا۔

"کہو؟" خاں صاحب نے ذرا سختی کے ساتھ کہا۔ "آج پھر بھوکے ہوگئے؟"

کلوا نے گردن زیادہ جھکالی۔

"بولتا کیوں نہیں بے، اتنی دیر سے کیوں آیا؟" خاں صاحب نے ذرا سختی سے پوچھا۔

"صاحب" کلوا نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکا۔

"یوں ہی ناٹک کرتا رہے گا یا کچھ بتائے گا بھی۔" خاں صاحب نے جھنجھلا کے کہا، جواب کے انتظار میں چند لمحوں تک کلوا کی طرف دیکھا پھر کتاب پڑھنے میں مشغول ہوگئے۔

"جگوا مرگوا صاحب" کلوا نے کہا اور وہ پھپھک پُھپھک کے رونے لگا۔

"جگوا مر گیا؟" خاں صاحب نے حیرت کے ساتھ کلوا کی طرف دیکھا۔

"ہاں صاحب، ہمار بھیاّ مرگوا۔" کلوا نے دوبارہ بڑی بے چینی کے ساتھ کہا اور وہ زور زور سے رونے لگا۔

خاں صاحب ایک سکتے کے عالم میں بیٹھے کلوا کی طرف دیکھتے رہے اور کلوا سر جھکائے سسکیوں کے ساتھ روتا رہا۔

"کچھ بیمار ہوگیا تھا؟" طویل خاموشی کے بعد خاں صاحب نے پوچھا۔

"ناہیں صاحب، بالکل ہٹا کٹا ہتا۔ تڑکے اُٹھ کے نہائس، باسی روٹی کھائس کے ہمرے ساتھ مجوری پر آئی گوا۔ آپ کے سیجے کہا ہنا ہن پھڑوا چلات ہتا۔"

"ہاں، میں نے دیکھا تھا۔ خاصا تندرست نظر آرہا تھا۔ تو کیا بس ایسے ہی، اچانک مرگیا؟" خاں صاحب نے پوچھا۔

"ناہیں صاحب، ام کا یہاں تے لوٹ کے گوا اور گھر پہنچت پہنچت جمین پر لوٹ گوا۔ ہمرے مطابک کونو کریا کاٹ کھائس۔" کلوا نے گہرے دکھ کے ساتھ جواب دیا پھر سر اٹھا کے تشویش کے ساتھ اپنے اطراف دیکھتے ہوئے بولا۔ "صاحب! اس باگ ماں بہت کھترناک کریا رہت ہے۔"

"تم نے دیکھا ہے؟" خاں صاحب نے بھی اپنے اطراف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں صاحب، انیک بار دیکھا ہے۔ ایک بار تو وہ اس ہلیٹر کے پاس پھن اٹھائے کے ہمرے مکابل کھڑا ہوئی گوا ہتا۔"

"اچھا؟ تو تم نے اسے مارا کیوں نہیں؟" خاں صاحب نے پوچھا۔

"ہم نہتے تھے ب۔" کلوا نے جواب دیا۔

"ہوں" خاں صاحب نے کچھ سوچا اور بولے۔

"تو تم جگوا کو کسی ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے؟"

"ہاں صاحب لیئی گئے تھے۔ گاؤں ماں ایک ویدر ہت ہویں ان ہن کو دکھاوا تہا وہ دوا دہن پر کونو پھائدہ ناہیں بھوا۔ مُنہ تے جھین آئے لاگا تو وید جواب دے رہن۔ پھر ہم تُرنتے بھیا کو بیل گاڑی ماں ڈال کے سرکاری اسپتال لیئی گئے۔ پر صاحب" کلوا نے گلوگیر آواز میں کہا۔" اسپتال پہنچت پہنچت دم ٹوٹ گوا۔" اور دکھ کے زیر اثر کلوا کا سر جھک گیا۔ وہ دیر تک سر جھکائے سوچتا رہا۔

"پچھلے برس دنگل ماں بھیاؔ کستی ہارگوا تہا ___ پر اب کی کھوب تیار ہوا تہا روج کہت رہے۔ اب کی دنگل ماں ہمرے مکابل کونو ناہیں ہوئی"

طویل خاموشی کے بعد کلوا نے کہا پھر سر اٹھا کے دور آسمان کی طرف دیکھا اور بولا " پُوس ماں دنگل ہوئے والا ہے"

کلوا کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے اور ستا ہوا سیاہ چہرہ دکھ کے گہرے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ کلوا دیر تک اپنے بیٹے کی جفاکشی، جرأت اور اس کی محبت کی باتیں کرتا رہا اور خاں صاحب کے ذہن میں اس کے جواں سال بیٹے کا عکس اُبھرتا رہا جو اپنے مضبوط ہاتھوں میں پھاؤڑا لیے سخت زمین کھود رہا تھا۔

سوچتے سوچتے خاں صاحب کو خیال آیا بولے۔ "پیسوں کی ضرورت ہے؟"

کلوا کے ساکت بدن میں حرکت ہوئی۔ اس نے کندھے سے انگوچھا اتار کے آنکھیں پونچھیں۔ چہرے کا پسینہ خشک کیا پھر کن انکھیوں سے خاں صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔" ہاں صاحب، بہت جرورت ہے"

خاں صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈال کے دس کا نوٹ نکالا اور کلوا کی طرف بڑھا دیا۔

کلوا نے لرزتا ہوا ہاتھ بڑھا کے نوٹ لیا اور کچھ توقف کے بعد بولا۔

"صاحب! حکم کرو تو کل سے اپنے چھٹکے کو مجوری پر لینا آئی ہے"

"ہاں ہاں، ضرور لیتے آنا" خان صاحب نے کہا۔

"پر صاحب!" کلوا نے کچھ کہتے کہتے سر جھکا لیا۔

"ہاں ہاں کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟" خاں صاحب نے بہت نرمی کے ساتھ پوچھا

"صاحب ___ اس کو بھی ہمرے برابر مجوری ملی؟" کلوا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

خاں صاحب نے کچھ توقف کیا پھر بولے "ہاں ہاں کیوں نہیں، اسے بھی تمھارے برابر ہی مزدوری دوں گا"

"بہت مہربانی صاحب" کلوا نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ خاں صاحب نے غور سے کلوا کی طرف دیکھا۔ کلوا کے سیاہ غم آلود چہرے پر اب ایک لازوال روشنی بیدار تھی۔ ایسی روشنی ___ جو طلوع ہوتے ہوئے سورج کے اطراف ہوتی ہے۔

⬡

گھر میں نہ پائیں گر مجھے، دفتر سے جب آئیں
اے ری سکھی میں کیا کروں، بچّوں پر جھنجھلائیں

ڈھلکا آنچل سینے سے، ہونٹوں پر مُسکان
اور سکھی کیا چاہیے، کرنے کو گُرو دان

بھابی! کل پھر آؤں گی، اب تو جی گھبرائے
ان کی عادت ہے عجب، تنہا نیند نہ آئے

اُس آنچل کی اوٹ میں جاکر جو چُھپ جائے
سارا جگ ڈھونڈے مگر اُس کا پتہ نہ پائے

گھور اندھیرا رات کا، دن کی چڑھتی دھوپ
شاشک، گایک، نرتکی، تیرے رُوپ انوپ

وقار واثقی

۱۵۲۵، رسول آباد، احمد آباد ۳۸۰۰۲۸

من دُبدھا میں ہی رہا، رَین ہوئی یا بھور
بِھیتر چمگادڑ اُڑیں، باہر کاگا شور

بِھیتر کیا کیا ہو رہا، اے دِل کچھ تو بول
ایک آنکھ روئے بہت، ایک ہنسے جی کھول

ہم جگ میں کیسے رہے، ذرا دیجیے دھیان
رات گذارے جس طرح، دُشمن گھر مہمان

دِل دماغ بس میں نہیں، لیے اُڑے پتنگ
حُکم سے باہر ہوگئے، اس تن کے سب انگ

جو دیکھا سمجھا سُنا، غلط رہا میزان
اور نکٹ آ زندگی، ہو تیری پہچان

بھگوانداس اعجاز

ڈی ۴۵۱، بلجیت نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۸

رشید احمد صدیقی کی خطوط نویسی

اُردو ادب میں رشید احمد صدیقی کی شخصیت متعدد خصوصیات کی حامل ہے۔ وہ ادب کے جس کوچے میں پہنچے وہاں انھوں نے اپنی ذہانت اور بذلہ سنجی کے گل بوٹے کھلائے اور اپنی شخصیت کی گہری چھاپ چھوڑی۔ ایک معلم اور طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے متعارف ہونے والے رشید صاحب انشائیہ نویس بھی تھے اور مرقع نگار بھی۔ وہ کھرے ناقد بھی تھے اور اچھے خطوط نویس بھی۔ گو انھوں نے مرزا غالب کی طرح "مراسلے کو مکالمہ بنانے" اور کوئی "نیا طرزِ تحریر ایجاد کرنے" کا دعویٰ تو نہیں کیا مگر ان کے خطوط اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ انھوں نے خطوط نویسی کے فن کی صداقتوں کو سمجھا بھی ہے اور برتا بھی ہے۔ ان کے وہ بے شمار خطوط جو انھوں نے اپنے دوستوں عزیزوں اور شاگردوں وغیرہ کو لکھے اُردو ادب میں خاصے کی چیز ہیں۔

ایک اچھا خط شخصیت کا عکس ہوتا ہے۔ خلوص اور بے ریائی عمدہ خطوط نویسی کا خاص وصف ہے۔ خطوں کی دنیا دراصل ایک علیٰحدہ دنیا ہوتی ہے نجی زندگی کی متحرک تصویریں، تہذیبی مرقعے، روزمرّہ زندگی میں پیش آنے والے چھوٹے چھوٹے واقعات اور حادثات یوں کہا جا سکتا ہے کہ خطوط کی کائنات میں زندگی کا سارا سوز و ساز اور اس کی تمام دل فریبیاں اور دل فراشیاں سمٹ آتی ہیں۔ خط لکھنے والے کی شخصیت اس طرح بے نقاب ہوتی ہے کہ نہ صرف اس کے مزاج، کردار اور اس کے مختلف ذہنی رویّوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں بلکہ اس کے عہد، خاندان اور ماحول سے متعلق بھی بہت سی باتیں غیر شعوری طور پر مکتوب الیہ کے سامنے آجاتی ہیں۔

رشید احمد صدیقی خطوط نویسی کے فن سے اچھی طرح واقف تھے اور اس کی عظمت و دل فریبی کے قائل بھی تھے۔ اس فن کے تئیں ان کا رویّہ کیا تھا اس کی وضاحت خود انھوں نے ان الفاظ میں کی ہے:

"خطوط کو نہ پکّا گانا ہونا چاہیے نہ فلمی قوالی۔ خط لکھنا دراصل اتنا خطبۂ صدارت تصنیف کرنے کا فن نہیں جتنا گفتگو کرنے کا سلیقہ ہے۔ اور گفتگو کرنا، گفتگو ہی کرنے کا نہیں خاموش رہنے کا بھی فن ہے۔ اس اعتبار سے بڑا سخت گیر فن ہے۔ خاموش رہنا صفات الٰہیہ میں سے ہے۔ اپنے بے پایاں اور بے کراں اختیارات میں تنہا بیٹھنا خدا ہی کے بس کی بات ہے۔

خطوط کو میں فنونِ لطیفہ میں جگہ دیتا ہوں۔ حسن و ہنر کا جو اظہار اور ابلاغ مختلف فنونِ لطیفہ سے علیٰحدہ علیٰحدہ ہوتا ہے گفتگو کرنے میں ان سب سے بطریقِ احسن کام لینا پڑتا ہے۔ اچھی گفتگو کرنے والے کی گفتگو میں نقش و رنگ رقص و آہنگ اور شخصیت کی بیک وقت جلوہ گری ملتی ہے۔ شخص کی عدم موجودگی میں یہی کرشمہ اس کے خطوط میں نظر آئے گا۔"

رشید احمد صدیقی کے خطوط میں یہ کرشمہ جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ سادگی، سلاست، خلوص، بے ریائی، دل سوزی اور دلنوازی کی تلاش اگر مکاتیب رشید میں کی جائے تو خالی ہاتھ واپسی نہیں ہوتی۔ وہاں مکتوب نگار کی نجی زندگی کی مجسم اور متحرک تصاویر ہیں، ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا تذکرہ ہے جن سے زندگی عبارت ہوتی ہے۔ ان کے خطوں میں خطابت اور بلاغت کے کڑے اصول نہیں ہیں۔ نہ سنجیدگی کی ایسی دبیز ردا ہے جو زندگی کے سارے حسن کو ڈھانپ لیتی ہے۔ ان خطوں میں خلوص کی آنچ ہے۔ جذبات کی گرمی ہے اور زندگی کے بے شمار رنگوں کی قوس قزح ہے۔

"خواص پسند" اور خلوت نشین رشید احمد صدیقی اپنے خطوط کی دنیا میں مکتوب الیہ کے ساتھ خوب گھلے ملے نظر آتے ہیں، خوشیوں میں گھل کر ہنستے مسکراتے ہیں اور غموں کا بھی برملا اظہار کرتے ہیں۔ نہ خوشیاں مصنوعی نظر آتی ہیں اور نہ غم رسمی محسوس ہوتے ہیں۔ اپنی کم آمیزی کے باوصف مکتوبات میں ان کے جذبات بے نقاب ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں، رازِ دروں خود بخود قلم کی نوک نے عیاں کر دیے ہیں۔ بے تکلفی اور بے اختیاری اکثر اس

شہناز انجم

۱۷۴۷/۲، میر جملہ لین، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

مقام پر جا پہنچی ہے جہاں من و تو کے حجابات اُٹھ جاتے ہیں، دل کی دھڑکن سرگوشی بن جاتی ہے اور یہ اس لیے ہوتا ہے کہ خط لکھتے وقت رشید صاحب "خط کے دیوتا" کے قبضۂ قدرت میں ہوتے ہیں۔ ان کا خیال ہے:

"خطوط کا معاملہ عشق و محبت کا ہے، جس طور پر محبت ہو جاتی ہے کی نہیں جاتی، اسی طور پر خط بھی لکھ جاتا ہے لکھا نہیں جاتا۔ محبت کے دیوتا کی طرح خط کا دیوتا بھی اندھا ہوتا ہے۔"

اس اندھے دیوتا کو رشید صاحب اچھی طرح پہچانتے تھے۔ زندگی کے حسن اور اس کی عظمت کے ساتھ اس کی لغزشوں اور کج ادائیوں سے بھی انھیں گہرا لگاؤ تھا۔ اسی لیے زندگی کے ہر پہلو پر ان کی گرفت مضبوط تھی۔ زندگی کے نشیب و فراز کو انھوں نے اپنے خطوط میں سلیقے اور اہتمام سے پیش کیا ہے۔ آل احمد سرور خطوط نویسی سے متعلق ان کی صلاحیتوں کا اس طرح اعتراف کرتے ہیں:

"رشید صاحب خطوں پر خاص توجہ کرتے تھے۔ بڑے مزے کے خط لکھتے تھے۔ خطوں میں وہ ہر طرح کی باتیں بھی کرتے تھے، اپنا اور مکتوب الیہ کا دل بھی بہلاتے، خلوت میں انجمن بھی برپا کرتے۔ ان کی انشا پردازی اور ان کے خطوں میں ایک رشتہ ہے بات سے بات پیدا کرنے اور لطف و انبساط کا۔"

رشید احمد صدیقی کے خطوط میں قومی اور تہذیبی شعور اور علی گڑھ کی محبت کے ساتھ انسان دوستی کے جذبات اور صحت مند تنقیدی انداز نظر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ انھیں اپنے ہم مذہبوں کی بدحالی کا بھی شدید احساس ہے مگر اس پر آنسو بہانا ان کا شیوہ نہیں، مایوسی کو وہ اچھی علامت تصور نہیں کرتے۔ بلکہ بہتری کے لیے مناسب راہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پروفیسر سید بشیر الدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آپ نے مسلمانوں کی ابتری کا جو نقشہ کھینچا ہے اور جس دکھ سے اس کا ذکر کیا ہے اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے اور کون ہے جو اس کی تصدیق نہ کرے گا۔ لیکن مایوس ہونا نہ کوئی اچھی فلاسفی ہے نہ مناسب طریقۂ کار خصوصاً میرے اور آپ کے لیے جو علی گڑھ کے ساختہ پرداختہ کہے جاتے ہیں... ہمارا آپ کا کام ماتم کرنا نہیں ہے بلکہ مدد کرنا اور کیے جانا ہے۔ جماعت CURRUPT ہو جاتی ہے تو فرد کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے۔"

علی گڑھ سے رشید صاحب کی شیفتگی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ وہ خود آخر دم تک علی گڑھ کے شیدائی رہے اور کتنے ہی لوگوں کو اس دیار کا شیدائی بنایا۔ رشید صاحب مسلمانوں کی نئی نسل خصوصاً علی گڑھ کے نوجوانوں کو زمانہ شناس دیکھنے کے خواہاں تھے۔ انھوں نے ہمیشہ نوجوانوں کو اچھے خیالات اور اچھی باتوں کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی۔ اس عمل میں ان کا رویہ زاہد خشک یا کٹر واعظ کا نہیں ہوتا بلکہ وہ باتوں باتوں میں حوصلہ بڑھا کر اونچا اُٹھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ خدا کی ذات اور اس کی رحمت پر پورا بھروسہ رکھتے ہیں۔ خدا اور ان کے درمیان تعلق کی کیا نوعیت ہے ذرا اس خط میں ملاحظہ فرمائیں:

"بچوں کی تکلیف اور علالت کا مجھ پر غیر معمولی اثر ہوتا ہے۔ اس لیے جب وہ کسی سخت مرض سے نجات پاتے ہیں تو میں خدا سے اس درجہ خوش ہوتا ہوں جیسے وہ کسی اور کا خدا نہیں صرف میرا ہے۔ صرف میرا نہ ہوتا تو اتنا فضل کیوں کرتا۔ آپ سن کر ہنسیں گے کہ میرا یہ تصور بعض اوقات مجھے مضحکہ خیز بنا دیتا ہے یعنی میں خدا کو اپنا فیملی ممبر سمجھنے لگتا ہوں۔"

طالب علموں کی ذہنی تربیت اور کردار کی تعمیر میں رشید صاحب کا طرزِ عمل کس قدر مخلصانہ تھا اس کا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے جو انھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے شاگردوں اور دیگر طالب علموں کو لکھے ہیں۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آپ نے اس حق تلفی کا ذکر کیا ہے جو بعض صاحبوں کی وجہ سے آپ کو پیش آئی۔ اس کا افسوس ضرور ہے لیکن زندگی میں اس طرح کی ٹکر و بات پیش آتی ہی رہتی ہیں۔ ان کا علاج یہ ہے کہ اپنی اچھی صلاحیتوں پر بھروسہ کرے اور ان کا مقابلہ صبر و برداشت سے کرتا رہے۔ اس طرح مشکلیں جلد دور نہیں بھی ہوتیں تو رفتہ رفتہ آسان ہونے لگتی ہیں۔ یہاں تک کہ ختم ہو جاتی ہیں۔"

یہ صرف زندگی سے نباہ کرنے کا درس نہیں ہے بلکہ زندگی پر قابو پانے اور چھوٹوں کو بڑا بنانے کا گر ہے۔ اور یہ رشید صاحب کی بڑائی ہے کہ وہ اپنی تحریروں کے ذریعے اس ورثے کو خوشی خوشی اپنے پرائے سب میں بانٹتے رہے۔ نظیر صدیقی کو جنوری ۱۹۶۳ء کے ایک خط میں لکھا:

"آپ میری ایک بات ضرور یاد رکھیں اس پر عمل کریں یا نہیں۔ تنقید نگار کے خیالات سے بد دل یا برہم ہونے کے بجائے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کیا کیجیے۔ اچھا تنقید نگار (اور اختلاف کرنے والا تنقید نگار بھی اچھا تنقید نگار ہو سکتا ہے)۔ شعر و ادب کا ضمیر ہوتا ہے۔ اس سے آپ اتفاق کریں یا نہیں اس کا احترام بہر حال لازم آتا ہے۔ میرے اس کہے پر عمل کیجیے گا تو آپ میں خود اپنا اچھا تنقید نگار بننے کا ملکہ پیدا ہو جائے گا۔"

دوست اور دوستی کے بارے میں رشید احمد صدیقی کا نظریہ خلوص اور بے ریائی پر مبنی ہے۔ دوستی کے احترام میں وہ خود جھکنے میں بھی اپنی ہتک محسوس

نہیں کرتے۔ پروفیسر بشیرالدین کو ایک خط میں اس طرح مناتے ہیں:

"میرا پچھلا خط پاکر آپ کو کتنی تکلیف پہنچی ہوگی — میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ نوبت یہاں تک پہنچے گی — مسائل ہوں، اشخاص ہوں، ادارے ہوں، تحریکیں ہوں، پڑھے لکھے لوگوں میں ان پر بحث اور اختلاف رائے ہوا ہی کرتا ہے۔ اس سے دوستوں میں غلط فہمی یا شکر رنجی نہیں ہونی چاہیے بہر حال جو ہوا سو ہوا آپ بھول جائیے اور مجھے معاف کر دیجیے۔ آئیے ہم دونوں اس عہد کو لوٹ جائیں جہاں خط و کتابت سے آپس میں میل محبّت کی باتیں کیا کرتے تھے۔"

انھیں کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"مجھے تو خوشی ہے کہ آپ کو کام کرنے کا موقع کشمیر میں ملا معلوم نہیں آپ کیسا محسوس کرتے ہیں۔ لیکن خود کشمیر اتنی خوب صورت جگہ ہے کہ وہ بہت سی دشواریوں کی تلافی کر سکتی ہے۔ فطرت کی اتنی اچھی رفاقت اور کہاں مل سکتی ہے — اچھا دوست کسی اچھی جگہ پر ہوتا ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں بھی اسی جگہ پر ہوں۔"

دوستی کا احترام اور دوستوں کی دل داری اور دل نوازی انھیں بے حد عزیز تھی۔ اخلاقی قدروں کی پاس داری اور مشرقی روایات کا جو ورثہ انھیں ملا تھا اس کے ذریعے انھوں نے زندگی کو سنوارنے اور پرکشش بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ انھوں نے ادب اور انسانیت کے مابین لطیف رشتہ قائم کرنے کی سعی کی ہے۔ وہ طنز و مزاح نگار تھے لیکن ان کے خطوط میں شوخی و ظرافت کا سیلِ رواں نہیں ملتا۔ ہاں اسلوب کی شگفتگی میں طنز و مزاح کی مدھم لہر موج تہ نشیں کی مانند اکثر جگہ رواں رہتی ہے مسعود صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"سالہا سال سے کچھ اس طرح کا حال ہے جیسے کسی نے زندگی کے سارے ہرے بھرے درخت کاٹ کر گرا دیے ہوں اور ان میں آگ دے دی ہو۔ آپ جانتے ہیں گیلی لکڑی کتنے دھیرے دھیرے، کتنے دنوں تک سلگتی رہتی ہے۔ اور اس سے کیسا تاریک اور دم گھٹنے والا دھواں اٹھتا رہتا ہے۔"

دہلی کے مشاعرۂ جشنِ جمہوریت میں شرکت کا حال پروفیسر محمد حسن کو یوں لکھا ہے:

"میں خود ۲۴ جنوری کے لال قلعے کے مشاعرے میں پہنچ نہ پایا۔ دروازے پر پولیس، مشاعرے کے منتظمین اور پبلک کوئی بھی آپے میں نہ تھی۔ جیسے مشاعرے میں شرکت کی نہیں لال قلعے کو لوٹنے کی دعوت دی گئی تھی۔ سرکاری اسسٹنٹ کو اور مجھے بے بسی اور ہجوم کی زد میں دیکھ کر "بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق"، یعنی موٹر کا سرخ اور زرتار قبا پوش ڈرائیور آگے بڑھا۔ اس کا حدود اربعہ سج دھج، تیور اور تگ و دو کا انداز دیکھ کر پولیس دبک گئی اور مجمع سہم گیا اور میں حفاظت ہی نہیں احترام سے دروازے سے گزر گیا۔ پنڈال میں پہنچا تو محسوس ہوا کہ عام طور پر نقل و حرکت پر پابندی تھی۔ ایسے لوگوں پر بھی جیسے کہ آپ تھے۔"

رشید احمد صدیقی کے خطوط ادب کا گرانقدر سرمایہ ہیں۔ ان کے اسلوب میں زبان کی فصاحت — اور مضامین کی بوقلمونی وغیرہ ایسی خصوصیات ہیں جو ادب میں ان کو اہم مقام بخشتی ہیں۔ ان خطوط کو ایسا نگارخانہ کہا جا سکتا ہے جس میں خود رشید صاحب کی سیرت و شخصیت کا پہلو روشن نظر آتا ہے۔ ان کی تعلیمی، تہذیبی، سماجی اور ادبی سرگرمیوں کی جھلکیاں صاف دکھائی دیتی ہیں اور ان کے مکتوب الیہم کی شخصیت اور اس کے مختلف تہذیبی و تمدنی رویّوں کی بھی ترجمانی ہوتی ہے۔

خالہ شبّو

پچھلے پچیس تیس برسوں میں زندگی نے اتنی کروٹیں لی ہیں کہ ہماری معاشرت کا پورا ڈھانچہ ہی کچھ کا کچھ ہو کر رہ گیا ہے۔ نہ صرف شہروں بلکہ قصبوں اور گانوؤں کی زندگی بھی ایک مسلسل دوڑ اور ہنگامہ بن کر رہ گئی ہے۔ اِس دوڑ میں ہمیں جہاں زندگی کی بہت سی نعمتیں اور آسائشیں میسّر ہوتی ہیں وہیں اس نے دوسری کئی چیزوں کے ساتھ ہم سے فارغ الوقتی بھی چھین لی ہے۔ اب کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ مشاطاؤں کی لچھے دار باتوں میں گھنٹوں کھویا رہے۔ ان کی لچھے دار باتوں میں گھنٹوں کھوئے رہنے کی بات تو دور رہی خود مشاطہ ہی نہ جانے کہاں اُڑن چھو ہو گئی ہے؟ شاید بناؤ سنگھار کے مشینی آلات نے اسے نگل لیا ہے۔ مانا کہ آج ہماری سنگھار میز کے ساتھ ہی رکھے ہوئے بینگلز بکس میں رنگا رنگ چوڑیوں کے دسیوں سیٹ ہوتے ہیں مگر اب وہ حسین تصوّر کہاں جو منیہارن کے ساتھ وابستہ تھا۔ منیہارن تو اب بس ایک کہانی بن کر رہ گئی ہے نئی نسل کو شاید یہ بھی معلوم نہ ہوگا کہ محلّے یا گھر میں شادی بیاہ یا تہوار کے موقع پر منیہارن کی آمد ہمارے لیے کتنی بڑی خوشی کی بات ہوتی تھی۔ یہ بات دوسری ہے کہ چوڑیاں ہمیں بزرگوں کی ہی پسند کی پہننی پڑتی تھیں۔ اب تو ہم مالن کو بھی ترس گئے ہیں۔ بیلے اور چمبیلی کے اُن گجروں کی مہک ہمارے احساس میں آج بھی بسی ہوئی ہے جو تہوار یا شادی بیاہ کے موقعوں پر ہمیں بچپن میں بھی مل جایا کرتے تھے۔ اور پھر شادی کے بعد تو برسوں تک دُلہن کو پھول اور گجرے پہنچانا مالن کا فرض ہوتا ہی تھا۔ مشاطہ، منیہارن یا مالن کی بات چھوڑیے، اب تو ہماری خالہ شبّو بھی نہیں رہیں۔

مالن اور منیہارن کی شکلوں کا تو اب صرف ایک دھندلا سا ہیولا ہی باقی رہ گیا ہے مگر اللہ بخشے خالہ شبّو ہمارے تصوّر میں اب بھی اُسی طرح زندہ ہیں جیسے اب سے بیس برس پہلے تھیں۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پان کی پیک سے گلکاری کیا ہوا برقعہ ڈالے خالہ شبّو ہمارے دروازے کا پردہ ہٹا کر بس پوچھنے ہی والی ہیں کہ بیٹی جو سب خیریت تو ہے نا! وہ اس طرح پہلے تو خیریت دریافت کرتیں اور اِدھر سے گرم جوشی کا اظہار ہونے پر یا پھر اپنی غرض سے وہ لفڑ لفڑ جوتی گھسیٹتی صحن میں داخل ہو جاتیں۔ وہ روزانہ نہیں تو دوسرے تیسرے دن ضرور آتیں اور آنے کی وجہ صرف تین باتیں ہوتی تھیں۔ یا تو اپنے اکلوتے لڑکے سے کوئی اذیت پانے پر بلبلا کر گھر سے نکل پڑتی تھیں، جب اس طرح آتیں تو گھنٹوں کے لیے چھٹی ہو جاتی تھی۔ پہلے تو اپنے جل موہے لڑکے کو طرح طرح سے کوستیں اور اپنا سینہ پیٹتی رہتی۔ اور پھر کسی نہ کسی بیونت سے بات کھانے پینے تک جا پہنچتی۔ جس کا واضح مطلب یہی ہوتا کہ اب خالہ شبّو کے ذہن کی سوئی معدے میں اٹک گئی ہے۔

ان کے آنے کی دوسری بڑی وجہ یہ ہوتی تھی کہ وہ ساری آبادی کی خیر خبر رکھنے کا بھی دم بھرتی تھیں۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ پوری آبادی میں کسی کا ماتھا بھی گرم ہو اور خالہ شبّو فوراً نہ پہنچیں۔ وہ اپنی اس عادت سے تقریباً مجبور سی تھیں اور اپنی اسی عادت کی بدولت وہ چلتا پھرتا اخبار بھی کہلانے لگی تھیں۔ کل شام کس کے گھر کیا پکا تھا، شیخ فتّو نے آج پھر اپنی زبان دراز بیوی کی ٹھونکا پیٹی کر دی ہے، خضاب کے لیے پیسے مانگنے پر چھکّن چچا کا اپنی بیوی سے چار دن پہلے جو جھگڑا ہوا تھا ان کی آپسی بول چال ابھی تک شروع نہیں ہوئی ہے، اچھن میاں کی بیوی کبھی واپس لوٹ کر نہ آنے کی دھمکی دے کر ایک بار پھر میکے چلی گئی ہے، اور تو اور خالہ شبّو کو یہ بات بھی معلوم تھی کہ روحی کے میاں کا اپنی پڑوسن سے کوئی چکّر چل رہا ہے اور یہ کہ نعیمہ کا پانچویں بار پیر بھاری ہو کر ایک بار پھر اُمّیدوں پر اوس پڑ گئی ہے۔ دلچسپ بات تو یہ تھی کہ یہ راز کی باتیں خالہ شبّو کے سینے تک ہی محدود نہیں رہتی تھیں بلکہ ان کی شہر گردی کے طفیل سینہ در سینہ دوسری تمام بیبیوں تک بھی آناً فاناً پہنچ جاتی تھیں۔ کبھی وہ ایسے چکّروں کا ذکر اس چٹخارے کے ساتھ کرتیں کہ انھیں اپنے یہاں سے جانے دینے کو طبیعت نہیں چاہتی تھی۔

ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ خالہ شبّو

نور جہاں

۲۱۱۴، رودگراں، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

کی ایک بڑی خوبی یا خامی یہ تھی کہ جہاں دو ناراض
پڑوسنوں میں صلح صفائی کرا دینے میں طاق تھیں
وہیں دوست سے دوست پڑوسنوں کے درمیان
بنتوں میں فساد کھڑا کر دینے میں بھی اپنا جواب نہیں
رکھتی تھیں، اُن کے من سے اگر کوئی اترا یا کسی نے انھیں
کوئی ایسی بات کہہ دی جو ان کو ناگوار گزری تو اس کا
بدلا ضرور لیتیں اور اس طرح لیتیں کہ کسی کو گمان تک
نہ گزرتا کہ اس آفت کے پیچھے خالہ شبو کا ہاتھ ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری سہیلی ریحانہ نے ایک
بار انھیں چھیڑتے ہوئے یوں ہی کہہ دیا تھا کہ خالہ'
کبھی تو اپنے گھر بھی بیٹھا کرو۔ بس کیا تھا اُس
وقت تو وہ کچھ یوں ہی سا مُنہ بنا کر اُٹھ آئی تھیں
مگر بعد میں ریحانہ کے خلاف اس طرح مہم چلائی کہ
بے چاری کی اپنی کئی پڑوسنوں سے بول چال تک بند
کرادی۔

اگر انھیں کسی سے بدلا لینا ہوتا' یا پھر
یوں ہی ادھر کی بات اُدھر کرنے کی خواہش زور مارتی'
تو کسی نہ کسی بہانے آ دھمکتیں۔ ادھر اُدھر کی بات
کرنے اور کچھ اپنی پریشانیاں بیان کرنے کے بعد
بڑے راز دارانہ انداز میں کہتیں کیوں بی جمّو! کیا
آج کل ریحانہ سے کچھ کھٹا کا چل رہا ہے؟ جواب
نفی میں ملنے پر کہتیں نہیں میں تو بس اس لیے
پوچھ رہی تھی اُسے بہت دنوں سے تمھارے ہاں
نہیں دیکھا۔ پھر وہ بات آگے بڑھاتے ہوئے کہتیں
لو! بی جمّو! میری تو مت ہی ماری گئی ہے' میں تو
تم سے ایک بات کہنا ہی بھول گئی سُنا ہے کہ نجو بُوا
کو تم سے بہت شکایت ہے۔ فطری طور پر سوال یہی
ہوتا کہ کیوں انھیں مجھ سے کیا شکایت ہوئی؟ تو خالہ
شبّو کہتیں کہ سُنا ہے تم نے پرسوں انھیں بالکل
ٹھنڈی اور دیر کی پکی ہوئی چائے پلائی تھی۔ نجّو
بُوا میں اور مجھ میں ناچاقی پیدا کر دینے کا اُن کا یہ
ایک آسان سا طریقہ تھا۔ جب کچھ دن بعد بات
کھلتی کہ یہ سب آگ خالہ شبّو کی ہی لگائی ہوئی
ہے تو وہ اپنے آپ کو اس طرح صاف نکال لے
جاتیں کہ ہمیں خود کو ہی ندامت ہوتی۔ آخر میں تو
لوگوں کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ اگر دو گھروں میں کوئی
ناچاقی یا دو پڑوسنوں میں کوئی تکرار ہوئی ہے تو
اس میں کہیں نہ کہیں خالہ شبّو کا ہی ہاتھ رہا ہوگا۔

مانا کہ خالہ شبّو اِدھر کی بات اُدھر کرنے
میں اپنا کوئی جواب نہیں رکھتی تھیں مگر وہ دل کی
بُری بھی نہیں تھیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ان کا پورا
اور صحیح نام کیا تھا؟ بڑوں سے سُنا تھا کہ ان کا
بچپن سے ہی شبّو نام تھا۔ اِسی آبادی میں پیدا
ہوئیں اور ماں باپ نے اسی آبادی میں دیکھ بھال
کر شادی کر دی تھی اور پھر وہ اِسی جگہ کی خاک کا
پیوند بھی ہوگئیں۔

ذیابیطس

ذیابیطس کی بیماری جس میں پیشاب میں شکر آتی ہے ایک بھیانک روگ ہے۔ اس سے انسان دن بہ دن کمزور ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس روگ کے بہت سبب ہو سکتے ہیں جیسے : بدہضمی، نروس سسٹم کا کمزور ہو جانا، جگر یا گردے میں خرابی آجانا وغیرہ وغیرہ۔ اس بیماری میں پین کریہ (Pancreas) کام نہیں کرتی اور جسم سے پیشاب کے راستے شکر باہر نکلنا شروع ہو جاتی ہے۔ ایلوپیتھی میں اس کا کوئی علاج نہیں سوا اس کے کہ انسولین (Insulin) کے ٹیکے لگائے جاتے ہیں لیکن اس کے اثرات مابعد (After effects) بہت خراب ہوتے ہیں۔ ان ٹیکوں سے بینائی پر برا اثر پڑتا ہے اور نظر کمزور ہوتی چلی جاتی ہے۔

ہومیوپیتھی میں اس کا پورا پورا علاج ہے بشرطیکہ دوائی علامات کے مطابق ٹھیک ٹھیک چُنی گئی ہو۔ ہومیوپیتھی ایک ایسا علم ہے جس کے مطابق مریض کی جسمانی اور دماغی علامات دیکھ اور سُن کر دوائی دی جاتی ہے۔ ایسی دوائی جو Mental & Physical Sumptoms کو پوری طرح Cover کرے۔ ڈاکٹر کو جو ایک اور بات دھیان میں رکھنی چاہیے وہ یہ ہے کہ دوائی مریض کے مزاج کو سمجھ کر دے ورنہ بیماری جڑ سے نہیں اکھاڑی جا سکتی۔

ذیابیطس کی پہچان : مریض کو بے حد پیاس لگتی ہے اور وہ بار بار ٹھنڈا پانی پینے کے لیے مانگتا ہے۔ پیشاب کو ٹیسٹ کرنے پر اس میں شوگر پائی جاتی ہے۔ جس جگہ وہ پیشاب کرتا ہے وہاں پر کچھ دیر کے بعد چیونٹیاں آجاتی ہیں۔ مریض کے وزن میں کمی آتی جاتی ہے۔ اس کا نروس سسٹم خراب ہو جاتا ہے۔

ہومیوپیتھی میں اس بیماری کی بہت سی دوائیاں ہیں لیکن یہاں چند ایک کے بارے میں ہی لکھا جا سکتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہومیوپیتھی میں دوائیاں علامات کے مطابق دی جاتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے مریض سے اور اُس کے جانکاروں سے مریض کی ذہنی اور جسمانی کیفیات پوچھی جاتی ہیں پھر ان کو دوائی کی علامات کے ساتھ ملایا جاتا ہے۔ اگر علامات بالکل مل جائیں تو اونچی طاقت کی دوا دے کر روگ کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ جو دوائیاں درج کی جا رہی ہیں ان کو بھی علامات کے بموجب ہی دینا ہوگا۔

(۱) سزی جیم جمبولینم (Syzygium Jambolinum) Q : ڈاکٹر رائے بہادر داس اس دوا کو مجرب بتاتے ہیں۔ یہ بلڈ شوگر اور پیشاب میں شوگر کی زیادتی کے لیے خاص دوا ہے۔ میرا ذاتی تجربہ بھی اس کے بارے میں بہت اچھا ہے۔ یہ دوا دن میں تین چار بار لی جا سکتی ہے۔

(۲) فاسورک ایسڈ ۳۰-IX : جب یہ بیماری اعصابی وجوہ سے پیدا ہوئی ہو۔ پیشاب کا رنگ دودھ جیسا ہو۔ بیماری بہت دکھ، چنتا اور اسی طرح کے کسی دوسرے سبب سے آئی ہو تو شروع شروع میں یہ دوا بہت کامیاب ہے۔

(۳) یورینیم نائیٹریٹ ۳۰-۳X : جب بیماری ہاضمے کی خرابیوں کی وجہ سے آئی ہو، جسم بہت دبلا ہو گیا ہو، زبان خشک رہتی ہو تو یہ دوا دینی چاہیے۔

(۴) آرسیکم بروام ۳X-۳۰-IX : جب مریض کو قبض کی شکایت بھی ہو تو اس کا استعمال مفید رہتا ہے۔

(۵) آرجنٹم نائٹریکم ۳۰-۶ : پیشاب میں شکر اور گدلاپن ہو کبھی کبھی پھٹے دودھ کی طرح آئے۔ آدھی رات کے وقت تکلیف بڑھ جاتی ہے۔ کمزوری اور لاغری بہت ہو تو یہ دوا مفید ثابت ہوتی ہے۔

(۶) بربیرس ولگیرس Q-۳X : گردے اور کمر میں درد رہتا ہو۔ بار بار پیشاب کی حاجت ہوتی ہو۔ پیشاب کرنے کے بعد معلوم ہو کہ کچھ قطرے باقی رہ گئے ہیں۔ منہ خشک رہتا ہو تو یہ دوا دینی چاہیے۔

(۷) فاسفورس ۳۰ : ذیابیطس کے ساتھ اعصابی تکلیف اور تپِ دق کی صورت میں بائی مزاج والوں کے لیے بہت مفید ہے۔

(۸) پلمبم (Plumbum) ۳۰ : ذیابیطس کے ساتھ ساتھ قبض کا ہونا، دن رات کا بخار، پاخانہ خشک آنا مینگنیوں کی طرح۔ بے حد پیاس لگنا اور

(ڈاکٹر) گوردیپ سنگھ
روپ کور چیریٹیبل ڈسپنسری
۲۰ دھرم پورلاج، گھنٹہ گھر، سبزی منڈی، دہلی ۱۱۰۰۰۷

اور منہ خشک رہنا۔ ان علامات کی موجودگی میں یہ دوا دینی چاہیے۔

(۹) آئرسینکم ۳۰ : لاغری، کمزوری، تھوڑے تھوڑے پانی کی بار بار پیاس، پانی کی مانند پتلے دست۔ ان تمام صورتوں میں مفید ہے۔

(۱۰) آرنیکا ۳۰-۶ : جب بیماری بہت سخت چوٹ لگ جانے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو۔ نرم بستر بھی بہت سخت معلوم ہوتا ہو۔

(۱۱) اوپیم ۳۰-۶ : غنودگی اور قبض، مریض پر ایک بےخودی کا عالم چھایا ہوا ہو۔ بے ہوشی ہو یا بے ہوشی سے ملتی جلتی حالت ہو تب یہ دوا دیں۔

ان کے علاوہ کچھ اور دوائیں جو اکثر صورتوں میں کام آسکتی ہیں وہ یہ ہیں: ڈیجی ٹیلس کنتھرس۔ بیلونیاس۔ نکس وامیکا۔ مرکیوری اس۔ میوریکس وغیرہ۔

بائیوسیک علاج جو کہ ہومیوپیتھی کا ایک حصہ ہے ذیابیطس کو ٹھیک کرسکتا ہے۔ عام طور پر اس علاج میں نٹرم سلف ۱۲x اور نٹرم فارس ۱۲x دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر بھٹاچاریہ کا کہنا ہے کہ ان دواؤں سے کافی کیس ٹھیک کیے جاسکتے ہیں۔ کالی فاس ۶x اس حالت میں دینا چاہیے جب کہ اعصابی کمزوری عام کمزوری، بےخوابی اور بہت زیادہ یا بہت کم بھوک اور منہ سے بدبو کی علامتیں ظاہر ہوں۔ اگر پیاس کی شدت ہو مریض دبلا ہوگیا ہو، ملول رہتا ہو اور اسے نمک کھانے کی بہت خواہش ہو تو نٹرم میور دینا مناسب ہے۔ مریض دبلا ہوکر سوکھ رہا ہو، بھوک حاوی ہوگئی ہو، پیشاب زیادہ خارج ہوتا ہو، مریض تھتھلاتا ہو، پھیپھڑے متاثر ہوگئے ہوں تو کلکریا فاس کا آزمانا لازمی ہے۔

ڈاکٹر درباری کا کہنا ہے کہ ارہڑ کی ۲۱ پتیاں لے لیں۔ اس میں آدھ سیر پانی ڈال کر اتنا ابالیں کہ صرف تین چھٹانک پانی باقی رہ جائے۔ اس میں بارہ دانے کالی مرچ پیس کر ڈالیں۔ یہ ایک خوراک ہے۔ اس طرح چالیس دن تک علاج کریں۔ شرطیہ آرام ہوگا۔ بیل پتی کے گیارہ پتے رگڑ کر ڈھائی دانے کالی مرچ کے ساتھ روزانہ اکتالیس دن تک لینے سے مرض سے نجات مل سکتی ہے۔

ڈاکٹر ہنی مین نے انسانی نسل کو تین میازم میں بانٹا ہے۔ سورک۔ سائی کوسس اور سفلیں۔ کئی بار ہومیوپیتھک تب تک پورا کام نہیں کرتی جب تک کہ مریض کو اس کے مزاج کے مطابق اینٹی سورک یا سائی کوسس یا سفلیں دوا نہ دی جائے۔ اس طریقے سے لاعلاج بیماریاں ٹھیک کی جاسکتی ہیں۔

پرہیز : اس مرض میں ہلکی غذا کھانی چاہیے تاکہ معدے اور جگر وغیرہ پر بوجھ نہ پڑے۔ ہری اور کچی سبزیاں زیادہ روٹی اور تلی ہوئی۔ اور گھی والی اشیا کم استعمال کریں۔ کھانڈ اور دوسری میٹھی چیزوں کا استعمال چھوڑ دینا ضروری ہے۔ فاقہ بھی اس مرض میں اچھا رہتا ہے۔ قدرتی علاج میں فاقے کو بہت اچھا بتایا گیا ہے۔

جہاں تک ہوسکے کسی ڈاکٹر کی صلاح لینی چاہیے۔ گھریلو علاج کے لیے چھ سے لے کر تیس تک طاقت یعنی پوٹینسی کی دواؤں کا استعمال کرنا ٹھیک ہے۔ ہاں اگر علامات بہت کچھ ملتی ہیں تو ۲۰۰ تک کی طاقت کی دوا لی جاسکتی ہے۔ ایسی دوا کو سات آٹھ دن میں ایک بار دینا کافی ہوگا۔

غزلیں

کیفی سنبھلی

ہوا چلی تو کوئی نقشِ معتبر نہ بچا
کوئی دیا، کوئی بادل، کوئی شجر نہ بچا

سند لیے ہوتے پرواز کی، فضاؤں سے
میں جب زمین پہ اُترا تو کوئی پر نہ بچا

یہ شہر تو مرے اجداد نے بسایا تھا
یہ اور بات کہ میرا ہی اس میں گھر نہ بچا

اُجڑ گیا ہے کچھ ایسا مکانِ دل اب کے
تصورات میں بھی کوئی بام و در نہ بچا

وہ کیسے معرکۂ وہم و اعتبار میں تھا
اسی کی تیغ چلی اور اسی کا سر نہ بچا

پرانتھا بینک، سنبھل (مرادآباد) ۲۴۴۳۰۲

لو دیے سے گئی، گھر سے چھپر گیا
ایک جھونکا ہوا کا یہ کیا کر گیا

میں تو پرچھائیوں کا تھا پالا ہوا
چاندنی رات دیکھی تو بس ڈر گیا

ان نگاہوں میں چھینٹے لہو کے سے ہیں
اپنے ہی عکس کا کوئی خوں کر گیا

درِ مقفّل سرِ شام اس نے کیے
بن کے مہتاب میں گھر کے اندر گیا

کل مچلتا تھا مٹّی کی چھاتی پہ جو
آج پودا وہی تشنہ لب مر گیا

بلبلے سی تو چاہت یہ عامرؔ نہیں
ایک دم جو اُٹھا ایک دم مر گیا

محمد عامر علوی عامرؔ

۱۴۔ شبلی ہوسٹل، ایم۔ ایم۔ ہال، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

شفیق رائے پوری

بندِ غم توڑ کے آزاد میں ہو بھی نہ سکوں
ضبط بھی کر نہ سکوں چاہوں تو رو بھی نہ سکوں

تجھ سے اب ترکِ تعلّق بھی نہیں ہے ممکن
چاہتا ہوں ترا ہو جاؤں تو ہو بھی نہ سکوں

میں تو صحرا ہوں مجھے کون کرے گا آباد
لیکن آباد کرے کوئی تو ہو بھی نہ سکوں

کاش یوں چھین لے مجھ سے کوئی احساسِ خودی
میں گرفتار انا پھر کبھی ہو بھی نہ سکوں

بزمِ یارانِ سخن گو میں تمنّا ہے شفیقؔ
ایسی پہچان بنا لوں جسے کھو بھی نہ سکوں

ایم۔ پی۔ الیکٹری سٹی بورڈ او۔ اینڈ ایم۔ ڈویژن جگدل پور ضلع بستر (ایم۔ پی) ۴۹۴۰۰۱

بیگم صالحہ عابد حسین

فکر تونسوی

خوشتر گرامی

صالحہ عابد حسین

جنابِ صدر، محترمہ صالحہ عابد حسین اور عزیز سامعین! جنابِ شریف الحسن نقوی کا حکم تھا کہ اس شام کو جو صالحہ عابد حسین کے نام سے منسوب ہے، میں ان کی سوانح اور شخصیت پر مضمون پڑھوں۔ میں حکم کی تعمیل میں حاضر ہوگئی ہوں مگر سوچ رہی ہوں کہ اس ہستی کے بارے میں، جو مجھ سے اتنی قریب ہے کہ جتنا کوئی بھی نہیں اس کے بارے میں کیا کہوں اور کیسے کہوں۔ مگر سوچتی ہوں کہ یہ میرا فرض بھی ہے اور حق بھی کہ صالحہ عابد حسین کی نجی زندگی کی وہ تصویر لوگوں کے سامنے پیش کروں، جو باہر کے لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہے۔

تو جناب کینوس پر اس تصویر کے خدوخال کا آغاز اس طرح ہوا کہ ۱۸ اگست ۱۹۱۳ء کو پانی پت کے محلّہ سادات میں خواجہ غلام الثقلین اور مشتاق فاطمہ کے گھر ایک کمزور دُبلی پتلی بیمار بچّی نے جنم لیا۔ باپ نے اس کا نام مصداق فاطمہ رکھا اور ابھی دو سال ہی کی تھی کہ وہ اپنے بہت سے علمی اور ادبی کام ادھورے چھوڑ کر عین جوانی میں خدا کو پیارے ہوگئے۔ اپنی وصیت میں لکھا کہ یہ بچّی اگر زندہ رہے تو ان کی جائیداد میں اور بھائی بہنوں کے ساتھ اس کا بھی حصّہ ہوگا۔

مشتاق فاطمہ حالی کی پوتی تھیں ان سے تعلیم و تربیت حاصل کی تھی وہی حالی جنھوں نے عورتوں کے لیے کہا تھا کہ اے ماؤ بہنو بیٹیو دُنیا کی زینت تم سے ہے اور سماج میں ان کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ اپنے خاندان اپنے گھر میں انھوں نے عورتوں کی تعلیم کا چرچا کیا اور ان کے حقوق کی حمایت کی اسی حالی کے گھر کی خواتین شمالی ہندوستان کے اکثر مسلمان گھرانوں کی طرح جاہل قدامت پرست اور توہم پرست نہیں تھیں۔ اور مشتاق فاطمہ اس میں امتیازی درجہ رکھتی تھیں۔ انھوں نے اپنی چھوٹی بیٹی کی تعلیم و تربیت پر اپنی خرابیٔ صحت کے باوجود ہر ممکن توجّہ دی اور اپنی محبّت و شفقت سے اس کی اس محرومی کا ازالہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ ہوش سنبھالنے سے پہلے باپ کی محبّت و تربیت سے محروم ہوگئی۔

مصداق فاطمہ بچپن سے لڑکپن میں داخل ہوئیں۔ اپنے خوب صورت ذہین بہنوں بھائیوں کے مقابلے میں ان کو خاندان میں کوئی خاص اہمیت نہیں دی گئی۔ اس کی ایک وجہ ان کی مزاج کی تیزی کھلنڈرا پن اور تھوڑی سی سرکشی بھی تھی۔ ابھی وہ چودہ برس کی تھیں کہ ان کو اپنی چاہنے والی ماں کی جدائی سہنی پڑی جو ایک طویل بیماری کے بعد انتقال کر گئیں۔ ان کے انتقال کے تھوڑے دنوں بعد ان سے بڑی بہن سیدہ خاتون اچانک اس دورِ فانی سے مُنہ موڑ گئیں۔ مصداق فاطمہ کو ان دونوں صدموں نے جذباتی طور پر توڑ کر رکھ دیا۔ مگر ان کے چچا خواجہ غلام السبطین اور بڑے بھائی خواجہ غلام السیّدین نے اپنی محبّت دلداری اور ہمّت افزائی سے انھیں سنبھال لیا۔

نامساعد حالات کی بنا پر وہ اسکول کی تعلیم جاری نہیں رکھ سکیں۔ کالج کی تعلیم کا موقعہ نہیں ملا۔ مگر انھوں نے جو بھی امتحان دیے چاہے وہ مڈل کا امتحان ہو یا میٹرک کا ادیب فاضل ہو یا ادیب ماہر اس میں امتیازی درجہ پایا —— اور عمر بھر طالب علمانہ زندگی بسر کی اب بھی جب کہ صحت بہت خراب ہو چکی ہے آنکھیں کمزور ہوگئی ہیں ان کا کافی وقت مطالعے میں گذرتا ہے۔ پڑھنے کے ساتھ پڑھانے کا بھی شوق رہا ہے۔ اور وہ ایک اچھی استاد ہیں۔

۱۹۳۳ء میں ان کی شادی ڈاکٹر سیّد عابد حسین سے ہوگئی۔ جو ان کے بھائی کے دوست تھے جامعہ ملیہ میں قومی خدمت کا کام کر رہے تھے۔ عمر میں ان سے کافی بڑے تھے شادی شدہ تھے ایک بڑے خاندان کا بار ان پر تھا کہ ان کے یہاں کنبے کا تصوّر بہت وسیع تھا۔ مصداق فاطمہ نے اچھے اچھے پیاموں کو ٹھکرا کر ڈاکٹر عابد حسین کے پیام کو منظور کیا۔ شاید اسی لیے کہ انھوں نے اپنی زندگی کا جو نقشہ بنایا تھا اس میں ڈاکٹر عابد حسین جیسے رفیقِ زندگی کا ساتھ ضروری تھا جو ان کے خدائے مجازی نہیں واقعی ساتھی اور دوست تھے۔

اگر میں یہ کہوں کہ مصداق فاطمہ جو شادی کے بعد صالحہ عابد حسین کہلانے لگیں تھی، ان کا یہ فیصلہ بہت اہم تھا۔ اس لیے ان کو اپنی شخصیت

صغرا مہدی

عابد ولا، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

ے اور سنوارنے میں اور اپنی ادبی صلاحیتوں کو
کار لانے کا موقعہ ملا۔ وہ سب حاصل کر سکیں
حاصل کرنا چاہتی تھیں اور جو حاصل نہیں
کے لیے ان کو یہ یقین رہا کہ وہ حاصل کرنے
ل ہی نہیں۔

شادی کے ایک سال بعد وہ اپنی زندگی کے
بڑے المیہ سے دوچار ہوئیں وہ یہ کہ ماں
گر قبل اس کے کہ وہ اپنی پیاری اکلوتی بیٹی
ار سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کرتیں بچی نے اس
ے مُنہ موڑ لیا ـــ اور اس کے بعد ان کی
بیماریوں کا سلسلہ چلا۔ جسے انھوں نے اپنے
ں انتھک تیمارداری، دلداری، رفاقت اور
محدود وسائل کے باوجود علاج اور اپنے بھائی
درج کے پیار اور مدد کے بل پر جھیل لیا اور
ت ارادی سے بیماریوں پر فتح پائی۔ بیماریوں کا
لہ زندگی بھر جاری رہا اور آج بھی ہے آج
ہ بالکل تنہا ہیں تھکی ہوئی ہیں مگر پھر بھی
ں کمزوری اور بڑھاپے سے نبرد آزما ہیں۔
کے طویل ہونے کا شکوہ ہے مگر اس سے
یں ہیں۔

صالحہ عابد حسین کو اپنے خاندان پر بجا طور
ناز ہے۔ مولانا حالی، خواجہ سجّاد حسین، خواجہ
سین، خواجہ غلام السیّدین اور خواجہ احمد
۔ ہندوستان میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں
ب لوگوں نے اپنے اپنے میدان میں نام کمایا
۔ ان کے علاوہ ان کے خاندان کے اور لوگوں
، اپنی ذہانت خدا ترسی، اصول پرستی، روشن
ر سماجی خدمت کی بنا پر اپنے اپنے حلقے میں
یدگی اور ہر دلعزیزی حاصل کی ہے۔ مگر
عابد حسین کی سیرت کی خوبیوں اور ان کی
ACHIEVEME کا سارا کریڈٹ ان کے
خاندان کو نہیں جاتا ہے بلکہ اس میں ان کی ذہانت
خداداد صلاحیتوں اور ذاتی محنت و کاوش کا بہت
بڑا ہاتھ ہے۔

اگر میں یہ کہوں کہ صالحہ عابد حسین اپنے وقت
کی Women's Lib کی سب سے بڑی علمبردار ہیں
تو آپ یقیناً چونکیں گے ـــ مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ
اپنے بھائی اور شوہر جن سے وہ حد درجہ متاثر ہیں ان
سے کبھی اس لیے مرعوب نہیں ہوئیں کہ وہ مرد ہیں۔
انھوں نے اپنے آزاد وجود پر ہمیشہ اصرار کیا اور
اُن کے شوہر نے بھی اس کا احترام کیا ان کی شخصیت
کو کبھی کچلنے کی کوشش نہیں کی۔ شوہر کا ذکر اس
لیے کر رہی ہوں کہ یہ کام عام طور پر وہی کرتے
ہیں۔

صالحہ عابد حسین جس خاندان میں بیاہ کر
آئیں وہ ان کے خاندان کے مقابلے میں بالکل مختلف
تھا۔ خواتین اَن پڑھ اور پسماندہ تھیں انھوں نے
نوعمر لڑکیوں اور بچیوں کو اپنے پاس بلا کر رکھا ان
کو ممکن تعلیم و تربیت دی اور اپنی اپنی صلاحیتوں
کے مطابق ان کو آگے بڑھنے کا موقعہ دیا انھیں
ان کے آزاد وجود کا احساس دلایا۔ ساتھ میں عورت
ہونے کے ناطے ان کے جو فرائض تھے ان سے آگاہ
کیا۔ اور اس ذمّے داری کا بھی احساس دلایا کہ
جو ایک عورت کی اپنے خاندان کے لیے ہوتی ہے۔
خاندان کی دوسری خواتین کی زندگی میں بھی ہر ممکن
بہتری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جامعہ کی خواتین میں
بھی انھوں نے بیداری پیدا کی۔ ان کو یہ احساس
دلایا کہ ان کی زندگی صرف گھر تک محدود نہیں ہے۔
ان میں سماجی کاموں کی لگن پیدا کی، ادبی ذوق پیدا
کیا اور اکابرین جامعہ کو خواتین کے وجود اور ان
کی اہمیت کا احساس دلایا ـــ پُرانے زمانے کی
پردہ دار خواتین کو انھوں نے جلسوں میں لاکر ان سے
تقریریں کرائیں۔ عورتوں کے ڈراموں میں پارٹ
کرایا، مضمون لکھوائے۔ اس طرح وہ بغاوت کا
جھنڈا لیے بنا آنچل کو پرچم بنائے بغیر عورتوں کے
حقوق کی لڑائی لڑتی رہیں۔ عملی طور پر بھی اور
اپنے قلم سے بھی۔ اور اپنے عورت ہونے پر ہمیشہ
فخر کیا اور خواتین کی ناول نگار کہلانے پر خوش
ہوئیں۔ ۱۹۴۷ء تک انھوں نے بُرقعہ اوڑھا ـــ
بُرقعہ اوڑھ کر سیر و سیاحت کی ریڈیو پر تقریریں
کیں۔ قومی اور ادبی جلسوں میں شرکت کی فوٹوگرافی کی۔

میں نے ابھی ذکر کیا تھا کہ ان کی ایک بچی
ہوئی تھی مگر پیدائش کے فوراً بعد وہ خدا کو پیاری
ہوگئی، اسے یہ دُنیا رہنے کے قابل نہیں معلوم ہوئی
یا پھر وہ اپنی ماں کو یہ موقعہ دینا چاہتی تھی کہ وہ
صرف اس سے ہی نہیں خاندان کے دوسرے بچّوں
سے بھی اتنا ہی پیار کریں۔ اور وہ سب ان کی
تربیت و تعلیم سے بہرہ مند ہوں۔ وہ چلی گئی مگر
ان کے دل میں اپنی جدائی کا ایک زخم چھوڑ گئی
جس کی کسک اور ٹیس کو انھوں نے دوسروں کے بچّوں
کو چاہ کر کم کیا۔ وہ اپنے شوہر کی صحیح معنی میں
رفیق تھیں۔ انھوں نے ان کو بے حد Idealize
کیا۔ ان کے ساتھ ان کے مقاصد سے بھی محبّت کی۔
چاہے جامعہ ملیہ کے ذریعے قومی خدمت کا کام ہو
یا تصنیف و تالیف و ترجمہ کا کام ہو یا رسالوں
اور اخباروں کی ادارت ہو وہ ہر مقام پر ان
کے ساتھ رہیں۔ خاندانی ذمّے داریوں سے بہت
حد تک اور گھریلو ذمّے داریوں سے پوری طرح
انھیں آزاد کر دیا۔ ان کے خاندان کو اپنا لیا اور
اپنے خاندان کو ان کا بنا دیا۔

ان کی جو بات مجھے دل سے پسند ہے وہ یہ
کہ تنگی ترشی، جفاکشی، بیماریوں، ذمّے داریوں اور
خاندانی بکھیڑوں کے ساتھ انھوں نے زندگی کو خوب

ENJOY کیا اور اسے خوش دلی سے جیا۔ سیر و سیاحت کی، باغبانی کی، فوٹو گرافی کی، چرخا کاتا، ڈرامے ڈائریکٹ کیے، ان میں ایکٹنگ کی۔ کلچرل پروگرام تیار کرائے فلمیں دیکھیں۔ لکھنا پڑھنا تو خیر ان کا اوڑھنا بچھونا ہی رہا۔ بچپن سے ان کو اس بات کا شاکی دیکھا کہ انھیں لکھنے کا وقت نہیں ملتا۔ اور ہمیشہ اُن کو لکھتے ہوئے پایا۔ اور آج بھی اپنی کمزور صحت کے باوجود لکھتی ہوئی ملتی ہیں اس فکر میں غلطاں بیچاں کہ یہ کتاب ادھوری نہ رہ جائے وہ مسودہ نامکمّل نہ رہ جائے (خدا نہ خواستہ) میرے بعد شاہد علی خاں کو پریشانی ہوگی!

ان کے اخلاقی اصول سخت ہیں مگر بے لوچ نہیں وقت اور زمانے کے تقاضوں کا انھوں نے ہمیشہ ساتھ دیا۔ اس سے سمجھوتہ کیا مگر اپنی ٹرمز پر صاف گوئی اور حق گوئی ان کی سیرت کی نمایاں خوبی ہے۔ یہاں تک کہ دروغ مصلحت آمیز کی بھی قائل نہیں ہیں اور بقول انیس قدوائی "اقبال کی وہ اس لیے تعریف نہیں کرتیں کہ ان کا کہنا ہے کہ بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق۔ مگر ان کی عقل محوِ تماشائے لبِ بام کبھی نہیں رہتی، بلکہ یہ اندازہ کرتی رہتی ہیں کہ اس زینے میں کتنی سیڑھیاں ہیں اور اس کے چڑھنے اور اُترنے میں کتنا وقت صرف ہوگا اور وہاں سے گرد و پیش کے کیا کیا نناظر دیکھنے کا موقعہ ملے گا۔"

وہ مذہبی ہونے کے باوجود روشن خیال ہیں شاید اس لیے کہ ان کے نزدیک مذہب نہ بزرگوں کی ہی وراثت ہے نہ چند ارکان کی پابندی کا نام ہے۔ مذہب کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا ہے اور یہ سلسلہ ابھی بھی جاری ہے مذہب ان کا اسلوبِ زندگی ہے۔ اور اس کی رُوح یہ ہے کہ اس کے بندوں کو چاہا جائے۔ اپنے پاس جو بھی ہو وہ ان میں بانٹ دیا جائے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ خدا کی راہ میں جتنا دو خدا اتنا ہی دیتا ہے۔ اور میں اس کی گواہ ہوں کہ واقعی خدا ان کو دیتا ہے۔ ہر بیماری کو وہ اپنی آخری بیماری سمجھ کر لوگوں کے نام اپنی وصیت اور ان کے نام کے لفافے اپنی دیورانی انیس بانو کے سپرد کر دیتی ہیں۔ مگر جب خدا کے فضل اور سب کی دعاؤں سے اچھی ہو جاتی ہیں تو وہ سب کو اپنے ہاتھ سے دے دیتی ہیں کہ خدا نے مجھے شاید اسی لیے پھر بچا لیا ہے۔

بیگم انیس قدوائی نے صالحہ عابد حسین کا بہت ہی خوب صورت خاکہ لکھا ہے اس کے اقتباس پر اپنے اس مضمون کو ختم کرتی ہوں۔

"مشرقی معاشرت اور مغربی طرزِ زندگی میں ایسا خوب صورت تال میل انھوں نے پیدا کر لیا ہے کہ کہاں بیٹھنا زیادہ مناسب ہوگا ڈرائنگ میں صوفے پر یا صحن میں پڑی ہوئی بان کی کھرّی چارپائی پر یا ان کے کتابوں رسالوں سے بھرے ہوئے کمرے میں گاؤ تکیے سے لگ کر۔ کوئی خلیرا ماموں ہے تو کوئی چچیرا بھائی کوئی بہن کی بچّی ہے کوئی میری تیری کسی کی بھی۔ لیکن چابک دست اتنی ہیں کہ کسی کو میری بچّی کہہ کر گلے لگایا تو کسی کو میرا بیٹا کہہ کر بیٹھ تھپکی کسی کو کھانے کو پوچھا تو کسی کو دوا کو۔ لاڈ پیار کرکے کمرہ سے بھگا کر دروازہ بند کر لیا۔ باہر کا شور شغب پسند نہیں مگر گھر کا غل غپاڑہ کچھ ایسا بُرا نہیں لگتا۔ اس لیے انھوں نے اپنے کمرے میں مضبوط چٹخنی لگا رکھی ہے۔ اور الماریوں میں کتابیں بھر رکھی ہیں تاکہ کوئی ان کی تنہائی میں مُخل نہ ہو۔"

(اُردو اکادمی دہلی نے ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو "بیگم صالحہ عابد حسین کے ساتھ ایک شام" کا اہتمام کیا تھا۔ یہ مضمون اسی تقریب میں مرحومہ کی موجودگی میں پڑھا گیا تھا)۔

اِک مُکمّل ادبی خطِ تاریخ

۱۹ ء ۸۸

پیشِ جناب سید شریف الحسن صاحب نقوی تسلیم — سنِ ارتحال صالحہ محترمہ بیگم صالحہ عابد حُسین

۸۸ ء ۱۹ — ۸۸ ء ۱۹

یاد رہے گا یہ سالِ ارتحال بیگم صالحہ عابد حُسین

۱۸ ھ ۱۴

تاریخی قطعۂ انتقال

۱۹ ء ۸۸

کانوں میں آواز آئی غیب سے = ہے میسّر آپ کو ہر ایک چین

۳۵ ۱۳ + ۵۳ ۶

۸۸ ء ۱۹

خلد میں آباد ہیں از حُکمِ حق = آج بیگم صالحہ عابد حُسین

۹۲ ۹ + ۱۶ ۴

۱۸ ھ ۱۴

سالِ پیدائش بیگم صالحہ عابد حُسین اٹھارہ اگست

۱۳ ء ۱۹

از بندۂ حقیر۔ ناچیز مُمتاز اثری فیروز آبادی

۸۸ ء ۱۹

— ممتاز اثری

۱۲، جمعیہ ٹولہ، فیروز آباد ۲۸۳۲۰۳

انسانیت کا پرستار
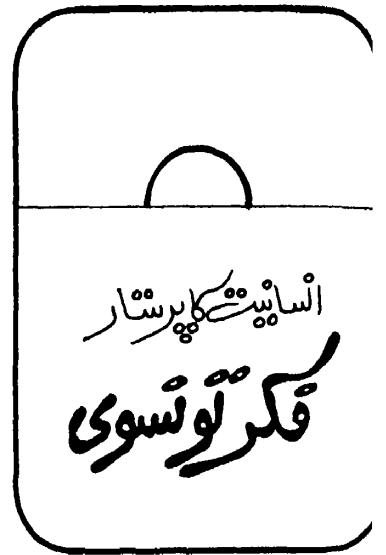
فکر تونسوی

حقیقی ادیب ہر طرح کے تحفظات،
عصبات اور حد بندیوں سے بلند ہوتا ہے۔ فکر تونسوی
سا سچّا ادیب کا نام ہے۔ اُردو کا شاید ہی کوئی
ری ایسا ہو جس نے فکر تونسوی کی کوئی نہ کوئی
بلیق کسی نہ کسی رسالے یا اخبار میں نہ پڑھی ہو۔
عوام اور خواص، دونوں میں مقبول تھے اور پڑھے جاتے
۔ اس مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ
ماجی برائیوں پر اتنے صاف اور واضح لفظوں میں طنز
رتے تھے کہ اس کی تہہ تک پہنچنا، اعلیٰ تعلیم یافتہ سے
کم پڑھے لکھے آدمی تک کے لیے مشکل نہ ہوتا۔
دو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں ان کی تحریریں بلا مبالغہ
ہائی قیمتی سرمایے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ چوں کہ
بار میں طنزیہ کالم لکھنا اُن کا پیشہ تھا اس لیے
وں نے بہت زیادہ لکھا۔ اُن کے طنزیہ و مزاحیہ
ضامین کے متعدد مجموعے شائع ہوئے اور اُن کی
ام تر تحریروں میں وہی مانوس فضا اور کردار
تے ہیں جو ہندوستانی سماج کا حصّہ ہیں اسی
ضا میں ہندوستان کا عام آدمی سانس لے رہا
ہے جو غلط کار سیاست، بدعنوانی، مکّاری اور مذہب
۔ نام پر ہونے والے استحصال کا شکار ہے۔
فکر تونسوی کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ
ان کے قول اور فعل میں تضاد نہیں تھا۔ جیسے وہ
اپنی تحریروں میں نظر آتے تھے ویسے ہی اپنی نجی
زندگی میں بھی دکھائی دیتے تھے۔ وہ اکثر ازراہِ
مذاق کہا کرتے تھے کہ "میں پہلی جنگِ عظیم کے
دوران پیدا ہوا تھا اور تیسری جنگِ عظیم میں مارا جاؤں
گا"۔ کاش کہ تیسری جنگِ عظیم کے انتظار میں وہ کچھ
عرصہ اور جی لیتے!

اس وقت بے ساختہ اُن کا ایک مضمون
یاد آرہا ہے جس کا عنوان تھا "فکر تونسوی ——
عالمِ بالا میں"۔ یہ مضمون کم از کم بیس بائیس سال
قبل نظر سے گذرا تھا۔ اس میں انھوں نے لکھا تھا
کہ عالمِ بالا پر جب اُن سے پوچھا گیا کہ تم دُنیا میں
کیا کرتے تھے تو انھوں نے جواب دیا کہ "مضامین
لکھتا تھا اور سماج کی اصلاح کرنا چاہتا تھا"۔ اُن
سے کہا گیا کہ جاؤ اور پھر اپنے سماج کی اصلاح کرو۔
انھوں نے جواب دیا کہ "وہاں کوئی کچھ نہیں سنتا۔
میں اب وہاں کسی حال میں واپس نہیں جاؤں گا"۔
اس پر انھیں دھکّے دے کر نیچے گرا دیا گیا اور اُن کی
آنکھ کھل گئی۔ کتنی سچّی بات کہی گئی تھی اس مضمون
کے توسط سے! اسی خیال کو معین احسن جذبی نے
اپنے ایک شعر میں یوں ادا کیا ہے:

کیا جانیے کب وہ پاپ کٹے، کیا جانیے وہ دن کب آئے
جس دن کے لیے ہم اے جذبی، سب کچھ یہ گوارا کرتے ہیں

مذکورہ مضمون میں بعض بڑے چبھتے ہوئے
جملے تھے جو ہندوستانی سماج پر بھرپور طنز کی
حیثیت رکھتے تھے۔ چند جملے دیکھیے۔ کچھ یوں تھے:

"ارے آپ نہیں جانتے کہ ہندوستان
کہاں ہے؟ یہ وہی جگہ ہے جہاں گائے اور مسجد
کے نام پر فساد ہوتے ہیں۔ جہاں کُمبھ کا میلہ
لگتا ہے"۔

"حد ہو گئی یہاں دُنیا والوں کو اتنا حقیر
سمجھا جاتا ہے اور دُنیا والے ہیں کہ اللہ اکبر اور
ہر ہر مہادیو، شمبھو کے نعرے لگاتے نہیں تھکتے..." وغیرہ۔

یہ جملے اب سے بیس بائیس سال قبل لکھے گئے
تھے۔ لیکن ملک کی موجودہ فضا کو ذہن میں رکھیے تو
پتا چلتا ہے کہ اب بھی ہندوستانی قوم کو اسی طرح
کے "کھلونے" دیے جاتے ہیں۔ اور قوم ہے کہ اقتصادی
مساوات کے لیے لڑنے کے بجائے مذہب، زبان
اور علاقے کے نام پر، ایک دوسرے سے دست و
گریباں رہتی ہے۔ فکر تونسوی کے یہی وہ خیالات
تھے جن کے باعث میں انھیں ایک آئیڈیل ادیب
مانتا تھا۔ جب سے اُردو رسالے پڑھنے کا چسکہ لگا تب
سے فکر تونسوی کے نام سے آشنائی رہی، عام آدمی
کے مسائل پر اکثر، بلکہ ہر روز اتنے مؤثر انداز میں
لکھنے والے طنز نگار اُردو تو کیا دوسری زبانوں
میں بھی مشکل ہی سے ملیں گے۔ ظاہر ہے ایسے
مصنّف سے ملنے کی خواہش ہر ایک کے دل میں
پیدا ہوتی ہے۔ سو میں بھی ان سے ملنے اور انھیں
دیکھنے کا ایک عرصے سے متمنّی تھا۔

یادش بخیر! کناٹ پلیس میں تھیٹر کمیونیکیشن
بلڈنگ کا کافی ہاؤس ابھی "بقیدِ حیات" تھا۔ جہاں
اب ایئر کنڈیشنڈ پالکا بازار نظر آتا ہے۔ اب سے
کوئی تیرہ چودہ سال قبل پہلے پہل وہیں انھیں دیکھا
تھا۔ ان پر فالج کا حملہ ہو چکا تھا۔ وہ چلنے میں دشواری
محسوس کرتے تھے۔ فکر صاحب پر مجتبیٰ حسین کا خاکہ
"بھیڑ کا آدمی" غالباً اسی زمانے میں شائع ہوا
تھا۔ میں نے ایسے فنکار بہت کم دیکھے ہیں جن کا

معین اعجاز
اُردو سروس، آل انڈیا ریڈیو، نئی دہلی

ظاہر اور باطن ایک ہی جیسا ہو۔ بعض اہلِ قلم تو آپ نے ایسے بھی دیکھے ہوں گے جو دُور سے تو بہت اچھے اور صاف ستھرے دکھائی دیتے ہیں لیکن قریب سے دیکھنے پر ایسی مایوسی ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ۔

دِلّی میں ان کی زندگی کا بڑا حصّہ "پیاز کے چھلکے" ادھیڑنے میں گذرا۔ پیاز کے ان چھلکوں کے توسط سے انھوں نے ہندوستان کے عام آدمی کے کرب کو نہ جانے کتنے زاویوں سے ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ وہ سماج میں پائی جانے والی تمام تر ناہمواریوں کا مذاق اڑاتے اور حد تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنا بھی خوب خوب مذاق اڑایا۔ اور یہ کام بڑے دل گُردے کا ہوتا ہے۔ اُن کے مضامین میں بین السطور بعض ایسے خُوب صورت جُملے مل جاتے کہ پڑھ کر طبیعت شگفتہ ہو جاتی لیکن اُن میں چھپی ہوئی گہری معنویت کی تہہ تک بھی قاری فوراً پہنچ جاتا تھا۔ مثلاً اُن کے اِس جملے پر غور کیجیے۔ "بس اور سوشلزم کے انتظار میں آدھی عمر گذر گئی۔"

اب اِس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی سُن لیجیے۔ ایک صاحب نے ایک انگریزی اخبار میں دِلّی پر ایک مضمون لکھا۔ اُس مضمون کا پہلا جملہ یوں تھا۔ "میں گذشتہ بیس سال سے دِلّی میں مقیم ہوں۔ اور اِس مدّت کا نصف حصّہ بس اور سوشلزم کے انتظار میں گذر گیا۔"

میں نے موصوف سے ایک ملاقات میں کہا کہ "قبلہ یہ جُملہ تو فکر صاحب کا ہے!" اس پر وہ بپھر اُٹھے اور بولے "قطعی نہیں' یہ میرا جُملہ ہے۔ فکر بھلا..." اِس بات کا ذکر میں نے فکر صاحب سے بھی کیا۔ انھوں نے کہا کہ "خود موصوف نے بھی اپنے ایک مضمون میں اسے میرا ہی جُملہ بتایا ہے۔ خیر چھوڑو دروغ گورا حافظہ نہ باشد۔"

اپنی خدمات کا بار بار ذکر کرکے زمانے کی "بے توجہی" کا گلہ کرنے والے ادیب تو ہم نے بہت سے دیکھے ہیں۔ ان میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جنھیں اپنی "خدمات" کا اتنا صلہ مل گیا جس کے وہ قطعی حقدار نہ تھے۔ لیکن فکر صاحب کو کبھی یہ کہتے ہوئے نہیں سُنا گیا کہ اُن کے ساتھ کسی طرح کی زیادتی ہوئی یا انھیں نظر انداز کیا گیا۔ یہ شرافت اور اعلیٰ ظرفی کا وہ نمونہ ہے جو آج کے دَور میں (کم از کم ادیبوں کے حلقے میں) تقریباً نایاب ہے۔ اپنی قوم اور اپنے سماج کے دکھ درد کا ذکر کرنے والے کو اس کے سماج نے کیا دیا؟ ایسے لوگوں نے بھی قومی پیمانے کے اعزاز اور انعام حاصل کر لیے جن کی فکر صاحب کے سامنے کوئی حیثیت نہ تھی۔ ظاہر ہے اس طرح کا اعزاز حاصل کرنے والے کو بُرا یا بھلا ادب تخلیق کرنے کے علاوہ اور بھی "کچھ" کرنا پڑتا ہے۔ اور تکلف برطرف اس میں "سوشل اسٹیٹس" بھی کچھ رول ادا کرتا ہے۔ فکر صاحب جوڑ توڑ کے آدمی نہ تھے۔ ان کا "سوشل اسٹیٹس" بھی "منصفانِ ادب" کے لیے قابلِ توجہ نہ تھا۔ اگر ان میں "دُنیاداری" ہوتی تو وہ زندگی بھر دِلّی میں بس کے دھکے نہ کھاتے اور نہ اُن کے بیٹے بیٹی کو کلرکی کرنا پڑتی۔

خدا بھلا کرے دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی کا کہ انھوں نے ۱۹۸۶ء میں مئی یا جون کے مہینے میں انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں فکر صاحب کے ساتھ ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا تھا۔ اس میں لوگوں نے فکر صاحب سے اُن کے فکر و فن سے متعلّق کُھل کر سوالات کیے۔ انھوں نے سب کے جواب اپنے مخصوص انداز میں دیے اور اکثر ہال قہقہوں سے گونج اٹھتا۔ یہ فکر صاحب کی ذات اور ان کے فن کی عظمت ہی تھی جو گرمی کی دوپہر میں بھی لوگوں کو شہر کے دور دراز علاقوں سے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر تک کھینچ لائی تھی۔ اُس خوشگوار دوپہر کی یادیں اب تک اُن لوگوں کے دلوں میں تازہ ہیں جو اس نشست میں شریک تھے۔

اس کے کچھ دن بعد براڈ کاسٹنگ ہاؤس کے سامنے ایک روز اچانک اُن سے ملاقات ہوگئی۔ اس میں انڈیا انٹرنیشنل سینٹر والی نشست کا بھی ذکر آیا۔ کچھ دیر بعد انھوں نے کہا "تمھاری کتاب کا ذکر سُنا تھا۔ کیا تم نے رسمِ اجرا وغیرہ کا اہتمام نہیں کیا تھا؟" میں نے کہا "جی نہیں! کتاب کے دوسرے ہی مضمون میں 'رسمِ اجرا' کا مذاق اُڑایا گیا ہے۔" اس پر انھوں نے اپنے مخصوص تبسّم کے ساتھ کہا "میاں یہ سب کچھ بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر آج کے زمانے میں بات نہیں بنتی۔" بات تو انھوں نے بالکل درست کہی تھی۔ خود فکر صاحب کو بھی کبھی اپنی شخصیت کو اجاگر کرنے کے لیے سستے طریقے اپناتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔

ویسے تو فکر صاحب نے شاعری بھی کی تھی لیکن بقول ان کے "شاعری لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی اس لیے اسے ترک کر دیا۔" اُن کی طنزیہ و مزاحیہ تحریریں پورے برّصغیر میں دلچسپی سے پڑھی جاتی تھیں لیکن فکر صاحب کی ایک کتاب ایسی بھی تھی جو سنجیدہ تحریروں پر مبنی تھی۔ اس کتاب کا نام تھا "چھٹا دریا" اور جو پنجاب کے پانچ دریاؤں کے نام معنون کی گئی تھی۔ دراصل یہ ان کی ڈائری تھی جس میں تقسیمِ وطن کے نتیجے میں پیش آنے والے واقعات اور ذاتی تجربات قلمبند کیے گئے تھے۔ لاہور میں فکر صاحب پر کیا گذری؟ کس طرح ان کے دوستوں نے ان کی مدد کی اور عام انسانوں پر کیا گذری؟ یہ تمام باتیں اِس کتاب میں بڑے موثر انداز میں لکھی گئی ہیں۔ دراصل نفرت بھرے اُس ماحول میں فکر صاحب اُس انسان کو تلاش کر رہے تھے جو ہندو تھا اور نہ مسلمان!

اسی انسان کی تلاش میں وہ زندگی بھر مصروف رہے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ "جب کوئی جنازہ دیکھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ ایک اور اُردو والا کم ہوگیا۔" اور اب۔ جب کہ وہ خود اِس دُنیا سے اُٹھ گئے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بہت سے اُردو والے "بے زبان" ہو گئے۔ جی ہاں "بے زبان"! فکر تونسوی کی تحریریں عام آدمی کی زبان بن گئی تھیں۔

اُردو کا شیدائی
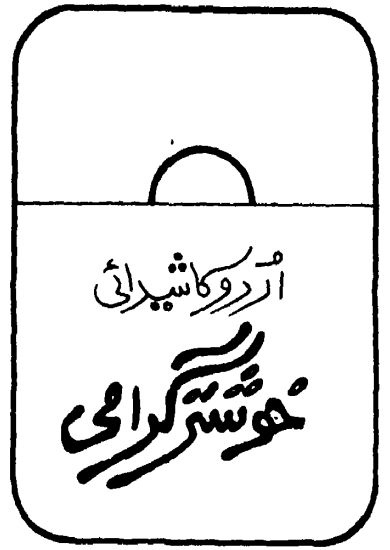
خوشتر گرامی

خوشتر گرامی ـــ آج ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن وہ اپنے پیچھے اُردو زبان و ادب کا اتنا بڑا سرمایہ، روایات اور اسلوبِ نگارش کا ایک ایسا لازوال خزانہ چھوڑ گئے ہیں کہ جس سے اُردو زبان و ادب اور اُردو کے شیدائی و فدائی آنے والے زمانے میں برسوں فیضان حاصل کرتے رہیں گے اور اُن کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔

تقسیمِ ہند کے بعد تبادلۂ آبادی ایک ایسا المیہ تھا کہ جس کے زخم ابھی تک بھی نہیں بھرے ہیں۔ تبادلۂ آبادی سے جو نقصانات ہوتے ہیں اُس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن اِس کا ایک خوش آئند اور نہایت اہم پہلو بھی ہے جس پر شاید ابھی تک کسی نے توجّہ نہیں دی وہ یہ کہ پاکستان سے آنے والے مہاجرین (شرنارتھیوں) کے قافلے میں متعدد اُردو اخبارات و جرائد اور سینکڑوں اُردو اہلِ قلم بھی شامل تھے جن سے اُردو کے خلاف اُٹھنے والے طوفان کو روکنے میں بے پناہ مدد ملی۔ وہ اُردو کی گرتی ہوئی دیوار کے لیے پشتہ بن گئے انھوں نے اُردو کو زبردست سہارا اور حیات نو عطا کی۔ انھوں نے اُردو کے ایک سیکولر زبان ہونے اور کسی دین و مذہب سے وابستہ نہ ہونے کا ناقابلِ تردید ثبوت پیش کیا۔ اُردو کی تاریخ میں یہ بات ریکارڈ کی جائے گی کہ وہ لوگ جو خود بے سہارا ہوگئے تھے وہ اُردو کا سہارا بن گئے۔ اِن لوگوں کی فہرست بہت طویل ہے یہاں اُس کا جائزہ لینے کا موقع نہیں ہے صرف اتنا ہی کہہ کر اصل موضوع پر آنا چاہتا ہوں کہ ان ہی میں سے ایک تھے ـــ جناب خوشتر گرامی۔ بھاری بدن، درمیانہ قد، کتابی چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں مہر و محبت سے بھرپور اُن پر موٹا سیاہ فریم کا چشمہ، لمبی اور اُونچی ناک جو اُردو کی بھی ناک بن گئی تھی بڑے بڑے کان جو اُردو کے خلاف ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں تھے ٹی ٹائپ مُونچھیں کلین شیو، کشادہ پیشانی پہلے کلاہ دار پگڑی اور شملہ بمقدار علم کے دلدادہ تھے مگر بعد میں قراقلی کی اُونچی باڑھ کی گول ٹوپی پہننے لگے تھے۔ قراقلی کی فراہمی کا خاص اہتمام کرتے اور اُس کی بڑی شناخت رکھتے تھے سردی میں کھلے گلے کا کوٹ بنا ٹائی کا اور گرمیوں میں بوشرٹ اور پتلون اُن کا لباس ہوتا تھا۔ ہر وقت مُسکراتے رہنا اُن کی صحت کا راز تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی کا نشان یہ شعر بنا لیا تھا جو اکثر اُن کی زبان پر آجاتا تھا:

میں فسردہ کبھی نہیں ہوتا
مجھ کو عادت ہے مُسکرانے کی

پاکستان سے آنے کے بعد وہ کئی سال تک جناب انور دہلوی کے مکان میں رہتے رہے تھے اور گلی لوہے والی (چرخے والان) سے میرا راستہ تھا اِس لیے اکثر صبح کو الجمعیتہ (روز نامہ) دلّی کے دفتر جاتے ہوئے جہاں اُس وقت میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتا تھا اُن کو دیکھتا تھا وہ صبح کی سیر سے جس کے وہ زندگی بھر عادی رہے واپس آتے ہوتے تھے اور میں دفتر جاتے ہوئے ان کو دیکھا کرتا تھا بعد ازاں ایک محفل میں تعارف کے بعد علیک سلیک کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ لاہور میں شاہ عالمی دروازہ کے باہر 'بیسویں صدی' کا دفتر تھا جس پر ایک بہت بڑا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اُن کو دیکھ کر مجھے وہ یاد آجاتا تھا۔ 'بیسویں صدی' اُن چند خوش قسمت جرائد میں سے ایک تھا جسے منصۂ شہود پر آتے ہی قبولیت عامہ کی سند حاصل ہوگئی تھی نہ صرف اُس کی صوری و معنوی حیثیت کی وجہ سے بلکہ اس لیے بھی کہ پہلا شمارہ شائع ہونے سے قبل اُس سے ضمانت طلب کرلی گئی تھی لیکن وہ بے پناہ حوصلے مند انسان تھے اور شاید برطانوی سامراج کے اِس وار نے اُن کو اور زیادہ حوصلے مند بنا دیا تھا اِس لیے وہ جب تقسیم ہند کے بعد دلّی آئے اور انھوں نے 'بیسویں صدی' کو حیات نو بخشی تو اُن کی یہی حوصلے مندی اُن کا سرمایہ اور پشت پناہ رہی یہاں بھی نومبر ۱۹۷۰ء میں 'بیسویں صدی' میں آر ایس ایس کا قلمی چہرہ چھاپنے پر دفعہ ۱۵۳ کے تحت حکومتِ یوپی نے مقدمہ قائم کر دیا تھا جو بعد میں واپس لیا گیا۔

خوشتر صاحب کی زندگی ایک کھلی کتاب اور 'بیسویں صدی' اُن کے افکار و نظریات کا آئینہ دار تھا۔ اُن کا تعلّق کبھی کسی سیاسی جماعت سے نہیں رہا لیکن وہ اپنی پیشہ ورانہ تنظیم آل انڈیا نیوز پیپرز ایڈیٹرز کانفرنس کے رُکن ضرور تھے۔ اور آخر تک رہے اُن کا سیاسی عقیدہ حُبّ الوطنی اور وطن دوستوں سے دوستی تھا مگر اپنے وطن مالوف

ناز انصاری
مُدیر اعزازی ہفت روزہ ایشیا دہلی

کو جواب پاکستان بن گیا ہے وہ آخری دم تک نہیں
بھولے تھے پاکستان سے آنے والے ادیبوں، شاعروں،
صحافیوں اور افسانہ نگاروں کے لیے اُن کا دروازہ
آدھی رات کو بھی کھلا ہوتا تھا۔ اور ہر آنے والے سے
اُن کی رسیلی آنکھیں سوال کرتی نظر آتی تھیں اور کانوں
میں رس گھولنے والے لبوں پر اختر شیرانی کے یہ
الفاظ آنے کو بیچین ہوتے تھے:

او دیس سے آنے والے بتا
کس حال میں ہیں یارانِ وطن

انھوں نے دلّی کو وطن ثانی بنا لیا تھا۔
۱۹۴۷ء میں دلّی نے ان کے لیے آغوش ایسے وا کیے
کہ چالیس برس بعد اُسے ان کو اپنی گود میں ابدی نیند
سلاکر ہی چین آیا وہ دلّی کو چھوڑ کر بمبئی چلے گئے تھے
اور اپنے خیال میں دلّی کو چھوڑ گئے تھے لیکن خاک دلی
کو وہ اتنے عزیز تھے کہ انھیں بہانہ بنا کر کھینچ بلایا جہاں
ملک الموت تاک میں تھا اُس نے ایک تیر ایسا مارا
کہ ہائے ہائے اور اب وہ مُسکراتا چہرہ کبھی نظر نہ
آئے گا۔

خوشتر صاحب ایک آدرش سیکولرسٹ تھے
وہ فرقہ پرستی کے تو بدترین دشمن تھے ورنہ دشمنوں
سے بھی دشمنی نہیں رکھتے تھے۔ بیسویں صدی کے
تیر و نشتر اس کے شاہد عادل ہیں کہ اُس میں
فرقہ پرست جماعتوں۔ فرقہ پرست رہنماؤں۔ فتنہ
پروروں اور مفسدہ پردازوں پر کاری چوٹیں ہوتی تھیں
— ایسی کہ وہ گالیاں کھا کے بھی بے مزہ نہ ہوں۔
تیر و نشتر میں اُردو کا مقدمہ جس مضبوطی، پامردی اور
تواتر کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا وہ اُن کی اُردو سے
بے پناہ اور لازوال محبت کا ثبوت ہے۔ 'بیسویں صدی'
تیر و نشتر اور خوشتر گرامی ایک ہی چیز کے تین نام
تھے۔ تیر و نشتر کے باعث اُردو میں منفرد طنزیہ ادب
کا گراں بہا اضافہ ہوا ہے۔ انھوں نے 'بیسویں صدی'
کو جنسی ادویات کے اشتہاروں، فلمی اداکاروں کے
مکھڑوں اور اُن کے احوال و کوائف سے پاک رکھا
اُن کا دعویٰ تھا کہ 'بیسویں صدی' فحش اور عریاں
ادب سے پاک ہے اور اُسے بلا جھجک ہر شخص اپنے
اپنے گھر لے جا کر اپنی بہو بیٹیوں کو پڑھنے کے لیے
دے سکتا ہے۔ 'بیسویں صدی' کے تیر و نشتر اور قلمی
چہروں کا انتخاب کچھ غیر مطبوعہ قلمی چہروں، خاکوں
اور شخصیات پر مشتمل کتاب انھوں نے اکتوبر ۱۹۷۴ء
میں شائع کی تھی جس پر پہلے حکومتِ پنجاب نے
اور پھر بہار اُردو اکادمی نے ایوارڈز عطا کیے
تھے۔ 'بیسویں صدی' کے ساتھ ساتھ انھوں نے
'بیسویں صدی' کا ایک ڈپو بھی قائم کیا تھا جس
سے متعدّد سرکردہ اُردو اہل[illegible] کی درجنوں کتابیں
شائع کی ہیں۔ انھوں نے ایک زمانے میں 'بیسویں
صدی' کے ساتھ ساتھ ہندی کا ماہنامہ 'نئی صدی'
بھی شروع کیا تھا جو زیادہ دن نہیں چل سکا۔
غالباً سال ڈیڑھ سال کے اندر بند ہو گیا تھا۔

وہ ایک باغ و بہار شخصیت کے مالک
تھے۔ اُن کی گفتگو اور آل انڈیا نیوز پیپرز ایڈیٹرز
کے اجلاس اور غیر رسمی مجلسوں میں تقریروں میں
تیر و نشتر کی جھلک ملتی تھی انھوں نے اپنے ہمعصر
سیکولر مُدیروں کا ایک گروپ بنا لیا تھا جو
فرقہ پرستانہ ذہنیت رکھنے والے مُدیران جرائد سے
برابر ٹکر لیتا رہا۔ بحیثیت ایک انسان وہ ایسی
اخلاقی صفات سے متّصف اور اُن کے علمبردار تھے
جو انسان کو شرف انسانیت عطا کرتی ہیں — وہ
مرغ و ماہی کے دلدادہ اور بڑے ہی مہمان نواز
تھے۔ ایڈیٹرز کانفرنس کے اجلاسوں کی رونق تھے
وہ اِن اجلاسوں میں عطر کی شیشی ساتھ رکھتے تھے
جس سے وہ شرکائے اجلاس کا خیر مقدم
کرتے تھے۔

اِن اجلاسوں میں شریک وزرائے گرامی
قدر سے نوک جھونک بھی بہت بے تکلّفی سے کرتے
تھے ایک بار انھوں نے وزیرِ اطلاعات و نشریات
مسٹر آئی۔ کے۔ گجرال سے کہا کہ "اُن کے ریڈیو ٹی وی
کے گانے مخرب اخلاق ہوتے ہیں"۔ گجرال صاحب
نے برجستہ جواب دیا کہ "خوشتر صاحب ۷۲
برس کی عمر میں یہ بات کہہ رہے ہو وہاں آکر
نوجوانوں کے خطوط اور فرمائشوں کو بھی تو کبھی
دیکھو"۔ خوشتر صاحب نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔
"آپ مجھے بھی گمراہ کرنا چاہتے ہیں"
ایک بار مرارجی بھائی (اُس وقت کے
نائب وزیر اعظم) اجلاس میں آئے تو ہاتھ ملاتے
ہوئے کہنے لگے۔ "آپ گُڑ کھاتے ہیں (مرارجی بھائی
نے اپنی تقریر میں کہا تھا) اور زہر اگلتے ہیں"۔ اس
پر زبردست ہنگامہ ہوا۔

ایڈیٹرز کانفرنس کے اجلاسوں میں افتتاحی
یا اختتامی اجلاسوں میں مرکزی اور ریاستی
وزرا کو بلایا جایا کرتا ہے۔ پنڈت جی بھی آئے
ہیں خوشتر صاحب پنڈت جی کا بہت احترام
کرتے تھے اور وہ اُن کے لیے ایک آئیڈیل انسان
تھے لیکن خوشتر صاحب اُن کے بھی چُٹکی لینے
سے باز نہ رہے کہنے لگے: "آپ کہتے ہیں کہ اُردو آپ
کی مادری زبان ہے مگر اُردو کو دوسری زبان نہیں
بناتے"۔ پنڈت جی نے کہا "آپ اس کے لیے
فضا کیوں نہیں بناتے"۔ خوشتر صاحب بولے
"آپ تیر و نشتر نہیں پڑھتے"۔

جس زمانے میں خوشتر صاحب پر دفعہ
۱۵۳ کا مقدمہ قائم ہوا اتفاقاً اُسی زمانے میں
دلّی میں ایڈیٹرز کانفرنس کی اسٹینڈنگ کمیٹی کا
اجلاس ہو رہا تھا۔ مسز اندرا گاندھی سے ہندوستان
بھر سے آئے ہوئے ارکان کمیٹی ملنے گئے تو خوشتر

خوشتر گرامی ہندوستان کے پہلے وزیرِاعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ

ماحب کے خلاف مقدمہ کا مسئلہ بھی دورانِ گفتگو ٹھا۔ خوشتر صاحب نے کہا "آپ فرقہ پرستوں ہ آئے دن برستی رہتی ہیں مگر آپ کے افسران اور وبائی حکومتیں اُن کے خلاف لکھنے والوں پر مقدمات ائم کرتے ہیں۔" مسز گاندھی یہ سُن کر مسکرائیں اور ہنے لگیں "فرقہ پرستوں سے لڑنا ہے تو ایسے مرحلے اکثر آئیں گے گھبرا گئے تو وہ سر چڑھ جائیں گے۔"

یہ کہنے کے بعد اپنے سیکریٹری کو نوٹ کرنے کے لیے کہا بعد میں وہاں کانگریس حکومت قائم ہو جانے پر یہ مقدمہ واپس لے لیا گیا۔

خوشتر صاحب نے 'بیسویں صدی' کی صورت میں بلاشبہ ایک ایسی شمع روشن کی کہ جس کی لو سے بہت سی شمعیں روشن ہوئیں انھوں نے اُردو زبان و ادب کو بہت کچھ دیا اب دیکھنا یہ ہے کہ اُردو والے اس احسان کو کس طرح اُتارتے ہیں۔

ہم طرح اشعار

پچھلی بار ہم نے کہا تھا کہ قارئین اشعار بھیجتے ہوئے مطروحہ مصرعے کی بحر اور ردیف قافیے کو ضرور ملحوظ رکھا کریں لیکن اس بار بھی کئی قارئین نے ایسے شعر بھیجے جن کی یا تو بحر مختلف ہے، یا ردیف یا قافیہ۔ کچھ حضرات نے ناموزوں شعر بھی لکھ بھیجے ہیں۔ ہم پھر گزارش کریں گے کہ شعر کا انتخاب مطروحہ مصرعے کو سامنے رکھ کر ہی کیجیے اور بہتر سے بہتر شعر چُنیے۔ جو مصرع دیا گیا تھا وہ میر تقی میر کا تھا۔

موصولہ اشعار میں سے منتخب شعر درج ذیل ہیں۔ پہلے، دوسرے اور تیسرے نمبر پر درج اشعار بھیجنے والوں کو "گلدستہ" کی ایک ایک کاپی ارسال کی جائے گی۔

موقوف جرم ہی پہ کرم کا ظہور تھا
بندے اگر قصور نہ کرتے قصور تھا (امیر مینائی)

مرسلہ: بدر الفریدی، بکس ۵۱، مئوناتھ بھنجن اعظم گڑھ (یوپی) ۲۷۵۱۰۱

کوئی تو درد مند دلِ ناصبور تھا
مانا کہ تم نہ تھے کوئی تم سا ضرور تھا (جگر مرادآبادی)

مرسلہ: محمد مقیم، مقام پورینیہ، پوسٹ بھنڈاری، وایا بیناٹانڈ، مغربی چمپارن، بہار

ماخوذ تھا میں سنگ اُٹھانے کے جرم میں
پھل میری دسترس سے مگر اب بھی دُور تھا (سیف سہسرامی)

مرسلہ: رفیعہ خانم، پٹھان ٹولی، سہسرام ۸۲۱۱۱۵ (بہار)

آئینہ دیکھ اپنا سا مُنہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا (غالب)

مرسلہ: ہاشم ہادی بہرائچی، (دار العلوم دیوبند)، سید

(دار العلوم دیوبند، سہارنپور)، محمد تقی لکھمینہ، بیگوسرائے ۸۵۱۲۱۱ (بہار)، نسیم فاطمہ حسن منزل (الٰہ آباد)، اے علی، برہانپور (ایم پی)، محمد کلیم الرحمٰن مومن پورہ، ناگپور۔

تھا مستعار حُسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اُس ہی کا ذرّہ ظہور تھا (میر تقی میر)

مرسلہ: کے۔ اے سرفراز، لکھمنیاں بیگوسرائے، رحمٰن عرش (محبوب نگر)، محتشم عثمانی، (دھنباد)۔

صورت تری دکھا کے کہوں گا یہ روزِ حشر
آنکھوں کا کچھ گناہ نہ دل کا قصور تھا (امیر مینائی)

مرسلہ: محمد بدر الدین، شیر پور (سمستی پور)، امتیاز انور صدیقی، مولانا حالی ہوسٹل (علیگڑھ)، رعنا پروین، شاہ گنج (پٹنہ)۔

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دُور تھا (میر تقی میر)

مرسلہ: محمد ارشاد عالم شہزاد، جبار چک (بھاگلپور)، محمد شاہد اعظم لکھمنیاں (بیگوسرائے)۔

منعم کے پاس قاقم و سنجاب تھا تو کیا
اُس رند کی بھی رات کٹی جو کہ عور تھا (میر تقی میر)

مرسلہ: بشارت عظیم (کلکتہ)، بی بی پروین نوشاد، جبار چک (بھاگلپور)

قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے
اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا (غالب)

مرسلہ: محمد یوسف بھاگلپوری، دار العلوم دیوبند (سہارنپور)، وصی اللہ حبیب نعمانی الٰہ آبادی، دار العلوم دیوبند، سہارنپور

ہم بوسہ لے کے ان سے عجب چال چل گئے
یوں بخشوالیا کہ یہ پہلا قصور تھا (داغ)

مرسلہ: محمد عباس قاسمی، ڈومریا، کمرّی ٹولہ (پورنیہ)۔

گلشن بہار پر تھا نشیمن بنا لیا
میں کیوں ہوا اسیر مرا کیا قصور تھا (ثاقب)

مرسلہ: سید علی سنجر، تیلیا باغ (بنارس)، طہورہ عتیق انفعال، (حیدرآباد)

ایسا کہاں بہار میں رنگینیوں کا جوش
شامل کسی کا خونِ تمنّا ضرور تھا (جگر مرادآبادی)

مرسلہ: صابر علی صابر، جھوٹیوالان (سہارنپور)، عرفان احمد، بگہی، وایا ہری نگر (مغربی چمپارن)۔

فصلِ بہار آئی تو میخانے بند ہیں
رندوں کا ایسا کون سا عارف قصور تھا (عثمان عارف)

مرسلہ: محمد انور، علاؤلپور، بیلاگنج (گیا)، نور الحسن مضطر مدھوبنی دار العلوم دیوبند۔

نظریں جھکیں تو رنگ سا چہرہ پہ آگیا
اتنا تو اعترافِ محبت ضرور تھا (عثمان عارف)

مرسلہ: ایم۔ اے حسن مضطر (دار العلوم دیوبند)، پرویز اختر پرویز قریشی محلّہ (آسنسول)۔

مجلس میں رات ایک ترے پرتوے بغیر
کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا (میر تقی میر)

مرسلہ: ندرت جہاں، واسع پور، دھنباد

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم
یک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہِ طور تھا (میر تقی میر)

مرسلہ: وقار احمد انعام، واسع پور، دھنباد

اے داغ صدمۂ غمِ ہجراں دُرست ہے
یہ سب سہی مگر تمہیں جینا ضرور تھا (داغ)

مرسلہ: محفوظ فاطمہ، دھنباد (بہار)

دیکھا سلف سے آج تک اندازِ عشق کا
تقصیر وار تھا وہی جو بے قصور تھا (داغ)

مرسلہ: اسجد حسین، امین ہاسٹل، علیگڑھ

اب باریابِ انجمنِ عام بھی نہیں
وہ دل کہ خاص محرمِ بزمِ حضور تھا (حالی)

تھی عاجزی وہ مجھ کو عطا ہوئی (امیر مینائی)
خدانے آپ کو جتنا غرور تھا

مرسلہ: گوہر شیخپوری، تیلیا باغ، بنارس

، پہ تم جب آئے تو آئی وہ موت بھی (فانی بدایونی)
موت کے لیے مجھے جینا ضرور تھا

مرسلہ: میر شفقت علی وفا، فیروز آباد، آگرہ۔

ان کے رو برو بھی وہی شان اضطراب (نامعلوم)
و بھی اپنی وضع پہ کتنا غرور تھا

مرسلہ: عبدالاول نعمانی، آزاد پارک، وارانسی

ہوں کا تھا قصور، نہ دل کا قصور تھا (جگر)
ہ میرے سامنے میرا غرور تھا

مرسلہ: مسعود قیصر، اشرف نگر، مونگیر

دل کو تم نے لطف سے اپنا بنا لیا (جگر مرادآبادی)
دل میں اک چھپا ہوا نشتر ضرور تھا

مرسلہ: این زیڈ جذبی، نیا بازار، دھنباد

ں تو نے چشم لطف سے دیکھا غضب کیا (داغ دہلوی)
ں اس نگاہ کے جس میں غرور تھا

مرسلہ: طفیل احمد شہزاد، واسع پور، دھنباد

نہ قدر رحمت حق پارسا نے کچھ (حالی)
ا قصور وار اگر بے قصور تھا

مرسلہ: محمد عباس فیضی، دارالعلوم دیوبند

یہ فرد جرم ہے کیا کیجیے اے کریم (ناطق گلاوٹھوی)
ے کمی ہوئی، یہ ہمارا قصور تھا

مرسلہ: محمد علیم الرحمٰن، مومن پورہ، ناگپور

رہے ہیں دوست مجھے آ رہا ہے دوست
وت کو بھی آج ہی مرنا ضرور تھا
(ناطق گلاوٹھوی)

مرسلہ: محمد نعیم الرحمٰن، مومن پورہ، ناگپور

ہرے سرور سے حاصل سرور تھا (ناطق گلاوٹھوی)
تھا نشے میں چور، نشہ مجھ میں چور تھا

مرسلہ: محمد سلیم، مومن پورہ، ناگپور

ظاہر نہ تھا، نہیں سہی، لیکن ظہور تھا
کچھ کیوں نہ تھا جہان میں کچھ تو ضرور تھا
(مولانا ناطق گلاوٹھوی)

مرسلہ: فاطمہ بیگم، مومن پورہ، ناگپور۔

رنگینی حیات کا عنوان بن گیا (عثمان عارف)
آدم کی زندگی کا جو پہلا قصور تھا

مرسلہ: محمد النظر علی، متوناتھ بھنجن، اعظم گڑھ

وحشت میں تھا جو اک بت پرنور کا خیال
صحرا تمام غیرت آغوش حور تھا
(آفتاب الدولہ قلق)

مرسلہ: طلحہ وقار غالب، نوریوں سرائے، سنبھل

خلقت نہیں ہوئی تھی مری جب تک لئے خدا (نواب رامپوری)
سینے میں کس کے میرا دل ناصبور تھا

مرسلہ: محمد فصاحت کوثر، نوریوں سرائے، سنبھل

تھی گرد آئینے پہ جو جھوٹے وقار کی
میں نے وہ صاف کر دی یہ میرا قصور تھا
(عزیز انصاری اندوری)

مرسلہ: جاوید عالم، جواہر روڈ، دھار

درس تپش ہے برق کو اب اس کے نام سے (غالب)
وہ دل ہے یہ کہ جس کا تخلص صبور تھا

مرسلہ: محمد قیصر امام، مجاہد پور، بھاگلپور

الفت نہیں وفا نہیں ہمدردیاں نہیں (عثمان عارف)
انسانیت سے اتنا تو انساں نہ دور تھا

مرسلہ: ہنس مکھ گھونوی، حبیب پور، بھاگلپور

میٹھی نگاہ، میٹھی زباں، آستیں میں سانپ (عثمان عارف)
ظالم کی دوستی میں بھی کتنا فتور تھا

مرسلہ: محمد اسماعیل کٹیہاری، انارکلی، کٹیہار

تلواریں ابروؤں نے لگائیں مژہ نے تیر
بوسے کا لینا کون سا ایسا قصور تھا
(میر علی محمد عارف)

مرسلہ: طاہر ادیب سہسرامی، بارہ دری، سہسرام

اب آپ آگئے ہیں تو آتا نہیں ہے یاد (مظہر امام)
ورنہ ہمیں کچھ آپ سے کہنا ضرور تھا

مرسلہ: ماسٹر نسیم احمد صدیقی، ہلدوانی، نینی تال

شکل بشر میں جانے وہ کس کا ظہور تھا (ذکی بلگرامی ذکی)
اک خواب تھا کہ حادثہ کوہ طور تھا

مرسلہ: محمد دانش حامدی بھوجپوری، نیا بھوجپور

چہرے پہ تمکنت تو نگاہوں میں نور تھا (ذکی بلگرامی ذکی)
سارا بدن شباب کی مستی میں چور تھا

مرسلہ: محمد کاشف رئیس بھوجپوری، نیا بھوجپور

محرومیوں سے حیف عبارت تھی زندگی
مرنا بھی تھا محال کہ جینا ضرور تھا
(روشن لال روشن بناری)

مرسلہ: کلیم اللہ، دالمنڈی، وارانسی۔

حالات کے تقاضے! نہ اس کو جھکا سکے (بدر نظیری)
وہ شخص نرم خو تھا بہت! پر غیور تھا

مرسلہ: محمد علی، لودی اسٹیٹ، نیو دہلی

سچائیوں کی لاش مرے بازوؤں میں تھی (یعقوب بدر)
زخموں سے میرا سارا بدن چور چور تھا

مرسلہ: حکیم ایم۔اے انصاری، سکندر آباد، بلند شہر

وہ دن تھے میرے خوب کہ جب بے شعور تھا
کچھ فکر تھی، نہ کبر نہ فخر و غرور تھا
شاکر گیاوی

مرسلہ: احمد نشور صدیقی، جمشید پور

حیرت میں حسن رہ گیا آئینہ دیکھ کر
میرے تو خیر جوف نظر کا قصور تھا
(محمد بخش منظر جے پوری)

مرسلہ: شاہد علی، میرا سدن، سنگانیر، جے پور

ہنس کر اٹھاتا یا اسے رو کر اٹھاتا میں
اس بار زندگی کو اٹھانا ضرور تھا
(منظر)

مرسلہ: محمد عبید اللہ، مدرسہ اصلاحیہ، سنگانیر، جے پور

مجھ کو یہ کیا خبر تھی کہ اس شر پسند کے (محفوظ الرحیم
دل میں فتور اور زباں پر حضور تھا شاداں)

مرسلہ: محفوظ الرحیم شاداں، جمشید پور

تم کو بلایا پاس یہ میرا قصور تھا (احسن امام احسن)
تم پاس آئے میرے مگر میں ہی دور تھا

مرسلہ: احسن امام احسن، نزد جین مندر، ہزاری باغ

دیکھا قریب سے تو وہ موج سراب تھی (بشر نواز)
جس آبجو کا چرچا بشر دور دور تھا

مرسلہ: محمد شکیل الرحمٰن، بھیکن پور، بھاگلپور

کشتی ڈبو دی خود ہی کہ طوفاں کو غم نہ ہو
ورنہ مرے نصیب میں ساحل ضرور تھا

(مناظر حسن شاہین)

مرسلہ محمد جاوید اقبال، موضع ڈپو، چاکنڈ گیا

سچ بولنے کے جرم میں سولی پہ چڑھ گیا
دنیا سمجھ رہی ہے کہ میں بے قصور تھا

(زاہد وارثی)

مرسلہ: شیخ حمید حمزہ، برہانپور (ایم۔پی)

یہ اور بات ہے کہ میں بے کار ہو گیا
مجھ پر مرے بزرگوں کا سایہ ضرور تھا

(اختر امام انجم)

مرسلہ: درخشاں ظفر، دائرہ سہسرام

آئندہ ماہ کے لیے اس مصرعے پر اپنی پسند کے اشعار، شاعر کے نام کے ساتھ اس طرح بھجوائیں کہ آپ کا خط ہمیں ۱۲ رمارچ تک ضرور مل جائے۔ ایک صاحب صاحبہ ایک ہی شعر بھیجنے کی زحمت کریں۔ شعر پوسٹ کارڈ پر لکھ کر بھیجا جائے۔ مصرعہ

اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی

قافیہ ردیف

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے موصولہ عنوانات

فروری ۱۹۸۸ء کے "ایوانِ اردو دہلی" کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی، قارئین کی طرف سے اس کے بہت سے عنوانات (شعری زیادہ نثری کم) وصول ہوئے ہیں۔ تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوانات ذیل میں شائع کیے جا رہے ہیں ــــ پچھلے ماہ بطور عنوان موصول ہونے والا ایک شعر تھا:

سرفروشی کی تمنّا اب ہمارے دِل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوِ قاتل میں ہے

یہ شعر تین حضرات نے بھیجا تھا اور تینوں نے اسے ایک الگ شاعر کے نام منسوب کیا تھا۔ ہم نے قارئین سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنے طور پر تحقیق کر کے بتائیں کہ دراصل یہ شعر کس کا ہے؟ اکثر حضرات نے لکھا کہ یہ رام پرشاد بسمل کا شعر ہے اور جب وہ تختۂ دار پر لٹکائے جا رہے تھے تب بھی یہ ان کی زبان پر تھا لیکن پرویز اختر صاحب (قریشی محلہ، آسنسول) نے "بلٹز" کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ شعر بسمل عظیم آبادی کا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ یہ شعر بسمل عظیم آبادی کا ہے لیکن پرویز اختر صاحب نے "بلٹز" ہی کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ بسمل عظیم آبادی ایک انقلابی شاعر تھے۔ یہ درست نہیں۔ قاضی عبدالودود صاحب کے بیان کے مطابق وہ محض ایک غزل گو شاعر تھے اور پٹنہ کے رؤسا میں تھے۔ اس غزل میں انقلابی یا باغیانہ مفہوم پیدا ہو جانا غزل کی اشاریت کی ودیعت ہے۔ رام پرشاد بسمل سے یہ شعر بلکہ پوری غزل ہی غالباً اس لیے منسوب ہو گئی کہ وہ اسے اکثر لحن سے پڑھا کرتے تھے ورنہ ان کا تو شاعر ہونا بھی محقق نہیں۔

اب فروری ۱۹۸۸ء کے عنوانات ملاحظہ فرمائیں۔

شعری عنوانات

بہتر کی رفاقت بھی نہ حاصل ہو سکی مجھ کو (انجم عثمانی)
عَلم لے کر میں اپنے ہاتھ میں تنہا نکل آیا

مرسلہ: عمادالدین کاکوی، معرفت احمد حسین اکیڈمی اسکول، جہان آباد

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
(غالب)

مرسلہ: سیدہ ماہ نور، معرفت سیف سہسرامی، پٹھان ٹولی، سہسرام

دشت تو دشت ہے دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے (علامہ اقبال)
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

مرسلہ: کہکشاں ظفر (دائرہ سہسرام)، نہال احمد (لکھمنیاں بیگوسرائے)، سید عبدالرحمٰن (مور سینٹر، پٹنہ)، ارشاد احمد انصاری (پٹی بھلوان، سیوان)۔

آنجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ امم کیا ہے

مرسلہ: شہنواز خاں (شیخ پورہ، سہسرام)، محمد نعیم الرحمٰن (مومن پورہ، ناگپور)۔

تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر
سرفروشی کی تمنّا ہے تو سر پیدا کر
(امیر مینائی)

مرسلہ: پروین نوشاد (جبار چک، بھاگلپور)

ح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
ن کو اپنی منزل آسمانوں میں (علامہ اقبال)

رسلہ: فردوس کنول، شیخ پورہ، سہسرام

ب ترے معرکہ آراؤں میں
، میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں (اقبال)

رسلہ: عابد حسین پورنوی، دارالعلوم دیوبند

ں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
مانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے (اصغر)

رسلہ: ماسٹر نسیم احمد صدیقی، ہلدوانی، نینی تال

وان باطل کے سر پر جگمگائے گی
ں کی جنبش ختم بھی ہونے نہ پائے گی (جوش)

رسلہ: گلستاں افروز، جبار چک، بھاگلپور

م تو تارے بھی توڑ سکتا ہے
ں ہے کوئی کام آدمی کے لیے (زار غازی پوری)

رسلہ: طاہر ادیب سہسرامی، سہسرام (بہار)

، نہ دیکھے تمہاری طرف
، کا سر کٹ جاتے رہو (اختر امام انجم)

سلہ: محمد شاہد رضا خان تابش، بھاگل پور

جھکانا ہے میدانِ جنگ میں
ج عظمتِ ہندوستاں مجھے (وفا اکبرآبادی)

سلہ: صابر علی صابر، سہارن پور

کے بھی نہ قدم مطمئن ہوئے
پنتگی مرے عزمِ سفر میں ہے (شکیل بدایونی)

سلہ: محمد شہزاد عالم ارشاد، جبار چک، بھاگلپور

و چھین لو دستِ جفا سے تیغ
یم و کرم کا سوال کیا؟ (عزیز بگھروی)

لہ: محمد عادل عقیل، کھجور تلہ، سہارنپور

رگی ہے والہانہ
ہٹ جائے زمانہ (شکیل بدایونی)

: محمد ارشاد عالم شہزاد، جبار چک، بھاگلپور

گدا دستِ اہلِ کرم دیکھتے ہیں
ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں (محمد رفیع سودا)

مرسلہ: شاکر حسین ایم۔اے، بیدروں ٹولہ، بدایوں

میں کہاں رُکتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے
مجھ کو جانا ہے بہت اونچا حدِ پرواز سے (اقبال)

مرسلہ: شاہد علی بنارسی، میراسدن، جے پور

نئی کچھ نہیں اپنی جانبازیاں
یہی کھیل ہم کو لڑکپن سے ہے (مومن خاں مومن)

مرسلہ: میر شفقت علی وفا، فیروزآباد، آگرہ

ہو اگر عزم جواں تو کیا قفس کی تیلیاں
بازوؤں میں قوتِ پرواز ہونا چاہیے (کامل بریلوی)

مرسلہ: رضوان انصاری، سکندرآباد

مجاہد ہوں اُجالوں کا اندھیروں کو مٹا دوں گا
مفاسد کی جڑوں کو کاٹ ڈالوں گا جلا دوں گا (مناظر حسن شاہین)

مرسلہ: مظفر نصیب صدیقی، ڈاٹو، چاکند، گیا

پرچھائیوں سے برسرِ پیکار میں ہی تھا
لڑتی رہی ہوا سے جو تلوار میں ہی تھا (صابر)

مرسلہ: خالق حسین برہانپوری، ایم پی

پہلے خود دار تو مانندِ سکندر ہو لے
پھر جہاں میں ہوسِ شوکتِ دارائی کر (علامہ اقبال)

مرسلہ: شاہ مسیح الرحمٰن عرف شمیم، لکھنیاں، بیگوسرائے

قاتل نیا، خنجر نیا، شمشیر نئی ہے
مقتل میں مرے قتل کی تدبیر نئی ہے (نذیر احمد قمر)

مرسلہ: منور پاشا تماپوری، شاہ آباد

ناکام آرزوؤں پہ یوں داد کی طلب
گویا شمار ان کا بھی قربانیوں میں ہے (سورج تنویر)

مرسلہ: گلناز فاطمہ، آبگلہ، گیا

بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی اب اس کے سوا
اٹھائے ہاتھ میں تیر و کماں میں بھی تھا (نجم عثمانی)

مرسلہ: طفیل احمد شہزاد، واسع پور، دھنباد

ہمارے سینے میں شعلے بھڑک رہے ہیں فراق
ہمارے سانس سے روشن ہے نامِ آزادی (فراق گورکھپوری)

مرسلہ: واحد اختر اکیلا، صاحب گنج، بہار

تیروں کی باڑھ آنے دے اپنے قدم نہ روک
ان کی خوشی یہی ہے تو خوں میں نہائے چل (عروج قادری)

مرسلہ: اکرام الدین، کیسرو جہند دتی، گیا

وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے! (علامہ اقبال)

مرسلہ: منصور ساجد، ریلوے کالونی، گریڈیہہ

نثری عنوانات

"ٹوٹے شدہ سمت کے مسافر" (افسانہ۔ انجم عثمانی)

مرسلہ: محمد ظفر احسن کوثر، کریم منزل، آبگلہ، گیا ۸۲۳۵۵۳

"جوشِ جہاد" (ناول۔ صادق حسین سردھنوی)

مرسلہ: اسجد حسین، امین ہاسٹل۔ علیگڑھ

"دُنیا کا سب سے انمول رتن" (افسانہ۔ پریم چند)

مرسلہ: محمد شمشاد اختر، چاکند۔ گیا

"پیمانِ محکم" (جوش ملیح آبادی کی نظم کا عنوان)

مرسلہ: بے بی پروین نوشاد، جبار چک، بھاگلپور

"اپنے مرکز کی طرف" (افسانہ۔ اوم کرشن راحت)

مرسلہ: شوشنکر پرساد، دیگھوا، ٹکاری۔ گیا

"میں زندہ رہوں گا، میں زندہ رہوں گا" (کہانی۔ رام لعل)

مرسلہ: ایم۔ انور حسین، کلٹی (مغربی بنگال)

"ستون" (افسانہ۔ شوکت حیات)

مرسلہ: شاہد علی سحر، گلزار باغ، پٹنہ

"اور تلوار ٹوٹ گئی" (نسیم حجازی)

مرسلہ: نوخیز فتح پوری، بھاگلپور

"یہ میرا ظرف دیکھ" (عطیہ پروین)

مرسلہ: چاند نسرین شاداب، بھاگل پور

"شریف مجاہد" (ناول۔ صادق حسین سردھنوی)

مرسلہ: مصباح الدین طارق، چاکند، گیا

"گلدستہ" پہلے اور دوسرے نمبر پر درج شعری عنوان اور پہلے نمبر پر درج نثری عنوان بھیجنے والوں کو ارسال کیا جائے گا۔

وہ بددُعا اسے سمجھے اگر دُعا لکھوں
اب ایسے شخص کو میں اپنا حال کیا لکھوں

مجھ تک آئے گی روشنی اس کی
شمع اِک نم کہیں جلا رکھنا

نئی کتابیں

ندی کے پار کا منظر (مجموعۂ کلام)، ۱۹۸۷ء
مصنف : حیات لکھنوی
صفحات : ۱۲۰
قیمت : ۳۰ روپے
ملنے کے پتے : موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ــــ اُردو گھر دین دیال اوپادھیائے مارگ، نئی دہلی ــــ ایم۔ ایم ظفر، ۵ / امامیہ ہال، پنچکوئیاں روڈ، نئی دہلی۔

حیات لکھنوی کے کلام کی کچھ خصوصیات فوری طور پر متوجہ کرتی ہیں ۔ ان کا لب و لہجہ انتہائی شائستہ متوازن اور کلاسیکی بانکپن لیے ہوئے ہے ۔ وہ جس تجربے کا اظہار کرتے ہیں وہ بیک وقت انفرادی ردِ عمل بھی ہے اور اجتماعی انسانی صورتِ حال کے تضادات کا نقش اضطراب بھی ۔ حیات لکھنوی کے ہاں 'سمندر' ایک کلیدی لفظ ہے ۔ ذات و کائنات کی وسعتوں کا استعارہ ۔ وہ اس سے ہم کلام ہیں لیکن سمندر سے ربط و مفاہمت کے جملہ مراحل سے بہ اندازِ تسخیر نبرد آزما نہیں ہوتے ۔ جذبہ و فکر کی نرم رو سرگوشیوں کی وساطت سے ان مراحل کو اپنی حسیات میں جذب کرنا چاہتے ہیں ۔

ایک امید دلوں میں ہے حرارت کی طرح
ایک شعلہ جو سمندر سے بجھایا نہ گیا

سمندر دُور تک پھیلا ہوا ہے
کبھی اُبھروں کبھی میں ڈوب جاؤں

یہ اِلتجا دُعا، یہ تمنّا فضول ہے
سوکھی ندی کے پار سمندر نہ جائے گا

ــــــــــــ

میں کوئی بہتا ہوا بیکراں سمندر ہوں
اِک آئینے میں ہزار آئینے اُبھرتے ہیں

ــــــــــــ

میں تشنگی کا سمندر ہوں ریگ زاروں میں
جمی ہوئی مرے ہونٹوں کی پیاس بھی جا

ــــــــــــ

پھر بتاؤں گا اس طرف کیا ہے
یہ سمندر تو پار کر جاؤں

ــــــــــــ

بے آب کشتیوں کی طرح حرف حرف ہے
فکر و خیال کا وہ سمندر کہاں گیا

حیات لکھنوی تمازت انگیز وابستگیوں کے شاعر ہیں ۔ ان سے محروم ہونے پر وہ نالہ و فریاد کی بجائے ایک فکر انگیز افسردگی کی تجسیم کاری کرتے ہیں ۔ اپنے مخصوص شائستہ لب و لہجے میں ۔

ان کے ہاں جس انسان کی تصویر اُبھرتی ہے ۔ وہ ہمارے دَور کا گوشت پوست کا وہ انسان ہے جو اپنے تہذیبی ورثے سے سرشار ہونے کے باوجود سنگینیٔ عصر سے ناگزیر طور پر خائف ہے ۔ صالح اقدار کا پرستار ہے لیکن انہدام کے عمل میں گھر گیا ہے ۔

کون بیٹھے گا آج اس کے تلے
وہ شجر اب جو سایہ دار نہیں

تنہائیوں میں بھی مجھے محسوس یہ ہوا
جیسے مرے سوا بھی کوئی میرے گھر میں تھا

جس زاویے سے چاہو مری سمت پھینک دو
مجھ سے ملے بغیر یہ پتھر نہ جائے گا

حیات لکھنوی بہرحال کربِ عصر کا سامنا کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں ۔ ان کے ہاں نورِ فکر اور جذبۂ دل کی متنوع کیفیات کا ایک جہان روشن ہے ۔ وہ تصنّع سے آزاد ہیں ۔ ترسیل کا تجربہ ان کے ہاں لاابالی اظہار کی بجائے متوازن، شائستہ، تخلیقی ذریعۂ تکمیل کا تجربہ ہے ۔

'ندی کے پار کا منظر' اعلیٰ اشاعتی معیار کے مطابق شائع ہوئی ہے ۔ اور ہر لحاظ سے خوبصورت، بامعنی اور لائقِ مطالعہ ہے ۔ حیات لکھنوی نے بلاشبہ اس ورثے کو جو انھیں اپنے والدِ محترم عزیز لکھنوی سے ملا تھا اپنی منفرد اور مخصوص شناخت کے جوہر سے تنویرِ نو عطا کی ہے ۔

تغیّرات (تنقیدی مضامین)
مصنف : خالد سعید
صفحات : ۱۰۴
قیمت : ۲۳ روپے
ناشر : پلیشں رفت پبلی کیشنز، مُسلم چوک، گلبرگہ ۴

خالد سعید کے مضامین کی تفصیل کچھ اس طرح

ہے:

۱۔ نثری نظم کے باب میں کچھ گفتگو۔

۲۔ میلی چادر کے تانے بانے۔

۳۔ آگ کا دریا۔

۴۔ خلا میں بکھرے ہوئے حروف کی پہچان۔

۵۔ زبانِ اُردو، حقائق، مسائل اور تقاضے۔

۶۔ نظموں کے تجزیے۔

خالد سعید لکھتے ہیں: "میں کوئی نقاد نہیں ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے کاندھوں سے یہ بارِ امانت اُٹھایا بھی نہیں جاتا۔ یہ دو چار مضامین دراصل ادبی تخلیقات اور ادبی مسائل کو سمجھنے کی کوشش کا نتیجہ ہیں۔ ان میں تجزیاتی رنگ زیادہ شامل ہو گیا ہے۔" مضامین کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بارِ امانت کی گرانی کے اعتراف کے باوجود خالد سعید کو بہرحال اپنی "ناتوانی" کی تجزیاتی قوت پر اعتماد ہے اور وہ اس استعداد کی مدد سے بارِ گراں کو کامیابی سے اپنے کاندھوں پر اُٹھانے کے فن سے واقف ہیں۔ ان کا یہ استدلال قابلِ غور ہے کہ راجندر سنگھ بیدی کا ناولٹ "ایک چادر میلی سی"۔ فنی اکائی کے طور پر تشدد کی یورش کے باوجود بنیادی طور پر تخلیقی تسلسل اور زندگی کی معنویت کی علامت ہے۔ ناولٹ کے کچھ حصّوں کو سامنے رکھ کر کی جانے والی جزوی تفہیم واقعتاً صحیح تفہیم نہیں ہے۔ "آگ کا دریا" وقت کی تجسیم کے تخلیقی نصب العین سے تمرکز آزما ہے۔ حمید الماس کی شعری حسیت اور دائرۂ عمل کی حدود بہرحال واقعہ کی گہرائی سے زیادہ اس کی 'ساختی نوعیت' کے ساتھ منسلک ہیں۔ اُردو زبان رفتہ رفتہ ناگزیر انداز سے مسلمانوں کی زبان بنتی جا رہی ہے اس کی بقا کا یقینی تحفظ صرف تعلیمی پھیلاؤ اور ترویج و اشاعت کے ذرائع کو زیادہ کارگر بنانے سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ خالد سعید یہ سب نتائج انتہائی شفاف اسلوب میں مناسب حوالوں کی روشنی میں مرتب کرتے ہیں۔ لیکن نثری نظم کے بارے میں ان کا یہ استدلال متنازعہ فیہ ہے کہ موزونیت ہی اس کی شناخت کا معیار فراہم کر سکتی ہے۔ اگر اس معیار کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اُردو زبان میں آزاد نظم کی مروّجہ صورتوں میں کیا خرابی ہے؟ جزوی موزونیت نام کی اگر کوئی شے ہے تو وہ نثر ہی کی کوئی صورت ہو سکتی ہے۔ نثری نظم کے شعری کردار کی ضمانت کیسے بن سکتی ہے؟ خالد سعید کا استدلال بہرحال مزید غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

خالد سعید کے ہاں اچھے نقاد کے تمام عناصر موجود ہیں۔ تجزیاتی طریقِ کار، تازہ کار شفاف اسلوب ان کی تنقید کے امتیازی اوصاف ہیں۔ ان سے یہ توقع رکھنا بجا ہوگا کہ وہ ادھورے خاکوں اور خام صورت میں محفوظ کیے ہوئے مضامین کو بہت جلد مکمل مضامین کی شکل دیں گے اور قارئینِ اُردو کے سامنے پیش کریں گے۔

—— بلراج کومل

اِک چراغ اور (مجموعۂ کلام)
شاعر: دھرم پال عاقل
صفحات: ۱۴۴
قیمت: ۳۵ روپے
ناشر: سندر کتاب گھر، پاٹن ۸، شملہ ۱۷۱۰۰۲

دھرم پال عاقل کا نام اُردو شاعری میں کلاسیکل روایتوں پر واقف کارانہ نظر کے سبب اعتبار کا حامل ہے۔ عاقل صاحب پوری زندگی اُردو کی خدمت کرتے رہے۔ کبھی بھاشا سنسکرتی وبھاگ کے ترجمان فکر و فن کے مُدیر کی حیثیت سے، کبھی مشاعروں، سیمیناروں اور دوسرے ثقافتی پروگراموں کے انعقاد کے ذریعے —— عاقل صاحب کی تخلیقات ملک کے ادبی رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔

پیشِ نظر مجموعے میں غزلوں کی اکثریت ہے حالانکہ دوسری اصناف کی بھی نمائندگی ہے۔ عاقل صاحب اُردو غزل کے مزاج شناس اور اس کے جدید و قدیم رویوں پر واقف کارانہ نظر رکھنے والے لوگوں میں ہیں ؎

کل رات ایک خواب نے چونکا دیا مجھے
ایسا لگا کہ خوں میں نہائے ہوئے ہیں لوگ

کچھ ایسا ہو نہ برسیں بستیوں پر
وہ بادل جنگ کے جو چھا رہے ہیں

وہ سہمی سہمی نظریں اور وہ حیرت زدہ چہرہ
خموشی ان کی اپنی بے زبانی یاد آتی ہے

ساری دُنیا کو بھولنے والا
ساری دُنیا کو یاد آتا ہے

عاقل صاحب کا ایک مصرعہ ہے:

صداقت کا گریباں زندگی بھر ہم نے تھاما ہے

غزل کی زبان میں گریباں تھامنا بے عزت کرنے کے لیے مستعمل رہا ہے، یہاں دامن کا محل تھا۔

اِک چراغ اور اپنی دیدہ زیب طباعت اور شاعرانہ لہجے کے سبب اس دورِ پُر آشوب میں طوفان میں روشن چراغ کہا جا سکتا ہے۔

شب رنگ نمو (مجموعۂ کلام)
شاعر: خالد سعید
صفحات: ۱۱۲ / قیمت: ۱۵ روپے
ناشر اور ملنے کا پتا: میٹل رفت پبلی کیشنز، مسلم چوک، گلبرگہ

بہ قول شاعر یہ ان کے گزشتہ بارہ سال کے کلام

نتخاب اوّل ہے۔ سادہ سرورق، لیتھو کی طباعت
قلب فنکار کے الاؤ کی دھڑک ہر لفظ میں پنہاں
ہر کے جادو کے ساتھ۔ ہیئت کا انتخاب
موع کی مناسبت سے۔ نظمیں، نظمیں معلوم ہوتی
اور غزلیں، غزلیں۔

ویسے بھی اب دلوں میں تعلق نہیں رہا
کیوں درمیاں اُٹھاتے ہو دیوار بے سبب

ہاتھوں میں آسمان پگھلتا نہیں تو کیا
ہونٹوں پہ چلچلاتی ہوئی تشنگی تو ہے

پہ کھول آؤ
رنی کو راہ دو
نہ ہر شجر کی شاخ پر بوسے ملیں گے
تمھارے نام کے
[شاخ شاخ بوسے]

مگر اس سب کے باوجود خالد سعید کے
ں مسلّمہ تلازمات سے بے نیاز الفاظ کی کثرت
آتی ہے۔ لفظ کا تصوّر سیال ضرور ہونا چاہیے
اتنا نہیں۔ پھر غزل کی اپنی روایت ہے اور
ں کا مخصوص مزاج۔ خالد سعید بہت جگہ اس
بھی بے نیاز نظر آتے ہیں۔ مثلاً:

راہ ہموار کیا، دل میں کجی بھی رکھ دی

ظ "راہ" مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال
یں ہوتا کم سے کم مستند لوگوں کے یہاں۔

نے گرفتاری میں لذّت، نے روانی میں مزہ

گرفتاری کی رعایت سے روانی کا استعمال
ں مناسب نہیں۔

ایسی چھوٹی موٹی خامیوں کے باوجود سالِ
ں کے قابلِ ذکر مجموعوں میں شب رنگ نمو شمار
جاسکتا ہے۔

شمعِ حرم (مجموعۂ نعت)
شاعر: حامد الانصاری انجم
صفحات: ۸۰
قیمت: ۴ روپے
ناشر اور ملنے کا پتا: دارالانصار، قمر منزل لوہرسن بازار، ضلع بستی۔

حامد الانصاری انجم کا یہ مجموعۂ نعت دوسری دفعہ اشاعت پذیر ہوا ہے جو اس دور میں کسی بھی شاعر کے لیے بڑا اعزاز ہے۔ اس سے پہلے یہ مجموعہ چراغِ حرم کے نام سے اشاعت پذیر ہوا تھا۔

انجم کہنہ مشق شاعر ہیں۔ تغزل کے جملہ اوصاف ان کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہیں اور اس میں نبیؐ کریم کی محبت نے وہ تاثیر پیدا کردی ہے کہ ہم ایسے لوگ اپنے عجز کے اعتراف کے سوا کیا کرسکتے ہیں ؎

بڑی روح پرور، بڑی دل نشیں ہیں
محمدؐ کی باتیں مدینے کی باتیں

بر دل مسرت، بہ لب تبسم فرشتے مژدہ سنا رہے ہیں
خوشا یہ ساعت زہے مقدر حضورؐ تشریف لا رہے ہیں

ماہ و انجم کی شعاعیں سب کریں اٹکھیلیاں
خلدِ طیبہ مرکزِ انوار کی باتیں کریں

—— اطہر فاروقی

اِطلاع نامہ بابت "ایوانِ اُردو دہلی"
بموجب
فارم۔۴

مقامِ اشاعت: دفتر اُردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
وقفۂ اشاعت: ایک ماہ
پرنٹر: ایس۔ایچ۔نقوی
قومیت: ہندوستانی
پتہ: اُردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
پبلشر: ایس۔ایچ۔نقوی
قومیت: ہندوستانی
پتہ: اُردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
ایڈیٹر: ایس۔ایچ۔نقوی
قومیت: ہندوستانی
پتہ: اُردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
مالک: (کوئی حصّہ دار یا شیئر ہولڈر نہیں) اُردو اکادمی (دہلی انتظامیہ) گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

میں ایس۔ایچ۔نقوی بہ قائمیِ ہوش و حواس اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق دُرست ہیں۔

دستخط
(ایس۔ایچ۔نقوی)
۱۸ر فروری ۸۸ء

اُردو خبرنامہ

اُردو کو مغربی بنگال میں سرکاری زبان کا درجہ دینے کے مطالبے کا اعادہ

۱۰ جنوری کو مسلم انسٹی ٹیوٹ ہال میں انجمن ترقّی اُردو مغربی بنگال کا ریاستی اُردو کنونشن مندوبین کے اجلاس، جلسۂ عام اور مشاعرے کے انعقاد کے بعد کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ کنونشن میں مغربی بنگال میں اُردو کے مسائل پر بھرپور بحث و تمحیص کے بعد قراردادیں منظور کی گئیں۔ کنونشن میں کلکتہ سمیت ریاست کے تمام اضلاع سے ایسے ۱۴۳ مندوبین نے شرکت کی جن کا اُردو کے مسائل سے براہِ راست تعلّق ہے اور اُردو بولنے والے عوام سے اُن کا قریبی رشتہ ہے۔

مندوبین کے اجلاس میں یہ بات بہت شدّت کے ساتھ سامنے آئی کہ ریاست مغربی بنگال میں ہر جگہ اُردو ذریعۂ تعلیم کے مسائل اتنے لاینحل بنا دیے گئے ہیں کہ اب کہیں بھی اُردو اسکول قائم کرنا اور اسے باقی رکھنا غیر ممکن ہوتا جارہا ہے۔ ایسے اُردو اسکولوں کو بھی منظوری نہیں دی جاتی جو پندرہ سولہ سال سے قائم ہیں۔ سب سے زیادہ اس بات پر تشویش کا اظہار کیا گیا کہ مغربی بنگال میں اُردو بولنے والی طالبات کے لیے درس گاہوں کی تعداد صفر کے برابر ہے جس کے نتیجے میں اُردو طالبات اعلا تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہتی ہیں۔

مندوبین کے اجلاس کے اختتام پر بحث و تمحیص کی روشنی میں احسن مفتاحی نے بنیادی قراردادیں پیش کیں جو بغیر کسی ترمیم و تنسیخ کے اتفاقِ رائے سے منظور کرلی گئیں۔ قراردادیں درج ذیل ہیں:

انجمن ترقّی اُردو مغربی بنگال کا یہ ریاستی اُردو کنونشن ریاست کی اُردو بولنے والی آبادی کے اس واجبی مطالبے کا پھر اعادہ کرتا ہے کہ مغربی بنگال کے جن علاقوں میں اُردو بولنے والوں کی تعداد کم از کم دس فی صدی ہے وہاں اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے اور یہ کام باضابطہ قانون ساز ادارے یعنی ریاستی اسمبلی میں ریاستی زبان کے ایکٹ میں ترمیم کرکے کیا جائے تاکہ اس اقدام کو دستوری اور قانونی حیثیت حاصل ہوجائے۔

انجمن ترقّی اُردو مغربی بنگال کا یہ ریاستی اُردو کنونشن وزیر اعلا مغربی بنگال مسٹر جیوتی باسو کو یہ یاد دہانی کرانی ضروری سمجھتا ہے کہ ٹیٹاگڑھ اُردو کنونشن کے بعد جب انجمن کے مرکزی جنرل سیکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم کی قیادت میں اُردو کے وفد نے ان سے ملاقات کرکے مذکورہ بالا مطالبہ پیش کیا تھا تو خود انھوں نے اس امر کا اعتراف کیا تھا کہ انجمن کا یہ مطالبہ واجبی ہے اور اس کو تسلیم کرلینے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ فی الوقت اُردو کو ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق کلکتہ، گارڈن ریچ اسلام پور اور آسنسول سب ڈویژن میں جہاں کم از کم دس فی صد اُردو بولنے والے موجود ہیں اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا جائے گا اور اگر ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق کچھ اور ایسے علاقے نکل آئے جہاں اُردو بولنے والے کم از کم دس فی صد ہیں تو وہاں بھی اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا جائے گا لیکن وزیر اعلیٰ نے اپنے وعدے کو عملی جامہ نہیں پہنایا اور چیف سیکریٹری نے ۱۹۸۱ء میں ایک ایگزیکٹو آرڈر جاری کر دیا کہ کلکتہ گارڈن ریچ، اسلام پور اور آسنسول سب ڈویژن میں سرکاری کام کاج اُردو میں بھی کیے جائیں اور زیادہ سے زیادہ اُردو اسکول قائم کیے جائیں۔ اگرچہ یہ آرڈر بھی ناکافی تھا اور انجمن کے مطالبے کی تکمیل سے قاصر تھا لیکن ریاستی حکومت خود اپنے ایگزیکٹو آرڈر کو بھی عملی جامہ نہ پہنا سکی، حالاں کہ اس دوران مختلف مواقع پر وزیر اعلیٰ کی توجّہ اس امر کی طرف مبذول کرائی جاتی رہی کہ ریاست کے دس فی صد اُردو بولنے والے علاقوں میں اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔

انجمن ترقّی اُردو مغربی بنگال کا یہ اُردو کنونشن اُردو کو سرکاری زبان بنائے جانے کے تعلّق سے حکومتِ مغربی بنگال کی وعدہ فراموشی پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے پھر یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ریاستی زبان کے ایکٹ میں ترمیم کرکے دس فی صد اُردو بولنے والے علاقوں میں اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دینے میں اب مزید تاخیر نہ کی جائے۔

ریاست مغربی بنگال میں اُردو ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ بہت سنگین ہے اس لیے اس سلسلے میں جناب مظہر انصاری نے درج ذیل قرارداد پیش کی جو اتفاقِ رائے سے منظور کی گئی:

انجمن ترقّی اُردو مغربی بنگال کا یہ کنونشن اس بات پر سخت تشویش کا اظہار کرتا ہے کہ ریاست مغربی بنگال میں اُردو ذریعۂ تعلیم کے مسائل دن بدن سنگین ہوتے جارہے ہیں اور اُردو تعلیم گاہوں کی

منظوری کا معاملہ ایک طویل عرصے سے معرضِ التوا
میں پڑا ہوا ہے یہاں تک کہ جن اُردو پرائمری اسکولوں
کی منظوری کے لیے اُردو اکادمی نے سفارش کی
تھی اور متعلقہ انسپکٹروں نے ان کے حق میں رپورٹ
پیش کی تھی ان کا مسئلہ بھی سرد خانے میں ڈال دیا
گیا ہے۔

مغربی بنگال کے اُردو بولنے والے علاقوں
میں آبادی کے تناسب کے لحاظ سے اُردو تعلیم کی
درس گاہوں کی بہت کمی ہے اور بعض علاقے تو ایسے
ہیں کہ وہاں اُردو بولنے والے خاصی تعداد میں رہتے
ہیں لیکن وہاں اُردو ذریعۂ تعلیم کا کوئی انتظام نہیں
ہے۔ اُردو بولنے والی طالبات کا مسئلہ اور بھی سنگین
ہوگیا ہے۔ گرلز ہائی اسکولوں کی تعداد کلکتہ میں اور اضلاع
میں برائے نام ہے یہاں تک کہ بعض اضلاع میں
تو اُردو بولنے والی طالبات کے لیے ایک بھی
گرلز ہائی اسکول نہیں ہے۔ کالجوں میں اُردو
بولنے والوں کی معتدبہ تعداد ہونے کے باوجود
اُردو کے شعبے قائم نہیں کیے جاتے اور نہ اُردو
اساتذہ کی تقرری کی جاتی ہے۔ اس لیے اُردو
کنونشن حکومتِ مغربی بنگال سے پُرزور مطالبہ
کرتا ہے کہ وہ تعلیمی بجٹ کا دس فی صد حصّہ اُردو
ذریعۂ تعلیم کے لیے الگ کر دے تاکہ فنڈ کی کمی
اُردو ذریعۂ تعلیم کی درس گاہوں کی منظوری اور
ان کے قیام کو متاثر نہ کرے۔

ریاستی اُردو کنونشن مرکزی حکومت سے
مطالبہ کرتا ہے کہ کلکتہ ریڈیو اسٹیشن سے اور ٹی وی
سے روزانہ ایک گھنٹے اُردو پروگرام اور اُردو خبریں
نشر اور ٹیلی کاسٹ کرنے کا فوری انتظام کرے۔

ریاستی اُردو کنونشن ریاستی حکومت سے
مطالبہ کرتا ہے کہ اُردو پرائمری اساتذہ کے لیے ٹیچرس
ٹریننگ سینٹر قائم کرے اور جو اساتذہ کی ملازمت
دس برس ہو چکی ہے ان کو ٹرینڈ تسلیم کرے۔

مندوبین کے اجلاس کے بعد جناب مظہر
انصاری کی صدارت میں جلسۂ عام منعقد ہوا جس
میں صدر جلسہ کے علاوہ ڈاکٹر جاوید نہال، پروفیسر
کملیشور مشرا، جناب رئیس الدین فریدی اور پروفیسر
سلیمان خورشید نے مغربی بنگال میں اُردو کے مسائل
پر روشنی ڈالی اور ان کے حل کے لیے مرکزی اور ریاستی
حکومتوں سے مطالبہ کیا۔ جلسۂ عام کے بعد مشاعرہ ہوا
جس میں مغربی بنگال کے ممتاز شعرا نے شرکت کی۔

(اخبارِ مشرق، کلکتہ)

اُردو ادب اور زبان کی صورتِ حال

حیدرآباد لٹریری فورم کی جانب سے ۱۰ جنوری
کو ایک سمپوزیم "اُردو ادب اور زبان کی صورتِ حال"
کے عنوان سے منعقد کیا گیا۔ اس سمپوزیم کی صدارت
پروفیسر گیان چند نے کی۔ انھوں نے اپنی صدارتی
تقریر میں کہا کہ یہ عنوان دراصل دو عنوانات پر مشتمل
ہے "اُردو ادب اور اُردو زبان" انھوں نے زبان کی
صورتِ حال کو مایوس کن قرار دیا اور کہا کہ شمالی ہند
میں آزادی سے پہلے جو زبان کی صورتِ حال تھی وہ
اب کافی بدل چکی ہے۔ یو پی میں اُردو رسم الخط پر
ہندی حاوی ہو چکی ہے۔ مالک رام صاحب کے
حوالے سے انھوں نے کہا کہ اُردو ہندوستان میں
آئندہ ۲۵ برسوں میں ختم ہو جائے گی۔ ادب کے
تعلق سے انھوں نے کہا کہ اُردو میں تخلیق زیادہ ہے
مگر معیار بھی گر گیا ہے۔ جدّت زندگی سے قریب
ضرور لائی ہے لیکن جدید ادب پڑھے لکھے لوگوں
کے لیے رہ گیا ہے، اُردو تعلیمی معیار پست ہو چکا
ہے اُردو سے جذباتی لگاؤ اور تہذیبی رشتہ برقرار
رہے اور اُسے دوسری اختیاری زبان کی حیثیت
سے منوایا جائے تو اُردو زبان باقی رہ سکتی ہے
علی ظہیر نے اپنا کلیدی مضمون پیش کیا اور کہا کہ
اُردو کو اُردو والوں نے ہی نقصان پہنچایا ہے کیونکہ
تقسیم سے پہلے انگریزی کے زیرِ اثر اُردو کو کمتر سمجھ
اور پھر لسانی صوبوں کی تشکیل نے روزگار کے لیے
اُردو سے اور بھی دوری پیدا کر دی جس کی وجہ سے آ
کی نسل اُردو میں اظہارِ خیال تو کر سکتی ہے لیکن لکھ
پڑھنے سے معذور ہے۔ انھوں نے سرپرستوں کو مشو
دیا کہ وہ اپنے بچّوں کے اسکول میں اُردو کلاسوں کا مط
کریں۔ علی ظہیر نے دوسری سرکاری زبان کی اصطلا
کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ دوسری سرکاری زبان کا
مخصوص مدّت تک استعمال ہوگا۔ انھوں نے دست
میں اُردو کے تعلق سے ایک نئے بل کی منظوری پر ز
دیا۔ یوسف اعظمی نے اتّر پردیش کی مثال دیتے ہوئے
کہا کہ اُردو کو جب وہاں دوسری سرکاری زبان بنا
کا موقع ملا تو خود برسرِ اقتدار لوگ ہی اس کی مخالفت
کر گئے۔ اس لیے اُردو والوں کو اپنی سیاسی بصی
سے کام لیتے ہوئے اپنی زبان کو بچانا ہوگا۔ بیگ
احساس نے اُردو ادب کی صورتِ حال پر تفصیل سے
روشنی ڈالی اور کہا کہ ادبی رسائل اُردو میں نہ ہو
کے برابر ہیں۔ اور اُردو کی خبر رساں ایجنسی بھی نہیں
ہے۔

حسن فرخ نے کہا کہ ادب کی صورتِ حا
زبان کے مقابلے میں بہتر ہے۔ لیکن اُردو میں تار
اُردو زبان ابھی تک نہیں لکھی گئی۔ صحافتی اصلا
اُردو میں مفقود ہیں جس کی وجہ سے زبان سکڑتی جا
ہے۔ یوسف کمال نے کہا کہ اُردو زبان جو بازار سے
شروع ہوئی تھی پھر بازار میں آگئی ہے گجرال کمی
رپورٹ برف دان کی نذر ہو چکی ہے۔ انھوں ن
بنگالی زبان کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ ہم کو اسم
[illegible]

پوری ہندوستانی زبانیں متاثر ہیں جب کہ اس کا سرکاری موقف لسانی ریاستوں کے قیام تک کچھ نہ تھا۔" حلف" کے صدر مغنی تبسّم نے کہا کہ یہ والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنی نسل کو اپنی زبان سکھائیں تاکہ وہ اپنے تہذیبی ورثے سے واقف ہو سکیں۔ انھوں نے اُردو رسم الخط کے ساتھ ساتھ ہندی رسم الخط کو بھی اپنانے کی تجویز پیش کی۔

(مظہر مہدی آرگنائزنگ سکریٹری)

بچّوں کے لیے سائنس کی عام کتابوں کے مسوّدوں پر ورکشاپ

آج کے دور میں سائنس وقت کی اہم ضرورت ہے۔ سائنس کو بچّوں میں مقبول کرنا اور اُن میں سائنسی ذہن پیدا کرنا ایک قومی فرض بھی ہے۔ "بچّوں کا ادبی ٹرسٹ" نے نیشنل کاؤنسل آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کمیونیکیشن، ڈپارٹمنٹ آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، حکومتِ ہند کے مالی تعاون سے بچّوں کے لیے سائنس کی عام (غیر درسی) کتابوں کے مسوّدوں پر ایک تین روزہ ورکشاپ ۲۲، ۲۳، ۲۴ جنوری ۱۹۸۸ء غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدّین، نئی دہلی میں منعقد کی۔ مشہور سائنس داں اور حکومتِ ہند میں شعبۂ سمندریات کے سکریٹری ڈاکٹر سیّد ظہور قاسم نے ورکشاپ کا افتتاح کیا۔ افتتاحیہ خطبے میں انھوں نے کہا کہ سند باد جہازی اور رابنسن کروسو کی انتہائی دل چسپ کہانیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کو ہمیشہ سمندر سے دل چسپی رہی ہے، اور آج بھی سمندر نہ صرف بچّوں، بلکہ بڑوں کے لیے بھی دل چسپی کا باعث ہے۔ انھوں نے بچّوں کے ادیبوں کو سمندریات سے متعلّق کہانیاں اور معلوماتی کتابیں لکھنے کی دعوت دی۔ ڈاکٹر قاسم نے بچّوں کے ادب کے سلسلے میں ٹرسٹ کی کوششوں کو مفید اور قابلِ قدر اقدام کہا اور عام سائنس کی معلومات بہم پہنچانے کے لیے اس ورکشاپ کو بہت سراہا۔ انھوں نے کہا کہ سرکاری اداروں کو ایسی رضا کار تنظیموں کی ہر طرح مدد کرنی چاہیے۔ ٹرسٹ کے سرپرست کرنل بشیر حسین زیدی نے صدارت کی۔ تین روزہ ورکشاپ کی پانچ نشستوں میں بارہ ۱۲ مسوّدوں پر تنقیدی بحثیں ہوئیں۔ یہ مسوّدے ۳ سے ۱۴ سال تک کے بچّوں کے لیے سائنس کے مختلف موضوعات پر تیار کیے گئے تھے۔ ان میں بیج بونے، پودے اگانے، جنگل کی زندگی، غذا، بارش، پانی، کاربن اور نیوکلیائی تباہی کے خطرات جیسے مختلف موضوعات شامل تھے۔ ورکشاپ میں زیرِ بحث آنے والے مسوّدوں کی اُردو اور ہندی نقلیں لگ بھگ دو ہفتے پہلے تمام شرکا میں تقسیم کر دی گئی تھیں۔

ورکشاپ میں اسکولوں اور یونیورسٹی کے سائنس کے اُستادوں کے ساتھ اُردو، مراٹھی، گجراتی، بنگالی اور ہندی ادب کے ماہرین اور ادیبوں کے علاوہ مختلف اسکولوں کے بچّوں نے بھی شرکت کی۔ چھ مصنّف ایسے تھے جو پہلی بار اس میدان میں داخل ہوتے تھے۔ دو نوجوان مصنّفوں نے بھی اپنے مسوّدے شامل کیے تھے۔ ہر مسوّدے پر عام تنقیدی بحث کے علاوہ ایک ماہر کو خصوصی تنقید و ہدایت کے لیے بھی مقرّر کیا گیا تھا۔ ایسوسی ایشن آف رائٹرس اینڈ السٹریٹرس فار چلڈرن کے ماہرین نے بھی تنقیدی بحثوں میں حصّہ لیا۔ ورکشاپ میں شریک بچّوں نے بھی پورے جوش و خروش سے حصّہ لیا اور اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ بزرگوں کے ساتھ ساتھ اُن کے تبصروں اور مشوروں کو سنجیدگی سے سُنا گیا۔

ٹرسٹ کے سکریٹری غلام حیدر نے بتایا کہ ۱۹۸۴ء میں ٹرسٹ کے قیام کے بعد سے دو سیمینار اور ورکشاپ، اس ورکشاپ سے پہلے بھی منعقد ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں مہاراشٹرا اسٹیٹ اُردو اکادمی نے بھی بچّوں کے اُردو ادب پر ایک دو روزہ سیمینار اور ورکشاپ منعقد کیا تھا۔ ضرورت یہ ہے کہ تمام اُردو اکادمیاں اور اُردو کے لیے کام کرنے والے تمام سرکاری و غیر سرکاری ادارے اس بنیادی مسئلے کے لیے پوری سنجیدگی سے ایک مہم شروع کریں۔

ان بارہ مسوّدوں میں سے ورکشاپ میں ہوئی تنقیدی بحثوں کی روشنی میں ضروری تصحیح کے بعد کچھ بہترین مسوّدوں کو اشاعت کے لیے تیار کر لیا جائے گا، اور کوشش کی جائے گی کہ انھیں دیدہ زیب تصاویر اور ظاہری اور باطنی خوب صورتی کے ساتھ جلدی سے جلدی اشاعت کی منزل تک پہنچایا جائے۔

(غلام حیدر، سیکریٹری)

غیر اُردو داں اساتذہ کے لیے مراسلاتی کورس

سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز، میسور۔ وزارتِ ترقّی انسانی وسائل، حکومتِ ہند کی جانب سے مئی ۱۹۸۸ء سے غیر اُردو داں اساتذہ کے لیے دو سالہ "مراسلاتی کورس" شروع کیا جا رہا ہے۔ اُردو تدریس کا یہ کورس دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ اس کورس کے دوران ڈھائی مہینے کے دو یا تین ذاتی رابطے کے پروگرام رکھے جائیں گے تاکہ مبتدی کی دشواریوں کو ذاتی رابطے کے ذریعے دُور کیا جا سکے۔ ذاتی رابطے کے اس پروگرام میں ٹی۔ اے/ ڈی۔ اے کا سارا خرچ حکومتِ ہند برداشت کرے گی۔ اس دو سال کے مراسلاتی پروگرام کے لیے پروگرام کے دوران خط و کتابت کے اخراجات کے لیے زیرِ تربیت اساتذہ کو ۷۰ روپے

ماہوار بھی دیا جائے گا جو اپنے اسکولوں میں اُردو تدریس کا سلسلہ شروع کریں گے۔

اس مراسلاتی کورس میں داخلے کا فارم کارڈینیٹر، کانٹیکٹ کم کورس پونڈس کورس اُردو سینٹر، سولن (ہماچل) سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ فارم بھر کر ۱۵ روپے کے پوسٹل آرڈر کے ساتھ اُوپر دیے گئے پتے پر روانہ کریں۔

اُردو دوستوں سے گزارش ہے کہ اس کورس پونڈس کورس کی معلومات غیر اُردو داں اساتذہ تک بہم پہنچائیں۔ خصوصاً جنوبی اور مشرقی ہند کے اساتذہ اس سے فیض یاب ہو سکتے ہیں۔

"کتابیاتِ اقبال" کی تیاری میں تعاون کی اپیل

راقم اپنی کتاب "کتابیاتِ اقبال" (طبع اوّل ۱۹۷۷ء) کا نیا ایڈیشن تیار کر رہا ہے جو ۱۹۸۸ء میں دو جلدوں میں ہوگا۔ کتابیات ہیں:

(الف) تصانیفِ اقبال (نظم و نثر) کا جزوی و کلّی اور متفرق و مختلف ایڈیشنوں

(ب) اقبال پر مختلف زبانوں میں شائع ہونے والی ہر نوع کی کتابوں اور کتابچوں

(ج) کلامِ اقبال کی شرحوں

(د) کتابی صورت میں مطبوعہ مختلف زبانوں میں اقبال کے تراجم

(س) اخبارات اور مجلّات و رسائل کے اقبال نمبروں

(ص) یونیورسٹیوں کے امتحانی مقالوں (برائے ایم۔ اے، ایم فل، پی ایچ۔ ڈی۔ وغیرہ) کے حوالے شامل کیے جا رہے ہیں۔ ہر حوالہ ان کوائف پر مشتمل ہوگا:

۱۔ نام کتاب/مقالہ/رسالہ (نام یا عنوان اصل زبان میں درج ہوگا)

۲۔ نام مصنّف/مرتّب/مترجم/مُدیر

۳۔ تاریخ/سنہ اشاعت

۴۔ ناشر/مطبع اور مقامِ اشاعت

۵۔ ضخامت (صفحات)

۶۔ کتاب/مقالے/رسالے کی تقطیع (سینٹی میٹروں میں)

۷۔ ابواب/مباحث/مضامین کے عنوانات (محتویات کی فہرست)

۸۔ دیباچہ/مقدمہ نگار کا نام

قارئین سے اس علمی کام میں تعاون کی درخواست ہے۔ براہِ کرم اس پتے پر معلومات ارسال فرمائیے۔ ممنون رہوں گا۔

(ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، پنجاب یونیورسٹی، اورنٹیل کالج، لاہور (پاکستان))

پنڈت نہرو پر اُردو کتاب

یکم فروری کو مہاراشٹر کی وزیرِ مملکت برائے تعلیم، روزگار اور عدلیہ مس چندریکا کینا نے مہاراشٹر اُردو اکادمی کی طبع کی ہوئی ڈاکٹر ظ۔ انصاری کی تالیف "جواہر لال نہرو — کچھ کہی کچھ ان کہی" کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب ملک کی دیگر زبانوں میں بھی شائع ہونی چاہیے تاکہ دوسرے بھی اس سے لطف اندوز ہو سکیں، جواہر لال نہرو، سروِ دھرم سمبھاؤ کے زبردست ماننے والے تھے اور انھوں نے نئے ہندوستان کی تعمیر میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔

مہمانِ خصوصی ڈاکٹر رفیق ذکریا نے کہا کہ ظ۔ انصاری نے مختلف ذرائع سے معلومات حاصل کر کے پنڈت نہرو کی زندگی کے رنگا رنگ پہلوؤں کو پیش کیا ہے، کتاب کے واقعات سے ہمیں پنڈت جی کی انسان دوستی اور فراخدلی کا اندازہ ہوتا ہے، اس کتاب نے اُردو کی ایک بہت بڑی کمی کو پورا کیا ہے۔

وزیر مملکت برائے ہاؤسنگ جناب سیّد احمد نے فرمایا کہ ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے اس صدی کی سب سے بڑی اور اہم شخصیت پنڈت جواہر لال نہرو کی شخصیت کے بعض اہم زاویوں سے ہمیں روشناس کرایا ہے، چھوٹے چھوٹے واقعات کے ذریعے عوام خصوصاً اقلیتوں کے بارے میں پنڈت جی کے رویّے اور رجحان پر روشنی ڈالی گئی ہے جو بڑا قابلِ قدر کام ہے، آج کے حالات میں ضروری ہو گیا ہے کہ پنڈت جی کے خیالات کو سامنے رکھا جائے اور ان کی بھائی چارگی اور انسان دوست قدروں کو یاد کیا جائے۔

(پریس ریلیز، مہاراشٹر اُردو اکادمی)

کل ہند مشاعرہ اور کوی سمیلن ہریانہ اُردو اکادمی اور ساہتیہ اکادمی کے اشتراک سے

ہریانہ جو علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے، اُردو اکادمی کے قیام کے بعد یہاں اُردو کی ترقی اور بقا کے لیے مزید فضا سازگار ہوئی ہے اسی ماحول کو قائم رکھنے کے لیے حکومتِ ہریانہ۔ قومی یک جہتی کے فروغ اور لسانی ہم آہنگی کی ضرورت کے پیشِ نظر پوری ریاست میں ہریانہ اُردو اکادمی اور ہریانہ ساہتیہ اکادمی کے اشتراک سے قومی یک جہتی کے موضوع پر مشاعرے اور کوی سمیلن منعقد کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ اس پر عمل درآمد کرتے ہوئے دونوں اکادمیوں کی مشترکہ کوششوں سے گذشتہ ۳۰ جنوری ۱۹۸۸ء کو فریدآباد میں کل ہند مشاعرے اور کوی سمیلن

اہتمام کیا گیا جس کی صدارت محترمہ سشما سوراج صاحبہ وزیر خوراک و رسد حکومت ہریانہ نے کی۔ اس موقع پر انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ملک میں قومی یک جہتی کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے شاعروں اور کویوں سے اپیل کی کہ وہ اپنی تخلیقات سے علاقائی اور لسانی تفرقے کو ختم کریں اور عوام میں خوشگوار ذہنی ماحول پیدا کریں۔ انھوں نے شمع روشن کرکے مشاعرے کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر ہریانہ کی اعلا تعلیم کے ڈائرکٹر جناب آر این پرانشر اور ہریانہ اُردو اکادمی کے سکریٹری جناب کشمیری لال ذاکر نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور ان مشاعروں کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ مشاعرے میں ممتاز شعرا اور کویوں نے شرکت کی۔

(پریس ریلیز، ہریانہ اُردو اکادمی، پنچکلا)

مجنوں گورکھپوری حیات ہیں

کسی غلط فہمی کی وجہ سے ہندوستان کے اُردو اخبارات میں اور خود "ایوانِ اُردو دہلی" میں خبر شائع ہوئی تھی کہ اُردو کے ممتاز ادیب اور نقّاد مجنوں گورکھپوری ہم سے جدا ہو گئے۔

انتہائی مسرّت کے ساتھ یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ مجنوں صاحب کی وفات کی خبر غلط تھی وہ بہ فضلِ خدا حیات ہیں۔ خدا انھیں تادیر سلامت اور تندرست رکھے۔

۱۹۸۶ء کے غالب ایوارڈ

۱۹۸۶ء کے غالب ایوارڈ جن حضرات کو دیے گئے، ان کے نام درج ذیل ہیں۔ یہ ایوارڈ ۱۲ر فروری ۱۹۸۸ء کو ایوانِ غالب نئی دہلی کے آڈیٹوریم میں صدر جمہوریۂ ہند نے انعام پانے والوں کو پیش کیے۔ مرحومین کے ایوارڈ ان کے متعلقین نے حاصل کیے۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری، برائے تنقید۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد، برائے شاعری۔ پروفیسر نورالحسن انصاری، برائے تحقیق۔ (پس مرگ) جناب آنند نرائن ملّا، برائے مجموعی خدمات۔ جناب ابراہیم یوسف برائے ڈراما۔ جناب احمد جمال پاشا، برائے طنز و مزاح۔ (پس مرگ) جناب غلام رسول عارف، برائے صحافت اور محترمہ امینہ بیگم، برائے خطّاطی۔

تعزیتی جلسہ

۳ر فروری کو اُردو اکادمی، دہلی کے دفتر میں ایک تعزیتی جلسہ ڈاکٹر بشیر بدر کی صدارت میں ہوا جس میں جناب خان غازی کابلی اور جناب شاداں بارہ بنکوی کے انتقال پر اظہارِ غم کیا گیا اور دو منٹ کی خاموشی کے ساتھ درج ذیل تعزیتی قرارداد منظور کی گئی۔ اکادمی کے سیکریٹری سیّد شریف الحسن صاحب نقوی نے مرحومین کے سوگ میں باقی وقت کے لیے اکادمی کے دفاتر بند کردینے کا اعلان کیا۔

قراردادِ تعزیت

اُردو اکادمی، دہلی کے عہدیداروں اور کارکنوں کا یہ جلسہ جناب خان غازی کابلی اور جناب شاداں بارہ بنکوی کے انتقال پر دلی رنج کا اظہار کرتا ہے اور ان کے پس ماندگان سے ہمدردی ظاہر کرتا ہے۔

جناب خان غازی کابلی ہماری جنگِ آزادی کے نڈر سپاہی رہے تھے۔ وہ سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں کے پیرو تھے اور کٹّر قوم پرستانہ خیالات رکھتے تھے۔ فرقہ وارانہ سیاست سے وہ کس قدر نفور تھے اس کا اندازہ اس واقعے سے کیا جاسکتا ہے کہ پاکستان بن جانے کے فوراً بعد انھوں نے پشاور کو خیرباد کہا اور دہلی میں آ بسے۔ حکومتِ ہند نے انھیں مجاہدِ آزادی کی حیثیت سے تامر پتر دیا تھا اور انھیں ماہانہ پنشن بھی دی جاتی تھی۔

خان غازی کابلی ایک اچھے شاعر اور صحافی بھی تھے۔ ان کی شاعری کا لہجہ باغیانہ تھا اور ان کے اشعار میں انقلابی گھن گرج سنائی دیتی تھی۔ ایک صحافی کی حیثیت سے وہ اُردو کے کئی بڑے اخباروں سے وابستہ رہے جن میں "پرتاپ" اور "ملاپ" خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ہمّت اور حوصلہ ان کا نسلی ورثہ تھا۔ ان کی عمر سو سال ہوچکی تھی مگر اس عمر میں بھی وہ کئی ذمہ داریاں نبھا رہے تھے۔ وہ پختون جرگہ ہند کے صدر تھے اور کئی دوسرے محاذوں پر بھی سرگرم عمل تھے۔ پچھلے دنوں اُردو اکادمی، دہلی کی طرف سے منعقدہ بزرگوں کے مشاعرے میں انھوں نے بھی شرکت کی تھی اور نئی غزل سنائی تھی جو اُن کی جواں ہمّتی اور زندہ دلی کی ترجمان تھی۔

جناب شاداں بارہ بنکوی ایک خوشگو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ سب سے خندہ پیشانی اور تپاک سے پیش آتے۔ قیام لکھنؤ میں تھا، اُردو کا کوئی بھی معروف شاعر لکھنؤ پہنچتا تو اس کی پذیرائی اور خاطر مدارات میں وہ پیش پیش رہتے۔ وہ ملک کے اکثر مشاعروں میں مدعو کیے جاتے تھے اور خود انھوں نے بھی لکھنؤ میں کئی بڑے مشاعرے منعقد کرائے۔ ان کے کلام کے دو مجموعے شائع ہوتے تھے۔ ایک کا نام تھا "لفظوں کے چراغ" اور دوسرے کا "سنہری جالی سے سبز گنبد تک"۔ موخرالذکر نعتیہ کلام پر مشتمل ہے۔ ایک اور مجموعہ "سچّائیاں" چھپ رہا تھا کہ انھیں موت کا بلاوا آپہنچا۔ خداوند کریم ان کی مغفرت فرمائے۔

آپ کی رائے

○ "ایوانِ اردو دہلی" کا جنوری ۸۸ء کا شمارہ پڑھا۔ اسی شمارے میں ظہیر غازی پوری کا مراسلہ بھی ہے۔ مظہر امام کے جس مکتوب کو ظہیر غازی پوری نے غیر اہم بتایا ہے اس سے زیادہ 'گمراہ کن' مراسلہ خود انھوں نے لکھا ہے۔ آزاد غزل کو لے کر ان کے گمراہ کن مراسلے "گلبن" اور "سالار" میں چھپتے رہے ہیں۔ کرامت علی کرامت، یوسف جمال اور کتنے ہی صاحب قلم حضرات ان کی سرزنش کر چکے ہیں مگر وہ اپنی غلط حرکتوں سے باز نہیں آ رہے ہیں۔

میں "ایوانِ اُردو دہلی" میں شائع شدہ ان کے مراسلے کی طرف آتا ہوں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "آزاد غزل والا مذاکرہ سرے سے مذاکرہ ہے ہی نہیں اور آزاد غزل کے پروپگنڈہ ایجنٹوں نے اسے خود لکھا اور اپنے ہی رسالے میں شائع کیا۔" اس طرح کا مہمل جملہ لکھتے وقت انھیں سوچنا چاہئے تھا کہ ادب کے دربار میں حاضری دے رہے ہیں اور "ایوانِ اُردو دہلی" کا حلقہ بہت بڑا ہے۔ ان کی جانکاری کے لیے عرض ہے کہ مظہر امام، سری نگر سے بھاگلپور آتے تھے اور "کوہسار" کے دفتر میں وہ مذاکرہ باضابطہ طور پر ہوا تھا۔ اس موقع پر تصویریں بھی کھینچی گئی تھیں (اگر ظہیر غازی پوری چاہیں تو ملاحظہ کے لیے "اندیشہ" کے مُدیر سے رجوع کریں، تصویر انھیں بھیج دی جائے گی۔ ایسی تصویروں میں "اندیشہ" کے مدیر ارشد رضا، قیصر جمال، مناظر عاشق ہرگانوی اور مظہر امام مذاکرہ کی کارروائی میں نظر آئیں گے) جہاں تک ظفر ہاشمی کے خط کا سوال ہے۔ یہ اور اس طرح کے خطوط "اندیشہ" میں ہی چھپتے تھے، وہ بھی اس لیے کہ مذاکرے کے پڑھنے والوں کا ردِّ عمل قارئین تک پہنچ جائے۔ اگر ظفر ہاشمی کا خط "اندیشہ" میں نہ چھپتا تو ظہیر غازی پوری حوالہ کہاں سے دیتے۔ اسی سے آزاد غزل کے ہمنواؤں کی نیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ منظر علی خاں (کراچی) نے مراسلہ نہیں لکھا تھا جس کا حوالہ ظہیر غازی پوری نے دیا ہے، بلکہ "اندیشہ" کے مذکورہ شمارے پر ان کا تفصیلی تبصرہ تھا جو سب سے پہلے "جسارت" کراچی میں، اس کے بعد "اندیشہ" میں چھپا تھا۔ ظہیر کو شاید علم ہو کہ منظر علی خاں طنز و مزاح نگار ہیں۔ اس تبصرے میں منظر صاحب نے طنز و مزاح کو پورے طور پر راہ دی ہے۔ ظہیر نے مظہر امام کی "فہرست سازی" پر بھی اعتراض کیا ہے۔ ان کی اس بچکانہ ذہنیت پر ہنسی آئی۔ ادب کے اظہار کے لیے، ادب کی افادیت کو اُجاگر کرنے کے لیے اور کسی صنف کی مقبولیت کی نشاندہی کے لیے فہرست سازی بھی ضروری ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک فن ہے۔ اب ظہیر کو اس فن کی افادیت کا نہیں ہے تو انھیں کون سمجھائے۔

ظہیر نے سرور الزماں سرور کی آزاد غزلوں کی اشاعت کے بارے میں جانکاری چاہی ہے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ "کوہسار" اور "گلبن" میں ان کی کئی آزاد غزلیں شائع ہو چکی ہیں۔ ظہیر کو چاہیے کہ سروے کریں اور تحقیقی مزاج پیدا کریں ___ بھارت یایاور کی آزاد غزلیں بھی 'کوہسار' سے علیم صبا نویدی کے انتخاب تک میں موجود ہیں۔ مظہر امام چونکہ آزاد غزل کے موجد ہیں اس لیے وہ کسی کو نظر انداز کرنا نہیں چاہتے۔ ہم جیسے آزاد غزل کے نام لیوا بھی کسی کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

ظہیر نے کلام حیدری کی جس رائے کو بطور "سند" پیش کیا ہے اس سلسلے میں عرض ہے کہ مظہر امام پر تین حضرات پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے ہیں اور ان کے مقالے تکمیل کے آخری مراحل میں ہیں۔ آزاد غزل پر بھی تین حضرات پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے ہیں، ان سب کی کتابیں بہت جلد آ جائیں گی۔ اور "کوہسار" کا 'آزاد غزل نمبر' چھپ ہی رہا ہے۔ دیوناگری رسم الخط میں بھی آزاد غزل پر میری کتاب ۸۸ء میں آ رہی ہے، اس لیے کلام حیدری اور ظہیر غازی پوری کو بد دل ہونے اور طنز کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

محترم مُدیر صاحب، جس ایمانداری سے آپ نے ظہیر غازی پوری کا مراسلہ چھاپا ہے اسی صحافتی دیانتداری سے میرا یہ خط بھی "ایوانِ اُردو دہلی" میں چھاپ دیں۔

___ مناظر عاشق ہرگانوی

○ "ایوانِ اُردو دہلی" میں ظہیر غازی پوری کا مراسلہ پڑھا۔ انھوں نے بغیر تحقیق کے مجھ پر اور "اندیشہ" پر الزام عائد کیا ہے کہ آزاد غزل کا مذاکرہ مظہر امام کی غیر موجودگی میں تیار کیا گیا تھا۔ "اندیشہ" سنجیدہ ادبی حلقے میں اپنا وقار و وزن رکھتا ہے۔ ظہیر غازی پوری کے اس طرح کے گمراہ کن الزام سے "اندیشہ" کا معیار مجروح ہوتا ہے۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ بھاگلپور میں مظہر امام کی آمد پر "کوہسار" کے دفتر میں وہ انٹرویو لیا گیا تھا اور میری تحریک پر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، قیصر جمال اور مظہر امام قریب ڈھائی تین گھنٹہ جم کر بیٹھے تھے۔ اس انٹرویو کی تصویریں بھی لی گئی تھیں۔ صحافت بڑا جوکھم کا کام ہے اس دشت کی سیاحی کے بعد ہی ذمہ داری کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ہم مواد، معیار اور حقیقت پر توجہ دیتے ہیں خواہ مخواہ کا اسٹنٹ

یلا کر قارئین کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرتے۔

—— ارشد رضا، بھاگلپور

○ ظہیر غازی پوری کا خط حد درجہ گمراہ کُن ہے،
یاں تک "اندیشہ" کے مذاکرے کا تعلق ہے، میں اس
ذاکرے میں شامل تھا۔ مَیں یہ بات بھی واضح کر دوں کہ
ں آزاد غزل کا مخالف ہوں، اس کا اندازہ مظہر امام کی
ست سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ جہاں تک مظہر امام
شمولیت کا سوال ہے تو میرے پاس اس مذاکرے کی
و بر موجود ہے اگر ظہیر صاحب کو ضرورت ہو تو
ہ راست مجھ سے طلب کر سکتے ہیں۔ ویسے بھی مظہر امام
اس جملے سے یہ بات کہاں واضح ہوتی ہے کہ وہ مذاکرے
ں شامل نہیں تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس طرح
ویگ جملے لکھنے میں مظہر امام کا کوئی ثانی نہیں
۔ ظفر ہاشمی کے خط کا اقتباس بھی غالباً ظہیر صاحب
مجھ میں نہیں آیا۔ اسے دوبارہ پڑھنے کی زحمت
یں۔

—— قیصر جمال، پٹنہ

○ "ایوانِ اُردو دہلی" کی غزلیں، نظمیں، مضامین
ں ساری تخلیقات معیاری و فکر انگیز تو ہوتی ہی
، لیکن ساتھ ہی ساتھ شائع شدہ باذوق حضرات
ستوبات بھی قابلِ مطالعہ ہوتے ہیں۔ اس بار
ب ظہیر غازی پوری کا طویل خط یقیناً قابلِ
نا ہے۔ موصوف نے جن نکات پر خامہ فرسائی
ہے وہ حقیقت پر مبنی ہیں۔

—— محمد رفیع رضا، کٹیہار

طوط کی اشاعت کے ساتھ یہ بحث بند کی جاتی ہے۔ (ادارہ)

○ "ایوانِ اُردو دہلی" جنوری ۸۸ء کے شمارے
سیّد صباح الدّین عبدالرّحمٰن کے انتقال کی خبر،
لہ معارف نومبر ۸۷ء کی خبر سے بالکل مختلف ہے
یہ عجیب بات ہے کہ ان کے انتقال کی خبر جو
سرے رسالوں میں چھپی ہے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ
اختلاف ضرور ہے (دیکھیے کتاب نما دسمبر ۸۷ء۔
ہفت روزہ ہماری زبان ۱۵ر دسمبر ۱۹۸۷ء —
رسالہ معارف نومبر ۱۹۸۷ء)۔ ابھی ان کے انتقال
کو دو ماہ بھی نہیں ہوئے ہیں اور اس حادثہ کی
مختلف روایتیں سامنے آگئی ہیں جب کہ ان کے
ساتھ دسنوی صاحب بھی رکشے پر تھے۔ پھر کیا وجہ
ہے کہ بیان میں اس قدر تضاد پیدا ہو گیا ہے۔
ان کا انتقال ۱۸ر نومبر ۸۷ء کو ہوا اور "ایوانِ اُردو
دہلی" جنوری ۸۸ء کے شمارے میں جو اطلاع دی گئی ہے۔
وہ دوسرے رسالوں سے مختلف تو ہے ہی خود معارف
نومبر ۸۷ء کی خبر سے مختلف ہے "معارف" کی خبر اس طرح ہے: "ابھی
وہ (سید صباح الدّین عبدالرّحمٰن) ڈالی گنج کے
پُل ہی پر تھے کہ دفعتاً ان کا رکشا ایک آوارہ گائے
سے ٹکرا گیا اور وہ گر پڑے، سر اور دماغ میں چوٹ
آئی اور وہ اسی وقت بے ہوش ہو گئے۔ اسپتال
پہنچ کر ..... خاتمہ ہو گیا۔"

"ایوانِ اُردو دہلی" جنوری ۸۸ء میں ان
کے انتقال کی خبر اس طرح شائع ہوئی ہے: "اخباری
اطلاعات کے مطابق وہ ندوہ کی کسی میٹنگ میں
شرکت کرنے لکھنؤ پہنچے تھے اور سید شہاب الدّین دسنوی
کے ساتھ ایک سائیکل رکشے میں جا رہے تھے کہ پیچھے
سے ٹرک نے ٹکر ماری مرحوم رکشا سے نیچے گر پڑے
اور ٹرک انھیں کچلتا ہوا گذر گیا۔"[1]

—— سید محی رضا، بمبئی

[1] ہم نے "قومی آواز" لکھنؤ کی فراہم کردہ اطلاع پر بھروسا کیا تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ "معارف" میں شائع شدہ تفصیلات کو زیادہ مستند سمجھنا چاہیے۔ دسنوی صاحب سے بھی رجوع کیا جاسکتا ہے۔ (ادارہ)

○ "ایوانِ اُردو دہلی" اولین شمارے سے
زیرِ مطالعہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جتنا شاندار
آغاز اس کے حصہ میں آیا، اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔
پھر اتنی قلیل مدت میں ایسی مقبولیت! اس بے مثال
کامیابی کا راز "ایوانِ اُردو دہلی" کا اپنا منفرد مزاج
و معیار ہے۔ "ایوانِ اُردو دہلی" کا بڑھتا ہوا حلقۂ
اشاعت ثابت کرتا ہے کہ آج بھی معیاری ادب کا
صالح ذوق رکھنے والے قارئین کم نہیں ہیں یہ اور
بات ہے کہ ہماری ادبی صحافت بھی فلم کی طرح آرٹ اور
کمرشیل جیسے خانوں میں منقسم ہوتی جا رہی ہے۔

محترم! بعض لوگ ہیں جو ہر ادبی جریدے کو
افسانے کی تعداد بڑھانے کی فرمائش لکھتے ہیں شاید
انھوں نے رشید احمد صدیقی کا یہ قول نہیں پڑھا کہ "جو
قوم افسانہ کہنے اور سُننے پر اُتر آتی ہے، وہ ایک دن
خود بھی افسانہ بن جاتی ہے۔"

میرے خیال میں مضامین، انشائیہ، افسانے،
طنز و مزاح اور غزلوں کی تعداد بالکل مناسب ہے۔
قارئین کے کالم (مصوّر صفحے کے عنوانات، ہم طرح
اشعار، ناقابلِ فراموش وغیرہ) بھی اپنی مثال آپ
ہیں۔ قارئین کے خطوط (آپ کی رائے) میں نئی نئی
گرہیں بھی کُھل رہی ہیں اور بہت سی غلط فہمیاں
بھی دُور ہو رہی ہیں۔ بہر صورت بالکل عدیم المثال
ہے "ایوانِ اُردو دہلی" کا کردار۔ ایسے ہی کچھ اور
دلچسپ، مفید اور معیاری کالموں کی شروعات یقیناً
خوش آئند ثابت ہوگی۔

—— جاوید فریدی پنڈولوی، پنڈول ضلع مدھوبنی

○ تازہ شمارہ یوں تو معیاری ہے لیکن خورشید جہاں
کا مضمون "من کہ" کنہیا لال کپور کے مضمون "من کہ"
کی نقل ہے۔ سب کچھ وہی ہے صرف بعض جملوں میں
تبدیلی کر دی گئی ہے۔ خورشید جہاں نے "میں" سے بات
شروع کی ہے اور کنہیا لال کپور نے ایک پروفیسر کا
قصہ بیان کیا ہے۔

(نام پڑھا نہیں جاسکا)، رانچی

○ اس بار مضامین کا حصّہ تشنہ ہے۔ عبدالمغنی نے اپنے مضمون میں وہی پُرانی باتیں کہی ہیں جو ماہر اقبالیات پچھلے پچاس سال سے لکھتے آرہے ہیں۔ نیا نکتہ ایک بھی نہیں ہے۔ راغب جلالی کا مضمون تشنہ ضرور ہے مگر دونوں سرورق کی تصویروں نے مضمون کو بیحد اہم بنا دیاہے۔ واہی کا " ناقابلِ فراموش" واقعی ناقابلِ فراموش ہے۔ طنزیہ و مزاحیہ مضامین آپ ضرور شائع کیجیے لیکن چوری کی تخلیقات مت چھاپیے۔ مگر آپ بھی پکڑ کیسے کر سکتے ہیں۔ خورشید جہاں نے بمبئی سے شائع ہونے والے رسالہ " رنگ " جولائی ۷۲ء کے شمارے سے اجے کمار ورما کا مضمون اپنے نام سے چھپوالیا ہے۔ صرف بعض الفاظ بدل دیے ہیں اور کتابوں کے نام بدلے ہیں۔

—— شبیر حسن دانا، مظفر پور

○ جنوری ۱۹۸۸ء کا شمارہ بے حد پسند آیا۔ "من کہ" ..... کے تحت محترمہ خورشید جہاں کی تخلیق اچھی ہے۔ موصوفہ نے موجودہ تعلیمی معیار کا جو خاکہ کھینچا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ آج تعلیم کا معیار اتنا گرتا جا رہا ہے کہ اس طرف توجہ دِلانا نہایت ضروری ہے۔ عُمدہ طرزِ تحریر نے اس مضمون میں اور بھی چار چاند لگا دیے ہیں۔

"ناقابلِ فراموش" کے تحت آپ نے جو سلسلہ شروع کیا ہے اس کی شروعات اچھی ہے۔ سچ ہے آج بھی اس ہندوستان میں ایسی ہستیاں موجود ہیں جو کردار اور انسان دوستی کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔

—— فرحان غنی، پٹنہ

○ "ایوانِ اُردو دہلی" کا جنوری کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ "حرفِ آغاز" میں آپ نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ اُردو زبان کی تدریس اور ترویج کی ذِمّہ داری ایک حد تک اردو والوں پر بھی ہے۔ عبدالمغنی صاحب کا مضمون "شاعرِ مشرق شاعرِ انسانیت" ڈاکٹر اقبال کی متصوفانہ، فلسفیانہ اور بلند آہنگ شاعری، اور ان کے نظریۂ حیات کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوگا۔

افسانوں میں بشیشر پردیپ صاحب کا افسانہ "وہ ایک شخص" بے حد پسند آیا۔ محترمہ خورشید جہاں صاحبہ نے "من کہ" میں آج کے تعلیمی ماحول کی صحیح تصویر کشی کی ہے۔

—— ششی لمبٹن، آگرہ

○ یوں تو اُردو کے دیگر رسائل بھی ہیں مگر کم عرصے میں "ایوانِ اُردو دہلی" نے اپنا انفرادی مقام بنالیا ہے۔ یہ صوری و معنوی اعتبار سے اُردو کا واحد جریدہ ہے جس میں زبان و ادب اور تنقیدی مسائل کے ساتھ ساتھ زندگی کے تاریک گوشوں کو بھی اُجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جیسا کہ خورشید جہاں کا مضمون "من کہ" امید ہے آئندہ بھی زبان و ادب کی خدمت کے ساتھ سماجی پہلوؤں کی جانب بھی قارئین کی توجّہ مبذول کرانے کی سعی کرتے رہیں گے۔

—— خلیل احمد انصاری، بُرہانپور

○ مغنی صاحب کے مقالے سے اقبال کے شیدائی خصوصاً مستفید ہوسکتے ہیں۔ افسانوں میں حیات اللہ انصاری نے بے حد متاثر کیا۔ کیف صاحب کی نظم اچھی ہے۔ آزاد نظموں سے تو خیر مجھے کوئی لگاؤ ہی نہیں۔ غزلیں ایک حد تک موثر ہیں۔ خورشید جہاں کی تحریر خوب ہے۔ پڑھ کر کئی تصویریں نگاہوں میں گھوم گئیں۔ "ناقابلِ فراموش" ناقابلِ فراموش ہے۔

—— رضوان عثمانی، مظفر پور

○ عبدالمغنی صاحب کا مضمون اچھا لگا۔ افسانوں میں حیات اللہ انصاری اور بشیشر پردیپ نے کافی متاثر کیا۔ نظمیں اور غزلیں معیاری ہیں۔ البتہ طنز و مزاح کچھ پھیکا ہے۔ "ہم طرح اشعار" کا کالم قاری کو اپنی جانب متوجّہ کرنے میں کسی طرح کی کسر نہیں چھوڑتا۔

—— راشد انور، رانچی

○ جنوری کے شمارے کے یوں تو تمام مضامین اہم ہیں — تاہم عبدالمغنی صاحب کا مضمون "شاعرِ مشرق شاعرِ انسانیت" بے حد معلوماتی رہا اور حیات اللہ انصاری کا افسانہ "ٹھکانہ" بشیشر پردیپ کا "وہ ایک شخص" بے حد پسند آیا۔

—— ایم۔اے۔کریمی، گیا

○ جنوری کے شمارے میں کیف بھوپالی کی نظم پروفیسر عبدالمغنی کا مضمون "شاعرِ مشرق شاعرِ انسانیت" رضا نقوی صاحب کا "ناقابلِ فراموش" اور جناب سیرت اجمیری کی غزل یہ سب سراہنے کے قابل ہیں۔

—— احمد نشور صدّیقی، جمشید پور

○ عبدالمغنی صاحب کا مضمون اور حیات اللہ انصاری صاحب کا افسانہ فکر و احساس میں اضافہ کا سبب بنے۔ مغنی صاحب اپنے مضمون میں بڑی احتیاط کے ساتھ اقبال کے شعری نظام اور ان کی علمی جامعیت کو اپنے نظریات کی میزان پر تولتے نظر آتے ہیں لیکن اقبال کا تجزیہ ایک عقیدت مند کی حیثیت سے زیادہ اور پارکھ کی حیثیت سے کم کرتے ہیں۔ شعری حصّے میں علیم اللہ حالی، سیرت اجمیری اور ہلال فرید متاثر کرتے ہیں۔ واہی صاحب کا 'ناقابلِ فراموش' واقعی ناقابلِ فراموش ہے اور اس عہد میں جب فرقہ واریت نے محبّت اور یقین کی لَویں کتر ڈالی ہیں ایسی تحریریں روشنی کا استعارہ ہیں — راج نرائن رازؔ کے تبصرے بھی وقیع ہیں۔

—— عین تابش، سہسرام

○ اقبال پر عبدالمغنی کا مضمون خاصا اہمیت کا حامل ہے۔ ان کا یہ جملہ "اقبال کے عمل کا محاذ مشرق تھا اور ان کی فکر کا افق پورا عالم" بڑا ہی حقیقت پسندانہ ہے۔

کیف بھوپالی کی نظم اور گُربچن سنگھ کا افسانہ بطورِ خاص پسند آیا۔ خورشید جہاں کا "من کر..." ہنسانے کے ساتھ ساتھ رُلاتا بھی ہے۔

—— فہیم نادر، دربھنگہ

○ "ایوانِ اُردو دہلی" ہر اعتبار سے بہت خوبصورت ہے۔ بزرگ طنز و مزاح نگار و شاعر جناب رضا نقوی واہی صاحب کا مضمون "ناقابلِ فراموش" پڑھ کر بے حد متاثر ہوا ہوں۔ فرقہ پرست حضرات کے لیے یہ ایک چیلنج ہے۔ موصوف نے اپنے اس مضمون میں قومی یکجہتی اور ہندو مسلم ایکتا کی بے مثال روداد پیش کی ہے اور بڑے ہی موثر انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ عبدالمغنی کا مضمون "شاعرِ مشرق شاعرِ انسانیت" بے حد معیاری اور قابلِ مطالعہ ہے۔ افسانے، غزلیں اور نظمیں سب کی سب اعلیٰ پایہ اور معیار کی ہیں۔

—— مصطفےٰ مومن، حیدرآباد

○ "ایوانِ اُردو دہلی" کا تازہ شمارہ دیکھا۔ حسبِ معمول پسند آیا۔ مندرجات کی تمام چیزیں لائقِ مطالعہ ہیں۔ ناقابلِ فراموش کے تحت رضا نقوی واہی کا واقعہ بہت ہی دلچسپ اور بروقت ہے۔ اس کے اچھے نتائج بھی مرتب ہو سکتے ہیں۔ پرچے کو بہتر بنانے کی ابھی بہت گنجائش ہے۔ کچھ اور شمارے آنے دیجیے۔ تجربات کی روشنی میں خود ہی باتیں واضح ہو جائیں گی۔ پھر باشعور قارئین بھی اس جانب آپ کی توجہ مبذول کراتے رہیں گے۔ اتنے قلیل عرصے میں آپ لوگوں نے جتنا کچھ کر لیا ہے وہ بھی ایک کارنامہ ہے۔

—— فاروق شفق، کلکتہ

○ "ایوانِ اُردو دہلی" کا ہر شمارہ خوب سے خوب تر دیکھ کر بے حد خوشی ہوتی ہے۔

جنوری کے شمارے میں سرورق پر سُنہری کوٹھی کی تصویر جاذبِ نظر اور خوبصورت رہی۔ ایک قدیم فنی شاہکار سے روشناس کرانے پر میں جناب راغب الدّین جلالی کو دلی مبارکباد دیتا ہوں۔ کیف بھوپالی کی نظم "میری دھرتی" خوب رہی۔ افسانوں میں گُربچن سنگھ جی کی کہانی کانپنے والے پتّے بے حد متاثر کرتی ہے۔

حیات اللہ انصاری، ساجد حمید، اظہار افسر کی تصویریں شائع نہیں ہوئیں اور سیرت اجمیری صاحب کا پتہ لکھا نہیں گیا [1]

—— شمیم جنیدی، گلبرگہ

[1] اس کوتاہی کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ اُن حضرات نے اپنی تصاویر نہیں بھجوائیں۔ (ادارہ)

○ جنوری کے شمارے میں ڈاکٹر منصور عالم آرہ کا ایک مراسلہ شائع ہوا ہے اور صفحہ ۵۸ پر خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی کا ایک شعر پیش کیا گیا ہے جس کی کتابت میں کاتب سے یقیناً سہو ہوا ہے مصرعِ اوّل اس طرح ہے:۔

"لگے مُنہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب"

"مُنہ چڑھانا" اُردو میں کوئی محاورہ نہیں۔ نہ آتش کے زمانے میں اور نہ آج ہی مستعمل ہے۔ اصل میں "مُنہ چِڑانا" ہے جسے کاتب نے "چڑھانا" کر دیا ہے۔ دیوانِ آتش (نول کشور) اور کلیاتِ آتش مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، دہلی یونیورسٹی مطبوعہ رام نرائن لعل، الہ آباد ۱۹۸۵ء صفحہ ۵۵ پر اصل شعر اس طرح ہے ۔

لگے مُنہ بھی چِڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

—— عزیز صدیقی، بھاگلپور

○ خواجہ احمد عبّاس نمبر کی اشاعت کے بعد سے مُسلسل "ایوانِ اُردو دہلی" قریبی بُک اسٹال سے لے کر مطالعہ کیا کرتا ہوں "ایوانِ اُردو دہلی" کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مثل ہے ہر کالم قابلِ مطالعہ ہے فضا ابن فیضی کی غزل بے حد پسند آئی لیکن بُڑھاپے کی غزل اور جوانی کی تصویر یہ چیزیں عجوبہ ہیں۔

—— انصار زبیر اعظمی، اعظم گڑھ

○ فروری کے شمارے کی تمام کہانیاں پسند آئیں۔ خصوصاً بھیشم ساہنی کا افسانہ "اہم بریہما سمّی" بہت خوب ہے۔

غزلوں میں مظہر امام نے متاثر کیا۔ نوبل اور خاکے پر مضامین ہم طالب علموں کے لیے کافی قیمتی ہیں۔

—— شہزاد انجم، گیا

○ فروری ۸۸ء کے شمارے میں مرزا محمد رفیع سودا کی غزل بعنوان سرودِ رفتہ کا مطلع ——

گل پھینکے ہے عالم کی طرف بلکہ ثمر بھی

تحریر ہے شاید یہ کتابت کی غلطی ہے مطلع دُرست اس طرح ہے۔

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی [1]

—— فرید صدیقی، رامپور

[1] مطلع مشہور اسی طرح ہے لیکن پروفیسر محمد حسن کی مرتبہ "کلیاتِ سودا" میں مصرعِ اوّل اسی طرح لکھا گیا ہے جس طرح "سرودِ رفتہ" میں نقل ہوا۔ اسی کو دُرست سمجھنا چاہیے —— ادارہ

○ یوں تو دہلی سے بے شمار رسائل شائع ہو رہے ہیں مگر اُن میں وہ بات نہیں جو "ایوانِ اُردو دہلی" میں ہے۔

—— محمد نجیب اللہ انصاری، سیتا رامپور

اُردو اکادمی، دہلی:
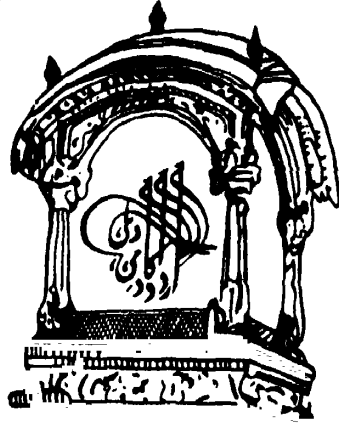
اغراض و مقاصد

(۱) دہلی کی لسانی تہذیب کے مشترکہ حصّے کے طور پر اردو زبان اور ادب کا تحفظ اور ارتقا۔

(۲) اردو میں ادبی اور معیاری تصنیفات اور بچوں کی کتابوں کی اشاعت اور حوصلہ افزائی۔

(۳) اردو میں ادبی اور سائنسی اور دوسرے موضوعات سے متعلق ایسی اہم کتابوں کے تراجم کا اہتمام کرنا جن کا ابھی تک اردو زبان میں ترجمہ نہ ہوا ہو۔

(۴) اردو میں حوالہ جاتی کتابوں کی تالیف و اشاعت۔

(۵) قدیم اردو ادب کی صحیح ترتیب و تدوین کے بعد اشاعت۔

(۶) اردو کے غیر مطبوعہ معیاری ادب پاروں کی اشاعت۔

(۷) اردو کے مستحق مصنّفین کی غیر مطبوعہ تصنیفات کی اشاعت میں تعاون۔

(۸) گزشتہ ایک سال کے دوران مطبوعہ اردو تصنیفات کے مصنّفوں کو انعامات کی تقسیم۔

(۹) اردو کے عمر رسیدہ اور مستحق مصنفین کی ماہانہ مالی اعانت

(۱۰) اردو اسکالروں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک مقررہ مدّت کے لیے مالی اعانت کے ساتھ دوسری سہولتیں بہم پہنچانا۔

(۱۱) مشہور اسکالروں اور دوسری اہم شخصیتوں کو جلسوں کو خطاب کرنے کے لیے دعوت دینا۔

۱۲۔ ادبی موضوعات پر سمینار، سمپوزیم، کانفرنس اور نشستیں منعقد کرنا جن میں عالمی ادبی رجحانات کے منظر میں اردو کے مسائل پر بحث و مباحثہ ہو اس کے ساتھ اردو کی تدریس اور اس کے استعمال سے متعلق سرکاری احکامات کی تعمیل و تکمیل کا جائزہ اور ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے مختلف ایسی ادبی اور تہذیبی تنظیموں کو مالی اعانت دینا جو کہ اسی طرح کی نشستیں منعقد کرتی ہیں۔ لیکن یہ مالی اعانت ایک معاملے میں پانچ سو روپے سے زیادہ نہیں ہوگی۔

۱۳۔ اردو میں اعلیٰ معیار کے رسالے جریدے اور اسی طرح کی دوسری مطبوعات کی اشاعت۔

۱۴۔ اِن ضابطوں کے تحت مطبوعات کی فروخت کا اہتمام۔

۱۵۔ اکادمی کے لیے منقولہ اور غیر منقولہ جایداد حاصل کرنا لیکن شرط یہ ہے کہ غیر منقولہ جائداد کے حصول سے پہلے دہلی انتظامیہ کی پیشگی منظوری ضروری ہوگی۔

۱۶۔ اردو کی تعلیم، اس کے استعمال اور سرکاری احکامات کی تکمیل میں حائل دشواریوں اور اردو بولنے والوں کے مطالبوں کو دہلی انتظامیہ کے علم میں لانا۔

۱۷۔ ایسے سبھی جائز اقدامات کرنا اور قانونی کارروائیاں کرنا جن سے مذکورہ مقاصد کے فروغ و تعمیل میں مدد مل سکتی ہو۔

۱۸۔ سوسائٹی کی ساری آمدنی سوسائٹی کے اغراض و مقاصد کے حصول ہی کے لیے خرچ کی جائے گی۔

نمبر:
۲۷۶۱ اور ۲۶۳۴۴۸

ادارۂ تحریر
سیّد شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی

جلد: ا، شمارہ: ۱۲ — فی کاپی ۵۰ر ۲ روپے، سالانہ قیمت ۲۵ روپے — اپریل ۱۹۸۸ء

عنوان	مصنف	صفحہ
حرفِ آغاز	سیّد شریف الحسن نقوی	۴
مضامین:		
بحری توانائی	ذاکر علی انصاری	۶
میں اور کہانی	منشا یاد	۱۲
دِلّی کے آثارِ قدیمہ	خلیق انجم	۱۹
عصری معنویت کا افسانہ	سلیم شہزاد	۲۶
حسرت موہانی ۔ ایک مردِ قلندر	نامی انصاری	۳۵
مہدی حسن اور غزل گایکی	شاہد میر	۳۸
افسانے:		
دام شنیدن	منشا یاد	۱۴
عجیب و غریب	جوگندر پال	۲۳
فساد	خوشونت سنگھ/ ترجمہ: تنویر اختر رومانی	۳۳
نظمیں:		
نظمیں	شہریار	۵
ناسور	اعجاز اعظمی	۵
غزلیں:		
	ظہیر غازی پوری/ رونق نعیم	۱۱
	گوہر عثمانی/ سید حیات وارثی/ فاروق شفق	۱۸
	قاضی حسن رضا/ سید فرید مسکینی/ عرفان حمید	۲۵
	مسعودہ نکہت/ عفت زرّیں/ نجمہ عزیز مرادآبادی	۳۲
ہم طرح اشعار	قارئین	۴۰
شعری اور نثری عنوانات	قارئین	۴۲
نئی کتابیں	دلیپ بادل/ ایم. آر. قاسمی/ فریاد آزر/ اطہر فاروقی	۴۴
اُردو خبرنامہ	ادارہ	۴۷
سرفروشی کی تمنّا	بہزاد فاطمی/ شوکت جمال	۵۳
آپ کی رائے	قارئین	۵۵

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ:
ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی
اُردو اکادمی گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

رق اور تزئین: ارشد علی
خوشنویس: تنویر احمد

سیّد شریف الحسن نقوی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے ثمر آفسیٹ پریس دہلی ۶ سے چھپوا کر دفتر اُردو اکادمی نئی دہلی ۲ سے شائع کیا۔

حرفِ آغاز

غزل ہمیشہ ہی سے اُردو کی اور اُردو والوں کی پسندیدہ صنفِ سخن رہی ہے۔ ہمارے اکثر قدیم شاعروں کی شہرت اور ناموری
ضامن ان کی وہی فکری اور فنّی کاوشیں ہیں جو غزل کی صورت میں ظاہر ہوئی ہیں۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ انھوں نے د
اصناف میں بھی طبیعت کے جوہر دکھائے ہیں اور اپنے قادر الکلام شاعر ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

غزل ذمّہ داری سے کہی جائے تو اس کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں لیکن کام چلاؤ غزل کہنے کے لیے موزوں طبع ہو
ہے۔ رسمی مضامین کا انبار ہے جس سے سینکڑوں کیا ہزاروں دواوین بھرے پڑے ہیں، بیان کے ڈھلے ڈھلائے سانچے بھی موجود ہیں۔ پھ
ہے کہ ان مضامین اور اسالیبِ بیان سے آشنا ہونے کے لیے مطالعے کی زحمت بھی چنداں ضروری نہیں۔ کوئی مشاعرہ سُن لیا جائے یا غ
سرائی کی کسی محفل میں شرکت کرلی جائے، کم و بیش ان تمام مضامین اور اسالیب تک ہماری رسائی ہو جائے گی اور ان کی بدولت ہم آ
کے ساتھ رسمی قسم کی غزل کہہ لینے پر قادر ہو جائیں گے۔

محرّکات خواہ کچھ بھی رہے ہوں، مولانا حاؔلی نے جس غزل کے رد میں آواز اٹھائی تھی وہ وہی غزل تھی جو زندگی کے حقیقی معاملا
مسائل کی ترجمان نہ ہوکر بے روح خیالی مضامین کی جگالی بن کر رہ گئی تھی۔ بعض حلقوں کی طرف سے شدید مخالفت کے باوجود حاؔلی کی یہ آواز
نہ رہی۔ ان کے بعد جو غزل گو سامنے آئے اور انھوں نے اس صنف میں درجۂ امتیاز حاصل کیا، وہ وہی تھے جنھوں نے صرف متقدمین کی ب
پر اکتفا نہیں کی اور اپنے فکر و فن کی بنیاد بڑی حد تک اپنے نجی تجربات اور شخصی مشاہدات پر رکھی۔ نظم گو شعرا کا ایک پورا قافلہ سامنے آیا
یں اقبؔال جیسا دیو قامت شاعر بھی شامل تھا۔

ترقّی پسند تحریک کے آغاز کے ساتھ نظم گوئی کا رجحان اور آگے بڑھا، صرف یہی نہیں، ترقّی پسند ناقدوں نے غزل کو بے وقت کی
قرار دینے کی کوشش بھی کی۔ یہ کوشش اگرچہ پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی اور غزل کی شدید ترین مخالفت کے دنوں میں بھی جذؔبی اور مجرؔوح
ترقّی پسند شاعر غزل کہتے رہے لیکن مجموعی طور پر ترقّی پسندی کے عروج کا زمانہ غزل کے زوال کا زمانہ تھا۔

آزادی کے چند برس بعد غزل ایک نئی توانائی کے ساتھ سامنے آئی، تازہ ہوا کے ایک خوشگوار جھونکے کی طرح۔ جدید شعرا میں اکثر
نظم سے بھی اپنا رشتہ قائم کیا اور اسے نئے امکانات تک لے گئے لیکن دھیرے دھیرے بساطِ شعر پر غزل غالب آتی گئی اور پچھلے آٹھ دس ب
یں سامنے آنے والے اکثر شاعر غزل ہی کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہیں۔ اب غزل جس کثرت سے کہی جا رہی ہے اس کا ایک تشویشناک پہلو یہ
یہ سدا بہار صنفِ سخن ایک بار پھر رسمیت کا شکار ہونے لگی ہے اور چند مضامین اور الفاظ کی تکرار پھر اس کی پہچان بننے لگی ہے۔ ایک اور توجہ
بات، ہمارے بعض شاعروں کی طرف سے جو صرف غزل کہتے ہیں، یہ پروپیگنڈہ ہے کہ غزل افضل ترین صنفِ شاعری ہے۔ یہ محض اپنے عجز کو عق
بنا کر پیش کرنے کی کوشش ہے اور حتمی طور پر ایک گمراہ کن کوشش۔

اگر اُردو شاعری کو ہمہ جہت ترقّی کرنی ہے تو نظم اور دوسری شعری اصناف پر بھی ہمارے شعرا کو اتنی ہی توجّہ دینی چاہیے جتنی غزا
صرف غزل شاعری کے تمام ذائقوں سے ہمیں بہرہ ور نہیں کرسکتی۔

"ایوانِ اُردو دہلی" اور "بچّوں کا ماہنامہ اُمنگ" دونوں ہی اُردو دُنیا میں تیزی سے مقبولیت حاصل کر رہے ہیں۔ اس کے لیے ہم ا
پڑھنے والوں کے بھی ممنون ہیں اور ان نیوز ایجنسیوں کے بھی جو ان رسالوں کو ہمارے ہزاروں قارئین تک پہنچانے کا وسیلہ ہیں۔

——— سیّد شریف الحسن

اُداسی کی ہجو

سمندروں سے خراج لے کر
مہیب صحراؤں سے گذر کر
حسین ابن علی کا لشکر
وہ آرہا ہے، وہ آچکا ہے
تمام اشجار جھومتے ہیں
فرشتے سجدوں میں منہمک ہیں
چراغ ہر سمت جل رہے ہیں
بتاؤ اب تم اداس کیوں ہو
بتاؤ افتاد کیا پڑی ہے
تمہارے بازو پہ آج بھی کیوں
سیاہ پٹی بندھی ہوئی ہے

تنہائی

اندھیری رات کی اس رہگذر پر
ہمارے ساتھ کوئی اور بھی تھا
افق کی سمت وہ بھی تک رہا تھا
اسے بھی کچھ دکھائی دے رہا تھا
اسے بھی کچھ سنائی دے رہا تھا
مگر یہ رات ڈھلنے پر ہوا کیا
ہمارے ساتھ اب کوئی نہیں ہے

(خواب کا در بند ہے ۔۔۔ جس پر اس سال ساہتیہ اکادمی ایوارڈ دیا گیا ہے)

ادھوری خواہش

یہ خنجر لو اور وار کرو
اور میرے سو ٹکڑے کر دو
پھر چھلنی جسم کو سہلاؤ
آنکھوں کی اوس میں نہلاؤ
تم میرے قاتل کہلاؤ
اس دن کے لیے میں زندہ ہوں۔

شہریار

شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ناسور

کون سا ایک پل گذرتا ہے
جس میں ماضی کی تلخ یادوں کے
زہر کے گھونٹ میں نہیں پیتا
زخم خوردہ ہے آتما میری
ذہن پر درد کی خراشیں ہیں
خوں ٹپکتا ہے سوچ کے رُخ سے
ڈگمگانے لگے وفا کے قدم
کون قاتل ہے کہہ نہیں سکتا
تم کو الزام دے نہیں سکتا
خود ہی مجرم بنوں بجا بھی نہیں
پھر یہ کیوں کر جمود ٹوٹے گا
زہر کا مادّہ سمٹتا ہے
کیا یہ ناسور بن کے پھوٹے گا

اعجاز اعظمی

کامراون نردھا، اعظم گڑھ (یوپی)

انسان ابھی تک توانائی کے ذرائع ڈھونڈ نکالنے کے لیے زمین کی خشکی کی حدوں میں ہی کام کرتا رہا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی تک صرف ایک تہائی امکانات کا ہی جائزہ لیا گیا ہے۔ زمین کے دو تہائی حصّے کے بارے میں، جو پانی سے ڈھکا ہوا ہے، اس کی طرف حال ہی میں توجّہ مبذول کی گئی ہے۔ دُنیا بھر میں توانائی کی بڑھتی ہوئی مانگ کو دیکھتے ہوئے اس بات کا اندیشہ ہونے لگا ہے کہ کہیں موجودہ توانائی کے بھنڈار ختم نہ ہو جائیں۔ اِسی بات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اور توانائی کے ختم ہونے والے ذرائع (تیل، کوئلہ) کی روز افزوں کھپت کو دیکھتے ہوئے آج دُنیا کے مختلف ممالک میں نئی توانائی کے ذرائع ڈھونڈ نکالنے کے لیے سائنسداں بڑے پیمانے پر تحقیق و تفتیش کر رہے ہیں۔ ان کی کوشش ہے کہ توانائی کا کوئی ایسا متبادل ذریعہ نکالا جائے جس کا استعمال صدیوں تک ہوتا رہے اور جن سے کم سے کم لاگت میں توانائی تیّار کی جاسکے اور جس کے استعمال سے کسی طرح کی ماحولیاتی آلودگی بھی نہ پیدا ہو۔

سورج توانائی کا بہت بڑا ذخیرہ ہے جو اپنی شعاعوں کے ذریعے ۵۵۰ سے ۷۰۰ $\times 10^{12}$ MWh تک توانائی زمین تک بھیجتا ہے جس میں سے ۱۱۰ سے ۱۴۰ $\times 10^{12}$ MWh سالانہ سمندر میں جذب ہو جاتی ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو سمندر میں توانائی پیدا کرنے کی امکانی قوّت بہت زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج سمندر کو توانائی کا بہت بڑا ذخیرہ سمجھا جانے لگا ہے۔ آج بحری توانائی توجّہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ بہت سے ممالک بحری توانائی پیدا کرنے اور استعمال میں لانے کے لیے کوشاں ہیں اور فرانس اور روس اس توانائی کا بخوبی استعمال کرنے بھی لگے ہیں۔ بحری توانائی کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ یہ لامحدود متبادل توانائی ہے اور اس سے کسی قسم کی آلودگی پیدا ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ بحری توانائی کی کئی قسمیں ہیں۔

۱۔ تیز پانی کی توانائی (TIDAL ENERGY)

سمندر سے پیدا ہونے والی توانائی میں شاید سب سے زیادہ مقبول اور ممکن الحصول توانائی کا ذریعہ تیز پانی سے پیدا ہونے والی توانائی ہے۔ سمندری پانی کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ ۲۴ گھنٹے میں قریب دو بار بڑھتا اور گھٹتا ہے یہ اتار چڑھاؤ سورج اور چاند کی کشش ثقل سے پیدا ہوتا ہے جسے ٹائڈ کہتے ہیں۔ اِن کا اندازہ سمندر کے کسی کنارے پر کھڑے ہو کر لگایا جاسکتا ہے۔ ٹائڈ سے توانائی پیدا کی جاسکتی ہے ایسا اندازہ ہے۔ اس توانائی کو پیدا کرنے کی کوشش سب سے پہلے امریکہ اور فرانس میں اِسی صدی میں قریب ۱۹۳۰ء کے بعد ہوئی اور ۱۹۶۶ء میں فرانس میں دریائے رانس پر ایک پلانٹ لگایا گیا جو دُنیا کا شاید پہلا پلانٹ تھا۔ یہ آج بھی بخوبی کام کر رہا ہے۔ اس پلانٹ سے قریب 544 mill. K.W. بجلی پیدا ہوتی ہے۔ اِسی طرح کا دوسرا پلانٹ رُوس نے Kishlaya کی کھاڑی میں ۴۰۰۰ K.W. بجلی پیدا کرنے کے لیے ۱۹۶۹ء میں لگایا۔ حالانکہ شروع میں ان پلانٹوں پر ایک بڑی رقم لگانی پڑتی ہے مگر آگے چل کر اس خرچے میں کمی ہوتی جاتی ہے کیوں کہ اس میں پانی کو بار بار استعمال کیا جاتا ہے۔ ٹائڈل پاور حقیقت میں توانائی کا اچھا ذریعہ ہے۔ اندازہ ہے کہ مستقبل میں ٹائڈل سے پیدا ہونے والی توانائی کا قریب ۲۰ فی صدی عمل میں لایا جائے گا۔

سمندر کا پانی چڑھ کر چاروں طرف پھیل جاتا ہے۔ اس پھیلے ہوئے پانی کو کسی مخصوص جگہ پر ڈیم (Dam) یا ریزروائر (Reservoir) میں اکٹھا کیا جاسکتا ہے اس کام کے لیے خاص جگہ کا ہونا ضروری ہے جہاں پانی ۵ سے ۸ میٹر اونچائی تک چڑھ سکے۔ پانی ایک بار جب ریزروائر میں بھر جائے تو اُسے بند کر لیا جائے اور پھر جب سمندری سطح نیچے گرنے لگے تو اس پانی

ڈاکٹر علی انصاری
سائنسداں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوشنوگرافی، دونا پاولا، گو

کو چھوڑ دیا جائے۔ پانی کی سطح نیچی ہونے کی وجہ سے پانی رفتار سے گرے گا جیسے اگر کسی ٹربائن سے ہو کر جانے دیا جائے تو ٹربائن اس پانی کی رفتار سے گھومنے لگے گی جس سے برقی توانائی پیدا ہوگی۔ پانی سے اسی اُصول پر بجلی پیدا کی جاتی ہے۔ سائنسدانوں نے ایسی ایجاد کی ہے (دیکھیے تصویر نمبر۱) جس سے پانی کو A ریزروائر میں پہلے بھرا جاتا ہے جب سمندر کا پانی گرنے لگتا ہے تو A ریزروائر کا پانی B میں ٹربائن کے ذریعہ جاتا ہے اور بعد
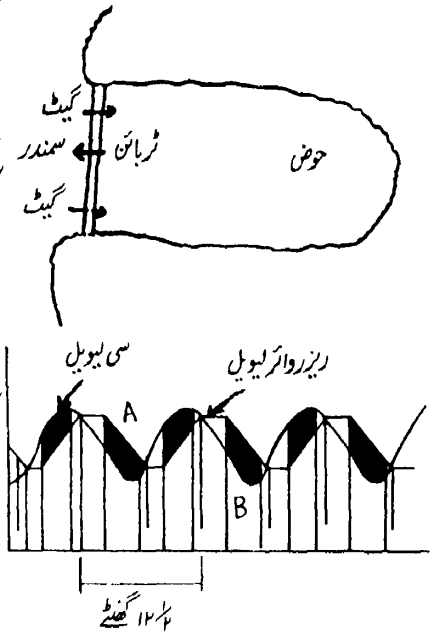
شکل نمبر۱: دو طرفہ جنریشن آپریشن سائیکل
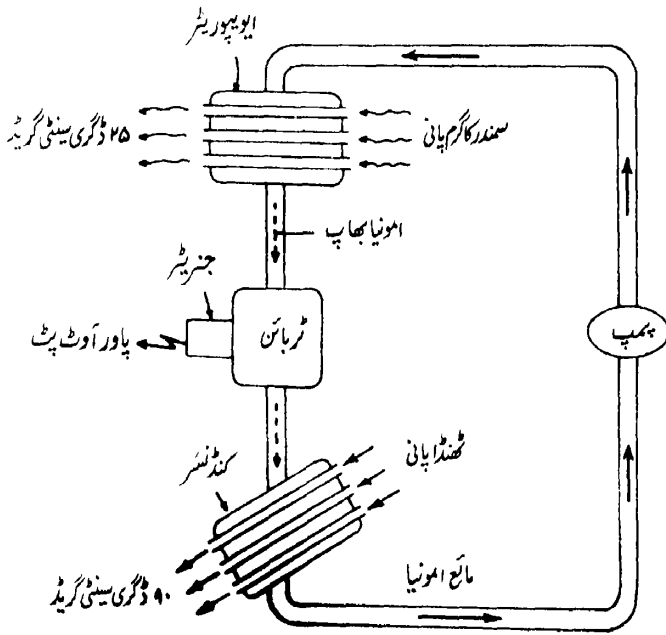
میں وہاں سے باہر نکلتا ہے جیسے ہی پانی اُوپر چڑھتا ہے A میں پہنچتا ہے اور اس طرح پانی کا بہنا برابر لگا رہتا ہے جس سے توانائی برابر پیدا ہوتی رہتی ہے۔ ہندوستان کے ٹراپکی خطے میں کچھ کی کھاڑی اس طرح کی توانائی پیدا کرنے کے لیے موزوں بتائی جاتی ہے چوں کہ ٹائڈل پاور ایک مستقل اور تجدیدی ذریعہ ہے اس لیے یہ تیل اور کوئلے جیسے ذرائع سے کہیں بہتر اور کفایتی ثابت ہوگا۔

۲۔ سمندر کی حرارتی توانائی (OTEC)

شمسی شعاعیں جب سمندر کی اوپری سطح پر پڑتی ہیں تو اپنی حرارت سے اسے گرم کر دیتی ہیں۔ چونکہ شعاعیں پانی کے اُوپری حصّے تک ہی رہ جاتی ہیں اس لیے صرف سمندر کی سطح کا پانی گرم ہو پاتا ہے اور نیچے کا پانی ٹھنڈا ہی رہتا ہے۔ اس طرح سمندر کے سطحی اور گہرے پانی کے درجۂ حرارت میں ۲۰ سے ۳۰ ڈگری سینٹی گریڈ کا فرق ہوتا ہے جس سے توانائی پیدا کی جاسکتی ہے۔ ایک فرانسیسی سائنسداں ڈی۔ آرسونوال نے سب سے پہلے ۱۸۸۱ء میں اِس تجویز کو پیش کیا تھا جو آج ممکن سی لگنے لگی ہے۔

اوٹک ایک ایسا سسٹم ہے جس کے ذریعہ سمندر کی حرارتی توانائی کو برقی توانائی میں تھرموڈائنمک کے اُصول پر بدلا جاسکتا ہے۔ اوٹک کا طریقۂ عمل آسان ہے۔ اس میں امونیا جیسے مائع کو ایک پائپ میں پمپ کیا جاتا ہے جو سمندر کے گرم پانی کے درجۂ حرارت سے تبخیر میں بدلتا ہے جیسے دوسرے پائپ کے ذریعے سمندر کے ٹھنڈے پانی میں لے جایا جاتا ہے جہاں ٹھنڈک پا کر یہ پھر مائع میں تبدیل ہو جاتا ہے امونیا کے ویپر (Vapoun) کو اگر دوسرے پائپ سے لے کر ٹربائن سے گذارا جائے تو توانائی پیدا کی جاسکتی ہے۔ امونیا کے علاوہ دوسرے مائع اور سمندر کا پانی بھی استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔ اوٹک کے لیے دو طریقے درکار ہیں۔

(الف) کلوزڈ رنکائن سسٹم
(Closed Rankine System)

اس سسٹم کا ردِّ عمل تصویر نمبر ۲ میں دکھایا گیا ہے۔ بہت حد تک یہ سسٹم ریفریجریشن سے ملتا جلتا ہے جو Reverse میں کام کرتا ہے۔ اس سسٹم میں مائع امونیا یا پروپین کا استعمال کیا جاتا ہے جو بہت ہی کم درجۂ حرارت پر بھاپ بن جاتی ہے۔ پہلے مائع امونیا کو ایک پائپ کے ذریعے اس جگہ بھیجا جاتا ہے جہاں پر

شکل نمبر۲: کلوزڈ رنکائن سسٹم

مندر کا گرم پانی ہوتا ہے۔ اس کی گرمی سے مائع یس میں تبدیل ہوجاتا ہے جسے ایک پائپ کے ذریعے وسری جگہ بھیجا جاتا ہے جہاں اِسے ٹربائن سے کالتے ہیں۔ جب یہ گیس ٹربائن میں پھیلتی ہے تو پنے دباؤ سے ٹربائن کو چلاتی ہے جس کا سلسلہ جنریٹر ے لگا ہوتا ہے۔ اس طرح جنریٹر چلنے لگتا ہے۔ مد میں امونیا گیس دوسرے پائپ سے نکل کر ایک نڈنسر سے گزرتی ہے جہاں ٹھنڈک کی وجہ سے یس پھر مائع میں تبدیل ہوجاتا ہے جس کا استعمال وبارہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ پلانٹ چلتا ہتا ہے۔

ب) اُوپن رنکائن سسٹم
(Open Rankine System

اس سسٹم کا طریقۂ عمل پہلے والے سے ھوڑا الگ ہوتا ہے۔ اس سسٹم میں کسی مائع ی جگہ سمندر کا کھارا پانی ہی استعمال میں یا جاتا ہے۔ اس لیے لاگت میں کمی آجاتی ہے۔ جیساکہ تصویر نمبر ۳ میں دکھایا گیا ہے، مندر کا سطحی گرم پانی عمل تبخیر میں لایا جاتا ہے جس سے پانی بھاپ بن کر پریشر بناتا ہے جو ٹربائن کو چلاتا ہے ٹربائن سے جنریٹر چلتا ہے جیساکہ بیان کیا جاچکا ہے۔ اس طرح توانائی پیدا ہوتی ہے۔ دوسری طرف بھاپ ایک پائپ سے نکل کر کنڈنسر میں جاتی ہے اور وہاں کی ٹھنڈک سے دوبارہ پانی میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ اس پانی سے کھارا پن (سالٹ) الگ ہوجاتا ہے اور یہ دوسرے روزمرّہ کے کاموں میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس سسٹم سے توانائی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ سمندری پانی کا کھارا پن بھی دُور کیا جاسکتا ہے۔

حالاں کہ اس طرح کا کوئی پلانٹ ابھی زیر عمل نہیں ہے لیکن اس توانائی کو استعمال میں لانے کے لیے بہت سے سیمینار اور سمپوزیم ہوچکے ہیں۔ بہت سے ممالک نے اس کی طرف اہم قدم بھی اُٹھائے ہیں۔ اس توانائی کے بہت سے فوائد ہیں مثال کے طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اُوٹک سے کسی ماحولیاتی یا دوسری طرح کی آلودگی کے پیدا ہونے کا امکان نہیں ہے، توانائی پیدا کرنے کا یہ سلسلہ وار ذریعہ ہے جسے دوسرے کام جیسے ڈی سیلی نیشن کے ساتھ ساتھ عمل میں لایا جاسکتا ہے۔ بات یہیں تک محدود نہیں۔ اس توانائی کو بحری کانکنی جیسے وسیع کارنامے کو انجام دینے میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اُوٹک میں گہرے سمندر کے جس ٹھنڈے پانی کا استعمال کیا جاتا ہے وہ پانی اپنی کیمیائی خاصیت رکھتا ہے جس سے مچھلی کی غذا پیدا کرکے مچھلی کی پیداوار کو بڑھایا جاسکتا ہے۔

انھیں فوائد کو دیکھتے ہوئے امریکہ نے جزیرہ ہوائی کے ساحل پر ایک پلانٹ لگانے کا منصوبہ بنایا ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ ہندوستان کے پچھمی اور پوربی ساحل کا دکھنی حصّہ اُوٹک کے لیے موزوں بتایا جاتا ہے (دیکھیے تصویر نمبر ۴) اور یہاں ۲۵ سے ۵۰ میگاواٹ تک کا پلانٹ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی دوسرے ٹراپکی حصّے ہیں جہاں اُوٹک لگایا جاسکتا ہے خاص کر ایسے جزیروں پر جہاں عام طور پر توانائی پیدا کرنا مشکل ہو۔ ویسے تو اُوٹک ایک قابلِ عمل طریقہ ہے پھر بھی اس میں دشواریاں اور پیچیدگیاں ہیں جن کو حل کرنا آسان نہیں۔

۳۔ لہری توانائی (WAVE ENERGY)

سمندر سے لہروں کا اُٹھنا اور ڈوبنا ایک سلسلہ وار خود کار عمل ہے جو پانی کو برابر حرکت میں رکھتا ہے۔ سمندر سے اُٹھنے والی یہ لہریں ہوا سے پیدا ہوتی ہیں اور ان میں بکثرت توانائی پائی جاتی ہے۔ ایسا اندازہ ہے کہ ایک ۴ میٹر اُونچی لہر سے قریب ۴ر۵ ہارس پاور کی توانائی پیدا ہوسکتی ہے اور اگر حساب

تصویر نمبر ۳: اُوپن رنکائن سائیکل

تصویر نمبر ۴: ہندوستان کے دونوں، پچھمی اور پوربی ساحل پر درجۂ حرارت کی پروفائل جو اوٹک (OTEC) کے لیے بنائی جاتی ہے
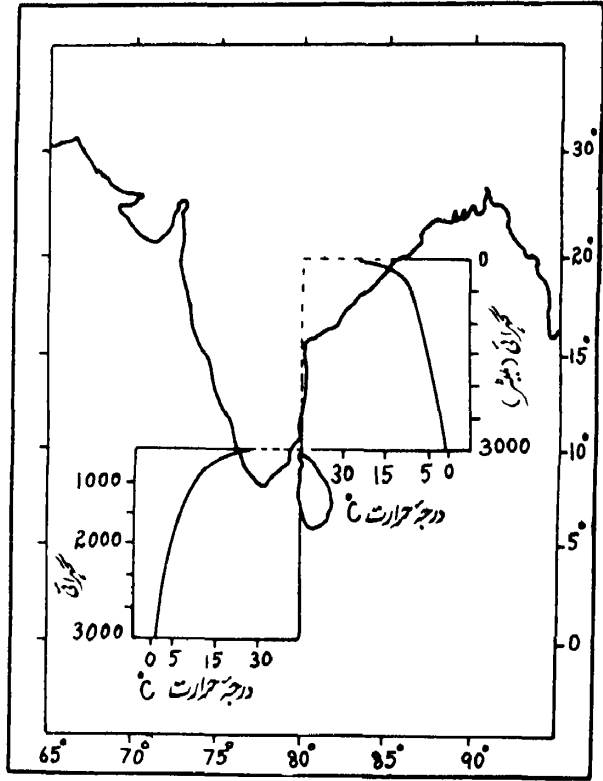
لگایا جائے تو ۲۸۰۰۰ ہارس پاور کی توانائی ایک میل لمبی لہر سے پیدا کی جاسکتی ہے۔ اس توانائی کو حاصل کرنے کے لیے دُنیا کے کئی ممالک نے تجربہ کیا ہے اور ایسا خیال ہے کہ دُنیا کی سمندری لہروں سے قریب $۲٫۵ \times ۱۰^{۱۲}$ واٹ توانائی پیدا کی جاسکتی ہے۔ لہروں کے لگاتار چلنے سے ہی توانائی بنتی ہے جس سے برقی توانائی پیدا ہوگی۔

بکثرت پائی جانے والی اس توانائی کو بڑے پیمانے پر پیدا کرنے کے لیے تفصیلی تحقیقات کی جارہی ہیں اور کچھ ایجادات بھی ہوتی ہیں جنھیں تجربات کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔ دوسری بحری توانائی کی طرح اس توانائی سے بھی کسی طرح کی آلودگی کے پیدا ہونے کے امکانات نہیں ہیں۔ لہری توانائی ایک متبادل توانائی ہے جس کا استعمال خاص کر اُن جزیروں پر جہاں پاور پلانٹ لگانا ممکن نہ ہو، کیا جاسکتا ہے۔ لہری توانائی پیدا کرنے کے لیے جو تجربات تحقیق اور تفتیش کے بعد کیے گئے ہیں ان میں کاکریل رافٹ (Cockrell raft) اور سالٹرس ڈک (Salters Duck) اہمیت رکھتے ہیں۔

کاکریل رافٹ: جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس سسٹم کو سَر کرسٹوفر کاکریل نے سب سے پہلے ۱۹۷۲ء میں تحقیقات کے بعد دریافت کیا جیسا کہ تصویر نمبر ۵ میں دکھایا گیا ہے۔ اس میں سلسلہ وار فلوٹ (Float) پانی کی سطح پر ایک پُروفائل (Profile) میں لگائے جاتے ہیں اور ان سب کو ایک ہائڈرالک پمپ سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ پانی کی لہروں کے ساتھ ساتھ یہ فلوٹ رُوٹیٹ کرنے لگتے ہیں اور ہائڈرالک پاور پیدا کرتے ہیں جسے برقی توانائی میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

سالٹرس ڈک: لہری توانائی کو استعمال میں لانے کے لیے جتنی ایجادیں ہوئی ہیں ان میں اسے سب سے آسان سمجھا جاتا ہے (دیکھیے تصویر نمبر ۶)۔ اسٹیفن سالٹر نے اس کی ایجاد کی جس میں ایک خاص طرح کے فلیپ کا استعمال کیا جاتا ہے جو دیکھنے میں تیرتے ہوئے بطخ جیسے لگتے ہیں۔ یہ فلیپ (Flap) پانی کی سطح پر لہروں کے ساتھ ساتھ برابر حرکت اور جنبش کرتے رہتے ہیں اور لہروں سے ٹکرا کر ان کی توانائی کو جذب کرلیتے ہیں۔ یہ توانائی ٹربائن کو چلنے میں مدد

تصویر نمبر ۵: کاکریل رافٹ سسٹم

تصویر نمبر ۱۶ : سالٹرس ڈک سسٹم

دیتی ہے جس سے برقی توانائی پیدا ہوسکتی ہے۔

بحری توانائی کی ایک اور قسم

توانائی کی ایک بڑی قسم دریا کے میٹھے پانی اور سمندر کے کھارے پانی کے ملنے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ دو طرح کے پانی الگ الگ سالٹ رکھنے کی وجہ سے ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں اور ان کے آسماٹک پریشر (Osmotic Pressure) میں فرق ہوتا ہے۔ پانی کم گاڑھے پن سے زیادہ گاڑھے پن کی طرف آسماٹک پریشر کی وجہ سے جاتا ہے۔ پانی کے اس بہاؤ سے زیادہ گاڑھے پانی کا لیول (Level) اُوپر چڑھے گا اور اُس وقت تک چڑھتا رہے گا جب تک اس کے چڑھاؤ کا پریشر اور آسماٹک پریشر دونوں برابر نہ ہو جائیں۔ اس طرح اُوپر چڑھا ہوا پانی کسی ٹربائن سے گزارا جائے تو توانائی پیدا ہوسکتی ہے۔ اس طرح کھارے پانی سے پیدا ہونے والی توانائی بے پناہ ہے جس کا استعمال دوسری توانائی کی طرح کیا جاسکتا ہے۔ سمندر میں پانی کی تیز لہریں (Current) کافی رفتار سے چلتی ہیں جو توانائی سے بھری ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر کیوروشیو کرنٹ (Kuroshio Current) اور کیلیفورنیا کرنٹ (California Current) سے توانائی پیدا کرنے کے لیے ایک ۵ر۷ امیٹر لمبے بارج (Barge) کا استعمال کیا جارہا ہے جس سے KW 5 تک کی توانائی پیدا ہونے کی اُمید کی جارہی ہے۔ ان سب کے علاوہ سمندر نباتات اور حیوانات کا بھی بہت بڑا بھنڈار ہے جن کا استعمال توانائی پیدا کرنے میں کیا جاسکتا ہے۔ بحری نباتات میں کیلپ (Kelp) ایسی گھاس ہے جس سے کیلیفورنیا (California) میں قدرتی گیس پیدا کی جاتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بحری توانائی مستقل توانائی کا ذریعہ بن سکتی ہے یا نہیں۔ اگر ہم اس ناقابلِ یقین اور بے پناہ متبادل توانائی کے ذرائع کو کسی طرح عمل میں لاسکیں تو بے شک یہ ایک مستقل توانائی بن سکتی ہے۔ توانائی کی خود کفالتی ہندوستان جیسے ملک کے لیے بہت ضروری ہے۔ توانائی کے دوسرے ذرائع جیسے تیل اور کوئلہ ختم ہونے والے ہیں جس کا خطرہ سب کو محسوس ہونے لگا ہے۔ اس لیے یہ بہتر ہوگا کہ متبادل توانائی کے ذرائع ڈھونڈے جائیں۔ سمندر ایسی توانائی کا بے پناہ ذخیرہ ہے۔ وقت آرہا ہے اب ہمیں کنونشنل (Conventional) ذرائع سے ہٹ کر سمندر کی طرف جانا ہوگا۔

ظہیر غازی پوری

ہر غزل ہر شعر اپنا استعارہ آشنا
فصلِ گل میں جیسے شاخِ گل شرارہ آشنا

خون تھوکا، دل جلایا، نقدِ جاں قربان کی
شہرِ فن میں، میں رہا کتنا خسارہ آشنا

کھو گیا اپنی نظر سے اَن کہے قصّے بھی وہ
بزمِ حرف و صوت میں جو تھا اشارہ آشنا

اپنے ٹوٹے شہپروں کے نوحہ گر تو تھے بہت
دشتِ فن میں تھا نہ کوئی سنگِ خارا آشنا

عمر بھر بپھری ہوئی موجوں سے جو لڑتا رہا
وہ سمندر تو ازل سے تھا کنارہ آشنا

آفس سپرنٹنڈنٹ، بی۔ایس۔آر۔ٹی۔ کارپوریشن، ہزاری باغ ۸۲۵۳۰۱ (بہار)

رونق نعیم

(۱)

گماں حدِ نظر تک کیا تھا لیکن کیا نکل آیا
جدھر دریا کی موجیں تھیں اُدھر صحرا نکل آیا

یہ میری دُور بینی موجبِ آشوبِ جاں ٹھہری
کہ ہنگامے کی تہ میں ایک سنّاٹا نکل آیا

گھنے اشجار تھے اور چھاؤں کی پہچان مشکل تھی
اور اُس پر آسماں کے مُنہ سے اک شعلہ نکل آیا

تو کیا آبِ رواں سے پیاس اپنی بُجھ نہیں سکتی
یہ کیسا سلسلہ آخر سرابوں کا نکل آیا

اب اپنی چشمِ حیرت سے میں پوچھوں بھی تو کیا پوچھوں
وہ کیسا آئینہ تھا کون سا چہرہ نکل آیا

بھڑک اُٹھی تھی ایسی آگ سب کچھ جل گیا رونق
اچانک یہ کدھر سے ابر کا ٹکڑا نکل آیا

(۲) (نذرِ مومن)

تو دکھاتا تھا مجھ کو میرا مُنہ
آئینے! تیرا کیوں ہے میلا مُنہ

سارا منظر ہے خون آلودہ
لوگ اب دیکھیں اپنا اپنا مُنہ

منصفی پُوچھتی ہے کس کا ہے
کاغذی پیرہن میں کالا مُنہ

کیا بڑی بات زیب دیتی ہے
اُس کے مُنہ سے ہے جس کا چھوٹا مُنہ

میں نے ہی اُس کو مُنہ لگایا تھا
اُس کا مُنہ تھا کہ میرے لگتا مُنہ

بات رونق غزل کی ہوتی ہے
اور غزل دیکھتی ہے میرا مُنہ

نہرو روڈ، ڈاکخانہ رانی گنج ۷۱۳۳۴۷ (مغربی بنگال)

آپ نے پنجاب کی وہ لوک کہانی ضرور پڑھی سُنی ہو گی جس میں دو بھائیوں کے نصیبوں کا ذکر ہے۔

بڑے بھائی کو زندگی کی ہر نعمت کا سُکھ اور خوشی حاصل ہے۔ وہ مٹّی کو بھی چُھوتا ہے تو وہ سونا بن جاتی ہے لیکن چھوٹا بھائی ہر چیز کو ترستا رہتا ہے اور اگرچہ وہ زیادہ محنت کرتا ہے مگر اس کی پوری نہیں پڑتی وہ اُداس رہتا اور اکثر اکیلے میں بیٹھ کر سوچتا ہے کہ آخر اس کا دامن خوشیوں سے کیوں خالی ہے اور اس کے بھائی کے کیوں پَو بارے ہیں۔

ایک سرد اور تاریک رات میں وہ بھوکا پیاسا رات بھر کنوئیں کی گادھی پر بیٹھا کھیتوں کو پانی دینے کے لیے بیل ہانکتا رہتا ہے مگر رات کے تیسرے پہر اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ پانی اس کے اپنے کھیتوں کے بجائے اس کے بھائی کے کھیتوں کو سیراب کرتا رہا ہے۔ اسے صدمہ اور تعجب ہوتا ہے مگر پھر اسے اندھیرے میں چند سائے سے حرکت کرتے نظر آتے ہیں دریافت کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ وہ اس کے بڑے بھائی کے نصیب ہیں جو اس وقت بھی جب وہ اپنے گھر میں آرام دہ بستر پر میٹھی نیند سویا ہوا ہے جاگ رہے ہیں اور اس کے کھیتوں اور مفادات کی نگرانی کر رہے ہیں وہ ان سے اپنے نصیبوں کے بارے میں پوچھتا ہے تو وہ اسے بتاتے ہیں کہ اس کے نصیب دریا کے اُس پار پہاڑ کی ایک غار میں لمبی تان کر سو رہے ہیں اور اس وقت تک نہیں جاگیں گے جب تک وہ خود وہاں پہنچ کر انھیں نہیں جگائے گا۔

اگلے روز وہ اپنے سوتے ہوئے نصیبوں کو جگانے کے لیے گھر سے نکلتا ہے۔ آدمی کو سوئے ہوئے بخت جگانے اور ارمانوں کی ہیر کا دیدار کرنے کے لیے ہمیشہ تخت ہزارہ چھوڑنا اور مشکلات کے دریا بیلے عبور کرنا پڑتے ہیں — وہ طویل اور دشوار مسافتیں طے کرتا ہے۔ راستے میں کئی انوکھے واقعات پیش آتے ہیں ایک بادشاہ سے ملاقات ہوتی ہے جس کے شہر کے کسی نہ کسی کونے میں ہر وقت آگ بھڑکتی رہتی ہے بادشاہ کہتا ہے جب تمھارے نصیب جاگ پڑیں تو ان سے اس آگ کا سبب ضرور پوچھنا اور یہ بھی معلوم کرنا کہ اس پر کیسے قابو پایا جا سکتا ہے ایک درخت کو دیکھتا ہے جس کا پھل نہایت تلخ ہے درخت کہتا ہے اے نیک دل کسان اپنے نصیبوں سے پوچھنا مجھ غریب کو ایسا کڑوا پھل کیوں لگتا ہے کہ ہر کوئی چکھ کر تھُوہ تھُوہ کرتا چل دیتا ہے۔

پھر ایک بڑی مچھلی اسے اس شرط پر دریا پار کرنے میں مدد دیتی ہے کہ وہ اپنے بختوں سے معلوم کرتا آئے کہ ٹھنڈے ٹھار پانی میں رہتے ہوئے بھی اس کا اندر کیوں جلتا رہتا ہے۔

اس کے نصیب اس کے غار میں پہنچتے ہی جاگ پڑتے اور اُٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں وہ ان سے اپنے اور دوسروں کے سوالوں کے جوابات پوچھتا ہے۔ وہ بتاتے ہیں بادشاہ کی بیٹی کی بہار سی جوانی ڈھل رہی ہے مگر بادشاہ نے اس کا اب تک بیاہ نہیں کیا جب وہ اس کی شادی کردے گا تو شہر کی آگ بجھ جائے گی۔ درخت کا کڑوا پھل اس لیے لگتا ہے کہ اس کی جڑ میں ایک قیمتی خزانہ مدفون ہے جب اسے وہاں سے ہٹا دیا جائے گا تو درخت کے پھل کی کڑواہٹ دور ہو جائے گی۔ مچھلی کے بارے میں نصیب بتاتے ہیں کہ اس کے پیٹ میں دو قیمتی لال ہیں جن کی وجہ سے اس کا اندر جلتا رہتا ہے اگر وہ انھیں اگل دے تو اسے چین آ جائے گا۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ میں بھی اپنے سوتے ہوئے نصیبوں کو جگانے کے لیے دُور دراز کے سفر پر نکلا ہوا دیہاتی کسان ہوں۔ گھر سے نکلتے وقت میرے پاس اپنے کچھ سوالات تھے جن کے جوابات میں اپنے نصیبوں کو جگا کر پوچھنا چاہتا تھا مگر راستے میں کتنے ہی آدمی، پرندے درخت اور جانور اپنے اپنے سوالات میرے دامن میں ڈالتے گئے اور میرا بستہ بھاری ہو گیا۔

کہانی کے کسان میں اور مجھ میں فرق صرف

پچھلے دنوں پاکستان کے مشہور افسانہ نگار جنابِ منشا یاد دہلی آئے تھے۔ اُردو اکادمی، دہلی نے ان کے اعزاز میں ایک استقبالیہ ترتیب دیا تھا جس میں موصوف نے اپنا یہ مضمون اور کہانی پڑھی تھی اور ازراہِ عنایت یہ دونوں چیزیں "ایوانِ اُردو دہلی" میں اشاعت کے لیے دے گئے تھے۔ ہم موصوف کے دلی شکریے کے ساتھ انہیں اپنے پڑھنے والوں تک پہنچا رہے ہیں۔

یہ ہے کہ اس نے ہمت سے کام لے کر بالآخر آزمائش کا دریا پار کرلیا اور اس کے نصیب جاگ اٹھے مگر میرا سفر ختم ہونے میں نہیں آتا۔ شاید میں راستے سے بھٹک گیا ہوں۔ میں جتنا سفر طے کرتا ہوں سوالوں کی تعداد اور بڑھتی جاتی ہے اور جواب کسی ایک کا بھی نہیں ملتا۔ اور اب تو مجھے اپنے سوالات بھول گئے ہیں اب دوسروں کے سوالات ہی میرے اپنے سوالات بن گئے ہیں جو مجھے دن رات گھیرے رکھتے ہیں۔ میں کہیں منزل پر پہنچوں کسی کنارے سے لگوں تو سوالوں کے ٹھیک جوابات ملیں مگر میں تو ابھی تک راستے کے گرد وغبار میں بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے اور باتیں کرتے ہوئے میری رُوح میں کسی خیال کی چھلتر سی چبھ جاتی ہے۔ ایک سائرن سا بول کر اور کوئی کہانی سُجھا کر چُپ ہو جاتا ہے پھر میرے اندر سوچوں کی گراری سی پھرنے لگتی ہے خراس سا چلنے لگتا ہے کہانی میرے ساتھ کئی کئی روز و شب لکن میٹی کھیلتی رہتی ہے میں ٹپک کر بھی نہیں ٹپکتا۔ کہانی لکھ کر بھی میبھٹ میرے ہی سر رہتی ہے۔ البتہ کچھ دیر کے لیے سانس لینے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے مگر پھر لوک کہانی کی مچھلی کی طرح ٹھنڈے میٹھے پانی میں رہتے ہوئے بھی میرا اندر جلنے لگتا ہے۔ اور جب جلن حد سے بڑھ جاتی ہے تو میں لعل اگلنے کی کوشش کرتا ہوں مگر اندر لعل ہوں تو باہر آئیں صرف کچھ خالی سیپیاں، کوڑیاں اور روڑ کنکر نکلتے ہیں مگر تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی سکون مل جاتا ہے۔

میں کہانیوں کے اس شہر کا باسی ہوں جو میرے اندر آباد ہے۔ اس میں بھی ہر وقت کہیں نہ کہیں آگ سلگتی اور دُھواں اٹھتا رہتا ہے ایک طرف آگ بجھتی ہے تو دوسری طرف دُہائی مچ جاتی ہے۔ مگر اس آگ کی صورت مختلف ہے یہ تخلیقی کرب کی آوی ہے جو ہر وقت چڑھی رہتی ہے ایک پُور اُترتا ہے تو دوسرا چڑھ جاتا ہے۔ مجھے بڑی فکر رہتی ہے کوئی برتن بھانڈا پلاّ نہ رہ جائے۔ کچّے اور پکّے برتنوں کے بارے میں آپ کو علم ہے کہ وہ جلد گھر جاتے ہیں اور اپنے ساتھ صادق جذبوں کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔ میں ڈوبنا نہیں چاہتا اسی لیے میں نے آوی پر چڑھے رہنا قبول کیا ہے۔

○

دائم شیدا

انھیں شک ہے کہ میں نے اپنا عقیدہ بدل لیا ہے حالاں کہ ایسا بالکل نہیں ہے میں نے صرف گوشت خوری ترک کی ہے۔

دُنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو گوشت نہیں کھاتے یعنی ویجی ٹیرین ہیں ان کے پاس گوشت نہ کھانے کی اپنی اپنی وجوہات ہوں گی ہو سکتا ہے بعض لوگ کسی خاص عقیدے کی بِنا پر گوشت نہ کھاتے ہوں۔ بعض کو ڈاکٹر نے پرہیز بتایا ہو کچھ ایسے بھی ہوں گے جن کا نفسیاتی مسئلہ ہوگا مثلاً میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جس کا بچپن میں ایک بار زکام بگڑ گیا تھا اور اسے ہر چیز سے مردار کی بُو آتی تھی ایسے میں اسے گوشت کی یخنی پلائی گئی تو اسے قے ہوگئی کیوں کہ اسے اس میں سے مردار کی بدبُو آئی حالاں کہ یہ تو اس کے اپنے اندر پیدا ہوگئی تھی۔ مگر اس کا دل اس روز سے ہمیشہ کے لیے گوشت سے پھر گیا۔ لیکن میرا معاملہ بالکل مختلف ہے میں بچپن سے اب تک گوشت خوری کا شوقین رہا ہوں اور بھنا ہوا گوشت تو میری مرغوب ترین غذا رہا ہے۔ اور حالاں کہ خون میں یوا یسڈ کی مقدار زیادہ ہوجانے کی وجہ سے مجھے ڈاکٹروں نے کئی بار اس سے پرہیز بتایا اور اس کے نتائج سے آگاہ کیا مگر میں ان کی ہدایات پر کبھی پوری طرح عمل نہ کرسکا۔ مگر اب میں نے کچھ عرصے سے گوشت خوری بالکل ترک کردی ہے تاہم اس کی وجہ عقیدے کی تبدیلی نہیں ہے بلکہ اس کا عقیدے سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ میں عام طور پر اس کا ذکر اس لیے نہیں کرتا کہ شاید کسی کو یقین نہ آئے۔ لیکن اب میرا خیال ہے کہ مجھے اصل بات بتا ہی دینی چاہیے تاکہ میرے بارے میں کسی قسم کی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔

دراصل بات یہ ہے کہ مجھے بچپن ہی سے مختلف زبانیں سیکھنے کا شوق تھا اور میں نے چند ایک زبانیں سیکھیں بھی لیکن سچّی بات یہ ہے کہ میرا جانوروں اور وہ بھی بھیڑ بکریوں کی زبان سیکھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اسے بس اتفاق اور میری بدقسمتی ہی سمجھیے کہ میں یہ زبان بلا ارادہ سیکھ گیا۔ ہُوا یوں کہ ایک زمانے میں ہم گاؤں میں رہتے تھے جہاں ہمارا گھر تھا وہاں پچھواڑے میں بھیڑ بکریوں کا ایک باڑہ تھا۔ میں رات کو دیر تک سکول کا کام کرتا اور جاگتا رہتا اور بھیڑ بکریوں اور ان کے میمنوں کی آوازیں سنتا رہتا۔ دو ایک بار اندھیری رات میں بھیڑیا باڑے میں گھس آیا اور ایک آدھ بھیڑ اٹھا کر لے گیا جس کے بعد بھیڑ بکریاں اور میمنے ہر وقت ڈرے ڈرے اور سہمے سہمے رہنے لگے خصوصاً گرمیوں کی تاریک راتوں میں بھیڑیوں کے خوف سے بھیڑ بکریاں رات رات بھر ممیاتی رہتیں۔ میں لیمپ بجھا کر سونے کی کوشش کرتا مگر ان کی آوازیں اور سرگوشیاں مجھے سونے نہ دیتیں۔ پھر پتہ نہیں کیسے خود بخود ان کی زبان میری سمجھ میں آنے لگ گئی۔ رات بھر میمنے اس قسم کی باتیں کرتے رہتے۔

"ماں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ماں مجھے بھوک لگی ہے۔"

"ماں دن کب نکلے گا۔"

"ہائے مجھے سردی لگ رہی ہے۔"

اور ہر ماں کی طرح ان کی مائیں بھی انھیں جھوٹی سچّی تسلّیاں دیتی رہتیں۔

ایک دفعہ ابّا کو پتہ نہیں کیا بیماری لگ گئی۔ حکیم صاحب نے انھیں گولیاں دیں اور ہدایت کی کہ وہ ان کو بکری کے دودھ کے ساتھ ایک عرصہ تک استعمال کریں۔ کچھ روز تو ابّا پڑوس والوں سے دُودھ مانگتے رہے پھر انھوں نے دُودھ دینے والی ایک بکری خرید لی۔ جس کے ساتھ دو ننّھے منّے گل گتھنے میمنے بھی تھے۔ ایک کالا دوسرا ڈب کھڑبّا۔ اس طرح مجھے بکروں کے زیادہ قریب رہ کر ان کی زبان سیکھنے کا موقع مل گیا۔ میمنوں سے میری گہری دوستی ہوگئی میں اسکول سے واپس آکر دیر تک ان سے کھیلتا رہتا انھیں اپنے قاعدے اور کتابوں سے کہانیاں اور نظمیں پڑھ پڑھ کر سُناتا۔ شام کو انھیں اپنے ساتھ کھیتوں کھلیانوں میں لے جاتا اور ان کے لیے درختوں سے ٹہنیاں کاٹتا وہ درختوں کے پتّے کھاتے رہتے

منشایاد

۳۶۲ - ای، سٹریٹ ۷۵، جی ۶/۴، اسلام آباد

میں پہاڑے یاد کرتا رہتا۔ پتے کھاتے یا
گھاس چرتے اور پہاڑے یاد کرتے ہم آپس
میں باتیں بھی کرتے رہتے۔ رات کو وہ اپنی ماں کو
دن بھر کی سیر اور کھیل کود کی تفصیل بتاتے اور
دوڑنے، چھلانگیں لگانے، کھال اور گڑھے پھلانگنے،
بلند ٹیلوں اور جھاڑیوں پر چڑھنے میں ایک دوسرے
سے بازی لے جانے کی ڈینگیں مارتے۔

"میں بڑا ہوگیا ہوں"۔ ایک کہتا ـــــ
"نہیں میں اس سے بڑا ہوگیا ہوں۔"
دوسرا کہتا ـــــ

بکری ان کے ہوشیار اور بڑا ہونے کی
باتیں سُن کر اُداس ہوجاتی۔ اور کہتی ـــــ
"کاش تم ہمیشہ چھوٹے ہی رہو کبھی
بڑے نہ ہو۔"

ان دونوں کی سمجھ میں بالکل نہ آتا ماں
ایسا کیوں سوچتی اور کہتی تھی وُہ برا مناجاتے
اور دیر تک اس سے روٹھے رہتے۔ میں نے بھی
کبھی انھیں بتانا مناسب نہ سمجھا کہ ان کے بڑے
ہونے پر کس قسم کے حالات پیدا ہوسکتے ہیں۔

پھر ایک دن ڈب کھڑبا گم ہوگیا۔ ہم
نے بہت ڈھونڈھا مگر اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ بکری
کئی روز تک اسے یاد کرکے چلاتی اور ممیاتی رہی
میں اور کالا بھی اُسے یاد کرتے رہے پھر آہستہ آہستہ
بھول گئے۔

کالا اب اور بڑا ہوگیا تھا۔ اس کے سینگ
بڑے اور نوکیلے ہوگئے تھے اس کے جسم سے بڑے
بکروں جیسی بُو آنے لگی تھی بڑے بوڑھے اکثر اس
کا مُنہ کھول کر اس کے دانت دیکھتے۔ میرے ہم عمر
لڑکے اسے دیکھ کر ڈر جاتے حالاں کہ وہ کسی کو
کچھ نہیں کہتا تھا۔ میں اسے ساتھ لے کر گھومتا
رہتا۔ ہم ایک دوسرے کی زبان ہی نہیں اشارے
بھی سمجھتے تھے میں اسے جہاں بلاتا وہ دوڑ کر پہنچ
جاتا جس بات سے منع کرتا منع ہو جاتا۔ میں جدھر
جاتا وہ میرے پیچھے پیچھے آجاتا۔ مجھے دُور سے پہچان
لیتا۔ میری خوشبو سے مجھے جان لیتا۔ لیکن ایک روز
بڑا دلچسپ واقعہ ہوگیا۔

وہ میرے مغالطے میں شیقو نائی کے
پیچھے چل دیا۔ شیقو بے چارہ گھبرا گیا وہ جدھر جاتا
جس قدر تیز بھاگتا کالا بھی اس کے پیچھے دوڑتا
آتا خوف سے تھر تھر کانپتا شیقو بڑی مشکل سے
جان بچا کر گھر پہنچا۔ اس کی ماں شکایت لے کر
آئی کہ آپ کے بکرے نے مارنے کے لیے دور تک
میرے بیٹے کا پیچھا کیا ہے۔ شیقو کی ماں چلی گئی تو
میں نے بکرے سے استفسار کیا اور یہ جان کر
میری ہنسی چھوٹ گئی کہ شیقو نے اس روز اسی
رنگ کی چادر اوڑھی ہوئی تھی جیسی میری چادر
تھی۔ اور کالا یہ سمجھتا رہا کہ وہ میرے پیچھے بھاگ
رہا ہے۔ بکرے نے بھی اس واقعے پر ہنسنا چاہا
مگر کوشش کے باوجود نہ ہنس سکا اور دیر تک
اس بات پر اداس رہا کہ اسے ہنسنا نہیں آتا تھا
لیکن اگلے روز یہ معلوم کرکے کہ اس کی ماں سیم
نالے کے پُل سے گر کر زخمی ہوگئی تھی اور اسے
ذبح کیا جارہا تھا ہم دونوں سخت پریشان ہوئے۔
میں اسے دیر تک تسلی دیتا اور اس کا دل بہلانے
کی کوشش کرتا رہا لیکن بعد میں جب اسے پتہ چلا
کہ میں نے بھی اس کی ماں کا گوشت مزے لے لے
کر کھایا ہے تو وہ مجھ سے بدکنے لگا۔ اور کئی روز
تک میرے قریب آنے سے ہچکچاتا رہا۔ میں اسے
پیار کرنے لگتا تو وہ سمجھتا میں دانتوں سے اس کی
بوٹی نوچنے لگا ہوں۔ میں نے اُسے سمجھانے کی
کوشش کی کہ میں آدمی ہوں بھیڑیا نہیں۔ ہم
آدمی زندہ جانوروں کو نہیں کھاتے۔ کھانے سے
پہلے انھیں مار لیتے ہیں کچا نہیں چبا جاتے،
چبانے سے پہلے آگ پر بھون لیتے ہیں پھر آہستہ آہستہ
کچھ دنوں بعد اس کا خوف کم ہوگیا اور وہ مجھ
پر پہلے کی طرح اعتماد کرنے لگا۔

میں نے پرائمری کا امتحان پاس کر لیا اور
شہر کے ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا تو وہ بہت
اداس ہوگیا۔ مجھے بھی اس سے بچھڑنے کا بہت
افسوس تھا مگر مجبوری تھی۔

بڑی عید کی چھٹیوں میں میں خوش خوش
گاؤں واپس آیا لیکن یہ جان کر میری ساری
خوشی کافور ہوگئی کہ اس بار عید پر اسی کی
قربانی دی جارہی ہے میں نے گھر میں ہر ایک کی
منت سماجت کی کہ وہ میرے کالے کو چھوڑ دیں
اور قربانی کے لیے کوئی دوسرا بکرا یا دُنبہ خرید
لیں مگر میری ایک نہ چلی۔ کالے کو بالکل پتہ نہیں
تھا کہ اس کے ساتھ کیا بیتنے والی ہے میں نے
بھی اسے پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا وہ خوش
خوش میرے ساتھ دوڑتا پھرتا۔ چھلانگیں لگاتا۔
اُونچے پیڑوں کے تنوں سے چمٹ کر پتے نوچتا اور
میری ٹانگوں سے سینگ رگڑ رگڑ کر اظہارِ محبت
کرتا۔ مگر جب اسے لٹا کر چھری چلا رہے تھے اس
نے گھبرا کر مجھے آوازیں دینا شروع کردیں۔ میں
اسے ذبح ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا اس لیے
اپنے کمرے میں چھپ گیا تھا مگر اس کی چیخ و پکار
مجھے سنائی دے رہی تھی شاید اس کا خیال تھا
کہ میں آکر اسے بچالوں گا اس لیے وہ آخری وقت
تک مجھے پکارتا اور داد فریاد کرتا رہا مگر میں آنسو
بہانے کے سوا کچھ نہ کرسکا۔ میرا خیال تھا میں
احتجاج کے طور پر کم از کم اس کا گوشت نہیں
کھاؤں گا مگر جب گوشت پک کر میرے سامنے
آیا تو اس کی خوشبو سونگھ کر میرے مُنہ میں پانی

بھر آیا اور میں نے سب کچھ بھول کر بوٹیاں کھانا شروع کر دیں۔

اس کے بعد میں نے کبھی کسی بکرے یا پالتو جانور سے دوستی نہیں کی۔ ہر بقرعید پر ہمارے ہاں دُنبہ یا بکرا آتا رہا اور ذبح ہوتا رہا لیکن میں کوشش کرتا کہ ان سے دوستی یا محبّت نہ ہو ورنہ زیادہ افسوس ہوتا ہے۔ حالاں کہ ابّا کا خیال تھا جانور سے جتنی زیادہ مانوسیت اور محبّت ہو اتنا ہی زیادہ ثواب مِلتا ہے لیکن میں کوشش کے باوجود خود میں اتنی ہمّت نہ پاتا۔ چنانچہ جب قربانی کا وقت آتا میں عید ملنے کے بہانے کسی رشتے دار یا دوست کے ہاں چلا جاتا اور اس وقت گھر آتا جب بکرا یا دُنبہ کٹ چکا ہوتا۔ ابّا کہتے تھے کہ اس سے ایمان کمزور پڑ جاتا ہے لیکن میں ایمان کو کمزور نہیں پڑنے دیتا تھا کٹے ہوئے بکرے یا دُنبے کو مزید کاٹنے، بوٹیاں چیرنے اور خویشوں اور درویشوں میں تقسیم کرنے میں ان کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ گھبراہٹ اور کمزوری کا اظہار میں صرف اسی وقت تک کرتا تھا جب تک بکرا یا دُنبہ زندہ ہوتا اور دیکھ، سُن، بول اور محسوس کر سکتا۔ ہاں مجھے سری سے بہت ڈر لگتا میں قصاب کی دُکان پر بھی بکرے یا دُنبے کی سری دیکھتا تو اس کی بے جان آنکھوں کا سامنا نہ کر سکتا مجھے ایسے لگتا جیسے وہ مجھ پر گڑی ہوں اور کچھ کہہ رہی ہوں۔ میری یہ کوشش بھی ہوتی کہ میں کسی بکرے کو پتہ نہ چلنے دوں کہ میں اس کی زبان جانتا ہوں۔ میں نے گھر والوں اور جاننے والوں سے بھی کبھی اس کا ذکر نہیں کیا کہ میں بکروں کی زبان جانتا ہوں لیکن ان کی زبان جاننے سے خاصی تکلیف دہ صورتِ حال پیدا ہوگئی تھی بعض اوقات مجھے لگتا میں اندر سے بکرا بنتا جا رہا ہوں۔

گھر والوں نے کئی بار اصرار کیا ہے کہ عید کی قربانی میں خود کروں اپنے ہاتھ سے بکرے کی گردن پر چھری چلاؤں کیوں کہ ایسا کرنا سُنّت ہے۔ مولوی صاحب نے بھی مجھے سمجھایا اور بتایا کہ ایسا کرنا اس لیے ضروری ہے کہ اللہ کی راہ میں خون بہانے کا جذبہ اور جرأت پیدا ہوتی ہے اور آدمی جہاد میں حصّہ لینے کی تربیت پاتا ہے لیکن میں کوشش کے باوجود ایسا نہ کر سکا۔ کیوں کہ ذبح ہونے سے پہلے بکرے جس طرح آہ و بکا کرتے ہیں اسے صرف میں ہی پوری طرح سُن اور سمجھ سکتا ہوں اور صرف مجھے ہی اس بات کا اندازہ ہے کہ کسی ہم زبان کو ذبح کرنا کتنا مشکل کام ہے یہ کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں — عام آدمی کسی ہم زبان اور ہم جنس کو قتل تو کر سکتا ہے ذبح نہیں کر سکتا اس کے لیے پیغمبر کا دل اور حوصلہ درکار ہوتا ہے انھیں بھی آنکھوں پر پٹی باندھنا پڑتی ہے۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ کاش مجھے بکروں کی زبان نہ آئی ہوتی اور میں اس قدر بُزدل نہ ہوتا۔ بہر حال اگر چہ اسے ایمان کی کمزوری پر محمول کیا جاتا تھا مگر میں نے تہیّہ کیا ہوا تھا کہ اپنے ہاتھ سے کسی جانور کو ذبح نہیں کروں گا لیکن پچھلے سال میں اپنے اس عہد پر قائم نہ رہ سکا اور یہیں سے خرابی کا آغاز ہوا۔

ہُوا یوں کہ بہت سی دُعاؤں اور منّتوں کے بعد میرے گھر میں اللہ کے فضل و کرم سے بیٹا پیدا ہو گیا۔ بہت خوب صورت اور بالکل میمنے کی طرح پیارا۔ ابّا نے فوراً عقیقے کے لیے دو بکرے منگوا لیے۔ شہر میں ایک عرصہ سے رہتے رہتے اب بکروں سے کبھی کبھار ہی ملاقات ہوتی تھی اور گفتگو سے تو میں خود بھی گریز کرتا تھا لیکن عقیقے کے دونوں بکرے کئی روز تک میرے کمرے کی کھڑکی کے قریب صحن میں بندھے رہے۔ خیال تھا کہ جمعرات کو عقیقہ کیا جائے لیکن آپا کو سُسرال سے آنے میں دیر ہو گئی شاید ان کا کوئی جیٹھ یا دیور بیمار تھا۔ اس دوران میں دونوں بکرے رات کو جگالی کرتے ہوئے عجیب و غریب گفتگو کرتے رہتے۔ پتہ نہیں انھیں کیسے اپنے انجام کی خبر ہو گئی تھی چھوٹا بہت زیادہ خوفزدہ تھا ایک رات کہنے لگا ——

"ذبح کس طرح کرتے ہیں؟"

"زمین پر لِٹا کر گردن پر چھری چلا دیتے ہیں۔" بڑے نے جواب دیا ——

"تکلیف تو بہت ہوتی ہوگی؟"

"ہاں میں نے ایک بار دیکھا تھا بڑی دیر تک جان نکلتی رہتی ہے۔"

"ذبح کیوں کرتے ہیں۔"

"کھانے کے لیے۔ اُن کے مُنہ میں بھی بھیڑیے کے دانت ہوتے ہیں۔"

"میری تو ڈر کے مارے ابھی سے جان نکلنے لگی ہے۔"

"ڈر تو مجھے بھی لگ رہا ہے۔"

"کیا دونوں کو ایک ساتھ ذبح کریں گے؟"

"شاید باری باری۔"

"پہلے کون ذبح ہوگا؟"

"تمھیں زیادہ ڈر لگتا ہے اس لیے پہلے میں۔"

"نہیں تمھیں ذبح ہوتے دیکھ کر تو میں اور بھی گھبرا جاؤں گا اس لیے پہلے میں۔"

"نہیں میں۔"

"نہیں میں۔"

"میں میں میں۔"

دیر تک میں ان کی باتیں سنتا رہا پھر اُٹھ کر کھڑکی بند کر دی مگر مجھے دیر تک نیند نہ آئی۔

اگلے روز چھٹّی کا دن تھا میں دیر سے سو کر

ٹھا دیکھا تو گھر میں دوپہر کے کھانے کی تیاریاں
ورہی تھیں۔ پیاز چھیلے جا رہے تھے، مسالہ پیسا
ا رہا تھا۔ تکّوں، کوفتوں اور ـــــ گوشت کا
ردگرام بن رہا تھا۔ والد صاحب شاید قصائی کو
انے گئے ہوئے تھے۔

کال بیل کی آواز سُن کر میں باہر گیا تو
روس کی مسجد سے دینی مدرسے کا طالب علم لڑکا
ھالوں کے بارے میں پتہ کرنے آیا تھا کہ اتری
بایا نہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ ابھی نہیں اتری
یں۔

"ابھی تک نہیں اتریں؟" اس نے حیرت
ے پوچھا

"ذبح کیے بغیر کیسے اتار سکتے ہیں؟"

"ہاں جی ـــ یہ تو ٹھیک ہے میں پھر
باؤں گا۔"

جب ذبح کرنے کا وقت آیا میں گھر سے نکل
ناچاہتا تھا لیکن ابّا نے میرے ہاتھ میں چُھری تھما
ی اور اصرار کیا کہ میں اپنے ہاتھ سے ذبح کروں
ں نے بہت کوشش کی مگر انھوں نے مجھے جانے
دیا

پہلے چھوٹے کو لایا گیا وہ تھر تھر کانپ رہا
ا اور خوف سے ممیا رہا تھا مجھے بہت ترس آیا
ں نے کہا

"پہلے بڑے کو لاؤ۔"

بڑے کو لایا گیا تو وہ زور زور سے چیخنے
پھر گھگھیاتی ہوئی آواز میں چھوٹے سے مخاطب

"مُنہ دوسری طرف کر لو چھوٹے۔"

چھوٹے کا اپنی جگہ کھڑے کھڑے پیشاب
ا ہوگیا۔

مجھے [illegible]

نے سوچا بڑے کو پہلے ذبح کیا تو وہ ہول سے مر
جائے گا چنانچہ میں نے کہا

"پہلے چھوٹے ہی کو لاؤ۔"

اصل میں میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ
پہلے کسے ذبح کروں۔ وہ چھوٹے کو لے آئے جب اُسے
اٹھایا گیا۔ تو اس نے زور زور سے ممیانا اور چیخنا
شروع کر دیا۔

"ہائے میں مرا ـــ ہائے میں مرا۔"

"حوصلہ کرو" میرے مُنہ سے اچانک نکل
گیا" تم اللہ کی راہ میں قربان ہو رہے ہو۔"

بکرے نے چونک کر گردن اٹھائی۔ اور مجھے
ایسی نظروں سے دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش
کر رہا ہو پھر اس نے ایک لمبا سانس لیا اور چھری
کے نیچے اپنی گردن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

میں نے اللہ اکبر کہہ کر چھری چلا دی اور
وہ حلال ہو گیا مگر جب کھانے کا وقت آیا تو
مجھے گوشت سے ویسی ہی بو آئی جیسی اپنے لولہو لود
بیٹے سے آتی تھی اور میں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ
لیا۔

اس کے بعد میں کوشش کے باوجود کبھی
گوشت کو چھو نہ سکا۔ اب انھیں شک ہے کہ میں
نے اپنا عقیدہ بدل لیا ہے حالاں کہ ایسا بالکل
نہیں ہے میں نے صرف گوشت خوری ترک
کی ہے۔

گوہر عثمانی

کبھی دل میں کبھی خوابوں کے نگر میں رہنا
نکہتِ گل کی طرح روز سفر میں رہنا

مُعجزہ یہ بھی ہے اس دور کے فنکاروں کا
آگ سے کھیلنا اور موم کے گھر میں رہنا

وقت سمتوں کے تعیّن کو بدل سکتا ہے
تم مرے ساتھ محبت کے سفر میں رہنا

فکرِ شاعر کے دریچوں سے گزر کر دیکھو
کتنا دشوار ہے لوگوں کی نظر میں رہنا

غرق ہونے سے بچے کتنے سفینے گوہر
کام آیا مری کشتی کا بھنور میں رہنا

توڑ کر دائرہَ فکر نکلتے کم ہیں
پیچ و خم سے جو اُلجھتے ہیں وہ چلتے کم ہیں
تجربہ کار ہیں بچّے بھی بزرگوں کی طرح
وہ بھی اب وعدہَ فردا سے بہلتے کم ہیں
لے کے بیساکھیاں چڑھتے ہیں جو اُونچائی پر
لڑکھڑا جاتے ہیں جب بھی تو سنبھلتے کم ہیں
دن میں جو امن کا مفہوم بتاتے ہیں ہمیں
وہ بھی اب رات گئے گھر سے نکلتے کم ہیں
راہ میں تم سے بچھڑنے کی شکایت بیکار
ہم سفر ایک ہی رفتار سے چلتے کم ہیں
جب سے سیّاروں کی رفتار سمجھ میں آئی
راستہ ہم بھی حیاتؔ اپنا بدلتے کم ہیں

سیّد حیات وارثی

فاروق شفق

تلوار پہ چلنے کا سلیقہ نہیں آیا
سچ ہے کہ اسے شہر میں جینا نہیں آیا

بارش میں بھی مُرجھائی ہوئی لگتی ہیں بیلیں
اس سال بھی ساون کا مہینا نہیں آیا

ہم تھک بھی گئے بُجھ بھی گئے تاروں کی صورت
شاخوں پہ کوئی پھول سنہرا نہیں آیا

ٹوٹے ہوئے تختے نہ وہ موجیں نہ کنارا
اچھا ہی ہوا راہ میں دریا نہیں آیا

تقسیم ہواؤں نے شفقؔ کر دیا ہم کو —
گھر لے کے ہمیں شام کو رستا نہیں آیا

...ینی کا گنبد

باؤلی کی مغربی دیوار پر جو عمارتیں ہیں،
...ن کا پچھلی قسط میں ذکر کیا جا چکا ہے، بائی کوکلای
...مقبرے سے پہلے ایک اور عمارت ہے، جسے
...نی کا گنبد کہا جاتا ہے یہ گنبد نو فٹ چار انچ
...تع ہے۔ گنبد کے اُوپر اور مقبرے کے اندر کاشی
...ری کا کام تھا۔ اب کاشی کاری کے ٹایل گر چکے
...) کہیں کہیں باقی ہیں۔ گنبد کے اندر بہ قول
...یر الدّین احمد خطِ نستعلیق میں اشعار لکھے ہوئے
...ے۔ پلاسٹر جھڑنے کی وجہ سے اب کوئی شعر باقی
...یں ہے۔ بشیر الدّین احمد صاحب کے زمانے میں
...عار کے جو الفاظ باقی رہ گئے تھے، اُن سے بہ قول
...یر الدّین احمد اندازہ ہوتا تھا کہ "کوئی جوان
...ب مر گیا تھا، جس کی وفات حسرت آیات کے
... والم کے اظہار میں یہ اشعار لکھے گئے تھے[1]۔"
...ن مسلم اور ہندو آثارِ قدیمہ کی فہرست (انگریزی)
...ں اطلاع دی گئی ہے کہ برج کی اندر کی دیوار پر
...سٹر پر فارسی کے دس شعر لکھے ہوئے تھے۔ لیکن
...ب (یعنی ۱۹۱۶ء) پانچ پورے ہیں۔ چھٹے شعر
...، پہلے مصرع کے چند لفظ باقی ہیں۔ ساتواں
...ر آٹھواں شعر بالکل غائب ہے۔ نویں شعر کا
...ہلا مصرع ہے اور دسواں شعر بالکل غائب ہے۔
...ہرست" کے مرتّب نے گنبد کے اندر یہ الفاظ پڑھے
...ے "از ماتمِ زہرا خون"۔ اور اس سے اندازہ لگایا
...ا کہ "زہرا" وہی خاتون ہیں، جن کا مزار برابر

کے مقبرے میں ہے۔[2] اب یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ عمارت کسی نوجوان کی موت پر تعمیر کی گئی تھی یا "زہرا" نامی خاتون کی یاد میں بنائی گئی تھی۔

اس گنبد کے نیچے ایک مسجد ہے جو اکیس فٹ نو انچ لمبی اور اکیس فٹ چوڑی ہے۔ اس کے تین دالان ہیں۔ شمالی دیوار میں ایک محرابی دروازہ ہے۔ اس گنبد اور مسجد میں کچھ عرصے پہلے تک رہائش تھی۔ جب عمارت کی حالت بہت خستہ ہو گئی اور جگہ جگہ سے ڈھنے لگی تو اسے خالی کرایا گیا۔ بعد میں کچھ لوگوں نے مسجد اور گنبد کی مرمّت کرا دی اور مسجد کے دروازوں پر تیغے لگا دیے۔ اس گنبد اور مسجد کے لیے راستہ باؤلی میں سے جاتا تھا۔ یہ راستہ ختم کر دیا گیا۔ آج کل باؤلی میں اتنا پانی ہے کہ میرے لیے گنبد میں جانا ممکن نہیں تھا۔[3]

باؤلی سے درگاہ میں جانے کا جو راستہ ہے، وہاں ایک کتبہ تھا، جس پر خطِ نسخ میں فارسی کے گیارہ اشعار کا ایک قطعہ کندہ تھا۔ اب یہ کتبہ وہاں نہیں ہے۔ میں نے بہت سے سجادہ نشینوں سے اس کتبے کے بارے میں دریافت کیا، لیکن اس کے بارے میں کوئی بھی صاحب معلومات فراہم نہیں کر سکے۔ بشیر الدّین احمد نے واقعات دارالحکومت دلی (حصّہ دوم) میں اور ظفر حسن نے A Guide to Nizamuddin میں یہ قطعہ نقل کیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئی تھیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ۱۹۱۹ء تک یہ کتبہ وہاں موجود تھا۔ اس کتبے کی اہمیت یہ تھی کہ اس سے پتا چلتا ہے کہ باؤلی سے درگاہ میں جانے کا جو چھتّہ ہے، وہ ملک سید الحجاب معروف نے تعمیر کرایا تھا۔ اس قطعہ سے یہ معلومات بھی فراہم ہوئی ہیں کہ:

۱۔ معروف صاحبزادے تھے حضرت نظام الدّینؒ کے ایک مرید وحید الدّین قریشی کے۔
۲۔ معروف کا نام حضرت نظام الدّینؒ ہی نے رکھا تھا۔
۳۔ ۷۸۱ھ میں یہ عمارت تعمیر ہوئی۔

یہ قطعہ واقعاتِ دارالحکومت دلی، حصّہ ۲ اور A Guide to Nizamuddin اور List of Muhammadan and Hindu Movements, Vol. II میں نقل ہوا ہے۔ اب وہ قطعہ ملاحظہ ہو:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱) بعہدِ دولتِ شاہِ معظّم
تجستہ خسروِ اولادِ آدم

(۲) مدارِ دینِ احمد شاہِ فیروز
شہِ صاحبقراں سلطانِ اعظم

خلیق انجم
جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو (ہند) راؤز ایونیو، نئی دہلی ۲

درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء

(۳)
موفق گشت ازحق بندہ معروف
اساسِ ایں عمارت کرد محکم
(۴)
جوارِ روضۂ شیخ المشائخ
نظام الحق والدّین قطبِ عالم
(۵)
وحید الدّین قریشی والدِ من
کر با اہلِ ارادت بود ہمدم
(۶)
بحسنِ اعتقاد و صدقِ اخلاص
در اسرارِ ولی اللّٰہ محرم
(۷)
مرا چوں برد پیشِ شیخِ عالم
بدستِ خود گرفت و کرد نامم
(۸)
بلفظ خود مرا معروف خواندہ
دریں عالم چو شیخ عیسوی دم
(۹)
رجا دارم کز انفاس مبارک
دراں عالم بود معروفیم ہم
(۱۰)
بخواں تاریخِ اتمام عمارت
دریں جاچوں بیائی خیر مقدم
(۱۱)
ز ہجرت ہفت صد و ہشتاد و یک بود
مرتّب شد بنا و اللّٰہ اعلم

مالن دروازے سے درگاہ میں داخل ہونے راستہ ہے۔ اس دروازے کا ذکر پچھلی قسط میں یا جاچکا ہے۔

درگاہ کا صحن شمال اور جنوب کی طرف ایک سو چوبیس فٹ تین انچ لمبا اور مشرق سے مغرب کی طرف ستاون فٹ چار انچ چوڑا ہے۔ صحن کا فرش خراب ہوگیا، آج کل فرش کی مرمت ہورہی ہے۔ سنگِ مرمر کے چوکے لگائے جارہے ہیں۔

صحن کی شمالی دیوار (جس کے درمیان میں مالن دروازہ ہے) میں دروازے سے داخل ہوتے ہی بائیں طرف کو کتابوں کی دُکان ہے، اس کے برابر میں ایک سجادہ نشین حنیف نظامی صاحب کی نشست گاہ ہے۔ دروازے کے دائیں طرف ٹھیکری والے بابا اور اس کے برابر میں سیّد محفوظ علی نظامی صاحب کی نشست گاہیں ہیں۔ یہ سب حضرات تعویز گنڈے کرتے ہیں۔ اور ہر مذہب کے لوگ بڑی تعداد میں یہاں ہوتے ہیں۔

یہیں ایک مسجد ہے، اب اس میں مدرسہ ہے۔ اس میں دینی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس مدرسے کے صحن میں شمال کی طرف تین قبریں ہیں، جن کے سنگِ مرمر کے تعویذ ہیں۔ دو قبریں خواتین کی ہیں اور ایک قبر بچی کی ہے۔

مدرسے کے صحن کے جنوبی حصّے میں سنگِ مرمر کے بڑے بڑے تختے پڑے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی فرش سے اکھاڑے گئے ہیں۔ ان پتھروں کے ساتھ ایک اُونچے سے چبوترے پر چونے اور پتّھر کی بنی ہوئی کسی صاحب کی قبر ہے۔

مسجد کے قریب سے شمال کی طرف ایک راستہ اندر کو جاتا ہے یہ نواب مُصطفےٰ خاں شیفتہ کا خاندانی قبرستان ہے۔ قبرستان میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ کو ایک کمرہ ہے، جس میں کئی قبریں ہیں، اس کمرے میں رہائش ہے۔ کمرے سے متصّل مغرب کی طرف نواب مصطفےٰ خاں، اُن کے صاحبزادے نواب اسحٰق خاں، نواب اسحٰق خاں کے صاحبزادے نواب محمد اسمٰعیل خاں کی قبریں اور بعض دوسری قبریں ہیں۔ نواب اسحٰق خاں اور نواب محمد اسمٰعیل خاں کی قبروں پر تو کتبے ہیں، لیکن ایسی کوئی قبر نہیں جس پر شیفتہ کا کتبہ لگا ہو۔ اس لیے شیفتہ کی قبر کی نشان دہی کرنا مشکل ہے۔ ان قبروں کے پاس بھی ایک دو خاندان آباد ہیں۔ قبرستان کی حالت خاصی خراب ہے۔

صحن کے مشرق میں کئی احاطے بنے ہوئے

ہیں، جن میں سے بعض پر جالیاں لگی ہوئی ہیں، ان احاطوں پر بہت سی قبریں ہیں۔ انھی قبروں میں حضرت بابا فریدالدین گنج شکر کے نواسے اور خواجہ سیّد بدرالدین اسحٰق دہلوی کے صاحبزادے خواجہ سیّد موسیٰ کا مزار ہے۔ جس احاطے میں سیّد موسیٰ کا مزار ہے اُس کی مغربی دیوار میں بہت خوب صورت جالیاں بنی ہوئی ہیں۔

صحن کی جنوبی دیوار سے ملحق جہاں آرا بیگم محمد شاہ بادشاہ اور مرزا جہانگیر کے مزار ہیں۔ جنوبی دیوار سے ایک راستہ، امیر خسرو کے مزار کی طرف جاتا ہے۔ پہلے یہاں باقاعدہ دروازہ تھا، جسے درمیانی دروازہ کہا جاتا تھا۔ اب یہ دروازہ گر چکا ہے۔ اس دروازے پر ایک قطعہ کندہ تھا، جسے بشیرالدین احمد نے نقل کیا ہے قطعہ ہے:

بدورِ ابوالعدل شاہ عالم گیر
بنائے ساخت جواہر درے برائے ثواب
بہ ہوشیار علی خاں چہ مژدہ ہاتف داد
کشاد مفتح الابواب

یا عزیز

مرحوم خانی بیگانہ مختار
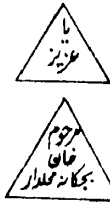
جماعت خانہ

حضرت نظام الدینؒ کے روضۂ مبارک کے مغرب میں یہ عمارت صدیوں سے مسجد کے طور پر استعمال ہو رہی ہے، مسجد کو بغور دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ عمارت مسجد کے لیے نہیں بنائی گئی تھی۔ ابتدا میں اس عمارت کا انداز مقبرے کا تھا۔ ایک بڑا سا کمرہ اور اس پر ایک بڑا سا گنبد۔ کہا جاتا ہے کہ علاؤالدین خلجی کا لڑکا خضر خاں حضرت کا مرید تھا۔ اس نے اُن کی زندگی میں مقبرہ تعمیر کر دیا تھا لیکن نہ جانے کیوں حضرت نے وصیت کی کہ مجھے اس مقبرے کے اندر دفن نہ کرنا۔

فرشتہ نے بھی یہی لکھا ہے کہ "خواجہ نظام الدینؒ کے گنبد کے پاس جو شاندار عمارت ہے، وہ خضر خاں نے بنوائی تھی"[5]۔ فرشتہ نے عمارت کا نام نہیں لکھا، لیکن گنبد کے مغرب میں صرف جماعت خانہ ہے۔ فیروز شاہ تغلق نے اپنی کتاب "فتوحاتِ فیروز شاہی" میں اپنی تعمیرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "جماعت خانہ جدید بنا کردہ کہ آنچناں پیش ازیں آنجا نہ بودہ"[6]۔ اس عبارت کے کئی مفہوم ممکن ہیں۔ ایک تو یہی ہے کہ میں نے جدید جماعت خانہ تعمیر کرایا، جو اس سے پہلے وہاں نہیں تھا، دوسرا مطلب یہ بھی ممکن ہے کہ "جماعت خانہ پہلے سے موجود تھا، میں نے اس کو دوبارہ ایسا بنوایا یا اُس میں کچھ ایسے اضافے کیے کہ ایسی عمارت پہلے وہاں نہیں تھی۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ جماعت خانے کی عمارت پہلے سے موجود تھی، فیروز شاہ تغلق نے اس کو بہتر بنایا ہوگا۔ یہ تو اکثر مورخین نے لکھا ہے کہ مسجد کے دونوں طرف کے کمرے فیروز شاہ تغلق نے بنوائے تھے۔

ظفر حسن نے لکھا ہے کہ "حضرت نظام الدینؒ کو اُس مسجد کے صحن میں دفن کیا گیا تھا، جو حضرت نے خود بنوائی تھی"[7]۔ گویا جماعت خانہ خود حضرت نے بنوایا تھا۔

سیّد احمد خاں لکھتے ہیں: "اُس زمانے میں (حضرت کی زندگی میں) خضر خاں نے اس مسجد کا صرف بیچ کا درجہ بڑے گنبد سمیت بنایا تھا۔ اگرچہ اس عمارت کے بننے کی تاریخ نہیں معلوم ہوتی، لیکن کتب تواریخ کے تتبع سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمارت ۷۱۲ھ سے پہلے بنی ہوگی کہ اس کو آج تک پانچ سو برس سے زائد عرصہ ہوا"[8]۔ ان تمام بیانات کی روشنی میں یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ جماعت خانہ کس نے تعمیر کرایا تھا، ہاں یہ یقینی ہے کہ یہ عمارت مقبرے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اور فیروز شاہ نے اس کو موجودہ شکل دی تھی۔ اس وقت درگاہ نظام الدین کے احاطے میں جتنی عمارتیں ہیں، اُن میں قدیم ترین عمارت اسی جماعت خانے کی ہے۔ اس عمارت کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ افغانوں کے بنائے ہوئے گنبدوں میں سب سے بڑا گنبد اسی عمارت کا ہے۔

مسجد کا ایک مرکزی ہال ہے اور دونوں جانب دو اور دالان ہیں۔ پوری عمارت کی تعمیر دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مرکزی ہال پہلے بنا تھا۔ بعد میں دونوں طرف دو دالان تعمیر کیے گئے۔ عین ممکن ہے کہ یہ دالان فیروز شاہ تغلق نے تعمیر کیے ہوں۔

یہ عمارت لال پتھر کی بنی ہوئی ہے۔ اور پٹھان طرز تعمیر کا بہت خوب صورت نمونہ ہے۔ پوری مسجد پنچانوے فٹ نو انچ لمبی (شمال سے جنوب کی طرف) اور چھپّن فٹ چھے انچ چوڑی (مشرق سے مغرب کی طرف) ہے۔ مرکزی ہال اڑتیس فٹ چھے انچ مربع ہے اور بلندی میں چھتیس فٹ اور گنبد کی بلندی ملا کر اڑتالیس فٹ ہے مرکزی ہال کے دونوں طرف دو دالان ہیں۔ دونوں ترپن فٹ لمبے اور اُنتیس فٹ چوڑے ہیں۔ ان دونوں دالانوں پر بھی گنبد ہیں۔ درمیانی ہال بغلی کمروں سے چھے فٹ بلند ہے۔ مرکزی ہال کے گنبد کا قطر باون فٹ ہے۔ تینوں گنبد چونے اور پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔ ان پر سفیدی کی جاتی ہے۔

مرکزی کمرے کا بہت بڑا محرابی دروازہ

ہے۔ دونوں طرف دو نسبتاً چھوٹی محرابیں ہیں، جنھیں جالیاں لگا کر بند کر دیا گیا ہے۔

مرکزی ہال کی تعمیر تقریباً وہی ہے، جو علائی دروازے کی ہے علائی دروازہ علاؤ الدین خلجی نے ۱۳۱۱ء میں بنایا تھا۔ جماعت خانے کے اندرونی حصے اور علائی دروازے کی طرزِ تعمیر اور آرائش میں غیر معمولی مشابہت دیکھ کر بعض مورخین کا یہ بیان درست معلوم ہوتا ہے کہ جماعت خانے کا یہ حصہ علاؤ الدین خلجی کے لڑکے خضر خاں نے تعمیر کرایا تھا۔ علائی دروازے کی محرابوں کے اندرونی حصے پر نیزے کی شکل کی جھالریں بنائی گئی تھیں، بالکل اسی انداز کی جھالر مرکزی ہال کی محراب پر بنائی گئی ہے۔ طاق نما ڈاٹوں کی محرابوں پر بھی دوہری نیزے دار جھالریں بنائی گئی ہیں۔

صدر دروازے پر پوری سورۃ الرحمٰن خطِ ثلث میں کندہ ہے۔ اس دروازے کی جنوبی دیوار پر سنگِ سرخ پر حضرت نظام الدین کی وفات کا قطعہ لکھا ہوا ہے۔ قطعہ ہے:

نظام دو گیتی شہ ماہ و طیں
سراجِ دو عالم شدہ بالیقیں
چو تاریخ فوتش بجستم زغیب
ندا داد ہاتف شہنشاہِ دیں

۷۲۵ھ

مرکزی ہال کے دونوں طرف جو دالان ہیں، وہ عین ممکن ہیں کہ فیروز شاہ تغلق نے بنائے ہوں۔

اکبر بادشاہ کے زمانے میں اس مسجد کی بڑے پیمانے پر مرمت ہوئی۔ مسجد پر جو منبت کاری کا کام ہے، وہ اکبر کے عہد کا ہے۔ خاص طور پر روکار کے لال پتھروں پر جو کام ہے، وہ اکبری عہد کا ہے۔ روکار کی جالیاں، منڈیروں کی حاشیہ بندی اور محرابوں کی منبت کاری اور مخصوص انداز کی خطاطی وغیرہ اکبری عہد کی یاد دلاتی ہے۔ فتح پور سیکری کے بلند دروازے کی آرائش بالکل اسی انداز میں کی گئی ہے۔ مسجد کے اندرونی حصے کی آرائش اکبری عہد سے پہلے کی ہے۔(۸)

مسجد کے اندر مغربی دیوار میں تین بلند طاق نما محرابیں ہیں۔ درمیان میں منبر ہے محرابوں پر قرآن شریف کی آیتیں کندہ ہیں۔

مرکزی ہال کے گنبد کی چھت میں ایک سنہرا کٹورا زنجیر کے سہارے الٹا لٹکا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کٹورا سونے کا ہے۔ چوں کہ بہت اونچائی پر ہے اور اونچی اونچی پاڑیں باندھے بغیر اس کی صفائی ممکن نہیں، اس لیے اب یہ بالکل کالا پڑ گیا ہے۔ اپنی اونچائی کی وجہ سے یہ محفوظ بھی ہے، کہتے ہیں کہ جاٹوں نے جب دلی پر حملہ کیا تو انھوں نے کٹورے پر بہت گولیاں چلائیں، لیکن اس کی زنجیر نہیں ٹوٹی۔(۹)

حواشی

۱۔ واقعاتِ دار الحکومت دہلی، حصہ ۲، ص ۸۰۸۔

۲۔ List of Muhammadan and Hindu Movements, Vol. II, Calcutta, 1916, pp. 141-142.

۳۔ اس عمارت کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: A Guide to Nizamuddin, Zafar Hasan, 1919, Calcutta, p. 7.
سیر المنازل، ص ۷۰۔

۴۔ عجائب الاسفار، ابن بطوطہ (اردو ترجمہ) دہلی، ۹۵ (حواشی)

۵۔ تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ، جلد دوم (اردو ترجمہ) ص ص ۳۹۷-۳۹۸۔

۶۔ فتوحاتِ فیروز شاہی، سلطان فیروز شاہ تغلق، علی گڑھ، ۱۹۵۴ء، ص ۱۴۔

۷۔ A Guide to Nizamuddin, Zafar Hasan, 1919, Calcutta, p. 11.

۸۔ آثار الصنادید، سرسید احمد خاں، ۱۹۰۰ لکھنؤ، باب پہلا، ص ۳۸۔
جماعت خانے کی آرائش کے لیے ملاحظہ ہو:
Islamic Architecture and Culture in india, R. Nath, Delhi, 1982, pp. 23-27.

۹۔ جماعت خانے کے لیے مزید دیکھیے:
(1) Delhi Past and Present, H.C. Fanshawe, London, 1902, pp. 238-239.
(2) List of Muhammadan and hindu Movements, Vol. II, pp. 139-140.
(3) Archacology and Movemental Remains of Delhi, Care Stephen, Reprint, Allahabad, 1967, pp. 113-116.

میں یہاں شاہراہ کی پٹری پر سارا دن
مُردہ پڑا رہا ہوں مگر کسی نے دھیان نہیں دیا ہے۔
ابھی ابھی میری آنکھ آپ ہی آپ کھلی ہے اور حیرت
سے میری جان پر بنی ہوئی ہے کہ مَیں تو مر چکا تھا،
پھر جی کیسے پڑا ہوں۔

شام کافی گاڑھی ہو چکی ہے اور سڑکوں کی
بتیوں سے روشنی کے فوارے چھوٹ رہے ہیں اور
راہ گیروں کے انبوہ کے انبوہ مخالف سمتوں میں
اندھا دھند آجا رہے ہیں، ایک دوسرے سے بے خبر،
بلکہ اپنے آپ سے بھی بے خبر ـــــ وہ آدمی چلتے چلتے
اُس درخت سے ٹکرا گیا ہے اور اپنا سر سہلاتے
ہوئے جوں کا توں آگے ہو لیا ہے، مانو اُس کی
بجائے کوئی اور ہی سر سہلا رہا ہو۔ میں نے اپنے
آپ کو بتایا ہے، کیا پتہ، وہ بھی میرے مانند ذیابیطس
کا مریض ہو اور اپنے بغیر ہی چل رہا ہو۔؟

مَیں اپنے وجود کو گھسیٹ کر قریب ہی پٹری
کے کنارے پتھر کے بنچ پر آ بیٹھا ہوں اور حواس کو
یکجا کرنے کے لیے ایک لمبی سانس لے رہا ہوں۔

آج صبح گھر سے نکلتے ہی مجھے کھٹکا سا ہوا
تھا کہ وہ میرے پیچھے لگ گیا ہے ـــــ نہیں، مجھے معلوم
نہیں وہ کون اور کیا ہے۔ کئی دفعہ میرے خون میں
شکر کی مقدار ایک دم گر جاتی ہے اور وہ ـــــ
ہاں، ہمیشہ وہی ـــــ میرے آگے پیچھے یا دائیں بائیں
سے مجھے آ لیتا ہے ـــــ نہیں، مَیں اُسے کبھی دیکھ تو
نہیں پایا مگر مجھے یقین ہے وہ وہی ہوتا ہے۔
جب وہ میرے سر پر آ پہنچتا ہے تو خوف کے مارے
مَیں اپنے اندر ہی اندر کہیں غائب ہو جاتا ہوں اور
اگر چل رہا ہوتا ہوں تو میری بجائے وہی چلنے لگتا
ہے ـــــ کئی بار تم مجھے کوئی اور ہی لگتے ہو شرون،
بڑے پیارے! ـــــ شبّو کے بارے میں مجھے سدا یہی
خوف لاحق رہا ہے کہ وہ بیوگی کی اُس پر میری محبت
کا دم بھرتی ہے، اتنی میٹھی ہے کہ اکثر اپنی نظر بچا
کے اُسے مُنہ سے لگا لیتا ہوں اور پھر پیشاب کی
بجائے شربت خارج کرنے کی نوبت آتی ہے تو کانوں
کو ہاتھ لگاتا ہوں کہ آئندہ احتیاط سے کام لوں گا،
مگر کیا کروں؟ احتیاط برت برت کر بدن میں شکر
کا نشان بھی نہ رہے تو سنبھالے کے لیے پھوکا اور پھیکا
میٹھا ہی ساتھ دے تو دے۔

کاما سے بچاؤ کے لیے ڈاکٹر نے مجھے ہدایت
کر رکھی ہے کہ اِس نوعیت کی ایمرجنسی میں مجھے خوف
محسوس ہونے لگے تو مَیں اطمینان سے مُسکرانا شروع
کر دوں اور مُسکراتے ہوئے مُنہ میں میٹھی گولیاں ڈال لوں۔
میں ہمیشہ میٹھا اپنے پاس رکھتا ہوں اور اپنے بٹوے
کے بالائی خانے میں مَیں نے ایک ٹائپ شدہ نوٹ
رکھا ہوا ہے۔ اِس میں اپنے نام اور پورے پتے
کے علاوہ مَیں نے یہ اطلاع فراہم کر رکھی ہے کہ مَیں
ذیابیطس کا مریض ہوں اور کہ میرے کوٹ کی
اندرونی جیب میں کچّی شکر کی گولیوں کا پیکٹ رکھا
ہے۔ اِس میں سے چند گولیاں میرے مُنہ میں ڈال
دی جائیں گی تو مجھے ہوش آ جائے گا۔

گھر سے تھوڑے فاصلے پر آ کر مجھے یہ احساس
بے چین کرنے لگا تھا کہ وہ ـــــ ہاں، وہی، اور
کون ہے ـــــ میرے تعاقب میں چلا آ رہا ہے۔ مَیں
نے گھبرا کر ہونٹوں پر ایک بے لباس مسکراہٹ
لٹا لی اور اپنا ہاتھ بے اختیار کوٹ کی اندرونی جیب
کی طرف لے گیا تا کہ میٹھی گولیاں نکال کر مُنہ میں
رکھ لوں، مگر مَیں یہ سوچ کر رک گیا کہ بس میں بیٹھ
کر کھا لوں گا، اور بس اسٹاپ کی جانب تیز تیز قدم
بڑھانے لگا۔ ایسے موقعوں پر مَیں ٹھیک سے
سوچنے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہوں۔ سارا فساد میرے
اندرون میں بپا ہوتا ہے مگر میں فرطِ خوف سے
مُسکرا مُسکرا کر اپنے آس پاس گھور رہا ہوتا ہوں۔
مَیں بڑی تیزی سے چل رہا تھا اور بار بار اپنے پیچھے
دیکھ رہا تھا کہ ایک نوجوان خاتون سے ٹکرا گیا اور
حالاں کہ میں چاہتا تھا کہ اُس کی گری ہوئی اشیا
کو اکٹھا کرنے میں اُس کی مدد کروں، مَیں ویسے ہی
آگے چلتا گیا۔

"ایڈیٹ!"

اُسے سُن کر خدا جانے مجھے کیا سوجھی کہ سامنے
سے آتی ہوئی ایک اور خاتون سے اپنے کیے کی معافی
مانگنے کے لیے اُسے جُھک کر سلام کرنے لگا۔ نہ اُس
بے چاری کی سمجھ میں کچھ آیا، نہ میری سمجھ میں، اور

جوگندر پال

۲۰۴، منداکنی انکلیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹

ذرا سی ٹھہر کے کندھے اُچکا کر وہ اپنی راہ ہولی اور میں منہ لٹکا کر اپنی ——

اِس وقت بھی میں اگر دو چار میٹھی گولیاں منہ میں رکھ لیتا تو بات بگڑنے سے بچی رہتی، مگر اُڑے اُڑے سے ہوش میں مجھے اِس کے سوا کچھ سوجھ ہی نہ رہا تھا کہ کسی طرح بہ حفاظت بس میں جا بیٹھوں۔ میں نے ایک بار پھر اپنے پیچھے گھور کر دیکھا اور بدستور مُسکرا مُسکرا کر مزید خوفزدگی سے اپنی رفتار تیز کرلی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ جس سے خوفزدہ ہوں وہ میرے ذہن میں بھی آگھسا ہے۔ اب تو جو کچھ کرنا تھا اُسی چھلاوے کو کرنا تھا۔

میں پتّھر کے بنچ پر بیٹھا تعجّب کیے جا رہا ہوں کہ ایک بار موت واقع ہو جائے تو کوئی کیوں کر جی سکتا ہے۔ میرے اِردگرد روشنی کا فوارہ چھوٹا ہوا ہے اور سینکڑوں لوگ اندھا دھند اِدھر اُدھر آ جا رہے ہیں اور مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ ہر ایک کے ذہن پر کوئی چھلاوہ قابض ہے اور وہ بے خبری میں جدھر بھی جا رہا ہے اس چھلاوے کی مرضی سے ہی جا رہا ہے۔ اِسی اثنا میں ایک بے بس اور بے نام پِلّا مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اپنی ننھی مُنّی دم ہلاتے ہوئے میرے قدموں میں آ بیٹھا ہے اور میرے جوتے چاٹنے لگا ہے۔

ہوا یہ، کہ پٹری پر چلتے چلتے میں بس اسٹاپ سے بھی بہت آگے نکل آیا تھا اور مجھے معلوم نہ تھا کہ میں کدھر اور کیوں جا رہا ہوں۔ میرا سر متواتر گھوم رہا تھا اور آنکھوں میں دُھندسی چھا رہی تھی اور ذہن میں نیند کے پٹ کُھل رہے تھے۔ میں نے پوری کوشش سے اپنے آپ کو اپنے جسم کے سارے حصّوں میں سے ذہن میں اکٹھا کر لینا چاہا اور اپنے آپ کو یہ سمجھانے میں کامیاب ہو گیا کہ فوراً کوٹ کی اندرونی جیب سے میٹھی گولیاں نکال کر منہ میں رکھ لوں — ہائیں! یہ کیا؟ — میرے ہاتھ جیب کی طرف نہیں اُٹھ پا رہے تھے — میں نے پٹری پر بیسیوں راہگیروں پر نظر دوڑائی اور ہر کسی کے عقب میں لڑکھڑاتے ہوئے اُسے مخاطب کرنا چاہا — ارے بھائی! بھائی! — مگر کسی نے میری طرف سر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ میرے ہاتھ پیر جواب دے رہے تھے اور ہر لمحہ میرے لیے نہایت اہم تھا۔ آخر میں ایک شخص کے عین سامنے جا کھڑا ہوا — پلیز میری جیب میں سے — اُس بھلے انسان نے ہڑبڑا کر مجھے ایک طرف جھٹک دیا اور سرعت سے آگے بڑھ گیا۔

میں اِس قدر بدحواس ہو چکا تھا کہ ایک اور شخص کو روکنے کی بے تاب کوشش میں میں نے اپنے آپ کو اُس پر گرا دیا اور — اور جہاں مجھے وہ نظر آ رہا تھا، وہاں دراصل کوئی تھا ہی نہیں۔ میں آنکھیں پھاڑے تا دیر وہاں دیکھتا رہا اور پھر ہَول سا محسوس کر کے بے اختیار چلّانے لگا — اے لوگو، خدا کے واسطے! — کوئی خدا کے واسطے میری جیب سے گولیاں نکال کر میرے منہ میں ڈال دو! — بچاؤ — ! — شاید میری آنکھیں مجھے دھوکا دے رہی تھیں، ورنہ اتنی بھیڑ میں سے کوئی تو میری طرف متوجہ ہوتا — شاید وہاں کوئی، وجود ہی نہ تھا۔ کیا پتہ، میرے منہ سے آواز ہی نہ نکل رہی ہو اور بدحواسی میں میں اپنے اندر ہی اندر چلّائے جا رہا ہوں — یا کیا پتہ کیا؟

پِلّا اچھل کر میری گود میں آ بیٹھا ہے اور مجھے سونگھ سونگھ کر میرے وجود پر اِس طرح منہ مار رہا ہے جیسے میں کوئی لذیذ شئے ہوں۔ میں نے پیار سے جُھک کر اپنے گال اُس کے منہ کے ساتھ جوڑ لیے ہیں، مگر یہ خیال مجھے ابھی تک بے چین کیے ہوئے ہے کہ اگر میں واقعی مر گیا تھا تو پھر جی کیسے پڑا۔

اپنی دانست میں میں پٹری پر لڑکھڑاتے ہوئے بدستور چلّائے جا رہا تھا — او بھائی لوگو! کوئی تو — ایک نوجوان کے اچانک رُک جانے پر میری جان میں جان آئی۔ میں نے اپنے آپ کو اُس کی طرف کھینچ کر اپنی اندرونی جیب کی طرف اشارہ کیا۔

وہ نوجوان اپنا ہاتھ بڑی سرعت سے میری اندرونی جیب کی طرف لے گیا اور میرا بٹوا نکال کر بھاگ کھڑا ہوا۔

ارے بھائی! — اے لوگو! —

نہ معلوم مجھ میں کہاں سے اتنا دم پیدا ہو گیا کہ میں بھی اُس کے پیچھے دوڑنے لگا — نہیں، میں کہاں دوڑ سکتا تھا؟ یہ وہی تھا — وہی، اور کون؟ — جو میری اِس حالت میں میری بجائے چل رہا ہوتا ہے — چند قدم پر ہی اُس نے میرے وجود کا بوجھ وہیں جھٹک دیا اور اُس نوجوان کے تعاقب میں غائب ہو گیا، اور میں ڈھیر کا ڈھیر نیچے آ گرا۔

پِلّا میرے کندھوں پر چڑھ کر میرے منہ میں منہ ڈال رہا ہے اور مجھے بہت بھلا معلوم ہو رہا ہے۔

مجھے سو فیصد یقین ہے کہ پٹری پر گرتے ہی میرا دم نکل گیا تھا — ثبوت؟ — ثبوت کیا دوں؟ — اتنی گہری نیند دم نکلنے کے سوا کب آتی ہے؟ — اور پھر میں نے اپنی اِن دو آنکھوں سے اُسے جو دیکھ لیا — وہ کون؟ — اور کون؟ — جَم دُوت! — وہ مجھے جھنجھوڑ رہا تھا اور اٹھنے کو کہہ رہا تھا — چلو، چلیں! — میں کیوں کر اٹھتا؟ سو اُس سے کہنے لگا، پہلے میری جیب سے چند میٹھی گولیاں میرے منہ میں ڈال دو۔ اُس نے مجھ پر جھک کر میری جیب سے گولیوں کا پیکٹ نکالا اور بڑے پیار سے ایک ایک کر کے دو چار میرے منہ میں ڈال دیں اور انتظار کرنے لگا کہ میں اُٹھ کر اُس کے ساتھ ہو لوں، مگر گولیاں چُوستے چُوستے میں از سرِ نو سانس لینے لگا!

⬡

قاضی حسن رضا

رطرف ہے تو ہی تو تیرا تکلّم جا بہ جا
ھول کی خوشبو سا بکھرا ہے تبسّم جا بہ جا

ار، تانگے، آشنا نا آشنا چہروں کی بھیڑ
ہر کے بازار میں خوفِ تصادم جا بہ جا

ت، دن، بازار، کوچہ، گھر، سفر ہو یا حضر
ب چہرہ آشنا ملتا ہے گُم صُم جا بہ جا

نج تیری محفلِ اہلِ سخن میں ہر طرف
ے غزل! اُردو غزل تیرا ترنّم جا بہ جا

ے جزیرہ خوف کا ہے جس میں تنہا ہے رضاؔ
اس میں تیرگی کا ہے تلاطم جا بہ جا

قاضی پورہ، کھنڈوا (ایم۔پی) ۴۵۰۰۰۱

سیّد فرید مسکینی

ربط اپنوں سے نہ غیروں سے شناسائی ہے
اب تری یاد ہے اور گوشۂ تنہائی ہے

میں نے دیکھا تھا کبھی بزمِ تصوّر میں جسے
دل کے آئینے میں صورت وہ اتر آئی ہے

میرے سر میں ہے سمایا ہوا سودا تیرا
تیرے جلووں کی مری آنکھ تمنّائی ہے

میں اندھیرے میں تھا گمنام ستارے کی طرح
زندگی نے مری تجھ سے ہی جلا پائی ہے

در بہ در خاک اُڑاتا پھرے کیوں تیرا فریدؔ
یہ کرم کی ترے توہین ہے، رسوائی ہے

کوچہ مسکین شاہ، سکندرآباد، ضلع بلند شہر

عرفان حمید

ہوس کا جذبۂ رُوحانیت سے رشتہ کیا
ہوس کو صرف بدن چاہیے، بدن کا کیا

خزاں نصیب درختوں پہ کر گئی پتھراؤ
ہوا نے دیکھ لیا تھا کسی پہ بیتا کیا

ہر ایک شخص نے پوچھا ہے میرے شہر کا حال
میں خیریت سے ہوں یہ بھی کسی نے پوچھا کیا

ہوس کو لمسِ بدن چاہیے کہ اس کے لیے
بدن، بدن ہے، بدن کا نیا پُرانا کیا

وہ شخص کون ہے عرفاںؔ جس کے دھوکے میں
سُنا گیا مجھے کل ایک اجنبی کیا کیا
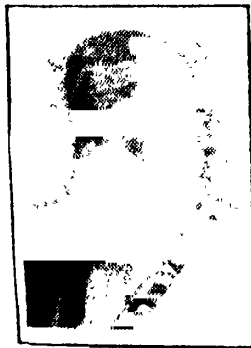
جے ۱۱ی، معرفت جناب قیصر حسین، محلہ گنگولہ بازار، الموڑہ

ادب میں عصری معنویت کے اظہار سے یہ مراد ہے کہ ادب اپنے فنی وسائل کو بروئے کار لاکر ایک محدود مدّتِ زماں اور قطعۂ مکاں میں رونما ہونے والے تند و تلخ صدق اور شیریں و ترش کذب کو ان کے تمام پہلوؤں سے صفحۂ کاغذ پر نقش کر دے۔ عصری معنویت کا یہ محدود تصوّر اس وقت غیر محدود ہو جاتا ہے جب ادب میں پیش کردہ حقائقِ حیاتِ انسانی کے بنیادی اور آفاقی تصوّرات سے مربوط ہوں۔ اس طرح ایک عہد کا ادب کلاسک کی مثال بنتا اور برسوں اذہان و اوراق میں زندہ رہتا ہے۔ افسانہ (ناول ڈراما یا فکشن) چوں کہ شاعری کے بالمقابل زندہ کرداروں سے زیادہ قریب ہوتا ہے اس لیے عصری معنویت کا اظہار بھی اسی کے توسط سے زیادہ توانائی اور زیادہ فنکاری سے کیا جاسکتا ہے۔ اس میں چاہے پریم چند وغیرہ کے افسانوں کی طرح کردار موجود ہوں یا انور سجّاد وغیرہ کے بعض افسانوں کی طرح غیر موجود، ان کی تخلیق بہرحال عصر ہی سے ماخوذ موضوعات اور خیالات کے خام مواد سے ہوتی ہے۔ شاعری کے موضوعات اور خیالات بھی عصر ہی سے اخذ کیے جاتے ہیں لیکن اظہار کے طریقِ کار کا فرق اور تجریدی اور تجسیمی ذرائع اظہار کا فرق ان میں صنفی بُعد پیدا کر دیتا ہے اور نتیجے میں بیانیہ مثنوی کا کردار بیانیہ افسانے کے کردار سے مختلف خصائص کا حامل نظر آتا ہے۔

افسانہ نثری اظہار کا ایک اہم ترفنی اسلوب ہے جو (ہر عصر میں) اپنے عصر کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ داستانوں میں بیان کیے گئے طویل و مختصر افسانے اپنے تمثیلی استعاراتی اور علامتی پہلوؤں سے کسی عصر کی ذہنی، نفسی، رُوحانی یا معاشرتی سطحوں کا اظہار کرتے ہیں۔ ان میں فرد اور افراد کے باہمی یا بے رشتہ تعلقات (عمل اور ردِّ عمل) کے نشیب و فراز کی فنی عکّاسی ملتی ہے جسے تہذیب و ثقافت کے عروج و زوال کے تصوّرات پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے۔ حکایات اور تمثیلیں اخلاقی تادیب کے موثر ذرائع ہیں اور ان کے بیانیہ اسالیب پر بھی عصر کی چھاپ دیکھی جاسکتی ہے کہ جب معاشرہ اخلاقی، رُوحانی یا سیاسی بحران کا شکار ہو تو اس بحران کا فنی اظہار افسانے کی انھیں حکایتی اور تمثیلی ہیئتوں کے توسّط سے پُر اثر کیا جاسکتا ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز کے افسانے میں زوال پذیر تمدّن کے نشانات نمایاں ہیں۔ یہ نشانات اگرچہ مغرب سے درآمد شدہ کہلاتے ہیں لیکن ان کی جھلکیوں کو مشرق میں عموماً اور برِّ صغیر ہند و پاک میں خصوصاً، بآسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہ عہد نہ صرف سیاسی اور سماجی بیداری کا عہد تھا بلکہ حکمراں طبقے کے سیاسی اور سماجی بحران کا عہد بھی تھا۔ جاگیردارانہ نظام کے تنزّل کے ساتھ نئے معاشرتی نظام کا عروج، استدلالی فکر و ذہنیت کا فروغ، نظامِ زرداری اور نظامِ اشتراک و مساوات کی دوش بدوش مقبولیت، مزدور اور کسان طبقوں کی پسماندگی اور ان کی طبعی محنتوں کا استحصال وغیرہ ایسے عوامل ہیں جنھوں نے اس صدی کی ابتدا میں بیک وقت نمایاں ہو کر نشو و نما پائی۔ اس افراتفری کے ماحول میں پریم چند کا افسانہ تخلیق ہوا جو مذکورہ تمام عوامل کو ان کے متنوع پہلوؤں سے سامنے لاتا ہے۔

چوتھی اور پانچویں دہائیوں میں یہ عوامل مزید شدّت سے متحرک ہوئے۔ سیاست اور ملوکیت مزید بحران، خلفشار اور انتشار سے دوچار ہوئے جن کا علاج مزید نئے سیاسی اور فکری رُجحانات اور تحریکات میں تلاش کیا گیا۔ تبدّل و تغیر کی وہ دھوم رہی کہ استحکام اور انضباط کسی شعبۂ حیات میں جڑ نہ پکڑ سکے۔ منٹو، کرشن چندر، بیدی، عصمت اور قرۃ العین حیدر نے اس صورتِ حال کا افسانہ رقم کیا۔ منٹو کا افسانہ اگر سماج کے کسی ناسور کی نشاندہی کرتا ہے تو کرشن چندر کا افسانہ "درد لا دوا" سے لمحاتی نجات کی کوشش

سلیم شہزاد
۲۹۶، ایم ایچ بی کالونی، مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳
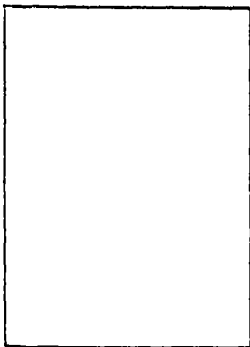
ں اس ناسور پر پھاہا رکھ دیتا ہے۔ بیدی کا افسانہ
ماجی اور انسانی رشتوں کی جڑیں اگر دیومالا میں
اش کرتا ہے تو عصمت کا افسانہ ان رشتوں کو افراد
ے ذہنی، رُوحانی اور جنسی عوامل کے توسط سے
طحِ ابلاغ تک لانے کی کوشش کرتا ہے اور
ۃ العین حیدر کا افسانہ پُرتصنع، ظاہر پسند اور
بط پرست سماج کی کھوکھلی اقدار کے مثالی کردار
امنے لاتا ہے۔ گویا ترقی پسند افسانے کی عصری
عنویت مذکورہ فنکاروں کے یہاں بخوبی دیکھی
اسکتی ہے جو فن کی سطحوں پر تو انسانی مسائل کی
لیل و ترکیب، ان کے وقوع کے اسباب کی
لاش اور ان کی بالراست تصویر کشی کا عمل ہے
یکن فکری سطحوں پر منٹو، قرۃ العین حیدر اور
سی حد تک بیدی کے سوا، دوسرے تمام ترقی
سند افسانہ نگاروں کے یہاں یہ معنویت ایک
تمی فیصلے، بے لچک ادعائیت اور فن پر اشتراکی
ر افادی نظریے کے تسلط کی حامی نظر آتی ہے۔
س طرح عصریت کا آفاقی تصوّر ترقی پسند ادبی
ریک کے زمانے میں ایک محدود تصوّر کے رُوپ
ں اجاگر ہوتا ہے جو اگرچہ کلاسک افسانہ دینے
ے قاصر ہے لیکن جس کی معنوی اہمیت سے انکار
مکن نہیں۔

۴۷ء سے ۵۵ء تک کا عصر ایک خاص
عنویت کا حامل ہے جس میں نہ صرف سماجی اور
سیاسی نظریات کی بے مائگی کھل کر سامنے آتی
ہے بلکہ انسانی اور اخلاقی تصوّرات بھی شکست و
ریخت سے دوچار ہوتے ہیں۔ یہ عصر غلامی اور تنگی
ے خاتمے اور آزادی اور فراخی کے آغاز کا شاہد بھی
ہے۔ برِصغیر کے ملوکی خاکے اسی عصر میں ایک ہمہ گیر
سیاسی نظام کے تسلّط کو اپنا کر بین الاقوامی برادری
یں شامل ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں نئے نئے
آفاقی رُجحانات سیاسی، سماجی اور فکری وغیرہ
کا لین دین بڑے پیمانے پر عمل میں آتا ہے اور
یوں ادب اور فنون کے اظہار میں اسالیب کی
نئی راہیں کھلتی ہیں۔ اسی دور میں جدّت طرازی کے
شوق میں اظہار کے مغربی پیرائے اختیار کیے جاتے
اور خبط پسندی کی حد تک ہر معروف، فنی اور غیر فنی
رویّے کی تقلید کی جاتی ہے۔

چھٹی دہائی میں افسانہ ایک اور نئے موڑ سے
گذرتا ہے۔ اگرچہ کرشن چندر، عصمت چغتائی،
خواجہ احمد عبّاس اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ اپنی
پُرانی راہ پر گامزن رہتے ہیں لیکن بیدی، قرۃ العین
حیدر اور انتظار حسین پُرانی راہ سے ہٹ کر ایک نئی
راہ اپنا لیتے ہیں جس پر دھند، دھول اور دھواں
چھایا ہوا ہے۔ ۶۰ء کے بعد معنویت کے ساتھ
بے معنویت کے بھی چرچے ہیں۔ عصری معنویت کو
عصری حسیّت کے توسط سے سمجھا جانے لگا ہے اور
کچھ لکھنے والے ادب کے یا شعر و افسانہ کے ماورائے
عصر ہونے کی باتیں بھی کر رہے ہیں۔ اس صورتِ حال
میں عصر، معنویت، بے معنویت، حسیّت اور
ماورائے عصر سبھی تصوّرات کی از سرِ نو تحقیق و تدوین
کی جانی چاہیے تا کہ کسی مدلل فیصلے کی روشنی میں
ان تمام تصوّرات کا یا ان میں سے کسی ایک یا تحلیلی
تصوّر کا اطلاق جدید افسانے پر کیا جا سکے۔

بعض نمایاں اسباب موجودہ عصر کو
"جدید" کی صفت سے متصف کرتے ہیں اور انھیں
اسباب کے تناظر میں جب جدید عصر ادب میں اپنی
راہ بناتا ہے تو اس کے نئے فکری کوائف کے اظہار
کے لیے فنکار کو لامحالہ اظہار کے لیے اسالیب اور
اظہار کی نئی ہیئتیں اختراع کرنی پڑتی ہیں۔ جدید
عصر کا افسانہ پریم چند کی روایت سے انحراف کا
افسانہ ہے۔ افسانے کی پریم چندی روایت
پلاٹ، کردار اور واقعے کے منطقی بیان کی روایت
ہے جس کے ذیل میں منظر نگاری، بیانِ واقعہ
کا عروج، زمان و مکاں اور عمل کی وحدتیں وغیرہ
عوامل بھی شامل ہیں (مثال میں "کفن" کا نام
لیا جا سکتا ہے) جب کہ جدید افسانہ محولہ بالا
صنفی لوازم کی ہر جگہ پابندی نہیں کرتا بلکہ بعض
افسانے تو کسی جگہ ان کے پابند نہیں ("پھندنے"
اس غیر پابندی کی مثال ہے)۔

جدید عصر میں سرعتِ رفتار کے سبب
چونکہ زماں و مکاں کے روایتی تصوّرات یکسر
بدل گئے ہیں اس لیے کائنات اور آفاق کی
وسعتیں اور گہرائیاں دُوری اور انتشار کی بجائے
قربت اور ارتکاز کی غماز بن گئی ہیں جس سے
کسی مقام پر "ساکن" فرد کے لیے دوسرے
"دور دراز" مقام پر ہونے والی عصری اور فکری
تبدیلیوں سے "جاری زمانے" میں متاثر ہونا
ممکن ہو گیا ہے۔ اس تاثر آفرینی اور تاثر پذیری
کے مُسلسل عمل میں زمین کے مختلف خطّوں پر واقع
ہونے والے تغیّرات ہر لمحہ فرد اور فنکار کو اپنا
معمول بنائے رکھتے ہیں جس کے نتیجے میں اظہار
کے پیرایوں میں بھی مسلسل تبدیلی ناگزیر ہے
اور اس طرح عصر اپنے جدید سے جدید تر ہونے
کا جواز فراہم کرتا رہتا ہے۔ پابندی میں وہ
سماجی اور فکری روایات و اقدار کی پابندی
ہو یا فنون و ادب کے معیارات و اصول کی،
جدید سے جدید تر کی طرف سفر ناممکن نہیں تو
مشکل اور سُست رفتار ضرور ہوتا ہے چنانچہ
ادب میں یا افسانے میں جو عدم پابندی ظہور
میں آئی ہے وہ گزشتہ ادبی ادوار کی کلاسیکی
ادعائیت سے انقطاع ہی کا نتیجہ ہے۔ اب
افسانے یہ "مربوط بیانِ ماجرا اور تسلسلِ واقعہ

سے فنکار اعراض برتتا ہے۔ ایک سطحی ٹھوس
کرداروں کے توسط سے مخصوص زماں اور محدود
مکاں کا پابند ہوکر کوئی صورتِ حال بیان
نہیں کرتا۔ فطرتی منظر نگاری افسانے میں اگر
شجرِ ممنوعہ نہیں تو اس سے بیانِ واقعہ کو غیر ضروری
رنگین بھی اب نہیں بنایا جاتا۔ گویا جدید عصر کی
ہمہ جہت پھیلتی بڑھتی بے شکل معنویت اس
بے ماجرا اور بے کردار افسانے کے ذریعے اپنا
فنی اور فطری اظہار پاتی ہے۔ پریم چند کے
افسانے اور ترقی پسند افسانے کی عصری معنویت
کی طرح جدید افسانے کی عصری معنویت بھی جدید
عصر کے خلفشار، بحران اور افراط و تفریط میں دیکھی
جا سکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا
ہے کہ جدید افسانہ عصری معنویت کا افسانہ ہے اور
اپنے حیاتیاتی طریق کار اور آفاقی حقائق کو من و من
بیان کرنے کے سبب کلاسک بننے کی صلاحیت
بھی رکھتا ہے۔ واضح رہے کہ آفاقی حقائق کا
من و من بیان محض حقیقت نگاری نہیں ہے جو
اگرچہ سماجی حقیقت نگاری کے مقابلے میں نسبتاً
وسیع تر مفہوم کی حامل ہوتی ہے لیکن چونکہ یہ بھی
یک سطحی بیان کے ذریعے واقعے کی سپاٹ تصویریں
پیش کرتی ہے اس لیے من و عن بیان کے سامنے
یہ محدود بیانیہ ہو جاتی ہے اور چاہے واقعہ بذاتِ
خود مختصر تر صورت رکھتا ہو، موخرالذکر فنی برتاؤ
اس واقعے کی کثیر جہتی تصویر قاری کے سامنے لاتا
ہے جس سے زمانی اور مکانی لحاظ سے واقعہ اپنے
ابلاغ میں دور رس اور دیر پا بنتا ہے چاہے
سریع ابلاغ نہ بنتا ہو۔ سرعتِ ابلاغ ویسے کسی
صنف کی تفہیم کے لیے شرط بھی نہیں۔ شعر یا افسانے
کی پہلی سماعت (یا قرأت) ہی میں اس کا
ابلاغ بھی ممکن ہو، یہ ضروری نہیں اور جب ادب
میں شعر ہی کے ابلاغ کا مسئلہ ہو جس کی لفظی
بساط دو مصرعوں سے زیادہ نہیں تو افسانے
کے ابلاغ میں تو بہر حال سرعت نہ ہوگی اور پھر
افسانہ جدید بھی ہو تو یہ عمل مزید تاخیر سے
واقع ہو سکتا ہے۔ جملۂ معترضہ سے جدید افسانے
کے ابہام کا مسئلہ صورت پذیر ہوتا ہے جس سے
یہاں بحث نہیں لیکن عصری اور فکری پیچیدگیوں
ہی کے اسباب میں اس ابہام کا حل موجود ہے۔
ابہام ذہن کو بے معنویت کے تصور تک لے جاتا اور
عصری بے معنویت کا سوال سامنے لاتا ہے۔ عصری
بے معنویت (زمانۂ حال کی معنویت اور بے معنویت
کا تضاد) جو سریع رفتار، مشینی، لاتعلق، بے سمت
اور لغو زندگی کی دین ہے ادب میں، خصوصاً
فکشن میں، اپنا فطری اظہار پاتی ہے۔ یہاں
کرداروں سے زیادہ کرداروں کے ہیولوں کے
توسط سے کسی "غیر واقعے" کے وقوع کا بے ربط
اظہار کیا جاتا ہے اور وقوع کی فضا خواب کی
فضا سے مماثل ہوتی ہے جس کی تخلیق میں داستان،
تمثیل اور حکایت وغیرہ کی تکنیکیں بروئے کار
لائی جاتی ہیں۔ واضح رہے کہ عصری معنویت یا بے معنویت
فنکار کی حسیت پر مبنی ہے، ایک فنکار کے لیے جو تصور
اور تجربہ بامعنی ہے دوسرے فنکار کے لیے وہی تصور
اور تجربہ بے معنی بھی ہو سکتا ہے، مثلاً:

"اس نے دیوار پر حویلی کے باہر سنہ تعمیر
دیکھا، اس کے کچھ کچھ ہندسے نظر آ رہے تھے لیکن
صاف طور پر نہیں۔ اس کو دیکھ کر حیرت ہوئی کہ
حویلی کی کوئی بھی دیوار منہدم نہیں ہوئی تھی۔"
(گپھائیں: حمید سہروردی)

اور:

"جب شرجیل نے اس کئی ہزار سال پرانے
غار میں پہلا قدم رکھا تو اس کا سارا خوف اور
وسوسہ ان تمام جانے پہچانے مناظر میں غائب
ہو گیا اور اس نے بے دھڑک ان تہذیبی یادگا
کو چھو لیا ــــ ارے، یہ تو بالکل بھری بھری ہیں!
(پہلا چہرہ + چوتھا چہرہ = دوسرا چہرہ:

"حویلی کی کوئی بھی دیوار منہدم نہیں ہوئی تھی"
"تہذیبی یادگاریں بھری بھری ہیں" میں احساس
کا تضاد واضح ہے جو دو مختلف فنکاروں کے زاو
کے فرق کا نتیجہ ہے:

نوجوان نے پمفلٹ کو چومنا شروع
اس شخص نے پمفلٹ، پرچی یا اشتہا
غور سے دیکھا، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ
بکھرنے لگی اور پھر وہ بے اختیار ہنسنے لگا۔
اس شخص نے ایک نظر غور سے بوڑھے کو دیکھ
پھر پرچے کو دیکھنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کا
بگڑنے لگا، غصے سے اس کا چہرہ لال ہو گ
اس نے غضب ناک ہو کر پرچے کو مسلنا شر
کیا اور پھر اس طرح اس کے پرزے پرزے کرنے
جیسے وہ اس بوڑھے کی تکا بوٹی کر رہا ہو
(میں) زمین پر پڑے پرچوں کو اکٹھا کر کے
جلدی جلدی الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا، وہ س
ایک جیسے تھے، سادہ ــــ بالکل سادہ!"
(آئینے بانٹنے والا: شبیر

"پمفلٹ کو دیکھنے" کے ایک ہی تجربے کا ایک
بامعنی (مختلف لوگوں کا اسے چومنا، اسے د
ہنسنا، اس کے پرزے اڑانا) اور بے معنی (ایک
فرد کا پمفلٹ کو سادہ پانا) ہونا ان سطور
واضح ہے۔ بلکہ کسی واحد تصور کے تعلق سے ا
کے جذبات و احساسات کی طرفگی اور انفرا
کا اظہار مقتبس سطور میں فنکارانہ چابکدستی
ملتا ہے۔ جدید افسانے میں اس قسم کی بے
مثالیں موجود ہیں جن میں فنکار کی حسیت

یک ہی عصر کو کبھی بامعنی اور کبھی بےمعنی
۔ اس متضاد کیفیت میں فنکار کسی مخصوص
تود کو جڑا رکھنا نہیں چاہتا۔ اپنے فن
لہار کے لیے، چاہے وہ زمانۂ حال کے
ے کا بیان کر رہا ہو، واقعے کو ماضی یا
کے نقطوں پر ظاہر کرتا ہے اور اس
یں بھی کسی ایک نقطۂ عصر پر اکتفا نہ
ے ایک ہی واقعے کو کبھی حال کے آئینے
نا، کبھی ماضی کی گپھاؤں کے اندھیرے
ے کی صداقت تلاش کرتا اور کبھی غیر یقینی
ی خوابناک فضا میں سفر کرتا ہے۔
معنویت (یا بےمعنویت) کا یہ ماورائے
تمثیل اور حکایت کی ہیئتوں میں تجرید
یقت کے پہلو بہ پہلو چلتا ہے مثلاً:

(۱) جب میں ٹرین سے اترا تو اسٹیشن
ھا۔

(۲) اور وہ اپنے قد و قامت میں
ئے۔

(۳) میں نے فوراً پہچان لیا، یہ وہی
، جن کو سیاہ پوش نے گڈّے گڑیوں
نی پیکر عطا کیے تھے۔

(طلسم آباد : انور قمر)

دہ عصر کی تصویر ہے، (۲) سے ایک طلسمی
و ماضی کی داستانی کہانیوں سے ماخوذ
ہر ہوتی ہے اور (۳) کے وقوعے میں
یں" (۲) کے "بڑھنے والوں" کو مستقبل
کرتے ہوتے دیکھتا ہے دراصل یہاں نہ
ر ماضی ہیں نہ مستقبل بلکہ ایک زمانِ
ن یا عصر ماورا ہے جس میں غیر ممکن
ن رونما ہو رہے ہیں۔ افسانے میں وقت
ولم کی طرح حرکت غیر ممکن واقعات کے

افسانوی وقوع کے لیے ضروری ہے اور جب
وقت کی اکائیاں افسانے میں یوں متحرک ہوں
تو لامحالہ وقوع کے مقامات بھی محدود نہیں
رہتے۔ اس طرح جدید افسانہ وحدتِ زماں
اور وحدتِ مکاں کے تکنیکی تصوّرات کی نفی
کرتا ہے! یہ کہا جا سکتا ہے کہ افسانے یا فکشن
کا تصوّرِ زماں وقت کے منطقی بہاؤ کو مسترد
کرکے ماورائے عصر وقوعی تصوّر کو اپناتا اور
اس طرح مزید معنویت کا حامل ہو جاتا ہے!

افسانے کی عصری معنویت کا مسئلہ
دراصل عصری شناخت، عصری حسیّت اور
عصری افکار کے انجذاب کے بعد فنکار کے ذاتی
تجربے اور مشاہدے کو افسانوی اظہار کی
سطح سے یا افسانے کی ہیئت کے توسط سے
صرف حقیقی یا صرف غیر حقیقی بیانِ واقعہ کے
غیر فطری طرز کی بجائے دونوں کے امتزاج سے
بے ساختہ اور فطری طرز کی تشکیل کا مسئلہ
ہے۔ اس عمل میں افسانے کے روایتی معیارات
ٹوٹتے ہیں۔ بیانِ واقعہ کے لیے منطقی ربطِ زمان و
مکاں کی پابندی ناگزیر نہیں ہوتی ماجرا اپنے
تسلسل کو قائم نہیں رکھ سکتا اور کردار موقع و
محل اور تجرید و تجسیم کے لحاظ سے کبھی بےنام
اور بےہیئت اور کبھی مجسّم بھی ہوتے ہیں۔ جدید
افسانے نے روایتی معیارات سے انحراف کیا ہے،
انتہا تو یہ کر دی کہ افسانے سے واقعے ہی کو
غائب کر دیا، زمان و مکاں کے تصورات کو
لایعنی گردانا اور بے ماجرا اور بے کردار ہو رہا۔
لیکن یہ انتہا پسندانہ صورتِ حال مختصر العمر
ثابت ہوئی اور جلد ہی افسانے کو واقعے یا
کہانی کی طرف مراجعت کرنی پڑی کہ اس فنی
مظہر کے بغیر افسانے کا صنفی تصور ہی محال ٹھہرتا
ہے چنانچہ عبوری دور کے بعد جدید افسانے
کی روایت جب متشکل ہوئی تو اس نے "کفن"
اور "پھندنے" کو اپنا پیشرو تسلیم کیا اگرچہ اپنی
بےہیئتی، بے زمانی اور نامیاتی تحریک کے سبب
اسے اپنے دھارے ایسے ہمہ وقت رواں منبع
سے مربوط تصوّر کرنے چاہئیں جو خود بے ہیئت
اور بے زماں ہونے کی صفات رکھتا ہو۔

عصری معنویت کی چند تجرباتی مثالیں جو
انور خاں کی "فنکاری" سے ماخوذ ہیں، یہاں
پیش ہیں جن سے جدید افسانے کی معنویت،
بےمعنویت، عصری حسیت اور ماورائے عصر خصوصیات
کا جائزہ بیک نظر سامنے آسکتا ہے:

"مجھے کبھی ایسا محسوس نہیں ہوا کہ میں ان
سے کہیں کسی سطح پر جڑا ہوا ہوں۔ ہم تو بس
ساتھ ہونے کا ناٹک کر رہے ہیں۔ ہم میں سے
ہر شخص الگ الگ ہے۔ کوئی خوف ہے جو ہر شام
ہمیں یہاں کھینچ لاتا ہے، شاید اکیلے پن کا خوف۔
ہم سب اکیلے پن سے گھبراتے ہیں اور اسے بھلانا
چاہتے ہیں، اس لیے یہاں جمع ہو جاتے ہیں، ساتھ
میں ہونے کا تماشا کرتے ہیں اور اپنے اپنے گھروں
کو لوٹ جاتے ہیں اسی لیے تو کبھی ہنستے ہنستے
سب کو اچانک چپّی لگ جاتی ہے جیسے اپنی ہنسی
پر شرمندہ ہوں بے اطمینانی ہر چہرے کا سائن
بورڈ ہے۔" (شام رنگ)

اسلوب : بیانیہ، انشائیہ، طنزیہ، بتصراتی
مافیہ : عصر کی معنویت اور بےمعنویت
کا امتزاج
تفکّر : افراد کے مابین بظاہر رشتگی اور
بباطن بے رشتگی
تکنیک : استعاراتی
ساتھ ہونے کا ناٹک = معاشرہ

اکیلے پن کا خوف : شام
چہرے کا سائن بورڈ : وسیلۂ اظہار
کردار: میں، ہم (معاشرہ)

"قصّہ دراصل یہ ہے کہ ایک کنوئیں کے پاس چند مینڈک رہا کرتے تھے۔ ایک دن کنوئیں کی منڈیر پر وہ پھدک رہے تھے کہ وہاں سے آنکھوں پر موٹی سی عینک لگائے ہوئے ایک بیل گزرا جسے دیکھ کر وہ سہم گئے ایک ــــ نوجوان مینڈک جو بہت زیادہ ڈر گیا تھا، بیل کے چلے جانے کے بعد، جب اس کے اوسان بجا ہوئے تو ایک گہری سانس لے کر پیٹ پھلاتے ہوئے بولا، 'اس میں کون سی بڑی بات ہے، میں بھی بڑا ہو سکتا ہوں'۔ یہ کہہ کر اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا، 'میرے پاس کئی ڈگریاں ہیں، میں اونچی ذات کا مینڈک ہوں، معاشیات اقتصادیات، نفسیات، فلسفہ، تاریخ اور ادب پر میں نے بہت ساری کتابیں پڑھ رکھی ہیں، میں سماج کے اونچے طبقے کے لوگوں سے خلا ملا رکھتا ہوں، میں انٹلکچول ہوں' ــــ اب جب کہ میرا پیٹ پھٹنے لگا ہے، ایک بزرگ مینڈک نے آکر مجھے بتایا ہے کہ بیٹا جو بیل کچھ دیر پہلے گزرا تھا، وہ دراصل بیل نہیں تھا بلکہ وہ تو دوسرے کنوئیں کا مینڈک ہے اور اب خود ہوا نکلنے کی فکر میں ہے۔" (ہوا)

اسلوب: بیانیہ، طنزیہ
مافیہ: بے معنی خبط اور تصنّع پسندی
تفکّر: فرد کی اجنبی ماحول سے مناسبت کی کوشش
تکنیک: حکایتی، استعاراتی
میں = نوجوان مینڈک
موٹی سی عینک لگائے ہوئے ایک بیل = مخبوط دانشور
کردار: مینڈکوں کی ماہیت میں افراد

"کچھ دن بعد وہ ایک بار پھر اپنی حویلی سے بانسری بجاتا ہوا برآمد ہوا تھا اور اس کی بانسری کی سریلی مدھر آواز سے گاؤں کے نوعمر لڑکے مسحور ہو کر۔ جانے کن سرزمینوں کی جانب چل پڑے تھے۔" (بانسری کی آواز)

اسلوب : بیانیہ
مافیہ : بے معنویت میں معنویت کی تلاش
تفکّر : عینی حقیقت کے حصول کے لیے غیر یقینی وسائل کی طرف مراجعت
تکنیک: اسطوری، استعاراتی
بانسری والا = غیر یقینی وسیلۂ حصول
بانسری کی سریلی مدھر آواز = عینیت
نہ جانے کن سرزمینوں کی جانب = نامعلوم کی طرف
کردار: معاشرے کا استعارہ

"سڑک پر چلتے راہ گیر، میدان میں کھیلتے بچّے، فٹ پاتھ کے کنارے پھولوں سے لدا درخت، سامنے کھپریل کے مکان کی منڈیر پر بیٹھا کبوتر کا جوڑا، روز ہی گیلری میں بیٹھی سن رسیدہ عورت کو دیکھتے ہیں اور شاید سوچتے ہیں اس بڑھیا کے ذہن کے کسی گوشے میں وہ بھی محفوظ ہیں۔" (گیلری میں بیٹھی عورت)

اسلوب: بیانیہ
مافیہ: ماورائے حقیقی ذریعے سے حقیقت کی شناخت
تفکّر: مظاہر میں ذات کا شمول اور (غیر) مظاہر کے شعور سے ذات کی تحقیق
تکنیک: تمثیلی، وقوعاتی
"طوطا مینا" (معروض) کے شعور سے فرد (معروف) پر اثر انداز مظاہر کا مشاہدہ۔
کردار: راہ گیر، بچّے، درخت، کبوتر اور بڑھیا

ان مثالوں کے تجزیوں میں "مافیہ" اور "تفکّر" کے لیبل جدید افسانے کی عصری معنویت (یا بے معنویت اور حسّیت وغیرہ) کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔ اقتباسات سے واضح ہے کہ افسانوں میں واقعہ، کردار اور ماحول وغیرہ افسانوی لوازم بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ عصری زندگی کو عموماً اور "بڑے شہر" کی عصری زندگی کو خصوصاً ان میں موضوع بنایا گیا ہے اور ان کی فنی پیش کش میں افسانے کے عصری فنی تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے یعنی ان کے اسلوبِ بیان اور تکنیک میں متعدد جدّتیں (بیانِ واقعہ میں طنزیہ عناصر، نئی لسانی تشکیل، تمثیل، حکایت اور اسطور کا عمل) روا رکھی گئی ہیں۔

جدید افسانہ روایتی اور ترقّی پسند افسانے کے مقابلے میں کہیں زیادہ عصری معنویت کا حامل ہے کیوں کہ اس میں کسی محدود تصوّرِ زندگی سے منسلک نہ رہ کر آفاقی حقائق کو ان کے فکری کیف و کم کے ساتھ اظہار کی سطحوں پر لایا جاتا ہے۔ اس کا فکری تعمّل، فن کے گوناگوں وسائل کے توسّط سے، عصر کے وسیع تر تناظر پر حاوی ہے اور یہ موجودہ عصر کے کوائف کو گذشتہ و آئندہ عصر کے کوائف پر محمول کرتا یعنی واقعے کو اس کے سہ پہلو زاویوں سے دیکھتا ہے۔

آج کل بعض خالص نقّاد اور بعض افسانہ نگار نقّاد ۱۹۷۰ء کے بعد کی حسّیت کا بھی شد و مد سے ذکر کر رہے ہیں جو ایک بے بنیاد تصوّر ہے کیوں کہ حسّیت وسیع تر عصری پس منظر میں وقفے وقفے سے تبدیل نہیں ہوتی۔ اگر ۱۹۳۷ء، ۱۹۴۷ء اور ۱۹۵۷ء کی حسّیتیں ایک دوسرے سے متغایر ہیں تو اس کی وجہ ان دہائیوں کی سماجی اور سیاسی

ں پھل کو قرار دیا جاسکتا ہے جب کہ ۷۰ء
ند ۶۰ء سے مختلف صورتِ حال کسی شعبے
ظر نہیں آتی ۔ ۷۵ء اور ۸۰ء کے درمیان
یاسی فکری تبدیلیوں کا مختصر دور آیا تھا'
کے اثرات دور رس نہ تھے اس بیچ افسانہ اگر
حد تک سیاسی رنگ آمیزی کے ساتھ پیش
رہا تو صرف اس رنگ آمیزی اور ترقی پسند
نے کی طرح مخصوص رجحان رکھنے کے سبب
ثابت نہ ہوسکا ۔ اس کے بعد تو حالات پھر
ڈگر پر آرہے اور سیاسی اونٹ پہلی کروٹ
رہا ۔" ہنگامی حالات" کے افسانے کو اگر ۶۰ء
عد کے رجحان سے ممیز کیا جائے تو اس کی
ت وقتی اشتہار نامے سے زیادہ نہیں رہتی
لیے اسے جدید افسانے کے مرکزی دھارے
لگ کرکے نہیں دیکھنا چاہیے ۔

۱۹۷۰ء کے بعد کی حسّیت ہی کے نام پر
نے کو دوبارہ حقیقت نگاری (بلکہ سماجی
ت نگاری) کے دھڑے پر لگانے کی کوشش
ں جارہی ہے اگر افسانہ واقعے اور کردار کی
واپس آیا ہے تو اس نے حقیقی واقعے اور
ں کردار کے حوالے سے بھی جو فن دیا ہے وہ
حقیقت نگاری کے افسانے سے بلند تر
ہ کا حامل ہے ۔ اب اگر اس کی پشت پر
رہ کسی نظریے کی چٹّان لاد کر اسے ریت کے
ر پر چڑھایا جارہا ہو تو وہ کس بلندی تک
لے گا' اس کا اندازہ بآسانی لگایا جاسکتا
عصری معنویت اور حسّیت اگر ادب کے
ن چڑھنے کے لیے ضروری عوامل ہیں تو انھیں
فلسفیانہ' نفسیاتی یا عمرانی تناظر میں نہ
ہوتے' ان کے توسّط سے افسانے کی فنّی
ت دیکھنی چاہیے کہ اگر" کسی شخص کے پیٹ
سے گھوڑا برآمد ہو رہا ہے" تو معنویت اور
حسّیت اس عمل کی تفہیم میں کہاں تک معاون
ہو رہے ہیں ؟ گھوڑا صرف گھوڑا ہے یا ایک شخص
کا ذہنی خلفشار (علامت) ؟ اور یہ آدمی کے
پیٹ سے نکلنے والا حقیقی گھوڑا ہے تو اس ماورائے
حقیقی بیان کے وسیلے سے قمراحسن کس لغو
صورتِ حال کا اظہار کر رہا ہے ؟ اسی طرح بار بار
کی شکایت اور تنبیہ کے باوجود ایک شریف
آدمی کے دروازے پر شراب کی بوتلیں چھپائی
جارہی ہیں اور کوئی نتیجہ نہ نکلنے کی صورت میں
شریف آدمی خود شراب پینے لگا ہے تو اس
حقیقت بیانی کے پردے میں کیا احتجاج چھپا ہے'
اسے دیکھنا چاہیے اس احتجاج کا معمول کون ہے
(خود احتجاج کرنے والا) اور سماج پر اس کے
منفی اثرات کیا ہوں گے' اس جانب سلام بن
رزّاق قاری کے ذہن کو متوجہ کرتا ہے نہ کہ
بدمعاشوں میں ایک اور بدمعاش کا اضافہ
دکھانا اسے مقصود ہے ۔

عصری تغیّرات کے درمیان کسی حسّیت
کا تشخّص ہونے کے لیے برسوں لگ جاتے ہیں ۔ ابھی تک
یہ فیصلہ نہیں ہوسکا ہے کہ منٹو جدید تھا کہ ترقی پسند؟
منٹو کی حسّیت نے موجودہ عصری معنویت یا بے معنویت
کو چھولیا تھا تو اسے جدید کہا جاتا ہے ۔ اس نے
اپنے افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری کے کمالات
بھی دکھائے ہیں تو وہ ترقی پسند ہے مگر اس کے تعلّق
سے حتمی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا اور یہی بات ہر فنکار
کے تعلّق سے پیدا ہو جائے تو ۶۰ء کی حسّیت ہو یا ۷۰ء
کی سب کچھ بے معنی ٹھہرتا ہے ۔ تنقیدی موشگافیوں
کے لیے آپ اصطلاحوں سے کھیلتے رہیے' فنکار آپ کی تنقیدی
حسّیت سے بہت اُونچا رہ کر اپنا کام کرتا رہے گا ۔

اطلاع نامہ بابت "ایوانِ اُردو دہلی"

بموجب

فارم-۴

مقامِ اشاعت : دفتر اُردو اکادمی' گھٹا مسجد روڈ' دریاگنج' نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

وقفۂ اشاعت : ایک ماہ

پرنٹر : ایس۔ایچ۔نقوی

قومیت : ہندوستانی

پتہ : اُردو اکادمی' گھٹا مسجد روڈ' دریاگنج' نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پبلشر : ایس۔ایچ۔نقوی

قومیت : ہندوستانی

پتہ : اُردو اکادمی' گھٹا مسجد روڈ' دریاگنج' نئی دہلی' ۱۱۰۰۰۲

ایڈیٹر : ایس۔ایچ۔نقوی

قومیت : ہندوستانی

پتہ : اُردو اکادمی' گھٹا مسجد روڈ' دریاگنج' نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مالک : (کوئی حِصّہ دار یا شیئر ہولڈر نہیں) اُردو اکادمی' (دہلی انتظامیہ) گھٹا مسجد روڈ' دریاگنج' نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مَیں ایس۔ایچ۔نقوی بہ قائمیِ ہوش و حواس اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق دُرست ہیں۔

دستخط
(ایس۔ایچ۔نقوی)

۱۷ مارچ ۱۹۸۸ء

مسعودہ نکہت

پردے، پردے میں بات اُس کی تھی
دل میں پوشیدہ ذات اُس کی تھی
تم نے دُنیا کا ذکر چھیڑ دیا
میرے ہونٹوں پہ بات اُس کی تھی
وہ گیا تو اندھیرا چھوڑ گیا
روشنی جیسی ذات اُس کی تھی
صبح سے چھلکی چھلکی ہیں آنکھیں
گفتگو، پچھلی رات اُس کی تھی
بے نیازی شعار تھا جس کا
کائنات و حیات اُس کی تھی
نوحہ لکھنا ہے عمر بھر نکہت
زندگی بے ثبات اُس کی تھی

ہر درد ہر شکست کا حاصل ہے زندگی
ہم رہ روانِ وقت سے غافل ہے زندگی
جلوہ فشاں ہے نورِ محبّت سے کائنات
تخلیقِ کائنات کا حاصل ہے زندگی
پہلے ہی زندگی کے ستم بے پناہ تھے
اس دور میں تو اور بھی قاتل ہے زندگی
ہر غم ثبوتِ زیست ہے تا منزلِ اجل
ہر گام حادثوں کے مقابل ہے زندگی
کتنا حسین ہے یہ تضادِ غم و نشاط
طوفاں کہیں ہے اور کہیں ساحل ہے زندگی
زرّیں میں ترجمانِ غمِ لازوال ہوں
ہر فکر ہر خیال میں شامل ہے زندگی

عفّت زرّیں

محترمہ نے تصویر بھیجنے سے معذوری ظاہر کی ہے

نجمہ عزیز مُرادآبادی

جب جب میں آئینہ دیکھوں
سامنے ان کا چہرہ دیکھوں
وہ آتے ہیں میرے گھر پر
کب تک اُلٹا سپنا دیکھوں
ہے ان کا اعجازِ محبّت!
بھیڑ میں خود کو تنہا دیکھوں
دُنیا بھر کے رنج و غم کو
اپنے غم کا حصّہ دیکھوں
امن کے دعوے داروں کو بھی
جنگ پہ اب آمادہ دیکھوں
ظلم و تشدّد، عدمِ تحفّظ
دَورِ حوادث کیا کیا دیکھوں

معرفت: ۵۷، آتو جی لین، بدھوارہ، بھوپال (ایم۔پی) ۴۶۲۰۰۱
۵۳۳، گلی حکیم والی، چوڑی والان، جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶
محلّہ قاضیان، بستی کرتپور، ضلع بجنور (یو۔پی) ۲۴۶۷۳۱

خوشونت سنگھ
ترجمہ
تنویر اختر رومانی
آزاد نگر، جمشید پور ۸۳۲۱۱۰

پورا شہر بسنت کے نئے، بلّوریں دھندلکوں میں لپٹا ہوا تھا۔ دُکانیں سب بند تھیں اور گھروں کے دروازوں میں اندر سے چٹخنی لگی ہوئی تھی۔ لیمپ پوسٹ کی ہلکی روشنی سنسان سڑکوں کو منوّر کر رہی تھی۔ کچھ سپاہی اسٹیل کی ٹوپی پہنے اور کندھوں پر رائفل ٹکائے گھوم رہے تھے۔ ان کے بھاری بوٹوں کی آواز شہر کی سنسان فضا کو توڑ رہی تھی۔

دھندلی روشنی اندھیرے میں ڈوب چلی تھی۔ آدھے چاند کی روشنی سے خاموش سڑکیں روشن ہو رہی تھیں۔ ہوا اخباروں اور کاغذ کے ٹکڑوں کو فٹ پاتھ سے سڑک پر یہاں وہاں اڑا رہی تھی۔ ہوا خنک تھی اور بسنت کی مہک لیے تھی۔ کچھ کتّے اندھیری گلیوں سے نکل کر لیمپ پوسٹ کے اِرد گرد اکٹھے ہوگئے تھے۔ سپاہیوں کی ٹولی ان کے پاس سے گذرتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ ان میں سے کسی ایک نے کچھ گندی سی پھبتی کسی۔ دوسرے نے پتھر اٹھا کر کتّوں پر پھینکنے کی ایکٹنگ کی۔ کتّے مخالف سمت میں بھاگنے لگے اور اپنے بچاؤ کے لیے مناسب فاصلہ ڈھونڈنے لگے۔

رانی ایک لاوارث کتیا تھی جس کے بچّے شہر کے گلی کوچوں کی آبادی بڑھا رہے تھے۔ رانی دبلی پتلی شہر کے عام لاوارث کتّوں جیسی تھی۔ اس کی سفید کھال کھردری تھی، جس میں چھلے ہوئے گوشت کے چکتے نظر آتے تھے۔ اس کی پسلیوں سے سوکھے ڈھیلے تھن لٹکتے رہتے تھے۔ اس کی دُم ٹانگوں کے بیچ لپٹی، مڑی رہتی اور وہ ڈری سہمی اِدھر اُدھر گھومتی پھرتی۔

یہ تو ہندو دُکاندار رام جوایا کی رحمدلی تھی جس کی دُکان کے آنگن میں رانی نے اپنی کوکھ خالی کی تھی ورنہ وہ کب کی اپنے پہلی بار کے آٹھ بچّے دینے کے بعد بھوک سے مر چکی ہوتی۔ دُکاندار کے گھر کے لوگ اسے کھانا دیتے اور اس کے پلّوں سے تب تک کھیلتے جب تک کہ وہ دوڑنا بھاگنا سیکھ کر اپنے لیے کھانا چرانے لائق نہ ہو جاتے۔ دُکاندار کی اس رحمدلی نے رانی کو کاہل بنا دیا تھا۔ ہر سال جیسے ہی بسنت کا موسم آتا وہ رمضان مسلمان کے سبزی کے چھوٹے ٹھیلے کے اِرد گرد گھومنے پھرنے کا بہانہ ڈھونڈنے لگتی۔ اس ٹھیلے کے تختے کے نیچے بڑا ہٹّا کٹّا کتّا موتی رہتا تھا۔ موسم سرما کے شروع میں رانی موتی کی آدھی درجن اولادیں اس ہندو دُکاندار کے گھر والوں کو دیتی۔

موتی نیوفاؤنڈ لینڈ اور اسپینئل نسلوں سے پیدا ہوئی دوغلی قسم سے تھا۔ اس کے جھبرے بالوں اور غصیلی صورت پر رمضان کو ناز تھا — رمضان نے موتی کی دم اور کان تراش دیے تھے۔ اس نے اسے خوب کھلایا پلایا تھا۔ اور موتی بڑا تندرست و توانا ہو کر آس پاس کے کتّوں کی برادری کا لیڈر بن گیا تھا۔ رانی کے بھی کئی اُمیدوار تھے۔ لیکن سال گزرنے کے ساتھ اور بسنت کی آمد پر رانی موتی کے تصوّر میں کھو جاتی اور وہ رمضان کی دُکان کے اِرد گرد مٹر گشتی کرنے لگتی۔

اس بار بسنت ضرور آیا تھا۔ لیکن شہر فرقہ وارانہ فساد اور کرفیو کے خوف سے بے رفتار ہو گیا تھا۔ دن میں لوگ دس اور بیس کی ٹولی بنا کر سڑکوں کے کونوں پر پھسپھساتے اور بات کرتے ہوئے نظر آتے۔ کوئی بھی دُکان نہیں کھلتی تھی اور کرفیو لاگو ہونے سے کافی پہلے ہی سڑکیں اور گلیاں سنسان ہو جاتیں، جن پر صرف سپاہی اور آوارہ کتّے ہی رہ جاتے۔

آج رات تو موتی بھی غائب تھا۔ دراصل جب سے کرفیو لگا تھا رمضان نے اسے گھر میں چارپائی سے باندھ دیا تھا۔ ایسے ماحول میں سڑکوں پر مٹر گشتی کرنے کے بجائے اچھا تھا کہ وہ رمضان کے گھر کی رکھوالی کرتا۔ رانی رمضان کی دُکان پر آئی اور اِدھر اُدھر سونگھنے لگی۔ اسے وہاں موتی کئی دنوں سے نظر نہیں آیا تھا۔ اسے بڑی مایوسی ہوئی۔ لیکن بسنت تو صرف سال میں ایک بار آتا تھا۔

رانی نے موتی کے خیالوں کو جھٹک دیا اور ٹہلتی ہوئی رام جوایا کے گھر کی جانب چل پڑی۔ اس کے عاشقوں کی ایک لمبی قطار اس کے پیچھے تھی۔ رانی نے رام جوایا کے دروازے پر پہنچ کر

اپنے عاشقوں کی طرف مُڑ کر دیکھا۔ وہ غرّاتے
جھپٹتے آپس میں لڑ رہے تھے۔ رانی کھڑی ہو کر ان
کی ہار جیت کی بازی دیکھنے لگی۔ کچھ ہی منٹوں کے
بعد ایک کالا کتّا، جو رانی کی اپنی پُرانی اولادوں میں
سے تھا، بازی جیت گیا۔ باقی سارے کتّے بھاگ
گئے۔

رمضان کے گھر میں چارپائی کے نیچے بیٹھا
موتی اداس آنکھوں سے اپنے مالک کی طرف دیکھ
رہا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں کی بسنتی ہوا نے اس کو بے چین
کر دیا تھا۔ اس نے سڑک پر غرّاہٹ سنی اور ہوا میں
رانی کی موجودگی کو سونگھ لیا۔ لیکن رمضان اسے کہاں
جانے دیتا تھا۔ اُس نے رسّی کو جھٹکے سے کھینچا پھر
ڈھیلا چھوڑ کر چیخنے چلانے لگا۔ رمضان کے مضبوط
بھاری ہاتھ اس کی پیٹھ پر پڑے۔ کچھ دیر بعد وہ
پھر چلانے لگا۔ رمضان کئی دنوں سے پہرہ داری
میں سویا نہیں تھا اور نیند سے بوجھل تھا۔ جلد ہی
وہ خرّاٹے بھرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد موتی نے اپنی
رسّی کو زور سے کھینچا اور بھونکنے لگا۔ رمضان غصّے
میں اسے مارنے کے لیے چارپائی سے اُٹھا۔ موتی
دروازے کی طرف کودا اور چارپائی کو اپنے پیچھے
کھینچتا لے گیا۔ اسی نے مُنہ سے دروازہ کھولا اور باہر
کی طرف بھاگا۔ چارپائی دروازے میں پھنس گئی اور
رسّی اس کی گردن کے گرد کس گئی۔ اس نے رسّی
کو وحشی طاقت سے جھٹکا دیا اور چھلانگ لگا کر سڑک
پر بھاگ نکلا۔ رمضان اپنے کمرے کی طرف بھاگا۔ وہاں
سے اپنی قمیص کے نیچے ایک چھُری چھپائی اور موتی کے
پیچھے ہو لیا۔

رام جوایا کے گھر کے باہر رانی اور اس کالے
کتّے کا جسمانی تعلق قائم ہو چکا تھا۔ اچانک ہی
ہٹا کٹا موتی دکھائی دیا۔ غصّے میں غرّاتا ہوا وہ
رانی کے عاشق پر جھپٹا۔ باقی کتّے بھی میدانِ جنگ
میں جُٹ گئے اور یہ تماشہ غرّاہٹ مچانے لگے۔

رام جوایا بھی کئی راتوں سے سویا نہیں تھا۔
وہ پہرے داری کرتا رہا تھا اور بھیڑ کے ساتھ مسلمانوں
کے خلاف چلّا چلّا کر انھیں للکارتا رہا تھا ——
ہر ہر مہادیو! آخر آج رات تھکان اور نیند نے اس
پر غلبہ پا لیا تھا۔ اور وہ چارپائی کے نیچے ڈھیر سارے
روڑے پتھر اور تیزاب سے بھری بوتلیں ہاتھ بھر کی
دُوری پر رکھ کر سو گیا تھا۔ باہر کے شور نے اسے جگا
دیا۔ اس نے نیند سی حالت میں ہی ہاتھ میں ایک
بڑا پتھر اُٹھایا اور دروازہ کھولا۔ زوردار گالی کے ساتھ
اس نے وہ پتھر کتّوں پر دے مارا۔ اچانک ہی کوئی آدمی
کونے سے نکلا اور پتھر سیدھا اس کو جا لگا۔

پتّھر نے رمضان کو زیادہ چوٹ نہیں
پہنچائی لیکن اچانک حملے نے اسے بھونچکا کر دیا۔ وہ
خوف سے "خون۔ خون" چلّایا اور اس نے چاقو کو
اپنی قمیص سے باہر نکال لیا۔ دُکاندار اور سبزی
والا لمحہ بھر تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر
چلّاتے ہوئے اپنے گھروں کی جانب بھاگے۔ مردہ شہر
میں پھر سے شور و غل مچ گیا۔ چلّانا اور بڑھ گیا۔ سرداروں
کے گردوارے میں زور سے ڈھول نگاڑے سے بجنے
لگے۔ ماحول میں ہر طرف فساد کی آوازیں اور دھرم
اور مذہب کے نعرے سنائی دینے لگے۔

لوگ گھروں سے باہر نکل آئے اور تحقیقات
کرنے لگے۔ یہ کہا جا رہا تھا کہ کسی مسلمان یا ہندو
پر حملہ ہوا ہے۔ کسی کو اغوا کر لیا گیا ہے اور اسے
ہلاک کر دیا جائے گا۔ غنڈوں کا گروہ ابھی حملہ کرنے
ہی والا تھا کہ کتّوں نے بھونکنا شروع کر دیا۔ اصل
میں انھوں نے ایک عورت پر حملہ کیا تھا اور اس کے
بچّوں کو جان سے مار دیا تھا۔ مخالفت کی گئی ہوگی۔
ہاں کی گئی تھی۔ پانچ پانچ اور دس دس کے گروپ
بن گئے تھے۔ دس سے بیس اور پھر سینکڑوں مسلح
لوگ چاقو، بھالے، کلہاڑی اور مٹی کے تیـ
ڈبّے لیے رام جوایا کے گھر کی طرف بڑھ چلے
استقبال پتّھر اور تیزاب کی بوتلوں نے کیا
نے بھی اندھا دھند جوابی حملہ کیا۔ مٹی کے تیـ
ڈبّے بنا بھید بھاؤ کے خالی کر دیے گئے اور
دی گئی۔ آگ کی لپٹیں رام جوایا کے گھر اور
پڑوس کو ہندو، مسلمان، سکھ کا بھید کیے بغ
آسمان کو چھو رہی تھیں۔

پولس کے سپاہی جائے واردات پ
اور فائرنگ شروع کر دی۔ آگ بجھانے کی
راستوں میں ٹٹنانے لگی اور پانی کے فوّا
سے باتیں کرنے لگے۔ لیکن آگ شہر کے دو
حصّوں میں بھی لگا دی گئی اور آگ بجھا
گاڑیاں کم پڑنے لگیں۔

آگ ساری رات، سارا دن بھڑکتی
گھر بھڑ بھڑا کر گرتے رہے اور آدمی مرتے ر
جوایا کا گھر بھی آگ کی نذر ہو گیا تھا اور و
سے جان بچا کر بھاگا۔ کئی دنوں تک تباہ
کا دھواں چاروں طرف کھنڈروں میں اٹھتا
وہ شہر جو کچھ دنوں قبل زندہ، بھاگتا دوڑ
اب جلا ہوا، اینٹ پتّھر کا ڈھانچہ رہ گیا

کچھ مہینوں کے بعد سکون ہوا تو ر
اپنا گھر دیکھنے گیا۔ وہاں سب کچھ تباہ تھا
کا ڈھیر ہی بچا رہ گیا تھا۔ ملبے کی ایک چھوٹی
پہاڑی جیسا۔ صرف وہ گوشہ صاف تھا جہ
اس کا لیٹرین ہوتا تھا۔ وہاں رانی لیٹی ہوئی
اس کے پتلے سوکھے تھنوں کو چوس رہے
پاس ہی موتی کھڑا اپنے ناجائز بچّ
نگرانی کر رہا تھا۔

(انگریزی۔

رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی اپنے
ور افتادِ طبع کے لحاظ سے باغیانہ فطرت
ے، جس کی شہادت ان کے آغازِ شباب
ر دورِ آخر تک کے تمام واقعات وسانحات
ب۔ اس پس منظر میں ان کے سیاسی کردار
ابی سرگرمیوں پر غور کرنا بڑی حد تک نتیجہ
ت ہوسکتا ہے۔

اوائلِ شباب میں وہ سر ضیاء الدین کی
علی گڑھ پہنچے تو اپنی قابلِ لحاظ تعلیمی
د کے باوجود کالج سے دو مرتبہ نکالے گئے۔
یہ ہوئی کہ نواب محسن الملک کی سفارش
امتحان میں شامل ہونے کی اجازت
گئی اور ۱۹۰۳ء میں انھوں نے بی۔ اے
یا۔ علی گڑھ سے "اُردوئے معلّیٰ" نکالا تو
ی سرکار کے خلاف باغیانہ مضمون شائع
پاداش میں پریس ضبط ہوگیا اور ڈیڑھ
سزا الگ ہوئی (اصل میں یہ مضمون مولانا
ہیل کا لکھا ہوا تھا مگر رسالے میں مُصنّف
یں چھپا تھا۔ حسرت سے جب مضمون نگار
چھا گیا تو انھوں نے جواب دیا "آپ کو
ہیں کہ یہ رسالہ کس کا ہے۔ پھر یہ کیوں
ں کہ مضمون کس کا ہے؟") مجلسِ احرار میں
ہوئے تو اپنے گرم انقلابی خیالات کے
بلس کے دیگر ممبران سے بہت جلد دل
تہ ہوکر الگ ہوگئے۔ صداقت آشرم کے
مشہور کانگرسی لیڈر مولانا مظہر الحق کے
بارے میں حسرت کا یہ شعر اسی زمانے کا ہے:

شیر جیسا جسم ہے بودے مگر یہ دل کے ہیں
مظہر الحق نام ہے پیرو مگر باطل کے ہیں

کانگریس میں شامل ہوئے تو "آزادیِ کامل بیرونِ حکومتِ برطانیہ" کے سوال پر ۱۹۲۱ء کے احمدآباد سیشن کے موقعے پر گاندھی جی سے ان کے شدید اختلافات پیدا ہوگئے اور بالآخر وہ کانگریس سے کنارہ کش ہوگئے۔ مسلم لیگ میں آئے تو یہاں بھی لیگ کے دیگر قائدین سے ان کا شدید اختلاف ہوا (یہ اختلاف بھی اصولی تھا اور آزادیِ کامل کے مطالبے کی بنا پر تھا)۔ پھر کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہوئے کہ یہ اس وقت کے انقلاب پسندوں اور آزادی چاہنے والوں کا ملجا و ماویٰ تھی مگر یہاں بھی ان کی تشفّی نہ ہوئی۔ ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی نے ۱۹۵۰ء میں جب ملک کا آئین مرتّب کرلیا تو مولانا حسرت موہانی واحد شخص تھے جنھوں نے دستور کے مسودے پر دستخط کرنے سے صاف انکار کردیا کیوں کہ وہ اس سے غیر مطمئن تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ کم و بیش انگریزوں کے ۱۹۳۵ء کے بنائے ہوئے ایکٹ پر مبنی ہے اور ہندوستانیوں کی اُمنگوں اور آرزوؤں کی کما حقّہٗ ترجمانی نہیں کرتا (جناب عبداللطیف اعظمی کی تحقیقات کے مطابق، اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ حسرت موہانی نے دستور کی اس کاپی پر دستخط نہیں کیے تھے جو نیشنل آرکائیوز نئی دہلی میں محفوظ ہے)۔ پارلیمنٹ میں جب ہندی کو راشٹر بھاشا قرار دیا گیا اور اُردو سرکاری کام کاج سے یک قلم خارج کردی گئی تو مولانا نے اعلان کیا کہ وہ اُردو کا مقدمہ اقوامِ متحدہ میں لے جائیں گے۔ پارلیمنٹ کے ممبر کی حیثیت سے ان کو جو تنخواہ اور بھتّہ ملنا واجب تھا اس کو قبول کرنے سے انھوں نے صاف انکار کردیا۔

قاہرہ میں مُسلم ممالک کی "فلسطین بچاؤ کانفرنس" میں شریک ہوئے تو برسرِ اجلاس مطالبہ کیا کہ فلسطین خالی کرنے کے لیے انگریزوں کو تین مہینے کا الٹی میٹم دیا جائے اور اگر وہ پھر بھی فلسطین خالی نہ کریں تو تمام مسلم ممالک کو متحدہ طور پر انگریزوں کے خلاف اعلانِ جنگ کردینا چاہیے (یہ الگ بات ہے کہ بغیر انگریزوں کی طاقت کا اندازہ لگائے اور مسلم ممالک کے اندرونی خلفشار کو نظر میں رکھے یہ اقدام بھی اسی انجام سے دوچار ہوتا جس انجام سے وہابی تحریک ۱۸۵۷ء میں دوچار ہوچکی تھی)۔

ان واقعات پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ حسرت موہانی ازل سے باغیانہ فطرت لے کر آئے تھے اور کسی ایسی چیز کو ماننے پر ہرگز تیار نہ ہوتے تھے جو عام روایت کے مطابق ہو یا مصلحت

نامی انصاری

۱۷/۹۷، پریڈ، کانپور ۲۰۸۰۰۱

پسندی اور دور اندیشی پر مبنی ہو۔ اپنے موقف کے بارے میں وہ بالکل بے لچک بلکہ شمشیر برہنہ تھے۔ اصولوں پر سمجھوتہ ان کے نزدیک کفر و زندقہ سے بھی بڑھ کر تھا۔ وہ نہ کسی سے مرعوب ہوتے تھے نہ متاثر خواہ وہ مہاتما گاندھی، محمد علی جناح یا وائسرائے ہی کیوں نہ ہوں۔ وہ اپنی ذات سے استقامت کی ایک ایسی چٹان تھے جس سے ٹکرا کر ہوا، دھوپ، پانی، آندھی، طوفان سب بے اثر ہو جاتے ہیں۔ ان کی مضبوطی کا راز ان کے بے داغ کردار، بے لوث خدمات اور فقرِ غیور میں تھا جس کی نسبت علامہ اقبال نے کہا ہے:

اس فقر سے آدمی میں پیدا
اللہ کی شانِ بے نیازی
یہ فقرِ غیور جس نے پایا
بے تیغ و سناں ہے مردِ غازی

سر ونسٹن چرچل وزیر اعظم برطانیہ نے ایک مرتبہ "مردِ قلندر" کی تعریف اس طرح کی تھی:

"مردِ قلندر زندگی کے آرام و آسائش اور مال و دولت سے بے نیاز ہوتا ہے۔ چنانچہ جو شخص گھر بار، روپے پیسے، جاہ و حشم، طبل و علم اور ملک و مال کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا ہو، قدرتی امر ہے کہ دنیا اس سے خوف کھائے اور جان لے کہ یہ ایک ایسا انسان ہے جو اس کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے اور اسے دنیاوی لالچ دینا بیکار ہوگا۔" (مضمون از کرشن دیو شرما، مطبوعہ آجکل حسرت نمبر، اگست ستمبر ۱۹۸۱ء)

مردِ قلندر کی یہ تعریف مولانا حسرت موہانی سے زیادہ شاید ہی کسی پر صادق آتی ہو۔

سیاسی زندگی کے علاوہ بہ حیثیت شاعر بھی وہ اس روایت کے باغی ثابت ہوتے جو ان کو انیسویں صدی کے اواخر کے غزل گو شعرا سے ملی تھی۔ ان کی غزل کا ذائقہ اس غزلیہ شاعری سے مختلف ہے جو ناسخ اسکول یا داغ، امیر، جلیل، ریاض سے منسوب ہے۔ ان شعرا نے اُردو شاعری کے محبوب کو کبھی طوائف کبھی امرد کے روپ میں پیش کیا مگر حسرت نے محبوب کو گھر آنگن کے منظر نامے میں پیش کر کے اُردو شاعری کو اس کے پیروں پر سیدھا کھڑا کر دیا۔

اپنی ذاتی زندگی میں بھی وہ متوسط طبقے کے معاشرے کے رسوم و قیود سے یکسر بے نیاز رہے۔ احاطہ کمال خاں (کانپور) کی ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں، جس میں پانی کا نل بھی نہیں تھا، انھوں نے فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی مگر کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا تو کجا، حرفِ شکایت بھی زبان پر نہیں لاتے۔

حسرت کے دور میں یعنی بیسویں صدی کی اوّل چار دہائیوں میں انقلابی تصورات کے دو نمایاں نشانات تھے۔ ملک سے انگریز حکمرانوں کا اخراج اور سوویت انقلاب۔ حسرت کی سیاسی سرگرمیاں انھیں دو محوروں کے ارد گرد گھومتی ہیں۔ حصولِ آزادی کا نصب العین مختلف عقائد اور عزائم رکھنے والوں کا مشترکہ نصب العین تھا۔ انگریزوں کو نکال باہر کرنے کے نقطے پر تو سب متفق تھے، مگر اس کے بعد کیا ہوگا اور انگریز کے جانے کے بعد ہندوستان میں کیسا نظامِ حیات رائج کیا جائے گا، ان امور پر سب منتشر ہو جاتے تھے۔ حسرت چونکہ فطرتاً جوشیلے اور عجلت پسند تھے اس لیے ان کو مہاتما گاندھی اور کانگریس کے دیگر عمائدین کی مصلحت پسندی اور آہستہ روی بالکل پسند نہ آتی تھی۔ وہ راست اقدام کے قائل تھے اور فوراً بزن بول دینا چاہتے تھے انجام خواہ کچھ ہو۔ اسی لیے وہ کانگریس کے گرم دل کے رکن بن گئے جس کی قیادت بال گنگا دھر تلک اور اربندو گھوش کر رہے [illegible]

حسرت کے خلوص نیت اور جوش و جذ[illegible] کی صداقت میں کلام نہیں۔ وہ آزادی کامل [illegible] حصول چاہتے تھے مگر اس کے لیے ان کے پا[illegible] نہ تو کوئی واضح طریقہ کار تھا اور نہ وہ جماع[illegible] اور قوت تھی جو آزادی کا فوری حصول ممکن دیتی۔ مہاتما گاندھی نے ان کے آزادیِ کا[illegible] کے موقف کے بارے میں کہا تھا کہ:

"اگر مولانا صاحب آزادیِ کامل چا[illegible] ہیں تو میں پیچھے نہیں رہوں گا۔ میں تو آگرے [illegible] قلعے پر قبضہ کر سکتا ہوں جہاں ٹیلر جیسا پا[illegible] گورنر ہے لیکن اس کے لیے طاقت چاہیے۔ [illegible] ایسی کوئی بات نہیں کہنا چاہتا جس کے کرنے [illegible] مجھ میں طاقت نہ ہو"

آزادی کے بعد کے ہندوستان کے وفاقی نظا[illegible] کا ایک خاکہ حسرت نے تیار کیا تھا مگر وہ عم[illegible] اعتبار سے گنجلک اور ناقابلِ عمل تھا جس [illegible] ظاہر ہوتا ہے کہ آزادی کا تصور تو ان کے ذ[illegible] میں واضح تھا مگر انقلاب کا تصور خود ان [illegible] دل و دماغ میں بھی روشن اور واضح نہ تھا [illegible] وہ روس کے اکتوبر انقلاب سے بھی متاثر [illegible] اور ہندوستان میں اشتراکی نظام رائج کر[illegible] کے مؤید بھی، جیسا کہ کمیونسٹ پارٹی میں ان[illegible] شمولیت اور درج ذیل شعر سے ظاہر ہوتا [illegible]

لازم ہے یہاں غلبۂ آئینِ سوویت
دو چار برس میں ہو کہ دس بیس برس میں

مگر یہ "غلبۂ آئینِ سوویت" ان کے متصوفانہ مزا[illegible] اور تہذیبی پس منظر سے میل نہیں کھاتا۔ ایک طرف وہ اشتراکیت اور اسلام کو شیر و شکر بنا[illegible] کی پرزور وکالت کرتے تھے تو دوسری طر[illegible]

جاگیردارانہ نظام کو من و من باقی رکھنے میں بھی انھیں کوئی قباحت نظر نہیں آتی تھی۔ وہ نظام حیدرآباد کے زبردست حامی تھے اور ان کو ہندوستان میں اسلامیت کا مظہر سمجھتے تھے۔ روحانیت اور تصوّف پر ان کو گہرا اعتقاد تھا اور ضعیف الاعتقادی بھی اس حد تک تھی کہ اربندو گھوش اور سبھاش چندر بوس کی موت پر یقین کرنے کو تیار نہ تھے۔ ان کو اس بات کا پختہ یقین تھا کہ سبھاش چندر بوس زندہ ہیں اور وقت آنے پر نمودار ہو کر ہندوستان کی قیادت سنبھال لیں گے۔ حسرت کے مزاج میں اس قسم کے تضادات اتنے زیادہ اور اتنے مختلف النوع تھے کہ ان کی موجودگی میں ان کے یہاں انقلاب کے ایک مضبوط اور واضح تصوّر کی جستجو بہت دشوار نظر آتی ہے۔ وہ یقیناً انقلابی تھے مگر صرف آرزو کی حد تک اور ظاہر ہے کہ آرزوؤں سے تقدیریں نہیں پھرا کرتیں جیسا کہ خود انھوں نے کہا ہے:

وصل کی بنتی ہیں اِن باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

تاہم حسرت کا تصورِ انقلاب جوش کی طرح یکسر رومانی نہیں تھا، بلکہ اس کے اندر جوشِ عمل کی تیزی و دڑّا کی بھی تھی کیوں کہ حسرت صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ سیاسی زندگی کے مردِ میدان بھی تھے اور ملک کے عوام و خواص سے ان کا تعلق براہِ راست اور چہرہ بہ چہرہ تھا۔ انھوں نے انگریز کے جیل خانوں میں مشقّت کی سختیاں اپنے کمزور جسم پر سالہا سال جھیلی تھیں۔ "مشاہداتِ زنداں" کے نام سے انھوں نے جو کتابچہ تحریر کیا ہے اس کو پڑھنے سے جیل کی اذیّت ناک زندگی کی تصویر نگاہوں میں پھر جاتی ہے۔ یہ شدائد اور مصائب صرف حسرت کی اپنی ذات تک محدود نہ تھے بلکہ ان کی شریکِ حیات نشاط النساء بیگم بھی اس میں برابر کی حصّے دار تھیں۔ ان دونوں میاں بیوی نے مل کر آزادی کے لیے جتنی سختیاں جھیلیں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ جنگِ آزادی میں ہندوستانی عورتوں کا حصّہ بہت اہم ہے۔ کستور با گاندھی، کملا نہرو، زلیخا بیگم (اہلیہ مولانا ابوالکلام آزادؔ) سروجنی نائیڈو اور نشاط النساء بیگم کا نام اپنے عزم و استقلال کا بنا پر سرِ فہرست ہے۔

مولانا حسرت موہانی کی ذات میں بیک وقت فقر و استغنا، تصوّف اور روحانیت، بے لوثی و بے غرضی اور حرّیت و انقلاب کا ایسا حیرت انگیز اجتماع تھا جسے بیسویں صدی کی کرامت کہنا چاہیے کیوں کہ پھر اس کے بعد چشمِ فلک نے ایسا عجوبۂ روزگار شخص نہیں دیکھا۔ شاید قدرت نے وہ سانچہ ہی توڑ دیا ہو جس میں حسرت موہانی جیسے شخص ڈھلا کرتے تھے:

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

مہدی حسن کی آواز سن کر بعض اوقات یوں لگتا ہے کہ صاف و شفّاف پانی کی جھیل میں ایک سُنہرے پروں والی خُوب صورت مچھلی دُور تک تیرتی ہوئی چلی جارہی ہے یا بلند بام پہاڑوں سے اُترا ہوا "جھرنا" گھنے جنگلوں سے ہوکر گزر رہا ہے۔ راجستھان اپنے ریتیلے میدانوں کے لیے خاصہ مشہور ہے مگر ان ریگزاروں کے "لونا" گاؤں (ضلع جھنجھنوں) میں ایک ایسا پھُول نمو پذیر ہوا جس کی خوشبو دُور دراز علاقوں میں پھیلتی چلی گئی۔ میرا بائی کے بعد مہدی حسن دوسرے ایسے فنکار ہیں جو راجستھان کی عالمی شناخت بن چکے ہیں۔ مشہور فلمی اداکار دلیپ کمار نے لتا منگیشکر کو متعارف کراتے ہوئے لندن کے البرٹ ہال میں نثری شاعری کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرتے ہوئے کہا تھا کہ جس طرح ایک بچّے کی مسکان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، خوشبو کا کوئی وطن نہیں ہوتا اسی طرح تمام عالم کے لیے لتا منگیشکر کی آواز قدرت کا بیش بہا تحفہ ہے۔ اگر یہی الفاظ مہدی حسن کی غزل گایکی کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے کہے جائیں تو تاثّرات کی شدّت میں کوئی کمی نہیں آپائے گی۔ خود لتا منگیشکر مہدی حسن کے فن کی دلدادہ ہیں اور اُن کا یقین ہے کہ "اسی فنکار کے گلے میں "ساکشات" سرسوتی کا قیام (نواس) ہے۔" شاید مہدی حسن کی تعریف کے لیے اس سے زیادہ خوب صورت پیرایۂ بیان اب کسی کو میسّر نہ آسکے!

اُردو غزل اپنی معنی آفرینی اور تہہ داری میں اپنی مثال آپ ہے لیکن مہدی حسن سے پہلے جتنے بھی غزل گایک ہوئے وہ غزل کے لغوی معنی کو دھیان میں رکھ کر ہی غزل گاتے رہے۔ بیشتر غزلوں کا انتخاب اس طرح کیا جاتا تھا کہ سامعین کی جمالیاتی حِس کو بیدار کیا جائے اور اُنھیں حُسن و شباب کی دُنیا میں غرق کر دیا جائے۔ مگر مہدی حسن سے اُن غزلوں کو گانے کی روایت شروع ہوئی جو کسی قدر سنجیدہ اور پُر مغز کہی جانے کی مستحق ہیں۔ ہلکی پھلکی غزلوں میں "ٹھمری انگ" کے گانے کی چھاپ زیادہ سے زیادہ نظر آتی تھی لیکن مہدی حسن نے "خیال گایکی" کو غزل سے ہم کنار کیا اور دراصل غزل میں پوشیدہ معنوی تہہ داری کا تقاضا بھی یہی تھا کہ غزل کو گانے کا وسیع CANVASS میسّر آسکے۔ مہدی حسن غزل کو شروع بالکل خیال گایکی کے انداز سے کرتے ہیں اُن کا آلاپ قدرے گمبھیر (سنجیدہ) اور مجوزہ راگ کا خوب صورتی سے احاطہ کرتا ہے۔ استھائی کی لَے اس قدر "وِلمبت" (دھیمی) ہوتی ہے کہ بار بار اُستاد امیر خاں کی خیال گایکی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ مہدی حسن "انترے" (دوسرے مصرعے) کو بار بار اس طرح دوہرانے لگتے ہیں کہ شعر میں پوشیدہ تصوّر کھل کر سامنے آنے لگتا ہے۔ عام طور پر اشعار تحت میں مزہ دیتے ہیں ایک اچھا تحت پڑھنے والا شعر کی تمام تر خوبیوں کو اُجاگر کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مہدی حسن کی تھمی ہوئی لَے میں غزل سرائی ایک خوب صورت تحت کا بھی مزہ دیتی ہے۔ مزید وضاحت کے لیے مندرجہ ذیل اقتباس نقل کرنا مناسب لگتا ہے "غزل کسی بھی راگ اور تال میں گائی جائے، گانے والے کو ایسا انداز اپنانا ضروری ہے جس کے ذریعے اشعار میں چھپے ہوئے تصوّر کا اظہار پوری طرح سے ہو جائے۔ بہ الفاظِ دیگر گلوکار کو شاعر کے احساسات سے پوری طرح ہم آہنگ ہو جانا چاہیے۔ مہدی حسن کا کہنا ہے کہ چاہے گانے کی لَے قائم نہ رہے راگ بدل جائے مگر الفاظ کی ادائیگی پوری خوب صورتی سے ہونا ضروری ہے جس لفظ کا جیسا تلفّظ ہے ویسا ہی غزل گاتے وقت بھی قائم رہنا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر

محتسب کی خیر اُونچا ہے اُسی کے نام سے

اس مصرع کو گاتے وقت لفظ "محتسب" کو اگر پوری توجّہ کے ساتھ ادا نہ کیا جائے تو تال اور لَے کی بندشوں کی وجہ سے گانے والا "موحوتا سب" پڑھے گا لیکن مہدی حسن نے محتسب کو محتسب ہی پڑھا ہے اور یہی اُن کی غزل گایکی کی بڑی خوبی ہے۔"

("غزل گایکی" شاعر بمبئی، شمارہ ۹، جلد ۵۴، صفحہ

مہدی حسن کی غزل گایکی کی امتیازی حیثیت

شاہد میر
صدر شعبۂ نباتیات، گورنمنٹ کالج،
بانسواڑہ (راجستھان) ۳۲۷۰۰۱

س لیے بھی ہے کہ وہ بیشتر دُھنوں کا خاکہ خود
یار کرتے ہیں جو غزل کے موڈ سے میل کھا سکے۔
ثال کے طور پر اُن کی گائی ہوئی غزل :

پھُول ہی پھُول کھِل اُٹھے مرے پیمانے میں
آپ کیا آئے بہار آگئی میخانے میں

ی "اِستھائی" راگ ملہار میں ہے۔ پہلے مصرع میں
پھول کھِلنے کی مناسبت سے ملہار کے سُر خاص لُطف
یتے ہیں لیکن دوسرا مصرع شروع کرتے ہی مہدی
حسن جیسے ہی لفظ "بہار" کو چھوتے ہیں تو راگ
لہار کے بجائے "راگ بہار" کے سروں کا جماؤ دکھائی
ینے لگتا ہے۔ کسی شعر کی اس سے خُوب صورت
سدا بندی اور کیا ہو سکتی ہے۔ لفظوں کی
مناسبت سے سروں کا یا راگ کا بدل جانا موسیقی
ی لُغت میں چِتر نگ (चतुरंग) کہا جاتا ہے اور
سے وہی گا سکتے ہیں جن کو سروں پر مکمّل عبور
اصل ہو۔ بے شک مہدی حسن اُن گلوکاروں
ں سے ہیں جن کے سامنے سُر دست بستہ کھڑے
ہتے ہیں، لَے اور تال جن کی دہلیز کی
لام ہیں

مہدی حسن نے سنگیت کی تعلیم چھے سال
ی عمر ہی سے شروع کر دی تھی۔ جے پور دربار کے
ج گایک جناب عظیم خاں مہدی حسن کے والد
ور اسماعیل خاں چچا تھے ان دونوں کی رہبری
ں ہی مہدی حسن کی آواز نے تربیت کی منزلیں
لے کیں اور آٹھ سال کی عمر میں بڑودہ مہاراج کے
امنے اسٹیج پروگرام دیا۔ مہدی حسن کے اُستادوں
نے انھیں پہلا سبق یہ پڑھایا کہ سنگیت عبادت کا درجہ
کھتا ہے اور آج بھی وہ اپنے اوّل اوّل سبق کو
ظر انداز نہیں کرتے۔ اُن کے گلے سے نکلے ہوئے
سُر اپنے اندر پوری عقیدت سمیٹے ہوئے نظر
آتے ہیں۔

یوں تو مہدی حسن نے بے شمار شعرا کا
کلام گایا ہے مگر مِیرؔ اور نَاصِرؔ کاظمی کی غزلیں (جن
کا مزاج اور موڈ تقریباً ایک جیسا ہے) مہدی
حسن کی آواز پا کر اظہار کی بلندیوں کو چھونے
لگتی ہیں :

دیکھ تو دل کہ جاں سے اُٹھتا ہے

یہ غزل مہدی حسن کی آواز پا کر سوز و گداز سے
اس قدر لبریز نظر آتی ہے کہ لوگ اسے مِیرؔ کی غزل
نہ کہہ کر مہدی حسن کی غزل کہنے پر مجبور ہو جاتے
ہیں۔ اسی طرح راگ بہاگ میں گائی ہوئی غزل:

مرا علاج مرے چارہ گر کے پاس نہیں
(ناصر کاظمی)

مہدی حسن کی آواز پا کر محسوسات کی پیکر بنتی
نظر آتی ہے۔ مہدی حسن کے انفاظ میں انھیں
سیف الدین سیفؔ، قتیلؔ شفائی اور فیضؔ کے
کلام سے خاص لگاؤ ہے۔ حال ہی میں ایک
انٹرویو کے دوران مہدی حسن نے اس بات کا
بھی اعتراف کیا ہے کہ وہ امیر خسروؔ کا کلام
گانے کے بعد اب اس بات کے بھی خواہش
مند ہیں کہ کبیرؔ، رحیمؔ، تیرا اور نانک وغیرہ کا
عارفانہ کلام بھی صدا بند کریں۔

مہدی حسن کے وہ کیسیٹس (Casse-
ttes) جو ہندوستان میں مقبول ہوئے ہیں
اور لاکھوں کی تعداد میں شائقینِ موسیقی میں
تقسیم ہوئے ہیں اُن میں "البرٹ ہال کی محفل"
"بمبئی کا کنسرٹ" "میری پسند" "کہنا اُسے"
اور "شہد" کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ "کہنا اُسے"
میں تمام غزلیں شہزاد احمد کی ہیں جب کہ "میری
پسند" اور "شہد" میں پروین شاکر، عدمؔ، عالم
تاب تشنہؔ، احسان دانشؔ وغیرہ کا کلام شامل ہے۔
رکارڈس کے اس گُل دستے میں مہدی حسن نے

اگر ایک جانب ظاہیر راگ ایمن، راگیشوری، بہاڑی
جھنجھوٹی وغیرہ میں غزلیں ترتیب دی ہیں تو دوسری
جانب گمبھیر اور سنجیدہ راگ جیسے [illegible] اور درباری کو
بھی لفظوں کا لباس عطا کیا ہے۔

کچھ مدت ہوئی مہدی حسن بمبئی کی ایک
پانچ ستارہ ہوٹل میں قیام پذیر تھے۔ موجودہ
دور کے مشہور غزل گایک [illegible] مہدی حسن
سے ملاقات کی غرض سے ہوٹل پہنچے [illegible]
سے یوں مخاطب ہوئے کہ "ہندوستان میں
کلاسیکی موسیقی کے کئی گھرانے ہیں جیسے آگرہ گھرانہ،
رامپور گھرانہ، جے پور گھرانہ، دلّی گھرانہ وغیرہ مگر ہم
غزل گایکوں کا صرف ایک گھرانہ ہے [illegible]
ہے مہدی حسن کا [illegible]
[illegible] صرف مہدی حسن سے اُن کی بے پناہ
عقیدت کا مظہر ہیں بلکہ موجودہ "غزل گایکی"
کی سمت و رفتار کا ایک واضح اشارہ بھی ہیں۔

اکادمی کی زیرِ طبع کتابیں

ہم ہر مہینے یہ گزارش کرتے ہیں کہ قارئین اشعار بھیجتے ہوئے مطروحہ مصرعے کی بحر اور ردیف قافیے کو ضرور ملحوظ رکھا کریں لیکن ہر مہینے سینکڑوں اشعار ایسے موصول ہوتے ہیں جن کی یا تو بحر مختلف ہوتی ہے یا ردیف قافیہ۔ ناموزوں شعر بھی اچھی خاصی تعداد میں آجاتے رہیں۔ ظاہر ہے ان کے لیے اس کالم میں جگہ نہیں نکالی جاسکتی۔

اس بار قارئین نے ایک اور سہل پسندی دکھائی۔ پچھلے مہینے ہم طرح اشعار کے لیے جو مصرعہ دیا گیا تھا وہ سوداؔ کا تھا اور اتفاق سے سوداؔ کی جس غزل سے یہ مصرعہ لیا گیا وہ فروری کے "سرودِ رفتہ" میں شائع کی گئی تھی۔ اکثر قارئین نے اسی غزل کے اشعار نقل کرکے بھجوا دیے۔ اسی زمین میں ایم قمرالدین صاحب کی ایک غزل جنوری میں چھپی تھی، کچھ قارئین نے اس کے اشعار بھجوا دیے ہیں۔ اس کالم کا مقصد آپ کے ذوقِ مطالعہ کو مہمیز کرنا ہے، اشعار کی تلاش میں اچھے اچھے دواوین کا مطالعہ کیجیے، پرانے رسائل کی فائلیں بھی کھنگالیے اور مطروحہ مصرعے کو سامنے رکھ کر بہتر سے بہتر شعر چُنیے۔

موصولہ اشعار میں سے منتخب شعر درج ہیں:

گُل پھینکے ہے عالم کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو اِدھر بھی (سوداؔ)

مرسلہ: مصوّر عالم ناصر (لال باغ، پٹنہ)، کلناز فاطمہ (آبگلہ، گیا)، رضا حسین (مدھوبنی)، محمد سلیم انور (گیا)، محمد انظار اختر (سمستی پور)، محمد بدرالدین (شیر پور) کاشف رضا (واسع پور)، محمد فضل اللہ ضیائی (کانپور)، جاوید احمد خاں معصوم (پٹنہ)، محمد عارفین لُطفی (مغربی چمپارن)۔

تنہا ترے ماتم میں نہیں شام سیہ پوش
رہتا ہے صدا چاک گریبانِ سحر بھی (سوداؔ)

مرسلہ: شبّیر احمد نظیر (دارالعلوم، دیوبند)، محمد رفیع ناشاد (کیٹھار)، محمد ارشاد عالم شہزاد (جار پک)، اسعداللہ جمالی (اعظم گڑھ)، میر شفقت علی وفا (آگرہ)، محمد قیصر امام (بھاگلپور)، رحمٰن عرش (محبوب نگر)، محمد شکیل الرحمٰن (بھاگلپور)، اجیت عمر (پٹنہ)، لڈّن (مغربی چمپارن)، ہاشم ہاشمی (دھنباد)، ہاشم ہادی بہرائچی (دیوبند)۔

کِس ہستیِ موہوم پہ نازاں ہے تو اے یار
کچھ اپنے شب و روز کی ہے تجھ کو خبر بھی (سوداؔ)

مرسلہ: محمد اسجد معروفی (دیوبند)، حسین احمد مدھوبنی (دیوبند)، محمد عاصم (بیگوسرائے)، محمد وجیہ الدین تنویر (آسنسول)، محمد انعام الحق (بھاگلپور)، سیّد اسرار احمد (نلگنڈہ)، محمد عقیل الرحمٰن (بھاگلپور)، سید وقار احمد انعام (دھنباد)، شاہد علی بنارسی (جے پور)۔

اے ابر قسم ہے تجھے رونے کی ہمارے
تجھ چشم سے ٹپکا ہے کبھو لختِ جگر بھی (سوداؔ)

مرسلہ: فاخرہ شبنم (دھنباد)، عبدالغفور (بھاگلپور)، محمد پرویز اختر مجوبی (سمستی پور)، محمد شہزاد عالم ارشاد (بھاگلپور)، اسجد حسینی (علی گڑھ)، محمد منیرالدین کائنات (محبوب نگر)، بیگم نکہت واحد (بہار)۔

کیا ضد ہے خدا جانیے مجھ ساتھ وگرنہ
کافی ہے تسلّی کو مری ایک نظر بھی (سوداؔ)

مرسلہ: عبدالمنّان ناگپوری (ناگپور)، جمال بھاگلپوری (بھاگلپور)، گلستاں افروز (بھاگلپور)، محمد احسن عالم (پٹنہ)۔

دِل اُس نے لیا مجھ کو ملی دولتِ دیدار
کیا لُوٹ کا سامان اُدھر بھی ہے اِدھر بھی (سوداؔ)

مرسلہ: محمد رئیس (مغربی چمپارن)، فرحان غنی

اے نالہ صد افسوس جواں مرنے پہ تیرے
پایا نہ تنک دیکھنے تیں روے اثر بھی (سوداؔ)

مرسلہ: محمد سرور بلیاوی (بلیا)۔

سوداؔ تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی (سوداؔ)

مرسلہ: بے بی پروین نوشاد (بھاگلپور)، عبدالقدوس (سمستی پور)۔

ویرانے میں اِک دِن نکل آئیں گے شجر بھی
پھر ان میں نظر[1] آئیں گے گُل اور ثمر بھی
(ایم۔ قمرالدین)

مرسلہ: ایم۔ اے کریمی (گیا)، ہنس مکھ یگیہ (بھاگلپور)، رضی عالم شاداب سمستی پوری (دیوبند)، کہکشاں ظفر (سہسرام)۔

کیا سمجھوں اِسے یہ وقت کی خوبی کہ خرابی
ہوتی ہے اگر شام تو ہوتی ہے سحر بھی
(ایم۔ قمرالدین)

مرسلہ: محمد انظر علی بنگالی (اعظم گڑھ)، غوثیہ تبسم (سہسرام)، انصار زبیر اعظمی (اعظم گڑھ)، محمد نظام الدین عرف منّا (بھاگلپور)۔

اے زندگی اِک ایسا کوئی دن بھی کہ جس میں
مجھ کو نہ ملے کوئی خبر، اپنی خبر بھی
(ایم۔ قمرالدین)

[1] شاعر موصوف کے مطابق "نظر" کی جگہ "نکل" پڑھا جائے (ا

مرسلہ: وصی احمد نعمانی (دہلی)، محمد تسلیم عرف
سو (بھاگلپور)۔

بن کے کوئی فکر پہنچ عرش پہ لیکن
مر بن کے کوئی شعر مرے دل میں اتر بھی
(ایم۔ قمر الدین)

مرسلہ: محمد علی عرف بھولا (بھاگلپور)، یعقوب
ما گڈو (سہسرام)

ں میں وہ جسے چاہیے بھرپور نظارا
ہ اور ہیں کافی ہے جنھیں "ایک نظر" بھی
(ایم۔ قمر الدین)

مرسلہ: محمد شکیل (بھاگلپور)۔

ے پھینکے ہے یورپ کی طرف بلکہ ثمر بھی
ے نیچر و سائنس بھلا کچھ تو ادھر بھی (اکبر الٰہ آبادی)

سلہ: ابن غوری (نلگنڈا)، وصی اللہ حبیب نعمانی الٰہ آبادی
یو بند)۔

یار تو رگ رگ سے ہماری ہوئے واقف
وہ ہیں کہ پاتے نہیں اس بت کی کمر بھی (اکبر الٰہ آبادی)

مرسلہ: سُہیل اختر آسی (مظفر پور)، ولی اللہ
یب نعمانی (الٰہ آباد)۔

دل کے تصدق جو محبت سے بھرا ہو
ں درد کے صدقے جو ادھر بھی ہے اُدھر بھی (جگر مراد آبادی)

مرسلہ: سمیع اللہ (مغربی چمپارن)، جمشیدہ
ویز (پٹنہ)۔

شق ہیں ترے حور و ملک، جنّ و بشر بھی
بنا ہے خدا حسن تو پڑتی ہے نظر بھی (داغ دہلوی)

مرسلہ: جابر حسین (مغربی چمپارن)، طاہر
ارغالب (مراد آباد)۔

نا ہوں شبِ وصل کہ تقدیر بری ہے
ے نہ کہیں شام کے ہمراہ سحر بھی
(امیر مینائی)

مرسلہ: نور محمد (مغربی چمپارن)

کس کس کا گلہ کیجیے یارب کہ شبِ وصل
دشمن ہے مؤذن کی طرح مرغِ سحر بھی (امیر مینائی)

مرسلہ: منظور عالم نعمانی (مغربی چمپارن)۔

کیا دیکھیں گے ہم جلوۂ محبوب کہ ہم سے
دیکھی نہ گئی دیکھنے والے کی نظر بھی (جگر مراد آبادی)

مرسلہ: شمیم رضا (مغربی چمپارن)۔

آئینہ ترے حسن کا دل بھی ہے جگر بھی
ہے ایک ہی صورت کہ اِدھر بھی ہے اُدھر بھی (امیر مینائی)

مرسلہ: حسان احمد (مغربی چمپارن)۔

کیا جانیے کیا حال ہے یارانِ عدم کا
اک عمر ہوئی ہے نہیں آتی ہے خبر بھی (امیر مینائی)

مرسلہ: شبیر احمد (مغربی چمپارن)۔

رُخ عرش کی قندیل ہے قد شمعِ تجلّی
اللہ کی قدرت کا تماشا ہے بشر بھی (امیر مینائی)

مرسلہ: راشدہ بیگم (مغربی چمپارن)۔

ہوتی ہی نہیں کم شبِ فرقت کی سیاہی
رخصت ہوئی کیا شام کے ہمراہ سحر بھی (جگر مراد آبادی)

مرسلہ: محمد اسجد المعروفی (دیو بند)۔

مایوس شبِ ہجر نہ ہو اے دلِ بیتاب
اللہ دکھائے گا تو دیکھیں گے سحر بھی (جگر مراد آبادی)

مرسلہ: مسعود عالم ابن مجیب اللہ (مغربی چمپارن)

چاہت میں بنا غیر شریک اپنا پئے ظلم
جب جانیں بنالے وہ ہمارا سا جگر بھی (نواب رامپوری)

مرسلہ: محمد فصاحت کوثر (سنبھل)۔

اس دورِ بلا میں نہ محبت سے پکارو
در اصل اب اپنی نہ رہی مجھ کو خبر بھی (محمد رفیع رضا)

مرسلہ: ایم کلیم آزاد (کیٹھار)۔

ہیں منتظرِ فیضِ کرم تشنہ نگاہیں
اک جام مرے ساقی گلفام ادھر بھی
(عاصم بریلوی)

مرسلہ: شبیر احمد پروانہ (مدھوبنی)۔

اس صوبے کی رونق ہیں ترے گیسو و عارض
تو شامِ اودھ بھی ہے بنارس کی سحر بھی
(نذیر بنارسی)

مرسلہ: عبدالاوّل نعمانی (وارانسی)۔

اے چارہ گرو دیکھا ہے ان آنکھوں نے کیا کیا
جلتے ہوئے انسان کبھی جلتے ہوئے گھر بھی
(عبید اللہ اسمٰعیل پوری)

مرسلہ: خوشبو فرحاں (ہبکو سرائے)۔

جلووں کو ترے دیکھ کے جی چاہ رہا ہے
آنکھوں میں اتر آئے مرا کیفِ نظر بھی (جگر مراد آبادی)

مرسلہ: غیاث الدین (دیو بند)۔

مت پوچھ کہ کیا شے ہے محبت کا اثر بھی
ملتے ہی نظر رہتی نہیں اپنی خبر بھی (عاصم بریلوی)

مرسلہ: علی احمد سہرساوی (دیو بند)۔

لایا ہے عجب رنگ مرا سوزِ محبت
لو دینے لگے آج مرے زخمِ جگر بھی (صابر علی صابر)

مرسلہ: صابر علی صابر (سہارنپور)۔

نکلا ہے سفر پہ تو سفر کا ہے تقاضا
لازم ہے ترے پاس ہو کچھ رختِ سفر بھی (فہیم نادر)

مرسلہ: محمد حامد (دربھنگہ)۔

ممکن ہے نگہ ہی غلط انداز ہو لیکن
کانٹوں میں نظر آتا ہے ہم کو گلِ تر بھی
(حافظ غلام احمد فروغی)

مرسلہ: محمد اسمٰعیل انارکلی (کیٹھار)۔

اشعار پہ تنقید بجا ہے مرے نقاد!
پر اس کے لیے چاہیے شاعر کی نظر بھی
(مناظر حسن شاہین)

مرسلہ: مظفر نصیب صدیقی (گیا)۔

اللہ رے بے تابی دل، وصل کی شب کو
کچھ نیند بھی آنکھوں میں ہے کچھ مے کا اثر بھی
(یاس یگانہ چنگیزی)۔ مرسلہ: محمد سلیم الرحمٰن (ناگپور)۔

بے جان کے ساتھ اور اک ایمان کا ڈر بھی
وہ شوخ کہیں دیکھ نہ لے مڑ کے ادھر بھی (یگانہ چنگیزی)

مرسلہ: محمد نعیم الرحمٰن (ناگپور)۔

تو بیچ میں رہ جائے تو یہ تیری خطا ہے
جنت جسے کہتے ہیں اُدھر بھی ہے اِدھر بھی (افسر میرٹھی)

مرسلہ: محمد کلیم الرحمان (ناگپور)۔

اغیار تو دُنیا ہیں اُٹھائے ہوئے سر پر
ہم بیٹھے ہیں اس طرح کہ اُٹھتا نہیں سر بھی (اکبر الٰہ آبادی)

مرسلہ: بشیر ابن شبیر (الٰہ آباد)۔

اب تو یہ تمنا ہے کسی کو بھی نہ دیکھوں
صورت جو دکھا دی ہے تو لے جاؤ نظر بھی (اصغر گونڈوی)

مرسلہ: محمد قیصر امام (بھاگلپور)۔

دُنیا سے الگ کل بھی سفر میرا تھا روشن
دُنیا سے جُدا اب ہے مری راہگذر بھی (روشن بنارسی)

مرسلہ: ایم افسر آرٹسٹ (وارانسی)۔

بیگانۂ منزل ہے دلِ درپئے منزل
ہاں لب پہ یہ لازم کہ دعا میں ہو اثر بھی (مانی جائسی)

مرسلہ: م۔ امین بھیلونی (مہسانہ)

کیا ایک ہی ڈورے میں بندھی انکی نزاکت
جب ہلتی ہے گردن تو لچکتی ہے کمر بھی (داغ)

مرسلہ: تقدیس آفرین عتیق (حیدرآباد)۔

واعظ ہے صراط آپ کی گو بال سے باریک
دیکھا ہے کبھی جادۂ ناسورِ جگر بھی (عزیز لکھنوی)

مرسلہ: ناجیہ معظم (حیدرآباد)۔

لکھا ہوا تقدیر میں ہے خیر بھی، شر بھی
اے صاحبِ تدبیر رہے اس پہ نظر بھی (عبد)

مرسلہ: شیخ عبداللہ عبد جمشید پوری

یوں آتشِ نفرت کو نہ پھیلائیے ورنہ
آجائے نہ شعلوں میں کہیں آپ کا گھر بھی
(سید جمیل احمد فاطمی بلیاوی)

مرسلہ: ایس۔ مبارک حسین سرور (بیگوسرائے)۔

اللہ کرے خیر کہ مرغانِ چمن کو
طوفان کا خدشہ بھی ہے صیاد کا ڈر بھی
(جمیل احمد فاطمی بلیاوی)

مرسلہ: سید فصاحت حسین (بیگوسرائے)۔

کب اہلِ وفا ڈرتے ہیں تکمیلِ وفا سے
تلوار اُٹھائی ہے تو حاضر ہے یہ سر بھی
(معین الدین درد لکھیناوی)

مرسلہ: ظفر الحسن مہدی (بیگوسرائے)۔

ممکن نہیں تاریک رہے گھر شبِ ہجراں
روشن تری یادوں سے ہے دیوار بھی در بھی
(شمیم بیتاب لکھیناوی)

مرسلہ: شاہ ندیم احمد شاداب شاہ فیملی (بیگوسرائے)

اِک عمر کہ گذری ہے غریب الوطنی میں
کیا پوچھو ہو بتلاؤں کہ کیا ہوتا ہے گھر بھی (حسینی)

مرسلہ: غلام جیلانی (چاکند، گیا)

شبنم ہی تری یاد میں گریاں نہیں اے دوست
اشکوں سے ہے بھیگا ہوا دامانِ سحر بھی (شگفتہ سہسرامی)

مرسلہ: نجم السحر (سہسرام)۔

درپیش تھا صحرا کبھی پانی کا سفر بھی
چھوٹی نہ مگر ہم سے تری راہ گذر بھی

مرسلہ: ایم۔ انور حسین (کلٹی، مغربی بنگال)

کیوں کہنہ خیالات کی دُنیاؤں میں گم ہو
ہے تم کو نئی سمت کا درپیش سفر بھی (بدر نظیری)

مرسلہ: محمد علی (نیو دہلی)۔

دم توڑتے ارمان بھی بوسیدہ نظر بھی
رہزن ہو تو لے جاؤ یہ سامانِ سفر بھی (نورتقی نور)

مرسلہ: پرویز عالم چمن (میرٹھ)

میں شہرِ نگاراں کے قریب آ ہی چکا تھا
دی دشت نے آواز کہ دو گام اِدھر بھی
(پروفیسر عبدالروف)

مرسلہ: پرویز اختر پرویز (آسنسول)

رہ جائے نہ پھیکا یہ کہیں رنگ حنا کا
مَل لیجیو ہاتھوں پہ مرا خونِ جگر بھی (شمیم

مرسلہ: آصفہ محمود (دیو

بس جائے کسی روز یہ ویران سا گھر بھی
بھولے سے چلے آیئے اک بار ادھر بھی (رمیہ

مرسلہ: سیدہ ماہ نور (سہ

اب تک ہے مجھے یاد رہِ عشق میں اے شان
کچھ کام نہ آیا تھا مرے دیدۂ تر بھی

(صابرہ خاتون شان)۔ مرسلہ: فریضہ عمر (کیتھ

بدلے میں ملیں تیرے جو خورشید و قمر بھی
لینا تو کیا دیکھوں نہ انھیں ایک نظر بھی (صابر

مرسلہ: محمد ذکی سروش (سنبھ

غم رات پہ موقوف نہیں شہرِ شرر میں
دل ڈوبتا رہتا ہے مرا وقتِ سحر بھی (صدف

مرسلہ: نظر حسین بابا (کلکتہ

اِک طرفہ تماشا ہے یہ سورج کی نظر بھی
لاتی ہے اگر شام تو دیتی ہے سحر بھی (ولی مد

مرسلہ: مختار احمد (بیگوسرا

پھاگن کی ہوا کر گئی شاخوں کو برہنہ
لے جائے گی یہ بادِ سموم اب کے ثمر بھی (سیف سہ

مرسلہ: رمیصا خانم (سہسرا

ہے ایک ہی جلوہ جو اِدھر بھی ہے اُدھر بھی
آئینہ بھی حیران ہے آئینہ نگر بھی (اصغر گونڈ

مرسلہ: محمد علیم الرحمٰن معرفت محمد عبدالحلیم، قدوائی روڈ، مومن پورہ، ناگ

"گلدستہ" آخری نمبر کا شعر بھیجنے والے کو ارسال کیا جا رہا ہے

آئندہ کے لیے اس مصرعے پر اپنی پسند کے اشعار شاعر
نام کے ساتھ اس طرح بھجوائیں کہ آپ کا خط ہمیں ۱۲ اپریل تک
مل جائے۔ ایک صاحب/صاحبہ ایک ہی شعر بھیجنے کی زحمت کر
شعر پوسٹ کارڈ پر لکھ کر بھیجا جائے تو بہتر ہے۔ مصرعہ:

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

قافیہ ردیف

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے موصولہ عنوانات

مارچ ۱۹۸۸ء کے "ایوانِ اُردو دہلی" کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی، قارئین کی طرف سے اس کے بہت سے شعری اور نثری عنوانات آئے یں۔ تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوانات ذیل میں شائع کیے جارہے ہیں:

شعری عنوانات

لمتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
ھرتی کے باسیوں کی مُکتی پریت میں ہے (اقبال)

مرسلہ: میر شفقت علی وفا، فیروزآباد آگرہ

زل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
اعمرِ رفتہ کو آواز دینا (صفی لکھنوی)

مرسلہ: نوشاد احمد کریمی (بتیا)، بُشریٰ فاطمہ
منوؔ، محمود انجم (ٹونک)، کامیاب ذکی (بدایوں) اور
سین احمد برکاتی (جے پور)۔

کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
اشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں (غالب)

مرسلہ: سید عبدالرحمٰن (پٹنہ)، نغمہ خانم
نیا) اور ممتاز حسین (مظفر پور)۔

گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
ں ہوں اپنی شکست کی آواز (غالب)

مرسلہ: محمد عارف انصاری (بھاگلپور)
رمحمد ریاض الدین (دربھنگہ)۔

نار سے نکلی ہے وہ دُھن سب نے سُنی ہے
ساز پہ بیتی ہے وہ کس دل کو پتہ ہے؟ (ساحر)

مرسلہ: طلعت پروین، پٹنہ

ھی آنکھوں میں جواں خواب سجانے نکلا
بربط پہ کوئی گیت سُنانے نکلا
(مناظر حسن شاہین)

مرسلہ: مناظر حسن شاہین، گیا

ہمارے دیس میں اِک خوش نوا فقیر
اور اپنی دُھن میں غزل خواں چلا گیا (فیض)

مرسلہ: شاداب، مظفر پور

اے کاش تم بھی سنتے مرے غم کی داستاں
دیوار و در کو حال کہاں تک سُناؤں گا (ظفر اقبال)

مرسلہ: ایم. صابر سرگم، صاحب گنج

ہمارے ضبطِ تمنّا کی خیر ہو یا رب
کہ سازِ دل پہ غزل آج گا رہا ہے کوئی (سلیم واصفی)

مرسلہ: سید اقبال حسن ہاشمی، ٹونک

راستے دشوار تر ہیں پاؤں میں ہیں آبلے
دُور ہے منزل، ٹھہریے دم ذرا لے لیجیے (کماری کمل)

مرسلہ: محمد کاشف رئیس حامدی، سہارنپور

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جُز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک (غالب)

مرسلہ: فردوس کنول، سہسرام

کیسا دُکھ ہے تیرے دل میں
بستی بستی گانے والے (خسرو متین)

مرسلہ: کہکشاں ریاض، دہلی

چھیڑ اے دل کوئی پیری میں تو نغمہ ایسا
لوٹ آئے جیسے پھر سے کے جوانی میری (صابر علی صابر)

مرسلہ: صابر علی صابر، سہارنپور

ضعفِ پیری جو بڑھا موت کے پیغام چلے
آگیا وقتِ سفر، صبح چلے، شام چلے (ریاض خیرآبادی)

مرسلہ: محمد کلیم انور، گیا

روح زخمی ہو تو بن سکتا نہیں جذبۂ غزل
جب شکستہ ساز ہو تو نغمگی ممکن نہیں (محمد رفیع رضا)

مرسلہ: شمع افروز، کیٹھار

مری تقدیر میں تنہائیاں ہیں
کسی محفل میں جی لگتا نہیں ہے (پیام فتحپوری)

مرسلہ: نظر احسن کریمی، آبگلہ

گنگناتا پھر رہا تھا اِک فقیر
دھوپ رہتی ہے نہ سایا دیر تک (نواز دیوبندی)

مرسلہ: واحد اختر اکیلا، صاحب گنج

نثری عنوانات

"ننگی دوپہر کا سپاہی" (افسانہ: سلام بن رزّاق)

مرسلہ: شاذیہ پروین منشاتول، بتیا، مغربی چمپارن۔

"گاتا جائے بنجارا" (ساحر لدھیانوی کے گیتوں کا مجموعہ)

مرسلہ: مظفر نصیب صدیقی، موضع ڈبو اور رفعت کریم، دربھنگہ

"زرد پتّوں کی بہار" (سفرنامہ: رام لعل)

مرسلہ: شہنواز خاں، سہسرام

"پت جھڑ کی بہار" (عفت موہانی کا ناول)

مرسلہ: محمد شہزاد عالم ارشاد، بھاگلپور

"گمراہ مسافر" (محمد طارق کا افسانہ)

مرسلہ: ایم. اے. کریمی. آبگلہ

"بہاریں چلی گئیں" (مائل ملیح آبادی کا ناول)

مرسلہ: محمد ارشاد عالم شہزاد، بھاگلپور

"نوحہ گر" (سلطان جمیل نسیم کا افسانہ)

مرسلہ: غلام ربّانی، جالند

"روزی کا سوال" (واجدہ تبسم کا افسانہ)

مرسلہ: قیصر ندیم، مظفر پور

"سارے دن کا تھکا ہوا پُرش"
(صلاح الدین پرویز کا ناول)

مرسلہ: اسجد حسین، علی گڑھ

"زندگی کے موڑ پر" (کرشن چندر کا افسانہ)

مرسلہ: محمد ثناء اللہ، مظفر پور

"گلدستہ" پہلے نمبر پر شعری عنوان اور پہلے نمبر پر نثری عنوان بھیجنے والے کو ارسال کیا جائے گا

اُردو غزل

مرتبہ : ڈاکٹر کامل قریشی
اشاعت : مارچ ۱۹۸۷ء
صفحات : ۳۶۰
قیمت : ۳۱ روپے
ناشر و تقسیم کار : اُردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اگر دہلی ہندوستان کا دل ہے تو اُردو اکادمی دہلی اس کی دھڑکن۔ یوں تو ہندوستان کے دیگر صوبوں میں بھی اُردو اکادمیاں ہیں۔ جو اُردو کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں مگر اُردو اکادمی دہلی کی بات کچھ اور ہی ہے۔ اُردو زبان کو عوام تک پہنچانے اور مقبول بنانے میں اس نے جو مثبت کام کیا ہے وہ قابلِ صد تحسین ہے۔

زیرِ نظر کتاب اکادمی کی طرف سے کیے گئے ہند و پاک غزل سیمینار میں پڑھے گئے مقالات پر مشتمل ہے۔ جس میں حرفِ آغاز (سید شریف الحسن نقوی)، پیش لفظ (ڈاکٹر خلیق انجم) اور مقدمہ (ڈاکٹر کامل قریشی) کے علاوہ اُردو کے صفِ اوّل کے ادیبوں، شاعروں، ناقدوں، محققوں اور اُستادوں کے مضامین شامل ہیں۔ کم کہنے میں بہت کچھ کہہ جانا نقوی صاحب اور خلیق انجم صاحب کا حصّہ ہے کامل قریشی صاحب کا مقدمہ فکر انگیز ہے۔ آل احمد سرور (غزل کا فن)، ڈاکٹر جاوید وششٹ (دکنی غزل)، ڈاکٹر محمد انصار اللہ (اُردو غزل دسویں صدی ہجری / سولھویں صدی تک)، پروفیسر محمد حسن (سودا کی غزل گوئی)، پروفیسر جگن ناتھ آزاد (اقبال کی غزل کا ابتدائی دور)، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی (نئی غزل کے پیش رو)، سید ضمیر حسن دہلوی (بہادر شاہ ظفر کا تغزل)، بیگم صالحہ عابد حسین (حالی کی غزل) اور ڈاکٹر صلاح الدین (ذوق کا رنگِ تغزل) کے مضامین دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ مختصراً اُردو غزل کا بھرپور تجزیہ "اُردو غزل" میں موجود ہے۔ کتاب کی کتابت اور طباعت اعلیٰ پایے کی ہے۔ سرورق نہایت دیدہ زیب ہے۔

—— دلیپ بادل

ارمغانِ سیفیہ (کالج میگزین)

مرتبین : عبدالقوی دسنوی، ڈاکٹر محمد نعمان
اشاعت : اکتوبر ۱۹۸۶ء
ناشر : شعبۂ اُردو سیفیہ پوسٹ گریجویٹ کالج، بھوپال (مدھیہ پردیش)

اُردو میں مختلف اسکولوں، کالجوں اور دانش گاہوں کی سطح پر ہر سال علمی و ادبی مجلّے شائع کرنے کی روایت خاصی پُرانی ہے۔ ان مجلّوں کا مقصد عام طور پر ان اداروں سے وابستہ طلبا و اساتذہ کی ادبی کاوشوں کی پیش کش اور اپنے ادارے کی کارکردگی کا اظہار ہوتا ہے کبھی کبھی ایسے مجلّوں میں کوئی اہم تحریر بھی شائع ہو جاتی ہے۔

"سیفیہ پوسٹ گریجویٹ کالج بھوپال" ہندوستان کے چند مشہور اداروں میں سے ایک ہے۔ اس کالج کے شعبۂ اُردو نے "ارمغانِ سیفیہ" کے نام سے یہ مجلّہ شائع کیا ہے جس میں شامل بیشتر تحریریں مقامی نوعیت کی حامل ہیں، لیکن ان تحریروں سے بھوپال اور وہاں کے ادب پر کام کرنے والے حضرات کو خاطر خواہ فائدہ ہو سکتا ہے۔

بھوپال کا گیس المیہ ساری دُنیا میں اپنی ہلاکت اور تاراجی کے سبب ہمیشہ یاد رکھا جائے گا انسان کے ہاتھوں انسانوں کی اس بربادی پر تاسف کا اظہار دُنیا کے تقریباً تمام گوشوں سے کیا گیا ہے، "ارمغانِ سیفیہ" میں ایک گوشہ گیس المیہ یا قیامتِ صغریٰ کے نام سے شامل ہے جس میں بھوپال سے تعلق رکھنے والے فنکاروں نے اس واقعے کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔

اس مجلّے کا سب سے اہم حصّہ یہی ہے۔ ایک چیز اور ہے جو خاص طور پر متوجہ کرتی ہے اور وہ ہے مجلّے کے ابتدائی ۴۶ صفحات پر مشتمل ایک "البم" جس میں مرحوم دادا صاحب بانی سیفیہ کالج کی تصویر سے لے کر کالج کے اعلیٰ منتظمین، اہم عہدیداران، لائق اساتذہ، ہونہار طلبا و طالبات کی تصاویر کے علاوہ زندگی کی مختلف جہات اور تعلیمی سرگرمیوں سے متعلق موضوعات پر کالج میں ہوئے سیمینار اور تقریبات کے اہم موقعوں پر لی گئی تصاویر ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ مختصر سی البم کالج کی پُرشکوہ تاریخی عمارتوں کی سیر کراتے ہوئے آخیر میں کچھ ایسے کھلاڑیوں سے بھی ملاقات کراتی ہے جو عالمی شہرت کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ آج اپنی سیاسی اہمیت بھی رکھتے ہیں جیسے اسلم شیر خاں ممبر پارلیمنٹ وغیرہ۔

غرضیکہ ۲۷۸ صفحات پر محیط اس مجلّے کے مطالعے سے یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ جیسے قاری بذاتِ خود

سیفیہ کالج کے پُرفضا ماحول میں رہ کر وہاں کی تہذیب
ور وہاں کے مزاج کا حصّہ بن گیا ہو!
میگزین پر قیمت کی وضاحت نہیں کی گئی
ہے۔

—— ایم ۔آر۔ قاسمی

شاہنامۂ ہند

شاعر : سریر کابری
صفحات : ۲۰۸
قیمت : ۲۵ روپے
ملنے کا پتہ : ظفر بک ڈپو، جی ۔بی ۔روڈ گیا (بہار)

فردوسی کے شاہنامے اور حفیظ جالندھری
کے شاہنامۂ اسلام کے بعد گیا (بہار) کے کہنہ مشق
شاعر سریر کابری (مرحوم) کا "شاہنامۂ ہند" بڑی
حد تک ایک کامیاب کوشش ہے۔ فردوسی کے
شاہنامے میں افسانوی رنگ کے غلبے کی وجہ سے
تاریخی واقعات حقیقت سے دُور جا پڑے ہیں مگر
سریر کابری مرحوم نے اس شاہنامے میں جہاں ایک
طرف ہندوستان کے تاریخی واقعات کو غیر جانبداری
کے ساتھ شعری قالب میں ڈھالا ہے وہیں ادبیت
کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیا ہے۔ شاہنامۂ
ہند کئی جلدوں میں شائع ہوتا مگر مرحوم کی زندگی
نے وفا نہ کی۔ پھر بھی دو جلدوں کے لیے مسودہ ان
کی زندگی میں تیار تھا مگر اشاعت سے قبل
دوسری جلد کا مسودہ گُم ہو گیا۔ پہلی جلد ۱۹۵۴ء
میں شائع ہوئی جس کی اشاعت ۱۹۸۲ء میں
دوبارہ عمل میں آئی۔ پہلی جلد میں والیِ مالابار کے
معجزۂ شق القمر دیکھنے سے لے کر سلطان شہاب الدین
غوری کے حملوں اور فتوحات کا بڑے دلچسپ
انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے کچھ موضوعات
اس طرح ہیں۔
'اصحابِ رسول کا مالابار آنا اور بود و باش اختیار کرنا'
راجا داہر کا جنگ کے میدان میں آنا اور مارا جانا'
ہندوستان میں غزنوی حکومت، راجا جے پال کا
غزنی پر حملہ، خواجہ معین الدین چشتیؒ کا اجمیر آنا'
سلطان شہاب الدین غوری کی فتوحات وغیرہ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخ کو ادب
کا قالب پہنانے سے اس کی واقعیت مشتبہ ہو جاتی
ہے مگر اہلِ سخن کو اس طرف خصوصی توجّہ
دینے کی ضرورت ہے۔ فردوسی کا شاہنامہ آج بھی
اسی طرح مقبول ہے۔ حفیظ جالندھری شاہنامے
کی بدولت ہی لافانی ہو چکے ہیں۔ اس لحاظ
سے سریر کابری مرحوم کی یہ کوشش نہ صرف اپنے
آپ میں کامیاب ہے بلکہ آج کے شعرا کو اس
ادھورے کام کی تکمیل کی طرف متوجّہ بھی
کرتی ہے۔

دو آتشہ

شاعر : سریر کابری
صفحات : ۱۶۸
قیمت : ۳۰ روپے
ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ، اُردو بازار، دہلی ۶

"دو آتشہ" سریر کابری (مرحوم) کا آخری
شعری مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں مختلف موضوعات
پر نظمیں ہیں اور بیشتر نظمیں سماج کی دقیانوسی
اور جابرانہ روایت کے خلاف جدوجہد کی عکاسی
کرتی ہیں۔ نظمیں نہایت سادہ اسلوب میں
قاری کو دعوتِ فکر دیتی ہیں۔ کچھ نظمیں طویل بھی
ہیں مگر مرحوم کا کارنامہ یہ ہے کہ قاری کی دلچسپی
طویل نظموں میں بھی برقرار رہتی ہے۔ مذکورہ
مجموعے میں جمہوریت، مزدور و مالک، سرفروش،
دورِ حاضرہ، الیکشن کے بہروپیے، ہمارے لیڈر،
جنتا کی فریاد، آزادی کے بعد، قتلِ عام اور غارت
گری، قول و فعل کا تصادم، اقلیت اور اکثریت
کا تصادم، بیوہ کی عید وغیرہ اہم نظمیں ہیں چند
نظموں سے اقتباسات ملاحظہ ہوں ؎

اِک طرف تو اشتعال انگیز تحریریں بھی ہیں
اِک طرف رحم و کرم کی لب پہ تقریریں بھی ہیں
اِک طرف ہے خانہ بربادی کی تعلیمِ پلید
اِک طرف اُجڑے کھنڈر بسنے کی تدبیریں بھی ہیں
—— قول و فعل کا تصادم

اِک مصیبت ہو تو اپنے سر سے ٹالے آدمی
بڑھ گئے گوروں سے بھی دو ہاتھ کالے آدمی
—— قتلِ عام و غارت گری

اُتر آیا ہے سارا ملک —— شغلِ قتل و غارت پر
غلامی ہنس رہی ہے آج آزادی کی راحت پر
—— آزادی کے بعد

اور سب کچھ ہاتھ آتا ہے ہُنر کے زور سے
کونسل کی ممبری ملتی ہے زر کے زور سے
—— الیکشن

—— فریاد آزر

کرچیں

مصنّف : انور ندیم
صفحات : ۱۲۸
قیمت : ۱۵ روپے
ناشر : ہم لوگ پبلشرز، نشاط گنج، لکھنؤ

ایک حسّاس تخلیق کار اظہارِ ذات کے
لیے جو کچھ کرتا ہے وہ سب انور ندیم نے کیا ہے
اور جس مرحلۂ کرب و بلا سے عام طور پر تخلیق کار

کو گزرنا پڑتا ہے اس کی انتہا سے انور ندیم گذرے ہیں۔

"کرچیں" کی داستان اپنے آپ میں دلچسپ ہی نہیں قابلِ عبرت بھی ہے ؎

جنتِ لوح و قلم اس نے سجائی لیکن
قلبِ فنکار دہکتا ہے جہنم کی طرح

یہ کہانی انور ندیم نے ایک فلم کے لیے لکھی تھی مگر انور ندیم ٹھہرے شاعر اور لاپروا انھیں فلم کے غیر یقینی کاروبار کے نشیب و فراز سے ذرا بھی واقفیت نہ تھی ان سے یہ سب تو اس دل نے کرایا جو شاعری کے لیے مچلتا تھا، اس بدن نے کرایا جس میں اداکاری کی صلاحیتیں رینگتی تھیں اور اس دماغ نے کرایا جو کہانیاں بُنتا تھا ـــ مگر فلم نگری میں اس سب کے علاوہ ایک اور صلاحیت بھی درکار ہوتی ہے جو سب سے زیادہ ضروری ہے اور وہی غالباً لکھنوی تہذیب کے پروردہ، نانیہال کی طرف سے جوش سے نسبت رکھنے والے اس انسانیت کے پجاری میں نہ تھی یعنی سرکس بازی وہ غالباً SHOW BUSINESS کے پہلے سبق سے ہی واقف نہ تھے نتیجتاً ۲۵ ستمبر ۱۹۸۲ء تک فلم مکمل نہ ہو سکی اور دس سال تک انتظار کرنے کے بعد جب یہ یقین ہو گیا کہ فلم کا مکمل ہونا غیر یقینی ہے تو انھوں نے یہ کہانی ہمیں آپ سب کو سنا دی۔

کرچیں کی کہانی لکھنؤ کی ایسی تہذیب کی کہانی ہے جس کی اکھڑی طنابوں کے اب نشانات بھی مٹ چکے ہیں۔ امراؤ جان ادا کی کہانی اگر ایک طوائف سے زیادہ انحطاط پذیر دور کی تاریخ ہے تو ممتاز کی کہانی بھی اس سے بکھرتے وجود کے ساتھ ہمیں اس معاشرے کی روداد سناتی ہے جو ذہنی اور فکری طور پر بہت پیچھے جی رہا ہے۔ اُردو ادب میں طوائف جنسی تسکین کے حصول کا ذریعہ ہی نہیں تہذیبی علامت بھی رہی ہے۔ لکھنؤ کے تمام ہی مضافاتی علاقوں میں مخصوص موقعوں پر طوائف کی شرکت ضروری تصور کی جاتی تھی ـــ لکھنؤ کی اس تہذیب کو انور ندیم سے قبل بھی فلم کا موضوع بنایا گیا ہے۔ مگر انور ندیم کا انداز دوسرے لوگوں کے مقابلے میں معروضی زیادہ ہے۔ سچے تخلیق کار کی طرح انھیں ہمدردی تو ہے مگر یہ ہمدردی ان سے حقائق کی پردہ پوشی نہیں کراتی۔ یہی وجہ ہے کہ ممتاز کے بعد وہ اس کی بہن کے مستقبل کا عام فلموں کی طرح بہت خوشگوار تصور پیش نہیں کر سکے بلکہ فلم کے اختتام پر ناز اور بھارتی بابو ـــ ممتاز کے اس ناکردہ گناہ کو جو سرفراز کی شکل میں، ناز کا مستقبل بنانے کی آخری ناکام کوشش کے طور پر ان کے پاس تھا ـــ لے کر بمبئی کی طرف کوچ کرتے ہیں جہاں نہ ان کی منزل کا کوئی تعین ہے، نہ ہی مستقبل کی پریشانیوں سے وہ باخبر ہیں؟

ممتاز کا کردار ایک عورت کا بھرپور کردار ہے جو اپنی بہن کو "کوٹھے" کی دلدل سے نکالنے کے لیے نہ صرف اپنے محبوب بھارتی بابو سے اس کی شادی کا پروگرام بناتی ہے بلکہ ایک لٹے پٹے امیرزادے سے شادی کر کے اسے سنوارنے کی کوشش کرتی ہے۔

کہانی پر انور ندیم کی پکڑ بہت گہری ہے جبھی تو وہ اپنے کلاروں سے ایسے مکالمے بلوائے جو فلموں میں چاند کو "چھونے کا قصہ" سے کسی طرح کم نہیں ـــ

"یہ بھی نہیں کہ حضرت داغ کی غزلیں ہی کوٹھے تک آئی ہوں اور میر و غالب کا کلام ہم سے بچ گیا ہو، تم محفل میں پڑھو یا تنہائی میں، غزل تو سبھی کے دلوں کی زبان ہے۔"

ایک اور مقام پر انور ندیم کا قلم نشتر کی طرح کیسے کاری زخم لگاتا ہے ـــ

"بہت خوب آپ خواب دیکھ بھی سکتے ہیں اور دکھا بھی سکتے ہیں مگر میرا ہاضمہ بالکل ٹھیک ہے! بھارتی صاحب! مجھے خواب دیکھنے کا مرض نہیں ہے چوک میں ایسے بہت سے کوٹھے ہیں جہاں کئی لڑکیاں اپنے حالات سے سمجھوتا نہیں کر سکی ہیں آپ کہیں بھی اپنے سپنوں کا کاروبار کر سکتے ہیں"۔

کتاب کا سرورق دیدہ زیب ہے اور لیتھو پر اتنی معیاری طباعت میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔

ـــ اطہر فاروقی

تحریکِ آزادی میں اُردو کا حصّہ

ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں اُردو
جو شاندار حصّہ رہا ہے اور اس کے جتنے پہلو
رجہات ہوسکتے ہیں ان پر اُردو اکادمی' دہلی
جانب سے ایک سہ روزہ کل ہند سیمینار غالب
یڈمی' بستی حضرت نظام الدّین اولیا نئی دہلی میں
۲ فروری سے ۲۹ فروری ۱۹۸۸ء تک ہوا۔
وفیسر آل احمد سرور نے اس سیمینار کا افتتاح
تے ہوئے کہا کہ اس موضوع پر ازسرِ نو غور
کرنے کی ضرورت اس لیے ہے کہ لوگ اُردو کی
خدمات کو فراموش کرتے جا رہے ہیں۔ اُردو نے
ہندوستان کی تاریخ کے ہر موڑ پر قومی فکر کا ساتھ
دیا ہے اور گنگا جمنی تہذیب کی برکتوں کے جلوۂ
صد رنگ کو عام کیا ہے لیکن ایسے لوگوں کی کمی
نہیں ہے جو اُردو کی خدمات کو نظر انداز کر کے
تنگ نظرانہ تاویلیں پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے
کہا کہ اگر صرف لوک گیتوں کو ہی لیا جائے تو اُردو
میں بہت بڑا سرمایہ ایسا فراہم ہوسکتا ہے جس
میں سماجی حالات پر طنز بھی ہے' اور سیاسی
واقعات پر تبصرہ بھی ہے۔ علی گڑھ تحریک کے مرکزی
کردار کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے سر سیّد احمد خاں
کے تعمیری کارنامے کا ذکر کیا اور کہا کہ اسی علی گڑھ
نے شبلی، حسرت موہانی' اقبال سہیل بھی پیدا کیے'
سرور صاحب نے یہ بھی کہا کہ ۲۳ مئی کو ٹیپو سلطان
کی برسی ہے' جنگِ آزادی کے شہیدوں میں ٹیپو
سلطان کا بہت بڑا مقام ہے۔ اُردو اکادمی کو ٹیپو
سلطان کی یاد اس کی قومی خدمات کے شایانِ شان
منانا چاہیے۔

سیمینار کے موضوع اور مقاصد پر روشنی
ڈالتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ' چیرمین
سیمینار کمیٹی نے کہا کہ اگرچہ یہ موضوع نیا نہیں
ہے لیکن آج کے سیاسی اور تہذیبی حالات نے
جو سوالات پیدا کر دیے ہیں ان کے تناظر میں اس
موضوع کے حوالے سے نئے سوال اٹھیں گے۔ پروفیسر
نارنگ نے تحریکِ آزادی میں اُردو کا جو کردار رہا ہے
اُس کی تین ارتقائی کڑیوں کا ذکر کیا اور کہا کہ

دائیں سے بائیں: سید شریف الحسن نقوی' ڈاکٹر تنویر احمد علوی' سید شہاب الدّین دسنوی' پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر گوپی چند نارنگ

بنیادی کڑی حُبّ الوطنی کے جذبات ہیں جو مقامی بھی تھے اور ملک گیر بھی، مثلاً وجہی یا ولی نے دکن و گجرات کی تعریف میں جو کچھ کہا ہے وہ مقامی ہے لیکن دیوان زادہ میں شاہ حاتم نے پورے ہندوستان کا تصوّر پیش کیا۔ گویا ملک کی سیاسی و تہذیبی سالمیت و وحدت کا تصوّر اُردو شاعری میں شروع سے ہی ملتا ہے۔ دوسری ارتقائی کڑی کی مثال انھوں نے کلاسیکی غزل کے اشعار سے دی جن میں انگریز دشمنی کے جذبات کا اظہار ملتا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے راجہ رام نارائن موزوں، آبرو، میر تقی میر، سودا، مصحفی اور جرأت کا بالخصوص حوالہ دیا جن کے کلام میں انگریزوں کے خلاف کھلے ہوئے اشارے ملتے ہیں۔ پروفیسر نارنگ نے مزید کہا کہ تیسری ارتقائی کڑی وہ واضح سیاسی تصوّر ہے جو بغاوت ۱۸۵۷ء یعنی پہلی جنگِ آزادی کے بعد ملنے لگتا ہے جس کا اظہار حالی اور آزاد کی حُبّ الوطنی کی نظموں سے ہوتا ہے پھر کانگریس کے قیام کے ساتھ یہ سیاسی قومی شعور اُردو شاعری، اُردو فکشن اور اُردو صحافت میں عام طور پر ملنے لگتا ہے۔ اس میں اقبال، درگا سہائے سرور اور چکبست جیسے نظم گو شعرا کا بھی حصّہ ہے، حسرت موہانی اور محمد علی جوہر جیسے غزل گو شعرا کا بھی اور ابوالکلام آزاد جیسے شعلہ بیان خطیبوں اور نیشنلسٹ، قومی رہنماؤں اور صحافیوں کا بھی۔ افتتاحی اجلاسوں کی صدارت دارالمصنفین کے رُکن اور انجمن ترقیِ اُردو ہند کے نائب صدر سیّد شہاب الدّین دسنوی نے کی۔ خیر مقدمی کلمات اُردو اکادمی، دہلی کے سکریٹری سیّد شریف الحسن نقوی نے ادا کیے اور آزادی کی چالیسویں سالگرہ کے سلسلے میں اُردو اکادمی کے دیگر پروگراموں اور منصوبوں کا ذکر بھی کیا۔

دوسرا اجلاس چائے کے وقفہ کے بعد پروفیسر نذیر احمد کی صدارت میں شروع ہوا اس اجلاس میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے تحریکِ آزادی کے سماجی اور معاشی اسباب وعلل پر روشنی ڈالی اور دو مآخذ کا حوالہ دیتے ہوئے وضاحت کی کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ یہ اسباب مذہبی تھے لیکن مذہبی سے زیادہ ان کی جڑیں معاشی اور سماجی تھیں۔ دوسرا مقالہ مولانا آزاد لائبریری کے جناب محمد ضیاء الدّین انصاری نے "ہندوستان کی آزادی میں علی گڑھ تحریک کا علمی و ادبی حصّہ" پر پڑھا۔ دونوں مقالوں پر فکر انگیز بحث ہوئی۔

○

دوسرے دن کی پہلی نشست کی صدارت، جو مقالہ خوانی کی دوسری نشست تھی، جناب کوثر چاند پوری نے فرمائی۔ پہلا مقالہ جناب کاظم علی خاں نے "تحریکِ آزادی اور لکھنوی ادب" پر پڑھا، انھوں نے انگریزی حکومت کی سیاسی چالوں اور دھاندلیوں کا شکار ہونے والی اودھ کی حکومت کے زوال کی اجمالی داستان کے بیان کے بعد، لکھنؤ کے شاعروں نے بدیسی سرکار کے مظالم کے خلاف جس طرح اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے اس کی متعدد مثالیں دے کر لکھنوی ادب اور تحریکِ آزادیِ ہند کے تعلّق پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے ناسخ اور جان صاحب کے بعض غیر معروف اشعار کا حوالہ بھی دیا اور فتح محمد طالب کی مثنوی 'تواریخ احمدی' ۱۲۸۰ھ کا بھی تعارف کرایا جس میں مولوی احمد اللہ شاہ کی انگریزوں کے خلاف معرکہ آرائیوں کی تفصیل نظم کی گئی ہے۔ دوسرا مقالہ ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے "اُردو کی اٹھان میں سیاسی اور تہذیبی آزادی کی اُمنگیں" کے عنوان سے پڑھا۔ انھوں نے وضاحت کی کہ اُردو زبان اپنے مزاج اور ساخت کے اعتبار سے ایک آزاد خیال اور سیکولر زبان ہے۔ موجودہ عہد میں جو تنگ نظر اور متعصب حضرات اُردو کے قومی اور اتحاد پسندانہ کردار کو نظر انداز کر کے اُردو کے خلاف زہر پھیلا رہے ہیں، دراصل وہ ہندوستان کے دوست نہیں دُشمن ہیں۔ اس نشست کا تیسرا اور آخری مقالہ دیوان ظفر پیامی نے "اُردو اور تحریکِ آزادی۔ فکری اور نظریاتی رشتے" کے موضوع پر پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ تحریکِ آزادی کے تمام کرداروں نے اُردو کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا مثلاً اُردو ہی میں علمائے کرام نے جہادِ آزادی کے حق میں فتاوے جاری کیے آریہ سماجیوں نے بھی ہندو اصلاحی تحریکوں کے لیے اُردو کو اپنایا نیز قومی دھارے کی کانگریس کے علاوہ بھگت سنگھ، اشفاق اللہ اور رام پرشاد بسمل جیسے مجاہدینِ آزادی نے بھی اُردو ہی میں ترانے گائے۔ دیوان ظفر پیامی نے مزید کہا کہ اُردو زبان نے کسی بھی دوسری ہندوستانی زبان کے مقابلے میں سب سے زیادہ عکاسی ملی جُلی تہذیب کی کی۔ ہندو مُسلم اتّحاد پر بھی سب سے زیادہ زور اُردو ہی نے دیا۔

مقالوں کی تیسری نشست پروفیسر مسعود حسین خاں کی صدارت میں ہوئی۔ پہلا مقالہ پروفیسر سیّدہ جعفر نے شعرائے حیدرآباد پر پڑھا۔ انھوں نے وضاحت کی کہ شعرائے حیدرآباد کو صرف انگریزوں کا سامنا نہیں تھا بلکہ ان کی لڑائی دیسی ملوکیت کے خلاف بھی تھی اور بدیسی سامراج کے خلاف بھی۔ شعرائے حیدرآباد نے آزادی اور انقلاب کی اس روایت سے تقویت حاصل کی جو تلنگانہ تحریک تک پہنچتی ہے ایسے شاعروں میں مخدوم، شاہد صدّیقی سلیمان اریب قابل ذکر ہیں۔ کرشن چندر کے ناول "جب کھیت جاگے" کا پس منظر بھی تلنگانہ تحریک ہی ہے۔ پروفیسر قمر رئیس نے

یکِ آزادی اور پریم چند" پر اپنا مقالہ پڑھا۔ ں نے "سوزِ وطن" کی کہانیوں سے لے کر پریم کے آخری زمانے کے افسانوں اور ناولوں تک زہ لیتے ہوئے وضاحت کی کہ پریم چند تحریکِ ی کے ہر موڑ پر اس کے نقیب رہے۔ ان کا تھا کہ سچا ہندوستان دیہات میں آباد ہے ں میں نہیں۔ چنانچہ وہ ہمیشہ عوامی تحریکوں اتھ رہے، سول نافرمانی اور خلافت کا بھی ں نے ساتھ دیا وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست تھے۔ انھوں نے پریم چند پر گاندھی جی کے ، کا ذکر بھی کیا۔ جناب شہاب الدین دسنوی ریکِ آزادی کے تین دور میں اُردو کا حصہ" ان سے مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ جنگ خواہ ہو یا آئینی، اسے ہر حال میں تین منزلوں سے پڑتا ہے ایک دور عوام میں بیداری پیدا کرنے ا ہے، دلوں میں جوش پیدا کرنے اور ہونے جنگ کے اسباب وعلل کی معقولیت نے کا۔ اس کے بعد جنگ کی تیاریاں کی جاتی ران سب کے بعد جنگ کی کاروائی عمل میں ۔ اُردو زبان و ادب ان تینوں مدارج میں ستان کی تحریکِ جنگِ آزادی کو مثبت اور رخ دیتا رہا ہے۔

اس سہ روزہ سیمینار کی مقالہ خوانی کی ی نشست ۲۹ فروری کو ڈاکٹر ظ۔ انصاری رت میں ہوئی۔ اس اجلاس کا پہلا مقالہ نیس اشفاق نے "اکبر کی شاعری میں تحریکِ ی کا انعکاس" کے عنوان سے پڑھا۔ انھوں نے طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کو تین حصوں میں لیا، ان کے مطابق اکبر کی شاعری میں تین ی عناصر کی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے۔ یہ تین عناصر اندیشہ، تشویش اور احتجاج ہیں۔ ڈاکٹر انیس نے اکبر کے ان تینوں رُجحانات کے لیے ان کی شاعری سے دلیلیں دیں۔ انھوں نے اکبر کے وسیلے سے اس عہد کی سیاسی اور اقتصادی صورت حال کا جائزہ بھی لیا اور گاندھی جی کے فکری اور عملی اقدامات کا اثر نیز اکبر کے عہد پر اس کے مثبت اثرات کا احاطہ بھی کیا۔ اپنے مقالے کے اختتام پر انھوں نے اکبر کی شاعری کے ذریعے پیدا ہونے والی اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی بیداری کی سمت بلیغ اشارے کیے۔ اس نشست کا دوسرا مقالہ پروفیسر شبیہ الحسن کا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اُردو زبان و ادب کا آزادی کی جنگ میں جو کردار رہا ہے وہ بہت ہی وقیع اور لائقِ ستائش ہے مگر تحریکِ آزادی نے اُردو زبان و ادب کو جو نئی روح اور اسالیب کے جو نئے پیکر عطا کیے ہیں وہ بھی کچھ کم لائقِ تحسین و ستائش نہیں۔ انھوں نے کہا کہ تحریکِ آزادی نے اُردو زبان کو نیا لب و لہجہ، نئے الفاظ اور پُرانے الفاظ کی نئی تعبیرات سے روشناس کرایا۔ اس اجلاس کا آخری مقالہ جناب حیات اللہ انصاری نے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ اُردو کے ادیبوں اور شاعروں نے جدوجہد آزادی کو نہ صرف اپنی تخلیقات کے ذریعے آگے بڑھایا بلکہ وہ خود اس جنگ میں گاندھی جی کی قیادت میں شریک رہے۔ انھوں نے اُردو کے مختلف شعرا کے کلام سے مثالیں پیش کیں۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ اُردو کے سرمایے میں عوام کی کوششوں اور ان کے کارناموں کی گونج کم سنائی دیتی ہے، ہمیں چاہیے کہ ان کے کارناموں کو بھی ہم اپنی زبان و ادب کا حصہ بنائیں۔

آخری نشست کی صدارت پروفیسر محمد حسن نے کی اس اجلاس میں ایم حبیب خاں نے اپنا مقالہ "اُردو صحافت ۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء" پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ اُردو صحافت اپنی ابتدا سے ہی بے باک اور حق و صداقت کی امین رہی ہے۔ ان کے مطابق اُردو کی صحافت اور اس کی تاریخ ہی جدوجہد آزادی کے بطن سے جنم لیتی ہے۔ حبیب خاں نے زور دے کر کہا کہ اُردو صحافت ہی صحیح معنوں میں ہماری قومی تحریکات اور جدوجہد آزادی کو عوام تک پہنچانے کا موثر ذریعہ رہی ہے۔ صدر جلسہ پروفیسر محمد حسن نے "اُردو ادب میں آزادی کا تصور" پر اپنا بھرپور مقالہ پیش کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ ہماری زبان ابتدا سے ہی تصور آزادی سے معمور ہے۔ آزادی کی جڑیں اس کے خمیر میں پیوست ہیں۔

سہ روزہ سیمینار کے اختتام پر سیمینار کے چیئرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ایک پانچ نکاتی ریزولیوشن پیش کیا جس کی سیمینار کے شرکا اور سامعین نے پُرزور تائید کی۔

ریزولیوشن

۱۔ شہید ٹیپو سلطان کا یوم شہادت ۲۳ مئی ہے۔ ان کی یاد اُردو اکادمی کو قومی نوعیت کا مذاکرہ یا جلسہ کر کے منانا چاہیے۔ ٹیپو سلطان کی بے مثال قربانی نے اُردو شاعروں اور ادیبوں کو ہمیشہ متاثر کیا۔ اس بارے میں تنقیدی، تحقیقی کتاب شائع کرنا بھی مناسب ہوگا۔

۲۔ تحریکِ آزادی کے سلسلے میں اُردو رسائل اخبارات، کتابچوں اور کتابوں میں شائع ہونے

والی جن نظموں، مضامین، اداریوں اور دیگر تحریروں کو انگریز سرکار نے ضبط کیا تھا اور ان میں سے جو نیشنل آرکائیوز دہلی، برٹش میوزم، انڈیا آفس، دیگر یوروپی ذخائر، نیز ریاستی آرکائیوز میں اب تک محفوظ ہیں۔ تاریخی اور قومی اہمیت کے اس نادر سرمایے کو ایک بار مرتب و مدوّن کرا کے اُردو اکادمی دہلی کو باقاعدہ سلسلۂ کتب کے طور پر شائع کرنا چاہیے۔

۳۔ تحریکِ آزادی کے سلسلے میں اُردو میں شائع ہونے والا بہت سا تاریخی اور ادبی میٹریل اب نایاب ہے، اس میں سے بھی خاص خاص تحریروں کتابوں کو نئی ترتیب و تدوین کے ساتھ ایک سلسلۂ کتب کے طور پر شائع کرنا چاہیے یہ کام بھی اُردو اکادمی اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے۔

۴۔ مندرجہ بالا کتابوں میں سے بعض کو اُردو اکادمی خود یا ہندی اکادمی، دہلی سرکار کی مدد سے دیوناگری میں بھی شائع کرے تاکہ اُردو کی نہایت اہم قومی اور سیاسی خدمات سے ہندی پڑھنے والے بھی پوری طرح آگاہ رہیں۔

۵۔ تحریکِ آزادی سے متعلق بہت سے ترانے اُردو میں لکھے گئے۔ ایسی نظمیں اور ترانے اُردو سے جڑی ہوئی بولیوں، مثلاً کھڑی، ہریانی، برج، راجستھانی، اودھی وغیرہ میں بھی ملتے ہیں۔ انھیں بھی کتابی شکل میں اُردو اکادمی کی جانب سے شائع کرنا چاہیے۔

اُردو میں عوامی ادب کی روایت

۱۶؍فروری ۸۸ء سے مذکورہ موضوع پر شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی اعانت سے سیمینار ہوا جس کے افتتاحی اجلاس میں صدرِ شعبہ پروفیسر قمر رئیس نے کہا کہ ملک کی دوسری زبانوں کی طرح اُردو میں بھی عوامی ادب کا قابلِ قدر سرمایہ موجود ہے لیکن افسوس ہے کہ اُردو کے عالموں اور نقّادوں نے اس کی تحقیق اور تدوین کی طرف اب تک کوئی توجّہ نہیں کی۔ انھوں نے کہا کہ اُردو زبان و ادب کی ہمہ گیر مقبولیت اس بات کا ثبوت ہے کہ اس زبان کی جڑیں ہندوستان کی تہذیب میں دُور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ لیکن آج جب بعض حلقوں کی طرف سے اُردو کو شہری اشرافیہ کی زبان کہا جا رہا ہے اس کی ضرورت ہے کہ ہم اُردو کے عوامی ادب کی تحقیق و تلاش کر کے اُردو کے بنیادی عوامی رشتوں کو دریافت کریں اور اُردو کے عوامی ادب کو اُردو ادب میں اس کا جائز مقام دلائیں۔

دہلی یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر پروفیسر کے۔ ڈی۔ گنگ راڈے نے اُردو زبان کی شیرینی، مقبولیت اور جنگِ آزادی میں اس کے گراں قدر حصّے کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم کسی بھی زبان کے اصل کردار کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک ہم اس کے عوامی ادب کے سرمایے کا تنقیدی جائزہ نہ لیں، اس اجلاس کی صدارت پروفیسر آلِ احمد سرور نے کی اور کلیدی مقالہ ڈاکٹر محمد حسن نے پڑھا۔ دونوں نے زور دے کر کہا کہ عوامی ادب کو نظر انداز کرنا اپنی جڑوں سے کٹنے کے مترادف ہے انھوں نے کہا کہ بعض تاریخی حالات اور شرفا پرست ذہنیت کے زیرِ اثر اُردو میں عوامی ادب کو ہمیشہ حقارت آمیز نظر سے دیکھا گیا جو صحیح رویّہ نہیں ہے۔ پروفیسر سرور نے کہا کہ شعبۂ اُردو کے طالب علموں کے ذریعے سب سے پہلے نواحِ دہلی کی بولیوں کا سروے کیا جانا چاہیے۔

چائے کے وقفے کے بعد سیمینار کا پہلا اجلاس شروع ہوا اس میں شمیم حنفی، ڈاکٹر عتیق اللہ، پروفیسر یوسف سرمست نے مقالے پڑھے۔ ابتدائی دو مقالوں میں لوک ادب، عوامی ادب اور لوک گیتوں کے عوامی کردار کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی تعریف متعین کرنے کی کوشش کی گئی۔ ڈاکٹر یوسف سرمست نے قدیم دکنی اُردو میں عوامی ادب اور عوامی عناصر کی نشاندہی کی۔

۱۷؍فروری کی صبح دس بجے سیمینار کا دوسرا اجلاس شروع ہوا۔ اس کی صدارت پاکستانی ادیب و شاعر ڈاکٹر وزیر آغا نے کی ڈاکٹر ابراہیم فیض اور ڈاکٹر ابوالفیض سحر نے دکنی زبان کی لوک کہانیوں اور لوک گیتوں پر مقالے پڑھے۔ ڈاکٹر ابوالفیض سحر نے کہا کہ قدیم دکنی دور میں اُردو شاعری، عوامی بول چال محاورات اور عوامی زندگی کے تجربات سے بہت قریب تھی۔ بعد میں فارسی ادبیات کے زیرِ اثر اور زبان کی معیار بندی کے نتیجے میں عوام کی زندگی سے اس کا رشتہ کمزور پڑ گیا۔ ڈاکٹر کنول ڈبائیوی نے اُردو میں خیال اور نوٹنکی کے موضوع پر اپنا مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ خیال کے ہی دامن سے نوٹنکی کی صنف نے جنم لیا انھوں نے عوامی عقیدوں اور توہّمات کی ترجمانی کرنے والی اصناف مثلاً نور نامہ، فضائل نامہ، قصّہ دائی حلیمہ وغیرہ کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ یہ منظوم عوامی گیت لاکھوں مسلمانوں کے مذہبی جذبات کی تسکین کا باعث رہے ہیں۔ علی جواد زیدی نے اپنے مقالے میں کہا کہ گیتوں، دوہوں، اندر سبھاؤں اور نوٹنکیوں کی شکل میں ایک بڑا ذخیرہ عوامی

ادب کا ایسا ہے جس کے سنجیدہ مطالعے کی ضرورت ہے۔ تحریکِ آزادی کے مختلف مرحلوں میں ایسے بے شمار گیت تصنیف ہوتے ہیں جو گائے جاتے تھے اور جو جنگِ آزادی میں عوام کے حوصلے بڑھاتے تھے۔ ایسے گیتوں کو بھی تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر [illegible] لوی نے گجرات اور مہاراشٹر کے علاقوں میں گائے جانے والے عوامی گیتوں کا احاطہ کیا اور مثالیں دے کر بتایا کہ اُردو کا عوامی ادب کسی ایک علاقے تک محدود نہیں بلکہ پورے ملک میں پھیلا ہوا ہے اور اس میں ہر علاقے کے محنت کش اور غریب انسانوں کے دُکھ سُکھ کی کہانیاں چھپی ہوئی ہیں۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے اُردو میں لوک ادب کی روایت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اُردو زبان کا کردار چوں کہ شہری رہا ہے اس لیے اس میں دیہات میں پیدا ہونے والے لوک ادب کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ عوامی ادب بولیوں کے اثر سے مرتب ہوتا ہے۔ اُردو کے لوک ادب میں بھانڈوں کی نقلوں اور ڈرامے کی عوامی شکلوں کو بھی اہمیت حاصل رہی ہے۔ شادی بیاہ کے گیتوں میں عوامی جذبات کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور انور سدید نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ اُردو کے عوامی ادب پر برِّصغیر میں یہ پہلا مذاکرہ ہے۔

سیمینار کے تیسرے اجلاس کے مقالوں میں بہار میں اُردو کے عوامی ادب اور عوامی گیتوں کا مطالعہ پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر ش۔ اختر نے کہا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بارے میں اُردو میں بے شمار گیت لکھے گئے جن کو خانہ بدوش عورتیں گایا کرتی تھیں۔ ڈاکٹر شکیلہ اختر نے بہار کے ان لوک گیتوں کا جائزہ لیا جو پیدائش، شادی بیاہ اور چھٹی چھلّے کی رسموں کے موقع پر گائے جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جوگ اور [illegible]نا کے گیت لڑکی کے گھر گائے جاتے ہیں۔ شہانے گیت دُولہا اور دُلہن کو سجانے اور سنوارنے کے موقعے کے لیے ہیں اور سب سے آخر میں جھومر گایا جاتا ہے۔ نوجوان اور نو بیاہتا لڑکیاں جھومر کے گیت گاتی ہوتی خود بھی جھوم جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ برہ کے گیت، چیت اور بیساکھ کی رومانی راتوں کے گیت۔ سندھی زبان کے اسکالر ڈاکٹر ایم۔ اے۔ جیٹلی نے اُردو کے محاوروں اور کہاوتوں کے عوامی کردار پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ کہاوتیں ہر زبان میں عوام کے تجربات کا حاصل ہوتی ہیں اس لحاظ سے اُردو بڑی مالا مال ہے کہ اس میں کہاوتوں اور محاوروں کا سرمایہ بہت کثیر ہے۔ چندر شیکھر نے ہریانہ کے لوک گیتوں کا مطالعہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہریانوی زبان اُردو سے بہت قریب ہے اور ہریانوی زبان مختلف لہجوں کی مخلوط زبان ہے۔ یوں بھی عوامی گیتوں کی زبان ملی جلی زبان ہی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر مجیب الاسلام نے کہا کہ اُردو کا خمیر دلی میں اٹھا اور ٹھیٹھ اُردو کے بہترین نمونے دہلی کے عوامی گیتوں میں ملتے ہیں ان میں بہت سے گیت ایسے بھی ہیں جو دہلی سے باہر گئے اور وہاں مقبول ہوئے۔

۱۸ فروری کی صبح دس بجے سیمینار کے چوتھے اجلاس کا آغاز ہوا۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنے مقالے میں کہا کہ اُردو کے دو رُوپ ہیں ایک بالائی دوآبے کے علاقے میں رائج رہا ہے اور دوسرا گنگا پار کی کھڑی بولی ہے جو روہیل کھنڈ کے علاقے میں بولی جاتی رہی ہے اور جو اُردو سے قریب ترین ہے۔ انھوں نے لسانی شواہد کے ذریعے بتایا کہ گزشتہ سات آٹھ سو سال سے دہلی اور دوآبے کے علاقوں میں جو زبان عوام کے میل جول سے پرورش پاتی رہی ہے اور جس کی بنیاد کھڑی اور ہریانوی پر ہے وہ اُردو ہی ہے جب کہ جدید ہندی میں یہ بنیاد غائب ہے اس لیے کہ اس کا آغاز صحیح معنوں میں ۱۸۰۰ء کی آس پاس للّو لال کی کتابوں سے ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اُردو نے برج، اودھی، مراٹھی، تیلگو اور کنّڑ کے علاقوں میں بھی اپنی جگہ بنائی اور وہاں اُردو کے لاکھوں بولنے والے پیدا ہو گئے۔ شہروں کے علاوہ ہزاروں قصبات میں بھی یہ زبان زندہ بولی کی حیثیت سے رائج ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اُردو کے عوامی گیتوں کی ابتدا کا سہرا امیر خسرو کے سر باندھا اور برین نسخے کی تفصیل بتاتے ہوئے اس پر زور دیا کہ ان کی بیشتر پہیلیاں تبدیلی کے عمل سے گذرنے کے باوجود ان کی ہی ہیں۔ ابراہیم یوسف نے ۱۹ ویں صدی کے آخر میں لکھے اور کھیلے جانے والے بے شمار ڈراموں کے حوالے سے بتایا کہ ان ڈراموں میں عوامی زندگی اور عوامی تہذیب کی شمولیت سے ہی بھرپور مقبولیت کا وصف پیدا ہوا۔

سیمینار کے پانچویں اور آخری اجلاس میں پروفیسر عقیل رضوی نے کہا کہ اُردو میں عوامی قصوں اور عوامی گیتوں کا سرمایہ جتنا وسیع ہے اتنا ہی اسے نظر انداز کیا گیا ہے۔ جناب رشید حسن خاں نے اُردو میں پہیلیوں کے سرمایے اور ان کی قدر و قیمت پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ پہیلیاں بالعموم بچّوں کے ذہن میں تیزی اور براقی پیدا کرنے کے لیے گڑھی جاتی تھیں اور مختلف علاقوں اور زمانوں سے گزرتے ہوئے ان میں لفظی تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں۔ ابوالفیض عثمانی نے چار بیت کے عوامی کردار پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ رام پور اور ٹونک کی بستیوں میں یہ صنف بہت مقبول رہی ہے۔ چار بیت کی کوئی بندھی ٹکی ہیئت نہیں ہے اس کے وزن اور قافیوں کا نظام بدلتا رہتا ہے لیکن اس کا بڑا وصف یہ ہے کہ اسے گایا جا سکے یہ عوامی صنف اس

معنی میں بھی ہے کہ اسے نچلے طبقے کے صناع اور کاریگر جوان اور بوڑھے مل کر خاص اسلوب سے گاتے ہیں۔

آخر میں سیمینار کے ڈائرکٹر ڈاکٹر قمر رئیس نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ اُردو میں عوامی قصّوں، عوامی گیتوں، بارہ ماسوں اور دوسری عوامی اصناف کا سرمایہ اتنا بڑا ہے کہ ان میں سے ہر صنف پر ایک الگ سیمینار کی گنجائش ہے۔ اس سیمینار کا مقصد عوامی ادب کے اس گراں قدر سرمایے کی طرف یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور محققین کی توجہ مبذول کرانا تھا اور مجھے خوشی ہے کہ ہم اس مقصد میں کامیاب ہوئے۔

ڈاکٹر قمر رئیس نے ایک قرارداد پیش کی جو اتفاقِ رائے سے منظور ہوئی اس میں دانش گاہوں کے اُردو شعبوں، اُردو اکادمیوں، ترقیِ اُردو بورڈ، انجمن ترقیِ اُردو اور یو جی سی سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ آئندہ چند برسوں میں اُردو کے عوامی ادب کی تحقیق و تدوین کے کام کو ترجیحی طور پر آگے بڑھائیں ہندوستان میں اگر اُردو زبان کو زندہ رہنا ہے تو اس کی ان عوامی جڑوں اور بنیادوں کو از سرِ نو دریافت کرنا ہوگا جو عوامی تہذیب اور عوامی ادب کے خزانوں میں چھپی ہوئی ہیں۔ (ارتضیٰ کریم)

راجستھان اُردو اکادمی کی سرگرمیاں

راجستھان اُردو اکادمی کے زیرِ اہتمام اس سال تمام راجستھان کے اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے طلبا و طالبات کا ایک انعامی مقابلہ منعقد کیا گیا۔ اس مقابلے کے لیے مڈل سطح، سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری سطح اور کالج اور یونیورسٹی سطح کے تین الگ الگ گروپ بنائے گئے اور ہر گروپ کے لیے الگ الگ [illegible] نویسی کے مقابلے کے لیے حسبِ ذیل موضوعات مقرر کیے تھے۔

مڈل سطح: "ہمارا پیارا وطن ہندوستان"

سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری سطح: "سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا"

کالج اور یونیورسٹی سطح: "اُردو شاعری میں قومی اتحاد کا پیغام"۔

اس مقابلے میں سارے راجستھان کے سوا دو سو طلبا و طالبات نے حصّہ لیا اور حسبِ ذیل نتائج رہے۔

۱۔ کالج اور یونیورسٹی سطح

پہلا انعام: مِس زبیدہ تاج، مہرا گرلز کالج اودے پور۔ دوسرا انعام: جنابِ محمد شاہد خاں، شعبۂ اُردو راجستھان یونیورسٹی، جے پور۔ تیسرا انعام: جنابِ جمیل خاں، شعبۂ اُردو گورنمنٹ کالج، ٹونک۔

۲۔ سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری سطح

پہلا انعام: جنابِ آصف آزاد، گورنمنٹ نیتاجی سبھاش چندر بوس ہائر سیکنڈری اسکول موتی کٹلہ جے پور۔ دوسرا انعام: جنابِ عطاءاللہ خاں، گورنمنٹ ہائر سیکنڈری اسکول ٹونک اور مِس سنجیدہ گورنمنٹ سینٹرل ہائر سیکنڈری اسکول اجمیر۔ تیسرا انعام: مِس افشاں عثمانی، گورنمنٹ کملا نہرو گرلز ہائر سیکنڈری اسکول جے پور اور مِس تنویر جہاں، مُسلم ہائر سیکنڈری اسکول جے پور۔

۳۔ مڈل سطح

پہلا انعام: جنابِ ایّوب خاں، گورنمنٹ مڈل اسکول چھوٹی چھابری ضلع ناگور۔ دوسرا انعام: مِس ریشما بھارتی، گورنمنٹ گرلز ہائر سیکنڈری اسکول ٹونک۔ تیسرا انعام: جنابِ جلیل احمد گورنمنٹ مڈل اسکول بھیم منڈی ضلع کوٹہ اور جنابِ شاداب عالم اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول سیکر۔

راجستھان اُردو اکادمی کے زیرِ اہتمام اکادمی

ٹریننگ کا چھ ماہ کا کورس ہوگا۔ اور یہ ٹریننگ بلامعاوضہ دی جائے گی۔

بچّوں کے ادب پر پی ایچ۔ ڈی

خوشحال زیدی کے تحقیقی مقالے "اُردو میں بچّوں کا ادب" پر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے یہ مقالہ ڈاکٹر مظفر حنفی کی زیرِ نگرانی مکمل ہوا ہے اور مقالہ نگار نے کوشش کی ہے کہ امیر خسرو سے تا حال اُردو میں بچّوں کے لیے کسی قابلِ ذکر تخلیق کا حوالہ رہ نہ جائے۔

ڈاکٹر خوشحال زیدی کے مضامین مُلک کے متعدد رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ وہ محکمۂ تعلیم دہلی سے وابستہ ہیں۔ (تسکین زیدی)

ہم قلم کی سالگرہ

رام پور میں ۱۴ فروری ۸۸ء کو معروف ادبی تنظیم "ہم قلم" کی دوسری سالگرہ منائی گئی۔ صدارت حسان آفندی نے کی۔ اور نظامت کے فرائض ایاز نظر نے انجام دیے۔ تقریب کی ابتدا قاری عتیق الرحمٰن نے تلاوتِ کلام پاک سے کی۔ عبدالوہاب صدّیقی نے ایک نعت پڑھی۔ اس کے بعد ایس۔ فضیلت نے ایک طنزیہ "قصّہ ایک سرکاری ادیب کا" پڑھا۔ خلیل خاں نے اپنا افسانہ "خواب" اور محمد اطہر مسعود خاں نے اپنے تین افسانے "جواز" "پیشگی شکریہ" اور "لائف پارٹنر" پڑھے۔ ایاز نظر، رفیع اشرف اور نعمان غازی نے بھی افسانے پڑھے۔ "ہم قلم" کا قیام ۹ فروری ۸۷ء کو عمل میں آیا تھا۔ وصی اقبال نے "ہم قلم" کے اغراض و مقاصد کی ایک شق کی پُر زور الفاظ میں تائید کی جس میں کہا گیا ہے کہ بزم کا ہر ممبر دو افراد کو اُردو پڑھائے گا یا اُردو پڑھنے والے دو افراد کی ٹیوشن کا خرچ برداشت کرے گا۔

(محمد اطہر مسعود)

(۱)

اس مختصر تحریر کا سرنامہ، درج ذیل شعر ، ماخوذ ہے:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوِ قاتل میں ہے

شہور شعر، حسرت موہانی سے تو کم، رام پرشاد بسمل زیادہ تر منسوب رہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ شعر امجد حضرت شاد کے شاگرد رشید سید شاہ محمد حسن ت جھبو صاحب بسمل کی غزل کا مطلع ہے۔ جو کے مطبوعہ مجموعۂ کلام "حکایتِ ہستی" میں موجود ۔ اسی غزل کے کچھ اشعار مطلع کے ساتھ ب ذیل ہیں:

فروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوِ قاتل میں ہے
رو راہِ محبت رہ نہ جانا راہ میں
لذتِ صحرا نوردی، دوریِ منزل میں ہے
پھر مقتل میں قاتل کہہ رہا ہے بار بار
آئیں وہ، شوقِ شہادت جن کے جن کے دل میں ہے
والو آؤ، اب گردن کٹاؤ شوق سے
یہ غنیمت وقت ہے خنجر کفِ قاتل میں ہے
رہ سنسان، خم اُلٹے پڑے ہیں، جام چور
سرنگوں بیٹھا ہے ساقی جو تری محفل میں ہے
ت آنے دے دکھا دیں گے تجھے اے آسماں
ہم ابھی سے کیوں بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے
، نہ اگلے ولولے ہیں اور نہ وہ ارماں کی بھیڑ
صرف مٹ جانے کی اک حسرت دلِ بسمل میں ہے

اس غزل کا سنِ تخلیق، مجموعے میں ۱۹۲۱ء درج ہے اور اس کے بعد یہ مصرعہ ہے:

ہم ابھی سے کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے

معلوم ہوتا ہے کہ غالباً یہ کسی شعری نشست کا مصرعہ طرح ہے اور اسی زمین میں بسمل مرحوم نے غزل کہی تھی۔

پیشِ نظر مجموعے کے آغاز میں جمیل مظہری کا مضمون "ایک تقریظی تعارف" کے عنوان سے درج ہے۔ اس مضمون میں مضمون نگار موصوف اپنے اور بسمل عظیم آبادی کے "ہم عصروں، ہم عمروں اور ہم صفیروں" کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں، "ان میں سبھی اپنی طبیعت کے بادشاہ تھے مگر اس کے ساتھ کسی نہ کسی ڈیوڑھی کے فقیر بھی۔ کسی میں آتش کی شعلہ خیزی کی چھوٹ اور کسی پر شاد کی چھاپ تھی تو کسی پر غالب کا غلبہ اور کسی کے گلے میں اقبال کی ذہنی غلامی کا پٹہ۔ ایک مستقل انفرادیت کا مالک ہم لوگوں میں سوائے بسمل کے کوئی نہ تھا۔ آپ بے تکلف میرے شعر کو اجتبیٰ کا شعر اور اجتبیٰ کے شعر کو میرا شعر کہہ کے سنا سکتے ہیں اور بڑے سے بڑے نقاد کو دھوکہ دے سکتے ہیں۔ لیکن بسمل کا ایک شعر بھی ہزاروں اشعار کے ہجوم میں پکار پکار کے نہیں، چیخ چیخ کے کہتا ہے کہ میں بسمل کا ہوں اور بسمل کے فن کار ذہن کی پیداوار ہوں۔

اس انفرادیت کے علاوہ بسمل کی غزلیت میں ایک جذباتی تپیدگی بھی ہے جسے ہم بسمل کی تڑپ کہہ سکتے ہیں۔ افسوس کہ اس تڑپ کی میراث کو قبول کرنے والا نئے عظیم آباد میں کوئی نظر نہیں آتا۔ یہ مخصوص رنگِ سخن انہی سے شروع ہوا اور انہی پر ختم ہو گیا۔"

اس اقتباس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ بسمل عظیم آبادی کس پایے کے شاعر تھے۔

پروفیسر عطاء الرحمٰن عطا کاکوی (تلمیذ شاد) اپنے مقالے "بسمل عظیم آبادی" میں زیر بحث شعر کے متعلق کہتے ہیں "ان کی غزل 'دل میں ہے وقاتل میں ہے' اس دور کی یادگار ہے جب ملک میں تحریک عدم تعاون کا زور تھا۔ اس غزل کا مطلع ہندوستان گیر شہرت کا مالک ہوا۔ غزل ایک عرصہ تک ما بہ النزاع رہی مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ بسمل ہی کے قلم سے نکلی تھی جس پر جنابِ شاد کی اصلاح ہوئی۔ وقت کی پکار تھی مشہور ہو گئی"۔

شاہ جھبو صاحب بسمل کے عزیز قریب سید شاہ جعفر حسین ایڈوکیٹ کا تحریری بیان ہے "۱۹۲۱ء کی شہرۂ آفاق غزل جس کا مطلع ہے":

سرفروشی کی تمنا . . . . .

ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے دور میں زباں زدِ خواص وعوام تھی اور ۲۱ سے ۴۲ء تک کی تحریکوں میں جنگِ آزادی کے رہنما بھی اپنی تقریروں میں اس غزل کے اشعار سے زور اور طاقت پیدا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے آنجہانی جواہر لال نہرو کو بھی اپنی تقریر کے درمیان اس غزل کے مطلع کو پڑھتے ہوئے سنا تھا۔ لیکن غالباً عظیم آباد سے باہر، حال تک، بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف تھے کہ یہ غزل سید شاہ محمد حسن بسمل عظیم آبادی کی ہے۔ دہلی، لکھنؤ اور عظیم آباد کے ادبی رسالوں اور اخباروں میں جھبو بھائی کے زمانۂ علالت اور انتقال کے بعد ایک عرصہ تک اس غزل کے متعلق بحثیں ہوتی رہیں اور آخر سبھوں کو اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑا کہ یہ غزل سید شاہ محمد حسن بسمل ہی کی ہے۔ جھبو بھائی

کے استغنا کا تو یہ عالم تھا کہ انھیں کبھی ان امور کی پروا ہی نہ ہوئی۔"

مندرجہ بالا بیانات کی روشنی میں اب کسی مزید بحث کی گنجائش نہیں اور اس کو بار بار چھیڑنا محض تضیعِ اوقات ہے۔

——— بہزاد فاطمی

ناگیشور کالونی، ایسٹ بورنگ روڈ، پٹنہ ۱

(۲)

موقر ماہنامہ "ایوانِ اُردو دہلی" کے ماہ فروری ۱۹۸۸ء کے شمارے میں صفحہ ۳۴ پر درج ذیل شعر:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

کے سلسلے میں تحقیقی سطح پر کچھ لکھنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ شعر بسمل عظیم آبادی، حسرت موہانی اور رام پرشاد بسمل تینوں ہی شاعروں کی طرف الگ الگ منسوب کیا جاتا رہا ہے اور یہ بھی درست ہے کہ اسے بالعموم مفرد شعر سمجھا جاتا ہے اور اکثر و بیشتر اسے رام پرشاد بسمل ہی کی طرف کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ 'نیا دور' لکھنؤ اگست ۱۹۸۷ء کا جو شمارہ حال ہی میں بازار میں آیا ہے اس میں بھی ایک مضمون نگار نے اسے رام پرشاد بسمل ہی کا شعر بتایا ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہ نہ تو شعر مفرد ہے اور نہ ہی حسرت موہانی یا رام پرشاد بسمل کا شعر ہے۔ بلکہ آج سے تقریباً دس، پندرہ سال قبل ہی تحقیقی سطح پر یہ بات طے ہو چکی ہے کہ زیرِ بحث شعر سید شاہ محمد حسن بسمل عظیم آبادی عرف شاہ جھبو (متولد بمقام خسرو پور ضلع پٹنہ ۱۹۰۰ء، متوفی بمقام پٹنہ سٹی ۲۰/جون ۱۹۷۸ء) کا ہے۔ اس سے متعلق تحقیقی مباحث کا آغاز اس وقت ہوا تھا جبکہ اسے "بہار کی خبریں" تاریخ ۳/ ۱۹۷ء صفحہ ۹ پر رام پرشاد بسمل کی طرف منسوب کیا گیا تھا اور ارتضیٰ حسین ہوش مرحوم، مدیر "بہار کی خبریں" نے بھی اسی خیال کی تائید فرمائی تھی۔ چنانچہ اُن ہی دنوں ہفتہ وار "امانت" پھلواری شریف کے سالگرہ اور یومِ آزادی نمبر ۱۹۷۳ء میں صفحہ ۱۵ پر ایک مفصل مضمون لکھ کر سید شاہ نجیب مصطفیٰ جعفری نے صحیح صورت کی وضاحت کر دی تھی اور اس شعر کی تخلیق کا پوراپس منظر بھی بیان کر دیا تھا اور مکمل غزل بھی شائع کر دی تھی۔ بعد ازیں شاد کے اس مایۂ ناز شاگرد کی وفات کے بعد جب عطا کاکوی نے "آج کل" ستمبر ۱۹۷۸ء میں بسمل عظیم آبادی پر مضمون لکھا تو اس میں اس غزل کی وہ فوٹو اسٹیٹ کاپی بھی شائع کر دی گئی جس پر ۱۹۲۱ء میں شاد عظیم آبادی نے اصلاح دی تھی اور جس کا اصل مسودہ خدا بخش لائبریری میں آج بھی محفوظ ہے۔ چنانچہ مالک رام نے "تحریر" اکتوبر ۱۹۷۸ء میں صفحہ ۱۲۲ پر بسمل عظیم آبادی کے متعلق جو تعزیتی شذرہ لکھا ہے اس میں بھی ان تمام باتوں کی وضاحت موجود ہے۔ اور بقول مالک رام "یہ غزل سید شاہ محمد حسن بسمل ہی کی ہے۔" بسمل کے انتقال کے بعد جب "حکایتِ ہستی" کے نام سے ان کا مجموعۂ کلام اگست ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا، تو اس میں بھی نہ صرف یہ کہ نعت شریف کے بعد بسمل کی یہ غزل شامل کی گئی بلکہ اسے ایک خاص تزئین کے ساتھ کتاب کے آخری ڈسٹ کور پر بھی دے دیا گیا۔ "حکایتِ ہستی" میں گرچہ اس غزل کی تخلیق کا پوراپس منظر تو نہیں درج کیا گیا ہے لیکن اس میں عطا کاکوی کے بیان پر مستزاد سید شاہ جعفر حسین ایڈوکیٹ کا یہ بیان بھی درج ہے کہ انھوں نے پنڈت نہرو کو بھی اس غزل کا زیرِ بحث مطلع پڑھتے ہوئے سنا تھا اور یہ بات تو مشہور و معلوم ہی ہے کہ دسمبر ۱۹۲۷ء میں 'کاکوری کیس' میں پھانسی کی سزا پانے والوں نے پھانسی پانے سے پہلے عدالت سے باہر زینے پر بیٹھ کر جھوم جھوم کر یہ شعر گایا تھا۔

لہٰذا مذکورہ بالا مندرجات سے یہ نتائج سامنے آتے ہیں کہ زیرِ بحث شعر مفرد نہیں بلکہ دس اشعار پر مشتمل غزل کا مطلع ہے۔ اور یہ حسرت موہانی یا رام پرشاد بسمل کی تخلیق نہیں بلکہ شاگردِ شاد اور ہم نشین مبارک عظیم آبادی محمد حسن بسمل ہی کی طرف اس کا انتساب صحیح ہے۔ یہ غزل ۱۹۲۱ء میں کہی گئی اور کانگریس کی کلکتہ کانفرنس میں اسی سال پڑھی گئی تھی۔ البتہ برسبیلِ تذکرہ ایک تسامح کی طرف نشاندہی کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سید شاہ نجیب مصطفیٰ جعفری نے لکھا کہ اسے بسمل کی تصویر کے ساتھ مولانا ظفر علی خاں (لاہوری) نے اپنے اخبار "صباح" میں شائع کیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اخبار "صباح" مولانا ظفر علی خاں کی ادارت میں نہیں بلکہ قاضی عبد الغفار (متوفی ۱۹۵۶ء) کی ادارت میں نکلا تھا۔ چنانچہ مالک رام نے رسالہ "صباح" کو قاضی صاحب ہی کی طرف منسوب کیا ہے لیکن دو باتیں مزید تحقیق طلب ہیں ایک تو یہ کہ مصطفیٰ جعفری یا مالک رام کسی نے بھی "صباح" کے اس شمارے کی تاریخ اشاعت نہیں لکھی ہے اور نہ ہی مجھے مقامی کتب خانوں میں "صباح" کی کوئی فائل مل سکی اور دوسری بات یہ کہ سری نواس لاہوٹی نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ "آواز" نئی دہلی یکم جولائی ۸۵ء میں صفحہ ۵ پر لکھا ہے کہ قاضی عبد الغفار نے ۱۹۱۸ء میں "الصباح" نکالا لیکن چھ مہینے بعد اسے بند کر دینا پڑا۔ ان بیانات کی روشنی میں یہ ضروری ہے کہ اس رسالے کے زمانۂ اشاعت اور بالخصوص اس شمارے کی تاریخ اشاعت پر تحقیقی وضاحت کی جائے جس میں بسمل کی غزل شائع ہوئی تھی۔ امید ہے کہ کوئی صاحب نظر یہ تحقیقی تشنگی بھی دور فرما دیں گے۔

شوکت جمال

نیو پٹنہ فارمیسی، پٹنہ ۴

"اُردو اکادمی دہلی" کے موقّر ماہنامے
نِ اُردو دہلی" اور "بچّوں کا ماہنامہ اُمنگ" کے
ارے موصول ہوئے۔ ان مجلّوں میں معروف
. ادبا کی تخلیقات نظر سے گذریں۔ آپ نے
نے والوں کی بھی حوصلہ افزائی کی ہے جو ایک
سن امر ہے۔ گذشتہ دنوں اُردو ادب کے کئی
ندہ ستاروں کا غروب ہو جانا اُردو والوں
ہٗ فکریہ ہے۔ ایسے نازک وقت میں نئے
.الوں کی معیاری تخلیقات کا انتخاب بے حد
) ہے۔ اب معروف و غیر معروف کے امتیاز
رکھنا اُردو شعر و ادب کے سرمایے کو محدود
ے مترادف ہوگا۔ اس لحاظ سے آپ کے حُسنِ
،کی داد دیتا ہوں۔

"ایوانِ اُردو دہلی" کی خصوصی اشاعت،
. احمد عبّاس نمبر" قابلِ ذکر ہے کہ آپ نے اس
جہ صاحب مرحوم کی حیات اور ان کی گرانقدر
ِمات پر سیر حاصل مقالے شامل کیے ہیں۔
یاب تصاویر سے بھی اس نمبر کو مزیّن کیا
ت کم سرکاری رسالے اس آب و تاب سے
ا پرآتے ہیں۔ یہ سب آپ کی ذاتی توجہ،
ثوق اور لگن سے ہی ممکن ہو سکا ہے۔

ہ ایک المیہ ہے کہ اُردو میں اب بچّوں کے لیے
ما جا رہا ہے۔ بڑے قلم کار بچّوں کے لیے
یدا اپنی توہین سمجھنے لگے ہیں پہلے یہ بات
اکبر آبادی، اقبال، اسماعیل میرٹھی،
نا نیّر وغیرہ نے بچّوں کا ادب تخلیق
کرکے اُردو کے ادبی سرمایے میں بیش بہا اضافہ کیا
ہے۔ مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ آپ "اُمنگ"
شائع کرکے بچّوں کے ادب کو مالا مال کر رہے
ہیں۔

—— سیّد مظفر حسین برنی
(گورنر ہریانہ، ۱۸ فروری ۸۸ء)

○ "ایوانِ اُردو دہلی" کا شمارہ نمبر ۱ جو میرے
لیے پہلا ہے آج ظاہری معنوی خوبی سے آراستہ
ملا آپ کی خوش مذاقی کے ساتھ آپ کے درک و
بصیرت کا بھی قائل ہونا پڑا۔ بالخصوص "حرفِ آغاز"
کا یہ جملہ "عام حالات میں ادب کو ایسی تلوار بنا دینے
کی خواہش کا اظہار جو کسی کو مارنے کے کام بھی آسکے
اور ڈرانے کے بھی خاصا چونکا دینے والا ہے"۔
پروفیسر رشید احمد صدّیقی کی یاد آگئی۔ انتہائی
معقول، مگر اس کے ساتھ تصویر کا دوسرا پہلو بھی
دِکھاتے چلتے تو دائرہ مکمّل ہو جاتا کہ "اور اسی طرح
ادب کو اس درجہ بے مقصد بنا دینا کہ رُوح و ذہن
کو ناکارہ و حیز بنا دے کوئی مبارک فعل نہیں ہے
خواہ اس پر جدیدیت کا عنوان ہی کیوں نہ چسپاں
ہو" اس لیے کہ آپ سے اس توازن کی امید ہم
رکھتے ہیں[1]

آپ کے اداریہ سے یہ اندوہناک خبر بھی ملی
کہ بیگم صالحہ عابد حُسین ہمارے درمیان نہیں ہیں۔
اِنّا للّٰہ ...

—— مجروح سُلطان پوری، بمبئی

[1] مؤدبانہ گزارش ہے کہ اداریہ ایک بار اور ملاحظہ فرمائیں
اس میں یہ بات بھی عرض کردی گئی ہے۔ —— (ادارہ)

○ "ایوانِ اُردو دہلی" کے فروری ۱۹۸۸ء کے
شمارے میں آپ کا اداریہ بہت معنی خیز ہے۔ اس میں
ادب کی سماجی معنویت کے حوالے سے جو سوالات
آپ نے اُٹھائے ہیں ان پر اگرچہ ماضی قریب میں بہت غور
کیا جا چکا ہے مگر اب بھی ان سوالات پر نظریاتی
اختلافات سے گریز ممکن نہیں ہے۔

سلام بن رزّاق کے اس فقرے کے معنی "اگر
ہمارا فن سماجی معنویت سے خالی ہے تو اس کی حقیقت
اس بھوانی تلوار کی سی ہے جو لندن کے میوزیم میں رکھی
گئی ہے۔ وہ نہ کسی کو مارنے کے کام آسکتی ہے اور نہ
ڈرانے کے"، جو آپ نے لیے ہیں وہ بظاہر دُرست
معلوم ہوتے ہیں مگر اس کا ایک دوسرا مفہوم بھی
ہے کہ ادب میوزیم میں رکھنے کی چیز نہیں ہے۔ وہ
تو ایک زندہ اور توانا شے ہے جس سے زخم اور مرہم
دونوں کا کام لیا جا سکتا ہے بھیشم ساہنی کی ناول
"تمس" کی مثال سامنے ہے مگر یہ کلّیہ نہیں ہے
ایک امکانی صورت ہے۔ آپ ادب کی سماجی
معنویت کی کچھ بھی تعبیر کریں مگر ادب کی تخلیق ایک
آزادانہ عمل ہرگز نہیں ہے۔ اس دُنیا کا کوئی بھی عمل
کلیتاً آزاد نہیں ہے۔ یہاں تک کہ بیوی سے لطفِ
صحبت بھی مکمّل آزادانہ عمل نہیں ہے۔ اس میں
بھی اندیشہ ہائے دُور دراز کے سائے لہرانے لگتے ہیں۔
مَیں آپ کی اس بات سے متّفق ہوں کہ "ادب
اپنے پڑھنے والوں کے داخلی رویّوں میں تبدیلی لاتا
یا ان کی اصلاح کرتا ہے۔ خارجی حالات پر وہ
براہِ راست اثر انداز نہیں ہوتا۔ ادب کا مخاطب
فرد ہے سماج نہیں۔ وہ فرد کو متاثر کرکے ہی سماج
کو متاثر کر سکتا ہے"۔ مگر فرد کے روحانی ارتفاع
سے اس کے مادّی حالات میں بہتری کس طرح ممکن
ہوگی یہ میں نہیں سمجھ سکا۔ مَیں اسے اپنی فہم کا
قصور ماننے کو تیار ہوں مگر دُنیا کی تاریخ میں

کب ہوا ہے کہ کسی ملک یا خطّے نے روحانی بلندی
مل کرلی ہو اور اس سے اس کے مادّی حالات
بخود بہتر ہو گئے ہوں۔ یہ تو خلطِ مبحث ہے۔
ل سوال رُوحانیت اور مادّیت کا نہیں ہے بلکہ
ل اس کا ہے کہ ادب میں سماجی معنویت کا ظہور
نہج سے ہو کر ادب کی اپنی شناخت بھی قائم
، اور وہ حقیقی زندگی سے بے تعلق بھی نہ ہو۔ اظہار
سالیب مختلف ہو سکتے ہیں مگر ادب کو ادب
رہنا چاہیے پمفلٹ نہیں بن جانا چاہیے اور نہ
اس کو دیوانے کے خواب یا مجذوب کی بڑ کی صورت
ظاہر ہونا چاہیے جیسا کہ آج کل بعض انتہا پسند
ید افسانہ نگار پیش کر رہے ہیں۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ روسو کی تحریروں
انقلاب فرانس کی راہ ہموار کی اور یہ بھی درست
کہ ادب انقلاب نہیں لا سکتا مگر ذہن و فکر کو
ثر کر سکتا ہے اور ایک بہتر زندگی کے حصول کے
جدوجہد کا حوصلہ دے سکتا ہے۔ علامہ اقبال نے
ی تو یہی کہا تھا . . . .

"جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا"

ب کے لیے یہ کہنا کہ وہ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ
، نہ بذاتِ خود کوئی مقصد بلکہ یہ صرف تخلیق کار
ذہنی آسودگی کا ذریعہ ہے جس سے وہ ... پنا
بتھارسس کرتا ہے' ایک ایسا مفروضہ ہے جس
نہ کوئی منطقی جواز ہے اور نہ عملاً ایسا ہوتا ہے۔

——— نامی انصاری' کانپور

ہم نے مادّیت یا روحانیت کی بحث نہیں چھیڑی ہے روحانی
بلندی سے مراد اخلاقی ترقی ہے جو لازماً مادّی حالات پر اثر
انداز ہوتی ہے۔
——— (ادارہ)

○ فروری کے اداریہ میں سلام بن رزّاق کی ایک
تقریر کے حوالے سے ادب کے سماجی مقاصد پر اظہارِ
خیال کرتے ہوئے آپ نے بالکل دُرست فرمایا ہے کہ
ادب اپنے پڑھنے والوں کے داخلی رویّوں میں تبدیلی
لاتا ہے یا ان کی اصلاح کرتا ہے' خارجی حالات پر
وہ براہِ راست اثر انداز نہیں ہوتا۔ ان دنوں
پھر کچھ لوگ ادب میں سماجی پس منظر کی بات
زوروں سے اُٹھا رہے ہیں۔ گذشتہ دنوں جھریا
میں مشہور افسانہ نگار غیاث احمد گدی کی برسی کے
موقع پر پروفیسر رونق شہری نے ایک فکر انگیز
مقالہ "غیاث احمد گدی کے افسانوں میں سماجی
پس منظر" پڑھا۔ موصوف نے کہا کہ "گدی کے
افسانوں میں سماجی پس منظر جُز کی حیثیت رکھتے
ہیں کُل کی نہیں۔ ان کے یہاں دوسرے موضوعات
بھی کم نہیں ہیں۔" میرے خیال میں غیاث احمد
گدی کے افسانوں کے یہی اوصاف انہیں کلاسک
کا درجہ عطا کرتے ہیں۔ ادب کی تعریف جو آپ نے
پیش کی ہے غیاث احمد گدی کے افسانے اس کی
روشن دلیل ہیں۔

——— نجم عثمانی' دھنباد

○ "ایوانِ اُردو دہلی" کا فروری ۱۹۸۸ء کا
شمارہ بروقت موصول ہوا۔ حالانکہ آج کل رسالے
دیر سے شائع ہوتے ہیں اور قاری کو کرب سے دوچار
ہونا پڑتا ہے یہ خدا کا کرم اور آپ لوگوں کی انتھک
کوششوں کا نتیجہ ہے کہ "ایوانِ اُردو دہلی" پابندی
کے ساتھ وقت پر شائع ہو رہا ہے۔

آپ نے حرفِ آغاز میں درست ہی فرمایا
ہے کہ ادب کا مخاطب فرد ہوتا ہے نہ کہ سماج۔ فرد
کو متاثر کر کے ہی سماج کو متاثر کیا جا سکتا ہے۔
مجروح صاحب کی غزل لاجواب ہے۔ ان کا یہ فرمانا
کہ قلم اور زندگی دونوں گھسیٹ رہے ہیں اس
سے قاری کو پریشانی محسوس ہوتی ہے۔
کالی داس گپتا رضا صاحب نے تحقیق کا ایک
عمدہ نمونہ پیش کیا ہے اظہر فاروقی صاحب نے ساہنی
کے افسانے کا ترجمہ نہایت عمدگی اور سلیقے سے کیا ہے
یہ گمان ہی نہیں ہوتا ہے کہ ترجمہ پڑھا جا رہا ہے "پوتا
پالنا" ایک دِلکش انشائیہ ہے۔ ناقابلِ فراموش
واقعے متاثر نہیں کر سکے۔

——— انوار انصاری' رانچی

○ پچھلے ماہ دہلی سے آئے ہوئے ایک دوست کے
پاس "ایوانِ اُردو دہلی" (نومبر ۱۹۸۷ء) دیکھ کر
عجیب افسوسناک مسرت حاصل ہوئی۔ ایک اتنا
اچھا جریدہ سری نگر میں نہیں نظر آیا۔ جبکہ پست معیار
کے جاسوسی' فلمی' نیم مذہبی اور جرائم کے رسایل کی
یہاں بھرمار ہے۔ آخر پورے ملک کی واحد اُردو
ریاست میں کیوں "ایوانِ اُردو دہلی" جیسے جرائد
بھیجنے کی طرف خصوصی توجہ نہیں کی جاتی؟[1]

——— محمد عارف بٹ' سری نگر

[1] ہم اپنے طور پر کوشاں ہیں۔ آپ بھی ہمارا ساتھ دیں اور
اپنے حلقۂ اثر تک اسے پہنچائیں۔ ——— (ادارہ)

○ دہلی سے واپس آنے والے میرے ایک دوست
نے دیگر ادبی رسائل کے ساتھ "ایوانِ اُردو دہلی" کے
بھی آٹھ شمارے مجھے بطور تحفہ پیش کیے۔ مَیں نے
دو تین دن میں اس نئے جریدے کے تقریباً تمام
شمارے دیکھ ڈالے ہیں۔ بحیثیت مجموعی پرچہ خوب
ہے۔ مگر یہ دیکھ کر کوفت ہوئی کہ کہیں کہیں تھوڑے
سے نئے پن کے سوا پرچہ سراسر روایتی ہے۔ آثارِ قدیمہ
جیسے مضامین زیادہ دے کر "ایوانِ اُردو دہلی" کو
کلچرل اور زیادہ منفرد بنائیے۔

عبّاس نمبر شائع کرنے پر مبارکباد۔ اس کا
ابھی صرف حصّہ "رو برو" ہی پڑھا ہے جو نہایت
ہی معیاری' معلوماتی' اہم اور خوبصورت ہے براہِ کرم
کشمیر میں "ایوانِ اُردو دہلی" بھجوایا کریں۔[2]

——— ظہور شاعر' سری نگر

[2] آپ اس سلسلے میں ہم سے تعاون کریں چند ایجنسیوں کو "ایوانِ
اُردو دہلی" جاتا ہے مگر محدود تعداد میں۔ (ادارہ)

○ خواجہ احمد عباس نمبر" میں نزہت مہدی نے "خواجہ احمد عباس ایک نظر میں" کے عنوان سے ان کے مختصر حالاتِ زندگی درج کیے ہیں۔ اس میں انعام و اکرام کی فہرست میں مدھیہ پردیش اُردو اکادمی کے کُل ہند میر تقی میر ایوارڈ کا ذکر نہیں ہے۔ یہ ایوارڈ گیارہ ہزار روپیہ کا تھا اور وزیرِ اعلیٰ جناب ارجن سنگھ کے ہاتھوں ایک تقریب میں دیا گیا تھا۔ اس تقریب میں فیض احمد فیض بھی موجود تھے یہ ایوارڈ ۱۹۸۰ء کا تھا اور یہ جلسہ ۲۸ اپریل ۸۱ء کو منعقد ہوا تھا۔ اس طرح سے پدم شری اور ہریانہ سرکار کے اعزاز کے بعد یہ تیسرا اعزاز ہوا۔

اس کا ذکر قدرے تاخیر سے کر رہا ہوں مجھے امید تھی کہ ضرور کوئی اس طرف توجہ دلائے گا لیکن افسوس ہوا کہ لوگ کس قدر جلد بھول جاتے ہیں۔

—— اظہر راہی، اجین

○ میں "ایوانِ اُردو دہلی" کا پابندی سے مطالعہ کرتا ہوں مجھے خوشی ہے کہ اُردو اکادمی دہلی نے ایک نہایت مثبت قدم اُٹھایا ہے اس خط کے ذریعے میں آپ کی توجہ ایک خاص سمت میں دلانا چاہتا ہوں۔ آپ نے پہلے شمارے کے "حرفِ آغاز" میں لکھا تھا "ایوانِ اُردو دہلی کا ایک اور مقصد سائنسی روشن خیالی کو فروغ دینا ہے"۔ لیکن آپ کے رسالے میں سائنسی مضامین کبھی کبھی بھولے بھٹکے ہی نظر آتے ہیں۔ گذشتہ تین شماروں سے سائنس کا "س" بھی "ایوانِ اُردو دہلی" میں نظر نہیں آیا۔ یہ مانا کہ ایک شمارہ خواجہ احمد عباس نمبر تھا لیکن بقیہ دو عام شمارے تھے۔ سائنس کی اہمیت سے ہم سب جتنا واقف ہیں اتنا ہی اُردو قارئین میں سائنسی مزاج کی کمی سے بھی واقف ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اُردو میں سائنسی مضامین لکھنے والے بہت کم ہیں لیکن کیا یہ اُردو اکادمی کے لیے بھی ناممکن ہے؟ [1]

—— محمد ایوب اور ساتھی، روڈ گران، دہلی

۱؎ سائنسی روشن خیالی سے ہماری مراد ایک ایسا اندازِ نظر ہے جو معقولیت پسند ہو۔ "ایوانِ اُردو دہلی" بساط بھر یہ اندازِ نظر پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور گاہ بگاہ سائنسی موضوعات پر بھی مضامین ہم اپنے قارئین تک پہنچا رہے ہیں۔ (ادارہ)

○ فروری کے شمارے میں بھیشم ساہنی صاحب کی کہانی اہم برہما سمتی (ترجمہ اطہر فاروقی صاحب) نظر نواز ہوئی۔ اس کہانی کا شمار ہندی ادب کی بہترین کہانیوں میں ہوتا ہے جس میں تمام قدیم فلسفیوں کو سنسکرت تصوف کی روشنی میں ہندوستان کی جنگ آزادی کا پس منظر فراہم کیا گیا ہے۔

کہانی میں سنسکرت الفاظ کی کثرت ہے جس کی وجہ سے بہت لوگ کوشش کے بعد بھی آج تک اس کا اُردو ترجمہ نہیں کر پائے۔ خود میں نے بھی بھیشم صاحب کی اجازت سے اس کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہا۔ ترجمے سے قطع نظر غالباً اطہر صاحب نے بغیر اجازت ترجمہ کیا ہے ورنہ جب بھیشم صاحب مجھے تحریری اجازت دے چکے ہیں تو پھر اطہر فاروقی صاحب کو کبھی نہ دیتے۔ [1]

—— شمس فیض، جمشید پور

۱؎ اطہر فاروقی صاحب نے ساہنی صاحب کی اجازت ہی سے اس کہانی کا ترجمہ کیا ہے۔ —— (ادارہ)

○ "ایوانِ اُردو دہلی" کا فروری ۱۹۸۸ء کا شمارہ زیرِ مطالعہ ہے۔ مضامین کی ترتیب میں آپ نے جس خوش سلیقگی کا مظاہرہ کیا ہے اس پر مبارکباد قبول فرمائیے۔ خلیق انجم کا "دہلی کے آثارِ قدیمہ" پر مشتمل مضمون تاریخی اور جغرافیائی اعتبار سے بہت ہی معلوماتی ہے۔ میرے خیال میں یہ سلسلہ صرف دہلی تک ہی محدود نہیں رہنا چاہیے میری ناقص رائے ہے کہ آپ ادب سے متعلق "معلوماتِ عامہ" کا ایک گوشہ ضرور رکھیں تاکہ قارئین کی معلومات میں اضافہ ہو۔

—— عبدالحق حقانی القاسمی، پورنیہ

○ ماہ فروری ۸۸ء کے شمارے میں جناب مظہر امام کی غزل بطور خاص پسند آئی دوسری طرف شیخ سلیم احمد کا افسانہ "خون" اور اندرجیت لال کا انشائیہ "پوتا پالنا" قابلِ تعریف ہیں۔

—— ایم۔ اے کریمی، گیا

○ "ایوانِ اُردو دہلی" کے تمام گوشوں کے ساتھ اگر ایک گوشہ مختصر ڈرامے کا بھی ہو تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کی افادیت اور بڑھ جائے گی کیونکہ اُردو ادب میں ڈرامے کی طرف توجہ نہیں کے برابر ہے۔ ممکن ہے آپ کے ایک اور گوشہ کے بڑھا دینے سے ڈرامہ نگار یا قلمکار حضرات متوجہ ہوں اور اُردو ڈرامے کے سرمایے میں اضافہ ہو۔

—— رضی الرحمٰن، رانچی

○ فروری ۱۹۸۸ء کا "ایوانِ اُردو دہلی" کتاب گھر مئو سے دستیاب ہوا۔ اس ماہ ٹائیٹل بہت خوبصورت تھا۔ فضا ابن فیضی، مجروح سلطانپوری اور مظہر امام کی غزلیں کافی پسند آئیں۔ کہانیوں میں "پُرانی بستی کی نئی کہانی" پسند آئی۔

—— اعجاز احمد انصاری، مئو ناتھ بھنجن

○ "ایوانِ اُردو دہلی" میں مزید دو چیزوں کا جو آپ نے اضافہ کیا ہے تصویر پر نثری یا شعری عنوان اور دوسرا اہم طرح اشعار یہ مجھے بہت پسند آیا۔

—— محمد یوسف مفتاحی، رانچی

○ "ایوانِ اُردو دہلی" (مارچ ۱۹۸۸ء) موصول ہوا شکریہ اس میں میری غزل کے مطلع ثانی میں ایک لفظ غلط چھپ گیا ہے مطلع اس طرح ہے

رات کو جاگنا، دن کو سونا تیرے نام
خوابوں کو پلکوں میں پرونا تیرے نام

پہلا مصرع اس طرح شائع ہو گیا ہے۔

رات کو جاگنا شب کو سونا تیرے نام

ازراہِ کرم یہ خط شائع فرما دیجیے تاکہ رفعِ شک ہو جائے۔

—— عنوان چشتی، نئی دہلی

○ "ایوانِ اُردو دہلی" فروری ۱۹۸۸ء کے صفحے (۹ صفحہ) ۵۸ کے حوالے سے عرض ہے کہ آپ نے میرے شعر کو عمداً حذف تو کیا لیکن اس کی کوئی وجہ ظاہر نہیں کی۔ خیر!

مطلع میں تبدیلی کی دونوں وجہوں کو بھی شاید ہی کوئی قبول کرے۔ شعر سے متعلق نہ کوئی اُردو محاورہ[1] ہے اور نہ ہی وہ میرے شعر کا جزو ہے۔ اپنے خیال کا اظہار جس میں شعر کے قافیے کی کلیدی حیثیت ہے، میں نے صرف الفاظ "نکل آئیں گے" سے کیا ہے، جس کی نہ صرف ترسیل بلکہ توثیق بھی "نکل آنا" کے معانی سے ہو جاتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے "فرہنگِ آصفیہ" (دوسری اشاعت) جلد سوم صفحات ۹-۲۴۸ "نکل آنا" (فعل لازم) (۱) باہر آنا، ظاہر ہونا، باہر ہو جانا؛ (۲) پیدا ہونا، کھڑا ہونا، برپا ہونا۔ (۳) پھوٹنا، اُبھرنا، زمین سے باہر آنا۔ اور "فیروز اللغات" (نئی اشاعت)، صفحہ ۱۳۷۰ "نکل آنا" (ا۔مص) باہر آنا، ظاہر ہونا، پیدا ہونا، زمین سے باہر آنا، پھوٹنا۔

یہ بھی عرض ہے کہ "نکل آئیں گے" کی تکرار سے مطلع میں حُسن اور اثر کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے "نظر آئیں گے" کی تبدیلی سے زائل ہو جاتی ہے۔

—— ایم۔ قمرالدین، نئی دہلی

[1] اُردو محاورے کا مطلب ہے اُردو بول چال اور ہم پھر عرض کریں گے کہ "شعر نکل آنا" اُردو بول چال نہیں ہے۔ "نکل آنا" کے جو معنی آپ نے نقل کیے ہیں وہ درست ہیں۔ (ادارہ)

○ فروری ۱۹۸۸ء کے شمارے میں میرا جو خط چھپا ہے، اس میں خواجہ احمد عباس کے جاری کردہ ہندی جریدے کا نام "سنگم" تحریر ہے غالباً یہ سہو مجھ سے ہی ہوا ہے۔ دراصل اس جریدے کا نام "سرگم" تھا۔

—— مظہر امام، سری نگر

○ "ایوانِ اُردو دہلی" جتنا مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس رسالے کو عوام میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ اور بڑی تیزی سے اس نے اپنے ہم مزاج قارئین کا ایک حلقہ بنا لیا ہے۔ مگر ایک بات یہ کھٹکتی ہے کہ یہ رسالہ تازہ وارد افسانہ نگاروں/ شاعروں کی تخلیقات شائع کرنے سے گریز کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں جب تک ہمیں آج کے نوجوانوں کی سوچ کا، ان کی تخلیقات کے توسط سے پتہ نہیں چلتا ہم ان کے اندر کے چھپے ہوئے فنکار کی بازیافت نہیں کر سکتے۔ اگر تازہ وارد افسانہ نگاروں/ شاعروں کے لیے کوئی نیا کالم شروع کیا جائے تو یہ قدم اُردو قاری کے حق میں سودمند ثابت ہو سکتا ہے۔ امید ہے آپ اس طرف توجہ دے کر ممنون فرمائیں گے[1]

—— ذاکر حسین، گونڈی

[1] "ایوانِ اُردو دہلی" کے ہر شمارے میں دو تین نو وارد قلمکاروں کو جن کی تخلیقات اچھی صلاحیتوں کی غماز ہوں، جگہ دی جاتی ہے۔ (ادارہ)

○ خوب سے خوب تر کی جستجو میں "ایوانِ اُردو دہلی" کی رفتار بہت خوب ہے۔ لیکن "سرودِ رفتہ" کے تحت صرف شعرا ہی کی رونمائی چہ معنی دارد؟ نثر نگاروں کو کیوں نظر انداز کیا جا رہا ہے؟ ان کا تعارف ان کی تصانیف کے نام اور چند منتخب جملوں سے ہونا چاہیے۔ (اور ولادت و وفات کے سنین کے ساتھ مقامات بھی درج فرمائیں تو بہتر ہو) بلکہ ایک قدم اور۔ ساہتیہ اکادمی کے ایوارڈ یافتہ مصنفین بھی اس بزمِ سرود میں شمولیت کے مستحق ہیں[1]۔

—— ابن غوری، اُلگ

[1] اس کالم کا عنوان "سرودِ رفتہ" ہے، اس میں مرحومین ہی جگہ پا سکتے ہیں۔ ساہتیہ اکادمی کے ایوارڈ یافتہ حضرات کے لیے ہم ایک الگ گوشہ قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ (ادارہ)

○ رسالہ بک اسٹال سے خرید کر نہایت شوق و ذوق سے پڑھتا ہوں اور طبیعت ہمیشہ دوسرے شمارے کے استقبال کے لیے بے قرار رہتی ہے۔ دلنواز جریدے کو دیکھ کر اور پڑھ کر زبانِ اُردو کی سابق شان و شوکت اور عظمتِ رفتہ کی تازہ ہو جاتی ہے۔ اگر "ہم طرح اشعار" اور "سرود..." وغیرہ کی طرح "ایوانِ اُردو دہلی" میں مزید ایک کالم کی گنجائش نکال کر "ادبی شہ پارے" یا "معتبر ادب پارے" کے عنوان سے ایک مستقل سلسلے کا آغاز کیا جائے اور اس کے تحت ان معیاری ادبی شہ پاروں کو جگہ دی جائے جو نثری ادبیات کے انبار میں پڑے ہیں اور جن سے ہم جیسے تہی دست و دلدادۂ ادب انسان کی آنکھیں ہنوز نا آشنا ہیں تو اچھا ہو۔

—— حسین احمد مہپیاوی، دارالعلوم

○ "ایوانِ اُردو دہلی" سرورق سے آخری صفحے تک جو حُسن و دلکشی رکھتا ہے وہ عصرِ حاضر کے اُردو رسالوں میں کم ہی دیکھنے میں آیا ہے کتابت، طباعت کے حُسن کے علاوہ مضامین نظم و نثر کا انتخاب اور ان کا تنوع ان کی تزئین و ترتیب میں جدت، انفرادیت اور پھر اُردو خبرنامے کا اضافہ قارئین کے دامنِ نظر کو اپنی طرف کھینچ کر صدا دیتے ہیں۔

—— ساحل اُوگانوی، اُوگانو

-e-Urdu Delhi, Issue No. 12, April 1988, Price Rs. 2-50 A.H.W.
-red with the Registrar of News Papers at R. N. No. 45938/87 Delhi Postal Regd. No.

سرودِ رفتہ

صحبت میں غیر کی نہ مرے یار بیٹھنا
بیٹھے بھی گاہے جا کے تو ہشیار بیٹھنا

ہو جاویں گے اک آن میں رستے کے رستے بند
جا کر کہیں نہ تو سرِ بازار بیٹھنا

ہوں گرچہ بے گنہ، پہ مجھے تیرے روبرو
سر کو جھکائے مثلِ گنہ گار بیٹھنا

کیا یہ بھی چڑ نکالی ہے، یوں میرے سامنے
آئینہ لے کے ہاتھ میں ہر بار بیٹھنا

اے مصحفی وہ دوست ہی دشمن ہے جان کا
تو اُس کے پاس جا کے نہ زنہار بیٹھنا
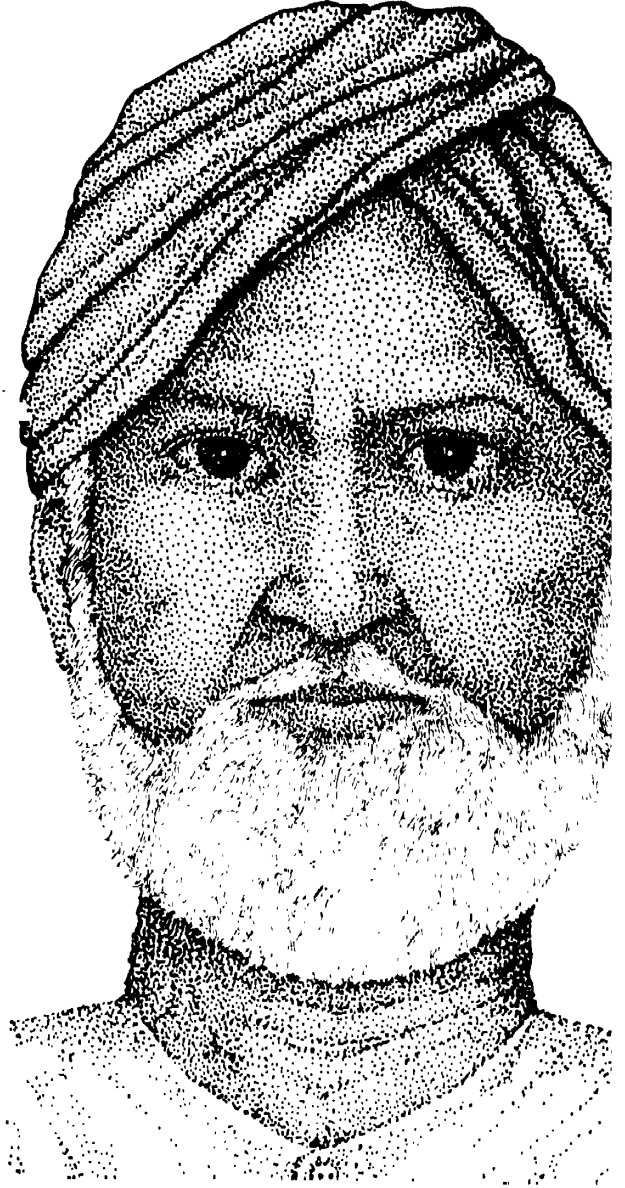
شیخ غلام ہمدانی مصحفی

ولادت : ۱۷۴۹ء
وفات : ۱۸۲۴ء